تصنیف

اے۔ جے۔ گرانٹ

ترجمہ

مولوی حمید احمد صاحب انصاری بی۔ اے

مترجم و رفیق جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی

سنہ ۱۳۵۰ھ م سنہ ۱۳۴۰ف م سنہ ۱۹۳۱ع

یہ کتاب لانگمنس گرین اینڈ کمپنی کی اجازت سے
جن کو حق اشاعت حاصل ہے اردو میں ترجمہ
کرکے طبع و شائع کی گئی ہے

فہرست مضامین تاریخ یورپ

حصہ اول حصہ دوم حصہ سوم

فہرست مضمون تاریخ یورپ — حصہ اول - دوم - سوم

فہرست مضامین تاریخ یورپ

فہرست مضامین

یورپ اور مغربی ایشیا کا سطحی نقشہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ یورپ

حصۂ اوّل

قرونِ اولیٰ

بابِ اوّل

تاریخ یورپ کا دورِ اولیں

یورپ کے تاریخی روایات، اور تمدن میں چند ایسے ممتاز اور بدیہی خصوصیات ہیں جو مصر اور ایشیا کے تمدنوں میں مفقود ہیں۔ مگر چونکہ براعظم یورپ ایشیا و افریقہ سے ملحق ہے اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ قرونِ ماضیہ میں یورپ کی تہذیب ایشیا اور مصر کے تمدن قدیم کی خوشہ چیں رہی ہے۔ دونوں تمدنوں میں کیا حقیقی تعلق تھا یا یونان نے مصر۔ لیڈیا۔ فینشیا اور اسیریا سے کس قدر فیض حاصل کیا یہ ایسے مسائل ہیں جن کی اب تک تحقیق نہیں ہو سکی۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کی ابتدائی تاریخ جن تیرہ و تار بادلوں میں چھپی ہوئی ہے وہ تحقیق کی تیز کرنوں کی تاب نہیں لا سکتے اور رفتہ رفتہ چھٹتے جاتے ہیں جس سے تاریکی

دھندلی سی روشنی نظر آرہی ہے۔ مگر قبل اس کے کہ تاریخ قدیم کے متعلق کچھ قابل وثوق حالات معلوم ہوں ضرورت ہے کہ تحقیقات کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو۔ اکھاڑات کا کام اور سرگرمی سے کیا جائے۔ کتبے پڑھے جائیں اور گم شدہ زبانوں کے حروف معلوم ہوں۔ ماہرین فن جدید قیاسات پیش کرینگے اور ان پر رد و قدح ہوگی مگر ان مختلف اور متضاد آراسے ممکن ہے کہ ایک حد تک انکشاف حقیقت ہو۔ اس وقت صرف یہ ممکن ہے کہ تاریخ قدیم کے چند پہلوؤں پر سرسری نظر ڈالی جائے۔

مشہور یونانی شاعر ہومر کی رزمیہ نظمیں تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے نہایت ہی اہم و ممتاز ہیں کیونکہ ان کے مطالعہ سے ایک حد تک حقیقت حال منکشف ہوتی ہے اور انھیں سے تاریخ یورپ کی ابتدا ہے۔ اہل یورپ کے علمی ذخیرے میں یہ نظمیں سب سے قدیم ہیں اور زمانہ حال تک ان سے بہتر یا ان کی ہم پلہ نظمیں نہیں لکھی گئیں۔ ان نظموں کی قدامت سے یہ نہ خیال کیا جائے کہ یہ وحشیوں کے بے سرے ترانے ہیں بلکہ یہ نظمیں اس خاص صنف کلام یعنی رزمیہ شاعری کے بہترین اور قابل قدر نمونے ہیں۔ ہومر کی دو نظمیں ہیں جن میں سے ایک کو ایلیڈ اور دوسری کو اوڈیسی کے نام سے مشہور ہے۔ دونوں نظموں کا موضوع ایک مشہور جنگ ہے جو یونانیوں اور ساکنین شہر ٹرائے کے مابین مدت تک جاری رہی۔ ایلیڈ میں جو شروع سے آخر تک بالکل رزمیہ رنگ میں ہے شہر ٹرائے کے محاصرے کا ذکر ہے اور خصوصاً مشہور یونانی سورما اکیلیس کی برافروختگی کا تذکرہ ہے جس کی وجہ سے یونانیوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور ان کا سب سے جری سپاہی یونانی سردار اگامیمنن کی بدسلوکی سے رنجیدہ ہو کر اپنے خیمے میں پڑا رہا۔ اصل قصہ تو صرف اسی قدر ہے مگر اس کے سلسلے میں شاعر نے یونانیوں اور ٹرائے والوں کی معرکہ آرائیوں کے نہ صرف عجیب و غریب قصے بیان کئے ہیں بلکہ ان کے رزم و بزم کے نقشے دکھائے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس انسانی جنگ میں دیوتا بھی وقتاً فوقتاً مداخلت کیا کرتے تھے اور گو رزمیہ رنگ غالب ہے مگر شرکائے جنگ کی حرماں نصیب بیویوں اور والدین کے درد مفارقت کو خوب دکھایا ہے۔ دوسری نظم یعنی اوڈیسی کا موضوع اس سے زیادہ وسیع ہے

اس میں ایک یونانی سردار یولی سیس کی جہاں نوردی کا ذکر ہے جو محاصرۂ ٹرائے کے ختم ہو جانے کے بعد سرگرداں رہا اور بحری سفر کی صعوبتوں اور دیوتاؤں کی ناراضگی کی وجہ سے ایک مدت دراز کے بعد اپنے وطن پہنچا اور مختلف مقامات کی سیر کی۔ اس نظم سے اس زمانے کے طرز زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور نہ صرف سپاہیوں اور جنگجو لوگوں کا ذکر ہے بلکہ عورتوں کا بھی مثلاً اس کی وفادار بیوی پی نی لوپی، ساحرہ کرِ کی اور شہزادی ناسی کا، جسے شاعر نے حسن اور عالم دوشیزگی کا بہترین نمونہ بنایا ہے۔ شاعر ہم کو مختلف مجالس اور مختلف مذاق کے لوگوں میں لیجاتا ہے۔ کبھی ملاحوں میں کبھی شہروں کے سیاسی جلسوں اور کبھی تجارتی لوگوں کے کھیلوں میں گویا اس زمانے کے رسم و رواج کی ایک پوری تصویر ہے۔ اڈیسی ؔالیڈ سے رزمیہ عظمت وشان میں کم مرتبہ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ یورپین لٹریچر میں اس سے بہتر کوئی افسانہ نہیں۔ ہومر کی نظموں میں یورپ کی ابتدائی تاریخ کے متعلق سب سے پرانا مواد ملتا ہے۔ ایک مدت تک یہ مسائل زیر بحث تھے کہ ان نظموں کا مصنف کون ہے۔ تاریخی واقعات سے ان کو کہاں تک تعلق ہے اور سوسائٹی کی جو تصویر اس کے صفحوں میں کھینچی گئی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے لیکن گزشتہ پچاس سال میں ایک قسم کا نیا مواد بھی مل گیا ہے۔
ماہرین آثار قدیمہ اور ارباب حفر (Excavatoss) نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ۱۸۷۲ء میں شلائی مان نے ٹرائے میں زمین کھودنا شروع کیا اور زمین کے نیچے سے ایسے خزانے برآمد کئے جو ہزاروں سال سے دبے ہوئے تھے۔ اس محقق نے دوسرے مقامات پر بھی کامیابی کے ساتھ حفر کا کام کیا۔ اس کی کامیابی سے دوسروں کی بھی ہمت افزائی ہوئی مگر کسی کو اس قدر کامیابی نہ ہوئی گو ان کا اسلوب کار زیادہ بااصول تھا۔ شلائی مان کی تحقیقات نہایت دلچسپ اور مفید تھی مگر ڈاکٹر ایونس نے ۱۸۹۳ء میں کریٹ میں جو نئی باتیں معلوم کیں ان سے تاریخ قدیم کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئے تھے اُن میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ ڈاکٹر ایونس نے ایک گم شدہ تہذیب

کے آثار دریافت کیے جس کا مورخین کو کبھی وہم گمان بھی نہ ہوا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ یورپ کے تہذیب و تمدن کا آغاز ہومر کی نظموں سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال قبل ہوا ہے۔ کتبے بھی دریافت کیے گئے مگر وہ ایسے حروف میں لکھے ہوئے ہیں جو اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئے ہیں جو مواد اس تحقیقات سے بہم پہنچا ہے اس سے بہت سے سوال پیدا ہوتے ہیں مثلاً تمدن یورپ کی قدامت کس قدر ہے اور اس کو مشرق کی تہذیب و تمدن سے کیا تعلق ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ مدت تک اس تحقیقات میں مصروف رہینگے مگر اب ان نظریات کو چھوڑ کر ہمیں اصلی تاریخ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

ہومر کی تصویریں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہومر کے نام سے جو نظمیں منسوب کی جاتی ہیں وہ اس کی ہیں یا کسی دوسرے مصنف یا مصنفین کی۔ ان امور کا ابھی قطعی تصفیہ نہیں ہوا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کے سیاسی اور تمدنی حالات کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ باوجود افراط و تفریط صحیح ہے۔ علاوہ اس کے ادبی حیثیت سے یورپین تمدن کی یہ پہلی جھلک دلچسپی سے خالی نہیں۔

شاعر ہمیں ایک ایسا تمدن دکھاتا ہے جس میں یونانی قوم بے شمار دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہے جن کے ہاتھوں میں انسان کی بھلائی اور برائی تھی۔ زیس دیوتاؤں اور انسانوں کا باپ، دیوتاؤں پر حکمراں تھا مگر اسے کامل اختیارات حاصل نہ تھے۔ دیوتا طاقت کے لحاظ سے انسان سے افضل تھے کیونکہ وہ حیات و ممات کے پابند نہ تھے مگر ان کی اندرونی حالت انسان سے بہتر نہ تھی۔ زیس بھی نہ قادر مطلق تھا نہ احکم الحاکمین۔ اس کے اخلاق و عادات بھی ویسے ہی تھے جیسے ٹرائے کے سورماؤں کے۔ تمدن ابتدائی حالت میں تھا۔ مردوں کا پیشہ کاشتکاری اور جنگجوئی تھا اور بعض تجارت بھی کرتے تھے۔ غلامی پر تمدن کا دار و مدار تھا۔ اسیران جنگ غلام بنائے جاتے تھے۔ عورتوں کا اثر غالب تھا مگر قانوناً ان کی حیثیت غلاموں سے بہتر نہ تھی۔ دیہات میں پیتل سب سے زیادہ استعمال میں آتا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ دورِ

حجریت ختم ہوگیا تھا اور عہد حدیدیت شروع ہو چکا تھا کیونکہ لوہے کا بھی جا بجا ذکر آتا ہے۔

یونانیوں کی سیاسی حالت جو اس نظم میں بیان کی گئی ہے وہ مورخین کے لئے اور بھی دلچسپ ہے کیونکہ اسی خاکے پر یونان کی سیاسی عمارت کی بنیاد پڑی ہے اور یورپ کی سیاسی ترقی پر بھی اس کا بہت کچھ اثر پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم میں ایک بادشاہ ہوتا تھا مگر اس کو یہ منصب نہ صرف حسب و نسب کی بنا پر حاصل ہوتا تھا بلکہ دلاوری اور شجاعت اور فہم و ذکاوت کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا۔ بادشاہ بالکل خود مختار نہیں ہوتا تھا کیونکہ تمام اہم سیاسی امور امراء کے مشورے سے طے ہوتے تھے اس لئے ہومر کے زمانے کی ریاستوں میں مجلس امراء کا دوسرا نمبر ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مجلس بھی تھی جو بادشاہ اور مجلس امراء سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ بادشاہ اور اس کے امراء کسی کام کو شروع تو کر سکتے تھے مگر ان کو یہ آزادی نہ تھی کہ نہایت ہی اہم امور میں رعایا سے مشورہ لئے بغیر قطعی تصفیہ کر لیتے اس لیے اس قسم کے جملہ امور مجلس عام میں پیش ہوتے اور اس مجلس کو اختیار تھا کہ بادشاہ کے تجاویز کو قبول کرے یا ان پر عمل کرنے سے انکار کر دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابتدائی خاکے میں حکومت کے یہ وہی اشکال ہیں جن کو اب ہم ملکیت امرائیت اور جمہوریت کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

باب دوم

یونان کی ابتدائی تاریخ

تمدن یورپ کی تاریخ میں سب سے نمایاں خصوصیت اس کی وسعت پذیری ہے یعنی جو خیالات اور جذبات ایک محدود طبقے میں مقید تھے وہ رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل گئے۔ یورپ کے ایک دور افتادہ گوشے (یونان) میں تہذیب اور تمدن کی ابتدا ہوئی۔ پھر بحیرۂ روم کے ساحلوں پر جو ممالک واقع ہیں ان میں پھیلی۔ وہاں سے اس کے اثرات مغربی یورپ میں پہنچے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ دنیا کے اکثر ممالک اس سے فیض یاب ہو گئے۔ یورپ نہ صرف یونان بلکہ روما اور شام اور دوسرے ممالک کا ممنون منت ہے مگر یونان کا اثر غالب اور ابھی تک باقی ہے کیونکہ زمانۂ حال کے تمدن کے جملہ ترقی پذیر عناصر کی ابتدا یونان ہی سے ہوئی ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ نہ تو اس کا رقبہ ہی زیادہ ہے اور نہ اس کے فوجی اور سیاسی کارنامے ہی دوامی اہمیت رکھتے ہیں پھر بھی اس ملک کی تاریخ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

یونان کا رقبہ بہت ذرا سا تھا مگر اس سے مغالطے میں نہ پڑنا چاہئے۔ کیونکہ جس ملک کو اس وقت ہم یونان کہتے ہیں اس سے یونان کا رقبہ مسیحؑ سے چھ سو سال قبل بہت زیادہ تھا اور لفظ یونان (یا ہیلاس) کا اطلاق ان تمام ممالک پر تھا جہاں یونانی بود و باش رکھتے تھے۔ علاوہ یونان کے یونانی
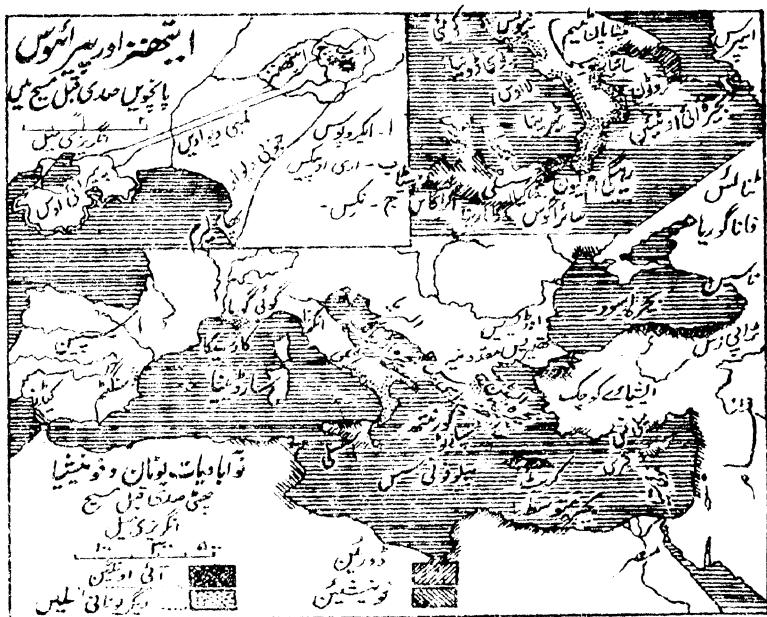
نوآبادیات یونان و فونیشیا چھٹی صدی قبل مسیح میں

ایشیائے کوچک کے مغربی ساحلوں پر آباد تھے۔ بحیرۂ اسے جین کے جزائر میں، سسلی اور جنوبی اٹلی اور بحیرۂ اسود، افریقہ اور بحیرۂ روم کے سواحل پر بھی وہ آباد تھے۔ مگر ان منتشر آبادیوں میں سیاسی اتحاد نہ تھا۔ یونانی بستیوں کا روئے زمین کے ایک وسیع رقبہ پر پھیل جانا یونانی تارکان وطن کی اولوالعزمی کا نتیجہ تھا مگر یونانی نوآبادیوں کی سیاسی حالت زمانۂ حال کی نوآبادیوں سے بالکل مختلف تھی کیونکہ یونانی نوآبادی ابتدا ہی سے آزاد اور خود مختار ہوتی اور آبائی وطن سے سوائے یگانگت اور رسوم کی یکسانی کے کوئی تعلق نہ رہتا۔ یونان کی تاریخ بہت سی منتشر ریاستوں کی تاریخ ہے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا تھا کہ بوجہ ضرورت چند ریاستیں متحد ہو جایا کرتیں مگر باوجود روشن خیال مدبرین کی لگاتار کوششوں کے یونانی ریاستوں میں کبھی قوی اتحاد نہیں ہوا جس کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ خطۂ یونان مقدونیہ کے پنجۂ ستم کا شکار ہوا حالانکہ مقدونیہ والے نیم مہذب تھے۔ یہ ریاستیں جو بحیرۂ اسود سے جبل الطارق تک پھیلی ہوئی تھیں سیاسی تمدنی اور مذہبی حالات میں ایک دوسرے سے غایت درجہ مختلف تھیں مگر بعض امور میں یک جہتی بھی تھی۔

مذہب کا اصل اصول ہر جگہ ایک ہی تھا۔ ہر جگہ مقامی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی مگر بڑے دیوتا جن کا ہومر کی نظموں میں ذکر ہے ان کے معتقدین ہر جگہ موجود تھے۔ ان میں اکثر تو ایسے ہیں جن کا تعلق عناصر یا رموز فطرت سے ہے مثلاً زیس (Zeus) آسمان ہے۔ پوسی ڈن (Poseidon) سمندر ہے۔ اپالو (Apollo) آفتاب ہے۔ ڈی می ٹر (Demeter) زمین اور پرسی فنی (Persephone) بویا ہوا تخم ہے مگر جیسے جیسے یونانیوں کی تخئیل میں ترقی ہوتی گئی دیوتاؤں کے خواص بھی اعلیٰ تر ہوتے گئے اور ان کی طرف اعلیٰ ترین اخلاق و عادات منسوب کئے جانے لگے اس طرح مذہب جہالت کی آلائشوں سے پاک ہوتا گیا۔ یونانی بستیوں میں دیوتاؤں کے بے شمار مندر تھے مگر ان میں بعض کو خاص فوقیت حاصل تھی اور یہ تمام قوم یونانی کی ملک خیال کئے جاتے تھے۔ دو مندر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان میں سے ایک اپالو کا مندر ہے جو ڈیلفی (Delphi) میں واقع تھا یہ دیوتا اپنے معتقدین کے سوالات کا جواب دیا کرتا جو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ اس قسم کے مندروں کو جہاں معتقدین کے سوالات کے جواب دیئے جاتے "اوریکل" (Oraele) کہتے تھے مگر ڈیلفی کے مندر کی وقعت اور شہرت سب سے زیادہ تھی اور اس کے اثر سے ایک اہم مگر ضعیف اتحاد اقوام یونان میں پیدا ہو گیا تھا۔

یہ مندر خلیج کورنتھ کے شمال میں یونان کے بلند ترین سلسلۂ کوہی کے دامن میں واقع تھا اور اس مقام کے بھیانک اور وحشت انگیز نظارہ سے معتقدین کے دلوں میں دیوتا کا ہیبت و جلال پیدا ہوتا۔ یہ عظیم الشان مندر چھوٹی چھوٹی عمارتوں کے وسط میں واقع تھا اور قریب میں کھیل اور ورزش کے لئے ایک میدان تھا۔ تمام یونانیوں کو یہ حق حاصل تھا کہ اس مندر میں آئیں اور اپنی مشکلات حل کرائیں۔ یونان کی تہذیب پر اس کا بہت اثر پڑا ہے کیونکہ بسا اوقات ریاستیں سیاسی معاملات میں مشورہ چاہتیں مثلاً کسی جدید نو آبادی کا قایم کرنا یا دستوری حکومت قائم کرنا۔ اخلاقی امور بھی تصفیہ کے لئے پیش کئے جاتے اور اکثر اوقات مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنے کے لئے درخواست کی جاتی۔ اس قسم کے سوالات کا جواب مبہم الفاظ میں دیا جاتا جس کے مختلف اور متضاد معنی نکل سکتے۔ ایک یونانی سردار پرھس رومیوں سے برسر پیکار تھا۔ اس نے جنگ کا نتیجہ دریافت کیا تو ایسے الفاظ میں جواب دیا گیا جس سے فتح و شکست دونوں کا ترشح تھا۔ ڈیلفی کے پوجاریوں کے حرکات و افعال اب تک سراپا راز ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی ذات سے مذہب اور اخلاق و عادات کا معیار نہایت اعلیٰ رہا۔ اپالو جس کی ڈیلفی میں پرستش ہوتی تھی روشنی صحت اور علم کا دیوتا مانا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک مندر پی لو پونیس کے مغرب میں دریائے ال فیس کے کنارے اُلم پیا میں واقع تھا جس میں بہت سی عمارتیں ایسی تھیں

جن کو یونانکے فن تعمیر کے بہترین نمونے کہہ سکتے ہیں۔ اس مقام کے قریب زیس اُلم پیس دیوتا کی یادگار میں ایک تہوار منایا جاتا جس میں مختلف کھیل اور کرتب ہوتے جو اصطلاحاً اُلم پیا کے کھیل کہے جاتے۔ ان کھیلوں کی ابتدا قیاساً ۷۷۶ قبل مسیح ہوتی ہے۔ پہلے پہلے صرف ۲۰۰ گز کی دوڑ ہوا کرتی۔ اور جو شخص اس میں سبقت لے جاتا اس کو فاتح الجمید کہتے، گر رفتہ رفتہ دوسرے کھیلوں کا بھی رواج ہوتا گیا مثلاً گھونسہ بازی، کشتی، کود پھاند، تیراندازی، رتھوں کی دوڑ، مگر اس میں اخراجات کی وجہ سے صرف امرا شریک ہوسکتے تھے۔ گھونسہ بازی اور کشتی ایسے کھیل تھے جن سے وحشت کی بو آتی ہے مگر دوسرے کھیل ایسے تھے جن میں جان کا خطرہ بالکل نہ تھا اور اس سے یونانیوں کی امن پسندی کا ثبوت ہوتا ہے۔ ان کھیلوں میں صرف یونانی شریک ہوسکتے تھے جس سے یونانیوں میں ایک قسم کا اتحاد تھا اور یہی ان کی قومیت کی نشانی تھی۔ جن ایام میں یہ کھیل ہوتے ان میں آپس کی خانہ جنگیاں بھی بند ہو جاتیں اور تمام ریاستوں کے باشندے اس میں امن وامان کے ساتھ شرکت کرتے۔

تمام یونانیوں کے سیاسی خیالات میں باوجود اختلافات کے ایک حد تک یگانگت کا بھی عنصر موجود تھا۔ کسی ریاست میں شاہی حکومت تھی کہیں امرا کا زور تھا، اور کہیں جمہوریت غالب تھی۔ مگر یونان کی تمام ریاستیں "شہری ریاستیں" تھیں یعنی ان کی حدود ارضی کسی نہ کسی شہر کے رقبہ کے اندر رہتیں۔ اس امر کو خوب ذہن نشین کرلینا چاہیے کیونکہ زمانہ حال میں صفحۂ ہستی پر کسی ملک میں اس قسم کی ریاستیں موجود نہیں۔ ہر ایک یونانی شہر یا تو ایک علیحدہ خود مختار ریاست تھا یا کم ازکم اس کے باشندوں کا یہ مطمح نظر تھا کہ انکا شہر ایک علیحدہ خود مختار ریاست ہو جائے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا کہ چند شہر برضا و رغبت متحد ہو جاتے یا کوئی طاقتور شہری ریاست اپنے ہمسایہ شہروں کو اپنے زیر اثر کر لیتی۔ مگر اس قسم کے اتحاد باوجود مفید ہونے کے یونانیوں کے احساسات کے خلاف تھے اس لئے انکی ہستی چند روزہ ہوتی

تھی۔ بعض شہروں کی آبادی کثیر اور رقبہ وسیع ہوتا گو بعض شہر ایسے تھے جو زمانۂ حال کے لحاظ سے محض قریئے یا دیہات کہے جا سکتے ہیں مگر ان کو بھی کامل آزادی حاصل تھی۔ یہ آزادی چھوٹی ریاستوں کے لئے وبال جان تھی۔ کیونکہ ان کی حکومت اور فوج علیحدہ ہوتی اور اکثر اوقات سکہ بھی علیحدہ ہوتا۔ یگانگی کا دوسرا عنصر باوجود اختلافات کے مجالس عامہ کا وجود تھا جو تمام ریاستوں میں تھیں۔ نیابت جس پر یورپ کی مجالس سیاسی کا دارومدار ہے اس کا وجود نہیں پایا جاتا مگر تمام ریاستوں میں یہ رواج تھا کہ اہم سیاسی امور پر بحث کرنے اور ان کو طے کرنے کے لئے شہر کے تمام باشندے جمع ہوتے۔ یونانی ریاستوں کے دستور سلطنت کے مطالعہ میں خصوصاً یہ پیش نظر رہے کہ مختلف ریاستوں میں اس مجلس عامہ کا کس قدر اقتدار تھا۔

تمدن یونان کی ترقی میں ان تمام ریاستوں کا حصہ تھا جو ایشیائے کوچک بحیرۂ ایجین اطالیہ اور صقلیہ میں پھیلی ہوئی تھیں مگر فی الحال ہمیں صرف ان ریاستوں سے سروکار ہے جو جزیرہ نمائے بلقان کے جنوبی حصہ میں واقع ہیں جسے اب یونان کہتے ہیں۔ جغرافیائی حالات کا اثر ہر قوم کے تمدن اور طرز زندگی پر پڑتا ہے اور یہی حال یونان کا بھی ہے تھسلی کے شمال تک تمام ملک یونان کہا جاتا تھا اور کوہ المپس اور سلسلۂ کوہی جسے کام بونی کہتے ہیں اس کی شمالی سرحد پر واقع تھے۔ مگر تمدن یونان کا مرکز اس حصے میں واقع تھا جو درۂ تھرموپائی لی کے جنوب میں ہے۔ اس حصہ کی جغرافیائی خصوصیات دو ہیں ایک تو سمندر کا قرب اور دوسرے پہاڑوں کا ہر جگہ پیش نظر ہونا۔ وسیع میدانوں کا وجود بالکل نہیں اور ہر جگہ اونچے اونچے پہاڑ نظر آتے ہیں جن کی بلندی نو ہزار فٹ تک ہے۔ ان پہاڑوں کی وجہ سے تجارت اور آمدورفت میں بہت دقت ہوتی ہے اور اسی سبب سے ملک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے ہیں جن میں ذرائع آمدورفت نہ ہونے کی وجہ سے سیکڑوں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں پیدا ہو گئیں جن کا اس سے قبل ذکر آیا ہے۔ سلسلۂ کوہی کے سبب سے آمدورفت میں دقت تھی مگر سمندر کے قریب سے اس کا نعم البدل ہو جاتا اور آمدورفت کا بھی بڑا

ذریعہ تھا۔ چھوٹے جہازوں کے لئے بے شمار چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں خصوصاً مشرقی سواحل پر تھیں جو ایشیا کے مقابل تھے۔ یونان کے اسی سبب سے ایشیا سے زیادہ تعلقات رہے ہیں اٹلی سے آمد و رفت اس سے زیادہ دشوار تھی۔ اس کے علاوہ بحیرۂ ایجین میں بے شمار چھوٹے چھوٹے جزائر ہیں جن کو طے کرتے ہوئے یونانی ملاح آسانی سے ایشیا پہنچ جاتے کیونکہ زمین کبھی ان کی نظروں سے غائب نہ ہوتی۔

اس سے ظاہر ہے کہ یونان کے باشندوں میں پہاڑوں کے سبب سے مفارقت پیدا ہوئی مگر سمندر ان کے لئے ذریعۂ اتحاد تھا اور ان دونوں سے ملک کی حفاظت ہوئی کیونکہ اگر یہ قدرتی حفاظت نہ ہوتی تو یونان کسی نہ کسی مشرقی سلطنت کا جزو بن گیا ہوتا۔

قوم یونان میں چند مختلف عناصر موجود تھے جن میں سے دو قابل ذکر ہیں یعنی ڈورین اور آئونین ہومر کی نظموں میں اول الذکر کا پتہ نہیں چلتا۔ دونوں اقوام کے عادات و خصائل میں بہت اختلاف تھا۔ ڈورین لوگوں نے جنوبی یونان پر ہومر کے زمانہ کے بعد حملہ کیا اور ان کی فتوحات سے یونان میں بہت سے انقلاب پیدا ہو گئے۔ ڈورین اقوام آئونین لوگوں سے شجاعت توانائی اور جنگجوئی میں فوقیت رکھتی تھیں مگر تمدن میں ان سے گری ہوئی تھیں۔ ڈورین ریاستوں میں اہم ترین اسپارٹا تھا اور اس کے بعد کورنتھ اور آرگوس۔ آئونین اقوام کا جولانگاہ ایشیائے کوچک اور جزائر ایجین میں تھا۔ خاص یونان میں ان کی صرف ایک بڑی ریاست تھی یعنی ایتھنز اور اہالیان ایتھنز اپنے آپ کو اقوام آئونین کا ہادی اور رہبر خیال کرتے تھے۔ یہ قوم ڈورین لوگوں سے زیادہ مہذب تھی تجارت خاص مشغلہ تھا مگر جنگجوئی میں ان کی مد مقابل نہ تھی۔ اسی تمدنی فوقیت کا نتیجہ تھا کہ سرزمین یونان اسی قوم یعنی آئونین کے نام سے مشرقی ممالک میں مشہور ہوئی سنسکرت میں "یادن" کا لفظ اس قوم کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور عرب "یونان" کہتے تھے جو اسی لفظ "آئونین" سے مشتق ہیں۔

جن چار ریاستوں کا ذکر اوپر آیا ہے ان کے تاریخی اور تمدنی حالات نہایت اہم ہیں کیونکہ تاریخ یونان کا انحصار انھیں پر ہے خصوصاً ایتھنز اور اسپارٹا پر۔ اسپارٹا ایک تیز بہنے والی پہاڑی ندی کے کنارے واقع ہے جو گرمی میں بھی خشک نہیں ہوتی۔ جنوب کے علاوہ اس کے ہر طرف سلسلہ ہائے کوہ واقع تھے اور جنوب میں میدان بھی یوروٹاس ندی ایک تنگ درے میں سے بہتی ہوئی نکل گئی تھی جس کی آسانی سے دشمن کے مقابلے میں حفاظت کر سکتے تھے۔ اسپارٹا کے ڈورین باشندے اس وادی کے اصلی باشندے نہیں تھے۔ ان لوگوں نے ابتدائی زمانہ میں اس ملک پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا مگر مفتوح اقوام کے افراد ان کے درمیان موجود تھے اور ان کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ اسپارٹا کی تاریخ میں یہ امر قابل لحاظ ہے کیونکہ اسپارٹا کے رسم و رواج میں یہ مصلحت مضمر تھی کہ کسی نہ کسی طرح قومیت قائم رکھی جائے اور اس سبب سے اسپارٹن لوگوں کی تعلیم و تربیت کا مقصد اور غایت یہ تھی کہ ان کے افراد میں شجاعت اور توانائی پیدا ہو اور جنگ میں گھبرانے یا دشمن کو پیٹھ دکھانے کو ننگ و عار خیال کریں۔ مردوں کو وسط زندگی تک عیالداری سے کوئی تعلق نہ رہتا۔ نوجوانوں کی تعلیم کے لئے بڑے بڑے مدارس تھے جہاں بچے ہوش سنبھالتے ہی بھیج دیئے جاتے۔ واضح رہے کہ یہ مدرسے صرف تربیت کے لئے تھے نہ کہ تعلیم کے لئے ان مدرسوں کی تربیت کا خاص مقصد یہ تھا کہ لڑکے چاق چوبند مضبوط اور توانا ہوں، ان کو مختلف قسم کی ورزشیں اور کرتب سکھائے جاتے۔ کھانا نہایت سادہ ہوتا۔ اس تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ قوم کے افراد ہر قسم کی صعوبت برداشت کر لیتے اور سخت سی سخت جسمانی تکلیف سے بھی ان کی جبین پر شکن نہ آتی تھی۔ قوم پرستی کا اعلیٰ ترین خصائل میں شمار تھا۔ دماغی تعلیم کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ نوجوانوں کا وقت زیادہ تر فوجی قواعد شکار اور مصنوعی جنگ میں صرف ہوتا تھا جو بعض اوقات مہلک بھی ہو جاتی علم ادب یا فنون لطیفہ کا مذاق بہت کم تھا مگر ان کو اپنے تمدن پر ناز تھا اور اہالیان ایتھنز

کو حقارت سے دیکھتے اور کہتے کہ یہ زنانے ہیں ان پر لفظ "مرد" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس قوم کا دستور سیاسی قریب قریب وہی تھا جس کا پتہ ہومر کی نظموں میں چلتا ہے کیونکہ یہاں بادشاہ بھی تھے اور مجالس امراء اور عوام بھی موجود تھیں مگر اختلافات پیدا ہو چلے تھے کیونکہ بجائے ایک بادشاہ کے اسپارٹا میں دو بادشاہ تھے اور ان کی رقابت سے قوت شاہی میں ضعف آچلا تھا۔ مگر اصل طاقت پانچ عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھی جن کو اے فور کہتے تھے۔ ان عہدہ داروں کا انتخاب جملہ شہری ایک سال کے لئے کرتے اور ان کو اندرونی اور خارجی پالیسی پر پورا اختیار دیدیا جاتا۔ ہومر کے زمانہ میں اس قسم کے عہدہ داروں کا وجود نہ تھا۔ زمانۂ حال میں اسپارٹا کے حالات میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی مگر یونانی اس ریاست کو حد درجہ وقعت کی نگاہ سے دیکھتے کیونکہ اس قوم میں وہ خصوصیات تھیں جو عموماً یونانیوں میں مفقود تھیں مثلاً ضبط قومی مستقل مزاجی اور امن و امان قایم رکھنے کی اہلیت۔ دوسری یونانی ریاستوں میں انقلابات ہوتے رہتے مگر اسپارٹا میں پشت ہا پشت تک ایک ہی پالیسی قائم رہتی۔ ایران کے ساتھ جو جنگیں ہوئیں اس کے قبل کی اسپارٹا کی تاریخ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں مگر اس کے قبل بھی اسپارٹا کئی جنگوں میں شریک تھا اور فتح کا سہرا ہمیشہ اسی کے سر رہا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حکومت کا رقبہ دوسری یونانی ریاستوں سے زیادہ وسیع ہو۔ اس نے مےسی نیا کے زرخیز خطہ پر قبضہ کر لیا تھا اور آرگوس سے بھی کچھ ملک اس نے چھین لیا تھا اور ان مقبوضات پر سختی کے ساتھ حکمراں تھے۔ اہل اسپارٹا نے مفتوح قوموں کو آزادی دینا اور اپنا ہمسر بنانا کبھی پسند نہ کیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ وہ فتح کر سکتے تھے مگر تدبیر مملکت کی خاص رمز یعنی مفتوح اقوام کی تالیف قلوب کا راز ان سے ہمیشہ نہاں رہا۔

اسپارٹا کی قوت کا مرکز خاکنائے کورنتھ کے جنوب میں تھا اور اہل اسپارٹا اس کے شمال میں بلا وجہ فوج کشی کرنا قرین مصلحت خیال نہ کرتے۔

خاکنائے مذکورہ کے شمال میں ممتاز ترین سلطنت ایتھنز تھی۔ اسپارٹا کی طرح ایتھنز قدرتاً محصور و مامون نہ تھا کیونکہ جس صوبۂ اٹی کا میں یہ شہر واقع تھا وہ کوہستانی تو ضرور تھا مگر یہ سبب پستی کے کسی پہاڑ سے ریاست کی حفاظت نہ تھی اور جنوب و مشرق دونوں جانبوں سے سمندر سے حملہ ہو سکتا۔ ایتھنز کا شمار ابتدا ہی سے بحری ریاستوں میں تھا اور سمندر ہی پر اس کا دار و مدار تھا۔ اس شہر کی ابتدا ایک کوہی قلعہ ایک روپولیس سے ہوئی جو سمندر سے قریب چار میل پر واقع ہے۔ اس قلعہ کے زیر سایہ آبادی کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ ایتھنز کی مذہبی اور تمدنی ہستی کا مرکز بن گیا۔ یہ خطۂ ملک یونانیوں کے خیال کے مطابق زرخیز تھا اور پائریس کا بندرگاہ تمام یونان میں بہترین خیال کیا جاتا تھا۔ شہر میں ایتھنا دیوی اور پوسی ڈن (سمندر کا دیوتا) کی خاص طور پر پرستش ہوتی تھی۔

ایتھنز کے باشندے بمقابلہ اسپارٹا ایک ہی نسل سے تھے۔ کیونکہ ان کے درمیان کوئی محکوم قوم آباد نہ تھی جس سے تشویش رہتی۔ غلاموں کی تعداد کثیر تھی مگر ان کے وجود سے کسی قسم کی زحمت نہ تھی اور اس وجہ سے ایتھنز میں اسپارٹا کی طرح ہر وقت فوجی تیاری کی ضرورت نہ تھی اور اس کے تمدن پر فوجی عنصر غالب نہ تھا۔ ایتھنز کی ابتدائی تاریخ کا افسانوں سے الگ کرنا اور اصلی واقعات کی تہ تک پہنچنا نہایت دشوار ہے مگر ان افسانوں سے ظاہر ہے کہ ابتدائے اٹی کا میں مختلف قومیں آباد تھیں اور ان سبھوں کے ایک جگہ آباد ہونے اور خلط ملط ہونے سے شہر ایتھنز وجود میں آیا۔ غالباً ابتدائی زمانہ میں ایتھنز میں بادشاہوں کی حکومت تھی۔ مجلس امرا بھی تھی جو مجلس ایریوپیگس کے نام سے موسوم تھی اور ایتھنز کی ایک نے سیاوہی مجلس ہے جسے ہومر کے زمانہ میں مجلس عوام کہتے تھے۔ مگر دور تاریخی کے آغاز سے قبل ہی اس نظام سلطنت میں تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ امراء کی دستبرد سے حکومت شاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ سنہ ۶۵۰ ق م کے قریب ایتھنز کے تاریخی حالات صاف صاف معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت امراء کا تسلط تھا۔ مگر امرا کی حکومت سے یہ لوگ

خوش نہ تھے اور کئی مرتبہ کوشش کی گئی کہ ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے یا کم از کم ان کے اختیارات محدود کر دئے جائیں۔ حکیم سولن کا نام جب صفحۂ تاریخ پر آتا ہے اس وقت بھی امراء برسر حکومت تھے اور عوام سے پرخاش چلی جاتی تھی۔ علیم ادکوری نظموں سے ان مشکلات کا پتہ چلتا ہے جو اس کے سامنے تھیں اور کس طرح اس نے ان کے رفع کرنے کی کوشش کی۔ یہ مشکلات دو قسم کی تھیں ایک تو سیاسی یعنی حکومت امراء سے عوام کی ناراضی اور دوسرے تمدنی کیونکہ ایٹی کا کے زراعت پیشہ لوگوں کی حالت نہایت ہی سقیم تھی۔ ان میں سے اکثر لوگوں نے ایتھنز کے امراء سے قرض لیا تھا اور بہ سبب عدم ادائی ان کے حلقہ بگوش ہو کر غلامی میں بک گئے تھے۔ حکیم سولن کے حالات میں افسانے کی بو پائی جاتی ہے مگر اس کے تدبر اور بےنفسی میں شک نہیں۔ اس نے ایتھنز کے ان باشندوں کو جو غلام ہو گئے تھے آزاد کرا دیا اور احرار کو غلام بنانا قانوناً ممنوع کرا دیا۔ دستور سلطنت کی بھی اس نے اصلاح کی جس سے گو دستور قدیم برائے نام جاری رہا مگر امراء کی ہمہ گیری کا خاتمہ ہو گیا اور عوام کا عنصر بہت بڑھ گیا۔ جو دستور اس کی کوشش سے قائم ہوا اس کو جمہوریت تو نہیں کہہ سکتے مگر جمہوریت کے عناصر نظام سلطنت میں داخل ہو گئے اور دیگر عناصر کے داخل ہونے کا راستہ کھل گیا۔ سولن صد درجہ کی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسی کو دستور ایتھنز کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد اور بھی تغیر ہوئے اور یونان کی اکثر سلطنتوں میں سیاسی ترقی کی رفتار یکساں تھی۔ تمام سلطنتوں میں اولاً شاہی حکومت تھی، اس کے بعد امراء کا دور دورہ ہوا۔ امراء کی حکومت جب ناقابل برداشت ہو جاتی تھی تو رعایا میں سے کوئی شخص ان کو زیر و زبر کر دیتا تھا جسکو یونانی اصطلاح میں ٹائرنٹ کہتے ہیں۔ ٹائرنٹ کا بھی مرور زمانہ کے بعد خاتمہ ہو جاتا تھا اور ان کی جگہ جمہوریت یا عمومیت قائم ہوتی تھی یہی حالت دنیا کے دوسرے حصوں اور قریب تر زمانے میں بھی ہوتی ہے۔

سولن کو بھی یہ خدشہ ہوا تھا کہ خدانخواستہ ایتھنز بھی کسی ٹائرنٹ کے زیر حکومت نہ آجائے اور اپنی دستوری اصطلاحات سے ایتھنز کو اس خطرہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی مگر پھر بھی ایتھنز کی یہی حالت ہوئی شہر میں مختلف جتھے قائم ہو گئے جو میدانی، ساحلی اور کوہی کے ناموں سے موسوم تھے مگر غالباً اس سے زمینداروں، تجار اور کاشتکاروں سے مراد تھی پسس ٹریٹس فرقۂ کوہی کا سرغنہ تھا۔ اس کی ذاتی حفاظت کے لئے ایک گارد مقرر کیا گیا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ اس کی طاقت مستحکم ہو گئی ہے اس نے قلعے پر قابض ہو کر تمام ایتھنز کو اپنے قبضۂ قدرت میں کر لیا۔ اہل ایتھنز کو اس کے نام سے نفرت ہو گئی اور اس کے بیٹے قاتلوں کو اپنے محسنوں میں شمار کرتے تھے۔ مگر جب تک پسس ٹریٹس زندہ رہا اس کی شخصی حکومت سے ایتھنز کو نہ صرف بہت کم نقصان پہنچا بلکہ اس نے بہت احسان بھی کیا ہے۔ سولن نے جو دستور قائم کیا تھا اس میں کوئی ظاہری تغیر نہیں کیا گیا مگر تمام اختیارات اجیر سپاہیوں کی اس فوج کے ہاتھ میں تھے جس کا قبضہ قلعے پر تھا۔ شہر میں امن قائم تھا اور تمدن کے مختلف شعبوں میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ صنعت و حرفت زراعت و تجارت کو فروغ دینے میں کوشش کی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں ایتھنز تمام یونان کے شہروں سے ادب و فنون لطیفہ میں سبقت لے گیا۔ غیر ملکی صناع ایتھنز میں بلائے گئے جن کی صناعی کے نمونے زمانۂ حال کے احفارات میں ملے ہیں۔ مقدس پہاڑ کے قریب اور اس کے اوپر مندر بنائے گئے۔ اس ٹائرنٹ نے ہومر کی نظموں کو جمع کرنے کی سب سے پہلے کوشش کی۔ اگر تمام ٹائرنٹ اس شخص کی طرح منصف مزاج ہوتے تو یہ نام کبھی بدنام نہ ہوتا۔ مگر اہل ایتھنز پورے طور پر خود مختار رہنا چاہتے تھے۔ اس کے خلاف بھی بغاوت ہوئی مگر اس میں ناکامی ہوئی۔ اس کے بیٹے کے زمانہ میں پھر بغاوت ہوئی مگر وہ بھی ناکام رہی۔ اس کے بعد ایتھنز کے چند امیروں نے ڈیلفی اور اسپارٹا سے ساز باز کرکے اس ٹائرنٹ کے خاندان کو ایتھنز سے نکال باہر کیا۔ اس طرح ایتھنز میں پھر جمہوریت قائم ہو گئی

اور ہپس ٹریٹیس کے بیٹے ہی پیاس نے شاہ ایران کے ظل عاطفت میں جا کر پناہ لی اور جب ایرانیوں نے ۴۹۰ ق.م میں ایران پر حملہ کیا تو اس فوج کے ساتھ بطور راہ نما کے آیا۔

آزاد حکومت کے قیام کے بعد ایتھنز نے سولن کے قائم کردہ دستور کی پابندی گوارا نہ کی۔ ایک زمانہ تک معاملات میں ابتری رہی مگر اسکے بعد جمہوریت کی طرف اور ترقی ہوئی جو اصلاحات ہوئیں وہ کلیس تھی نیس کے نام سے وابستہ ہیں۔ اہم ترین تغیر یہ تھا کہ حریت کی بنا وسیع تر کر دی گئی۔ اس وقت تک احرار میں شمار صرف ان لوگوں کا تھا جن کا ایٹی کا کی چار قوموں میں سے کسی سے تعلق تھا اور اس جماعت میں شریک ہونا نہایت ہی دشوار تھا۔ ایتھنز کی آبادی میں ایک تعداد کثیر ایسے لوگوں کی تھی جو تجارت وغیرہ کی غرض سے آکر آباد ہو گئے تھے اور احرار کی جماعت میں ان کا شریک کیا جانا قرین مصلحت تھا۔ کلیس تھی نیس نے یہ تصفیہ کیا کہ قدیم اقوام سے تعلق جماعت احرار میں شرکت کے لئے لازمی نہ ہو۔ جدید اور فرضی اقوام قائم کی گئیں اور اس طرح سے ایتھنز میں جماعت احرار کی تعداد میں کثیر اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ اور بھی اصلاحات عمل میں آئیں مگر ان کا تذکرہ بعد میں ہوگا۔

یونان کی شہری ریاستوں میں سے اہم ترین اسپارٹا اور ایتھنز تھے مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ یونان کی تاریخ انھیں دو ریاستوں کی تاریخ ہے۔ ان کے بعد کورنتھ کا درجہ ہے۔ تجارتی اغراض کے لئے یونان میں کوئی شہر اس سے بہتر موقع پر واقع نہیں تھا۔ کورنتھ اس تنگ خاکنائے پر واقع ہے جو وسطی یونان اور پیلوپونیس کے درمیان واقع ہے۔ متعدد بندرگاہیں بھی تھیں نہ صرف شرقی کنارے پر بلکہ خلیج کورنتھ پر بھی اسی طرح یونان کے شہروں میں کوئی شہر ایشیائے کوچک، سسلی، اٹلی اور بحیرۂ روم کے مغربی ممالک سے بھی تجارت کے لئے اس سے بہتر موقع پر نہ تھا۔ زمانۂ قدیم میں اس شہر کو دوسرے شہروں پر سیاسی فوقیت حاصل نہ تھی مگر تجارتی شہروں میں اہم ترین تھا۔ ازمنۂ قدیم میں تجارت کا اثر ریاستوں کی باہمی

تعلقات اور ان کے مستقبل پر اس قدر بدیہی نہیں ہے جتنا کہ زمانہ حال میں ہے مگر تجارتی شہروں کی دولت اور اولولعزمیوں کا اثر یونان کی تاریخ پر بہت کچھ ہے ابتداہی سے کورنتھ دولت عیش وعشرت اور غلاموں کی کثرت کے لئے مشہور تھا۔ سیاسی تاریخ میں کورنتھ میں بھی وہی تغیرات ہوئے تھے جو دوسری ریاستوں میں ہوئے تھے۔ ابتداءً شاہی حکومت تھی مگر اس کے خاتمہ پر امراء کی حکومت رہی جس کے بعد ٹائرنٹس کا ۶۵۵ء سے ۵۸۲ء ق م تک دور دورہ تھا۔ مگر ان کے ہٹنے کے بعد جمہوریت نہ قائم ہوئی بلکہ چند افراد کے ہاتھ میں حکومت آگئی۔ کورنتھ اور ایتھنز کے درمیان عرصہ تک رقابت کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ ان ریاستوں کے سیاسی اصول میں اختلاف تھا اور تجارتی رقابت مزید برآں تھی۔

کورنتھ کے جنوب وشرق میں آرگوس کی ریاست اور شہر واقع تھا۔ جس میدان میں یہ شہر واقع تھا اس میں زمانہ قبل از تاریخ کے آثار موجود تھے۔ باشندگان آرگوس نسلاً ڈورین تھے اور ایک زمانہ میں اسپارٹا کے ہمسر تھے مگر اہل اسپارٹا نے ان کو شکست دے کر ان کے ملک کا ایک ٹکڑا چھین لیا جس کی وجہ سے ان دونوں ریاستوں میں دوامی دشمنی پیدا ہوگئی۔ دوسری یونانی ریاستوں کے تعلقات کبھی کشیدہ اور کبھی خوشگوار ہوجاتے تھے مگر ان دونوں ریاستوں میں ہمیشہ دشمنی ہی رہی۔

بخوف طوالت دوسری ریاستوں کے صرف نام گنائے جاسکتے ہیں۔ خشکی پر علاوہ ریاست ہائے مذکورہ بالا کے شمال میں تھیبس واقع تھا جو ضلع بوائے شیا کی ریاستوں میں ممتاز تھا۔ اس ریاست کے باشندے ایک زمانے میں بدتہذیب اور بے حس خیال کئے جاتے تھے مگر ایک زمانے کے بعد اسی ریاست نے جنگجوئی اور تدبر میں اپنی افضلیت ثابت کر دکھائی۔ خاکنائے کورنتھ پر شہر میگارا واقع تھا جو اب ایک ذرا سا قصبہ ہے مگر ایک زمانہ میں تجارت میں ایتھنز اور کورنتھ کا ہمسر تھا اور اس کے باشندوں نے بہت سی مشہور نوآبادیاں قائم کیں جن میں سے ایک بائی زین ٹیم

(قسطنطنیہ) ہے جو اب بھی ایک یورپین سلطنت کا دارالخلافہ ہے۔ پیلوپونیس کے مغرب میں شہر اے لس واقع تھا جس کے سپرد اولمپیا کے کھیلوں کا انتظام تھا مگر اس میں سیاسی یا فوجی اہمیت نہ تھی۔ مشرق کے شہروں کے کارنامے بھی قابل فروگذاشت نہیں ہیں۔ جزائر ناکسوس کیوس اور ساموس کے باشندے ذی ثروت اور ترقی یافتہ تھے۔ جزیرۂ لیس بوس ایک ادبی تحریک کا مرکز تھا جس میں مشہور شاعرہ سیافو نے نام ونمود حاصل کیا۔ ایشیا کے ساحل پر بلدہ ہائے می لےٹس، اے فی سس اور ہالی کارناسس واقع تھے جو بلحاظ آبادی یا دولت ممتاز تھے یا ممتاز لوگوں کے زاد بوم ہونے کا انھیں فخر تھا یا وہاں سے اہم تحریکوں کی ابتدا ہوئی۔

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان میں ایک جری اور ترقی کن قوم کی آبادی تھی جو دائرہ سیاسی میں مختلف طرز ہائے حکومت کی یکے بعد دیگرے آزمائش کر کے آزادی اور حریت کی طرف قدم بڑھا رہی تھی، جس سے یورپ کی ترقی پر معتدبہ اثر پڑا ہے۔ فنون لطیفہ اور فلسفہ میں بھی ان لوگوں کو دخل تھا اور وہ ان مسائل اور مشکلات کو حل کرنے میں مصروف تھے جن پر تمدن یورپ کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ یونان کا چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہونا سیاست فنون لطیفہ اور فلسفہ میں جدید خیالات کے نشوونما کے لئے از حد مفید ہوا کیونکہ اس سے آپس میں قابل تحسین رقابت پیدا ہوئی، کمالات کے مقابلہ کرنے کا موقع ملتا تھا اور جدید عقائد کو دبانا دشوار تھا۔ مگر اس آپس کے تفرقہ سے ایک سخت خطرہ کا سامنا ہوا جب کہ ایک ایسی وحشی طاقت نے حملہ کیا جو متحد اور طاقتور تھی۔ یہ حملہ پانچویں صدی ق م کے اوائل میں ہوا۔

باب سوم

جنگ ایران اور اسکے نتائج

بعض مورخین کا قول ہے کہ تاریخ یورپ مشرق و مغرب کے مجادلہ کی تاریخ ہے مگر یہ قول صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تمدن یورپ کے سب سے خطرناک دشمن مشرق سے وارد ہوئے گو انھوں نے یورپ پر کبھی جنوب سے حملہ کیا کبھی مغرب سے اور کبھی شمال سے۔ تمدن یورپ کے عناصر ثلاثہ تخیل و فنون لطیفہ یونان، قانون و نظام رومی اور مسیحیت کی دینی و اخلاقی تعلیم ہیں جس میں بعد میں ان علوم طبعی کا اضافہ ہوا جو یونانی تخیل سے پیدا ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ سرزمین یورپ کے دشمن ان ملکوں سے آئے جو دریائے دجلہ و فرات کے کنارے واقع ہیں اور شام و عرب سے یہ دشمن نہایت خطرناک اس لئے تھے کہ یہ جاہل اور وحشی نہ تھے بلکہ اپنے ساتھ مذہب و اخلاق بھی لائے جو یورپ کے مذہب و اخلاق سے بہتر ہونے کے دعویدار تھے اور بعد میں تو علوم طبعی بھی اپنے ساتھ لائے۔ مجادلہ مشرق و مغرب کے تین دور ہیں۔ پہلا دور یونان و ایران کی رقابت سے شروع ہوتا ہے یعنی سائرس شاہ ایران کی فتوحات سے اس کی ابتدا ہے (۵۹۹ ق م) اور سکندر اعظم کی فتوحات (۳۲۱ ق م) پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دوسرا دور مسلمانوں اور عرب نسلوں کے ابتدائی محاربات سے شروع ہوتا ہے اور سنہ مسیح کی آٹھویں صدی میں ختم ہوتا ہے جب کہ مسلمانوں کو

قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) اور ٹورس (۷۳۲ء) میں شکست ہوئی۔ تیسرے دور میں محاربات صلیبی ہیں جن میں اہل یورپ اور ترکوں کا مقابلہ رہا۔ اس وقت ہم کو محاربۂ مشرق و مغرب کے پہلے دور سے سروکار ہے جو سب سے زیادہ خطرناک تھا کیونکہ اس زمانے میں یورپ کی تہذیب ایک تنگ گوشہ میں محدود تھی اور بصورت ناکامی اس کا فنا ہونا ناممکن نہ تھا۔

اس وقت جب کہ سرزمین یونان ننھی ننھی ریاستوں میں منقسم تھی جنکی سخت باہمی رقابت کے سبب سے ان کا تمدن و تہذیب معرض خطر میں تھا، دریائے فرات کی وادی میں عظیم الشان سلطنتیں قایم ہو رہی تھیں تین صدیوں تک ایشیا کی سیادت کا سہرا اسیریا کے سر تھا مگر کسی سبب سے جس کا ہمیں علم نہیں اس کی قوت میں زوال پیدا ہوا اور شمالی وحشی قوموں کے حملوں سے جانبر نہ ہو سکی۔ کئی ریاستیں اس کے آثار پر قایم ہوئیں جن میں سے لیڈیا واقع ایشیائے کوچک، میڈیا، بابل اور مصر کی ریاستیں سب سے بڑی تھیں۔ مگر ۵۵۹ ق۔م کے قریب سلطنت میڈیا کو ایران کے پہاڑیوں نے زیروزبر کر دیا۔ اس ایرانی گروہ کے بادشاہ کا نام یونانیوں میں سائرس مشہور تھا اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ سلطنت اسیریا کے تمام مقبوضات اس کے قبضۂ قدرت میں آجائیں۔ لیڈیا پر اس نے ۵۴۶ ق۔م میں قبضہ کر لیا اور ایشیائے کوچک بھی اس کی دستبرد سے بچ نہ سکا۔ لیڈیا کے قبضہ کے بعد ایشیائے کوچک میں جو یونانی بستیاں تھیں وہ ایرانیونکے مقابلہ کی تاب نہ لا سکیں اور سلطنت ایران میں شامل کر لی گئیں۔

سائرس کا ۵۲۹ ق۔م میں انتقال ہو گیا مگر اس واقعہ سے ایرانی فتوحات کا خاتمہ نہ ہوا۔ بابل ان کے قبضہ میں آچکا تھا اس کے بعد مصر کی باری آئی اور ہندوستان میں بھی ایران کے فتح و ظفر کے علم پہنچ گئے۔ ۵۲۱ ق۔م میں دارا شاہ ایران نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ سرزمین عالم میں اس وقت کوئی بادشاہ اس کا ہمسر نہ تھا۔ لیکن باوجود اس کے شکوہ بے پایاں کے ایشیائے کوچک کے باشندے غیر ملکی حکومت سے

نالاں تھے اور آخر میں انھوں نے بغاوت کی جو بے سود ثابت ہوئی۔ باہمی رقابت اتحاد کے منافی تھی اور ان کے مزاج میں حریت پسندی حد اعتدال سے بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ کسی قسم کی روک تھام پسند نہ کرتے تھے۔ آخر کار وہ ریاست ہائے یونان سے امداد کے طلب گار ہوئے ایتھنز اور اٹ ووریا سے کچھ لوگ ان کی مدد کے لئے آئے۔ ان لوگوں نے ایرانی شہر سارڈس کو جلا ڈالا مگر اس کے بعد وہ اپنے گھروں کو واپس گئے اور ایشیائے کوچک کے یونانی اپنی قسمت کو روتے رہے ۴۹۶ سنہ ق م میں ایرانیوں نے انکے بیڑے کو جلا دیا اور شہر ملیٹس کی فتح کے بعد اس بغاوت کا قلع قمع ہو گیا۔

مسلسل فتوحات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فاتح کو ایک ملک فتح کر لینے کے بعد دوسرے ملک پر دست درازی کی ترغیب و تحریص ہوتی ہے۔ ایشیائے کوچک کے بعد خاص خطہ یونان ایرانیوں کے پیش نظر تھا اور یونان کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا ہوتا اگر اہل ایتھنز نے سارڈس پر حملہ کر کے اسے جلا نہ دیا بھی ہوتا۔ یورپ پر دارا کے پہلے حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ممالک تھریس وغیرہ نے ایران کی حلقہ بگوشی قبول کر لی اور ایران کی سرحد یونان کی سرحد تک پہنچ گئی (۵۱۲ سنہ ق م) ایشیائے کوچک کے یونانیوں کی بغاوت فرو کر لینے کے بعد دارا جنوبی یونان کی ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا خصوصاً ایتھنز اور اٹ ووریا کی طرف جنھوں نے سارڈس کو جلا دیا تھا۔ ۴۹۲ سنہ میں دارا نے ایک فوج بحیرۂ ایجین کے شمالی ساحلوں کی طرف بھیجی مگر بیڑے کے ڈوب جانے کے سبب سے یہ فوج ذلت و خواری کے ساتھ واپس ہوئی۔ دوسرے سال اس نے پھر فوج کشی کی تیاری کی اور تمام فوج سمندر کی راہ سے روانہ کی۔ یہ فوج ڈاٹس اور آرٹا فرنس کے زیر کمان تھی اور ایتھنز کا ٹائرنٹ ہپیاس جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے ان کے ساتھ بطور راہ نما تھا۔ ابتداءً قسمت نے مساعدت کی کیوس ڈیلوس اور اریٹ ریا ایرانیوں کے قبضے میں آ گئے۔ اس کے بعد ہپیاس کے مشورے سے یہ فوج ایک تنگ آبنائے سے گزرتی ہوئی مراتھون کے میدان جنگ میں خشکی پر اتری۔ یونان

کا پہلا مورخ ہیرڈوٹس اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "تم دیکھتے ہو کہ آزادی کیسی بیش بہا نعمت ہے"، کیونکہ جذبہ حریت نے اس جنگ کا فیصلہ کیا۔ ایتھنز کا سر عسکر ملیٹاڈس تھا جو ایک زمانہ میں ایران کی فوج میں شریک تھا۔ اہل ایتھنز کو صرف ایک چھوٹی سی ریاست کی امداد حاصل تھی مگر جذبۂ حریت کے نشہ میں اہل ایران کی کثیر التعداد فوج کو انھوں نے شکست فاش دی اور ڈاٹس اور آرٹا فرنس اپنی ہزیمت خوردہ افواج کو لے کر ۴۹۰ق‌م میں ایران کو واپس ہوئے۔

جنگ مراتھان کی اہمیت کے متعلق اکثر مورخوں نے مبالغہ سے کام لیا کیونکہ یہ جنگ فیصلہ کن نہ تھی۔ اس کی وجہ سے دارا کے عزم بالجزم میں فرق نہ آیا اور یونان کو اپنے تسلط میں لانے کا اس نے پھر عزم کر لیا مگر مصر میں بغاوت ہو گئی جس کی وجہ سے اس کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا اور اس کے بعد موت نے اس کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ ایک عرصۂ قلیل کے بعد اس کا بیٹا زرکسیز تاجدار ایران ہوا۔ یہ پہلا ایرانی بادشاہ تھا جس کو فوجی معاملات سے مس نہیں تھا اور امور مملکت میں بھی درک نہ رکھتا تھا۔ یونان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ بجائے ایک جری اور ذی فہم بادشاہ (دارا) کے اس کو زرکسیز ایسے کمزور اور عیش پسند بادشاہ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ باوجود اپنی عیش پسندی اور ناقابلیت کے زرکسیز نے بھی یونان کی فتح کی غرض سے ایک کثیر التعداد فوج جمع کرنا شروع کی تاکہ پھر شکست نہ ہو۔ اس معرکہ آرائی میں ہم کو دو ملکوں کے اخلاق و عادات کے موازنہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایرانی وحشی نہ تھے کیونکہ ان کا تمدن ترقی یافتہ تھا۔ امور سیاسی میں بھی انھوں نے کافی ترقی کی تھی اور پابند مذہب بھی تھے۔ بعض خصوصیات ان میں ایسی تھیں جن میں وہ یونانیوں پر فوقیت رکھتے تھے کیونکہ ہمعصروں کو بھی اس بات کا اقرار تھا کہ بہادری اور سچائی میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تمدن یورپ کو ایک ایسے دشمن سے پالا پڑا تھا جس کے غلبے سے اس کے فنا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس معرکے میں حریت

کی بقا و فنا کا فیصلہ تھا یونانیوں میں تحریر و تقریر کی آزادی تھی اور تمام باشندوں کو امور سیاسی میں دخل دینے کا حق تھا۔ ان کے مذہب سے تخیل کو تقویت ہوتی تھی اور اس کے اصول ایسے نہ تھے جو کسی پر گراں ہوتے۔ کثرت ازدواج کا ان میں رواج نہ تھا۔ ادبیات فنون لطیفہ اور فلسفے کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اگر ایران کو کامیابی ہوتی تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہوتا کہ اس کی سلطنت میں ایک صوبے کا اور اضافہ ہو جاتا۔ یونان کی فتح سے اس کے باشندوں کو دو صدی تک آزادی نصیب رہی اور اس مدت میں انھوں نے اپنے تخیلات اور قوانین کو ترقی دی اور اسی زمانے میں انھوں نے یورپ کی دماغی ترقی کی بنیاد ڈالی۔

جنگ ایران کے حالات ہمیں ہیروڈوٹس کی تحریروں سے معلوم ہوتے ہیں جو یورپ کا پہلا مورخ ہے اور اس کا طرز بیان نہایت دلاویز اور دلکش ہے۔ یہ جنگ اس کی طفولیت اور جوانی کے زمانے میں ہوئی اور اس کے ہموطنوں نے اس جنگ کے دوران میں جو شجاعت کے جوہر دکھائے انکے حالات بلا کم وکاست اور صحت کے ساتھ لکھنے کی اس نے کوشش کی ہے۔ گر اس میں شک نہیں کہ واقعات کے ساتھ اس نے افسانہ کو ملا دیا ہے محاربات اور فوجی نقل و حرکت کے خاکے جو اس نے کھینچے ہیں اکثر مبالغہ آمیز ہیں خصوصاً متخاصمین کی تعداد کے اندازہ کرنے میں اس نے فاش غلطیاں کی ہیں۔ مگر جنگ ایران کے افسانے بھی تاریخ کے جزو ہیں اور اس واقعے سے یونانیوں کو ہمیشہ فخر و مباہات کا موقع رہا کہ ان کی قلیل التعداد فوج نے ایران کی افواج قاہرہ کو شکست دے کر میدان کارزار سے بھگا دیا۔ زمانۂ حال کی تاریخی تنقید سے جو نتائج مرتب ہوئے ہیں ان کے لحاظ سے بھی یونانیوں کی کامیابی قابل ستائش ہے۔

ہیروڈوٹس کے مبالغہ آمیز بیانات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کا انبوہ جس کی تعداد پچاس لاکھ نفوس بیان کی جاتی ہے بحیرۂ باس فرس کی طرف روانہ ہوا اور ایک ہفتہ تک شب و روز کوچ کرتے ہوئے یونانی انجنیروں کے

بنائے ہوئے پلوں پر سے گزر کر یورپ کے ساحل پر پہونچا زرکسیز خود اپنی فوج کا سپہ سالار تھا اور تھریس اور مقدونیہ سے گزرتے ہوئے درۂ ٹیمپ پر پہنچا جہاں یونانی مقابلہ کرسکتے تھے مگر انھوں نے اس کو بلا حفاظت چھوڑ دیا تھا جس سے حملہ آوروں نے خیال کیا کہ یونانی تاب مقاومت نہیں لا سکتے۔ مگر درۂ تھرموپالی پر پہنچکر جہاں سے وسطی یونان کا راستہ گیا ہے انھیں معلوم ہوا کہ ایک فوج ان کے مقابلہ کے لئے تیار ہے۔

زرکسیز کے مقابلہ پر تمام ملک یونان تیار نہ تھا۔ آرگوس کو اسپارٹا کی سیادت منظور نہ تھی اس لئے وہ الگ رہا۔ تھیبس ایتھنز کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے ایرانیوں سے مل گیا۔ سیراکیوز جو یونانی مستعمرات میں سب سے بڑا تھا صرف اس شرط پر شریک ہونے کو تیار تھا کہ جنگ کی عنان اس کے ہاتھوں میں رہے۔ اس سے انکار کیا گیا اور وہ الگ رہا۔ ڈیلفی کے مندر کے پجاری بھی جذبۂ قومی سے عاری تھے اور اپنے دیوتا کی زبان سے کہلوایا کہ "فتح جنگ کے دیوتا کی ہوگی جو مشرقی گاڑی میں آرہا ہے"۔ جنگ کا خمیازہ ایتھنز اور اسپارٹا کو بھگتنا پڑا۔ ایتھنز کی بے نفسی اور قوم پرستی خصوصاً قابل ستائش ہے کہ اس نے اپنی تمام بری اور بحری فوجیں اسپارٹا کے تحت میں کردیں گو اس کے جہازات تعداد میں زیادہ تھے۔ جنگ مراتھان کے بعد ایتھنز میں کئی اہم انقلابات ہو چکے تھے۔ اولوالعزم اشخاص ایتھنز کی سیادت کے لئے آپس میں مجادلہ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایرس ٹائیڈ رقدامت پسند تھا۔ وہ اس خیال کا سخت مخالف تھا کہ ریاست کے تمام ذرائع بیڑے پر صرف کئے جائیں اور اس امر پر زور دیتا رہا کہ ایتھنز کی نجات ایک زبردست فوج رکھنے پر منحصر ہے۔ بیڑے کے قیام کا زبردست حامی تھیمس ٹاکلیس تھا جو کلیس تھینس کی اصلاحات کے طفیل میں ایتھنز کے زمرۂ احرار میں شامل ہوا تھا۔ اس نے ایتھنز کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور ایرس ٹائیڈس کو بن باس ہونا پڑا۔ جب زرکسیز نے یونان پر حملہ کیا ایتھنز کے پاس ایک زبردست بیڑا تھا اور سمندر میں اس کو وہی فوقیت حاصل تھی جو اسپارٹا کو خشکی پر تھی مگر اتحاد حاصل

کرنے کی غرض سے اسپارٹا کی ماتحتی اس نے قبول کر لی۔
یونانی سپہ سالاروں کا خیال تھا کہ درہ ٹیمپ سے مقابلہ شروع کیا جائے اور وہاں ایک فوج کا دستہ بھیجا بھی گیا مگر بعد کو معلوم ہوا کہ وہاں مقابلہ دشوار ہے اس لئے یہ خیال ترک کر دیا گیا اور ایک چھوٹی سی یونانی فوج لیونی ڈاس شاہ اسپارٹا کے زیر کمان درہ تھرموپائیلی کی حفاظت کے لئے بھیجی گئی اور ایک یونانی بیڑہ جس میں ایتھنز کے جہازات تعداد غالب میں تھے درۂ مذکور کے سمندر کا راستہ بند کرنے کے لئے بھیجا گیا مگر باوجود اہل اسپارٹا اور دوسرے یونانیوں کے بے مثل ایثار کے زرکسیز نے درہ فتح کر لیا اور قریب تھا کہ تمام وسطی یونان اس کے تصرف میں آجائے۔ اگر اس نے جرأت کے ساتھ ایک زبردست حملہ کیا ہوتا تو یہ امر ناممکن الوقوع نہ تھا مگر ایک ایسا تغیر ہوا جس نے جنگ کے رخ کو بالکل بدل دیا۔
اہل ایران یا یونان کسی نے بحری فوج کی قوت کا اندازہ نہ کیا تھا کہ اس سے جنگ میں کیا کام نکل سکتے ہیں۔ ایرانیوں کے نزدیک تو جہازوں کا مصرف صرف یہ تھا کہ ان پر فوج کے لئے سامان خورد و نوش لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جائے یا بصورت شکست ان پر بیٹھ کر بھاگ نکلیں۔ یونانی بھی جہازوں کو حفاظتی جنگ اور بری افواج کی امداد کے لئے استعمال کرتے تھے مگر اس جنگ کا فیصلہ جہازوں نے کیا۔ یونانی بیڑہ خلیج سلامس میں لنگر ڈالے ہوئے تھا کہ اہل ایتھنز کو اپنا شہر خالی کرنے میں مدد دے انھیں مطلق یہ خیال نہ تھا کہ بیڑے سے جنگ کا فیصلہ ہو جائیگا۔ مگر اتفاقات اور ایتھنز کے سرغنہ تھیمس ٹاکلز کی حکمت عملی سے جنگ ہو ہی گئی۔ شاہ ایران کو فتح کا یقین تھا مگر اس کی افواج کثیرہ تنگ سمندر میں نقل و حرکت نہ کر سکتی تھیں جس کے سبب سے ان کو سخت شکست ہوئی۔ برخلاف اس کے یونانی اپنے زاد و بوم کے لئے لڑ رہے تھے اور مقامی حالات سے واقف تھے اور بہ نسبت اپنے حریفوں کے جہازوں کا استعمال زیادہ عمدگی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ اسی لئے وہ مظفر و منصور ہوئے۔

جنگ سلامس یونان کی تاریخ میں فیصلہ کن جنگ خیال کی جاتی ہے کیونکہ اس سے یونان کی آزادی اور یوروپین تمدن دونوں دوامی فنا سے بچ گئے۔ مگر یہ دل خوش کن نتیجہ ہرگز نہ پیدا ہوتا اگر زرکسیز میں ذرا سا بھی جرات یا استقلال ہوتا۔

اس کا بیڑا اب بھی یونانیوں کے بیڑہ سے بڑا تھا۔ اس کی فوج قریب قریب محفوظ تھی۔ مگر جنگ سے اس کا دل اکتا گیا تھا اور مارڈنییس کو فوج کا سپہ سالار کر کے ایران کو واپس چلا گیا۔ جنگ کے بعد ایام سرما میں ایرانیوں کے سپہ سالار نے کوشش کی کہ اسپارٹا اور ایتھنز میں نفاق پیدا ہو جائے لیکن گو ایک حد تک اسپارٹا نے ایتھنز کی امداد میں پہلو تہی کی مگر ان میں اتحاد قایم رہا۔ سلامس کی فتح سے ان تمام ریاستوں میں جوش بڑھ گیا جن میں قومی احساس باقی تھا اور دوسرے سال موسم بہار میں ایک یونانی فوج بوائیشیا میں داخل ہوئی اور وہیں ۹ ،۴ ق م میں پلاٹیا کی جنگ عظیم وقوع میں آئی۔ اس جنگ میں اتفاقات سے نہیں بلکہ فوجی تفوق کے سبب سے یونانیوں کو فتح وظفر نصیب ہوئی اور ان کو معلوم ہوا کہ ایران ایک مصنوعی ہاتھی ہے جس میں بھوسا بھرا ہوا ہے اور بجائے خوف کے ایرانی سپاہیوں اور ان کے طرز جنگ کو حقارت سے دیکھنے لگے۔ اسی اثنا میں مائی کالی کی بحری جنگ میں جو ایشیائے کوچک کے سواحل پر ہوئی۔ یونانیوں کو فتح حاصل ہوئی جس سے ثابت ہو گیا کہ سلامس کی فتح محض اتفاقی نہ تھی۔

باوجود ان شکستوں کے ایشیائے کوچک اور جزائر میں بہت سے یونانی شہر ابھی تک ایرانیوں کے قبضہ میں تھے اور یہ اندیشہ ہر وقت پیش نظر تھا کہ زرکسیز کی افواج کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے پھر کوئی زبردست ایرانی فوج نہ آ جائے۔ اس لئے جنگ پلاٹیا کے بعد یونانیوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ افواج ہر وقت تیار رکھی جائیں اور اس مقصد کے لئے تمام یونانی ریاستیں ایک زبردست اتحاد میں شریک ہوں۔ یونانی ریاستوں کا یہ اتحاد تاریخ یونان میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہی ایک موقع ہے کہ یونان کی ریاستوں

میں اتحاد کا شائبہ پیدا ہوا اور اس کا سلسلہ نہایت ہی قلیل زمانہ تک رہا مگر اس
سے دو زبردست اتحاد پیدا ہوئے جن میں یونان جنگ ہائے پیلو پونیس کے
زمانہ تک منقسم تھا۔ اس کے علاوہ اس اتحاد سے ایران کے خلاف جنگ
جاری رہی اور متحدین کا مقصد یہ تھا کہ سرزمین یونان کو ایران کے طوق غلامی
سے آزادی نصیب ہو۔

ہم مجبور ہیں کہ اس جنگ کے حالات اختصار کے ساتھ بیان کریں۔
افواج یونان کی کمان چند وجوہ سے بجائے اسپارٹا کے ایتھنز کے ہاتھ میں آگئی
جس کو ہم آئندہ کسی موقع پر بیان کرینگے۔ پہلے تو ایرانی بحیرۂ ایجین کے جزائر سے
نکال دئے گئے۔ اس سے یونانیوں کی ہمت افزائی ہوئی اور بجائے مدافعت
کے انھیں خود حملہ کرنے کا حوصلہ ہوا۔ خوش قسمتی سے انھیں کی مون سا تجربہ کار
سپہ سالار مل گیا اور اس کی بیدار مغزی کی وجہ سے یوری میڈن کے قریب
انھوں نے ایران کی بری اور بحری افواج کو شکست دی اور مصر تک ایرانیوں
سے لڑتے ہوئے پہنچ گئے۔ یہاں پہلے پہلے تو شاندار فتوحات نصیب ہوئیں
مگر بعد میں انھیں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ سنہ ۴۴۹ ق م میں انھوں نے ایک
فوج جزیرۂ قبرس کو فتح کرنے کے لئے بھیجی۔ ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی مگر
بدنصیبی سے اثنائے جنگ میں کی مون کا انتقال ہوگیا۔ سنہ ۴۴۸ ق م میں ایران
و یونان میں صلح اس شرط پر ہوئی کہ آئندہ سے کوئی ایرانی بیڑہ ایشیائے کوچک
کے سواحل یا بحیرۂ ایجین کے اطراف میں نہ آنے پائے۔ حکومت ایران اس
کے بعد بھی یونان کے ہمسایوں میں سب سے طاقتور تھی مگر یونان پر حملہ کرنے
کی اسے پھر جرأت نہ ہوئی۔

مگر جنگ ایران کا اختتام دل خوش کن نہیں ہے۔ اگر یونان کی تمام
ریاستیں متحد ہو جاتیں تو اس بدنصیب ملک کا انجام کچھ بہتر ہوتا۔ مگر آتش حسد کا
فرو ہونا مشکل تھا۔ ایران کی فوج کی موجودگی میں بھی کئی ریاستیں جنگ سے
الگ رہیں اور جب یہ خطرہ ہمیشہ کے لئے دفع ہوگیا تو پھر میدان پلاٹیا میں جو اتحاد قائم
ہوا تھا اس کا باقی رہنا اور بھی دشوار تھا۔ اتحادیوں کے طرز عمل کے متعلق ایتھنز

اور اسپارٹا کے درمیان وسیع اختلافات تھے۔ ایتھنز والوں کی رائے تھی کہ بے دھڑک حملہ کرنا چاہیئے مگر اسپارٹا والے دور دراز ممالک میں قسمت آزمائی کو حماقت خیال کرتے تھے۔ ۴۷۸ ق م میں پاسانیس شاہ اسپارٹا چند الزامات کا جواب دینے کے لیئے قسطنطنیہ سے واپس بلایا گیا جہاں کی افواج کا وہ سپہ سالار تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد بیڑہ کی کمان دوسرے حلیفوں کی رائے سے ایتھنز والوں کو پیش کی گئی اور انھوں نے قبول کرلی۔ جب دوسرا سپہ سالار اسپارٹا سے آیا اس کو سوا اس کے چارہ نہ تھا کہ یا تو واپس جائے یا ایتھنزیوں کی ماتحتی قبول کرے اس لیئے اسپارٹا کا بیڑا واپس چلا گیا اور حلیفوں کے تمام بیڑے ایتھنز کے تحت میں آ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمین یونان میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ اسپارٹا خشکی کی ریاستوں کا مرکز تھا اور ایتھنز بھی کچھ عرصہ تک اس میں شامل رہا۔ مگر بحری ریاستوں نے اپنی جماعت الگ بنالی جس کو اتحاد ڈیلین اس مناسبت سے کہتے تھے کہ اس کے جلسے ڈیلوس میں ہوتے تھے۔ اس کی صدارت ایتھنز کو دیگئی۔ اتحاد ڈیلین یونانی سیاسیات میں ایک جدید اور امید افزا تجربہ تھا۔ ریاستیں خود اس میں بطیب خاطر شریک ہوئیں کیونکہ امید تھی کہ اس کے وجود سے ایرانیوں کو حملہ کرنے کی جرات نہ ہوگی اور سواحل بحر ایجین پر امن وامان قائم رہیگا۔ جملہ معاملات بطریق احسن طے کر لیئے گئے اور یہ بھی طے ہو گیا کہ ہر ریاست کو کس قدر جہاز سپاہی اور نقد روپیہ فراہم کرنا چاہیئے۔ ہر سال موسم بہار میں جملہ شرکائے اتحاد کے نمائندوں کا ایک جلسہ ہوا کرتا جس میں سال آئندہ کا نظام العمل طے ہوتا۔ اس اتحاد میں زمانۂ حال کے دستور اشتراکی کی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر اتحاد یونان کی حوصلہ افزا امیدیں جلد خاک میں مل گئیں۔ جب ایران کے حملوں کے تواتر کا خوف جاتا رہا اکثر ریاستوں سے مقررہ رقوم کے ادا کرنے میں پہلوتہی ہونے لگی مگر شرائط اتحاد کی رو سے کسی ریاست کو علٰحدہ ہونے کا اختیار نہ تھا اور ایتھنز کی یہ پالیسی تھی کہ علٰحدہ ہونے والے کو بجبر اتحاد سے الگ نہ ہونے دیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحاد ڈیلین دیگر الفاظ میں شہنشاہیت ایتھنز ہو گیا اور اس کے حلیف اس کے

باجگذار ہو گئے یعنی ایتھنز کی اب صرف صدارت نہ تھی بلکہ شہنشاہیت۔ ہم اس امر کا احساس کر سکتے ہیں کہ یونان کو اس بات کی ضرورت تھی کہ وہاں "شہری ریاست" سے زیادہ طاقتور ریاست پیدا ہو اور ایتھنز کی شہنشاہیت اس کا پیش خیمہ تھا۔ مگر ایتھنز کے ہمعصر اس کو ایک جابر حاکم خیال کرتے تھے جو دوسری ریاستوں پر بلا روک حکومت کر رہی تھی جن کو خود مختار ہونے کا استحقاق تھا۔

آئندہ سے یونان کی ریاستیں دو گروہوں میں منقسم ہو گئیں ایک تو اسپارٹا اور اس کے حلفاء اور دوسرے ایتھنز اور اس کے حلفا اور ان دونوں ہمسر سلطنتوں میں بہت جلد جنگ چھڑ گئی ایتھنز کو یہ ہوس ہوئی کہ علاوہ جزائر کے سرزمین یونان کے ایک حصۂ کثیر کو اپنے قبضہ میں لائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے وسط یونان کی ریاستوں سے ایتھنز والے برسرِ پرخاش ہو گئے اور پھر اسپارٹا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ابتداءً ایتھنز کا پلہ بھاری رہا مگر خشکی پر اس کے سپاہی نہ اسپارٹا کا مقابلہ کر سکتے تھے نہ تھیبیوں کا۔ ۴۴۵ ق م کے ختم ہونے تک ایتھنز کی سلطنت کا خشکی کے حصہ کا خاتمہ ہو گیا اور اسپارٹا سے صلح کرنے پر مجبور ہوا جسے سی سالہ صلح کہتے ہیں۔ اس صلح کے مطابق ہر دو اتحادات نے جس کے صدر اسپارٹا اور ایتھنز تھے ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کیا اور یہ طے ہو گیا کہ کسی اتحاد کے کسی رکن کو اس سے علیحدہ کر کے اپنے اتحاد میں شریک کرنے کی کوشش نہ کی جائیگی۔ اور اگر آپس میں کسی قسم کی غلط فہمی یا اختلاف ہو تو جنگ کے قبل ثالثی سے کام لیا جائے۔ ۴۴۵ ق م میں گویا ایتھنز کی فوجی فتوحات کی آرزو کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر اسی زمانہ میں یہ ریاست اپنی عظمت کے انتہائی درجہ پر پہنچ رہی تھی۔ تاریخ یورپ میں اسکی طرز حکومت، تمدنی زندگی، ادبیات، اور فنون لطیفہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں جن کا تذکرہ باب آئندہ میں ہو گا۔

باب چہارم

یونان پیرکلیس کے زمانے میں

پیرکلیس نے اپنی ایک مشہور تقریر میں ایتھنز کے خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایتھنز یونان کا مکتب ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ ایتھنز میں یونانی تمدن کے بہترین عناصر موجود تھے اور اس شہر کے باشندوں نے یونان کے سامنے ایک ایسا صحیح نظیر پیش کیا تھا جس کی سب پیروی کر سکتے تھے۔ پیرکلیس کا دعوے بیجا نہ تھا۔ گو یہ صحیح ہے کہ اہل ایتھنز ضبط اور استقلال کا سبق اسپارٹا سے سیکھ سکتے تھے اور یونان کے دوسرے اضلاع نے بھی فنون لطیفہ اور فلسفہ کی ترقی میں حصہ لیا ہے اور یونان کے سیاسی خیالات کی اشاعت میں بھی ان کا حصہ ہے۔ مگر باوجود ان امور کے اس میں شک نہیں کہ تمام یونان ایتھنز کے کمالات سے فیضیاب ہوا ہے جس طرح کہ یونان خود تمام یورپ کے لئے منبع علم و فضل ہے۔

ایتھنز کا تمدن

ایتھنز کے تمدن میں بہت کم ایسے خصوصیات ہیں جو یونان کی دوسری ریاستوں میں نہیں پائے جاتے۔ ایسے اشخاص کی تعداد جن کو "شہریت" کے پورے حقوق حاصل تھے ان کی تعداد قریب ..... ۵ کے تھی۔ مگر علاوہ شہریوں کے ایک تعداد کثیر ایسے اشخاص کی تھی جن کا شمار شہریوں میں نہیں تھا۔ ان میں وہ غیر ملکی شامل

تھے جو ایتھنز میں بغرض تجارت مقیم تھے اور شہریت کے حقوق سے محروم تھے کیونکہ کلیس تھینس کی اصلاحات سے کسی غیر ملکی کا حقوق شہریت حاصل کرلینا سخت دشوار ہوگیا۔ یہ آزاد غیر ملکی جو میٹک کے نام سے موسوم تھے اکثر بندرگاہ میں مقیم تھے اور ریاست ایتھنز کی تجارت زیادہ تر انھیں کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کے علاوہ غلام بھی تھے۔ ان کی ٹھیک تعداد کا اندازہ کرنا دشوار ہے مگر اس میں شک نہیں کہ احرار سے ان کی تعداد زیادہ تھی۔ زمانۂ قدیم کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہ ہوتی تھی۔ ان کے آقاؤں کو انکے جان ومال پر پورا اختیار تھا اور بدچلنی کی پاداش میں لاریم کی کانوں میں بھیجدئے جاتے جہاں سے زندہ بچکر آنا محال تھا۔ مگر ایتھنز کے باشندے نرم دل اور خدا ترس تھے اور بمقابلہ دوسری یونانی ریاستوں کے اپنے غلاموں سے انسانیت کا سلوک کرتے۔ غلاموں کا کوئی مخصوص لباس نہ تھا، اپنے آقا کے گھر میں خاندان کے دوسرے ارکین کی طرح رہتے اور ان کے تعلقات اپنے آقاؤں سے خوشگوار تھے۔ اس زمانے کے محققین جن کے پیش نظر اسپارٹا کی سختی تھی ایتھنز میں غلاموں کی آزادی کو خطرناک خیال کرتے تھے مگر غلاموں کے ساتھ جو عمدہ سلوک وہ کرتے تھے اس کی وجہ سے ان کی ریاست میں غلاموں نے کبھی بغاوت نہیں کی۔ زمانۂ جنگ میں اور خصوصاً جنگ پیلو پونیس کے اختتام پر اکثر غلام میدان جنگ سے فرار ہوگئے۔ مگر ایتھنز کی تاریخ میں غلاموں کی کسی ایسی اہم بغاوت کا پتا نہیں چلتا جیسا کہ اسپارٹا میں ہیلیٹون کی بغاوت ہوئی جس سے اس ریاست کی زندگی کا چراغ گل ہوتے ہوتے رہ گیا جس زمانے کی تاریخ ہم لکھ رہے ہیں اس کے بعد عقلاء ایتھنز غلامی کے جواز و عدم جواز پر بحث کرنے لگے تھے۔ یوری پی ڈیس کا خیال تھا کہ بعض غلاموں کے خصائل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بہ نسبت اپنے آقاؤں کی آزادی کے زیادہ مستحق ہیں اور ارسطو نے لطائف ودلائل غلامی کے جواز میں پیش کئے ہیں جس کو وہ تمدن کے بقا کے لئے ضروری خیال کرتا تھا۔

ایتھنز کی عورتوں کے حالات کے ضبط تحریر میں لانے کی زیادہ ضرورت

نہیں کیونکہ معاملات سلطنت میں انھیں بہت کم دخل تھا۔ ہومر کے زمانے میں جو آزادی عورتوں کو نصیب تھی وہ پیریکلیس کے زمانہ میں قریب قریب مفقود ہو گئی تھی۔ شہری زندگی کی ترقی اور مشرقی ممالک سے آمد و رفت بڑھ جانے کے سبب سے مشرقی پردہ کا رواج ایتھنز کی عورتوں میں ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے زنانہ قید سے سوا تہواروں اور دوسری رسوم کے نکلنے کے انھیں بہت کم مواقع ملتے۔ ان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ زن و شوہر کی عمروں میں اکثر بہت فرق ہوتا اور باہمی موانست کا ہونا نکاح کے لئے ضروری نہیں خیال کیا جاتا تھا جیسا کہ آجکل مغربی ممالک میں رواج ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایتھنز کی عورتوں کا اس کی تمدنی زندگی یا فنون لطیفہ یا فلسفے کی ترقی میں کوئی حصہ نہ تھا۔ گو بعض عورتیں اس کلیہ سے مستثنیٰ تھیں مگر عقلائے یونان کی توجہ اس مسئلے کی طرف منعطف ہو چکی تھی اور ان میں سے اکثر عورتوں کی بے بسی اور جہالت کو رفع کرنے کی کوشش میں تھے۔ ارسٹوفانیس نے اپنے ناٹکوں میں عورتوں کے "آزادی" حاصل کرنے اور امور مملکت میں حصہ لینے کا مذاق اڑایا ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ رسم نکاح موقوف کر دی جائے اور ذکور و اناث کی تعلیم ایک ہی اصول پر ہو اور مختلف پیشوں کے اختیار کرنے میں کوئی روک نہ ہو۔ ان انقلاب آمیز خیالات کے مقابلہ میں زینوفن رسم نکاح کا مداح ہے اور اپنی ایک تحریر میں زن و شوہر کے خوشگوار تعلقات کو اخلاق کی بنیاد خیال کرتا ہے

یونان میں ایتھنز جمہوریت کا بہترین نمونہ تھا۔ مگر یونانی لفظ "جمہوریت" کا استعمال انھیں معنوں میں نہیں کرتے تھے جو اب اس کا مفہوم ہے کیونکہ خود ایتھنز میں لے ٹک اور غلاموں کی تعداد آزاد شہریوں سے بہت زیادہ تھی اور ان کو سیاسی معاملات میں بالکل دخل نہ تھا۔ ایتھنز کو جمہوریت کہنے سے یہ مراد ہے کہ شہریوں کی جماعت میں کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس کو بوجہ امارت یا شرافت خاص حقوق حاصل تھے اور رعایا کی عام مجالس کو ریاست کے تمام سررشتوں کی نگرانی کا اقتدار حاصل تھا۔ ایتھنز کا دستور

سیاسی زمانہ حال کے اصول سیاست سے بالکل مختلف تھا اور یہ اختلاف مجلس عوام اور خصوصاً اس کے وسیع اختیارات میں حاصل تھا۔ ہر مہینہ میں ایک بار یا دو بار تمام شہری یا کم از کم جتنے آسکیں مقام "نکس" میں جمع ہوتے اس جماعت کو "ایک لی سیا" کہتے تھے اور اس کے اقتدارات کی کوئی انتہا نہ تھی۔ زمانہ امن و جنگ دونوں کے معاملات اس میں طے ہوتے۔ محصولات پر مباحثہ ہوتا۔ سربرآوردہ عہدہ داروں کا عزل و نصب ہوتا اور اسی جماعت سے وضع قوانین اور عدالت العالیہ کا کام بھی لیا جاتا۔ تاریخ عالم میں کسی ریاست میں مجلس عوام کو اس قدر وسیع اقتدارات حاصل نہ تھے۔

تمام مجالس وزرا اور حکام اسی مجلس ایک لی سیا کے تابع فرمان تھے۔ ریاست کے سربرآوردہ عہدہ دار دس "جنرل" تھے جو تمام شہریوں کی رائے سے منتخب ہوتے اور ریاست کا تمام کام انہیں کے ہاتھوں میں تھا۔ مگر زمانہ حال کے یورپین نظام سیاسی کی طرح ایتھنز میں "پارٹیاں" نہیں تھیں نہ کوئی شخص وزیر اعظم تھا یا اس عہدہ دار کے مماثل اقتدار رکھتا تھا اور جب "پارٹیز" کا وجود نہ تھا تو ظاہر ہے کہ نہ مجلس وزرا تھی نہ نیابت کا طریقہ تھا اور اگر ایسا ہوتا تو یہ شہریوں کی جماعت عام کے اقتدارات کے منافی ہوتا جو ایتھنز کے نظام سیاسی کا اصل اصول تھا۔ اس نظام کے علاوہ عہدہ داروں کے تقرر کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ ایتھنز میں عہدہ داروں کی تعداد کثیر تھی اور جمہوریت کا اقتضا یہ تھا کہ ان کی تعداد میں کثرت ہو تاکہ کسی ایک فرد یا چند افراد کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ نہ رہے۔ چند مستثنیات کے علاوہ ان تمام عہدہ داروں کا انتخاب قرعہ اندازی سے ہوتا جس کا نتیجہ تھا کہ کسی عہدے کے لئے کسی قابل اور ہیدار مغز شخص کا انتخاب شاذ و نادر ہوتا۔ جمہور ایتھنز میں اس سے عجیب و غریب کوئی شے نہیں مگر اہل ایتھنز اسی کو جمہوریت کا اصل اصول خیال کرتے۔ ان کے خیال میں اس سے یہ فائدہ تھا کہ ہر شخص کو منتخب ہونے کے لئے برابر کا موقع تھا خواہ اس میں لیاقت یا کسی کام سے مناسبت ہو یا نہ ہو۔ قرعہ اندازی کے سبب سے کسی عہدہ دار کو یہ موقع نہ تھا کہ مجلس عامہ کے اقتدار کو کلاً یا جزاً سلب

کر لے۔ عہدہ داروں کی کثرت بھی ایتھنز کی ایک خصوصیت ہے۔ ایک یونانی مصنف نے قریب چھ ہزار عہدہ داروں کے نام گنائے ہیں۔ آزاد شہریوں کی قلیل تعداد کا خیال کرتے ہوئے ظن غالب یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی منصب حاصل تھا خواہ وہ بطور جوری کے کیوں نہ ہو جو ایتھنز میں مقدمات کا تصفیہ کرتے تھے۔ جو عہدہ دار قرعہ اندازی سے منتخب ہوتے تھے ان میں سربرآوردہ اراکین "مجلس پنج صدی" تھے جو مجلس ایک لی سیا کے زیر نگرانی سلطنت کے معمولی کاروبار کو طے کرتے تھے مگر اس کا نظام ایسا قائم کیا گیا تھا کہ اس کو کوئی آزادی نہ ہو اور ہر بات میں وہ ایک لی سیا کی تابع ہو۔ مگر اہل ایتھنز کو قرعہ اندازی سے خطرات کا احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ چند عہدہ دار ایسے بھی ہیں جن کا انتخاب قرعہ اندازی سے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے دس جنرلوں کا انتخاب غلبۂ آراء سے کیا جاتا اور جب ایتھنز کی مالی حالت خراب ہوگئی تو عہدہ دارانِ مالیہ (فناانس) کا انتخاب بھی بذریعۂ انتخاب ہونے لگا گو پیرکلیس کے زمانہ میں ان کے لئے بھی قرعہ اندازی کا رواج تھا۔

پیرکلیس کا دعوے تھا کہ نظام جمہوری جو ایتھنز میں رائج تھا اس سے آزادی مساوات اور استحکام حاصل تھا۔ ہمارے قانون سے امیر و غریب ہر شخص کے لئے معدلت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور جب کوئی فرد کسی طور پر نام و نمود حاصل کرتا ہے تو وہ ریاست کی پبلک ملازمت میں داخل کر لیا جاتا ہے جو اس کی خدمات کا صلہ ہے نہ کسی قسم کا حق ہم ایسے شخص کو جو پبلک معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں رکھتا نہ صرف بے ضرر بلکہ بیکار خیال کرتے ہیں اور اگر ہم میں سے سب افراد کسی کام کی ابتدا نہیں کر سکتے تو کم از کم ہم میں بھلے برے کی تمیز موجود ہے۔ ہماری رائے میں بحث و مباحثہ سے قوت فعلیہ میں ہرج نہیں ہوتا بلکہ نقصان جو پہنچتا ہے اس علم کے نہ ہونے سے ہوتا ہے جو کسی فعل کے قبل مباحثہ میں سے حاصل ہوتا ہے۔ ایتھنز کی حریت و مساوات میں تو کوئی شبہ نہیں مگر آئندہ چل کر معلوم ہوگا کہ اس کا دستور کارگر نہ تھا کیونکہ آخر میں ایتھنز کو اپنے اس تیقن کا خمیازہ بھگتنا پڑا کہ سلطنت کی خدمت

کے لئے کسی خاص لیاقت یا تعلیم و تجربہ کی ضرورت نہیں ۔

امور مملکت میں پیرکلیس کے اقتدارات

اگر جمہوریت ایتھنز نے اس زمانہ میں امن و جنگ دونوں میں اپنی فوقیت ثابت کی تو اس کا سہرا بلا شبہ اس پُر عظمت شخص کے سر ہے جس کے ہاتھ میں اس کی عنان حکومت تھی ۔ پیرکلیس گروہ شرفا میں سے تھا مگر ابتدا ہی سے اس نے عوام کا ساتھ دیا اور جمہوریت ایتھنز پر اس نے آخری رنگ چڑھایا ۔ فلسفیوں، صناعوں، شاعروں، اور کاریگروں کا دوست تھا اور ایتھنز نے یونان میں فنونِ لطیفہ میں جو فوقیت حاصل کی وہ اس کی دلچسپی اور تربیت کی بدولت تھی ۔ بہ حیثیت صدر جمہور اس کی حالت عجیب تھی ۔ وہ صدر نشین یا وزیر اعظم نہ تھا ۔ جمہوریت نے اسکو کسی ایسے عہدہ سے سرفراز نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے وہ سلطنت پر پورے طور پر حاوی ہوتا ۔ یہ صحیح ہے کہ پندرہ سال تک وہ "جنرل" کے عہدہ پر فائز رہا مگر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کے علاوہ نو اور عہدہ دار بھی اس کے ہم مرتبہ تھے اور قانون وقت کے مطابق جب چاہتے اسے معزول کر سکتے تھے ۔ مگر اس کی سیاسی قوت دوسری قسم کی تھی جس کو ہم اب مشکل سے سمجھ سکتے یا اپنے خیالات کے مطابق کر سکتے ہیں ۔ جمہور کا وہ معتمد علیہ مشیر تھا ۔ اس کی تقریریں بغور سنی جاتیں اور اس کے مشورہ پر عمل کیا جاتا ۔ اس کا اقتدار ایسا تھا کہ اس کا احساس یا اندازہ آسانی سے نہیں ہو سکتا اور ہر وقت اسے اندیشہ لگا رہتا کہ کہیں اس کے ہاتھوں سے عنان حکومت نہ نکل جائے اور آئندہ محاربۂ عظیم کی ابتدا میں ایسا ہوا بھی ۔ مگر اس کے جسمانی رعب، پُر تاثیر فصاحت، اعلیٰ تدبر اور مستقل مزاجی کا زبردست سکہ اس کے ہموطنوں پر ایسا جما ہوا تھا کہ زمانۂ حال میں بہت کم وزرا حقیقی معنوں میں طویل مدت تک برسرکار رہے ہیں گو فصاحت اور مجلس عوام میں اقتدار رکھنے کے سوا اس کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا ۔

پیرکلیس کی جس تقریر کے اقتباسات ہم نے پیش کئے ہیں اس میں اسکی شان تدبّر اور خوش تقریری کی جھلک پائی جاتی ہے مگر ایتھنز کی عظمت کے اسباب جو وہ خیال کرتا ہے تعجب انگیز ہیں۔ پیرکلیس نے ایتھنز کے جنگی فتوحات اور اس کی سلطنت کی وسعت رقبہ پر اظہار فخر کیا ہے اور دعوے کیا ہے کہ اس کی عظمت و شکوہ پر آئندہ نسلوں کو حیرت ہوگی۔ مگر یہ امید غلط ثابت ہوئی۔ فتوحات کا دروازہ بند ہوگیا اور اس کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا مگر اس کے کارناموں پر زمانے کو اب تک تحیر و استعجاب ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کی عظمت کا دارومدار فتوحات اور وسعت سلطنت پر نہیں ہے بلکہ اس کے باشندوں کے تمدنی کمالات پر اور اس ترقی پر ہے جو انھوں نے علوم و فنون کے ہر شعبہ میں کی۔

پیرکلیس کے زمانہ میں ایتھنز کو عمارات کے لحاظ سے "عروس البلاد" کہنا بیجا نہ ہوگا۔ معمولی مکانات کی تعمیر میں تو زیادہ تکلفات نہیں کئے گئے مگر ایک روپولیس (قلعۂ ایتھنز) اور اس کے قرب وجوار میں متعدد عالیشان عمارتیں وجود میں آگئیں جن سے فن تعمیرات میں ایک نیا دور پیدا ہوا۔ ایتھنز کی حفاظت کے لئے اس کی طویل دیواریں کافی تھیں جو سمندر تک چلی گئی تھیں اس لئے اس کی حفاظت کے لئے کسی قلعہ کی ضرورت باقی نہ رہی اور قلعۂ مذکور اس کی مذہبی زندگی کا مرکز ہوگیا جہاں جملہ رسومات ادا کی جانے لگیں۔ پیرکلیس ہی کی تحریک اور اہتمام سے پارتھی نان کے پرشکوہ مندر کی تعمیر شروع ہوئی جس کو فیڈیس کے تراشتے ہوئے مجسمات سے آراستہ کیا گیا جس کے ٹکڑے اب بھی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پارتھی نان کے علاوہ ایک روپولیس پر دو اور مندر بھی تھے اور اس ٹیکری کے دامن میں تھیٹر اور بڑے بڑے ہال بنے ہوئے تھے۔ فنون تعمیر و بت تراشی میں ایتھنز کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ فیڈیس کا مایۂ ناز مجسمہ ایتھنا دیوی کی مورت تھی جس کے لئے پارتھی نان کا مندر بنا تھا۔ یہ مورت سونے اور ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تھی مگر بدقسمتی سے ضائع ہوگئی۔ اس کی صناعی کا اندازہ صرف سکوں سے ہوسکتا ہے جس پر

اس کے خط و خال کندہ تھے یا زمانۂ مابعد کی بھدی نقلوں سے مگر خوش قسمت دیکھنے والوں پر اس کا اثر وہی ہوتا تھا جو مذہبی تصاویر کے بہترین نمونوں کا ہوسکتا ہے۔ اس مورت کے علاوہ پارتھی نان کے بیرونی حصہ بھی مجسمات سے آراستہ تھے جو یا تو فیڈیس کے خود تراشے ہوئے تھے یا اس کی نگرانی میں تراشے گئے تھے۔ ان مجسمات کے بڑے بڑے ٹکڑے اب بھی موجود ہیں اور اس سے یونانی بت تراشی کی خوبی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ایکروپولیس کے جنوب و مشرق میں ڈایونیسیس کا تھیٹر تھا جس سے تمام یورپ فیضیاب ہوا ہے کیونکہ ڈراما کی غایت صرف حظ نفس نہ تھی بلکہ اس سے روحانی مذہبی اور اخلاقی تعلیم بھی مقصود تھی۔ یونانیوں کے ادبی کمالات میں ڈراما نویسی نہایت ہی ممتاز ہے۔ قدیم یونان کے کھنڈروں میں تھیٹروں کے آثار ہر جگہ پائے جاتے ہیں اس کا اثر ان کے علم و ادب کی ہر شعبہ میں موجود ہے یہاں تک کہ رسوم مذہبی اور سیاسیات بھی اس کے اثر سے بچ نہ سکے۔ ایتھنز کا تھیٹر اس قدر وسیع تھا کہ اس کی آزاد آبادی کی ایک تعداد کثیر اس میں وقت واحد میں آسکتی تھی۔ ڈراما کی نقلوں کی ابتدا ڈائونیسیس (شراب کا دیوتا) کی پرستش سے ہے۔ جس میں ان نقلوں کا ایک خاص حصہ تھا اور باوجود امتداد زمانہ ان نقلوں سے مذہبی عنصر بالکل غائب نہ ہوا۔ ایک وقت میں چار ایکٹروں سے زیادہ مکالمہ میں شریک نہ ہوتے۔ سینری (پردے) بالکل سادے ہوتے اور بدلے نہ جاتے۔ حزنیہ ناٹکوں میں نقالوں کی گفتگو خطیبانہ لہجہ میں اور ایک ہی طرز میں ہوتی۔ مگر کسی ملک میں ڈراما کو قومی زندگی میں اتنا دخل نہ تھا جتنا کہ یونان میں کیونکہ مذہب و اخلاق و سیاسیات کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اس کو بنایا جاتا تھا اور زمانۂ حال میں جو کام اخبارات اور مذہبی خطبات سے لیا جاتا ہے اس زمانہ میں وہ کام ڈراما سے لیا جاتا۔ ڈراما کی دو قسمیں تھیں حزنیہ اور طربیہ حزنیہ میں متانت اور سنجیدگی کا پہلو غالب تھا اور طربیہ میں شوخی اور ظرافت کا۔ مگر طربیہ نویس بھی اپنا زور طبع تمدنی معاملات یا حسن و عشق کی داستانوں تک محدود نہ رکھتے بلکہ صاف صاف اور اکثر معاندانہ

پہلو سے اپنے زمانہ کے سیاسی مسائل پر بحث کرتے یا فلسفیوں کا مذاق اڑاتے۔
ایتھنز کے ممتاز ترین ڈراما نویس پیری کلیس کے زمانہ میں موجود تھے۔ حزنیہ نویسوں
کا سرتاج اے سی کلیس تھا جو اندازاً سنہ ۵۲۵ ق م میں پیدا ہوا اور سنہ ۴۵۶ ق م میں
انتقال کر گیا۔ ان تاریخوں کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جنگ ایران کے زمانہ
میں تھا مگر اس کی موت کے قبل ایتھنز میں پیری کلیس کا اثر پیدا ہو چکا تھا۔ اے سی کلیس
کے جانشین سوفوکلیس نے قریب ۹۰ سال زندگی پائی سنہ ۴۹۵ یعنی جنگ مارتھان
سے پانچ سال قبل پیدا ہوا اور سنہ ۴۰۶ میں انتقال کیا یعنے اپنے محبوب وطن
کے دشمنوں کے قبضہ میں آجانے کے دو سال قبل۔ اے سی کلیس کی طرح
اس میں بلند نظری نہ تھی مگر وہ اپنے مضامین کو اس خوبی کے ساتھ ترتیب
دیتا ہے کہ ڈراما کے دیکھنے والوں کے قلوب پر اثر ہو۔ لیکن اگر وہ بلند نظری
میں اپنے پیش رو سے کم ہے تو اس کے معاوضہ میں اس میں شوخی اور
انسانیت زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے اگر وہ ایتھنز کا سب سے بڑا شاعر نہیں
تو کم از کم اتنا ضرور ہے کہ یونانی شاعری کی بہترین خصوصیات اس میں
موجود تھیں۔ اس دور کا تیسرا شاعر یوری پیڈس ہے مگر اس میں اور شاعران
مذکورۂ بالا میں ایک خاص امتیاز ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع بھی وہی
ہے جو دوسروں کا تھا یعنی ایتھنز اور یونانیوں کے سورماؤں کے کمالات۔
مگر نہ تو اے سی کلیس کی طرح اس میں حسن اعتقاد یا صوفیانہ رنگ ہے نہ
سوفوکلیس کی طرح حسن پرستی میں محو رہتا ہے۔ اس کی ذات سے یونان
کی شاعری میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس میں ارتیاب، نکتہ چینی،
بداعتقادی کا رنگ غالب ہے۔ عورتوں اور غلاموں پر جو مظالم ہوتے تھے
اس کے دل پر خاص اثر ہوتا ہے۔ اس کی یہ انقلابی تعلیم اسکی ممتاز خصوصیت
ہے اور اسی کے سبب سے اس کے کمال شاعری کے متعلق متضاد آرا ہیں۔
آرسٹوفینس کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ جس طریقہ پر اس نے طربیہ ناٹک
لکھیں ان کا رنگ زمانۂ ماسبق کی طربیات سے بالکل جداگانہ ہے اور
باوجود مسخراپن اور بذلہ سنجی کی حد کر دینے کے شعر گوئی میں اس نے کمال

دکھایا ہے۔ اگر شیکسپیئر بھی کرہمس میں دکھانے کے لئے کوئی تماشہ لکھتا تو غالباً وہ اسی شاعر کے رنگ میں ہوتا۔

یہ تمام مصنف شاعر تھے اور بحر و قافیہ کے پابند تھے مگر یورپ میں اسی عہد میں نثاری کا آغاز ہو چکا تھا ان مصنفین میں اولیں ہیروڈوٹس تھا یہ ایشیائے کوچک کا رہنے والا تھا مگر اس کی تمام عمر ایتھنز میں گزری۔ ہیروڈوٹس کی مایہ ناز تصنیف جنگ ایران کی تاریخ ہے مگر اس میں اس نے نہ صرف یونان بلکہ ایران لیڈیا اور مصر کا بھی تذکرہ کیا ہے تخیل یونانی کی تاریخ میں اس تصنیف سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ پہلے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی دور از قیاس واقعات کو بھی روایتاً بیان کر دیتا ہے۔ فوق العادت واقعات میں بھی اس کو شک نہیں ہوتا۔ گو زمانۂ حال میں جن اصول پر تاریخ لکھی جاتی ہے اس کے اصل اصول اس کی تصنیف میں موجود ہیں کیونکہ وہ کوشش کرتا ہے کہ واقعات کے تہ تک پہنچ جائے اور مختلف راویوں کی شہادت کو وزن کرتا ہے گو اس میں اس کو کامیابی کم ہوتی ہے۔ اور دوسرا مورخ تھوسی ڈیڈس بظاہر بہت بعد کا معلوم ہوتا ہے گو واقعہ یہ ہے کہ دونوں ہمعصر تھے تھوسی ڈیڈس نے جنگ پیلوپونیس کی تاریخ لکھی ہے جس کا ذکر آئندہ آئیگا۔ اس کا شمار یونان کے ممتاز اہل کمال میں ہے اور اس کی تاریخ کا سلاست بیان میں کوئی جواب نہیں۔ گراسی میں اس کا کمال نہیں کیونکہ سیاسی اور تمدنی فلسفہ کا آغاز بھی اسی کی تصنیف سے ہوا۔ جس مہیب جنگ کی تاریخ اس نے لکھی ہے اس جنگ کا کوئی عمدہ نتیجہ تھا تو اس کی یہ تحریر تھی۔

سائنس اور فلسفہ کو بھی اس دور میں نمایاں ترقی ہوئی علوم طبعیات کی ابتدا ایشیائے کوچک میں ہوئی اور طالیس ساکن ملیٹس پہلا مہندس خیال کیا جاتا ہے۔ طالیس اور اس کے جانشینوں نے قدرت کا مطالعہ شروع کیا اور مناظر قدرت کے اسباب و علل پر غور کیا اس سے قبل رموز فطرت کا دارومدار دیوتاؤں اور دیویوں پر تھا۔ علم ہندسہ کے علاوہ ان فلسفیوں کے خیالات ہم کو عجیب اور لغو معلوم ہوتے ہیں مگر حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اس

تحقیق کی بنیاد ڈالی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ علم طبعی کی ترقی میں ایتھنز کا بہت کم حصہ ہے۔ مگر فلسفہ کی جو خدمت اس نے کی ہے اس میں کسی یونانی ریاست کو برتری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سقراط ایتھنز کا باشندہ تھا۔ سقراط ۴۶۹ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۹۹ ق م میں اپنے ہموطنوں کی جہالت اور اوہام پرستی کا شکار ہوا۔ اس لئے دور پیریکلیس میں اس کا بھی شمار ہو سکتا ہے۔ سقراط حق کا فدائی ہونے کے سبب سے حقیقی معنوں میں فلسفی تھا مگر اس کے ہمعصر خیال کرتے تھے کہ وہ اپنے زمانہ کی سائنس و فلسفہ پر معترض تھا۔ اپنے زمانہ کی تعلیم اور اپنے ہمسروں کے طرز روش کو وہ مخرب اخلاق اور بیہودہ خیال کرتا تھا۔ علوم طبعی کے شیدائیوں کے خیالات کا مذاق اڑاتا۔ حصول علم اس کا بھی مدعا تھا مگر جس علم کا وہ جویاں تھا اس کے خیال میں آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ دیوتاؤں کی فطرت کیا ہے۔ انسان کیا ہے اور وہ شے کیا ہے جس کے حصول کی اس کو کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کی تعلیم کا طریقہ بھی اس کے عقائد کی طرح انوکھا تھا۔ نہ اس کا کوئی مدرسہ تھا نہ اسے شاگردوں کی تلاش تھی۔ اس کی عادت تھی کہ ایتھنز کے چوک میں ہر شخص سے گفتگو کرتا اور اثنائے گفتگو میں اس سے نیکی، جرات، پاکبازی اور دوسری انسانی خصوصیات پر بحث کرتا۔ اور اگر اس مباحثہ میں اپنے متعلمین کو وہ واقعی تعلیم نہ دیتا تو کم از کم اتنا ان کے ذہن نشین کر دیتا جو روزمرہ کے الفاظ ان کی زبان پر ہیں ان کے مفہوم کے سمجھنے میں قاصر ہیں۔ عقائد کی تنقید میں وہ ادب اور بذلہ سنجی سے کام لیتا جس کی وجہ سے ایتھنز کے تمام سمجھ دار نوجوان اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اسی طرح اس نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی اور یورپی فلسفہ کی تاریخ میں کوئی فلسفی اس سے زیادہ ممتاز نہیں۔

اس دور کے فلسفہ اور فنون لطیفہ کی ترقی پر نظر غائر ڈالنا اس غرض سے ضروری ہے کہ بلاریب انھیں کے سبب سے یونان کا سکہ یورپ کی تہذیب پر اب تک جما ہوا ہے۔ دنیا کی بہت سی اقوام یونان سے فنون

حکمرانی اور نبرد آزمائی میں سبقت لیگئی ہیں مگر دنیا کی کسی قوم نے دنیا کے علوم وفنون میں اس قدر قابل قدر اضافہ نہیں کیا ہے اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ انکے کمالات کا خاتمہ اسی پر نہیں ہے کہ جو کچھ کر گئے بلکہ انھوں نے آیندہ ترقی کا دروازہ کھول کر زمانہ حال کی ترقیات کی بنیاد ڈالی۔

باب پنجم

ایتھنز کا زوال اور احیاء

۴۴۵ قم کی صلح میں یہ مصلحت مضمر تھی کہ ریاست ہائے یونان کے مستقل اتحاد کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ مگر یونانیوں کے جذبات کا قابو میں لانا دشوار تھا اور اس کے علاوہ باہمی حسد کی وجہ سے صلح دیرپا نہ ہو سکتی تھی اور نہ کسی بیرونی دشمن کا خطرہ تھا۔ ایران کی قوت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور مقدونیہ کا ستارہ اس وقت تک چمکا نہ تھا۔ سی سالہ صلح کے دس ہی سال بعد جنگ پیلوپونیس شروع ہوئی جس نے یونان کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔

اس جنگ کے اسباب بدیہی ہیں۔ "توازن قوت" جس پر اب یورپ کی سلطنتیں عمل پیرا ہیں اسکا اس زمانہ میں بھی احساس ہو چلا تھا گو اسکے لئے کوئی خاص نام نہ تھا۔ یونانی سلطنتیں ہمیشہ کسی ایسی سلطنت کے خلاف میں متحد ہو جاتیں جسکی طاقت سے انکی آزادی معرض خطر میں ہوتی۔ ایتھنز کی طرف سے اس امر کا خدشہ پیدا ہو چلا تھا گو سرزمین یونان اور مصر میں اسے شکست ہو چکی تھی۔ اسکی سلطنت کا رقبہ یونانیوں کے خیالات کے مطابق ضرورت سے زیادہ وسیع تھا اور اس رقبہ پر اس کی حکومت جابرانہ تھی۔ اس کی تجارت میں روز افزوں ترقی ہو رہی تھی۔ پائرس بحیرۂ ایجین میں سب سے بڑا بندرگاہ ہو گیا تھا اور تجار اطراف و اکناف سے آکر وہاں آباد ہو رہے تھے۔ اس کی بحری اور بری تیاریوں کی وجہ سے اہل اسپارٹا خائف تھے اور تجارتی سرگرمی سے اہل کورنتھ خار کھاتے تھے، بلکہ ان کو خوف تھا کہ ایتھنز کے سبب سے

تجارت بالکل مندی نہ پڑ جائے کیونکہ مشرق میں سلامس اور اے جی نا ایتھنز کے قبضہ میں تھے جس سے کورنتھ کو اندیشہ تھا کہ اپنے زبردست بیڑے کی مدد سے ایتھنز جب چاہے اس کی تجارت کو برباد کر سکتا ہے۔

مغرب میں بھی ایتھنز نے اسپارٹا کے باغی غلاموں کی ایک نوآبادی ناپاکٹس میں بسادی تھی۔ یہ مقام خلیج کورنتھ کے تنگ ترین حصہ میں واقع تھا جس کے سبب سے اس کے حکام کو خلیج کورنتھ میں جہاز رانی بند کر دینے کا ویسا ہی موقع حاصل تھا جیسا کہ انگلینڈ کو جبرالٹر کے قبضہ سے بحیرۂ روم میں تفوق حاصل ہے۔ ایتھنز کی سلطنت وسیع تھی مگر اس کے پر جوش باشندوں کی اولوالعزمی اس وسعت کو بھی ہیچ خیال کرتی تھی۔ صقالیہ (سسلی) اور جنوبی اطالیہ کی یونانی نوآبادیاں دولت مند ہونے کے علاوہ ان کی تجارت بر سر ترقی تھی اس لئے بہت سے ایتھنیوں کا خیال تھا کہ ان کو بھی اتحاد ایتھنز کے جال میں پھانس لیا جائے۔ یونان کی تاریخ بھی چھوٹے پیمانہ پر یورپ کی تاریخ ہے اور اکثر یورپین جنگوں کے اسباب بھی وہی تھے جو اس یونانی محاربۂ عظمے کے تھے۔ کورسیرا شہر کورنتھ کی ایک نوآبادی تھی مگر آپس میں کچھ ناچاقی ہو گئی جس کے سبب سے اہل کورسیرا نے اتحاد ایتھنز میں شرکت کی درخواست کی تا کہ کورنتھ کی آتش غضب کے شکار نہ ہو جائیں۔ کورسیرا کے اتحاد ایتھنز کی شرکت میں سی سالہ صلح کی شرائط میں سے کوئی شرط مانع نہ تھی مگر اہل ایتھنز یہ خوب جانتے تھے کہ اگر کورسیرا ان کے اتحاد میں داخل کر لیا گیا تو اس کا نتیجہ خانہ جنگی ہو گا اس لئے یہ معاملہ مدت تک زیر غور رہا مگر آخر کار ایتھنیوں نے کورسیرا کو اپنا حلیف بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ آتش جنگ مشتعل ہو گئی۔ کورنتھ نے اسپارٹا سے امداد کی درخواست کی۔ ایک مدت تک سفارتی گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا مگر مصرع "دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا" اس لئے بالآخر ۴۳۱ سنہ ق م میں جنگ شروع ہو گئی جو جنگ پیلوپونیس کے نام سے مشہور ہے۔ دنیا میں شاید ہی کسی اور جنگ کی تاریخ اس سے زیادہ شد و مد سے لکھی گئی ہو کیونکہ اس کا مصنف تھوسی دیدس ایتھنی بحیثیت

جنگ پیلو پونی شین میں یونانی تقسیم
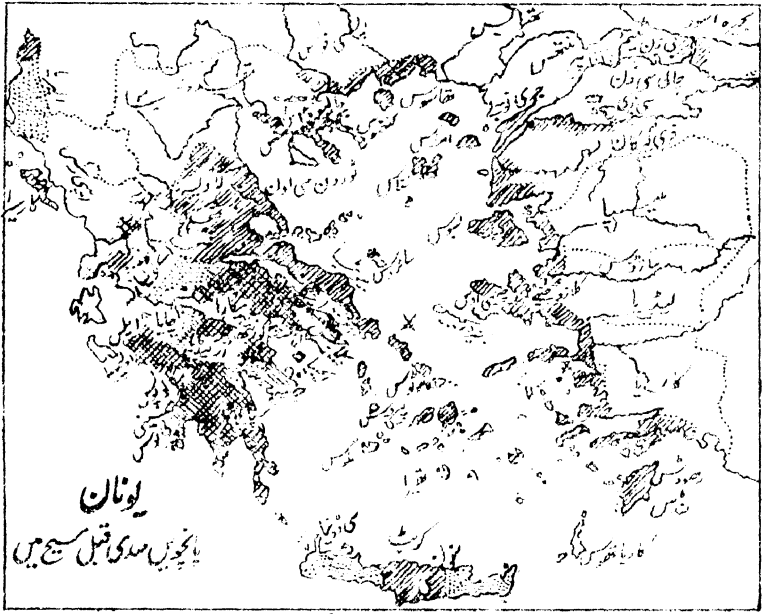
غیر جانب ملکتیں — اسپارٹا اور اتحادی — ایتھنز اور اتحادی

یونان پانچویں صدی قبل مسیح میں

ایک افسر کے اس جنگ میں شریک تھا کسی بحری جنگ میں اسے ناکامی ہوئی جس کے سبب سے اپنے محبوب وطن سے خارج کر دیا گیا اور بقیۃ العمر اس نے اپنے دشمنوں میں گزاری شرکت جنگ کے سبب سے اسے واقعات سے واقف ہونے کے نادر ذرائع حاصل تھے جس سے دوسرے مورخین بہرہ مند نہیں ہو سکتے تھے۔ اس واقفیت کے علاوہ اس میں دوسرے محاسن بھی موجود تھے مثلاً عمق نظر، بے لوث غیر جانب داری، اور پر اثر طرز تحریر جس کی وجہ سے اس کی تصنیف دنیا کی بہترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے اور فلسفۂ تاریخ میں اس تحریر سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ایتھنز میں اُس وقت میں جمہوری سلطنت قائم تھی مگر بقول تھوسی دیدس یہ صرف ظاہری صورت تھی مگر اصل میں پیرکلس بلا شرکت غیرے سلطنت ایتھنز پر حکمران تھا۔ اس جنگ اور دشمنوں کی کثرت سے پیرکلس ہراساں نہ ہوا کیونکہ وہ اسکو ال خیال کرتا تھا اور اسے یہ بھی امید تھی کہ آخر میں ایتھنز ہی کو فتح نصیب ہوگی۔ اسے یہ خوب معلوم تھا کہ ایتھنز کی بری فوج اس قدر زبردست نہ تھی کہ وہ اسپارٹا کی جری اور باقاعدہ فوجوں کا مقابلہ کر سکے مگر ایتھنز کی فصیلوں کی مضبوطی پر اسے کامل اعتماد تھا۔

اس کے علاوہ ایتھنز کی بحری فوج نہایت زبردست تھی اور اس کے پاس زر و مال بھی اسپارٹا سے بہت زیادہ تھا پیرکلس نے مدافعتی جنگ کا مشورہ دیا کہ اسپارٹا والے تھک کر صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر اس مشورے پر ایتھینی سختی کے ساتھ کاربند ہوتے تو ممکن تھا کہ پھر صلح ہو جاتی۔ مدافعتی جنگ سے نہ فیصلہ کن فتوحات کی امید ہو سکتی اور نہ مختلف فیہ مسائل کے تصفیہ کی۔ جنگ کے ابتدائی زمانے میں کوئی نتیجہ خیز لڑائی نہیں ہوئی۔ ۴۳۱ اور ۴۳۰ ق م میں اسپارٹا اور اس کے حلفا افواج کثیر کے ساتھ اٹیکا میں داخل ہوئے مگر ایتھینی اپنی فصیلوں کے اندر گھس آئے اور اسپارٹا والوں کو بلا مزاحمت اپنی زراعت برباد کرنے دی اور خود بحری محاربات سے اہل اسپارٹا کو پریشان کرتے رہے مگر اس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔

بد قسمتی سے ۴۳۰ء میں ایتھنز کو ایک ایسی بلائے بے درماں سے پالا پڑا جو اسپارٹا سے زیادہ مہیب تھی۔ اس کی فصیلوں کے اندر مرض طاعون پھیل گیا اور چونکہ دیہات کے باشندوں کے آجانے سے آبادی حد درجہ گنجان ہو گئی تھی اس لئے ہزاروں آدمی اس بلا کی نذر ہوئے جس سے ایتھنیوں میں ایک عام پریشانی پھیل گئی۔ مگر مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی پیریکلس کو بھی طاعون ہو گیا تھا مگر اس سے صحت پا کر اس نے کسی معمولی سی بیماری میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ایتھنیوں کی امیدوں کا دارومدار اسی کی ذات پر تھا کیونکہ اس کے سوا ان میں کوئی شخص ایسا موجود نہ تھا جو اس کا معتمد علیہ ہونے کے علاوہ ایتھنز کی عظمت کو بھی برقرار رکھ سکتا۔ مجالس ایکلیزیا کو ایک موقر مشیر کی ضرورت تھی۔ اس مجلس میں بہ حیثیت مجموعی جرات، حب وطن، اور استقلال کی کمی نہ تھی مگر بغیر کسی ہادی اور رہبر کے قومی اندیشہ تھا کہ فوری جوش میں بلا کافی غور و خوض کے کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھے جس سے بعد میں پشیمانی ہو۔ جنگ کا سلسلہ برسوں جاری رہا جس میں بہت سے جوش افزا محاربات ہوئے مگر کوئی فیصلہ کن ثابت نہ ہوا۔ اکثر واقعات جن کا ذکر تھوسی دیدوس نے بڑے شد و مد سے کیا ہے فی الحقیقت نہایت ہی خفیف تھے۔ ۴۲۵ء میں ایتھنز کے بیڑے نے دو تین سو اسپارٹا کے سپاہی پیلوپونیس کے سواحل پر گرفتار کر لیے۔ اسپارٹا میں احرار کی تعداد اس قدر کم تھی کہ دو سو سپاہیوں کے گرفتار ہو جانے سے ایک عرصہ کے لئے جنگ کا خاتمہ ہو جاتا۔ مگر اس کامیابی سے ایتھنیوں کا دماغ پھر گیا اور چونکہ صلح انھیں کسی طرح منظور نہ تھی۔ اس لئے جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ ۴۲۴ ق م میں اسپارٹی جنرل براسی ڈاس ایک چھوٹی سی فوج لیکر چالسی ڈس پہنچ گیا جو بحیرۂ ایجین کے شمال میں واقع ہے۔ اسپارٹا کی افواج کے لئے ان کا اس دور دراز مقام تک پہنچ جانا اور ایتھنز کے خوفناک بیڑے سے کسی جگہ مڈبھیڑ نہ ہونا ان کے لئے بہت بڑی کامیابی تھی۔ ایتھنی محکوم ریاستوں پر جابرانہ حکومت نہ کرتے تھے مگر ان کی تالیف قلوب میں ایتھنیوں کو کامیابی نہ ہوئی اس لئے براسی ڈاس نے کچھ حکمت عملی اور کچھ ڈرا دھمکا کر اس شہر کے بہت سے باشندوں کو ملا لیا۔ ایتھنز کو اس جنگ میں

کچھ ایسا سخت دھکہ نہیں لگا تھا" اور اس لیے شمالی اضلاع میں اپنا رسوخ دوبارہ قایم کرنے کے لئے انھوں نے ایک عظیم الشان مہم کی تیاری شروع کردی۔ مگر اس فوج کو جو جمہوری لیڈر کلیون کے زیر کمان تھی ایم فی پولس میں شکست فاحش ہوئی۔ کلیون اور براسی ڈاس دونوں اس لڑائی میں کام آئے۔
دونوں فریق امتداد زمانہ کی وجہ سے جنگ سے عاجز آگئے تھے اور ۴۲۱ سنہ میں صلح اس شرط پر ہوگئی کہ ہر دو فریق اپنے اپنے فتوحات سے دست کش ہوں۔
چھ سال تک برائے نام صلح رہی مگر ایتھنز اور اسپارٹا کی روزافزوں رقابت سے تمام یونان میں ریشہ دوانیاں ہورہی تھیں۔ ایتھنز میں خود مختلف پارٹیوں میں آپس میں مخالفت تھی۔ قدامت پسندوں کا لیڈر نی کیاس تھا۔ پاکبازی اور ایمانداری کی وجہ سے اس کی بڑی عظمت تھی مگر اخلاقی جرات یا سیاسی فراست سے عاری تھا۔ عوام کا لیڈر السیابڈس تھا جو اپنے زمانہ میں یونانیوں میں نہایت ہی پرشوکت گزرا ہے۔ اپنے حسن صورت، خوش گوئی اور جنگی اور انتظامی قابلیت کی وجہ سے اس کے ید قدرت میں تھا کہ ایتھنز میں ایک نئی روح پھونک دے مگر ان محاسن پر نفسانیت اس قدر غالب تھی کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ایتھنز کی بربادی میں اس کا حصہ غالب ہے۔ اس نے پہلے کوشش کی کہ اہل پیلوپونیس کو اسپارٹا کے خلاف متحد کرے اور اس میں اس کو قدرے کامیابی ہوئی مگر اسپارٹا نے اتحادیوں کو میدان جنگ میں شکست فاحش دے کر اس اتحاد کو زیر و زبر کردیا۔ اس کے بعد السیابڈس نے ایک زیادہ اہم اور پرخطر مہم کا بیڑا اٹھایا۔ ایتھنز اور اسپارٹا کے محاربات میں اب تک کوئی فیصلہ کن جنگ نہیں ہوئی تھی۔ یہ امر تو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا تھا کہ ایتھنز کے سپاہی اسپارٹا کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے اور اسپارٹا والے کبھی ایتھنز کے بیڑے کے مقابلہ میں نہ آئے گویا کامیابی کے ساتھ ہر ریاست اپنے عنصر میں زبردست تھی۔
جنگ کی ابتدا سے متعدد بلند حوصلہ ایتھنیوں کو صقالیہ اور اطالیہ

میں اپنی فتوحات کے دائرہ کو وسعت دینے کی آرزو تھی کیونکہ وہاں کسی اسپارٹی جنرل کا براسی ڈس کی طرح خشکی کے راستہ سے پہونچنے کا خوف نہ تھا اور اگر صقالیہ اور جنوبی اطالیہ کے زرخیز علاقے سلطنت ایتھنز میں شامل کرلئے جاتے تو اسی کا پلہ بھاری رہتا۔ صقالیہ کی ریاستوں کے باہمی مناقشات سے ایتھنز کو مداخلت کا موقع مل گیا۔ السیبائڈس نے مشورہ دیا کہ ایک مہم بھیجی جائے جس کا ظاہر امنشا تو یہ تھا کہ ایک یونانی ریاست کو دوسرے کے خلاف امداد پہونچائی جائے مگر اصل میں صقالیہ کی فتح سے مقصود تھا۔

نی کیاس کی مخالفت کے باوجود مہم کی روانگی طے ہوگئی۔ تین جنرلوں (نی کیاس، السیبائڈس اور لاماکس) کے زیر کمان ایک زبردست فوج بھیجی گئی اس سے بھاری فوج کبھی ایتھنز نے میدان جنگ میں نہیں اتاری تھی اور ایتھنیوں کو امید قوی تھی کہ اس مہم میں کامیابی ہوگی۔ مگر صورت حالات سے ظاہر ہے کہ کامیابی کے قرائن کم تھے گو ایک حد تک اس ناکامیابی کے اسباب اتفاقی تھے۔ صقالیہ میں یونانیوں کی کثیر آبادی تھی جن کے حوصلے بلند تھے اور ان میں جوش مردانگی اب تک باقی تھا۔ نبرد آزمائی میں ایتھنی اکثر یونانی ریاستوں سے کمتر تھے اس لئے اس بات کی بہت کم امید تھی کہ وہ صقالیہ کی آبادی پر دواماً حکومت کرسکینگے خصوصاً اپنے زاد بوم سے اس قدر دور اور سیر اکیوس ایسی زبردست ریاست کے موجود ہوتے ہوئے۔

ایتھنیوں کو ابتدا ہی سے اس مہم میں ہزیمت کا سامنا ہوا کیونکہ صقالیوں کو نہ ان سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ وہ سیر اکیوز کے خلاف ان کی حمایت کرنے کی جرات کرسکتے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ دھاوا کرکے سیر اکیوز پر قبضہ کرلیتے مگر ایتھنی جنرلوں کے اختلاف آراء کی وجہ سے یہ موقع بھی نکل گیا۔ اس کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ السیبائڈس پر دیوتاؤں کی بے حرمتی کا الزام لگایا گیا اور ایتھنز میں جواب دہی کے لئے واپس بلایا گیا۔ ایتھنز جانا خلاف مصلحت جانکر اسپارٹا میں جاکر پناہ گزیں ہوا اور اپنے وطن کے دشمنوں کو اپنی خدمات پیش کردیں۔ اہل اسپارٹا نے کھلم کھلا اعلان جنگ کردیا ایک اسپارٹی

فوج روانا گا اٹیکا میں بمقام ڈی کی سیا قلعہ گزیں کر دی گئی اور کچھ سپاہی ایک اسپارٹی افسر کے زیر کمان صقالیہ بھیجد ئے گئے تاکہ ایتھنز کے مخالفین کی مدد کریں۔

اسپارٹا کی ان جوڑ بندیوں سے ایتھنی مہم کا قلع قمع ہوگیا جس کو تھوسی ڈیڈس کے زور قلم نے نہایت ہی دردانگیز فسانہ بنا دیا ہے۔ اسپارٹی جنرل گی لی پس کی آمد کے بعد ایتھنی فوج کی حالت اور بھی سقیم ہوگئی۔ نی کیاس امداد طلب کرنے پر مجبور ہوا۔ ایتھنز سے ایک امدادی فوج مقر ر ڈوسیاستھنیز کے زیر کمان بھیجی گئی مگر اس کا آنا بے سود تھا کیونکہ ایتھنز کا بیڑہ جس پر اس کا ناز تھا سیراکیوز کے بندرگاہ میں بند پڑے رہنے سے بیکار ہوگیا۔ ملاحوں میں مختلف امراض پھیل گئے تھے اور جہاز بیکار ہورہے تھے کیونکہ لکڑی کے جہاز اگر پانی سے وقتاً فوقتاً نکالے نہ جائیں اور صاف نہ کئے جائیں تو ان کے پیندے گل جاتے ہیں۔ سیراکیوز کے قریب ایک عظیم الشان بحری جنگ ہوئی جس میں ایتھنز کے بیڑے کو شکست فاش ہوئی اور بھاگ نکلنے کا موقع بھی نکل گیا۔ دونوں جنرلوں نے ہتیار ڈالدیئے مگر موت نے ان کو ذلت وخواری سے بچالیا۔

اگر اب اسپارٹا اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے تو غالباً جنگ کا خاتمہ ہوگیا ہوتا مگر بقول تھوسی ڈیڈس اہل اسپارٹا "آرام دہ" دشمن تھے یعنی سست اور بے ہمت مگر اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ قدیم سلطنتوں میں اور خصوصاً اسپارٹا کے پاس کوئی اندوختہ نہ تھا اور نہ جنگ کے لیے قومی قرضوں کے لینے کا اس وقت تک رواج ہوا تھا جن کا بار آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے اہل ایتھنز نے بڑی جرات اور عاقبت اندیشی سے کام لیا جس کی وجہ سے جنگ کا سلسلہ نو سال تک جاری رہا۔ اس جنگ کے آخری دور کی خصوصیت یہ ہے کہ ایران نے پھر یونانی سیاسیات میں دخل دینا شروع کیا۔ مگر اس سے یہ نہ خیال کیا جائے کہ اس کا سطوت وجبروت پھر قائم ہوگیا تھا یا اس نے کوئی فوج بھیجی بلکہ روپیہ سے مدد کرتا رہا۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرکز جنگ بجائے صقالیہ وغیرہ کے بحیرۂ باسفورس و بحر اسود میں ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایتھنز کو غلہ بحر اسود کے راستہ سے ملتا تھا۔ صقالیہ کی شکست کے بعد ایتھنز کی سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے یہانتک کہ جزیرۂ یوبیا بھی اس کے قبضے سے نکل گیا اور اگر اس کے جہاز بحر اسود سے غلہ نہ لاسکتے تو قحط کی وجہ سے مجبوراً اسے ہتیار ڈالدینا پڑتے جنگ کی صورت تو یہ تھی مگر اس اثنا میں ایتھنز کی فتحمندی کے آثار و قرائن پیدا ہوگئے تھے کیونکہ السیابڈز اسپارٹا سے بھی بیزار ہوگیا اور باوجود اس کی غداری کے ایتھنین س کو خوش آمدید کہنے پر تیار تھے کیونکہ ایک تو اس کی ٹکر کا آدمی کوئی ان میں نہ تھا اور دوسرے دربار ایران میں اس کا بڑا رسوخ تھا۔ ۴۱۰ سنہ میں اس کے زیر کمان ایتھنز کو اسپارٹا کی فوج اور بیڑے پر بمقام کائزی کس "ایک زبردست فتح حاصل ہوئی مگر اس جنگ کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ باوجود اس شاندار فتح کے ایتھنیوں کو اس پر اعتماد نہ ہوا۔ فوج کی کمان اس سے لے لی گئی اور اس وقت سے اس کا نام صفحۂ تاریخ سے ناپید ہوگیا۔ برخلاف اس کے اسپارٹا والوں میں ایک بڑا جنرل لائی سینڈر پیدا ہوگیا جس نے ایرانی شاہزادہ سائرس کے مزاج میں دخل پیدا کرکے ۴۰۵ سنہ ق م میں مقام ایگاس پوٹومی واقع بحر مرمرہ ایتھنی فوج اور بیڑے کو شکست فاش دے کر ان سے ہتیار رکھوا لئے۔ اس شکست سے ایتھنز کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے باشندوں میں تاب مقاومت باقی نہ رہی۔ فاتحین نے ایتھنز کا محاصرہ شروع کردیا اور ناگفتہ بہ مصائب جھیلنے کے بعد ایتھنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ان کے شہر کی دیواریں زمین دوز کردی گئیں جمہوریت زیر و زبر ہوگئی سلطنت کا تو پہلے ہی خاتمہ ہوگیا تھا اب ایتھنز کا مستقبل نہایت تاریک اور مایوس کن ہوگیا اور اندیشہ پیدا ہوگیا کہ اب اس کا شمار یونان کے درجۂ دوم کے شہروں میں ہوگا اور اس کی حیات و ممات بھی اب اسپارٹا کی مرضی پر مبنی رہے گی۔ مگر ۴۰۴ سنہ ق م میں اس کی خوش قسمتی سے اسباب ایسے پیدا ہوگئے جس سے اس ذلت و خواری کے بعد اس کی قسمت نے

ستارہ پھر چمکا گو سابقہ قوت اور عظمت اسے حاصل نہ ہوسکی مگر کم از کم آزادی جو دنیا میں سب سے قیمتی چیز ہے حاصل ہوگئی۔

ایتھنز کا احیاء

یونان کی ریاستوں کی باہمی رقابت ایک حد تک احیائے ایتھنز کا باعث ہوئی کیونکہ ان کے اتحاد کی بنیاد اس کی مخاصمت پر تھی اور جب ایتھنز کی حالت دگرگوں ہوگئی تو باہمی مناقشات پھر چھڑ گئے۔ اسپارٹا نے بھی مصلحت وقت سمجھ کر ایتھنز کو سنبھلنے میں مدد دی تاکہ کورنتھ اور تھیبس کے مقابلے کے وقت کوئی اس کا مددگار رہے۔ ایتھنز کی پہلی کامیابی یہ تھی کہ سلطنت جمہوری پھر قائم ہوگئی۔ اہل اسپارٹا نے ایتھنز میں سلطنت خواص قائم کردی تھی مگر اس جدید حکومت کے خلاف میں سخت بغاوت پیدا ہوگئی۔ دلدادگان جمہوریت کو اوائل میں فتوحات نصیب ہوئیں مگر بیرونی امداد کے بغیر ان کا اپنے مخالفین پر غلبہ پانا دشوار تھا۔ اس لئے اہل اسپارٹا نے پھر ایتھنز کے معاملات میں مداخلت کی اور دانشمندی سے خواص کی ناگوار حکومت کے بجائے جمہوریت پھر قائم کرادی۔ مگر ہم بیان کرچکے ہیں کہ ایتھنز کی دیواریں مسمار کردی گئی تھیں۔ اس کا بیڑا تباہ ہوگیا تھا۔ اس کے مقبوضات چھن گئے تھے اور بیرونی ریاستوں سے جملہ تعلقات منقطع ہوگئے تھے۔ تاہم اس کے اچھے دن پھر رہے تھے۔ اسپارٹا نے ایتھنز کو ایرانی امداد سے نیچا دکھایا تھا جس کی وجہ سے یونانی ایران کے دست نگر ہوگئے تھے مگر اسپارٹا کے بادشاہ ایجلاس کی غیور طبیعت نے اس کو گوارا نہ کیا اور اس نے اسپارٹا کی روایات کے برخلاف ایران پر حملہ کرنے کا قصد کیا ایران کی خلقی کمزوری اس سے قبل ثابت ہوچکی تھی۔ یونانیوں کی ایک جماعت تخت کے کسی ایرانی دعویدار کی امداد میں سلطنت ایران کے وسط تک پہنچ گئی تھی اور وہاں مقام بابل کے

قریب ایران کو شکست فاش دے کر اپنے سپہ سالار کے مرنے کے بعد صحیح و سالم ساحل تک پہنچ گئی اور ایرانی باوجود سخت کوشش کے ان کے ساحل تک پہنچ جانے میں مزاحم نہ ہو سکے۔ اگر ایجلاس کو اس مہم میں کامیابی نصیب ہوتی تو دونوں ملکوں کی تاریخ میں انقلاب عظیم ہو گیا ہوتا۔ مگر اس سے ایشیائے کوچک تک پہنچتے ہی یونان میں اسپارٹا کے خلاف بغاوت ہو گئی جس کا باعث کچھ تو اسپارٹا سے منافرت اور کچھ ایرانی رشوت تھی۔ اس بغاوت کے فرو کرنے میں اہل اسپارٹا کو ناکامی ہوئی اور ایجلاس کو واپس بلانے پر مجبور ہوئے جب کہ وہ ایران پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا اپنے وطن مالوف کے حکم پر اس نے سر تسلیم خم کیا اور اس کے آتے ہی جنگ کا رخ بدل گیا۔ اس کے بعد بھی یونان میں چھیڑ چھاڑ جاری رہی مگر اس میں صرف ایک واقعہ قابل تحریر ہے۔ اسپارٹا کے خلاف جو عام بدولی پیدا ہو گئی تھی اس سے نفع اٹھا کر ایران نے اس پر سمندر کی راہ سے حملہ کرنے کا قصد کیا ایرانی بیڑہ کا امیر البحر کانن باشندۂ ایتھنز تھا۔ اسپارٹا کے بیڑہ کو نائڈس واقع ساحل ایشیائے کوچک میں شکست ہوئی اور فتحمند کانن ایرانی جہازوں کا بیڑہ لے کر ایتھنز کے بندرگاہ میں آ کر لنگر انداز ہوا۔ مگر ایرانی جنگ سلامس کا بدلہ لینے نہیں آئے تھے۔ ایتھنز کو انھوں نے اسپارٹا کے مقابلہ میں اپنا حلیف بنا لیا اور ایتھنز کی فصیلیں اب پھر بنائی گئیں جس سے جنگ پیلوپونیس سے جو نقصانات اس کو پہنچے تھے ان کی تلافی ہو گئی ایتھنیوں کی بحری قوت پھر چمک گئی جس کے سبب سے وہ اسپارٹا سی سلطنت کا مقابلہ کر سکتے تھے جسکی قوت خشکی میں محدود تھی۔ یونانی سیاسیات میں ایتھنز کو پھر کبھی سیادت حاصل نہیں ہوئی مگر اتنا ہو گیا کہ دو تین سر برآوردہ ریاستوں میں اسکا بھی شمار تھا اسکے مقبوضات جو اسکے قبضہ سے نکل گئے انہیں سے بعض پر اسکا پھر تسلط ہو گیا مگر باوجود اسکے کہ اسکے اہل الرائے گزشتہ غلطیوں میں پھر پڑنے سے بچتے رہے اور اپنے حلفا سے موانست و مودت کا برتاؤ کرتے رہے مگر یونانی ریاستوں میں اتحاد پیدا ہونا دشوار تھا اور اسی سے ایتھنز کے جدید مقبوضات سے اسکا تسلط جلد اٹھ گیا۔

یونان کی آزادی کا خاتمہ

جنگ پیلوپونیسس کے بعد یونان کی سیاسی اور جنگی کارناموں میں دلچسپی باقی نہیں رہی گو یونان میں اس دور کے بعد بھی بڑے بڑے اہل الرائے مقرر اور سپہ سالار پیدا ہوئے مگر ان کے کارناموں کا یورپ کے مستقبل پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ یونان کی تمام ریاستیں ایک دوسرے کے مخالف تھیں، اتحاد کے امکان کا ذرا سا شائبہ نہ تھا اور نہ کوئی سلطنت اتنی قوی تھی کہ دوسروں کو جبراً اپنا ہم خیال بنا سکے۔ اس دور کے سیاسی مناقشوں یا جنگوں سے کوئی نتیجہ نہ تھا سوا اس کے کہ مقدونیہ کی نوخیز سلطنت کی قوت کو استحکام ہوا اور یونان میں اس کا اثر بڑھتا رہا۔ مگر اس زمانۂ انحطاط میں بھی فنون لطیفہ، ادبیات سائنس اور فلسفہ کی ترقی رک نہ سکی۔ اس کا ذکر آئندہ آئیگا۔ فی الحال اس بدنصیب ملک کی تاریخ کا مختصر سا خاکہ جنگ کیرونیا (۳۳۸ ق م) تک پیش کرینگے جب کہ اس کی آزادی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

ایتھنز کے زوال کے بعد اسپارٹا کا دور دورہ شروع ہوا کیونکہ کسی دوسری ریاست نے ایتھنز کی طرح اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کیا۔ یونان کی دوسری ریاستیں ایسی بے بسی کی حالت میں تھیں کہ اندیشہ تھا کہ سب اس کی نذر ہو جائینگی۔ اگر اس کے شہریوں میں سیاست اور تدبر ہوتا اور اس کے قومی خصائل میں وہ نقائص نہ ہوتے جن کا متعدد مرتبہ ذکر ہو چکا ہے تو بہت ممکن ہے یونان میں اسکے ذریعہ سے وہی اتحاد پیدا ہوتا جو زمانۂ مابعد میں روما کے طفیل اطالیہ میں ہوا تھا مگر

اہل اسپارٹا اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اُن کی قدامت پسندی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ فنون سپہگری کے سوا کسی اور فن میں مہارت پیدا کرنا ان کے لئے باعث عار تھا۔ غیروں کے ساتھ نہ انھیں ہمدردی تھی اور نہ محبت آزاد شہریوں کی تعداد قلیل تھی کیونکہ انھوں نے غیر ملکیوں کو شہریت کے حقوق نہیں دئے تھے۔ وجوہ مندرجۂ بالا کے سبب سے ان کی سلطنت ایتھنز سے بھی کم دیرپا ثابت ہوئی۔

گزشتہ باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایجلاس بادشاہ اسپارٹا ایران پر یورش کرنے کی غرض سے ایشیائے کوچک تک پہنچ گیا تھا اور اسے خود یونان میں اسپارٹا کے خلاف بغاوت ہو جانے کے باعث واپس ہونا پڑا تھا۔ اس بغاوت کے اسباب ظاہر ہیں۔ یونان کی تمام ریاستیں آزادی کی دلدادہ تھیں اور اسپارٹا کی جابرانہ سیادت انھیں ناگوار تھی۔ اس لئے تھیبس، آرگوس اور کورنتھ اس کے خلاف متحد ہو گئے اور ایتھنز بھی جلد اس اتحاد میں شریک ہو گیا۔ مگر اسپارٹا کی قومی طاقت اب بھی بے مثل تھی اور ایجلاس کی واپسی کے قبل بھی صاف ظاہر تھا کہ متحدین اسپارٹا کے مدمقابل نہیں۔ ایجلاس اور اس کی فوج کی واپسی سے اس کی فتح میں کوئی شک نہیں رہا۔ مگر اہل اسپارٹا کو اپنے دشمنوں کو جنگ میں نیچا دکھا سکتے تھے مگر بغیر کسی بیرونی امداد کے یہ ممکن نہ تھا کہ ان سے ہتیار رکھا لیتے اس لئے انھوں نے ایک عجیب وغریب حرکت کی۔ اہل اسپارٹا کو اپنے حب وطن پر ناز تھا اور اپنی ان نادر خدمات پر جو ایران کی جنگ عظیم کے دوران میں انھوں نے انجام دی تھیں اور اس وقت بھی وہ ایران ہی کے خلاف برسرپیکار تھے۔ مگر آخر کار وہ ایران ہی سے مدد کے طالب ہوئے۔ شاہ ایران کو رقمی اور فوجی امداد کے معاوضہ میں انھوں نے ان یونانی شہروں کے حوالہ کر دینے کا وعدہ کیا جن کو اس جنگ عظیم میں ایران کے جوے سے نجات ملی تھی۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ یونان کی ریاستوں پر اس جنگ کے بعد ایران من مانی شرائط عائد کرے۔ بظاہر شرائط یہ تھیں کہ تمام ریاستیں آزاد رہیں اور تمام اتحاد توڑ دئے جائیں مگر اس کی اصل غایت یہ تھی کہ اسپارٹا کی سیادت پھر قائم ہو جائے کیونکہ جس اتحاد میں وہ خود شریک تھا وہ قائم رہا اور برخلاف اس کے دوسرے اتحاد توڑ دئے گئے۔ اس جدید انتظام کی شرائط

سے شہنشاہ ایران کے فرمان کے ذریعہ سے یونان کی تمام ریاستوں کو اطلاع دیگئی اور سب کو بلا چون وچرا سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس صلح کو "صلح بادشاہی" کہتے ہیں جس کی وجہ سے تمام یونان پھر ایران کا حلقہ بگوش ہو گیا اور سلامس اور پلاٹیا کے بعد ایران کو جو زک ہوئی تھی اس کا داغ دھلگیا۔

اسپارٹا کو اس ملت فروشی کے عوض میں اپنے حریفوں پر غلبہ ہو گیا اور مخالفت ایک دم نابید ہو گئی ریاست تھیبس اس کے حریفوں میں سربرآوردہ تھی اور اس کے قلع قمع کرنے میں اہل اسپارٹا نے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ اولاً بلدہ ہائے واقع ضلع بوایشیا کی سیر کردگی سے تھیبس معزول کیا گیا اور ثانیاً ایام صلح میں سخت دغابازی سے تھیبس کے قلعہ کو فتح کرکے اس میں اپنی فوج ڈالدی ۳۸۲ق‌م میں اسپارٹا کا طالع اقبال نصف النہار پر پہنچ گیا مگر ملت فروشی کی سزا اسے جلد ملی ۳۷۹ق‌م میں تھیبس میں بغاوت ہو گئی اسپارٹی فوج کے عہدہ دار مار ڈالے گئے اور شہر تھیبس دوبارہ آزاد ہو گیا۔ اس شورش کی وجہ سے پھر خانہ جنگی شروع ہوئی جس میں کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں۔ ایتھنیوں نے تھیبس کی کچھ دستگیری کی اور اسپارٹا نے کئی بار تھیبس کے علاقہ کو تباہ و برباد کر دیا مگر اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوا آخرکار ایتھنیوں نے جنگ سے تنگ آکر صلح کی تحریک کی اور "صلح بادشاہی" کے شرائط پر جنگ کے اختتام پر اپنی آمادگی ظاہر کی مگر اہل تھیبس اب اڑ گئے کہ جب تک بوائیشیا پر ہماری سیادت تسلیم نہ کیجائے ہم جنگ سے باز نہ آئینگے۔ اسپارٹا والوں نے اس موقع کو غنیمت جانا کہ ایتھنز اور دوسری ریاستوں سے علیحدہ ہو جانے سے تھیبس کا جلد قلع قمع کر دینگے۔ مگر تمام قیاسات کے برخلاف اہل تھیبس نے بے مثال استقلال دکھایا۔

یونان میں وہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ ایرانی جنگ میں وہ الگ تھلگ رہے تھے اور عموماً وہاں کے لوگ بے حس اور کم عقل خیال کئے جاتے۔ مگر ان میں ایک نئی تحریک پیدا ہو گئی تھی اور خوش قسمتی سے ان میں اس زمانے میں دو مدبر پلی لوپڈاس اور اے پامی نون ڈاس موجود تھے۔ باوجود ان عیوب کے اہل تھیبس جری سپاہی تھے۔ جنگ پیلوپونیس میں انھوں نے

ایتھنیوں کو شکست دی تھی ابجلاس کے مقابلے میں انھوں نے بہادری کا ثبوت دیا تھا
اور یونانیوں کی رسم کے خلاف جنگ میں ان کی صفیں کھڑی
ہوئی تھیں۔ مگر باوجود ان خوبیوں کے کسی کو امید نہ تھی کہ تن تنہا وہ اسپارٹا کا مقابلہ
کرسکیں گے۔ لیکن جب شاہ اسپارٹا اپنی فوج جرار لے کر بوائے شیا میں داخل ہوا تو
اس نے تھیبس کی فوج کو مقابلہ پر تیار پایا۔ ان کے سپہ سالار اے پامی نونڈاس
نے فوج کو ایک جدید طریقہ سے صف آرا کیا تھا جس کا یونانیوں کو تجربہ نہیں تھا۔
ان میں یہ قاعدہ تھا کہ فوج کو طویل صفوں میں صف بستہ کرتے اور ہر جانب کے
سپاہی ایک ہی وقت میں لڑائی میں شریک ہوتے مگر اے پامی نونڈاس نے
قلب لشکر اور میمنہ کو پیچھے رکھا اور میسرہ کو اسپارٹی فوج کے میمنہ پر ڈالدیا۔
اہل تھیبس کی فتح قطعی تھی (۳۷۱ ق م) شاہ اسپارٹا میدان جنگ میں کام آیا
اور اس کے سپاہی جانبازی اور بہادری سے لڑے مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور
اور اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسپارٹا کی فوج کو شکست قطعی نصیب ہوئی اور اسکے
بعد اہل اسپارٹا پھر نہ سنبھلے کیونکہ ایتھنیوں کی طرح ان میں سنبھلنے کا مادہ نہ تھا۔
بادمخالف کے ایک ہی جھونکے سے اسپارٹا کی عظمت کا خاتمہ ہوگیا اور یونان
سے اس کا اقتدار ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

لیکن یونان کے منتشر اجزا کو جمع کرنا ایک دشوار کام تھا جس میں اسپارٹا
اور ایتھنز کو ناکامی ہوچکی تھی اس لئے تھیبس کا اس میں کامیاب ہونا مشکل تھا۔
اتحاد کی دو صورتیں تھیں یا تو کوئی ریاست اس قدر طاقتور ہو جائے کہ
دوسروں کو جبراً اپنی پالیسی پر چلائے یا ترغیب و تحریص سے اپنا ہمخیال بنالے
تھیبس کی تمام امیدیں صرف ایک شخص اے پامی نونڈاس پر منحصر تھیں جو سپہگری
اور تدبیر مملکت دونوں میں یکتائے زمانہ تھا۔ لیکن اس کو اس مہم عظیم میں ناکامی
ہوئی کیونکہ یہ کام ایک شخص کے بس کا نہ تھا خصوصاً جب کہ اس کا اقتدار ایک ہی
ریاست تک محدود ہو اور صرف اسی کی فوج سے کام لے سکتا ہو۔ اس میں شک
نہیں کہ اس کے برابر یونان میں کسی شخص کو اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ اے پامی نونڈاس
ایک عظیم فوج لے کر پیلوپونیس میں داخل ہوا اور اہل اسپارٹا چوں بھی نہ کرسکے۔

اس کا قصد صرف یہ نہ تھا کہ اسپارٹا کا غرور توڑ دے بلکہ ان اقوام کو آزادی دلائے جو مدت سے اسپارٹا کے جور و ستم کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں۔ اسپارٹا کے شمال میں آرکاڈیا تھا جس میں کسی شہر کی اب تک بنیاد نہیں پڑی تھی۔ شہر میگالوپولیس قائم کر کے اے پامی نونڈاس نے اس کو آرکاڈیا کا دارالسلطنت قرار دے دیا۔ اس کے بعد میسنیا میں داخل ہو کر اس نے وہاں کے باشندوں کو بھی آزاد کرایا جنکی آزادی عرصۂ دراز سے اسپارٹیوں نے سلب کر لی تھی اور ان کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔ شہر میسینیا کا قیام بھی اسی کی کوشش سے ہوا۔ یونان کی اکثر شہری ریاستوں نے اس کی اس مہم میں مدد کی۔ مگر افسوس کہ آتش رشک و حسد پھر مشتعل ہو گئی کیونکہ ایتھنز کی طرح تھیبس کی سیادت بھی اہل یونان کو ناگوار خاطر تھی گو ایک عرصہ تک تھیبس کی فتوحات کا سلسلہ کوئی روک نہ سکا اور اس کی اولوالعزمی کے سبب سے یونان کا اثر ان اضلاع میں بھی پہنچ گیا جہاں اب تک نہ پہنچا تھا تھسالیا کی بدانتظامی کو بھی اس نے رفع کیا۔ مقدونیہ میں خانہ جنگی ہو رہی تھی اس لئے وہاں بھی اہل تھیبس نے مداخلت کی اور وہاں کے ایک شاہزادہ کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس شاہزادہ کا نام فلپ (فیلقوس) تھا جو بعد تخت نشینی فلپ اعظم کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کی حکومت پر جس سے یونان اور یونان کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے تھیبس کے قیام کا نمایاں اثر ہوا ہے۔ مگر تھیبس کی سیادت کا بھی جلد خاتمہ ہو گیا ۳۶۲ قم میں اہل اسپارٹا، ایتھنز اور چند اور ریاستیں تھیبس کے خلاف متحد ہو گئیں اور پیلوپونیسس میں اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئیں اس لئے اے پامی نونڈاس پھر پیلوپونیسس میں داخل ہوا اور باوجود مخالفوں کی کثرت کے اپنی عمدہ فوج کے سبب سے اس کو فتح ہوئی۔ مگر افسوس ہے کہ اس جنگ میں وہ خود بھی کام آیا اور چونکہ اس کے ہمقوموں میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا لہذا اس کی زندگی کے ساتھ تھیبس کی چند روزہ سیادت کا خاتمہ ہو گیا اور پھر اس کا شمار چھوٹی ریاستوں میں ہونے لگا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کام کا اس نے بیڑا اٹھایا تھا اس کی قوت سے کہیں زیادہ تھا اور اس کے مدبروں میں کوئی

اب نہ تھا جو اس کی تدبیروں کو بار آور کر سکتا۔

۳۶۲ سے ۳۳۸ ق م تک یونانی ریاستوں میں سیادت کا کوئی دعویدار نہ ہوا مگر اس اثنا میں یونان کی شمالی سرحد پر ایک نئی قوت کے اقبال کا ستارہ چمکا جو سلطنت مقدونیہ کے نام سے مشہور ہوئی اور جس کو رفتہ رفتہ یونان کے سیاسی معاملات میں روز افزوں دخل ہوتا گیا اور بالآخر تمام یونان اس کا دست نگر ہو گیا۔ یونانی مقدونیوں کو وحشی کہتے تھے اور مقدونیہ کے حملہ کو دارا اور زرکسیز کے حملوں کی طرح سمجھتے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یونانی خون کی آمیزش تھی اور ان کی زبان بھی بگڑی ہوئی یونانی بولی تھی۔ مقدونیہ کے خاندان شاہی کے یونانی نژاد ہونے پر اولمپیا کے کھیلوں میں بھی کبھی اعتراض نہیں کیا گیا تھا جس میں صرف یونانی الاصل لوگ شریک ہو سکتے تھے۔ مقدونی غیر ترقی یافتہ یونانی تھے۔ ان کی وہی حالت تھی جو زمانہ ہومر میں یونانیوں کی عام طور پر تھی۔ مقدونی کندہ ناتراش پہاڑی کاشتکار تھے۔ ان کے شہر تعداد میں کم اور چھوٹے چھوٹے تھے اور علوم و فنون کا ان میں بہت کم رواج تھا جن کے سبب سے جنوبی یونان کو اس قدر شہرت ہوئی تھی۔ سیاسی انقلابات اور بغاوتیں مقدونیہ میں بھی ہوئی تھیں مگر سلطنت شاہی اب تک قائم تھی اور اے یامی نونٹاس کی موت کے بعد اس کی بنیاد اور بھی مضبوط ہو گئی جب کہ فلپ (جو گرفتار ہو کر تھیبس گیا تھا) ۳۵۹ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے حالات جو کچھ ہمیں معلوم ہوئے ہیں ان کے ماخذ اس کے مخالف یونانی مورخوں اور مقرروں کی تحریرات ہیں مگر اتنا صاف ظاہر ہے کہ فلپ قابل اور ذہین ہونے کے علاوہ ایک جری اور بے مثل سپاہی تھا۔ تدبیر مملکت میں اسے خاص ملکہ تھا۔ سازش اور ریشہ دوانیوں میں یونانیوں سے کم نہ تھا اور میدان جنگ میں بھی پورے طور پر ان کا مدمقابل تھا۔ اس کی وفا شعار رعایا اسی کی طرح جری تھی۔ ان کے قوئے زبردست اور آپس میں اتحاد تھا جس کی وجہ سے فلپ کو اپنے تمام مہمات میں کامیابی اور فتح ہوئی

مقدونیہ کے مقابلہ میں یونان کی حالت نہایت ردی ہو رہی تھی۔ انحطاط کا لفظ تو ہم استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ فنون لطیفہ اور فلسفہ میں اس کی ترقی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ مگر مقدونیہ کی زبردست قوت کے مقابل میں اس کی آزادی کا بقا ذرا دشوار تھا کیونکہ کسی ریاست میں یہ صلاحیت باقی نہیں تھی کہ اس کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو پھر جمع کر سکتا یا کوئی مدبر اس بگڑے زمانہ میں اس کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتا۔ اتحاد کئی مرتبہ قائم ہوئے مگر ان کی غایت صرف یہ تھی کہ کسی زبردست سلطنت کی طاقت توڑ دی جائے۔ اس کے علاوہ ہر ریاست میں مخالف پارٹیاں تھیں اور ذاتی مفاد کے لئے قوم فروشی بھی جائز خیال کی جاتی تھی۔ کسی قوم یا کسی زمانہ کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ ایک طرح تو یونانیوں کا اخلاقی معیار بلند تر ہو رہا تھا۔ غلامی کی خرابیوں کا احساس ہونے لگا تھا اور قوم ہیلاس (یونانی) کے ایک قوم واحد ہونے، اس کی آزادی قائم رکھنے اور بیرونی دشمنوں سے اس کو محفوظ رکھنے کا بھی خیال پیدا ہو گیا تھا مگر افسوس ہے کہ "محاسن سیاسی" میں انحطاط تھا۔ اسپارٹا اور چند دوسرے علاقوں کے علاوہ جہاں کے باشندے کاشتکاری کرتے تھے، فوجی ملازمت سے لوگ جی چراتے تھے اور سلطنت کی حفاظت اکثر غیر ملکی اجیر سپاہیوں کے سپرد تھی اور ان فوجوں کے افسروں کا اقتدار بڑھ رہا تھا۔ کہ چودھویں صدی میں اٹلی میں بعینہ یہی حالت تھی۔ ایتھنز کے باشندے تعیش میں پڑ گئے تھے اور اپنا زیادہ تر وقت اور روپیہ تھیٹر میں صرف کرتے تھے۔ ڈیماس تھینیس وہاں کا محب وطن مقرر اس کا رونا رویا کرتا تھا کیونکہ اسی عیش و عشرت کی وجہ سے قوم اور حفاظت ملک کے دوسرے انتظامات پر ان کو اپنا روپیہ صرف کرنا ناگوار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ رشوت کا بازار گرم تھا جس کی وجہ سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ مدبّران یونان کے اکثر افعال ذاتی اغراض اور جلب منفعت پر مبنی تھے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کے افعال و خواص ایسے ہوں اس کا بقا مقدونیہ کی زبردست سلطنت کے مقابلہ میں دشوار تھا جہاں تمام اقتدارات ایک ہی فریس اور مدبّر بادشاہ کے ہاتھ میں تھے۔

شاہ مقدونیہ نے قدم بہ قدم کبھی اپنی فوج کے زور سے اور کبھی ابلہ فریبی سے سرزمین یونان پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ سلطنت ایتھنز اگر لیئے احیا کے بعد قائم رہتی تو مقدونیہ کے اقتدار کو روک سکتی مگر ٹھیک اسی زمانہ میں اس کی سلطنت کے حصے بکھرے ہونے لگے۔ ایتھنز کے بیڑے کا زور باقی رہا تھا اور نہ اسکی دھاک تھی اور دو فیصلہ کن مقابلوں میں ان کو حال ہی میں شکست فاش ہوئی۔ ایتھنز نے اپنے حلیفوں کو متحد کرنے کی کوشش کی مگر بے سود ثابت ہوئی اور آخر کار ان کو تن تنہا مقدونیہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے دو اسباب تھے ایک تو یہ کہ اس کی تجارت اور بحری تعلقات مقدونیہ کی زد میں تھے اور دوسرے شہرۂ آفاق مقرر ڈیما سس تھینس ایتھنز کو فلپ کے خلاف اکسا رہا تھا۔ ڈیما س تھینس نہ سپاہی تھا اور نہ مدبر۔ اس کی قوت کی بنیاد صرف اس کی فصاحت و بلاغت پر تھی جس میں اس کا ہمسر نہ زمانہ قدیم میں ہوا اور نہ زمانہ حال میں۔ مقرریت کی جملہ خوبیاں اس میں موجود تھیں یعنی مزاج، بلند خیالی، طنز، مدلل تقریر اور سامعین کے جذبات کو مشتعل کر دینا۔ مگر تدبیر مملکت میں اسے اس درجہ دخل نہ تھا۔ ایتھنز اور یونان کی گزشتہ عظمت کا سکہ اس کے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ تھوسی ڈائیڈس کی تاریخ کا اس نے بنظر غائر مطالعہ کیا تھا اور وہ عہد پیرکلس کی عظمت زندہ کرنے کا خواب اکثر دیکھتا تھا۔ اس کا سطحی نظریہ تھا کہ ایتھنز کو پھر یونان کی سیادت حاصل ہو جائے اور اس کے ذریعہ سے یونان کو آزادی ملجائے۔ ممکن ہے کہ اگر مقدونیہ کی سیادت تسلیم کر لیتا تو ایتھنز کے حق میں بہتر ہوتا اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس نے اپنی تقریروں میں مقدونیوں کو بلا سبب بدنام کیا ہے۔ مگر زمانۂ حال کے اکثر محققین اس کے جانب دار ہیں۔ ان کے خیال میں یہی بہتر تھا کہ بجائے محکومیت کو چپکے سے تسلیم کر لینے کے ایتھنز کے لوگ اپنے کو برقرار رکھنے کی کوشش میں نکبت و نابود ہو جاتے۔

ایتھنز اور فلپ کے درمیان فلپ کے تخت نشین ہوتے ہی چھیڑ چھاڑ پیدا ہو گئی شہر ایمفی پولیس اس کی سرحد کے قریب تھا۔ اس شہر کے قرب و جوار

میں سونے کی کانیں تھیں۔ فلپ نے اس شہر پر حملہ کر دیا اور ایتھینیوں کو یہ باور کرا دیا کہ میں اس کو کچھ روز کے بعد ان کے حوالے کر دوں گا ان کو مداخلت سے باز رکھا اس کے بعد اولن تھنس کے بحری اتحاد کی طرف متوجہ ہوا جس کی وجہ سے اس کے ساحلی مقبوضات معرض خطر میں تھے۔ ڈیماس تھینیس کو یقین کامل تھا کہ اگر اولن تھنیس کو فلپ نے مغلوب کر لیا تو اس کے بعد ایتھنز کی باری آئیگی اس لئے اس نے ایتھینیوں کو مشورہ دیا کہ اس اتحاد کی مدد کے لئے فوج بھیجیں۔ ایتھینیوں نے اس کے مشورہ پر عمل کیا مگر اس میں عجلت سے کام نہیں کیا اور فوج پہنچتے پہنچتے اس اتحاد کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ اس معرکے کے کچھ ہی قبل یونان میں ایک دوسری جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس جنگ کو "جنگ مقدس" کہتے ہیں مگر دراصل یہ تھبیوں اور فوکیوں کے مابین سرحدی جنگ تھی جس کے دوران میں فوکیوں نے ڈیلفی کے مندر کے مقدس خزانے پر اپنی فوجوں کی تنخواہ ادا کرنے کے لئے قبضہ کر لیا تھبیوں کی حالت اس قدر ابتر ہو گئی تھی کہ ان کو فوکیوں نے شکست دیدی اور مجبوراً ان کو فلپ سے امداد کی درخواست کرنا پڑی جس سے فلپ کو اپالو دیوتا کی بے حرمتی کا بدلہ لینے کی غرض سے وسطی یونان کے معاملات میں مداخلت کا موقع مل گیا جس سے اس نے خوب نفع اٹھایا۔ ۳۴۶ء میں اس نے ایتھینیوں کو مصالحت پر مجبور کیا اور درۂ تھرموپالی پر قبضہ کر لیا جو اس وقت تک فوکیوں کے قبضے میں تھا۔ یہ درہ وسطی یونان کی کلید تھا اور اس پر اس نے اپنا قبضہ ہمیشہ قائم رکھا۔

یونان کی زندگی کے ابھی آٹھ سال اور باقی تھے۔ مگر اس زمانہ کے حالات وقت سے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے ماخذ ایتھنز کی مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کی تحریروں کے سوا کچھ نہیں۔ ڈیماس تھینیس نے فلپ کے مخالفوں کو اکسانے اور ان کے مجتمع کرنے میں اپنی فصاحت اور بلاغت کا پورا زور لگایا۔ فلپ کے خلاف جو تقریریں اس نے کی ہیں فلپکس کے مجموعی نام سے مشہور ہیں۔ اس اثنا میں ڈیلفی کے انتظام کے متعلق کچھ جھگڑا ہو گیا

جس سے فلپ کو یونان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا دوبارہ موقع ملا۔ مگر اس کا اصلی منشا اب تمام یونانی خوب سمجھ گئے تھے تھیبس نے ایتھنز کا ساتھ دیا اور چند اور یونانی ریاستیں ان کی شریک ہوگئیں مگر ان کی سعی بلیغ بے سود ثابت ہوئی۔ یونانی اور مقدونی افواج ۳۳۸ھ میں بمقام کیرونیا ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں۔ مقدونیہ کی پیدل فوج کا تو یونانیوں نے کچھ مقابلہ کیا مگر جب مقدونیہ کے سواروں نے زیر کمان سکندر فرزند فلپ دھاوا کیا تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ یہ سکندر وہی ہے جو بعد میں سکندر اعظم کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور و معروف ہوا۔ اس جنگ نے یونان کی آزادی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور پھر یونانیوں کو کبھی پوری اور حقیقی آزادی نصیب ہی نہیں ہوئی۔

مقدونیہ کی فتح یونان کے حق میں مفید تھی یا مضر اس کا تصفیہ کرنا آسان نہیں۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں یونانیوں نے اپنی آزادی کا عاقلانہ استعمال نہیں کیا تھا۔ مقدونی نہ ظالم تھے، نہ جابر۔ ان کو یونان سے یگانگت تھی اور ان کے دور حکومت میں یونان کی زبان اور علوم کو عظیم الشان وسعت حاصل ہوئی۔ گر ڈیماس تھنز اور اس کے ہمخیال لوگوں نے مقدونیہ کے مقابلہ میں جو سعی بلیغ کی تھی وہ بے سبب نہیں تھی۔ یونانیوں کے ذوق سلیم اور دماغ سے دنیا کچھ دن اور بھی مستفید ہو سکتی مگر ان کے فنون لطیفہ اور شاعری ایسے نازک پھول تھے جو صرف آزادی کی ہوا میں پنپ سکتے تھے۔

جنگ پے لو پو نے سس کے بعد یونانی سیاسیات میں ہم ابتری دیکھتے ہیں وہ ان کی علمی ترقیوں میں حائل نہیں ہوئی۔ اس عہد میں کوئی نامی شاعر تو نہیں پیدا ہوا گو ارسٹوفینس ۳۸۸ھ ق م تک ڈرامے لکھتا رہا۔ بت تراشی میں پراگزیٹیس اور دوسرے صناعوں کا کام نہایت نفیس ہے مگر فیڈیاس کی ہمسری کا وہ دعوے نہیں کر سکتے۔ مندر بھی اس زمانہ میں بہت سے تعمیر ہوئے مگر کوئی پارتھیناں کے منزلت نہیں پا سکتا تھا۔ اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ یونانیوں کے قوائے عقلی رو بہ انحطاط تھے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے

علمی مشاغل نے دوسرا پیرایہ اختیار کیا۔ اگر صرف ڈیماس تھیبس کی تقریروں کو لے لیا جائے تو وہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یونانیوں کی جودت طبع میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ سائنس اور فلسفہ میں ترقی جاری تھی۔ سقراط نے جس پودے کی اپنے خون سے آبیاری کی تھی وہ اب بارآور ہو رہا تھا۔ زینوفن، افلاطون اور ارسطو ان تینوں فلسفیوں کو اس سے راست بالواسطہ تلمذ حاصل تھا۔ ارسطو اور افلاطون کو فلسفہ میں جو درجہ حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ افلاطون نے سقراط کے سیدھے سادے فلسفہ کو ایسی ترقی دی جس کا اس کے استاد کو خواب و خیال بھی نہ ہوگا کیونکہ ارسطو کو علاوہ فلسفہ کے شاعری اور الٰہیات میں بھی دخل تھا۔ اس کے تخیلات کا تمدن یورپ پر اب تک سکہ جما ہوا ہے اور خود اس کے زمانہ میں اس کے شاگردوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس کے معتقد ہو چلے تھے۔ اخلاق والٰہیات مذہب و سیاسیات سب سے اس نے بحث کی ہے اور تمام یونانی اور رومی فلسفیوں پر اس کا اثر پڑا ہے۔ مذہب مسیحی پر بھی اس کے خیالات اور تعلیم کا اثر پڑا ہے۔ زمانہ حال کے سیاسیات اور معاشیات میں اس کی تعلیم کا اثر پدیدہی ہے اور اکثر علما اس کی تحریرات سے استدلال کرتے ہیں۔ افلاطون نے اپنے خیالات کو زیادہ تر اپنے استاد سقراط کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارسطو سقراط کی طرح شاعری جذبات اور مذہب کی طرف زیادہ مائل نہ تھا۔ اس نے اس زمانہ کے تمام علوم میں دخل پیدا کر لیا تھا یعنی اخلاق و فنون لطیفہ سیاسیات اور طبعیات سب پر کتابیں لکھی ہیں اور جملہ علوم کو اس نے ترقی دی۔ افلاطون کی طرح اس کی تحریرات میں ادبی شان نہیں ہے مگر اس کی وجہ سے سائنس میں جو اضافہ ہوا ہے وہ پائدار ہے۔ ارسطو سکندر اعظم کا استاد تھا اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ نے بھی اس کی قدر کی۔ رومیوں پر بھی اس کا بیّن اثر پڑا ہے مگر اسکی شہرت ازمنۂ وسطیٰ میں معراج کمال تک پہنچی جب کہ حکماء و فلاسفۂ اسلام نے اس کی تعلیم کو پھر تازہ کیا اور اس کے فلسفہ سے دنیا کو دوبارہ روشناس کیا۔ عربوں سے اس کا فلسفہ پھر یورپ میں مروج ہوا اور یہاں تک اس نے

زور پکڑا کہ کتب مقدسہ سے کچھ ہی کم مستند خیال کیا جاتا تھا۔ الطالیہ کے شاعر دانتی نے کہا ہے کہ ارسطو "استاد العارفین ہے"۔ نشاۃ جدیدہ کے بعد اس کی قدر و منزلت میں کچھ کمی آگئی اور اس کی انتہائی عظمت جو یورپین علما کے دلوں میں جاگزین ہو گئی تھی رو بہ تنزل ہو گئی مگر بغور پڑھنے سے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اب کافی اندازہ ہو گیا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یورپین تہذیب کی فلسفیانہ بنیاد قائم کرنے میں بہت کم لوگوں کا حصہ ارسطو کے برابر ہے۔

سکندر اعظم اور اسکے فتوحات

جنگ کرونیا تاریخ یونان کا آخری باب نہیں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد یونان کے خصوصیات میں عظیم تغیر واقع ہو گیا، اوّل تو شہری ریاستوں کو یونانی سیاسیات میں جو اہمیت حاصل تھی اس کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ یونانی سلطنتیں صرف کسی خاص شہر اور اس کے مضافات پر مشتمل تھیں مگر اب ان کی آزادی سلب ہو گئی (گو اب بھی ان کا وجود یونان میں باقی تھا) روما بھی ایک شہری ریاست تھی۔ اطالیہ اور جرمنی میں شہری ریاستیں از منۂ وسطے میں موجود تھیں مگر دور آئندہ میں یورپ کی تاریخ بڑی بڑی سلطنتوں سے متعلق ہے۔ مقدونیہ کے بادشاہوں نے مشرق میں بڑی بھاری سلطنت قایم کی اور ان کے زوال کے بعد روما کی سلطنت مغرب میں قایم ہوئی۔ مرور زمانہ نے ان سلطنتوں کا بھی خاتمہ کر دیا اور چھوٹی ریاستوں نے انکی جگہ لیلی مگر شہری ریاستوں کے دن پھر نہیں پھرے۔

جنگ کرونیا کے بعد تمام یونان اسپارٹا کے سوا فلپ کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ مگر فلپ کی بالکل یہ خواہش نہ تھی کہ وہ یونان پر جابرانہ حکومت کرے۔ اس کو یہ آرزو تھی کہ یونانی اس کو اپنا نمائندہ خیال کریں۔ تمام یونان مقدونیہ کے زیر اقتدار تھا مگر تمام ریاستوں کو مقامی آزادی حاصل تھی۔ فلپ کی غرض یہ تھی کہ یونان کے انتظامات منضبط کر دینے کے بعد ایران پر یورش کرے مگر وہ ابھی یہ قصد ہی کر رہا تھا کہ کسی قاتل کے خنجر سے وہ اجل کا شکار ہو گیا مگر وہ

اپنا فرض منصبی ادا کر چکا تھا اور جب اس کا لائق بیٹا اس کا جانشین ہوا تو اس سے مقدونیہ کے منصوبوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ۳۳۴ ق م میں سکندر ایشیا میں داخل ہوا اور اس کے فتوحات کا وہ عظیم الشان سلسلہ شروع ہوا جس نے تاریخ عالم میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ مقدونیہ سے اس نے مصر کا رخ کیا وہاں سے بحیرۂ کیسپین اور پھر پنجاب کا۔ فتح و نصرت اس کی ہم رکاب تھی اس کے دامن پر شکست کا دھبہ کبھی نہیں لگا۔ سکندر کے فتوحات کا صرف یہی سبب نہیں تھا کہ دنیا میں اس کی برابری کا کوئی جنرل پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ کہ ایران کی حالت رقبے اور وسعت کے باوجود نہایت ہی ابتر تھی۔ دربار شاہی میں آئے دن جھگڑے رہا کرتے تھے جن میں خون خرابے تک نوبت پہنچ جایا کرتی تھی سلطنت اور فوج کا انتظام نہایت ہی خراب تھا۔ ایرانی فوج کی وہی حالت تھی جو جنگ ایران و یونان میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ فنون حرب میں انھوں نے کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ لیکن اگر ایران کی حالت اس قدر ابتر اور خراب نہ بھی ہوتی پھر بھی مقدونیہ کا مقابلہ دشوار تھا۔ مقدونیہ کی فوجی طاقت ایک جدید قسم کی قوت تھی۔ اس کے علاوہ شاہی قوت کی بنیاد بھی نہایت مضبوط تھی اور اس اولوالعزمی میں رعایا بادشاہ کی امداد پر کمر بستہ تھی۔ مقدونی فن حرب میں یونان کے تمام معلومات سے مستفید ہوئے تھے اور اسے ترقی بھی دی تھی۔ جس فوجی ترتیب سے اے پامنونڈاس نے اسپارٹا کو شکست دی تھی اس کو ترقی دیکر مقدونیوں نے ایک نئی شکل پیدا کر دی تھی جسے وہ "مقدونی فلانکس" کہتے ہیں یہ فوج پیدل سپاہ پر مشتمل تھی جس کی صفیں گھنی ہوئی تھیں اور سپاہیوں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے بھالے ہوا کرتے تھے۔ یہ صفیں اس قدر قریب قریب اور ان کے بھالوں کی نوکیں ایسی پاس پاس ہوتی تھیں کہ جب مقدونی دھاوا کرتے تھے تو کوئی دشمن ان کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ مگر سکندر کی فوج جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا سواروں کا ایک رسالہ تھی جس کی وہ خود کمان کرتا تھا اور اسی سے اکثر جنگوں کا فیصلہ ہوتا تھا۔ مقدونی فن حرب میں قلعہ شکن آلات کا

استعمال خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس سے یونانی واقف نہ تھے۔ کیونکہ اہل سپارٹا نے ایتھنز کی فصیلوں کو کبھی توڑنے کی کوشش نہ کی۔ گر کسی شہر کی فصیلیں سکندر کے منصوبوں کے پورے ہونے میں حائل ہوئیں۔ شہر ٹائر (سور) کے محاصرے میں اس نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیدیا۔ ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔ یونانی فوج میں افسر نہیں ہوتے تھے۔ ایتھنز میں جو شخص ایک سال جنرل رہا ہو دوسرے سال ممکن ہے کہ وہ بطور معمولی سپاہی کے لڑے۔ مگر مقدونیوں میں دوسرا طریقہ رائج تھا سکندر کا خیال تھا کہ فوجی معاملات کی سربراہی کے لئے خاص تعلیم اور مدت العمر کے تجربے کی ضرورت تھی اور اس لئے مقدونی فوج کے افسروں کو خاص تعلیم دی جاتی تھی۔

ابتدائے جنگ ہی سے مقدونیوں کی برتری اور فوقیت ثابت ہونے لگی تھی۔ دریائے گرانیکس کے قریب ایرانی فوج نے کچھ مزاحمت کے لئے ہاتھ پاؤں ہلائے مگر بے سود۔ اس کے بعد اس نے ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کا قصد کیا اور یونانی شہروں کو اپنی سیادت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ صرف شہر ہالی کارناسس میں اس کی کچھ مخالفت ہوئی مگر اس کے قلعہ شکن آلات نے ثابت کر دیا کہ دنیا میں ایک جدید قوت پیدا ہو گئی ہے۔ اس محاصرہ سے فارغ ہو کر وہ وسط ایشیائے کوچک کی طرف متوجہ ہوا اور وہاں کے باشندوں پر اپنی دھاک جماتا ہوا جنوب مشرق میں سلیسیا کے پہاڑوں کی طرف پہنچا جہاں اسے خیال تھا کہ ایرانی اپنے دروں کی حفاظت کے لئے موجود ہونگے۔ مگر ایرانیوں نے خوف ہو کر تمام درے چھوڑ دیئے تھے اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے بحیرہ روم کے ساحل پر پہنچ گیا مگر کچھ عرصہ کے بعد دریائے اسسس کے کنارہ پر ایک عظیم الشان فوج مگر غیر منتظم فوج اس کے مقابلہ کے لئے آگئی جس میں شاہ دارا خود بہ نفس نفیس موجود تھا۔ سکندر کے مقابلہ میں صرف کثرت فوج بے کار تھی۔ دارا کی فوج کو شکست فاحش ہوئی (۳۳۳ء) سکندر نے دارا کا پیچھا نہیں کیا بلکہ اپنی فوج ظفر موج کو لیکر شام و مصر کی تسخیر کے لئے روانہ ہو گیا۔ شہر ٹائر (سور) ایک قدیم تجارتی شہر شام کے ساحل پر

ایک جزیرہ پر واقع ہے۔ وہاں کے باشندوں نے سکندر کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے
انکار کر دیا۔ اس شہر کی فصیلیں اس قدر مضبوط تھیں کہ قریب تھا کہ سکندر اس کی
تسخیر سے مایوس ہو کر واپس جائے مگر اس کے انجنیروں نے ایک سنگی فصیل ساحل
سے شہر کی دیواروں تک بنائی جس کی وجہ سے بہت جلد سکندر کا اس پر قبضہ
ہو گیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر اس نے مصر کا رخ کیا جو اس زمانے میں ایران کے
قبضے میں تھا۔ ایرانیوں کی حکومت سے اہل مصر سخت بیزار تھے۔ اس لئے سکندر
کو انھوں نے اپنا مشکل کشا خیال کر کے اس کی اطاعت بخوشی قبول کر لی۔ مصر
کی زرخیزی ضرب المثل ہے اور اس کے جغرافیائی موقع کے سبب سے جو
فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ مصر میں اس نے شہر اسکندریہ
کی بنیاد رکھی جو بعد میں یونان کے علم و فضل کا ایک بڑا مرکز ہوا۔ مصر سے فارغ
ہو کر سکندر نے عراق کا رخ کیا جہاں ایک عظیم الشان ایرانی فوج اس کے مقابلے
کے لئے موجود تھی۔ مگر مقام آربیلا یا اس کے قریب ۳۳۱ ق م میں ایران کو پھر
شکست ہوئی اور دارا پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایران کے بڑے بڑے شہر جن کا ذکر سن کر
یونانیوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا سب یکے بعد دیگرے بلا مزاحمت فتح ہو گئے۔
بابل اور سوسا کو سکندر نے اُن کے حال پر چھوڑ دیا مگر پرسی پولیس (اصطخر) کا
قصر شاہی اس نے مسمار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے یہ قصد کیا کہ کسی صورت سے
دارا اس کے قبضے میں آ جائے کیونکہ اس کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ ایرانی اس کو
اپنے ملک کا فاتح خیال کریں بلکہ اپنے بادشاہوں کا جانشین بھی۔ اگر دارا اسکے
قبضے میں آ جاتا تو ممکن تھا کہ وہ تخت و تاج سے دست کش ہو کر سکندر کو اپنا
جانشین کر دیتا مگر دارا کو اس کے ایک جنرل نے مار ڈالا اور اس طرح سکندر کے
منصوبے خاک میں مل گئے۔

سکندر نے دارا کے قاتل کو قتل کرا دیا اور اس کے بعد اس نے ایرانیوں
کی تالیف قلوب میں سعی بلیغ کی کیونکہ اس کا منشا یہ تھا کہ اس کی سلطنت میں ایرانی
اور مقدونی عنصر برابر رہیں۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو ایرانی عورتوں سے شادی
کرنے کی ترغیب دی اور خود بھی ایرانی لباس و عادات کا پابند ہو گیا۔

دربار ایران کے آداب کو بھی اس نے اپنے دربار میں رواج دیا اور مشرقی فرماں رواؤں کی طرح دیوتاؤں سے اپنا سلسلۂ نسب ملانا شروع کیا۔ روایت ہے کہ جب سکندر مصر کے کسی بتخانہ میں گیا تو وہاں کی پجاری عورت نے کہا کہ تم ہمارے دیوتا کے بیٹے ہو۔ سکندر نے اس قصے کو مشہور کرنے کی کوشش کی تاکہ لوگوں کو اس کا یقین آجائے۔ سکندر کی یہ حرکت صرف خود پسندی پر مبنی نہ تھی بلکہ اس میں فراست کا بھی شائبہ تھا کیونکہ جس بادشاہ کی سلطنت مختلف قوموں پر ہو اس کے لئے فوق الانسانی سلسلۂ نسب اس وقت ضروری تھا۔ مگر یہ پالیسی سکندر کے جانباز مقدونی افسروں کو شاق گزری تھی جن کی زندگی اب تک آزادی سے گزرتی تھی اور جو سیدھے سادے سپاہی ہونے کے باعث درباری تکلفات کے پابند نہ ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ سکندر نے اپنے دربار میں جو نئے آداب رائج کئے تھے ان سے ان کی سبکی ہوتی تھی جو ان کو کسی طرح منظور نہ تھی۔

مگر اس کے فتوحات کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ آئندہ فتوحات میں اس نے فن سپہ گری میں بھی اپنا جوہر اور کمال دکھا دیا کیونکہ اب تک تو اس کو ایران کی از کار رفتہ فوجوں کے مقابلے میں یہ آسانی فتح حاصل ہوتی رہی مگر آئندہ کے مہمات میں اسے وحشی اور جنگلی اقوام سے سابقہ پڑا اور وہ بھی ایسے مقامات میں جن کے حالات اسے بہت کم معلوم تھے اور ان ملکوں کے پہاڑی ہونے کے سبب سے وہاں کے باشندے بیرونی حملوں سے محفوظ بھی تھے۔ مگر سکندر نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ تاج ایران کے تمام مقبوضات پر تسلط کرے اس قصد سے اس نے بحیرۂ کیسپین کا رخ کیا اور جن ممالک کو بلوچستان و افغانستان کہتے ہیں ان میں سے ہوتا ہوا ہمالیہ کے دروں کو طے کر کے پنجاب میں پہنچا۔ یہاں کے باشندوں کو بھی اس کے مقابلہ میں ناکامی ہوئی اور اس نے تمام ہندوستان کو اپنے اقتدار میں لانے کا قصد کیا مگر اس کے سپاہیوں نے جن کے پاس ان فتوحات میں مال و متاع کثیر ہو گیا تھا آگے بڑھنے سے انکار کیا اور سکندر کو بادل ناخواستہ حکم دینا پڑا کہ وہ بابل کو واپس جائیں۔ مگر اس نے خود اسی راستہ

سے واپس جانا پسند نہ کیا اور اپنی پیادہ کا ایک حصہ اپنے ساتھ لیکر دوسرے راستہ سے سمندر کے کنارے کنارے واپس ہوا مگر صحرائے گیڈروسی میں پانی کی نایابی سے اسے دشواریاں ہوئیں جو کبھی کسی دشمن کے مقابلہ میں پیش نہ آئی تھیں۔ فوج کے ایک حصہ کو اس نے جہازوں میں بٹھاکر دریائے سندھ سے سمندر کے راستہ سے امیرالبحر نیرکس کے زیر کمان بھیجا۔ یہ بیڑہ ایک مدت تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا مگر آخر کار صحیح وسالم دریائے فرات کے دہانہ پر پہنچ گیا۔ اس فوج کو مختلف مصائب کا سامنا ہوا مگر اس کے سبب سے یونانیوں کی جغرافیائی معلومات میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

سکندر کے فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع ہوگیا تھا۔ اب اسے دو کام باقی تھے یا تو ممالک مفتوحہ کی تنظیم میں مشغول ہو اور زمانے پر ثابت کردے کہ انتظام مملکت میں بھی اسے اتنا ہی دخل ہے جتنا سپہ گری میں یا اپنی فوجوں کی باگ مغرب کی طرف پھیر دے کیونکہ مشرق اس کے زیر تسلط ہو چکا تھا۔ اگر اس کی زندگی وفا کرتی اور ان دونوں تدبیروں میں سے کسی ایک پر بھی اُسے عمل کرنے کا موقع ملتا تو زمانہ آئندہ کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی مگر ۳۲۳ ق م میں بابل کے قریب سکندر ایک ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہوا اور وہیں انتقال کر گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۳۲ سال کی تھی مگر اسی قلیل عرصہ میں اس نے نصف دنیا پر اپنی فتوحات کا سکہ جما دیا۔ سکندر کے فتوحات کے نتائج کا لب لباب یہ ہے کہ ان سے یونان کو بے انتہا وسعت نصیب ہوئی۔ سکندر خود یونانیوں کی لیاقت و ذہانت کا قائل تھا اور جو راستے اس کی فوجوں نے یونان کی تجارت، تمدن اور زبان کی توسیع کے لئے کھولدیئے تھے اس سے یونانی خوب بہرہ یاب ہوئے۔ دریائے دجلہ کے مشرقی ممالک میں تو یونان کا کوئی اثر باقی نہ رہا مگر ایشیائے کوچک، شام، عراق اور مصر یونانیوں کے قبضہ میں آگئے اور بہت جلد ان جدید مقبوضات میں یونانیوں کے علوم کو اتنا فروغ ہوا کہ یونان میں بھی نہیں ہوا تھا۔ سکندریہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کیونکہ زمانہ حال پر اس کا احسان عظیم ہے۔ ایتھنز کے باہر شاید ہی کسی مقام پر علوم ادب،

ریاضی، طب اور ہیئت کو اتنا فروغ ہوا ہو جتنا کہ اسکندریہ میں مگر یہ علمی ترقیاں اسکندر کے بعد اس کے جانشینوں کے زمانہ میں ہوئیں اس لئے اب ہم اختصار کے ساتھ بیان کرینگے اس کی موت کے بعد اس کے مقبوضات کا کیسا حشر ہوا۔

اگر سکندر کچھ روز اور زندہ رہتا تو ممکن تھا کہ وہ کوئی ایسی صورت نکال لیتا جس سے اس کے بعد اس کی سلطنت منتشر ہونے سے بچ جاتی اور تمام اقوام ممالک اور سلطنتیں ایک ہی مضبوط زنجیر میں جکڑی رہتیں۔ مگر اس کی قبل از وقت موت کے باعث اس کی سلطنت کے شیرازہ کا بکھر جانا لازمی تھا۔ کیونکہ اس کا کوئی لایق جانشین نہ تھا۔ اس کے بچے شیر خوار تھے اور نہ اس کی قوم میں کوئی قانون وراثت تھا جس سے اس کے جانشین کا تعین بہ آسانی ہوسکتا۔ اس کے سپہ سالاروں نے اپنے اپنے زیر اثر ممالک پر خود مختار حکومتیں قائم کرلیں مگر اس سے آپس میں شدید خانہ جنگی ہوگئی ہمیں اتنا وقت نہیں کہ ان خانہ جنگیوں کو تفصیل کے ساتھ اس موقع پر لکھ سکیں بلکہ ان کے عام نتایج کا تذکرہ کرنا کافی خیال کرتے ہیں اور جب روما کی مشرقی فتوحات کا تذکرہ لکھینگے تو اس کے ضمن میں ان سلطنتوں کا بھی کچھ ذکر آجائیگا۔

سکندر کی سلطنت کے کھنڈروں پر تین طاقتور اور استوار سلطنتیں قائم ہوئیں یعنی مصر، شام اور مقدونیہ۔ بطلیموس نے مصر پر قبضہ کرلیا اور اس کی اولاد وہاں آغاز سنہ مسیحی تک حکمراں رہی مصر کی زرخیزی اور اس کی تجارتی ترقی کے سبب سے بطلیموس کی سلطنت نہایت طاقتور اور پر عظمت تھی۔ مصر میں یونانیوں کی حکومت سے ایک جدید دور شروع ہوا۔ دیسی باشندوں کے طرز زندگی میں کوئی فرق نہ آیا اور مصری مذہب و رسوم قائم رکھے گئے مگر حکمراں خاندان خالص یونانی تھا اور یونانی علوم و فنون لطیفہ کی اہمیت کا انھیں خاص احساس تھا۔ اسکندریہ نہ صرف ایک عظیم الشان تجارت گاہ ہوگیا بلکہ علوم یونان کا بھی مرکز بنگیا۔ اس میں شک نہیں کہ اسکندریہ کے علما

کی توجہ تالیفات پر زیادہ تھی مگر شاعری کو بھی یہاں فروغ ہوا۔ شعرا ر
اسکندریہ میں تھیوکریٹس جو تیسری صدی قبل مسیح میں گزرا ہے مشہور ہے فلسفہ اور
سائنس کی طرف اسکندریوں کا زیادہ رجحان تھا۔ اور ان علوم میں انھوں
نے ایسی ترقی کی جس کا احسان اب تک دنیا پر ہے۔ اقلیدس انھیں
علما میں سے ہے۔ فلسفۂ یونان بھی رائج تھا اور علمار اسکندریہ کا الہیات
مسیحی کی ترقی پر خاص اثر پڑا ہے۔ فلو یہودی بھی اسکندریہ کا باشندہ
تھا جس کے خیالات عقائد مسیحی کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ دو صدیوں
کے بعد اوری جین اسکندری (سنہ ۱۸۵۔۲۳۲ء) کا نام قابل ذکر ہے جس
نے الہیات مسیحی میں افلاطون کے فلسفہ کو جگہ دی۔ اسکندریہ میں کئی
نامی اطبا بھی گزرے ہیں جنھوں نے یونانی فن تشریح اور علم الحیات
کو خاص ترقی دی۔ جالینوس (سنہ ۱۳۱۔۲۰۰ء) کا علم طب پر احسان عظیم ہے
اور اسی کی تصنیفات کے مطالعہ سے یورپ کے فن طب کی بنیاد پڑی
ہے۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے تھے اس کے ایک عرصہ بعد یہ ترقیاں
ہوئیں مگر ان کا اس موقع پر ذکر کرنے سے منشا صرف یہ ہے کہ یونانی
دنیا کی علمی تاریخ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی اور اس زمانہ میں بھی تمام
علمی ترقیات کا ماخذ یونان ہی تھا۔

جس زمانہ میں بطلیموس نے اپنی سلطنت کی بنیاد مصر میں ڈالی
اسی زمانہ میں سیلوکس نے اپنی سلطنت فرات کے سواحل پر قائم کی مگر مشرقی
مقبوضات اس کے جانشینوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور ان کی سلطنت صرف
شام تک محدود رہی۔ علوم و فنون کی ترقی میں اس حکومت کو زیادہ ذوق شوق
نہ تھا جیسا کہ بطلیموس کو تھا مگر یونانیوں کے شہر شام میں بھی قائم ہوئے اور
یونان کے فنون لطیفہ کو کچھ فروغ ہوا اور شام ہی سے یونانی علوم و فنون کا
اثر یہودیوں کی سرزمین میں حضرت عیسٰیؑ کے زمانہ تک پہنچتا رہا۔ حکمرانان شام
اپنے آپ کو شہنشاہ کہتے تھے۔ ان کے غرور کی کوئی انتہا نہ تھی اور دوسری اقوام
کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر جب روما سے ان کا مقابلہ ہوا تو

ان کے کر و فر کا خاتمہ ہوگیا۔

سکندر کے جانشینوں کی حکومت مقدونیہ میں زیادہ مضبوط تھی۔ ایک عرصہ تک طوائف الملوکی رہی مگر اس کے بعد سلطنت مقدونیہ انیٹی گونس کی اولاد کے قبضہ میں آگئی جو سکندر کے سپہ سالاروں میں سے تھا اور ان کا قبضہ دوسری صدی ق م تک قائم رہا جب کہ تمام ملک پر رومی مسلط ہو گئے۔ مگر ان حکمرانوں کی حکومت کا رقبہ وہ نہ تھا جو شاہ فلپ کے زمانہ میں تھا۔ یونان ان کی حکومت سے بیزار تھا اور یونان کے چند قلعوں میں ان کی فوجیں (جنھیں یونان کی بیڑیاں) کہتے رہتی تھیں۔ مگر یونان کے شہروں یا اقوام ایران کا کوئی اقتدار نہ تھا۔ مقدونیہ کے مشرق میں صوبہ تھریس میں سخت بدامنی پہلی صدی مسیحی تک رہی جب کہ یہ صوبہ بھی رومیوں کے قبضہ میں آگیا۔ مغرب میں ایپائرس میں بھی ایک جدا سلطنت قائم ہوگئی اور یہاں کا بادشاہ پرہس ایک عرصہ تک رومیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔

ایشیائے کوچک سکندر کے جانشینوں میں سے کسی کے قبضہ میں نہ آسکا گو وہ اس پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے آپس میں لڑتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے باشندے اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکے اور مختلف اقسام کی ریاستیں یہاں قائم تھیں کہیں بادشاہ حکمران تھے جیسے پانٹس اور پرگامم روڈز کی طرح بعض آزاد شہر تھے، کہیں جمہوریت تھی، کہیں حکومت جابرہ، کہیں مختلف شہروں کا اتحاد۔ وسط میں صوبہ گلیشیا تھا جس میں گال آباد تھے۔ یہ وہی قوم ہے جو فرانس، آئرلینڈ اور ویلز میں آباد تھی اور بلقان اور یونان سے گزرتی ہوئی یہاں آکر مستقل طور سے آباد ہوگئی تھی۔ یہ مختلف اقوام کی نقل و حرکت کے ایک بڑے سلسلے کا آغاز ہے جس کی اہمیت چوتھی اور پانچویں صدیوں میں جاکر معلوم ہوگی جب کہ یہ تحریک سلطنت روما کے زوال کا باعث ہوئی۔

روما کا عروج اور اسکی ابتدائی دستوری جدوجہد

اگر سکندر اعظم اپنی افواج کی باگ بحیرۂ روم کے مغربی سواحل کی طرف موڑتا تو کئی طاقتور سلطنتوں سے اس کو سابقہ پڑتا۔ افریقہ کے شمال میں قرطاجنہ واقع تھا جہاں کے جنگجو اور پرجوش باشندوں کو رام کرنے میں اسے اپنی پوری طاقت صرف کردینی پڑتی۔ روما کو اطالیہ میں عروج حاصل ہورہا تھا مگر اس وقت رومی سامینوں سے دست بگریباں تھے۔ اگر سکندر اپنی طاقت کا پلہ سامینوں کی طرف ڈالدیتا تو روما گیا۔ دنیا کی تاریخ اس کے بعد کچھ اور رہی ہوتی۔ لیکن ممکنات پر بحث کرنا عبث ہے اس لیے ہم روما کی ابتدائی تاریخ کی طرف متوجہ ہونگے۔ رومیوں اور یونانیوں کے طبائع اور کارناموں میں اختلاف ہے۔ یونان مبدء علوم و فنون ہے۔ روما سے یورپ نے قانون اور اصول حکومت ورثہ میں پایا ہے۔ یونانی تغیر پسند تھے برخلاف ان کے رومی قدامت پرست تھے یونانیوں کا رجحان فنون لطیفہ اور فلسفی تخیلات کی طرف تھا۔ رومیوں کا دماغ عملی تھا اور ان کو فنون حرب اور انتظام مملکت میں ید طولے حاصل تھا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ رومیوں اور یونانیوں میں یگانگی بھی تھی ان کی زبانیں مشابہ تھیں اور باوجود تمام اختلافات کے ان کے مذہب اور رسوم میں بیحد مشابہت تھی اور گوان دونوں ممالک کے سیاسی کارناموں میں کوئی مناسبت نہیں کیونکہ روما کی عظیم الشان اور دیرپا

سلطنت کے مقابلہ میں یونان کسی شمار قطار میں نہیں مگر روما بھی ابتداءً ایتھنز اور کورنتھ کی طرح ایک شہری ریاست تھا۔

روما کی ابتدائی تاریخ بھی تاریکی میں چھپی ہوئی ہے کیونکہ تاریخ نویسی کی طرف رومیوں نے اسی وقت رخ کیا جب کہ ان میں قومیت کی روح پیدا ہوگئی تھی اور رومی شاعروں اور مورخوں نے زمانہ قدیم کے قصوں اور افسانوں کو جمع کرنا شروع کیا۔ مگر ان افسانوں میں تصرف بہت کچھ ہوا ہے۔ رومی مورخوں نے اپنی ابتدائے رسم ورواج کے متعلق فرضی قصے گڑھ لئے ہیں۔ ان افسانوں کی دلچسپی میں کوئی شک نہیں مگر تاریخی لحاظ سے ان کی کوئی وقعت نہیں۔ البتہ یہ ان سے ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ رومیوں کے تخیلات کیا تھے۔ ان افسانوں میں کس قدر صحت ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے مگر اس وقت ہم صرف وہ واقعات بیان کرینگے جن کی اصلیت ایک حد تک ثابت ہو چکی ہے۔

یونان کی طرح اطالیہ بھی ایک ایسا ملک ہے جہاں پہاڑوں اور سمندر کا اثر اس ملک کے باشندوں کی طبیعتوں اور قسمتوں پر پڑا ہے۔ مگر اطالیہ ان پہاڑوں کے سبب سے مختلف اضلاع میں منقسم نہیں ہوگیا ہے جن میں آمد و رفت دشوار ہو اور نہ یونان کی طرح سمندر کے ہر جگہ خشکی میں در آنے کی وجہ سے اس کے ساحل میں خم پیدا ہوگیا ہے کھاڑیوں اور بندرگاہوں کی تعداد یونان میں اسی وجہ سے زیادہ ہے۔ اطالیہ کا سب سے بڑا سلسلۂ کوہی جسے اپی نائن کہتے ہیں شمالی میدان میں مغرب سے مشرق کی طرف چلا گیا ہے مگر مشرق میں ساحل کے متوازی ہوگیا ہے اس لئے پو کے سوا تمام دوسری ندیاں جو ساحل مشرقی پر ہیں چھوٹی چھوٹی ہیں اور بڑی ندیاں سب مغربی ساحل پر ہیں۔ جہاز رانی کے ابتدائی زمانہ میں اطالیہ سسلی اور سارڈینیا کے جزائر سے بلکہ سواحل شمال افریقہ سے بھی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا مگر یونان اور ممالک مشرقی تک پہنچ جانا ذرا دشوار تھا۔ اطالیہ کے مغربی ساحل کے وسط میں دریائے ٹائبر سمندر میں آملتی ہے

اور اکثر اوقات اس میں کافی پانی ہوتا ہے جس کے سبب سے اس زمانہ کے چھوٹے چھوٹے جہاز بہ آسانی اس میں گزر سکتے ہونگے۔ دریائے ٹائبر کے دہانہ سے پندرہ میل کے فاصلہ پر اس کے بائیں یعنی شرقی ساحل پر سات چھوٹے چھوٹے پہاڑ واقع ہیں۔ وہاں کوہ پلاٹین پر ایک قلعہ واقع تھا جو بعد میں شہر روما کے نام سے مشہور ہوا۔ روما ابتدائی زمانے ہی سے ایک اہم تجارتی مرکز تھا دریائے ٹائبر کے مشرقی کنارے پر اقوام لاطینی متوطن تھیں اور مغربی پر اٹرسکن۔ ان دونوں اقوام کی تجارتی اشیاء ندی سے روما میں آتیں اور وہاں سے اٹالیہ کے دوسرے بندرگاہوں اور ممکن ہے کہ دیگر اقطاع عالم کو بھیجی جاتیں۔ غالباً زمانہ قدیم میں ان سات پہاڑوں پر دو مختلف اقوام آباد تھیں مگر تاریخی زمانہ سے قبل ہی دونوں خلط ملط ہو چکی تھیں اور ان کی آبادی کے گرد ایک فصیل بھی بن چکی تھی جس کی تعمیر رومی بادشاہ سرویس ٹلیس کی طرف منسوب کیجاتی ہے۔ روما کے تاریخی افسانوں میں سات بادشاہوں کا ذکر ہے جس سے کم از کم روما میں بادشاہوں کا وجود ثابت ہوتا ہے مگر یہ بادشاہ اسی قسم کے تھے جن کا ذکر ہومر کی نظموں میں ہے۔ شاہان روما جنگ میں اپنی فوج کی کمان کرتے اور زمانہ صلح میں نزاعات کا فیصلہ کرتے مگر ان کے اختیارات محدود تھے ان کے دوش بدوش دو مجلسیں تھیں پہلی مجلس کا نام سینیٹ تھا یعنی مجلس عظام اور دوسری شہریوں کی مجلس جو ایتھنز کی مجلس عوام یا ایکلیسیا کے مماثل تھی۔ ان مجالس کے باہمی تعلقات کے لئے کوئی قانون نہ تھا بلکہ ان کا دارومدار رسم و رواج اور روایات پر تھا۔ مگر آخر میں یونان کی طرح روما میں بھی سلطنت شاہی کا خاتمہ ہوگیا۔ ٹارکوین متکبر آخری بادشاہ کا نام بیان کیا جاتا ہے اور روایت ہے کہ اس کا اخراج ۵۰۹ ق م میں ہوا۔

اس بادشاہ کے اخراج کے بعد روما میں جمہوریت قائم ہوگئی اور دستور اساسی میں دو مجسٹریٹوں نے جنھیں کانسل کہتے تھے شاہی فرائض اپنے ذمے لے لئے ان حکام کا انتخاب صرف ایک سال کیلئے ہوتا تھا اور ان سے فوج کی سپہ سالاری اور شہر کی اعلیٰ مجسٹریٹی کا کام لیا جاتا تھا اس سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کے فرائض ان سے

الطالی نسلیں
زی کون
کارسیکا
روما
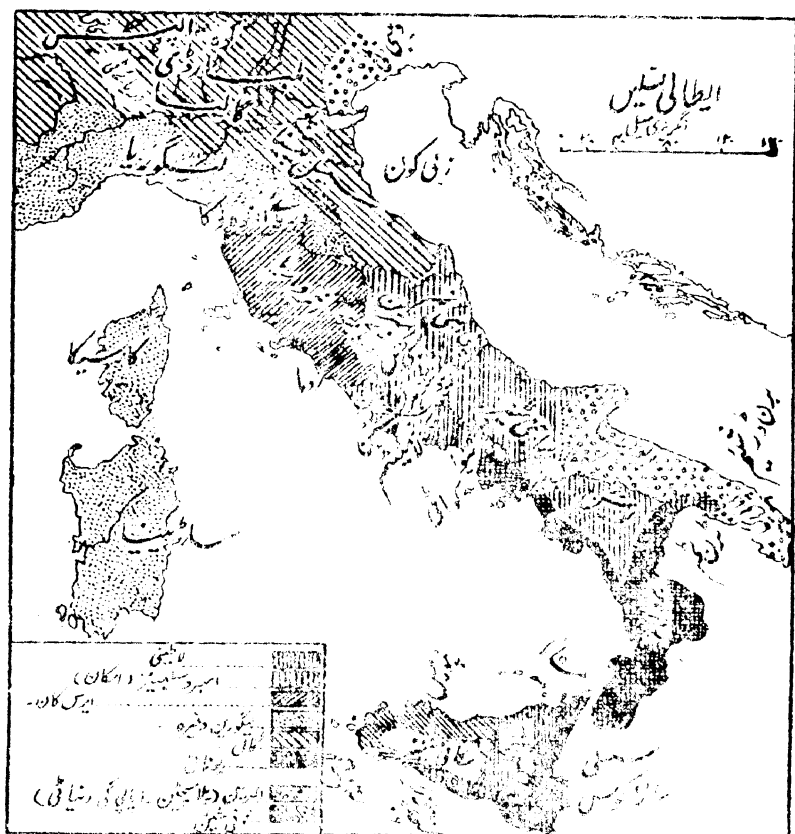
منسوب ہوگئے تھے لیکن بادشاہ کے اقتدارات ان کو حاصل نہ تھے۔ اول تو دونوں کانسل خود ایک دوسرے کی طاقت کو دیکھ نہ سکتے تھے دوسرے ان کی حکومت کا زمانہ صرف ایک سال تھا اور اس میں بھی ان پر یہ بات فرض کردی گئی تھی کہ وہ سینیٹ کا بیحد اعزاز واحترام کریں۔ درحقیقت سینیٹ ہی روما کی سب سے طاقتور جماعت تھی جس میں شہر کے اکابر شریک رہتے تھے اور ان کی رکنیت دائمی اور تا دم مرگ ہوتی۔ اصلی فرائض کے لحاظ سے تو وہ محض کانسلوں کے مشیر تھے مگر رفتہ رفتہ تمام اقتدارات انھوں نے سلب کرلئے کیونکہ اس مجلس کے ارکین تجربہ کار ہوتے اور اپنے عہدوں کے دوامی ہونے کے سبب سے کانسلوں پر قدرتاً انھیں فوقیت حاصل تھی جن کا تقرر صرف ایک سال کیلئے ہوتا۔ علاوہ کانسلوں اور سینیٹ کے جمہوریت روما میں ایک تیسرا عنصر بھی تھا شہریان روما بھی اپنی مجالس میں جمع ہوتے جو کمیٹیا کے نام سے موسوم تھیں۔ ان مجالس شہریان میں سب سے بڑی کمیٹیا سنچوریاٹا تھی جس میں شہری اپنے فوجی عہدوں کے لحاظ سے جمع ہوتے مگر اس میں شمار آرا اس طریقہ سے رکھا گیا تھا کہ دولت کا اثر تعداد پر غالب تھا۔ کمیٹیا کے اقتدارات وسیع مگر مبہم تھے۔ کانسلوں کے انتخاب کا حق ان مجالس کو حاصل تھا۔ کانسلوں کے فیصلوں کا مرافعہ انھیں مجالس میں ہوتا تھا اور وضع قوانین کا اختیار بھی انھیں کو تھا۔ مگر ان ہرسہ عناصر کی باہمی رقابت کے قصوں سے تاریخ روما لبریز ہے۔ جمہوریت کے بیشتر زمانہ میں سینیٹ کو غلبہ حاصل رہا مگر مرور زمانہ کے بعد یہ اقتدارات مجالس عوام کو حاصل ہوگئے مگر عوام کا اقتدار دیرپا ثابت نہوا اور عہدہ داران جمہوریت نے عوام کے اقتدارات کو سلب کرلیا۔ مگر یہ واقعات پانچ سو سال میں جاکر ہوئے۔

دور شاہی کے اختتام کے بعد کسی کو یہ خیال نہ ہوگا کہ اطالیہ کا مستقبل روما کی قسمت کے ساتھ وابستہ ہے کیونکہ روما کو اس جزیرہ نما کی دوسری سلطنتوں پر تمدن یا قوت میں فوقیت حاصل نہ تھی۔ اگر کسی قوم کو دعوے ہوسکتا تو وہ اٹیرسکن تھے جن کی آبادی روما کے شمال و جنوب میں پھیلی

ہوئی تھی۔ یہ عجیب و غریب قوم جس کی تاریخ پر اب تک روشنی نہیں پڑ سکی اور نہ اس کی زبان معلوم ہو سکی، تعداد اور ثروت میں رومیوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ تمدن میں بھی انھوں نے رومیوں سے زیادہ ترقی کی تھی بعد میں جاکر رومیوں نے اسی قوم کے عقائد مذہبی اور فن تعمیر کو اختیار کیا۔ جزیرہ نمائے اطالیہ کے جنوب میں متعدد یونانی ریاستیں تھیں جن کا ذکر آچکا ہے۔ کیومے اور ٹارنیٹم میں یونانی شہروں کے معمولی خط و خال موجود تھے اور سسلی میں سیراکیوز کی عظیم الشان شہری سلطنت تھی جو ایک زمانہ میں سسلی اور جنوبی اطالیہ پر قریب قریب حاوی ہو گئی تھی۔ ان متمدن اقوام کے باقیات الصالحات کے علاوہ لامبارڈی کے شمالی میدانوں میں جنگجو اور پرجوش قوم گال آباد تھی جو نسلاً باشندگان گال (فرانس) سے رشتۂ اخوت رکھتی تھی۔ اطالیہ کے جنوب و وسط میں مختلف اقوام آباد تھیں جو نسلاً روما سے ہمجنس تھیں مگر اس کے برابر متمدن نہ تھیں۔ ان میں سے سامنیوں کا نام اب تک اس لئے قائم ہے کہ یہ روما سے عرصہ تک برسر پرخاش تھے۔

روما کے کارنامے صرف بیرونی فتوحات پر مشتمل نہیں ہیں۔ اندرونی مشکلات کو اس نے جس خوبی سے حل کیا ہے وہ خود ایک معرکہ ہے اور اس کی بیرونی فتوحات کی بنیاد ہے۔ خانہ جنگیوں نے اس قدر طول کھینچا تھا کہ قریب تھا کہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اگر ایسا ہوتا تو پھر روما کا شمار اطالیہ کی زبردست سلطنتوں میں نہ ہوتا۔ اس خانہ جنگی کا سبب یہ تھا کہ روما میں دو گروہ تھے ایک کو شہریت کے حقوق حاصل تھے اور دوسرا گروہ اس سے محروم تھا۔ پہلے گروہ میں شرفا پیٹریشین یعنی روما کے قدیم باشندے اور دوسرے میں رذیل (پلی بین) تھے جو مختلف مقامات سے آکر آباد ہو گئے تھے۔ شرفا اپنے حقوق سے دست بردار ہونے پر کسی صورت سے آمادہ نہ تھے اور رذیل اپنی بےبسی سے نالاں تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دونوں میں سخت مخالفت پیدا ہو گئی۔ گو رذیل بھی کمیٹیا کے جلسوں میں شرکت کے مجاز تھے مگر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں شمار آرا میں عزومال کا خیال

کیا جاتا تھا نہ کہ تعداد کا۔ اس کے علاوہ رذیل کانسلی یا سلطنت کے کسی دوسرے
عہدہ پر پہنچ نہ سکتے تھے مگر ان کے ساتھ سختی یا جبر کا برتا ؤ نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ اسپارٹا
کے غلاموں کی طرح نہ تھے اور ایتھنز کے غیر ملکی باشندوں سے بھی انکی حالت
بہتر تھی۔ مگر تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ انقلابات ہمیشہ ایسی
جماعتوں کی وجہ سے ہوئے جنھیں کچھ حقوق حاصل تھے اور مزید حقوق کے
طلبگار تھے نہ کہ ایسی جماعتوں سے جو بالکل بے بس اور درماندہ ہوں۔ رذیل
روما سیاسی حقوق سے محروم تو تھے ہی مگر اس کے علاوہ تمدنی مشکلات سے وہ
اور بھی پریشان تھے خصوصاً قانون ادائے قرضہ ان کے لئے سخت وبال جان
تھا۔ اگر ان میں سے کوئی بدنصیب قرض نہ ادا کر سکتا تو اپنے ساہوکار کا غلام
ہو جاتا۔ آگے چل کر یہی تمدنی مشکلیں ان کی کھلم کھلا مخالفت کا سبب
بن گئیں۔ ۴۹۴ قم میں رذیلوں نے اپنی شکایات کے رفع کئے جانے کا
مطالبہ کیا اور جب اس سے انکار کیا گیا تو انھوں نے روما سے ہجرت کرنے کا
قصد کر لیا اور روما سے قریب ایک پہاڑ پر جو کوہ مقدس کے نام سے مشہور
تھا جا کر قیام کیا۔ اسی پہاڑ پر سے انھوں نے اعلان کیا کہ اگر ان کے
مطالبات قبول نہ کئے گئے تو وہ اپنی علیحدہ سلطنت قایم کر لینگے۔ مگر
سلطنت روما کا بقا بغیر رذیلوں کے دشوار تھا اس لئے شرفا کو انکے مطالبات
قبول کرنے پڑے لیکن جس طریقہ پر یہ مصالحت عمل میں آئی وہ عجیب و غریب
ہے۔ رذیلوں کو تو شرفا کے حقوق نہیں دیے گئے مگر ان کو اختیار دیا گیا کہ
اپنے مجسٹریٹ اور دیگر انتظامات الگ کر لیں۔ یہ مجسٹریٹ ٹریبیون کہے جاتے
تھے جن کی تعداد بالآخر دس تک پہنچ گئی۔ ان کے حالات اور اختیارات
روما کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب چیز ہیں۔ ان کو اختیار تھا کہ سلطنت کے
معمولی مجسٹریٹوں کے احکام منسوخ کر دیں یا ان میں ترمیم کریں اور سینٹ العوام
میں ان کے فیصلوں کے خلاف میں مرافعہ پیش کرائیں یا کمیٹیا میں کسی معاملہ
کو پیش ہونے سے روک دیں۔ اس کے علاوہ انھیں خود بھی کچھ اختیارات
حاصل تھے۔ بعض مقدمات کی وہ خود سماعت کر سکتے تھے اور ان کا اہم ترین

اقتدار یہ تھا کہ وہ کمیشیا کے جلسے منعقد کرانے کے مجاز تھے اور ان جلسوں میں شمار آرا دولت و مال کی بنا پر نہیں ہوتا تھا بلکہ تعداد پر۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ ان جلسوں کے فیصلوں کے پابند صرف رزیل ہوتے تھے۔ رزیلوں نے جو نظام سلطنت قائم کر دیا تھا اس کے لحاظ سے گویا روما کے قلب میں ایک دوسری سلطنت پیدا ہو گئی تھی یعنی طبقہ ادنیٰ کی مجالس کو سلطنت روما سے وہی تعلق ہو گیا تھا جو زمانہ حال میں مجالس اہل حرفہ کو مالکان کارخانجات سے ہوتا ہے۔ اگر یہ حقوق ایک دوسرے کی تخریب کے لئے استعمال کئے جاتے تو لازمی تھا کہ سلطنت کے تمام کاروبار بند ہو جاتے مگر ایسا نہیں ہوا اور باوجود اس دوعملی کے نظام سلطنت کا جمہوریت کے خاتمہ تک قائم رہنا خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ دونوں گروہوں میں رقابت بھی تھی رومیوں کے زبردست حب قوم کی دلیل ہے۔

لیکن ۴۹۴ق م میں جن شرائط پر مصالحت ہوئی تھی وہ دیرپا ثابت نہ ہوئیں کہ دونوں گروہوں کا ایک دوسرے میں جذب ہو جانا ناگزیر ہو گیا۔ روما کے ارتقاء سیاسی کے صرف چند واقعات کا ہم ذکر مختصر طور پر کریں گے لیکن اس کے ساتھ یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ یہ انقلابات جس زمانہ میں عمل میں آئے سلطنت روما اطالیہ میں اپنے مقبوضات کو وسعت دے رہی تھی اور اگر بیرونی جنگوں کا دباؤ نہ ہوتا تو اغلب ہے کہ شرفا و رذلا کے مطالبات آسانی سے قبول نہ کرتے۔ رزیلوں نے ۴۶۹ق م میں پھر ایک قدم آزادی کی طرف بڑھایا اور مطالبہ کیا کہ قوانین روما بعد تدوین شائع کئے جائیں کیونکہ تصفیہ مقدمات کا دارومدار رسم و رواج پر تھا جس کے جاننے اور سمجھنے والے صرف عہدہ داران عدالت تھے جو سب شرفا میں سے ہوتے تھے اس لئے روما کے رزیلوں کو یہ خیال ہوا کہ ان عہدہ داروں کے ظلم و جبر سے بچنے کی یہی تدبیر ہے کہ تمام قوانین ضبط تحریر میں آجائیں۔ اس مطالبہ پر ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے قوانین موجودہ کے متعلق تحقیقات عمل میں لا کے انکو ”الواح دوازدہ“ پر لکھوایا اور عوام میں شائع کیا۔ یہ قوانین روما

کی تدوین کی پہلی کوشش تھی جن کو تمام یورپ میں مقبولیت حاصل ہوئی مگر قوانین مذکورہ کے شائع ہوتے ہی رذیلوں نے مزید مطالبات پیش کئے اور پھر ہجرت کی دھمکی دی۔ ۴۴۹ ق م میں ان کو اپنے منصوبوں میں پوری کامیابی ہوئی اور قوانین "ویلیرین" کی رو سے یہ طے ہوا کہ مجالس عوام کے فیصلے کی پابندی تمام قوم رومی پر لازمی ہوگی۔ ان قوانین کے نفاذ سے نظام سلطنت میں دو متضاد مجالس کے قیام سے جو دوعملی پیدا ہوگئی تھی اس کا خاتمہ ہوگیا اور سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔ گویا اب دو مجالس ہوگئیں ایک کینٹیا اور دوسری مجلس قبائل۔ اول الذکر میں اہل مال و زر کو غلبہ حاصل تھا اور دوسری میں جمہور کو۔ ان دونوں کے فرائض مختلف تھے مگر ان کے فیصلوں اور احکام کی پابندی سب پر لازمی تھی۔ سیاسی حقوق کے ملجانے کے بعد رذیلوں کو صرف ایک شکایت اور باقی رہ گئی یعنی یہ کہ سلطنت کے عہدوں تک وہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس شکایت کے بالکلیہ رفع ہوجانے کے لئے سو سال تک انتظار کرنا پڑا مگر ۴۴۵ ق م میں ان کا مقصد ایک حد تک حاصل ہوگیا۔ رومیوں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے دستور میں کوئی لفظی تغیر کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور حقوق دیتے جاتے تھے۔ اس ذریعہ سے یہ طے پایا کہ آئندہ سے ہر سال یا تو کانسل منتخب کئے جایا کریں جو شرفا میں سے ہوتے تھے یا دو فوجی ٹربیون با اختیارات کانسلاں" جو شرفا یا رذیلوں ہر دو گروہ میں سے منتخب ہوسکتے ہیں۔ اس اصلاح کے بعد غریب تر رذیلوں کو صرف یہ شکایت رہ گئی کہ اطالیہ کے اضلاع مفتوحہ میں زمینوں کا بڑا حصہ یا تو شرفا نے غصب کرلیا تھا یا خوش حال رذیلوں نے اور ان کے حقوق کا کچھ لحاظ نہ کیا گیا۔ زمینات مفتوحہ کے متعلق غالباً آپس میں سخت بدمزگی پیدا ہوگئی تھی مگر ۳۶۷ ق م میں قوانین لی سی نی پاس ہوئے جو دس سال بعد جاری ہوئے۔ قوانین مذکورہ کے دو جزو تھے ایک تمدنی اور دوسرا سیاسی جن کی رو سے ہر شہری کی زمینات مقبوضہ کا رقبہ محدود کردیا گیا اور ہر زمیندار پر لازمی کردیا گیا کہ مزارعین میں ایک مقررہ تعداد آزاد مزدوروں کی رکھے۔ قوانین مذکورہ سے اس زمانہ کی

تمدنی مشکلات کا پتہ چلتا ہے جن کا ذکر متعاقب آئیگا۔ قوانین مذکور کا سیاسی جزویہ تھا کہ کانسل دوبارہ قایم کی گئی مگر اس شرط پر کہ دونوں کانسلوں میں ایک لازمًا رزیلوں میں سے ہو اور دونوں بھی ہو سکتے تھے

ان قوانین کے نفاذ سے شرفا اور رزیلوں کے آئے دن کے قضیے گویا تمام ہو گئے گو شرفا کی کچھ خفیف سی فوقیت باقی رہ گئی جس کے برقرار رکھنے پر وہ مُصر تھے ساتھ مُصر تھے شہریان روما میں مساوات کلی قائم ہو گئی مگر جس طریقہ سے کہ بعد یہ مساوات حاصل ہوئی تاریخ دنیا میں یگانہ ہے۔ رومیوں کو یہ دعوے ہی تھا کہ یہ مقصد انھیں بغیر کشت و خون کے حاصل ہوا۔ گو یہ دعوے مبالغہ آمیز ہے مگر اس میں شک نہیں کہ تاریخ دنیا میں ایسی نظیر نہ ملیگی جہاں مساوات امن و امان کا قیام آئینی طریقہ سے عمل میں آیا ہو اور بلا شبہہ اس قضیہ کے بغیر خونریزی طے ہو جانے سے اجزاء سلطنت میں ایک زبردست اخوت پیدا ہو گئی ورنہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہوتے۔ اور اس سیاسی جد و جہد کا امن و امان کے ساتھ ختم ہو جانا زمانہ مابعد میں روما کی فتوحات کا باعث ہوا۔

اب صرف ایک اور بات کا ذکر کرنا ضروری ہے قبل اس کے کہ ہم فتح اطالیہ کا تذکرہ کریں۔ سلطنت شاہی کے اختتام کے بعد بجائے بادشاہوں کے دو کانسل مقرر کئے گئے اور ایک عرصہ تک ان کے علاوہ ریاست میں کوئی عہدہ دار نہ تھا۔ لیکن ضرورت زمانہ کے بعد دوسرے عہدے بھی قائم کئے گئے جن میں کانسلوں کے فرائض تقسیم ہو گئے۔ عدالتی کام کے لئے پریٹرس کا تقرر ہوا اور شہریوں کی فہرستیں بنانے اور سینیٹ میں تقررات کرنے کا کام سنسرز کے تفویض ہوا۔ شہر روم کی صفائی اور پولیس کے فرائض ایڈیلس کے سپرد ہوئے اور قوانین لی سی نی کے نفاذ کے بعد ٹریبیون بھی جن کا مقصد رزیلوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہوا تھا سلطنت کے معمولی انتظامی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایک عہدہ "ڈکٹیٹر" تھا جو تمام رومی خدمات سے جداگانہ تھا۔ سلطنت روما میں کوئی عہدہ دار یا مجلس ایسی نہ تھی جو اس کی دوامی

فوجی ضروریات کی سربراہی کر سکتی گو مجلس سینیٹ اس کمی کو اپنی دوامیت اور جب قومی سے ایک حد تک پوری کرتی تھی۔ مگر سخت آزمائش یا مشکل کے وقت رومی کسی سربرآوردہ آدمی کو ڈکٹیٹر مقرر کر دیا کرتے تھے جو ضروریات کے لحاظ سے بلا مشاورت غیرے اپنی رائے سے احکام دیتا۔ اس عہدہ دار کی میعاد صرف چھ ماہ کی ہوتی اور بالکل خود مختار رہتا۔ ڈکٹیٹر کا تقرر گویا ایک محدود میعاد کے لئے حکومت شاہی کا دوبارہ قایم کرنا تھا۔

فتح اطالیہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ روما ایک شہری سلطنت تھی جس کی حدود رفتہ رفتہ وسیع ہوتی گئیں یہاں تک کہ قریباً تمام جزیرہ نمائے اطالیہ اس کے قبضہ میں آگیا۔ مگر یہ فتوحات عرصۂ دراز کی بنرد آزمائی کے بعد حاصل ہوئیں جس کی تفصیل بالکل تاریکی میں چھپی ہوئی ہے اور رومیوں کی تاریخوں میں ان فتوحات کے جو تذکرے ہیں وہ ناقابل اعتبار ہونے کے علاوہ خود ستائی سے بے حد مملو ہیں۔ روما کے مختلف حریف اس سے متعدد خصوصیات میں افضل تھے اس لئے اس کے فتوحات کے اسباب میں زیادہ کاوش کرنا بھی دشوار ہے اور چند اہم واقعات کا ذکر کرنا کافی ہوگا۔ روما کے قریب ترین ہمسائے شمال میں اٹرسکی تھے اور جنوب میں لاطینی۔ لاطینیوں کے ساتھ روما کے تعلقات ابتدا ہی سے خوشگوار اور دوستانہ تھے اس لئے اٹرسکیوں کے ساتھ جو سلسلۂ رزم پیکار جاری رہا اس میں رومی اتحاد لاطینی کے صدر رہتے۔ اگر اٹرسکیوں کی بستیوں میں اتحاد ہوتا تو یقیناً وہ روما پر غالب رہتے چونکہ تعداد اور دولت میں وہ رومیوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ اسی پھوٹ کی وجہ سے روما کو شہر وی ای پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ لاطینیوں کے اضلاع سے آگے دوسری تومیں تھیں جن میں سے تین ایکوی، واسکی، ہرنی کی قابل ذکر ہیں۔ ان لڑائیوں کی ابتدا سے اپنی بقا کے اختتام تک روما نے یہ اصول ہمیشہ مد نظر رکھا کہ "تفرقہ ڈالو اور فتح کرو"۔ اسی اصول پر کاربند ہو کر رومیوں نے ہرنیکیوں سے جن کا علاقہ ایکوی اور واسکی

کے وسط میں تجارتی اتحاد جوڑا اور ساٹھ سال کی جنگ و جدال کے بعد روما کو
ان دونوں آخر الذکر اقوام پر غلبہ حاصل ہوا اس کے بعد انھیں کبھی کبھی سر اٹھانے
کی جرأت ہوتی رہی مگر آزادی پھر حاصل نہ ہو سکی۔ اسی زمانہ میں ۳۹۶ ق م میں
رومیوں نے قوم وی ای کو بھی مغلوب کر لیا۔ مگر اپنے عروج کے ابتدائی زمانہ
میں رومیوں کو ایک نہایت سخت خطرہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ غالیوں کی ایک جماعت
کثیر اٹرسکیوں پر شمال سے حملہ آور ہوئی اور اٹرسکیوں کی فوجوں کو شکست دیتی
ہوئی رومیوں پر بلائے بے درماں کی طرح آ پڑی دونوں فوجوں کا روما کے قریب
اے لیا ندی پر مقابلہ ہوا جس میں روما کی فوج کے غالیوں کے زبردست حملہ کی
تاب نہ لا سکی۔ شہر روما پر غالیوں کا قبضہ ہو گیا اور قریب تھا کہ اس کا ہمیشہ کے
لئے خاتمہ ہو جائے مگر حقیقت میں غالیوں کے حملہ سے روما کو تقویت پہنچی کیونکہ
اٹرسکی ہمیشہ کے لئے ضعیف ہو گئے لیکن رومی اپنے قومی اتحاد اور زبردست
حب وطن کی وجہ سے پھر پنپ سکے اور جب غالی حملہ آور واپس گئے تو
رومیوں نے پھر زور پکڑا اور اپنے مقامی دشمنوں سے لڑنے لگے۔ قوانین
لی کی نی کے نفاذ کے بعد سلطنت روما اندرونی خرخشوں کے مٹ جانے
سے اور بھی طاقتور ہو گئی اور اس کے اہم فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔
اٹرسکیوں کے شہروں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا گیا اور اس کے بعد غالیوں
نے جب پھر اطالیہ میں دخل در معقولات کرنے کی جرأت کی تو انکو دندان شکن
جواب دیا گیا۔ ان فتوحات سے روما کا نام اطالیہ کے حدود کے باہر بھی مشہور
ہوا اور قرطاجنہ کی زبردست تجارتی سلطنت سے بھی رومیوں نے اتحاد پیدا
کیا جو بعد ان کی حریف ثابت ہوئی ۳۴۳ ق م میں سامینوں اور رومیوں میں
الحانیہ میں حصول تفوق کے لئے لڑائی شروع ہوئی۔

سامینوں کے ساتھ جنگ سال مذکور میں شروع ہوئی مگر معلوم نہیں کہ
کب اس جنگ کا سلسلہ ختم ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس کا اختتام ۲۹۰ ق م میں ہوا
مگر یہ جنگ دوسرے ناموں سے اس کے بعد بھی جاری رہی اور سامینوں کی
مخالفت کا ۸۲ ق م تک خاتمہ نہیں ہوا لیکن ان جنگوں کو جنگ ہائے سامنی

کہنا ہی غلطی ہے کیونکہ اس سلسلۂ جنگ میں ان تمام لڑائیوں کا شمار ہے جو رومیوں اور اطالیہ کے دوسری اقوام کے درمیان ہوتی رہیں کیونکہ ان کو روما کی ماتحتی ناگوار تھی اور وہ اس کوشش میں تھیں کہ روما کے جوئے کو اپنے کندھے سے اتار دیں۔ اس میں نہ صرف سامنی یا اٹرسکی شریک تھے بلکہ یونانی اور سابن بھی تھے اور ایک دفعہ ایک مقدونی فوج بحیرۂ ایڈریاٹک عبور کر کے رومیوں سے لڑنے آئی تھی۔ رومیوں کے دشمنوں میں سامنی نہایت جری اور مستقل مزاج تھے اس لئے جب روما کے خلاف کوئی تحریک پیدا ہوتی تھی تو ان کا زبردست حصہ ہوتا تھا۔ سامنی پہاڑوں پر رہنے کے سبب سے نہایت جری تھے۔ قومیت کے لحاظ سے رومیوں کے ہمجنس تھے مگر تمدن اور تجارت میں رومیوں سے کمتر تھے۔ ان کے کوہی مسکنوں تک رومی مشکل سے پہنچ سکتے تھے اور اپنے انجام کو پہنچنے کے قبل رومیوں کو کئی دفعہ ان سے شکست ہوئی۔

جنگ ہائے سامنی کا آغاز ۳۴۳ قبل مسیح سے ہے جب کہ اس قوم نے کامپانیا کے زرخیز علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے باشندوں نے عاجز آکر روما سے امداد کی درخواست کی۔ چند ہی روز کی جنگ کے بعد سامنی کامپانیا سے نکال دیئے گئے اور رومیوں کی سیادت اس دلفریب خطے پر قائم ہوگئی۔ دوسری جنگ سامنی کے قبل رومیوں کو ایک دوسری مصیبت کا سامنا ہوا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ رومیوں کو اتحاد لاطینی کی صدارت حاصل تھی اور لاطینیوں نے روما کو اس کے محاربات اور یورشوں میں وفاداری کے ساتھ ساتھ دیا تھا مگر مسلسل فتوحات کے سبب سے رومیوں کا اقتدار اتحاد لاطینی میں بڑھتا گیا جو لاطینیوں کو ناگوار تھا۔ انھوں نے مساوات کی خواہش کی اور مطالبہ کیا کہ ہر سال ایک کانسل لاطینی ہو۔ رومیوں نے انکار کیا اور فوراً جنگ شروع ہوگئی جو دو سال تک جاری رہنے کے بعد رومیوں کی فتح پر ختم ہوئی۔ اتحاد لاطینی ٹوٹ گیا اور روما نے اپنی "تفرقہ اور فتح" کی پالیسی کے لحاظ سے ہر لاطینی ریاست کے ساتھ علٰحدہ علٰحدہ صلح کی۔

دس سال کے بعد (۲۲۷) دوسری جنگ سامنی شروع ہوئی جس میں سلطنت روما
کی ہستی معرض خطر میں آگئی۔ رومیوں نے دو کانسلوں کے زیر علم ایک فوج
بھیجی مگر وہ کمین گاہ میں پھنس گئی اور ہتھیار ڈال دینے پر رومیوں کی نوآبادیاں
چھن گئیں اور دوسری قوموں نے جب دیکھا کہ سامنیوں کے اقبال کا ستارہ
چمک رہا ہے تو وہ بھی انھیں کی شریک ہوگئیں گویا تمام اطالیہ روما کا دشمن ہوگیا
مگر رومی نہایت استقلال کے ساتھ لڑتے رہے اور آخر کو فتح انھیں کی رہی اور
۳۰۴ ق م میں سامنیوں کو رومیوں کے شرائط صلح قبول کرنا پڑے۔ اٹرسکی
اور دوسرے شرکائے جنگ اس سے قبل ہی جنگ سے الگ ہو چکے تھے۔ مگر
یہ صلح دیرپا ثابت نہیں ہوئی ۲۹۸ ق م میں سامنیوں نے پھر ہتھیار اٹھائے
اور اٹرسکی ان کے شریک ہو گئے اس جنگ کی لڑائیاں علاقہ اٹرودریا میں
ہوئیں اور سامنیوں کی ایک فوج وہاں اٹرسکیوں کی امداد کے لئے پہنچی مگر
۲۹۵ ق م میں رومیوں نے اپنے دشمنوں کو بمقام سین ٹی نم شکست فاش دی
اور سامنیوں کو پھر روما کے شرائط صلح قبول کرنے پڑے۔ مگر اس جنگ کے
بعد بھی رومیوں کو چین نہیں ملا اور تمام اطالیہ میں کسی نہ کسی قوم سے جنگ کا سلسلہ
جاری رہا۔ اٹرسکیوں نے پھر بغاوت کی اور چند اقوام غالی کو اپنی امداد کے
لئے بلایا مگر ایک لڑائی میں جو جھیل وادی مو کے قریب ہوئی روما نے اپنے
ان دشمنوں کو ہمیشہ کے لئے کچل کر بے دست و پا کر دیا۔ ۲۸۱ ق م میں رومیوں
کو ایک نئے دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اطالیہ کے جنوبی سواحل کے یونانی شہروں
نے اطالی جنگوں میں بہت کم دلچسپی لی تھی اور غالباً وحشی سامنیوں کی طاقت
کے ضعیف ہونے سے اور ایک متمدن سلطنت کے قوی ہو جانے سے
ان کو ایک گونہ اطمینان بھی تھا۔ مگر رومیوں کے فتوحات نے انکے مقبوضات
کو بہت وسیع کر دیا تھا اور یونانی نوآبادیوں کی حدود تک پہنچ گئے تھے
جس کے سبب سے یہ لازم آگیا تھا کہ روما اور یونانی نوآبادیوں کے آئندہ
تعلقات کا تصفیہ ہو جائے۔ جنوبی اطالیہ کے یونانی شہروں میں اہم ترین شہر
ٹارینٹم تھا۔ اس شہر کی بندرگاہ بہت بڑی سی تھی اور قدرتی موقع کے

سبب سے اس کی حفاظت چنداں دشوار نہ تھی اس لیے بحیرۂ آئونیہ میں تجارت اور جنگ کے لیے اس شہر کو اچھا موقع حاصل تھا۔ رومیوں سے اس شہر سے مخالفت نہ تھی مگر اس کے بندرگاہ میں رومی جہازوں پر حملہ کر دینے سے جنگ چھڑ گئی۔ یہ لوگ روما کی طاقت سے ناواقف تھے اور بے سوچے سمجھے جنگ پر کمر بستہ ہو گئے مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ان کی افواج روما کی افواج کے مقابل میں بالکل ہیچ ہیں اور وہ بغیر امداد نہیں لڑ سکتے اس لئے انھوں نے پرہس شاہ ایپائرس کو اپنی امداد کے لئے بلوایا۔

ملک ایپائرس سکندر کی سلطنت کا ایک ٹکڑا تھا جہاں اس کے فتوحات کی یادگار ابھی تک قائم تھی۔ پرہس خود ایک جانباز جنرل تھا جس نے فنون حرب کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا تھا۔ اس جنگ میں رومیوں کو مقدونیہ کے "فلانکس" کے دیکھنے کا پہلا موقع ملا جس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔ رومیوں کی تلواریں چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں اور ان کی صفیں چھدری چھدری برخلاف اس کے مقدونیوں کی تلواریں لمبی لمبی ہوتی تھیں اور ان کی صفیں نہایت گھنی تھیں۔ اس کے علاوہ پرہس کی فوج میں بہت سے ہاتھی بھی تھے۔ اس قسم کی جنگ کا رومیوں کو تجربہ نہ تھا۔ اگر اس جنگ کی تاریخ کسی قابل مورخ نے لکھی ہوتی تو تاریخ روما میں یہ ایک نہایت دلچسپ باب ہوتا۔ مگر نتائج جنگ واضح ہیں۔ رومیوں کے ہتھیار اور ان کی جنگی مہارت اس درجہ کی نہ تھی کہ ان کو فتح نصیب ہو اور متعدد شکستیں ہوئیں مگر آخر کار فتح انھیں کے ہاتھ رہی۔ اگر یہ معمی سمجھ میں آجائے تو سلطنت روما کی عظمت کا راز سمجھ میں آگیا۔ رومیوں کے فتوحات جسمانی قوت یا فوجی جوش پر مبنی نہ تھے گو ان کی بھی کمی نہ تھی بلکہ تدبر، استقلال اور اس کے شہریوں اور حلفاء کی وفاشعاری پر۔ جنوبی اطالیہ کی تمام قومیں یونانی، لوکانی، بروٹی اور بہت سے سامنی پرہس کے ساتھ ہو گئے تھے مگر وسط اطالیہ کی سلطنتیں اس کی ہم نوا رہیں۔ اس کے علاوہ رومی ان سپاہیوں کی جگہ جو لڑائیوں میں ضائع ہوتے جدید سپاہی آسانی سے بھرتی کر سکتے تھے اور ان میں یہ بھی صلاحیت تھی کہ فن حرب کے جدید طریقوں

کو اختیار کریں اور اس کے علاوہ شکست کی انھوں نے مطلق پروانہ کی۔ پرہس کو
بھی اپنے یونانی حلفاء کے ساتھ دقتیں پیش آرہی تھیں کیونکہ انھیں بالطبع تو جی
قواعد اور سخت زندگی سے سخت نفرت تھی۔ اس لئے مجبور ہو کر اس نے سسلی
کا رخ کیا جہاں کے یونانیوں نے اس کو قرطاجنیوں کے مظالم سے نجات
دینے کے لئے بلایا تھا۔ وہاں بھی اس کو فتوحات ہوئے مگر قلعہ لی بے ایم سے
انھیں وہ نہ نکال سکا اور مجبور ہو کر ۲۷۶ق م میں اطالیہ واپس آیا مگر اس مدت میں
اس کے حلفاء اس سے الگ ہو چکے تھے اور رومی بھی پھر سنبھل گئے تھے۔
بی نی وین ٹم واقع سامنیا میں اس سے اور رومیوں سے آخری جنگ ہوئی
جس میں باوجود فلانکس اور ہاتھیوں کے پرہس کو شکست فاحش ہوئی اور
اپنے ملک میں جا کر ایک غیر معروف جنگ میں مارا گیا۔ پرہس پر جو رومیوں کو
فتح ہوئی وہ گویا تنخواہ دار سپاہیوں کے سرگروہ پر ایک ایسی قوم کی فتح تھی
جس کی رگوں میں جذبۂ قومی موجزن تھا۔ رومیوں کی فتح اپنی اخلاقی قوت
اور پیش بینی کے سبب سے ہوئی اور انھیں اوصاف کے سبب سے انھوں
نے قرطاجنیوں کو یک صدی کے بعد مغلوب کیا۔ روایت ہے کہ پرہس کا
قول تھا کہ اگر میں رومیوں کا بادشاہ ہوتا تو ساری دنیا فتح کر لیتا۔ ٹارنیٹم
اور دوسرے یونانی شہروں نے سر اطاعت خم کیا جس کے سبب سے تمام
اطالیہ پر روما کا قبضہ ہو گیا سوا ان ممالک کے جو دریائے پو کے شمال میں تھے
اور جنھیں رومی اطالیہ کے حدود سے خارج سمجھتے تھے۔ دنیا کی دوسری سلطنتیں
بھی روما کو اپنا مد مقابل خیال کرنے لگی تھیں۔ مصر اور قرطاجنہ نے روما کے
ساتھ تعلقات قائم کئے۔ آئندہ جن معاملات میں رومی مصروف رہینگے ان کا
تعلق اطالیہ سے باہر بیرونی ممالک سے ہوگا۔ اب روما کا بحیرۂ روم میں خاص
اثر ہو چلا تھا اور اس کو اس امر کا تصفیہ کرنا تھا کہ بحیرۂ روما کے سواحل کے دوسرے
ممالک سے اس کے تعلقات کیا رہینگے۔

روما نے تمام اطالیہ اپنے قبضۂ اقتدار میں لانے میں جن منازل کو طے
کیا ہے ان کا خاکہ ہم پیش کر چکے ہیں تسخیر اطالیہ بجائے خود ایک زبردست کارنامہ ہے۔

اس کے قبل بھی فتوحات ہوئیں مثلاً سکندر اعظم کے فتوحات مگر روما کے فتوحات کی خاص خوبی ان کی دیرپائی ہے۔ محاربات یونان کا اثر سمندر میں لہروں کے ٹکرانے کے اثر سے زیادہ نہیں۔ سکندر کی سلطنت اس کے مرتے ہی پاش پاش ہوگئی مگر فتوحات روما سے یورپ میں امن و امان کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس لئے فتوحات روما اور انکے دوامی اثر کے اسباب پر غور کرنا ضروری ہے۔ اہم ترین امر اس میں یہ ہے کہ رومیوں کی فوجی تدابیر میں دماغی پہلو غالب ہے۔ بمقابلہ دوسری اقوام قدیم کے رومیوں کو فتح و شکست کی پروا بہت کم تھی۔ ان کی تیاریاں ایسے وسیع پیمانہ پر ہوتی تھیں کہ شکست کی نقصانات کی بہت جلد تلافی کرلی جاتی اور ایک فتح دوسری فتح کا زینہ ہوتی۔ رومی افواج کا ضبط اسپارٹا کے ضبط فوجی سے کم سخت نہ تھا مگر باوجود اس سختی کے اس میں صرف فرائض کی پابندی لازمی نہ تھی بلکہ ہر فرد کے اختیار تمیزی پر بھی بہت کچھ چھوڑ دیا جاتا۔ رومی "لیجن" میں ہر شخص کی جگہ مقرر تھی مگر ہر شخص ایک حد تک اپنے افعال کا مختار تھا اور رومی افواج مقدونیہ کی "فلانکس" کی طرح بالکل مشین نہ تھیں۔ یورپ میں سڑکوں کی تعمیر رومیوں سے شروع ہوئی جس کی وجہ سے رومی اپنے دشمنوں پر نہایت سرعت کے ساتھ حملہ کرتے تھے۔ سڑکوں کی ایجاد کا سہرا رومیوں کے سر ہی ہے۔ اس کے قبل صرف راستے ہوا کرتے تھے۔ اس ایجاد کی اہمیت کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ یہ سڑکیں ابتداءً فوجی اغراض سے بنائی گئی تھیں مگر بعد میں تجارت کو بھی ان کے وجود سے بہت فروغ ہوا۔ سڑکوں کے سبب سے رومی فوراً دشمن کے ملک میں پہنچ جاتے تھے۔ بغاوت کے زور پکڑنے کے قبل ہی اسے فرو کرسکتے تھے گویا ان سڑکوں سے تمام وہ کام لئے جاتے تھے جو اب شمالی ہندوستان کی سرحد کی ریلوں سے لئے جاتے ہیں۔ دوسری جنگ سانی سے سڑکوں کی تعمیر شروع ہوئی۔ پہلی سڑک روما سے علاقہ کامپانیا کو تعمیر کی گئی اور بعد میں برنڈسی تک بڑھا دی گئی اور دوسری سڑکیں بھی شمال اور جنوب مشرق کی طرف بنائی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی سڑکوں کی حفاظت کا سامان کیا گیا ورنہ دشمن بھی ان سڑکوں سے نفع اٹھا سکتے۔ اس مقصد کے لئے رومیوں نے ان سڑکوں پر مناسب موقع پر نوآبادیاں بسائیں۔ مگر رومی نوآبادیوں اور دوسری

نوآبادیوں میں بہت فرق تھا۔ رومی نوآبادی سے مفہوم سپاہیوں کی ایک مستقل جماعت سے تھا جو کسی دشمن کے ملک میں رکھی جاتی اور ان کی قوت بسری کے لئے مفتوح قوم کی زمینات ان کے سپرد کر دی جاتیں۔ اگر نوآبادوں کو روما میں شہریت کے حقوق حاصل ہوتے تو وہ نوآبادی میں بھی قائم رہتے مگر نوآبادیاں ایسی بھی تھیں جن کو شہریت کے پورے حقوق حاصل نہ تھے۔ ان کا فرض تھا کہ اپنی فوجی قوت قائم رکھیں روما کے فوائد کی نگہبانی کریں اور سڑکوں کی حفاظت کریں انھیں نوآبادیوں سے اطالیہ کے اکثر مشہور شہروں کی ابتدا ہوتی ہے۔

روما کو فتوحات ضبط فوجی، نوآبادیوں اور سڑکوں کی بدولت حاصل ہوئے۔ مگر یہ ذرائع بھی بے سود ثابت ہوتے اگر علاقہ جات مفتوحہ کے باشندوں کے ساتھ جو روما کا تعلق پیدا ہوا اس میں حد درجہ کا تدبر نہ برتا جاتا۔ روما نے ان مفتوحہ علاقوں کو اپنی سلطنت کا جزو نہیں بنایا بلکہ ان کو اپنا حلیف بنایا۔ ان تمام حلفا کے ساتھ ایک اہم شرط یہ ہوا کرتی تھی کہ وہ رومی فوجوں کے لئے سپاہیوں کی ایک مقررہ تعداد دیا کریں اور اس زمانہ کے بعد رومی افواج میں حلفاء کی تعداد زیادہ ہوتی جو خراج بھی دیا کرتے تھے۔ فوجی خدمت کے علاوہ دوسری شرائط میں اختلاف عظیم تھا۔ رومیوں کا اصول یہ تھا کہ اپنے حلفار کے حقوق میں فرق رکھتے تاکہ ان پر حکومت کرنے میں دشواری نہ ہو۔ پرہس کے مقابلہ میں جو معاریات ہوئے ان کے اختتام کے بعد حسب ذیل گروہ اطالیہ میں تھے۔ سب سے افضل تو شہریان روما تھے، جو روما اور اس کے مضافات کے علاوہ رومی نوآبادیوں اور بعض دوسرے شہروں میں بھی تھے جنھیں "شہریت روما" کے حقوق ان کی خاص خدمات کے اعتراف میں دے گئے تھے۔ ان سے کمتر چند گروہ تھے جن کو بجائے "شہریت روما" کے "لاطینی حقوق" حاصل تھے۔ ان اقوام کو اپنے اندرونی معاملات کے طے کرنے کی پوری آزادی تھی، ان کی تجارت میں روک ٹوک نہ تھی، رومیوں کے ساتھ شادی بیاہ کر سکتے تھے اور ان میں سے بعض افراد "شہریت روما" کے حقوق بھی حاصل کر سکتے تھے مگر ان کا درجہ رومیوں سے

کمتر تھا اور جنگ میں بھی یہ روما کی لیجن (جیوش) میں شریک نہ کیے جاتے تھے بلکہ خاص افواج میں۔ ان کے بعد حلفا کا درجہ تھا جن کے حقوق مختلف تھے مگر ان کو بھی ایک بڑی حد تک حکومت خود اختیاری حاصل تھی اور سب کو روما کی فوجوں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ ان حلفاء کے باہمی تعلقات اور دوسری اقوام کے ساتھ تعلقات کے متعلق سخت شرائط تھے۔

نظام سلطنت روما یہی تھا۔ اب اقوام مفتوحہ کے ساتھ جو سلوک انھوں نے کیا اگر آپ اس کا مقابلہ اس سلوک سے کریں جو ایتھنز اور اسپارٹا کے لوگ اپنے مفتوحین کے ساتھ کرتے تھے تو ظاہر ہوگا کہ رومیوں کا سلوک حد درجہ کی فراخدلی پر مبنی تھا اور انھوں نے اپنی اس فراخدلی اور تدبر کا پھل پایا۔ ان کے حلفاء ہمیشہ وفاشعار رہے گو بعض وقت بغاوت پر بھی آمادہ ہو جایا کرتے تھے۔ سلطنت روما کے تدبر اور قیام امن و امان کے سبب سے تمام اطالیہ ان کے قبضہ میں آگیا اور رفتہ رفتہ بحیرۂ روم کے تمام ممالک پر اس کا اثر پھیل گیا۔

رومی فتوحات کی ایک دوسری وجہ کی طرف گذشتہ باب کے آخر میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی جنگ کے نازک زمانے میں ڈکٹیٹر کا تقرر۔ یہ روایت ہے کہ جنگ ہائے غالیہ کے زمانے میں کیامی لس پانچ بار ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا اور اس جانباز جنرل کی لاجواب بہادری فراخدلی اور خوش قسمتی رومیوں میں ضرب المثل ہو گئی۔ جنگ ہائے سامنی کے زمانے میں کئی شخص ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے۔ یہ رومیوں کی خاص خوبی تھی کہ وہ ایک دوسرے پر کامل اعتماد رکھتے تھے اور ذاتی رقابت کا کبھی خیال بھی نہ کرتے تھے۔ آزادی کی وہ پرستش کرتے تھے مگر اعتدال کے ساتھ اور ان میں یہ احساس تھا کہ بعض مواقع ایسے بھی ہیں کہ تقویت حاصل کرنے کے لیے آزادی سے باز آنا ہی بہتر ہے۔ جنگ میں ضروری ہے کہ ہر معاملے کا تصفیہ عجلت اور اخفاء کے ساتھ کیا جائے اور یہ بات سینیٹ اور کمیٹیا کے مباحث سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

ہر شخص جمہور کا دلدادہ تھا اس سے کبھی اس بات کا اندیشہ پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ڈکٹیٹر چھ مہینے کے بعد اپنے اقتدارات سے سبکدوش ہونا پسند نہ کرے گا۔ روما کی تاریخ میں رومیوں کی اخلاقی قوت قابل توصیف نظر آتی ہے اور اپنے قابل ترین افراد سے بحیثیت مجموعی رومی زیادہ قابل ستایش ہیں۔

محاربات روما و قرطاجنہ

رومی اب تمام ملک اطالیہ پر مسلط ہو چکے تھے مگر ان کے فتوحات کا سلسلہ ملک اطالیہ تک محدود نہیں رہا بلکہ اطالیہ ان کی شہنشاہی کا پہلا زینہ تھا۔ اس ملک کا جغرافی موقع ایسا نہیں ہے کہ بیرونی ممالک سے کچھ سروکار نہ رہے۔ سسلی قریب قریب اطالیہ کا ایک حصہ ہے اور جب سسلی پر قبضہ ہو جائے تو افریقہ کے شمالی سواحل کچھ دور نہیں۔ اطالیہ کے مغربی ساحل پر جزائر سارڈینیا و کرسکا ہیں۔ اگر ان پر کسی مخالف ریاست کا قبضہ ہو تو سلطنت اطالیہ کو ادھر سے ہر وقت حملہ کا خطرہ رہتا ہے۔ ان وجوہ کے سبب سے رومیوں کو بحیرۂ روم کے ساحلی ممالک کے قبضہ کے لئے قرطاجنیوں کے ساتھ مجادلۂ عظیم کرنا پڑا۔ مورخین یورپ نے قرطاجنیوں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ قرطاجنیوں کے ادبیات اور فنون لطیفہ کے صرف منتشر اجزا ہم تک پہنچتے ہیں اور ان کے عروج و زوال اور دیگر تاریخی اور تمدنی حالات کے ذرائع صرف انکے دشمنوں کی تحریریں ہیں جنھوں نے ان کے تمدن کو نیست و نابود کر دیا۔ جو مواد ہمارے سامنے موجود ہے اس سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ تمدن یورپ کی ترقی میں ان کا کوئی حصہ ہے لیکن اگر ان کے مزید حالات ہمیں معلوم ہوتے تو ممکن تھا کہ ہماری رائے کچھ اور ہوتی۔ قرطاجنی بخلاف رومیوں اور یونانیوں کے نسل سامی میں سے تھے اور ابتداءً قرطاجنہ میں شام کے شہر ٹائر (سور)

سے آکر آباد ہوئے۔ ان کی آبادیاں بحیرہ روم کے مغربی ساحل کے متعدد مقامات
میں تھیں۔ اس قوم کے مشاغل بالکل تجارتی تھے۔ یونانیوں کو تجارت میں خاص
درک تھا اور رومیوں کی پالیسی بھی یہی تھی کہ اپنی تجارت کو فروغ دیں مگر
قرطاجنیوں کو تجارت کے علاوہ کوئی اور دلچسپ مشغلہ نہ تھا۔ شمالی افریقہ میں
یہ قوم بطور فاتح آباد ہوئی تھی مگر دیسی باشندوں کی تالیف قلوب میں انھیں کبھی
کامیابی نہ ہوئی۔ رومیوں کے مقابلہ میں ان کے نظام سیاسی میں اتحاد کی کمی
تھی۔ رومیوں کی شہریوں کی فوجوں کے مقابلہ میں کارتھیج کی افواج میں اجیر
سپاہی تھے جنھیں صرف اپنی تنخواہ سے سروکار تھا۔ گو یہ سپاہی نہایت جری تھے
اور قابل جنرلوں کے زیر علم خوب لڑتے تھے مگر جیوش روما کی طرح سخت وسرد
برداشت نہ کر سکتے تھے۔ رومیوں نے تمام اطالیہ کو اپنے حزم واستقلال اور تدبر
سے اپنا حلیف بنا لیا تھا مگر قرطاجنیوں نے اپنی مفتوحہ اقوام کی تالیف قلوب
میں بہت کم کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ دیسیوں کو انھوں نے مغلوب
کر لیا تھا مگر وجوہ مذکورۂ بالا کے سبب سے دیسی آبادی کبھی ان سے خوش
نہیں رہی اور ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں سے ملجانے پر تیار رہی۔ قرطاجنہ میں
ابتدا ٔ سلطنت شاہی قائم تھی مگر تیسری صدی قبل مسیح کے وسط میں سلطنت
خواص قائم ہوگئی جس میں تجارتی عنصر غالب تھا اور ان کا دستور سیاسی وہی
تھا جو جمہوریت وینس کا چودھویں اور پندرھویں صدی میں تھا۔ تمام
اقتدارات ایک مجلس کو حاصل تھے جس کے اراکین کی تعداد ۱۰۴ تھی جو جائداد
ہائے خالی شدہ کو خود ہی پر کرتے تھے۔ میدان جنگ میں سپہ سالاروں کے
اختیارات بالکل غیر محدود ہوتے تھے۔ قرطاجنیوں کے علمی کارناموں کا ہمیں
علم نہیں۔ ان کے مذہب کا کچھ ضعیف سا حال معلوم ہے جس سے وحشیانہ پن و جہالت
کی بو آتی ہے۔ ان کے معبودوں میں دو مشہور ہیں ایک بعل جس کے سندروں
میں انسانی قربانیاں ہوتی تھیں اور دوسرا اسٹارٹی جس کی پرستش میں بیان
کیا جاتا ہے کہ طرح طرح کی بداعمالیاں ہوتی تھیں۔

رومی قرطاجنیوں سے عرصہ سے واقف تھے اور ایک آدھ دفعہ ایسا

بھی ہوا تھا کہ دونوں مل کر کسی تیسری سلطنت سے لڑے بھی تھے۔ سسلی میں ان دونوں اقوام میں پہلے پہل مقابلہ ہوا۔ اس جزیرہ کو تصرف میں لانے کا قرطاجنیوں کو عرصہ سے خیال تھا گو اس کے سواحل پر آزاد یونانی ریاستیں بھی تھیں۔ لڑائیوں کا آغاز یوں ہوا کہ رومیوں نے بلا کسی معقول وجہ کے میسنا پر قبضہ کرلیا مگر اصل وجہ یہ تھی کہ ہر دو اقوام کا منشا تھا کہ جزیرۂ سسلی کو اپنے تسلط میں لائیں۔ قرطاجنیوں کے ساتھ پہلی جنگ جو "جنگ فنیقی" کے نام سے مشہور ہے ۲۶۴ سنہ سے ۲۲۱ سنہ ق م تک جاری تھی مگر بخوف طوالت اس کا سرسری تذکرہ کرنے سے بھی ہم معذور ہیں گو اس کی دلچسپی میں شک نہیں۔ جزیرۂ سسلی کے قبضہ کے علاوہ اس جنگ سے ایک غرض یہ تھی کہ بحری فوقیت کا بھی تصفیہ ہو جائے قرطاجنہ ایک عظیم الشان بحری ریاست تھی۔ رومیوں کے پاس نہ جنگی جہاز تھے نہ انھیں بحری جنگ کا تجربہ تھا گو جنگ ہائے سامنی میں انھوں نے بھی ایک بیڑہ بنا لیا تھا۔ مگر اس جنگ میں رومیوں کو مجبوراً ایک زبردست بیڑہ بنانا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرطاجنیوں کو ہزیمت دیکر انھوں نے سسلی پر قبضہ کرلیا۔ رومیوں کی کامیابیوں کے متعلق ان کے مورخوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے مگر جو خاکہ ہم نے کھینچا ہے اس کی صحت میں شک نہیں کیونکہ جنگی ضروریات کو فوراً رفع کر دینا رومیوں کی ایک ممتاز خصوصیت تھی۔ رومیوں نے قرطاجنی جہازوں کے نمونے پر جہاز بنائے اور اس کے علاوہ ایک اوزار ایجاد کیا جس کے ذریعے سے دشمن کے جہاز کو اپنے جہاز میں جکڑ دیتے اور پھر دست بدست مقابلہ شروع ہو جاتا تھا جیسا کہ خشکی میں ہوتا ہے۔ اس طرح سے جنگ کے ابتدائی زمانہ میں روما کو دوبارہ فتح حاصل ہوئی اور ۲۵۶ سنہ ق م میں انھوں نے افریقہ پر فوج کشی کی تاکہ خود قرطاجنہ پر قبضہ کرکے جنگ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر اس فوج کو افریقہ کے سواحل پر اترتے ہی شکست ہوئی کئی رومی بیڑے طوفانوں کی نذر ہوئے اور خود سسلی میں جہاں رومیوں کو فوقیت حاصل تھی دو شہر یا نورامس اور للی بیم نہایت جرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس آخر الذکر قلعہ کے محاصرہ کے ساتھ گویا اس جنگ کا خاتمہ ہوا۔

قرطاجنیوں کا سپہ سالار ہملکار بارکا نہایت قابل تھا۔ اور رومی بیڑوں اور افواج کو کئی مرتبہ اس سے ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ہملکار کی قابلیت کے علاوہ رومیوں کے پاس روپیہ کی بھی کمی تھی جس کی وجہ سے اس جنگ نے بہت طول پکڑا مگر آخر کار سلطنت روما اور اس کے محب وطن باشندوں کی سعی بلیغ سے ۲۴۱ ق م کے پاس قرطاجنیوں کو شکست فاش ہوئی اور سر تسلیم خم کر کے جزیرہ سسلی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑا۔ جزیرہ کا مشرقی حصہ اب بھی شہر سیرا کیوز کے قبضے میں تھا مگر باقی تمام حصہ روما کے قبضے میں آگیا۔ اطالیہ سے باہر سلطنت روما کا پہلا مقبوضہ ثابت ہوا۔ رومیوں نے اپنی دو ممتاز خصوصیتوں یعنی جدت اور استقلال کی وجہ سے اطالیہ کو مسخر کیا تھا اور انھیں خصوصیات کے بدولت شہنشاہیت کا پہلے زینہ طے کرنے میں بھی انھیں کامیابی ہوئی۔

مگر اس ہزیمت سے ریاست قرطاجنہ بالکل ضعیف نہیں ہوئی اور اس سے احتمال تھا کہ دونوں قومیں پھر بھی نہ کبھی برسر پرخاش ہو جائینگی۔ ۲۴۱ سنہ سے ۲۱۸ سنہ ق م تک صلح قائم رہی اور پھر دوسری "جنگ پیونک" شروع ہوئی جس نے روما اور قرطاجنہ کے قضیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ مگر اس جنگ کے آغاز کے قبل دوسرے اہم واقعات ہوئے ہیں جن کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ دونوں حریف سلطنتوں کے باہمی تعلقات اور طرز جنگ پر اس کا بیّن اثر پڑا ہے۔ رومیوں نے اس زمانے میں اپنی سلطنت کو شمال کی طرف وسعت دیکر کوہ آلپس تک پہنچا دیا۔ سلسلہ ہائے کوہی آلپس و آپی نائنس کے درمیان جو ملک ہے اس میں قوم گال آباد تھی۔ یہ قوم اور ملک وہی ہے جس کو اب فرانس کہتے ہیں اور جس نے ۳۹۰ سنہ میں رومیوں کو شکست فاش دی تھی۔ آلپس تک اپنے مقبوضات کے بڑھانے میں کچھ تو رومیوں کے فوجی اغراض وابستہ تھے اور دوسرے یہ کہ دریائے پو کی وادی زراعتی اغراض کے لئے نہایت مفید ہے۔ جنگ و جدال کا سلسلہ عرصہ تک قائم رہا غالیوں کو خود اپنے پہاڑوں اور جنگلوں میں شکست ہوئی۔ رومیوں کے دو سپہ سالاروں سپیو اور فلامینیس نے اس جنگ میں خاص نام آوری حاصل کی اور آخر الذکر نے ایک سڑک روما سے راوینا تک بنوائی۔ لیکن گو غالیوں کا ملک

برائے نام فتح ہوگیا مگر ان کے دم خم باقی تھے اور موقع ملتے ہی انھوں نے رومی جوے کو اپنے سے اتارنے کی کوشش کی۔ اسی زمانہ میں رومیوں نے علاوہ سسلی کے جزائر کرسکا اور سارڈینیا پر بھی قبضہ کرلیا جو اس کے قبل قرطاجنیوں کے قبضہ میں تھے مگر انھوں نے دوبارہ ہتیار اٹھانے سے یہ بہتر خیال کیا کہ رومیوں کے اس تشدد پر سر تسلیم خم کریں۔

قرطاجنہ نے بھی اس زمانہ میں اپنی سلطنت میں معتدبہ اضافہ کیا بلکہ اس کے ہمعصر خیال کرتے تھے کہ روما سے زیادہ اس سلطنت میں وسعت پیدا ہوئی۔ جزائر مذکورۂ بالا کا نعم البدل ان کو ہسپانیہ میں مل گیا۔ تسخیر ہسپانیہ ہملکار بارکا کے خاندان کے ارکین کی اولوالعزمی کا نتیجہ تھی جس نے پہلی جنگ میں رومیوں کو متعدد شکستیں دی تھیں۔ ہملکار اپنی تنخواہ دار فوجوں کی ایک سخت بغاوت فرو کرکے ہسپانیہ کی فتح کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس کا جانشین اس کا بھائی ہسیدروبال ہوا جس کی موت پر اس مہم کا سردار ہملکار کا بیٹا ہینی بال ہوا جس کی شخصیت تاریخ قرطاجنہ میں سب سے بڑی ہے۔ ہینی بال نے ابتدا ہی سے روما سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی۔ اس کے زیر کمان قرطاجنیوں کی فوجیں کوہ پیرینیز تک پہنچ گئیں۔ گو یہ فتوحات محض سطحی تھیں مگر ہسپانیہ میں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو اس فوج کی میدان جنگ میں مزاحمت کرسکتی۔ ۲۱۹ء ق م میں ہینی بال نے ساگنٹم کا محاصرہ شروع کیا جس کے سقوط کے بعد تمام جزیرہ نمائے ہسپانیہ اس کے قبضہ میں آجاتا۔ مگر ساگنٹم نے روما سے حفاظت کی درخواست کی۔ جس پر رومیوں نے ہینی بال کو حکم دیا کہ اس شہر کے محاصرہ سے باز آئے۔ ہینی بال نے حقارت کے ساتھ انکار کیا اور گو آٹھ ماہ کے بعد ہینی بال کو فتح ہوگئی مگر ظاہر تھا کہ روما سے جنگ ضرور ہوگی۔ روما کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ فوجیں فوراً تیار کی گئیں اور ہسپانیہ روانہ کردی گئیں کیونکہ گمان غالب تھا کہ مقابلہ وہیں ہوگا۔ مگر رومیوں کو ابھی ہینی بال سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔

مورخین میں مدت سے یہ بحث درپیش ہے کہ رفتار زمانہ پر غیر معمولی قابلیت کے افراد کا کس قدر اثر پڑا ہے اور کس قدر دوسرے اسباب وعلل کا جو افراد انسانی کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قرطاجنہ کی دوسری جنگ جس طرز پر ہوئی اور جتنی مدت تک جاری رہی وہ زیادہ تر ہینی بال کی قابلیت اور

استقلال کا نتیجہ ہے۔ تاریخ یورپ میں فن سپہگری میں اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ سکندر اعظم، جولیس سیزر اور نپولین بھی اس خطاب کے دعویدار ہوسکتے ہیں مگر اس کی عظمت کو وہ ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ ان کی فتوحات ایسے دشمنوں پر تھیں جو ان سے ہر طرح کمزور تھے۔ سکندر نے ایران کی از کار رفتہ سلطنت اور وحشی اقوام کا قلع قمع کیا۔ سیزر کو جو فتوحات نصیب ہوئیں وہ وحشی اور غیر متمدن غالیوں یا دوسری غیر قواعد داں افواج پر تھیں۔ نپولین کی کامیابی اس غیر معمولی جوش پر مبنی تھی جو انقلاب فرانس سے پیدا ہوا تھا اور یورپ کی دوسری سلطنتوں کی فوجوں کے کمزور ہونے کی وجہ سے۔ مگر ہنی بال نے روما پر اس وقت حملہ کیا جب کہ روما کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا اس کی افواج کے ضبط اور استقلال کا کوئی مدمقابل نہ تھا، اس کی حکمران جماعت نہایت قابل تھی اور اس کے سپہ سالار میدان جنگ میں اپنا کمال دکھا رہے تھے۔ ایسے زمانہ میں ہنی بال کا فتحمند رہنا اور سلطنت روما کا اپنی ہستی کو قائم رکھنا ظاہر کرتا ہے کہ دونوں حریف کس پائے کے تھے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ رومی ہسپانیہ پر فوج کشی کی تیاری کر رہے تھے مگر ہنی بال نے یہ جدت کی کہ اس نے اطالیہ پر خود حملہ کر دیا۔ قرطاجنیوں کو بحیرۂ روم میں بحری فوقیت حاصل نہ تھی، اس لئے وہ ہسپانیہ سے خشکی سے روانہ ہوا اور کوہ پیرینیز کے دروں میں سے ہوتا ہوا سرزمین فرانس میں داخل ہوا اور قصد کیا کہ کوہ آلپس کو طے کرے۔ اس زمانے سے نپولین کے وقت تک بہت سے جرنلوں نے اس سلسلۂ کوہی کو طے کیا ہے یا طے کرنے کا دعوے کیا ہے مگر ہنی بال کو اس معرکۂ عظیم میں جو دشواری ہوتی ہے وہ شاید ہی کسی کو ہوئی ہو کیونکہ اس کے پاس نقشے نہیں تھے اس کے جغرافیائی معلومات محدود تھے، مقامی اقوام اس کی مخالف تھیں مگر اس مرد میدان نے ان مشکلات کی کچھ پروا نہ کی اور اپنے سپاہیوں اور ہاتھیوں کو جو افریقہ کی گرمی کے عادی تھے لیکر کوہ آلپس کے یخ بستہ دروں اور سلسلۂ کوہی کے سنگلاخ راستوں کو طے کرتا ہوا اطالیہ کے میدان میں وارد ہوا۔ رومی جیوش ہسپانیہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے مگر جب دشمن روما کے

دروازوں تک پہنچ گیا تو مجبوراً ان کو واپس بلانا پڑا۔ اس کے ساتھ جو محاربات ہوئے تاریخوں میں ان کا مفصل ذکر ہے۔ ہم بالاختصار بیان کرتے ہیں کہ ہنی بال سے جہاں جہاں رومیوں سے جنگ ہوئی فتح اسی کے ہاتھ رہی اور اس کی فتوحات سے جمہوریت روما کی کمر ٹوٹ گئی۔ ۲۱۸ سے ۲۰۵ ق م تک ہنی بال اطالیہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوچ کرتا رہا اور کوئی اس کا مزاحم نہ ہوا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روما نے اطاعت کیوں نہ قبول کی۔ مگر جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں رومیوں کا نظام سلطنت ایسا زبردست تھا اور ان کا حب وطن اتنا قوی تھا کہ مسلسل ہزیمتوں سے بھی ان کی ہمت نہ ٹوٹتی تھی اور پھر سنبھل کر شکست کو فتح سے بدل دیتے تھے۔ لیکن اگر صرف فوجی نقطۂ خیال سے دیکھا جائے تو ہنی بال کی کامیابی ایک حد معین سے بڑھ نہیں سکتی تھی۔ میدان جنگ میں تو کوئی اس کا مدمقابل نہ تھا مگر محاصروں میں اسے اس قدر کامیابی نہ ہوتی تھی اور بعض مبصرین کو اس کی سپہ سالاری میں بھی تامل ہے اس کے علاوہ خود اس کی قوم اس کی پوری مدد نہیں کرتی تھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ سمندر پر اب قرطاجنہ کا کوئی اثر نہ تھا اور دوسرے قرطاجنہ کے اہل الرائے اسے حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قرطاجنہ کی اس بے پروائی کے سبب سے یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ فی الحقیقت یہ جنگ صرف ایک فرد واحد (ہنی بال) اور ایک پوری قوم (روما) کے درمیان تھی۔

واقعات جنگ بالاختصار حسب ذیل ہیں۔ اطالیہ کے میدان شمالی میں قدم رکھتے ہی رومیوں کو ہنی بال کا لوہا ماننا پڑا۔ رومیوں کے سواروں کے رسالوں کو ٹی کی نس میں ہزیمت ہوئی اور اس کے بعد ہی رومی فوج کو ہنی بال نے ٹری بیا میں شکست فاحش دی جس میں رومیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اس جنگ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہنی بال نے کمال استادی سے کمیں گاہیں بنائی تھیں اور رومی پیادہ سپاہ نے اس میں اپنے ضبط اور استقلال کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے بالآخر اس جنگ کے خاتمہ پر رومیوں کی شکست فتح سے متبدل ہو گئی۔ اس کے بعد ہنی بال نے سلسلۂ کوہ ایپی نائینز کو طے کیا۔ رومیوں نے ایک فوج زیر کمان فلامینیس اس کے

روکنے کے لئے بھیجی مگر اس کو بھی اس نے جھیل ٹراسی مین کے قریب شکست دی۔ اگر اس دوسری صریحی فتح کے بعد ہنی بال نے روما پر حملہ کر دیا ہوتا تو ممکن تھا کہ روما اس کے قبضہ میں آجاتا اور ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گیا ہوتا۔ اس سے رومی خود متحیر تھے اور مورخین بھی شش و پنج میں ہیں مگر ہنی بال نے فیصلہ کیا کہ روما پر حملہ کرنا ابھی مناسب نہیں۔ جنگ ٹریبیا کے بعد علاقۂ شمالی کے غالی بھی تعداد کثیر میں اس کے شریک ہو گئے اور اسے امید تھی کہ روما کی ناگوار حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے وسطی اطالیہ کے باشندے بھی اس کے جھنڈے کے نیچے جوق جوق چلے آئینگے۔ یہ امید گو خوش آئند تھی مگر پوری نہیں ہوئی کیونکہ اطالیوں کو روما سے اس درجہ کی منافرت نہ تھی جو افریقیوں کو قرطاجنہ سے تھی۔ کچھ لوگ ہنی بال کے شریک ہو گئے مگر وسط اطالیہ کے باشندے زیادہ تر وفادار رہے اور انھیں کی وفاشعاری روما کی بقا کا باعث ہوئی۔

رومیوں کی ہمتوں کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ ٹراسی مین کی جنگ کے بعد فے بیس کو انھوں نے ڈکٹیٹر مقرر کیا اور اسی کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ ہنی بال سے کھلے میدان میں نہ لڑا جائے بلکہ اس کی افواج کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے اور جہاں موقع ملے اس کو پریشان کیا جائے۔ مگر ۲۱۶ء میں رومیوں کی پھر کچھ ہمت بندھی۔ جدید کانسل منتخب ہوئے اور انھوں نے افواج کثیر اپنے ساتھ لے کر بمقام کناٹے (جنوبی مشرقی اطالیہ) ہنی بال کے مقابلے کے لئے آئے مگر ان کو ایسی شکست فاحش نصیب ہوئی کہ جس کا صفحات تاریخ میں کہیں ذکر نہیں اور اس فوج کثیر میں سے صرف چند ہزار بچ سکے۔ اس فتح عظیم کے بعد خود ہنی بال کے افسروں نے اس سے اصرار کیا کہ فوراً روما پر حملہ کر دے اور غالباً ان کا اصرار درست بھی تھا۔ مگر ہنی بال پھر وہی لیت و لعل کی چال چلا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ اطالیہ کے تمام باشندوں کو جنھیں روما سے ذرا بھی ملال تھا اپنا شریک کرے اور اسے یہ بھی امید تھی کہ بہت سے افراد خوفزدہ اور مرعوب ہو کر اس کے جھنڈے کے نیچے چلے آئینگے اور ایک حد تک اس کا یہ قیاس صحیح بھی تھا۔ بہت سے سامنی اور جنوب اطالیہ کے یونانی اسکے

ہمنوا ہو گئے جس سے روما کا مستقبل نہایت تاریک ہو گیا مگر اس کے جری باشندے ہمت نہ ہارے کیونکہ ان میں خوز بردست اتحاد تھا اور وسط اطالیہ کے حلفاء اپنی وفاشعاری پر قائم تھے۔ رومیوں نے اپنی فوجی پالیسی کو بدل دیا اور قصد کر لیا کہ آئندہ سے میدان جنگ میں ہنی بال کا مقابلہ نہ کریں گے مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے سر تسلیم خم نہ کیا۔ اس جدید پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ معرکۂ کنائے سے روما کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ ہنی بال کی فتوحات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ فتح اس کے ہمرکاب ضرور تھی مگر اس واقعہ کے بعد روما کی قوت برابر بڑھتی گئی۔ برخلاف اس کے ہنی بال کو قرطاجنہ سے تازہ دم سپاہیوں کی کمک نہیں بھیجی جاتی تھی اور جب اس کا ستارہ غروب ہونے لگا تو اس کے اطالوی حلفاء بھی اس سے کنارہ کش ہونے لگے۔ رومیوں نے جلد اپنے نقصانات کی تلافی کر لی ہنی بال کی طرح ان کو محاصروں میں ناکامی نہ ہوئی تھی اور انھوں نے ہنی بال کے حلفاء میں سے تین زبردست شہروں کپوا، سیراکیوز اور ٹارنیٹم پر پھر دوبارہ قبضہ کر لیا مگر رومیوں کو زیادہ کامیابی اسپانیہ میں حاصل ہوئیں۔ رومی اس ملک کی طرف اس لئے متوجہ ہوئے کہ یہیں سے ہنی بال کو امداد پہنچ سکتی تھی کیونکہ سمندر سے اب اس کی حکومت اٹھ گئی تھی۔ ہسپانیہ میں بھی رومیوں کو ابتدا میں شکستیں ہوئیں اور ان کی ہمت اس قدر ٹوٹ گئی کہ قریب تھا کہ فتح کا خیال ہی بالکل چھوڑ دیں۔ مگر اس نازک موقع پر ایک رومی نوجوان سی پیو نے روما کی عزت رکھ لی ہنی بال کے مقابلے میں جو معرکے ہوئے ان میں سی پیو کے برابر کسی نے نام آوری حاصل نہیں کی۔ دوسرے سپہ سالار مثلاً فےبیس اور مارسلیس سے بھی بڑی بہادری سے لڑے اور رومی مورخ اور شعراء ان کی اولوالعزمی کے مداح ہیں مگر رومیوں میں سی پیو ہی اس جنگ کا مرد میدان ہے۔ معرکۂ ہائے قرطاجنہ میں سی پیو ابتدا ہی سے شریک تھا۔ ہنی بال سے جو پہلا مقابلہ ٹی کی نس میں ہوا تھا اس میں اس نے اپنے باپ کی جان بچائی تھی اور جنگ کنائے میں بھی موجود تھا اور جان سلامت لیکر بھاگ نکلا۔ رومیوں کی ممتاز خصوصیات وفاشعاری، حب قومی، ضبط اور کارگزاری سب اس کے ضمیر میں تھیں مگر ان

خصوصیات کے علاوہ تخیل اور سرگرمی بھی تھی جو یونانی ادبیات کے مطالعہ کا نتیجہ تھا جن کا رواج روما میں ہو چلا تھا۔ اپنے ہموطنوں کے دلوں میں اس کا خاص اثر تھا اور ان کے دلوں میں یہ خیال جم گیا تھا کہ یہی نوجوان ان کا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔ اس کی معرکہ آرائیوں کی ابتدا ہسپانیہ سے ہوئی جہاں اس نے ہنی بال کے بھائی ہیس ڈروبال کو کئی دفعہ شکست دیکر جزیرہ نمائے مذکورہ کے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا۔

ہسپانیہ میں ہیسڈروبال کی شکست کا نتیجہ عجیب وغریب ہوا ہسپانیہ کو خیر باد کہکر اس نے اپنے بھائی کی کمک کے لئے اطالیہ کا رخ کیا۔ اگر دونوں فوجیں مل جاتیں تو یقیناً ہنی بال پھر حملہ کرتا اور اس دفعہ روما کو نہ چھوڑتا مگر ہیسڈروبال کی فوج ہنی بال تک نہیں پہنچنے پائی اور رومیوں نے میٹارس میں مزاحم ہو کر (۲۰۷ ق م) میں اسے شکست دی۔ ہنی بال کو اس کے بھائی کی اطالیہ میں آنے اور شکست وموت کی خبریں ایک ہی وقت میں ملیں اور اس کے بعد اس کو رومیوں سے تنہا مقابلہ کرنا پڑا حالانکہ اس کی فوجیں روز بروز گھٹتی جاتی تھیں مگر آخر وقت تک رومی اس سے گریز کرتے رہے اور سرزمین اطالیہ میں اس سے معرکہ آرا نہ ہوئے۔

مگر اب جنگ کا اختتام قریب تھا۔ فتحمند سیپو ہسپانیہ سے واپس ہو کر فتح ونصرت کے ڈنکے بجاتا ہوا روما میں داخل ہوا اور ایک زبردست فوج اپنے ہمراہ لیکر افریقہ کا رخ کرکے قرطاجنہ پر یورش کرنے کا قصد کیا جس سے قرطاجنی ہراسان ہو گئے اور انھوں نے ہنی بال کو واپس بلا لیا۔ ہنی بال واپس آیا اور ۲۰۲ ق م میں سیپو سے بمقام زاما مقابلہ ہوا۔ اس کی فوج میں اب آزمودہ کار سپاہی باقی نہ رہے تھے اور جدید سپاہیوں کی تعداد غالب تھی اس کے علاوہ رومی اسکے داؤں پیچ اور کمین گاہوں سے خوب واقف ہو گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت سخت لڑائی کے بعد رومیوں ہی کی فتح رہی اور ہنی بال کے مشورے سے قرطاجنیوں نے شکست مان لی جس کے بموجب انھیں چند علاقے اور جنگی جہاز رومیوں کے سپرد کرنے پڑے۔ رومیوں نے افریقہ میں قدم جمائے مگر

قرطاجنہ کی آزادی برقرار رہی۔
خدا خدا کرکے یہ محاربۂ عظیم روما کی فتح پر ختم ہوا اور اب مغربی سواحل بحیرۂ روم میں اس کا کوئی رقیب باقی نہ تھا۔ تمام بڑے بڑے جزیرے اس کے قبضہ میں آگئے ہسپانیہ پر اس کا تسلط ہو گیا اور قرطاجنہ کی تجارت رومی تاجروں کے ہاتھ میں آگئی۔ مگر افسوس ہے کہ قرطاجنہ کی تجارت کے ساتھ قرطاجنیوں کی خو بو بھی رومیوں میں آگئی اس لئے فتح سے روما کو خالص نفع نہیں ہوا۔ اطالیہ میں غلاموں کی تعداد کثیر آگئی اور ان کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ ہونے لگا۔ بیرونی ممالک پر قبضہ ہو جانے سے ایسے رسوم و رواج رائج ہو گئے جو آخر میں جاکر جمہوریت کی فنا کا باعث ہوئے۔

باب یازدہم

بحیرۂ روم میں رومیوں کی فوقیت

جنگ ہائے قرطاجنہ میں روما کو جو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی اس کی وجہ سے نظام سلطنت میں بہت کچھ فرق پڑ گیا۔ دستور سیاسی میں بظاہر تو کوئی تغیر نہیں ہوا کیونکہ رومی اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے نظام سلطنت میں تغیرات تو کر دیتے تھے مگر ان کو ضبط تحریر میں نہیں لاتے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ جمہوریت کا وہ رنگ باقی نہ رہا جو پہلے تھا۔ مجالس سیاسی سب حسب سابق باقی تھیں مگر انکے فرائض اور ان کی اہمیت میں ضرور تغیر ہو گیا۔

دستور رومی میں اصولاً تمام اقتدارات کا ماخذ جمہور روما تھا۔ مجسٹریٹوں کا تقرر جمہور کے ہاتھوں میں تھا اور یہ حکام سلطنت روما کے خادم سمجھے نہ کہ آقا۔ سینیٹ بھی ابتداءً صرف مجلس شورائے تھی۔ مگر درحقیقت سینیٹ کا اقتدار دستور کے تمام اجزا پر غالب تھا اور جنگ قرطاجنہ کے انصرام میں جو کامیابی اس مجلس کو ہوئی اس سے اس کی طاقت اور بھی بڑھ گئی روما کی بزرگی اور عظمت کیشیا کے ضعف کا باعث ہوئی اور عنان سلطنت ان مجالس کے ہاتھ سے نکل گئی شہریان روما کی تعداد لاکھوں سے بڑھ گئی تھی جو تمام اطالیہ بلکہ ممالک مفتوحہ یورپ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا جلد جلد جمع ہونا اور معاملات سیاسی پر مباحثہ کرنا روز بروز دشوار ہوتا جاتا تھا۔ ابتھنز ایک ذرا سی ریاست تھی اس میں تمام شہریوں کا اجتماع ممکن تھا مگر روما کی وسعت اس اجتماع کے منافی تھی کمیشیا

میں جس کو جمہور رومی کہتے تھے زیادہ تر ایسے لوگ جمع ہوتے تھے جنھیں سیاسی جلسوں کی شرکت کے علاوہ کوئی کام نہ تھا اور کام کاج والے لوگ اس میں بہت کم شریک تھے۔ مجسٹریٹوں کو بھی امور سیاسی کے تصفیے یا پالیسی قائم کرنے میں بہت کم دخل تھا کیونکہ دستور روما ان احکام کے اختیارات کے بڑھنے کا مخالف تھا مجسٹریٹ تنہا کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کی کمیٹیاں ہوتی تھیں جن میں دو یا دو سے زیادہ مجسٹریٹ شریک رہتے۔ اگر ایک مجسٹریٹ کی رائے دوسرے کے خلاف ہوتی تو اس کا حکم کالعدم ہو جاتا اور اس کے علاوہ ٹریبیون کو یہ اختیار تھا کہ جس حکم کے نفاذ کو چاہے روک دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دستور روما کا منشا یہ تھا کہ حکمران جماعتوں کو جہاں تک ممکن ہو ضعیف رکھا جائے اور ان کے اختیارات کے حدود اور موانع مقرر کر دینے سے یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ رومیوں کو حکام کی طرف سے خطرہ رہا کرتا تھا اور وہ آزادی کو حسن انتظام پر ترجیح دیتے تھے۔

کمیشیا کی کچھ وقعت نہ رہ گئی تھی اور مجسٹریٹوں کا تقرر صرف چند روزہ ہوا کرتا تھا۔ مگر بخلاف ان کے سینٹ چند افراد کی مستقل جماعت تھی جن کی رکنیت تا حین حیات ہوتی تھی۔ اس مجلس کے متعدد ارکین ایسے تھے جو مناصب جلیلہ پر سرفراز ہو چکے تھے اور ان کو اپنے تجربۂ واقف کاری اور استقلال کی وجہ سے امور مملکت میں اس قدر دخل ہوا کہ گویا عنان حکومت ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ قرطاجنہ کے محاربۂ عظیم میں جو کامیابی ہوئی وہ اسی مجلس کے سیاست اور تدبر کا نتیجہ تھا اور فتح ہو جانے سے اس کی قوت اور بھی بڑھ گئی یہاں تک کہ جمہور روما کی اصلی مجالس یعنی کمیشیا کا وجود صرف برائے نام رہ گیا اور مجسٹریٹ اس کے ارشاد کی تعمیل اپنا فرض سمجھنے لگے سینیٹ کو یہ عظمت اپنے ارکین کی قوم پرستی، جرات استقلال، سیاسی دوربینی اور کامیابی سے حاصل ہوئی تھی اور گو یہ اقتدارات ایک حد تک غاصبانہ تھے مگر مورخین کی رائے ہے کہ انصرام امور مملکت میں ان کو جو کامیابی ہوئی وہ اس غصب کی ضرورت کو ثابت کرتی ہے۔ جنگ قرطاجنہ کے قبل روما کی جو حالت تھی اس کو بعد کے حالات سے بہت بہتر خیال کیا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں رومیوں کی

تمام جماعتوں میں اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے کا خاص خیال تھا اور پورے اتحاد کے ساتھ ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔ اگر رومیوں میں یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو سینیٹ کو نہ تو کامیابی ہوتی اور نہ وہ اپنی قوت قائم رکھ سکتے۔

ہنی بال کو شکست دینا تو آسان تھا مگر رومیوں کو اب اس سے بڑی مہم درپیش آئی۔ ضروریات سیاسی اور خود ان کی اولوالعزمی انھیں مجبور کر رہی تھی کہ بحیرۂ روم کے تمام ملک پر تسلط حاصل کریں جس سے ان کے دائرۂ حکومت میں مختلف ممالک آجائینگے جن کے باشندے قوم مذہب اور زبان میں اس سے مختلف ہوں گے۔ ان فتوحات سے نئی مشکلات کا سامنا ہوگا اور اس کے علاوہ یہ بھی سوال پیش آئے گا کہ رومیوں میں غیر اقوام پر حکومت کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں اس حکومت کا خود اس کے خصائص اور دستور پر کیا اثر ہوگا۔ گو مستقبل نے ثابت کر دیا کہ جمہور روما میں یہ صلاحیت نہ تھی شہنشاہیت تو حاصل ہوئی مگر اس کی وجہ سے جمہوریت دب گئی اور اس کی جگہ پر ایک دوسرا نظام سلطنت قائم ہوا جس کو اُس زمانہ کے رومی ہرگز پسند نہ کرتے۔

اس زمانے تک مدبران روما کی نگاہیں مغرب کی طرف لگی ہوئی تھیں اور ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ غالیہ، ہسپانیہ مغربی افریقہ اور جزائر پر قابض ہو جائیں۔ مگر ہنی بال کی ہزیمت کے بعد انھوں نے اپنی توجہ کو شرق کے متمدن تر بے حس ممالک کی طرف منعطف کیا۔ بحرۂ روم کے شرقی سواحل پر بہت سی سلطنتیں قائم تھیں جو ایک زمانہ میں سکندر اعظم کی سلطنت کا جزو تھیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سکندر کی موت ہی کے بعد اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے مقبوضات منقسم ہو گئے۔ سلسلہ تقسیم اب تک جاری تھا گر تین ریاستیں اب بھی خاص اہمیت رکھتی تھیں۔ ان میں سے پہلی ریاست مقدونیہ تھی اور گو اس کی وسعت پہلی سی نہ تھی مگر اس کے باشندے جری تھے اور ان کے مقبوضات میں معدنیات کی کانیں تھیں۔ دوسری سلطنت شام تھی جس پر سکندر کے ایک سپہ سالار سلیوکس کی اولاد قابض تھی۔ اس سلطنت کے وسیع رقبے میں بھی بہت سے غدار شہر تھے۔ تیسری سلطنت مصر تھی جس پر ایک دوسرے سپہ سالار بطلیموس کی اولاد

حکمراں تھی۔ اس ریاست کا جغرافیائی موقع اچھا تھا اور چاروں طرف صحرا و لق و دق اور سمندروں کے ہونے سے بیرونی حملوں سے محفوظ تھی مگر حکمراں جماعت یونانی الاصل تھی اور اصلی باشندے مصری تھے اس لئے اس سلطنت میں قومی روح نہ تھی۔ ان تین سلطنتوں کے علاوہ بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ تھریس میں بالکل بدامنی تھی اس لئے اس کا تفصیل سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایشیائے کوچک میں سکندر کی وفات کے بعد سنہ ۲۰۰ ق م کے قریب بالکل طوائف الملوکی پھیل گئی۔ پرگامم، کاپاڈوشیا اور بتھی نیا میں بادشاہ حکمراں تھے۔ بہت سے آزاد یونانی شہر تھے اور وسط میں ریاست گیالی شیا تھی جس میں تیسری صدی کے بعد غالی آکر آباد ہو گئے تھے۔ خود یونان میں کا یاپلٹ ہو گیا تھا اور ڈیماس تھینیز کے زمانہ کی حالت بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس زمانہ کی عظیم ریاستیں یعنی تھیبس، ایتھنز، کورنتھ اور اسپارٹا باقی تھیں مگر ان کا اثر زائل ہو چکا تھا اور شہری سلطنتوں کے بجائے مختلف اتحادات قائم ہو گئے تھے۔ کورنتھ کے شمال میں یونان کے پہاڑی اور غیر متمدن مغربی حصہ میں اتحاد ایٹولی تھا جو بجائے شہروں کے اضلاع کا اتحاد تھا۔ اس اتحاد کا مقصد یہ تھا کہ مشرق کے متمدن اضلاع کو موقع پاکر لوٹ لیا کریں۔ پیلوپونیس میں اتحاد آکائی تھا۔ یا سیات یونان میں یہ ایک جدید تجربہ تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانیوں کے دماغ میں جدت اب تک باقی تھی کیونکہ یہ (اتحادی ریاست) کی پہلی مثال ہے جس کا زمانہ حال میں بہت رواج ہو گیا ہے اور آئندہ جاکر اس کو اور بھی تقویت ہوگی۔ آکائیا کے شہروں کی ذاتی آزادی قائم تھی اور اتحاد کی غرض صرف یہ تھی کہ بیرونی دشمنوں سے محفوظ رہیں۔ روما نے ان اتحادات کو مٹا دیا مگر پیریکلس کے زمانہ کی ایتھنز کی جمہوریہ کی طرح اس اتحاد کی خصوصیات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

مگر کیا سبب تھا کہ یہ سب مشرقی ریاستیں روما کی حلقہ بگوش ہو گئیں کیونکہ علمی کارناموں کے لحاظ سے تو رومیوں کو یونانیوں سے کوئی نسبت نہ تھی اور بہت جلد وہ زمانہ آیا کہ رومی ایتھنز، سکندریہ اور مشرق کے دوسرے شہروں میں علم حاصل کرنے لگے۔ فنون حرب کا بغور مطالعہ کیا جاتا تھا اور اس

فن پر بہترین کتابیں مقدونیہ کے یونانیوں نے لکھی تھیں۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے فتح کا سہرا رومیوں ہی کے سر رہا اور فتح کر لینے کے بعد ان ملکوں پر آسانی سے وہ قابض رہے۔ رومیوں کی کامیابی کا زیادہ تر راز یہ تھا کہ ان میں رشتۂ قومی نہایت مضبوط تھا گو اس درجہ کا نہیں جیسا کہ جنگ ہائے قرطاجنہ کے زمانہ میں تھا۔ لیکن زمانۂ قدیم میں کسی قوم میں اس قدر اتحاد نہ تھا۔ جماعت حکمراں نہ صرف قوم کی ہمجنس تھی بلکہ خود قوم حکمراں تھی۔ برخلاف اس کے مصر اور شام بلکہ ایک حد تک مقدونیہ کے بادشاہوں اور ان کی رعایا میں کوئی یگانگت نہ تھی اس لئے ان کو اپنے بادشاہوں سے اس درجہ کی عقیدتمندی اور وفاشعاری نہ تھی جیسا کہ رومیوں کو اپنی جمہوریت سے تھی۔ یونانیوں کو خود تسلیم تھا کہ رومی ان سے زیادہ راست باز اور راست گو ہیں۔ ان کی تجارت میں کسی قسم کا دھوکا نہ تھا۔ رومیوں کو اپنے قول و فعل کا پاس تھا اس لئے ہر شخص ان پر اعتماد کرتا تھا۔ یونانیوں کا دروغ گوئی کے سبب سے کوئی اعتبار نہ کرتا۔ پالی بیس کا خیال ہے کہ یونانیوں کے مغلوب ہونے کا یہی سبب ہے۔

مشرق میں روما اولاً مقدونیہ سے برسر پرخاش ہوا۔ مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے جنگ گنائے کے بعد ہنی بال سے سازباز کر لیا تھا اور مقدونی سپاہی جنگ زاما میں قرطاجنیوں کی طرف سے لڑے تھے۔ فلپ کی اس حرکت سے رومیوں کو سخت اشتعال ہوا اور گو اس طویل جنگ کے بعد پھر کسی دوسری سلطنت سے برسر پرخاش ہونا مناسب نہیں خیال کیا جاتا تھا مگر آخر کار یہی طے پایا کہ سلطنت روما کی عظمت و توقیر قائم رکھنے کے لئے ایک یورش کرنا ضروری ہے گو مقدونیہ پر مستقل قبضہ کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ ۱۹۸ سنہ ق م میں ایک فوج زیر کمان فلامینیس فلپ کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی مگر ہم اس خاص جنگ یا دوسرے جنگی معرکوں کو جو رومیوں کو مشرق میں پیش آئے تفصیل سے بیان نہیں کر سکتے۔ یونان کے متمدن باشندے روما کے طرفدار تھے اور ۱۹۷ سنہ ق م رومیوں نے بمقام سائی نوسی فالے مقدونیوں کو شکست دی۔ اس جنگ میں بھی روما کی لیجن (فوج) اور مقدونیہ کے فلانکس کا مقابلہ ہوا۔ رومی فلانکس

کے دھکا دے تو برداشت نہیں کر سکتے تھے مگران کو بھی فن حرب میں کچھ کم کمال نہیں تھا اور فتح آخر انھیں کی ہوئی۔ رومی سپاہیوں کی صفیں جگہ جگہ چھوڑ چھوڑ کر ترتیب دی گئی تھیں تاکہ نقصان زیادہ نہ ہو اور ہتیاروں میں رومی چھوٹی تلوار سے زیادہ کام لیا کرتے تھے۔ ہموار زمین پر رومی فلانکس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ اس امر کی کوشش کرتے تھے کہ مقدونیوں کو دھوکا دے کر ناہموار زمین پر لے آئیں تاکہ ان کی صف ٹوٹ جائے اس کے بعد ان کو غلیلوں اور تیروں سے پریشان کرتے اور جب ان کی صفیں بالکل درہم برہم ہو جاتیں تو پھر دست بدست لڑائی ہونے لگتی جس میں رومی سپاہی مقدونیوں سے آسانی سے بازی لے جاتے جو اپنی صف آرائی کے بغیر لڑ نہیں سکتے تھے۔

رومیوں نے یونانیوں کے ساتھ جو سلوک ان کا ملک فتح کرنے کے بعد کیا وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یونانیوں سے اس کے قبل بھی وہ واقف تھے کیونکہ خود اطالیہ اور سسلی میں یونانی شہر تھے مگر یونان میں آنے کے بعد انھیں اس بات کا اندازہ ہوا کہ یونان کے تمدن اور علوم کا پایہ کس قدر بلند ہے۔ ابتدائً تو انھوں نے یونان میں ہر ایک شے کو ستائش کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کا سپہ سالار یونان میں سیاحانہ طور پر پھرتا رہا اور فنون لطیفہ کے نادر نمونوں، مندروں اور مشہور تاریخی مقامات کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ یونانیوں سے محبت رکھنا اور ان کی قدر کرنا تعلیم یافتہ اشخاص میں فیشن ہو گیا۔ مگر یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی۔ رومیوں کو جلد معلوم ہو گیا کہ یونانی ان کی قدردانی اور ستائش کے مستحق نہ تھے کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ یونانیوں کے اخلاق خراب ہیں ان میں مکر و فریب خود غرضی کا مادہ زیادہ ہے اور آخرکار ان کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کرنا پڑا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یونانیوں سے ملنے جلنے سے ان کی تاریخ میں ایک انقلاب ہو گیا۔ فلسفہ اور فنون لطیفہ میں یونانی معراج کمال پر پہنچ گئے اس لئے باوجود منافرت کے رومیوں نے ان کے علوم و فنون حاصل کرنے میں ایسی سعی بلیغ کی کہ تاریخ میں ایک قوم کا دوسری قوم پر شاید ہی اس قدر اثر ہوا ہو۔ رومیوں نے اس تاریخ سے اپنے قومی مذہب

ادبیات اور فلسفہ کو خیرباد کہا اور یونانی خیالات مذہبی اعتقادات اور فلسفہ کے دلدادہ ہو گئے۔

رومیوں کا یہ بالکل قصد نہ تھا کہ مشرق میں مستقل طور پر اپنا اثر بڑھائیں۔ فلپ کی اطاعت قبول کرنے پر رومیوں نے اس کی آزادی تسلیم کر لی۔ یونانیوں کو خوف تھا کہ اب بجائے مقدونیوں کے ان پر رومی مسلط ہو جائینگے مگر ان کا خوف بے اصل ثابت ہوا کیونکہ ۱۹۶ ق م میں فلامینیس نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ کورنتھ میں اعلان کر دیا کہ یونان آج کی تاریخ سے آزاد ہے جس سے یونانی پھر یہ خواب دیکھنے لگے کہ پرکلس اور ڈیماس تھنیز کا زمانہ دوبارہ عود کر آئیگا۔

مگر انسان کی طرح اقوام کا شباب بھی عود نہیں کرتا۔ چار سال کے بعد رومیوں نے مجبوراً پھر دوسری فوج یونان کی تسخیر کے لئے بھیجی کیونکہ چار سال قبل جو انتظام کیا گیا تھا وہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ یونانیوں نے اپنی آزادی کا اس بری طرح استعمال کیا کہ ان کی حرکتوں سے رومی برافروختہ ہو گئے اور یونانیوں کو مجبوراً انیٹوکس شاہ شام سے امداد کی درخواست کرنا پڑی۔ ہینی بال جس کو رومیوں نے قرطاجنہ سے نکلوا دیا تھا جلا وطن ہو کر اس بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا تھا اور اپنے خدمات پیش کیے تھے۔ رومیوں کو یہ اور بھی ناگوار ہوا۔ مگر انیٹوکس نے اپنی حماقت سے اس پیر آزما سپاہی کے مشورہ پر عمل نہ کیا اور جب رومیوں کی فوج یونان میں پہنچ گئی تو اس کی افواج کو سخت ہزیمت ہوئی۔ اور یونان سے بھاگ کھڑا ہونا پڑا۔ مگر رومیوں نے اس کا ایشیائے کوچک تک تعاقب کیا اور مگنیشیا میں ۱۹۰ ق م میں پھر اسے سخت شکست دی۔ بادشاہ شام کی فوج رومیوں سے تگنی تھی مگر بدنظمی اور سپہ سالاروں کی نالائقی باعث ہزیمت ہوئی۔ اس جنگ میں کئی مشہور لوگ مشیر تھے۔ ہینی بال قرطاجنی انیٹوکس کا مشیر خاص تھا مگر اس جنگ کے بعد اس نے خودکشی کر لی کہ کہیں رومی اس کی حوالگی کا مطالبہ نہ کریں۔ رومیوں کے سپہ سالار دو تھے ایک توسی پیو جس کو فتح زاما کے سبب سے "فاتح افریقہ" کا خطاب ملا تھا اور دوسرا اس کا بھائی۔ اس زمانہ میں خاندان سی پیو اور ان کے

مقرّبین کی امداد کے بغیر کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود ان فتوحات کے رومیوں نے کسی ملک کا الحاق نہ کیا اور اپنے حلفاء کی قدر افزائی اور دشمنوں کی تعزیر پر اکتفا کیا۔ اتحاد ایٹولی نے یونان میں اس کی مخالفت کی تھی اس لیے ان پر زبردست تاوان لگایا گیا اور ان کی زمینیں چھین لی گئیں۔ رومیوں کے حلفاء میں سے سربرآوردہ شاہ پرگامم تھا اور جمہوریت روڈز جن کے اثر اور مقبوضات میں اضافہ ہوا۔

ان فتوحات سے رومیوں نے گویا مشرق میں اپنی سیادت قائم کر دی مگر جو انتظامات انھوں نے کر دیئے تھے وہ دیرپا ثابت نہ ہوئے۔ مقدونیہ کا دوسرا بادشاہ پرسیس بلند حوصلہ شخص تھا۔ اس کو رومیوں کی ماتحتی ناگوار تھی اور خود یونان میں متعدد لوگ ایسے تھے جن کو رومیوں کی حلقہ بگوشی منظور نہ تھی یہ سب اس کی امداد پر تیار ہو گئے۔ رومیوں کو اس کے منصوبوں کی خبر ہو گئی اور ۱۷۱ق م میں انھوں نے پھر مقدونیہ پر فوج کشی کی۔ اس معرکہ آرائی میں ابتداءً رومیوں کو سخت ناکامی ہوئی۔ رومی فوجیں کئی مقامات میں روک دی گئیں اور کئی جگہ ان کو شکست ہوئی آخر کار رومیوں نے پھر خاندان سی پیو کے افراد سے درخواست کی کہ اس مشکل سے ان کو نجات دلائیں۔ ایمیلیس پالس سی پیو کا برادر نسبتی سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ اس پر بھی مقدونیوں نے خوب داد شجاعت دی مگر آخر کار ۱۶۸ق م میں رومی فوج مقدونیہ میں داخل ہو گئی اور بمقام پڈنا مقدونی ”فلانکس“ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اس پر بھی رومیوں نے کھلم کھلا قبضہ کرنے سے احتراز کیا بلکہ ہوشیاری سے شاہ مقدونیہ کو معزول کرکے اس ملک میں چار جمہوری سلطنتیں قائم کیں جو برائے نام آزاد مگر دراصل روما کی باجگذار تھیں۔ لیکن یہ انتظام بھی زیادہ روز نہ چلا اور ۱۴۶ق م میں مقدونیہ سلطنت روما کا ایک معمولی صوبہ ہو گیا۔

اس بغاوت کے فرو کرنے کے بعد رومیوں نے اپنا طرز عمل بدل دیا اور یونانیوں کی قدر و منزلت کرنے کے بجائے ان کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آنے لگے جو ان کے سابقہ طرز عمل یعنی اقوام مفتوحہ کی تالیف قلوب کے

اصول کے بالکل برخلاف تھا۔ مقدونیہ میں رومیوں نے نہایت بیرحمی کے ساتھ لوٹ مار کی اور جب ان کو اس سے بھی تشفی نہ ہوئی تو انھوں نے اپنے سپاہیوں کو ایپائرس میں یلغار کے لیے بھیجدیا کو اس بدنصیب ملک سے انھیں کوئی وجہ پرخاش نہ تھی۔ اور علاوہ دیگر مظالم کے اس ملک کے ڈیڑھ لاکھ باشندے غلام بناکر بیچ ڈالے گئے تاکہ رومی سپاہیوں کو انعام دیا جائے۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ غیر ممالک کی فتح سے رومیوں کے اخلاق پر نہایت بری غراب اثر پڑ رہا تھا اور اسی اخلاقی انحطاط سے جمہوریت روما کا خاتمہ ہو گیا۔ روما نے تمام دنیا تو فتح کر لی مگر افسوس کہ اس مہم عظیم میں اپنی روح کھو دی۔

رومیوں کے جدید انتظامات سے یونان پر مصیبت آگئی۔ پرگامس اور روڈس نے رومیوں کی بہت امداد کی تھی مگر ان کے ساتھ بھی رومیوں نے اچھا سلوک نہ کیا اور ان کے مقبوضات چھین لیے۔ اتحاد آکا کیا کا انجام بھی اچھا نہ ہوا۔ رومی اس کے خلاف اسپارٹا کے جابر بادشاہ کے پشت پناہ ہو گئے اور آخر کار جنگ میں اس اتحاد کو شکست ہوئی کورنتھ بھی رومیوں نے فتح کر لیا اور اس شہر کو مسمار کر کے جلا دیا۔ یونان صوبہ تو نہیں بنایا گیا مگر رومیوں کا تسلط اس پر ہو گیا۔

۱۴۶ق م رومی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی سال میں مقدونیہ سلطنت روما کا ایک صوبہ بنایا گیا۔ کورنتھ مسمار کیا گیا اور قرطاجنہ کا قلع قمع کر دیا گیا۔ قرطاجنہ کی بربادی رومیوں کے دامن پر ایک سخت دھبہ ہے۔ قرطاجنہ پر دوبارہ فتح حاصل کرنے پر بھی رومیوں کو اندیشہ تھا کہ کہیں یہ قوم پھر دوبارہ سر نہ اٹھائے۔ اس کے علاوہ قرطاجنہ کی تجارت اب بھی فروغ پر تھی گو دراصل نہ قرطاجنہ کی پہلی سی حالت تھی اور نہ تجارت میں وہ رومیوں کے حریف تھے مگر رومیوں نے ٹھان لیا کہ کسی نہ کسی صورت سے قرطاجنہ کی تخریب کی جائے اور اس غرض سے انھوں نے ایسی سخت شرائط پیش کیں جسے قرطاجنی کبھی قبول نہ کر سکتے تھے۔ جنگ شروع ہو گئی۔ قرطاجنی خوب دل کھول کر لڑے اور رومیوں کا مقابلہ

کرتے رہے مگر ان کا انجام قریب تھا اور ان کا خاتمہ فاتح زاما کے متبنّی بیٹے کے ہاتھ سے ہوا۔ کورنتھ کی طرح رومیوں نے قرطاجنہ کو بھی مسمار کرکے جلا دیا۔ فتح مندسی پیو کو اس وقت ہومر کا ایک فی البدیہہ شعر یاد آیا اور اسے خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ ایک روز بد ایسا بھی آئے کہ کوئی فاتح روما کے ساتھ بھی یہی کرے۔ قرطاجنہ بھی اس تاریخ سے سلطنت روما کے صوبجات میں شامل ہو گیا۔

بحیرۂ روما کے ساحل مشرقی کے تمام ممالک ابھی رومیوں کے قبضہ میں نہیں آئے تھے مگر اس کے دائرۂ اثر میں ضرور تھے۔ رومی ہر جھگڑے میں کود پڑتے اور تعلق ہو یا نہ ہو ہر فریق سے من مانے شرائط منظور کرا لیتے مثلاً ۱۶۸ ق م میں اینٹوکس بادشاہ شام نے مصر پر فوج کشی کا قصد کیا مگر اس کے ملک کی سرحد پر پہنچتے ہی ایک رومی افسر نے اس کو واپس ہونے کا حکم دیا۔ شاہ شام نے بہت کچھ زور مارا مگر اس نے اپنی چھڑی سے ایک خط کھینچ دیا اور کہا کہ سلطنت روما کا حکم ہے کہ تم اس خط کے اس پار نہ آؤ۔ روما کی اس قدر دھاک بندھی ہوئی تھی کہ شہنشاہ شام کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ یہودی بھی رومیوں سے مرعوب اور خائف تھے ایک یہودی مصنف لکھتا ہے "رومیوں نے ان تمام سلطنتوں اور جزائر کو مسخر کر لیا ہے جن کے حکام نے ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت کی۔ اپنے حلفاء اور دوستوں کے ساتھ وہ محبت سے پیش آتے ہیں جسے چاہیں بادشاہ بنا دیں اور جسے چاہیں تخت سے اتار دیں۔ ان کی عظمت کی کوئی انتہا نہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان میں سے کوئی فرد لباس شاہی زیب تن نہیں کرتا کہ دوسروں پر حکومت کرے اور نہ ان میں آپس میں بغض وحسد ہے" اس مصنف نے رومیوں کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ ایک زمانہ میں صحیح تھی مگر جس عہد میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں رومیوں کے اخلاق وعادات میں یہ خصائص باقی نہ رہے تھے اور بہت جلد وہ زمانہ آنے والا تھا کہ بغض وحسد کی آگ بھڑک اٹھے۔

اس عہد کے رومیوں کے خصائل بیان کرنیکے بجائے یہ مناسب

ہوگا کہ اس زمانے کے دوسرے برآوردہ اشخاص کی سیرت پر نظر کی جائے جن کے خصائص متضاد تھے۔ ان میں سے پہلا مارکس کیٹو ہے۔ پلوٹارک نے اس کے سوانح بھی لکھے ہیں جس میں اس کا خاکہ نہایت کمال کے ساتھ کھینچا ہے۔ یہ مایۂ ناز رومی سپاہی منش آدمی تھا جو فوجی فرائض نہایت محنت و مشقت کے ساتھ ادا کیا کرتا تھا۔ عہدہ دار ہونے پر بھی ایمانداری اس نے ہاتھ سے نہ دی؛ ضبط اوقات کا حد درجہ پابند تھا اور دوسروں سے بھی سختی کے ساتھ پابندی کراتا تھا، جزرسی بھی اس کی مشہور تھی اور مرفہ الحال ہونے پر بھی سادہ زندگی بسر کرتا رہا۔ گویا اس میں رومیوں کی ممتاز خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ اپنی بیوی اور بچوں کی نسبت اس کا قول تھا کہ دنیا میں ان سے پاک کوئی شے نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی غلاموں کے ساتھ اس کا سلوک نہایت ہی درشت بلکہ ظالمانہ تھا اور ان کے ساتھ رعایت کرنا یا انسانیت کے ساتھ سلوک کرنا اس کی نظر میں نہایت برا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ زمانے کا رنگ بدل رہا تھا اور برے دن آرہے ہیں۔ عمائد سلطنت جو خرد برد کرتے یا شان و شوکت سے کے ساتھ رہتے ان کا سخت دشمن تھا۔ اس کے نزدیک ان تمام خرابیوں کی جڑ یونانیوں کے مطالعۂ علوم و فنون میں مضمر تھی اس لئے اس کی خواہش تھی کہ تمام فلسفیان یونان خارج البلد کر دئے جائیں خود سقراط کو وہ "لفاظ اور خطرناک آدمی" کہا کرتا تھا۔ تعلیم کے نئے طریقوں کو سخت ناپسند کرتا اور خصوصاً یونانی استادوں سے جن کا روما میں اثر بڑھ رہا تھا اسے سخت بغض تھا کیٹو کہا کرتا تھا کہ یہ لوگ صرف زبان سے اور رومی دل سے تعلیم دیتے ہیں۔ مگر زمانہ اس کا مخالف تھا۔ خود اسی کا قول تھا کہ میں پیدا ہوا ایک عہد میں اور میری زندگی گزری دوسرے عہد میں آخر کار اسے بھی فلسفۂ یونان کا مطالعہ کرنا پڑا جس سے وہ سخت متنفر تھا۔

اس عہد کا دوسرا سربرآوردہ آدمی جو اس سے بالکل مختلف تھا سپیو ثانی فاتح قرطاجنہ تھا۔ علوم یونانی جن سے کیٹو کو خاص نفرت تھی ان سے اس کو دلچسپی بلکہ شغف تھا۔ یونانیوں کی صحبت میں اسے خاص لطف آتا تھا

اوران کے ساتھ سیاسیات اخلاق اور مذہب پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔
جمہور روما کے ساتھ اسے خاص عقیدت تھی اور اس کے خدمات قابل قدر
تھے مگر اس کا مطمح نظر اتنا بلند تھا کہ کیٹو کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا عہد مذکور
پر اس کا اور اس کے احباب کا بیحد اثر پڑا ہے۔ سی پیو نہ بہت بڑا سپاہی تھا نہ مدبر
مگر اس کے خصائل ایسے تھے جس کی وجہ سے ہم نہ صرف رومیوں کی قدر کرنے
پر مجبور ہوتے ہیں بلکہ ان کی محبت بھی ہمارے دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔

باب دوازدہم

سینیٹ کی قوت کا زوال

سینیٹ نے جس کامیابی کے ساتھ روما پر حکمرانی کی تھی اس کا ذکر آچکا ہے۔ مگر وہ زمانہ آرہا ہے جب کہ اس کے اقتدار کے دوسرے دعویدار پیدا ہونگے اور جمہور روما بھی اپنے حصے کے طلبگار ہونگے جو اصولاً ان کا تھا۔ اس انقلاب کے متعدد اسباب ہیں مگر سب کا کم و بیش وسعت حکومت روما سے تعلق ہے۔ فطرتاً رومیوں کو فتح مندی کی ہوس نہ تھی گر چند در چند وجوہ سے رومیوں کا تمام اطالیہ پر تسلط ہوگیا اور پھر تمام ممالک بحیرۂ روم ان کے زیر اقتدار ہوگئے مگر یہی فتوحات عظیم جمہوریت کی بربادی کا باعث ہوئیں۔ دوسری اقوام سے ملنے جلنے اور مبادلۂ خیالات سے رومیوں کے اخلاقی نظام کی بنیاد ہل گئی۔ فرائض منصبی ادا کرنا ان کے یہاں بہت بڑی خوبی تھی مگر آزادی خیال کے اثر سے جو فلسفۂ یونان کے مطالعہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ خوبی ایک حد تک جاتی رہی۔ یونان کے فلسفہ، فنون لطیفہ، ادبیات اور تخیلات مذہبی کا رنگ رومیوں پر غالب ہوگیا۔ یونان کے علوم رومیوں کے علوم سے اعلیٰ و ارفع تھے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں میں سے وہ سادگی اور فرائض پرستی جاتی رہی جو ان کی خاص صفت تھی اور بجائے خدمت قومی کے ان میں دوسرے مشاغل بھی پیدا ہوگئے۔ ممالک مفتوحہ کا اثر بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ سسلی، سارڈینیا، کرسکا، افریقہ (سابق مقبوضات قرطاجنہ) مقدونیہ اور ایشیائے کوچک سب رومیوں کے

زیر تسلط تھے اور ان کے انتظام کے لئے مختلف مدارج کے حکام ہر سال روما سے بھیجے جاتے تھے جن کے ذمے فوجی انتظامات، وصول مالگزاری اور قیام امن وامان و معدلت کے فرائض تھے۔ سلطنت روما کی یہ پالیسی نہ تھی کہ مفتوحین پر ظلم ہو اور اس کے صوبہ دار بھی اکثر ایماندار اور بیدار مغز تھے۔ مگر خدمات کی نوعیت ایسی تھی کہ جبر و تعدی کی تحریص ہوتی۔ صوبجات مفتوحہ میں عہدہ داروں تجار اور ساہوکاروں کو روپیہ پیدا کرنے کا بے مثل موقع تھا۔ اس کی وجہ سے روما میں ساہوکاروں کی ایک زبردست جماعت پیدا ہو گئی جن کی عیش پرستی سے رومیوں میں سادگی کا نام باقی نہ رہا اور جو لوگ کہ خود مختار حکومت سے صوبجات مفتوحہ میں سرشار ہو چکے تھے روما واپس آکر گمنامی میں نہ رہ سکتے تھے۔ روما کی سیاسی اور تمدنی زندگی پر فتوحات کا نہایت ہی مضر اثر پڑا۔ کیٹیا ایک زمانہ میں باشندگان روما کی باوقعت جماعت تھی مگر جب شہریان روما الطالیہ اور صوبجات کے تمام شہروں میں پھیل گئے تو اس مجلس میں صرف ایسے لوگ جمع ہوتے جنھیں کوئی خاص مشغلہ نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی نہ کچھ وقعت ہو سکتی تھی اور نہ وہ اس بات کا دعویٰ کر سکتے تھے کہ ان کی آواز جمہور روما کی آواز ہے۔ مجسٹریٹوں کے فرائض بھی بیشمار ہو گئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ فوجی اور مالی عہدہ داروں کے فرائض کی اب تک تخصیص نہ کی گئی تھی اور مجسٹریٹوں کو فوجوں کی سرکردگی میں دور دراز ممالک میں جانا پڑتا تھا جس سے شہر روما کے انتظامات میں ابتری پھیل رہی تھی۔ ان وجوہ سے دستور روما کا صرف ایک جزو یعنی سینیٹ باکار رہ گیا تھا مگر سینیٹ پر فتوحات کے مخرب اخلاق نتائج کا سب سے زیادہ اثر پڑا۔ دستور روما کے فرسودہ ہو جانے کے علاوہ اہم تمدنی خرابیاں بھی پیدا ہو رہی تھیں جن میں اہم ترین یہ تھی کہ الطالیہ کے کسان جو جیوتش رومی کی روح رواں تھے اپنی زراعت چھوڑ کر شہر روما میں جوق جوق چلے آتے تھے اور یہ بھی فتوحات روما کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ الطالیہ میں سسلی، کرسکا افریقہ اور مصر کے زرخیز ممالک سے سستا غلہ روما میں کھنچا آرہا تھا جس کی وجہ سے الطالیہ میں غلہ پیدا کرنا بے مصرف ہو گیا۔ اس کے علاوہ الطالیہ میں ایک جدید قسم کی غلامی کا

رواج ہو گیا تھا۔ فتوحات روما کی وجہ سے ہزارہا اسیران جنگ اطالیہ میں لاکر غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے جو رومی ساہوکاروں کے معادن اور کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ غلاموں سے کام لینے کا نتیجہ اکثر یہ ہوا کرتا ہے کہ آزاد مزدوروں کی قدر جاتی رہتی ہے اور اس کے علاوہ آزاد مزدور غلاموں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہات کے باشندوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہا اور بجائے زراعت کے مویشی اور بھیڑ پالنے کا رواج ہو گیا۔ مزارعین نے روما میں جاکر پناہ لی جہاں بیکاری اور فاقہ مستی سے ان کی دیہاتی خوبیاں جاتی رہیں۔

روما کی تاریخ میں نہایت ہی نازک موقع تھا۔ سلطنت کی بہتری تو اسی میں تھی کہ خود اراکین سینیٹ میں سے کوئی روشن خیال اور محب وطن شخص اصلاح سلطنت کا بیڑا اٹھاتا۔ مگر سینیٹ کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی اور اس کے اراکین کو سوائے اپنے اور اپنی جماعت کے مفاد کے دوسروں کے نفع و نقصان کی بالکل پروا نہ تھی۔ آخر کار مردے از غیب پرید آید و کارے بکند، کا مضمون ہوا اور جمہور روما کے ٹریبیونوں میں سے ایک شخص نے ایسی تجویزیں پیش کیں جن سے ایک سو سال تک انقلاب اور تغیرات کا سلسلہ جاری تھا۔ روما کے دوسرے عہدہ داروں کی طرح ٹریبیون بھی ایک عضو معطل ہو گئے تھے مگر اصولاً ان کے اقتدارات قائم تھے۔ اس شخص کا نام ٹائی بے ریس گراکس تھا جو ۱۳۳ق م کے دس ٹریبیونوں میں سے ایک تھا۔ گراکس کا تعلق روما کے ایک قدیم اور نہایت ہی معزز خاندان سے تھا اور خاندان سی پیو سے بھی اسے تعلق تھا۔ گراکس طبعاً انقلاب پسند واقع نہ ہوا تھا بلکہ اسے صرف تمدنی اصلاحات کا خیال تھا یعنی شہریان روما جو اپنے مزارع چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں آکر آباد ہو گئے تھے انھیں پھر دیہات میں آباد کرے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ایک قانون نافذ کرانا چاہتا تھا ہم دیکھ چکے ہیں کہ روما کا اصول یہ تھا کہ اطالیہ کے ہر علاقہ فتح کرنے کے بعد اس نے مفتوحین کی مزارع کا ایک مقررہ حصہ ضبط کر لیا۔ ان زمینوں سے بعض تو اسی وقت فروخت کر دی جاتیں۔ مفتوحہ اضلاع کی زمینیں زیادہ تر سرکاری ملک تصور کی جاتیں اور کاشت پر دیدی جاتیں۔ رفتہ رفتہ زمینداروں نے لگان

دینا موقوف کر دیا کیونکہ زمینات سرکاری کا انتظام سینیٹ سے متعلق تھا اور زمیندار بھی زیادہ تر اسی مجلس کی ارکان کی جماعت میں سے تھے۔ اصولاً زمینات مذکور ہمیشہ سرکاری تصور کی جاتیں مگر عملاً زمینداران کا ان پر پورا قبضہ تھا۔ ٹائی بے رس گراکس نے یہ تجویز پیش کی کہ سلطنت تمام زمینات پر دوبارہ قبضہ کرے اور ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے روما کے مفلس اور قلاش باشندوں میں تقسیم کر دے۔ اس تقسیم کو عمل میں لانے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا مگر ارکان جائداد نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی کیونکہ اس تجویز سے ان کے حقوق محصلہ پر اثر پڑتا تھا گراکس نے دوبارہ ٹریبیون منتخب ہونے کی کوشش کی گو یہ دستور رومی کے خلاف تھا مگر عین انتخاب کے وقت ایک بلوہ ہوا جس میں روما کا یہ فرزند یگانہ مارا گیا۔ روما کے شریفوں اور رذیلوں کے تنازعات اس تاریخ تک خونریزی سے پاک تھے مگر تنائج موجودہ کی ابتدا خونریزی سے ہوئی جو نہایت بد شگون تھا۔

ٹائی بے رس گراکس کا قتل نہ صرف اخلاقی جرم تھا بلکہ ایک سیاسی غلطی بھی تھی۔ جمہور روما میں اس سے سخت ناراضی پھیل گئی اور انھوں نے مقتول ٹائی بے رس کے بھائی گائیس کو اپنا لیڈر بنا لیا۔ گائیس جو اس وقت سرکاری کام سے روما کے باہر تھا نہایت قابل اور کارآزمودہ تھا۔ ۱۲۴ ق م میں روما واپس آیا اور ٹریبیون منتخب کیا گیا۔ اس کا بھائی سچا محب وطن تھا جسے ملک کی بہتری کے سوا کوئی اور خیال نہ تھا۔ گائیس میں بھی جذبۂ حب وطن جوش زن تھا مگر اس کے ساتھ اسے خیال تھا کہ اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لے اور سینیٹ کی قوت کو توڑ دے جس کے اشارہ سے اس کا بھائی قتل ہوا تھا۔ گائیس نے متعدد اصلاحی تجاویز پیش کیں جس سے دستور روما میں زبردست انقلاب ہو گیا۔ اپنے بھائی کا زرعی قانون اس نے دوبارہ نافذ کرایا اور جنوبی اطالیہ، کورنتھ اور قرطاجنہ میں نوآبادیاں قائم کرائیں جن کو رومیوں نے بے چراغ کر دیا تھا۔ اس نے ایک اور قانون نافذ کیا جس کی رو سے غلہ اہل روما کو نصف قیمت پر دیا جانے لگا کیونکہ روما کے قلاش باشندوں کی دستگیری کرنا ضروری تھا۔ مگر اس کے نتائج سخت مضر ہوئے کیونکہ سستے غلے کے لالچ سے غریب

دیہاتی روما میں جوق جوق آنے لگے اور اس سے ایک خراب رسم کی بنیاد پڑ گئی۔ یعنی جب کوئی جدید سیاسی تحریک جمہور روما کے سامنے پیش کی جاتی تو بطور رشوت غلہ اور سستا کیا جاتا یہاں تک کہ اہل روما کو آخر کار غلہ بالکل مفت ملنے لگا گراکس نے کامیابی کے ساتھ روما کے امرا میں تفرقہ ڈالدیا تھا اور ایک گروہ کو اپنا ہمدرد بنا لیا تھا۔ امرا کے دو گروہ تھے ایک اصل شرفا جن کو سینیٹ کی رکنیت کا حق تھا اور اہم عدالتی مقدمات کا تصفیہ وہی کر سکتے تھے اور دوسرے ساہوکار جن کو روما میں نائٹ کہتے تھے، جن کو یہ حقوق حاصل نہ تھے۔ گراکس نے انھیں بھی عدالتی حقوق دلا کر اپنا گرویدہ بنا لیا۔ تجاویز مذکورہ بالا عمل میں لانے میں جو طریقہ گراکس نے اختیار کیا وہ بھی قابل غور ہے۔ سینیٹ کو تاریخی روایات کے لحاظ سے جو اقتدارات اور حقوق حاصل تھے اس کی اس نے بالکل پروا نہیں کی بلکہ اس کے برخلاف وہ صرف جمہور روما کو کورم میں مخاطب کرتا تھا۔

سینیٹ کے اقتدارات پر اس سے قبل کبھی کھلم کھلا حملہ نہیں ہوا تھا پہلے پہل تو گائس اپنے جملہ مقاصد میں کامیاب ہوا جس کا سبب علاوہ اس کی پر اثر تقاریر کے یہ بھی تھا کہ اس کی تجاویز سے عوام کی مشکلات حل ہو رہی تھیں اور ان کے جذبات برانگیختہ ہوتے تھے۔ اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گائس دوبارہ ٹریبیون منتخب ہوا مگر اب اسے معلوم ہوا کہ کیٹیا جس پر اس نے اپنی امیدوں کی بنیاد رکھی تھی کس قدر کمزور تھی یعنی کمیشیا (جلسۂ عوام) کو قابو میں رکھنا دشوار تھا۔ اس کا ایک رقیب پیدا ہو گیا جس نے عوام کو اس کی طرف سے پھیر دیا اور پھر تیسری مرتبہ گائس ٹریبیون منتخب نہ ہو سکا۔ اس خدمت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی اس کے مخالفین نے اسے چین نہ لینے دیا اور تجویز پیش کی قرطاجنہ میں جو نو آبادی گائس نے بسائی تھی اس کو توڑ دیا جائے۔ گائس کے مویدین کو یہ سخت ناگوار ہوا اور انھوں نے اس کے بھائی کے خون کا انتقام لینے کا قصد کیا۔ اس حد تک پہنچ کر یہ تحریک گائس کے ہاتھ سے نکل گئی اور شورش پسند لوگوں کا اثر بڑھ گیا۔ لیکن اس جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ سینیٹ کو پھر غلبہ ہوا اور

گایس باوجود اپنے دوستوں کی وفاشعاری کے فرار ہونے پر مجبور ہوا اور آخرکار اپنے دشمنوں کے تعاقب سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی۔

اہل استبداد کی کامیابی قطعی تھی اور ارکین سینیٹ پھر اپنی پرانی روش پر چلنے لگے مگر گایس اور ٹائی بے ریس کے ایثار نے زمانے کا رنگ پلٹ دیا تھا۔ غربائے روما کو آخرکار ایسے لیڈر مل گئے تھے جنھوں نے انھیں بتا دیا تھا کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کیا کرنا چاہیے اور ان کے دلوں میں اپنے محسنوں کی یاد تازہ تھی جنھوں نے ان کے لیے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں اس کے علاوہ اس گروہ کو اپنی طاقت کا احساس تھا اور بہت جلد ان کو اپنی طاقت کے استعمال کا موقع مل گیا۔ مگر جب یہ موقع آیا اس جماعت نے معاملات خارجیہ میں دخل دیکر سینیٹ کی قوت بالکل توڑ دی۔

رومی مقبوضات واقع شمالی افریقہ کے مغرب میں ایک خطہ ملک موسومہ نومی ڈیا ہے۔ یہاں سخت مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔ رومیوں نے اس ملک کے تخت و تاج کا مالک ایک شخص کو قرار دیا تھا مگر ایک دوسرے شخص جگرتھا نے اس سلطنت پر قبضہ کر لیا اور مجبوراً اس غاصب کو زیر کرنے کے لیے فوج روانہ کرنی پڑی۔ اس جنگ کی ابتدائی لڑائیوں میں رومیوں کو نہایت ذلت کے ساتھ شکست ہوئی جس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ رومی سپہ سالار نہایت نااہل تھے اور دوسرے یہ کہ ملک بالکل غیر آباد اور ویران تھا جس کی وجہ سے فوجوں کی نقل و حرکت دشوار تھی۔ مے ٹےلس کے تقرر سے جو امرا روما میں سے تھا صورت حال میں کچھ اصلاح ہوئی۔ جگرتھا کو شکست ہوئی اور اس کا تعاقب کیا گیا مگر وہ بھاگ نکلا۔ مے ٹےلس کا نائب ایک نوجوان رومی مسمی میریس تھا۔ یہ شخص دیہات کا رہنے والا اور کم حیثیت تھا مگر اس کے حوصلے بلند تھے اس لیے وہ روما چلا گیا اور انتخاب کانسلی کا دعویدار ہوا تاکہ کانسل ہو کر نومیڈیا جائے اور جنگ کا خاتمہ کرے۔ میریس کا یہ دعوے روایات روما کے خلاف تھا اور اس کے علاوہ ارکین سینیٹ بھی فوجی معاملات میں غیروں کی دخل دہی ناپسند کرتے تھے مگر جمہور روما نے میریس کا ساتھ

دیا اور وہ انتخاب میں کامیاب ہوا۔ میریس نے اب نومیڈیا کا رخ کیا مگر باوجود خفیف کامیابیوں کے جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار رومیوں کی خوش قسمتی اور میریس کے نائب سولا کی لاثانی بہادری سے جگرتھا گرفتار ہوا اور اس طرح اس جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

میریس شاداں و فرحاں روما واپس آیا مگر اس جنگ کے ختم ہوتے ہی سلطنت روما پر ایک قہر عظیم نازل ہوا۔ رومیوں نے حال ہی میں غالیہ کا جنوبی حصہ اپنی سلطنت میں ملحق کر لیا تھا۔ اس علاقے میں چند اقوام آباد تھیں جن کو رومی کمبری اور ٹیوٹن کہتے تھے۔ اس قوم کے آدمی بلند قامت تھے ان کی آنکھیں نیلی تھیں اور بال ہلکے رنگ کے اس قوم کی کوئی حملہ آور فوج نہ تھی بلکہ تمام قوم جدید مساکن کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ ان کے ساتھ ان کی بیویاں اور بچے بھی گاڑیوں میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ یہ وہی جرمن اقوام ہیں جنھوں نے پانچ سو سال بعد مغرب میں سلطنت روما کو زیر و زبر کر دیا۔ ان اقوام اور روما میں جو ابتدائی مقابلے ہوئے اس میں جمہور روما کی فوجوں کو سخت شکستیں ہوئیں۔ آخری شکست رومیوں کو ۱۰۵ ق م میں دریائے رون کے قریب ہوئی جس میں رومیوں کے ۱۲۰۰۰۰ آدمی ضائع ہوئے۔ رومیوں کو اندیشہ تھا کہ یہ وحشی اقوام اب اطالیہ کا رخ کرینگی اور ان پر وہی مصیبت نازل ہوگی جو ہنی بال کے حملوں سے ہوئی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے وحشیوں کے ٹڈی دل جنوب میں ہسپانیہ کی طرف اور شمال میں دریائے رائن کے دہانے کی طرف چلے گئے اور اٹلی کی طرف انھوں نے ۱۰۲ ق م میں رخ کیا لیکن اس مدت میں میریس کی فوج ظفر موج نومیڈیا فتح کر کے واپس آگئی تھی اور ان کے مقابلہ کے لئے تیار تھی۔ میریس نے جو اس اثنا میں چار دفعہ کونسل ہو چکا تھا فوج کو اس مہم عظیم کے لئے خوب تیار کر دیا تھا ۱۰۲ ق م میں وحشی جب پھر واپس آئے انھوں نے اپنی جماعت کے دو ٹکڑے کر دئے ایک جماعت اطالیہ میں کوہ ایلپس کے مشرقی دروں میں سے داخل ہوئی اور دوسری رون ندی کی طرف روانہ ہوئی۔ مگر ان کی بہادری اور شجاعت روما کی قواعد داں

افواج کے مقابلہ میں بیکار تھیں اور ۱۰۲ ق م میں میرس نے ٹیوٹن اقوام کو بمقابلہ اکوئے سکیس سے سخت نقصان کے ساتھ شکست دی اور دوسرے سال اطالیہ واپس آکر کمبری اقوام کو بھی شکست فاش دی۔ وحشیوں نے اپنی گاڑیوں کے پیچھے کھڑے ہو کر لڑنا شروع کیا ان کی عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش لڑتی تھیں اور آخر کار موت کو قید ہونے سے بہتر سمجھ کر ان جانباز عورتوں نے خودکشی کر لی۔ رومیوں کو کامیابی زیادہ تر میرس کے سبب سے ہوئی تھی مگر سولا کے ہمدردوں نے بعد میں دعوے کیا کہ یہ کامیابی سولا کے سبب سے ہوئی تھی جو میرس کا نائب تھا اور سایہ کی طرح ہر جنگ میں اس کے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ کامیابی کا سہرا خواہ کسی کے سر ہو اس کی وجہ سے ۴۰۰ سال تک سلطنت روما کو کبھی ایسا زبردست خطرہ درپیش نہیں آیا۔

واقعات مذکورہ بالا کی اہمیت نہ صرف فوجی ہے بلکہ سیاسی بھی ہے میرس کا مسلسل سپہ سالار رہنا دستور روما میں ایک نئی بات ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ سلطنت سخت خطرہ میں تھی اور مجبوراً ایک ایسا شخص پانچ سال تک سپہ سالار رہا جو سپیو کی طرح طبقۂ امراء میں سے نہ تھا بلکہ عوام میں سے اور انھیں کے ایما سے سینیٹ کی سخت مخالفت کے باوجود برسرکار تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ میرس کی سپہ سالاری سے شہنشاہیت روما کی ابتدا ہوئی ہے یعنی اس زمانہ سے سلطنت روما میں اصل اقتدار کسی نہ کسی فوجی سپہ سالار کے ہاتھ میں رہا ہے اور حکومت دستوری کو کچھ زور اسی زمانہ میں ہوتا جب کہ کوئی ایسا شخص برسر اقتدار نہ ہو۔ میرس کے بعد سولا کا دور دورہ ہوا۔ سولا کے بعد پامپی کا۔ پامپی کے بعد جولیس سیزر تھا جس کے انتقال کے بعد آگسٹس نے شہنشاہیت روما کی بنیاد ڈالی۔

وحشیوں کی ہزیمت کے بعد میرس کا سلطنت روما میں کوئی مدمقابل نہ تھا جس کی وجہ سے وہ کسی سے کمتر رہنا پسند نہ کر سکتا تھا۔ امن وامان قائم ہو جانے کے بعد اس نے میدان سیاست میں قدم رکھا اور جمہور روما کا شریک ہو گیا جن کے دو لیڈروں نے برادران گراکس کی یاد اب تک تازہ رکھی تھی ان دونوں کی شراکت میں اس نے اصلاحی تجاویز پیش کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ عوام کے لئے

ستا غلہ مہیا کیا جائے اور نوآبادیاں ان علاقوں میں بسائی جائیں جنھیں وحشیوں نے ویران کر دیا تھا۔ میریس نے جدید تجاویز کے عمل میں لانے اور نوآبادیوں کی نگرانی اپنے ذمہ لی مگر باوجود اس کی کوشش کے اس کی تجاویز نے عملی صورت اختیار نہ کی جس کی وجہ یہ تھی کہ مثل دوسرے جری سپاہیوں کے اس میں تدبیر مملکت کا مادہ نہ تھا۔ اپنے شرکاء سے وہ لڑ بیٹھا اور سینیٹ کے دام تزویر میں آگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ جنگی شروع ہوگئی اور روما میں اس نے سینیٹ کی قوت بحال کر دی۔ میریس کی عظمت کا اب خاتمہ ہو رہا تھا اور آئندہ سے بجائے کامیاب سپہ سالار یا مدبر کے اس کی حیثیت ایک ناکام سازش کرنے والے کی ہوگئی۔ مگر اس کے کارناموں سے تاریخ روما میں ایک زبردست تغیر کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اب روما میں جمہور کی آواز ضعیف ہوتی جاتی ہے اور سپہ سالاروں کی قوت بڑھتی جاتی ہے اور انھیں کی مرضی سے جملہ امور کا تصفیہ ہوتا ہے۔ نظام فوجی میں بھی ایک اہم تغیر ہوا جو قابل ذکر ہے۔ رومی فوجوں میں غربا کو شریک نہیں کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے فوجی خدمت باوجود سختی کے تمغۂ شرافت خیال کی جاتی تھی۔ مگر جب میریس نے جنگ نیومیڈیا اور جرمنوں کے حملوں کو مسترد کرنے کے لیے سپاہی بھرتی کرنا شروع کیے تو اسے مجبوراً ہر طبقہ کے لوگوں کو فوج میں لینا پڑا جس کی وجہ سے روما کے غربا کی ایک تعداد کثیر فوج میں بھرتی ہوگئی۔ گویا اس تاریخ سے رومی فوجیں آزاد شہریوں پر مشتمل نہ تھیں بلکہ تنخواہ دار سپاہیوں پر اور ان کو سلطنت روما سے جو تعلق تھا وہ تنخواہ کا تھا نہ کہ حب وطن کا۔ اگر انھیں عقیدتمندی تھی تو اپنے سپہ سالار سے تھی نہ کہ سلطنت روما سے۔ اس تغیر سے فوجی حکومت کے قیام میں آسانی ہوئی اور سپہ سالاروں کا یہ اقتدار بالآخر روما کے زوال کا باعث ہوا۔

باب سیزدہم

سولا، خانہ جنگی اور سینیٹ کا احیاء

سنہ ۲۰۱ ق م کے بعد سلطنت روما بیرونی دشمنوں کے حملوں سے محفوظ تھی مگر سخت اندرونی مشکلات پیدا ہو گئے تھے۔ حلفائے روما کے حقوق کا مسئلہ نہایت دقت طلب تھا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ رومیوں نے جب اطالیہ کے مختلف اضلاع اپنی سلطنت میں ملحق کر لیے تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ نہایت شرافت اور فراخدلی کا برتاؤ کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے جنگ ہائے قرطاجنہ کے زمانے میں روما کا ساتھ دیا مگر اب ان دونوں اقوام کے تعلقات کشیدہ ہو رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ رومی مغرور تھے مگر اپنے حلفاء کے ساتھ ظلم یا سختی نہ کرتے تھے۔ اس کشیدگی کا سبب یہ تھا کہ حلفاء اب اس بات کو محسوس کرنے لگے تھے کہ انھوں نے سلطنت روما کی اکثر آڑے وقتوں میں مدد کی ہے جس کی وجہ سے ان کے ساتھ انصاف و مساوات کا برتاؤ ہونا چاہیے حلفاء کے مختلف مدارج تھے مگر لاطینیوں کی حالت سب میں بہتر تھی کیونکہ وہ روما کے ساتھ آزادی کے ساتھ تجارت کر سکتے تھے اور بعض حالتوں میں شہریت روما کے پورے حقوق بھی حاصل کر سکتے تھے۔ دوسرے حلفاء کی حالت ایسی نہ تھی اور ان کے لئے کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے وہ شہریان روما کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کر سکتے۔ لاطینی اور دوسرے حلفاء زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے اور اپنے اندرونی معاملات خود طے کرتے تھے اور رومی ان میں بہت کم دخل

دیتے تھے۔ غالباً دنیا میں اس زمانے میں مفتوح اقوام سے اس سے بہتر سلوک نہ ہوتا تھا۔ بظاہر ان کے یہ شکایات تھے کہ اثنائے جنگ میں ان پر دوہرا بوجھ پڑتا ہے فوجی قانون میں ان کو مرافعہ کا حق نہیں دیا گیا ہے اور رومی حکام اکثر ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتے ہیں مگر اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شہریان روما کے ساتھ مساوات کے خواہشمند تھے جس کے عطا کرنے سے رومیوں کا کوئی نقصان نہ تھا جیسا کہ بعد میں جا کر ثابت ہوا۔ مگر رومیوں کو اپنے حقوق خاص پر ناز تھا اس لئے جب تک کہ حلفاء نے اپنے حقوق کے لیے ہتھیار نہ اٹھائے رومیوں کو عقل نہ آئی اور آخرکار کشت و خون کے بعد مجبوراً وہی حقوق حلفاء کو دینا پڑے جو انھیں خود حاصل تھے۔

برادران گراکس اور میریس نے (۱۰۰ ق م میں) اس مسئلہ کو چھیڑا تھا اور پھر ۹۱ ق م میں مارکس لیوس ڈروزس نے جو ایک پرجوش اور بے لوث امیر تھا اطالیوں کی حق تلفیوں کی طرف رومیوں کو متوجہ کیا۔ ڈروزس ۹۱ ق م میں ٹریبیون منتخب ہوا اور اس نے اصلاح کی سفارش نہ صرف اطالیوں کی دادرسی بلکہ خود سینیٹ کے نفع کے لئے کی۔ کئی خفیف اصلاحات کے نفاذ میں اسے کامیابی ہوئی مگر تمام اقوام اطالیہ کو حقوق مساوات دینے کی تحریک پیش کرتے ہی رومیوں کی آتش غضب مشتعل ہو گئی اور اسی سال ڈروزس قتل کیا گیا۔

ڈروزس کے قتل ہوتے ہی خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کے سبب سے روما کی حالت حد درجہ نازک ہو گئی کیونکہ اس وقت اس کے مدمقابل وحشی یا قزلباش نہ تھے بلکہ خود اسی کے قواعد داں سپاہی اور تجربہ کار افسر۔ اس جنگ کے حالات وضاحت کے ساتھ معلوم نہیں۔ جانبین کی طرف سے سخت مظالم ہوئے اور کئی علاقے ویران ہو گئے۔ نہ کوئی بڑی یا فیصلہ کن جنگ ہوئی مگر ایک سال کے بعد رومیوں نے محسوس کر لیا کہ اس جنگ کا خاتمہ تلوار کے زور سے نہ ہو گا اس لئے مجبوراً صلح و آشتی سے کام لیا گیا اور آخرکار اسی طرز عمل پر کاربند ہوئے جس پر ایک سال قبل عمل پیرا ہونے سے جنگ کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ ۸۹ ق م

سولا، خانہ جنگی اور سینیٹ کا احیاء

سنہ ۱۰۵ ق م کے بعد سلطنت روما بیرونی دشمنوں کے حملوں سے محفوظ تھی مگر سخت اندرونی مشکلات پیدا ہو گئے تھے۔ حلفائے روما کے حقوق کا مسئلہ نہایت وقت طلب تھا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ رومیوں نے جب اطالیہ کے مختلف اضلاع اپنی سلطنت میں ملحق کر لیے تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ نہایت شرافت اور فراخدلی کا برتاؤ کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے جنگ ہائے قرطاجنہ کے زمانے میں روما کا ساتھ دیا مگر اب ان دونوں اقوام کے تعلقات کشیدہ ہو رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ رومی مغرور تھے مگر اپنے حلفاء کے ساتھ ظلم یا سختی نہ کرتے تھے۔ اس کشیدگی کا سبب یہ تھا کہ حلفاء اب اس بات کو محسوس کرنے لگے تھے کہ انھوں نے سلطنت روما کی اکثر آڑے وقتوں میں مدد کی ہے جس کی وجہ سے ان کے ساتھ انصاف و مساوات کا برتاؤ ہونا چاہیے حلفاء کے مختلف مدارج تھے مگر لاطینیوں کی حالت سب میں بہتر تھی کیونکہ وہ روما کے ساتھ آزادی کے ساتھ تجارت کر سکتے تھے اور بعض حالتوں میں شہریت روما کے پورے حقوق بھی حاصل کر سکتے تھے۔ دوسرے حلفاء کی حالت ایسی نہ تھی اور ان کے لئے کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے وہ شہریان روما کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کر سکتے۔ لاطینی اور دوسرے حلفاء زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے اور اپنے اندرونی معاملات خود طے کرتے تھے اور رومی ان میں بہت کم دخل

دیتے تھے۔ غالباً دنیا میں اس زمانے میں مفتوح اقوام سے اس سے بہتر سلوک نہ ہوتا تھا۔ بظاہر ان کے یہ شکایات تھے کہ اثنائے جنگ میں ان پر دہرا بوجھ پڑتا ہے فوجی قانون میں ان کو مرافعہ کا حق نہیں دیا گیا ہے اور رومی حکام اکثر ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتے ہیں مگر اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شہریان روما کے ساتھ مساوات کے خواہش مند تھے جس کے عطا کرنے سے رومیوں کا کوئی نقصان نہ تھا جیسا کہ بعد میں جا کر ثابت ہوا۔ مگر رومیوں کو اپنے حقوق خاص پر ناز تھا اس لئے جب تک کہ حلفاء نے اپنے حقوق کے لئے ہتیار نہ اٹھائے رومیوں کو عقل نہ آئی اور آخر کار کشت و خون کے بعد مجبوراً وہی حقوق حلفاء کو دینا پڑے جو انھیں خود حاصل تھے۔

برادران گراکس اور میریس نے (۱۰۰ ق م میں) اس مسئلہ کو چھیڑا تھا اور پھر ۹۱ق م میں مارکس لیویس ڈروزس نے جو ایک پرجوش اور بے لوث امیر تھا اطالیوں کی حق تلفیوں کی طرف رومیوں کو متوجہ کیا۔ ڈروزس ۹۱ق م میں ٹریبیون منتخب ہوا اور اس نے اصلاح کی سفارش نہ صرف اطالیوں کی داد رسی بلکہ خود سینیٹ کے نفع کے لئے کی۔ کئی خفیف اصلاحات کے نفاذ میں اسے کامیابی ہوئی مگر تمام اقوام اطالیہ کو حقوق مساوات دینے کی تحریک پیش کرتے ہی رومیوں کی آتش غضب مشتعل ہوگئی اور اسی سال ڈروزس قتل کیا گیا۔

ڈروزس کے قتل ہوتے ہی خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کے سبب سے روما کی حالت حد درجہ نازک ہوگئی کیونکہ اس وقت اس کے مدمقابل وحشی یا قرطاجنی نہ تھے بلکہ خود اسی کے قواعد داں سپاہی اور تجربہ کار افسر۔ اس جنگ کے حالات وضاحت کے ساتھ معلوم نہیں۔ جانبین کی طرف سے سخت مظالم ہوئے اور کئی علاقے ویران ہوگئے۔ نہ کوئی بڑی یا فیصلہ کن جنگ ہوئی مگر ایک سال کے بعد رومیوں نے محسوس کر لیا کہ اس جنگ کا خاتمہ تلوار کے زور سے نہ ہوگا اس لئے مجبوراً صلح و آشتی سے کام لیا گیا اور آخر کار اسی طرز عمل پر کاربند ہوئے جس پر ایک سال قبل عمل پیرا ہونے سے جنگ کا منہ نہ دیکھنا پڑتا یعنی ۸۹ق م

میں رومیوں نے اعلان کیا کہ باغی حلفاء میں سے جو ساٹھ دن کے اندر اطاعت قبول کرلیں انھیں شہریان روما کے حقوق دیئے جائینگے جس کا نتیجہ خاطر خواہ ہوا کیونکہ اسی حق کے حصول کے لیئے حلفاء لڑ رہے تھے اور سب نے ہتیار ڈالدیے۔ صرف پہاڑی علاقوں میں چند جتھے باقی رہ گئے۔

حلفاء کی بغاوت کے بعد رومی ایک دوسری مشکل میں پھنس گئے۔ اس زمانہ کی تاریخ سخت تاریکی میں چھپی ہوئی ہے اور جن تحریکات کا اس زمانہ میں آغاز ہوا ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا دشوار ہے مگر قیاس یہ ہے کہ ان میں پارٹی اسپرٹ (گروہ بندی) کا سخت زور ہوگیا تھا جس کی وجہ سے سلطنت کی ہستی معرض خطر میں آگئی۔ اس کے علاوہ علاقۂ پونٹس واقع ایشیائے کوچک کے بادشاہ نے رومیوں کے خلاف سر اٹھایا تھا۔ یہ شخص باوجود وحشی ہونے کے قابل تھا اور یونانیوں کے طور طریقے اختیار کرلیئے تھے۔ رومیوں کو اطالیہ میں مصروف دیکھکر اور یہ معلوم کرکے کہ ایشیائے کوچک کی رعایا رومی عہدہ داران مالگزاری کی دار وگیر سے سخت نالاں ہے فوراً اس صوبہ پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا جس سے رومی مقبوضات مشرق کی بنیاد گویا ہل گئی۔ متھریڈیٹس کی فوجیں یونان اور ایتھنز میں پہنچ گئیں جہاں ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ رومیوں نے محسوس کیا کہ ان کی سلطنت کو مشرق میں دوبارہ قائم کرنے کے لیئے ایک زیرک اور مستقل مزاج آدمی کی ضرورت تھی۔ مگر ایسے شخص کا تقرر دشوار تھا کیونکہ مختلف گروہوں میں سخت باہمی مخالفت تھی۔ باوجود ہزیمت کے رومیوں کا خیال تھا کہ دوبارہ اقتدار جمانے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔ اور بصورت فتح سپہ سالار کی عظمت بہت بڑھ جائیگی اور اس کو اور اسکے سپاہیوں کو مال غنیمت بے شمار ملیگا۔ اس عہدہ کے دو دعویدار تھے اصولاً تو یہ خدمت سولا کو ملنی چاہیے تھی جو سال ماقبل میں کانسل تھا مگر جمہور روما کی خواہش تھی کہ میریس کا تقرر ہو اور ان کو یہ بھی امید تھی کہ اگر حلفاء کے ساتھ مزید مراعات کی جائیں تو وہ بھی ان کے ہم نوا ہو جائینگے۔ لیکن مسئلہ ایسا نہ تھا جو بحث و مباحثہ سے طے ہوتا اور آخر کار جنگ وجدال کی نوبت آگئی۔ میریس کی قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

سولا روما کی طرف بڑھا اور اس پر قبضہ کرلیا۔ یہ روما کی تاریخ میں پہلی مثال ہے کہ روما کے کسی شہری نے روما پر قبضہ کرلیا ہو۔ میریس اپنی جان لیکر بھاگ کھڑا ہوا اور سولا نہ صرف روما یا اطالیہ بلکہ تمام شہنشاہی روما کا مالک بن بیٹھا۔ لیکن یہ امر بدیہی تھا کہ اگر اس کی فوجیں اطالیہ سے ہٹ جائیں تو وہاں پھر سخت بدامنی پھیل جاتی۔ مگر یا تو مشرق میں جنگ کا رخ رومیوں کے خلاف تھا یا وہاں زیادہ نفع کی امید تھی اس لئے سولا روما میں قیام امن کے لئے سرسری انتظام کرکے اپنی فوج لے کر یونان پہنچا اور ثابت کردیا کہ متھریڈیٹس کی فتوحات محض اتفاقی تھیں اور اس کی فوج روما کے قواعد داں اور سکھائے ہوئے سپاہیوں کے مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی تھی، خصوصاً جب کہ ان کی کمان ایک لائق سپہ سالار کے ہاتھ میں ہو۔ بادشاہ مذکور کی افواج کو دو دفعہ ایشیا میں سخت شکست ہوئی اور اہل ایتھنز نے بھی ایک طویل محاصرہ کے بعد اطاعت قبول کی۔ اس کے بعد سولا نے ایشیائے کوچک کا رخ کیا اور متھریڈیٹس نے بدرجۂ مجبوری صلح کی درخواست کی اور تمام رومی مقبوضات کا تخلیہ کردیا۔ سولا ان محاربات میں ۸۷ ق م سے ۸۳ ق م تک مصروف تھا۔ اس اثناء میں روما اور اطالیہ میں پھر اس کے دشمنوں کا غلبہ ہوگیا۔ میریس جلاوطنی سے واپس آگیا تھا اس کے دل میں جوش انتقام موجزن تھا اس لئے اس نے کنا کو اپنا شریک کرلیا جو جمہور روما کا سرکردہ تھا ان لوگوں نے روما پر قبضہ کرلیا، اپنے دشمنوں کو قتل کرڈالا اور چند روز کے لئے سینیٹ کو بے دست وپا کردیا۔ ۸۶ ق م میں میریس نے انتقال کیا اور روما میں کنا کا طوطی بولنے لگا مگر ظاہر تھا کہ ایک نہ ایک دن ظفریاب سولا مشرق سے واپس آئیگا اور جو بدلہ وہ اپنے دشمنوں سے لیگا وہ میریس کے انتقام سے سخت تر ہوگا۔ اس زمانہ میں کنا کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ کس طرح سولا کا مقابلہ کیا جائے، اس لئے اس نے ایک فوج تیار کی اور یونان کے قصد سے روانہ ہوا کہ افواج کی کمان بزور شمشیر سولا سے چھین لے مگر اس کے سپاہی اس سے بددل ہوگئے اور انھوں نے اس کو برنڈیسی میں قتل کردیا۔ سولا ۸۳ ق م میں اطالیہ واپس آیا مگر جمہور روما اس سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جانبین میں جنگ ہوئی مگر سولا نے باسانی اپنے دشمنوں کو زیر کرلیا

اور روما پر قبضہ کر کے سامانیوں کی آخری بغاوت فرو کردی اپنے حریفوں کے ساتھ وہ نہایت بیرحمی کے ساتھ پیش آیا جس سے میریس اور لنا کے مظالم لوگ بھول گئے اور سلطنت روما پر جو جابرانہ حکومت اس نے کی وہ عرصہ تک رومی فراموش نہ کر سکے۔

مگر باوجود اس بیرحمی کے سولا بڑے پایہ کا مدبّر تھا اور سلطنت روما کے آئندہ انتظام کے لئے قطعی رائے اس نے قائم کر لی تھی۔ اس کا منشا تھا کہ سینیٹ کے اقتدارات پھر بحال کئے جائیں تاکہ جمہور روما پھر سر نہ اٹھاسکیں اور نہ میریس کی طرح کوئی فوجی سردار دستور روما کو زیر و زبر کر سکے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے اس نے تین اہم فرائض سینیٹ کے سپرد کر دیئے یعنی وضع قوانین، معدلت اور سلطنت کی عام پالسی۔ اور سینیٹ کو مزید تقویت دینے کے لئے اس نے ٹریبونس کے اقتدارات کو ضعیف کرنا شروع کیا کیونکہ انھیں عہدہ داروں کے ذریعہ سے جمہور روما نے اپنے مقاصد حاصل کئے تھے اس لئے اس نے قاعدہ مقرر کرا دیا کہ جو شخص اس خدمت کو قبول کرے وہ کسی اعلیٰ خدمت کا مستحق نہیں ہو سکتا اور اس کے علاوہ ہر ٹریبیون پر لازمی کر دیا گیا کہ ہر سال کے ختم پر اپنی کارگزاری ثابت کرے۔ یہی ایک خدمت تھی جس کے ذریعہ سے بلند حوصلہ افراد کے لئے ممکن تھا کہ سیاسی اقتدار حاصل کریں سولا نے جو قواعد وضع کئے ان کے نفاذ کے بعد اولوالعزم اشخاص کو خدمت ٹریبیونی سے کوئی رغبت باقی نہ رہی کیونکہ ایک تو اس سے کوئی بڑا اقتدار نہ ہوتا اور دوسرے آئندہ کسی بڑی خدمت کے ملنے کی امید نہ رہتی۔ گویا جمہور روما سے وہ ہتیار چھین لیا گیا جس کے ذریعہ سے انھوں نے اس قدر سیاسی اور تمدنی ترقی کی تھی۔ سولا نے کامیاب سپہ سالاروں کے غصب سلطنت کو بھی دشوار کر دیا اور قاعدہ مقرر کرا دیا کہ جس شخص کو فوجی خدمات کی خواہش ہو وہ پہلے چھوٹی خدمتوں سے شروع کرے اور درجہ بدرجہ سپہ سالاری تک ترقی کرے اور اسی خدمت پر دوبارہ مقرر ہونے کے لئے بھی ایک وقفہ مقرر کیا گیا جس کا اصل منشا یہ تھا کہ میریس کی طرح کوئی شخص طویل عرصہ تک سپہ سالار رہکر سلطنت پر قبضہ نہ کرے کسی گمنام شخص کا خدمت کانسلی پر تقرر نہ ہو سکے اور وہ سالہا سال تک سپہ سالار افواج نہ رہے۔ خدمت ٹریبیون کی

تبدیلی سے سولا نے مجالس عوام کو ضعیف کر دیا۔ اور اولوالعزم اشخاص کے زور پکڑنے کو بھی اس نے قواعد مذکورہ کے نفاذ سے ناممکن کر دیا جس سے سینیٹ کا اب کوئی مد مقابل نہ رہا۔ انصرام امور سلطنت اور وضع قوانین پر اس کی پوری نگرانی تھی اور عدالتیں بھی اس کی نگرانی میں کر دی گئیں جس سے گائیس گراکس کی اصلاحات گویا کالعدم ہو گئیں۔ ان تدابیر کے عمل میں لانے سے سولا کا منشا تھا کہ جمہور کی ترقی روک دے اور روما میں اسی قسم کی حکومت قائم کرا دے جو جنگ ہائے قرطاجنہ کے زمانہ میں تھی۔ اس کی تدابیر بے سود ثابت ہوئیں مگر دلچسپی سے خالی نہیں۔ اگر سینیٹ میں اصلاح پذیری کا مادہ باقی ہوتا تو سولا کی اصلاحات اس کے مرض کی دوا بن سکتیں مگر جن وجوہ سے سینیٹ کے اقتدارات ضعیف ہو رہے تھے ان کی طرف سولا کو توجہ نہ تھی اور وہ صرف بیرونی اثرات رفع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی شخص کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی نوک قلم سے سینیٹ کا عظمت و اقتدار دوبارہ قائم کرے کیونکہ اس کے ارکین کے خصائل ناپسندیدہ ہو گئے تھے۔ سپہ سالاروں کے اقتدارات کم کرنے کی جو کوشش سولا نے کی وہ بھی بے سود ثابت ہوئی۔ روما ایسی عظیم الشان اور غدار سلطنت میں ایسے سپہ سالاروں کا ہونا ضروری تھا اور ظاہر ہے کہ جب کسی فرد واحد کے ہاتھ میں ایسے غیر معمولی اقتدارات آ جائیں تو جلد ان سے سبکدوش ہونا پسند نہ کرے گا۔

سولا کی اصلاحات دیرپا ثابت نہ ہوئیں کیونکہ یہ تدریجی نہ تھیں بلکہ بزور شمشیر عمل میں لائی گئی تھیں اور بزور شمشیر کالعدم کر دی گئیں۔ ۷۸ ق م میں اس نے انتقال کیا۔ اس کے مرتے ہی اس کا قائم کردہ دستور زیر و زبر ہو گیا اور سلطنت میں بدامنی پھیلنے لگی ہسپانیہ میں میریس کی پارٹی کو ایک نیا اور قابل لیڈر مل گیا جس کا نام سرٹوریس تھا اور سینیٹ کی افواج کو اس کے زیر کرنے میں پہلے پہل سخت ناکامی ہوئی مشرق میں بھی سولا کی آنکھیں بند ہوتے ہی متھری ڈیٹس کی افواج نے پھر سر اٹھایا اور ایشیائے کوچک کے زرخیز علاقوں اور غدار شہروں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی خطرات تھے

جن کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ سلطنت روما تہ وبالا ہو جائیگی بحیرۂ روم اور خصوصاً اس کے مشرق میں بحری ڈاکوؤں نے لوٹ مار مچانی شروع کر دی اور ان کا مقابلہ کرنے کی کسی کو جرات نہ تھی۔ سمندروں میں وہ جہازوں کو لوٹ لیا کرتے۔ اطالیہ کے سواحل پر اتر کر لوٹ مار کرتے بلکہ جو لوگ جمہوریت روما کی حفاظت میں ہوتے ان کو اور بھی لوٹتے۔ خود اطالیہ میں غلاموں کی ایک خوفناک شورش پیدا ہو گئی تھی۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جنگ ہائے قرطاجنہ کے بعد غلاموں کی تعداد میں اضافہ کثیر ہوا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس ملک میں غلامی کا رواج ہو وہاں کے تمدن کی بنیاد نہایت متزلزل ہوتی ہے یکایک میں چند غلام جو شیروں سے کشتی لڑنے کے لئے سکھائے جا رہے تھے اپنے قید خانے سے نکل بھاگے اور بہت جلد ان کے گرد دوسرے غلام بھی تعداد کثیر میں جمع ہو گئے۔ ان کا سرگروہ ایک تھریسی سردار مسمی اسپارٹکس تھا جس میں علاوہ قابلیت کے ان وحشی غلاموں کو منضبط رکھنے کی صلاحیت بھی تھی۔ اطالیہ میں ہر جگہ بڑے بڑے قید خانے تھے جہاں غلام رکھے جاتے تھے اور ان سے زراعت کا کام لیا جاتا تھا۔ اسپارٹکس کی جماعتوں نے سر عام ان قید خانوں کے دروازے کھول دیئے اور آزاد شدہ غلام جوق جوق ان کے شریک ہوتے گئے۔ ان کو انتقام اور تاخت و تاراج کا خوب موقع ملا بلکہ یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ ان کا سر کرنا دشوار ہو گا۔ رومی سپاہ جو ان کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی اس کو ابتدائً شکست ہوئی۔ جنوبی اطالیہ ان غلاموں کی فوج کے قبضہ میں تھا اور صرف محصور شہر ان کی دست درازی سے محفوظ تھے۔ زراعت پیشہ لوگوں کو ان کے ہاتھوں سخت اور ناگفتہ بہ تکالیف پہنچیں۔

اس پر آشوب زمانہ میں سولا نے غصب اقتدارات کے متعلق جو قیود نافذ کی تھیں ان کا قائم رہنا دشوار تھا۔ ایک نوجوان فوجی سردار مسمی پامپی ہسپانیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بھیجا گیا اور ۷۱ ق م میں ایک طویل اور پریشان کن جنگ کے بعد واپس آیا۔ غلاموں کی بغاوت بھی اس اثنا میں کراسس نے ختم کر دی تھی جو ایک سربرآوردہ رومی تھا اور اپنے زمانہ کا سب سے دولت مند آدمی تھا۔ کراسس اور پامپی نے مطالبہ کیا کہ ۷۰ میں ان کو کانسل منتخب

کیا جائے اور ان کی فتوحات کے صلہ میں ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ ان کے مطالبات سولا کی تجاویز کے منافی تھے مگر انکار دشوار تھا کانسل مقرر ہوتے ہی ان کامیاب سرداروں نے سولا کے قائم کردہ دستور کو تہ و بالا کر دیا۔ کیونکہ اراکین سینیٹ میں بھی اس دستور کے حامی بہت کم تھے اور ٹریبیون کے اقتدارات کی بحالی سے اس کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ جمہور روما کو پھر وضع قوانین اور جملہ امور سلطنت پر اقتدار حاصل ہو گیا اور سولا نے جو قیود ان کی ترقی میں حائل کر دی تھیں دفع ہو گئیں۔

سیاسیات روما کا رخ اس وقت یہ تھا کہ تمام اقتدارات سلطنت کسی فرد واحد کو حاصل ہو جائیں یعنی سلطنت شاہی کسی نہ کسی صورت میں قائم ہو جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری تدبیر ممکن نہ تھی۔ چونکہ نیابت کے طریقہ کا ابھی رواج نہیں ہوا تھا اس لئے سلطنت روما کسی غدار سلطنت میں جمہوریت کا فروغ ہونا ناممکن تھا۔ سینیٹ پر جمہور کو بالکل اعتماد نہ تھا کیونکہ اس کے اراکین صرف اپنے خاص طبقہ کی نیابت کرتے تھے اور جمہور روما کسی فرد واحد کو اپنا اصلی نائب تصور کرتے تھے جسے وہ برسر اقتدار کرتے۔

ہسپانیہ کی بغاوت فرو ہو گئی اور باغی غلاموں کے گروہ نیست و نابود کر دیئے گئے۔ مگر اب بھی مزید خطرات درپیش تھے۔ بحری قزاق الطالیہ کے سواحل پر غارتگری کر رہے تھے۔ جس کے سبب سے غلہ بیحد مہنگا ہو گیا تھا۔ مشرق میں ایک رومی فوج سپہ سالار لیوکلس کی ماتحتی میں متھریڈیٹس کو شکست دے کر آرمینیا کے پہاڑوں میں پہنچ گئی تھی مگر یہ کامیابی دیرپا ثابت نہیں ہوئی اور پھر ہنوز روزاول کا مضمون تھا۔ رومیوں میں اس وقت پامپی کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کو اس مصیبت سے نجات دلا سکتا کیونکہ اب تک وہ چھ مہمات میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جمہور روما بھی اس کے گرویدہ تھے کیونکہ اس نے ٹریبیون کے اختیارات بحال کر دیئے تھے اور اراکین سینیٹ اور امراء روما بھی اس سے ناراض نہ تھے۔ ۶۷ ق م میں گیا بی نیس (ٹریبیون) نے اپنے بحال شدہ اختیارات عمل میں لا کر تحریک کی کہ پامپی کو بحری قزاقوں کا قلع قمع

کرنے کے لئے روانہ کیا جائے تمام افواج بری و بحری اس کے تحت میں کر دی جائیں اور سلطنت روما کے تمام ذرائع اس کے سپرد کیے جائیں۔ اس تحریک کی کسی قسم کی مخالفت نہیں ہوئی اور پامپی نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ اس پر اعتماد بجا کیا گیا تھا۔ صرف معقول انتظام کی ضرورت تھی اور پامپی میں انتظام کا خاص مادہ تھا۔ پامپی نے قزاقوں کا تعاقب کیا اور جب وہ اپنے ساکن واقع کریٹ اور سلیشیا میں پہنچ گئے وہاں ان کا قلع قمع کر دیا گیا مگر اس فتح کے بعد اس نے مفتوحین کے ساتھ رحمدلی کا برتاؤ کیا۔ قزاقوں کی بیخکنی سے سمندر میں پھر امن قائم ہو گیا اور روما میں غلہ سستا ہو گیا۔ متھریڈیٹس کی بیخ کنی ابھی باقی تھی جو ایشیائے کوچک پر قبضہ کیے ہوئے تھا اور رومیوں کا مذاق اڑاتا تھا۔ اسلئے ایک دوسرے ٹریبیون (مینلیس) نے تحریک کی تسخیر اضلاع مشرق کے لئے پامپی کو غیر محدود اقتدارات بلا تعین وقت عطا کیے جائیں۔ مگر یہ تحریک آسانی کے ساتھ مقبول نہیں ہوئی۔ اکثر لوگوں کو اندیشہ ہوا کہ دستور جمہوری کا خاتمہ ہو رہا ہے اور بعض اراکین سینٹ نے علانیہ کہدیا کہ سلطنت جدید قائم ہو رہی ہے مگر اس تحریک کو قبول کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ ۶۶ سنہ ق م میں پامپی اس جدید مہم کو سر کرنے کیلئے روانہ ہوا۔ مگر یہ مہم نہایت آسان ثابت ہوئی۔ صرف انتظام کی ضرورت تھی نہ کہ کسی خاص فوجی قابلیت کی۔ متھریڈیٹس شکست کھا کر کریمیا کی طرف بھاگا اور وہیں مر گیا۔ اس کے بعد پامپی ایشیائے کوچک سے ہوتا ہوا شام میں پہنچا جہاں طوائف الملکی پھیلی ہوئی تھی۔ سکندر اعظم کے سپہ سالاروں کی اولاد اس کی زرخیز وادیوں اور غدار شہروں پر برائے نام قابض تھی مگر ملک شام اور اس کے بڑے بڑے شہر مثلاً انطاکیہ و دمشق شاہ آرمینیا کے قبضہ میں آ گئے تھے اور جنوب میں یہودی بھی قریب قریب خود مختار تھے۔ گویا شام اس وقت ایک پختہ پھل تھا جسے صرف توڑنے کی ضرورت تھی۔ پامپی نے ملک شام کو ایک رومی صوبہ قرار دیا اور اپنی واپسی سے قبل تمام اقطاع مشرق کا انتظام مناسب کر دیا۔ ملک شام کے علاوہ قدیم صوبجات بھی نیا و سلیسیا کا انتظام بھی اس نے درست کیا اور بہت سے شہر

اور جدید سلطنتیں قائم کی گئیں تاکہ ایشیائے کوچک میں امن قائم رہے اور دریائے فرات کی طرف رومی سرحد محفوظ رہے۔ پامپی کے انتظامات نہایت اہم تھے اور جب تک رومیوں کا اقتدار مشرق میں قائم تھا ان کا اثر باقی تھا۔ سنہ ۶۲ ق م میں اس نے روما کی طرف کوچ کیا۔ اسے امید تھی کہ اس کا نہایت شاندار استقبال ہوگا مگر جب وہ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ سخت ابتری پھیلی ہوئی ہے جس کے اسباب آئندہ باب میں بیان کیے جائینگے۔

بابِ چہار دہم

قیصر

جمہوریت روما اب عالم نزع میں ہے اور اس کی آزادی کا خاتمہ اس کے متحمد فوجی سرداروں کی تلواروں سے ہو رہا ہے سینیٹ اور کیٹیا اور عہدہ داران دستوری کے اقتدارات بحال کرنے کے لئے بھی کبھی کبھی کوشش ہوتی ہے مگر ان کا بارآور ہونا محال ہے۔ فوجی حکومت کے قیام کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی اور آئندہ چار سو سال تک حکومت خوداختیاری روز بروز ضعیف ہوتی جاتی ہے اور اس کے بجائے شخصی حکومت قائم ہو جاتی ہے جس کا دارومدار افواج کی وفاداری پر ہے۔

پامپی کے اطالیہ واپس ہونے سے قبل روما میں ایک سخت بغاوت ہو گئی جس کا سرگروہ کیاٹی لین تھا۔ اس بغاوت کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔ مورخین کو اس کے اسباب و مقاصد کے متعلق اختلاف ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس زمانے کے مدبرین میں سے کون کون اس میں شریک تھے۔ مگر ہمارے نقطۂ خیال سے اس واقعہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں کیونکہ رفتار زمانہ پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ روما میں فتنہ و فساد کے مختلف عناصر موجود تھے۔ غربا اپنے افلاس سے پریشان تھے اور سینیٹ سے بیزار اور انھیں وجوہ سے سیاسی اور تمدنی اصلاحات کے منتظر رہتے تھے۔ امرائے روما نے بھی اس ابتری کے زمانہ میں بہت تکالیف اٹھائی تھیں اور ان میں سے اکثر عیاشی اسراف

وغیرہ کی بدولت تباہ ہو چکے تھے۔ کیا ٹی لین بھی انھیں امرا میں سے تھا۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی تھا کہ جب پامپی واپس آئیگا تو سولا کا طرزِ عمل اختیار کرے گا یا کم از کم اپنے لئے مطلق العنان حکومت کا اور اپنے سپاہیوں کے لئے زمینوں کا طلبگار ہوگا اور اس کے مطالبات بغیر قتل، اخراج اور عام ابتری کے پورے نہ ہونگے۔ اس بغاوت کی اصلیت سمجھنے میں دقت یہ واقع ہوتی ہے کہ باغیوں میں مختلف گروہوں کے لوگ تھے۔ بعض تو صرف سیاسی اصلاح اور جمہور کے اقتدارات کی بحالی چاہتے تھے۔ بعض ایک فوج قائم کرنا چاہتے تھے جو پامپی کی فوج کا مقابلہ کر سکے اور بعض صرف یہ چاہتے تھے کہ بدامنی پھیل جائے اور ان کو لوٹ مار اور غارتگری کا موقع ملے۔ کیا ٹی لین نے ابتداً دستوری ذرائع اختیار کئے اور تین دفعہ اس نے کانسلی کے انتخاب کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا مگر اسے ناکامی ہوئی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ان ذرائع سے وہ برسر اقتدار نہیں ہو سکتا تو اس نے ابتری پھیلانے کی کوشش کی اور بگڑے دل گرفتہ کار سپاہیوں کی فوج اس نے اٹروریا میں جمع کر لی اور کمان خود اپنے ہاتھ میں لی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو روما میں چھوڑ دیا کہ موقع پا کر شہر میں آگ لگا دیں اور جب ابتری پھیل جائے قبضہ قائم کر لیں۔ مگر اس زمانہ میں سسرو کانسل تھا۔ اس کے جاسوسوں نے باغیوں کے منصوبوں کی اسے اطلاع دیدی اور اس نے ایسا انتظام کیا کہ باغیوں کے منصوبے خاک میں مل گئے اور گرفتار ہو کر سب قتل کر دیے گئے۔ کیا ٹی لین کی فوج کو بھی فیصلے میں شکست ہوئی اور وہ خود بھی مارا گیا۔

روما میں اس وقت بہت سے مشاہیر موجود تھے۔ ان میں سے بعض سربرآوردہ اشخاص کے حالات بیان کئے جاتے ہیں جس سے اس زمانے کے حالات کا اندازہ ہوگا۔ سسرو کا ذکر آچکا ہے۔ یہ شخص ایک معمولی خاندان سے تھا اور دیہات میں پیدا ہوا تھا۔ فن سپہگری سے اس کو مناسبت نہ تھی اس لئے اس نے پیشۂ وکالت اختیار کیا کیونکہ سپہگری کے علاوہ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے روما میں کوئی شخص شہرت و نام آوری حاصل کر سکتا۔ روما کا سب سے بڑا مقرر ہونے

کی وجہ سے اس کا نام اب تک زندہ ہے اور اپنے زمانے اور زمانۂ مابعد پر اس کی تحریروں اور تقریروں کا ایسا بیّن اثر پڑا کہ زبانِ لاطینی اس کے اثر سے اب بھی خالی نہیں۔ فلسفے میں اسے کوئی رتبہ حاصل نہیں مگر ادبیات یونان میں اسے خاص مہارت تھی اور اس نے بہت سی یونانی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ سیاسیات میں اس کا رجحان قدامت پسندی کی طرف تھا اور اس کی خواہش یہ تھی کہ روما کے دونوں ذی ثروت طبقوں یعنی امرا جن میں سے ارکین سینٹ منتخب ہوتے تھے اور طبقۂ ساہوکاران آپس میں متحد ہو کر بدامنی، ابتری اور انقلابات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں۔ ایک حد تک اسے کامیابی بھی ہوئی اور اس نے ایک بغاوت فرو کر دی مگر چونکہ فوج اور اس کے سرداروں کے مقابلہ میں انسانیت، جمہوری روایات اور خوبیٔ تقریر کی کوئی وقعت نہ تھی اس لئے اس فرد زمانہ ادیب کو اس کی سیاسی امیدوں میں بالآخر ناکامی ہوئی۔

کیٹو ثانی بھی سیاسیات میں سسرو کا ہم خیال تھا مگر بالکل دوسری قماش کا آدمی تھا۔ یہ شخص کیٹو (جس کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے) کا پوتا تھا اور ہر بات میں اس کا مقلد تھا۔ اپنے دادا کی طرح یہ بھی زمانہ کی روش سے نالاں تھا۔ اسے ہمیشہ یہ رونا تھا کہ گزشتہ روایات کا احترام و ادب گھٹتا جاتا ہے، عیش پھیلتا جاتا ہے، عہدہ داران سرکاری میں رشوت کی گرم بازاری ہے، سینیٹ روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہے اور عام رعایا ناہموار ہو گئی ہے۔ اخلاقی جرأت کی اس میں کمی نہ تھی اس لئے جس بات کو وہ اپنے اصول کے خلاف خیال کرتا اس کے خلاف صدائے احتجاج بلالحاظ موقع و محل بلند کرتا اور خود بھی نہایت سادہ اور ایمانداری کی زندگی بسر کرتا۔ مگر اس میں کمی تھی تو عقل سلیم اور معاملہ فہمی کی۔ اس کے مداح بھی تھے مگر تمام زمانہ اس کا مذاق اڑاتا اور کسی نے اس کی تقلید نہ کی۔ مگر زمانہ مابعد کے مبصرین کا خیال ہے کہ حامیانِ جمہوریت میں سے یہ آخر تھا اور اس کی تعلیم روما کے ابتدائی شہنشاہوں کے لئے سدِ راہ تھی۔

کراسس کے بارے میں اتنا کہدینا کافی ہے کہ وہ اپنے زمانے کا سب سے دولتمند ساہوکار تھا اور دیگر ذرائع سے اس نے کثیر مال و متاع جمع کر لیا تھا۔

سپہگری اور سیاسیات میں بھی اس کو دخل تھا مگر دولت ہی کے سبب سے زیادہ تر
اس کی قدر و منزلت تھی اور ہر سیاسی گروہ اس کو شریک کرنا بہتر سمجھتا تھا۔
جولیس سیزر سے اس کو خاص تعلق تھا اور ابتدائی زمانے میں اس نے سیزر کی بہت
کچھ امداد بھی کی تھی۔ سیزر سنہ ۱۰۲ ق م میں پیدا ہوا اور خاندانی تعلقات کے لحاظ سے
وہ جمہور کا طرفدار تھا۔ لیکن اس زمانے تک اس نے نہ اپنی قابلیت کا ثبوت
دیا تھا نہ اس کے حوصلوں سے عوام کو آگاہی ہوئی تھی۔ اگر اس میں کوئی خصوصیت
تھی تو یہ تھی کہ ہمیشہ لباس فاخرہ زیب تن کیا کرتا اور اپنے اسراف اور دریا دلی
کے سبب سے دلدادگان فیشن میں اس کی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ سیزر میرس کا
خاص حامی تھا جس زمانے میں کہ میرس کی حمایت کرنا سخت خطرناک تھا۔
خوش تقریر بھی تھا گو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اس کو سسرو سے کوئی نسبت
نہ تھی مگر اپنے مضمون کو توضیح کے ساتھ بیان کرنے اور اپنے سامعین کو گرویدہ
کر لینے کا اس میں خاص مادہ تھا۔ سیزر اور کراسس کو کیٹلین سے بھی کچھ تعلق تھا
مگر ابتری پھیلانے میں انھوں نے اسے کوئی مدد نہیں دی تھی۔ اس لئے اس کے
زوال سے ان دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

پامپی سنہ ۶۲ میں واپس ہوا اور اس نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا
کہ رومیوں کو اس سے جو اندیشہ تھا وہ بے سر و پا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس
کے حوصلے بلند تھے مگر انقلاب پسندی اس کے خمیر میں نہ تھی۔ اسے گمان غالب
تھا کہ دستوری ذرائع سے اس کی امیدیں اور حوصلے پورے ہو جائینگے۔ اس لئے
برنڈسی میں اترتے ہی اس نے حسب قاعدہ اپنی فوج کی کمر کھلوا دی اور اس
امید میں رہا کہ اس کے سطوت و جبروت کی وجہ سے سینیٹ مجبور ہوگی کہ شرق میں
جو انتظامات اس نے کئے تھے انھیں منظور کرے اور اس کے سپاہیوں کو بطور
انعام زمینیں عطا کرے۔ مگر اس کو سخت مایوسی ہوئی۔ کیٹالین کی بغاوت فرو
کرنے میں سینیٹ کو جو کامیابی ہوئی تھی اس سے سینیٹ کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔
اس لئے اس کے ارکین نے پامپی کے بعض مطالبات کو بالکل رد کر دیا اور بعض
کے متعلق فیصلہ کیا کہ انپر بعد کو غور کیا جائیگا۔ شرق میں اسکے اختیارات شہنشاہوں سے

زیادہ تھے اور اب روما میں آکر محض ایک معمولی آدمی ہو گیا جس کا اہل سینیٹ نہ جڑھاتے تھے اس لئے اس نے اپنے ساہی اور مددگار تلاش کرنے شروع کئے تاکہ وہ سینیٹ کی قوت کو توڑ سکے۔ سیزر کراسس اور جمہوری جماعت کے لوگ اس کے طرفدار ہو گئے کیا ٹی لین کی بغاوت فرو ہو جانے کے بعد سیزر ہسپانیہ کو سپہ سالار بنا کر بھیجدیا گیا تھا مگر اب واپس آگیا تھا اور سینیٹ کا وہ بھی مخالف تھا۔ اس لئے تینوں زبردست اشخاص نے ایک دوسرے کی حمایت کا بیڑا اٹھایا جن میں سے ہر ایک میں ایک نہ ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ پامپی کے کارنامے شہرۂ آفاق تھے، کراسس کے پاس بے شمار دولت تھی جس کے بغیر کوئی فوجی کارروائی نہ ہو سکتی تھی! اور سیزر کا اثر فوج اور جمہور پر غالب تھا۔ ان کا مقابلہ کرنے سے مجبوری تھی۔ اس اتحاد کو مورخوں نے "اقتدار ثلاثہ اوّل" کے نام سے نامزد کیا ہے۔ ابتداءً اتحاد مخفی رکھا گیا مگر اس کے نتائج جلد ظاہر ہو گئے۔ سیزر ۵۹ ق م میں کانسل منتخب کیا گیا۔ پامپی کے شرقی کارناموں کا اعتراف کیا گیا اور اس کے سپاہیوں کو زمینیں دی گئیں۔ سینیٹ اب بالکل بے دست و پا ہو گئی تھی کیونکہ ذرا سی مخالفت پر سیزر کی فوج ان کی سرکوبی کے لئے تیار تھی۔ ۵۹ھ کے اختتام پر اتحاد ثلاثہ نے سلطنت روما کے لئے جدید انتظامات کئے۔ سیزر پانچ سال اور پھر دس سال کے لے غالیہ میں سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ پامپی نے روما میں قیام کیا۔ تاکہ سینیٹ کی نگرانی کرتا رہے اور کراسس کو اپنی دولت میں اضافہ کرنیکے لئے جدید موقعے ملنے اور سپہ سالاری کا بھی وعدہ کیا گیا۔

۵۸ ق م میں سیزر مہم غالیہ کو سر کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ دنیا میں کسی مہم کی تاریخ اس سے بہتر نہیں لکھی گئی کیونکہ سیزر نے خود اس کا تذکرہ اپنے قلم سے لکھا ہے جو نہایت واضح اور فصیح ہے اور تعلی کی بو سے بالکل خالی ہے۔ سب سے پہلے اس نے قوم سوئس کو پیچھے ہٹایا جو رومی صوبوں پر حملے کر رہے تھے اور اس کے بعد جرمنوں کی طرف متوجہ ہوا جو صوبۂ غالیہ کو تاخت و تاراج کرنے کی تیاری میں تھے۔ جرمن بھی اپنے ہم نسل اقوام کمبری اور ٹیوٹن کی طرح رومیوں کے لئے نہایت خطرناک دشمن ثابت ہوئے مگر سیزر نے ان کا قلع قمع کر دیا اور ان کی تعداد کثیر کو قتل کر کے دریائے رائن کی طرف بھگا دیا۔ اس وقت تک تو سیزر یا تو مقبوضات روما کی حفاظت کر رہا تھا یا ان

اقوام کی جن سے روما سے ارتباط تھا مگر اب وہ ملک غالیہ کی تسخیر پر کمر بستہ ہو گیا جس کے لئے ملک گیری کی ہوس کے سوا کوئی معقول عذر نہ تھا۔ اس غرض سے اسنے دریائے رائن کو دو مرتبہ عبور کیا اور جن غالی قبائل نے اس کا مقابلہ کیا سب کو مغلوب کر لیا۔ اس کے بعد وہ برطانیہ میں پہنچا اور برطانیوں کو رومی شمشیر کا مزہ چکھایا مگر اس اثناء میں غالیہ کے جدید مقبوضات میں بغاوت شروع ہو گئی۔ شمال میں اس نے بغاوت فرو کی تو اس کے شعلے جنوب میں بھڑک اٹھے اور سیزر کو سخت دقتیں پیش آئیں مگر آخر کار اس نے باغیوں کے سردار کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا اور باوجود باغیوں کے سخت مقابلہ کے سیزر کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس محاربۂ عظیم میں سخت خونریزی ہوئی سیزر نے خود اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی تہ تیغ کیے گئے۔ باغی قبائل کی زمینیں ویران کر دی گئیں۔ قبائل کے قبائل اسیر بنا کر غلامی میں بیچ ڈالے گئے۔ مگر باوجود ان امور کے زمانۂ قدیم کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے سیزر کے مظالم ناقابل برداشت نہ تھے۔ سیزر کے جنگ ہائے غالیہ کی تاریخ یورپ میں خاص اہمیت ہے کیونکہ ان کے سبب سے جرمن اقوام کے حملے تین سو سال کے لیے رک دیئے گئے اور اس زمانہ تک مغربی ممالک ان کی دار و گیر سے محفوظ رہیں۔ اسی اثناء میں فرانسیسی قوم اور سلطنت کی بنیاد پڑی کیونکہ تمدن و علوم روما اس ملک میں سرعت کے ساتھ پھیل گئے اور غالیوں نے نہ صرف رومی حکومت کو خوشی کے ساتھ قبول کیا بلکہ رومی تعلق پر فخر کرنے لگے۔ ان محاربات کا سیزر کے مستقبل اور روما کے نظام سلطنت پر جو اثر پڑا وہ بھی اہم ہے۔ اس کی فوج کو اگر عقیدت مندی تھی تو اس کی ذات سے نہ کہ سلطنت روما سے۔ مسلسل رزم و پیکار کی وجہ سے یہ فوج حد درجہ کارآزمودہ اور بہر دآزما ہو گئی تھی نقل و حرکت نہایت سرعت کے ساتھ کرتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ سپاہی قواعد داں اور بہادر تھے اور ان کو اپنے کارناموں پر ناز تھا۔ انھیں سپاہیوں کی امداد کے بل پر سیزر تخت و تاج شاہی کا دعویدار ہوا۔

مگر جس وقت سیزر ایک ملک کے بعد دوسرا ملک فتح کر رہا تھا روما میں بھی تغیرات مسلسل ہوتے رہے۔ پامپی کے سپرد جو کام ہوا تھا وہ سیزر کے کام سے زیادہ دشوار تھا اور اس کی کامیابی بھی اس درجہ کی نہ تھی جو سیزر کو حاصل ہوتی تھی کیونکہ روما کی

شورہ پشت آبادی میں امن وامان قائم رکھنا جرمنوں اور غالیوں کو رام کرنے سے
زیادہ دشوار تھا۔ ۵۶ ق م میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اقتدار ثلاثہ کے دشمن قریب
تھے کہ غالب آجائیں اور سینیٹ پامپی کے دباؤ سے نکل جائے۔ سسرو اس بغاوت کا
بانی اور سرغنہ تھا۔ صورت حالات اس قدر نازک ہوگئی کہ سیزر اپنا کام غالیہ میں چھوڑکر
الطالیہ واپس ہوا اور لیوکا واقع الطالیہ میں پہنچا جہاں اس کے دونوں شرکار پامپی اور
کراسس بھی اس سے جا ملے۔ سسرو اور اس کے ہمخیال ارکین سینیٹ کو امید تھی کہ
پامپی اور سیزر کے باہمی اختلاف سے انھیں کامیابی ہوگی مگر انھیں بہت جلد معلوم
ہوگیا کہ اتحاد ثلاثہ میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوگا، اور اگر انھوں نے مخالفت جاری رکھی
تو سیزر کی تلوار نیام سے نکل آئیگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت کے عناصر ناپید ہوگئے اور
سسرو اور دیگر مخالفین اتحاد نے اپنے افعال پر پشیمانی ظاہر کی اور معافی چاہی۔
ارکین اتحاد ثلاثہ نے پھر روما کا جدید انتظام کیا۔ سیزر کی سپہ سالاری میں پانچ سال
کی توسیع کی گئی۔ پامپی اور کراسس سال آئندہ کے لئے کانسل مقرر کرائے گئے
اور کراسس کو اس کے علاوہ پارتھیا کے خلاف مہم لیجانے کا بھی بطور انعام وعدہ
کیا گیا۔ مگر اب اقتدار ثلاثہ کے ٹوٹنے کا وقت قریب تھا۔ ۵۳ ق م میں کراسس اپنی
مشرقی مہم پر روانہ ہوا جس کی اس کو حد درجہ آرزو تھی مگر اس کو شکست ہوئی اور وہیں
مارا گیا۔ اس کی موت سے سیزر اور پامپی کے درمیان کوئی مصالحت کرنے والا
باقی نہ رہا اور ان دونوں میں مخالفت شروع ہوگئی مگر مخالفت کا اصل سبب یہ
تھا کہ دونوں میں خلقی حسد تھا کیونکہ اس زمانہ میں پامپی نے کوئی ایسا کار نمایاں
نہ کیا تھا جس کی وجہ سے اس کی قوت اور شہرت میں ترقی ہوتی۔ اس باہمی مناقشہ
کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پامپی سینیٹ کی طرف جھکا اور سینیٹ ہی کا حامی بنکر اس نے
سیزر سے دوستانہ تعلقات ترک کر دیئے جس سے خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ
یہ جنگ سیاسی اسباب کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی بلکہ دو اولوالعزم اشخاص کے ذاتی حسد
کی وجہ سے گو پامپی برائے نام سینیٹ اور سینیٹ کے اقتدارات کا حامی تھا اور سیزر
جمہور روما اور ان کے حقوق کے لیے لڑ رہا تھا۔ ابتداءً کچھ گفت و شنید کا سلسلہ جاری
رہا مگر آخر کار جنگ شروع ہوگئی اور سیزر روبی کون ندی عبور کرکے الطالیہ میں داخل ہوا۔

ابھی تک رومیوں نے سیزر کا لوہا نہیں مانا تھا ان کا خیال تھا کہ اس کو جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں وہ غالیہ کے نیم وحشی اقوام کے مقابلہ میں تھیں گر اس نے ثابت کر دیا کہ قواعد داں رومی افواج بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ پامپی اور ارکین سینیٹ کو کامیابی کی قوی امید تھی گر شروع سے آخر تک ایک جنگ میں بھی سرخروئی نصیب نہ ہوئی۔ سیزر نے نہایت سرعت کے ساتھ روما پر حملہ کیا جس کی مدافعت کا پامپی کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اہل اطالیہ نے سلطنت جمہوری کی حمایت میں کسی قسم کی گرمجوشی ظاہر نہ کی کیونکہ مسلسل خانہ جنگیوں اور انقلابات کی وجہ سے سیاسی معاملات میں انھیں دلچسپی باقی نہ رہی تھی انھیں صرف امن وامان کی ضرورت تھی تاکہ اطمینان سے تجارت و زراعت میں مشغول رہیں۔ اور سیزر نے بجائے تاخت وتاراج اور غارتگری کے تالیف قلوب کو اپنا اصول قرار دیا۔ دشمنوں کے ساتھ ہمیشہ مراعات کرتا اور قیام امن وامان میں ہمیشہ ساعی رہتا۔ اس لئے پامپی اپنی افواج لیکر برنڈسی کی طرف ہٹا اور وہاں سے ایپائرس کا رخ کیا اس امید میں کہ جس ملک میں اس کو غیر معمولی کامیابی ہوئی تھی وہاں اب بھی اسے سپاہی اور مددگار ملجائینگے۔ سیزر نے اس کا تعاقب مناسب خیال نہ کیا۔ ہسپانیہ میں بغاوت ہوگئی تھی وہاں حسب عادت تیزی کے ساتھ پہنچکر باغیوں کا قلع قمع کیا اور پھر اطالیہ واپس آیا۔ یہاں حالت نازک ہورہی تھی کیونکہ نہ صرف پامپی کی فوج نہایت غدار تھی بلکہ سمندر پر بھی اس کا قبضہ تھا۔ گر سیزر ان خطرات سے ہراساں نہ ہوا اور براہ سمندر ایپائرس پہنچا۔ پامپی پر اس نے پہلا حملہ جو کیا اس میں سخت ناکامی اور نقصان ہوا گر پھر اس نے تھسلی کا رخ کیا اور وہاں فارسالیا میں پامپی کو شکست فاش دی۔ پامپی میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا اور ایشیائے کوچک کی طرف چلا اس امید میں کہ اس کا نام سنتے ہی لوگ اس کے گرد جمع ہو جائینگے۔ مگر شکست نے اس کی شہرت کو خاک میں ملا دیا تھا اور آخر کار ایک مدت کی سرگردانی کے بعد ساحل مصر کے قریب کسی قاتل نے اس کا کام تمام کر دیا۔ گر سلطنت روما پر تمام وکمال قبضہ حاصل کرنے کیلئے سیزر کو زمانے تک مصروف جنگ رہنا پڑا۔ تسخیر مصر وافریقہ کے بعد حامیان پامپی وسینیٹ نے ہسپانیہ میں سر اٹھایا گر وہاں بھی منڈا میں سیزر نے ان کو شکست دے کر انکی قوت

ہمیشہ کے لئے توڑ دی۔
ان فتوحات کے بعد تمام سلطنت روما سیزر کے قبضۂ اقتدار میں آگئی مگر سکندر کی طرح حیات نے وفا نہ کی۔ اس کے کارناموں سے ظاہر ہے کہ سپہگری کے علاوہ وہ تدبیر مملکت میں بھی اسے خاص دسترس حاصل تھی۔ اور اگر زندگی نے کچھ اور ساتھ دیا ہوتا تو سلطنت روما کا وہ معقول اور دوامی انتظام کر دیتا۔ باوجود اس کے کہ اس نے شہنشاہی روما کی مکمل عمارت تعمیر نہیں کی اور صرف اس نے ابتدائی خاکہ تیار کیا تھا شہنشاہی روما کا حقیقی بانی وہی تھا۔
اس میں شک نہیں کہ جو طرز عمل اس کے جانشین آگسٹس اور دوسرے شہنشاہوں نے اختیار کیا وہ جولیس سیزر کے مجوزہ انتظامات سے مختلف تھا مگر سیزر ہی پہلا شخص تھا جس کی اولوالعزمی سے ایک فرد واحد کے ہاتھ میں سلطنت روما کی عنان حکومت آگئی اور اسی کے جبر و سطوت اور عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے شہنشاہی روما کا آئندہ چل کر قیام عمل میں آیا۔ سیزر کے مجوزہ انتظام حسب ذیل تھے۔
تمام اقتدارات ایک ہی شخص کے قبضے میں رہیں مگر اس کی موت تک یہ طے نہیں ہوا تھا کہ اس شخص کو شہنشاہ یا بادشاہ یا ڈکٹیٹر کہا جائے۔ سینیٹ کے عزو وقار کو قائم رکھا جائے اور اس کی تعداد میں اضافہ کر کے ۹۰۰ کر دیا جائے تاکہ صوبجات کے مشاہیر اور اکابر بھی اس میں شریک ہو سکیں۔ اس کے احکام قطعی ہو نہیں سکتے تھے اور آئندہ سے وہ سلطنت کی مجلس شوریٰ ہو گئی۔ سیزر شہنشاہی کے درجہ تک جمہور کا حامی بنکر پہنچا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس کے مجوزہ نظام میں کمیٹیا کے اختیارات کے بحال رہنے کا کوئی موقع نہ تھا کیونکہ شہریان روما کو کوئی معقول حق نہیں تھا کہ وہ ساری دنیا پر حکمرانی کریں۔ اس لئے شہریان روما کو وہ اختیارات دینے سے مجبور تھا جو گراکس ان کو دینا چاہتا تھا گر گراکس کے دوسرے اصلاحات کو سیزر نے بحال رکھا مثلاً غربا کی امداد اور جدید نو آبادیوں کا قیام جدید شہنشاہی کے یہی اصول تھے۔ مگر بہت سی باتیں طے ہونے سے رہ گئیں مثلاً جانشینی اور مفتوحہ صوبجات کا انتظام جہاں اصلاح کی سخت ضرورت تھی۔
سیزر کے کارنامے صرف فتوحات اور سیاسی اصلاحات تک محدود نہیں۔ اس کا شمار روما کے مشہور مصنفوں میں ہے بلاد الطالیہ میں آزاد مجالس بلدی کے قیام

اور تنظیم کے لئے اس نے ایک نہایت اہم قانون نافذ کیا۔ جنتری میں اس نے اصلاح کی اور اسی کی اصلاح شدہ جنتری ۱۶۰۰ء تک یورپ میں جاری رہی۔ یورپ میں اس سے زیادہ ذہین اور ذکی شخص پیدا نہیں ہوا اور اگر اس کی حیات نے کچھ اور وفا کی ہوتی تو نوع انسان کی ترقی اور فلاح کے لئے یہ برگزیدہ شخص بہت کچھ کر سکتا۔ مگر اس کے اصلاحات کو روما کی اکثر جماعتیں اندیشے اور عناد کی نظر سے دیکھتی تھیں کیونکہ ان اصلاحات کو عمل میں لانے سے جمہوری روایات نظر انداز ہو رہی تھیں اور نہ عوام کے جذبات کا خیال رکھا گیا تھا۔ ۴۴ ق م میں مختلف جماعتوں نے سیزر کے خلاف سازش شروع کی۔ ان میں سے بعض کو سیزر کی ذات سے بغض تھا۔ وہ اسکے علوئے مرتبت کو دیکھ نہیں سکتے تھے اور بعض کو دراصل سلطنت جمہوری کے مٹ جانے کا افسوس تھا۔ ۱۵ مارچ ۴۴ ق م میں ان اشخاص نے سیزر کا کام تمام کر دیا جس سے سلطنت روما پھر بدامنی اور ابتری کا شکار ہو گئی اور تیرہ سال کی خانہ جنگی کے بعد سیزر ہی کے تجاویز پر عمل کرنے سے امن و امان قائم ہو سکا۔

باب پانزدہم

آگسٹس

روایت ہے کہ سیزر کی موت کے بعد سسرو نے کہا تھا کہ "جابر کا تو خاتمہ ہوگیا مگر نفس جبر ابھی زندہ ہے"۔ سسرو کو امید قوی تھی کہ سیزر کی ہلاکت کے بعد جمہوریت کی قوت پھر زور پکڑے گی مگر اسے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ جمہوریت کی بنیاد تک ہل گئی تھی، اس طرز حکومت کا زمانہ اب باقی نہ تھا اور سلطنت روما کے مزید قیام کے لئے بادشاہی کا احیا کسی نہ کسی صورت میں لازمی تھا۔

سیزر کی موت کے بعد روما میں سخت ابتری پھیل گئی۔ بروٹس اور کیسیس جن کے ایما سے سیزر کا قتل عمل میں آیا تھا اپنے آپ کو "آزاد کنندگان روما" کہتے تھے اور انھیں امید تھی کہ اب وہی برسر اقتدار ہوں گے۔ مگر سیزر کے دوست انٹنی نے جو اس سال کا کونسل مقرر ہوا تھا اپنا عمل دخل کر لیا اور قاتلان سیزر منہ دیکھتے رہ گئے۔ ان لوگوں کے علاوہ ایک دعویدار سلطنت اور بھی تھا یعنی جولیس سیزر کا وارث اور بھانجا آکٹا ویانس سیزر جس نے اپنی خداداد فہم و فراست سے اپنے حریفوں کے منصوبے خاک میں ملا دیئے اور آخرکار شہنشاہ روما ہوگیا شہنشاہ ہونے کے بعد اس نے آگسٹس کا لقب اختیار کیا مگر سہولت کے لئے ہم ابھی سے اسے آگسٹس کہتے ہیں۔ اپنے نانا کے انتقال کے وقت آگسٹس ایپائرس میں تھا۔ جولیس سیزر نے اپنے وصیت نامہ میں اس کو اپنا وارث قرار دیا تھا اور گو اس وقت اس کا سن صرف انیس سال کا تھا مگر ہمت کر کے وہ روما پہنچا اور سیزر کے ترکہ کا دعویدار ہوا

جس کے حصول میں بے شمار خطرے تھے۔ جب وہ روما میں وارد ہوا اس وقت اس کی
کامیابی کی بہت کم امید تھی کیونکہ ہر فرد اور ہر گروہ اس تاک میں تھا کہ اس حسین
نوجوان کو اپنے حصول مطلب کا ذریعہ قرار دے مگر یہ لڑکا سازش اور تدبیر میں ان کا
استاد نکلا اور نشیب و فراز خوب سمجھ کر بمعیت انٹنی و لیپڈس "اتحاد ثلاثہ ثانی" کی
بنیاد ڈالی۔ ان تینوں میں باہمی اختلاف تھے مگر ایک امر میں اتفاق کلی تھا یعنی
سیزر کے نام کو بدنامی سے بچایا جائے، اس کی پالیسی کو قائم رکھا جائے اور اس کے
قاتلوں کو واقعی سزا دی جائے۔ مقاصد مذکورہ میں تینوں شرکا کو بہت جلد کامیابی
ہوئی کیونکہ آگسٹس سیزر کا جانشین تھا اور اس وجہ سے فوج والے اس کو محبت کی
نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انٹنی اس وقت سلطنت روما کا سب سے قابل سپہ سالار تھا،
اس لئے اس کے زیر علم اس قدر سپاہی جمع ہو گئے جس کی بروٹس اور کیسیس کو کبھی
خواب و خیال میں امید نہیں ہو سکتی تھی۔ ۴۲ ق م میں ان دونوں قاتلان سیزر کو
بمقام فلپی سخت شکست ہوئی اور دونوں وہیں مارے گئے۔ اس طرح دو سال کے
بعد دستور جمہوری پھر زیر و زبر ہو گیا اور عالم رومی میں پھر شخصی سلطنت قائم ہو گئی
گو بجائے ایک کے تین اشخاص حکمراں تھے۔

مگر اتحاد ثلاثہ بدت تک قائم نہیں رہا۔ لیپڈس میں نہ کوئی مادہ تھا
نہ قابلیت اس لئے اس کو اتحاد سے علیحدہ کر دیا گیا اور دونوں باقی ماندہ ارکین
میں یہ تصفیہ ہوا کہ انٹنی مشرق میں سکونت پذیر ہو اور سلطنت روما کا مشرقی حصہ
اس کے زیر فرمان رہے اور آگسٹس نے روما اور مغرب لے لیا۔ اس انتظام کے
لحاظ سے انٹنی کا پلہ بھاری تھا کیونکہ اس کے حصے میں سب مشرقی زرخیز صوبے
آ گئے تھے مگر آگسٹس کو بھی یہ نفع تھا کہ اس کی حکومت شہر روما پر تھی اور اس لحاظ سے
گویا وہ سلطنت روما کی ہستی اور روایات کا حامی و مدد خیال کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ
ازیں اس کو خوش قسمتی سے آدمی بھی اچھے مل گئے۔ آگسٹس کو بذات خود فن سپہگری
میں دخل نہ تھا مگر اس کا سپہ سالار اگریپا اپنی بہادری اور شجاعت کی میدانوں
میں ثابت کر چکا تھا۔ میناس بھی اس کے ارکین دولت میں سے تھا جس میں
خاص انتظامی مادہ تھا اور رومیوں کی دل جوئی میں کمال رکھتا تھا۔ اس طرح

گویا آگسٹس میں وہ تمام خوبیاں جمع ہوگئیں جو رومیوں میں پسندیدہ خیال کی جاتی تھیں برخلاف اس کے انیٹنی نے بالکل متغائر طریقہ اختیار کیا کیونکہ اس نے سکندریہ میں اقامت اختیار کی اور ملکہ مصر کلیوپیٹرا کا بندۂ بے درم ہوگیا جس کی وجہ سے روما میں یہ افواہیں پھیلنے لگیں کہ اس نے مشرقی طرز زندگی اختیار کرلیا ہے، روما کو مصر کے زیر نگیں کرنا چاہتا ہے اور مشرقی اقوام کے مقابلہ میں اپنا جوہر سپہگری اب نہیں دکھا سکتا۔

دونوں حریفوں میں صلح کرانے کی بھی کوششیں ہوئیں مگر جب خلقی رقابت باہمی بغض و حسد کے علاوہ اصول متغائر ہوں تو صلح و آشتی کا قائم رہنا دشوار ہے آخرکار ۳۱ ق م میں جنگ چھڑ گئی اور یونان کے مشرقی ساحل پر بمقام ایکٹیم کے قریب ایک فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس میں انیٹنی کو باوجود اس کی شہرت اور وسعت تجربہ کے آگسٹس اور اس کے سپہ سالاروں نے شکست فاش دی انیٹنی اپنی معشوقہ ملکہ کو لیکر سکندریہ پہنچا مگر آگسٹس نے انھیں وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور اس شہر کا محاصرہ کیا انیٹنی اپنے زخموں سے جانبر نہ ہوسکا اور کلیوپیٹرا نے زہر کھاکر اپنا کام تمام کرلیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام سلطنت روما پھر ایک فرد یعنے آگسٹس کے زیر فرماں ہوگئی۔

آگسٹس کو اس مرحلے کے طے کرنے کے بعد اپنی وسیع سلطنت کے انتظامات کو مستحکم بنیاد پر قائم کرنے کی ضرورت ہوئی جس کے تین طریقے تھے۔ یا تو جولیس سیزر کی تجاویز کو عملی جامہ پہناتا یا سلطنت جمہوری کو بحال کرتا یا کوئی دوسرا طرز حکومت اختیار کرتا۔ آگسٹس مدت تک غور و خوض میں رہا، کئی تغیر اس نے کیے اور پھر ان کو پلٹ دیا اور آخرکار بار بار تجربوں کے بعد اس نے وہ نظام سلطنت قائم کیا جو روما میں کئی صدیوں تک جاری تھا۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ شہنشاہی روما کا بانی دراصل جولیس سیزر تھا مگر آگسٹس کے انتظامات ایک حد تک اس کے تجاویز سے متغائر تھے جس کا سبب یہ تھا کہ جولیس کو انقلابی تغیرات کرنے میں دریغ نہ ہوتا تھا، سیاسیات میں اس کو جمہور سے زیادہ ہمدردی تھی، اس لئے اس نے روما کے قدیم روایات کی کچھ پروا نہ کی اور سینیٹ کے اقتدارات کو کالعدم کرکے

ایک جدید طرز حکومت پر اپنی سلطنت قائم کی۔ مگر آگسٹس قدامت پسند تھا اور
انقلابات سے خائف۔ سیزر کا حسرت ناک انجام ہر وقت اس کے پیش نظر رہتا تھا
اور علاوہ خوف و خطر کے اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ جدید حکومت میں روما کے
قدیم روایات کا اثر غالب ہو اور رومیوں کی اور شاید خود اس کی نظروں سے وہ
انقلاب عظیم مخفی رہے جو روما کے طرز حکومت میں ہو چلا تھا۔ ان وجوہ سے نہ
آگسٹس نے دستور میں کسی تغیر کا اعلان کیا نہ کوئی خطاب اختیار کیا نہ بادشاہ
یا ڈکٹیٹر یا شہنشاہ کہلوایا بلکہ بقول خود اس نے وہ اقتدارات اختیار کر لئے تھے
جو جمہور روما نے اسے بطیب خاطر دیئے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اپنے
دوران حکومت میں رومی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنے عہد
سلطنت کے آخر میں اس نے اپنے کارناموں کو مختصر جملوں میں السنۂ یونانی
و لاطینی میں لکھوا کر اس کے کتبے مختلف مقامات پر لگا دیے تھے۔ ان میں سے ایک کتبہ
جو صوبۂ گلاشیا کے ایک مندر میں نصب کیا ہوا تھا اب تک محفوظ ہے۔ آگسٹس نے ان
کتبوں میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ حکومت اس کے ہاتھوں میں تمام رعایا کی مرضی سے
آئی مگر اس نے ان اقتدارات کا استعمال نہیں کیا بلکہ جمہوریت کو بحال کیا۔ اس جملہ
میں غالباً اس نے ریاکاری سے کام نہیں لیا ہے کیونکہ اس نے دستور روما کو بحال
کرنے کی بہت کوشش کی اور تمام اقتدارات کا اس کی ذات میں جمع ہو جانے کا
سبب اس کا طلب عز و جاہ نہ تھا بلکہ رومیوں کی ناگفتہ بہ حالت جس کی وجہ سے
جمہوریت عود نہ کر سکتی تھی۔

آگسٹس کا طرز حکومت بالاختصار یہ تھا کہ اس نے اپنی ذات کو مختلف
عہدہ داروں کے اقتدار کا مرکز بنا لیا تھا اور یہی اجماع اقتدارات اس کی حکومت
کی ممتاز خصوصیت ہے۔ اس کی قوت اس قدر زبردست تھی کہ رعایا اور اہل سینٹ
اس کی انگلیوں کے اشاروں پر چلتے۔ اسی لئے تمام اہم عہدوں پر اس کا قبضہ ہو گیا
اور اس نے اپنے آپ کو کانسل اعظم اور ٹربیون تا حین حیات مقرر کرا لیا۔
کانسل اعظم ہونے کی وجہ سے تمام رومی افواج اس کے ماتحت ہو گئیں اور
ٹربیون ہونے کی وجہ سے اسے نہ صرف مذہبی عظمت حاصل ہوئی بلکہ وضع قوانین

اور عدالتوں پر اس کا پورا اقتدار ہو گیا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس نے کوئی خطاب اختیار نہیں کیا مگر رسماً اس کو اس کے جانشینوں کو پرنسپس یعنی امیر کہا جاتا تھا جس سے صرف یہ منشا تھا کہ وہ سلطنت کا سب سے سربر آوردہ فرد تھا اور اس کا ترجمہ بجائے شہنشاہ کے امیر جمہوریہ کیا جائے تو بہتر ہو گا۔

نظام سلطنت پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آگسٹس سینیٹ کی حد درجہ عزت و توقیر کرتا تھا اور اس جماعت کو اس نے بہت سے اختیارات بھی دیدیئے تھے جن کے دینے کا جولیس سیزر کو خیال تک نہ تھا۔ سیزر نے سینیٹ کی تعداد بڑھا کر ۹۰۰ کر دی تھی اور اس میں صوبجات کے ممتاز افراد کو بھی شریک کیا تھا مگر آگسٹس نے تعداد سابقہ بحال کر دی اور اس کی رکنیت روما کے امرا کے لئے مخصوص کر دی۔ سلطنت کے نصف صوبے جن میں افواج کی ضرورت نہ تھی سینیٹ کے زیر انتظام کر دیئے گئے اور اس کے علاوہ یہی مجلس بہت جلد سلطنت روما کی عدالت العالیہ بھی ہو گئی۔ آگسٹس ہر موقع پر اس مجلس کی عزت و احترام کرتا جس کی وجہ سے اس کے اراکین اس سے بہت خوش تھے۔

جدید نظام سلطنت میں مجلس سینیٹ کے اقتدارات اس قدر وسیع تھے کہ اس نظام سلطنت کو "حکومت دو عملی" کہتے ہیں۔ اس کی رو سے نصف سلطنت آگسٹس کے زیر فرمان تھی اور بقیہ نصف سینیٹ کے۔ مگر یہ محض ظاہر داری تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ قطعی اختیارات صرف آگسٹس کو حاصل تھے اور مجلس سینیٹ جو کچھ کرتی تھی اس کی منظوری سے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تغیرات مذکورہ بالا سے ابتدائے سینیٹ کے احترام و اقتدار میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ روما کی دوسری قومی مجالس کا حشر اچھا نہیں ہوا۔ جولیس کے زمانے میں ہی ان کی حالت سقیم ہو چکی تھی اور آگسٹس نے ان کو بالکل دبا دیا۔ وضع قوانین کا ان کو اختیار نہ رہا، کمیٹیا کے جلسے صرف مرافعوں کی سماعت کے لئے ہونے لگے اور ان مجالس کو بعض عہدہ داروں کے انتخاب کے علاوہ کوئی اختیار باقی نہ رہا۔ مگر یہ اختیار بھی کچھ کارگر نہ تھا کیونکہ جن عہدہ داروں کا یہ مجلس انتخاب کرتی مثلاً کانسل، پریٹر، ٹربیون وغیرہ سب شہنشاہ کے مقرر کردہ عہدہ داروں کے ماتحت ہوتے اور آگسٹس کی موت کے

بعد تو عہدہ داروں کے انتخاب کا طریقہ بالکل مسدود ہوگیا۔ صوبوں کے انتظام کی بھی اصلاح کی گئی کیونکہ ان کے باشندوں کی حالت بدانتظامی اور عہدہ داروں کے استحصال بالجبر سے قابل رحم ہوگئی تھی۔ مگر سلطنت جمہوری کے زوال کے بعد ان کی حالت سنبھلنے لگی کیونکہ شہنشاہ کو صوبہ جات کی بدنظمی سے نقصان تھا اور ان کی فلاح سے نفع۔ اس لئے صوبہ داروں کے افعال کی نگرانی ہونے لگی انکی تنخواہیں مقرر کردی گئیں اور رشوت ستانی کی سخت ممانعت ہوگئی۔ ان اصلاحات کے بعد ظلم و تعدی کی شکایات کہیں نہ کہیں باقی رہیں مگر شاذونادر جس کی وجہ سے یہ کہنا بجا ہوگا شہنشاہیت کے قیام سے رومیوں کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا مگر باشندگان صوبجات مفتوحہ کے لئے موجب فلاح و برکت ہوا۔

آگسٹس ہر دلعزیزی کی ضرورت خوب محسوس کرتا تھا اور اس لئے اس کے بقا میں ہر طرح کوشاں رہتا۔ چنانچہ شہر روما میں اس نے بادشاہت کے لوازمات کبھی اختیار نہ کئے بلکہ معمولی امیروں کی طرح رہتا تاکہ جمہور کا بھی خیال رہے کہ تمام اقتدارات شاہی جبراً اس کے سر منڈھ دیئے گئے تھے۔ اس کے ہمعصر مصنفین اور شعرا نے اس کے اقتدارات کے قیام اور رعایا کی دلجوئی میں اس کی بہت کچھ مدد کی۔ اس کی داد و دہش کی کوئی انتہا نہ تھی مگر اہل علم کو ہمیشہ اپنے وزیر میناس کے ذریعہ سے لیتا دیتا تھا۔ آگسٹس کے عہد کی تمام تصنیفات سے وہ خوش اعتقادی اور حسن ظن ظاہر ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کو اس کی ذات سے تھا اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو یقین کامل تھا کہ اس کی ذات سے روما کو بے شمار فائدے ہوئے۔ اس زمانے کے دو مشہور شعرا ہوریس اور ورجل اسکی مدح سرائی میں رطب اللسان ہیں۔ ہوریس نے اپنی نظموں اور غزلیات میں آگسٹس اور اس کے وزرا کی تعریف کے پل باندھ دیئے ہیں اور شہنشاہ اور اس کے خاندان کے کارناموں کو آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا قول ہے کہ "آگسٹس ایک دیوتا ہے جو ہم لوگوں میں آکر جلوہ افروز ہوا ہے"۔ ورجل کی خدمات اس سے بھی زیادہ قابل قدر ہیں کیونکہ اس نے آگسٹس کے ہر فعل اور ہر کارنامے کی تعریف کی ہے اور جمہوریت روما اور سادہ دیہاتی زندگی کی خوبیوں کی

تعریف کے ساتھ اس نے اپنی زبردست نظم اے نیڈ میں ثابت کیا ہے کہ آگسٹس کے خاندان کو بانی روما سے تعلق ہے اور یہ کہ آگسٹس شہر روما اور اس کی عظمت کا دوسرا بانی ہے۔ مگر آگسٹس نے علاوہ مصنفین کی امداد کے مذہب سے بھی تقویت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی گو مذہب کا اس زمانہ میں کوئی اثر باقی نہ رہا تھا، لامذہبی کا زور تھا، مندروں کے در و دیوار مسمار ہو رہے تھے اور دیوتاؤں کی پرستش کے بجائے جدید مشرقی عقائد کی اشاعت ہو رہی تھی۔ مگر آگسٹس نے مندروں کی مرمت کرائی، دیوتاؤں کی پرستش کو دوبارہ رواج دیا تاکہ اس کا اقتدار مذہبی بنیاد پر قائم ہو جائے اور اہل روما اس سے عقیدت مندی رکھیں۔ مگر یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ احیا مذہب سے اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ اپنی طاقت کو تقویت دے بلکہ اس کا حقیقی منشا یہ تھا کہ روما کی عظیم الشان روایات کو تازہ کرے، مذہبی رسوم کو دوبارہ رواج دے، زراعت کو وسعت دے اور سادہ زندگی کی طرف اہل ملک کو مائل کرے۔

جنگ اکٹیم کے بعد سلطنت روما میں سکون ہو گیا جو دو سال تک کم و بیش قائم رہا۔ مگر سلطنت روما کے بقا کے لئے اس کے سرحدات کی حفاظت اور استقامت کی ضرورت تھی اور اس غرض سے سرحدات کو وسعت دی گئی گو آگسٹس کو فن سپہگری سے مناسبت نہ رکھنے کی وجہ سے جنگ و جدال سے طبعی منافرت تھی۔ شمالی سرحد کو بہت وسعت دی گئی اور سلطنت روما کی حدود شمال میں دریائے رائن اور ڈینیوب تک پہنچ گئیں بلکہ ایک زمانہ میں تو دریائے ایلب تک پہنچ گئی تھیں۔ شہنشاہ آگسٹس کی بیوی کے پہلے شوہر کے بیٹوں (ڈروزس اور ٹائی بے ریس) نے مسلسل رزم و پیکار کے بعد جرمن اقوام کو مغلوب کر لیا تھا مگر یہ کامیابی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ جرمنوں کی غیور اور آزاد طبائع رومیوں کی غلامی اور ان کے حکام کے جبر و تعدی برداشت نہ کر سکیں اور ۹ء ق م میں ان کے سرگروہ آرمی نیس نے رومی سپہ سالار وارد کی افواج کو شمال مغربی جرمنی کی دلدلوں میں تباہ کر دیا۔ آگسٹس کے عہد حکومت میں یہی ایک ہزیمت اس کی افواج کو ہوئی تھی اور اس سے کچھ وہ ایسا دل برداشتہ ہو گیا کہ انتقام کی ہوس بھی باقی نہ رہی گویا آگسٹس کا

طالع اقبال اس کی حکومت کے ختم ہونے سے قبل ڈوب گیا۔ اس کی خانگی زندگی بھی پرحسرت تھی جس کے اثر سے سلطنت بھی بچ نہ سکی۔ اس نے تین شادیاں کیں مگر تا دم مرگ اس کی جانشینی کے مسئلہ کا تصفیہ نہ ہوا۔ شہنشاہ کا جانشین نہ ہونا شہنشاہیت کے مزید قیام کا منافی تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ جمہوریت برائے نام باقی تھی اس لئے جانشینی کے لئے قواعد وضع کرنا بھی دشوار تھا مگر آگسٹس کے اقتدارات اس قدر وسیع تھے کہ وہ اپنے اقتدارات وخطابات جس شخص پر چاہتا منتقل کر دیتا۔ اس کے ایک لڑکی تھی جس کی کئی اولادیں ہوئی تھیں مگر ان کی موت یا ادباشانہ زندگی کی وجہ سے ان میں سے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ کر سکا۔ آخرکار اس نے طوعاً وکرہاً اپنے ربیب ٹائی بے ریس کو اپنا جانشین بنایا جس کی قابلیت اور امانت میں تو شک نہیں تھا مگر ہر دلعزیزی پیدا کرنے کا مادہ نہ تھا۔ اور اس لئے وہ آگسٹس کی حکومت کی ممتاز خصوصیات برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔ آگسٹس نے ۱۴ء میں انتقال کیا اور یہی شخص اس کا جانشین ہوا۔

مگر قبل اس کے کہ ہم دوسرے شہنشاہ کا تذکرہ کریں ہم اپنے ناظرین کو بتانا چاہتے ہیں کہ تاریخ عالم میں شہنشاہی روما کے قیام کی کیا خاص اہمیت ہے کیونکہ ایک تو اس کے قیام سے تاریخ عالم کے دور قدیم کا اختتام ہوتا ہے اور دوسرے زمانہ قدیم میں جو طرزہائے حکومت رائج تھے وہ گویا اس میں ضم ہو گئے اور زمانہ حال کی حکومتوں کے دستور اس کے اثر سے خالی نہیں۔ شہنشاہی روما کے قیام سے بنی نوع انسان کو جو پہلا فائدہ پہنچا وہ قیام امن وامان تھا کیونکہ جنگ ایکٹیم کے بعد ممالک سلطنت روما میں برابر امن قائم رہا اور اس رقبہ عظیم میں صرف چار لاکھ فوج امن وامان کے قیام کے لئے کافی تھی جہاں اب لاکھوں سپاہی ہیں۔ امن وامان کی وجہ سے تمدن کا اثر تمام سلطنت میں پھیل گیا۔ مشرق میں یونانی اور مغرب میں لاطینی زبان کی کافی اشاعت ہو چکی تھی۔ مگر شہنشاہی کے قیام کے بعد مغربی صوبوں میں لاطینی قومی زبان ہو گئی اور اس طرح رفتہ رفتہ فرانسیسی ہسپانی اور اطالوی زبانوں کا آغاز ہوا۔ مغربی یورپ کی اقوام میں نہ صرف روما کی زبان رائج ہو گئی بلکہ انھوں نے اس کا تمدن بھی اختیار کر لیا اور قانون رومی کے اصول کے پابند ہو گئے کہ تمدن

روما کا بہترین ثمرہ قانون رومی تھا جس کا آئندہ نسلوں پر رومیوں کا سب سے بڑا احسان خیال کرنا چاہیے جیسے کہ یونان کے احسان عظیم فلسفہ اور فنون لطیفہ میں۔ قانون رومی کی بنیاد تو جمہوریت کے زمانہ میں پڑ چکی تھی مگر عہد شہنشاہی میں اس کی تدوین و ترتیب عمل میں آئی۔ اس قانون کو آئندہ نسلیں آیۂ الٰہی خیال کرنے لگیں اور یہی یورپی ممالک کی قوانین کی بنیاد ہیں گو انگلستان کے قوانین پر اس کا نسبتاً کم اثر پڑا ہے۔ یہ بھی کہنا صحیح نہیں ہے کہ شہنشاہی کے قیام سے آزادی کا خون ہوا۔ شہر روما میں تو ضرور آزادی تقریر مسدود ہو گئی اور اس زمانہ کے مورخین نہایت رقت کے لہجہ میں سینٹ کے اقتدار و احترام کے زوال اور شہر روما کے باشندگان کی بےبسی کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر شہنشاہیت کے باشندوں کی تعداد غالب کو نہ صرف دنیاوی فلاح ہوئی بلکہ ان کی آزادی کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ آگسٹس اور اس کے جانشینوں کی پالیسی تھی کہ شہروں کو حکومت خود اختیاری دیجائے جس کی وجہ سے تمام سلطنت روما میں ہزاروں آزاد شہر وجود میں آ گئے جن کی آزاد بلدیت عرصہ تک قائم رہی۔ ایک شہر یعنی عروس البلاد روما کی آزادی کا تو خون ہوا مگر اس کے بدلے ہزاروں آزاد شہر پیدا ہو گئے۔ قیام شہنشاہیت کا اثر جو زمانہ ما بعد کے تمدن پر پڑا ہے وہ دین مسیحی کی اشاعت سے ہوا ہے۔ آگسٹس نے بعد کوشش کی تھی کہ پھر بت پرستی کا زور بڑھے، ان مساعی میں اسے کچھ کامیابی ہوئی مگر اس کے قائم کردہ نظام سلطنت کو مذاہب قدیم کے بجائے مذہب جدید کو زیادہ نفع ہوا۔ شہنشاہیت روما ایک عظیم الشان سلطنت تھی جس میں مختلف اقوام آباد تھیں جن کے نظام سیاسی، السنہ اور مذاہب میں حد درجہ مغائرت تھی مگر اس ریاست "بین الاقوامی" کے لئے ایک مذہب "بین الاقوامی" کی ضرورت تھی۔ مذہب مسیحی کے زور پکڑنے کے قبل یہ آثار قوی ہوتے جاتے تھے کیونکہ اتنی عظیم سلطنت کے لئے ایک عام مذہب کی ضرورت تھی اور اس کی خصوصیات ایسے مذہب کی اشاعت کے موافق تھیں۔ حکومت روی کا رقبہ نہایت وسیع تھا گویا تمام اقطاع عالم ایک ہی فرمانروا کے زیر نگیں تھے۔ اس لئے داعیان مذہب بلا کسی دقت کے شام سے برطانیہ تک جا سکتے تھے۔ عمدہ سڑکیں ہر جگہ موجود تھیں۔

سکہ تمام ممالک میں ایک ہی رائج تھا اور چونکہ سلطنت ایک ہی تھی اس لئے ایک ملک کی سرحد سے دوسرے ملک میں جانے میں جو قیود ہوتی ہیں وہ بھی انکی آمد و رفت میں مانع نہ تھیں۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ لوگوں کو وہ ہر جگہ یونانی یا لاطینی میں اپنے مذہب کا پیام سنا سکتے تھے۔ وہ زمانہ جلد آنے والا تھا جب کہ سلطنت روما اور کلیسائے مسیحی میں سخت دشمنی پیدا ہو مگر شہنشاہیت کے وجود سے دین مسیحی کی اشاعت میں کامیابی ہوئی اور سخت جنگ و جدال کے بعد مسیحیت سے شہنشاہیت کو طاقت اور تقویت حاصل ہوئی۔

باب شانزدہم

روما کی شہنشاہی کا ابتدائی زمانہ

شہنشاہیت کے قیام سے یورپ کے عام متمدن ممالک کی قسمتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئیں اور ان ممالک کی تاریخ پر آیندہ صدیوں میں بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جاسکتی ہے بجائے اس کے کہ ہر ملک کی تاریخ پر فرداً فرداً تبصرہ کیا جائے کیونکہ سب ایک ہی شہنشاہیت بلکہ ایک ہی شہر کے ماتحت ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے مورخ اپنا فرض اختصار اور وضاحت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے۔ اس عہد میں صوبہ جات کی تاریخ خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ ان کی مالی حالت روبہ ترقی تھی اور تمدن کو فروغ ہو رہا تھا۔ ان کے باشندے تمدن و تہذیب کے لحاظ سے عرصۂ قلیل میں اطالیہ بلکہ خود روما کے ہم پلہ ہوگئے۔ زمانۂ حال کے مورخین نے ان کی انفرادی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی ہے مگر ہر ایک صوبے کی مسلسل تاریخ لکھنا دشوار ہے کیونکہ زمانۂ قدیم کے مورخین نے صوبجات کی تاریخ کا ذکر انھیں مواقع پر کیا ہے جب غالیہ، ہسپانیہ، مصر یا شام میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جس کا اثر شہنشاہی کی تاریخ پر پڑتا ہو۔ مگر کتبوں کی مدد اور آثار قدیمہ کے مطالعہ سے صوبجات کی مالی حالت کا پتہ چلتا ہے اور یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شہنشاہی کا قیام ان کی ترقی کا باعث ہوا۔

مگر خاص شہر روما میں شہنشاہی کی ہر دلعزیزی قائم نہ رہی کیونکہ اگسٹس کے جانشینوں میں تالیف قلوب کا مادہ نہ تھا اور نہ انھوں نے اپنے زمانے کے اہل علم کو خوش رکھنے کی کوشش کی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ہوریس اور ورجل

اگسٹس کی مدح سرائی میں رطب اللسان تھے مگر آئندہ پچاس سال کے مورخین شہنشاہوں کا تذکرہ حقارت اور نفرت سے کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کے دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ اگسٹس کے جانشینوں میں تدبر، فراست اور اعتدال کا مادہ کم تھا اور دوسرے جتنی جتنی کہ اگسٹس کے عہد کے قبل کی ابتری اور طوائف الملوکی کی خرابیاں فراموش ہونے لگیں جمہور اور خصوصاً امرائے روما کو خیال ہونے لگا کہ دنیا کی حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس عہد کے رومی تصانیف سے اس سیاسی بے چینی کا پتا چلتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ شہر روما کی قدیم اہمیت اب باقی نہ تھی اور اس کے باشندوں کی پریشاں حالی سے یہ نتیجہ نہ اخذ کرنا چاہیئے کہ تمام سلطنت روما میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

آگسٹس کے پہلے چار جانشین اس کے اعزہ میں سے تھے۔ ٹائی بے ریس پہلا شخص ہے جو اس کے بعد سریرآرائے سلطنت ہوا۔ اس کے شخصی خصائل نہایت متضاد تھے اس لئے اس کے حالات کا صحیح اندازہ دشوار ہے۔ سرخیل مورخان روما ٹےسی ٹس نے اسے اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنایا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہ شہنشاہ نہایت ظالم و جابر تھا اور اس کے عہد میں سلطنت روما میں ایک قیامت صغریٰ قائم ہوگئی تھی لیکن اس کی رائے کے ماننے میں ہمیں تامل ہے کیونکہ جو تفصیلی حالات اس نے بیان کئے ہیں اس سے خود اس کے دعاوی کا ابطال ہوتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ شہنشاہ سے اس کو ذاتی عناد تھا۔ ٹائی بے ریس کے طرز حکومت سے ظاہر ہے کہ وہ آگسٹس کا لائق جانشین تھا اور اسکی طرح صلح جو، ہوشیار، مستقل مزاج اور کارآزمودہ تھا۔ آگسٹس نے اپنے وصیت نامہ میں اسے ہدایت کی تھی کہ سرحدوں کو بڑھانے کی کوشش نہ کرے مگر ٹائی بے ریس کو ابتدا ہی سے خیال تھا کہ جرمنی کی تسخیر عمل میں لائے۔ وارو کی شکست کے باوجود جس کا ذکر آچکا ہے رومی فوجیں پھر ایلب کی طرف بڑھیں اور ٹائی بے ریس کے بھانجے نے جس کو اس فتح کی وجہ سے جرمانکس کا خطاب ملا رومی افواج کی شجاعت اور دلیری کا ثبوت دیا مگر اس کے بعد ٹائی بے ریس نے اس مہم کا خیال چھوڑ دیا اور دریائے رائن پھر سلطنت روما اور جرمنی کے درمیان حد فاصل ہوگئی۔ شہر روما میں اس رجعت کو

قومی تحقیر سے تعبیر کیا گیا مگر ٹائی بے ریس سمجھ گیا تھا کہ اس مہم میں بے شمار زر و مال اور سپاہیوں کی جانیں ضائع ہونگی اور کامیابی کی امید بھی موہوم تھی۔ جب رومیوں کے حملوں کا خوف جاتا رہا تو جرمنوں میں خود پھوٹ پڑگئی اور ان کا سرگروہ آرمی نیس اس خانہ جنگی میں مارا گیا جس سے آئندہ دو سو سال تک روما کی شمالی سرحد بالکل محفوظ رہی۔ دوسرے ممالک میں بھی امن و امان قائم تھا۔ اپنی سلطنت کے آخری زمانہ میں ٹائی بے ریس نے بجائے روما کے شہر کاپری اقریب نیپلز میں قیام اختیار کیا اور روایت کی جاتی ہے کہ وہاں عیش و عشرت کا بازار خوب گرم تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی عقل میں کچھ فتور آگیا تھا۔ ۳۷ء میں اس نے انتقال کیا اور کیا لی گولا اس کا جانشین ہوا۔ اس شخص کے خصائل عجیب و غریب تھے مگر یا تو بالکل فاتر العقل تھا یا شہنشاہی اقتدارات کے ملجانے سے اس کا دماغ پھر گیا تھا۔ اس کے اسلاف نے کبھی اپنے طرز زندگی میں اپنی مطلق العنانی کا اظہار نہیں کیا تھا مگر اس بادشاہ کو اس کا بالکل لحاظ نہ تھا۔ اس نے جو آداب دربار میں جاری کئے اس کی رو سے دیوتاؤں سے زیادہ اس کا احترام ہوتا اور ہر شخص پر لازم تھا کہ اس کی حضوری میں نہایت عجز و انکسار سے پیش آئے۔ چند سال سلطنت کرنے کے بعد وہ قتل کر دیا گیا اور اس کا چچا کلاڈیس اس کا جانشین ہوا۔ یہ شخص بھی متضاد خصائل کا آدمی تھا۔ علمی لیاقت بہت اچھی تھی اور معاملات سیاسی پر جو تقریریں اس نے کی ہیں ان سے اس کی فہم و فراست کا پتا لگتا ہے مگر اس کے مزاج میں استقلال نام کو نہ تھا اور اس کی مجلس ناگفتہ بہ عیاشیوں کا مرکز تھی۔ اس کے عہد سلطنت میں مقبوضات میں ایک اہم اضافہ ہوا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جولیس سیزر نے برطانیہ پر یورش کی تھی مگر اس نے قبضہ نہ کیا۔ مگر اب ۴۳ء میں رومی فوجیں دوبارہ آبنائے ڈوور عبور کر کے برطانیہ پہنچیں اور چونکہ وہاں کے باشندے ان کا مقابلہ نہ کرسکے انھوں نے کال چیسٹر تک قبضہ کر لیا۔ کلاڈیس بھی جنگ کے آخری زمانہ میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس زمانہ سے برطانیہ کا شمار رومی صوبجات میں ہوتا ہے اور رومیوں نے رفتہ رفتہ جزیرہ انگلستان کے شمالی اور مغربی حصوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ کلاڈیس بھی ۵۴ء میں قتل ہوا اور بجائے اس کے نیرو شہنشاہ ہوا جو سابقہ بادشاہوں سے بدرجہ

بہتر تھا۔ ٹائی بے ریس میں اگر کچھ خرابیاں تھیں تو اس کے محاسن کا پلہ بھاری تھا۔ کلاڈیس کے افعال و حرکات کی پردہ پوشی ممکن ہے مگر نیرو کی خباثت میں کوئی شک نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے تمام سلطنت روما مورد مصائب و آلام ہوگئی۔ اپنے عہد سلطنت کے ابتدائی پانچ سال میں وہ مشہور فلسفی سینکا اور ایک لائق سپاہی بوروس کے مشورہ سے امور سلطنت طے کرتا رہا جس سے لوگوں کو امید تھی کہ سابقہ بادشاہوں سے اس کا عہد حکومت بہتر ہوگا۔ مگر ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے مشیروں کو الگ کر دیا اور ذمہ داری سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے بجائے عیش و عشرت اور فضول خرچی میں پڑ گیا یہاں تک کہ عام جلسوں میں ناچنے گانے لگا جس سے رومیوں کو اس سے سخت نفرت ہوگئی۔ اس کی مجلس میں روز نئی رنگ رلیاں ہوتیں جس کا نتیجہ ہوا کہ آئے دن اس کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ دربار میں افواہ پھیل گئی کہ شمالی افواج نے علم بغاوت بلند کیا ہے جس میں خود محلسرا کی محافظ فوج شامل ہے۔ بزدل نیرو ان افواہ سے پریشان ہوکر روما سے فرار ہوگیا اور آخرکار سنہ ۶۸ء میں خودکشی کر لی۔

حالات مذکورۂ بالا سے ظاہر ہے کہ ان بادشاہوں کے افعال و حرکات اور ان کی تعیش کی داستان بیان کرنے سے کوئی نفع نہیں بلکہ اس سے بہتر ہوگا کہ سلطنت کے عام حالات پر نظر ڈالی جائے اور رعایا کی پریشاں حالی اور ابتری کے اسباب دریافت کئے جائیں۔ پہلی چیز جو ہمارے پیش نظر ہوگی وہ خود شہنشاہوں کی شخصی حیثیت تھی جس کا سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ کیونکہ جمہوریت ابھی تک بظاہر قائم تھی شہنشاہوں کے اقتدارات اور فرائض ضبط تحریر میں نہیں لائے گئے تھے، اور اس زمانہ کے روایات کسی فرد واحد کی مطلق العنانی کے بالکل خلاف تھے مگر پھر بھی تمام سلطنت روما ان کے تابع فرمان تھی اور اس سلطنت کے رقبہ میں دنیا کے تمام ممالک شامل تھے جن کا رومیوں کو علم تھا۔ زمانۂ مابعد میں یورپ میں کوئی بادشاہ یا ایسا حاکم نہیں گزرا ہے جس کی ذات شہنشاہان روما سے اعلیٰ وارفع ہو کیونکہ دوسرے ممالک میں ان کی موجودگی میں دوسرے طاقتور بادشاہ اور شہنشاہ تھے مگر شہنشاہان روما کا دنیا میں نہ کوئی حریف تھا

نہ ہمسر تھی ہر جگہ ان سے نہ صرف خوشامد اور چاپلوسی کا برتاؤ ہوتا بلکہ قریب قریب دیوتاؤں کی طرح ان کی پرستش ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر نشۂ اقتدار سے مخمور ہو کر دنیا و ما فیہا کو فراموش کر بیٹھے۔ جانشینی کے متعلق بھی کوئی قواعد نہ بنائے گئے تھے اور نہ صورت حالات کے لحاظ سے بنانا ممکن تھا۔ جانشینی کے متعلق مختلف امیدواروں کی طرف سے اور ان کے مددگاروں کی طرف سے سازشیں ہوتیں اور اکثر خفیہ قتل بھی ہوتے۔

ملازمان بارگاہ شہنشاہی میں آزاد شدہ غلاموں کا بھی گروہ تھا جن کا ظہور پر غتو راسی زمانے میں ہوا۔ ان کم اصل اشخاص کو شہنشاہوں کی ذاتی املاک کا انتظام سپرد تھا کیونکہ قدیم امراء پر شہنشاہوں کو بالکل اعتماد باقی نہ رہا تھا اور یہ آزاد شدہ غلام جن کی تعداد میں یونانی عنصر غالب تھا خاصے تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور معمولی کاروبار میں انھیں خاص ملکہ تھا اور شہنشاہوں کی اغراض کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ اس کے قبل بھی روما کے زمیندار اس قسم کے آزاد شدہ غلاموں کو اپنی املاک کے انتظام کے لیے مامور کرتے تھے اور چونکہ اب تمام سلطنت روما ایک ہی فرد کی ملک ہو گئی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان اشخاص کے رسوخ اور وقار میں افزائش ہوئی اور سیاسی اقتدارات بھی انھیں حاصل ہو گئے۔ مگر رومی امراء کو ان غلاموں کا عز و جاہ و اقتدار سخت ناگوار تھا اور شہنشاہوں سے ان کو جو خاص عناد تھا اس کی وجہ یہی ہے۔ اس کے علاوہ انصرام معاملات سلطنت میں ان کو ضرور دخل تھا مگر کم اصلی کی وجہ سے پاس عزت بالکل نہ تھا اور نہ دیانت و امانت کا خیال تھا جس کی وجہ سے محلسرائے شاہی میں جتنی خرابیاں تھیں سب انھیں پر محمول کی جا سکتی ہیں۔

پریٹورین گارڈ یعنی محافظان محلسرائے شاہی کا بھی قیام اسی زمانے میں عمل میں آیا۔ جمہوریت کے زمانے میں شہر روما یا اس کے مضافات میں کبھی فوج نہیں رکھی جاتی تھی مگر شہنشاہوں نے اپنے ابتدائی زمانے ہی سے شہر روما کے دروازوں پر اپنے پہرے بٹھا دیئے تھے۔ ان سپاہیوں کے فرائض یہ تھے کہ محلسرائے شاہی کی حفاظت کریں اور شہر روما کے شورہ پشت عناصر کو دبائے رکھیں۔ یہ فوج صرف اطالیہ سے بھرتی کی جاتی تھی اور صوبجات کی افواج سے ان کو زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔ ابتدائً تو یہ سپاہی شہنشاہوں کے وفادار خادم بنے رہے مگر رفتہ رفتہ جب ان کو اپنی قوت

کا احساس ہوگیا تو شہنشاہیت کو ان کی ذات سے ہر وقت خطرہ رہنے لگا۔
عام انتخابات کا سلسلہ ٹائی بے ریس کے عہد حکومت میں مسدود ہوگیا تھا اور ان عہدہ داروں کا اقتدار بھی باقی نہ تھا اس لئے رعایا کو ان کے بند ہو جانے کا افسوس نہ ہوا مگر سینیٹ اب بھی باقی تھی اور گئی گزری حالت میں بھی امراء روما کو اس کی رکنیت کی ہوس باقی تھی۔ ارکین سینیٹ اور شہنشاہوں کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے بلکہ جن چار شہنشاہوں کا تذکرہ ہم اس باب میں کر چکے ہیں ان کے زمانہ میں علانیہ مخالفت پیدا ہوگئی۔ ارکین سینیٹ کبھی اپنی گزشتہ عظمت فراموش نہ کر سکتے تھے اور شاید وہ کوشاں تھے کہ پھر اس کی عظمت عود کر جائے اسی لئے شہنشاہ انھیں ہمیشہ باغی خیال کرتے اور آئے دن ان پر مصیبتیں ڈھاتے تھے۔ شہنشاہ کی ذات کی حفاظت کے لئے ایک موہوم قانون نافذ تھا اور جو مخبر کسی شخص کے مقابلہ میں بغاوت کا الزام کامیابی کے ساتھ ثابت کر دیتا اس کو خزانۂ شاہی سے بیش قرار انعام ملتا۔ ارکین سینیٹ کی جان مصیبت میں رہتی کیونکہ بغاوت کے مقدمات کی سماعت میں گویا انصاف و معدلت کا مضحکہ اڑایا جاتا۔ مخبروں نے ان انعامات سے اپنے گھر بھر لئے اور امراء روما کو ان سے آزاد شدہ غلاموں سے بھی زیادہ نفرت تھی۔
۱۴ء سے جب کہ آگسٹس نے انتقال کیا نیرو کے قتل (۶۸ء) تک سلطنت روما کی عام حالت یہی تھی جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ نیرو کی موت کے بعد طوائف الملوکی کی صورت پیدا ہوگئی۔ افواج مقیم غالیہ و ہسپانیہ میں بغاوت پھیل گئی اور خود روما کی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ نیرو کے فرار اور خودکشی کا سبب یہ تھا کہ روما میں افواج پریٹوریَن کی بغاوت کی خبر پھیل گئی تھی۔ ایک مدت تک روما پر ان کا پورا اقتدار رہا اور انھوں نے اپنے حسب خواہش ایک سن رسیدہ اور معزز رکن سینیٹ گالبا کو شہنشاہ نامزد کیا۔ جو غالیہ کی بغاوت میں شریک تھا مگر گالبا نہایت دیانت دار اور راست باز آدمی تھا۔ امور سلطنت میں اس نے کسی کی رو رعایت جائز نہ رکھی اور نہ سپاہیوں کو بیش قرار انعام دیئے جس کی وہ امید میں تھے بلکہ نیرو نے جو انعام اکرام دیئے تھے اس کی بھی واپسی کا حکم دیا۔ گویا اس کی جز رسی اس کے زوال کا باعث ہوئی۔ ایک نوجوان رومی

اسیرمی اوتھو نے فوج کی ناراضی سے فائدہ اٹھاکر گالبا کے خلاف سازش کرنی شروع کی اور افواج پریٹورین کو داد و دہش کی لالچ سے اپنا مطیع بنالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گالبا قتل کیا گیا اور اوتھو اس کی جگہ پر شہنشاہ روما ہوگیا۔

مگر سیاسیات روما میں اب ایک جدید عنصر کا غلبہ شروع ہوتا ہے۔ ناظرین پر واضح ہوگیا ہوگا کہ اب سپاہی سیاہ و سفید کے مالک ہوگئے ہیں۔ تغیرات مذکورۂ بالا میں شہریان روما یا سینیٹ کو کوئی دخل نہیں اب تک صرف افواج پریٹورین کا دور دورہ تھا مگر اب سلطنت روما کی دوسری افواج پریٹورین افواج کے اقتدارات اور بیش قرار مشاہرات کو حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں اور ان کو احساس ہونے لگا کہ اس ابتری اور طوائف الملوکی سے صرف ایک ہی جیش کیوں نفع اٹھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے افواج صوبجات شہر روما پر دھاوا کرنے لگیں اور سلطنت روما ان افواج کی باہمی نفاق کا شکار ہوگئی۔ سب سے پہلے جرمنی کی فوج نے جس کے سپرد شمالی سرحد کی حفاظت تھی اپنے سپہ سالار وٹےلیس کی شہنشاہی کا اعلان کیا اور اس کے دعاوی کو تقویت دینے کے لئے اطالیہ کی طرف کوچ کردیا۔ اوتھو نے ادھر اُدھر سے کچھ فوج جمع کی اور لو واردین سے اطالیہ کے شمال کی طرف مقابلہ کیا مگر افواج شمالی کے مقابلہ میں اس کی فوج کی کوئی ہستی نہ تھی اور وٹےلیس شہنشاہ ہوگیا۔ مگر اس کی حالت بھی قابل اطمینان نہ تھی کیونکہ تدبیر مملکت میں اس کو بالکل دخل نہ تھا اور سپہ سالار بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ شام میں جو رومی افواج تھیں وہ اس وقت بیت المقدس کے محاصرہ میں مشغول تھیں ان کو افواج جرمنی کی کامیابی سخت شاق گزری اس لئے انھوں نے بھی سلطنت روما پر قبضہ کرنے کے قصد سے اپنے سپہ سالار ویس پاسین کی شہنشاہیت کا اعلان کردیا اور بیت المقدس کا محاصرہ چھوڑ کر روما کا رخ کیا۔ مقام کریمونا میں دونوں افواج میں نہایت خونریز جنگ ہوئی مگر وٹیلس کی افواج روما کے قیام اور وہاں کی عیش پرست زندگی کی وجہ سے سست پڑ گئی تھیں اور ان کو شکست ہوئی۔ وٹیلس مجبوراً شہر روما کو واپس آیا اور وہاں بھی کوئی قرار واقعی مدافعت نہ کرسکا۔ حملہ آوروں نے شہر پر دھاوا کرکے اس کو لے لیا۔ وٹی لےلیس اس معرکہ میں قتل ہوا اور ویس پاسین شہنشاہ ہوگیا۔

یہ سب واقعات ایک ہی سال میں ہوئے اور جتنے تغیرات ہوئے سب افواج کی چیرہ دستی سے ہوئے ہیں۔ ان میں شہریان روما یا سینٹ کی اولوالعزمی یا باشندگان صوبجات کی حریت پسندی کا کوئی حصہ نہیں۔ اس زمانہ کے مورخین نے خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ افواج صوبجات کے سپاہی اطالی النسل نہ تھے اور نہ اپنے کو "شہری" خیال کرتے تھے۔ جو انھیں صرف غارتگری یا فوجی عزت حاصل کرنے کا خیال تھا۔ یاسی اغراض ان کی اولوالعزمیوں سے وابستہ نہ تھیں۔ صرف غالیہ کے شمالی حصہ میں قومی حکومت قائم کرنے کے لئے ایک بغاوت اس سال کے آخر میں ہوئی مگر جب ویس پاسین نے امن وامان قائم کیا تو رومی افواج نے بہت جلد اس بغاوت کو فرو کر دیا۔

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ویس پاسین کو بھی انھیں مشکلات کا سامنا ہوگا جس کی او تھو اور وٹیلیس تاب نہ لا سکے اور شامی افواج کی کامیابی دوسری افواج کی ترغیب وحرص کا باعث ہوگی۔ مگر جتنی بڑی فوجیں تھیں سب یکے بعد دیگرے اس قضیہ میں شریک ہو چکی تھیں اس کے علاوہ ویس پاسین کی نہ صرف فوجی قابلیت نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی بلکہ وہ نہایت مستقل مزاج تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عنان سلطنت فوجی انقلابات کے سبب سے اس کے ہاتھ میں آئی مگر اس نے روما کی بہترین روایات کے مطابق حکومت شروع کی اور اس کے عہد حکومت سے روما کی بھلے دن پھر آئے۔ تمام سلطنت میں ابتری پھیلی ہوئی تھی، خزانہ خالی تھا، سینٹ میں متعدد جائدادیں خالی تھیں اور تمام ممالک غربی میں بدامنی تھی۔ مگر اپنے استقلال اور کفایت شعاری سے اس نے تمام افواج کو اپنا مطیع کیا، مالی حالت درست کر دی بلکہ سینٹ کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ ایک زبردست جنگ شام میں کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ افواج شام نے بیت المقدس کا محاصرہ چھوڑ کر روما کی طرف رخ کیا تھا مگر جیسے ہی ویس پاسین کی قوت مستحکم ہو گئی یہودیوں کے خلاف جنگ شروع کر دی گئی۔ یہودیوں اور رومیوں کے تعلقات ہمیشہ سے نازک تھے۔ جس کا سبب یہ تھا کہ یہودی خود نہایت شورہ پشت اور باہمت تھے نہ یہ کہ رومی ان پر ظلم کرتے تھے۔ یہودیوں نے ۶۶ء میں بغاوت کی مگر ابتدا ہی سے یہ ظاہر تھا کہ ان کے ذرائع اس قدر وسیع نہ تھے کہ سلطنت روما کی

مجموعی قوت کا مقابلہ کر سکیں۔ سنہ ۶۹ء کی خانہ جنگی سے یہودیوں کو کچھ دن کے لیے چین ملگیا مگر سنہء میں ویسپاسین نے مہم اپنے بیٹے ٹٹس کے سپرد کیا۔ یہودی نہایت شجاعت اور بہادری سے لڑے۔ مگر ان میں خود آپس میں پھوٹ پڑگئی تھی جس سے وہ اور بھی ضعیف ہوگئے تھے۔ آخرکار رومیوں نے دھاوا کر کے بیت المقدس پر بے حد کشت و خون کے بعد قبضہ کر لیا اور تصفیہ کیا کہ یہ متبرک شہر مسمار کر دیا جائے اور یہودیوں کو اس کی دوبارہ تعمیر کی اجازت کبھی نہ دیجائے۔ رومی فوج کا ایک دستہ اس کے مضافات میں مقرر کر دیا گیا۔ ظفریاب ٹٹس روما واپس ہوا اور کچھ روز بعد اپنے باپ کے مرنے پر اس کے تخت و تاج کا وارث ہوا۔ یہودی اس کے قبل بھی تمام سلطنت روما میں پھیلے ہوئے تھے مگر سقوط بیت المقدس سے ان کا مذہبی مرکز اور جائے اجتماع ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس واقعہ کے بعد سے تاریخ یورپ انکے مصائب پریشانی مظلومی اور دولت کی عجیب و غریب داستانوں سے پر ہے۔

ٹٹس نے صرف دو سال یعنی سنہ ۷۹ء سے سنہ ۸۱ء تک سلطنت کی اور اس کے بعد اس کا بھائی ڈومیشیان شہنشاہ ہوا (سنہ ۸۱ء۔ سنہ ۹۶ء) اس کی عہد حکومت میں ابتدائی شہنشاہوں کی بے اعتدالیوں کا پھر کچھ نقشہ آگیا۔ روما میں بےاطمینانی اور پریشانی پھیل گئی کسی کو اپنی جان کی خبر نہ تھی مخبروں کا بازار گرم تھا' ناکردہ گناہوں پر بغاوت کے الزام عائد کئے جاتے تھے اور ادھر محلسرا میں رنگ رلیاں منائی جانے لگیں اور سازشیں ہونے لگیں۔ اس بادشاہ کے عہد حکومت کا روما کی ترقی پر کوئی اثر نہیں پڑا اور آخرکار اس کے خلاف ایک سازش ہوئی جس میں اس کی بیوی' اس کے آزاد شدہ غلام اور افواج پریٹوریَن سب کے سب شامل تھے اور قاتل کے خنجر نے اس کا کام تمام کر دیا۔

باب ہفدہم

عہدِ شہنشاہانِ اینٹونائن

ڈومی ٹین کی موت کے بعد شہنشاہی روما میں ایک مبارک دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں تمام سلطنت ہر قسم کے قضیوں اور بدامنی سے پاک رہی اور اس عرصہ میں یعنی ۹۶ء سے ۱۸۰ء تک جتنے شہنشاہ تختِ روما پر جلوہ افگن ہوئے سب مستقل مزاج نکوکردار اور کار آزمودہ تھے۔ یہ زمانہ دورِ عہدِ شہنشاہانِ اینٹونائن کے نام سے مشہور ہے مگر اینٹونیس صرف دو آخری شہنشاہوں کا نام تھا۔ اس ۸۰ سال کے زمانہ میں شاہانِ سابقہ کے عہد کی بدامنی کا گویا بالکل خاتمہ ہو گیا، نہ کوئی خانہ جنگی ہوئی نہ کوئی شہنشاہ قتل کیا گیا اور مجلسِ اعلیٰ شاہی کی حالت بھی بہ نسبت سابق بہت بہتر تھی۔ تمام رومی دنیا پر ایک عالمِ سکون طاری تھا مگر یہ سکون وہ تھا جو طوفان کے قبل ہوتا ہے کیونکہ تیسری صدی عیسوی میں سلطنتِ روما زیر و زبر ہو گئی۔

اس عہد میں پانچ شہنشاہ گزرے ہیں۔ جانشینی کا مشکل مسئلہ بھی اس طرح حل ہو گیا تھا کہ شہنشاہ کسی سربرآوردہ ملکی عہدہ دار کا انتخاب کر کے اس کو اپنا بیٹا بنا لیتا اور اگر اس کا چال چلن ٹھیک ثابت ہوتا تو کچھ دن بعد اس کو اپنا ولی عہد قرار دیتا۔ شہنشاہ کو اس طرح اپنے جانشین کی تربیت کا موقع ملتا اور یہ بھی اندازہ کر سکتا کہ رعایا اس کے انتخاب پر صاد کرتی ہے یا نہیں۔ تبنیت کا طریقہ اس زمانہ میں ایسا کامیاب ثابت ہوا کہ تعجب ہے کہ زمانہ حال میں کسی ریاست نے جانشینی کا یہ عمدہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ مگر باایں ہمہ اس طریقہ کا نفاذ از روئے قانون نہیں کیا گیا تھا

بلکہ شہنشاہوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک عجیب بات ہے کہ ان شہنشاہوں میں سے ایک نے باوجود اپنے فرزند کی موجودگی کے دوسرے شخص کو اپنا جانشین نامزد کیا۔

اس مبارک عہد میں شہنشاہوں اور سینیٹ کے درمیان جو سخت مخالفت عرصہ سے چلی آرہی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ نہ مخبروں کی مخبریاں باقی رہیں، نہ بغاوت کے مقدمے، نہ خودکشیاں، نہ قتل۔ شہنشاہوں اور سینیٹ کے خوشگوار تعلقات دستوری تغیرات سے نہیں پیدا ہوئے تھے بلکہ واقعات گزشتہ کے سبب سے، اراکین سینیٹ کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور شہنشاہ بھی ان کا لحاظ رکھتے اور ان کی خدمات سے مستفید ہوتے۔ کشیدگی پھر بھی کبھی کبھی پیدا ہو جاتی مگر زیادہ تر ہم اس عہد میں دیکھتے ہیں کہ سینیٹ شہنشاہ کے ساتھ وفاداری سے پیش آتی ہے۔

صوبجات میں بھی حکومت شہنشاہی موجب فلاح و برکت ہو چلی تھی اور وہاں کے باشندے اپنے آپ کو روما کا ماتحت نہیں خیال کرتے تھے بلکہ اطالیہ اور خود روما کے ہمسر خیال کرتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس عہد کے پہلے شہنشاہ کے سوا اس کے جانشین سب صوبجات کے رہنے والے تھے اور جن شہنشاہوں کی حکومت سے سلطنت روما کو اس درجہ کا فلاح ہوا ان کا زاد و بوم ہسپانیہ تھا۔ اس زمانے سے سلطنت روما کے شہنشاہ اور صوبہ دار زیادہ تر صوبجات کے باشندے ہوتے ہیں اور دار الخلافہ روما یا اطالیہ سے شاذ و نادر۔ حکومت بلدی کو بھی اس زمانہ میں خوب فروغ ہوا۔ جن جن مقامات کے تفصیلی حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد حکومت بلدی قدیم انتظامات کی جگہ لے رہی ہے گویا سلطنت روما آزاد بلدیات کا عظیم الشان مجموعہ بن رہی تھی جن میں یکجہتی شہنشاہوں کی حکومت مرکزی سے قائم تھی۔

ہم متعدد مرتبہ بیان کر چکے ہیں کہ دور شہنشاہی کی نمایاں خصوصیت قیام امن تھی مگر اس درجہ کسی عہد میں نہ تھی۔ ٹریجن کے زمانے میں سرحدات ڈینیوب و فرات کے پار اہم محاربات ہوئے اور مارکس آریلیس کے عہد کے آخری سالوں میں جرمن اقوام کے پرخطر حملے شروع ہو گئے۔ مگر یہ سب سلطنت کی سرحدوں کے باہر تھے

اور ہیڈرین اور انٹونیس پائس کے زمانہ میں ایک جنگ بھی نہ ہوئی۔ تاریخ یورپ میں کوئی زمانہ نہیں گزرا ہے جس میں اتنے طویل عرصہ تک اور ایسے وسیع رقبہ میں کسی قسم کی فوجی تحریک نہ ہوئی ہو۔

باوجود اس امن و امان اور سکون کے علمی ترقی کا دروازہ بھی بند نہ ہوا تھا بلکہ لاطینی ادبیات کو دوبارہ فروغ ہوا اور جوونیل (شاعر) ٹیاسی ٹس (مورخ) اور پلینی اسی دور علمی کے درخشاں ستارے تھے۔ فنون بت تراشی اور تعمیر میں اس عہد کے صناعوں نے اپنے جوہر خوب دکھائے۔ روما اور دوسرے مقامات کے عجائب خانوں میں عہد قدیم کی جو اشیاء محفوظ ہیں ان میں سے بہترین اسی دور کی صناعی کے نمونے ہیں اور زیادہ تر شہنشاہ ہیڈرین کے محل کی صناعیوں کے ٹکڑے ہیں۔ ادبیات اور فنون لطیفہ کے علاوہ عالم مذہبی میں بھی بحث و مباحثہ کا بازار گرم تھا۔ قوانین روما کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ بھی ہیڈرین ہی کی حکومت سے شروع ہوا۔ فلسفۂ یونان اور خصوصاً فلسفہ رواقیین کا فیض رساں اثر روحی بت پرستوں میں بڑھنے لگا۔ کلیسیۂ مسیحی بھی باوجود دوسرے مذاہب کی سخت مخالفت اور اندرونی مناقشات کے ترقی کر رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ طاقت اور تقویت حاصل کرے جو آخر کار ان شہنشاہوں کی قائم کردہ حکومت اور تمدن کے زوال کا باعث ہوئی گو اس تمدن میں خود زوال کے عناصر موجود تھے اور ایسی سیاسی، مذہبی اور معاشی تحریکیں پیدا ہو گئیں تھیں جن سے اس تمدن میں انقلاب لازمی تھا۔ مگر جب تک یہ مبارک دور قائم رہا اس کی مقبولیت اور پسندیدگی میں کوئی کمزوری واقع نہ ہوئی اور بقول گبن اگر کسی فلسفی سے پوچھا جائے کہ تاریخ انسانی میں وہ کس دور کو ایسا خیال کرتا ہے جس میں بنی نوع انسان سب سے زیادہ عافیت میں رہے ہوں تو بلا خرخشہ وہ جواب دے سکتا ہے کہ وہ شاہان انٹونائن کا عہد تھا۔

اب ہم ان شہنشاہوں کی حکومت کے مختصر حالات بیان کرینگے۔ اس سلسلہ کا پہلا شہنشاہ نروا اراکین سینیٹ میں سے تھا۔ یہ شخص صلح جو طبیعت کا آدمی تھا اور مختصر مگر بابرکت حکومت کے بعد ٹریجن کو اپنا جانشین بنا کر ملک عدم کو چل بسا۔ ٹریجن ۹۸ء میں تخت نشین ہوا جو شہنشاہان روما میں عظیم ترین اور قابل احترام ہے۔ اس کی نیک نیتی کا

یہ عالم تھا کہ ازمنۂ وسطیٰ میں ایک روایت مشہور تھی کہ بت پرستوں میں صرف ٹریجن بہشت میں داخل ہو سکیگا۔ اگر اس کی حکومت داخلی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کی سعی بلیغ تھی کہ ٹیکس کم کر دیئے جائیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ریاست کا خزانہ معمور رہتا تھا۔ سینیٹ کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے یہاں تک کہ اس کے مداح نے کہا ہے کہ وہ سلطنت روما کا آقا نہ تھا بلکہ اراکین سینیٹ کا سرگروہ تھا۔ مسلسل خانہ جنگیوں سے ملک اطالیہ ویران ہو چلا تھا۔ ٹریجن اس کی سرسبزی اور آبادی میں ہمیشہ کوشاں تھا۔ یتامے کی پرورش کا بھی اس نے خاص انتظام کیا۔ پلینی ایک رومی ادیب اور مصنف گزرا ہے جس کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔ یہ ایک زمانے میں ایک صوبے کا حاکم اعلیٰ تھا اور شہنشاہ سے خط و کتابت رکھتا تھا۔ ان خطوط سے ظاہر ہے کہ صوبجات کے انتظام و نسق کے ذیلی امور پر بھی اس کی نگاہ رہتی تھی اور باشندگان صوبجات کی راحت و آسائش اور مرکزی حکومت کا وقار قائم رکھنے کا اسے ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ شہر روما کی آرائش و تزئین کے لئے متعدد مندر، مینار اور کمانیں بنوائیں مگر اپنے پیشروؤں کی طرح اس نے تعمیرات کا شوق رعایا پر محصولات کا بار گراں ڈالکر پورا نہیں کیا۔

ٹریجن کے زمانۂ حکومت میں رومی افواج غیر ملکوں میں جنگ و جدال میں مصروف تھیں اور اپنی فتوحات سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان کے ضبط اور نبرد آزمائی میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی ہے۔ شہنشاہ ٹریجن خود نہایت قابل سپہ سالار تھا۔ پہلی مرتبہ وہ اپنی افواج ڈینیوب کے پار کے ملک میں لے گیا جسے رومی ڈیشیا کہتے تھے اور فی زمانہ رومانیہ کہا جاتا ہے۔ اس اطراف کے وحشیوں نے رومی صوبجات میں لوٹ مار مچا رکھی تھی اور چونکہ ان کے ملک میں سونے کی کانیں تھیں اس لئے رومی نو آباد اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ان محاربات کے تفصیلی حالات ضبط تحریر میں نہیں لائے گئے ہیں مگر ٹریجن کا بنایا ہوا ایک مینار روما میں اب تک موجود ہے جس پر اس کی افواج کی نقل و حرکت کے نظارے اب تک منقوش ہیں۔ جنگ مذکور میں ٹریجن کو آسانی سے فتح حاصل نہیں ہوئی۔ پہلے تو دریائے ڈینیوب پر اسے کشتی پل بنانا پڑا۔ یہ پہلا پل ہے جو تاریخ عالم میں مذکور ہے۔ کئی لڑائیوں کے بعد شاہ ڈیشیا مارا گیا اور ڈیشیا بھی ایک رومی صوبہ ہو گیا۔ اس جنگ کے کچھ زمانے کے بعد رومیوں کو اپنی پوری قوت پارتھیا

کے خلاف میں صرف کرنا پڑی۔ یہ جری قوم ایرانی نسل سے تھی۔ ایرانی یونانیوں سے ہزیمت اٹھا چکے تھے مگر کئی پشتوں سے یہ قوم رومیوں کی خطرناک دشمن ہوگئی تھی اور کئی دفعہ رومی افواج کو ہزیمت دیکر ان کے علم چھین چکی تھی۔ مگر جب رومیوں نے اپنا پورا زور لگا دیا تو پارتھی ان کے مقابلہ سے عاجز آگئے اور ۱۱۵ء میں ٹریجن فاتحانہ عراق میں داخل ہوا۔ شہر بابل اس نے فتح کر لیا اور صوبجات آرمینیا اور عراق سلطنت روم میں شریک کر دیے۔ انھیں مشرقی مہمات میں اس زبردست شہنشاہ نے ۱۱۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ٹریجن کے انتقال کے بعد اس کا پسر متبنیٰ ہیڈرین مالک تخت و تاج ہوا جو ہسپانی الاصل تھا۔ ہر ملک کو اپنا گھر سمجھتا تھا اور روم کی نسبت ایتھنز میں اس کو زیادہ لطف آتا۔ اپنی دوران حکومت میں اس نے اپنی تمام سلطنت کا دورہ کیا اور شاید ہی کوئی صوبہ بچ گیا ہو جس کی نظم و نسق مالیات اور سرحدات کی حفاظت میں اس کے معائنہ سے اصلاح نہ ہوئی ہو۔ برطانیہ میں جو فصیل رومیوں نے دریائے ٹائن سے دریائے سالوے تک بنائی تھی اس کی تعمیر اسی کی طرف منسوب کی جاتی ہے گو زمانۂ مابعد کے حکام نے اس کی توسیع کی ہے۔ اس کا قول تھا کہ میں سلطنت کو اپنی ذاتی جائداد خیال نہیں کرتا بلکہ اس کو قوم رومی کی ملک سمجھتا ہوں اور شاید ہی کسی جمہوری سلطنت کے میر مجلس نے اپنے فرائض اس خوبی سے ادا کئے ہوں۔ مگر عہد جمہوری کے رومیوں سے اس کی خصائل بالکل متضاد تھیں۔ فنون لطیفہ سے اسے انہماک تھا۔ فلسفے اور مذہب کے پیچیدہ مسائل پر وہ نہایت کاوش کے ساتھ غور کیا کرتا تھا اور خانگی زندگی میں قدیم رومیوں کے سخت اخلاق کا پابند نہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں صرف یہودیوں کے سبب سے کچھ نقض امن ہوا۔ سلطنت کے جنوبی مشرقی حصہ میں یہودیوں کی تعداد کثیر تھی اور باوجود سقوط بیت المقدس انھیں اب بھی امید تھی کہ ان کی قوم دنیا میں پھر سرخرو ہوگی جس کی وجہ سے مصر اور قبرص میں ان کا قتل عام ہوا اور فلسطین میں ان کی بغاوت فرو کی گئی۔ فوج کی حالت وہی تھی جو ٹریجن کے زمانہ میں تھی مگر ہیڈرین نے صوبجات آرمینیا اور عراق پر سے رومی قبضہ اٹھا لیا غالباً اس کا سبب یہ ہوگا کہ سرحد مشرقی پر رومیوں کو آئے دن کی لڑائیوں سے گلوخلاصی ہو جائے مگر صوبۂ ڈیشیہ پر اس نے اپنا قبضہ بحال رکھا کیونکہ رومی آبادکاروں

کی تعداد کثیر وہاں اقامت گزیں تھی یا اس لئے کہ وہاں سونے کی کانیں تھیں۔
نظم و نسق سلطنت میں بھی ہیڈرین اہم تغیرات عمل میں لایا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شاہان سابق نے اپنے آزاد شدہ غلاموں کو ذمہ داری کی خدمتیں سپرد کر رکھی تھیں۔ یہ طریقہ نقص سے خالی نہ تھا اور اس کی وجہ سے امراء میں برافروختگی پھیل گئی تھی ہیڈرین نے بجائے اس کے باضابطہ نظام انتظامی رائج کیا اور عہدے قائم کئے جنھیں اعلیٰ طبقات کے افراد قبول کر سکیں ملازمت سرکاری امراء روما کے لئے اب باعث اعزاز خیال کی جانے لگی۔ مگر آئندہ چلکر ہمیں معلوم ہوگا کہ ایک صدی بعد ان عہدہ داروں کے اقتدارات بہت بڑھ گئے یہاں تک کہ ان کا وجود سلطنت کے لئے مضر ہوا اور اس کے زوال کا باعث ہوا۔ لیکن ہیڈرین کے زمانہ میں اور ایک عرصہ تک اس کے بعد بھی اس جدید نظام سے عمدہ نتائج مترتب ہوتے رہے اور رعایا پر کوئی مزید باران عہدہ داروں کے سبب سے عاید نہ ہوا۔ ہیڈرین نے اپنے پیشرو کے کار خیر جاری رکھے اور غلاموں پر ان کے مالکوں کے جو اختیارات تھے بہت کچھ گھٹا دیئے گئے۔
ہیڈرین کو بھی تعمیرات کا شوق تھا۔ شہر روما اور صوبجات کے بڑے بڑے شہروں میں اس نے عظیم الشان عمارتیں بنوائیں اور روما سے چند میل کے فاصلہ پر ایک عالیشان قصر تیار کرایا مگر ٹریجن کی طرح ہیڈرین نے بھی اپنا شوق پورا کرنے کے لئے رعایا پر تباہ کن محصول نہیں لگائے۔ ہیڈرین کی موت (۱۳۸ئہ) کے بعد اس کا پسر متبنے انٹونینس پائس تخت نشین ہوا اور ۲۳ سال تک برسر حکومت تھا۔ اس کے خصائل حمیدہ اور خصوصاً ادائی فرائض کی خود اس کے مشہور جانشین نے بیحد تعریف کی ہے۔ اس کے دوران حکومت میں نقص امن کی کوئی مثال نہیں ملتی یہاں تک کہ یہ دعوے کیا گیا ہے کہ ۲۳ سال کی حکومت میں نہ کسی رومی کا خون بہا نہ کسی غیر ملکی کا۔ اپنے پیش روؤں کی طرح وہ بھی غلاموں کے مصائب رفع کرنے میں کوشاں تھا باشندگان صوبجات کو شہریت روما کے حقوق اس نے نہایت فیاضی سے دیے اور قوانین روما کی تدوین اس کی وجہ سے ہوئی۔
اس شہنشاہ نے ۱۶۱ئہ میں انتقال کیا اور اس کا پسر متبنے مارکس آریلیس اس کا جانشین ہوا اور ۱۸۰ئہ تک حکمراں تھا۔ اسی کے زمانہ میں سلطنت روما کی خوشحالی

میں کیرڑا الگ گیا اور اسے خود شمال کی وحشی اقوام سے کئی خونریز مقابلے کرنے پڑے گو اس میں کامیابی اسی کو ہوئی۔ اس زمانہ کے رواج کے مطابق اس کے فتوحات کے نظارے ایک کالمے پر منقوش ہیں جو شہر روما کے ایک چوک میں اب تک موجود ہے۔ مگر زمانۂ حال میں اس کی شہرت اس کے فوجی کارناموں کے سبب سے نہیں ہے بلکہ فلسفی اور مذہبی تخیلات کی ایک چھوٹی سی کتاب پر ہے جس میں اس کے متفرق مسودے اس کے انتقال کے بعد جمع کر دیئے گئے تھے۔ یہ تخیلات گویا فلسفۂ رواقی کا ایک ایک مجموعہ ہیں جس میں عملی اور مذہبی پہلو پر زیادہ تر بحث کی گئی ہے۔ سلطنت رومائی دوسری نظام ہائے فلسفہ کی طرح رواقیت کی بنیاد بھی یونان میں پڑی تھی۔ اس فلسفہ کا مقصد یہ تھا کہ عالم طبعی کا عذر دریافت کیا جائے مگر اس کے معتقدین ایک قادر مطلق کے وجود کو تسلیم کرتے تھے۔ ابتداءً اس کے ماننے والے اصول اخلاق کی پابندی نہایت سختی کے ساتھ کرتے تھے جو بعض وقت مبالغہ کی نوبت پر پہنچ جاتی اور بعض ان میں سے ریاکار بھی تھے۔ شہنشاہی کے ابتدائی زمانے میں ان لوگوں نے شہنشاہوں کی نہایت سختی کے ساتھ مخالفت کی تھی۔ کیٹو اور سیزر کے قاتلوں کے بے حد مداح تھے اور بادشاہوں کے قتل اور خودکشی کو جائز سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے نیرو اور ویس پاسین کے زمانے میں یہ گروہ نہایت مطعون ہوا اور اس پر ظلم بھی ہوئے مگر اب امن و امان سے گزر رہی تھی اور ان کے عقائد میں وہ افراط و تفریط باقی نہ تھی۔ اس فلسفے کے مبلغین میں دو شخص سرآوردہ سمجھے جاتے ہیں ایک تو سنیکا جو نیرو کا وزیر تھا اور پھر اس کے ظلم کا نشانہ بنا اور دوسرا ایپک ٹیٹس ایک یونانی غلام جو ویس پاسین کے دور حکومت میں روما میں موجود تھا۔ مارکس آریلس کے ساتھ تو یہ فلسفہ یا مذہب گویا سریرآرائے سلطنت ہوا۔ اس مذہب کی عظمت بھی گویا اس تلاطم کی نشانی ہے جو لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں پیدا ہو رہا تھا اور جس کی طرف ہم پھر اشارہ کرینگے۔

مارکس آریلس کی تحریر کے بموجب فلسفۂ رواقی کے عقائد حسب ذیل تھے۔

دنیا مظہر ہے ایک فوق الانسان ذات کی قوت ارادی کا مظہر ہے جس کے آگے انسان کو بطیب خاطر سر تسلیم خم کرنا چاہیئے۔ انسان کی قوت ارادی اور قوت فکر کو بیرونی حالات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے انسان کی خوشی اسی کے ہاتھ میں ہے اور حقیقی خوشی سکون

قلب اور نشیب و فراز زندگی سے دماغ کو بالکل الگ تھلگ رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔
مگر ان عقائد کے علاوہ اس کے تخیلات سے ظاہر ہے کہ نہایت ہی حلیم الطبع تھا، اخوت انسانی کا اسے بہت خیال تھا اور تمام بنی نوع انسان کو بلا لحاظ قومیت، مذہب یا طبقہ مستفید کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس فلسفہ سے اسے کامل روحانی تشفی حاصل نہیں ہوئی اور گو مسیحیت کو اس نے پسند نہیں کیا اور مسیحیوں پر مظالم بھی کئے مگر اس کا مطمع نظر مسیحی عقائد سے قربت رکھتا تھا۔

اس کے عہد حکومت کے دوسرے واقعات کا تفصیلی ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔
شمالی وحشیوں سے خطرہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ اس زمانے میں ایک وبا تمام سلطنت روما میں پھیل گئی اور اس نے تمام سلطنت روما کو ویران کر دیا۔ شہنشاہ میں فوجی مادہ بہت کم تھا مگر اس خطرے کا اس نے بہادری سے مقابلہ کیا اور آخر میں کامیاب رہا۔ دشمن کو کوہ آلپس کی وادیوں میں متعدد شکستیں ہوئیں مگر اثنائے جنگ میں اس پر خود بھی وبا کا اثر ہو گیا اور ۱۸۰ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے مرتے ہی شاہان اینٹونائن کا قائم کردہ نظام سلطنت زیر و زبر ہو گیا۔ اس کی موت اس پراگندگی کا باعث نہ تھی بلکہ اس کی پہلی نشانی۔

باب ہجدہم

شہنشاہیت روما کا زوال

مارکس آریلیس کی موت کے بعد شہنشاہیت کے برے دن شروع ہو گئے شہنشاہان اینٹونائن کے زمانہ کے امن وامان اور خوش حالی کے بجائے خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور تیسری صدی عیسوی میں وحشیوں کے حملے کا آغاز ہوا۔ اس انقلاب اور سلطنت روما کے زوال کے اسباب پر اب ہم غور کرینگے۔

سلطنت روما کا زوال کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا کیونکہ کوئی انقلاب یا شکست یا کوئی منفرد واقعہ ایسا نہیں ہے جس کی طرف اسے منسوب کیا جائے اور یہ بھی یقین سے ساتھ کہنا دشوار ہے کہ کب اور کس سنہ میں سلطنت روما کا خاتمہ ہوا۔ سنہ ۴۱۰ء میں قوم گاتھ کے سردار الارک نے روما پر قبضہ کر لیا مگر سلطنت روما اس سانحۂ عظیم کے بعد بھی قائم تھی۔ سنہ ۴۷۶ء میں شہنشاہیت کا سایہ اطالیہ سے اٹھ گیا اور بعض لوگ اسی تاریخ سے شہنشاہیت روما کا اختتام شمار کرتے ہیں مگر یہ بھی غلط ہے کیونکہ سلطنت قائم تھی صرف اس کا دارالسلطنت روما سے قسطنطنیہ کو منتقل ہو گیا اور شہنشاہیت کا سب سے بڑا کارنامہ یعنی ترتیب قوانین روما کی تکمیل اس تاریخ کے بعد عمل میں آئی۔ سنہ ۸۰۰ء میں باوجود اس کے کہ شاہان قسطنطنیہ شہنشاہ ہونے کا دعوے کرتے تھے چارلس اعظم نے ایک دوسری شہنشاہیت روما قائم کی۔ شہنشاہیت روما شرقی کا ترکوں نے سنہ ۱۴۵۳ء میں کام تمام کر دیا اور گبن نے اپنی تاریخ عظیم اس واقعہ پر ختم کی ہے۔ گو جب قسطنطنیہ کی دیواروں پر نشان ہلال اڑنے لگا اس وقت بھی جرمنی میں سلطنت روما مقدسہ قائم تھی جو شہنشاہان

روما کی نام لیوا تھی اور اس کا سلسلہ ۱۸۰۶ء تک جاری تھا۔ ۱۸۰۶ء کے بعد سے کسی سلطنت نے شہنشاہیت روما مقدسہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے مگر زمانہ حال کی شہنشاہیت جرمنی میں اس کی قدیم روایات اب تک موجود ہیں اور اس سلطنت کو شہنشاہیت روما کا جانشین خیال کرنا چاہئیے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ سلطنت روما کا کسی سانحۂ عظیم سے خاتمہ ہو گیا اس میں مسلسل تغیرات ہوتے رہے اور باوجود ان تغیرات عظیم کے وہ فنا نہیں ہوئی۔

زوالِ سلطنت روما سے اصل میں مراد یہ ہے کہ تیسری اور چوتھی صدیوں میں اس کی قدیم خصوصیات بالکل مسخ ہو گئیں یعنی دین مسیحیت کو مذہب شاہی ہونے کا شرف حاصل ہوا، انقطاع مغرب میں وحشی حکمرانوں کا غلبہ ہو گیا اور تمدنی حالات میں انقلاب عظیم ہوا۔ شہنشاہان انٹونائن کے عہد کا امن وامان ہمیشہ قائم نہ رہ سکتا تھا اور نہ انتظامات ہمیشہ تک قائم رہ سکتے تھے۔ نظم ونسق کے زیر وزبر ہو جانے کا سبب یہ نہیں تھا کہ باشندگان صوبجات نے روما کا جوا اپنے کندھے سے اتار دیا کیونکہ رومیوں کی مدبّرانہ روش کے سبب سے ان کو روما سے کسی قسم کی رنجش نہ تھی۔ نہ اس کا یہ سبب تھا کہ باشندگان سلطنت کے اخلاق خراب ہو گئے تھے گو عام طور سے یہی خیال ہے، کیونکہ دین مسیحی کی ترقی سے شہنشاہیت کے اخلاق بجائے خراب ہونے کے درست ہو گئے تھے۔ جن وجوہ سے سلطنت روما کا زوال ہوا ان کی اہمیت کے متعلق اختلاف ہے مگر جو اسباب ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں اہم ترین ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شہنشاہوں کی نیک نیتی میں تو شبہہ نہیں مگر باوجود اس کے وہ بالکل مطلق العنان تھے۔ خود شہر روما میں حکومت خود اختیاری کا وجود نہ تھا۔ دوسرے شہروں میں مقامی آزادی ایک حد تک تھی مگر شہنشاہان انٹونائن نے اس پر بھی دست درازی شروع کر دی تھی گو ان کی مداخلت نیک نیتی پر مبنی تھی۔ مالی بدانتظامیاں روکنے اور اپنے اقتدارات قائم رکھنے کے لئے انھوں نے ہر شہر میں عہدہ دار مقرر کر دیئے تھے اور رفتہ رفتہ یہ شہر بجائے آزادی کے مرکز ہونے کے جبر وتعدی کی ہلاکت کن مشین کے پرزے ہو گئے۔ اس افسوس ناک حالت سے پہنچنے کے قبل بھی آزادی تقریر اور اختیار تمیزی کا وجود مفقود تھا اور رعایا کی

خواہشات یا ان کی ضروریات کے احساس کا کچھ خیال نہ تھا۔ قوانین روما کا اصول یہ تھا کہ قانون شہنشاہ کی قوت ارادی کا مظہر ہے۔ اس طرح گویا شہنشاہیت قطعی اور کامل حکومت مطلق العنان تھی اور تاریخ سے ثابت ہے کہ ایسی حکومتیں نفع بخش ہوتی ہیں مگران کا زوال فوری اور کامل ہوتا ہے۔

ان سیاسی اسباب کے علاوہ فوج میں بھی ابتری پھیل رہی تھی۔ ایک زمانہ سے فوجوں میں روما اور اطالیہ کے باشندوں کی بھرتی بند ہوگئی تھی اور سرحدات کی محافظ سپاہ صوبجات سے فراہم کی جاتی تھی۔ روما کے ان سپاہیوں نے وفاداری سے خدمت کی مگر ظاہر ہے کہ اطالیہ سے انھیں کوئی خاص انس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ابتدا ہی سے رومیوں نے غیر ممالک کے لوگوں کو جنھیں وہ حقارت سے وحشی کہتے تھے اپنی افواج میں شریک کر دیا تھا۔ وحشی باقاعدہ افواج میں شریک نہیں کئے جاتے تھے بلکہ رسالوں یا ذیلی افواج میں اور جب مدت دراز تک رومی افواج میں نوکری کرکے وہ اپنے وطن کو واپس ہوتے تو رومیوں کے فن حرب اور ہتھیاروں سے بخوبی واقف ہو جاتے اور اپنے ہموطنوں کو سکھاتے۔ اس طرح یہ وحشی رفتہ رفتہ رومیوں کے مدمقابل ہوگئے اور آخر کار ان وحشیوں نے رومیوں کا قلع قمع انھیں کے ہتھیاروں اور انھیں کے طریقہ جنگ سے کیا۔ اس طرح سے جتنی وحشی اقوام نے سلطنت روما پر حملہ آوری کی ہے ایک نہ ایک وقت میں یا تو روما کے حریف رہے ہیں یا اس کی افواج میں سپاہی تھے۔ اس قسم کے واقعات تاریخ میں کئی بار ہوئے ہیں مثلاً جیسے کہ رومیوں کے شاگرد ان کی تخریب کا باعث ہوئے اسی طرح زمانۂ مابعد میں نپولین کو انھیں ذرائع سے شکست ہوئی جو اس کی ابتدائی فتوحات کا باعث ہوے تھے۔

یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ سلطنت میں غلاموں کی تعداد کثیر تھی۔ ان کی حالت روبہ ترقی تھی۔ شہنشاہوں نے ایسے قوانین نافذ کئے تھے جن سے انکے مصائب رفع ہوں۔ بلکہ یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ غلامی کا طریقہ موقوف ہو جائے یا کم از کم اس کی صورت بالکل بدل جائے۔ مگر ظاہر ہے کہ غلاموں کو سلطنت کے قیام و زوال میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی اس لئے غلامی کا وجود بھی سلطنت روما کے متزلزل ہونے کا ایک سبب ہے۔

مگر اصل بات یہ ہے کہ جن سیاسی اور فوجی وجوہ کا ہم ذکر کر آئے ان سے کہیں
زیادہ حصہ سلطنت روما کی بنیاد کمزور کرنے میں مذہبی تحریکات کا ہے ہم بیان کر چکے ہیں
کہ شہنشاہان اینٹونائن کے پر امن عہد میں مذہبی دنیا میں سخت تلاطم پیدا ہو گیا تھا۔ اور
مختلف فلسفیانہ عقائد کی روما کے تعلیم یافتہ لوگوں میں اشاعت ہو رہی تھی ان میں سے
فلسفہ ہائے رواقی و فیثا غورث قابل ذکر ہیں۔ فلسفۂ فیثا غورث میں تصوف کا رجحان
زیادہ تھا فلسفۂ رواقی کا ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے۔ مگر فلسفہ سے زیادہ مذہب کا اثر
ہے۔ بت پرستی میں بھی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ سسرو کے عہد میں مذہب کی طرف
سے بددلی پیدا ہو گئی تھی اور لامذہبی کا زور تھا مگر اب ان میں بھی ایک قسم کے تصوف کا
رواج ہو گیا تھا۔ مشرقی مذاہب کے مقابلہ میں مقامی دیوتاؤں کا رنگ پھیکا ہو رہا تھا۔
مصری دیوتاؤں اور سائبیل کی پرستش کا اطالیہ اور ممالک مغربی میں رواج ہو چکا تھا۔
مگر تیسری صدی میں بت پرستوں میں سب سے زبردست مذہبی تحریک متھرا ازم کے
نام سے موسوم ہے۔ اس مذہب کا ایران میں آغاز ہوا اور آفتاب پرستی اس کا جزو اعظم
تھا مگر اس میں بھی تصوف کا رنگ اور قوت الہی کا احساس پیدا ہو گیا۔ تیسری صدی
میں یہ مذہب گویا ایک مرکز بن گیا تھا جس کے گرد احیا رشدہ بت پرستی کی تنظیم
عمل میں آرہی تھی۔

مگر مذہب مسیحی کی ترقی اور کلیسۂ مسیحی کی تنظیم زمانۂ مستقبل کے لحاظ سے اہم ترین
ہے۔ سلطنت روما میں مذہبی رواداری کی کمی نہ تھی اور مسیحیت پر ظلم کرنے کا الزام اس
پر عائد نہیں ہو سکتا مگر تمام مطلق العنان حکومتوں کی طرح سلطنت روما بھی ہر ایک
ایسی تحریک یا نظام کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتی تھی جس پر خود اس کی نگرانی اور اقتدار
نہ ہو اس لیے یہ کہنا بجا ہو گا کہ مسیحیوں کے عقائد حکام روما کو ناگوار نہ تھے بلکہ ان کے
کلیسہ کے نظام سے وہ خائف تھے۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کرتے ہیں اس وقت تک
مسیحیوں کے خلاف کوئی خاص قوانین نافذ نہیں ہوئے تھے لیکن یہ مذہب سلطنت
کے لئے خطرناک خیال کیا جاتا تھا اور اس کی اشاعت کی اجازت نہیں ہوئی تھی
اس لئے اس کے پیرو ہمیشہ معرض خطر میں رہتے تھے۔ یہ لوگ بت پرستی کو حقارت
کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور شہنشاہوں کی پرستش کے منکر تھے اس لئے ہر وقت

ان پر بغاوت اور آداب مذہب کی خلاف ورزی کا الزام عاید ہو سکتا تھا۔ مسیحیوں پر
مارکس آریلیس کی موت کے قبل بھی مظالم ہوئے۔ نیرو نے بھی ان پر سخت ظلم کیا اور
ٹریجن، ہیڈرین اور مارکس کی عہد حکومت میں بھی ان کے ساتھ بیرحمی کا برتاؤ ہوا۔ رفتار
زمانہ کے ساتھ سلطنت کلیسیہ کے مناقشات سخت تر ہوتے گئے کیونکہ دونوں ایک
دوسرے کا وجود گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ شہنشاہیت کا اصرار تھا کہ ہر امر میں رعایا اسکے
احکام کی پابندی کرے کلیسیہ کا دعوی تھا کہ ہر شخص اس کے اقتدار کے آگے سر تسلیم
خم کرے۔ اصلاح مذہب مسیحی کی تحریک سے تمام یورپ میں ایک سو سال تک جنگ
و جدال کا سلسلہ جاری رہا اور انگلینڈ میں قومی کلیسیہ کی مخالفت میں بغاوت ہو گئی
اور بادشاہ کے قتل کی نوبت آگئی۔ جب صرف اصلاحات اور فروعی معاملات
سے یہ نوبت پہنچ جاتی ہے تو ہم کو متعجب نہ ہونا چاہیے اگر یہ عظیم مذہبی انقلابات یعنی
مذہب مسیحی کی اشاعت و تبلیغ سخت مناقشات اور سلطنت کے تہ و بالا ہو جانے
کے بغیر نہ ہو سکی۔ رفتہ رفتہ شہنشاہیت اور کلیسیہ میں ربط پیدا ہو گیا مگر یہ اسی وقت
ہوا جب کہ کئی سخت مقابلوں میں ثابت ہو گیا کہ سلطنت کلیسیہ کا اقتدار روک نہیں
سکتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جدید مذہب کی ترقی کی وجہ سے وہ نظام
حکومت قائم رہ سکتا تھا جس کی ہیڈرین کے عہد حکومت میں ہم اس قدر
تعریف کر چکے ہیں۔

مارکس آریلیس کے بعد اس کا بیٹا کموڈس تخت نشین ہوا گر تبنیت کے
بجائے بیٹے کا وارث تخت و تاج ہونا سعید نہ ثابت ہوا کیونکہ کموڈس اپنے بدترین
پیشروؤں سے جرائم و معاصی میں کم نہ تھا۔ خود پسند، عیاش اور مطلق العنان ہونے
کے علاوہ اس بادشاہ کو مسلح پہلوانوں کی کشتیوں کا بھی بہت شوق تھا۔ اکھاڑوں
میں پہلوان بنکر اترنا اپنے لئے باعث فخر خیال کرتا تھا۔ ہرکیولز کے لباس میں اس نے
اپنے کئی مجسمات بنوائے تھے اور اس کے سوانح نویس نے لکھا ہے کہ ۷۸۵
کشتیاں لڑا تھا۔ مطلق العنانی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے لئے نئے نئے خطابات
تراشے جن سے اس کے سمجھدار ہمعصر متنفر رہتے تھے۔ امیر جمہوریہ کا خطاب اس
نے ناکافی خیال کیا اور "خداوند اور دیوتا" کا لقب اختیار کیا۔ اس کی خانگی

زندگی شرمناک تھی سینیٹ سے بھی مالی معاملات میں اختلاف ہو گیا اور آخرکار ۱۹۲ء میں سازش کا شکار ہو کر مارا گیا۔ جانشینی کا کوئی مسلمہ قاعدہ نہ ہونے سے پھر سلطنت پر مصیبت آگئی اور نیرو کے انتقال پر جیسی ابتری پھیل گئی تھی پھر وہی حال ہوا یعنی پہلے تو سینیٹ نے ایک شہنشاہ نامزد کیا مگر اس کو افواج پریٹورین نے تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے مال و متاع کے وعدوں پر دوسرے شخص کو نامزد کیا۔ صوبجات کی افواج کو ناگوار ہوا کہ دارالخلافہ کی افواج سیاہ سفید کی مالک ہو جائیں اور بااختیار ہونے سے نفع اٹھائیں اس لئے برطانیہ شام اور دریائے ڈینیوب کے جنوب کے صوبہ میں بغاوت شروع ہو گئی۔ آخرالذکر افواج روما سے قریب ترتھیں اور ان کی حالت بھی بہ نسبت دوسرے کے بہتر تھی لہذا کچھ خفیف جنگ و جدال کے بعد انہوں نے اپنے سپہ سالار سپ ٹی مس سے وی رس کی شہنشاہت کا اعلان کیا (۱۹۳ء) اس بادشاہ کا طرز حکومت اپنے پیشروؤں سے بالکل جداگانہ اور رعایا کے لئے موجب تکلیف تھا۔ افریقہ کا باشندہ ہونے سے امید تھی کہ سے وے رس روما کی روایات برقرار رکھیگا کیونکہ اس صوبہ میں رومی تمدن کا رنگ غالب تھا اور تیسری چوتھی اور پانچویں صدیوں میں کلیسئے مسیحی کے متعدد نامور افراد اسی صوبہ کے باشندے تھے مگر یہ شخص مسیحیت سے ناآشنا تھا اور تمدن رومی کی اسے بالکل پرواہ بھی نہ تھی اور نرا اجڈ سپاہی تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ میرے لئے فوج کو اپنا ہمدرد رکھنا کافی ہے رعایا کی مجھے چنداں پرواہ نہیں۔ گویا اس کے عہد حکومت سے سلطنت پر فوجی رنگ بالکل غالب آگیا اور کبھی رفع نہیں ہوا۔ سے وے رس نے افواج پریٹورین کا خاتمہ کر دیا۔ ملک اٹالیہ کو اس نے خاص حقوق سے محروم کر دیا اور شہر روما کو معمولی فوج کے ایک دستہ کے سپرد کر دیا۔ سپاہیوں کی اس نے تنخواہیں بڑھادیں اور دوسری مراعات بھی ان کے ساتھ ملحوظ رکھیں یعنی ان کو مناکحت اور چھاؤنیوں کے بجائے شہروں میں رہنے کی اجازت دی جس سے بہت سی قباحتیں پیدا ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ سپاہیوں کو اپنی قوت کا اور بھی زیادہ احساس ہو گیا اور ثانیاً ان کو سلطنت کے اس حصہ سے زیادہ انس ہو گیا جس میں وہ بود و باش رکھتے تھے۔ دور دراز مقامات پر تبادلہ کرنے میں زمانہ مابعد کے بادشاہوں کو سخت وقت پیش آنے لگی۔

سے وے رس نے آٹھ سال تک حکومت کی اور اس کے بعد اس کا بیٹا کراکلا شہنشاہ ہوا جو اپنے باپ کی طرز عمل پر کاربند تھا مگر اس میں سختی کا مادہ زیادہ تھا اور قابلیت بہت کم۔ فوجی معاملات میں اسے انہماک تھا مگر اس کے عہد کے اہم ترین واقعہ کو فوج سے کوئی تعلق نہیں یعنی اس نے سلطنت روما کے تمام آزاد باشندوں کو رومی شہریت کے حقوق عطا کئے۔ حقوق شہریت روما کی توسیع نہ صرف شہنشاہیت کے قیام بلکہ زمانہ قبل سے ہوتی آئی تھی یہی آزاد خیالی یعنی مفتوحہ اقوام کو مساوات کے حقوق دینا سلطنت روما کے استحکام کا باعث تھی۔ جولیس سیزر نے گالیوں اور دوسری اقوام کو نہایت فراخدلی سے یہ حقوق عطا کئے تھے اور گو اس کے جانشینوں نے اس کو اسی پیمانہ پر جاری نہ رکھا مگر تاہم اس اثناء میں صوبجات کے کثیر التعداد باشندوں نے یہ حقوق حاصل کر لئے تھے۔ صوبجات اور اطالیہ میں جو امتیاز تھا وہ عرصہ ہوا رفع ہو چکا تھا اور گو یہ ممکن ہے کہ کراکلا کا یہ فعل، روما اور اطالیہ کی تحقیر پر مبنی ہو لیکن شہنشاہیت روما کے بہترین روایات کے منافی نہیں ہے اس انقلاب عظیم میں فوجی اور مالی اغراض بھی مضمر تھیں۔ کیونکہ فوج کی بھرتی میں شہری اور غیر شہری کے امتیاز کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور عطائے حقوق کے عوض میں محصولات کا بار تمام باشندگان سلطنت پر ڈالا جا سکتا تھا۔

تیسری صدی کے بہت کم شہنشاہ طبعی موت سے مرے ہیں اور یہی انجام آخرکار اس بادشاہ کا بھی ہوا اور پھر طوائف الملوکی ہو گئی۔ گر ۲۱۸ء میں شام کی افواج نے ایک عجیب و غریب نوجوان کو تخت روما پر بٹھایا جو ایلاگابالس کے نام سے مشہور ہے۔ اس بادشاہ کی تخت نشینی سے ظاہر ہے کہ افواج شام کو اب وہی مقدرت حاصل تھی جو ایک زمانہ میں افواج ڈینیوب نے حاصل کر کے سے وے رس کو تخت نشین کیا تھا۔ مگر اس شہنشاہ اور اس کے جانشینوں کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی معاملات میں خاص حصہ لیا ہے۔ تخت نشینی سے قبل یہ شہنشاہ مقام امے سا کے سورج کے دیوتا کے پوجاریوں میں تھا جو ایک سیاہ پتھر کا خاص احترام کرتے تھے اور جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ آسمان سے گرا تھا۔ تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتے ہی اس شہنشاہ نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا

کہ اس پتھر کو روما میں منگایا اور وہاں کے بڑے مندر میں اس کی پرستش جاری کردی افسوس ہے کہ رومی اب ایک ایسے شخص کے زیر حکومت ہو گئے تھے جسے ایک سو سال قبل وہ نہایت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے کیونکہ یہ شہنشاہ بالکل مشرقی نمونہ کا بادشاہ تھا اور گلوبند جوشن اور جواہرات زیب بدن کیا کرتا چہرہ پر غازہ ملتا تھا جو روما میں سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ ۲۱۸ء سے ۲۲۲ء تک یہ بادشاہ حکمراں تھا۔ اس عرصہ میں اس کی محلسرا میں عیاشی اور عجیب و غریب مذہبی رسوم کا بازار گرم تھا۔ رومیوں نے تو اپنی بے بسی کے سبب سے اس کی حرکات پر تعرض نہ کیا مگر افواج روما نے اس کے خلاف سر اٹھایا اور اس کو قتل کر ڈالا۔ اس کا عزیز الیگزینڈر سے وے رس اس کا جانشین ہوا جو ۲۳۵ء تک برسر حکومت تھا اور جس کی ذاتی خصائل اور طرز حکومت میں اس کے پیشرو سے زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس بادشاہ پر اس کی والدہ کا بہت اثر تھا جو غالباً مذہب مسیحی کی پیرو تھی اور خود بھی ایماندار اور سادہ مزاج شخص تھا فلسفہ اور ادب میں اسے خاص درک تھا۔ مگر اس کے زمانہ میں سلطنت کے لئے ایک جدید خطرہ پیدا ہوا۔ ایران میں ایک جدید سیاسی انقلاب ہوا جس سے خاندان ساسانی کی حکومت شروع ہوئی۔ ساسانیوں میں قومیت کی روح تھی اور وہ ایران کے قدیم مذہب کے پابند تھے۔ اس جدید سلطنت کے قائم ہوتے ہی رومیوں سے جنگ چھڑ گئی اور اس سلطنت کے ساتھ کئی معرکے ہوئے جن میں سے کوئی فیصلہ کن نہیں تھا مگر روما کے لئے ایران کی طرف سے ہمیشہ کے لئے ایک خطرہ پیدا ہو گیا۔

اس بادشاہ کی معرکہ آرائیاں تو اب فراموش ہو گئیں مگر اس کی زندگی کا ایک واقعہ زیادہ مشہور ہے۔ اس کا سوانح نویس تذکرہ کرتا ہے کہ بالاتان پہاڑی پر اس نے اپنے خانگی مندر میں کئی مشاہیر عالم کے مجسمات جمع کئے تھے جن کی وہ پرستش کرتا تھا مندر کے بیرونی حصہ میں ورجل (رومی شاعر) سسرو (رومی مقرر) اور ایکلیس (یونانی سورما) کے بت تھے اور اندرونی مندر میں اپولونیس، آرفیس، حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ کے مجسمات تھے۔ آخر الذکر چار ناموں میں وہ مذہبی رجحانات مضمر تھے جن کا اس زمانہ میں زور تھا یعنی فلسفۂ فیثاغورثی، تصوف، یہودیت اور مسیحیت روشن خیال شہنشاہ کا خیال تھا کہ
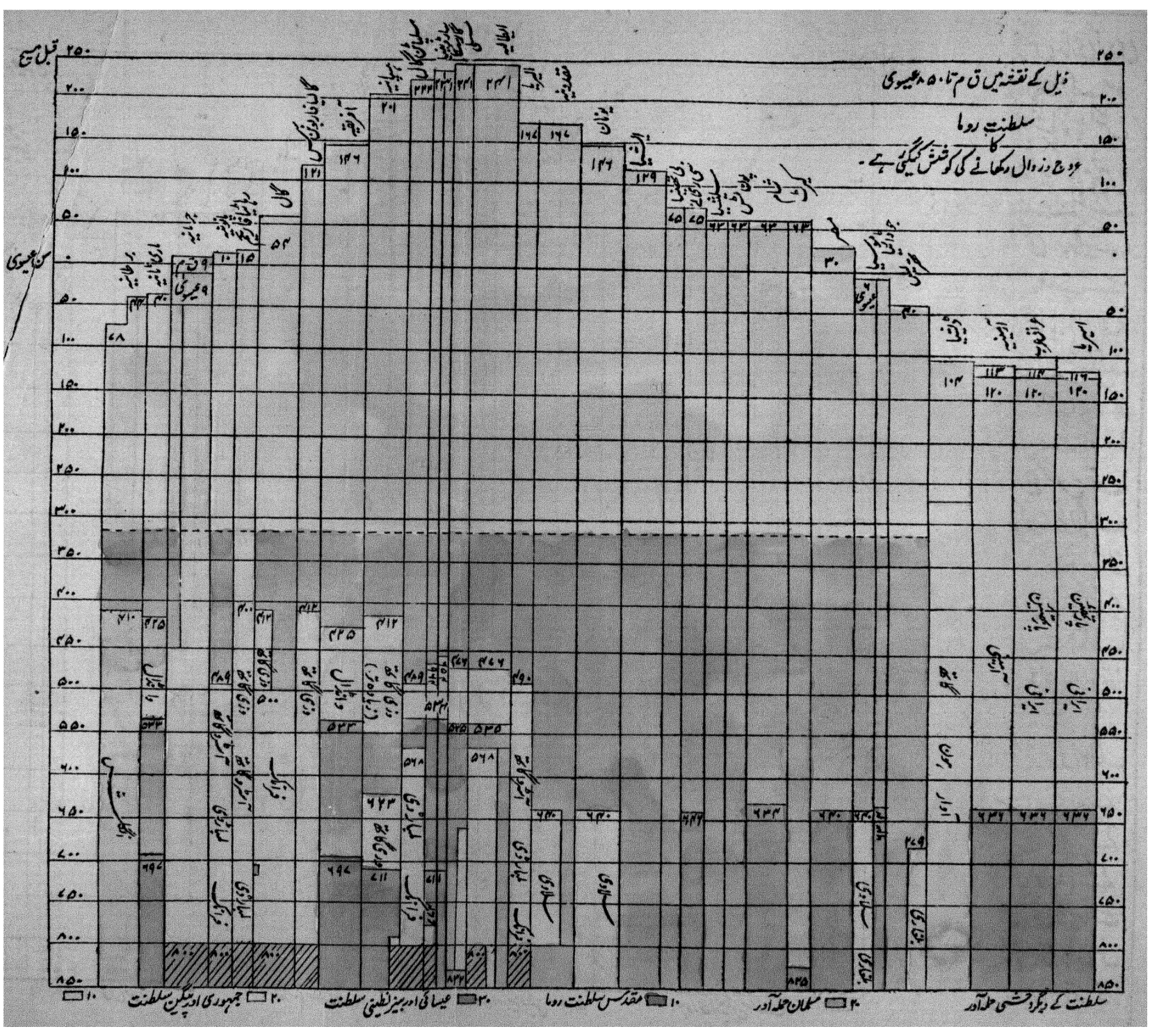
جملہ بزرگان دین کی پرستش ایک ساتھ ممکن ہے مگر کم از کم اس زمانہ میں مذہبی رواداری کا احساس پیدا نہیں ہوا تھا اور ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے بزرگان دین کا احترام نہیں کرتے تھے اور آئندہ صدی میں وہ مذہبی جد و جہد پیدا ہوئی جس میں آخرکار دین مسیحی کو فتح ہوئی۔ عہد سلطنت کے آخری سال میں افواج مقیم رائن میں بغاوت پیدا ہو گئی جس کو فرو کرنا اس نوجوان اور امن پسند شہنشاہ کے لئے ممکن نہ تھا اور وہیں کسی جنگ میں مارا گیا (۲۳۵ء)۔

باب نوزدہم

شہنشاہان انٹونائن کے عہد حکومت میں سلطنت روما کی تمدنی حالت

شہنشاہان انٹونائن کے پرشوکت اور پرامن زمانے سے آگے بڑھنے سے قبل اس عہد کی تمدنی حالت کے نمایاں پہلوؤں پر نظر ڈالنی مناسب ہوگی۔ بعض امور میں اس عہد کا تمدن یورپ کی بیسویں صدی کی تہذیب سے مشابہت رکھتا ہے اور آج کل کے یورپین لوگوں کے خیالات، عادات، مذاق اور طریقہ ہائے تفریح کو بہ نسبت ازمنۂ وسطیٰ کے دوسری صدی کے تعلیم یافتہ رومیوں کے مذاق سے زیادہ مناسبت ہے۔ تاہم تاریخ عالم کے کوئی دو دور بالکل مشابہ نہیں ہیں اور عہد مذکور کے تمدن میں بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو ہمیں عجیب یا قابل نفرت معلوم ہونگی۔

شہنشاہیت کے قیام سے امرائے روما کے طرز زندگی میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا تھا۔ دولت اب بھی ان کے قبضہ میں تھی نظم و نسق سلطنت روما میں ان کا بڑا حصہ تھا مگر ان کی آزادی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ افواج کی سپہ سالاری اور صوبجات کی صوبہ داری اب بھی ان کے دسترس میں تھی مگر دونوں حیثیتوں میں وہ شہنشاہ کے ملازم تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو غرور اور خود پسندی سے ملازمت شہنشاہی کسر شان خیال کرتے تھے اور شہر روما اور اس کے اطراف میں عالیشان محلوں میں عیش و عشرت کے ساتھ رہتے تھے۔ اس زمانہ کے شعراء نے ان بے شغل امرا کا خوب مذاق اڑایا ہے اور خصوصاً جووی نل اور ٹےسی ٹس نے ان کی خود نمائی عیاشی، بے رحمی، پرخوری اور بدکاریوں کا نہایت وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ان کے علاوہ روما میں ساہوکاروں کا بھی شہنشاہیت کے زوال کے قبل ڈیڑھ سو سال تک بہت زور رہا ہے۔ طلا جاگیا یہ طبقہ نائٹ یا ایکوائٹ کے نام سے موسوم تھا اور زمانۂ حال کے تجارتی رواج کے مطابق ان کی کمپنیاں ہوتی تھیں جو محصولات جمع کرنے کا ٹھیکہ لیتیں قرضہ دیتیں اور صنعت و حرفت کی سرپرستی کرتی تھیں جمہوریت کے آخری زمانہ میں ساہوکاروں کا زور بہت بڑھ گیا تھا کیونکہ سلطنت خود انکی سرپرست تھی اور باشندگان صوبجات کو ان کے ظلم و تعدی اور سخت گیری کے ساتھ کڑا سود وصول کرنے میں کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔ شہنشاہیت کے قیام سے امرا کی طرح ساہوکار پر بھی دار و گیر ہونے لگی اور کسی پر ظلم کرنے کی مجال نہ رہی مگر اس طبقہ کے دوسرے کاروبار جاری تھے جن سے سلطنت کے دارالخلافہ میں دولت کھنچی چلی آتی تھی۔

بلدہ ہائے سلطنت روما میں شہر روما ممتاز تھا۔ دوسرے شہر بھی تھے مثلاً ایتھنز، انطاکیہ، سکندریہ، لائنس اور قرطاجنہ مگر تمام سلطنت کا مرکز روما ہی تھا اور اس لئے بغیر اس شہر کی کوچہ گردی کے کسی حوصلہ مند شخص کے لئے ممکن نہ تھا کہ کسی قسم کا سیاسی اقتدار حاصل کرے۔ شہر روما ہر چیز کا مرکز تھا فنون لطیفہ کا، ادبیات کا، مذہب کا، اور عیاشی کا۔

دوسری صدی عیسوی میں فنون تعمیر و بت تراشی اوج کمال پر پہنچ گئے تھے۔ اصل سے بالکل مشابہ صوری مجسمات کے بنانے میں رومیوں نے یونانیوں کو بھی مات کر دیا۔ شہنشاہ ہیڈرین کو فنون لطیفہ میں خاص مہارت تھی اور خوبصورت اشیاء کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ اس کا مذاق سلیم اس کے محل کے آثار سے ظاہر ہے۔ مگر روما میں کبھی فنون لطیفہ کے متعلق صحیح مذاق پیدا نہیں ہوا جیسا کہ ایتھنز میں پیریکلس کے زمانہ میں تھا۔ رومی اپنی بدمذاقی کے سبب سے حسن و خوش اسلوبی کے بجائے نمائش اور طمطراق کے زیادہ دلدادہ تھے اور فنون لطیفہ کو دلبستگی کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ اس لئے روما میں نہ فنون لطیفہ کو کوئی خاص ترقی نصیب ہوئی نہ فن ڈراما نویسی میں۔ روما کے تھیٹروں میں معمولی تماشے ہوا کرتے تھے۔ ناچ گانے اور کشتیوں کا زیادہ رواج تھا اور تھیٹر کو قوم کی دماغی ترقی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تفریح طبع کے لئے

رومیوں کو رتھوں کی دوڑ اور پہلوانوں کی کشتیاں خصوصاً مرغوب تھیں۔ رتھوں کی دوڑ ایک چھوٹے سے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ہوتی تھی اور بادجود رتھبانوں کی ہوشیاری کے یہ دوڑیں خطرناک ہوتی تھیں۔ تماشہ دیکھنے والے کسی نہ کسی رتھبان کے پرجوش طرفدار ہوتے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں اس کا رواج بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ مشہور مصنف پلینی نے حقارت کے ساتھ ان کھیلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "تعجب ہے کہ ہزاروں آدمی بچوں کی طرح گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے اور رتھبانوں کو اپنی رتھوں پر جھکے ہوئے دیکھتے ہیں" مگر اس کھیل کی ہر دلعزیزی میں صدیوں تک کمی نہیں آئی اور قسطنطنیہ میں تو چھٹی صدی میں اور بھی زور پر ہو گیا۔

مگر رتھوں کی دوڑ سے مسلح پہلوانوں کی کشتیاں رومیوں کو کہیں زیادہ مرغوب تھیں۔ اس کھیل کے لئے روما میں ایک عظیم الشان عمارت بنی ہوئی تھی جسے کالیسیم کہتے تھے اور جس میں پچاس ہزار تماشائی بآسانی آسکتے تھے۔ اس قسم کے بڑے بڑے تھیٹر سلطنت کے دوسرے شہروں میں بھی بنے ہوئے تھے۔ یہ عمارات مختلف کھیلوں کے لیے استعمال میں آتی تھیں۔ روایت کیجاتی ہے کہ جب شہنشاہ ٹائٹس نے اس عمارت کا افتتاح کیا تو ۵۰۰۰ جنگلی جانوروں کا خون ہوا تھا۔ مگر صرف جانوروں کی خونریزی پر قناعت نہیں کیجاتی تھی بلکہ انسانوں کا خون بہانا بھی رومیوں میں جائز تھا۔ پہلوان ہندوستان کی طرح نہتے نہیں لڑتے تھے بلکہ ان کے ہاتھوں میں خنجر یا دوسرے ہتھیار ہوتے تھے۔ کبھی صرف دو پہلوان لڑتے اور کبھی کئی کئی ایک طرف ہوتے اور ایک ایک مقابلہ میں کئی آدمی جان سے جاتے۔ رومیوں کے تہواروں میں جتنے انسانوں کا خون ہوتا ان کی تعداد بیشمار ہے اور تعجب تو یہ ہے کہ ہر طبقہ کے مرد اور عورت مزے سے اس خونریزی کو دیکھتے اور شاذونادر اخلاق یا انسانیت کی بنا پر ان کھیلوں کی کوئی مخالفت کرتا۔ صرف چند عالی خیال لوگوں کو یہ انسانی قربانیاں ناپسند تھیں۔ سسرو نے ہاتھیوں کے مارے جانے پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ ٹائی بے ریس نے روما میں ان کھیلوں کو بند کر دیا تھا مگر کس سبب سے یہ معلوم نہیں۔ مارکس آریلیس نے حکم دیدیا تھا کہ پہلوان کند ہتھیاروں سے لڑیں مگر اس سے رومیوں میں بددلی پھیل گئی۔ دین مسیحی

کے پیرووں کے سوا ان کھیلوں پر کوئی معترض نہ تھا اور مسیحیوں کیلئے ان کھیلوں کا دیکھنا جائز نہ تھا۔ اغسطینوس نے جو کلیسیہ مسیحی کے اکابرین میں سے گزرا ہے ایک نوجوان کا واقعہ بیان کیا ہے کہ اس کو چند لوگ پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کے لئے زبردستی کھینچ لے گئے۔ کچھ دیر تک تو وہ زمین پر اپنی نگاہیں جمائے رہا مگر جب ایک پہلوان زخمی ہوکر زمین پر گر گیا تو تمام تماشائیوں نے نعرۂ خوشی لگایا جس سے اس کی نگاہیں بھی زمین سے اٹھ گئیں اور خون دیکھتے ہی اس کے مزاج میں خونخواری کا اثر ہو گیا۔ اس نے اپنی نگاہیں پھیرنے کی کوشش نہ کی بلکہ ٹکٹکی باندھ کر خونریزی دیکھتا رہا اور اس خونی کھیل کے لطف سے سرشار ہو گیا، مگر اس مدت میں عیسائیت کا زور ہو گیا اور ایک راہب ان کھیلوں کے روکنے کی کوشش میں مارا گیا جس سے اکثر لوگوں کو اس سے نفرت پیدا ہو گئی اور پانچویں صدی کے ابتدائی حصے کے بعد اس کا ذکر سننے میں نہیں آتا۔ مگر جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں یعنی دوسری صدی عیسوی میں مذہب مسیحی نے اس قدر زور نہیں پکڑا تھا اور کوئی اخلاقی موانع نہ تھے اس لئے رومی لطف کے ساتھ یہ خونخوار کھیل دیکھتے تھے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یونانیوں کے کھیلوں میں انکی تہذیب و تمدن کا روشن پہلو ظاہر ہے مگر جن رومی کھیلوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان کے سبب سے رومی تمدن پر ایک سخت دھبہ ہے جو کسی طرح دھل نہیں سکتا۔

اس عہد میں رومیوں کی اعلیٰ تعلیم پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تعلیم کا لب لباب صرف فن بلاغت میں کمال پیدا کرنا خیال کیا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں فصاحت و بلاغت کا حصول مفید ہو سکتا تھا کیونکہ جمہوریت ایتھنز کی طرح روما میں بھی عدالتوں اور سیاسی مجلسوں میں جو شخص پر اثر تقریر کر سکتا تھا اس کے لئے ترقی کا زینہ کھلا ہوا تھا۔ فن بلاغت کا رواج یونان سے روما میں آیا اور کیٹو نے اس کی سخت مخالفت کی مگر اس کا رواج بڑھتا گیا یہاں تک کہ سسرو کے زمانے میں فن تقریر میں کمال پیدا کرنا ہر رومی نوجوان کے لئے فرض ہو گیا۔ جولیس سیزر بھی بلاغت کے مدرسین کے درسوں میں شریک رہا تھا۔ روما میں سسرو نے فن تقریر کو معراج کمال پر پہنچایا جو تقریریں اس نے عدالتوں سینیٹ اور دیگر مجالس میں کی تھیں ان کا رومی

سیاسیات پر زبردست اثر تھا۔
مگر شہنشاہی کے قیام سے خطابت سے کام لینے کے مواقع بہت کم رہ گئے تھے۔ کمیشیا یا مجالس عوام کی ہستی باقی نہ رہی تھی اور عہدہ داران سرکاری مجمع عام میں کسی کا تقریر کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ سینیٹ کی آزادی باقی نہ رہی تھی جس کے ساتھ ہی آزادی تقریر کا موقع بھی جاتا رہا تھا، عدالتوں میں بھی فضول لفاظی اور لسانی کو ناپسند کیا جاتا تھا اور نفس معاملہ سے وکلاء کو ہٹنے نہ دیتے تھے۔ یہ کسی وکیل کے لیے ممکن نہ تھا کہ کسی مقدمے کی سماعت کے دوران میں سیاسی معاملات پر رائے زنی کرے۔ ملازمت سرکاری میں ترقی کے لیے صرف شہنشاہ کی مہربانی اور معاملہ فہمی کی ضرورت تھی جس سے فن تقریر کا اثر بالکل جاتا رہا۔ سیاسی اور قانونی اغراض کے لئے تو اب خوش تقریری کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر کمال یا ہنر کے طور پر اس کا عالمگیر رواج ہو گیا تھا۔ فن بلاغت کے استادوں کو روما میں خاص رسوخ حاصل تھا اور ان کے شاگرد ان کے ساتھ محبت اور ادب سے پیش آتے تھے۔ ان استادوں میں کوئیلین (۴۰ - ۱۱۵ء) کا نام بہت مشہور ہے کیونکہ اس کا مطالعہ نہایت وسیع تھا، مختلف علوم میں درک تھا، ادبیات میں خاص مہارت تھی اور فن تعلیم میں بھی ید طولےٰ رکھتا تھا۔ مقرر کی اس نے یہ تعریف کی ہے کہ بہترین مقرر وہ شخص ہے جو طباع ہونے کے علاوہ نیک بھی ہو مگر وہ بھی فن بلاغت کی مشق کو تعلیم کا بہترین ذریعہ خیال کرتا ہے۔ پانچ صدیوں تک یعنی ۱۰۰ق م سے ۴۰۰ء تک روما کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا یہی مشغلہ تھا کہ تاریخی یا فرضی مضامین پر جو ان کے استاد مقرر کریں تقریر کیا کریں۔ آگسٹس کے زمانے کی ایک بلاغت کی کتاب میں حسب ذیل مضامین پر تقریریں ہیں (۱) تین سو اسپارٹی غور کرتے ہیں کہ تھرموپائیلی میں انھیں دوسرے یونانیوں کے ساتھ بھاگ جانا چاہیے یا نہیں (۲) ہوزرکسیز دھمکی دیتا ہے کہ اگر اہل ایتھنز وہ نشانات فتح واپس نہ کر دینگے جو انھوں نے اس کی فوج سے چھینے تھے تو وہ پھر یونان پر حملہ کر دیگا۔" طلبا کو سکھایا جاتا تھا کہ اثبات اور نفی دونوں پہلوؤں پر تقریر کریں۔ مگر مضامین ذیل ان سے بھی زیادہ لغو ہیں، (۳) ایک شخص کی بیوی اور تین بچے جہاز کے ڈوبنے سے مر گئے اور اس کا مکان جل گیا۔ اس نے تنگ آ کر

پھانسی لگائی۔ ایک راہگیر نے پھانسی کی رسی کاٹ دی۔ اس حرمان نصیب نے ہرجے کا دعویٰ کیا (۴) ایک شخص کے تین بچے ضائع ہوگئے وہ ان کی قبر پر بیٹھا ہوا رو رہا تھا۔ ایک عیاش آدمی آیا اور اس کو قبر سے کھینچ لے گیا اس کا لباس بدلا بال درست کرائے اور دعوت میں شریک کیا۔ وہاں سے جب اسے گلو خلاصی ہوئی تو اس نے حملہ جابرانہ کا دعویٰ کر دیا۔

کسی خاص دور تاریخ کے متعلق اس امر کا اندازہ کرنا کہ قوم کا رجحان ترقی کی طرف تھا یا رو بہ انحطاط اس عہد کے طریقۂ تعلیم سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جن فنون کی تحصیل کا سلطنت روما میں اس زمانے میں رواج تھا ان سے نہ تو خصائل و طبائع پر کوئی پسندیدہ اثر پڑ سکتا تھا نہ تو لئے عقلی کی تربیت کے لئے ہی کسی مفید صورت کا امکان تھا مزید براں رومیوں کو جو مشکلات اس زمانے میں درپیش تھے ان کی عقدہ کشائی بھی ان علوم و فنون سے دشوار تھی فصاحت و بلاغت کی تحصیل سے چونکہ اس زمانے کے سیاسی اور تمدنی معاملات پر کوئی اثر نہ تھا اس لئے سلطنت بھی فنون مذکور کی اشاعت میں حارج نہ ہوئی۔ مگر اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ حقیقی علم بالکل معدوم ہو گیا تھا۔ سکندریہ کا مدرسۂ طبابت حکیم جالینوس کے فیض سے خوب رونق پر تھا اور قانون روما کی تدوین و ترتیب جاری تھی۔

اس عہد کے متعلق ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس سے ممکن ہے کہ قیاس کیا جائے کہ ہم اس عہد کے تمدن کو پسندیدہ خیال نہیں کرتے۔ مگر باوجود ان عیوب کے اس عہد کے تمدن کے بعض روشن پہلو بھی تھے جو پلاٹارک کی تصانیف اور پلینی کے خطوط کے مطالعہ سے عیاں ہونگے۔ پلوٹارک یونانی النسل تھا اور سنہ ۸۰ء کے قریب روما میں مصروف درس و تدریس تھا۔ اس کے سوانح کا شمار دنیا کی بہترین تصانیف میں ہے جس سے زمانہ مابعد کی نسلوں کو بے انتہا اخلاقی نفع پہنچا ہے۔ کیونکہ علاوہ دلچسپی اور ادبی خصوصیات کے اس نے اپنے ناظرین کے دلوں میں انسانیت شجاعت اور خداپرستی کے پاک جذبات برانگیختہ کرنے کی کوشش کی ہے پلینی کے خطوط سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے

مرد اور عورتوں میں نیکی اور مروت کی کمی نہ تھی۔ قدرتی مناظر کی دلفریبیوں میں ایسے خاص انہماک تھا۔ اور فنون لطیفہ اور علم ادب سے بھی ایک خاص لگاؤ تھا۔ روماکی جو تصویر اس نے اپنے خطوں میں کھینچی ہے اس سے ظاہر ہے کہ سلطنت روما کے باشندے نہ بالکل عیاشی میں مبتلا تھے اور نہ بالکل ازکار رفتہ ہو گئے تھے کیونکہ انھوں نے پلوٹارک کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا فلسفۂ رواقی کی حد درجہ قدر کی اور مذہب مسیحی کو ان میں فروغ حاصل ہوا۔

دوسری صدی عیسوی کے تمدنی حالات کا ہم نے جو ذکر کیا ہے ان کا تعلق زیادہ شہر روما سے ہے۔ اطالیہ اور دیگر صوبجات سلطنت کے متعلق بہت کم حالات معلوم ہیں کیونکہ اہل قلم اور اہل سیف دونوں کا مرکز شہر روما تھا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ جو حال روما کا تھا وہی قریب قریب اطالیہ کا بھی تھا۔ اطالیہ کے شہروں کو حکومت خود اختیاری حاصل تھی شہر پامپی کے کھنڈروں کے کھودنے سے ان شہروں کی تمدنی زندگی کی تفصیلی حالت بہت کچھ معلوم ہو چکی ہے شہر پامپی کے قریب ایک کوہ آتش فشاں ہے جسے ویسو ویس کہتے ہیں اور جس کی آتش فشانی سے یہ شہر ۷۹ء میں تباہ و برباد ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی تک یہ شہر راکھ اور مٹی کے تودوں کے نیچے دبا رہا اور اب بھی اسکے بعض حصے زیر زمین ہیں مگر موجودہ اکتشافات سے بہت کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں اور ظاہر ہوتا ہے کہ اطالیہ کے شہر عیش و عشرت کے مرکز تھے نہ کہ تجارت کے کشتی کے اکھاڑے بھی موجود ہیں۔ مندر نئے بھی ہیں اور پرانے بھی۔ نیا مندر مصری دیوی اسس کا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس دیوی کی عبادت شروع ہو چکی تھی۔ دیواروں پر جو تصاویر کندہ ہیں ان سے ظاہر ہے کہ فن تصویر کشی کو اس زمانے میں فروغ تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تباہی شہر کے وقت وہاں مجلس بلدی کے اراکین کا انتخاب قریب تھا کیونکہ دیواروں پر ایسی تحریرات موجود ہیں جن میں مختلف امیدواران انتخاب کے لئے رائے دینے کی درخواست کی گئی ہے۔

سلطنت روما کا عزم بالجزم تھا کہ حکومت بلدی کو تمام اقطاع سلطنت میں رواج دیا جائے۔ مشرق میں تو بلدیات کا وجود رومیوں کے ورود سے قبل ہی تھا۔ مگر ممالک غرب میں رومیوں کے زیر اثر متعدد شہر وجود میں آ گئے جن کی حکومت بلدی کا نظام

وہی تھا جو جولیس سیزر نے اپنے قانون بلدیات میں قائم کیا تھا۔ صوبجات افریقہ غالیہ ہسپانیہ میں ان شہروں کو خوب فروغ ہوا۔ برطانیہ میں ان کی تعداد ذرا کم تھی۔ مگر ان شہروں کو پوری آزادی حاصل نہ تھی۔ شہر میں با اختیار جماعت مجلس بلدی تھی اور جن خاندانوں سے اس مجلس کے ارکین منتخب ہوتے تھے ان کا شمار اس نواح کے شرفا میں تھا۔

عوام کے حالات تمام اقطاع سلطنت میں روبہ اصلاح تھے اور ترقی کر رہے تھے۔ غلاموں کے حالات باوجود تفحص معلوم نہیں مگر ان کی تکلیفیں بھی رفع ہو رہی تھیں اور ان کی حفاظت کے لئے قانون نافذ ہو رہے تھے۔ فلسفہ اور مذہب کی تعلیم یہ تھی کہ ان کے ساتھ نرمی اور انسانیت کا سلوک کیا جائے۔ شہنشاہوں کی پرستش قائم رکھنے کی خدمت غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں کے سپرد تھی اور اکثر بلکہ تمام شہروں میں طبقہ وسطےٰ میں ایک جماعت تھی جسے اگسٹیل کہتے تھے جس کا فرض یہ تھا کہ سیزروں کی پرستش جاری رکھے۔ مگر سلطنت روما کی بلدیات کی آزادی کا دور ختم ہو رہا تھا اور وہ زمانہ قریب تھا کہ مالی مشکلات کے بہانہ سے اس کی آزادی چھین لی جائے۔ مگر مالی مشکلات کا صرف بہانہ ہی بہانہ تھا اور شہنشاہی انتظام سے شہروں کی حالت اور بھی خراب ہو گئی اگر یہی اصول زمانہ حال میں برتا جائے اور ذرا سی مالی بدانتظامی کے شبہ پر کسی شہر کی آزادی سلب کر لی جائے تو آج نہ صرف یورپ بلکہ انگلستان میں بہت کم آزاد شہر باقی رہ جائیں۔

صوبجات کے تفصیلی حالات بہت کم معلوم ہیں جس سے ان کے متعلق رائے زنی کرنا دشوار ہے۔ بعض مقامات میں رعایا سخت تباہی کی حالت میں تھی۔ یونان کی آزادی تو خصوصاً گھٹتی جاتی تھی اور افلاس میں مبتلا تھی مگر دوسرے مقامات میں دو سو سال کی مسلسل امن و امان سے وہاں باشندے خوشحال اور فارغ البال تھے۔ صوبۂ افریقہ کے ویران کھنڈروں سے ظاہر ہے کہ صحرا کے وسط میں بھی سرسبز و شاداب مقامات تھے اور گزشتہ ہزار سالوں میں ان کی حالت ابتر ہو گئی ہے۔

صوبجات کی سرسبزی کا قیام خود شہنشاہوں کی ذاتی اغراض کی وجہ سے ضروری تھا اور اس لئے وہ ہر طرح سے کوشش کرتے تھے کہ ان کی پوری حفاظت کریں اس غرض سے انھوں نے طول طویل فصیلیں بنوائی تھیں۔ برطانیہ

میں ایک فصیل دریائے ٹائن سے خلیج سالوے تک بھی اور جرمنی میں دریائے رائن سے دریائے ڈینیوب تک۔ اہل فوج کو بھی اختیار نہ تھا کہ باشندگان صوبجات پر ظلم و تشدد کریں گو نیرو کے قتل کے بعد ایک حد تک ابتری پھیل گئی تھی پلینی جس کے خطوط کا ہم نے ذکر کیا ہے ایک گمنام صوبہ کا صوبہ دار تھا۔ شہنشاہ وقت (ٹریجن) سے اس کا سلسلۂ خط و کتابت جاری تھا۔ حسن اتفاق سے یہ خطوط دست برد زمانہ سے اب تک محفوظ ہیں۔ ان کے ہر صفحے سے صوبہ دار کی ایمانداری اور شہنشاہ کی توجہ کا اظہار ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی شہنشاہ یا اس کے معتمدین سے استمزاج کیا جاتا ہے اور شہنشاہ ان امور کے متعلق بہ نفس نفیس ہدایات دیا کرتا تھا۔ مثلاً حمام کی تعمیر، تالابوں کی مرمت، آگ بجھانے کا انتظام، ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی شہنشاہ سے استمزاج کیا جاتا تھا۔ پلینی نے منجملہ دیگر امور شہنشاہ سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ مسیحیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ شہنشاہ کا جواب انسانیت اور منصف مزاجی سے مملو ہے۔ اس نے جواب دیا کہ مسیحیوں کی تلاش کی ضرورت نہیں نہ گمنام مخبروں کی اطلاعوں پر عمل کیا جائے۔ اگر وہ اپنے عقائد سے توبہ کریں انھیں معاف کر دیا جائے۔ مگر حکومت کا ذرا ذرا سے معاملات میں دخل دینا خرابی سے خالی نہیں۔ گو اس مداخلت کا سبب یہ تھا کہ شہنشاہ دقیق جزوی معاملات کی طرف توجہ کرنا بھی اپنے فرائض میں داخل خیال کرتے تھے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا میں کسی قسم کا احساس باقی نہ رہا۔ افسوس کہ شہنشاہوں کو مطلق یہ احساس نہ تھا کہ عمدہ حکومت کے لیے آزادی بھی ایک لازمی شے ہے۔

روما کے تمدنی حالات کے متعدد پہلو ابھی تک تاریکی میں چھپے ہوئے ہیں بالخصوص زراعت پیشہ لوگوں کے حالات اور نوعیت قبضۂ زمین کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ مختلف اقطاع سلطنت کے حالات میں وسیع اختلاف تھا۔ اطالیہ کے زراعت پیشہ لوگوں کی حالت اچھی نہ تھی اور ان کی آبادی گھٹتی جاتی تھی۔ شہنشاہان انٹونائن نے ان کی اصلاح میں سعی بلیغ کی تھی۔ جائدادیں امیروں کے ہاتھوں میں آتی جاتی تھیں۔ غلام آزادی حاصل کر رہے تھے مگر

آزاد کاشتکار معاشی وجوہ سے مالکان جائداد کے غلام بن رہے تھے۔ عہد مذکور میں یہ حالت نہ تھی مگر آزاد کاشتکار اپنا حق مالکانہ کھو رہے تھے اور بڑے بڑے زمینداروں کے اسامی بن گئے تھے۔ نقد یا جنس میں ان کو لگان دیا کرتے اور یوں بھی ان کے دباؤ میں تھے۔ ایسے اسامیوں کو کالونائی کہتے تھے۔ قبضۂ زمین کی نوعیت وہی شکل اختیار کر رہی تھی جس کو زمانۂ مابعد میں فیوڈلزم (جاگیریت) سے تعبیر کرنے لگے۔

انقلاب و احیاء

الیگزنڈر سیورس کی موت کے بعد تمام سلطنت روما میں ابتری پھیل گئی اس لیے اس کے اہم مضامین پر تبصرہ کرنا ضروری ہے گو ان میں سے بعض نصف صدی کے بعد وجود میں آئے۔ پہلی چیز جو ہمارے پیش نظر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وسطی حکومت بالکل کالعدم ہو گئی تھی۔ حکام روما کا نہ افواج پر اقتدار باقی تھا نہ وہ سرحدات کی محافظت کر سکتے تھے اور نہ سلطنت کا معمولی انتظام، اس کے مختلف ممالک میں عملاً خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس کا ثبوت یہ کہ یہ عہد "تیس جابر حکام کا زمانہ" کہا جاتا ہے۔ یہ فقرہ مبالغہ سے خالی نہیں ہے کیونکہ وقت واحد میں اس قدر سلطنتیں موجود نہ تھیں مگر اس میں شک نہیں کہ متعدد سلطنتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ وسطی حکومت کی کمزوری سے وحشی اقوام نے سرحدوں پر یورش شروع کر دی اور ایسے ایسے صوبوں میں فتنۂ غارتگری برپا کیا جو صدیوں سے دشمن کے حملوں سے محفوظ تھے۔ ان وحشیوں اور ان کی مختلف اقوام کا ذکر بعد میں ہوگا۔ افواج روما بالکل سرکش ہو گئی تھیں اور انھیں اپنی طاقت کا احساس ہو گیا تھا۔ شہنشاہوں کا بنانا اور بگاڑنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان کی کارگزاری میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور وحشیوں سے جب کبھی مقابلہ ہوا فتح انھیں کے ہاتھ رہی، مگر اب انھیں نہ تو حکام روما کے احکام کی پروا تھی نہ سلطنت کے مفاد کی۔ حقیقت یہ تھی کہ اب انھیں کسی قسم کی روک تھام ناگوار تھی۔ افسر خود سپاہیوں کے دست نگر

ہو گئے تھے اور رعایا ان سے نالاں تھی۔ اس کے ساتھ ہی سلطنت کی مالی حالت نہایت خراب ہو رہی تھی۔ بدامنی سے تجارت کا بازار سرد پڑ گیا تھا فوجی اغراض کے لئے توفیر آمدنی کی ضرورت تھی جس کے لئے رعایا پر نئے نئے محصول لگائے جا رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت بالکل بند ہو گئی اور سلطنت کی مجموعی دولت معدوم ہو گئی۔ حکومت نے توفیر آمدنی کے لئے حکام اور محصول جمع کرنے والوں کی تعداد میں بیحد اضافہ کر دیا اور ہیڈرین نے جو نظام حکومت قائم کیا تھا اس نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ رعایا اس کے بوجھ سے دبنے لگی۔ ایک امر خصوصاً قابل لحاظ ہے یعنی شہنشاہیت کے ابتدائی زمانہ میں شہروں کی قوت اور سرگرمی سے اسے بہت کچھ تقویت تھی شہنشاہان انٹونائن کے زمانہ میں انکی آزادی پر کچھ قیود عائد کر دی گئیں تھیں مگر تیسری صدی سے بلدیات کی آزادی روز بروز گھٹنے لگی۔ پہلے تو یہ ہوا کہ بلدیات کے منتخب شدہ حکام شہنشاہی عہدہ داروں کے ماتحت کر دیئے گئے۔ اس کے بعد بلدیات سے ان عہدہ داروں کے انتخاب کا حق سلب کر لیا گیا اور ان کا تقرر راست شہنشاہ کی طرف سے ہونے لگا اور مجالس بلدی میں بجائے منتخب شدہ اراکین کے آس پاس کے زمینداروں کا عنصر غالب ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہ ہو گیا کہ تمام شہروں کے حکام اور مجالس بلدی ٹیکس جمع کرنے اور ان کے ادا کرنے ذمہ دار کر دیئے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس بلدی کی رکنیت جسے ہر شخص باعث اعزاز خیال کرتا تھا اس سے اب لوگ خائف ہونے لگے اور حکومت کی دھمکیوں سے جبراً وقہراً اس عزت کو قبول کرتے تھے۔ سلطنت کے آخری زمانے میں ان حکام بلدی کے منصب اور فرائض کے متعلق متعدد قوانین نافذ ہوئے ہے۔ بلدیات کی آزادی، نظام حکومت اور تجارت کی تباہی سلطنت روما کی بربادی کے اہم اسباب میں سے ہے۔ ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے گو زیادہ اہم نہیں مگر اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زوال کے اسباب پیدا ہو چلے تھے۔ رومی تمدن کے ظاہری محاسن معدوم ہو رہے تھے۔ علم کا چرچا گھٹ رہا تھا۔ کتبوں پر جو تحریریں ہیں نہ وہ عالی ہیں نہ ان کا طرز تحریر پسندیدہ ہے۔ سکوں کی وہی حالت ہے۔ فن بت تراشی بھی گئی گذری حالت میں ہے مثلاً شہنشاہ کانسٹنٹائن کی فتح کی کمان کو ہیڈرین کے زمانے کی دستکاری سے کوئی نسبت نہیں۔ فن تعمیر میں رومیوں کو یدطولیٰ حاصل تھا مگر یہ ہنر بھی انھوں نے کھو دیا تھا۔ سلطنت نہ صرف افلاس میں مبتلا تھی بلکہ خوف تھا کہ وحشیوں کے حملوں سے قبل خود رومی وحشی ہو جائینگے۔ اس کے علاوہ ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے مذہب اور مذہبی مباحثوں کا

چرچا بہت بڑھ گیا تھا۔ قدیم طریقے کی بت پرستی کا رواج مٹ رہا تھا مگر مندر ابھی باقی تھے اور بتوں کی پرستش کچھ کچھ جاری تھی۔ تصوف کا اس پر رنگ چڑھ رہا تھا اور اس کے پیرو کی کوشش تھی کہ اپنے عقائد اور نظام مذہبی میں یگانگی قائم کریں۔ فلسفۂ رواقی کا زور بالکل گھٹ گیا تھا کیونکہ اس عہد کی تصنیفات میں عقلیت کی بالکل جھلک نہیں ان امور سے قیاس کیا جا سکتا تھا کہ کوئی ایسا جدید مذہب قائم ہوگا جس میں رہبانیت اور مافوق العادت عقائد کے عناصر غالب ہونگے۔

وحشیوں کے حملوں کا زمانہ اب شروع ہوتا ہے۔ جن قوموں کو روما کے جبروت وسطوت سے کبھی اس کی سرحدوں کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھنے کی جرات نہ ہوتی تھی انھیں اب اس کے حدود میں لوٹ اور غارت گری کرنے کی جسارت ہوگئی گو ابھی تک انھوں نے سلطنت روما کے کسی حصہ پر مستقل قبضہ نہیں کیا تھا نئی نئی وحشی قوموں کے نام سننے میں آتے ہیں۔ جرمنی کی اقوام نقل وحرکت کر رہی تھیں اور انھوں نے بڑے بڑے جتھے بنائے تھے دریائے رائن کے بالائی حصہ میں قوم المانی آباد تھی جس نے ابتداءً غالیہ پر حملہ کیا اور پھر خود اطالیہ میں لوٹ مار مچادی۔ دریائے رائن کے نشیبی حصہ میں قوم فرنک آباد تھی۔ رومی ان کو وحشیوں میں سب سے زیادہ عیار بے رحم اور سخت دل خیال کرتے تھے اس قوم کی عظمت کا زمانہ ابھی کچھ دور تھا مگر ۲۵۳ء میں اس قوم کی ایک شاخ یلغار کرتی ہوئی غالیہ سے ہسپانیہ ہوتی ہوئی افریقہ تک پہنچ گئی۔ مگر تیسری اور چوتھی صدیوں میں وحشیوں کی سب سے زیادہ نام آور قوم گاتھ تھی جن کی آبادی کا مرکز دریائے ڈنیوب کے نشیبی حصے یعنی کریمیا کے قرب وجوار میں تھا۔ ان کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ قوم وحشی تھی گو رومی تمدن اور دین مسیحی اس قوم نے بہت جلد قبول کر لیا۔ مگر تیسری صدی میں یہ لوگ محض کندۂ ناتراش تھے تھور اور اوڈن دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ تحریر کا رواج ان میں ہو چکا تھا۔ ان کا رسم الخط ریونک ہے جو زمانۂ حال کی روسی زبان کے حروف سے مشابہ ہے۔ ان کے نظام میں زبردست اقتدار نہ تھی اور بادشاہ انتخاب کے ذریعہ سے مقرر ہوتے تھے چونکہ تمام معاملات مجلس شوریٰ میں طے ہوتے تھے۔ ۲۵۰ء میں قوم گاتھ نے دریائے ڈینیوب عبور کیا۔ شہنشاہ ڈیسیس نے اس سیلاب کو روکنے کی سعی

عبث کی اور اس میں مارا گیا۔ چند سال بعد اس قوم نے بحیرۂ اسود کے سواحل پر بحری یورشیں کرنی شروع کر دیں اور بحیرۂ باسفورس کو بھی عبور کر کے بحیرۂ ایجین کے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ڈائنا دیوی کے تقدس کا بھی خیال نہ کیا اس کا مندر جلا دیا۔ ایتھنز پر بھی انھوں نے قبضہ کر لیا اور جزیرہ نما پیلوپونیس تک پہنچ گئے۔ سلطنت روما کی اس بدنظمی سے ایرانیوں نے نفع اٹھایا اور صوبۂ شام پر حملہ کر دیا۔ ۲۶۰ء میں شہنشاہ ویلیرین کو ان کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی۔ ایرانیوں نے اسے گرفتار کر لیا اور کئی سال تک دربار کسریٰ میں اس نے ذلت و خواری کی زندگی بسر کی۔

سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ ہر صوبہ کے باشندوں کو اپنی اپنی عافیت کا خیال تھا کیونکہ رومی اب انکی حفاظت نہ کر سکتے تھے۔ شہنشاہیت روما میں تین حکومتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک اطالیہ کی جس کے ساتھ صوبۂ افریقہ ملحق تھا۔ دوسری غالیہ کی جس میں برطانیہ بھی شامل تھا اور امید تھی کہ یہ ریاست قوی اور خود مختار ہو جائے گی اور تیسری مشرق میں صوبہ جات شام و مصر شہر پالمیرا کے مطیع ہو گئے تھے جو کاروانوں کے راستہ پر ایک عظیم الشان تجارتی منڈی تھی۔ اس شہر کو کچھ عرصہ کے بعد ملکہ زنوبیہ کے زمانہ میں بہت عروج حاصل ہوا۔

مگر سلطنت میں ابھی تک قوت احیاء باقی تھی اور اس کے علاوہ سلطنت کے کسی حصے کے باشندوں میں روما سے علانیہ قطع تعلق کرنے کی خواہش نہ تھی۔ ۲۶۸ء میں کلاڈیس کو سپاہیوں نے شہنشاہ بنایا اور اس نے کم از کم فوجی نقطۂ خیال سے ثابت کر دیا کہ اس کا انتخاب نامناسب نہ تھا۔ قوم گاتھ سلطنت میں دوامی قیام کا قصد کر رہی تھی اس لئے سب سے پہلے اسے اس طرف رخ کرنا پڑا اور اس نے جزیرہ نمائے بلقان میں اس قوم کو سخت شکست دی جس میں ان کا نقصان عظیم ہوا۔ مگر ۲۷۰ء میں یہ شہنشاہ مرض طاعون کا شکار ہوا جس کے تیوع سے اس ابتری کے زمانہ میں سلطنت روما میں اور بھی پریشانی پھیلی ہوئی تھی مگر حسن اتفاق سے اس کا جانشین آرئیلین اس سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوا اور زمانۂ مابعد میں "محی العسکر اور محی العالم" کے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ سلطنت کے پراگندہ شیرازہ کو اس نے از سر نو مجتمع کیا۔ قوم گاتھ کو اس نے کئی مرتبہ شکست دی اور ان کے ساتھ دوامی معاہدہ کر کے ان کو صوبۂ ڈیشیا میں اس شرط پر آباد

ہونے کی اجازت دی کہ رومی فوج کے لئے سپاہیوں کی ایک مقررہ تعداد فراہم کریں قوم المانی کی بھی اس نے سرکوبی کی اور غالیہ اور برطانیہ کو بغیر کسی جنگ و جدال کے مطیع کرلیا۔ مگر اس کا مشہور ترین کارنامہ شہر پامیرا کی تسخیر ہے۔ اس شہر کی ملکہ زنوبیہ نے ریگستان کے درمیان میں نہایت زبردست قوت پیدا کرلی تھی۔ آیندہ تمدن کی ترقی اور سرسبزی کے لئے بہتر ہوتا کہ اس ابتری کے زمانہ میں یہ حکومت اور اسی قبیل کی دوسری جو سلطنتیں قائم ہوئی تھیں باقی رہتیں کیونکہ سلطنت روما بسبب وسعت یہ ممکن نہ تھا کہ ایک ہی مرکز سے تمام سلطنت کا انتظام خوش اسلوبی کے ساتھ ہوسکتا اور جدید سلطنتیں جو قائم ہوئیں ممکن تھا کہ ان میں آزادی کا عنصر بھی ایک حد تک ہوتا۔ مگر بہرحال حکمران سلطنت روما کی عظمت کو بحال کرنا اپنا فرض اولیں خیال کرتا تھا اور اسی اصول پر کاربند ہو کر اس نے اپنی فوج کی باگ زنوبیہ کی طرف موڑی، بدنصیب ملکہ کو شکست ہوئی اور رومی اس کو شاداں و فرحاں سونے کی زنجیر میں جکڑ کر روما لے آئے مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی بیکسی پر فاتحین کو رحم آیا اور شہر روما کے قریب ایک محل میں اسے رہنے کی اجازت مل گئی شہر پامیرا کو رومیوں نے بالکل تباہ کردیا اس کے نادر زمانہ مندر اور عمارات مسمار کردی گئیں اور کنوئیں تک بند کردئے گئے۔ اس شہر کے کھنڈرات تک ریگستان کے وسط میں موجود ہیں سلطنت روما کے دشمنوں کو آرےلین نے زیر کرلیا تھا اور اب سیاسی معاملات طے کرنا باقی تھا، مگر روما کی بغاوت پسند فوجوں کو اس کی حکومت ناگوار تھی ۲۷۵ء میں وہ قتل کردیا گیا اور پھر بدامنی شروع ہوگئی جو دس سال تک باقی رہی ۲۸۴ء میں ڈنیوب کی فوجوں نے اپنے سپہ سالار ڈائیو کلیشین کو سریر آرائے سلطنت کیا۔ ابتداءً اس کی تخت نشینی کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی کیونکہ تیسری صدی عیسوی میں بیسیوں ایسے بادشاہ ہوے اور چند روزہ حکومت کے بعد صفحۂ ہستی سے غائب ہوگئے۔ مگر اس کی تخت نشینی سے روما کی تاریخ میں ایک جدید اور دیرپا دور شروع ہوتا ہے کیونکہ یہ بادشاہ ایک نبرد آزما سپاہی تھا مشرق اور مغرب میں اس نے اپنا سکہ جما کر سلطنت روما کو پھر متحد کردیا مگر اس کی شہرت کا دارومدار صرف اس کے فوجی کارناموں پر نہیں ہے بلکہ اس کے سیاسی اصلاحات اور مذہبی پالیسی اس سے زیادہ اہم ہے۔

ڈائیو کلیشین کا باپ غلام تھا اور تخت نشین ہونے سے قبل خود اس نے

سپاہیانہ زندگی بسر کی تھی مگر برسر اقتدار ہونے پر اس نے اپنی سیاسی قابلیت ثابت کر دی نظام سلطنت میں اس نے وسیع اصلاحات کیں جو آگسٹس کی اصلاحات سے کم اہم نہیں گو ان اصلاحات کا مدعا کچھ اور ہی تھا۔ آگسٹس کے انتقال کے بعد جو تین صدیاں گذریں ان میں جمہوریت کا جو کچھ ظاہری دکھاوا باقی تھا وہ بھی رفتہ رفتہ زائل ہوتا گیا اور شہنشاہوں کی مطلق العنانی ظاہر ہونے لگی۔ ڈائیوکلیشین کے زمانہ میں اس دکھاوے کا بھی خاتمہ ہو گیا اور اب سلطنت روما لفظاً و معناً شہنشاہیت ہو گئی۔

سب سے زیادہ ضرورت فوجی اصلاح کی تھی کیونکہ فوج کی تعداد ناکافی تھی اس کے علاوہ فوج اکثر باغی ہو جایا کرتی تھی اور مختلف سرحدوں پر افواج کو مطیع رکھنا ایک شخص کے بوتے سے باہر تھا۔ ان خرابیوں کو رفع کرنے کی ڈائیوکلیشین نے کوشش کی اور اس میں اس کو کامیابی بھی ہوئی شہریان روما کی آزادی یا ان کی فلاح کی اس کو بالکل پروا نہ تھی اس کو جو کچھ خیال تھا وہ فوج کی درستی کا تھا۔ یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے مشرقی دربار آداب و طریق کو روما میں رواج دیا یعنی جس چیز سے رومیوں کو سخت نفرت تھی اب اسی کو طوعاً و کرہاً قبول کرنا پڑا۔ ڈائیوکلیشین نے اپنے سر پر تاج شاہی رکھا اور اپنے کو خداوند اور خدا کہلوایا۔ خواجہ سرا اور نقیب اس کے دربار میں دست بستہ حاضر رہا کرتے اور اس کی حضوری میں ہر شخص یہاں تک کہ وزرا کو بھی سربسجود ہو کر آنا پڑتا۔ رسوم مذکور کی ایجاد غالباً خود پسندی سے نہ ہوئی تھی بلکہ اس میں یہ حکمت عملی مضمر تھی کہ بادشاہ کا احترام مثل دیوتا کے ہونے لگے تاکہ سپاہی اسے دیوتا خیال کریں اور اس کے احکام کی بجا آوری بلا چون و چرا کیا کریں دربار کے جو آداب اس نے مقرر کئے تھے بلا کسی تبدیلی کے ہزار سال تک قائم رہے۔

نظام سلطنت میں بھی ڈائیوکلیشین نے مزید اصلاحات نافذ کیں جن کے بموجب آئندہ سے سلطنت روما میں دو شہنشاہ بلقب آگسٹس ہونے لگے جن میں سے ایک میلان واقع اطالیہ میں رہتا اور دوسرا نیکومیڈیا واقع ایشیائے کوچک میں۔ ہر دو شہنشاہوں کا ایک ایک شریک و مددگار ہوتا تھا جسے سیزر کہتے تھے جو شہنشاہ کی وفات کے بعد اس کا جانشین ہوتا۔ گویا اس طور پر سلطنت روما میں دفعتاً واحد کے اندر چار شہنشاہ اور چار شاہی دربار ہونے لگے اور تقسیم اقتدارات کا یہی عمل ہر طرف ہونے لگا۔ سلطنت کو بارہ خطوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر خطے کو سو صوبوں میں۔ عہدہ داران اعلیٰ و ادنیٰ کی تعداد میں اضافۂ کثیر کیا گیا۔ سیول اور فوجی عہدہ دار الگ الگ کر دیئے گئے۔ ان اصلاحات سے عہدہ داروں کی کارکردگی ضرور بڑھ گئی مگر رعایا پر بھی محصولوں کا بار بڑھ گیا یہاں تک کہ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ وہ زمانہ کے ساتھ ہی کہ محصول دینے والوں کی تعداد ان لوگوں سے کم ہو گئی ہے جن کی گذراوقات محصول ہی پر تھی۔

فوج کی بھی از سر نو تنظیم عمل میں آئی اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا پہلی جمعیت اور پلاٹینی" کی تھی

جن کا کام دراصل محل شاہی کی حفاظت تھا گر رفتہ رفتہ ان کی تعداد اسی ہزار ہوگئی اور قلب سلطنت کی حفاظت ان کے سپرد ہوگئی دوسری فوجی جماعتیں یعنی سرحدی تھی جس کے سپرد سرحدوں کی حفاظت تھی۔ تیسری کمی ٹاٹمین سیس تھی جو ہمیشہ تعلق و حرکت کرتی رہتی تھی اور جس کا کام یہ تھا کہ جب کوئی وحشی فوج سرحدوں کے اندر گھس آئے اس کی سرکوبی کرے یہی ڈائیوکلیشین کے اصلاحات کا لب لباب ہے گو اسکی "چار گونہ" سلطنت کا نظام اسکی موت کے کچھ روز بعد شکست ہوگیا گر دوسرے خصوصیات باقی رہے۔

ڈائوکلیشین کی مذہبی پالیسی کا ذکر باقی ہے۔ بادشاہ خود بت پرست تھا گر کچھ روز تک اس نے مذہب مسیحی کے ساتھ رواداری جایز رکھی کیونکہ خود اس کے خاندان میں اس مذہب کے حامی موجود تھے۔ گر اپنے عہد سلطنت کے آخری زمانے میں اس نے اس جدید مذہب کی تخریب و تباہی کی جان توڑ کوشش کی۔ اس کا یہ فعل تعصب پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کو خدشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کلیسائے مسیحی کا زبردست نظام جس نے تیسری صدی مسیحی میں بہت کچھ قوت پکڑ لی تھی سلطنت کا رقیب ہو جائیگا اور اس لئے اس نے خیال کیا کہ سلطنت کی بقا کے لئے اس کو نیست و نابود کرنا ہی مناسب ہے اس کے قبل مسیحیوں پر جو کچھ مظالم ہوئے تھے وہ مختص المقام تھے اور ان کا اثر چند روز میں زائل ہوگیا گر اس بادشاہ نے عزم بالجزم کر لیا کہ اس مذہب کو بالکل نیست و نابود کر دے ۳۰۳ء میں اس نے اپنا پہلا فرمان جاری کیا کہ تمام کلیسوں کو مسمار کر دیا جائے مسیحیوں کی کتب مقدسہ عہدہ داران شاہی کے حوالے کر کے جلادی جائیں اور تمام مسیحی جو شاہی ملازمت میں تھے اپنے عہدوں سے معزول کر دیے جائیں کچھ عرصہ کے بعد اس نے حکم دیا کہ تمام مسیحی اسقف قید کر لئے جائیں اور مسیحیوں کو اپنے عقاید سے توبہ کرانے کے لئے سخت جسمانی تکلیف بھی دیجائے۔ ان کے احکام سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کتب مسیحی اور کلیسۂ مسیحی کے نظام کی اہمیت محسوس کرتا تھا۔ مسیحیوں پر مظالم کا سلسلہ سختی کے ساتھ جاری رہا جس سے بہت سے مسیحیوں نے جان سے ہاتھ دھوئے اور اکثر نے اپنے عقاید سے توبہ کی گر ڈائیوکلیشین کو جلد معلوم ہوگیا کہ وہ ایسی طاقت سے برسرپیکار تھا جو اس سے زیادہ قوی تھی اور مسیحیوں کی قوت کو ناپید کر دینا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے ۳۰۵ء میں وہ سلطنت سے دست بردار ہوگیا تاکہ اپنی باقی ماندہ زندگی امن کے ساتھ بسر کرے۔ صحت کی خرابی اور اپنی مذہبی پالیسی میں ناکامی غالباً اس عزم کا باعث ہوئی اور وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے جانشین اسکے قائم کردہ نظام سلطنت کو کس طرح چلا سکتے ہیں ۳۰۵ء سے ۳۱۳ء تک اس نے زندگی گوشہ نشینی میں بسر کی اور باوجود متعدد کوششوں کے پھر اس نے سیاسی میدان میں قدم نہ رکھا۔

بت پرستی کا خاتمہ

ڈائیوکلیشین نے جو نظام سلطنت قائم کیا تھا وہ اس کی زندگی ہی میں متزلزل ہونے لگا تھا۔ انتظامی معاملات کو اس نے جس ڈھرے پر لگایا تھا اسی پر چلتے رہے مگر ایک ہی سلطنت میں چار بادشاہوں کا وقت واحد میں ہونا ناممکن العمل ثابت ہوا کیونکہ یہ ایسی بات تھی جس کا کسی زمانہ میں فروغ پانا مشکل تھا اور پھر ایسے پر آشوب زمانہ میں جب کہ باہمی اعتماد مفقود تھا اس پودے کا سرسبز ہونا سخت دشوار تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت روما میں پھر ابتری پھیل گئی اور مختلف مدعیان تاج و تخت میں سخت مجادلہ و مقابلہ کے بعد سلطنت پھر ایک شخص کے زیر نگیں ہوئی۔ یہ شخص کانس ٹن ٹائن تھا جس کا باپ آگسٹس کے عہدے پر ممتاز تھا۔ جب اس کے باپ نے انتقال کیا کانس ٹن ٹائن شہر یارک واقع انگلستان میں اپنی فوج کے ساتھ تھا۔ اس کے سپاہیوں نے اپنی رضا و رغبت سے اس کو شہنشاہ بنایا (۳۰۶ء) اور اس کے رقیبوں نے بھی اس وقت کوئی اعتراض نہ کیا مگر آخرکار اس کو بزور شمشیر سلطنت پر قبضہ کرنا پڑا۔ ۳۱۲ء میں اس نے کوہ آلپس طے کر کے اپنے رقیب میک زن شیس پر حملہ کیا۔ روایت کیجاتی ہے کہ اس کے جھنڈوں پر علاوہ رومی عقاب کے حضرت عیسٰی کے نام کے حرف بھی تھے اور اس نے خود بیان کیا ہے کہ آخری فیصلہ کن جنگ کے ایک روز قبل اس نے آسمان پر ایک صلیب دیکھی جس کے نیچے یونانی حروف میں لکھا تھا "اس کے بھروسے پر فتح کرو"۔ یہ جنگ عظیم روما کے قریب ۳۱۲ء میں ملویئن پل پر ہوئی۔ اس کا حریف شکست کھا کر

ہار گیا اور اس طرح کانسٹن ٹائن مغربی یورپ کا مالک ہوگیا۔ دس سال کے بعد شرقی
شہنشاہ لی کی نیس سے جنگ کے اسباب پیدا ہوگئے اور صوبہ تھریس میں کئی لڑائیوں کے
بعد کانسٹن ٹائن تمام روما کا شہنشاہ ہوگیا۔

جولیس سیزر کے سوا کسی دوسرے رومی شہنشاہ کا اثر زمانہ پر اتنا نہیں
پڑا ہے جتنا کہ کانسٹن ٹائن کا مگر اس کے خصائل کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ سپہ گری اور
انتظام سلطنت میں اس کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اگر نظام سلطنت میں اس نے معرکۃ الآرا انقلاب
نہ کئے ہوتے تو اس صورت میں بھی اس کا شمار روما کے اعلیٰ ترین جنرلوں اور مدبّروں
میں ہوتا۔ اس کے کارنامے عظیم الشان تھے اور اُن کا اثر دیرپا تھا مگر اس کی طینت میں
وہ خصائل نہ تھے جن کو عموماً دنیا کے بڑے آدمیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ نہایت ہی
ذی ہوش اور محتاط تھا۔ کوئی کام بلا غور و خوض نہ کرتا۔ اس کے مذہبی عقائد کا اندازہ کرنا دشوار ہے
مذہب مسیحی کا معتقد ضرور تھا مگر تادم مرگ بت پرستوں سے اس کا یارانہ تھا اور ترحم اور عزت کا
پاس اس میں بہت کم تھا۔ اصل یہ ہے کہ مذہب کا پاس اسے بہت کم تھا اور اپنے
ذاتی مفاد کے آگے مذہب کی کچھ حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کئی امور میں اس کی پالیسی آگسٹس سے
مشابہ ہے مگر اس کا زمانہ زیادہ پر آشوب تھا اور حل طلب مسائل جو اس کے پیش نظر تھے
زیادہ دقیق تھے۔

نظام سلطنت میں جو انقلابات اس نے کئے اُن میں اہم ترین یہ تھا کہ اس نے
مقام سلطنت روما سے بائی زین ٹیم میں منتقل کردیا جو اس کے نام کی رعایت سے قسطنطنیہ
مشہور ہوا۔ اس انقلاب کی اہمیت یہ ہے کہ سلطنت کی تمام گذشتہ روایات شہر روما سے
وابستہ تھیں۔ سلطنت کا مرکز وہی تھا اور یہ خیال عام رومیوں کے دماغوں میں جم گیا تھا
کہ ان کا شہر حیات ابدی رکھتا ہے اور جب اس کا زوال ہوگا تو دنیا کا خاتمہ ہوگا۔
اس سے ظاہر ہے کہ اس مقام سلطنت کی منتقلی سے ایک انقلاب عظیم ہوا اگرچہ یہ تغیر ضروری
اور ایک حد تک مفید تھا کیونکہ ایک مدت سے روما صرف برائے نام دارالسلطنت تھا۔ اس میں
شک نہیں کہ سلطنت میں کوئی شہر اس کا ہمسر نہ تھا مگر جب سے کہ وحشیوں نے شدید حملے شروع
کردیئے شہنشاہوں کو بہت کم موقع ملتا تھا کہ وہ روما میں قیام کریں۔ ہم بیان کرچکے ہیں
کہ ڈائیوکلی شین نے اپنا قیام نکومیڈیا میں رکھا تھا اور دوسرا شہنشاہ میلان شمالی اٹالیہ میں

رہتا تھا۔ روما سرحدوں سے جہاں وحشیوں سے ہمیشہ خطرہ رہا کرتا تھا بہت دور تھا۔ مقام سلطنت کے لئے قسطنطنیہ سے بہتر کوئی شہر نہ تھا۔ تجارتی اور فوجی ہر دو اغراض کے لئے اس کا موقع نہایت مناسب تھا کیونکہ وہ ایک راس زمین پر واقع ہے جس کے تین طرف عمیق سمندر ہے اور چوتھی یعنی مغربی جانب معمولی فصیلوں سے بخوبی حفاظت ہوسکتی ہے اس کے شمال میں وہ عظیم الشان بندرگاہ ہے جو گولڈن ہارن کے نام سے مشہور ہے اور جس کا شمار دنیا کے بڑے سے بڑے بندرگاہوں میں ہے۔ مصر کا غلہ وہاں نہایت آسانی کے ساتھ آسکتا تھا اور بحیرۂ اسود کی تمام تجارت اس کے تابع تھی۔ اس کے علاوہ وہ ان دونوں سرحدات کے ٹھیک وسط میں تھا جہاں وحشیوں کی طرف سے خطرہ تھا۔ قوم گاتھ دریائے ڈینیوب کے سواحل اور کریمیا میں موجود تھی اور مشرق میں ایرانی دریائے فرات کے کنارے دھمکی دے رہے تھے۔ قسطنطنیہ دونوں کے وسط میں ہونے سے ایک مرکزی مقام تھا جہاں سے دونوں اقوام کی سرکوبی ہوسکتی تھی۔ انھیں وجوہ کی بناء پر قسطنطین نے دارالسلطنت باسفورس کے کنارے آباد کیا۔ شہر کی بنیاد بڑی دھوم دھام سے پڑی اور مشرق کے مندروں اور دوسری عمارات کو تاخت و تاراج کر کے سنگ مرمر اور اشیاء زیبائش شہر کی آرائش کے لئے لائی گئیں۔

مقام سلطنت کی منتقلی کے وجوہات میں ایک وجہ موجہ کا ذکر باقی ہے کانسٹن ٹائن کا عزم بالجزم تھا کہ سلطنت کے مذہب یا کم از کم مذہبی پالیسی میں ایک زبردست انقلاب کر دے۔ روما میں بت پرستی کا زور تھا اور اس کی گذشتہ روایات نہایت قوی تھیں جن سے اندیشہ تھا کہ کسی تغیر کی سخت مخالفت ہوگی۔ اس کے خلاف کسی نئے شہر میں اس انقلاب کا اجراء نسبتاً آسان تھا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس کے مذہبی عقائد پختہ نہ تھے بت پرستی کا وہ مربی تھا اور آخر عمر میں جب اس نے اصطباغ لیا تو قدیم کلیسا میں شریک نہیں ہوا بلکہ ایک ایرین قسیس کے ہاتھ پر ایمان لایا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خود اس کی ماں مذہب مسیحی کی پیرو تھی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب تسخیر شہر روما کے لئے بڑھ رہا تھا تو اس کے پھریروں پر مسیحی نشانات تھے اور ۳۱۳ء میں ملوین پل کی جنگ کے قبل شہر میلان میں اس نے روا داری کا ایک مشہور اعلان شائع کیا جس میں اس نے حکم دیا کہ ایسے شخص کو جو مذہب مسیحی کے اصول کا پابند ہے یا ایسے مذہب کا

پیرو ہے جس کو وہ اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے کسی قانونی حق سے محروم نہیں رکھنا چاہئیے
اس زمانہ سے مذہب مسیحی کا وہ پورا مربی ہوگیا اور جدید شہر میں ابتدا ہی سے
مسیحیت کی تبلیغ شروع ہوگئی۔ اس کی زندگی میں کبھی بت پرستی کو نیست و نابود کرنے کی
کوشش نہیں کی گئی مگر مسیحی ان تمام قیود سے آزاد کر دئیے گئے جن سے اُنکی
زندگی تلخ ہو رہی تھی قسیسین مسیحی کو خاص حقوق دئیے گئے اور مسیحیوں کو رسوم بت پرستی
کی پابندی سے معاف کر دیا گیا۔ مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہنشاہ روما تمام سلطنت
اب جس کی مطیع و منقاد تھی خود مذہب مسیحی کا حامی و مربی تھا۔ بت پرستی مذہب مسیحی
کے ساتھ ساتھ کچھ دن اور برقرار رہی مگر اب اُس کا دم واپسیں تھا اور زمانہ
کی ہوا اس کے خلاف اور مذہب مسیحی کے موافق تھی۔ اس صدی کے قبل مسیحیت
تمام سلطنت میں رواج پا چکی تھی اور بت پرستی جس کا ڈائیوکلیشین کے زمانے میں
دور تھا۔ سلطنت کے دور دراز اور گمنام گوشوں میں پڑی دم توڑ رہی تھی۔

شہنشاہ نے مسیحیت کی حمایت تو کی مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنا دباؤ بھی
اس پر رکھا جس سے قسطنطنیہ میں فتوحات اسلامی کے زمانے تک کلیسیہ کے معاملات
بلکہ عقائد میں بھی شہنشاہوں کو دخل تھا۔ اس موقع پر گو قبل از وقت ہے مگر یہ ذکر
کر دینا مناسب ہوگا کہ شہنشاہ کی اس پالیسی سے روما میں متضاد نتائج پیدا ہوئے
شہر روما اب سلطنت کا سیاسی مرکز نہ تھا کیونکہ شہنشاہ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا
تھا اور ممالک متمدنہ کا نظم و نسق اس کے سیاسی مجالس کے ہاتھوں میں نہ تھا اب
وہاں سب سے زبردست شخصیت لشپ اسقف کی تھی جس کی ذات کے ساتھ
روما کی عظمت کے بہت سے روایات وابستہ ہو گئے تھے اور اس طرح
روما کو مذہبی معاملات میں وہ برتری اور فوقیت حاصل ہوگئی جو دنیاوی معاملات
میں اس نے کھو دی تھی۔ اس کے علاوہ سلطنت کے اٹھ جانے سے لشپ روما
کی طاقت میں روز افزوں ترقی ہونے لگی اور زمانۂ آئندہ میں کلیسائے مغربی کو
پوری آزادی اور خود مختاری حاصل ہوگئی برخلاف اس کے لشپ اسقف یا بطریق قسطنطنیہ
ہر بات میں شہنشاہ کا دست نگر تھا۔ اب ہم اس زمانے میں پہنچ گئے ہیں جو تاریخ عالم
میں نہایت اہم ہے کیونکہ بلاشک و شبہہ اسی زمانے سے دور قدیم کا خاتمہ ہوتا ہے

اور ازمنۂ وسطیٰ کی ابتدا ہوتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ ان دونوں قرون کی کوئی
حد فاصل نہیں ہو سکتی یونان اور روما کے عالم بت پرستی کے تمام خصوصیات مفقود ہو گئے
تھے شہری سلطنت اور ان کے جمہوری مجالس ناپید ہو چکے تھے ہر جگہ خود مختارانہ
حکومت جاری تھی۔ شہریوں کی فوجیں جنھوں نے یونان کو ایران کے پنجۂ ستم
سے آزاد کیا تھا اور روما کو سارے زمانہ کا مالک کر دیا تھا اب نظر نہیں
آتیں اور ان کی جگہ تنخواہ دار فوجیں تھیں۔ جو شہریت کے نام تک سے
ناواقف تھیں، حب وطن کا انھیں بالکل احساس نہ تھا صرف تنخواہ سے کام تھا
اور اپنے سرگروہ کا نام لیوا تھیں۔ تمدن میں بھی انقلاب عظیم ہو گیا تھا شہروں اور
قوموں اور قبیلوں میں جو امتیاز تھا وہ مفقود ہو گیا تھا جس سے سلطنت کی معاشی حالت
بالکل بدل گئی تھی۔ اس کی بنیاد اب بھی غلامی پر تھی مگر غلامی کی نوعیت بدل گئی تھی
غلاموں کی حفاظت کے نئے قوانین نافذ تھے اور اس تحریک کی ابتدا ہو چکی تھی
جس کی وجہ سے غلام آزاد کاشتکار ہو گئے تھے۔

ان تغیرات میں اہم ترین تغیر بنی نوع انسان کے اعتقادات اور مذاہب کا
تغیر تھا۔ مسیحیت کی آخری فتح کے قبل بھی بت پرستوں کے عقائد میں انقلاب عظیم
پیدا ہو چکا تھا۔ مسیحیت کی فتح یورپ کے مورخوں کے خیال میں دنیا کا سب سے
بڑا مذہبی انقلاب ہے کیونکہ مقامی دیوتاؤں کی پرستش کے بجائے ایک عام مذہب
رواج پا گیا تھا اور بجائے ان مذہبی اعتقادات کے جو ہر مقام قوم اور زبان
کے لحاظ سے مختلف تھے ایک ایسا مذہب پیدا ہو گیا تھا جس کا دعویٰ یہ تھا
کہ تمام آدمی اس کے معتقد ہو سکتے ہیں خواہ ان کا درجہ قوم یا زبان کی حیثیت سے
کچھ بھی ہو۔ عالم بت پرستی کی دیویاں اور دیوتاؤں کی اور فرشتوں اور ولیوں کے بجائے مسیح کی پرستش کا
رواج پایا جاتا تھا۔ یعنی عالم میں ایک عظیم الشان اور عجیب ترین انقلاب ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ ایام بت پرستی میں ایک رجحان پیدا ہو گیا تھا جس سے یہ تغیر ظاہر ہوا
اور اس کے فلسفیوں کا ایک شخص خود مرہون منت ہے گو کہ ان کا احسان
نہیں مانا۔ لیکن باوجود اس کے یورپ کے قدیم مذاہب اور اس جدید مذہب میں
بحیثیت مجموعی ساتھ ترقی کرنا اختلاف عظیم ہے۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ انقلاب مذہبی کے ساتھ دنیا میں ایک نئی طاقت اور ایک جدید نظام کا ظہور ہوا جو اس سے قبل مفقود تھا زمانۂ قدیم میں بہت سے مذہب تھے اور بہت سے مندر مگر کوئی کلیسا نہ تھا اور نہ یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ایسے اشخاص کی جماعت بھی ہو سکتی ہے جن کے عقائد مذہبی طریقۂ پرستش اور اخلاق ایک ہی ہوں۔ نہ یونان قدیم میں نہ روما میں، نہ بت پرستی کے عقائد ما بعد میں کلیسائے مسیحی کے مثل کسی چیز کا پتا چلتا ہے جو آیندہ ایک ہزار سال کے لئے تاریخ یورپ کا مرکز ثقل رہی۔ سلطنت روما میں ڈائوکلیشین کے زمانے تک حکومت بالکل خود مختار تھی اور ریاست ہی کا اصرار تھا کہ رعایا اس کی مطیع ہو اور حکومت ہی منبع قوانین مذہب و اخلاق بھی ہو۔ یہ انقلاب جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں نہایت سرعت کے ساتھ ہوا اور نہایت عجیب تغیر ہے کیونکہ حکومت کے دوش بدوش ایک ایسی قوت پیدا ہوگئی جو نوع انسان کی اطاعت کی مدعی تھی اور رفتہ رفتہ حکومت سے اس کا اقتدار زیادہ ہو گیا اس کی وجہ ایک حد تک یہ ہے کہ وحشیوں کے حملے سے سلطنت ضعیف ہو رہی تھی مگر اصل سبب یہ ہے کہ لوگوں کے خیالات بدل گئے تھے اور جدید اعتقادات پیدا ہو گئے تھے جن کے لوگ شدت سے معتقد تھے۔ تاریخ کو قرون میں تقسیم کرنا ایک حد تک محض خیال ہے مگر اس لحاظ سے کہ اکثر انقلابات نوع انسان کے خیالات میں ہوتے ہیں اس لئے زمانۂ قدیم اور قرون وسطیٰ میں حد فاصل مسیحیت کا غلبہ ہے جب کہ ازمنۂ وسطےٰ کے کلیسا نے اچھی طرح جڑ پکڑ لی۔ اسی طرح قرون وسطیٰ کا خاتمہ اور زمانۂ حال کا آغاز نظام کلیسا کے زوال سے ہوتا ہے جب کہ اصلاح مذہبی کے عہد میں یہ مذہبی اتحاد جاتا رہا اور مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔

حصۂ دوم

قرون وسطیٰ

باب اول

سلطنت روما میں دین مسیحی کا غلبہ

شہنشاہ کانس ٹن ٹائن کی زندگی میں اسکے مذہبی اصلاحات کی کوئی زبردست مخالفت نہ ہوئی بت پرست قوم کے سرخیل اور پوجاری اس مذہب کی ترقی بے دلی کے ساتھ دیکھتے رہے اور مخالفت کی جرأت نہ کر سکے پھر بھی صنم پرستی کے آئین میں تغیر اس قدر دشوار تھا اور بت پرستی نظام تمدن کی رگ و پے میں اس قدر سرایت ہو چکی تھی کہ بغیر کسی مجاہدے کے اس کا اثر زائل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ شہنشاہ کی زندگی کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ جو مذہب اس نے جاری کیا تھا اس کی ذات سے اس کو کچھ تقویت نہیں پہونچ سکتی تھی۔ اس کی فوجی اور سیاسی قابلیت میں کوئی شک نہیں مگر اخلاقی حالت روما کے بدترین بادشاہوں کی سی تھی۔ اس کی زندگی کے آخری ایام میں بلوے اور سازشیں ہوتی رہیں جن میں خود اس کا بیٹا اور بیوی اشتباہ میں قتل کئے گئے۔ ۳۳۷ء میں اس نے انتقال کیا اور اس کے دم توڑتے ہی محل میں ایک ہنگامۂ قتال برپا ہو گیا جس کا سلسلہ ۳۵۰ء تک جاری رہا جب کہ اس کا بیٹا کانس ٹین ٹیس سریر آرائے سلطنت ہوا اس کے دور حکومت کے ابتدائی پانچ سالوں میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا ۳۵۵ء میں جولین جو قسطنطین کا عم زاد بھائی تھا شہنشاہی میں اس کا شریک ہوا جولین کے حالات نہایت دلچسپ ہیں۔ فن سپہ گری میں وہ غیر معمولی قابلیت

رکھتا ہوگا کیونکہ جب وہ دریائے رائن کی فوج کا سردار تھا اس نے جرمنی پر
متعدد حملے کئے تھے اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ رومیوں میں نبرد آزمائی کا مادہ ہنوز
باقی ہے کانسٹنٹیس نے جولین کے اکثر عزیزوں اور دوستوں کو تہ تیغ
کر دیا تھا اس لئے دونوں میں سخت عناد تھا۔ ۳۶۰ء میں جولین کی فوجوں کو شہنشاہ نے
حکم دیا کہ وہ دریائے فرات کی سرحد پر منتقل ہو جائیں جہاں ایرانیوں کے حملے کا
خوف تھا۔ افواج نے اپنا مقام چھوڑنے سے انکار کر دیا اور علم بغاوت بلند کر کے آخر کار
جولین کو شہنشاہ بنا دیا۔ جولین نے منصب شہنشاہی کو قبول کر کے شہنشاہ سے اعلان
جنگ کر دیا اور قسطنطنیہ کی طرف کوچ کر گیا مگر قبل اس کے کہ اس کی فوجیں وہاں پہنچیں موت نے
کانسٹنٹیس کا کام تمام کر دیا اور دسمبر ۳۶۱ء میں جولین تمام سلطنت روما کا واحد مالک ہو گیا۔

جولین کے عہد سلطنت کا سب سے دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ بت پرستوں نے
دین مسیحی کی برتری اور فوقیت کو زیر و زبر کرنے کی آخری اور جاں گسل کوشش کی۔ بت پرستی کی
طاقت کے احیاء کے متعدد اسباب تھے۔ دین مسیحی کی کامیابی سے جو امیدیں وابستہ تھیں
کہ امن و امان اور فارغ البالی حاصل ہوگی اور بدکاری معدوم ہو جائے گی اس میں سخت
مایوسی ہوئی کیونکہ خود ملک میں خانہ جنگی کا سلسلہ جاری تھا اور بیرونی ممالک سے بھی
چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مسیحی شہنشاہ بدکاری اور عیاشی میں بت پرست بادشاہوں
سے کم نہ تھے اور اس پر طرہ یہ کہ مسیحی آپس میں بھی لڑ رہے تھے کانسٹنٹیس کی
تخت نشینی سے قبل ہی مسیحیوں میں تفرقہ پڑ گیا تھا اور انتظام کلیسا کے متعلق جو مختلف
عقائد اور خیالات تھے ان کے پیرووں میں سخت رقابت پیدا ہو گئی تھی جو آخری
کامیابی کے بعد اور بھی تلخ ہو گئی افریقہ میں خصوصاً آتش رقابت نہایت سختی کے ساتھ
بھڑک اٹھی تھی جس کا اصلی سبب یہ تھا کہ ڈائیوکلیشین کے زمانے میں چند حکام کلیسا نے اپنی
مذہبی کتابیں اس کے خوف سے جلانے کے لئے دیدی تھیں گو اب یہ اصل وجہ معدوم
ہو گئی تھی تاہم مخالف مسیحی فرقے اس وحشیانہ پن کے ساتھ آپس میں لڑ رہے تھے
کہ صوبہ افریقہ کا ایک بڑا حصہ ویران و برباد ہو گیا ان جھگڑوں کے علاوہ جن کے
حالات زیادہ معلوم نہیں حضرت عیسے کی ذات و صفات کے متعلق ایک سخت بحث چھڑ
گئی تھی جو کلیسائے مسیحی کے ابتدائی زمانے سے اس کے سرداروں کو پریشان

گر رہی تھی۔ تیسری صدی مسیحی میں مختلف بدعتی عقائد کا اظہار ہو چکا تھا مگر چوتھی صدی کے آغاز میں یہ مناقشات اور بھی شدید ہو گئے۔ شہر اسکندریہ میں مذہبی مباحث کا بازار بہت گرم تھا۔ یہاں ایک قسیس ایریس نامی تھا جس نے اس عقیدے کی تلقین شروع کی کہ حضرت عیسٰی اور خدا مشابہ عناصر سے ہیں اور اس کے برخلاف راسخ الاعتقاد مسیحی جن کا سرغنہ اتھاناسیس تھا یہ باور کرتے تھے کہ خدا اور مسیح ایک ہی عنصر سے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ امتیاز نہایت خفیف تھا مگر اس لفظی نزاع نے اتنا طول کھینچا کہ کلیسیہ کاتھولیکی کی ہستی معرض خطر میں آ گئی تھی۔ ابتدا میں قدیم کلیسیہ اور ایرین فرقے کے درمیان رسوم میں زیادہ اختلاف نہ تھا لیکن اگر اس فرقے کے عقاید کو فروغ حاصل ہوتا تو قسیسین کو جو فوقیت عوام پر حاصل تھی وہ جاتی رہتی اور پاپائے روما کو وہ قوت میسر نہ ہوتی جو آخر کار اس کو حاصل ہوئی۔

ان مذہبی اختلافات کو طے کرنے کے لئے بمقام نیقیہ (جنوبی فرانس) ایک کونسل منعقد ہوئی جس نے ایریس کے عقائد کو بدعتی قرار دیا لیکن اس کے معتقدین میں خصوصاً سلطنت کے مشرقی حصے میں کمی واقع نہ ہوئی۔ پاپائے روما نے اس مباحثے میں اتھاناسیس کا پورا ساتھ دیا۔ یہ مباحث پادریوں تک محدود نہ تھے بلکہ ان میں عوام بھی گرم جوشی کے ساتھ شریک تھے۔ دونوں فریقوں میں ایسی شدید منافرت پیدا ہو گئی کہ ان کو یہ بھی خیال نہ رہا کہ ہم دونوں مسیحی ہیں۔ ایریس اور اتھاناسیس کے معتقدین بت پرستوں سے زیادہ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تک کہ عیسائیوں کے باہمی جھگڑوں اور نزاعوں سے عاجز آ کر اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مسیحیت سے تو بہتر ہے کہ بت پرستی ہی کو پھر زندہ کیا جائے اور تھا بھی یہی کہ بت پرستی میں انقلابات کے باعث یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ اس کا احیاء بہ آسانی ممکن تھا اور عقاید بالکل مغائر ہو گئے تھے سیزر یا جولیس سیزر کو اگر جولین کے عقاید کا علم ہوتا تو ہرگز اسے اپنے اور اس کے عقاید میں کسی قسم کی مشابہت نظر نہ آتی جیسا ہم بیان کر چکے ہیں بت پرستی پر تصوف کا رنگ چڑھتا جا رہا تھا اور اس کے پیروؤں کی یہ کوشش تھی کہ اس کا نظام الیسا زبردست کر دیا جائے کہ وہ مسیحی کلیسا کا مقابلہ کر سکے۔ بت پرستوں کے منصوبوں میں جولین کی تخت نشینی سے یک گونہ پختگی آ گئی۔ جولین کی زبان پر مختلف دیوتاؤں کے نام

رہتے تھے مگر بذات خود پکا موحد تھا اور سورج کے دیوتا متھرا اس کی پرستش کرتا تھا جس کو وہ قادر مطلق کی زندہ تصویر خیال کرتا تھا اور یہی رجحان ذی فراست بت پرستوں کا تھا۔ مسیحیت کے ابتدائی زمانے میں بت پرستوں کے اندر اپنے مذہب کا زیادہ پاس نہ تھا مگر اب ایک غالب جماعت میں مذہب کے ساتھ شغف پیدا ہو گیا تھا۔

جولین نے بزمانۂ قیام ایتھنز یہ عقائد سیکھے تھے۔ ایتھنز اس زمانے میں پھر تعلیم اور جدید بت پرستی کا ایک بڑا مرکز ہو گیا تھا۔ سلطنت کی ملازمت کی وجہ سے اسے ایتھنز کو با دل ناخواستہ چھوڑ دینا پڑا مگر شہنشاہ ہوتے ہی اس نے اپنے اساتذہ کے عقائد کو رواج دینا شروع کیا۔ اس کی حکومت کا زمانہ نہایت مختصر تھا اس لئے یہ اندازہ کرنا دشوار ہے کہ اس کے تدابیر کے نتائج کیا ہوتے۔ مذہبی رواداری کا اس نے عام اعلان کر دیا۔ یہانتک کہ اس نے یہودیوں کے یروشلم میں اپنا معبد بنانے کی اجازت دیدی۔

سلطنت کے کتبوں اور سکوں سے تمام مسیحی نشانات غائب ہو گئے۔ صنمکدوں میں پھر جوش و خروش سے لوگ جانے لگے اور شہنشاہ کو خوش کرنے کے لئے قربانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نظام مذہبی کی استواری اور پجاریوں کی تعلیم و اخلاقی تہذیب کے ساتھ ساتھ انھیں ایک زنجیر میں جکڑ دینے کا جولین کو خاص خیال تھا۔ مسیحیت کی ہستی کو ان تدابیر سے کچھ خوف نہ تھا لیکن اگر جولین کچھ اور زندہ رہتا تو مسیحیوں سے اس سے ضرور جھگڑا ہو جاتا کیونکہ اس نے مسیحیوں کو تمام تعلیمی عہدوں سے علٰحدہ کر دیا تھا اور ملازمت سرکاری میں بت پرستوں کو مسیحیوں پر ترجیح دینے لگا تھا اور مسیحی قسیسین کو ان مالی مراعات سے بھی محروم کر دیا جن سے کانسٹنٹائن نے انکو سرفراز کیا تھا۔

مگر ان مذہبی اصلاحات کا فوجی مشکلات نے خاتمہ کر دیا۔ ایرانی اس زمانے میں اپنے بادشاہ شاپور کی سرکردگی میں سلطنت روما کے خطرناک دشمن ہو گئے تھے اور جولین کو مجبوراً ان پر فوج کشی کرنا پڑی۔ اپنی قابلیت کے سبب سے اس کو ابتدا میں فتوحات حاصل ہوئے۔ اور دریائے دجلہ کو عبور کر کے اس نے ایران کے قلب پر ایک حملہ کرنا چاہا مگر رسد کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کو لوٹنا پڑا اور مارا گیا۔

روایت کیجاتی ہے کہ جولین کے آخری الفاظ یہ تھے "اے مسیح تو نے مجھ پر فتح پائی" اور اس میں شک نہیں کہ اس کی موت کے بعد بت پرستی کی کامیابی کا آخری موقع بھی جاتا

رہا بلکہ یہاں تک ہوا کہ اس مذہب کی ہستی معرض خطر میں آگئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سلطنت روما کے کسی بڑے طبقے میں نہ تو قدیم مذہب کی طرف اعتقاد راسخ نہیں تھا اور نہ اس کے قائم رکھنے کی پرزور خواہش ہی پائی جاتی تھی۔ خود جولین کو بھی اس امر کی طرف سے سخت مایوسی تھی کہ جس مذہب کے ساتھ اس کو اس قدر شغف تھا اس باب میں اس کے حاشیہ نشینوں کو صرف سرسری دلچسپی تھی۔ بت پرستی کا بلا کسی جنگ و جدل کے معدوم ہو جانا ہی خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے پیرووں میں نہ جوش تھا اور نہ اعتقاد۔

اس کے علاوہ اور اہم واقعات بھی ہو رہے تھے یعنی وحشی قوموں کے حملے مگر فی الحال ہم صرف مذہبی امور اور خصوصاً مسیحیت کی آخری فتح کا ذکر کرینگے جولین کے بعد کئی شہنشاہوں کی چندروزہ حکومت رہی جن کا صفحات تاریخ میں کوئی کارنامہ مندرج نہیں ہے۔ مگر ۳۷۸ء میں شہنشاہ تھیوڈوسیس تخت نشین ہوا جس کا دور حکومت کئی وجوہ سے اہم ہے آیندہ باب میں تفصیلاً بیان کیا جائے گا کہ سلطنت روما اور وحشیوں کے کیا تعلقات تھے۔ اسی بادشاہ کے عہد حکومت میں قوانین روما کی ترتیب اختتام پر پہونچی اور آیندہ کی نسلوں پر اس کا احسان عظیم ہے اس باب میں ہم صرف اس کی مذہبی پالیسی پر تبصرہ کرینگے۔

تھیوڈوسیس مسیحی تھا اور مسیحی بھی نہایت راسخ الاعتقاد تھا ناسیس کا سرگرم پیرو۔ اس سے پہلے کے شہنشاہ زیادہ تر ایرین تھے۔ اس کی حکومت میں ایرین فرقے کو شکست فاش نصیب ہوئی اور بت پرستی بالکل معدوم ہو گئی بت پرستی کی آخری جدوجہد میں کوئی بات قابل ذکر نہیں کیونکہ اس کا نظام بہت ضعیف تھا اور مسیحیت کی فتح زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوئی۔ بت پرستی کا زبردست مرکز شہر روما میں تھا مگر یہاں بھی اس کا ضعف عیاں تھا کیونکہ ۳۸۲ء میں فتح کی دیوی کی مورت سینٹ کے مکان سے نکال دی گئی دس سال کے بعد شہنشاہ تھیوڈوسیس خود روما میں وارد ہوا۔ روایت کی جاتی ہے کہ اس کی موجودگی میں سینٹ میں مباحثہ ہوا کہ شہر روما کا مربی جوپٹر دیوتا خیال کیا جائے یا حضرت عیسےٰ شہنشاہ کی موجودگی سے بآسانی فیصلہ

ہوگیا۔ سینٹ نے مسیحت کے حق میں فیصلہ کیا اور اس فیصلہ کے بموجب متعدد قوانین وضع کئے گئے۔ بت پرستی کی عام قربانیاں موقوف کردی گئیں اور خلاف ورزی کے لئے سزا موت تجویز کی گئی۔ روما کے قدیم دیوتاؤں کی پرستش قربانی کے بغیر بھی ممنوع کردی گئی۔ دیوتاؤں کے مندرجن میں ایسی عمارتیں بھی تھیں جن سے بہتر بنی نوع انسان نے کبھی نہیں بنائیں مسمار کردی گئیں بعضوں کے مینار اور سنگ مرمر مسیحی کلیساؤں میں منتقل کردئے گئے اور بعض مندر مثلاً پینتھیان واقع روما اور پارتھیان واقع ایتھنز مسیحی استعمال میں آ گئے اور اس وجہ سے وہ محفوظ رہے۔ مسیحیت کی فتح کے ساتھ افسوس ہے کہ فنون لطیفہ کے نادر نمونوں کو اس بیدردی سے تباہ کیا گیا کہ صفحات تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی اور یہ سلوک نہ صرف سنگ تراشی اور نقاشی کے بہترین نمونوں کے ساتھ کیا گیا بلکہ شعراء فلسفیوں اور مورخوں کے اُن تصانیف کے ساتھ بھی روا رکھا گیا جن کو بت پرست مسیحیوں کے کتب مقدسہ کا ہم پلہ خیال کرتے تھے۔ اس وجہ سے مسیحیوں نے شاعر ورجل کے کلام کے سب کا مطالعہ ممنوع کردیا اور زمانہ قدیم کے نادر تصانیف اس وقت تک گمنامی اور کس مپرسی میں پڑے رہے جب تک کہ انھیں دوبارہ زندہ کرنے کا وقت نہیں آگیا قرون وسطیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ یہ بالکل جہالت کا زمانہ تھا غلط ہے مگر ایک لحاظ سے صحیح بھی ہے علم کی جو شعاعیں یونان سے نکلکر تمام عالم کو منور کئے ہوئے تھیں بالکل معدوم نہ ہوسکتی تھیں مگر دھندلی ضرور پڑ گئی تھیں جس سے بنی نوع انسان مدت تک جہالت میں مبتلا رہے۔

پھر تھیوڈوسیس کے ایک واقعہ پر سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحت کی فتح سے دنیا میں ایک نئی قوت کا ظہور ہوگیا تھا آئندہ باب میں ہم بیان کرینگے کہ بادشاہ نے قوم گاتھ سے خوشگوار تعلقات قائم کرئے تھے تھسالونیکا (سلانیکہ) کے باشندوں نے وہاں کے گاتھی سپاہیوں اور کچھ افسروں کو قتل کردیا جس سے بادشاہ سخت برافروختہ ہوگیا اور قتل عام کا حکم دیدیا اس میں اس شہر کے ہزاروں باشندے تہ تیغ کردے گئے اس حکم کی سفاکی میں شک نہیں مگر اس زمانے میں اس قسم کی سفاکیاں اور مظالم

عموماً ہوا کرتے تھے۔ اس واقعے کی اہمیت یہ ہے کہ بادشاہ کے اس فعل کے خلاف صدا ئے احتجاج بلند ہوئی اور اس کو اپنی بیرحمی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مسیحی قسیسوں کے درمیان اس وقت سربرآوردہ لوگوں میں سینٹ ایمبروس اسقف میلان تھا جس نے شہنشاہ کی اس سفاکی پر حد درجہ خفگی ظاہر کی اور جب بادشاہ نے میلان کے گرجے میں آنا چاہا تو اسقف نے اس کو نہ صرف گرجا میں آنے اور نماز میں شریک ہونے سے منع کر دیا بلکہ اس کو دین مسیحی میں اس وقت تک پھر نہ داخل کیا جب تک کہ اس نے اپنے افعال پر مجمع عام میں پشیمانی ظاہر نہ کی اس واقعے کی اہمیت میں کلام نہیں۔ غضب ہے کہ جولیس سیزر کے جانشین کی ایک پادری کے ہاتھوں یہ ذلت ہو اور تمام رومی فوجوں کا سردار دو مصلوب یہودی" (حضرت عیسےٰ بقول مسیحیاں) کے جانشین کے آگے سرنگوں ہو۔ تاریخ عالم میں ایسے انقلاب کم ہوئے ہونگے اس زمانے سے یورپ میں شہنشاہ اور مسیحی کلیسا دو عظیم قوتیں ہیں جن میں صلح شاذ و نادر اور مخالفت بیشتر رہتی ہے اس کشمکش کا سلسلہ اس زمانے تک جاری رہا جب تک کہ دونوں کا زور ٹوٹ نہ گیا اور اسی کے ساتھ قرون وسطےٰ کا بھی خاتمہ نہ ہو گیا۔

باب دوم

قوم گاتھ کے فتوحات اور سلطنت روما کا مغربی خاتمہ

گذشتہ باب میں ہم تفصیلاً بیان کرچکے ہیں کہ مسیحی کلیسا کو اپنے بت پرست مخالفوں پر غلبہ کامل حاصل ہوا۔ مگر اس زمانے میں ایک اور قسم کی کشمکش کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سلطنت روما کو وحشیوں کے حملے دفع کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کردینا پڑی۔ کلیسائے مسیحی کا غلبہ وحشیوں کی کامیابی میں ممد ہوا کیونکہ حکومت روما اپنی مصروفیت کے سبب سے حملہ آوروں کو اپنے حدود سے نکالنے میں اپنا پورا زور صرف نہ کرسکتی تھی۔

۳۲۵ء کے بعد مختلف اقوام جو زیادہ تر جرمنی الاصل تھیں رفتہ رفتہ حدود سلطنت روما میں اپنا قدم جمانے لگیں بلکہ بعضوں نے تو سلطنت روما کو اپنا مستقل مسکن بنالیا۔ ان واقعات کو کبھی وحشیوں کے حملوں کبھی ہجرت اقوام کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی واقعات سلطنت روما کے اسباب زوال خیال کئے جاتے ہیں۔

قبل اس کے ہم تفصیلاً بیان کریں کہ وحشیوں نے سلطنت روما کے مختلف ممالک پر کسطرح قبضہ کرلیا ان کی نقل وحرکت کے عام حالات بیان کرنا ضروری ہیں۔ واضح رہے کہ وحشیوں کا حملہ سیلاب کی طرح نہ تھا اور نہ یہہ ہوا تھا کہ یکایک سلطنت روما کی سرحدوں کی حفاظت متزلزل ہوگئی ہو جس سے وحشی سلطنت روما کے حدود میں دفعتاً گھس آئے ہوں بلکہ رومیوں نے وحشیوں پر اپنی فوجی برتری ایک زمانے تک قائم رکھی مگر رومی فتوحات کے باوجود وحشی حدود سلطنت میں برابر گھسنے آئے اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سلطنت روما کو شکست دینے کے بجائے وحشی اس میں جذب ہوگئے اور اس طرح رومیوں کو بیدخل کرسکے سلطنت روما کے چند نہایت زرخیز خطوں پر

متصرف ہو گئے یہ بھی واضح رہے کہ سلطنت کو تہ و بالا کر دینے اور اس پر قابض ہو جانے کے قبل ان سب وحشیوں کا سلطنت کے حلقہ بگوشوں میں شمار تھا ہم بیان کر چکے ہیں کہ رومیوں کی یہ عادت تھی کہ سرحد پار کے وحشیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیتے تھے جس وجہ سے وہ رومی انضباط اور فوجی قواعد سے واقف ہو گئے تھے اور اپنی قوموں کو بھی وہ طریقے سکھا دئے تھے۔ وحشیوں کا رومیوں پر غالب ہونے کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ ان لڑائی کی گھاتوں سے واقف ہو گئے تھے جن سے رومیوں نے انکو مغلوب کیا تھا اس کے علاوہ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ گو یہ وحشی نہایت دلیر اور جنگجو تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ خود ایک خوفناک دشمن سے جان بچانے کی غرض سے اپنے وطن کو چھوڑ کر سلطنت روما میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوئے تھے ہر چند سلطنت روما کی کمزوری اور اس کی دولت پر قابض ہونے کا لالچ ضرور انکے حملوں کا باعث تھا مگر اصل سبب یہی تھا کہ وہ خود ایک نہایت ہی خطرناک اور بیرحم دشمن سے پریشان ہو کر بھاگ رہے تھے۔

لفظ وحشی (Barbarian) غیر صحیح معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ حملہ آور رومیوں سے علوم و تمدن میں بہت پیچھے تھے مگر ان سے علم و ہنر سیکھنے کو تیار تھے۔ روما کی عظمت اور اس کے نظام سلطنت کا ان کے دلوں پر رعب جما ہوا تھا۔ انکی نیت یہ تھی کہ تمدن تباہ کردیں بلکہ خود بھی اس میں حصہ لیں۔ قوم گاتھ کی حالت خاصکر یہی تھی۔ اس قوم نے سب سے پہلے روما پر فتوحات حاصل کئے۔ رومی دوسرے حملہ آور وحشیوں کو بھی گاتھ کے نام سے یاد کرتے تھے تیسری صدی عیسوی میں سلطنت روما پر حملہ کرنے کے بعد قوم گاتھ وسطی یورپ میں بحیرۂ اسود سے بحیرۂ بالٹک تک آباد ہو گئی اور کریمیا میں اس کا اصل مرکز تھا جس زمانے میں رومیوں سے ان سے پہلے پہل مڈبھیڑ ہوئی اس وقت یہ قوم بت پرست تھی مگر سو سال کے بعد جب انھوں نے سلطنت روما پر حملہ لیا تو وہ دین مسیحی قبول کر چکے تھے اس قوم میں مذہب مسیحی کو مقدس مبلغ الفیلاس (سنہ ۳۱۱ سنہ ۳۸۰) نے پھیلایا تھا۔ یہ مبلغ فرقہ ایرین سے تعلق رکھتا تھا اور اسی کے عقائد کی اس نے قوم گاتھ میں تبلیغ کی تھی مگر قدیم مسیحیت اور اس فرقہ کے عقائد میں بہت فرق تھا جسکی وجہہ سے آیندہ چل کر قوم گاتھ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس مبلغ نے بائبل کا زبان گاتھک میں ترجمہ کیا اور

یہ نیا مذہب نہایت سرعت کے ساتھ تمام قوم میں بلا کسی مزاحمت کے پھیل گیا چوتھی صدی میں قوم گاتھ مسیحی ہو چکی تھی اور اس کے تمدن پر مذہب مسیحی کو فخر ہو سکتا تھا۔ الفریڈ اعظم کے زمانے سے قبل جو تمدنی حالت انگریزوں کی تھی وہی ان کی بھی تھی اور دوسرے اقوام سے زیادہ ان میں رومی تہذیب کے قبول کرنے کی صلاحیت تھی۔

۳۷۵ء کے قریب قوم ہن جو وسط ایشیا کے تاتاری اقوام سے تھی ان کے زاد و بوم پر بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو گئی، قوم ہن کے حملے کے وجوہ نامعلوم ہیں۔ قوم گاتھ کو دریائے نیسٹر کے کناروں پر شکست ہوئی اور بھاگ کر ڈینیوب پر پہونچی اور سلطنت کے حدود میں داخل ہونے کی خواستگار ہوئی۔ حدود سلطنت کے اندر قوم گاتھ کی تعداد کثیر تھی اس کے علاوہ جزیرہ نمائے بلقان کا شمالی حصہ مسلسل محاربات کی وجہ سے غیر آباد ہو گیا تھا اور زمینیں بنجر پڑی ہوئی تھیں۔ اس لئے قوم گاتھ کی درخواست منظور کی گئی اور ۳۷۶ء سے وہ ڈینیوب کے جنوبی اضلاع میں ٹڈی دل کی طرح آکر آباد ہونے لگے۔ شہنشاہ وقت مسمی والنس (Valens) نے اُن کو آباد ہونے کی اجازت دیدی مگر اس کی طبیعت میں بدگمانی اور ضرر رسانی کا مادہ تھا اور اس وجہ سے دونوں قوموں میں جو دوستانہ پیدا ہو گیا تھا اس میں رخنہ پڑ گیا اور آخر کو جنگ شروع ہو گئی اور (بمقام ایڈریانوپل) ۳۷۸ء میں رومیوں کو شکست فاش ہوئی۔ حملہ رومیوں نے کیا تھا اور قریب تھا کہ فتح انھیں کی ہو مگر اسیوقت گاتھ سواروں کا ایک زبردست رسالہ آگیا جسکی وجہ سے رومیوں کو سخت ہزیمت ہوئی اور پھر اس شکست سے رومی سنبھل نہ سکے کیونکہ ان میں سنبھلنے کا مادہ باقی نہ رہا تھا۔ اس کے بعد بھی کبھی کبھی رومی وحشیوں پر غالب آئے مگر فتح نے ان سے منہ موڑ لیا تھا مگر گاتھ بھی اپنے فتوحات سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکے کیونکہ انکی فوج میں طاعون پھیل گیا اور ان کا سردار مر گیا۔ شہنشاہ تھیوڈوسیس کو ان کے مقابلے میں کچھ کامیابی ہوئی اور آخر کار دونوں فریقوں میں ایک اہم صلحنامہ ہوا جس کی رو سے تھریس اور ایشیائے کوچک کا ایک معتدبہ حصہ ان کو دیدیا گیا اور گاتھوں نے وعدہ کیا کہ وہ چالیس ہزار سپاہی رومی فوجوں میں بھرتی کرنے کے لئے دینگے جن کے افسر بھی گاتھی ہونگے مگر سب شہنشاہ کے زیر علم ہو جنگے سلطنت کے دشمنوں کو

اُن کا محافظ بنانا خطرے سے خالی نہ تھا مگر تھیوڈوسیس کی زندگی میں یہ انتظام قائم رہا اور اگر اُس کے جانشین بھی قابل ہوتے تو سلطنت کو اس سے دائمی نفع ہوتا مگر ۳۹۵ء میں جب اس کا انتقال ہو گیا تو سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کا ایک بیٹا آرکیڈیس قسطنطنیہ میں سلطنت کرنے لگا اور دوسرا ہونوریس اٹلی میں۔ مگر ہونوریس نے روما کے بجائے شہر راونیا کو (Ravenua) اپنا دارالسلطنت قرار دیا کیونکہ اب روما محفوظ خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ راونیا کا موقع نہایت خراب تھا اور دلدلوں سے گھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے بخار کا مرض ہر وقت رہا کرتا تھا مگر یہ شہر روما کے دشمنوں کے حملوں سے محفوظ تھا۔ رومیوں کی قوت کا انحطاط صرف دارالسلطنت کے منتقل کر دینے سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس امر سے بھی کہ رومی اپنے ملک کی حفاظت کا بار وحشیوں پر ڈال رہے تھے ہم بیان کر چکے ہیں کہ رومیوں نے گاتھوں کی ایک تعداد کثیر کو فوج میں شریک کر لیا تھا مگر اس کے علاوہ دوسرے اقوام کے وحشی بھی رومی افواج میں ملازم تھے اور نہ صرف سپاہی کی حیثیت سے بلکہ بڑے بڑے جنرل بھی وحشی النسل تھے۔

۳۹۵ء میں جب تھیوڈوسیس کا انتقال ہوا اور اس کے نااہل بیٹے اس کے جانشین ہوئے تو اسی سال الارک جو قوم گاتھ کا گل سرسبد تھا ان کا بادشاہ ہوا اس کا تعلق مغربی گاتھوں سے تھا اور وہ نہایت جنگ جو حوصلہ مند، عہد کا پکا اور سچا عیسائی تھا مشرقی سلطنت سے اس سے سخت ان بن تھی اور اس کی یہ پہلی یورش شہر قسطنطنیہ پر ہوئی مگر فصیلوں کی مضبوطی کے سبب سے اس کو ناکامی ہوئی اُس کے بعد اُس نے جنوب میں یونان پر دھاوا کیا اور تاخت و تاراج کرتا ہوا بلقان کے شمالی مغربی حصے میں اقامت گزیں ہوا۔ سنہ ۴۰۰ء میں غالباً شہنشاہ آرکیڈیس کی شہ سے جو ایسے خطرناک آدمی کا اپنی حدود سلطنت میں رہنا پسند نہ کرتا تھا الارک نے مغربی طرف اٹلی کا رخ کیا مگر وہاں اس کو برابر فتح نصیب نہیں ہوئی شہر ویرونا کے قریب اس ٹی لی چو جو رومی افواج کا وانڈل سردار تھا اس کا مدمقابل ہوا اور اس نے الارک کو شکست فاش دیکر اطالیہ سے نکال دیا اس ٹی لی چو کو فخر تھا کہ اس نے قوم گاتھ کو ہمیشہ کے لئے نابود کر دیا اور اس کے اعزاز و افتخار میں افزائش ہو گئی۔ مگر کچھ ہی

سال کے بعد الارک کو پھر کامیابی کا موقع ملا۔ شہنشاہ اس جری سپاہی سے بدگمان ہو گیا جس کے اثر کی وجہ سے امور سلطنت میں اس کا کچھ بس نہ چلتا تھا اور انہی کے اشارہ سے ۴۰۸ء میں اس ٹی لی چو قتل کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سپاہیوں نے شاہی فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا اور ہزاروں الارک کی فوج میں جا کر شریک ہو گئے اس لئے جب الارک نے ۴۰۸ء میں دوبارہ حملہ کیا تو اس کے مقابلے کے لئے نہ کوئی جنرل تھا اور نہ فوج ہی تھی۔ اطالیہ کا پورا چکر لگاتا ہوا اور راونیا سے گزرتا وہ روما کی دیواروں کے پاس پہونچا۔ اس نے روما کا تین دفعہ محاصرہ کیا اور اگر چاہتا تو قبضہ بھی کر لیتا مگر الارک میں یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ وہ خود رومی تمدن کا دلدادہ تھا اور گو اس نے رومی افواج سے نبرد آزمائی کی تھی مگر اس کی اصلی خواہش یہ تھی کہ سلطنت روما میں اسے کوئی معزز عہدہ مل جائے۔ اسی وجہ سے وہ دو مرتبہ روما کے محاصرہ سے دست بردار ہوا مگر جب اسے مایوسی ہوئی اور اس نے دیکھا کہ شہنشاہ اور رومی اسے دھوکا دے رہے ہیں اس نے ۴۱۰ء میں تیسری مرتبہ پھر روما کا محاصرہ کر لیا ان اہم واقعات کا ہمیں تفصیلی علم نہیں۔

کیونکہ گاتھوں کا کوئی مورخ نہیں اور رومیوں کو اپنی ہزیمت اور شکست کی تصریح ناگوار تھی مگر اتنا ظاہر ہے کہ جب رسد نہ ہونے سے رومی افواج کی حالت ابتر ہو گئی تو الارک نے دھاوا کر کے شہر پر قبضہ کر لیا اور اس کے سپاہیوں نے قتل عام اور لوٹ مار مچا دی مگر پھر بھی الارک نے اپنے سپاہیوں کو ایک حد تک قابو میں رکھا اور بہت جلد روما کو چھوڑ کر جنوبی اطالیہ کی تسخیر کے لئے روانہ ہو گیا اور وہیں کسی مہلک عارضے میں مبتلا ہو کر قضا کر گیا اور دریائے بوسینٹو کے قریب دفن کیا گیا۔ قبر تیار کرنے کے لئے اس کی فوج نے اس دریا کے دھارے کا رخ پھیر دیا تھا۔

الارک کی فتح روما سے سلطنت روما کا خاتمہ نہیں ہوا مگر مغربی سلطنت کے انحطاط کے اسباب میں یہ ایک نہایت اہم چیز ہے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مرکز ہونے سے روما کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ اہل زمانہ

خیال کرتے تھے کہ اس کی یہ ایک نہایت اہم چیز ہے اس سقوط سے تمدن کی بیخ و بنیاد ہل جائے گی ۔ عیسائیوں پر یہ تہمت لگائی جانے لگی کہ جب تک روما میں قدیم دیوتاؤں کی پرستش ہوتی رہی ہمیشہ فتح ہی فتح رہی مگر جب سے عیسائیت کا رواج ہوا اقبال نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اغسطینوس نے جو رہبانوں میں نہایت نامور ہوا ہے اس کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے جو "شہر خدا" کے نام سے مشہور ہے الارک کی موت سے رومیوں کی ایک بڑے خطرے سے گلوخلاصی ہوئی کیونکہ اپنے سردار کے مرنے سے گاتھ بے سر کے ہو گئے ۔ مگر رومیوں میں سنبھلنے کی صلاحیت بالکل باقی نہیں رہی تھی اور نہ کوئی امید تھی کہ وہ وحشیوں کو اپنے ملک سے نکال سکیں گے الارک اور گاتھوں کی طرح دوسرے وحشی اقوام نے اطالیہ کو اپنا آماجگاہ بنا لیا اور بحیرۂ ایڈریاٹک کے مغربی کنارے کے اضلاع بالکل وحشیوں کے تصرف میں آ گئے یہاں تک کہ مغربی شہنشاہ کی برائے نام حکومت بھی بالکل معدوم ہو گئی ۔ گاتھوں میں الارک کا جانشین اٹالفس ہوا جس نے گالا پلاسیڈیا دختر شہنشاہ تھیوڈوسیس سے عقد کیا اور اس شہزادی کی منت و سماجت سے اس نے اطالیہ کو خیرباد کہکر جنوبی غالیہ اور شمالی ہسپانیہ میں ایک جدید سلطنت قائم کی جو تین سو سال تک قائم رہنے کے بعد ایک دوسری وحشی قوم کے ہاتھوں ختم ہو گئی ۔

اسی زمانے میں افریقہ کا صوبہ جو سلطنت روما کے مقبوضات میں نہایت متمدن تھا رومیوں کے ہاتھ سے نکلکر ایک دوسری وحشی قوم کے قبضہ ۴۲۹ء میں چلا گیا جو وانڈال کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ قوم گاتھوں سے مشابہ تھی اور ابتدا میں خیال کیا جاتا تھا کہ الارک کے سپاہیوں سے یہ لوگ سست ہیں اور ان میں جنگجوئی کا مادہ بھی بہت کم ہے مگر انھیں بھی جنسرک نامی ایک جری سردار مل گیا جسکی سرکردگی میں ملک غالیہ طے کرتے ہوئے وہ ہسپانیہ میں وارد ہوئے اور کئی بڑے بڑے اضلاع پر قابض ہو گئے ۔ صوبۂ افریقہ میں وہاں کے صوبہ دار اور سلطنت روما میں کچھ نزاع تھی جس سے ایک فریق قوم وانڈال سے امداد کا طلبگار ہوا انھوں نے تمام صوبے پر نہایت آسانی سے قبضہ کر لیا شہر قرطاجنہ البتہ دس سال کے بعد یعنی ۴۳۹ء میں ان کے قبضے میں آیا قوم وسی گاتھ کی طرح اس قوم کے فضائل

پسندیدہ نہ تھے یہ لوگ بے رحم لٹیرے اور قزاق تھے افریقہ کا تمدن انھوں نے قریب قریب نیست و نابود کردیا تھا گو مذہبی نزاعوں سے اس صوبے کی حالت پہلے ہی سے ابتر تھی۔ ان مصائب کے دوران میں راہب اگسٹنوس نے کتاب "شہر خدا" مذہب مسیحی کی تائید میں لکھی۔

قوم وانڈال کی تاخت و تاراج کے بعد رومی دنیا میں ایک دوسرے دشمن کا ظہور ہوا جو مذکورۂ بالا دونوں اقوام سے زیادہ خطرناک تھا۔ یہ قوم ہن تھی جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں۔ دریائے لیس ٹر پر فتح پاکر انھوں نے مغرب کا رخ کیا اور سلطنت روما پر حملہ آور ہوئے۔ ان کا سردار اٹیلا تھا جو ایک منتظم تھا جس کا نام ابتک صفحات تاریخ میں یادگار رہے گا تھے تو صرف نام کو وحشی تھے مگر قوم ہن پر لفظ وحشی کا پورا اطلاق ہوسکتا تھا یہ لوگ خانہ بدوش تھے، ایک مقام پر آباد ہونگی یہ وانہ تھی، رومی تمدن سے ان کو نفرت تھی اور ان کا انتظام مملکت نہایت ابتدائی حالت میں تھا مگر جب اٹیلا ایسا سردار ان میں پیدا ہو گیا تو یہ درحقیقت اپنے ہمسایہ اقوام کے لئے خطرناک ثابت ہوئے ۴۴۶ء میں مشرقی رومی سلطنت پر اس نے حملہ کیا اور قسطنطنیہ تک تمام ملک ویران و تباہ کرتا ہوا پہونچ گیا۔ وہاں سے پھر لوٹ مار کی غرض سے اس نے شمال کا رخ کیا اور جرمنی کو طے کرتا ہوا ۴۵۱ء میں غالیہ کی سرحد آ دھمکا۔ غالیہ کا ایک حصہ ابتک رومیوں کے قبضے میں تھا اور جنوبی حصے پر ویسی گاتھ قابض تھے مگر چونکہ اٹیلا کے حملے سے دونوں کو خطرہ تھا اس لئے دونوں نے ملکر اس کا مقابلہ کیا اور ۴۵۱ء میں دونوں متحدہ فوجیں بسرکردگی ایسیس جو رومیوں میں اخیر مشہور جنرل ہے شہر تروائے کے قریب صف آرا ہوئیں گر اس لڑائی کو تاریخ میں جنگ شالوں کہتے ہیں اٹیلا کو شکست ہوئی جس سے غالیہ اس کے پنجے سے چھوٹ گیا اٹیلا دریائے ڈینوب کی طرف واپس ہوا گر قوم ہن سلطنت روما کے اس صوبہ سے نکل کر ایک دوسرے صوبہ میں پھر نمودار ہوئی یعنی ۴۵۲ء میں کوہ الپس کے مشرقی دروں میں سے گذر کر کئی شہروں کو تباہ کرتا ہوا اٹیلا میلان میں پہونچا گر پوپ لیو کی منت و سماجت اور اس کے معزز عہدے سے خائف و مرعوب ہو کر وہ واپس چلا گیا اور ۴۵۳ء میں مرگیا۔

سلطنت روما کی حالت ایسی ابتر ہوگئی تھی کہ نہ کوئی فتح ہی نہ کسی مخالف کی موت ہی اسے وحشیوں کے پنجے سے بچا سکتی تھی اس زمانے میں رومی شہنشاہ والین ٹے ین تھا مگر اس کا اثر اس قدر کم تھا کہ اس کے خصائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے ٹیس سے جس نے اٹیلا کو نیچا دکھایا اس کو حسد بدگمانی تھی اور اس کے اغوا سے یہ زبردست جنرل قتل کردیا گیا۔ اس کے قتل کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر روما پر وحشیوں کا قبضہ ہوگیا۔ قوم وانڈال کا سردار جنسرک اس وقت قرطاجنہ میں تخت سلطنت پر متمکن تھا مگر اسے تاخت وتاراج کی ہوس اب بھی تھی اس کی بحری اور بری فوجیں نہایت زبردست تھیں ۴۵۵ء میں اس قوم کا ایک بیڑہ دریائے ٹائبر میں وارد ہوا اور ان کی فوج نے روما پر دھاوا کردیا۔ شہر میں تاب مقاومت بالکل نہ تھی۔ پوپ لیو کی منت وسماجت سے جنسرک قتل عام سے باز رہا مگر شہر کو اس نے خوب لوٹا اور روما کے خزانے قرطاجنہ پہونچ گئے۔

مگر روما کے لٹ جانے اور تباہ ہوجانے کے بعد بھی اکیس سال تک شہنشاہی کا نام اطالیہ میں قائم رہا اور راوینا کی دلدلوں میں کوئی نہ کوئی شخص برائے نام شہنشاہی پر فائز رہا ان شہنشاہوں کو کسی قسم کا اختیار نہ تھا اور سلطنت کی باگ وحشی النسل سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی۔ ۴۷۵ء میں ایک سپہ سالار مسمی اورسٹیس نے اپنے بیٹے کو روموس آگسٹس ٹولس کے لقب سے شہنشاہ بنادیا اور اس کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ مگر اصل قوت سپاہیوں کے ہاتھوں میں تھی جو تنخواہ کے کم ہوجانے سے ناراض ہوئے اوڈاکر کی سرکردگی میں انھوں نے علم بغاوت بلند کرکے اورسٹیس کو قتل کردیا اور اس کے بیٹے کو تخت سے اُتار دیا اب تخت وتاج اوڈاکر کے سامنے تھا اگر وہ چاہتا تو خود تخت پر بیٹھ جاتا یا کسی دوسرے کو اس عزت سے سرفراز کرتا مگر یہ دونوں طریقے اسے پسند نہ تھے اس نے تاج شاہی اور اس کے دیگر لوازمات کو شہنشاہ کے پاس قسطنطنیہ اس پیام کے ساتھ بھیجدیا کہ اطالیہ کو اب کسی شہنشاہ کی ضرورت نہیں اور اپنے نے صرف "پیٹ ری شین" کے خطاب کا طالب ہوا۔ مشرقی شہنشاہ سے جو درخواست اس نے کی تھی اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ شہنشاہ کے اقتدار کو تسلیم کرتا تھا مگر اصل یہ ہے کہ اس کا اقتدار صرف برائے نام تھا

اور تمام اختیارات اوڈاکر ہی کے ہاتھ میں تھے۔

۴۷۶ء کے یہ واقعات گو خود اہم نہیں اور ہمعصروں کی نگاہ میں بھی ان کی زیادہ اہمیت نہ تھی مگر یہ سال مغرب میں سلطنت روما کے اختتام کا سال ہے جہاں اُسکا نشوونما ہوا تھا اور اس کو فروغ و عظمت حاصل ہوئی تھی لیکن واضح رہے کہ یہ سلطنت روما کا خاتمہ نہیں کیونکہ شاہان قسطنطنیہ اپنے آپکو شہنشاہ روما کہتے تھے اور وہاں شہنشاہی اس کے ایک ہزار سال بعد تک قائم رہی شہنشاہان قسطنطنیہ کو موجودہ حالت سخت ناگوار تھی۔ وانڈال اور وسی گاتھ قوموں اور اوڈاکر کو وہ غاصب خیال کرتے تھے اور بہت جلد انھوں نے مغربی سلطنت پر دوبارہ قبضہ کرنیکی زبردست کوشش کی جس میں انکو نہایت شاندار مگر عارضی کامیابی ہوئی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ قومیت، زبان اور خصائل کے اختلاف کی وجہ سے اقوام غرب سے شہنشاہان قسطنطنیہ کو وفاشعاری کی امید نہ ہوسکتی تھی اور مغربی یورپ کا مستقبل وحشی اقوام سے وابستہ تھا جنھیں متمدن و شائستہ ہوجانے کے بعد اب وحشی کہنا بجا نہ ہوگا۔

باب سوم

اطالیہ چھٹی صدی عیسوی میں

اوڈاکر کے فتوحات سے اطالیہ بالکل اس کے قبضے میں آگیا۔ مگر اسے بھی چین نصیب نہ ہوا کیونکہ وحشیوں کی دوسری جماعت اس کی بیخ کنی کے لئے تیار ہوگئی۔ اس قوم کا نام اسٹرو گاتھ (مشرقی گاتھ) جو قوم وسی گاتھ (مغربی گاتھ) مذکورہ سابق کی ہم نسل تھی۔ قوم ہن نے جبراً ان کو اپنی فوجوں میں شریک کر لیا تھا اٹیلا کی فتح و شکست دونوں میں یہ شریک تھے اور اس وقت دریائے ایڈریاٹک کے مشرقی ساحلوں پر آباد تھے۔ ان کا سرگروہ تھیوڈورک تھا جس نے قسطنطنیہ کے دس سالہ قیام میں سلطنت روما کے مذہب و تمدن، طریقہ حکمرانی اور اس کی خرابیوں سے پوری واقفیت حاصل کر لی تھی اور اسی کے عادات و خصائل پر وہاں کے قیام کا گہرا اثر پڑا تھا چنانچہ ۴۸۹ء میں شہنشاہ زینو (Zeno) کے اصرار سے اس نے اطالیہ پر شمالی مشرقی دروں کی طرف سے حملہ کر دیا اور مدت دراز کی جنگ وجدال کے بعد اس کو کامیابی ہوئی۔ اوڈاکر کو تین جگہ شکست ہوئی جس کی وجہ سے وہ روانیا آکر قلعہ گزیں ہو گیا مگر آخر کار قحط کی وجہ سے ہتھیار ڈال دینا پڑا۔ فاتحین نے اسے بدعہدی سے قتل کر دیا اور تمام اطالیہ تھیوڈورک کے قبضے میں آگیا۔

تھیوڈورک نے اطالیہ میں ۴۸۹ء سے ۵۲۶ء تک حکومت کی اور اس کے دور حکومت کے بعض واقعات دلچسپ اور قابل تذکرہ ہیں کیونکہ دوسری صدی سے آٹھویں صدی تک عالم رومی میں زوال اور انحطاط کے سوا سنبھلنے کے آثار کہیں نمایاں نہیں مگر تھیوڈورک کی حکومت ان عیوب سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس نے رومی سلطنت کے آثار پر ایک دیرپا حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی اپنا دارالسلطنت

راوینا کو قرار دیا اور اس کے کلیساؤں اور دیگر عمارتوں میں شاندار اضافہ کیا۔ ان عمارتوں کی تعمیر اور سیاسی معاملات میں اس نے رومی النسل لوگوں کو اپنا مشیر بنایا۔ اس کا وزیر اعظم کیسیوڈورس (Cassiodorus) رومی تھا اور اس کا میر منشی (چیف سکرٹری) بے تھیس تھا جس پر لاطینی ادبیات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس نے دربار کی وہ رسوم اور طریقۂ حکومت اختیار کیا جو مشرقی سلطنت میں رائج تھا۔ اس کا قصد تھا کہ رومیوں کے تمدن اور گاتھیوں کی قوت کو یکجا کر دے اور اگر اتفاقی حوادث اس کے سدراہ نہ ہوتے تو اس کی قائم کردہ سلطنت دیرپا ثابت ہوتی۔

مذہبی معاملات میں بھی فاتح کا طرز عمل قابل توجہ ہے (His dealings with religionare cespacially note worthy) وہ بذات خود ایرین تھا اور چونکہ یہ مذہب اس کو اور اس کی قوم کو مرغوب طبع تھا۔ اس لئے اس نے کبھی اسے چھوڑنے کا خیال نہ کیا مگر قدیم کلیسیا کے ساتھ اس نے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کے پیروؤں کو کبھی پریشان نہ کیا۔ اسقفان مسیحی سے اس سے روابط تھے اور پوپ کو بھی وہ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا مذہبی رواداری کی ایسی مثال آئندہ ایک ہزار سال تک نہ ملیگی مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ طرز عمل کامیاب نہ ہو سکا چونکہ کیتھولک کلیسا بلا شرکت غیرے حکومت کرنا چاہتا تھا۔ اور اطالیہ میں ایک علیحدہ ایرین کلیسا کا وجود اسے ناگوار تھا کیتھولک کلیسا کے پیرو اس سے علیحدہ اور اس کے مخالف رہے۔ اور اس طرح مذہبی عنصر جو قرون وسطی میں (And thus) اکثر اتحاد کا نہایت زبردست ذریعہ تھا نا اتفاقی کا باعث ہو گیا تھیوڈورک کا ایرین ہونا۔ اس کے منصوبوں کے خاک میں ملجانے کا ایک خاص سبب تھا۔

قوم آسٹروگاتھ نے دیہات پر قبضہ کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک اطالیہ کا ایک ثلث ان کی آبادی کے لئے دیدیا گیا تھا اور اطالیہ کے قدیم باشندے شہروں میں رہتے تھے۔ تھیوڈورک کے عہد سلطنت کے آخر تک اطالیہ میں پورا امن و امان تھا اور اس کی وجہ سے تجارت کو بھی فروغ ہونے لگا یہاں تک کہ پوپ کو بھی مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ اطالیہ کو آخر کار جنگ وجدال کی بے اطمینانی کے بعد دم لینے کا موقع ملا ہے۔ لوگوں کو امید ہو چلی تھی کہ مسلسل محاربوں اور بیرونی حملوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ تھیوڈرک نہایت منصف مزاج تھا جس کی وجہ سے اسے کامیابی

ہوئی اور اطالیہ اور مغربی یورپ میں اس کا کوئی ہم پلہ بادشاہ نہ تھا۔ تمام نئی وحشی حکومتوں سے اس کا یارانہ تھا اور سب پر اس کو فوقیت حاصل تھی۔
مگر افسوس ہے کہ آخری زمانے میں اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ قدیم رومی کلیسا والے اس سے متنفر تھے اور اس کے بڑھاپے میں اس کی جانشینی کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہو گیا۔ اس کے صرف ایک لڑکی تھی جس کا شوہر مر گیا تھا اور اس کا وارث ایک پانچ سال کا بچہ تھا۔ تھیوڈورک کو عالم سراسیمگی میں یہ وہم ہو گیا کہ اس کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں جن سے وارفتہ ہو کر اس نے مظالم شروع کر دئے۔ اپنے میر منشی بے تھیس کو اس نے قتل کرا دیا اور جان پاپائے رومہ کو قید خانے میں اس شبہہ پر بھیجا کہ وہ قسطنطنیہ سے سازش کر رہا ہے چنانچہ جان قید ہی میں مر گیا اور اس عالم بے اطمینانی میں وہ خود بھی ۵۲۶ء میں انتقال کر گیا۔
تاریخ اطالیہ کے آیندہ باب کے سمجھنے کے لئے ہمیں قسطنطنیہ پر ایک نظر ڈالنا چاہئے جہاں انحطاط کے کوئی آثار (No sign) نمایاں نہ تھے سلطنت پھر اپنی اصلی قوت پر آ رہی تھی اور وحشیوں کی طرف سے کوئی خدشہ نہ تھا بادشاہ قسطنطنیہ کے تدرتی موقع سے نفع اٹھا رہا تھا۔ ایشیا کی صدیوں کی دولت فراواں کا وہ مالک تھا، شام ومصر سے غلہ اور دوسرے قیمتی اشیاء دست یاب ہوتے تھے گو سلطنت کا مغربی حصہ شہنشاہ کے قبضے سے نکل چکا تھا مگر رقبہ کے کم ہو جانے سے در اصل اس کی قوت دوبالا ہو گئی تھی۔ شہنشاہ جسٹینین ۵۲۷ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا اور ۵۶۵ء تک برسر حکومت تھا شہنشاہی کی تاریخ میں اس کا نام درخشاں حروف میں لکھا ہوا ہے مگر یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے فتوحات سے سلطنت میں استحکام کے بجائے ضعف آ گیا۔ اس کی بیوی تھیوڈورا ایک زمانے میں کسی تھیٹر میں رقاصہ تھی مگر اس نے اپنے حسن اور دلفریبی سے بادشاہ کو اپنا غلام بنا لیا تھا اور اس میں غضب کی فراست اور معاملہ فہمی بھی تھی جس وجہ سے بادشاہ کو امور سلطنت کے انصرام میں مدد ملتی تھی۔ بے لی ساریس کا نام بھی جسٹینین کے نام کے ساتھ ہمیشہ یادگار زمانہ رہے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا سپاہی تھا گو یہ قول مبالغہ آمیز ہے مگر اس میں شک نہیں کہ چھوٹی چھوٹی

فوجوں کے بل پر اس نے شاندار فتوحات حاصل کئے جس سے اس نے رومنوں کی عظمت کو دوبارہ زندہ کر دیا اور اس کے پیشروؤں کے کارنامے ماند پڑ گئے شہنشاہی فوجیں مختلف العناصر تھیں۔ نصف سے زیادہ اس میں وحشی تھے جنمیں سب سے ممتاز ایشیائے کوچک کی اسوری قوم تھی جو اپنی حربی قابلیت کی وجہہ سے رومی افواج کی پشت پناہ ہو گئی تھی چھٹی صدی عیسوی کی فوجیں جولیس سیزر اور ٹریجن کے زمانے کی فوجوں سے مختلف تھیں۔ پیدل سپاہیوں کے بجائے جو چھوٹی تلواروں سے مسلح تھے اب تیر انداز سوار فوج میں زیادہ تھے اور اسی عجیب وغریب فوج سے بے لی ساریس نے اپنے فتوحات کئے۔ اسکی فوج کی تعداد بھی قلیل تھی مگر تعجب ہے کہ انھیں کے بدولت اس نے اپنے آقا کے مقبوضات میں اضافۂ کثیر کیا۔ فن حرب میں اس کو کمال حاصل تھا، اس کی فوجیں سرعت کے ساتھ نقل وحرکت کر سکتی تھیں اور جلد جلد دھاوا کر کے دشمن کی بڑی بڑی مگر بے ڈول فوجوں پر غالب آتی تھیں۔

قسطنطنیہ کے باشندے نہایت سرکش تھے اور اُن سے جسٹینین کو اپنی حکومت کے ابتدائی زمانے میں پریشانی رہتی تھی اور سب سے پہلے بے لی ساریس نے انھیں لوگوں پر اپنا سکہ جمایا اور جب اس سے فراغت ہوئی اور بادشاہ کو اپنے جنرل اور اس کی فوج کی قوت کا احساس ہو گیا تو اس نے اپنے گم گشتہ مغربی مقبوضات کو دوبارہ فتح کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ ۵۳۳ء میں بے لی ساریس سواحل افریقہ پر وارد ہوا۔ قوم ونڈال جو یہاں حکمراں تھی اور جس نے اپنے مشہور قائد جنسرک کے زیر کمان سلطنت روما کو تہ و بالا کر دیا تھا اب عیاشی بدنظمی اور فنون سپہ گری سے عاری ہو جانے کے باعث بالکل بے حس ہو گئی تھی غنیم کے مقابلے کی تاب نہ لا سکی دو لڑائیوں میں اس زرخیز صوبے کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا اور وہ پھر شہنشاہی کا ایک جزو بن گیا۔ افریقہ سے صرف ۵۰۰۰ سپاہی لیکر اس بہادر جنرل نے سسلی پر قبضہ کر لیا اور ۵۳۶ء میں جنوبی اطالیہ میں وارد ہوا۔

اسٹروگاتھ قوم میں بھی ونڈال قوم کی طرح وہ دم خم باقی نہیں رہا تھا۔ مگر پھر بھی ان کی حالت اس درجہ ابتر نہ تھی۔ اور سنبھلنے کی صلاحیت ان میں اب بھی

موجود تھی۔ ان کے انحطاط کے اسباب کا معلوم کرنا دشوار ہے۔ رومیوں اور کلیسہ کی منافرت کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور اس کے علاوہ فتحیابی کے سبب سے ان کے اتحاد اور قوت میں فرق آ گیا تھا۔ رومی جنرل یکے بعد دیگرے فتوحات حاصل کرتا رہا۔ آسٹرو گاتھ کے قائد مدافعت بالکل نہ کر سکے اور نیپلس اور روما دونوں شہر ان کے قبضے سے نکل گئے۔ ان کی فوج ڈیڑھ لاکھ تھی اور بے سی لاریس کے ساتھ صرف پانچ ہزار آدمی تھے مگر پھر بھی روما پر وہ دوبارہ قبضہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد ان کی فوج میں بغاوت پھیل گئی اور رسد معدوم ہو گئی جس کے باعث ان کے دارالسلطنت راونیا پر بھی بے سی لاریس کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے وہ قسطنطنیہ واپس ہوا جہاں اس کا نہایت شاندار استقبال ہوا۔ شہنشاہ کی فوجوں کو جو مسلسل کامیابی ہوئی اس کی وجہہ سے تمام یورپ میں اس کا سکہ جم گیا۔ افریقہ اور اطالیہ کے علاوہ اس کی فوج ظفر موج نے ۵۵۴ء میں ہسپانیہ کے جنوبی حصے پر بھی قبضہ کر لیا۔

مگر ان فتوحات کے بعد سے قسمت نے جسٹی نین اور اس کے جنرل کا ساتھ چھوڑ دیا اور سلطنت روما کے استقلال اور استحکام کی جو امید اس کے ابتدائی کارناموں سے پیدا ہوئی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور سخت مالی مشکلات پیدا ہو گئے۔ بادشاہ کو عمارات کا نہایت شوق تھا اور کلیسہ سینٹ صوفیا واقع قسطنطنیہ (مسجد ایا صوفیہ) اور دوسرے مقامات کے گرجے اس کے حسن تعمیر کی اب تک داد دیتے ہیں مگر کثرت تعمیر میں خزانۂ شاہی خالی ہو گیا۔ ایرانیوں کے ساتھ بھی سلسلۂ رزم و پیکار شروع ہو گیا تھا اور گو آخر میں شہنشاہی فوجیں ظفریاب ہوئیں مگر ایرانی سخت جنگ و جدال کے بعد پسپا ہوئے۔ جسٹی نین کے آخری زمانے کی ناکامیابی کا راز اطالیہ کی حالت میں مضمر ہے اطالیوں کو اسٹروگاتھ قوم سے نفرت تھی اور چونکہ شہنشاہ قسطنطنیہ کم از کم برائے نام رومی تھا اس لئے اس کی حکومت پسند کی گئی مگر جنگ سے تمام ملک میں قحط رونما ہو گیا اور مصیبت کو دوبالا کرنے کے لئے طاعون بھی پھیل گیا۔ تھیوڈورک کے زمانے میں اطالیہ میں پھر مرفہ الحالی ہونے لگی تھی مگر اب پھر خانہ ویرانی ہو گئی اور محصولات سرکاری کا

بوجھ بھی اتنا تھا کہ اطالوی اس سے پریشان ہو گئے اور گاتھیوں کی حکومت کو غنیمت سمجھنے لگے۔ اس قوم میں بھی ایک نیا سردار پیدا ہو گیا جسکا نام ٹائیلا تھا اور جس کا شمار اس قوم کے اکابر میں ہوتا ہے۔ ٹائیلا ایک جری اور نبرد آزما سپاہی تھا اور نہایت پکا عیسائی منصف مزاج اور رحمدل تھا۔ اس کے زیر کمان گاتھی فوجیں تمام اطالیہ میں پھیل گئیں اس کے مقابلے کے لئے بلے طاساریس پھر بھیجا گیا مگر اس کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ گاتھیوں کا مقابلہ کر سکے۔ روما پر اس نے دوبارہ قبضہ کر لیا مگر اس کی کامیابی چندروزہ تھی شہنشاہ اس سے ناخوش ہو گیا تھا اس لئے وہ واپس بلا لیا گیا اور روما پر پھر ٹائیلا کا قبضہ ہو گیا۔ تمام ملک اطالیہ بھی اس کے قبضے میں آگیا۔ البتہ راونیا فصیلوں اور دلدلوں کے سبب سے محفوظ تھا۔ مگر شہنشاہ کی قوت ابھی اتنی ضعیف نہیں ہوئی تھی کہ وہ اطالیہ کے ہاتھ سے نکل جانے پر صبر کرتا اس لئے ایک زبردست فوج اس نے اپنے ایک سن رسیدہ خانگی لازم نارسیس کے زیر کمان بھیجی جو براہ خشکی اطالیہ پہونچی اور راونیا پہونچکر اس نے روما کا رخ کیا اور بمقام ٹاگنی اس سے اور ٹائیلا سے مقابلہ ہوا۔ گاتھیوں کو شکست ہوئی اور ٹائیلا اپنے زخموں سے جانبر نہو سکا۔ جنگ کا سلسلہ اس کے بعد بھی قائم رہا مگر گاتھیوں کے قدم اکھڑ گئے تھے چنانچہ ۵۵۳ء میں انھوں نے اطالیہ سے چلے جانے کی اجازت چاہی اس کی اجازت ان کو دیدی گئی اور کوہ الپس کو طے کرتے ہوئے اطالیہ سے نکل گئے اور قوم وسی گاتھ میں شامل ہو کر صفحۂ تاریخ سے ناپید ہو گئے۔ جسٹی نین کی سلطنت کا خاتمہ کامیابی کے ساتھ ہوا۔ ملکہ تھیوڈرا نے ۵۴۸ء میں انتقال کیا اور ۵۶۵ء جسٹی نین اور بلے سی لاریس دونوں مر گئے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جسٹی نین کے فتوحات سے ممکن ہے کہ سلطنت بجائے مستحکم ہونے کے ضعیف ہو گئی ہو اور اس لحاظ سے عظمت شہنشاہی کو برقرار رکھنے کے بجائے اس کی بربادی کا باعث ہوا ہو۔ مگر اس کا ایک کارنامہ ایسا ہے جس کے سبب سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا یعنی اس کے حین حیات میں اور زیادہ تر اسی کی زیر ہدایت ترتیب و تدوین قوانین رومی کا کام ختم ہو اجو کئی صدی

بربریوں کے حملے
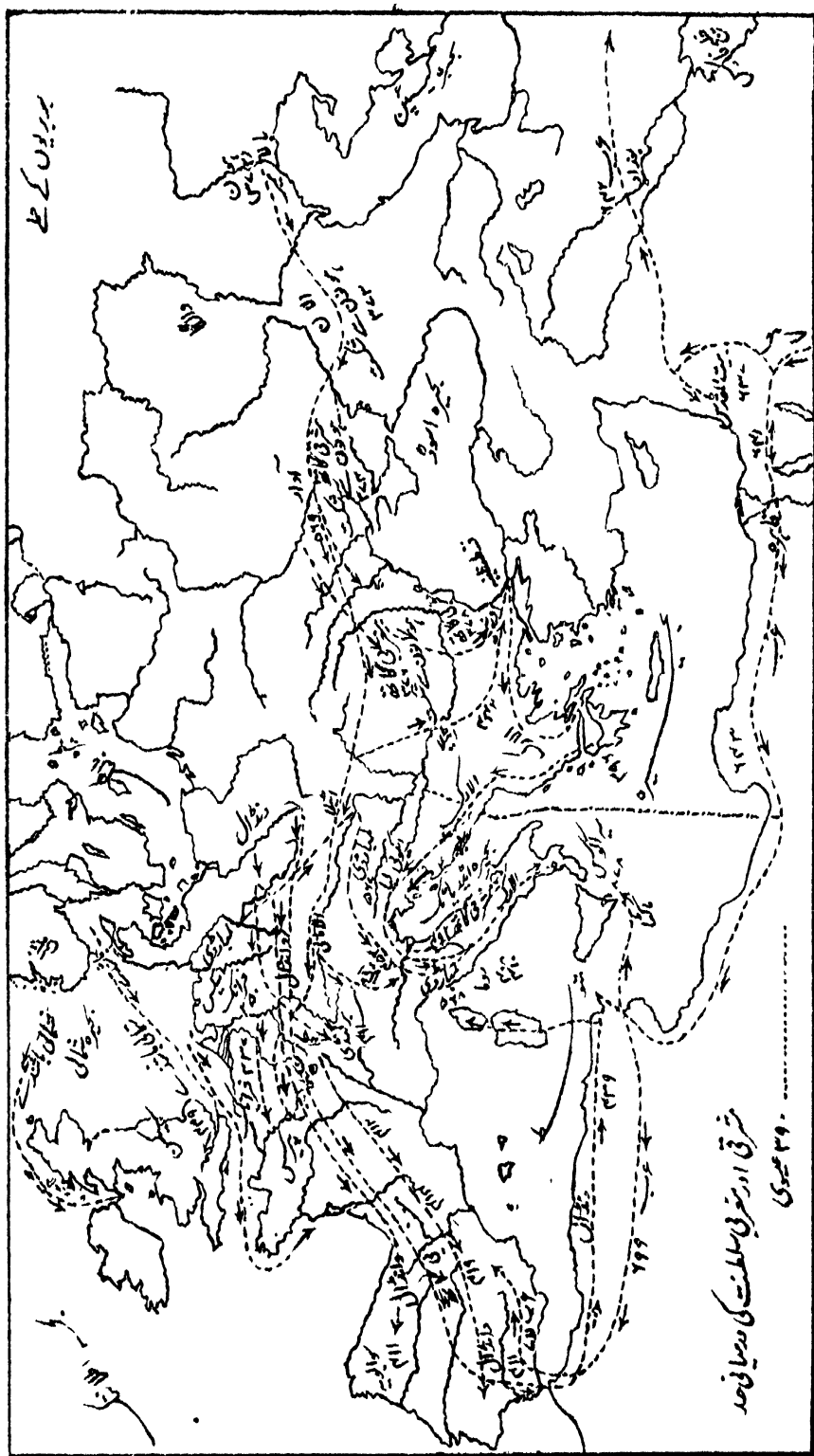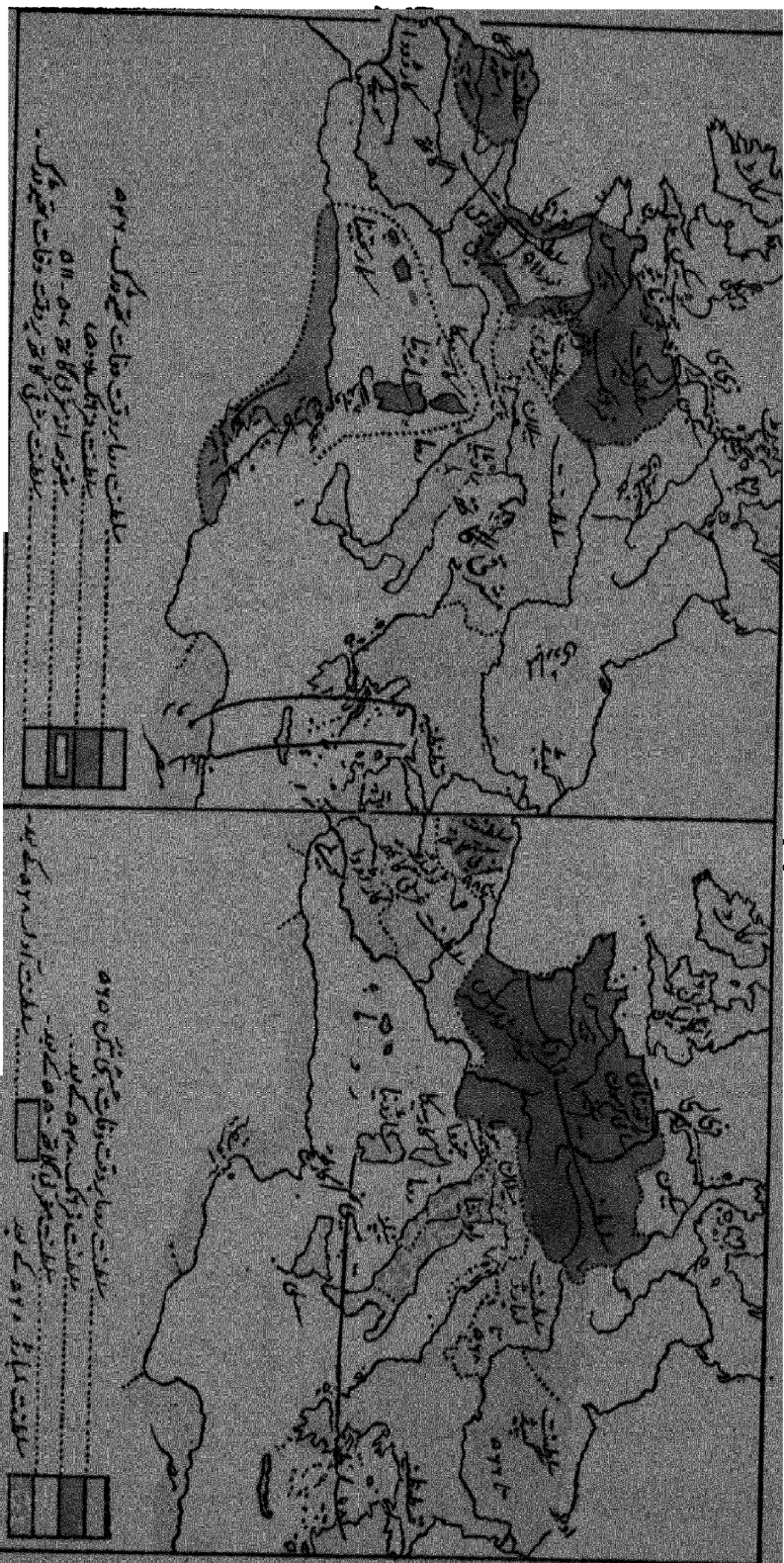
قبل شروع ہوا تھا اور بڑے لائق رومی مقنن اس کام میں برابر لگے ہوئے تھے یہ عظیم الشان کام اب ختم ہوگیا اور اس طرح تمام قوانین روما نہایت اعلیٰ ترتیب و اختصار کے ساتھ تمام دنیا میں شائع کئے جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ قانون روما کا اثر یورپ میں قرون وسطےٰ میں نہایت گہرا تھا۔ اقوام مغرب کچھ زمانے کے بعد اس گراں بہا خزانے سے واقف ہوئے مگر جب ان کو اس کا علم ہوا تو اس کی اہمیت، معقولیت، انصاف پسندی اور انسانیت ان کے دل پر نقش ہوگئی اور اس کو یہ قومیں ایک مصحف آسمانی خیال کرنے لگیں۔

خیر یہ جملہ تو معترضہ تھا۔ نارسیس کی فتوحات سے نہ ملک میں امن و امان قائم ہوا اور نہ اس کی مرفہ الحالی نے عود کیا۔ مصولات کی بھرمار ہوگئی۔ اور جب شہنشاہی فوجیں واپس گئیں تو ملک کا حفاظت کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔ جس کے باعث وحشیوں کو پھر یورش کرنے کا جلد موقع مل گیا۔ نارسیس کی فوج میں ایک جرمن قوم تھی جس کا نام لمبارڈ تھا۔ اس کی ابتدائی تاریخ اور سرگردانیوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اطالیہ کی زرخیز زمینوں کو وہ دیکھ ہی چکے تھے اس وقت وہ چلے گئے مگر پندرہ سال کے بعد ان کا ایک جم غفیر اطالیہ پہنچ گیا مشرق سے کوئی مدد کرنیوالا نہ تھا اور رفتہ رفتہ قوم لمبارڈ کا اطالیہ کے بیشتر حصہ پر قبضہ ہوگیا اور انکا کوئی حریف باقی نہ تھا اس قوم کی دوسری اقوام کی طرح ایک حکومت نہ تھی۔ بادشاہ ان میں ایک برائے نام تھا اور اس کا اثر بہت کم تھا اس لئے ان کے جتھے اطالیہ میں بلا کسی ترتیب کے پھیل گئے شہنشاہان قسطنطنیہ کے قبضے میں چند مستحکم مقامات رہ گئے تھے اور راونیا بھی انکے قبضے میں ۷۵۱ء تک باقی رہا تھا جس سے راونیا اور روما کے درمیان سلسلۂ رسل ورسائل قائم تھا۔ اس کے علاوہ جزائر سسلی، سارڈینیا اور کرسیکا پر بھی انہیں کا قبضہ تھا اور جنوبی اطالیہ میں بھی چند ان کے قلعے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی بحری قوت کا کوئی مدمقابل نہ تھا اور ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان تمام مقامات کے علاوہ تمام ملک پر قوم لمبارڈ کا قبضہ تھا۔ ان کا بادشاہ پے ویا شمالی اطالیہ میں رہتا تھا مگر جنوبی اطالیہ میں جو لمبارڈ رئیس تھے اسکی کچھ پروا نہ کرتے تھے لمبارڈ جب اطالیہ میں وارد ہوئے بت پرست تھے مگر رفتہ رفتہ مسیحی ہوگئے اور گو ابتداءً یہ لوگ ایرین تھے مگر کچھ روز کے بعد کاتھولیک

ہو گئے اور اس وجہ سے اس قوم کو بہت فروغ ہوا۔ ان کے خصائل وی گاتھ اور آسٹرو گاتھ اقوام کے مقابلے میں پسندیدہ نہ تھے اور اطالیہ کے باشندے ان سے نفرت کرتے تھے۔ مگر گاتھوں اور اطالیوں کے درمیان جو مذہبی تنفر تھا وہ لمبارڈ کے ساتھ نہ تھا اور اسی وجہ سے دوں قومیں دائرۂ مملکت میں آکر شیر و شکر ہو گئیں۔ گاتھوں کا نام اطالیہ سے بالکل غائب ہو گیا ہے مگر اطالیہ کا شمالی میدان اب تک لمبارڈ قوم کے نام کی رعایت سے لمبارڈی کہا جاتا ہے اور جزیرہ نما کی آبادی اور تمدن میں اب تک ان کا عنصر باقی ہے۔

قرون وسطیٰ کی تعمیری قوتیں۔ پاپائیت اسلام فرنگ

گاتھ قوم کے اولوالعزم بادشاہوں نے جس نظام سلطنت کے قیام میں اپنی کوششیں صرف کردی تھیں وہ ناپائدار ثابت ہوا اور چند روز کے بعد مٹ گیا اسیطرح شہنشاہان مشرق نے اطالیہ اور سرزمین مغرب میں اپنا اثر دوبارہ قائم کرنے کے لئے جو سعی بلیغ کی وہ بھی ناکام ثابت ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم تمدن برباد ہو رہا تھا اور بظاہر اس کرم خوردہ تمدن پر کسی جدید عمارت کی تعمیر کے کوئی آثار نمایاں نہ تھے مگر تاریخ عالم میں کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے جس میں ناکامی اور انحطاط کے علاوہ ترقی کی کوئی جھلک نہ ہو اور اگر چھٹی اور ساتویں صدیوں کی تاریخ پر نظر غائر ڈالی جائے تو ایسی قوتیں نمودار ہونگی جن کے باہمی تصادم سے وہ نتائج پیدا ہوئے جن کا قرون وسطیٰ کے ممتاز خصوصیات میں شمار ہے۔

قرون وسطےٰ کی ممتاز تر ہے کہ مذہب اور ہادیان مذہب کا اثر عوام میں بیحد بڑھ رہا تھا اس لئے اس موضوع پر ہم سب سے پہلے بحث کرینگے مسیحی کلیسا ابتدا ئے قیام سے برابر اپنا اثر بڑھاتا جاتا تھا مگر چھٹی صدی میں اسکا نظام اور بھی مضبوط اور استوار ہو گیا اور اس کی قوت پر نگاہیں پڑنے لگیں۔ اس قسم کا اقتدار حاصل کرنے میں اسے "رہبانیت" اور "پاپائیت" دو طریقوں سے بہت مدد ملی۔

رہبانیت دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں کیونکہ عیسائیت کے وجود سے پیشتر بھی یہ رواج تھا کہ اکثر عورتیں اور مرد دنیا سے دست کش ہو کر یاد خدا میں مصروف ہو جایا کرتے تھے۔ ہندوستان میں سادھوؤں اور تپسیا کرنے والوں کے

متعدد گروہ تھے، روما میں ویسٹل کنواریوں کا طبقہ تھا جو مابعد کے زمانے میں خانقاہوں کے مشابہ تھا۔ مسیحیت کی اشاعت کے بعد سلطنت کے مشرق میں رہبانیت کا زور ہوا۔ زہاد اور عباد کی تعداد کثیر مصر کے صحراؤں میں گوشہ نشین ہوگئی اور خود اطالیہ میں بہت سے لوگ مذہبی غلو کے باعث تارک الدنیا ہوکر خانقاہوں میں رہنے لگے۔ مگر ان کے یہ افعال ذاتی تھے اور چونکہ کوئی منضبط نظام نہیں تھا اس لئے افراط و تفریط ہوگئی۔ اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئیں اور بعض راہب تو پورے پورے ڈاکو بن گئے۔ سینٹ بی نی ڈکٹ (۴۸۰ء تا ۵۴۳ء) ہی رہبانیت کے لئے قوانین منضبط کر کے ایسی شکل میں لے آیا جس سے تاریخ یورپ پر اس کا بیحد اثر پڑا ہے۔ مگر واضح رہے کہ سینٹ بی نی ڈکٹ راہبوں کے کسی خاص گروہ کا بانی نہ تھا بلکہ خانقاہوں کا نظام اس نے درست کیا تھا اور قانون بنائے تھے اور جن خانقاہوں کا وہ خود نگراں تھا ان میں ایسے اصلاحات عمل میں لایا تھا کہ رہبانیت کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ ان خانقاہوں میں جو لوگ داخل ہوتے تھے ان کو عہد کرنا پڑتا تھا کہ وہ عمر بھر نکاح نہ کرینگے اور اپنے مرشد کی پوری تابعداری کرینگے۔ اس کے علاوہ ان کو اپنی تمام عمر خانقاہ اور کلیسیہ کی خدمت کے لئے وقف کردینا پڑتی تھی یہ لوگ زراعت بھی کرتے تھے جس وجہ سے تعلیم اور زراعت ان کے قبضے میں آگئی تھی۔ سینٹ بی نی ڈکٹ راہبوں کے لئے تنہائی ضروری خیال نہ کرتا تھا بلکہ ناپسند کرتا تھا اور اس کے مرید ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے تھے اور ان کا کوئی فعل انفرادی حیثیت سے نہ ہوتا تھا بلکہ ہمیشہ ایک جماعت کے طور پر۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہر ایک خانقاہ اپنے معاملات کا انتظام کسی بیرونی مداخلت کے بغیر خود کرتی تھی اور پاپائے روما کے سوا کسی بشپ کا اس پر کوئی اثر نہ تھا سینٹ بی نی ڈکٹ کے مریدوں میں ہر طبقے کے لوگ تھے، رومی اور وحشی احرار اور غلام اس کے نزدیک سب برابر تھے۔

خانقاہوں کا تمدنی اثر نہایت اہم تھا گو اسکا تجزیہ دشوار ہے۔ صنعت و حرفت اور زراعت کو فروغ دینے میں ان کے خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے زنانہ خانقاہوں کے قیام سے جن کا تمام انتظام عورتوں سے متعلق تھا فرقۂ اناث کا

وقار بہت بڑھ گیا تھا اور علوم و فنون کی شمعیں بھی انھیں خانقاہوں میں جلتی رہیں حالانکہ اس وقت تمام یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، مگر خانقاہوں نے سب سے زیادہ خدمت پاپائے روما کی کی ہے اور اس کا اقتدار قائم رکھا ہے آس پاس کے بشپوں اور حکام خانقاہ سے اکثر مخالفت رہتی تھی مگر پوپ کی فرمانبرداری کی تعلیم ہمیشہ خانقاہوں میں ہوتی تھی۔ پاپائے روما کا اقتدار جب کبھی بڑھا ہے خانقاہوں کے نظام میں کچھ نہ کچھ تغیر ضرور ہوا ہے، یوں سمجھنا چاہیے کہ پوپ کے لئے ہر خانقاہ ایک قلعہ تھی۔

سینٹ بی نی ڈکٹ نے جب یہ کام ختم کر لیا اور اس کا انتقال ہو گیا اس کے کچھ ہی روز بعد روما کی مسند پاپائی پر گریگوری اعظم (۵۹۰ تا ۶۰۴ء) میں متمکن ہوا اس کے وجود سے نظام کلیسیہ کو نہایت تقویت پہونچی اور کلیسیہ روما کی قوت تمام مسیحی ممالک میں مسلم ہو گئی اسی پوپ نے انگلستان کو مبلغ بھیجے ہیں کے مساعی سے اس جزیرے کے جنوبی حصے میں مسیحیت کو پھر فروغ ہوا گو اس کے شمالی اور مغربی حصوں میں اب بھی اس مذہب کے آثار باقی تھے اور اسی کی کوشش سے قوم لمبارڈ کلیسیہ روما میں آہستہ آہستہ داخل ہوئی۔ اس قوم کا بادشاہ نہایت بیدار مغز اور اولوالعزم تھا اور اکثر پوپ سے سیاسی اور ملکی معاملات میں برسر پرخاش رہا کرتا تھا مگر اس کی بیوی نہایت راسخ الاعتقاد کاتھولک تھی اور اس کے اثر سے بادشاہ آگیلوف اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ اس کے بڑے بیٹے کو کلیسیہ رومی میں اصطباغ دیا جائے اور اس طرح تمام قوم لمبارڈ کلیسیہ رومی کی پیرو ہو گئی۔

پوپ کی قوت اسباب ذیل سے بہت بڑھتی جاتی تھی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ پوپ کا اقتدار اٹلی میں دیگر حکام سے زیادہ تھا۔ شہنشاہ جسٹی نین نے عدالتی اور ملکی معاملات میں اس کو بہت کچھ اقتدار دیدیا تھا۔ اطالیہ میں مختلف حکام کے باہمی نزاعات سے ابتری پھیلی ہوئی تھی، مشرقی شہنشاہی کا ایک نائب راوینا میں رہا کرتا تھا مگر اس سے لمبارڈ بادشاہ اور ڈیوکوں سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔

قوم فرینک نے شمالی اضلاع پر قبضہ کر لیا تھا۔ شمال مشرق میں ایک جدید تورانی قوم آوار نامی جو قوم ہن کی ہم نسل تھی یلغار کر رہی تھی۔ شہنشاہان مشرق کی قوت رو بہ انحطاط تھی اور لمبارڈی روساء ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ اس عالم ابتری میں پوپ کے سوا رعایا کا ملجا و ماوا اور کون ہو سکتا تھا۔ کلیسیہ کی دولت اور قوت المضاعف ہو رہی تھی۔ اور مقبوضات بڑھ رہے تھے جن کے انتظام میں پوپ کا زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ پوپ گرگوری نے کلیسیہ کے رسوم عبادات، اور موسیقی میں بہت کچھ اصلاح کی جس سے غیر مسیحیوں پر اس کا زیادہ اثر پڑنے لگا پوپ گریگوری علاوہ ان کارہائے نمایاں کے بذات خود نہایت برگزیدہ آدمی تھا اور مرنے کے بعد اس کا شمار مسیحیوں کے اولیاء اللہ میں ہونے لگا جو اصلاحیں کہ اس نے کلیسیہ کے انتظام میں کیں ان کا اثر اب تک باقی ہے۔

سرزمین یورپ میں جب ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، علوم و فنون کی کساد بازاری تھی، مذہبی نزاعوں سے خلقت پریشان اور مبتلائے توہمات تھی، وحدانیت کا آفتاب ریگستان عرب میں طلوع ہوا اور اس کی درخشاں لیے شعاعوں سے تمام عالم دیکھتے ہی دیکھتے منور ہو گیا۔ حضرت محمد صلعم گریگوری اعظم ہمعصر تھے مگر قبل اس کے کہ حضرت آوازۂ تعلیم و تلقین بلند فرمائیں، اس کا انتقال ہو گیا اور اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ دنیا میں کیسی زبردست قوت پیدا ہوئی ہے۔ اسلام کی اشاعت جس سرعت کے ساتھ ہوئی اور اس کے تابعین کو دیگر اقوام کے مقابلے میں جو حیرتناک کامیابی ہوئی وہ غیر اقوام کے مورخوں کو ششدر کر دیتی ہے کیونکہ یہ فتوحات امداد غیبی سے ایسے دشمنوں پر حاصل ہوئے تھے جو طاقتور تھے اور مقابلے کے لئے ہر طرح تیار تھے۔ ۶۱۰ء میں شہنشاہ ہرقل قسطنطنیہ میں تخت نشین ہوا اور اپنے کارناموں سے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ بھی شاہان روما کا ایک لائق جانشین ہے۔ ایرانیوں نے فلسطین اور شام پر حملہ کر دیا تھا مگر نہایت مستعدی کے ساتھ اس نے ان کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا بلکہ خود نینوا تک ان کا تعاقب کیا اور شاہ ایران کو صلح کرنے پر مجبور کر دیا مگر ان شاندار فتوحات کے چند ہی روز بعد جب شہنشاہی فوجیں مسلمانوں کے مقابلے میں آئیں تو نہ توانکا

وہ دم خم باقی تھا نہ اثر۔

مذہب اسلام کی نشو و نما عرب کی گمنام سرزمین میں ہوئی جس کو رومیوں نے کبھی اس لائق نہ خیال کیا تھا کہ شمال کے چھوٹے سے ٹکڑے کے سوا اس کے کسی اور حصے پر قبضہ کریں۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر خانہ بدوش تھے اور متمدن قومیں ان سے بہت کم واقف تھیں مگر اسی خطے میں اسلام کی ابتدا ہوئی۔ اہل عرب پر اس زمانے کی مذہبی تحریکوں کا اثر ضرور رہا تھا۔ ان میں یہودی بھی تھے مسیحی بھی تھے مگر بیشتر افراد توہمات میں مبتلا تھے۔ خود مکۂ معظمہ میں بت پرستی کا رواج تھا اور اسی مقام پر حضرت محمد رسول اللہ صلعم ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے اور وحدت الٰہی اور اخوت انسانی کی تلقین فرما کر اہل عرب میں وہ روح اور ایسا جذبۂ غیرت اور ہمت پھونک دیا جس سے اس قوم نے چند سال میں نظام عالم زیر و زبر کر دیا اور ایک صدی تک دنیا میں کوئی قوت ایسی نہ تھی جو اس کا مقابلہ کر سکتی۔ آنحضرت کی وفات کے بعد خلفائے راشدین نے تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت عمر نے شام پر فوج کشی کی جس میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہرقل کے عہد حکومت میں سلطنت روم کی حالت بہت اچھی تھی مگر مذہبی نزاعوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ مذہبی مباحث کا بہ نسبت مغرب کے مشرق میں بہت زور تھا اور مشرقی مسیحیوں میں وحدانیت الٰہی کا عقیدہ عموماً پھیلا ہوا تھا اور الوہیت مسیح سے بھی انھیں انکار تھا جو کہ پاپائے روما ان عقائد کا سخت مخالف تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان عقائد کے پیرووں نے اسلام کی خالص وحدانیت کو کلیسیۂ روما کے پیچیدہ عقائد پر ترجیح دی۔ ۶۳۴ء میں شہنشاہ ہرقل کی جان گسل کوششوں کے باوجود صوبۂ شام مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور ۶۳۷ء میں انھوں نے بیت المقدس بھی لے لیا اور سلطنت ایران کو بھی پسپا کر دیا۔ نیز ۶۴۰ء میں مسلمانوں نے مصر بھی فتح کر لیا، ہرقل نے سال مابعد میں انتقال کیا اور اس نے اپنی آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھ لیا کہ اس کے ابتدائی فتوحات کے نتائج کو اس نئی اور پر اسرار قوت نے کیونکر پراگندہ کر دیا۔ فتح مصر کے بعد نصف صدی تک مسلمانوں کے فتوحات کا سلسلہ منقطع ہو گیا مگر غالباً اس کا یہ سبب تھا کہ مصر کے مغرب میں لق و دق ریگستان واقع ہے۔ اس کے بعد

پھر یہ سلسلہ شروع ہوا اور ۶۹۵ء میں مسلمانوں نے (قرطاجنہ) سے لیا اور شہنشاہی فوجیں مقابلہ نہ کر سکیں۔ مسلمانوں کی فوج ظفر موج برابر مغرب کی طرف بڑھتی گئی اور ان کا مشہور قاید طارق، اس تنگ آبنائے کو عبور کر کے جو یورپ و افریقہ کے درمیان حائل ہے اس مقام پر لنگر انداز ہوا جو اس کے نام کی مناسبت سے اب جبل الطارق کہلایا جاتا ہے۔ دو سال کے قلیل زمانے میں عساکر اسلامی نے تمام جزیرہ نمائے ہسپانیہ پر اپنا دخل کر لیا اور پیرینیز کے سلسلۂ کوہ تک پہونچکر اس کو طے کرنے کی فکر کرنے لگے۔ اب سوال یہ تھا کہ ممالک مشرق اور جنوب کی طرح وسطی اور شمال یورپ کے باشندے بھی بادیہ نشینان عرب کے آگے سر تسلیم خم کرینگے یا کوئی نئی قوت ایسی پیدا ہوگی جو ان کی پیش قدمی میں حائل ہوگی۔ یہ کام فرینک قوم نے انجام دیا جو قرون وسطی کی تیسری تعمیری قوت ہے۔

فرینک ایک جرمنی قوم تھی جس کی ہستی سے رومی تیسری صدی تک واقف نہ تھے اور اس کی ابتدا غالباً یہ تھی کہ مختلف قبائل نے متحد ہو کر "فرینک" کا نام اختیار کر لیا۔ ان کی ابتدائی تاریخ اور یورشوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کی اصلی تاریخ شاہ کلووس (۴۸۱ء) کی تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے میں یہ قوم دریائے رائن کے نشیبی سواحل پر آباد تھی۔ ان میں سے جو سمندر کے کنارے پر آباد تھے "وسی لین" کے نام سے مشہور تھے اور جو دریائے رائن کے کنارے شہر کولون کے نواح میں رہتے تھے رپوائے رین کہے جاتے تھے۔ غالیہ (فرانس) میں اس زمانے میں متعدد رئیس حکمراں تھے۔ دریائے سین کی وادی میں اس کے دونوں کناروں پر ایک رومی رئیس حکمراں تھا اور اب فرانس میں صرف یہی ایک خطہ تھا جہاں رومیوں کا نام قائم تھا۔ دریائے لوار کے جنوب میں قوم وسی گاتھ کی سلطنت تھی اور دریائے رون کی وادی اور شرقی اضلاع پر برگنڈی والوں کی حکومت تھی اور اس کے شمالی اضلاع پر قوم المانی قابض تھی۔ گر شاہ کلووس نے اپنے انتقال سے قبل تمام اضلاع مذکور پر قبضہ کر لیا اس کے فتوحات کا تفصیلی تذکرہ نہایت طویل ہوگا مگر قوم المانی کی جنگ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے کلووس کی بیوی جو ایک برگنڈی کی شہزادی تھی مذہباً عیسائی تھی اور بیوی کی ترغیب سے

غالباً کلودس نے منت مانی کہ اگر اس کو اس جنگ میں فتح ہو جائے تو وہ عیسائی ہو جائے گا۔ جنگ میں اسے فتح ہوئی اور وہ اپنے وعدے پر قائم رہا چنانچہ ۴۹۶ء میں وہ کلیسیہ مسیحی میں داخل ہو گیا اس کی رعایا یعنی قوم فرنیک نے بھی اس کی تقلید کی یہ واقعہ نہایت اہم تھا۔ گو مسیحی ہو جانے سے اس کے طرز زندگی میں کوئی فرق نہ آیا کیونکہ اس کا نامۂ اعمال جرائم اور معاصی سے مملو تھا مگر اس کے مسیحی ہو جانے کی اہمیت یہ ہے کہ کیتھولک کلیسا کے زبردست نظام سے اس کے خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔ گاتھی اقوام ایرین تھیں اور یہی ان نکبت و بربادی کا باعث ہوا مگر کلودس کے کلیسیۂ کاتولیک میں داخل ہو جانے سے اس کو کلیسیے سے زبردست امداد ملی جس کی وجہہ سے وہ خود اور اس کے جانشین اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوتے رہے۔

۵۱۰ء میں کلودس نے پیرس کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا مگر یہ ساعت کچھ ایسی نحس تھی کہ اسی سال اس کا انتقال ہو گیا اور قوم فرنیک میں زوال کے آثار نمودار ہونے لگے۔ قریب ایک سو سال تک خانہ جنگی اور حد درجہ کی ابتری رہی گبن کے بقول "تاریخ عالم میں کوئی عہد ایسا کم ملیگا جس میں معاصی کا زور اس سے زیادہ" اور محاسن اس سے کم ہو سکے"۔ کلودس کی اولاد جو خاندان میرودنجین کے نام سے مشہور ہوئی ان میں اس کی قابلیت کا شمہ بھی نہ تھا اور رفتہ رفتہ ان کا اقتدار برائے نام رہ گیا اور عنانِ حکومت "داروغۂ محلسرا" کے ہاتھوں میں آگئی۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ عہدہ دار ابتدا میں بادشاہ کے خانگی ملازم تھے مگر رفتہ رفتہ امور مملکت میں ان کا دخل بڑھتا گیا یہانتک کہ بادشاہ کے نام سے حکومت کرنے لگے اور عہدۂ داروغگی خاندانی و موروثی ہو گیا اس خاندان میں پہلا سربرآوردہ شخص پے پن ہے جس نے ۶۸۷ء میں شمالی فرنیک قوم کو پھر ایک قوم بنا دیا۔ ۷۱۴ء میں اس نے انتقال کیا اور اس کا بیٹا چارلس مارٹل اس کا جانشین ہوا۔

چارلس مارٹل ایک زبردست خاندان کا بانی ہوا جس نے مغربی یورپ میں اپنی قوت مستحکم کر لی اور رفتہ رفتہ منصب شہنشاہی کا مدعی ہو گیا اس کے عظیم الشان

کارنامے سرزمین فرانس سے وابستہ ہیں مگر واضح رہے کہ یہ بادشاہ خالص جرمن نسل
سے تھا۔ اور اس کی مادری زبان جرمن تھی قوم فرانسیسی سے اسے کوئی تعلق نہ تھا
زندگی بھر تمام ملک فرانس اس کے قبضے میں رہا گو اس وقت بھی خاندان کلووس کا کوئی
نہ کوئی بادشاہ برائے نام باقی تھا جس کی نیابت میں چارلس مارٹل حکومت کرتا تھا اور حق تو
یہ ہے کہ اس نے بادشاہ کے اقتدار کو بیحد بڑھا دیا تھا قرون وسطیٰ کے دوسرے
زبردست حکمرانوں کی طرح اس کی زندگی کا بیشتر حصہ امرا کی سرکشی کو توڑنے اور
ان کو مطیع بنانے میں صرف ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنی زندگی ہی میں داروغۂ محل
کو جو نائب السلطنت تھا ملک میں سب سے زیادہ صاحب قوت بنا دیا۔ ملک فرانس کی
سرحدوں کو بھی اس نے بہت وسیع کیا اور مشرق میں رائن ندی کے ادھر سیکسنی
اور باویریا کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا یہ فتوحات دیرپا نہ تھے مگر اس کے
جانشینوں کے فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے نہ صرف اسے بلکہ اسکے تمام خاندان کو
پاپائے روم کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور کلیسئہ روما کا وہ ملک فرانس اور دیگر
ممالک میں ہمیشہ ممد رہا تبلیغ مسیحیت کا کام بھی اس کے زمانے میں سرگرمی سے
جاری رہا اکثر مبلغ انگلستان کے باشندے تھے جنھوں نے جرمنی کے مختلف
حصوں میں مسیحیت کو پھیلایا قوم فرنک کے اکابران مبلغوں کے مربی تھے اس لئے
مبلغوں نے بھی ان کی عزت و توقیر بڑھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور
پاپائے روما اور سلاطین فرانس میں باہمی امداد کا تعلق پیدا ہو گیا۔

قبل اس کے ہم اس باب کو ختم کریں مناسب ہوگا کہ تاریخ اسلام پر
بھی ایک نظر ڈالی جائے کیونکہ اسی زمانے میں اسلام کی ترقی مشرق و مغرب دونوں
ممالک میں رک گئی ۷۱۸ء میں مسلمانوں کی ایک فوج جرار نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اور قریب تھا
کہ شہر مذکور ان کے قبضے میں آجائے مگر شہنشاہ لیو نے نہایت جرأت
کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور چونکہ مسلمان اپنے ممالک سے بہت دور تھے
اور ان کو بروقت امداد رسد نہیں پہونچ سکتی تھی اس لئے ان کو باول ناخواستہ
قسطنطنیہ سے بے نیل مرام واپس ہونا پڑا۔ مغرب میں ہسپانیہ کلیۃً ان کے قبضے میں
آچکا تھا۔ کوہ پیرینیز کے سلسلۂ کوہ کو طے کر کے جنوبی فرانس کے رومی شہروں پر

بھی وہ قابض ہو چکے تھے اور ان کے مسلسل فتوحات سے تمدن مسیحی سخت خطرے میں تھا کیونکہ ممکن تھا کہ وہ وسطی فرانس کی طرف رخ کرتے یا کوہ آلپس طے کر کے اطالیہ پر دھاوا کر دیتے اور شہر رومہ کا محاصرہ کر لیتے مگر اس کے برخلاف انھوں نے صوبۂ اکوی ٹین پر حملہ کر دیا اور جو لوار ندی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس ضلع کے ڈیوک کو اسلامی قائد عبد الرحمن نے پہلے ہی مقابلے میں شکست دی اور اسلامی فوجیں بلا کسی مزاحمت کے شمال کی طرف بڑھتی گئیں ایک وی ٹین کے ڈیوک اور چارلس مارٹل میں صفائی نہ تھی مگر مجبوراً اس نے چارلس سے امداد کی درخواست کی اور سنہ ۷۳۲ء میں چارلس، قوم فرینک کی فوجیں لیکر اس کی امداد کو پہونچا۔ مسلمان یلغار کرتے ہوئے اپنے حدود سے دور چلے آئے تھے اور ممالک مسیحی کی متحدہ فوجوں کے مقابلے کے لئے تیار نہ تھے دونوں فوجوں میں بمقام پواتیر مڈبھیڑ ہوئی مگر یہ لڑائی جنگ ٹورس (سنہ ۷۳۲ء) کے نام سے مشہور ہے۔ مسلمانوں نے خوب داد شجاعت دی مگر ان کی تعداد کم تھی۔ شام تک جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا اور چارلس تیار تھا کہ پھر دوسرے روز جنگ شروع کرے مگر مسلمانوں کی فوج اول تو مختصر تھی اور دوسرے اس کا ایک بڑا حصہ کام آچکا تھا اس لئے انھوں نے مراجعت ہی کو مناسب خیال کیا اور جن مقامات پر ان کا چند روزہ قبضہ ہو گیا تھا وہ سب ان کے قبضے سے نکل گئے۔ اس طرح گویا مشرق میں بحیرۂ باسفورس اور مغرب میں کوہ پیرینیز یہ دونوں مقام مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک زمانہ کے لئے حد فاصل ہو گئے۔ سنہ ۷۴۱ء میں چارلس مارٹل نے انتقال کیا اور اس کی سلطنت اس کے دو بیٹوں میں تقسیم ہو گئی جس سے اندیشہ تھا کہ کہیں ملک فرانس ہمیشہ کے لئے دو ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو جائے مگر حسنِ اتفاق سے اس کا ایک بیٹا دنیا سے بیزار ہو کر ایک خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گیا اور دوسرا پیپن سنہ ۷۴۷ء سے بلا شرکت غیرے حکمراں ہو گیا۔

شارلیمین اور جدید شاہنشاہی

قوم فرنیک کی ازدیاد قوت کا راز (جس کے سبب سے اس کے بادشاہوں نے شہنشاہی کا لقب اختیار کیا تھا) اس کے اور پاپائے روما کے باہمی جذبۂ امداد و اتفاق میں مضمر ہے۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم قوم فرنیک کی اولو العزمیوں کا تذکرہ کریں مناسب ہوگا کہ اطالیہ کی تاریخ پر ایک نظر غائر ڈالی جائے اور بتایا جائے کہ پاپائے روما کی وہاں کیا حالت تھی۔

مذہبی نقطۂ نظر سے پاپائے روما کی قوت برابر بڑھتی جاتی تھی کیونکہ خانقاہوں کے راہب او مبلغ ہر جگہ عوام میں یہ تلقین کرتے پھرتے تھے کہ معاملات کلیسیہ میں پوپ کے احکام آخری اور قطعی ہیں مگر خود روما اور اطالیہ میں ان کی حالت نازک اور خطرہ سے خالی نہ تھی۔ شہر روما کی شورہ پشت رعایا اور سرکش امراء پوپ کو بالکل خیال میں نہ لاتے تھے اور روما سے باہر قوم لمبارڈ کے رؤسا ان سے برسرِ پرخاش تھے۔ قوم لمبارڈ میں اتفاق او یکجہتی نہ تھی اور ان کے جنوبی رؤسا قریب قریب خودمختار تھے مگر باوجود اس کے جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اطالیہ میں ان کا طالع اقبال عروج پر تھا ان کا بادشاہ لیوٹ پرانڈ نہایت ذکی اور طباع حکمراں تھا جس کے مساعی سے شہنشاہان قسطنطنیہ کی حکومت کا نام سرزمین اطالیہ سے مٹ گیا اور شہر راونیا بھی محصور ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ان اضلاع پر بھی قابض ہو گیا جن پر پوپ بحیثیت نائب شہنشاہ حکومت کرتا تھا پوپ کو یہ امر سخت ناگوار تھا۔

اور اسی لئے اس نے تمام قوم لمبارڈ کو قابل گردن زدنی قرار دیا۔ واضح رہے کہ یہ مخالفت اختلاف مذہب کے باعث نہ تھی بلکہ اس کا باعث محض رقابت تھی کیونکہ لمبارڈ کلیسیہ روما میں داخل ہو چکے تھے مگر باوجود اس کے پوپ نے اعلان کر دیا یہ قوم دو مبروص، ہے بنی نوع انسان کی دشمن ہے اور ردّ جہنم واصل ہوگی اس سے ظاہر ہے کہ لمبارڈوں کے حملوں سے محفوظ رہنے اور اطالیہ کے کسی خطے پر بلا مداخلت غیر سے حکومت کرنے کے لئے ضرور تھا کہ پوپ کسی بیرونی طاقت سے امداد کا خواستگار ہو اور اس معاملے میں اسے شہنشاہان قسطنطنیہ سے کوئی امید نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ شہنشاہ لیو نے مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی جرأت اور بہادری کا کافی ثبوت دیا تھا مگر مذہبی نزاعوں کے سبب سے پوپ شہنشاہ سے امداد کا طالب نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ قسطنطنیہ میں حال ہی میں ایک جدید مذہبی تحریک پیدا ہو گئی تھی جو "بت شکنی" کے نام سے موسوم ہے اور جو زمانہ مابعد کی پراٹسٹنٹ تحریک سے مشابہ تھی اس کے دو وجوہ ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ لوگوں میں مشرقی کلیسیہ کی اوہام پرستی اور رہبانیت سے بددلی پیدا ہو گئی تھی اور دوسری وجہ مذہب اسلام کا اثر تھا اور اس کی کامیابی اس نئی تحریک کے پیرو بتوں کی پرستش کو سخت ناپسند کرتے تھے جو مشرقی کلیسیہ کے مذہبی رسوم میں جاری تھی اور حضرت مریم کی پرستش بھی ان کو ناگوار تھی۔ پادریوں کی مناکحت پر بھی یہ لوگ زور دیتے تھے مشرقی سلطنت میں یہ تحریک آناً فاناً پھیل گئی مگر کلیسیہ روما کے عقائد کے بالکل متضاد تھی ہر چند شہنشاہ لیو خود ان عقائد پر ایمان لے آیا تھا مگر ۷۳۱ء میں ایک کونسل روما میں منعقد ہوئی جس نے ان عقائد کو سخت بدعت قرار دیا اور شہنشاہ و دیگر معتقدین کو کلیسیہ سے خارج کر دیا۔ ۷۴۱ء میں لیو کا انتقال ہو گیا مگر بت شکنی کی تحریک اس کے جانشین قسطنطین کے زمانے میں برابر زور پکڑتی گئی اور روما سے اختلافات کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ ۷۸۵ء میں راسخ الاعتقاد ملکہ ایرین تخت شاہی پر قتل کے ذریعے سے متمکن ہوئی اس نے بت پرستی دوبارہ جاری کیا مگر پوپ اور دربار قسطنطنیہ کے تعلقات حسب سابق کشیدہ رہے جس کی وجہ سے پوپ ایسے خاندان سے امداد کا خواستگار نہ ہو سکتا تھا جس کا

ہر رکن اسے کفر و الحاد اور معاصی کا پتلا نظر آتا تھا۔

مشرقی سلطنت سے چونکہ پوپ کے تعلقات نہایت کشیدہ تھے اس لئے مجبوراً ان کو حکام فرانس سے جن کے وہ پہلے ہی سے مرہون منت تھے یہ درخواست کرنا پڑی کہ انھیں قوم لمبارڈ کے پنجۂ ستم سے رہائی دلائیں۔ پپن دس سال سے فرانس پر حکمران تھا مگر اس کی حیثیت اب بھی دار وغۂ محلسرا کی تھی حالانکہ تخت فرانس اس وقت خالی تھا۔ کچھ روز کے لئے پھر ایک بادشاہ برائے نام تخت پر بٹھا دیا گیا مگر ظاہر ہے کہ بلا اقتدار بادشاہ کا وجود محض بے سود ہے پپن کی قوت اس قدر زبردست ہو گئی تھی کہ وہ خود خطاب شاہی کا مدعی تھا وہ خود برسر حکومت تھا اس لئے تاج شاہی اپنے سر پر رکھ لینا اس کے لئے چنداں دشوار نہ تھا۔ مگر زمانۂ ماضی کے زبردست بادشاہوں کے روایات کا اثر اب بھی باقی تھا جس کی وجہ سے پپن ایک زمانے تک سریر آرائے سلطنت ہونے سے پس و پیش کرتا رہا۔ آخر کار پوپ کی امداد سے یہ عقدہ حل ہو گیا کیونکہ جب یہ معاملہ پوپ ذکریا کے پاس تصفیے کے لئے پہونچا تو اس نے فوراً فیصلہ کر دیا کہ جس شخص کے ہاتھ میں اقتدار شاہی ہے وہی بادشاہ کہلانے کا مجاز ہے۔ پوپ کے اس تصفیے سے پپن کو کوئی پس و پیش باقی نہ رہا اور برائے نام بادشاہ کو تخت سے اتار کر خانقاہ میں داخل کر دیا گیا۔ پپن کو امرائے فرانس نے اپنے کاندھوں پر لے کر اس کی بادشاہی کا اعلان کیا اور انگریزی مبلغ بانی فیس نے رسوم تخت نشینی ادا کئے۔ دو سال کے ذکریا جانشین پوپ اسٹیفن خود کوہ الپس طے کر کے فرانس میں آیا اور تاج شاہی اپنے ہاتھ سے پپن کے سر پر رکھا جس کی وجہ سے اس کا خاندان بلا خلش فرانس پر حکومت کرنے لگا۔ اس خاندان کو سابقہ خاندان کے نام کے وزن پر اور پپن کے بیٹے چارلس اعظم یا شارلمین کے نام کی رعایت سے کارولنگین (کارلوسی) کہتے ہیں۔

پوپ کے احسانات کے اعتراف میں پپن نے ان کی ایک عظیم خدمت کی ہم بیان کر چکے ہیں کہ پوپ قوم لمبارڈ سے سخت نالاں تھا اس لئے اس کی امداد کے لئے ۷۵۴ء میں ایک فرانسیسی فوج اطالیہ میں پہونچی۔ قوم لمبارڈ کے

بادشاہ کو شکست ہوئی اور اس نے ہتھیار ڈال دئے مگر فاتحین نے اس کی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے سے احتراز کیا اور صرف اس شرط پر اکتفا کی وہ اپنی سلطنت کا ایک ثلث پوپ اسٹیفن کے حوالے کردے یعنی وہ خطۂ ملک راوینا اور روما کے درمیان واقع تھا اور پوپ کا قبضہ ان ممالک پر بحیثیت خود مختار رئیس کے نہ تھا بلکہ شاہ فرانس کے نائب کی حیثیت سے وہ اس جگہ حاکم تھا۔ ۷۵۴ء کے چودہ سال بعد تک پپن بقید حیات رہا اور اپنی فراست اور حسن تدبیر سے اس نے اپنے مقبوضات کو بہت کچھ وسعت دی ۷۶۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور قوم فرینک کے رسوم کے مطابق اس کی سلطنت اس کے دونوں بیٹوں چارلس اور کارلومن کے درمیان تقسیم ہو گئی جس سے سلطنت میں ضعف کا احتمال ہو گیا۔ مگر کارلومن کا دو سال کے بعد کسی عارضہ میں انتقال ہو گیا اور چارلس تمام فرانس کا بادشاہ ہو گیا۔ اس بادشاہ کا نام چارلس یا کارل تھا مگر زمانۂ مابعد میں شارلیمین یا چارلس اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔ نسلاً یہ بادشاہ خالص جرمن تھا اور عادات و خصائل میں چارلس مارٹل اور پپن سے بھی زیادہ جرمن تھا۔ اس کا دارالسلطنت دریائے رائن کے قریب بمقام آئی لاشاپیل یا آکین تھا مگر نہ صرف جرمن بلکہ اہل فرانس بھی اس کو اپنے اکابر قوم میں شمار کرتے ہیں جس کی حکومت اور پالیسی سے ان کی تاریخ میں ایک نہایت اہم دور شروع ہوتا ہے۔

قرون وسطیٰ میں اس بادشاہ سے زیادہ سربرآوردہ کوئی حکمراں نہیں گزرا ہے قوم فرینک کے مقبوضات کو اس نے جرمنی کے قلب تک پہنچا دیا اور اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرون وسطیٰ کی جرمنی سلطنت کا یہی بانی تھا۔ اطالیہ اور ہسپانیہ بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے اور ہر دو ممالک میں اس کا اثر مدت تک قائم رہا۔ اس کے عہد سلطنت نے علوم و فنون میں ایک نئی روح پھونک دی تھی جس سے پردۂ تاریکی ایک حد تک اُٹھ گیا تھا اور ترقی کی تحریک اس کے دورِ حکومت میں کبھی کمزور نہیں ہوئی۔ اس کی قوت مغربی یورپ میں اس قدر بڑھ گئی اور کلیسیہ روما کے اس نے ایسے شاندار خدمات انجام دیئے کہ اعزاز کے طور پر اسے شہنشاہ کا اعزازی خطاب دیا گیا اور گو اس زمانے میں یہ منصب جلیلہ محض رسمی خیال کیا جاتا تھا مگر مرور ایام کے بعد اس کی اہمیت واضح ہونے لگی۔ اس شہنشاہ کی ذات قرون وسطیٰ کے

تمام تعمیری اثرات کی جامع تھی، قدیم رومی اثرات کا طولانی انحطاط اسی کے عہد میں ختم ہوا، اور زمانۂ حال کے تمدن کی ابتدا اسی کے عہد سلطنت سے ہوئی ہے۔

شارلیمن کے معتمد ایگن ہارڈ نے اس کے سوانح لکھے ہیں جس سے اس کے ذاتی اخلاق اور کارنامے معلوم ہوتے ہیں۔ شارلیمن بلند و بالا، قوی اور پھرتیلا آدمی تھا کسرت کا شوق تھا، اور اپنے دارالسلطنت کے حماموں میں تیرا کرتا تھا۔ اس زمانے کے معیار کے مطابق کھانے پینے میں محتاط تھا اور اس کی ذات سے اس کے وحشی جرمنی امراء کے عادات و خصائل میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ علوم و فنون کے فروغ و اشاعت سے اسے خاص دلچسپی تھی اور اس غرض سے اس نے ایک مشہور انگریز الکوئن سا کن یارک کو اپنے دربار میں نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ بلوایا تھا اور اپنے امراء کے بچوں کی تعلیم کی خدمت اس کے متعلق کی تھی متعدد السنہ سے واقف تھا یہاں تک کہ زبان یونانی بھی جانتا تھا سینٹ آگسٹین کی کتاب "مدینۃ اللہ" کے پڑھنے کا اسے خاص شوق تھا مگر ایک عجیب بات ہے جو اس زمانے میں عام تھی یعنی اس علم و فضل اور دماغی قوت کے باوجود یہ بادشاہ کبھی تحریر پر قادر نہ ہوا۔ اس کے خصائل میں بلند ہمتی، خدا ترسی، اور خدمت ملک کے جوہر خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں اور گو اس کی خانگی زندگی عیوب سے خالی نہیں ہے اور بعض مظالم کا بھی اس پر الزام ہے مگر پھر بھی اس زمانے کے امرا اور بادشاہوں سے اس کے اخلاق بہتر تھے۔

مورخین اس کا شمار فاتحین عظام میں کرتے ہیں مگر غالباً فن سپہگری میں اسے زیادہ دخل نہ تھا کیونکہ فوج کی کمان وہ زیادہ تر دوسروں ہی کے سپرد کر دیتا تھا اور خود صرف ہدایات دیا کرتا تھا۔ اب ہم اس کے فتوحات کو یکے بعد دیگرے بلحاظ تاریخ بیان کرینگے۔ سب سے پہلے اس نے حاکم ایکوی ٹین کو بالکلیہ اپنا مطیع کر لیا اس کے بعد مسلمانان ہسپانیہ کا اس نے کامیابی کیساتھ مقابلہ کیا باہمی نزاعوں اور منافشوں کی وجہ سے مسلمان آپس ہی میں کٹ مر رہے تھے اور اس موقع کو چارلز نے غنیمت جانا کوہ پیرینیز کو اس نے ایک دفعہ سے زیادہ طے کیا اور ۷۹۶ء میں شہر بارسیلونا پر قبضہ کر کے پیرینیز کے جنوب میں ایک خطۂ زمین پر قبضہ کر لیا جو ہمیشہ قائم رہا مگر یہ قبضہ نہایت

مشکل سے ہوا اور پرنیز کے طے کرنے میں شارلمین کا ایک جانباز جنرل رولینڈ مارا گیا،
اسکے مارے جانے کے حالات تاریخی روایات کے مشہورترین واقعات میں سے ہیں
مسیحیوں کی یہ فتح نہایت اہم ہے کیونکہ اسی مقام سے مسیحیوں کے فتوحات کا دائرہ
رفتہ رفتہ وسیع ہوتا گیا۔ یہانتک کہ چند صدیوں کے بعد تمام ہسپانیہ پھر انکے
قبضہ میں آگیا۔ ان محاربات سے زیادہ اہم شارلمین کی فتح سیکسنی کی لڑائیاں ہیں۔
واضح رہے کہ جس ملک سیکسنی کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ اس ملک سے بالکل مختلف
تھا جو اب ہم نقشوں میں دیکھتے ہیں۔ شارلمین کے زمانے میں اس ملک میں
ایمس، ویزر اور ایلب ندیوں کی نشیبی وادیاں شامل تھیں جن میں شروع سے
آخر تک جنگل ہی جنگل تھے اور سڑکوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ باشندے بالکل
جنگلی اور بت پرست تھے۔ اور مسیحی مبلغوں کے مواعظ پر بالکل دھیان نہ دیتے تھے
اور نہ ان مبلغوں کی مددگار فوجوں ہی سے مرعوب ہوتے تھے۔ شارلمین اس قوم
سے مدت تک لڑتا رہا اور ایک دفعہ تو اسکی فوجوں کو ہزیمت بھی ہوئی کیونکہ ۷۸۲ء
میں ان وحشیوں نے اسکی ایک فوج کو گھیر کر بالکل فنا کردیا۔ مگر آخرکار قوم سیکسن تاب
مقاومت نہ لاسکی اور انکے سرگروہ نے ہتھیار ڈالدئے اور دین مسیحی قبول کر لیا۔ اسکے
بعد ایک بغاوت بھی ہوئی مگر اس میں ناکامیابی ہوئی اور اس قوم کے چار ہزار افراد
سخت بیرحمی کے ساتھ تہ تیغ کر دیئے گئے۔ اس ملک میں دین مسیحی کی اشاعت نہایت
سختی اور بیرحمی سے ہوئی مگر دیرپا ثابت ہوئی مذہب مسیحی اور سلطنت فرانس دونوں
کے لیے قدم جم گئے کہ زمانۂ مابعد میں جب شارلمین کے ورثا ضعیف ہوگئے تو قوم
سیکسن نے جرمنی فتوحات کا سلسلہ جاری کر دیا۔

باویریا کے خلاف بھی فوج کشی ہوئی اور اس صوبے کو بھی مقبوضات
فرانس میں شامل کرلیا گیا اور یہ ملک جرمنی کا ایک نہایت ترقی کن خطہ ہو گیا۔ مگر
جرمنی کی حکومت سے شارلمین کی ہوس ملک گیری پوری نہیں ہوئی اور دریائے ایلب
عبور کرکے بوہیمیا میں پہنچا اور قوم چک کو مغلوب کیا۔ اسکے علاوہ قوم آوار سے بھی
مصروف رزم و پیکار رہا۔ یہ قوم ان ممالک میں آبادتھی جنکو اس زمانے میں
آسٹریا ہنگری کہتے ہیں اور مشہور تھا کہ قوم ہن کے سرگروہ اٹیلا کا جمع کیا ہوا خزانہ

ان کے قلعوں میں موجود ہے۔ یہ قوم نہایت طاقتور تھی اور اس کے وجود سے جرمنی کے متمدن اقوام کو ہمیشہ خطرہ رہا کرتا تھا۔ شارلیمن نے متواتر لڑائیوں کے بعد ان کے قلعوں کو مسمار کر دیا اور ان کے خزانے پر قبضہ کر کے تقسیم کر دیا۔ قوم آوار کا بادشاہ بھی اپنی فوج کی ہزیمت کے بعد دین مسیحی قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اب ہم بلحاظ سلسلۂ تاریخی قوم لمبارڈ کے مغلوب کئے جانے کا حال بیان کرینگے کیونکہ اسی سے چارلس کے اعزاز و افتخار میں افزائش ہوئی۔ اس کے باپ پپن کے فتوحات سے قوم لمبارڈ اور پوپ کے تعلقات استوار نہیں ہوئے تھے قوم لمبارڈ کے بادشاہ سے چارلس خود برسرِ پرخاش تھا۔ کیونکہ اس نے بادشاہ مذکور کی بہن سے نکاح کر لیا تھا اور پھر اس کو طلاق بھی دیدی تھی۔ ۷۷۳ء میں پوپ ہیڈرین کے اصرار سے چارلس نے لمبارڈی پر اپنی زرہ پوش فوج کے ساتھ دھاوا کیا وہاں کا بادشاہ شہر پیویا میں محصور ہو گیا اور آخر کار اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو گیا چارلس نے اس کے تمام ممالک پر قبضہ کر لیا اور شاہ اقوام لمبارڈ و فرنیک و سردار روما کا لقب ۷۷۴ء میں اختیار کیا اور ۲۶ سال تک اسی لقب پر قانع رہا۔ پوپ کے اقتدار اور مقبوضات میں بھی اس نے بہت کچھ اضافہ کیا۔

مگر قوم لمبارڈ کی نکبت و بربادی سے پوپ کو چین نہیں ملا کیونکہ امرائے روما اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے تھے اور اسے سخت پریشان کر رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ جدید پوپ لیو اور سابق پوپ ہیڈرین کے عزیزوں کے درمیان سخت مخالفت پیدا ہو گئی تھی اور پوپ کے دشمنوں نے شہر روما کے حدود کے باہر اس پر حملہ کر کے اس کو قریب قریب اندھا کر کے قید کر لیا تھا مگر وہ بچ نکلا اور کوہ آلپس طے کر کے ۷۹۹ء میں چارلس کے پاس پناہ لی اور اس سے عرض کیا کہ باوجود اس کے کہ میں "نائب مسیح" ہوں مگر میرے دشمنوں نے میری آبروریزی اور تخریب میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ بادشاہ نے اس کی شکایتوں سے متاثر ہو کر ۸۰۰ء میں پھر اطالیہ کا رخ کیا اور روما پہنچا۔ جہاں اس کا کوئی مزاحم نہ ہوا۔ پوپ لیو اس کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنے دشمنوں کے اتہامات کا جواب دیا۔ چارلس نے اس کے عذر قبول کئے اور اسے مسند پاپائی پر بحال کیا جس سے پوپ پھر شاہ فرانس کا مرہونِ منت ہو

اور اسکے احسانات کے صلے میں اسکو شہنشاہ کا لقب دیا۔

۸۰۰ء میں کرسمس (ولادت حضرت عیسیٰؑ) کے روز شارلمین سینٹ پیٹر کے گرجا میں مصروف عبادت ہوا۔ رسوم مذہبی ختم ہو جانے کے بعد پوپ اپنی جگہ سے اٹھا اور تاج شہنشاہی شارلمین کے سر پر رکھ کر آداب بجالایا۔ یہ واقعہ ذرا پراسرار ہے کیونکہ شارلمین نے خود ہی بیان کیا ہے کہ اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ ہوگا تو وہ گرجا میں ہرگز نہ جاتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ شارلمین کو خود لقب شہنشاہی کی ہوس تھی اور پوپ نے غالباً جو کچھ کیا وہ سمجھوتے ہی کی بنا پر کیا ہوگا۔ ۸۰۰ء سے ۱۸۰۶ء تک مغربی یورپ میں چند وقفوں کے سوا کوئی نہ کوئی بادشاہ ایسا ضرور گزرا ہے جسے شہنشاہ روما ہونے کا دعویٰ تھا۔

ابتدا میں یہ تغیر زیادہ مہتم بالشان نہ تھا کیونکہ لقب شہنشاہی اختیار کرنے سے شارلمین کی قوت میں ایک شمہ بھی اضافہ نہ ہوا۔ مگر صفحات تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لقب کا اختیار کرنا محض رسمی نہ تھا بلکہ تاریخ یورپ میں یہ واقعہ نہایت اہم ہے۔ شارلمین کے جانشین اس خطاب کو ایک خالی خولی عزت افزائی نہ خیال کرتے تھے اور گو اسکا حیطۂ اقتدار زیادہ وسیع نہ تھا مگر اس کی وجہ سے ان کو مغربی یورپ میں دوسری طاقتوں پر حقیقی برتری حاصل تھی۔ عہدۂ شہنشاہی اگر اس طرح برقرار نہ کیا گیا ہوتا تو قرون وسطیٰ کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ زیر تذکرہ شہنشاہی کو قدیم رومی شہنشاہی سے کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ شارلمین اور روما کے قدیم شہنشاہوں میں کوئی تعلق نہ تھا ان کی زبان لاطینی تھی قوانین روما کے وہ پابند تھے اور جرمنوں کو اپنا دشمن جانی خیال کرتے تھے مگر شہنشاہان مابعد اپنے کو نہ صرف شارلمین بلکہ جولیس سیزر و کانسٹن ٹائن کا جانشین خیال کرتے تھے اور ان کے اس تیقن کا اثر ان کے افعال و حرکات اور رفتار زمانہ پر پڑتا تھا۔

شارلمین کا کمال تدبر نہ صرف ملک گیری بلکہ اقطاع مفتوحہ کے نظم و نسق سے ظاہر تھا کیونکہ جدید مفتوحہ وسیع علاقوں کا نظم و نسق درست رکھنا نہایت دشوار امر ہے اور اس کے علاوہ ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ مقامی حکام کہیں مرکزی حکومت کو تہ و بالا نہ کردیں۔ یہ دائمی خطرہ رفع کرنے کے لئے اس نے خاص حکام بہ نفس نفیس مقرر کئے تھے جو تمام سلطنت کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ اپنے آقا کے احکام کو مقامی حکام تک پہنچاتے تھے اور دیکھتے رہتے تھے کہ ان احکام کی بجاتعمیل ہوتی ہے یا نہیں۔ سال میں دو مرتبہ موسم بہار

وموسم خزاں میں تمام عساکر شاہی جمع ہوتے تھے اور یہ قومی اجتماع "مے فیلڈ" کے نام سے مشہور تھے۔ عام سپاہیوں کی موجودگی سے ان مجالس میں جمہوری عنصر غالب پایا جاتا تھا مگر دراصل مباحث میں صرف امراء اور کلیسیہ کے بڑے بڑے پادری شریک رہتے تھے مجالس امراء سے زیادہ رعایا کے آرام و آسائش کا خیال بادشاہ کو تھا۔ اس نے بیحد کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح قدیم روسا کا اقتدار و اثر مٹا دے اور انتظام مملکت کے لئے اس نے "کاونٹ" مقرر کئے تھے جن کا منصب اس زمانے میں موروثی نہ تھا بلکہ اس خدمت پر وہ انھیں لوگوں کو مقرر کرتا تھا جن پر اس کو اعتبار ہوتا۔ بعض لوگ نظام جاگیری کی ابتدا شارلمین کی ذات سے منسوب کرتے ہیں مگر یہ خلاف واقعہ ہے کیونکہ وہ خود بڑے بڑے زمینداروں کی قوت توڑنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ جاگیریت کا اصل اصول یہ ہے کہ مقامی زمیندار بالکل خودمختار ہو اور شارلمین کی ہر جگہ یہ کوشش تھی کہ مرکزی حکومت کا اقتدار سب پر چھایا رہے۔ شارلمین کے صدہا قواعد و قوانین موجود ہیں جن سے ظاہر ہے اسے اشاعت علم حفاظت و نگہداشت کتب اور قیام امن و امان کا خاص خیال رہتا تھا سلطنت روما کے انحطاط کے بعد مغربی یورپ میں کسی حکومت کا یہ نصب العین نہ رہا تھا۔ قرون وسطیٰ کے گھپ اندھیرے میں قیام امن و امان اور اشاعت علم میں اس نے جو کوشش کی وہ قابل تعریف ہے۔

۸۱۴ء میں اس کا انتقال ہوا اس کے جانشین سرتاپا نالائق تھے جنھوں نے اس کے کارناموں کو بالکل چوپٹ کر دیا مگر اس نکبت و بربادی کی وجہ سے اس کا نام اور اس کے کمالات اور بھی چمک گئے۔ مرنے کے ساتھ ہی اس کے متعلق افسانے مشہور ہو گئے اور اس کے کارناموں کی ستایش میں متعدد رزمیہ نظمیں لکھی گئیں جس میں تاریخی واقعات کو نظرانداز کر کے اسے دیوتا کے رتبہ پر پہنچا دیا گیا یہانتک کہ مختلف روایات میں بیان کیا گیا کہ وہ محاربات صلیبی میں شریک تھا اور پیرس کو اس نے مسلمانان ہسپانیہ کے حملہ سے محفوظ رکھا تھا۔ یہ واقعات بالکل غلط ہیں مگر اس سے ظاہر ہے کہ اس کی عظمت کا اس کے ہمعصروں پر نہایت گہرا اثر تھا۔

شارلمین کی سلطنت کی بربادی

شارلمین کی سلطنت بلحاظ رقبہ اس قدر وسیع تھی کہ اس کے انتظام کے لئے انتہا درجے کی لیاقت اور سرگرمی کی ضرورت تھی اور اس کے جانشینوں میں اس کا مادّہ بالکل نہ تھا۔ اس کا جانشین اس کا اکلوتا بیٹا لوئی پارسا ہوا مگر اس کی قوت ارادی بالکل معطل تھی اور محض ناکارہ تھا پادریوں کا اسے بہت پاس تھا اور بالکل کٹھ پتلی کی طرح ان کے ہاتھوں میں تھا جس سے تمام سلطنت میں ابتری پھیل گئی۔ خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہر چند اس کے زمانۂ حیات میں اس کی سلطنت کا کوئی ٹکڑا اس کے قبضہ سے نہیں نکلا مگر نظام سلطنت چونکہ بالکل ضعیف ہوگیا تھا اس لئے اس کی موت کے بعد سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے۔ اس کے تین بیٹے تھے جن میں اس کی موت کے بعد فرینک قوم کے قوانین کے مطابق سلطنت تقسیم ہوگئی مگر خطاب شہنشاہی کا وارث صرف ایک ہی ہوسکتا تھا تقسیم مملکت کے بارے میں آپس میں ایک مدت تک سخت کشیدگی رہی مگر آخر کار ۸۴۳ء میں بروئے صلحنامہ وردن کچھ روز کے لئے صلح ہوگئی۔ اس صلحنامے کے لحاظ سے لوتھر کو جسے لقب شہنشاہی ملا تھا سلطنت کا وسطی حصہ ملا یعنی وہ ممالک جو رائن ندی کے کنارے واقع ہیں سوئیٹزرلینڈ اور شمالی اطالیہ بھی اسی کے حصے میں آئے۔ لوئی کو مشرقی ممالک ملے اور چارلس کو مغربی۔ مگر اس صلحنامے سے کوئی دوامی فیصلہ نہیں ہوا۔ اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ واقعات آئندہ کی بنیاد اس کے اوپر ہے۔ جرمنی اور فرانس کی ہستی بحیثیت مختلف ممالک کے اسی صلحنامہ کے بعد سے پیدا ہوئی ہے اور دونوں ممالک کے درمیان جو اضلاع ہیں

ان کے متعلق ان دونوں ملکوں میں سخت نزاع رہی۔
شارلمین کی سلطنت کے حصے بخرے ہو جانا کوئی امر اتفاقی نہ تھا جو اس کے پوتوں کی باہمی رقابت پر مبنی ہو کیونکہ ایسے زبردست اثرات پیدا ہو گئے تھے کہ شارلمین کے ایسے لائق حکمراں کے لئے بھی سلطنت کی ہستی کا قائم رکھنا دشوار کر دیتے اولاً یہ امر قابل لحاظ ہے کہ سلطنت کا رقبہ اس قدر وسیع تھا اور اس کے مختلف القوم باشندوں کے خصائل اور ضروریات اس قدر متضاد تھے کہ خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ ذرائع آمد و رفت دشوار اور ناپید ہوں ایک واحد حکمراں کا ایسی سلطنت پر حکومت کرنا بہر صورت دشوار تھا۔ ثانیاً اسی زمانے میں سلطنت پر وحشیوں کا ایک ٹڈی دل پھر ٹوٹ پڑا جو چوتھی اور پانچویں صدی کے وحشیوں سے زیادہ خطرناک تھا مسلمانوں کی فاتحانہ اولوالعزمیوں کو جنگ ٹورس میں روک دیا گیا تھا مگر ان کا دجو داب بھی خطرے سے خالی نہ تھا اور جنوبی اطالیہ پر ان کی یورشیں برابر ہوتی رہیں یہاں تک کہ سنہ ۸۴۶ء میں انھوں نے شہر روما کے کلیسیہ سینٹ پیٹر پر قبضہ کر لیا اور گو وہاں سے وہ ہٹا دئے گئے مگر مدت تک وسطی اطالیہ ان کی دار و گیر سے محفوظ نہ تھا۔ مشرق میں قوم مگیار (زمانۂ حال کے قوم ہنگرین کے مورث) آسٹریا۔ اور ہنگری سے جرمنی کے متمدنہ اضلاع کو تاخت و تاراج کر رہے تھے۔ ان کی دست برد سے زیادہ اندیشہ ناک قوم ڈین یا نارمن کے حملے تھے۔ یہ قوم ناروے سویڈن ڈنمارک اور بحیرۂ بالٹک کے سواحل پر آباد تھی اور وہاں سے تاخت و تاراج کے لالچ میں ممالک مغرب پر بلائے بے درماں کی طرح آپڑی۔ مگر ان لٹیروں کے حملے تاریخ یورپ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ روس کی تاریخ کی ابتدا بھی اسی ایک قوم کے ایک اولوالعزم سردار مسمی ریورک کے حملوں سے ہوتی ہے جس نے اس ملک پر سنہ ۸۶۲ء میں یورش کی۔ انگلستان پر بھی اسی قوم کے ایک بادشاہ ولیم فاتح نے گیارھویں صدی میں قبضہ کر لیا انگلستان کے علاوہ نارمنڈی نیپلز اور سسلی میں ان کی محکم اور استوار سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ آئس لینڈ کا دور دراز جزیرہ بھی ان کی ہوس ملک گیری سے محفوظ نہ رہ سکا بلکہ قیاس غالب ہے کہ کولمبس سے کئی صدیوں قبل یہ قوم امریکہ کے شمالی سواحل تک پہنچ گئی تھی مگر یہ واقعات زمانۂ مابعد کے ہیں ابتدا میں صرف قتل اور غارت گری ان کا مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی بڑی ندی دیکھتے اس میں اپنی کشتیوں کو بے تحاشا چھوڑ دیتے اور جہاں کہیں موقع ملتا خشکی پر اتر کر لوٹ مار کرتے۔ انگلینڈ فرانس اور جرمنی کے ساحلی اضلاع ایک مدت تک

سلطنت شارلیمن
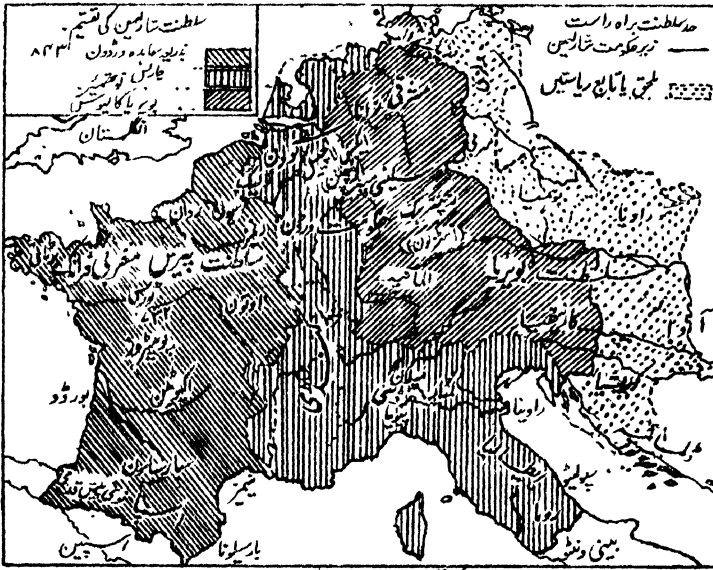
سلطنت شارلیمن اور اسکی تقسیم معاہدہ ورڈن کے وقت

ان کے ظلم و ستم کے تختۂ مشق رہے ۸۴۱ء میں انھوں نے رُوان پر قبضہ کر لیا اور ۸۴۳ء میں بورڈیو پر اور اس وقت سے بلائے بے درماں کی طرح فرانس کے پیچھے پڑ گئے۔ اضلاع جرمنی پر ان کی تباہ کن یورشیں ۸۸۱ء سے شروع ہوئیں جبکہ رائن ندی کے ذریعے سے جرمنی میں داخل ہوئے اور لیج کالون اے لاشاپل اور متعدد بڑے بڑے شہروں کو نیست و نابود کر دیا مگر دس سال کے بعد ۸۹۱ء میں جرمن پھر سنبھلے اور آرنلف کے زیر کمان ایک زبردست فوج جمع ہوئی جس نے ان لیٹروں کی کافی گوشمالی کی اور پھر مدت تک جرمنی پر حملہ کرنے کی انھیں ہمت نہ ہوئی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس پر ان کی یورشیں جلد جلد ہونے لگیں شارلیمین کی سلطنت عظیم کی بنا اس کے اور اس کے پیش رووں کے فتوحات پر قائم ہوئی تھی مگر ان وحشی لٹیروں کے حملوں اور اس کے جانشینوں کے ضعف کے سبب جب سلطنت کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی اور اس کا قیام دشوار ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے حصے بخرے شروع ہو گئے۔ صلح نامۂ ورڈن کی رو سے تین سلطنتیں قائم ہوئی تھیں مگر تقسیم کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور اٹلی، برگنڈی اور جنوبی فرانس میں خودمختار سلطنتوں کی بنیاد پڑ گئی۔ ان اہم انقلابات کے علاوہ اس زمانے میں ایک نئی قوت وجود میں آ رہی تھی جس پر ایک مدت تک یورپ کے تمدن اور سیاسیات کا دار و مدار تھا یہ نظام جاگیری تھا اس نظام تمدن کی بنیاد زمانۂ قدیم ہی میں پڑ چکی تھی اور اس کی تشکیل کے متعلق ہم آیندہ چلکر بحث کرینگے۔ اس وقت صرف اتنا ہی بیان کر دینا کافی ہے کہ جاگیریت میں نظام سلطنت اور تمدنی تعلقات کا دار و مدار ملکیت زمین پر تھا مالک زمین نہ صرف اس علاقے کا مالک بلکہ حاکم، جج اور قائد فوج، بھی ہوتا تھا اور مالگزاری بھی وصول کرتا تھا۔ اپنے علاقہ میں اس کا کوئی مدمقابل نہ تھا اور گو وہ بادشاہ اور شہنشاہ کی حکومت کو تسلیم کرتا تھا بعض عدالتی معاملات میں ان کا دست نگر تھا اور زمانۂ جنگ میں ان کی امداد پر مجبور تھا مگر اپنے علاقے میں یا اپنے کاشتکاروں کے ساتھ کسی کی مداخلت کو جائز نہ رکھتا تھا جاگیریت کے اصول مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں متغائر رہے ہیں۔ اس کا نشوونما شارلیمین کی سلطنت کی نکبت و بربادی کے بعد ضروریات زمانہ کی وجہ سے ہوا۔ وحشیوں کے حملوں سے رعایا

نالاں تھی۔ شہنشاہ کی حکومت صرف برائے نام باقی رہ گئی تھی اس لئے رعایا مجبور تھی کہ حفاظت کے لئے قوی ترین مقامی قوت کے گرد جمع ہو اور ظاہر ہے کہ زمیندار کے سوا اطراف میں کوئی زبردست نہ تھا۔ اس نظام تمدن کی اشاعت نہایت سرعت کے ساتھ ہوئی اور گو اس کی جڑیں شہنشاہی کے ضعف سے مضبوط ہوئیں تھیں مگر اسکی وجہ سے سلطنتوں کے روز بروز حصے بخرے ہوتے گئے۔

۸۴۳ء کے بعد بھی کچھ روز تک شہنشاہی شارلیمین کے خاندان میں باقی رہی مگر شہنشاہ کا وجود بطور رجاور کے تھا اور خطاب شہنشاہی کے سوا اور کوئی اثاثہ اس کے نالائق جانشینوں کے پاس نہ تھا۔ ۸۸۸ء تک کوئی نہ کوئی فرد اس خاندان کا موجود تھا مگر اس سال خطاب شہنشاہی اس خاندان کی شاخ آرنل فنگ میں چلا گیا جن کا مورث ولد الحرام تھا مگر اس کے افراد بھی مرکھپ گئے اور دسویں عیسوی میں خاندان شارلیمین کا کوئی نام لیوا تک باقی نہ رہا اور خطاب شاہی کے دعویدار قوم سیکسن کے رئیس ہوئے جن کو شارلیمین نے کئی زبردست معرکوں میں زیر کیا تھا۔

کلیسیہ مسیحی کا اثر تمدن یورپ پر حسب سابق نہایت قوی تھا مگر نویں صدی کے آخر میں اس کا ستارۂ اقبال بھی گردش میں آرہا تھا۔ ہم کسی گذشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں کہ کلیسیہ مشرقی (قسطنطنیہ) و کلیسیہ مغربی (روما) میں باہمی اختلافات تھے اور انھیں اختلافات کے باعث شارلیمین درجۂ شہنشاہی تک پہنچ گیا تھا۔ عقائد مذہبی میں اختلاف کے علاوہ جن کی وجہ سے اتحاد دشوار تھا روما اور قسطنطنیہ کے اسقفوں میں باہمی رقابت بھی موجود تھی۔ ۸۶۷ء میں قسطنطنیہ میں قسیسوں کا ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں عقائد مذہبی کے متعلق چند ایسے امور طے ہوئے جن سے دونوں کلیساؤں میں دوامی منافرت پیدا ہو گئی۔ قسطنطنیہ کے قسیس پادریوں کے تجرد کے سخت مخالف تھے اور بقول ان کے یہ طریقۂ معاشرت "شیطان کا جال تھا"۔ انھوں نے مغربی مذہب کے اس اصول کی سخت مخالفت کی کہ "مقدس روح" "باپ اور بیٹے" سے نکلتی ہے تثلیث میں سے وہ لفظ "بیٹے" کو بالکل خارج کر دینے پر زور دیتے تھے کیونکہ ان کی رائے میں یہ عقیدہ بدعت سے مملو ہے اور "ایک ہزار لعنتوں کے موجب ہے"۔ اس کے

علاوہ انھوں نے عید "ایسٹر" کی تاریخ بھی کلیسیہ روما کی تاریخ سے مختلف کردی ان اختلافات کو رفع کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہیں مگر سب بے سود ثابت ہوئیں اور دونوں کلیسیہ اس وقت تک جدا جدا ہیں۔

پاپائے روما کو خود شہر روما اور اطالیہ کے شوریدہ سر افراد پریشان کئے ہوئے تھے یہ مسلمان اطالیہ کو تاخت وتاراج کر رہے تھے امرائے روما خود پوپ پر اپنا اقتدار جتلا رہے تھے اور اکثر یہ بھی ہوتا کہ ان کی کوئی جماعت پوپ پر واقعی اپنا اقتدار جمالیتی اور اپنے اغراض کی تکمیل اس کے ذریعہ سے کراتی۔ اپنے عہدے اور منصب جلیلہ کے تقدس کے باوجود اکثر پوپوں کی خانگی زندگی اور انکے دربار کی حالت نہایت شرمناک تھی اور شہر روما میں پوپ کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ مگر باوجود ان مقامی مشکلات اور کلیسیۂ مشرقی کیساتھ کے آئے دن کے قضیوں کے اس زمانہ میں پوپ نے نہ صرف مذہبی تفوق بلکہ دنیاوی اقتدار کے متعلق اپنے دعاوی کو وسعت دینی شروع کی اور اپنے دعاوی کی تقویت کے لئے چند تحریریں روما میں ۸۶۳ء میں شائع کرائیں جو "اسوڈورین ڈکریٹیلس" (Isidoran Decretals) کے نام سے مشہور ہیں اور جو بظاہر ابتدائی زمانے کے پوپوں اور کونسلوں کے مقولات ہیں۔ ان جملہ تحریروں سے مدعا یہ تھا کہ پوپ کو کلیسیہ کے معاملات میں بلاشرکت غیرے کامل اختیارات حاصل ہیں اور ممالک غرب میں حکمرانی کا حق بھی اس کو حاصل ہے۔ زمانہ حال کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہے کہ یہ سب تحریریں جعلی تھیں اور ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ تاریخ کے صحیح واقعات سے کسقدر ناآشنا تھے اسی زمانے کی ایک اور جعلی تحریر "عطیۂ کانس ٹن ٹائن" کے نام سے مشہور ہے اس عجیب وغریب کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ شہنشاہ کانس ٹن ٹائن وفادار و رحمدل، قادر و نیک نفس شاہ اقوام المانی، وسرمانی، جرانی و برطانوی، وہونی پارساو خوش نصیب فاتح وغازی و ذی شان مرض جذام میں مبتلا تھا اور بت پرست پجاریوں نے اس کو مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہائے بغیر اسے صحت نہیں ہوسکتی مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اسے صحت حاصل ہوئی اور صحت یابی کے شکریئے میں اس نے حکم دیا کہ کلیسیۂ روما کا قسیس اعلیٰ تمام دنیا کے

قسیسوں کا سردار ہوگا اور پوپ سلوسٹر ہمارے محلات واقع روما اور خود شہر روما اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک مغرب پر قابض رہے گا۔ ان احکام میں ختم عالم تک کسی قسم کی ترمیم یا تغیر نہ کیا جائے اسی تحریر پر پوپوں کی دنیاوی حکومت کا دعویٰ مبنی تھا اور پندرھویں صدی تک جب کہ یورپ میں پھر علوم وفنون کا دور دورہ ہوا کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے یا اس کی صحت میں شک لائے۔

یورپ کی نویں صدی کی تاریخ کا تبصرہ ختم کرنے کے قبل ہمیں دنیائے اسلام پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی اتحاد باقی نہ رہا تھا۔ دنیائے اسلام میں تین سلطنتیں قائم تھیں خلافت بغداد، خلافت مصر، اور امارت قرطبہ۔ مسلمان اس وقت معراج کمال پر پہنچ رہے تھے، ہسپانیہ میں ان کے تہذیب وتمدن کا بہترین زمانہ تھا مذہبی رواداری کی انھوں نے ایسی بے نظیر مثال قائم کی تھی جس کی تقلید عیسائی ریاستوں میں نہایت مفید ہوئی۔

طلب علم مسلمانوں کا واحد مشغلہ تھا۔ علوم ریاضی، ہیئت اور کیمیا کو انھوں نے وہ ترقی اور جلا دی جس کے یہ علوم اب تک احسانمند ہیں۔ مگر باوجود ان علمی اور تمدنی ترقیوں کے دنیائے اسلام میں وہ اثرات پیدا ہو گئے تھے جو اس کے ضعف کا باعث ہوئے۔ نظام جاگیری مغربی یورپ کی طرح دنیائے اسلام میں بھی قائم ہو چلا تھا اور اس کے علاوہ وراثت کے جھگڑوں، مذہبی نزاعوں اور فوجوں کی خودرائی اور مطلق العنانی کے سبب سے اکثر اسلامی سلطنتیں کمزور ہو چلی تھیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کی طرف سے عالم مسیحی کو جو خطرہ تھا وہ بظاہر رفع ہو رہا تھا مگر دو صدیوں ہی کے بعد دین اسلام اور اس کے ساتھ مسلمانوں کے جوش نے پھر زور پکڑا اور مسیحیت کو اپنے زبردست مخالف کے مقابلے میں اپنی مجموعی قوتیں صرف کر دینی پڑیں۔

باب ہفتم

جرمنی کے سیکسن بادشاہ اور سلطنت مقدس روما کا قیام

دسویں صدی کی ابتدا میں شارلیمین کی حسن تدبیر کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ اس کی عظیم الشان سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ تہذیب و تمدن کے جو تخم اس نے بوئے تھے وہ ناپید ہو چکے تھے، وحشی اقوام کے حملوں کی شدت بڑھ رہی تھی گویا یورپ کی پھر وہی حالت ہو گئی تھی جو چوتھی اور پانچویں صدی میں تھی مگر فرق صرف اتنا تھا کہ سلطنت روما کی طرح موجودہ سلطنتوں میں ان دشمنوں کے مقابلے کی تاب نہ تھی۔ مگر یہ واقعات صرف سطحی ہیں شارلیمین کے عظیم الشان کارناموں کی یاد اس کی قوم کے دلوں سے فراموش نہیں ہوئی تھی اور اس کے کارہائے نمایاں کی تقلید تمدن و امن و امان کے دوبارہ قائم ہونے کا باعث ہوئی۔ تعجب ہے کہ اس کے جانشین نہ اس کے خاندان سے تھے نہ نسل فرینک کے جرمن بلکہ قوم سیکسن اس کے تخت و تاج پر قابض ہو گئی جو اس کی سخت ترین دشمن تھی اور جس کے مقابلے میں وہ مدت تک معرکہ آرائی میں مصروف رہا۔

اس زمانے میں جرمنی کی مشرقی حد ایلب ندی تھی اور اس کے مشرق میں سلاوی اقوام آباد تھیں جن کو نسلاً جرمنوں سے کوئی تعلق نہ تھا ملک جرمنی چھ ریاستوں میں منقسم تھا جنمیں سے ہر ایک میں ایک حد تک قومی احساس موجود تھا یہ چھ ریاستیں سیکسنی، فرانیکونیا، تھورنجیا، سوابیا، باویریا، اور لارین کے ناموں سے موسوم تھیں۔

ان میں سے ہر ایک عملاً خود مختار تھی گو عہدنامہ وردُن کے رو سے شاہ جرمنی کی سیادت تسلیم کرتے تھے مگر اپنے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت جائز نہ رکھتے ۹۱۸ء میں جرمنی کا تاج و تخت خالی تھا اور اس کا کوئی دعویدار بھی نہ تھا۔ وراثت پدری کا طریقہ جاری ہو چکا تھا مگر جرمنی بادشاہی کے متعلق ابھی تک اس طریقۂ جانشینی کا عمل نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی دوسرا طریقۂ عمل تسلیم کیا جاتا تھا۔ لہذا ۹۱۹ء میں باشندگان سیکسنی و فرانکونیا کی ایک مجلس شوریٰ ہوئی جس میں ہنری رئیس سیکسنی کا جرمنی بادشاہی کے لئے انتخاب کیا گیا۔ دوسرے رئیسوں نے بھی بہت جلد اس کا انتخاب منظور کر لیا۔

ظاہر ہے کہ خود مختار رئیسوں کا ساختہ و پرداختہ بادشاہ بن جانا فی نفسہٖ کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی تاریخی اہمیت ہو سکتی ہے۔ مگر حالت موجودہ میں اس کا اثر کچھ اور ہی ہوا کیونکہ ایک قابل آدمی کی سیادت تسلیم کر لی گئی تھی جو ایک زبردست اور پُرعزم قوم کا سردار تھا اور اس زمانے سے تین سو برس سے کچھ زیادہ تک جرمنی میں بلحاظ اتحاد و فلاح قومی و قوت مسلسل ترقی ہوتی رہی۔ ہنری کے دور حکومت میں کوئی خاص بات قابل بیان نہیں بالفاظ دیگر اس کی حکومت اس کے بیٹے اور جانشین کی حکومت کا پیش خیمہ ہے۔

اس نے اپنی تمام قوت اپنے ملک کی سرحدوں کے استحکام میں صرف کر دی قوم فارمن کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا مگر ایلب ندی کے شرق میں جو غیر جرمن اقوام آباد تھے وہ دیسی اقوام کو دبا رہے تھے اس خطرے کو دفع کرنے کیلئے اس نے ایلب ندی کے سواحل پر جرمنی نو آبادیوں کے قیام کے لئے راستہ کھول دیا اور متعدد سلاوی اقوام کو محکوم کر کے شارلیمین کے کام کی تکمیل کی ہنری نے اس خطۂ ملک کو بھی اپنا تابع فرمان کیا جو زمانہ مابعد میں برنیڈنبرگ کے نام سے مشہور ہوا اسی خطہ ملک میں ہوہین زولرن کے خاندان شاہی کا نشو و نما ہوا جسکے افراد ۱۷۰۱ء میں شاہان پرشیا اور ۱۸۷۱ء میں شہنشاہ جرمنی ہوئے اور جنھوں نے جرمنی کی متحدہ قوت کو ایسی ترقی دی جو ہنری کے زبردست خاندان سے ممکن نہ ہو سکی تھی۔ ڈنمارک کے جنوبی حصے پر بھی اس نے قبضہ کر لیا اور دین مسیحی کی وہاں اشاعت کی۔ مگر سب سے زیادہ وقعت

اس کو قوم مگیار کے زیر کرنے میں ہوئی جن کے قبضے میں اس وقت ڈینیوب ندی کے وسطی اضلاع تھے اور ان کے جوق کے جوق نہ صرف مشرقی جرمنی بلکہ ملک کے وسط تک تاخت و تاراج کرتے چلے آتے تھے۔ ان کا قلع قمع کرنے کے لئے ہنری نے دو طریقے اختیار کئے ایک تو جن راستوں سے وہ حملہ کرتے تھے ان پر مستحکم قلعہ پوش شہر بسا دیئے اور ثانیاً سواروں کے دستے ان لٹیروں کے تعاقب کے لئے مقرر کئے ۔ ۹۳۲ء میں اس کی طویل تیاریاں بارآور ہوئیں اور قوم مگیار کو شکست فاش ہوئی۔ جرمنی کے اندرونی معاملات میں اس کی ہمیشہ یہ کوشش تھی کہ دوسرے رئیسوں کو ہموار رکھے تاکہ وہ اس کی سیادت کو تسلیم کرتے رہیں۔ اس لئے وہ ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا کہ گویا وہ خود مختار بادشاہ ہیں اس طرح ملک جرمنی بجائے ایک متحد ریاست کے متعدد ریاستوں کا اتحاد تھا۔ ۹۳۶ء میں اس نے انتقال کیا مگر اپنے دور حکومت میں بہت کچھ کر گیا۔

اس کا جانشین اس کا بیٹا آٹو اول (یا آٹو اعظم) تخت جرمنی کا مالک ہوا اور اپنے باپ کے اصول پر چلتا رہا۔ اس نے ملک جرمنی کی حفاظت اور تنظیم میں سعی بلیغ کی بادشاہی کی قوت کو بہت بڑھایا اور پھر شارلیمین کی تقلید میں تاج شہنشاہی کا دعویدار ہوا۔ جرمن آبادکاروں اور افواج کو وہ ایلب ندی کے شرق میں بڑھاتا گیا میگڈیبرگ کی بشپ رک اسی نے قائم کی جو اضلاع مفتوحہ کا نہ صرف مذہبی مرکز تھا بلکہ ایلب ندی کے راستہ کی حفاظت بھی اس کے قیام سے مقصود تھی۔ سرحدی اضلاع میں اس نے خاص قسم کی حکومتیں قائم کیں جو مغرب میں پلاٹینیٹ کے نام سے موسوم تھیں اور مشرق میں ”مارک“ کے نام سے شرق میں اس نے شمالی مارک اور مشرقی مارک قائم کئے اور جنوب میں باویریا کا ”مشرقی مارک“ جو بعد میں آسٹریا کے نام سے مشہور ہوا۔ اطالیہ میں سے ویرونا کا مارک قائم کیا۔ ان سرحدی صوبہ جات میں حکام کو زیادہ اقتدار اور اختیارات دیئے گئے تھے جو ان کے ہم درجہ حکام کو جرمنی کے متمدن حصّہ میں حاصل نہ تھے۔ قوم مگیار سے اس سے بھی جنگ کا سلسلہ قائم رہا۔ ۹۴۹ء میں مگیار ڈینیوب کو عبور کرکے جرمنی میں حملہ آور ہوئے مگر آٹو نے ان کے ٹڈی دل کو بمقام لیخ فیلڈ (قریب آگسبرگ) روکا اور ان کو ایسی شکست فاش دی کہ آئندہ

سے وسطی یورپ ان کے حملوں کے خطرے سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا اس شکست کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم گمیار لوٹ مار کرنے کے بجائے ڈینوب کے وسطی حصے کی زمینوں پر آباد ہو گئی ان کی سلطنت ملک ہنگری کے نام سے مشہور ہوئی ۔

آٹو کو بہ مقابلہ اپنے باپ کے جرمنی کے رئیسوں کے ساتھ زیادہ مشکلات کا سابقہ ہوا اس کو ایک حد تک اس کوشش میں کامیابی ہوئی کہ اپنے اعزہ کو ان کے مقبوضات پر قابض کرا دے یا اپنی خاندان کی شاہزادیوں کا ان سے نکاح کر دے مگر ان تدابیر کے باوجود یہ امرا اپنی وفاداری پر قائم نہ رہے اور آٹو کو ان کی سرکوبی کے لئے ان پر کئی مرتبہ لشکر کشی کی ضرورت ہوئی کیونکہ امراء اپنے آپ کو خود مختار بادشاہ تصور کرتے تھے اور آٹو اپنی سلطنت کے حکام سے زیادہ ان کی وقعت نہ کرتا تھا آٹو ان کی گوشمالی برابر کرتا رہا مگر اُن کی ہمتیں پست نہیں ہوئیں اور قرون وسطیٰ میں بادشاہوں اور امراء کے قضیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا ۔

امرائے عظام کی شورہ پشتی سے تنگ آکر آٹو پادریوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان کو اپنا معتمد علیہ بنایا کیونکہ جرمنی میں یہی ایک تعلیم یافتہ طبقہ تھا اور چونکہ پادری تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے اس لئے ان سے یہ خوف نہ تھا کہ اپنے خاندانوں کے بقا کے لئے امراء کی طرح بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے ۔ یورپ کی حالت اس زمانے میں نہایت نازک اور مخدوش تھی اس لئے بادشاہ کو اختیار تھا کہ جس کو چاہے بشپ یا کلیسیہ کا اعلیٰ عہدہ دار کر دے ۔ جتنا جتنا اس کا زمانہ گزرتا گیا وہ اعلیٰ درجے کے پادریوں کو ملکی خدمات پر مقرر کرتا گیا اور اس زمانے سے جرمنی کے بشپ مذہبی فرائض ادا کرنے کے بجائے مالگزاری وصول کرنے ، مقدمات طے کرنے ، فوج کی تنظیم و ترتیب اور دیگر انتظامی معاملات میں مصروف ہو گئے کلیسیہ اور جرمانیہ بادشاہت کے ان مضبوط تعلقات سے آٹو اطالیہ کی پاپائیت کی طرف متوجہ ہوا اور اب ہم کو بھی اس ملک سے متوجہ ہونا چاہئے ۔

اطالیہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی وہاں صرف امن و امان کے قیام کی ضرورت تھی اور یہ اگر ہوتا تو اطالیہ یورپ کا سب سے زیادہ مرفہ الحال اور ترقی یافتہ ملک ہوتا ۔ مگر امن و امان عنقا تھا اور صدیوں تک اطالیہ کی یہی حالت رہی شمال میں ایک برائے نام شاہ اطالیہ تھا جو شارلیمین کی جنوبی سلطنت کا وارث تھا مگر تمام ملک اس کے زیر حکومت نہ تھا شمالی حصۂ ملک میں قوم گمیار کی

لوٹ مار سے آئے دن مصیبت رہتی تھی۔ وسطی حصّے پر اس صدی کی ابتدا میں تیس سال تک مسلمانوں کا مستقل قبضہ رہا اور یوں بھی مسلمان لوٹ مار کرتے رہتے تھے شہنشاہان قسطنطنیہ کے قبضے میں چند محفوظ مقامات تھے مگر تمام ملک مسلمان بحری حملہ آوروں کی دست برد سے ابتری کی حالت میں تھا۔ اطالیہ میں اس کے قبل بھی طوائف الملوکی کا زور رہا ہے مگر اس کا نعم البدل پاپائے روما کی قوت کے استحکام اور رعایا کی خیر اندیشی سے ہو جاتا تھا مگر دسویں صدی کی ابتدا میں پوپ کے دربار میں نہ صرف یہی ایک طوفان بدتمیزی کا عالم تھا بلکہ ان کی تاریخ کا یہ نہایت تاریک دور تھا شہر روما مختلف جماعتوں کی رقابتوں کا شکار ہو رہا تھا اور ہر جماعت پوپ کے ذریعے سے اپنا کام نکالنا چاہتی تھی اس زمانے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ روما کے سیاسی اور مذہبی معاملات میں چند عالی مرتبت خواتین کو خاص دخل حاصل ہو گیا تھا اس کی وجہ سے ایک ناقابلِ یقین روایت مشہور ہو گئی ہے کہ پاپائی کے منصبِ جلیلہ پر ایک عورت بھی سرفراز ہو چکی ہے۔

پاپائے روما کے دربار کی ان لغویتوں سے اٹو کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ چونکہ اس نے اپنی سلطنت کے انتظام کا بیشتر حصہ پادریوں کے سپرد کر دیا تھا کلیسیا ہی کے مرکز میں ان خرابیوں کا پیدا ہو جانا اُس کے مفاد کے منافی تھا اور نہ وہ کلیسیا میں کسی ایسے شخص کی حکمرانی پسند کر سکتا تھا جو صاحب قوت ہونے کے ساتھ جرمنی کا مخالف ہو اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر روما میں اس کا رسوخ۔ اقتدار قائم ہو جائے تو اس کے ملک کے پادری ہمیشہ کے لئے اس سے دبے رہیں گے اور مینز کے آرچ بشپ کی طرح کبھی اس کی مخالفت پر آمادہ نہ رہینگے۔

ان وجوہ سے جرمنی بادشاہوں نے اطالیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا جس سے زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ میں چند نہایت دلچسپ ابواب کا اضافہ ہوا۔ مگر اٹو جب پہلی مرتبہ اطالیہ پر حملہ آور ہوا تو پاپائے روما سے اسے کوئی سروکار نہ تھا اطالیہ کے آخری بادشاہ لوتھر کی ایک بیوہ ایڈیلیڈ تھی اور اس کی جانشین برینگر کی خواہش تھی کہ اس بیوہ کا اپنے بیٹے سے نکاح کر دے۔ مگر ایڈیلیڈ کو یہ تعلق ناگوار تھا اور اس سے بچنے کے لئے اس نے اٹو سے امداد کی درخواست کی۔ اٹو اطالیہ پر حملہ کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈھ رہا تھا اس نے ایڈیلیڈ کی درخواست کو منظور کر لیا اور کسی قدر تھوڑی

بغیر اطالیہ کے تاج و تخت پر قابض ہو گیا شاہ برنیگر کے ساتھ اس نے زیادہ سختی نہیں کی بلکہ اپنا نائب بنا لیا اور خود بمقام اطالیہ تاج شاہی اپنے سر پر رکھکر ایڈیلیڈ کو اپنی زوجیت میں لے آیا مگر اطالیہ کا تاجدار ہو جانے سے وہ پوپ کا ہمسایہ ہو گیا اور شہر روما کے معاملات میں اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔

سنہ ۹۶۲ء میں اسے روما کے معاملات میں بھی دخل دینے کا موقع مل گیا پوپ جان دوازدہم سے بیرنیگار سے سخت بگاڑ تھا اور شہر روما کی مختلف پارٹیاں اسے یوں بھی پریشان کیئے ہوئے تھیں پوپ پر بھی بد اعمالی اور عیاشی کا الزام تھا مگر اس نے آٹو سے اپنے دشمنوں سے بچانے کے لیئے امداد کی درخواست کی اور آٹو نے اس کے حسب الحکم آکر روما پر بلا کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا اور پوپ کا اقتدار دوبارہ قائم کرا دیا۔ ناظرین اب آٹو شاہ جرمنی اور شارلیمین کی حالت کا مقابلہ کریں۔ دونوں اپنے زمانے کے قوی ترین بادشاہ تھے اور دونوں نے یورپ کے غیر مسیحی دشمنوں کے خلاف کامیابی حاصل کی تھی اور دونوں نے کلیسہ کی ترقی اور اس کی قوت کے استحکام میں سعی بلیغ کی تھی اس لئے آٹو کو بھی بارگارہ پاپائی سے وہی صلہ ملا جو شارلیمین کو ۱۶۲ سال قبل ملا تھا۔ ۲ر فروری سنہ ۹۶۲ء کو تاج شہنشاہی آٹو کے سر پر رکھا گیا جس سے گویا شارلیمین کی شہنشاہی یورپ میں دوبارہ قائم ہو گئی۔ دونوں شہنشاہوں کی حالت ایک حد تک مشابہ تھی مگر ایک نمایاں فرق بھی تھا۔ شارلیمین کی سلطنت متفرق اجزا پر مشتمل تھی۔ وہ خود تو جرمن تھا مگر اس کی حکومت فرانس، برگنڈی، ہسپانیہ اور اطالیہ پر تھی۔ برخلاف اس کے آٹو اطالیہ پر حملہ آور ہونے کے قبل صرف جرمنی کا بادشاہ تھا اور اس کی رعایا خالص جرمنی تھی۔ ان وجوہ سے تاج شہنشاہی کا وہ اس قدر مستحق نہ تھا جتنا کہ شارلیمین اور اس کے اس فعل سے اس کے جانشینوں کے لئے خطرناک نتائج مترتب ہوئے۔ اگر اس خاندان کے بادشاہ اپنی حکومت جرمنی تک محدود رکھتے تو اغلباً ان کی حکومت قوی اور مستحکم ہوتی مگر اطالیہ کے تعلقات اور منصب جلیلۂ شہنشاہی کے گوناگوں مشاغل سے اطالیہ اور پاپائیت کے آئے دن کے جھگڑوں میں منہمک رہنا پڑا جس سے وہ اپنے اصلی کام یعنی سلطنت جرمنی کے استحکام کی طرف متوجہ نہ ہو سکے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک جرمنی کو متحد نہ رکھ سکے اور شہنشاہی بھی کچھ روز کے بعد برائے نام رہ گئی۔

مگر جن خطرات کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کا تعلق مستقبل بعید سے ہے تاجپوشی کے بعد ہی اطالیہ میں مشکلات پیدا ہونے لگے خود پوپ جس پر آٹو کے احسانات کا بار گراں تھا یہ احسانات بھول گیا اور اس کی مخالفت کرنے لگا۔ مگر آٹو نے اس کو تخت پاپائی سے اتار دیا اور دوسرا شخص مقرر کیا گیا۔ اہل روما سے آٹو نے احتیاطاً یہ قسم لے لی کہ وہ کسی ایسے پوپ کو تسلیم نہ کرینگے جس کا تقرر شہنشاہ کے ایماء سے نہوا ہو۔ مگر عہد شکنی رومیوں کی خمیر میں ملی ہوئی تھی اور آٹو کو بدقت بسیار یہ معلوم ہوا کہ روما اور اطالیہ کی حکومت اسے آئے دن کے جھگڑوں میں مبتلا رکھے گی۔ آٹو نے سنہ ۹۷۳ء میں جرمنی میں انتقال کیا۔

اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا آٹو ثانی اور اس کا پوتا آٹو ثالث اس کے جانشین ہوئے مگر ان کے عہد سلطنت میں کوئی خاص امر قابل تحریر نہیں لیکن وہ خطرات جو شہنشاہت کے لئے مہلک ثابت ہوئے پیدا ہو چلے تھے آٹو ثانی کے دور حکومت میں اطالیہ کے تعلق سے جو نقصان تھا وہ بھی ظاہر ہونے لگا تھا۔ مسلمانوں نے جنوبی اطالیہ پر حملہ کیا۔ آٹو ثانی نے ابتدائً کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا مگر آخر میں سخت ناکامی ہوئی اور اس اثناء میں جب کہ وہ ایک غیر ملک کی محافظت میں مصروف تھا خود اس کے ملک پر مشرق کے بت پرست وحشیوں نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ اسکے جانشین آٹو ثالث کے دور حکومت میں بھی اطالیہ کا اثر غالب تھا۔ یہ شہنشاہ عجیب خواص کا انسان تھا۔ اس کی ماں قسطنطنیہ کے خاندان شاہی سے تعلق رکھتی تھی اور اسی سے غالباً اس نے حکمرانی کے وہ طریقے سیکھ کر جاری کئے جو جرمن طبائع کے لئے باعث تنفر تھے آٹو پر ایک پادری کی تعلیم کا بھی بہت اثر پڑا تھا جو بعد میں سلوسٹر ثانی کے نام سے سریر پاپائی پر متمکن ہوا اس پادری اور اپنی ماں کی تعلیم سے آٹو کو ایک زبردست مرکزی حکومت کی قسطنطنیہ کے طرز پر قائم کرنے کا حوصلہ ہوا جو جرمن طرز حکومت سے بالکل متضاد تھی۔ ان تجاویز کو بار آور کرنے کے لئے وہ شہر روما میں ایک عالیشان محل میں اقامت گزیں ہوا اور مشرقی درباروں کے آداب و طریق کی سختی کے ساتھ پابندی کرنے لگا۔

مگر اس کے طرز عمل سے نہ جرمنی خوش ہوئے اور نہ رومی اور آخر کار رعایا کی بغاوت سے وہ روما سے بے سروپا بھاگ کھڑا ہوا اگر وہ زندہ رہتا تو اسکو مزید ناکامیوں کا خوگر ہونا پڑتا مگر دست اجل نے ۱۰۰۲ء میں اس کا خاتمہ کردیا اس جگہ یہ ذکر کردینا مناسب ہوگا کہ جرمنی کی شرقی سرحد پر دو زبردست ریاستیں قائم ہوگئیں تھیں جو زمانۂ مابعد میں ملک جرمنی سے اکثر برسرپرخاش تھیں ایک تو سلطنت پولینڈ تھی جس کا خودمختارانہ قیام پوپ کی امداد سے عمل میں آیا تھا اور اس کے جنوب میں قوم مگیار نے مذہب مسیحی قبول کر کے ملک ہنگری میں مستقل حکومت قائم کرلی اس طرح جرمنی کو اب سرحد شرقی پر وحشیوں کی لوٹ مار کرنے والی جماعتوں سے سابقہ نہ تھا بلکہ دو سلطنتوں سے جن کی اہمیت اور قوت روزافزوں ترقی پر تھی اس زمانہ کے لوگوں اور خود شہنشاہ کی اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی ایک مثال قابل اندراج ہے۔ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں عموماً جاگزیں ہوگیا تھا کہ ۱۰۰۰ء میں یا تو دنیا کا خاتمہ ہوجائے گا یا اُس کی صورت بالکل مسخ ہوجائے گی اس سال کے شروع ہونے کے قبل ہی سے تعمیر اکثر بالکل مسدود ہوگئی، کھیتوں کی کاشت بند ہوگئی گویا دنیا کا تمام کاروبار رک گیا مگر جب قیامت نہ آئی تو پھر گرجوں کی تعمیر شروع ہوگئی اور عالم مسیحی میں پھر عقل سلیم کے مطابق لوگ عمل کرنے لگے۔

شہنشاہی اور پاپائیت کی معرکہ کا آغاز

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت تک پوپ اور شہنشاہ ایک دوسرے کے ممد ومعاون تھے مگر اب ان اختلافات کا سلسلہ شروع ہونے کو ہے جن سے اطالیہ وجرمنی ہردو ممالک میں ابتری پیدا ہوئی۔ ان دونوں قوتوں کی باہمی رقابت کا سلسلہ ہم کو زمانۂ وسطےٰ کی ساری تاریخ سے واقف کردے گا اب ہم بیان کرینگے کہ اس معرکۂ عظیم کے قبل دونوں ممالک کی سیاسی حالت کیا تھی۔

جن وجوہات سے شاہانِ جرمنی نے اطالیہ کے حصۂ کثیر کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا اور جس بنا پر انھوں نے تاج شہنشاہی کا دعوےٰ کیا تھا اس کا مفصل تذکرہ آچکا ان کے اس فعل کو حرص جہاں بانی یا بلند حوصلگی پر محمول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ روما میں اپنا اقتدار قائم کرنے سے انھوں نے ایک گونہ پاپائیت اور جرمنی دونوں کی خدمت کی تھی مگر اطالیہ اور جرمنی کا تعلق ابتداہی سے مشکلات سے خالی نہ تھا اور مرور زمانہ سے اُن مشکلات کا حل اور بھی دشوار ہوتا گیا کیونکہ ان دونوں ممالک کے قدیم تاریخی روایات اور موجودہ تمدنی حالات میں بُعد عظیم تھا۔ جرمنی میں رومی حکومت کا قیام نہایت قلیل زمانہ تک رہا اور اس کے طرز حکومت ونظام حکومت سے قدیم روما کے اثرات بالکل مٹ گئے تھے جاگیریت کی جڑیں جرمنی میں نہایت مضبوط ہو گئی تھیں اور اسی پر اُس کے سارے تمدن وسیاست کی بنیاد تھی۔

برخلاف اس کے ملک اطالیہ قرون اولیٰ سے رومی تہذیب و حکومت کا مرکز تھا اس ملک کی زبان اور اس کا تمدن سب روما کے مرہون منت تھے۔ اطالیہ کے تمدن کے ہر شعبے پر قدیم روما کا اثر باقی تھا خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں جن کی طاقت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور ان کے باشندے خود مختاری کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔ اطالیہ میں بھی جاگیریت کا اثر پیدا ہو چلا تھا مگر اس شدت کے ساتھ نہیں جیسے کہ جرمنی میں جرمنی کے حکام بادشاہوں یا شہنشاہ طلبوا کلیسئہ مسیحی سے مل کر کام کرنے کے عادی تھے۔ برخلاف اس کے اطالیہ میں گو ان بادشاہوں نے پاپائیت کی آڑے وقتوں میں دستگیری کی تھی مگر اس کے ساتھ دوستانہ اور مفید تعلقات پیدا کرنا دشوار تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلیسئہ کاتھولیک کے سردار ہونے کے علاوہ پاپائے روما کی اطالیہ میں سلطنت بھی تھی اور پوپوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ دینی اور دنیاوی ہر دو امور میں شہنشاہی کے اثر اور دباؤ سے آزاد رہیں۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ یہ کشیدگی بھی بڑھتی چلی گئی اور پوپ جب اپنے نظام حکومت یا قوت میں استحکام پیدا کرنا چاہتے تو شہنشاہی کا مقابلہ لازمی ہوتا تھا مزید برآں اہل اطالیہ کو جرمنوں کی محکومی ناگوار تھی۔ یہ صحیح ہے کہ گیارھویں صدی میں قومی احساس پیدا نہیں ہوا تھا اور اس زمانے کے نظامِ تمدن میں بین الاقوامیت اس قدر تھی کہ زمانہ حال میں ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ گو اس زمانے میں نہ کوئی خاص اطالی قوم تھی نہ جرمنی قوم مگر باوجود اس کے اطالیوں کو اپنے درمیان میں غیر ملکی حکام اور سپاہیوں کا قیام ناگوار تھا جن کی زبان جن کے طبائع اور جن کا تمدن ان سے مختلف اور متضاد تھا۔ مخالفت کے یہی تخم تھے جن سے شہنشاہوں اور پوپوں کے درمیان ایک معرکۂ عظیم پیدا ہو گیا جو دو صدیوں تک یورپ کی تاریخ میں پیش نظر رہیگا۔

آٹو ثالث کی موت کے بعد سلطنت جرمنی اور شہنشاہی مقدس روما ہر دو کی عنان حکومت یکے بعد دیگرے ہنری ثانی کانراڈ ثانی اور ہنری ثالث کے ہاتھوں میں رہی۔ جرمنی میں خاموشی تھی۔ امرائے عظام کے ساتھ چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی اور بادشاہ ان کو دبانے کی کوشش کرتے رہتے مگر اس کا مفصل ذکر غیر ضروری ہے۔ ان سے زیادہ اہم یہ واقعہ ہے کہ ۱۰۳۲ء میں ملک برگنڈی شہنشاہی قبضہ میں آ گیا اور ہنری ثانی کے جانشینوں نے اس کا انتظام اس طرح کیا کہ ایلپس کے سلسلۂ کوہ کے مغربی درے ان کے قبضے میں رہیں تاکہ

اطالیہ میں ان کی افواج کے داخل ہونے میں کوئی زحمت نہ ہو۔ ان بادشاہوں کے دور حکومت میں بھی اطالیہ میں مشکلات کا سلسلہ جاری تھا۔ ان بادشاہوں کا فرض تھا کہ ملک جرمنی کو متحد رکھیں اور اس کی قوت کو استحکام بخشیں مگر یہ مفید اور ضروری کام چھوڑ کر ان کو بار بار اطالیہ کے لاطائل معاملات میں دخل دینا پڑتا تھا جن کے حل کرنے سے وہ مجبور تھے ان کی حکومت کا تذکرہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر روما کی مختلف جماعتوں کے باہمی نزاعات میں وہ بار بار دخل دیتے تھے اور جنوبی اطالیہ کی مختلف العناصر آبادی پر اپنا سکہ جمانے کے لئے فوج کشی کرتے رہے۔ مگر یہ سب معاملات گویا آنے والے معرکۂ عظیم کے پیش خیمے تھے اور اس لئے ان کا تفصیل سے بیان کرنا غیر ضروری ہے۔

اس اثنا میں اطالیہ میں جدید سیاسی عناصر وجود میں آرہے تھے۔ اطالیہ کے بلدیات کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ یعنی شہروں کی اپنی آزادانہ حکومت کی ابتدا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ بلدیات مذکور کو دوسری اور تیسری صدیوں کی عالیشان شہری بستیوں سے براہ راست کوئی تعلق تھا یا نہیں کیونکہ اطالیہ کے شہروں کا نظام بلدی صوبوں کی ابتری اور طوائف الملوکی کی وجہ سے ضعیف ہو گیا تھا اور ان میں جو جدید روح پیدا ہو گئی تھی وہ ان کے باشندوں کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ بلدیات مذکور میں سے ملان، لوکا، ویرونا، فلارنس، پیسا اور جینوا نے خاص سیاسی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ یہ شہر جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے کہ زیادہ تر شمال میں تھے۔ اطالیہ کے وسط میں پاپایان روما کی روز افزوں قوت اور ان کی مخالفت سے بلدیات کو فروغ حاصل ہونا دشوار تھا۔ علیٰ ہذا جنوب میں بھی بلدیات کو اہل نارمن کے طاقت پکڑ لینے سے زیادہ فروغ نہیں ہوا۔ قوم مذکور کے اطالیہ میں وارد ہونے سے قبل ہی جنوبی اطالیہ میں مختلف اقوام آباد تھے اور ہر ایک اپنی سیادت قائم کرنے کی فکر میں تھا۔ شاہان قسطنطنیہ کا اب بھی چند بڑے بڑے ساحلی مقامات پر قبضہ باقی تھا اور ان کے یونانی سپہ سالار اکثر اپنی فوجوں کے ساتھ اس خطۂ ملک میں وارد ہوا کرتے تھے قوم لامبارڈ کی اسپولیٹو اور بینو وینٹو میں دو زبردست ریاستیں تھیں، مسلمان سسلی پر قابض تھے اور سرزمین اطالیہ پر نہ صرف اکثر یورشیں کرتے رہتے بلکہ تعداد کثیر میں آباد بھی ہو گئے تھے۔ مگر باشندوں کی تعداد غالب اطالوی تھی اور چونکہ بار بار وہ تبدیل حکومت سے پریشان تھے اس لئے وہ تیار تھے کہ جو قوت امن و امان کی ضامن ہو سکے اس کی امداد کریں سنہ ۱۰۱۶ء

میں قوم نارمن کے افراد سرزمین اطالیہ میں بار اول وارد ہوئے اس زمانے میں فرانس میں
بسین ندی کے سواحل پر آباد ہو کر انھوں نے نارمنڈی کی زبردست سلطنت قایم کر دی تھی
پچاس سال کے بعد وہ انگلستان پر حکمراں ہو گئے اور اس زمانے میں ان کے گروہ کے گروہ
ممالک بحر روم میں فلسطین کے مقامات مقدسہ کی زیارت اور لوٹ مار کی غرض سے وارد ہو رہے
تھے اطالیہ میں جو نارمن ۱۰۱۶ء میں آئے وہ بیت المقدس کو زیارت کی غرض سے گئے تھے
مگر جنگ وجدال ان کے خمیر میں تھی لہذا انھوں نے جنوبی اطالیہ کے مناقشات میں نہایت
شوق سے حصہ لیا۔ ان کی امداد غنیمت خیال کی گئی اور ان کی فوجوں کو اول اول فتح نصیب
ہوئی گو یہ دائمی نہ تھی مگر فتح اور شکست ان کے لئے دونوں برابر تھیں، اطالیہ کی دولت و
ثروت اور لوٹ مار کے بیشمار مواقع کی خبریں نارمنڈی پہنچ چکی تھیں اور وہاں سے نارمنوں
کے گروہ کے گروہ اپنے اہل ملک کی امداد اور اپنی ذاتی منفعت کے لئے آنے لگے ۱۰۴۶ء میں
رابرٹ گوئسکارڈ ابن ٹانکریڈ اطالیہ میں وارد ہوا جس کا قوم نارمن کی تاریخ میں ولیم فاتح
انگلستان کے بعد درجہ ہے۔ کچھ روز تک تو قزاقی پر اس کا دار و مدار رہا، کبھی ایک فریق کی
حمایت میں لڑتا، کبھی دوسرے کی۔ مگر اس کی قوم کی دست درازیوں سے آخر کار مقامی باشندے
تنگ آ گئے اور رجملہ فریق ان کے اخراج پر آمادہ ہو گئے۔ پوپ لیو نہم کی فوجیں یونانیوں
اور اہل لمبارڈ کی امداد کے لئے پہونچ گئیں اور قریب تھا کہ نارمنوں کا خاتمہ ہو جائے۔
مگر ان کی قسمت نے یاوری کی اہل ملک کی ایک جماعت کو ان کے ساتھ ہمدردی تھی۔
ان کے دشمن کو اپنی قوت پر غرہ تھا اور ان کی جرأت اور بہادری میں کوئی کلام نہ تھا
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کیوٹیاٹے (Civitate) میں ان کے دشمنوں کو شکست فاش
ہوئی اور کچھ روز کے بعد خود پوپ اس کا اسیر ہو گیا۔ مگر اس جنگ کا نتیجہ عجیب و غریب
اور بعید از قیاس ہوا اہل نارمن مذہب کے پابند تھے اور پوپ کے ساتھ انھیں خاص
عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنے اسیر پوپ لیو کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا اور چونکہ ان
کو مسیحی کلیسا کے ساتھ خاص عقیدت تھی لہذا پوپ نے ان سے معقول شرائط پر صلح
کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے سے تیرھویں صدی تک اہل نارمن کا شمار پوپ کے
حلیفوں میں تھا۔ ۱۰۵۹ء میں پوپ نے رابرٹ گوئسکارڈ کو اپنے زیر عاطفت اپولیا اور
کالابریا کا ڈیوک مقرر کر دیا اور جزیرہ سسلی بھی اس کو اس شرط پر بخش دیا کہ جزیرہ مذکور

کو مسلمانوں کے قبضے سے نکال لے۔ سنہ ۱۰۶۲ء میں سسلی بھی متعدد معرکہ آرائیوں کے بعد اس کے قبضے میں آگیا۔ کیونکہ اس خطۂ ملک میں مسلمانوں کی فوجی قوت روبہ انحطاط تھی نارمنوں کو سسلی پر قبضہ کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوی۔ سسلی اور جنوبی اطالیہ میں انھوں نے ایک مضبوط اور استوار حکومت قائم کرلی صدیوں کی ویرانی اور بربادی کے بعد اس ملک کو سرسبزی اور خوشحالی نصیب ہوئی۔ علوم و فنون کو فروغ ہوا، خوشنما عمارتوں کی تعمیر عمل میں آئی۔ مگر چونکہ ان کی حکومت شخصی تھی اس لئے ان کے زیر سایہ بلدیات کے فروغ کا بہت کم موقع تھا۔

اس ملک کے شمال میں ریاست ٹسکنی تھی۔ اس کا رقبہ نہایت وسیع تھا اور اسلئے اطالیہ کے سیاسیات میں اس کی خاص اہمیت تھی۔ اس ریاست کا کاؤنٹ بانی فیس شہنشاہ کے معاونین میں سے تھا اور اسی کی عنایت سے بانی فیس کو کئی بڑے بڑے شہر مثلاً مینٹوا، فیرارا، بریشیا اور موڈینا مل گئے تھے۔ مقبوضات مذکور کی وجہ سے وسطی اطالیہ میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ اس کے انتقال کے بعد (سنہ ۱۰۶۹ء) میں اسکی بیٹی مٹلڈا رئیسہ ٹسکنی اس کی وارث ہوئی جس کی شادی گاڈفری رئیس لارین سے ہوئی مگر یہ دونوں لاولد تھے اور کلیسیا اور پوپ کے معتقدین خاص میں تھے اس وجہ سے جب پوپوں اور شہنشاہوں میں نزاع ہوئی تو ان دونوں نے افواج و زر و مال سے پوپ کی امداد کی۔

اب ہم پوپوں کی حالت پر ایک نظر ڈالیں گے قیام شہنشاہی سے روما کے اندرونی معاملات میں ایک حد تک اصلاح ہوچکی تھی مگر اب بھی مزید اصلاحات کی ضرورت باقی تھی۔ شمالی اطالیہ میں پوپ کا اقتدار تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ کائیلن اور راوینا کے (اسقف) بھی پوپ کے مساوی ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ خود روما میں آئے دن شرمناک جھگڑے ہوا کرتے۔ پوپوں کو شہر روما کے حکام کے ساتھ کبھی تابل اطمینان تعلقات قائم کرنے میں کامیابی نہ ہوئی کیونکہ حکام مقامی گو اس بات کو خوب جانتے تھے کہ شہر روما کو جو کچھ اہمیت ہے وہ پوپ کے قیام سے ہے مگر پوپ کی حکومت انکو ناگوار تھی۔ اس وجہ سے حکام بلدی و حکام کلیسیہ میں ہمیشہ ناچاقی رہتی جس کا دفعیہ مشکل تھا۔ پوپوں کے انتخاب کا بھی کوئی معین طریقہ نہ تھا۔ شہنشاہ اور پادریوں کے علاوہ امراء و عوام شہر روما دعویدار تھے کہ ان کو

انتخاب کا حق ہونا چاہیئے مگر ہر ایک کا کس قدر حصہ انتخاب میں ہونا چاہیئے اس کا کبھی تصفیہ نہیں ہوا
عہد زیر تذکرہ کے پوپوں کے متعلق بہت سے ناقابل اعتبار روایات مشہور ہو گئے ہیں مگر جن
روایات کی تحقیق ہو چکی ہے وہ بھی عجیب وغریب ہیں۔ مثلاً بینی ڈکٹ نہم بارہ سال کی عمر میں
پوپ منتخب ہوا، اس کی اخلاقی حالت نہایت شرمناک تھی اور آخر کار سالانہ وظیفے کی شرط پر وہ
اس منصب مقدس سے علیحدہ ہو گیا۔ شہنشاہ ہنری ثالث کو تین دعویداروں کے حقوق کے
تصفیئے کے لئے مداخلت کرنی پڑی۔ اس نے حکمت عملی سے ان تینوں دعویداروں کو بالائے
طاق کر دیا اور ایک جرمن کلیمنٹ ثانی کو پوپ منتخب کرا دیا جس سے کچھ اصلاح ہوئی۔
اس کے بعد دوسرے جرمن پوپ بھی ہوئے اور یہ عہدہ شرمناک بدنامیوں سے بچا رہا۔ مگر
جب تک خدمت پاپائی کے انتخاب کا مسئلہ غیر تصفیہ شدہ تھا کلیسہ کے اندرونی انتظامات
کی اصلاح کی کوئی امید نہ تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں کلیسۂ کاتھولیک بہ حیثیت
مجموعی ترقی کن حالت میں تھا، اس کا نظام قوت پکڑتا جا رہا تھا اور یورپ میں اس کی
وقعت بڑھتی جاتی تھی۔ روما میں مختلف جماعتوں کی باہمی حسد ومنافرت سے سخت ابتری
تھی۔ روما کی حالات دیکھکر حقیقی اصلاح کی بہت کم امید ہو سکتی تھی مگر اس موقع پر بھی جیسے
کہ دیگر مواقع پر ہوا تھا رہبانیت نے کلیسۂ مسیحی کی آبرو رکھلی۔

راہبان مسیحی کی جماعت میں ایک جدید تحریک اسی زمانے میں پیدا ہوئی تھی۔
جس کا مرکز مقام کلونی واقع برگنڈی تھا سینٹ بی نی ڈکٹ نے جن مقاصد سے رہبانیت
کو رواج دیا تھا وہ پس پشت پڑتے جاتے تھے اور راہبوں کو زہد وتقوے کی زندگی گراں
گزرنے لگی تھی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ خانقاہ نشین راہبوں کی حالت اس زمانے میں
افسوسناک ہو گئی تھی رہبانیت کی تاریخ میں ایسے دور اکثر گزرے ہیں۔ یعنی انحطاط
کے آثار کے بعد اس کے اصلی مقاصد کا احیاء اکثر ہوا ہے۔ کلونی سے جو تحریک شروع ہوئی
اس کا مقصود بھی رہبانیت کے اصول ومقاصد کا احیاء تھا اور سینٹ بینی ڈکٹ کے قائم کردہ
اصول سے سرمو اختلاف نہیں کیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس تحریک کی وجہ سے رہبانیت
میں ایک جدید روح اور سرگرمی پیدا ہو گئی اور اس کا اندرونی انتظام بھی کچھ متغیر ہو گیا
تھا اس سے قبل خانقاہوں کو اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی اور دوسری خانقاہوں سے کوئی
تعلق نہ تھا۔ مگر برخلاف اس کے جن خانقاہوں کا تعلق کلونی سے تھا ان کے تعلقات

ایک دوسرے سے مستحکم تھے۔ ہر خانقاہ کا صدر ایک پر اثر تھا جس کا تقرر کلونی کا ایبٹ (سجادہ نشین) کرتا۔ اس طرح یہ امید تھی کہ ایک خانقاہ کی غفلت کا دفعیہ دوسری خانقاہوں کی سرگرمی سے ہو جائے گا۔ تحریک مذکور میں شاہی حکومت کے آثار موجود تھے جن کا اثر بہت جلد نظام کلیسیہ میں بھی نمودار ہونے لگا۔ اس تحریک کی شہرت اور اثر کا اصل بانی ایک راہب مسمی ہلڈیبرانڈ ہے جو کچھ روز کے بعد بنام گریگوری ہفتم مسند پاپائی پر متمکن ہوا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی مذہبی تاریخ میں اُس سے زیادہ سربرآوردہ کوئی شخص نہیں ہے۔ روما میں اولاً وہ پوپ لیونہم کے معتمد کی حیثیت سے وارد ہوا اور اس زمانہ سے ۱۰۸۵ء تک مذہبی معاملات میں اس کا اثر غالب تھا۔ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ کلیسیہ کی آزادی کو تسلیم کرا دے۔ مقصد مذکور کے حصول میں دو موانع تھے اولاً یعنی دنیاوی حکومت کو پادریوں کے تقرر اور ان کی افعال کی نگرانی کا اختیار تھا ثانیاً پادریوں کی اخلاقی حالت قابل اعتراض تھی، ان میں سے اکثر تجرد کے پابند نہ تھے اور علانیہ اس کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ ہلڈیبرانڈ اور دیگر اہل کلونی مصر تھے کہ پادریوں پر تجرد نہ صرف اخلاقاً فرض ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ مجرد رہنے سے وہ دنیا و اہل دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہ سکتے ہیں تاکہ دنیاوی قوتیں ان کے مذہبی مشاغل میں مخل نہ ہو سکیں۔ مسند پاپائی پر متمکن ہونے سے قبل ہی وہ ایک اہم اصلاح کو عمل میں لانے میں کامیابی حاصل کر چکا تھا ۱۰۵۹ء میں پاپائیت کے انتخاب کے طریقہ کا تعین ہو گیا۔ امراء اور عوام روما کا انتخاب میں کوئی دخل باقی نہ رہا اور شہنشاہ کو انتخاب کی توثیق کا جو حق تھا اس کو بھی صراحۃً تسلیم نہ کیا گیا بلکہ انتخاب کی پوری ذمہ داری کارڈنل[۱] پادریوں پر چھوڑ دی گئی۔ اس طور پر کلیسیہ کے مرکز یعنے روما میں اس کی آزادی مسلم ہو گئی اور گو زمانۂ مابعد میں بھی انتخابات میں جھگڑے پیدا ہوئے اور بعض پوپوں کے اندرونی حالات نہایت شرمناک تھے مگر ہلڈیبرانڈ نے جو نظام قائم کیا تھا وہ عملاً مفید ثابت ہوا اور کبھی اس سے انحراف نہیں کیا گیا۔ واضح رہے کہ جس کونسل میں نظام مذکورۂ بالا طے ہوا تھا اسی کونسل میں یہ بھی طے کیا گیا کہ یوکرسٹ کی عید میں جو روٹی اور شراب استعمال میں آتی ہیں وہ علی الترتیب حضرت عیسیٰ کے گوشت اور خون میں متبدل ہو جاتے ہیں۔ ہلڈیبرانڈ

[۱] کلیسیۂ رومن کیاتھولک کے ستر اعلیٰ پادری جو پوپ کی کونسل کے رکن بھی ہوتے ہیں۔

کے اطالیہ میں بہت سے سرگرم معاون تھے مگر اس کے مخالف بھی تھے مثلاً مائیلن کا بشپ مسمی آرہبرٹ اس شہر کے کلیسیہ اور پادریوں کی آزادی کا دعویدار تھا جو ہلڈی برانڈ کی خواہش کے بالکل خلاف تھا۔ ۱۰۷۳ء میں وہ پوپ منتخب ہوا۔ اور چونکہ عوام اور پادریوں ہر دو میں ہردلعزیز تھا اس لئے قبل اس کے کہ اس کا انتخاب حسب ضابطہ مذکورۂ بالا ہو عوام نے خوشی کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ میں یہ شخص نہایت سر برآوردہ اور پاپائیت کا بہترین نمونہ ہے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے ہلڈی برانڈ نہ بلند قامت نہ وجیہ تھا مگر اس کی قوت ارادی نہایت مضبوط اور کلیسیہ کے دعاوی کے برحق ہونے کا اسے یقین کامل تھا کلیسیہ کو وہ دنیا کی اعلیٰ ترین قوت خیال کرتا جسے اقتدار ذات باری تعالیٰ سے براہ راست عطا ہوا تھا اور جس کے بادشاہ اور شہزادے دست نگر تھے۔ گیریگوری ہفتم یعنی ہلڈی برانڈ کی مدت العمر یہی کوشش رہی کہ پاپائیت کے اقتدارات کو عملاً تسلیم کرائے جیسا کہ اصولاً اس کو یقین تھا۔ اس کے خیالات و مقاصد کے متعلق قیاس کرنے کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ وہ بالکل واضح ہیں۔ اسی زمانے کی ایک تحریر سے ہم چند جملے نقل کرتے ہیں جو غالباً اس کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ "پاپائے روما کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں اسی کو بشپوں (اسقفوں) کے عزل و نصب کا اختیار ہے، اس کے افعال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں، کلیسیہ روما کو نہ کبھی دھوکا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے۔ انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی ہے خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی ہے۔ پوپ شہنشاہوں کا آقا ہے" ناممکن تھا کہ جس شخص کے خیالات ایسے ہوں جو وسیع اقتدارات رکھتا ہو اور اس کے معاونین کی بھی زبردست تعداد ہو وہ ان مقاصد کے حصول میں سرزمین یورپ کو زیر و زبر نہ کر دے۔

شہنشاہ ہنری چہارم چھ سال کی عمر میں ۱۰۵۶ء میں تخت نشین ہوا اور اس وجہ سے عنان حکومت کئی سال تک دوسروں کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے عہد حکومت کے ابتدائی زمانے میں امراء سے آئے دن کے جھگڑے رہتے جس سے اندیشہ تھا کہ شہنشاہی کا پوپ کی مخالفت کے بغیر ہی خاتمہ ہو جائے گا۔ اہل سیکسنی بغاوت پر آمادہ ہو گئے کیونکہ انکو ایک ایسے شہنشاہ کی اطاعت شاق تھی جو ان کی قوم سے نہ تھا۔ نزاعات مذکور کے دوران میں اسے کئی دفعہ شکست ہوئی جس سے وہ اپنے مخالفین کے مطالبات قبول کر لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر ۱۰۷۵ء کے اختتام تک وہ ان مشکلات پر غالب آگیا اور پوپ کے مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔

پوپ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم کے درمیان جو نزاع تھی اس کو گویا ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کا "نقطۂ انقلاب" خیال کرنا چاہیئے اس لیئے اس کی اہمیت ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ دونوں اشخاص میں کسی قسم کا ذاتی عناد نہ تھا۔ شہنشاہ راسخ الاعتقاد کیتھولک تھا اور پوپ کو شہنشاہ کا کماحقہ اعزاز کرنے میں کوئی عذر نہ تھا مگر غیر متعلق وجوہ کے سبب سے دونوں میں سخت ناچاقی پیدا ہو گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ شہنشاہوں اور پوپوں کے باہمی تعلقات کچھ ایسے نازک تھے کہ ان کی دقتوں کو سمجھنا دشوار تھا اور ان کے تصفیئے کی تاحال کوئی کوشش نہ ہوئی تھی۔ شہنشاہ ممالک متمدنہ کے دنیاوی سردار ہونے کا دعویدار تھا، اور

اس کے برخلاف پوپ کلیسیہ کا سردار ہونے کا دعوے رکھتا تھا۔ بظاہر دونوں میں مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی مگر عملاً دعاوی مذکورۂ بالا سے دقتیں پیدا ہوئی تھیں۔ شہنشاہ بعض اقتدارات کا دعویدار تھا جن کا پوپ کو بھی دعویٰ تھا اور جب دونوں کو اس اختلاف کا احساس ہوا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ اُن میں سے کون اقتدارات مذکورہ سے دست کش ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر دو کے اقتدارات کی بیّن تفریق نہیں ہوئی تھی یعنی کن امور کا شہنشاہ سے تعلق تھا اور کن کا پوپ سے اہل مذہب اور اہل سیاست کے جھگڑے دنیا کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں خواہ وہ کسی نام سے ہوں۔

اصل امر مابہ النزاع یہ تھا کہ جرمنی اور دیگر کیتھولک ممالک میں بشپوں کے تعلقات پوپ سے اور مختلف دنیاوی حکمرانوں سے کس قسم کے ہونا چاہئیں۔ گریگوری ہفتم کو اپنے عہدے کے فرائض کا خاص خیال تھا اور اسے ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ کلیسیہ کی طاقت بڑھائے مگر اس نے دیکھا کہ تمام یورپ اور خصوصاً جرمنی میں بشپ جو کلیسیہ کے اعلےٰ عہدہ دار تھے ان کا تقرر بادشاہوں کے اقتدار میں تھا یا شہنشاہ کا اقتداری تھا اور بشپ اپنے مذہبی فرائض کو انجام دینے کے بجائے بادشاہوں کے وزیر بنکے معمولی انتظامی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ بشپوں کے انتظامی امور میں مشغول رہنے کے اسباب کو ہم بیان کر چکے ہیں مگر گریگوری کو سخت ناگوار تھا کہ جن لوگوں (بشپون) کو کلیسیہ کی محافظت اور خدمت میں سرگرم رہنا چاہیئے تھا وہ کلیسیہ کے زبردست رقیب (شہنشاہ) کے تابع فرمان تھے۔ اس لئے ۱۰۷۵ء میں اس نے ایک فرمان پاپائی جاری کیا جس کا منشا یہ تھا کہ دنیاوی حکام خواہ شہنشاہوں یا بادشاہ وغیرہ وہ ہرگز مجاز نہیں ہیں کہ عہدہ داران کلیسیہ کا تقرر عمل میں لائیں اور عصا و انگشتری سے اس کو سرفراز کریں۔ گریگوری ہفتم نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر کوئی شہنشاہ، بادشاہ، ڈیوک وغیرہ مذہبی خدمات کے تقررات میں دخل دینے کی جرأت کرے گا تو وہ کافر و مرتد ہے۔ اس طور پر امر متنازع فیہ کا اظہار توضیح کے ساتھ ہو گیا کیونکہ اس اعلان سے گویا پوپ نے شہنشاہ کو ان حکام (بشپ) کے خدمات سے محروم کر دیا جس پر اس کی حکومت کا دار و مدار تھا آتش جنگ کے مشتعل ہو جانے کے لئے یہ وجہ کافی و وافی تھی۔

پوپ کی احتجاجی مراسلت کا جو جواب ہنری چہارم نے دیا اس کی عبارت یہ ہے

ظاہر تھا کہ وہ پوپ کو معزول کرانا چاہتا ہے۔ عبارت حسب ذیل تھی۔ "از شاہ ہنری جو غاصب نہیں ہے بلکہ بفضل الٰہی حکمراں ہے بنام ہلڈی برانڈ (گریگوری ہفتم) جو بظاہر پوپ ہے مگر دراصل ایک بد اعمال راہب ہے۔ ...... مسند مقدس جس کو تو نے غصب کر لیا اس پر سے اتر جا اور چھوڑ دے۔ مقدس پیٹر کی مسند پر کسی ایسے شخص کو بیٹھنے دے جو مذہب کی آڑ میں فساد برپا نہ کرے گا بلکہ پیٹر کے صحیح عقائد کی تعلیم و تلقین کرے گا۔ میں ہنری شہنشاہ بفضل الٰہی تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ مسند پاپائی سے دست کش ہو اور تمام زمانے میں مردود و ملعون ہو" پوپ کے جواب میں اسقدر درشتی نہیں ہے بلکہ ایک حد تک دردناک ہے" اے مقدس پیٹر، حواریوں کے سردار، اپنے مقدس کانوں سے میری آہ و زاری سن، تو نے مجھے بچپن سے پرورش کیا ہے اور آج کے دن تک تو نے مجھ کو بدکردار لوگوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھا ہے جو مجھ سے اس لئے نفرت رکھتے ہیں کہ میں تیرا سچا خادم ہوں" خط کے آخر میں معزولی کا حکم ہے" میں تمام مسیحیوں کو ہنری چہارم کی فرماں برداری سے بری کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ کوئی شخص اس کو پادشاہ تسلیم نہ کرے چوں کہ اس نے عیسائی ہو کر فرمانبرداری سے منھ موڑا ہے اور خدا سے منحرف ہو گیا ہے لہذا میں اس کو ملعون قرار دیتا ہوں"۔

پوپ کے لئے یہ حکم صادر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ شہنشاہ اور اس کی قوت کے مقابلے میں پوپ کی کوئی ہستی نہ تھی۔ ابتدا میں گو دونوں کی حالت غیر مساوی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ بات نہ تھی۔ اولاً تو واضح رہے کہ یہ راسخ الاعتقادی کا زمانہ تھا۔ اہل زمانہ کلیسیہ کے سردار کے اقتدار کو بلا چون و چرا تسلیم کرتے اور کافر و مرتد قرار دئے جاتے یا کلیسیہ سے علیحدہ کئے جانے کے خیال سے کانپ اٹھتے تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ شہنشاہ جرمن تھا اس لئے تمام اہل اطالیہ پوپ کے ہمنوا ہو گئے۔ قوم نارمن بھی پوپ کی امداد پر کھڑی ہو گئی اور میٹیلڈا رئیسہ ٹسکنی تو اس کے خاص معتقدین میں سے تھی۔ شمالی اٹلی کے بڑے بڑے شہروں کے باشندوں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ جرمنوں کی حکومت سے اگر انھیں کوئی بچا سکتا ہے تو وہ پوپ ہی ہے۔ مزید برآں شہنشاہ تمام اہل جرمنی کی امداد کی امید نہ رکھ سکتا تھا کیونکہ امرا پھر برسر پرخاش ہو گئے تھے اور خود اس کے اہل خاندان بلکہ اس کے بیٹے بھی آتش فساد مشتعل کرنے پر مستعد تھے۔ شہنشاہ نے جب دیکھا کہ جرمنی کے

جو لوگ اس کے مخالف تھے وہ پوپ سے ساز وباز کر رہے ہیں تو اس کو مجبوراً ۱۰۷۶ء میں ہتھیار خم کر دینا پڑا۔ ہنری اپنے امراء سے بمقام ٹربی بور شہنشاہی کونسل میں بحث و مباحثہ میں مشغول تھا جس میں انھوں نے اپنی مخالفت کا علانیہ اظہار کیا اور یہ بھی تصفیہ کیا کہ بمقام آگسبرگ چند روز کے بعد ایک دوسری کونسل منعقد ہوگی جس میں پوپ بہ نفس نفیس آکر ہنری کو معزول کر دے۔ شہنشاہ کے مخالفین کی تعداد اب بہت زیادہ ہوگئی تھی اس کو اندیشہ ہو گیا کہ خاندان میرو وَنجی کے آخری تاجدار کی طرح وہ بھی معزول نہ کر دیا جائے گا اور پوپ کی امداد سے اسی کے امراء میں سے کوئی اس کا جانشین منتخب کر لیا جائے گا۔ اس لئے ہنری نے یہی مناسب خیال کیا کہ بہ عجز و الحاح پوپ سے معافی کا خواستگار ہو جو اس وقت میٹلڈا رئیسہ ٹسکنی کے ساتھ قلعۂ کیانوسا واقع کوہ ایپی نائن میں مقیم تھا۔ جاڑے کا زمانہ تھا مگر ہنری وہاں گیا اور کیانوسا کے قریب پہونچکر پوپ سے شرف باریابی اور معافی کا خواستگار ہوا۔ مگر شہنشاہ کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے گریگوری نے للکار دیا۔ اس کا بیان ہے کہ تین روز تک برابر شہنشاہ برہنہ پا قلعے کے بند دروازوں پر حاضر ہوتا اور وہاں سے جھڑک کر نکال دیا جاتا آخر کار ملکہ میٹلڈا کی سفارش پر پوپ نے اس کو شرف باریابی بخشا۔ شہنشاہ نے اپنے آپ کو پوپ کے قدموں پر ڈال دیا اور پوپ نے اس کو اٹھا کر معاف کر دیا۔ اس طور پر کلیسیہ اور شہنشاہ کے حکام اعلیٰ میں مصالحت ہو گئی۔ پوپ گریگوری ہفتم کا خود بیان ہے کہ اس کے اظہار پشیمانی اور منت وزاری سے متاثر ہو کر ہم نے کلیسیہ میں داخل کر لیا اور اپنی بددعا واپس لے لی۔

یہ مشہور واقعہ یعنے شہنشاہ کا پوپ سے معافی کا خواستگار ہونا اب تک اہل دنیا کے دلوں پر نقش ہے۔ پوپ کا اقتدار اس وقت نصف النہار پر تھا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور مثال کسی شہنشاہ کی پوپ کے قدموں پر اپنا سر رکھنے کی نہیں ہے۔ مگر اس کے نتائج کچھ اور ہی ہوئے۔ ہنری چہارم نے اس برمحل چال سے بہت فائدہ اٹھایا کیونکہ اس کی اطاعت قبول کر لینے سے گریگوری نہ تو آگسبرگ کی مجلس میں شریک ہوا اور نہ اُسے ہنری کو معزول کرنے میں امرائے جرمنی کی معاونت کا موقع ملا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اطاعت قبول کر لینے سے اسے دم لینے اور آئندہ جنگ

کے لئے تیار ہونے کا موقع مل گیا جو بہت جلد زور و شور کے ساتھ شروع ہو گئی۔ گریگوری نے پھر شہنشاہ کی معزولی کا حکم دیا بلکہ دوسرا شہنشاہ بھی مقرر کر دیا۔ ہنری چہارم نے بھی اعلان کر دیا کہ گریگوری پوپ نہیں ہے اور ایک بشپ کو پوپ کا خطاب دے دیا۔ جرمنی کے تنازعوں کا فیصلہ کر کے ہنری چہارم نے روما کا رخ کیا اور سنہ ۱۰۸۱ء میں پوپ کو اس شہر میں محصور کر لیا قریب تھا کہ اس قلعہ کی فتح حاصل ہو مگر ملیریا بخار نے اس کو رجعت پر مجبور کیا۔ چند سال کے بعد یعنی سنہ ۱۰۸۴ء میں اس نے روما پر پھر حملہ کیا اور تمام شہر پر قبضہ کر کے قلعہ سینٹ اینجیلو کا محاصرہ کر لیا جس میں پوپ گریگوری ہفتم مقیم تھا۔ قریب تھا کہ پوپ اپنے قدیم دشمن کا اسیر ہو جائے مگر کمک پہونچ گئی اور وہ بچ گیا۔ اس نے نارمنوں کو اپنی امداد کے لئے طلب کیا تھا۔ ان کے سرگروہ رابرٹ گوس کارڈ کے پاس جب یہ حکم پہونچا تو وہ مقام ڈورازو کے محاصرے میں مصروف تھا جو بحیرۂ ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ گوس کارڈ نے فوراً اطالیہ کی راہ لی۔ اس کا باعث نہ صرف مذہبی جوش یا وہ عقیدتمندی تھی جو اس کو پوپ کی ذات سے تھی بلکہ وہ شہنشاہ کو اپنا رقیب خیال کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ وسطی اطالیہ میں ظفریاب ہو اس نے فوراً روما پر دھاوا کر دیا۔ شہنشاہی افواج نارمنوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں اس لئے ہنری چہارم نے کوچ کر دیا اور گریگوری ہفتم کی گلو خلاصی ہو گئی۔ نارمنوں نے پوپ کو اس کے دشمن سے بچا لیا مگر انھوں نے مقدس روما کو خوب لوٹا۔ آلارک اور جینسیرک کے ایسے وحشیوں نے بھی روما کو ایسا نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جتنا نقصان کہ پوپ کے ان معتقدین و حلفاء کے ہاتھوں اس شہر کو اٹھانا پڑا۔ اہل روما کے لعن و طعن سے عاجز ہو کر وہ نارمنو کے ساتھ چلا گیا اور چند روز بعد سیلرنو میں انتقال کر گیا۔ "راست بازی سے مجھے عشق تھا اور بدکرداری سے نفرت۔ اسی لئے میں بحالت غریب الوطنی مر رہا ہوں"۔ یہ اس کے آخری الفاظ تھے مگر اس کی موت کے ساتھ اس جھگڑے کا خاتمہ نہیں ہوا کیونکہ یہ نزاع ہنری چہارم اور گریگوری ہفتم کے درمیان نہ تھی بلکہ من حیث العہدہ شہنشاہ اور پوپ کے درمیان تھی مصالحت کے لئے کوششیں اکثر ہوئیں مگر نزاعات مذکورہ کا سلسلہ دو سو سال کے بعد جا کر اس وقت ختم ہوا جب کہ فریقین میں سے ایک کا خاتمہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ سنہ ۱۰۹۵ء میں پہلی جنگ صلیبی کا اعلان ہوا اور عیسائیوں کو اوائل میں جو کامیابیاں ہوئیں اور ان کے سبب سے جو جوش پیدا ہوا اس سے پوپ کا اعزاز اور اقتدار اور بھی بڑھ گیا۔

ہنری چہارم نے ۱۱۰۶ء میں انتقال کیا اور ہنری پنجم اس کا جانشین ہوا مگر شہنشاہ اور پوپ میں حسب سابق کشیدگی باقی رہی۔ مگر زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ دونوں فریقوں میں مصالحت کا خیال پیدا ہو گیا۔ اور امید ہو چلی کہ پوپ پاسکل سے جو نامہ و پیام جاری تھا وہ ضرور مصالحت کا باعث ہوگا۔ بیان کیا گیا ہے کہ پادری اپنی جائدادوں سے دست کش ہونے کو راضی تھے اور شہنشاہ بھی حق تقرر سے دست بردار ہونے پر رضامند تھا ہنری پنجم نے یہ خیال کر کے کہ یہ شرائط تسلیم کر لئے گئے ہیں روما کا رخ کیا اور وہیں تاج شہنشاہی اس کے سر پر رکھا گیا۔ مگر یہ صلح چند روزہ ثابت ہوئی۔ شرائط مذکورہ کو پوپ کی بزدلی پر محمول کیا گیا اور ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ غالباً اصل واقعہ یہ تھا کہ شرائط مذکورہ پر عمل پیرا ہونا منظور نہ تھا۔ تاجپوشی کی رسم خونریزی اور بلوؤں کے سبب سے رک گئی۔ ہنری پنجم روما سے فرار ہو گیا اور پھر جنگ شروع ہو گئی اس موقع پر سالہائے مابعد کے واقعات کا تذکرہ چھیڑنا ہم مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ وہ جنگ سابقہ کے واقعات سے ملتے جلتے ہیں۔ پوپ نے شہنشاہ کے کافر و مرتد ہونے کا حسب سابق فتوے دے دیا، شہنشاہ نے اس کا دنداں شکن جواب دیا۔ پوپ نے دوسرا شہنشاہ مقرر کر دیا اور شہنشاہ نے ایک نیا پوپ لا کے کھڑا کر دیا صلح کی گفت و شنید بھی جاری تھی مگر دونوں فریق اصل امر ما بہ النزاع کو زیر بحث لانے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن اس طویل جنگ اور اس کے لازمی نتائج سے دونوں حریف اُکتا گئے تھے۔ آخرکار ۱۱۲۲ء میں پوپ کیلکسٹس ثانی نے ایک انتظامی خاکہ پیش کیا جس کو فریقین نے منظور کر لیا اور یہ طویل نزاع کم از کم کچھ روز کے لئے ختم ہو گئی۔ اس انتظام کو "مصالحت ورمز" کہتے ہیں۔ دراصل فریقین میں جو امور متنازع فیہ تھے ان کے دائرے کو محدود کر دینے سے مصالحت ممکن ہو گئی اور یہ طے پایا کہ بشپوں کا انتخاب حکام کلیسیہ سے متعلق رہنا چاہئے اور ان کو انگشتری اور عصا عطا کرنے کا مجاز صرف پوپ ہوگا مگر شہنشاہ کا ایک نائب موقع انتخاب پر موجود رہے۔ اور اگر انتخاب میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کے تصفیہ کا مجاز شہنشاہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کے ممالک مقبوضہ میں اراضی پر قابض ہونے کی وجہ سے بشپوں کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ وہ اس کی سیادت کا اقرار کریں اور اراضی مذکور کا وثیقہ بھی اس سے حاصل کریں۔ "مصالحت ورمز" سے اس طول طویل قضیے کا کچھ زمانے کے لئے

خاتمہ ہو گیا جس سے فریقین کو سخت نقصان ہو رہا تھا مگر اصل امور متنازع فیہ کا ابھی تک تصفیہ نہیں ہوا تھا بلکہ ان کا ذکر تک نہ آیا تھا۔ شہنشاہان سلطنت مقدس روما جیسا کہ ان کے خطاب سے ظاہر ہے تمام یورپ پر حکمرانی یا بہ الفاظ دیگر روما کے قیصروں کی جانشینی کے دعویدار تھے اور ان کا منشا تھا کہ تمدن کے ہر شعبے پر ان کی نگرانی رہے۔ پاپایان روما کو بھی ان کے بالمقابل عالم گیر حکومت کی خواہش تھی اس لئے وہ اصولاً یا عملاً کسی حیثیت سے بھی کسی ایسی با اقتدار ہستی کے روادار نہیں ہو سکتے تھے جو ان کے اختیارات و قوت کو محدود کرنا چاہے۔ جب فریقین کے یہ دعاوی تھے تو صلح کا مدت تک قائم رہنا ناممکنات سے تھا۔

باب دہم

نفس شہنشاہی و پاپائی کا مقابلہ

دور ثانی

نفاذ مصالحت ورمز کے چند روز بعد پوپ نے ایک تحریر میں شہنشاہ ہنری پنجم کو لکھا کہ "آپ کی سلطنت میں بشپ اور ایبٹ (خانقاہوں کے سجادہ نشین) دنیاوی معاملات میں اس قدر مستغرق رہتے ہیں کہ ان کا زیادہ تر وقت عدالتوں یا مشاغل سپہگری میں صرف ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حکام کلیسہ وزرائے دربار ہو کر رہ گئے ہیں" فریڈرک اول نے جس کے عہد حکومت کا ذکر ہم اب کریں گے اس کا یہ جواب دیا کہ جن بشپوں کا تقرر فرامین شہنشاہی سے ہوا ہے وہ بلحاظ علم و فضل، زہد و تورع پوپ کے نامزد کردہ بشپوں سے افضل ہیں۔ پادریوں کا تقرر امور متنازع فیہ میں سے تھا۔ پوپوں کا اصل منشا یہ تھا کہ شہنشاہوں کو بشپوں کے خدمات سے محروم کر دیں جن پر ان کی حکومت کا دار و مدار تھا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ شہنشاہوں کو رومی قیصروں کے جانشین ہونے کے لحاظ سے تمام یورپ کے حاکم اعلیٰ ہونے کا دعویٰ تھا اور اسی طرح پوپ کو سینٹ پیٹر کے جانشین ہونے کی حیثیت سے سیادت کا دعویٰ تھا۔ تقریروں اور کتابوں میں دعاوی مذکور کو ہر دو فریق نہایت کر و فر سے پیش کرتے ہیں مگر عملاً یہ نزاع توازن قوت اور سیاسی اغراض پر مبنی تھی۔ پوپ کے مدت تک متعدد معاونین ایسے تھے جن کی فوجی قوت معقول تھی اور جن کے اغراض شہنشاہ کے مخالف ہونے کے لحاظ سے واحد تھے۔ چودھویں

صدی تک یہی حالت رہی یہاں تک کہ پوپ بالکل بے یار و مددگار ہوگئے اور ان کے
مصائب کا زمانہ ہوا شروع ہوگیا۔ تجدید سلسلۂ جنگ کے وقت دونوں فریقوں کی کیا حالت
تھی اسی پر ہم اب ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

۱۱۲۵ء میں لوتھیر رئیس سیکسنی ہنری چہارم کے بجائے شہنشاہ جرمنی ہوگیا اور
۱۱۳۸ء میں کانراڈ ثالث رئیس ہاہنسٹافن اس کا جانشین منتخب ہوا۔ کانراڈ کا دور دورہ
زیادہ تر جرمنی کے صوبجات فرانکونیا و سوئیبیا میں تھا اور اس کے خاندان کا تعلق ہاہنسٹافن
کے قلعے سے تھا جو سوئیبیا کے جنوب مغرب میں واقع تھا۔ تاج شہنشاہی چند مختصر وقفوں کے علاوہ
مدت تک اسی خاندان کے قبضہ میں رہا اور یہی شہنشاہی عظمت و قوت کا زمانہ تھا۔ ۱۱۵۲ء
میں کانراڈ کا بھتیجا فریڈرک اس کا جانشین ہوا جو زمانۂ مابعد میں فریڈرک باربروسا (سرخ
ریش) کے نام سے مشہور ہوا۔ از منۂ وسطیٰ کے شہنشاہوں میں شان و شوکت کے لحاظ سے
اس کا کوئی مدمقابل نہیں گزرا، یہ اور بات ہے کہ دوسرے شہنشاہ اس سے زیادہ کامیاب
یا قوی گزرے ہوں۔ اس کے عہد حکومت کے بعد جب ملک جرمنی طرح طرح کے آفات میں گھر
گیا تو اہل جرمنی اس کے زمانے کے فوجی فتوحات، تجارت کے فروغ، اور علوم و فنون کی
ترقی کو مدت تک یاد کرتے رہے لیکن جرمنی کے شہر بھی رفتہ رفتہ ترقی کرکے اسی درجہ پر
پہونچ رہے تھے جو اطالیہ کے شہروں کا تھا۔ جرمنی کے شہروں میں کولون، منیز اور آگسبرگ
ممتاز شہر تھے۔ ان شہروں کے باشندوں کو اپنے حقوق بلدی کا خاص خیال رہتا تھا
اور فنون لطیفہ میں بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اور ان اوصاف میں وہ اطالیہ کے شہروں
سے کسی بات میں کم نہ تھے۔ مذکورہ بالا تینوں شہروں کے علاوہ جنوبی اور مغربی جرمنی
میں اور بھی متعدد شہر تھے جن کو حقوق بلدی حاصل تھے جس طرح کہ فرانس کے شہروں کے
باشندے بادشاہ کو اپنا مربی و محافظ خیال کرتے تھے اسی طرح جرمنی کے شہروں کے
باشندے بھی شہنشاہ کو اپنا مددگار و معاون سمجھتے تھے، اور اس کے برعکس امراء کو اپنا دشمن و
رقیب شہنشاہ کی حکومت کا دارومدار بھی انھیں شہروں کی امداد پر تھا۔ اس لئے شہروں
کی روز افزوں قوت امراء کے اثر کو زائل کر رہی تھی۔ امراء کی قوت کے انحطاط کی یہ ایک
وجہ اور بھی تھی کہ قوانین رومی کے مطالعے کا رواج پھر ہو چلا تھا گو اس کے نتائج سرزمین جرمنی
میں اس زمانے میں ظاہر نہیں ہوئے۔ قوانین رومی کی اہمیت کے ضمن میں ہم بیان

کر چکے ہیں کہ جب اہل زمانہ اس قانون کی جانب متوجہ ہوئے تو انھیں ایسا معلوم ہوا گویا یہ کوایک دوسرا صحیفۂ آسمانی ہے۔ قوانین مذکور میں امرا کے اقتدار کا لحاظ بالکل نہیں رکھا گیا تھا کیونکہ ان کی تدوین ایسے زمانے میں عمل میں آئی تھی جب کہ شہنشاہان روما کے اقتدار پر کسی قسم کے قیود نہ تھے۔ قوانین روما کا لب لباب یہ تھا "کہ حاکم وقت کا فرمان قانون کا حکم رکھتا ہے" اور جن جن ممالک میں قوانین مذکور کی تعلیم جاری تھی وہاں بادشاہ یا حاکم اعلیٰ کے سوا امرا یا دیگر حکام کا اقتدار گھٹتا جاتا تھا۔ امرا کے اقتدار کا قوانین روما میں کہیں بھی ذکر نہ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں مجموعۂ قوانین مکمل ہو رہا تھا اسوقت امرا کے اقتدار کا وجود ہی نہ تھا۔

امور مذکورۂ بالا سے ظاہر ہے کہ زمانۂ زیر تذکرہ میں شہنشاہوں کی قوت کے زور پکڑنے کے متعدد اسباب موجود تھے مگر امرا کے بڑے بڑے خانوادوں کا اقتدار ان کے استحکام قوت میں سدراہ تھا۔ شارلیمین کے زمانے ہی سے شہنشاہوں نے اس زبردست رکاوٹ کو محسوس کیا تھا اور اٹو اعظم کی تخت نشینی کے زمانے سے امرا کی حالت اور بھی مخدوش ہو گئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ امرائے کبار (ڈیوکس) کی قوت ٹوٹ گئی تھی اور ان کے علاقے تقسیم ہو چکے تھے مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کئی بڑے بڑے علاقے ایک ہی شخص کے قبضے میں آجاتے تھے اور فریڈرک باربروسا کے زمانے میں تو امرا کی قوت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ شارلیمین اور اٹو اعظم کے عہد میں اس کا عشر عشیر تک نہ تھا۔ امرائے کبار کا سرغنہ ہینری "اسد" تھا جو خاندان گویلف کا سردار اور شہنشاہ فریڈرک کا عزیز بھی تھا علاقہ جات باویریا وسیکسنی کچھ تو اس کو وراثت اور کچھ بیوی کے جہیز میں ملے تھے۔ مقبوضات مذکور میں اس نے اور بھی اضافہ کیا اور جرمنی کے مشرق میں جو ممالک تھے ان کو فتح کر کے وہاں تہذیب و تمدن جرمنی کو رواج دیا۔ بلحاظ رقبہ و سرسبزی اسکے مقبوضات شہنشاہ فریڈرک کے ذاتی مقبوضات یعنے فرانکونیا و سوبیا سے کسی صورت میں کم نہ تھے۔ اس لئے فریڈرک کو اس کی رقابت کا ضرور اندیشہ ہوگا۔ مگر ابتداءً دونوں میں دوستی تھی اور شہنشاہ کے ابتدائی فتوحات زیادہ تر ہینری کے زور بازو کے نتائج تھے مگر آئندہ چل کر جب بجائے دوستی کے دونوں میں رقابت پیدا ہو گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جرمنی کی حالت ابتر ہو گئی بلکہ اطالیہ میں بھی شہنشاہ کو ذلت وخواری

نصیب ہوئی۔ مگر فریڈرک کے عہد حکومت کے اوائل میں شہنشاہت کی حالت بہت بہتر تھی شہنشاہ خود بھی قابل اور اولوالعزم تھا اور اس کی آرزو تھی کہ صفحات تاریخ پر اپنا کوئی زبردست کارنامہ چھوڑ جائے۔

اطالیہ کی حالت اس زمانے میں یہ تھی کہ وہاں کوئی گریگوری ہفتم کا سا زبردست پوپ نہ تھا اس لئے اس کے جانشینوں کے نام تک گنانے کی ضرورت نہیں لیکن اگر اس زمانے میں کوئی زبردست پوپ نہ تھا تو اس کا نعم البدل ایک ایسے پادری کے وجود سے ہوگیا جس کا ازمنۂ وسطیٰ میں کوئی ثانی نہیں۔ یہ شخص سینٹ برناڈ (سنہ ۱۰۹۱ء۔ سنہ ۱۱۵۳ء) تھا جو کلیسیہ کے معاملات میں اس وقت اسی قدر حاوی تھا جتنا کہ گریگوری ہفتم اپنے زمانے میں۔ سینٹ برناڈ کو زیادہ تر اپنی قابلیت اور خصائل حمیدہ کی وجہ سے کامیابی ہوئی اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ اس کا راہبوں کی ایک باوقعت جماعت سے تعلق تھا۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ راہبوں کی مختلف جماعتوں اور پاپائیت کے درمیان نہایت گہرے تعلقات تھے اور دونوں ایک دوسرے کی ترقی و انحطاط سے متاثر ہوتے تھے۔ پاپائیت کی عظمت اور اُس کی قوت کا استحکام سینٹ بینی ڈکٹ اور راہبان کلونی سے وابستہ ہے اسی طرح راہبوں کی جماعت میں ایک جدید تحریک پیدا ہو رہی تھی جس سے تمام مغربی یورپ میں ایک عام مذہبی جوش پیدا ہوگیا تھا۔ راہبوں کی یہ جماعت سسٹرشین کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے سرگروہوں میں سے ایک انگریز اسٹیفن ہارڈن تھا۔ جو اس گروہ کے بانی کا دوست تھا اور جس نے سنہ ۱۱۱۹ء میں پوپ سے اس جماعت کے قیام کا فرمان حاصل کیا۔ تحریک مذکور سے بھی رہبانیت کا احیاء مقصود تھا۔ ان کے عقائد بھی ویسے ہی تھے جو سنٹ بینی ڈکٹ کے تھے اور انھیں تلقین کی جاتی تھی۔ سسٹرشین فقراء کی جماعتوں کا قیام اکثر اوقات اس طور پر عمل میں آتا کہ چند لوگ پیروان سینٹ بنی ڈکٹ کی کسی خانقاہ سے الگ ہو کر شہروں کے عیش و عشرت سے بچنے کی غرض سے جنگلوں میں جا کر ریاضت و عبادت میں مشغول ہو جاتے مگر جماعت مذکور کے وجود میں آنے سے راہبوں کی زندگی میں کوئی نئی بات نہیں پیدا ہوئی البتہ اتنا فرق ہوگیا کہ بہ نسبت دیگر فقراء کے سسٹرشین فقراء کے تعلقات بشپوں سے خوشگوار ہوگئے اس کے علاوہ اہل کلونی کی طرح وہ ایک شخص کے تابع فرمان نہ تھے بلکہ ان کی خانقاہوں کے سجادہ نشین

جمع ہو کر اپنی جماعت کے معاملات کا خود تصفیہ کرتے تھے۔ ان کے خانقاہوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ حضرت مریم کے ساتھ انھیں خاص عقیدت تھی اور ان کی پرستش کو اولی خیال کرتے۔

فقرائے مذکور (سسٹرشین) کی جماعت کا اثر یوں تو ہر صورت میں پیدا ہوتا مگر قرن میں اسکو زیادہ تر شہرت سینٹ برناڈ کی ذات سے ہوئی جو اس جماعت میں آغاز شباب ہی سے شریک ہو کر خانقاہ کلیرو اکا سجادہ نشین ہو چکا تھا۔ سیاسیات یورپ میں تا امین حیات اس کا خاص اثر تھا۔ اسی نے اس مشہور ملحد ابیلارڈ (کی بیخ کنی کی تھی اور اس کے عقائد کو مسترد کر دیا تھا) جو پیرس کی یونیورسٹی میں تعلیم دے رہا تھا کہ "اعتقاد مذہبی ہر شخص کی ذاتی رائے ہے"۔ سینٹ برناڈ کا معاملات مذہبی میں اس قدر اثر تھا کہ اس نے اپنے مساعی جمیلہ سے کلیسیہ کے شیرازے کو منصب پاپائی کے دو امیدواروں کے مناقشات میں پراگندہ ہونے سے بچا لیا۔ اسی کے ایما سے یورپ کے سلاطین دوسری جنگ صلیبی کی شرکت پر آمادہ ہوئے جب کہ شہنشاہوں اور پوپوں کے فتنۂ باہمی نے پھر سے جنم لیا تھا گو وہ اس وقت بقید حیات نہ تھا۔ مگر کلیسیہ جو قوت حاصل کر چکا تھا وہ اسی کے اثر اور اسی کے مساعی جمیلہ کی رہین منت تھی۔

جنگ آئندہ میں مٹلڈا ارئیڈٹسکنی کے انتقال سے پوپ اپنے ایک زبردست معاون کی امداد سے محروم ہو گئے۔ کیونکہ اس کے انتقال کے بعد اس کے مقبوضات مختلف ورثا میں تقسیم ہو گئے جن سے پوپ کو خاطر خواہ امداد ملنے کی امید نہ ہو سکتی تھی۔

جنوب میں نارمنوں کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا۔ راجر شاہ سسلی ۱۱۵۴ء تک ان پر حکمراں رہا۔ اس کے عہد حکومت کے اواخر میں پوپ سے اس کے تعلقات خوشگوار نہ تھے مگر ۱۱۵۶ء میں اس کے جانشین ولیم اول نے پوپ پر فتح کامل کر کے صلح کر لی اور دوامی امداد کا اس سے وعدہ کیا۔ اس کے بعد ولیم ثانی سسلی کا بادشاہ ہوا (۱۱۸۹-۱۱۶۶ء) جس نے اس سلطنت کو انتہائی ترقی دی۔ سلطنت سسلی کی آبادی بالکل مخلوط تھی کیونکہ اس کے باشندوں میں مذہب قومیت اور زبان کا اختلاف تھا۔ جنوبی اطالیہ اور سسلی میں اطالیوں کے علاوہ نارمن یونانی اور مسلمان بھی تھے۔ نارمن حکومت کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اس کے زیر سایہ مختلف مذاہب کے لوگ امن و امان کے ساتھ رہتے تھے اور یہی مذہبی رواداری اس

سلطنت کی ترقی اور قوت پذیری کا باعث تھی اور اسی وجہ سے مختلف الاصل اور مختلف المذہب لوگ آپس میں صلح و آشتی کے ساتھ رہتے تھے، دوش بدوش اپنے دشمنوں سے لڑتے تھے اور اس اتفاق و یکجہتی سے سلطنت کی تقویت کے ضامن بنے ہوئے تھے شہر پیلرمو (دارالسلطنت سسلی) کی دلفریبی شاندار عمارات سے دوبالا ہوگئی تھی۔ سلاطین مذکور کے زیر سایہ جنوبی اطالیہ نے علوم اور فنون لطیفہ میں اسقدر ترقی کی کہ پھر کبھی نصیب نہ ہوئی پوپوں سے سلاطین مذکور بھی اکثر برسر پرخاش رہا کرتے اور کلیسیہ سے ان کو اس قدر عقیدتمندی نہ تھی جتنی کے زمانۂ سابق میں پائی جاتی تھی مگر بمقابلۂ پوپ وہ شہنشاہ سے زیادہ خائف تھے کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر شاہ جرمنی کے قدم اطالیہ میں جم گئے تو انکی ہستی معرض خطر میں آجائے گی اسلئے انھوں نے بلاپس وپیش پوپ کی حمایت کا بیڑا اٹھالیا۔

باب ماسبق میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ شمالی اطالیہ کے بلدیات روز بروز زور پکڑتے جاتے تھے۔ بارھویں صدی عیسوی میں بلدیات مذکور نے بلحاظ دولت و ثروت خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔ ان کی ترقی کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ شمالی اطالیہ کے شہر تجارتی راستے پر واقع تھے اور ان کی تجارت حد درجہ فروغ پر تھی۔ جنگ ہائے صلیبی کے باعث مشرق کی دولت شمالی اطالیہ کے شہروں میں کھنچ کر چلی آئی اور اس طور پر یورپ کے شہروں میں جینوا، پیسا، فلارینس، ملان اور وینس دولت اور شان و شوکت میں ممتاز ہوگئے اور اس دولت کے زعم میں ان کو اپنے اندرونی انتظامات میں خودمختاری کا دعویٰ ہوگیا اور بشپوں کی حکومت ان کو شاق گذرنے لگی شمالی اطالیہ میں امرا کی قوت کبھی زبردست نہ تھی اور اہل شہر نے اپنے آس پاس کے امرا کو اپنے قابو میں کر کے اکثر اوقات انھیں اپنے قلعوں کو خیرباد کہکر شہر کی فصیلوں کے اندر رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جنوبی اطالیہ میں بھی حکومت بلدی کا رواج ہو چلا تھا شہر نیپلز میں بھی چند روز تک حکومت بلدی نہایت شان سے قائم رہی اور اہل روما میں بھی شمال کے شہروں کی دیکھا دیکھی آزادی کی ہوس پیدا ہوگئی تھی مشہور عالم اور ملحد ابیلارڈ کے ایک شاگرد آرنالڈ ساکن بریشیا نے اپنی فصاحت و بلاغت سے اہل روما کے ذہن نشین کر دیا تھا کہ ان کو اپنے معاملات میں خودمختار ہونا چاہیئے نہ یہ کہ وہ امرا یا پوپ کے دست نگر رہیں

قریب تھا کہ اس کو ان کوششوں میں پوری کامیابی ہو۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ بلدیات مذکور امراء اور بشپوں کے اثر سے آزاد ہوگئی تھے اس کے بعد شہنشاہوں سے جد و جہد شروع ہوئی کیونکہ حکومت شہنشاہی کے بلدیات پر چند حقوق تھے یعنی سڑکوں اور پلوں اور افواج کی نگرانی اور چند حکام کے تقرر کا اقتدار اس لئے اپنے اغراض کے حصول کے لئے بلدیات پر لازم ہوگیا تھا کہ حکومت شہنشاہی کے دعاوی سے انکار کر دیں۔ اور اسی وجہ سے یہ لوگ ہر چند شاہان نارمن کی طرح ان کے تعلقات بھی پاپائی سے ہمیشہ خوشگوار نہ تھے۔ شہنشاہوں کے مقابلے میں پوپوں کو زیادہ پسند کرتے تھے اور ہر طرح سے ان کی معاونت پر آمادہ رہتے تھے۔

پاپائیت سے شہنشاہ فریڈرک کے تعلقات اس کے اوائل عہد حکومت ہی میں کشیدہ ہوگئے تھے۔ پوپ ہیڈرین چہارم نے ۱۱۵۷ء میں ایک خط فریڈرک کے پاس بھیجا جس کی عبارت سے صاف مترشح ہوتا تھا کہ شہنشاہ پوپ کا ماتحت ہے کیونکہ اس کے بقول شہنشاہی پوپ کا ایک عطیہ ہے۔ چونکہ اس عبارت سے واضح ہوتا تھا کہ شہنشاہ پوپ کا ماتحت ہے اس لئے اس نے فوراً اس دعوے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جواب دیا کہ شہنشاہی اس کو فضل خداوندی اور شاہان ماتحت کے انتخاب سے ملی ہے۔ اس نے اپنے دعوے کی تائید میں انجیل کی وہ آیت بھی پیش کی جس میں خدا ترسی اور احترام سلاطین کا حکم ہے۔ پوپ نے جواب دیا کہ اس کے الفاظ کو لغوی معنے میں نہیں لینا چاہئے۔ عطیے سے یہ مراد نہیں ہے کہ سلطنت پوپ کی بخشی ہوئی ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ اس کے نفع کی غرض سے لیکن اس تردید کے باوجود پوپ ہیڈرین اور بادشاہ میں مصالحت نہیں ہوئی یہاں تک کہ پوپ کا انتقال ہوگیا۔

شہنشاہوں کو اطالیہ میں ہمیشہ دقتوں کا سامنا ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ علاوہ جرمنی اور برگنڈی کے وہ اطالیہ کے بھی بادشاہ تھے اور ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ تاج شہنشاہی ان کو شہر روما میں پوپ کے ہاتھوں سے ملے۔ اہل اطالیہ میں جذبۂ قومی اس زمانے تک پیدا نہیں ہوا تھا اس لئے اطالیہ کے اکثر شہروں کے باشندے شہنشاہ جرمنی سے بلکہ اپنے ہم قوموں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ مگر بالعموم اہل اطالیہ شہنشاہوں سے متنفر تھے اور اہل روما خصوصاً اس کے خواہشمند تھے کہ شہنشاہ روما کا خطاب عطا کرنے میں انھیں

بھی کچھ نہ کچھ دخل ہونا چاہیئے اور اس کا کچھ صلہ بھی ملنا چاہیئے۔ جرمن اس دعوے کا یہ
جواب دیتے کہ شہنشاہی انھوں نے بزور شمشیر حاصل کی ہے۔ انھوں نے انھیں بخشی نہیں ہے
اطالیہ کے شہروں میں دولت فراواں تھی اس لئے شہنشاہوں کی یہ آرزو تھی کہ ان پہ
قابض ہو کر حکمرانی کریں اور محاصل وصول کریں۔ اسی وجہ سے اطالیہ کے شہروں کے باشندے
حکومت شہنشاہی کے مخالف ہو گئے تھے۔

فریڈرک اول اطالیہ پر چھ مرتبہ حملہ آور ہوا۔ ۱۱۵۴ء میں پہلی مرتبہ وہ تاجپوشی
کی غرض سے آیا مگر رسم تاجپوشی جنگ کے بغیر عمل میں نہ آئی اور وبا سے بھی اس کی فوج کا
نقصان ہوا۔ ۱۱۵۸ء میں وہ پھر اطالیہ میں اس غرض سے وارد ہوا کہ وہاں کے مغرور
شہریوں پر شہنشاہی کی قوت کا سکہ بٹھا کر انھیں ان کی سرکشی کا مزا چکھا دے۔ اس دفعہ
اسے پوری کامیابی ہوئی۔ اطالیہ کے متعدد شہروں کی اعانت سے اس نے شہر مائیلن
کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد اس نے بمقام رانکا گلیا (قریب بولونیا)
ایک ڈائٹ (شہنشاہی مجلس شوریٰ) منعقد کر کے اقتدارات شہنشاہی کا اعلان کیا
منجملہ دیگر امور کے اس نے اعلان کر دیا کہ شہنشاہ کے اقتدارات اطالیہ میں بھی وہی ہونگے
جو جرمنی میں تھے اور سابقہ شہنشاہوں کے جو مقبوضات اطالیہ میں تھے ان پر وہ قابض ہو جائیگا
عام شاہراہوں، ندیوں، بندرگاہوں اور منڈیوں میں محاصل وصول کرنے کا حق اسی کو
رہے گا۔ شہروں میں اس کے مقرر کردہ حکام رہیں گے جو حکام بلدی کے افعال کی نگرانی
کریں گے۔ اگر زمانۂ آئندہ میں اس کے حسب منشا عمل ہوتا تو اطالیہ کی آئندہ تاریخ کچھ اور
ہی ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس کی فلاح و بہبود میں افزایش ہو جاتی مگر ادبیات و فنون لطیفہ میں
جو ترقی ہوئی وہ نصیب نہ ہوتی کیونکہ علوم و فنون صرف آزادی کی ہواؤں سے سرسبز ہو سکتے
ہیں۔ یہ جدید حکومت لمبارڈی کے اکثر شہروں کو ناگوار تھی۔ شہر مائیلن نے شہنشاہ کی فوج کا
کا تین سال تک مسلسل مقابلہ کیا (۱۱۵۹ء-۱۱۶۲ء) مگر آخر کار رسد کے ختم ہو جانے سے اہل شہر
نے ہتھیار ڈال دیئے۔ فریڈرک نے حکم دے دیا کہ شہر مسمار کر دیا جائے، اس کے
قلعے توڑ دیئے جائیں اور اہل شہر کسی دوسرے مقام پر منتقل کر دیئے جائیں ان کامیابیوں
کی وجہ سے شہنشاہ کا تمام یورپ میں کوئی مدمقابل نظر نہ آتا تھا مگر وہ معراج ترقی پہ پہنچ
چکا تھا اس کے بعد اطالیہ میں اسے شاذ و نادر ہی کوئی کامیابی ہوئی اس کے آخری ایام

شہر روما نزاعات کا مرکز تھا۔ ۱۱۵۹ء میں الیگزنڈر سوم پوپ منتخب ہوا مگر بعض کارڈنل اس انتخاب سے مطمئن نہ تھے اس لئے انھوں نے اس کو نادرست قرار دیکر ایک دوسرا پوپ بنام وکٹر چہارم کھڑا کر دیا۔ الیگزنڈر سوم نے حکومت شہنشاہی کی مخالفت شروع کردی اس لئے فریڈرک نے وکٹر کو پوپ تسلیم کرلیا۔ اس زمانے تک پاپائی سے اس کے تعلقات قابل اطمینان تھے کیونکہ وہ بذات خود راسخ الاعتقاد کیتھولک تھا مگر الیگزنڈر سوم اس کا دشمن ہوکر شمالی اطالیہ کے شہروں سے مل گیا۔ الیگزنڈر کو اولاً اطالیہ میں رہنا دشوار ہوگیا تھا اس لئے وہ فرانس چلا گیا۔ مگر جب لمبارڈی کے بلدیات سے جنگ چھڑ گئی تو اسے بھی واپسی کا موقع مل گیا۔

شمالی اطالیہ کے شہروں کو جنگ ہائے ماسبق سے کافی سبق مل چکا تھا کہ فرداً فرداً بمقابلہ شہنشاہ ان کی کوئی ہستی نہیں اس لئے انھوں نے ایک زبردست اتحاد قائم کر لیا جسے "اتحاد لمبارڈی" کہتے ہیں۔ اور جس کے وجود میں آنے سے شہنشاہ کا اقتدار معرض خطر میں آگیا۔ اور اس کو دوبارہ اطالیہ کے معاملات میں مداخلت کرنا پڑی۔ چنانچہ ۱۱۶۶ء میں اس نے چوتھی مرتبہ اطالیہ پر فوج کشی کی جسب سابق اس کو ابتداءً کامیابی ہوئی۔ ارکان "اتحاد لمبارڈی" اس کی فوج ظفر موج کی پیش قدمی کو روکنے سے قاصر رہے، چنانچہ شہر روما پر بھی اس نے قبضہ کر لیا۔ مگر عین اس وقت جب کہ وہ اپنی کامیابی سے نفع حاصل کرنے کو تھا اس پر ایک سخت مصیبت نازل ہوئی جس کو اس کے ہمعصر قہر الٰہی سے تعبیر کرتے تھے۔ یعنی اس کی فتحمند فوجوں میں طاعون پھیل گیا اور ہزاروں سپاہی لقمۂ اجل ہوگئے۔ فریڈرک نے جب یہ دیکھا کہ اس کی فوج کا خاتمہ ہوگیا تو وہ مخفی طور پر اطالیہ سے واپس ہوگیا۔ اس معرکے میں اسے سخت ناکامی ہوئی اور اس کے واپس ہوتے ہی اس کے دشمنوں نے پھر سر اٹھایا ٹامس بکٹ (آرچ بشپ کینٹربری) نے اس واقعے کی متعلق رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اوائل آفرینش سے بانیان ظلم وستم کو کبھی ایسی سخت سزا نہیں ملی تھی اسی سے خدا کے انصاف اور اس کے قادر مطلق ہونے کا ثبوت ملتا ہے" ۱۱۶۷ء میں "اتحاد لمبارڈی" کو کئی دیگر بلدیات کے مل جانے سے مزید تقویت حاصل ہوئی یعنی وینس سے ہائیلن تک اور بریشیا سے بولونیا تک اطالیہ کے تمام شہر اس

اتحاد میں شریک ہوگئے اور پوپ الیگزینڈر ثالث کی یادگار میں میدان لمبارڈی میں ایک جدید شہر بنام "السانڈریا" بسایا گیا چنانچہ شہنشاہ کا اب اطالیہ پر دوبارہ حملہ آور ہونا بیحد ضروری ہوگیا۔

فریڈرک نے اطالیہ پر پانچویں دفعہ ۱۱۷۶ء میں حملہ کیا مگر اسے کامیابی کی بہت کم امید تھی کیونکہ اس کے اور ہنری "اسد" کے درمیان سخت رنجش پیدا ہوگئی تھی جو امرائے جرمنی کا سرگروہ اور اس کا خاص دوست تھا۔ ہنری نے محاربات اطالیہ میں شہنشاہ کی بیش بہا امداد کی تھی مگر اس ناچاقی کی وجہ سے اس نے اطالیہ کی طرف اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ فریڈرک کی بلدیات اطالیہ کی فوجوں سے بمقام لیگنانو (Legnano) مڈبھیڑ ہوئی اس فیصلہ کن جنگ میں جرمنی سواروں اور اطالیہ کے پیدل سپاہیوں کا مقابلہ تھا۔ لمبارڈی کے سپاہی ایک عظیم الشان گاڑی کے ارد گرد صف بستہ تھے جس پر مختلف شہروں کے جھنڈے آویزاں تھے سپاہیان مذکور میں سے اکثر نے عہد کر لیا تھا کہ اپنی آزادی کے برقرار رکھنے کے لئے جانیں دیدیں گے اور فنون جنگ میں بھی ان کو نہایت کاوش کیساتھ تعلیم دی گئی تھی۔ جنگ نے بہت طول کھینچا مگر آخر کار اہل اطالیہ کی بہادری اور فریڈرک کے بعض معاونین کی غداری نے اس کا فیصلہ کر دیا اور شہنشاہ کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ اطالیہ میں جو کچھ اس کی امیدیں تھیں سب خاک میں مل گئیں اور اس کو مجبوراً اپنے زبردست مخالف یعنی پوپ کو حکم قرار دینا پڑا۔ پوپ الیگزنڈر سے اس نے ۱۱۷۷ء میں کلیسئہ سینٹ مارک واقع وینس میں ملاقات کی بمقام کینوسا میں اس سے ایک صدی قبل اس کے پیشرو ہنری چہارم کو جو ذلت پوپ کے مقابلے میں نصیب ہوئی تھی اس سے یہ اہانت کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ فریڈرک پوپ کے سامنے دوزانو ہو کر معافی کا خواستگار ہوا اور جب پوپ اپنے خچر پر سوار ہونے لگا تو فریڈرک نے اس کی رکاب پکڑ لی اور پوپ انکار نہ کرتا تو خچر کی لگام بھی پکڑ لیتا۔ چند سال کے بعد ۱۱۸۳ء میں صلح نامۂ کانسٹنس کی رو سے بلدیات اطالیہ کو ان کی فتح کا ثمرہ مل گیا یعنی ان کی آزادی اور حکومت خود اختیاری عملاً تسلیم کر لی گئی اور ان کو افواج رکھنے، قلعوں کی تعمیر کرنے اور عدالتی معاملات میں

تصفیہ کرنے کے حقوق مل گئے۔ شہنشاہ صراحتاً سرزمین اطالیہ کے کسی حصہ سے دست بردار نہیں ہوا مگر اس کی حکومت صرف برائے نام رہ گئی۔

فریڈرک باربروسا اور اس کے دشمنوں یعنے پوپ کے معاذین کا معرکہ اس کے عہد حکومت کے واقعات میں نہایت اہم اور دلچسپ ہے۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ اسی معرکے سے جرمنی کے معاملات کی طرف وہ کافی توجہ مبذول نہ کرسکا اسی اثناء میں جرمنی میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے جن کا آیندہ اثر نہایت اہم تھا۔ اب ہم بالاختصار ان کا ذکر کریں گے۔ اطالیہ کے مخمصوں سے نجات ملتے ہی فریڈرک کو اپنے جرمنی مخالفین کی طرف متوجہ ہونا پڑا جن کا سرگروہ ہنری "اسد" تھا اس رئیس کے مقبوضات اس قدر وسیع تھے کہ بعض جرمنی مورخین کا خیال ہے کہ شہنشاہ پر اس کا غالب آنا ملک جرمنی کے متحد ہوجانے میں ممد ہوتا مگر طویل سلسلۂ جنگ کے بعد شہنشاہ کو کامیابی ہوئی اور اس کے رقیب کے مقبوضات پارہ پارہ ہوکر مختلف دعویداروں میں تقسیم ہوگئے مگر اس سے خاندان گوئیلف کا خاتمہ نہ ہوا گو ملک جرمنی میں کبھی اس کے افراد کو پھر رسوخ حاصل نہیں ہوا۔

ہنری "اسد" کے معرکوں سے چند ایسے اہم واقعات کا بھی تعلق ہے جن سے جرمنی کا تمدن ان ممالک میں پھیلا جو اس کے شرق میں تھے۔ شارلمین کے زمانے ہی میں اقوام سلاو (باشندگان شرقی یورپ جس میں روسی و اہل بلقان شامل ہیں) و ہنگیار (اہل ہنگری) کے زبردست حملوں سے ممالک مذکور میں جرمنی حکومت و تمدن کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ مگر اب پھر اس نواح میں اہل جرمنی زور پکڑتے جاتے تھے۔ اس ضمن میں دو امور قابل ذکر ہیں یعنے سلطنت ہائے پرشیا و آسٹریا کا آغاز ۱۱۵۶ء سنہ میں ڈینیوب ندی کے نشیبی اضلاع جو بادیریا کے مشرق میں تھے ان کی ایک علحدہ ریاست (ڈچی) قرار دی گئی جو اولاً بادیریا مشرقی کے نام سے موسوم ہوئی اور بعد کو اس کا نام آسٹریا ہوگیا۔ اسی صوبے یعنے آسٹریا میں خاندان ہیپسبرگ نے اپنی قوت مستحکم کرلی اس خاندان میں جرمنی شاہنشاہی پندرھویں صدی سے انیسویں صدی کے آغاز تک رہی اور پھر آسٹروی شاہنشاہی اس کے آخری رکن فرانسس جوزیف پر ختم ہوئی جس نے سنہ ۱۹۱۴-۱۹۱۸ کے محاربۂ عظیم کے دوران میں انتقال کیا۔

گولف اور عنبی لائنوں کے علاقے
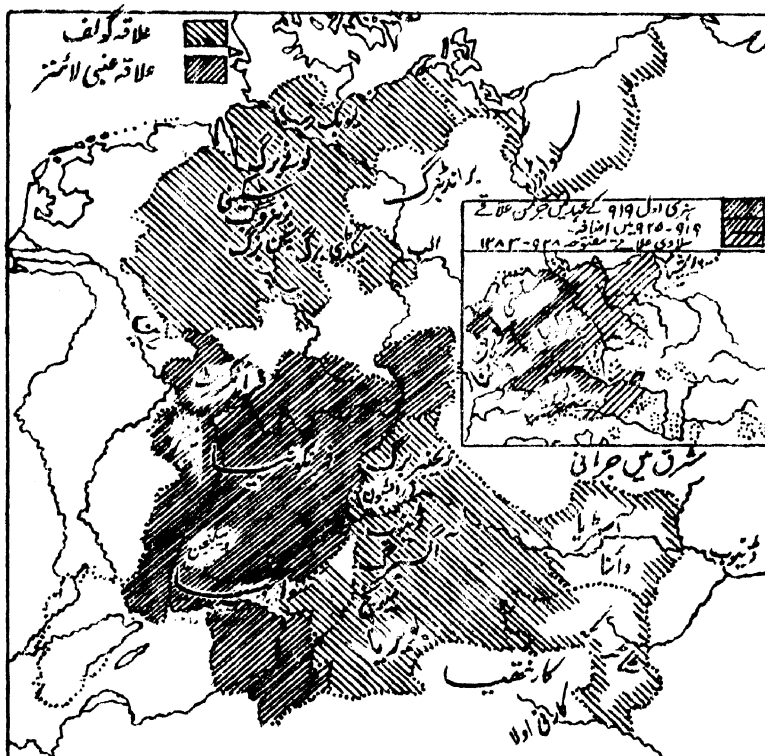
ابتدا میں ریاست آسٹریا گویا قوم مگیار کے مقابلے میں تمدن جرمنی کا مقدمۃ الجیش تھی اور اسی لئے اس کو شروع ہی سے بالکل آزاد رکھا گیا۔ اس زمانے سے کچھ قبل جرمنی کے شمال میں اس زبردست سلطنت یعنے پرشیا کی بنا پڑی جو زمانۂ دراز کی گمنامی کے بعد سلطنت آسٹریا کی حریف ہوگئی۔ ایلب ندی کے مشرق کے اضلاع پر جب جرمنوں کی حکومت دوبارہ قائم ہوگئی تو یہ ضروری ہوا کہ وہاں ایک مستحکم اور استوار حکومت قائم کی جائے۔ اضلاع مذکور کا حاکم اعلیٰ بر ینڈ ینبرگ کا مارگریو (رئیس) البرٹ المعروف بہ "خرس" تھا جس کو بلحاظ اس کی خدمات و اقتدار کے ۱۱۴۱ء میں الیکٹر[1] کا خطاب عطا ہوا۔ البرٹ کا تعلق خاندان اسکانی سے تھا جو چند روز کے بعد صفحۂ تاریخ سے غائب ہوگیا۔ دو صدیوں کے بعد ریاست بر ینڈ ینبرگ خاندان ہوہنزولرن کے قبضے میں آگئی اور اس کی ترقی شروع ہوئی جس سے رفتہ رفتہ اسی خاندان میں جرمنی شاہنشاہی آگئی اور ملک جرمنی کا یورپ کی زبردست سلطنتوں میں شمار ہونے لگا۔ اپنے عہد سلطنت کے اواخر میں فریڈرک بشرکت رچرڈ اول شاہ انگلستان و فلپ ثانی شاہ فرانس تیسری جنگ صلیبی میں شریک ہوا اس جنگ کی ابتداء تو نہایت امید افزا ہوئی مگر اس کا نتیجہ عیسائیوں کے حق میں اچھا ثابت نہوا۔ فریڈرک کے معاونین سمندر کی راہ سے روانہ ہوئے مگر وہ خود ایشیائے کوچک کی طرف سے روانہ ہوا اور اثنائے سفر میں ایک ندی کو عبور کرتے ہوئے اپنی زرہ کے بوجھ سے ڈوب کر مر گیا۔ (۱۱۹۰ء)

---

[1] جرمنی کے وہ رئیس جن کو شہنشاہ کے انتخاب کا حق تھا۔

باب یازدہم

شاہنشاہی اور پاپائیت کا مقابلہ

دورِ آخر

فریڈرک نے ایک جگہ اپنے بیٹے کی نسبت ٹھہرائی تھی جس کے سیاسی اثرات سے نہ صرف اطالیہ، جرمنی اور پاپائیت بلکہ یورپ کے تمام متمدن ممالک متاثر ہونے والے تھے۔ اس نے اپنے بیٹے ہنری کی نسبت کانس ٹنس رئیسۂ نیپلز سے کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی یورپ کی یہ عظیم الشان سلطنت جس کا شمار اب تک شہنشاہ کے خطرناک اور زبردست مخالفوں میں تھا، خاندان ہوہین اسٹافین کے شہنشاہوں سے وابستہ ہو گئی اور یہ عیاں ہو گیا کہ شہنشاہی اور پاپائیت میں آئندہ جو مقابلہ ہوگا اس میں یہ سلطنت شہنشاہی کی طرفدار ہو گی حالانکہ اس وقت تک اس نے پاپائیت کے لئے نمایاں خدمات انجام دئیے تھے

ہنری اپنے باپ کے انتقال کے بعد ۱۱۹۰ء میں ہنری ششم کے لقب سے تخت نشیں ہوا۔ اس کے مقبوضات نہایت وسیع تھے اور حوصلے بلند۔ اُسے آرزو تھی کہ شہنشاہی کو جو اب تک انتخاب پر مبنی تھی موروثی بنا دے اور اگر اس کو اپنے اس مقصد میں کامیابی ہو جاتی تو آیندہ صدیوں میں جرمنی کے حصے بکھرے نہ ہونے پاتے اسکے علاوہ قسطنطنیہ کی مشرقی شہنشاہی پر حملہ آور ہونے کا بھی اس کے دل میں خیال تھا مگر

یہ مقاصد محض خواب و خیال تھے کیونکہ اس کا پہلا فرض یہ تھا کہ اپنے آبائی مقبوضات میں اپنا اقتدار قائم کرے ۔ جرمنی اور نیپلز اور سسلی کا ایک شہریار کے زیر نگیں ہوجانا پاپایانِ روما کو نہایت شاق تھا ۔ اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ ان ملکوں میں سے کسی ایک جگہ بھی اس کی قوت مستحکم نہ ہونے پائے ۔ جرمنی میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تھی اور جنوبی اطالیہ میں تخت کا ایک دعویدار مسمی ٹانکریڈ پیدا ہوگیا تھا جس کی پشت پر خود پوپ تھا ۔ ایک زمانے کے جنگ و جدال کے بعد ہنری اپنے دشمنوں پر غالب آگیا مگر اس کے انتقال (۱۱۹۷ء) کے قبل ہی یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ پاپایانِ روما اس کی قایم کردہ جدید نظام حکومت وجرمن حکومت کے مخالف ہیں ۔

ہنری نے ۱۱۹۷ء میں انتقال کیا ۔ اس کا لڑکا فریڈرک بالکل کم سن تھا اور ایک مدت تک یورپ کی تاریخ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوسکتا تھا ۔ سال مابعد یعنی ۱۱۹۸ء میں تخت پاپائی پر انوسینٹ ثالث متمکن ہوا ۔ یہ پوپ گریگری اعظم اور گریگری ہفتم کا ہم رتبہ تھا جنھوں نے قرونِ وسطےٰ میں پاپائیت کی قوت کو اوج کمال پر پہنچا دیا تھا ۔ نئے پوپ نے پاپائیت کے دعاوی کا نہایت شرح و بسط سے اظہار کیا ۔ شہنشاہی اور پاپائیت کے تعلق کو وہ چاند اور سورج کے تعلق سے تشبیہ دیتا تھا یعنی جس طرح کہ چاند سورج کے نور مستعار سے چمکتا ہے ، اسی طرح شہنشاہی کی روشنی پاپائیت سے ماخوذ ہے ۔ قرونِ وسطےٰ میں اس قسم کے استعارے دلائل کی حیثیت رکھتے تھے اور اس لئے شہنشاہی کے موئدوں پر اس تشبیہ کی تردید اسی طرح فرض ہوگئی تھی گویا کہ وہ تشبیہ ایک خاص دلیل تھی اہل اطالیہ کو جرمنوں سے سخت تنفر تھا ۔ اس تنفر کا اظہار انوسینٹ نے اپنی بات سے بھی کیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ میں اطالیہ سے اس قابل نفرت قوم کو خارج کردوں گا ۔ اس کے مکتوبات میں اس قسم کے خیالات درج ہیں مثلاً "تم جانتے ہو کہ یہ خادم (پوپ) کیا ہے جسے حضرت مسیح نے اپنے پیروؤں کا حکمراں بنایا ہے ۔ یہ مسیح کا خلیفہ اور پطرس کا جانشین ہے ۔ اس کا درجہ خدا اور انسان کے مابین ہے خدا سے نیچے مگر انسان سے اوپر ، خدا سے کم مگر انسان سے زیادہ ، وہ سب کے اعمال کا حکم ہے مگر اس کے اعمال کا کوئی حکم نہیں کیونکہ انجیل میں مذکور ہے کہ میں (مسیح) حکم ہوں ۔ ایک دوسرے مقام پر اس نے لکھا ہے "حضرت مسیح نے پطرس کیلئے

نہ صرف کلیسا کی حکومت چھوڑی بلکہ تمام دنیا کی حکومت، جس پوپ کے خیالات اس قسم کے ہوں اس کا دنیاوی حکام خصوصاً شہنشاہ سے برسر پرخاش ہونا لازمی تھا۔ یہ بھی واضح رہے کہ کوئی شہنشاہ تخت نشیں ہوتے وقت خواہ کتنا ہی حسن اعتقاد کا اظہار کیوں نہ کرے مگر پوپ کے ساتھ مدت تک دوستانہ تعلقات برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔ دونوں کی مخالفت نہ تو شخصی تھی اور نہ اختلاف خیالات ہی پر مبنی بلکہ اس وجہ سے تھی کہ دونوں کے دعاوی ایسے تھے کہ مصالحت ناممکن تھی۔

تاج شہنشاہی کے امیدواروں میں کسی ایسے شخص کے نہ ہونے کی وجہ سے جو تمام انتخاب کنندہ رئیسوں کے پسند خاطر ہوتا شہنشاہی میں سخت ابتری پڑ گئی۔ بالآخر دو امیدوار باقی رہ گئے فلپ (خاندانِ ہوہن اسٹافین اور آٹو ابن ہنری "اسد" (خاندان گویلف) پوپ نے آٹو کو اپنے ظل عاطفت میں لے لیا اور ۱۲۰۸ء میں وہ شہنشاہ تسلیم کر لیا گیا پوپ کا وہ مرہون منت تھا اور اس احسان کا اعتراف اس نے نہایت فراخ دلی سے کیا اور ایک تحریر میں لکھا کہ میری بادشاہی خاک میں مل جاتی اگر کلیسائے مسیحی نے میرا پلہ بھاری نہ کر دیا ہوتا، اطالیہ میں آکر اس نے پوپ کے ساتھ متعدد مراعات کئے اور ۱۲۰۹ء میں روما کے اندر جشن تاجپوشی منایا۔ لیکن کسی پوپ اور شہنشاہ کی دوستی دیرپا نہیں ہو سکتی آٹو چہارم جب سلطنت نیپلز کا دعویدار ہوا تو پوپ اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا کیونکہ جنوبی اطالیہ اور جرمنی کا اتحاد اس کے مصالح کے منافی تھا۔ جرمنی میں بہت سے آدمیوں کو اس نے آٹو کی مخالفت پر آمادہ کر دیا اور ہنری ششم کے بیٹے فریڈرک کو فریڈرک دوم کے لقب سے بادشاہ و شہنشاہ تسلیم کر کے اس کے مقابلے پر کھڑا کر دیا۔ گرمیٔ ہنگامہ میں اس طرح پوپ نے نادانستہ ایک ایسے شخص کو آٹو چہارم کے زیر کرنے کے لئے برسر اقتدار کر دیا جو آیندہ چل کر تخت پاپائی کا سب سے خطرناک دشمن ثابت ہونے والا تھا۔ اپنے اقتدار کو پوری طور سے قایم کرنے کے لئے فریڈرک کو زمانۂ دراز تک جنگ و جدال میں مصروف رہنا پڑا اگر پوپ اور شاہ فرانس کی تائید اس کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ برخلاف اس کے آٹو کا کوئی یار و مددگار جان شاہ انگلستان کے علاوہ نہ تھا۔ ۱۲۱۴ء میں جنگ بووی نیس ہوئی جس سے آٹو چہارم کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اور فریڈرک کی قوت و اقتدار شہنشاہی کو استحکام پہنچا۔ انگلستان اور فرانس

کی تاریخ میں بھی اس جنگ کی خاص اہمیت ہے۔

پوپ انوسینٹ سوم کی قوت اس وقت یورپ میں نصف النہار پر تھی اور کسی پوپ کو اسقدر عروج حاصل نہ ہوا تھا کیونکہ اس نے اپنے مخالف کو مرتبۂ شہنشاہی سے معزول کر دیا تھا اور اپنے منتخبہ شخص کو شہنشاہ بنا دیا تھا۔ سسلی، سویڈن، ڈین مارک اراگان، اور پرتگال نے پوپ کی جاگیری سیادت مبہم طریقے پر تسلیم کر لی تھی۔ انگلستان کے معاملات میں بھی اس کی مداخلت کارگر ثابت ہوئی اور اس نے اپنے اثر سے اسٹیفن لینگ ٹن کو کین ٹربری کا اسقف اعظم مقرر کرا دیا۔ شاہ جہاں سالانہ خراج دینے پر آمادہ ہو گیا اور پوپ کی ماتحتی قبول کر لی۔ یورپ میں اس وقت سب سے زبردست بادشاہ فلپ آگسٹس شاہ فرانس تھا۔ مگر اس طاقت ور بادشاہ نے بھی پوپ کی مخالفت کی وجہ سے ملکہ ان گی بڑگا کو اپنے محل میں پھر داخل کر لیا اور دوسری بیوی کو طلاق دینے پر مجبور رہوا۔

واضح رہے کہ پاپائیت اور شہنشاہی کے مناقشے کے تیسرے اور سخت ترین دور کے آغاز کے قریب ایک نئی مذہبی تحریک پیدا ہونے اور فقرا کے جدید سلسلوں کے وجود میں آنے سے پاپائیت کو حد درجہ تقویت پہنچی۔ انوسینٹ سوم اور اس کے جانشینوں کو فران سس کن اور ڈومی نی کن فقرا سے وہی مدد ملی جو گری گوری ہفتم کو کلونی کی تحریک سے ملی تھی اور سکندر سوم کو سس ٹرشین تحریک سے فقرا کے ان سلسلوں نے کلیسائے کاتھولیکہ کی مدد ایسے نازک وقت میں کی جب کہ وہ سخت خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ کلیسا نہایت قوی تھا مگر عوام کو اس کے ساتھ ہمدردی باقی نہ تھی یا ممکن ہے کہ اس کی قوت کے بڑھنے ہی کے سبب سے یہ برگشتگی پیدا ہو گئی ہو۔ اس کے عبادات اور مواعظ میں لاطینی زبان مستعمل تھی جس سے عوام کے دلوں پر اس کی تعلیم کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ غربا اور خصوصاً اہالیان شہر یا تو کلیسا کے مخالف تھے یا اسکی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ فرانس کے جنوبی اضلاع، لانگے ڈوک اور پروونس میں ایسی مذہبی اور خلاف مذہب تحریکیں وجود میں آ رہی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل جانے کا اندیشہ تھا یعنے ان اضلاع میں ایسے خیالات کی تبلیغ ہو رہی تھی جن میں کلیسا کے ملحدانہ قرار دیا تھا۔ ان میں سے بعض خیالات ایسے تھے جو بمقابلۂ کلیسا کی تعلیم کے حقیقی

وسیحی مذہب سے قریب تر تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے" مثلاً الحاد اَلْ بی گین سی" جو مذہب کے بنیادی اصول اور اخلاق کے منافی تھے۔ ان خطرات کی وسعت کو مبالغے کی نظر سے نہ دیکھنا چاہئے اور یہ تحریکیں جن کا مرکز جنوبی فرانس تھا۔ اگر اپنے حال پر چھوڑ دیجائیں تو شاید رفتہ رفتہ ناپید ہو جاتیں۔ مگر روما کے حکام کو اس تحریک سے سخت انتشار ہوا اور اس کو دفع کرنے کا اہتمام ہونے لگا۔ اسی غرض سے سینٹ فران سِیس اور سینٹ ڈامی نِک کے سلسلے قائم ہوئے جن کے مقاصد یہ تھے کہ غربا کو پھر کلیسا کی طرف متوجہ کیا جائے وعظ دیسی زبانوں میں ہوں اور ان ملحدانہ خیالات کی تردید کی جائے جو جنوبی فرانس میں پھیلے ہوئے تھے۔

سینٹ فران سِیس، اَسِیْ سِیْ واقع وسط اطالیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد فرانس سے تجارت کرتے تھے اور اگر ان کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم واقع نہ ہوتا تو وہ بھی اسی تجارت میں مشغول ہو جاتے۔ مگر انھوں نے دنیادی آرزؤں اور جلب منفعت کے ذرایع کو خیرباد کہہ کے فقر کی دشوار گزار راہ اختیار کی اور کلیسا اور اپنے ہم جنسوں کی خدمت پر کمربستہ ہوگئے۔ ان کی زندگی کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہوگئے ہیں۔ مگر تاریخی ذرایع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی پاک اور بے لوث تھی اور وہ حسن اخلاق کے بہترین نمونہ تھے۔ ابتداءً ان کی تحریک کا کوئی خاص نظام نہ تھا رفتہ رفتہ چند ہم خیال ان کے شریک ہوگئے۔ ان کی جماعت مختلف مقامات کا دورہ کرتی رہی، پند و مواعظ اور خدمت خلق اس کا کام تھا اور خیرات پر اس کا گزارہ۔ کچھ روز کے بعد انھیں فقرا کے ایک خاص گروہ کے قایم کرنے کا خیال آیا جسے وہ "سلسلۂ غربائے اَسِیْ سِیْ" کہنا چاہتے تھے۔ پوپ نے اولاً اس تحریک کو تسلیم کرنے یا اس کی امداد کو منظور کرنے میں تذبذب کا اظہار کیا کیونکہ یہ ایک بالکل جدید چیز تھی اور کلیسا کے ابتدائی زمانے کے بعد سے فقر و استغنا کے یہ جذبات بالکل معدوم ہو چکے تھے۔ مگر سینٹ فرانسس کے تقدس اور صداقت کو بالآخر کامیابی ہوئی اور ۱۲۰۹ء میں یہ جدید سلسلہ قایم ہوگیا۔

سینٹ ڈامی نِک، سینٹ فران سِس کا معاصر تھا۔ اور اس کی تحریک بھی سینٹ فران سِس کے مماثل تھی۔ "الحاد اَلْ بی گین سی" کی وجہ سے جس کا ذکر آچکا ہے ایک

صلیبی جنگ شروع ہوگئی تھی جس میں سینٹ ڈامی نک بھی شریک تھے۔ ان کا عقیدہ ابتدا سے یہ تھا کہ گو ملحدوں کے ساتھ سختی سے کام لیا جا سکتا ہے مگر ان کا جوش رفع کرنے کے لئے اخلاقی اسلحہ سے بھی کام لیا جائے تو بہتر ہے۔ ان کا قول تھا کہ جوش کے مقابلے کے لئے جوش چاہئے، فروتنی کے مقابلے کیلئے فروتنی مصنوعی تقدس کے مقابلے کے لئے حقیقی تقدس اور باطل عقائد کے مٹانے کے لئے صحیح عقائد کی تبلیغ ہونا چاہیے۔ ۱۲۱۳ء میں ان کے سلسلۂ واعظین کا قیام عمل میں آیا جس کا خاص منشا یہ تھا کہ جنوبی فرانس سے ملحدانہ عقائد دفع کئے جائیں۔

فقراء کے ان دونوں گروہوں کا ذکر ہم ایک ہی جگہ کریں گے۔ کیونکہ ان کے خصائل مشترک تھے۔ ان میں اور راہبوں کی قدیم جماعتوں میں یہ فرق تھا کہ انھیں صرف اپنی ذاتی نجات کی فکر نہ تھی کہ وہ ہمیشہ مراقبے ہی میں رہتے بلکہ وہ خلق اللہ کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور اس کو معاصی سے بچانا چاہتے تھے۔ ان جدید فقراء کی خانقاہیں نہ تھیں بلکہ وہ اہل دنیا کے بیچ میں رہتے اور بنی نوع انسان کی خدمت کو عبادت الٰہی خیال کرتے تھے۔ ابتداءً ان کا یہ اصول تھا کہ ان کا کوئی مسکن نہو اور نہ کوئی عمارت خاص ان کے لئے بنائی جائے، لیکن جب عمارتیں تیار ہونے لگیں تو یہ ثابت ہو گیا کہ فقراء کی یہ جماعتیں اپنے مقدس بانیوں کے مقاصد سے ہٹ گئیں۔ ان کے نظام میں امور ذیل قابل غور ہیں:۔ اولاً کسی قسم کی جائداد اُن کے لئے حرام تھی اور گزراوقات کی صورت دریوزہ گری پر تھی۔ ثانیاً ان کا خاص کام یہ تھا کہ وعظ کہیں اور ان کے وعظ ہر ملک کے عوام کی زبان میں ہوں۔ ثالثاً انھیں فرماں برداری اور باہمی محبت کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔ ان کی ایک چوتھی خصوصیت بھی تھی اور اسی کو انکی قوت کا راز کہہ سکتے ہیں یعنے ان سلسلوں کی ایک شاخ تھی جسے ٹرشیئری (تیسرا) کہتے تھے۔ اس شاخ میں ایسے مرد اور عورتیں داخل تھیں جو نہ تو اس سلسلہ کا لباس پہنتے تھے نہ اس کے اصول کے بالکلیہ متبع تھے۔ یہ لوگ معمولی اہل دنیا کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان سلسلوں سے ان کا تعلق صرف اسقدر تھا کہ ان کی ہر طرح سے تائید کرتے تھے۔

ان دونوں سلسلوں کی ترقی حیرت ناک تھی۔ فرانسسکی (Grey) فقرا اور ڈامی نکی "سیاہ فقرا" کے نام سے مشہور تھے۔ مغربی یورپ کے شہروں میں یہ

بہت جلد پھیل گئے لیکن جنوبی یورپ میں ان کی تعداد و قوت زیادہ تھی۔ ان کی تنظیم نہایت دلچسپ ہے اور فی الجملہ کارگر بھی تھی۔ مگر ان کا اثر صرف تنظیم کی خوبی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ان کی بانیوں کی یادگار بطور خود ایک مستقل قوت تھی۔ سینٹ ڈامی نک کی یاد لوگوں کے دلوں میں ایک زمانہ تک قائم رہی جو انھیں "دین کا پہلوان" کہتے تھے۔ مگر سینٹ فرانسس کی زندگی اور خصائل کا اثر خاص کر زیادہ تھا، لوگ ان کی زندگی کو، پارسائی جوش مذہبی اور محبت کا آئینہ سمجھتے تھے۔ ان کے بہت سے قصے مشہور تھے کہ وہ غریبوں کی خدمت کرتے تھے۔ کوئی شخص خواہ کیسے ہی نفرت انگیز مرض میں مبتلا ہو، اس کی تیمارداری بہ طیب خاطر کرتے۔ کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو اپنی مخالفت یا معاصی کی وجہ سے اُن کی بیدریغ خدمت سے فائدہ حاصل نہ کرسکتا۔ اپنے گوناگوں مشاغل کے باوجود ہر وقت ہشاش بشاش رہتے اور اپنے رفیقوں کے ساتھ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے ان کی محبت کا دائرہ صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ جانور بھی اس میں شامل تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی چڑیوں کو وعظ سنایا کرتے۔ غرض تیرھویں صدی میں یہ ایک جدید قوت تھی جس کا اثر اب بھی زائل نہیں ہوا۔ فقرا کی ان جماعتوں کے قیام سے پاپائیت کو اپنے دنیاوی مخالف کے مقابلے میں خاطر خواہ مدد ملی۔

اس جدید جد و جہد میں دنیاوی اور شہنشاہی قوت کا نمایندہ ایک عجیب و غریب شخص شہنشاہ فریڈرک دوم تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ پوپ کی عنایت اور تائید سے شہنشاہ ہوا تھا، اور پھر مخالف ہو گیا تھا جس سے ظاہر ہے کہ پوپ کے دشمنوں میں سے اکثر وہ لوگ تھے جو ایک زمانہ میں اس کے گہرے دوست تھے۔

بیان کیا گیا ہے کہ شہنشاہ فریڈرک دوم نہایت کم رو اور پستہ قامت تھا اور اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح اس کے بال بھی سرخ تھے۔ مگر اس کی دماغی قوتیں غیر معمولی تھیں اور اس کے خیالات اور افعال میں ایک خاص اچھوتا پن پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے اس کے معاصر اسے "عجوبۂ روزگار" کہتے تھے۔ قرون وسطےٰ کی تاریخ میں کوئی اور بادشاہ اس کے مثل نہیں گذرا۔ کیونکہ وہ بارھویں تیرھویں صدی کے خیالات اور عقائد سے کوسوں دور تھا، اس کے خیالات زمانۂ مابعد کے بادشاہوں۔ یعنی ہنری ہفتم (انگلستان) یا لوئی یازدہم (فرانس) یا عہد نشاۃ جدید کے اطالوی خود سر حکام سے

ملتے جلتے تھے۔ جنوبی اطالیہ کے عوام کی زبان میں شعر کہتا تھا، اس لئے اسے ہم اس تحریک کے آغاز کا بانی کہہ سکتے ہیں جو یورپ کی جدید زبانوں میں ادبیات کے فروغ کا باعث ہوئی۔ سائنس اور فلسفے کی ترقی میں بھی اسے دلچسپی تھی جس کا اس وقت جنوبی یورپ میں چرچا تھا۔ نیپلز کی یونیورسٹی کی اس نے بناڈالی اپنے منشور میں اس نے لکھا ہے کہ "میں نے یہ یونیورسٹی اس غرض سے قائم کی ہے کہ تشنگانِ علم اپنے ملک میں رہکر اپنی پیاس بجھائیں اور انھیں تلاش علم کی خاطر ممالک غیر میں جاکر دریوزہ گری کی ضرورت نہ پڑے" سالیرنو میں اس نے طب کا ایک مدرسہ قائم کیا اور پالیرمو میں ایک چڑیا خانہ بنایا جس میں جنگلی جانور تھے۔ اس کے عہد حکومت میں جنوبی اطالیہ اور سسلی میں علوم عقلی اور فنونِ لطیفہ کو ایسا فروغ حاصل ہوا کہ زمانۂ مابعد میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اس علمی تحریک میں نہ صرف ٹامس ایکوی ناس (قرون وسطے کا نہایت جید عالم) کی طرح مسیحی علما ہی شریک تھے بلکہ مسلمان علما کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور ان کے ساتھ بھی شہنشاہ کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ مگر یہ علمی مشاغل اور ان کی ترویج پوپ کو اس عالم میں بھی ضرور ناگوار گزرتی۔ اگر اس کے اور شہنشاہ کے درمیان مخاصمت کے دوسرے اسباب بھی نہ ہوتے۔ پوپ نے متعدد فرامین میں شہنشاہ کو کافر اور ملحد قرار دیا۔ مگر ان فرامین سے یہ نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ بنائے الحاد کیا تھی۔ پوپ نے حالت غضب میں اعلان کیا تھا کہ شہنشاہ روح کو غیر فانی خیال نہیں کرتا۔ اور حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم اور حضرت مسیح کو کذاب اعظم، کہا کرتا ہے۔ مگر یہ محض واہی تباہی باتیں تھیں۔ فریڈرک اپنے آپ کو ہمیشہ مسیحی کہا کرتا تھا اور کیتھولک کلیسا کا موید تھا۔ اس کا قول تھا کہ "میں کلیسا سے برسر پیکار نہیں ہوں بلکہ اہل کلیسا کی عیاشی اور بداعمالی کا دشمن ہوں۔ میں پادریوں کی جماعت کا دشمن نہیں ہوں، میں ادنیٰ سے ادنیٰ پادری کو بھی اپنے باپ کے برابر سمجھتا ہوں اور عزت کرتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ دنیاوی معاملات سے الگ تھلگ رہے۔ کلیسا میں جو گندگی، کمزوری اور خرابیاں پیدا ہو گئیں ہیں اس کا باعث پادریوں کا خبثِ باطن، حرص اور لوٹ مار کی عادت ہے۔ میں بھیڑوں (مسیحیوں) کو ان کے گلہ بان (پادریوں) کے سپرد کر دوں گا، عامۂ خلق کو ان کے اسقف دیدوں گا اور دنیا (عالم مسیحی) کو اسکا روحانی باپ (پوپ) دوں گا۔ میں اس گرگ صفت ظالم کے چہرے سے تقدس کی نقاب

اٹھادوں گا اور اسے مجبور کر دوں گا کہ دنیاوی معاملات اور دنیاوی کرّوفر کو خیرباد کہکے مسیح کے مقدس نقش قدم پر چلے" اس سے ظاہر ہے کہ وہ کلیسا کی تعلیم فقر و استغنا سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ پاپائیت سے جب جد و جہد شروع ہو گئی تو اس کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں افراد قوم بھی کلیسا کے سردار ہو سکتے ہیں۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ شہنشاہ کی بھی اس قدر عزت و حرمت ہونی چاہئے جتنی کہ پوپ کی اور ممکن ہے کہ وہ اس عزت و حرمت کا خود بھی خواہشمند ہو۔ ان اقوال سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا رجحان بھی کلیسا کو دنیاوی حکام کے تحت میں لانے کی طرف تھا جیسا کہ انگلستان میں ہنری ہشتم کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔

فریڈرک دوم جرمنی اور شمالی اطالیہ پر شہنشاہ کی حیثیت سے حکمراں تھا اور نیپلز اور سسلی پر موروثی بادشاہ کی صورت میں فرمانروا بنا۔ اٹو اعظم کے زمانے سے شہنشاہوں کو جرمنی اور اطالیہ کے متضاد مفاد اور خصایص کی وجہ سے جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا وہ فریڈرک کے زمانے میں اور بھی بڑھ گئی تھیں اور اس کے عہد حکومت میں ہمیں توضیح کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے کہ اطالیہ میں شہنشاہوں کے اپنی ذاتی سلطنت کے معاملات میں مشغول رہنے سے جرمنی میں کیا خرابیاں پیدا ہوتی تھیں فریڈرک نے پوپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں سسلی اور جرمنی کے تعلق کو مستقل نہ ہونے دوں گا۔ اور جنوبی حکومت (نیپلز و سسلی) اپنے بیٹے کو عطا کر دوں گا جو پوپ کے تحت میں رہے گا۔ مگر اس نے وعدہ خلافی کی اور بجائے جرمنی کے اس نے اطالیہ میں حکومت کرنا زیادہ مناسب خیال کیا کیونکہ نیپلز میں وہ فی الحقیقت بادشاہ تھا اور جرمنی میں اس کے زبردست باجگذار رئیسوں کی زبردست قوت کی وجہ سے اس کا اقتدار محض برائے نام تھا۔ سسلی کی سلطنت میں اس نے تمام رقیب قوتوں کو زیر کر کے اقتدار شاہی کو تقویت دی۔ اس نے اگر جاگیرداروں کی قوت کو توڑا نہیں تو ضعیف تو ضرور کر دیا۔ اور امراء کے قلعوں کو مسمار کر کے، ان کے بجائے شاہی قلعے بنوائے۔ شہروں کی آزادی بھی کم کر دی گئی تمام افراد سلطنت شاہی قوانین کے پابند اور شاہی عدالتوں کی تحت میں کر دیئے گئے۔ صوبجات اس کے حکام کے زیر انتظام تھے اور جملہ انتظامی امور پہ اس کے امیر عدل (جسٹی شیئر) کی نگرانی تھی۔ یہ انتظامات قبل از وقت تھے اور ان سے

نشو ونمائے حریت کی امید نہ ہو سکتی تھی مگر انھیں انتظامات کی برکت سے نیپلز اور سسلی کو وہ خوش حالی حاصل ہوئی جو یورپ کے دوسرے ملکوں کو نصیب نہ تھی۔ مگر اس کی فوجی قوت اتنی زبردست نہ تھی کہ سسلی اور جرمنی دونوں پر وہ اپنا اقتدار قایم رکھ سکتا۔ اس لئے بسا اوقات اسے مجبوراً جرمنی میں اپنے شہنشاہی فرائض سے دست کش ہونا پڑتا تھا۔ اسی لئے اس کے عہد میں جرمنی اور سسلی کے نشو ونما میں ایک بیّن فرق ہے۔ مثلاً نیپلز اور سسلی میں نظام جاگیری یا تو بیخ و بنیاد سے اکھڑ گیا تھا یا بادشاہ کے قابو میں آگیا تھا۔ مگر جرمنی میں جاگیردار شہنشاہ کے خطرناک رقیب ہوگئے تھے۔ ۱۲۳۹ء میں فریڈرک نے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے جرمنی کے رئیسوں کو وسیع عدالتی اور فوجی اختیارات حاصل ہوگئے۔ اور بڑے بڑے رئیس تو عملاً مرکزی حکومت سے آزاد ہوگئے۔ جرمنی کے بڑے بڑے شہر اب تک شہنشاہی کے سرگرم موید تھے مگر ان کے ساتھ جو خاص مراعات اب تک ملحوظ تھے وہ امرا کو رام کرنے کے لئے کم کردیئے گئے۔ اور بعض صورتوں میں تو بالکل کالعدم ہی کردیئے گئے۔ مگر باوجود ان رعایتوں کے یا یہ کہیئے کہ انھیں رعایتوں کی وجہ سے امرا نے ان کے خلاف بغاوت کردی اور خود فریڈرک کا بیٹا ہنری ان کے ساتھ ہوگیا جو ولی عہدی کی حالت امید بیم سے گھبرا کے تخت و تاج کا جلد تر مالک ہونا چاہتا تھا۔ ہنری کو شکست ہوئی اور ۱۲۳۵ء میں اسے حبس دوام کی سزا ہوئی۔ اس کے بعد شہنشاہ نے جرمنی میں پھر اپنے اقتدار و جبروت کا سکّہ جمانا چاہا مگر امرا کی قوت بہت بڑھ چکی تھی اور شہنشاہ اطالیہ کے انتظامی امور میں منہمک ہوگیا۔ اس لئے جب سابق شہنشاہی جرمنی میں ایک کارگر حکومت قائم کرنے میں اس دفعہ بھی ناکامی ہوئی اور انیسویں صدی تک اس قسم کی کوئی کوشش بارآور نہ ہوئی۔

فریڈرک اور پاپائیت کے درمیان جو امور مابہ النزاع تھے وہ دستوری معاملات سے متعلق نہ تھے۔ ہنری چہارم اور پاپائیت میں جنگ اسقفوں کے انتخاب کے اصول پر ہوئی تھی۔ اور فریڈرک اول نے پوپ سکندر سوم کے انتخاب کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ مگر فریڈرک دوم اور پاپائیت کے باہمی مناقشوں کی بنیاد محض شخصی رقابت پر تھی اور دونوں علانیہ طور پر اطالیہ میں اپنے اپنے تفوق کے لئے دست وگریباں تھے۔ فریڈرک تخت نشینی کے بعد ہی پوپ کے احکام کے مطابق جس کا وہ مرہونِ منت تھا جنگ صلیبی

کی طرف متوجہ ہوا اور پوپ بھی اصرار کر رہا تھا کہ وہ اپنے عہد و پیمان کو پورا کرے۔ جنگ ہائے صلیبی کی تاریخ ہم اس کے بعد کسی باب میں بیان کریں گے جس سے معلوم ہوگا کہ جنگ صلیبی کا جوش اس زمانے میں بالکل سرد ہو رہا تھا۔ اور یہ تحریک اپنے اعلیٰ مقاصد سے ہٹ کر تجارتی اور قومی مفاد کا آلہ بن گئی تھی۔ فریڈرک کو زمانۂ سابق کے حامیان جنگہائے صلیبی سے کوئی نسبت نہ تھی، غیر مسیحیوں پر حملہ آور ہونے کی اسے ہوس نہ تھی اور اس کے علاوہ وہ خوب جانتا تھا کہ اپنی قوت کے مستحکم کرنے کے لئے جنوبی اطالیہ میں اس کا قیام ضروری ہے۔ مگر پوپ اسے مجبور کر رہا تھا اس لئے ۱۲۲۷ء میں وہ برنڈسی سے مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ مگر چند ہی روز میں ناگہانی بیماری کا بہانہ کر کے واپس آگیا پوپ خوب جانتا تھا کہ یہ اس کی چال ہے، اس لئے اس نے شہنشاہ کو کلیسا سے خارج کر دیا۔ جو شخص کلیسا سے خارج کر دیا گیا ہو، جنگ صلیبی میں شریک نہ ہو سکتا تھا مگر اسکے باوجود فریڈرک ۱۲۲۸ء میں پھر روانہ ہوا، اس جنگ صلیبی میں اس کی کارروائیاں اتنی ہی عجیب و غریب تھیں جتنے کہ اس کی روانگی کے حالات تھے۔ اس کا بیان تھا کہ مسلمانوں سے مجھے کوئی پرخاش نہیں اور فی الحقیقت اس میں مذہبی تعصب نہ تھا۔ اس کی دوسری بیوی یروشلم کے نام ونہاد بادشاہ کی بیٹی تھی جس کی بنا پر وہ وہاں کی حکومت کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ سفارتی کارروائیوں اور نامہ و پیام سے اس نے مسلمانوں سے مسیحی زائرین کے لئے ایسے مراعات حاصل کر لئے تھے جو حامیان جنگ صلیبی کو زمانۂ سابق میں جنگ و جدال سے حاصل نہ ہوئے تھے۔ یروشلم کی برائے نام حکومت بھی اسے مل گئی۔ پھر وہاں جب وہ پہنچا تو اسے کوئی پادری ایسا نہ ملا جو تاج اس کے سر پر رکھتا کیونکہ وہ کلیسا سے خارج ہو چکا تھا۔ اس لئے اس نے قربان گاہ سے تاج اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھ لیا۔ اطالیہ جب وہ واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ پوپ نے اس کے خلاف جنگ صلیبی کا اعلان کر دیا ہے اور پوپ کی فوجیں نیپلز میں لوٹ مار کر رہی ہیں فریڈرک نے ان فوجوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ ۱۲۳۰ء میں پوپ نے اس سے صلح کر لی اور کلیسا میں اسے پھر داخل کر لیا۔

مگر یہ مصالحت چند روزہ تھی اور اس کے بعد جو جنگ شروع ہوئی وہ اور بھی سخت تھی۔ پوپ گری گوری۔ نہم کی عمر اس وقت قریب قریب سو سال تھی۔ مگر اطالیہ

کے سیاسیات میں اسے اس وقت بھی بہت کچھ دخل تھا۔ موجودہ نزاع ابتداءً فریڈرک اور پوپ کے درمیان نہ تھی بلکہ لمبارڈی کے ان شہروں سے تھی جو فریڈرک اول کی تذلیل کے باعث ہوئے تھے۔ اس شہنشاہ کی ہزیمت اور معاہدۂ کانس ٹنس کے بعد سے شہری تحریک کو اطالیہ میں سرعت کے ساتھ ترقی ہوئی۔ شمال کے اتحاد لمبارڈی کی طرح وسطی اطالیہ میں بھی شہری اتحاد وجود میں آگئے تھے۔ جو شہنشاہ کی مخالفت پر آمادہ تھے۔ گزشتہ نصف صدی میں اطالیہ کے شہروں میں ایک خاص تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ دولت اور شان وشوکت میں انھوں نے خاصی ترقی کی تھی اور اپنی قوت کا انھیں احساس ہو گیا تھا۔ مگر ان شہروں میں مخالف طبقات کے مناقشوں سے انکی آزادی طوایف الملوکی سے متبدل ہو رہی تھی۔ اس لئے بعض مقامات میں کسی غیر سلطنت کا باشندہ حاکم اعلیٰ (پوڈیسٹا) مقرر کر دیا جاتا تاکہ کم از کم کچھ روز تک امن وامان رہے۔ بعض شہروں میں جابر حکام برسر اقتدار تھے۔ جن میں سر بر آوردہ ویرونا کا حاکم اے زی لی نو تھا۔ فریڈرک نے شہروں کو محکوم کرنے کا قصد کر لیا اور ذاتی مخاصمت کی وجہ سے ان شہروں میں سے اکثر اس کے حلیف ہو گئے، اسذی لی نو بھی سرگرمی کے ساتھ اس کی مدد کرتا رہا۔ دونوں جانب خونخوار درندوں کی طرح لڑتے رہے اور ابتداءً فریڈرک کو کامیابی ہوئی۔ ۱۲۳۷ء میں متحد شہروں کو شکست ہوئی تھی۔ اور آثار یہ تھے کہ فریڈرک کو فتح کامل حاصل ہو گی۔ مگر اس کے بعد پوپ شہروں کی تائید میں شریک جنگ ہو گیا۔ اس کے اغراض حسب سابق تھے۔ شہنشاہ پھر کلیسا سے خارج کر دیا گیا۔ پوپ گری گوری نہم نے اس اثناء میں انتقال کیا اور پوپ انوسنٹ چہارم جو شہنشاہ کا دوست تھا۔ اس کا جانشین ہوا۔ مگر نیا پوپ اپنی خدمت پر فائز ہو کر دوستی کے حقوق بھول گیا۔ ۱۲۴۵ء میں کلیسا کی ایک کونسل لیان میں منعقد ہوئی جس نے نہایت سختی کے ساتھ فریڈرک پر لعن وطعن کی اور اعلان کیا کہ وہ فرعون ہیرو ز اور نیرو سے کم نہیں۔ شہنشاہ نے بھی جواب دینے میں کوتاہی نہیں کی اس نے اعلان کیا کہ پوپ اس کو معزول نہیں کر سکتے۔ "تخت وتاج مجھے خدا نے دیا ہے۔ اور پوپ اور کونسل اور شیطان مجھے اس دولت سے محروم نہیں کر سکتے۔ کیا ایک کینہ اور رذیل آدمی شہنشاہ کو معزول کر سکتا ہے جس کا دنیا میں کوئی ہمسر نہیں ہے۔" مگر پوپ نے

شہنشاہ کی معزولی کا حکم نافذ کر دیا۔ اور جرمنی میں اس کے بجائے ایک دوسرے شہنشاہ کو کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد مخاصمین کا جوش اور بھی بڑھ گیا۔ فقرا کی جماعتیں جن کا زور بڑھا ہوا تھا عوام میں شہنشاہ کے خلاف نفرت پھیلا رہی تھیں۔ لمبارڈی کے بعض شہر فریڈرک کے طرفدار ہو گئے، مگر زیادہ تر اس کی مخالفت پر آمادہ تھے۔ ۱۲۴۷ء میں فریڈرک پارما کا محاصرہ کر رہا تھا مگر وہاں اسے سخت شکست ہوئی اور تین سال کے بعد جب اس نے ۱۲۵۰ء میں انتقال کیا تو اس جنگ کے نتیجے کے متعلق کوئی صحیح پیشین گوئی نہیں کیجا سکتی تھی۔

اس کے انتقال سے صورت حال بالکل بدل گئی جس سے سخت تعجب ہوتا ہے۔ سلطنت نیپلز کی قوت میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی اطالیہ اور جرمنی کی حالت وہی تھی مگر فریڈرک اپنے دشمنوں کا کم از کم ہم پلہ تھا۔ مگر اس کے جانشین پوپ اور اس کے حلیفوں کے مقابلے سے عاجز رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جو قابل تحسین حکومت اس نے سسلی اور نیپلز میں قایم کی تھی اس کا وجود امراء کو شاق تھا اور عوام ابھی تک کسی شمار میں نہ تھے۔ حکومت کی کامیابی کا انحصار فریڈرک کی زبردست قوت ارادی و تنظیم پر تھا اور اس کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی سلطنت کی یہ عمارت جو اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ تعمیر کی تھی، یکایک گر پڑی اور اس کے صرف کھنڈر باقی رہ گئے اس کا بیٹا کونراڈ چہارم اس کا جانشین ہوا۔ کونراڈ جرمنی میں تھا جب کہ اس کے باپ نے انتقال کیا اور چونکہ وہاں کسی زبردست حکومت کے قیام کا امکان نہ تھا اس لئے قسمت آزمائی کے لئے اس نے اطالیہ کا رخ کیا اور نیپلز میں داخل ہوا جہاں اس کے قدم جم گئے ہوتے مگر چند ہی روز کے بعد ۱۲۵۴ء میں موت نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس نے ایک بیٹا چھوڑا جو کونراڈ نو کے نام سے مشہور ہے مگر نیپلز اور سسلی میں اس خاندان کا سردار مین فریڈ ہوا جو فریڈرک دوم کا ناجایز بیٹا تھا۔ ۱۲۶۱ء میں اربن چہارم پوپ ہوا جو فرانسیسی تھا۔ اور خاندان ہوہن اسٹافین کو جنھیں وہ "بچگان مار" کہا کرتا تھا معزول کرنے کے لئے ہر طرح سے آمادہ تھا۔ پوپ نے سسلی کا تاج چارلس رئیس آنجو کو پیش کیا جو فرانس کے مقدس بادشاہ کا بھائی تھا چارلس نے حکومت قبول کر لی۔ اس لئے مان فریڈ کو فرانسیسی فوجوں سے لڑنا پڑا۔ چارلس کے ساتھ

پوپ نے ایک نہایت سخت معاہدہ کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا طرزِ عمل کسقدر دنیاداری اور دنائت پر مبنی تھا۔ اس معاہدے کی خاص شرط یہ تھی کہ اگر چارلس پوپ کے خزانے میں اپنا خراج وقت پر نہ داخل کرے گا تو کلیسیا سے خارج کر دیا جائے گا مان فریڈ کچھ روز تک فرانسیسی فوج کا مقابلہ کرتا رہا۔ مگر بالآخر بی نی وین ٹو کے قریب ایک جنگ ہوئی جس میں اسے شکست ہوئی اور وہ خود کام آگیا۔ چارلس نے نیپلز اور سسلی پر قبضہ کرکے سخت گیری اور مظالم کا سلسلہ شروع کر دیا جس سے اہلِ ملک کون راڈن کی طرف متوجہ ہوئے جس کی عمر ۱۲۶۶ء میں صرف سولہ سال کی تھی۔ مگر یہ لڑکا ہونہار اور ذی حوصلہ تھا۔ اس لئے اپنی موروثی سلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اطالیہ پر اس نے شمال کی طرف سے حملہ کیا، خود روما میں اس کا گرم جوشی سے استقبال ہوا مگر جب ٹاگ لیا کورہ میں فرانسیسی فوجیں اس کے مقابلے پر آئیں تو اس کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ خود گرفتار ہو گیا۔ اسی سال اگست میں نیپلز کے بازار میں قتل کر دیا گیا اور اور اس کے ساتھ خاندان ہوہین اسٹافین کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ جس نے قرون وسطیٰ کے درمیانی زمانے میں یورپ کے سیاسیات میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ پاپائیت کو فتح تو ہوئی مگر اس فتح کے حاصل کرنے کے لئے اس نے ایسے ذرایع سے کام لیا جو اس کے لئے باعث ذلت تھے اور یہ فتح کچھ روز کے بعد اس کی قوت کے لئے شکست سے زیادہ مضر ثابت ہوئی۔ اس طویل نزاع میں اعلیٰ ترین مذہبی اصول اقتدارات پاپائیت کی جانب سے ذاتی اغراض کے حصول کے لئے قربان کر دیئے گئے اور پاپائیت کو اس فتح کے صرف ۳ سال کے بعد ایسی سخت شکست ہوئی جس کا اس کی تاریخ میں کہیں اور ذکر نہیں۔ اور یہ شکست فرانسیسیوں کے ہاتھوں ہوئی۔ جن کو اس موقع پر پاپائیت نے اپنی فتح کا آلہ بنایا تھا۔

مگر قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں جرمنی کے چند واقعات کا ذکر ضروری ہے جنکی اس کی آئندہ تاریخ میں خاص اہمیت ہے۔ دسویں صدی سے سولھویں صدی تک جرمنی کی تاریخ کی بیّن خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اثر مشرق کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایلب ندی اب اس کی مشرقی سرحد نہ تھی بلکہ یہ سرحد اب اوڈر ندی تک پہنچ چکی تھی۔ اوڈر کے پار تمام مشرقی سرحد پر جرمنی کے مقابلے میں غیر جرمنی قومیں تھیں

جن میں سے بعض بت پرست تھیں۔ اہل ہنگری (ماگیار) ڈینیوب ندی کے شمال میں آباد تھے۔ ان کے شمال میں اہل بوہیمیا (قوم چک) تھے، پھر پولز اور ان کے شمال میں سلاوی نسل کے مختلف قبیلے تھے جن میں اہل پرشیا قابل ذکر ہیں جو غیر جرمن اور بت پرست تھے۔ ان کو زیر کرنے کے لئے ایک جدید قوت وجود میں آنے کو تھی۔ جنگ ہائے صلیبی کی وجہ سے متعدد فوجی مذہبی سلسلے قائم ہو گئے تھے جن میں سے نائٹس ٹیمپلرس اور نائیٹس ہاس پی ٹالرس زیادہ مشہور ہیں۔ ٹیوٹانک نائیٹس کا سلسلہ کم مشہور ہے مگر اپنی خدمات کے لحاظ سے اس کی اہمیت کم نہیں ہے۔ ان کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ بیت المقدس جانے والے جرمن زائرین کی حفاظت کریں مگر اس سرزمین میں مسیحی فتوحات ناپید ہو چکے تھے اس لیے وہاں اس سلسلے کے لئے کوئی شغل باقی نہ رہ گیا تھا۔ ۱۲۲۸ء میں انھیں اجازت دی گئی کہ شام کے بجائے بحیرۂ بالٹک کے سواحل پر نبرد آزمائی کا سلسلہ شروع کریں اور یہ وعدہ کیا گیا کہ پرشیا میں جو زمین وہ بت پرستوں سے چھینیں گے۔ ان کی ہو جائے گی۔ اس کا سردار (گرینڈ ماسٹر) ہرمن ساکن سال زا تھا جس کی ماتحتی میں انھوں نے اس ملک کو فتح کرنا شروع کر دیا اور اس پر حکومت کرنے لگے۔ ان کے افعال سخت بیرحمی پر مبنی تھے۔ پرشیا کے بت پرستوں کو مذہب مسیحی میں داخل کرنے کی طرف انھوں نے بہت کم توجہ کی کیونکہ اصل منشا یہ تھا کہ پرشیا والوں کو قتل کر کے ان کی املاک پر قابض ہو جائیں۔ مدت دراز کی معرکہ آرائیوں کے بعد انھوں نے اوڈر اور وس چولا ندیوں کے پار ایک وسیع خطۂ ملک کو عالم مسیحی میں شامل کر دیا۔ اس وقت تو کسی کو خیال نہ آیا ہوگا۔ مگر مستقبل بعید پر نظر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی سرزمین ان دو مرکزوں میں سے ایک ہوگی جن سے ایک زبردست جرمن قوت وجود میں آئے گی جو بالآخر ملک جرمنی کو ایک حکومت کے زیر سایہ متحد کر دے گی۔ یعنی اس مقصد میں کامیاب ہوگی جس میں خاندانِ ہوہن سٹاؤفن کو سخت ہزیمت اور ناکامی ہوئی تھی۔

باب دوازدہم

برطانیۂ عظمیٰ

رومی فتوحات سے نارمن فتوحات تک

برطانیہ بھی ارتقا کے ان تمام مدارج سے گزر چکا تھا جو یورپ کے دوسرے ملکوں کی تاریخ میں نمایاں ہیں یعنی یہ ملک بھی سلطنت روما کا ایک جزو ہو چکا تھا اور اس کے تمدن اور زبان سے بھی متاثر ہو چکا تھا۔ اہل جرمنی اور ڈین مارک نے اس پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا، اس کی تمدنی زندگی کو کلیسائے کاتھولیکیہ نے اپنے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ اس کی سرزمین میں بھی نظام جاگیری نے نمو حاصل کیا تھا اور ایک زبردست شاہی حکومت کے اثر سے اس میں اندرونی اتحاد پیدا ہو گیا تھا جس سے اسے یورپ میں اہمیت حاصل ہو گئی۔ لیکن بعض امور میں برطانیہ کی حالت مغربی یورپ کے دوسرے ممالک سے مختلف ہے اور اس کی تاریخ میں بعض نمایاں خصوصیات ہیں جو گال یا ہسپانیہ یا اطالیہ میں موجود نہیں اس کے ادارات اور ارتقا پر سمندر کا اثر نہایت اہم ہے۔

(۱)

جولیس قیصر کے حملہ سے برطانیہ کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ قیصر نہ صرف تلوار کا دھنی تھا بلکہ زور قلم بھی رکھتا تھا اس کی تاریخ سے جو دو جلدوں میں ہے اہل برطانیہ کے حالات کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ جن لوگوں سے اسے سابقہ پڑا

ان میں زیادہ تر کیلٹ تھے جو قومیت اور زبان کے لحاظ سے اہل گال سے مشابہ تھے۔ جنھیں قیصر زیر کر چکا تھا۔ کیلٹ اور گالی دونوں ڈروائڈ پجاریوں کے زیر اثر تھے۔ کچھ تو دونوں قوموں کے اس تعلق کی وجہ سے اور کچھ قسمت آزمائی کے شوق میں قیصر برطانیہ پر حملہ آور ہوا۔ اس کی مہم کا منشا یہ تھا کہ اہل جزیرہ پر رومائی قوت کا اظہار کرے ان کے ملک کو فتح کرنا مقصود نہ تھا۔ ۵۴ ق۔م میں قیصر گال کو واپس چلا گیا اور برطانیہ نے اپنی سابقہ حالت پر عود کیا۔ ایک صدی کے بعد جب کہ رومائی شہنشاہی مستحکم ہو گئی تو کلاڈیس کے عہد میں اس جزیرہ پر تسلط قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اہل جزیرہ میں نہ تو باہمی اتحاد تھا اور نہ ان کا کوئی فوجی نظام جس سے وہ رومیوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتے۔ برٹنو نے بہادری سے مقابلہ کیا مگر تاب مقاومت نہ لا سکے۔ رومی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور ایک صدی تک شمالی حدود تک پہنچ گیا۔ جزیرۂ برطانیہ رومیوں کے زیر انتظام شمال میں کلائڈ ندی اور خلیج فورتھ تک ہو گیا۔ اسکاٹ لینڈ کے شمالی کوہستانی خطہ اور اس کے خونخوار باشندوں کو زیر کرنا بے سود خیال کیا گیا، اسی طرح آئرلینڈ بھی اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ صوبۂ برطانیہ کی حدود معین کرنے کے لئے رومیوں نے دو عظیم الشان فصیلیں شمالی سرحد پر شرق سے مغرب تک بنائیں، ان میں سے ایک فورتھ سے کلائڈ تک گئی ہے، اس کے خفیف آثار باقی ہیں۔ دوسری سال وے سے ٹائن تک ہے، اس کے کھنڈر اب بھی باقی ہیں اور اس کا شمار یورپ میں روما کے اہم ترین آثار میں ہے۔ اس فصیل کے جنوب میں جو ملک تھا اس میں گال اور ہسپانیہ کی طرح روما کا نظام صوبجاتی رائج تھا۔ رومی روایات میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس سے اسی عہد میں اہل برطانیہ کی تمدنی حالت معلوم ہو سکے روما کے بڑے مورخ ٹےسی ٹس نے اگری کولا کی سیرت کے ضمن میں فتوحات کا ایک واقعہ تفصیل سے لکھا ہے۔ رومی شہروں اور مکانوں کے آثار اکثر مقامات میں موجود ہیں جن سے ہم اس زمانے کے تمدنی حالات معلوم کر سکتے ہیں۔ شہنشاہی کے دوسرے صوبوں کی طرح برطانیہ میں بھی عرصہ تک امن و امان کا سلسلہ قائم تھا گو روما کی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے چند مرتبہ کوشش ہوئی جس میں ۶۱ء کی بوڈی شیا کی بغاوت شامل ہے۔ رومیوں کے ورود کے قبل برطانیہ کے مختلف قبیلوں میں جو آئے دن کے جھگڑے ہوا کرتے تھے ان کے مقابلہ میں یہ امن و امان لوگ

غنیمت خیال کرتے ہونگے۔ برطانیہ میں رومیوں نے بڑی بڑی سڑکیں بنائیں یہ سڑکیں اولاً فوجی اغراض کے لئے بنائی گئی ہوں گی مگر کچھ روز کے بعد تاجر اور مسافر بھی اس سے نفع اٹھانے لگے ہوں گے۔ شہری زندگی وجود میں آئی اور اس میں اصلاح ہوتی رہی۔ بعض شہروں کو رفتہ رفتہ پوری بلدی آزادی حاصل ہوگئی۔ رومی تجار، عہدہ دار اور ساہوکار ملک میں کافی تعداد میں آنے لگے، اور ان کے ساتھ عیسائی مشنری بھی۔ سِلِچیس ٹڑ کے رومی شہر کے کھنڈروں میں ایک مسیحی گرجا کے آثار بھی برآمد ہوئے ہیں لیکن اکثر و بیشتر اس زمانہ کے آثار قدیمہ سے رومی تسلط کا صرف فوجی پہلو نظر آتا ہے۔ یہ آثار زیادہ تر چھاؤنیوں اور مستحکم مقامات کے ہیں یا ان مکانات کے جو رومی افسروں نے اطالوی طرز پر بنائے تھے۔ رومی سپاہیوں کی قبروں کے پتھر پائے جاتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے دیوتاؤں کے قربان گاہ بھی ملتے ہیں۔ جو سپاہیوں نے بنائے تھے۔ یہ سپاہی دور دراز ممالک یہاں تک کہ شام سے بھی آتے تھے۔ روما کا طرز عمل یہ تھا کہ ایک مفتوحہ ملک کے سپاہی دوسرے مفتوحہ ملک کی حفاظت کے لئے بھیجدیئے جاتے مگر ان آثار سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ رومیوں اور دیسیوں کے تعلقات کس قسم کے تھے۔ نہ یہ کہ برطانیوں نے تمدن میں کس درجہ تک ترقی کی ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ گو وہ گالیوں اور ہسپانیوں کی طرح مہذب نہ تھے مگر روما کی زبان اور اس کا تمدن قبول کرنے لگے تھے۔

برطانیہ میں روما کا تسلط چار سو سال تک تھا۔ اس اثنا میں اس جزیرہ میں کوئی تحریک ایسی پیدا نہیں ہوئی جس سے رومیوں کی قوت میں فرق آتا اور فی الجملہ دیسی لوگ ان کی حکومت سے ناراض بھی نہ تھے۔ مگر بعض وجوہ سے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں تیسری اور چوتھی صدیوں میں روما کا زوال شروع ہو گیا۔ روما خود خطرے میں تھا اور اس کے لشکر دور دراز سرحدوں کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ سنہ ۴۱۰ء کے قریب جیسا کہ وی سی گاتھ قوم نے اپنے زبردست سردار الارک کے تحت میں روما پر حملہ کیا۔ رومی لشکر برطانیہ سے واپس بلا لئے گئے۔

اس جزیرے کی تاریخ ما بعد پر رومی تسلط کا اثر کس حد تک ہوا۔ اس کا تعین ذرا دشوار ہے۔ رومیوں کی بڑی سڑکیں باقی رہیں اور صدیوں بعد تک اہل جزیرہ

ان سے کام لیتے رہے۔ رومیوں کی بدولت نئے نئے درخت اور پھل برطانیہ میں آئے اوران کے بعد کے فاتحوں نے ان نعمتوں کی قدر کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زمانہٗ مابعد کے تمدنی اوارات رومی تمدن سے متاثر ہوئے ہوں۔ مگر نہ تو گال اور ہسپانیہ اور بعض دوسرے رومی صوبجات کی طرح برطانیہ نے رومی تمدن بالکلیہ قبول کیا اور نہ کیلٹی زبان میں لاطینی الفاظ کا اسقدر اضافہ ہوا کہ جتنا گال میں۔ عجب ہے کہ ایک لاطینی زبان رومانیا میں باقی ہے۔ جو شہنشاہیت روما کی آخری فتوحات سے تھا اور برطانیہ کی زبان پر لاطینی کا کوئی اثر نہ ہوا حالانکہ یہاں رومیوں کی حکومت چارسو سال تک تھی۔ لاطینی کا ہماری زبان پر بہت اثر ہوا ہے مگر یہ اثر کلیسا کے ذریعہ سے پیدا ہوا اور اس کے بعد نارمن فتوحات اور احیاء علوم سے۔ اس کے علاوہ لاطینی زبان کے رہے سہے اثر کو بھی زمانہ مابعد کے فاتحوں نے مٹا دیا۔

(۲)

رومی سلطنت پر اب تک گاتھ، جنوبی جرمن اور فرینک حملہ آور ہوئے تھے مگر رومی شمالی جرمنوں کے خطرناک خصایص سے واقف تھے۔ برطانیہ کے ساحل پر اُن سے سابقہ بھی پڑ چکا تھا۔ اور اُن کے دفع کرنے کے لئے "سیکسن ساحل کا سردار" بھی مقرر کیا گیا تھا۔ برطانیہ سے جیسا رومی چلے گئے تھے تو انھیں اور بھی موقع مل گیا۔ کیونکہ رومیوں نے اہل صوبہ سے ہتیار لے لئے تھے اور صوبہ کی حفاظت کا انتظام اپنے سر لے لیا تھا۔ اس لئے چار صدیوں کی محکومی کے بعد برطانی اپنے ملک کی حفاظت کرنے اور جرمن حملہ آوروں کو دفع کرنے سے مجبور رہے۔ جزیرہ کی دولت اور بے بسی سے حملہ آوروں کو اور بھی ترغیب ہوئی اور ایلب ندی اور ڈین مارک کے جنوب سے ان کے جوق کے جوق آنے شروع ہوئے سمندر کی راہ سے یہ مقامات دور تھے اور ان کی ذرا ذرا سی کشتیاں بھی زمانہٗ مابعد میں اس کام کے لئے موزوں نہ خیال کی جاتیں مگر ان قسمت آزما بہادروں کو اس کی مطلق پروا نہ تھی اور وہ تعداد کثیر میں آنے لگے۔ مسیحیت کا اب تک ان پر اثر نہ ہوا تھا، قوم گاتھ سے بھی یہ زیادہ خونخوار اور بے رحم تھے جو روما کی سرحدوں میں گھس گئی تھی۔ یہ لوگ فرینک کی طرح مہیب اور ہولناک تھے جو گال کے رومی تمدن کو خاک میں ملا کر اس کے کھنڈروں پر ایک نئے تمدن کی بنیاد قائم کر رہے تھے۔ سمندر اور اس کے خطرات کی

انھیں کچھ پروا نہ تھی اور چند روز کے بعد ان جنگجو لوگوں کے ساتھ ان کی عورتیں اور بچے بھی آنے لگے۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ کوئی فوجی یورش نہ تھی بلکہ ایک قومی ہجرت تھی۔

آیندہ چار صدیوں کو برطانی اور انگریزی تاریخ کا تاریک عہد کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں تاریخ افسانوں سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ اگر یہ معلوم ہو سکتا کہ سنہ ۴۵۰ء اور سنہ ۸۰۰ء کے درمیان انگلستان میں کیا ہو رہا تھا تو بہت سے مسائل حل ہو سکتے۔ مثلاً امور ذیل کا انکشاف دشوار ہے۔ رومی تمدن کس طرح ناپید ہوا؟ قدیم برطانیوں کا کیا حشر ہوا اور وہ کس طرح صفحۂ ہستی سے غائب ہوئے؟ حملہ آوروں کے قومی اوارات میں مقامی اوارات سے کیا تغیرات ہوئے؟ مذہب مسیحی کن اضلاع میں اور کس حد تک باقی رہا۔ ان سوالوں میں سے کسی کا جواب شافی نہیں دیا جا سکتا۔

برطانیوں کے پاس ہتیار نہ تھے مگر سخت جد و جہد کے بغیر انھوں نے اپنا ملک دشمنوں کے قبضہ میں نہ جانے دیا اور خود اہل اطالیہ اپنے گاتھی فاتحوں کے مقابلہ میں اس سختی سے نہ لڑے۔ جدید حملہ آوروں کو جزیرہ میں اپنا پورا تسلط قائم کرنے میں ڈیڑھ سو سال لگ گئے۔ شاہ آرتھر کے افسانوں میں غالباً یہ حقیقت مضمر ہے کہ کیلٹی باشندوں نے جو مسیحی تھے اور جرمنوں سے زیادہ متمدن تھے عرصہ تک اس کا مقابلہ کیا اور کبھی کبھی انھیں کامیابی بھی ہوتی تھی۔ حملہ آور تین قوموں سے تھے۔ جوٹ قوم نے کینٹ اور جزیرۂ وائٹ کے نواح میں حملہ کیا۔ سیکسن قوم نے جنوبی اور مشرقی انگلستان کے باقی ماندہ حصہ پر شمال میں ایسیکس تک قبضہ کر لیا۔ انگلستان کے وسط اور شمال میں خلیج فورتھ تک قوم انیگل یا انگریزوں نے اپنا تسلط قایم کیا۔ برطانی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے جاتے تھے دو قطعی لڑائیاں ہوئیں۔ سنہ ۵۷۷ء میں ڈیورہیم کی لڑائی ہوئی جس کے بعد حملہ آوروں نے سی وُرن ندی کی وادی پر قبضہ کر کے ڈے وان اور کارن وال کے برطانیوں کو اپنے ویلز کے ہم قوموں سے جدا کر دیا۔ اسی طرح سنہ ۶۱۳ء میں چیسٹر کی جنگ سے اہل ویلز والے اہل کمبریا علیحدہ ہو گئے۔ حملہ آور تعداد میں کم تھے اس لئے ان کی مسلسل فتوحات سے تعجب ہوتا ہے گو ایسی ہی کامیابی گاتھ اور فرینک قوموں کو بھی ہوئی تھی۔ اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ من حیث العزم جرمنوں کو برطانیوں پر کوئی خاص فوقیت حاصل تھی۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ چار صد سالہ رومی حکومت میں اہل برطانیہ فوجی تربیت سے محروم تھے۔

اور ضبط فوجی کے خوگر نہ رہے تھے۔ حملہ آوروں میں بھی۔ جنھیں ہم انگریز کہیں گے انحطاط کے وہی آثار پیدا ہو گئے جن کا ذکر ہم گاتھ فرینک اور وان ڈال قوموں کے ضمن میں کر چکے ہیں اسی وجہ سے اہل ڈین مارک نے انھیں آسانی سے زیر کر لیا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ فرینک اور گاتھ قوموں کی تاریخ میں مذہب اور کلیسا کو کسقدر دخل تھا، انگریزوں کی تاریخ میں بھی ان کا اثر کچھ کم نہیں۔ برطانیہ میں جب وہ آئے تو بت پرست تھے اور خانقاہوں کو لوٹنے اور گرجوں کو جلانے میں انھیں خاص لطف آتا تھا مگر اہل شمال کی بت پرستی مسیحیت کے آگے سر تسلیم خم کر رہی تھی۔ انگریزوں نے جن اضلاع پر قبضہ کیا وہاں کے مسیحی ادارات کو انھوں نے تباہ کر دیا گو کیلٹون میں مسیحی مذہب ویلز اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں اب بھی باقی تھا اور وہ اپنے فاتحوں کے ملک میں تبلیغ کی کوشش کرتے تھے ۵۹۷ء سے قبل بھی انگریزوں میں بعض افراد نے مسیحی مذہب قبول کر لیا تھا مگر اس سال روما سے ایک مشن آئی جس نے انگریزوں کو پر جوش مسیحی بنا دیا یہاں تک کہ وہ خود اپنے وطن یعنے جرمنی میں مسیحیت کی اشاعت کے درپے ہو گئے۔

اہل انگلستان میں مسیحیت کی ترویج پوپ گریگوری اعظم کے ساتھ منسوب کیجاتی ہے۔ روایت ہے کہ اس نے روما کے بازار میں بعض انگریز غلام بکتے ہوئے دیکھے اور ان کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس نے آگسٹائن راہب کو اس قوم کو کلیسائے مسیحی میں داخل کرنے کے لئے روانہ کیا۔ کیونکہ ان کے مسیحی ہونے سے مذہب مسیحی کی ترقی کی بہت کچھ امید ہو سکتی تھی۔ آگسٹائن کینٹ میں وارد ہوا اور اس کا پر جوش خیر مقدم ہوا کیونکہ کینٹ کے بادشاہ اے تھیل برٹ کی فرینک بیوی برتھا عیسائی تھی اور کین ٹربری میں اس کے ساتھ عیسائی پادری تھے۔ فرینک قوم کا بادشاہ کلووس بھی ایک عورت کے اثر سے عیسائی ہوا تھا، اے تھیل برٹ کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے مگر اس کے مسیحی ہونے کے دوسرے اسباب بھی تھے۔ آگسٹائن کو وعظ کہنے کی اجازت دی گئی اور بہت جلد اس نئے مذہب کے قدم جم گئے، یہاں تک کہ وہ ملک کے تمام حصوں میں پھیل گیا۔

ایڈون شاہ نارتھمبریا ۶۲۷ء میں مسیحی ہوا مگر اس ملک میں مذہب مسیحی کو ایک خاص دقت پیش آئی۔ اس نے جن لوگوں کو مسیحی بنایا تھا وہ کلیسائے روما کے پیرو تھے اور ہر جزو میں اس کی تعلیم کے پابند تھے۔ مگر کیلٹی مسیحی اور وہ انگریز جنھیں ان لوگوں نے مسیحی بنایا تھا

اس جدید تحریک سے بعض امور میں اختلاف رکھتے تھے۔ ایک ہی ملک میں دو کلیسائی نظاموں کے وجود سے مشکلیں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں مذہبی اختلاف سے تعصبات پیدا ہو جاتے تھے جن سے طولانی اور خونریز خانہ جنگی کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ قوم گاتھ کی تباہی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مذہب ایرین کے پیرو تھے۔ افریقہ میں عرصہ تک مذہبی اختلافات سے خونریزی جاری تھی جو ہمیں محض لغو اور لایعنی معلوم ہوتی ہے۔ کیلٹی اور انگریز مسیحیوں کے اختلافات بھی بالکل جزوی تھے۔ مثلاً تہوار ایسٹر کی تاریخوں میں اختلاف تھا، سر منڈانے کے طریقے مختلف تھے اور بعض رسوم مختلف طریقوں پر منائی جاتی تھیں۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہبی اختلافات دو قوموں کی باہمی مخالفت پر مبنی تھے۔ مگر آسوی شاہ نارتھمبریا نے اس خطرہ کو دفع کر دیا ۶۶۴ء میں بمقام وٹ بی اس نے دونوں رقیب کلیسائیوں کے پادریوں کو جمع کیا اور ان کے دعووں کو سنکر کلیسائے روما کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اسوقت سے انگلستان کے کلیسا میں اندرونی اتحاد پیدا ہو گیا جو اس کے سیاسی اتحاد کا باعث ہوا۔

وٹ بی میں پادریوں کا مجمع برطانیہ میں انگریزوں کے آنے کے ۱۵۰ سال بعد ہوا۔ اس عرصہ میں ملک میں مذہبی ترقی کے دوش بدوش سیاسی ترقی بھی ہوتی رہی۔ برطانیہ میں آنے کے کچھ عرصہ کے بعد ان کی سات سلطنتیں قائم ہو گئیں جن کے حکام بادشاہوں کے لقب سے موسوم تھے۔ یہ سلطنتیں حسب ذیل تھیں:- (۱) مشرقی اینگلیا (۲) ای سیکس (۳) کینٹ (۴) سسیکس (۵) نارتھمبریا (۶) مرسیا (۷) وی سیکس (مغربی سیکس) آخری تینوں سلطنتیں بمقابلہ پہلی چار کے خاص اہمیت رکھتی تھیں اور انگلستان کی تاریخ اس عہد میں گویا ان تینوں کی رقابتوں کا تذکرہ ہے یہاں تک کہ اہل ڈین مارک کے آنے سے جزیرہ میں ایک جدید اور خطرناک عنصر داخل ہو گیا۔ مرسیا انگلستان کے وسط میں تھا اور اس کی سرحد ویلز سے ملی ہوئی تھی۔ اس ملک کے بادشاہوں میں قابل ذکر پین ڈا ہے جو مسیحیت کی روز افزوں قوت کے مقابلہ میں عرصہ تک بت پرستی کی حمایت پر اڑا رہا۔ نارتھمبریا کے مسیحی بادشاہوں کے مقابلہ میں اسے دو عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئیں۔ مگر بالآخر شاہ آسوی نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔ نارتھمبریا میں کئی زبردست بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے جدید مذہب کی حمایت کی اور اس کی

ترقی سے نفع اٹھایا۔ جزیرۂ انگلستان کی تاریخ میں ہی ایک عہد تھا جس میں سیاسی اور علمی مرکز ثقل شمال کی طرف منتقل ہوا اور معلوم ہوتا تھا کہ شہر یارک اور اوز ندی کو اس کی تاریخ میں وہ دخل حاصل ہوگا جو مشیت نے لنڈن اور ٹیمز کے حصہ میں رکھا تھا۔ نارتھمبریا ہی کی فوجوں نے پین ڈاکو قتل کرکے بت پرستی کا خاتمہ کیا تھا، پہلا انگریزی شاعر کیڈمن ساکن وٹ بی تھا۔ جارو واقع ٹائن کا ایک راہب مسمی بیڈ سرخیل مورخان انگلستان کہا جاتا ہے، شارلی مین کو جب اپنی غیر مہذب فرینک قوم میں تعلیم کی اشاعت کا خیال ہوا تو ایک عالم مسمی ال کوئن اسے یارک ہی میں ملا جس کے ذریعہ سے اس کی آرزو پوری ہوئی۔ مگر عہد قدیم کی سلطنتوں میں وہ استواری نہ تھی جو زمانۂ حال کی حکومتوں میں ہے۔ نارتھمبریا کی قوت کچھ روز کے بعد زائل ہوگئی اور اس کی جگہ دی سیکس نے لی جس کے بادشاہ ایگ برٹ نے اہل مرسیا کو ۸۲۵ء میں شکست دی۔ ایگ برٹ سا بادشاہ انگلستان میں اب تک نہ ہوا تھا۔ شارلی مین سے وہ خوب واقف تھا۔ انگلستان کے جزوی سیاسی معاملات کو جس خوبی سے اس نے طے کیا اس میں شارلی مین کی سیاسی ذکاوت کی ایک جھلک معلوم ہوتی ہے ان معاملات کو ہم نے جزوی کہا ہے۔ مگر فی الحقیقت نہ تو یہ خود اور نہ ان کے نتائج جزوی تھے کیونکہ یہی سلطنت دی سیکس شہنشاہی برطانیہ کی بنا تھی اور ایگ برٹ کا تمام انگریزوں اور بعض ویلش کا سردار اعلیٰ ہوجانا ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔

(۳)

ایگ برٹ کے زمانے ہی میں انگلستان کی آیندہ ترقی کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ انگریز مہذب ہوچکے تھے اور تمدن کے لحاظ سے یورپ کی دوسری قوموں کے دوش بدوش تھے۔ یورپ کے دوسرے ممالک کی طرح کلیسا ان کی ہدایت کے لئے آمادہ تھا۔ دے سیکس کے بادشاہوں کے تحت میں قومی اتحاد میں بہت کچھ ترقی ہوچکی تھی۔ فی الحقیقت ایگ برٹ ایک چھوٹے پیمانہ پر وہی کام کر رہا تھا جو شارلی مین نے وسطی یورپ میں کیا۔ افسانوں میں بیان کیا گیا ہے کہ جب شارلی مین نے فرانس کے شمالی ساحل پر اہل شمال کے جہاز دیکھے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۸۳۹ء میں ایگ برٹ نے انتقال کیا مگر اس کی حیات ہی میں انگلستان کے سواحل پر ان حملہ آوروں کے تباہ کن حملے شروع ہوگئے تھے۔ یورپ میں اہل شمال کی کاروائیاں

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ جہاں نورد قوم کس طرح آئس لینڈ اور امریکہ تک پہنچی اور برطانیہ فرانس، سسلی اور اطالیہ میں غارت گری کرنے لگے۔ یہ ایک زبردست قوم تھی جنگ میں لوگ ان سے کانپ اٹھتے تھے، خطرات کی انھیں مطلق پروا نہ تھی اور وہ زمانہ آنے والا تھا کہ رزم و بزم دونوں میں انھیں برتری حاصل ہو۔ قرون وسطےٰ کے تمدن پر جس کی ابھی ابتدائی حالت تھی ان کے یکایک حملہ آور ہونے سے اس کی تباہی کا سخت اندیشہ تھا۔ شارلیمن کی قایم کردہ سلطنت کی تباہی کے زیادہ تر یہی باعث ہوئے اور انگلستان بھی اپنی قوت کو ان کے مقابلہ میں قایم نہ رکھ سکتا تھا۔ اسکاٹ لینڈ کے شمالی ساحل کا چکر کاٹ کر اہل شمال آئرلینڈ میں بلائے بے درماں کی طرح پہونچ گئے اور وہاں بے انتہا مظالم کئے انگلستان کا مشرقی ساحل ان کا خاص جولانگاہ تھا۔ نارتھمبریا اپنی کمزوری سے انکا شکار ہو گیا اور ایڈن برا سے ہمبر تک کے تمام شہروں اور خانقاہوں کو اہل ڈین مارک (ڈین) نے تباہ و برباد کر دیا۔

ویسیکس کا نظام سلطنت زیادہ استوار تھا اور اس نے ان کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مگر اس ملک کو بھی سخت نقصان پہونچا اور اندیشہ تھا کہ اس کا بھی وہی حشر ہو جو نارتھمبریا اور مرسیا کا ہوا تھا۔ مگر الفریڈ اعظم نے جس کے "اعظم" ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، نہ صرف ویسیکس کو بچا لیا بلکہ انگریزی تمدن کو بھی۔ قرون وسطےٰ کے فرمانرواؤں میں اس نیک کردار بادشاہ کو خاص فوقیت حاصل ہے۔ یہ سچ ہے کہ انگلستان بالآخر اہل ڈین مارک کے زیر حکومت ہو گیا۔ مگر الفریڈ کی خدمات سے یہ روز بد اس زمانہ تک ملتوی ہو گیا۔ جب کہ ڈین مسیحی ہو کر ایک حد تک متمدن ہو گئے تھے اور ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ الفریڈ نے جو کام کیا تھا اس کے معترف ہو کر اسے وسعت دیں۔ الفریڈ، ایگبرٹ کے جانشین اتھیل وُلف کا چوتھا بیٹا تھا۔ اس کے تین بھائیوں نے اس کے قبل یکے بعد دیگرے چند روز تک حکومت کی مگر کسی کو چین نہ ملا۔ الفریڈ ۸۷۱ء میں تخت نشین ہوا جب کہ اس کی عمر ۲۲ سال کی تھی اہل شمال کو اب تک کبھی شکست نہیں ہوئی تھی۔ مگر ان کو زیر کرنے کے لئے اس نے نئی نئی تدبیریں سوچیں اور بالآخر اسے خاصی کامیابی ہوئی ۸۷۸ء میں اپنے بھائی کے ساتھ ان سے سات مرتبہ لڑا اور بالآخر انھیں اپنی شرائط منوا کر واپس جانے پر مجبور کیا۔

الفریڈ نے اس وقفہ کو غنیمت سمجھکر دے سیکس کی فوجوں کی تنظیم از سرِ نو کی۔ اہل ڈینمارک نے ۸۷۸ء میں پھر حملہ کیا، پہلے تو انھیں ہر جگہ کامیابی ہوئی مگر بالآخر الفریڈ نے انھیں ایڈنگ ٹن کی بڑی جنگ میں شکست دی۔ انگلستان کی تاریخ میں یہ جنگ خاص اہمیت رکھتی ہے اور انگریزوں کے لئے اس کی اہمیت وہی ہے جو جرمنی کی تاریخ میں سیکسن قوم کے مقابلہ میں شارلیمین کی آخری اور قطعی فتح کو ہے۔ اہل ڈین مارک کے سردار گتھرن نے وی سیکس اور جنوبی مغربی انگلستان کا تخلیہ کر کے شمال و مشرق کی طرف واپس جانے پر آمادگی ظاہر کی جہاں اس کا قبضہ مرسیا اور نارتھمبریا پر باقی رہا۔ معاہدے کی ایک شرط یہ بھی تھی جو اس زمانے میں عجیب و غریب معلوم ہو گی کہ گتھرن مسیحی مذہب اختیار کرے۔ اس معاہدے (ویڈمور) کے بعد سے اہل ڈین مارک کی طرف سے جو زبردست خطرہ تھا وہ دفع ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ انگلستان کا نصف حصہ جو ڈین للا کے نام سے موسوم ہو گیا تھا اب بھی ڈین قوم کے قبضہ میں تھا جس کے ذریعہ سے اس قوم نے پھر حملہ کیا اور چونکہ الفریڈ مر چکا تھا، انھوں نے تمام ملک کو مسخر کیا۔ مگر عہد ثانی کے ڈین مسیحی ہو چکے تھے اور ایک حد تک تہذیب سے آشنا ہو گئے تھے اور ان سے انگریزی قوم کے تمدن و مذہب کو اس نقصان کا اندیشہ نہ تھا۔ جو الفریڈ کے زمانہ میں تھا۔

الفریڈ کی حیثیت صرف ایک کامیاب سپہ سالار کی نہ تھی وی سیکس کے فوجی اور بحری ذرایع کی اس نے جس خوبی سے تنظیم کی اس کی مثال سابق میں نہیں ہے اس کے بیڑے میں ڈین قوم کے جہازوں سے بہتر جہاز موجود تھے۔ دیسی رضاکاروں کی فوج کی بھی اس نے تنظیم کی تاکہ ہر وقت جنگ کے لئے تیار رہیں۔ ڈین قوم کی فتوحات کی اصل وجہ یہ تھی کہ انگریز ان کے مقابلہ کے لئے تیار نہ تھے مگر اب وی سیکس کی فوجیں جنگ میں پیش قدمی کر سکتی تھیں۔ مگر نسل ہائے مابعد کی تحسین و تشکر کے اسباب صرف یہی نہیں کہ اس کی بدولت انگریزوں کو فتوحات نصیب ہوئے اور ان میں مدافعت کی قوت پیدا ہو گئی۔ اس کے تفوق کا اصل سبب یہ ہے کہ اس عہد میں جب کہ علم کی کساد بازاری تھی اس نے تعلیم اور علم اور مذہب کی حقیقی قدر کی پادریوں کی تعلیم کا اس نے بہتر انتظام کیا، گرجوں کی مرمت کی اور نئے گرجے بنوائے نئے ملکوں کی

دریافت کرنے کے لئے اس نے مہمیں بھیجیں۔ اس کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انگریزی ادب کو فروغ دینے کے لئے لاطینی کتابوں کا اس نے انگریزی میں ترجمہ کرایا اور "وقائع انگلستان" کی بنا ڈالی جو آگے چلکر ہماری تاریخ کا سب سے معتبر ماخذ ثابت ہوگا۔ اس مختصر خاکہ میں بھی ہم ان امور کو فروگذاشت نہیں کرسکتے۔

الفریڈ نے ۸۹۹ء میں انتقال کیا اور اس کے ایک سو سال بعد تک اس کے جانشین اس کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ اس کے بیٹے ایڈورڈ نے مرسیا، شرقی انیگلیا اور نارتھم بریا کے ڈین مقبوضات پر حملے کئے اور ۹۲۴ء میں جب اس نے انتقال کیا تو انگریزوں کی تمام آبادی اس کے زیر حکومت تھی۔ اس کے بیٹے اے تھلیس ٹن نے برونان بروسن ٹھین اور ان کے اسکاٹ اور برطانی حلیفوں کو شکست دی اس کے بعد کے تین بادشاہوں نے ویسیکس کے خاندان شاہی کے اقتدار کی بنا پر انگلستان کے قومی اتحاد کو اور مستحکم کیا۔ اس خاندان کا عروج ایڈگر (۹۵۹ء-۹۷۵ء) پر ختم ہوا جس کا مشیر کار ڈنس ٹن، گلاسٹن بری کی خانقاہ کا صدر راہب تھا جو بعد میں کین ٹربری کا اسقف اعظم ہوا۔ کلیسا اور حکومت شاہی کا گہرا اتحاد جرمنی کے سیکسن خاندان کی استحکام کا باعث ہوا تھا۔ ایڈگر ہی کی حکومت کے زمانہ میں ۹۶۲ء میں خاندان سیکسن کا بادشاہ مقدس شہنشاہی روما کے منصب اعلیٰ پر پہونچا۔ یہی اتحاد فرانس کے شاہی خاندان کی قیام کا باعث ہوا۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ کیاپیٹ کے خاندان اور کلیسا کے گہرے تعلقات تھے۔ ڈنس ٹن اور ایڈگر کی باہمی معاونت میں بھی کلیسا اور حکومت کا یہی اتحاد جلوہ گر تھا۔ ڈنس ٹن کو انگلستان کی خانقاہوں کی اصلاح کا خاص خیال تھا اور وہ چاہتا تھا کہ سینٹ بی نی ڈکٹ کا طریقہ پھر جاری ہو سلطنت کے اتحاد اور ویسیکس کے شاہی خاندان کے مفاد کی ترقی کا بھی اسے خاص خیال تھا۔

ایڈگر نے ۹۷۵ء میں انتقال کیا اس سال انگلستان کی تاریخ کی ایک صدی ختم ہوتی ہے جو انگریزوں کے لئے مایۂ ناز ہے اور اگر اس کے بعد ذلت اور ہزیمتوں کا سلسلہ نہ شروع ہوتا تو اس کی اہمیت کے تسلیم کئے جانے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ ویسیکس کی حکومت شاہی کے زوال کے اسباب کا تعین دشوار ہے قرون وسطےٰ میں سلطنتوں میں استواری مطلق نہ تھی۔ جو کارنمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ چند روشن خیال افراد کے ہیں۔ عامۂ قوم کو حکومت میں کوئی دخل نہ تھا اور ان کے اقتدار کا زما

آنے والا تھا۔ ہر چیز کا دارومدار چند افراد پر تھا اور تمدن کو اس عدم استواری سے ضرر پہونچتا تھا جو اس زمانہ میں ہم شخصی سلطنتوں کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔

اے تھیل ریڈ" شاہ بدمشورہ" ۹۷۸ء میں اپنے باپ کا جانشیں ہوا اور ۳۸ سال تک حکومت کرتا رہا۔ انگریزوں کو جو ہزیمتیں اس زمانے میں ہوئیں ان کا باعث زیادہ تر اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس نے ان خصائل کا اظہار نہ کیا جو ویسیکس کے خاندان شاہی کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں لیکن یہ بھی واضح رہے کہ جس دشمن کا اسے مقابلہ کرنا پڑا وہ ان دشمنوں سے زیادہ خطرناک تھا جو انگلستان پر الفریڈ کی موت کے بعد حملہ آور ہوئے تھے۔ ڈین قوم نے پھر حملہ کیا اور یہ حملے نہ تو منفرد تھے اور نہ غیر متحد بلکہ منتظم و مرتب جتھوں کے حملے تھے بلکہ ایک پوری متحد قوم (ڈین مارک) نے حملہ کر دیا تھا۔ ڈین مارک اور ناروے کی دو زبردست سلطنتیں تھیں اور شاہ کیا نوٹ دونوں پر چند روز سے حکمراں تھا۔ یہ ان چند موقعوں میں سے تھا جیسا کہ خیال ہو سکتا تھا کہ اسکانڈی نے دیا کی قومیں یورپ کی سیاسیات میں فیصلہ کن حصہ لیں گی مگر اس قوم کا اتحاد عارضی تھا اور سے اہمیت صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی تھی جب اس کے افراد میں گہرا اتحاد ہو۔

جزیرۂ انگلستان پر تیسری مرتبہ اب پھر ایک بے رحمانہ حملہ ہوا۔ انگریزوں نے جو مصائب اہل برطانیہ پر برپا کئے تھے اور جو انھیں خود اہل ڈین مارک کے ہاتھوں سہنا پڑے تھے، ان کے اب وہ پھر شکار ہوئے جب کہ شاہ سیل ون اور اس کا بیٹا کیانوٹ حملہ آور ہوئے اہل ڈین مارک تمدن اور مذہب میں ابھی بہت پست تھے کیونکہ اکثر مقامات پر انھوں نے قتل عام کئے اور آل فی گی، اسقف اعظم کینٹربری کو انھوں نے قتل کر دیا مگر یہ کہنا لازمی ہے کہ اس سفاکی کی ایک خاص وجہ بھی تھی یعنی اسے تھیل ریڈ کے حکم سے انگلستان میں جتنے ڈین تھے سب قتل کر دئے گئے تھے۔

اے تھیل ریڈ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ایڈمنڈ رومین میں ڈیڑھ سال تک کیانوٹ کے ساتھ نہایت بہادری کے ساتھ لڑتا رہا اور یہ امید ہو گئی تھی کہ انگلستان سے پھر انگریزوں اور ڈین قوم کے درمیان تقسیم ہو جائے گا جیسا کہ الفریڈ کے زمانہ میں ہوا تھا مگر ایڈمنڈ مر گیا۔ اور ۱۰۱۶ء میں کیانوٹ انگریزوں کا بادشاہ ہو گیا اور تمام ملک نے بلا کسی مزید مقابلہ کے اس کی حکومت تسلیم کر لی کیونکہ ابھی تک جذبۂ قومی وجود میں

نہیں آیا تھا اور کیا نوٹ کی فوجی قوت کا سب کو علم تھا مگر اس نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ وہ ایک عقلمند اور رحم دل بادشاہ ہے۔

ناروے، ڈین مارک اور انگلستان کیا نوٹ کے زیر حکومت تھے شہنشاہان جرمنی کی سلطنت اس سے زیادہ وسیع تھی مگر ان کی بحری اور بری فوجیں اتنی زبردست نہ تھیں کیا نوٹ کو یہ آرزو تھی کہ اپنے خاندان کے لئے ایک عظیم الشان سلطنت قایم کرے سلطنت کی وسعت اور اس کی نگرانی کے لیے مسلسل دوروں کی ضرورت تھی جس کا اثر نظام سلطنت پر پڑا۔ اس نے نہ تو انگلستان کا نظام سیاسی درہم برہم کیا اور نہ اس کو ڈین مارک کا ماتحت کیا بلکہ اس کے بڑے صوبوں مثلاً نارتھمبریا، مشرقی انگلیا اور ویسیکس کو بڑے بڑے حکام کے تحت میں کر دیا جو ارل کہے جاتے تھے اور جو ان صوبوں میں بادشاہ کی نیابت کرتے تھے۔ سیاسی قوت کو اس طور پر تقسیم کر دینا ممکن ہے کہ اس وقت ضروری اور مناسب ہو مگر انگریزی قوم کے متحد ہونے میں یہ تقسیم حارج ہوئی۔ اور ولیم شاہ نارمنڈی نے جب انگلستان پر حملہ کیا تو اسی تقسیم کی وجہ سے انگلستان کی فوجیں غیر متحد رہیں۔

کیا نوٹ کے انتقال (۱۰۳۵ء) اور ہیسٹنگز کی جنگ (۱۰۶۶ء) کے درمیان جو وقفہ ہے اس پر ہم ایک محض سرسری نظر ڈالیں گے۔ ڈین مارک کی جدید قوت ویسیکس کی حکومت سے بھی زیادہ غیر مستحکم ثابت ہوئی۔ کیا نوٹ کے انتقال کے بعد خانہ جنگی شروع ہو گئی اور جو سلطنت کہ اس نے حصے بخرے کر دیے تھے اس سے سلطنت کی کسی کو پروا نہ تھی۔ البتہ سلطنت کے ان اجزا پر جن حکام (ارل) کو اس نے مسلط کر دیا تھا ان کا زبردست اثر پیدا ہو گیا تھا۔ ان میں سربرآوردہ ویسیکس کا ارل گاڈون تھا جس کے اثر سے ایتھیل ریڈ کا بیٹا ایڈورڈ کنفسر بادشاہ بنایا گیا۔ اس کی اولاد نہ تھی اور سیاست کے مقابلہ میں مذہب سے اسے زیادہ لگاؤ تھا۔ اس کی جانشینی کا مسئلہ اس کی حکومت کے ابتدا ہی سے زیر بحث تھا۔

جانشینی کے مدعی متعدد تھے اور ان کی کامیابی کے آثار قریب قریب برابر تھے ایڈمنڈ آئرن سائیڈ کی اولاد موجود تھی، ڈین مارک کا شاہی خاندان کیا نوٹ کی میراث کا مدعی تھا، گاڈون ویسیکس کا ارل اور اس کا بیٹا ہیرلڈ تخت و تاج کے امیدوار تھے۔ اور نسلاً خالص انگریز ہونے کی وجہ سے انھیں قوی امید تھی۔ مگر بحیرۂ انگریزی کے پار ایک

جدید قوت وجود میں آئی تھی جس کا ذکر باب سیزدہم میں آئے گا۔ یہ لوگ اسی نسل کے تھے جس سے ڈین تھے مگر نارمن کے نام سے موسوم تھے اور گو برائے نام شاہ فرانس کے ماتحت تھے۔ مگر درحقیقت آزاد تھے۔ ان کا بادشاہ ولیم تھا جو عنقریب فاتح کے لقب سے مشہور ہونے والا تھا وہ بھی انگلستان کے تخت کا مدعی تھا۔ ایڈورڈ کن فےسر کی ماں نارمن تھی اور ولیم کا دعوے تھا کہ ایڈورڈ نے اسے اپنا وارث بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک ضعیف روایت مشہور ہے کہ گاڈون کے بیٹے ایڈورڈ نے بھی تائید کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ولیم ایک جری اور کامیاب سپاہی تھا اور اس کی قوم اہل ڈین مارک کی طرح بہادر تھی اور اہل فرانس کے ساتھ رہنے سہنے سے تمدن اور سیاسیات میں بہت کچھ ترقی کر چکی تھی۔ اس لئے اس کے دل میں بھی آرزو تھی کہ جیسے کیانوٹ نے انگلستان کا تاج حاصل کر لیا تھا وہ بھی حاصل کرے۔

سنہ ۱۰۶۶ء میں ایڈورڈ کے مرتے ہی جنگ چھڑ گئی۔ گاڈون کا بیٹا ہیرلڈ بادشاہ منتخب کیا گیا اور اس کی رسم تاجپوشی عمل میں آئی مگر اسے معلوم تھا کہ تخت و تاج کیلئے اسے خوب لڑنا پڑیگا۔ اولاً ڈین مارک کا بادشاہ ہیرلڈ ہارڈراڈ نے یارک شائر پر یورش کی۔ شاہ ہیرلڈ نے انگریزی فوج کے ساتھ شمال کی طرف کوچ کیا اور یارک کے قریب اسٹیمفورڈ برج پر شاہ ڈین مارک کو شکست دی۔ مگر وہ شمال ہی میں تھا کہ سیکس میں ولیم شاہ نارمنڈی کے ورود کی خبر آئی اور بہ عجلت ممکنہ وہ جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۰۶۶ء کو ہیسٹنگز کی جنگ ہوئی جس میں ولیم کو فتح ہوئی اور "ولیم فاتح" کے لقب سے مشہور ہو کر وہ بہت جلد شاہ انگلستان ہو گیا۔

(۴)

ہم بیان کر چکے ہیں کہ رومیوں، انگریزوں اور ڈین اور نارمن قوموں نے کس طرح یکے بعد دیگرے برطانیہ فتح کیا۔ مگر سنہ ۱۰۶۶ء کے بعد یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں انگریز بیرونی حملوں سے محفوظ رہے۔ بہت کم ایسا ہوا کہ کسی غیر ملک کی فوج اس جزیرہ میں وارد ہوئی ہو اور اگر آئی بھی تو اس کا کوئی دیرپا یا اہم اثر باقی نہیں۔ فی الحقیقت یہ برکت نارمنوں کی فراست اور دیسی باشندوں کی صحیح نظام تمدن کی بدولت حاصل ہوئی۔

ولیم کو خوب معلوم تھا کہ اس کی قوت دو اسباب سے خطرے میں ہے۔ اولاً غیر ملکی حکومت انگریزوں کو شاق ہوگی اور وہ ہر طرح کوشش کریں گے کہ اسے اپنے ملک سے دفع کریں۔ ثانیاً اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ خود اس کے امرا اسے پریشان کرینگے کیونکہ وہ قسمت آزمائی اور اپنے حوصلوں کو پورا کرنے کے لئے آئے تھے اور مفتوحہ ملک میں بڑی بڑی جاگیروں کے دیئے جانے کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ولیم اپنے پادشاہ یعنی شاہ فرانس کے ساتھ وفاداری سے پیش نہ آیا تھا اور اسے خوب معلوم تھا کہ اس کے امرا کسقدر جلد بغاوت پر آمادہ ہوسکتے ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ انگریزوں کے بجائے اسے زیادہ تر زحمت اپنے امرا سے ہوئی۔ انگریزوں نے کئی مرتبہ سرزنش کی مگر ان کی بغاوتیں مقامی تھیں اور آسانی سے فرو کر دی گئیں۔ بہت جلد نئی حکومت میں اور ان میں مصالحت ہوگئی اور یہی مصالحت قرون وسطےٰ میں انگلستان کی قوت کی بنا ہے۔

اس پہلو کو بخوبی ذہن نشین کرنے کے لئے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انگلستان پر کئی مرتبہ بیرونی حملے ہوچکے تھے اور انگریزوں کی نظر میں ولیم کی حکومت کیا نوٹ اور ڈین خاندان کی حکومت کے سلسلہ میں تھی۔ جذبۂ قومی میں ابھی تک بہت کم ترقی ہوئی تھی۔ اگر نئی حکومت زبردست ہوتی، امن وامان قایم رکھتی اور ملک کے فلاح وبہبود میں ساعی ہوتی تو انگریزوں کو اپنے موجودہ حکام کا نارمن ہونا ہرگز شاق نہ ہوتا کیونکہ ان کے سابقہ حکام بھی غیر ملکی یعنی ڈین تھے شاہ ولیم نے اس امر کی احتیاط رکھی کہ ایسی کوئی بات نہو جو انگریزوں کو بے وجہ ناگوار گذرے۔ انگریزوں کے ساتھ اس کا سلوک قریب قریب وہی تھا جو کیا نوٹ کا تھا۔ جدید ادارات اس نے جاری کئے۔ قدیم ادارت میں ترمیم کی، امرا کی جائدادیں ضبط کرلیں۔ مگر عامۃ الناس کی زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ قومی فوج (فیرڈ) بحال رہی اور عدالتیں بھی حسب سابق قایم تھیں۔ اولاً ہر طرف نارمنوں کا بول بالا تھا۔ مگر ان کی تعداد اس قدر نہ تھی کہ قومی زندگی ان سے پورے طور سے متاثر ہوتی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ ان مغرور فاتحوں نے بہت جلد انگریزوں کی زبان اور تمدن قبول کرلیا۔ یہی انھوں نے فرانس میں کیا تھا اور کچھ روز کے بعد اطالیہ سسلی و آئرلینڈ کے باشندوں کے ساتھ بھی شیر وشکر ہوگئے۔

ولیم کو زیادہ تر دقتیں ان نارمن امراء سے پیش آئیں جو اس کے ہم رکاب آئے تھے۔ نارمن قوم کے فتوحات سے نظام جاگیری کے ادارات کو خاص ترقی ہوئی ہیں نظام کی طرف پہلے ہی سے رجحان موجود تھا۔ کیونکہ نظام جاگیری تمدن اور حکومت کا کوئی ایسا نظام نہ تھا جسے کوئی بیرونی قوت کسی قوم کو پابند کرتی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ زمین دولت کا واحد ذریعہ تھی اور مرکزی حکومت اس قدر قوت نہ رکھتی تھی کہ بڑے بڑے مالکان اراضی کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی اور تمدنی زندگی قدرتاً نظام جاگیری کے سانچے میں ڈھل جاتی تھی۔ نارمنوں کی فتح کے قبل بھی نظام جاگیری کے نشو و نما کے آثار ہویدا تھے، مثلاً سیادت قومی قبضۂ اراضی سے وابستہ ہونے لگی تھی، اراضیات فوجی خدمتوں پر مشروط تھیں اور ادنیٰ درجہ کے آزاد اشخاص کی آزادی سلب ہونے لگی تھی۔ مگر نارمن فتح کے بعد ان غیر واضح اور قدرتی رجحانات نے ایک مخصوص نظام کی شکل اختیار کر لی۔ انگریز زمینداروں میں سے اکثر کی زمینیں چھین لی گئیں اور نارمنوں کو منتقل کر دی گئیں جو نظام جاگیری کے اصول اور طریقوں سے بخوبی واقف تھے۔ اور یہ انقلاب آسانی سے عمل میں آسکا۔ بڑے بڑے امراء کو جو اب بیرن کے لقب سے مشہور ہوئے۔ بادشاہ نے خود اراضیات عطا کیں اور وہ گویا اس کے بڑے آسامی ہوئے امراء نے اپنی ان زمینوں کو جن کا وہ خود انتظام نہ کر سکتے تھے۔ دوسروں کو لگان پر دے دیا جو ان کے آسامی یا شکمیدار کہے جا سکتے ہیں اور جنھیں اصطلاحاً ویسل کہا جاتا تھا نظام تمدنی کے سب سے نیچے زینے پر مختلف حیثیتوں کے افراد تھے جن کی حالت غلامی کے قریب تھی۔ یورپ کے نظام جاگیری کے لحاظ سے ہر آسامی پر فرض تھا کہ فوجی خدمات میں اپنے زمیندار کا شریک ہو جنگ میں اس کے ساتھ جائے اور قانونی مقدمات کو بھی زمیندار کی عدالت میں پیش کرے جو نظام جاگیری میں اس کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر بیرن گویا ایک چھوٹا سا بادشاہ تھا اور اقتدارات کے لحاظ سے بادشاہ سے کچھ ہی کم تھا۔ اسی وجہ سے کسی ریاست میں جہاں نظام جاگیری پورے طور سے جاری ہو استوار حکومت قائم نہ ہو سکتی تھی اور طوائف الملوکی کی حالت پیدا ہوتی تھی

ولیم کا کمال یہ ہے کہ انگلستان میں اس نے ان خرابیوں کو پیدا ہونے نہ دیا اور اپنے امراء کے ہاتھ سے وہ دقتیں نہ اٹھائیں، جن میں اس نے خود شاہ فرانس

کو پھنسا رکھا تھا۔ یہ قابل رشک کامیابی اسے کن طریقوں سے حاصل ہوئی؟ اولاً اس نے انگریزوں کا نظام فوجی بحال رکھا۔ اور اسے ترقی دی اور ان کی علٰحدہ عدالتوں کو بھی برقرار رکھا۔ ثانیاً اراضیات مفتوحہ کی تقسیم میں بیشتر حصہ اس نے اپنے لئے محفوظ رکھا تاکہ امرا پر اس کی برتری قائم رہے۔ ثالثاً اس نے کسی نارمن امیر کو ملک کے ایک حصہ میں اراضیات عطا نہ کیں بلکہ ملک کے مختلف حصوں میں ہر ایک امیر کو زمینیں دی گئیں جس سے نہ تو وہ آسانی سے حملہ آور ہو سکتے تھے اور نہ بادشاہ کے مقابلہ میں اپنی حفاظت کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ کسی امیر کو ملک کے کسی خاص حصہ میں غلبہ حاصل نہ تھا اس لئے وہ اپنا رسوخ بھی قایم نہ رکھ سکتا تھا جس طرح کہ انگلستان میں پہلے زمانہ میں مرسیا یا مشرقی اینگلیا وغیرہ کے حکام کے لئے ممکن تھا۔ مگر جدید مفتوحات پر جب ویلش اور اسکاچ کی طرف سے حملہ کا اندیشہ ہوا تو ولیم نے سرحدی صوبجات قائم کئے جن میں بیرنوں کو وسیع فوجی اور عدالتی اختیارات حاصل تھے۔ مثلاً چیسٹر، ڈرہم وغیرہ۔

فاتح اعظم کی یہ عام انتظامی تدبیریں تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے دو اور انتظامات تھے جن سے بیرن اس کے قابو میں آ گئے۔ ۱۰۸۵ء میں انگلستان کے حالات کے متعلق تحقیقات عمل میں لائی گئیں۔ جن کے نتائج ڈومس ڈے بک میں مندرج ہیں۔ بقول کسی کے "یہ تحقیقات اس قدر مکمل تھیں کہ ایک گز زمین، ایک گائے یا بیل یا خنزیر ایسا نہ تھا جس کا اندراج اس کتاب میں نہ ہو"۔ یہ تحقیقات زیادہ تر محاصل کے وصول کرنے کے لئے عمل میں آئی تھی مگر اس سے حکومت کو بہت کچھ تقویت پہنچی۔ زمانہ حال میں بھی اعداد و شمار کے مہیا ہونے سے حکومتوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔

اس کے بعد سالس بری میں ۱۰۸۶ء میں ایک مجمع ہوا جس میں حلف دئے گئے یہ سرزمین یورپ کے نظام جاگیری کے اصول کے بالکل خلاف تھا۔ کیونکہ اس نظام کا اصل اصول یہ تھا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنے افسر اعلیٰ کے تحت میں ہر شخص سے لڑے۔ اگر کوئی بیرن بادشاہ سے برسر جنگ ہوتا تو بیرن کے اسامیوں کا مسلمہ فرض یہ تھا کہ وہ بادشاہ سے لڑیں اور بادشاہ بھی اس فرض کو تسلیم کرتے تھے۔ مگر انگلستان میں یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا۔ سالس بری میں انگلستان کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ کے

زمینداروں کو بادشاہ کی وفاداری کا حلف اٹھانا پڑا خواہ وہ اسامی ہوں یا اسامیوں کے اسامی یا شکمیدار ہوں۔ اس حلف کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کسی بیرن اور بادشاہ کے درمیان جنگ ہوتی تو اس کے اسامی بجائے اس کا ساتھ دینے کے بادشاہ کے جھنڈے کے نیچے لڑتے اور اگر اس حلف کی خلاف ورزی کرتے تو قانوناً باغی قرار دئے جاتے اور سزائے موت اور جائداد کی ضبطی کے مستوجب ہوتے۔

کلیسا سے بھی ولیم کو بہت مدد ملی جس کی قوت اس زمانہ میں کلونی کی تحریک اور ہل ڈی براںڈ کے طرز عمل سے ترقی پر تھی۔ ولیم نے تسخیر انگلستان میں پوپ کی تائید کی تھی اور فتح کے بعد رسوم طرز تعمیر اور انتظامی امور کے لحاظ سے انگلستان اور نارمنڈی کے کلیسا میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ بیک رافع نارمنڈی کی خانقاہ کا سردار لافرانک کینٹربری کا اسقف اعظم مقرر ہوا۔ کلیسا کی عدالتیں جداگانہ قائم ہوئیں اور عرصہ تک کلیسا انگلستان کے بادشاہوں کا موئید تھا۔

یورپ کے دوسرے ملکوں کے برخلاف انگلستان کا دستوری ارتقا مسلسل ہے ۱۰۶۶ء ہی میں اس ادارہ (پارلیمنٹ) کا آغاز نظر آتا ہے۔ جو آج دنیا کی نیابتی مجالس میں سب سے زیادہ معزز ہے۔ اور جس کے نمونہ پر دوسرے ملکوں میں ایسی مجالس قائم ہوئی ہیں۔ نارمن فتح کے قبل انگلستان میں وٹن ایجیمو مجلس عقلا قائم تھی جس کے مشورہ کے بغیر بادشاہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ایڈورڈ کن فے سر کی مجلس عقلا ولیم کے زمانہ میں "مجلس عظمیٰ" ہو گئی کیونکہ یہ بادشاہ پرانے طریقوں کو باقی رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس مجلس میں بادشاہ کے بڑے بڑے اسامی بلائے جاتے تھے۔ جن میں بڑے بڑے پادری بھی شامل تھے جن کو شاہی اراضیات عطا ہوئے تھے۔ اگر تمام اسامی اس میں شریک ہوتے تو یہ مجلس بہت بڑی اور بیکار ہو جاتی لیکن غریب اسامی اس مجلس میں شریک نہ ہو سکتے ہوں گے، اور سیاسی قوت کی اس زمانے میں قدر بھی نہ تھی اس کی مجلس عظمیٰ میں زیادہ تر دولتمند زمیندار اسقف اور راہب شریک تھے۔

باب سیزدہم

فرانس میں حکومت شاہی کا عروج

ہم شہنشاہی اور پاپائیت کی نزاع کو تفصیل سے بیان کر چکے ہیں تاکہ قرون وسطےٰ کی تاریخ کے اہم امور بخوبی ذہن نشین ہو جائیں۔ جب شہنشاہ اور پوپ دست و گریباں تھے اور انکی رقابت سے جرمنی اور اطالیہ کو گاہے نفع اور گاہے نقصان ہو رہا تھا، یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی اہم واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ انگلستان میں قومی اتحاد نسبتہً قبل عمل میں آچکا تھا اور یہ ملک بہ لحاظ قوت اور اثر مسلسل ترقی کر رہا تھا۔ ہسپانیہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں جو جنگ صدیوں سے چلی آرہی تھی، اب بھی جاری تھی مگر اب پلہ عیسائیوں کی طرف جھک رہا تھا فرانس کی قوت اور اس کی شاہی حکومت کی ترقی کی تاریخ یورپ میں خاص اہمیت ہے کیونکہ جب کون راڈ نو کے ساتھ شہنشاہی ختم ہو گئی اور پوپ نے اپنے مخالفوں پر قطعی فتح حاصل کر لی تو فرانس گویا یورپ کی زبردست ترین قوت کے لحاظ سے جرمنی کا جانشین بن گیا اور اس نزاع کو جاری رکھا جو پوپوں اور شہنشاہوں میں ایک مدت سے چلی آتی تھی۔ فرانس نے پاپائیت کو ایسا زخم کاری پہنچایا جس سے وہ پھر سنبھل نہ سکی اور اس طور پر فرانس نے پاپائیت سے فریڈرک ثانی اور فریڈرک باربروسا کا گویا انتقام لے لیا۔ اب ہم پھر تین سو سال قبل کے حالات پر نظر ڈالیں گے اور بیان کریں گے کہ اس زمانے میں رائن اور رون ندیوں کے مغرب اور خصوصاً سین ندی کے کناروں پر کیا حالت تھی۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جس ملک کو اب فرانس کہتے ہیں چارلس اعظم کے مقبوضات

کا ایک جزو تھا۔ ورڈن (۸۴۳ء) کے صلحنامہ کے مطابق جب اس کی سلطنت تین حصوں
میں منقسم ہوگئی اور رائن اور رون کے مغربی خطۂ ملک نے ایک مستقل سلطنت کی شکل اختیار
کرلی۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرانس کی سلطنت کا آغاز ۸۴۳ء سے ہے مگر ڈیڑھ سو سال
تک اس کی حالت ایک خواب پریشاں کی سی تھی کیونکہ اسے مسلمانوں اور اہل شمال کے
حملوں کے مصائب اٹھانا پڑتے تھے اور مرکزی حکومت میں حفاظت ملک کی صلاحیت
نہ تھی۔ نظام جاگیری بلا کسی روک ٹوک کے جڑ پکڑتا جاتا تھا۔ مرکزی حکومت کسی شمار میں نہ تھی
اگر اثر تھا تو بڑے بڑے زمینداروں کا جن کے اسامی ان کے مدد پر تھے۔ نارمنوں کے
حملوں سے اس تاریک عہد کی تاریخ کا کچھ سراغ لگتا ہے۔ ۸۸۵ء میں انھوں نے پیرس پر
حملہ کردیا اور اگر شہر کی حفاظت کا دارومدار بادشاہ کی گرم جوشی پر ہوتا تو انھیں ضرور کامیابی
ہوجاتی۔ لیکن جو بادشاہ سے نہ ہوسکا وہ ایک امیر نے کر دکھایا۔ اوڈو (یعنی پیرس کے
کاؤنٹ) نے دشمن کو بھگا دیا اور اس خدمت کے لئے چند روز کے بعد بادشاہ منتخب ہوگیا
۹۱۱ء میں سین ندی کے دونوں طرف کے زرخیز علاقے نارمنوں کے حوالہ کردیئے گئے
جن سے ان کے خطرناک حملوں کا سدباب ہوگیا۔ یہ ضلع نارمنڈی کے نام سے موسوم
ہوا اور اس کے ڈیوک اپنی سلطنت میں بالکل خودمختار تھے۔ مگر ایک حد تک شاہ فرانس
کی جاگیری فوقیت کو تسلیم کرتے تھے۔ مگر اس کے بعد پھر سالہا سال تک فرانس کی شاہی
حکومت کی حالت نہایت ابتر تھی اور خطاب "شاہی" محض برائے نام تھا کیونکہ شاہان
فرانس کے دوش بدوش فلانڈرز، شانپائن، نارمنڈی، برگنڈی، اے کوئی ٹین اور
تولوز کے حکام تھے جن کی قوت بادشاہ سے کم نہ تھی اور کوئی صورت بظاہر ایسی نظر نہ آتی تھی
کہ بادشاہ ان کو زیر کرلیں گے۔

۹۸۷ء میں ایک اہم واقعہ ہوا جس کے نتائج دوررس تھے یعنی اس سال ہیوکاپیٹ کا
بادشاہ مقرر ہوا۔ اس واقعے کے قبل وہ پیرس اور اس کے نواح کے اضلاع کا حکمراں تھا۔ اس
کے قبضے میں جو جاگیر تھی رقبہ میں دوسروں سے بڑی نہ تھی مگر مقبوضات کے یکجا
ہونے سے اس کی قوت بڑھی ہوئی تھی۔ اس زمانے سے لیکر جمہوریت کے قیام تک فرانس
میں جتنے بادشاہ گذرے ہیں سب اسی رئیس کی اولاد میں سے تھے مگر اس وقت کسی کے
دل میں یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ اس واقعے کی ایک اور

اہمیت بھی ہے یعنے ہیوکاپیٹ اور کلیسا کے درمیان گہرا اتحاد تھا۔ اور جس زمانے میں کہ کلیسا اور شہنشاہی کے درمیان خونریز جنگ ہورہی تھی اس وقت بھی کلیسانے ہر طرح سے شاہانِ فرانس کی تائید کی تھی اس کے علاوہ ہیوکاپیٹ خود ایک زبردست اور ذی اثر جاگیردار تھا۔ اس کی قوت جو کچھ تھی اس وجہ سے تھی نہ کہ خالی خولی خطاب شاہی کے سبب سے۔ لیکن اس نے اور اس کے جانشینوں نے اس جاگیری قوت کو تاج شاہی کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اور اقتدار شاہی رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ تمام جاگیردار محکوم کر لئے گئے بادشاہوں کو ملک میں پورا اقتدار حاصل ہوگیا اور تمام ملک میں نہ تو کوئی ان کا رقیب تھا اور نہ کوئی ان کا مزاحم ہوسکتا تھا۔ فرانس کی سیاسی تاریخ کا یہ ایک عظیم الشان واقعہ ہے اور اس کے متعلق مزید تفصیل کی ضرورت ہے۔ ہیوکاپیٹ جب بادشاہ منتخب ہوا تو اس کے قبضے میں سوم اور لوار ندیوں کا درمیانی علاقہ تھا جس میں دو بڑے شہر یعنے پیرس اور آرلینس واقع ہیں۔ ان علاقوں پر جو Demesne (املاک شاہی کہے جاتے ہیں اس کی براہِ راست حکومت تھی۔ علاقہ جات شاہی کے علاوہ بڑے بڑے امرا کے علاقے تھے جن پر وہ مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرتے تھے بادشاہ کے ساتھ ان کی وفاداری برائے نام تھی اور اس کی خدمت بھی وہ شاذونادر بجالاتے تھے مگر آئندہ تین صدیوں میں شاہانِ فرانس نے مختلف طریقوں سے شاہی علاقوں کو وسعت دی اور امرا کی جاگیروں پر دست درازی کرتے رہے یہاں تک کہ فی الحقیقت کوئی جاگیردار باقی نہ رہا۔ فرانس کے تمام باشندے پورے طور سے بادشاہ کی رعیت میں داخل ہوگئے۔ امرا کی دولت اور ان کے سابقہ مقبوضات اب بھی باقی تھے۔ مگر اب انھوں نے اقتدار شاہی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ یہ صورت تین صدیوں کے بعد پیدا ہوئی اور ہم نے اسے اس موقع پر اس لئے بیان کیا ہے کہ وہ واقعات آسانی سے سمجھ میں آجائیں جن سے یہ صورت پیدا ہوئی۔

پہلا بادشاہ جس کے عہدِ حکومت میں بادشاہی کی ترقی کے آثار نمایاں ہیں فلپ اول (۱۰۶۰ء تا ۱۱۰۸ء) ہے۔ اس کے عہدِ حکومت کے دو واقعات سے بادشاہی کی ترقی میں بالواسطہ مدد ملی۔ اولاً ۱۰۶۶ء میں نارمنڈی کے ڈیوک ولیم نے جو فرانس کے جاگیرداروں میں سب سے بڑا اور بادشاہ کا حریف تھا۔ انگلستان پر حملہ کیا اور اسے

فتح کر لیا۔ اس فتح سے ولیم کی اہمیت بہت بڑھ گئی مگر اس کے ساتھ ہی اس کی قوت کا مرکز
فرانس سے انگلستان کو منتقل ہو گیا اور گو کچھ روز کے لئے وہ فرانس کا خطرناک ہمسایہ
ہو گیا مگر رفتہ رفتہ اس کے فرانسیسی مقبوضات شاہی علاقوں میں ختم ہو گئے۔ ثانیاً سنہ ۱۰۹۵ء
میں بمقام کلیرمون پہلی جنگ صلیبی کا اعلان ہوا اور ایک بہت بڑی فوج مختلف راہوں
سے عازم بیت المقدس ہوئی۔ پہلی جنگ صلیبی میں اہل فرانس نہایت گرمجوشی سے
شریک ہوئے۔ شاہ فرانس کو اس سے بہت نفع ہوا کیونکہ اس کے بہت سے زبردست
اور متمرد جاگیردار بیت المقدس چلے گئے اور ان میں سے اکثر وہیں پیوند خاک ہو گئے
بادشاہ کو ان کی غیبت سے اپنی قوت مستحکم کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے جانشین
کے حالات نظر انداز کر کے ہم لوئی ہفتم (سنہ ۱۱۳۷ء تا ۱۱۸۰ء) کا ذکر کریں گے۔ بظاہر
اس کی حکومت نے فرانس کی حالت میں کوئی ترقی نہیں کی اور نہ اس سے کوئی کارنمایاں
ہی صادر ہوا۔ یہ بادشاہ بلا سوچے سمجھے دوسری جنگ صلیبی میں شریک ہو گیا۔ جس میں ہزیمت
و نقصان کے سوا کوئی نفع نہ ہوا۔ خود فرانس میں بھی اسے نقصان برداشت کرنا پڑا۔
اس کے باپ نے اس کی شادی اے کوی ٹین کی رئیسہ الیانور سے کر دی تھی۔ اے کوی ٹین
جنوبی فرانس کی جاگیری قوتوں میں سب سے زیادہ زبردست تھی اور امید تھی کہ اس
شادی سے علاقہ جات شاہی میں ایک مستقل اضافہ ہو جائے گا۔ مگر بادشاہ اور ملکہ میں
جھگڑا ہو گیا اور بادشاہ نے ملکہ کو اس بنا پر طلاق دیدی کہ وہ "حدود ممنوعہ" میں اس سے
قرابت رکھتی تھی۔ اس کی اس حماقت سے ای کوی ٹین کا علاقہ فی الوقت اس کے قبضے
سے نکل گیا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ طلاق مل جانے کے بعد ہی الیانور انگلستان کے نامور
بادشاہ ہنری دوم کے عقد نکاح میں آ گئی جس کا قبضہ فرانس میں پہلے ہی سے نارمنڈی اور
آنجو پر تھا۔ اے کوی ٹین پر قابض ہو جانے سے اس کے جملہ مقبوضات وسعت اور
قوت کے لحاظ سے ان علاقوں سے بڑھ گئے جو براہ راست شاہ فرانس کے تحت میں
تھے، گو یہ تمام علاقے فرانس کی سلطنت میں شامل تھے اور ان علاقوں پر بطور جاگیردار
متصرف ہونے کے باعث ہنری پر فرض تھا کہ شاہ فرانس کے اقتدار کو کم از کم برائے نام
تسلیم کرے۔ گو فرانس کی شاہی قوت نے لوئی ہفتم کے عہد میں بظاہر کوئی ترقی نہیں
کی مگر وہ قوتیں در پردہ اپنا کام کر رہی تھیں جن سے فرانس کی بادشاہی کو آئندہ چلکر

قطعی فتح حاصل ہونے والی تھی۔ یہ امور جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے حسب ذیل ہیں:۔
حکومت کے کل پرزوں کی نگہداشت بمقابلۂ سابق بہتر طریقوں پر ہونے لگی۔ اقتدار کا مرکز دربار شاہی ہوگیا جس میں صرف بڑے بڑے امراء شامل نہ تھے بلکہ پادری اور وکیل بھی تھے جو بادشاہ کے خاص خادم تھے۔ ان کے علاوہ علاقہ جات شاہی میں بہت سے نئے شہر آباد ہو رہے تھے جن میں صرف تاجر آباد تھے بلکہ کاشت کار جن کی حالت غلاموں کی سی تھی اور جو اپنے آقاؤں کے مظالم سے عاجز آکر شہروں میں آباد ہو رہے تھے۔ ان دونوں رجحانوں میں زمانۂ مابعد میں مزید ترقی ہوئی۔ لوئی ہفتم کے عہد سلطنت میں بادشاہی اور کلیسا اور طبقۂ متوسطہ کے درمیان گہرا اتحاد پیدا ہو چکا تھا اور انھیں دونوں جماعتوں کی تائید سے بالآخر بادشاہی کو فتح حاصل ہوئی۔

فلپ دوم جو فلپ آگسٹس کے نام سے مشہور ہے ۱۱۸۰ء میں لوئی ہفتم کا جانشین ہوا۔ قرون وسطےٰ کے بادشاہوں میں فرانس اس بادشاہ کا بالخصوص مرہون منت ہے کیونکہ متعدد لڑائیوں میں فتح حاصل کر کے شاہی علاقوں میں اس نے کثیر اضافہ کیا۔ ہنری دوم شاہ انگلستان نے فرانس میں جو وسیع علاقے حاصل کئے تھے۔ اب وہ اس کے نااہل بیٹے جان کے زیر حکومت تھے۔ فلپ نے جان کو شکست دی اور نارمنڈی کو فتح کر لیا۔ ۱۲۱۴ء میں جان شہنشاہ آٹو چہارم کا حلیف ہو گیا تو فلپ آگسٹس نے پوپ کی تائید حاصل کی اور اپنے دشمنوں کو بووین کی فیصلہ کن جنگ میں شکست دی۔ یورپ کی تاریخ میں اس جنگ سے زیادہ اہم بہت کم لڑائیاں ہیں کیونکہ اسی کی بدولت فریڈرک دوم کو تاج شاہانہ ملا جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں، انگلستان کو منشور اعظم حاصل ہوا اور شاہان فرانس کو انگلستان کے شاہی خاندان کے وہ مقبوضات دوا ہاتھ لگ گئے جو نارمنڈی اور آنجو میں تھے۔ لیکن فلپ دوم نے اس کے علاوہ اور بھی فتوحات حاصل کئے جو اس سے کچھ ہی کم اہمیت نہ رکھتے تھے۔ شمال اور مشرق و مغرب اور وسط میں فتوحات اور میراث کے ذریعہ سے وسیع علاقے بادشاہ کے قبضے میں آگئے۔ چند سال قبل شاہ فرانس بیشمار جاگیردار رئیسوں میں سے ایک جاگیردار تھا۔ اور جاگیرداروں میں قوی شمار نہ کیا جاتا تھا۔ مگر اب اس کے مقبوضات اسقدر وسیع ہو گئے تھے کہ تمام حریف جاگیرداروں سے کامیابی کے ساتھ لڑ سکتا تھا۔

علاقہ جات شاہی کی وسعت کے ساتھ نظام مملکت میں بھی نہایت احتیاط کے ساتھ اصلاحیں عمل میں آرہی تھیں کلیسا سے جو اتحاد تھا وہ برقرار رکھا گیا گو کبھی کبھی دونوں میں چھیڑ چھاڑ ہو جایا کرتی تھی۔ طبقۂ متوسط کے ساتھ جو اتحاد تھا اور بھی مضبوط ہو گیا شہروں کو جتنے منشور فلپ آگسٹس نے دیئے اُتنے کسی بادشاہ نے نہ دیئے ہوں گے۔ تجارتی اشتراک کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اور شہروں کو اس نے ایک حد تک حکومت خود اختیاری سے سرفراز کر دیا تھا۔ پیرس فرانس کے شہروں میں سب سے بڑا تھا۔ فلپ کے طرزِ عمل سے اس کی وسعت، دولت اور اہمیت میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ اس کے علاوہ فلپ نے فرانس کی شاہی حکومت کے لئے وہ ہتھیار مہیا کر دیئے جو اس کے آئندہ فتوحات کا ذریعہ بن گئے۔ یعنی باضابطہ حکام، روپیہ اور ایک باقاعدہ فوج۔ باضابطہ حکام بالکلیہ بادشاہ کے دست نگر تھے، اس سے قبل بھی اسی قسم کے حکام تھے۔ مگر ان کے اقتدارات اور فرائض اب معیّن ہو گئے۔ امرا شاہی ملازمت سے رفتہ رفتہ خارج ہونے لگے اور عہدہ داران عظام کا انتخاب طبقۂ متوسط سے ہونے لگا۔ نئے عہدہ دار جو بیلی کے نام سے موسوم تھے شاہی علاقوں میں بطور نائبانِ شاہی بھیجے گئے تاکہ حریفوں کے مقابلے میں شاہی اقتدار کو قائم رکھیں۔ پادشاہ نے اپنا خزانہ بھی بھر لیا۔ اس کی کئی صورتیں تھیں۔ علاقہ جات شاہی میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا جس کا ذکر آ گیا ہے، بہت سے جاگیری خدمات کا نقد معاوضہ مقرر کر دیا گیا۔ یہودیوں کی سرپرستی کی گئی جس کا انھیں شکرانہ ادا کرنا پڑتا تھا پادریوں سے بھی روپیہ وصول کرنے کے ذرائع پیدا کئے گئے۔ فلپ کی فوج معمولی جاگیری فوج نہ تھی، بلکہ وہ خود سپاہیوں کو بھرتی کرتا اور ان کی تنخواہیں ادا کرتا تھا۔ یہ فوجیں ان فوجوں سے زیادہ قابلِ اعتماد تھیں جو جاگیردار مہیا کیا کرتے تھے۔ ایک فرانسیسی مصنف نے الفاظ ذیل میں اس کی کامیاب حکومت کے واقعات کا خلاصہ کیا ہے۔ "علاقہ جات شاہی کے حدود سلطنت کی سرحدوں تک پہنچ گئے۔ اقتدار شاہی بھی ان سرحدوں تک قائم تھا۔ نظام جاگیری، انگلستان اور شہنشاہی کی متحد قوتوں کے مقابلے میں اسے فتح حاصل ہوئی۔ خاندان شاہی کی بنیاد مستحکم ہو گئی اور فی الحقیقت سلطنت فرانس کا آغاز ہو گیا"

فلپ کے بعد اس کا بیٹا لوئی ہشتم تین سال تک حکمراں رہا۔ ۱۲۲۶ء میں اس کا پوتا لوئی نہم تخت نشین ہوا۔ اور ۱۲۷۰ء تک حکومت کرتا رہا۔ لوئی نہم عموماً سینٹ لوئی

کے لقب سے مشہور ہے جس کا وہ مستحق تھا۔ قرون وسطیٰ کے کیتھولک مذہب کا وہ بہترین نمونہ تھا۔ فی الحقیقت اس کی حالت سینٹ فرانسس کی سی تھی گو لوئی یورپ کی سب سے زبردست سلطنت کا بادشاہ تھا اور سینٹ فرانسس نے فقر کی راہ اختیار کی تھی۔ ان دونوں ممتاز ہستیوں میں مذہب کا اثر نہایت گہرا تھا۔ اور اس کا ہر فعل بلا کسی چون و چرا کے اس کی تعلیم پر مبنی تھا۔ سینٹ لوئی دن کا بڑا حصہ کلیسا کی خدمت میں صرف کیا کرتا تھا لباس فاخرہ اور عیش و عشرت سے نفرت تھی اور ادنیٰ سے ادنیٰ کام خود کرتا تھا۔ بشرطیکہ کلیسا کا حکم ہو۔ فقیروں اور مریضوں کے پاؤں اپنے ہاتھ سے دھویا کرتا۔ جن کے جسم پر پھوڑے پھنسیاں ہوتی تھیں ان سے بھی ذرا الجھن نہ آتی تھی۔ اس شغف مذہبی کے ساتھ ہی حسن اخلاق، خوش دلی اور انسانیت کا مادہ بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اگر اس میں کوئی عیب تھا تو یہ کہ مذہبی تعصب سے اس نے غیر مذہب والوں پر ظلم کئے مگر یہ عیب کلیسا کا تھا۔ فی الحقیقت اس کی حالت قرون وسطیٰ کے دوسرے ممتاز افراد سے اس بارے میں بہتر تھی اور اس کا حسنِ اخلاق اس کے حسنِ اعتقاد کی بہترین دلیل ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ تقدس اور شفقت مذہبی کی وجہ سے وہ اپنے شاہانہ فرائض سے بے خبر نہ تھا۔ ہر شخص کے ساتھ وہ انصاف سے پیش آتا۔ اور کلیسا کے بہترین مفاد کا اسے خاص لحاظ رہتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ مصر تھا کہ ہر شخص بادشاہ کی پوری فرماں برداری کرے اور اس کے حقوق کا پورا پاس رکھے، یہاں تک کہ وہ اس امر کا بھی روادار نہ تھا کہ کلیسا کسی طرح اس کے حقوق میں دست اندازی کرے اس نے یہ بات فرانس کے جاگیردار امرا کے ذہن نشین کر دی تھی کہ وہ ان کے حقوق میں کسی طرح بھی دست اندازی کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن ۱۲۴۳ء میں فلانڈرس، برٹنی، برگنڈی گیاس کنی اور لانگی ڈوک کے امرا نے اس کی حکومت کو تہ و بالا کرنے کی غرض سے بغاوت کر دی۔ سینٹ لوئی نے نہایت استقلال اور ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور سینٹ کی جنگ میں انکا قلع قمع کر دیا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ اس جنگ سے فرانس میں نظام جاگیری کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ اس کے بعد کسی امیر کو یہ ہمت نہ ہو سکتی تھی کہ حکومت شاہی کے ساتھ مساوات کا مدعی ہو۔ امرا کے ساتھ مناقشات کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر نہ تو ان کی بنیاد قدیم نظام جاگیری پر تھی اور نہ انھیں کبھی کوئی قطعی کامیابی ہی

حاصل ہوئی پاپائیت کے ساتھ جو معاملات ہوئے ان میں بھی اس نے آزادی سے کام لیا اور اس کے مقابلے میں حقوق شاہی سے ایک شمہ بھی دست کش ہونے سے انکار کرتا رہا اگر اس پر کوئی الزام لگایا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس نے فرانس میں ان کوئی زیشن کے نام سے ایک مذہبی عدالت انسدادِ الحاد کے واسطے قائم کی تھی۔ کیونکہ پاپائیت کی طرح اسے بھی فکر تھی کہ الحاد کی بیخکنی کی جائے نہ صرف اہل فرانس کے تمدن اور خیالات پر ہی اس کا بُرا اثر پڑا بلکہ اس سے حکومت شاہی کے نظام اور قوانین بھی بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکے۔ یورپ میں سینٹ لوئی کی قوت مسلم تھی اور اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ انگلستان میں امراء کی جنگ میں دونوں مخالف جماعتوں نے اسی کو حَکَم بنایا اور اس کے فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کی وجہ سے دیرپا صلح نہ ہو سکی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کے عہد حکومت کے اواخر میں اس کا بھائی چارلس رئیس آنجو، سسلی اور نیپلز کا بادشاہ ہو گیا تھا اور گو اس حیثیت سے وہ شاہ فرانس کا ماتحت نہ تھا مگر اس کی کامیابی سے فرانس کی حکومت شاہی کی سطوت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اس کے مشاغل کے ایک شعبہ کا ذکر کسی اگلے باب میں آئے گا۔ وہ جنگہائے صلیبی کے آخری حقیقی شیدائیوں میں سے تھا۔ دو صلیبی لڑائیوں میں وہ شریک ہوا پہلی جنگ کے موقع پر وہ مصر میں لنگر انداز ہوا، جہاں اولاً اسے کچھ کامیابی ہوئی مگر بالآخر سخت ہزیمت اٹھانا پڑی دوسری مرتبہ اس نے بلا سوچے سمجھے تونس پر یورش کر دی اور وہاں پہنچکر اپنی فوج کی ایک جماعت کثیر کے ساتھ طاعون کا شکار ہو گیا۔

سینٹ لوئی کے عہد حکومت میں دستور مملکت کی ترقی پر بھی غور کرنا چاہیئے کیونکہ اسی نے وہ آلۂ حکومت تیار کیا جس سے اس کے پوتے فلپ چہارم نے مطلق العنان شاہی حکومت قایم کی اور اس پاپائیت کو ذلیل کیا جس کی سینٹ لوئی کی نگاہوں میں خاص عظمت تھی یہ بھی واضح رہے کہ بادشاہ کی عدالت کو خاص اہمیت حاصل تھی اور اس کا اقتدار سب سے زیادہ تھا۔ فرانس میں جو آزاد ادارات تھے ان کی وقعت بہت کم تھی اور ان کو وہ ترقی نصیب نہ ہوئی جس سے بالآخر انگلستان میں دستوری حکومت قائم ہوئی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عدالت شاہی نے امراء کو یا تو ملک سے خارج کر دیا تھا یا ان کو اپنا ماتحت بنا لیا تھا۔ دربار میں اب زیادہ تر اہل قلم اور وکلاء تھے۔

سینٹ لوئی کے عہد حکومت میں خاص خاص معاملات کے تصفیے کے لئے یہ عدالت نئی نئی صورتیں اختیار کر رہی تھی۔ مجلس شاہی کے قیام کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں جس سے معاملات خارجیہ اور سلطنت کی عام پالیسی کا تعلق تھا۔ اسی طرح "ایوان حساب" بھی وجود میں آیا جو حسابی معاملات کو طے کرتا تھا اور جس میں شاہی عدالت کے وہ ارکان شریک تھے جنھیں امور مالیہ میں خاص دخل تھا۔ پارلیمنٹ کا قیام بھی اسی بادشاہ کے زمانے میں عمل میں آیا۔ یہ بھی عدالت شاہی کی ایک شاخ تھی اور اس میں عدالت مذکور کے وہ ارکان شامل تھے جنھیں عدالتی معاملات میں مہارت تھی۔ پارلیمنٹ کے کئی ایوان تھے مگر اس کی تشکیل پر یہاں تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ اس کی حیثیت عدالت العالیہ کی سی تھی اور اس کے فرائض میں قانون سازی داخل نہ تھی۔ جیسا کہ انگلستان کے پارلیمنٹ میں ہے۔ اس کا اصل کام یہ تھا کہ علاقہ جات شاہی کے مرافعات کی سماعت کرے اور اہم ترین فریضہ یہ تھا کہ جاگیردار امراء کے مقابلے میں شاہی حقوق کی نگہداشت کرے اور بادشاہ کے مفاد کو پیش نظر رکھکر امراء کے مراعات میں دست اندازی کرے بادشاہ کی طرف سے یہ دعویٰ تھا کہ بہت سے مقدمات جن کا تصفیہ امرا کی جاگیری عدالتوں میں ہوتا تھا۔ فی الحقیقت شاہی عدالتوں سے ان کا تصفیہ ہونا چاہئے تھا۔ ان مقدمات کو شاہی مقدمات قرار دیکر امرا کی عدالتوں سے انھیں اٹھالیا جاتا اور پارلیمنٹ میں پیش کیئے جاتے تھے۔ ابتدائی زمانے کی تاریخ میں عدالتی نظام حکومت کی ترقی میں بہت کچھ ممد تھا۔ انگلستان میں بھی ہنری اول اور ہنری دوم نے شاہی حقوق کی بقا کے لئے دورہ کرنے والے ججوں کا تقرر کیا تھا۔ فرانس میں یہ کام پارلیمنٹ کے سپرد تھا۔ جن قوتوں کی وجہ سے نظام جاگیری نابود ہوا اور حکومت شاہی کو تفوق حاصل ہوا اور اس کا کوئی حریف نہ رہا' ان میں پارلیمنٹ کا رتبہ نہایت اعلےٰ ہے۔

سینٹ لوئی کے عہد حکومت میں بہت سے واقعات یکے بعد دیگرے تکمیل کو پہنچے جن سے حکومت شاہی کے قبضے میں ایک وسیع اور زرخیز سرزمین آگئی۔ اس کے سمجھنے کے لئے ہمیں کچھ دیر کے لئے پھر زمانہ ماقبل پر نظر ڈالنا پڑے گی۔ چنانچہ اب ہم ایک واقعہ کو بیان کریں گے جو تیرھویں صدی کی تاریخ میں نہایت دلچسپ ہے۔

یورپ کے ملکوں میں جنوبی فرانس نہایت دولتمند اور متمدن تھا۔

تروبادور (Troubadour) شاعروں اور ان کی شاعری کا یہی مسکن تھا۔ اس کے شہر دولت سے مالامال تھے۔ چھوٹے بڑے امرا کے قلعے تہذیب، تعیش اور بعض اوقات عیاشی کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ اس صوبے میں تیرھویں صدی کے آغاز میں عجیب و غریب مذہبی تحریکیں کوہ آلپ کے مغربی جانب پروونس کے ضلع میں وجود میں آ رہی تھیں۔ مشرق میں وال ڈین سی فرقہ تھا جس کی خواہش تھی کہ قدیم مسیحیت کی طرف عود کرے۔ اور کیتھولک کلیسا کے ظاہری کروفر، رسوم اور بعض عقائد پر انھیں اعتراض تھا مغرب کی طرف لانگی ڈوک کے ضلع میں شہر تولوز کے آس پاس وہ عقائد رائج ہو گئے تھے جو آل بی جین سی کے نام سے مشہور رہیں۔ مگر اس نام سے مختلف قسم کے عقائد مشہور ہو گئے تھے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ جدید خیالات مختلف ذرائع سے مشرق کی طرف سے آئے تھے اور ملحدوں میں سے اکثر خدائے واحد کے بجائے نیکی اور بدی کے دو حریف اور مساوی الاقتدار قوتوں کو مانتے تھے۔ ان عقیدوں سے عملی زندگی کے لئے خاص نتائج نکالے جاتے تھے بعض کا خیال تھا کہ تزکیۂ نفس نہایت ضروری ہے اور بعض انھیں عقائد کی رو سے ہر قسم کی بد اطواری کو روا رکھتے تھے۔ لانگی ڈوک کا رئیس اعظم تولوز کا کاؤنٹ ریمون تھا جو بڑی شان و شوکت سے زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے ذاتی عقائد غیر معین تھے۔ کچھ روز کے بعد اس نے ظاہر کیا کہ میں کلیسا کا تولیکی کا راسخ الاعتقاد پیرو ہوں۔ مگر ملحدوں کو اس کے دربار میں خاص رسوخ حاصل تھا۔

سنہ ۱۲۰۸ء میں یہ معاملہ اس وقت نہایت نازک ہو گیا جب کہ پوپ کا ایک مخبر پی ٹرڈی کاس ٹل ناؤ قتل کر دیا گیا۔ پوپ انوسینٹ سوم نے لانگی ڈوک کے ملحدوں کے خلاف جنگ صلیبی کا وعظ کہا اور اعلان کر دیا کہ جو شخص ان ملحدوں سے لڑے گا اُسے بیت المقدس کی زیارت کا ثواب ہوگا۔ اس جنگ کا سرغنہ سائمن ڈی مونٹ فرٹ تھا جس کے بیٹے نے انگلستان کے دستوری ادارات کے قیام میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس کی زیر ہدایت اس جنگ نے نہایت وحشیانہ صورت اختیار کر لی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ متعدد شہر تباہ کر دیئے گئے اور مطلق لحاظ نہ کیا گیا کہ ان کا کوئی قصور ہے یا نہیں۔ یا مظلوموں میں عورتیں بچے یا بوڑھے بھی شامل ہیں۔ جنگ صلیبی کے خونخوار سپاہی قتل عام سے قبل روح القدس کی مدح میں مذہبی گیت گایا کرتے تھے۔ تولوز کا کاؤنٹ

ان فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکا جو ٹڈی دل کی طرح اس کے علاقوں میں گھسی چلی آرہی تھیں گو اس کے ہمسایہ شاہ اراگان نے اس کی مدد کی۔ تاہم مدد بے سود ثابت ہوئی۔ اور ۱۲۱۳ء میں میورے کی جنگ کے بعد کامیابی کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔

یہ جنگ صلیبی تولوز کے کاؤنٹ کے خلاف ہوئی جو نظام جاگیری میں شاہ فرانس کی رعایا میں سے تھا۔ مگر شاہ فرانس نے اس جنگ میں مطلق مداخلت نہ کی۔ جنگ کا اصل محرک پوپ انوسینٹ ثالث تھا۔ شاہ فرانس کی تعریف کرنا چاہیئے کہ اس نے مظالم اور قتل عام پر سخت اعتراض کیا گو اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ لیکن اولاً جنگ میں شریک نہ ہونے کے باوجود اصل نفع اسی کو ملا کیونکہ اس کی قوت اسقدر بڑھ گئی تھی کہ جب سرزمین فرانس کے کسی جاگیردار کی قوت ٹوٹ جاتی تو اس کی جاگیر حصے بخرے ہو کر علاقہ جات شاہی کے حلقے میں داخل ہو جاتی تھی۔ تولوز کے علاقہ رفتہ رفتہ حسب ذیل طریقہ پر املاک شاہی میں شامل ہو گئے۔ سائی من ڈی مونٹ فورٹ نے تولوز کے کاؤنٹ کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور ان میں شمالی امراء کا دخل کرا دیا تھا جو اس کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ اس نے ۱۲۱۸ء میں انتقال کیا اور اہل ملک نے ان امراء کے مظالم سے تنگ آکر جنھیں وہ غیر ملکی خیال کرتے تھے، سابقہ کاؤنٹ کے بیٹے کی طرف سے بغاوت کر دی جس سے اس جنگ کا دوسرا دور شروع ہوا۔ سائی من کے بیٹے اماری نے یہ دیکھکر کہ میں اس علاقے کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتا۔ اسے لوئی ہشتم شاہ فرانس کے سپرد کر دیا جو ۱۲۲۳ء میں فلپ آگسٹس کا جانشین ہوا۔ اب جنگ سے صرف یہ مقصد تھا کہ یہ وسیع علاقہ شاہ فرانس کے قبضے میں آجائے۔ لوئی ہشتم اختتام جنگ سے قبل ہی مر گیا۔ مگر ۱۲۲۹ء میں بلانش ملکہ کاسٹیل نے اپنے بیٹے لوئی نہم کی طرف سے مُو کا صلحنامہ مرتب کرایا۔ اس معاہدے کی رو سے رون ندی کے مغرب کے بعض زرخیز علاقے فوراً بادشاہ کے قبضے میں آگئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ تولوز کے کاؤنٹ کی اکلوتی بیٹی اور وارثہ کا عقد شاہ فرانس کے بھائی سے ہو۔ ۱۲۷۱ء میں اس شاہزادے کا بھی انتقال ہو گیا اور اس نے کوئی وارث نہ چھوڑا جس سے یہ پورا زرخیز علاقہ قبضہ شاہی میں آگیا۔ جس کی وسعت اب بحر جرمنی سے بحر روم تک تھی۔

بابِ چہاردہم

قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کے مصائب

ہم بیان کر چکے ہیں کہ مقدس رومی شہنشاہی کے مقابلے میں پاپائیت کو فتح ہوئی تھی، اور ہنری چہارم فریڈرک بار بروسا اور فریڈرک دوم کو یکے بعد دیگرے اس کے ہاتھوں ذلت و خواری نصیب ہوئی تھی، فریڈرک دوم کی اولاد کو بھی ہزیمت ہوئی۔ اس کا خاندان نیست و نابود ہو گیا اور نیپلز اور سسلی کے زرخیز علاقے فرمان پاپائی سے ایک فرانسیسی شہزادے کے زیر فرماں ہو گئے۔ مگر اس انتہائی کامیابی کے بعد پاپائیت اور فرانس کے شاہی خاندان میں ان بن ہو گئی۔ حالانکہ مدت تک ایک دوسرے کے کام آنے سے دونوں میں رابطۂ اتحاد تھا۔ اس جد و جہد میں پاپائیت کو ایسی سخت اور خلاف توقع شکست ہوئی کہ پھر سنبھل ہی نہ سکی۔

اس جد و جہد میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ پاپائیت کو کوئی ایسا حلیف نہ ملا جس سے خاطر خواہ مدد مل سکتی۔ جرمنی کی حالت اندرونی نزاعوں سے نہایت ابتر تھی اور اس سے کسی متحدانہ کارروائی کی امید نہ ہو سکتی تھی اور اگر ہوتی بھی تو پوپ ایسے دشمن کی مدد کرنے پر اس کے آمادہ ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ فرانس کے شاہی خاندان سے بھی تائید کی توقع نہ ہو سکتی تھی جس کو پوپ نے سسلی اور جنوبی اطالیہ کے ممالک عطا کئے تھے کیونکہ اہل سسلی فرانسیسیوں کے مظالم سے تنگ آ کر بغاوت پر کمربستہ ہو گئے اور ان کی

ایک جماعت کثیر کو تہ تیغ کر کے جزیرۂ سسلی کی حکومت اراگان کے خاندان میں منتقل کر دی (۱۲۸۲ء)۔ اطالیہ کے شہروں نے زمانۂ سابق میں پوپ کی بہت خدمت کی تھی مگر اب انھیں شہنشاہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا، اس لئے انھوں نے بھی پوپ کی اعانت سے پہلو تہی کی۔ علاوہ ازیں چودھویں صدی کے آغاز میں نہ تو پہلا سا مذہبی جوش باقی تھا اور نہ پوپوں کے ساتھ وہ حسنِ اعتقاد۔ نہ تو فقرا کی کوئی جدید جماعت وجود میں آئی تھی اور نہ رہبانیت کی کوئی نئی تحریک۔ پرانی خانقاہوں میں جمود کے آثار نمایاں تھے فرانسسکی اور ڈومی نیکی فقرا کی جماعتیں باہمی نزاعوں سے مضمحل ہو چکی تھیں اور ان کا مطمحِ نظر بھی پست ہو گیا تھا۔ ذاتی انتقام اور جلب منفعت کے لیئے پوپوں نے اپنے "روحانی ہتھیاروں سے اسقدر کام لیا تھا کہ ان کی دھاریں کند ہو گئی تھیں اور وہ بیکار ہو گئے تھے۔ ان ہتھیاروں سے مراد ہے صلیبی لڑائیاں اور کلیسہ سے اخراج۔ اور مذہبی رسوم میں معتوبوں کو ممنوع الشرکت قرار دینا۔

تیرھویں صدی کے اواخر میں بانی فیس ہشتم تخت پاپائی پر ۱۲۹۴ء میں متمکن ہوا جو گریگوری ہفتم اور انوسینٹ کی طرح پاپائیت کے تفوق اور اقتدار کا پرجوش حامی تھا۔ پوپ منتخب ہونے سے قبل وہ فرانس کا دوست خیال کیا جاتا تھا مگر انتخاب کے بعد ہی سابقہ تعلقات کو نظر انداز کر کے وہ کیتھولک کلیسا یعنی خود اپنے مفاد کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اسے زعم تھا کہ پاپائیت کو تمام بادشاہوں پر برتری حاصل ہے اور اس کا قول تھا کہ "خدا نے ہمیں تمام بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سرتاج بنایا، تاکہ ہم اس کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ کے پھینک دیں، تباہ کر دیں، نیست و نابود کر دیں منتشر کر دیں یا اگر چاہیں تخم ریزی کریں اور نئی عمارت بنائیں" یہ اس نے ۱۳۰۰ء میں کہا تھا اور اس کے بعد اس نے ایک فرمان جاری کیا جس میں دعوے کیا گیا کہ پیغمبر کے اس قول کا کہ "آج میں نے تجھے قوموں اور حکومتوں کا سرتاج بنایا ہے" پاپائیت ہی پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر دنیاوی حکومت سے کوئی غلطی ہو جائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کر سکتی ہے۔ لیکن اگر روحانی حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اس کا انصاف کرنے والا خدا ہے۔ سنہ ۱۳۰۰ء میں اس نے نہایت کروفر سے روما میں جوبلی کی رسم منائی جس میں ہزارہا آدمی شریک ہوئے

اور ان کے جوش و خروش سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سر پھر گیا۔ اس نے دعوے کیا کہ میری دو تلواریں ہیں ایک روحانی اور ایک دنیاوی۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ باری باری وہ شہنشاہی اور پاپائی دونوں لباسوں میں لوگوں کے روبرو نمودار ہوا جس شخص کے خیالات ایسے ہوں اس کا یورپ کی دنیاوی حکومتوں سے دست و گریباں ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں۔ خصوصاً فرانس سے نزاعات کا پیدا ہونا تو ناگزیر تھا جو شہنشاہوں کی ہزیمت و تذلیل کے بعد اس وقت یورپ کی سلطنتوں میں سب سے زیادہ سر بر آوردہ تھا۔

۱۲۸۵ء میں فلپ چہارم فرانس کا بادشاہ ہوا۔ اپنے طرز عمل کے لحاظ سے وہ بے رحم، بے اصول مگر صاحب جبروت و قوت تھا۔ خصوصاً پوپ پر اس نے ایسے وحشیانہ پن سے حملہ کیا کہ کلیسا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مگر فی الحقیقت ہم اس بادشاہ کے خصائل سے بہت کم واقف ہیں۔ اس کے افعال کے محرک اس کے وزیر اعظم تھے جن میں قابل ذکر پیئر فلوت اور نوگارے ہیں یہ دونوں طبقۂ متوسط سے تھے اور جاگیری امرا سے بلحاظ نسل یا مفاد کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ یہ دونوں قوانین روما کے بڑے ماہر تھے جس کا اس زمانے میں رواج ہو گیا تھا اور جس کا ایک خاص اصول یہ تھا کہ بادشاہ اپنے تمام رقیبوں سے برتر ہے۔ فرانس میں فلپ چہارم کی حکومت انگلستان میں ہنری ہشتم کی حکومت سے مشابہت رکھتی ہے اور فلوت اور نوگارے ٹیوڈر بادشاہوں کے کارپردازوں یعنی ایمپسن، ڈڈلے اور ٹامس کرام ویل کے مماثل ہیں۔ رومی قانون کو اس کے عہد حکومت میں ایک زبردست قوت حاصل تھی۔ روپیہ کی بھی اسے سخت ضرورت تھی۔ کیونکہ نظام حکومت کو بہت کچھ ترقی ہوئی تھی۔ اور اخراجات بڑھ گئے تھے۔ اسی وجہ سے محاصل میں بھی زیادتی ہوئی۔ بادشاہ نے پریشان ہو کر بے ایمانی اور دغا بازی سے کام لیا اور سکوں کا وزن گھٹا دیا (یعنے سونے اور چاندی کے سکوں میں جسقدر وزن ہونا چاہیے تھا اسے کم کر دیا۔)

فرانس میں اب صرف تین نیم آزاد جاگیریں باقی رہ گئی تھیں یعنی برٹنی گوین اور فلاندرس۔ فلاندرس کا علاقہ اپنے مصنوعات کی وجہ سے نہایت دولتمند تھا اس کے شہروں کی صنعتی اور سیاسی ترقی قابل رشک تھی۔ ان شہروں کو اپنے اندرونی

معاملات میں قریب قریب پوری آزادی حاصل تھی اور فنون لطیفہ میں بھی انھیں شہرت حاصل ہو رہی تھی۔ اسی وجہ سے شاہ فرانس ان سے خار کھاتا تھا۔ فلاندرس اور نیدرلینڈ کی شمالی یورپ میں وہی حیثیت تھی جو جنوبی یورپ میں اطالیہ کے بلدیات کی تھی۔ اور شاہانِ فرانس کی بروژ اور گان یا گینٹ (Ghent) اسی قدر مخالفت کرنے والے تھے جتنی میلان اور بریس چیانے شہنشاہ فریڈرک اول کی کی تھی۔ شاہ فرانس کو روپیہ کی ضرورت تھی، اسی وجہ سے اس سے اور فلاندرس کے کاؤنٹ سے جھگڑا ہو گیا۔ ۱۳۰۰ء میں کاؤنٹ نے شاہی فوجوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور فلاندرس علاقہ جات شاہی میں ضم ہو گیا۔ مگر فلاندرس کے شہریوں نے جب دیکھا کہ ان کی بلدی آزادی اور سرگرمی میں اقتدار شاہی کی وجہ سے کمی پیدا ہو رہی ہے تو انھوں نے کاؤنٹ کی مدد کے بغیر بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی کیونکہ وہ کسی کی فرماں برداری کے عادی نہ تھے۔ شاہی فوج نے فلاندرس کی طرف اس امید میں کوچ کیا کہ باغی شہریوں کو بہت جلد ان کی حماقت کا مزا چکھا دے گی۔ فلاندرس کی فوج کورتیرے کے قریب صف بستہ تھی۔ فرانس کے جواں مردوں (Knights) نے بلا سوچے سمجھے اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔ فلاندرس کے شہریوں نے ایک نہر کے پیچھے اپنی صفیں نہایت احتیاط سے جمائیں تھیں۔ اس کے بعد دونوں فوجوں کا بے ترتیبی سے مقابلہ ہوا۔ اور فرانس کے شہسواروں کو شکست فاحش حاصل ہوئی۔ مقتولوں میں پیئر فلوت بھی تھا فلاندرس سے فرانسیسی اسوقت تو دست کش ہو گئے مگر چند روز کے بعد ایک نئی فوج مجتمع ہوئی اور فلاندرس پر پھر حملہ ہوا۔ مونز آن پویل کی جنگ میں فرانس کی فوج کی عزت پر جو دھبہ آ گیا تھا وہ ایک حد تک مٹ گیا۔ لیکن فلاندرس کے لوگوں میں اب بھی تاب مقاومت باقی تھی اس لئے بادشاہ نے مصالحت پر آمادگی ظاہر کی اور فلاندرس کا بیشتر حصہ اپنے کاؤنٹ کی برائے نام حکومت میں آزاد رہا اور جنوب کی طرف کا ایک ذرا سا خطۂ ملک فرانس کے قبضہ میں آ گیا۔

فلاندرس کی جنگ کے دوران میں شاہ فرانس اور پوپ کے درمیان ایک اہم نزاع پیدا ہو گئی تھی۔ اس نزاع کا آغاز ۱۲۹۹ء سے ہوتا ہے جب کہ بادشاہ نے فرانس کے پادریوں پر محاصل عاید کرنے کی کوشش کی جس کے جواب میں پوپ نے ایک

فرمان جاری کر دیا کہ پادری کسی دنیاوی حکمران کو کسی قسم کے محاصل نہ دیں۔ بادشاہ یا وزیروں نے اس کے جواب میں فرانس سے اطالیہ کی جانب روپیہ کی برآمد ممنوع کر دی۔ پوپ کو فرانس کے کلیسا سے ایک رقم کثیر وصول ہوا کرتی تھی اس لئے اس نے شاہ فرانس سے صلح کر لی اور اپنے احکام واپس لے لیئے۔

مگر یہ نزاع دفع ہونے والی نہ تھی کیونکہ جہاں بانی فیس ہشتم ایسے اولوالعزم پوپ اور فلپ چہارم ایسے قوی اور بے اصول بادشاہ موجود ہوں، وہاں بھلا یہ ممکن ہے کہ چھیڑ چھاڑ نہ ہو۔ چنانچہ اس فتنۂ نزاع نے برناڈ اسقف پامیر کی وجہ سے پھر سر اٹھایا تولوز کے الحاق سے جنوبی فرانس میں کلیسا کا جو انتظام کیا گیا اس سے اس اسقف کو اختلاف تھا اور تولوز کے نیئے اسقف سے بھی ذاتی مخالفت رکھتا تھا۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے فلپ کے قتل کرنے کی سازش کی تھی اور گرفتار کر کے اس پر مقدمہ دائر کیا گیا۔ یہ کارروائیاں زیادہ تر بادشاہ کے وزیر اعظم کی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی عادت تھی کہ اگر وہ کسی شخص کو تباہ کرنا چاہتا تو اس پر نہایت چالاکی اور بے ایمانی سے بدترین الزامات عائد کرتا تھا تاکہ تمام قوم اس سے بدظن ہو جائے۔ اس تدبیر سے وہ ہمیشہ کام لیا کرتا تھا۔ صرف اسقف برنارڈ ہی کے خلاف اس نے یہ کارروائی نہیں کی بلکہ اس کے بعد خود پوپ اور جماعت ٹیمپ لرز کی تخریب کے لئے بھی وہ یہی چال چلا اس وجہ سے حقیقت اور دروغ گوئی میں امتیاز کرنا دشوار ہے اور جو الزامات اس اسقف پر لگائے گئے ان کی صحت میں شک کرنا نامناسب نہیں۔

پوپ کہتا تھا کہ برنارڈ پر مقدمہ روما میں چلایا جائے کیونکہ سلطنت کی عدالتوں کو پادریوں کے مقدمات کی سماعت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یاد رہے کہ یہ قانونی مسئلہ وہی ہے جس سے انگلستان میں ہنری دوم کے زمانے میں اس موقع پر سخت ابتری پیدا ہو گئی تھی جب کہ ٹامس بیکیٹ نے دعوےٰ کیا تھا کہ سلطنت کی معمولی عدالتیں پادریوں کے مقدمات کی سماعت نہیں کر سکتیں۔ پوپ نے بہت سخت فرمان جاری کئے جس کے جواب بادشاہ اور اس کے کارپردازوں نے اور بھی سخت دیئے یہاں تک کہ پوپ نے ۱۳۰۲ء میں ایک فرمان جاری کر کے اعلان کیا کہ "ہر شخص کی نجات کے لئے ضروری ہے کہ روما کے اسقف (پوپ) کا تابع ہو پاپائیت سے فرانس کی

موجودہ کشمکش اس جنگ سے مشابہ تھی جو ہنری چہارم اور پوپ گری گوری ہفتم کے درمیان ہوئی تھی۔ البتہ فرق یہ تھا کہ جنگ اب دوسرے قسم کے اسلحہ سے ہو رہی تھی اور اس کا نتیجہ کچھ اور ہی ہونیوالا تھا۔ جانبین میں غیظ و غضب بھی مقابلۃً زیادہ تھا۔ نوگارے کو ایک عجیب و غریب تدبیر سوجھی یعنے روما اور اس کے قرب و جوار میں پوپ کے جو دشمن تھے ان سے اس نے سازو باز کرکے یہ قصد کیا کہ پوپ پر حملہ کرکے اسے گرفتار کرلے اور اسے بطور ملزم مجلس عام میں پیش کرے جس کا انعقاد شاہ فرانس کے حکم سے ہو تاکہ پوپ دنیاوی حکمرانوں پر اپنے تفوق کے خیال کے دعوے سے دستکش ہونے پر مجبور ہو جائے اس تدبیر کے سرانجام کے لئے سنہ ۱۳۰۳ئہ میں نوگارے روما کے خاندان کولونا کے ملازموں میں داخل ہوگیا۔ پوپ اس وقت اپنے قلعہ میں تھا جو روما سے چند میل کے فاصلے پر اناگنی میں واقع تھا۔ نوگارے اور کولونا مسلح سپاہیوں کو ساتھ لیکر قلعۂ مذکور میں گھس گئے اور پوپ کے دربار میں جبراً داخل ہوگئے۔ ایک معاصر اطالوی وقایع نگار اس منظر کو الفاظ ذیل میں بیان کرتا ہے۔ "پوپ بانی فیس نے شور و شغب سنکا اور یہ دیکھکر کہ تمام کارڈنلوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، سینٹ پیٹر کی عبا زیب بدن کی قسطنطنین کا تاج سر پر رکھا اور بہشت کی کنجیاں اور صلیب اپنے ہاتھ میں لیکر تخت پاپائی پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کے دشمن کولونا اور دیگر اشخاص جب اس کے قریب آئے تو انھوں نے رکیک اور سفیہانہ الفاظ اس کی شان میں استعمال کئے اور اسے اور اس کے باقی ماندہ ملازموں کو گرفتار کرلیا۔ اس زمانے میں یہ بھی مشہور تھا کہ زرہ پوش کولونا نے پیرانہ سال پوپ کے منہ پر گھونسا مارا حالانکہ وہ اپنے منصب عالی کا پورا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ابنائے زمانہ کو اس کے ساتھ خاص ہمدردی پیدا ہوگئی اور وہ ان قصوں اور روایتوں کو بھول گئے جو اس کے افعال اور خصائل کے متعلق مشہور تھیں۔ شاعر دانتی اس کا مخالف تھا مگر اس نے بھی اپنی ایک عظیم الشان نظم میں اس اندوہناک واقعے کا ذکر نہایت تاسف سے کیا ہے اس کا قول ہے کہ مسیح کو پھر چوروں کے درمیان مصلوب کیا گیا، سرکہ اور زہر پھر اس کے لبوں سے لگا دیا گیا۔

اوائل میں یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا تھا کہ نوگارے کی تدبیر کارگر ثابت ہوگی۔ کیونکہ عوام نے بغاوت کرکے بانی فیس کو رہا کرادیا تھا مگر اس کی عمر ۸۰ سال کی

ہو چکی تھی اور اس نے چند روز کے بعد انتقال کیا۔ نوگاریے گھات میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح اپنے آقا کی کامیابی کی صورت پیدا کرے۔ بانی فیس کا جانشین پوپ بینی ڈکٹ ذوم بھی فرانس کے قابو میں بالکلیہ نہ آسکا۔ لیکن وہ بھی زیادہ نہیں جیا اور ۱۳۰۵ء میں بورڈو کا استقف کلیمنٹ پوپ منتخب ہوا۔ انتخاب سے پیشتر اس کے اور شاہ فرانس کے درمیان نامہ و پیام ہوئے تھے۔ اس گفت و شنید کی نوعیت تو معلوم نہیں ہوسکتی مگر یہ یقین ہے کہ اس نے بادشاہ کے اغراض کو پورا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسی وعدے کی بنا پر پالیسی اور وجہ سے اس نے اپنے جائے قیام کے لئے اوی نیون کا انتخاب کیا اور دربار پاپائی وہیں منتقل کر دیا۔ یہ شہر پوپ کی ملک تھا مگر فرانس کے جغرافیائی حدود کے اندر واقع تھا اور عملاً شاہ فرانس کے زیر اثر تھا پوپوں کے اقتدار کی بنا یہ تھی کہ دنیاوی حکومتوں سے آزاد تھے اس لئے ان کا ۷۰ سال تک فرانس کا دست نگر اور تابع فرمان رہنا تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اسی وجہ سے اوی نیون میں پوپوں کے قیام کو "قید بابل" کہتے ہیں کیونکہ وہ فرانس کے تابع ہو گئے تھے اور اس قیام کے نتائج بھی خاص ہیں۔

انتخاب سے قبل پوپ نے شاہ فرانس سے جو وعدہ کیا تھا اس کا اظہار واقعات مابعد سے ہونے لگا۔ بادشاہ اور کلیسا کے درمیان مصالحت ہو گئی یہانتک کہ بادشاہ کے ان کارپردازوں سے بھی درگزر کیا گیا جنھوں نے پیرانہ سال پوپ کی تذلیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ اس کے بعد نائٹس ٹیمپ لرز کی جماعت پہ دست اندازی کی گئی۔

یہ جماعت پہلی جنگ صلیبی کے ضمن میں زائرین بیت المقدس کی حمایت و امداد کے لئے قائم ہوئی تھی۔ مگر ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کے دوبارہ زور پکڑنے سے مشرق کی کمزور مسیحی سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئی تھیں۔ اس لئے فلسطین میں مذہبی جماعتوں کا قیام ناممکن ہو گیا تھا۔ سلسلۂ سینٹ جان کے نائٹ اب تک روڈز پر قابض تھے مگر ٹیمپ لرس اب مسلمانوں کے ساتھ جنگ و جدال میں مصروف نہ تھے۔ ان کی مجموعی تعداد قریب پندرہ ہزار تھی جن میں سے ایک ثلث فرانس میں مقیم تھے ان کے بارے میں بہت سی مشتبہ روایتیں مشہور ہیں مگر اسقدر صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت

دولتمند تھے۔ ساہو کاری اور لین دین کے کاموں میں یہودیوں کو بھی مات کرتے تھے اسی وجہ سے ان کی زندگی ان کے سلسلے کے سخت اصول کے مطابق نہ تھی۔ ان الزامات کے لئے کافی شہادت موجود ہے مگر ان کے علاوہ اس سلسلے پر دوسرے بیہودہ الزام بھی لگائے جاتے ہیں جن کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے شلاً ان پر یہ الزام تھے کہ وہ مشرق کے مذہبی عقائد کے پیرو ہیں، مسیح کو نہیں مانتے اور ان کی مورت پر تھوکتے ہیں۔ ان کے اخلاق نہایت قبیح ہیں۔ ان الزامات کے متعلق محاکمہ کرنا ناممکن ہے کیونکہ ان کے راوی ان کے دشمن تھے جو ان کی تخریب بلکہ قتل کے درپے تھے اس لئے قرین قیاس و انصاف یہی ہے کہ یہ الزام بے بنیاد تھے۔ اس سلسلے کے تمام ارکان گرفتار کر لئے گئے اور پیرس میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ حالانکہ غریب پوپ التجا کرتا رہا کہ ان کو پاپائی عدالت کے سپرد کیا جائے سنہ ۱۳۱۰ء میں ان میں سے چوّن پیرس میں جلا دیئے گئے اور اس کے بعد پوپ پر دباؤ ڈالا گیا کہ اس سلسلے کو موقوف کر دے۔ پوپ نے بادلِ ناخواستہ منظور کر لیا۔ موقوفی کے بعد بادشاہ نے اہل سلسلہ کی تمام جائداد ضبط کر لی مگر اس سے بھی اسے تسکین نہ ہوئی اور ان کا سردار زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شعلوں کے بیچ میں سے اس نے بادشاہ اور پوپ کو آواز دی کہ میرے ساتھ خدا کے سامنے حاضر ہو۔

ارتقائے دستوری کے لحاظ سے فلپ چہارم نے فلپ دوم اور سینٹ لوئی کے طرزِ عمل کی اصلاح کی اور ترقی کی طرف ایک قدم آگے بڑھایا۔ پارلیمنٹ کی تنظیم نہایت احتیاط سے عمل میں آئی اور اقتدارِ اعلیٰ کے حاصل کرنے میں وہ بادشاہ کا زبردست معاون ثابت ہوا۔ پاپائیت کے ساتھ جو جدوجہد ہوئی اس کے دوران میں ایک نیا ادارہ وجود میں آیا جس نے بہت نام حاصل کیا اور فرانس کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً اس نے نمایاں حصہ لیا۔ انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کی طرح کیتھولک کلیسا کے مقابلے میں اسے بھی تمام قوم کی تائید کی ضرورت تھی اس لئے سنہ ۱۳۰۲ء میں اس نے ایک مجلس قایم کی۔ یہ مجلس اسٹیٹس جنرل کے نام سے موسوم ہے اور سلطنت کے تین طبقوں یعنے پادریوں، امرا اور عوام پر مشتمل تھی۔ ان تینوں طبقوں کے اجلاس علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے اور اس وقت اس کا کام صرف یہی تھا کہ بادشاہ کے طرزِ عمل

اور ان دلایل کی تصدیق کریں جو وہ پوپ کے خلاف پیش کرتا تھا۔ یہ جماعت فرانس کی اسی حد تک نیابت کرتی تھی جتنی کہ اس زمانے میں انگلستان کا پارلیمنٹ اپنے ملک کی نیابت کرتا تھا۔ آئندہ بادشاہوں کے زمانے میں اکثر نازک موقعوں پر اس مجلس نے امور مملکت میں دخل دیا ہے۔ مگر اس کی قسمت میں یہ نہ تھا کہ انگلستان کے پارلیمنٹ کی طرح قوم کی سیاسی زندگی کی بنیاد بن جائے۔ اس کی ناکامی کے اسباب متعدد ہیں اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انگلستان کی طرح اس کی بنیاد قوم کی معاشرت اور اس کے خصایل پر نہ تھی۔ اس کا قیام حکومت شاہی کی طرف سے ایک خاص وقت کے رفع کی غرض سے ہوا تھا۔ اور سنہ ۱۷۸۹ء تک جب کہ وہ حکومت شاہی کی بربادی کا باعث ہوئی۔ یہ بنیادی کمزوری اس میں باقی نظر آتی ہے۔ فرانس کے اہم ادارات وہ تھے جن کی بانی حکومت شاہی تھی نہ کہ وہ جو قوم کی پسند خاطر سے وجود میں آئے تھے۔

باب پانزدہم

تمدن جاگیری

"جاگیریت" ایک اصطلاح ہے جس کا اطلاق غیر معین طریقہ سے ایک نظام تمدن پر ہوتا ہے جو کئی صدیوں تک سرزمین یورپ میں جاری تھا۔ اس کا نشو و نما رومی شہنشاہی کے زمانے میں ہو چکا تھا مگر قطعی شکل اس نے نویں صدی میں اختیار کی اور مغربی یورپ میں اس کا وجود اٹھارھویں صدی کے اواخر تک باقی تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک اس نظام کو یورپ کے تمدن میں اہمیت حاصل تھی اور ایک وسیع رقبے میں جاری تھا۔ انگلستان کے تمدن اور ادارات کی بنا اسی پر تھی گو بادشاہی کے غلبۂ قوت سے اسے پورا نشو و نما حاصل نہ ہوا۔ فرانس اور جرمنی میں اسے پوری ترقی ہوئی۔ اور ہسپانیہ اور اطالیہ میں بھی یہ نظام جاری رہا، پولینڈ، بوہے میا، ہنگری اور روس کا اصطلاحاً جاگیری ممالک میں شمار نہیں مگر جاگیریت کے خصوصیات ان میں بھی نمایاں تھے اور یورپ کے دوسرے ممالک میں اس کے ناپید ہو جانے کے بعد بھی وہاں اس کا وجود تھا۔ جاگیری تمدن کے اہم خصایص کے بیان کرنے میں ہم زیادہ تر تیرھویں صدی کے حالات بیان کریں گے اور مثالیں فرانس کی پیش کریں گے۔

جاگیریت اور اس کے تمدن کے متعلق قانونی اصطلاحات مستعمل ہیں جو لاطینی یا قدیم فرانسیسی سے ماخوذ ہیں جس سے اس کے ادارات غیر حقیقی معلوم ہوتے ہیں گویا کہ

مصنفوں نے اس نظام کو ایجاد کر کے اہل یورپ کو اس کا پابند کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نظام اس زمانے کی قوتوں، خیالات اور ضروریات سے از خود وجود میں آیا تھا اور قبل اس کے کہ مصنفین ان کے لئے لاطینی نام تجویز کریں اس کا عملدرآمد اور اس کے ادارات وجود میں آ چکے تھے۔ جاگیریت کی اصل پر یہاں بحث کرنا ناممکن ہے اس لئے یہاں ہم جے ایس ال کے ایک قول کی نقل پر اکتفا کریں گے "حکومت اس جماعت کے ہاتھوں میں رہتی ہے یا پہونچ جاتی ہے جس کو اس تمدن میں سب سے زیادہ قوت حاصل ہو اور اس قوت کی نوعیت کا انحصار ادارات پر نہیں ہے بلکہ ادارات کا انحصار اس قوت پر ہے جن قوتوں کا اثر جاگیریت کے نشو و نما پر ہوا ان کا ذکر ہم فقرات مابعد میں کریں گے۔

جاگیریت مرکزی حکومت اور نظم و نسق کے منافی ہے۔ نویں اور دسویں صدی میں یورپ کی مرکزی حکومتیں طاقتور اور بااثر نہ تھیں۔ رومی شہنشاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ شارلیمین نے کوشش کی تھی کہ ایک ایسی سلطنت قائم کرے جس کا نظم و نسق قابل اطمینان ہو۔ مگر موت نے اس کی کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیا۔ اہل شمال اور مگ یر قوم کے حملے ان ضعیف حکومتوں کو تہ و بالا کر چکے تھے جنھوں نے ان کا مقابلہ کیا تھا۔

جاگیریت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ زمانۂ حال میں جن امور میں اقوام کی ادائی ہوتی ہے ان میں شخصی خدمت کے ذریعہ سے بجائی ہوتی تھی کیونکہ قرون وسطےٰ میں زر مسکوک کی کافی مقدار نہ تھی اور نہ نوٹوں اور چیکوں کا ہی رواج تھا جن سے اس زمانے میں سکوں کی کمی کو پورا کیا جاتا ہے۔ قرون وسطےٰ میں سرمائے کی بھی کمی تھی۔ اور سرمائے کو جب قوت حاصل ہوئی تو سرمایہ دار ہمیشہ جاگیریت کے مخالف ہی نظر آئے۔

قدیم تمدن میں روایات کو تحریری قانون کے شرائط سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور نظام جاگیری کی تحت میں بھی روایات اور رواج کو تمدن میں بمقابلہ قانون عقل اور افادہ زیادہ دخل تھا۔

جاگیری تمدن کی واحد بنا ہر ملک میں جاگیری علاقے تھے جن میں جاگیردار امرا

خواہ وہ کسی حیثیت کے ہوں قلعہ نما مکانوں میں رہتے تھے۔ ان کے ارد گرد ان کے متوسلین آباد تھے جن میں سے بعض احرار تھے اور بعض کی حیثیت غلاموں (سَرف) کی سی تھی۔ متوسلوں پر جاگیردار پورے اقتدار کے ساتھ حکومت کرتا تھا۔ ایک فرانسیسی مصنف کا قول ہے کہ جاگیریت نام ہے "قبضۂ اراضی اور اقتدار شاہی کے نقطۂ اتحاد کا"۔ زمانۂ حال میں قبضۂ اراضی سے مالک اراضی کو اس اراضی پر بسنے والوں پر چند مخصوص اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ ان سے لگان حاصل کرتا ہے، زمین سے انھیں بے دخل کر سکتا ہے اور ان کی زندگی پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنا اثر مختلف طریقوں سے ڈال سکتا ہے۔ مگر قرون وسطےٰ میں جاگیرداروں کو وہ حقوق حاصل تھے جو اب بادشاہوں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ مثلاً جاگیردار اپنی رعایا سے محاصل وصول کر سکتے تھے، ان سے فوجی امداد طلب کر سکتے تھے، اپنی اراضی میں انھیں کام کرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ اور ان کے مقدمات کی سماعت اپنی عدالتوں میں کرتے تھے۔ اگر مالک اراضی کو اپنے متوسلوں پر اقتدار شاہی حاصل نہ ہوتا تو جاگیریت کا وجود ہی باقی نہ رہتا۔

زراعتی کام کرنے والوں میں سب سے بڑا اور اہم طبقہ غلاموں (سَرف) کا تھا۔ گو مزارعین میں بعض احرار بھی تھے۔ غلاموں کی عام حالت کے بارے میں کوئی خاص رائے قایم کرنا دشوار ہے کیونکہ مختلف ممالک اور زمانوں میں ان کی حالت یکساں نہ تھی۔ صرف ایک لحاظ سے سرفوں کی حالت زمانۂ حال کے مزدوروں سے پست تھی ہر چند سرفوں کی ذاتی اراضی پر انھیں مستقل قبضہ تھا۔ قانوناً اور رواجاً کوئی جاگیردار کسی سرف کو اس کے مکان اور ملحقہ زمین سے بے دخل نہ کر سکتا تھا اور موروثیت کے اصول کے لحاظ سے جس کی قرون وسطےٰ میں بالعموم پابندی ہوتی تھی، باپ کی جائداد بیٹے کو پہونچتی تھی اور اس طرح سرفوں کی زندگی ایک حد تک پر امن تھی اور انھیں ایک گونہ آرام بھی حاصل تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ یہ لوگ ہر طرح سے جاگیرداروں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ محصول کے طور پر جو روپیہ ان سے لیا جاتا تھا اس کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ آٹا پیسنے کے لئے اور انگور سے شراب بنانے کے لئے انھیں اپنے آقا کی چکی اور شراب نکالنے کی کل سے فرصت نہیں ملتی تھی جس کی حسب رواج ایک اجرت معین تھی انھیں اپنے آقا کا ہر قسم کا کام کرنا پڑتا تھا جس کی کوئی انتہا نہ تھی اور جو کچھ وقت

آقاؤں کے کام سے بچتا اسی میں وہ اپنی اراضی کی نگہداشت کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر ان میں کوئی باہمی مخالفت ہوتی یا خود آقا سے کوئی نزاع پیدا ہوتی تو اس کا تصفیہ بھی اسی جاگیردار کی عدالت میں ہوتا تھا، جہاں مقدمے کی سماعت مروجہ طریقوں سے ہوتی تھی اور فیس مطلوبہ ادا کرنا پڑتی تھی۔

حکمراں جماعت کو اپنے علاقوں کے انتظام کی طرف بہت کم توجہ تھی اور یہ کام نائبوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ امرا کا پیشہ جنگ تھا اور اسی کو وہ شایستہ مشغلہ خیال کرتے تھے چودھویں صدی تک صرف زرہ پوش جوانمرد میدان کارزار میں جوہر سپہ گری دکھا سکتے تھے اور غربا اس پیشے کو اختیار کرنے کی جرات نہ کر سکتے تھے۔ بعنفوان شباب سے تا دم مرگ جاگیری امرا کے لئے حصول مقاصد اور نام آوری کا ذریعہ یہی تھا۔ نوجوان امرا اولاً اپنے والد یا کسی دوسرے امیر کی خدمت میں اپنا وقت صرف کرتے تھے تاکہ اپنے فن میں کمال پیدا کر سکیں، اپنے آقا کے گھوڑے کی نگہداشت کرتے کھانے پر خدمتگار کی طرح حاضر رہتے اور لباس پہننے میں آقا کو مدد دیتے تھے۔ اس کے بعد یہ لوگ اٹھارہ یا بائیس برس کی عمر میں فروسیت (Chivalry) کی جماعت میں داخل ہوتے تھے۔ داخلے کی رسم اولا نہایت سادہ تھی یعنے جس امیر کے ہاتھوں نوجوان کی تربیت ہوئی تھی وہ اس کے کاندھے پر آہستہ سے ایک ضرب لگاتا اور اس کے بعد نوجوان گھوڑے پر سوار ہو کر سپہ گری کے کرتب دکھاتا۔ لیکن تیرھویں صدی میں کلیسا کے اثر سے داخلے میں مذہبی رسوم کا بھی اضافہ ہو گیا۔ یعنے داخلے کے قبل امیدوار ایک شب مراقبے میں مصروف رہتا اور عشائے ربانی میں شرکت کے بعد تلوار قرباں گاہ کے اٹھا کر اس کے باندھی جاتی۔ رسم کے ختم پر دعا اور وعظ کی نوبت آتی جس میں نئے نائٹ کو ہدایت کی جاتی کہ کلیسا، غربا اور بیواؤں کی طرف اپنے فرائض کا خیال رکھے۔ فروسیت کے وقائع میں اس طبقے کے محاسن کا نہایت دلاویز تذکرہ ہے اور بلا شک وشبہ اسی کی بدولت اس زمانے کی جنگوں میں لوٹ مار اور وحشیانہ مظالم میں کمی ہوتی تھی۔ مگر اس مصنف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معیار ہمیشہ قائم نہ رہتا تھا اور اس زمانے کے سپاہی اکثر اس معیار سے گر جاتے تھے۔ مثلاً انگلستان کے "بلیک پرنس" یعنے کالے شہزادے نے لموژ میں قتل عام کرا دیا تھا۔ حالانکہ اسے فروسیت کا گل سرسبد کہا جاتا ہے۔

جاگیریت کی ممتاز ترین خصوصیت طبقۂ امراء کے باہمی تعلق میں مضمر تھی۔ اور یہ تعلقات نظام اراضی پر مبنی تھے۔ بادشاہ کے علاوہ اراضی کا کوئی مالک مطلق نہ تھا۔ ہر جاگیر کا مالک اپنے سے بڑے میر کی رعیت (Vassal) ہوتا تھا۔ چنانچہ (Homage) یعنی رسم اعتراف افضلیت سے یہ تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ وسیل اپنے آقا کے سامنے برہنہ سر اور غیر مسلح حاضر ہوتا اور دو زانو ہو کر اقرار کرتا کہ میں آپ کا خادم ہوں۔ آقا اسے اٹھا کر اس سے معانقہ کرتا۔ اس کے بعد وسیل وفاداری کا عہد کرتا اور آقا اسے کوئی چیز شلاً دستانہ یا نیزہ دے دیتا جو اس اراضی عطا شدہ کی نشانی خیال کی جاتی۔ آقا اور وسیل کے تعلقات رواج کے لحاظ سے ہر جگہ مختلف تھے۔

وسیل کا فرض تھا کہ اپنے آقا کے لئے فوجی خدمات بجا لائے اور مسلح ہو کر اس کی مدد کرے خواہ وہ کسی سے برسر جنگ ہو۔ لیکن یہ امداد غیر متعین نہ تھی بلکہ وقت اور مقام کے لحاظ سے محدود تھی یعنے اس کی میعاد چالیس روز سے زیادہ نہ ہو سکتی تھی اور اپنی اراضی سے ایک مقررہ فاصلے سے زیادہ آگے جانے پر وہ مجبور نہ تھا۔ قرون وسطےٰ کی فوجوں کی بنا انھیں امرا کی فوجوں پر تھی۔ یہ فوجیں بلحاظ حالات ایک دوسرے سے مختلف ہوتیں، اپنے سردار کے احکام کی پروا نہ کرتیں۔ اور ایک منظم فوج کے مقابلے میں بیکار ثابت ہوتیں تھیں۔ جنگ صد سالہ میں انگلستان کی فتح کا یہی سبب تھا کہ انگلستان میں شاہی فوج قائم ہو چکی تھی اور اس کے برخلاف فرانس کی فوج جاگیری تھی۔

وسیل کے فرائض صرف فوجی خدمت تک محدود نہ تھے۔ مختلف موقعوں پر اس کا آقا اس سے اعانت کی امید کرتا تھا اور یہ اعانت روپیہ کی شکل میں ہوتی تھی شلاً نئے وارث کو جاگیر پر قبضہ کرنے سے قبل ایک رقم کثیر ادا کرنا لازم تھی اور اگر وارث قابض متوفی کی اولاد سے نہ ہوتا تو رقم کی مقدار اور بھی بڑھ جاتی۔ سفر یا شکار میں اگر آقا جاگیر کی طرف آنکلتا تو وسیل کا فرض تھا کہ آقا اور اس کے ہمراہیوں کی ضیافت کرے۔ اس کے علاوہ مختلف دوسرے موقعوں پر بھی وسیل کو نذریں پیش کرنا پڑتی تھیں۔ شلاً اگر آقا جنگ میں گرفتار ہو جائے تو اس کے فدیئے کا ایک حصہ اسے ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر جنگ صلیبی میں جاتا تو اس کے اخراجات کا ایک حصہ وسیل پر عاید ہوتا تھا اس طرح آقا کی بیٹیوں کی شادی اور بیٹوں کے نائٹ ہونے کے موقع پر بھی اسے

اپنی جیب خالی کرنا پڑتی تھی۔

اعانت کے علاوہ وسیل سے مشورے کی امید بھی کی جاتی تھی۔ اس کا فرض تھا کہ اپنے آقا کے ساتھ بیٹھکر امن و جنگ کے اہم مسائل پر غور کرے اور عدالت میں اس کے ساتھ مقدمات کی سماعت کرے۔

جاگیریت کی بعض اور نمایاں خصوصیتیں بھی ہیں مگر فی الحقیقت یہ نظام نہ تھا بلکہ ایک قسم کی طوائف الملوکی تھی جس میں حقیت اراضی کی طریقۂ مذکورۂ بالا سے کوئی اصلاح نہ ہو سکی جن لوگوں نے اس نظام کے اصول پر غور کیا ہے ان کا بیان ہے کہ اس میں اختیارات اور درجوں کے لحاظ سے متعدد مدارج تھے۔ سب سے نیچے سرف تھے اور ان کے اوپر مختلف درجوں کے امرا تھے اور سب سے اوپر بادشاہ۔ بعض مصنفوں نے اس سلسلے کو اور بھی بڑھایا ہے کہ بادشاہ شہنشاہوں کی رعایا میں شمار ہوتے، اسی طرح شہنشاہ پوپ کی رعایا میں شمار ہوتا تھا۔ اور پوپ خدا تعالیٰ کی رعایا میں سے سمجھا جاتا تھا۔ مگر مغربی یورپ میں یہ مکمل نظام موجود نہ تھا۔ رعایا بسا اوقات اپنے آقا سے زیادہ طاقت ور ہوتی تھی جو مثلاً انگلستان کا بادشاہ ہنری دوم شاہ فرانس کے تفوق کا معترف تھا یہ بسا اوقات ایک ہی شخص اپنی اراضی کے لحاظ سے مختلف امرا کی رعیت میں ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات ایک ہی شخص مختلف اراضی پر قبضہ کے اعتبار سے ایک ہی آدمی کو اپنا امیر بھی مانتا اور رعیت بھی۔

بیان کیا گیا ہے کہ جاگیریت کوئی مرض نہ تھا۔ بلکہ تمدن کی ترقی کے سلسلے میں بطور خود وجود میں آیا تھا اور ایک زمانے میں جب کہ وحشی ہر طرف سے حملہ آور ہو رہے تھے اور حکومتوں میں استواری نہ تھی۔ اسی کی بدولت تمدنی تعلقات قائم تھے۔ مگر جاگیریت میں طوائف الملوکی کا مرض ہر وقت موجود تھا۔ ہر ایک جاگیردار امیر اپنے مقبوضات میں اقتدار شاہی رکھتا تھا اور جاگیری تعلقات ہم آہنگی قائم کرنے کے لئے بے سود تھے۔ ہر جاگیردار کو بطور خود جنگ کرنے کا اختیار تھا نارمن فتوحات سے انگلستان میں ایک زبردست حکومت قایم ہو گئی جس سے یہ مرض انگلستان میں نہ پھیلنے پایا، لیکن فرانس، ہسپانیہ اور جرمنی میں بالکل عام تھا۔ اس کے نتائج اسقدر اندوہ افزا تھے کہ اس کے دفع کرنے یا کم از کم اس کے مصائب کو کم کرنے کے لئے "صلح خداوندی" کا قیام عمل میں آیا کیونکہ حکومتیں بطور خود اس کو دفع کرنے سے قاصر تھیں۔ قرون وسطےٰ کے ادارات میں کلیسا کا نظام سب سے زیادہ

مکمل تھا اس لئے اسی نے اس کی طرف توجہ کی کیونکہ دنیاوی حکام بالکل بے بس تھے۔ اولاً یہ کوشش ہوئی کہ خانہ جنگی بالکل ممنوع قرار دی جائے اور پھر یہ کہ خاص اس کی میعاد مقرر کر دی جائے۔ ۱۰۳۵ء میں شہنشاہ ہنری چہارم نے جرمنی میں "صلح خداوندی" کا اعلان کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر صلح مستقل طریقہ پر قایم نہیں ہو سکتی تو کم از کم چند مخصوص ایام میں جنگ ممنوع قرار دے دی جائے۔ اس نے ایک اعلان جاری کیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ کرسمس کے ایک ماہ قبل سے ۱۳ جنوری تک، مارچ میں تیرہ روز تک اور ہر ہفتے میں پنجشنبے سے لیکر دوشنبے کی صبح تک جنگ موقوف رکھی جائے۔ گو "صلح خداوندی" سے ایک حد تک جنگ کی صعوبتوں میں کمی پیدا ہو گئی تھی اور کلیسا کی قوت بھی خاصی تھی پھر بھی اتنی نہ تھی کہ حکماً جنگ جو امراء کو لڑنے بھڑنے سے باز رکھے۔

جاگیریت کے تحت میں عدالتی انتظامات کی بھی وہی گت تھی جو قیام امن کی تھی زمانۂ حال اور زمانۂ قدیم کے مقابلے میں قرون وسطےٰ کے تخیلات معدلت اور مقدمات کی سماعت کے طریقے کچھ اور ہی تھے۔ دادرسی کا تعلق بالکلیہ امرائے جاگیری سے تھا اور ان کے ماتحتوں سے جنھیں وہ اپنی مجالس میں شریک کرتے تھے۔ نظام جاگیری میں جو فرد جاگیردار سے برتر ہوتا وہ کبھی کبھی مقدمات میں مداخلت کرتا مگر بالعموم جاگیردار عدالتی معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس حق کو وہ اپنی خاص ملک خیال کرتے تھے موسیو سی نی بو نے نظام جاگیری میں عدالت کے متعلق حسب ذیل رائے دی ہے "عدالت کسی مقدمے کی پورے طور سے چھان بین نہ کرتی تھی کہ حقیقت کا انکشاف ہو جائے، انصاف اور عقل کو عدالتی عملدرآمد میں بالکل دخل نہ تھا۔ بلکہ تمام امور کا تصفیہ حسب رواج ہوتا تھا۔ جاگیری نظام معدلت میں رواج کو زیادہ تر دخل تھا اور کھیلوں کی طرح اس کے خاص قواعد تھے۔ حکام کا کام صرف یہ دیکھنا تھا کہ قواعد کی پابندی ہوتی ہے یا نہیں اور جیسا کہ کھیلوں میں ہوتا ہے کھیل کی رفتار دیکھکر جیتنے والے کا نام شایع کر دیتے تھے۔ ہر مقدمہ چند خاص کارروائیوں پر مبنی تھا۔ جن پر رواجاً عمل تھا اور ان کے لئے خاص الفاظ مقرر تھے۔ اگر کسی قاعدے کے خلاف کوئی لفظ کسی کی زبان سے نکل جاتا یا کوئی نامطبوع حرکت ہو جاتی تو وہ خاطی مقدمہ ہار جاتا تھا۔ مثلاً لیل میں ایک شخص انجیل پر ہاتھ رکھکر حلف لے رہا تھا، اس کا ہاتھ اتفاق سے ہل گیا۔ مقدمہ ہارنے کے لئے

یہ فروگذاشت کافی تھی۔

جاگیریت کے قانونی عملدرآمد میں دو طریقے قابل ذکر ہیں یعنی "آرڈیل" اور "مقدمہ بذریعہ جنگ"۔ آرڈیل کے کئی طریقے تھے اور سب کے سب لغو اور خلاف عقل تھے ان میں سب سے زیادہ معمولی "آتشی امتحان" تھا جس میں ملزم اپنے جسم کا کوئی حصہ آگ میں ڈال دیتا تھا۔ مثلاً جلتی ہوئی لکڑیوں پر چلتا، اپنا ہاتھ کھولتے ہوئے پانی میں ڈالتا یا گرم لوہا اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ اگر چند مقررہ ایام میں جسم کا متاثر حصہ درست ہو جاتا تو اسے بے جرم خیال کیا جاتا تھا۔ "مقدمہ بذریعہ جنگ" ایک قسم کا ڈوئیل (دو مسلح شخصوں کی لڑائی) تھا۔ اس کا رواج عموماً امرا میں تھا مگر ادنےٰ طبقے کے لوگ بھی اکثر اسی کو پسند کرتے۔ مقدمات کی سماعت کے اس طریقے میں عقل، شہادت یا انصاف کو مطلق دخل نہ تھا۔ عدالت کا فرض صرف یہی تھا کہ شرائط کو طے کر دے اور نتیجے کا اعلان کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس طریقے سے طاقتور لوگوں کو خاص فائدہ پہونچتا ہوگا اور ظالموں کو ظلم کرنے کا خوب موقع ملتا ہوگا۔

قرون وسطےٰ کے لوگ ان طریقوں کے خوگر تھے مگر جب انھیں رومی قانون کے اصول اور طریقوں کا علم ہوا تو انھیں سخت تعجب ہوا، کیونکہ رومی قانون میں تمدن کے مفاد کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ حقیقت کا انکشاف ہو، شہادت پرکھی جائے اور پورا انصاف ہو۔ بارھویں اور تیرھویں صدی کے لوگ تو اس قانون کو ایک نیا صحیفہ خیال کرنے لگے تھے اور اسی کے معترف ہونے سے اکثر یورپ کے بہترین افراد مقدس رومی شہنشاہی کے دعاوی کو تسلیم کرنے لگے تھے۔

اب ہم ان قوتوں کا ذکر کریں گے جو جاگیریت کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔ کلیسا کو بھی جاگیری نظام کی ہیئت ترکیبی میں جگہ مل گئی تھی اور جاگیردار امرا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ مگر فی نفسہ اس کا رجحان جاگیریت کے خلاف تھا۔ کیونکہ کلیسہ ہمہ گیر تھا اور جاگیریت مقامی۔ کلیسہ میں وراثت کو دخل نہ تھا۔ اور اس کے اقتدار کو قبضۂ اراضی سے کوئی حقیقی تعلق نہ تھا۔ یورپ کی شاہی حکومتیں اپنی قوت کے تناسب سے ہمیشہ سے جاگیریت کی مخالف تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا آغاز بھی جاگیری تخیلات سے ہوا مگر ان کا مقصد شروع ہی سے یہ تھا کہ ملک کے تمام باشندے بادشاہ کے

تحت میں ہوں اور جاگیرداروں کی مقامی حکومت مٹ جائے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فرانس کے بادشاہوں کو اس مقصد میں کامیابی ہوئی اور جرمنی کے شہنشاہ اس میں ناکام رہے۔ مگر جرمنی میں بھی جو کام شہنشاہوں سے نہوا اسے ایک حد تک بادشاہوں اور رئیسوں (الیکٹر) نے کر دکھایا۔

کلیسا اور بادشاہوں کے علاوہ تیسری مخالف قوت شہروں کی تھی جنکی تعداد گیارھویں اور بارھویں صدی میں یورپ کے ہر ملک میں بہت بڑھ گئی تھی۔ وحشیوں کے حملوں اور شہنشاہوں کے سخت محاصل سے رومی شہنشاہی کا عظیم الشان شہری تمدن ناپید ہو گیا تھا۔ مگر شہر نظام انسانی کی قدرتی صورتیں ہیں۔ اور جب طوائف الملوکی کے بعد یورپ میں امن وامان ہوا اور تجارت کو فروغ حاصل ہوا تو مغربی یورپ کے ہر ملک میں شہری زندگی نے پھر فروغ حاصل کر لیا۔ ان شہروں میں پہلے کچھ روز تک ابتری تھی مگر ان کی قوت بڑھتی گئی۔ تمدنی اور سیاسی لحاظ سے ان شہروں کی حیثیت مختلف تھی۔ بعضوں کی حیثیت خود مختار جمہوری حکومتوں کی سی تھی اور بعض کسی بادشاہ یا رئیس کے تحت میں تھے۔ مگر ان میں سے قریب قریب سب کو اپنے اندرونی معاملات میں کافی آزادی حاصل تھی اور گو اولاً نظام جاگیری کے یہ بھی ایک جزو تھے، مگر اس نظام کے شروع ہی سے مخالف تھے۔ جاگیریت کا تعلق جاگیرداروں کے تمدن سے تھا۔ اور اسی سے پیدا ہوا تھا۔ شہروں کو آزادی تجارت، عمومیت فنون لطیفہ اور باہمی معاونت سے سروکار تھا اور ان تخیلات کے وجود میں آتے ہی یہ نظام پاش پاش ہو گیا۔

جنگ ہائے صلیبی

اسلام اور مسیحیت کے طرزِ اشاعت میں اختلاف ہے۔ اسلام کی اشاعت ابتدا ہی سے تلوار اور فتوحات کے ذریعے سے ہوئی اور اسلامی فوجوں کی کامیابیوں سے مسیحی مذہب ایشیا، افریقہ اور ہسپانیہ سے خارج کر دیا گیا اور صلیب کے بجائے ہلال مذہب کا نشان ہو گیا۔ برخلاف اس کے مسیحیت کو عہد اولیں میں زیادہ تر کامیابی باطنی کشش اور خوبیٔ تعلیم سے ہوئی چنانچہ مشرقی اور مغربی گاتھ واندال اور فرینک بطیب خاطر مسیحی ہو گئے تھے۔ لیکن جب فرینک قوم کو اپنے ممالک مشرق میں تبلیغ کا خیال آیا تو انھوں نے نہایت سختی کے ساتھ وہاں کے باشندوں کو عیسائی ہونے پر

(۱) میں نے مصنف کے الفاظ کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ باوجود تبحر اور کمال واقفیت عیسائی علما اسلام کے ساتھ کسقدر تعصب سے کام لیتے ہیں۔ اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ صدیوں کی مخالفت کا اثر علم و کمال سے زایل نہیں ہوتا بلکہ جو کدورت دلوں میں ہے وہ افعال اقوال سے ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ ہر مسلم اور انصاف پسند غیر مسلم جانتا ہے کہ اسلام کی اشاعت کسطرح ہوئی۔ مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں مذہب مسیحی کی جو حالت ابتدائے اسلام کے زمانہ میں تھی ہر باخبر شخص پر روشن ہے۔ جزوی مذہبی اختلافات کی بنا پر مسیحی ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے اور اگر مذہب اسلام کی تبلیغ عین اسوقت نہوتی تو اندیشہ تھا کہ بحیرۂ روم کے اطراف کے ممالک کا تمدن ناپید ہو جاتا۔ (مترجم)

مجبور کیا۔ شارلی مین بھی اپنے شکست خوردہ حریف کو ہمیشہ عیسائی ہونے پر مجبور کیا کرتا تھا اور بغیر اس کے ان کے اظہار اطاعت کو قبول نہ کرتا۔ مگر اس سخت گیری کا منشاء صرف یہی تھا کہ کفار مسیحی مذہب قبول کریں۔ بانی فیس اور دلی بُرورڈ کا بھی یہی طرز عمل تھا اور ان کا قول غالباً یہ تھا کہ "ہم تمھارے خواستگار ہیں تمھارے مال و متاع کی ہمیں حرص نہیں"۔ یہ واضح رہے کہ اس وقت تک مسیحیوں کی خواہش صرف اسی قدر تھی کہ جس طرح بن پڑے غیر مسیحیوں کو عیسائی بنالیں وہ ان کو نیست و نابود کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مسیحیت کی تعلیم میں جبر سے زیادہ کام لینے کا طریقہ جنگ ہائے صلیبی سے شروع ہوتا ہے اور کلیسا کا مقصد اس زمانے سے یہ ہو گیا کہ غیر مسیحیوں کو مسیحی بنانے کے بجائے نیست و نابود کر دیا جائے۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں مسیحیوں کی مسلح جماعتیں فلسطین، ایشیائے کوچک اور مصر وغیرہ کی اسلامی سلطنتوں پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ یہ تحریک جنگ ہائے صلیبی کے نام سے مشہور ہے ان جنگوں کی تعداد بالعموم سات بیان کی جاتی ہے مگر یہ تعداد مشکوک ہے کیونکہ مشرق میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی مخالفت کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہوا۔

ان لڑائیوں کی نوعیت کیا تھی اور لڑنے والوں کے مقاصد کیا تھے؟ ایک مصنف کی رائے ہے کہ اس تحریک کے ذہن نشین کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ یہ بات فرض کر لی جائے کہ اس زمانے میں دیوانے پن کی ایک وبا یورپ میں پھیل گئی تھی۔ یہ تحریک ہر چند عجیب وغریب اور افسانہ نما ہے اور بسا اوقات اس کے مقاصد کچھ اور ہی ہوتے تھے۔ پھر بھی اس کی حقیقت کا سمجھ لینا چنداں دشوار نہیں۔

گیارھویں صدی کے اواخر میں کلیسا کی قوت انتہائی عروج پر تھی۔ اس صدی کے وسط میں گرے گری ہفتم کا اثر تمام یورپ پر چھایا ہوا تھا۔ پاپائیت کے اقتدارات کے متعلق اس کی جو آرزوئیں تھیں اور جس حد تک وہ پوری ہوئیں انھیں ہم بیان کر چکے ہیں۔ پوپ گویا کلیسہ کی زبان تھا اور جو احکام اس کی زبان سے نکلتے تھے ان پر تمام یورپ آمنّا و صدّقنا کہتا تھا۔ اور ان کے بجالانے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ چونکہ یہ عہد "عہد خوش اعتقادی تھا"۔

مگر اسی کے ساتھ یہ عہد "عہد جنگ" بھی تھا۔ تمدن کی بناء جاگیریت پر تھی

اور جاگیریت کا دارومدار مسلح جوان مردوں پر تھا۔ لوگ جنگ پر اس عجلت کے ساتھ آمادہ ہو جاتے کہ آج وہ تخیل وہم و گمان بھی نہیں آسکتی۔ اور کیوں نہ ہوتا کہ دل بہلانے کا یہی ایک شغل تھا، کھیل کود اور سیاسیات ہی نہیں بلکہ تجارت تک کی جگہ جنگ نے لے رکھی تھی۔ مگر شاہی حکومتوں کے عروج سے خانگی نزاعوں کا موقع بہت کم رہ گیا تھا۔ اس لئے جب کلیسا کے حکم سے زرخیز مشرقی ممالک میں لڑنے بھڑنے اور فتوحات حاصل کرنیکا موقع ہاتھ لگا تو امرائے جاگیری نے اسے نہایت زریں موقع خیال کیا اور جنگ کے لئے فوراً تیار ہو گئے۔

اس مہم پر لوگوں کو تیار کرنے میں کلیسا کے پیش نظر بعض خاص مصالح تھے زیارت قبور مذہبی زندگی کا ایک اہم جزو بن چکی تھی۔ ٹامس بیکیٹ، سینٹ جیمس ساکن کام پوس ٹیلا اور چند دوسرے بزرگان دین کے مقبروں پر زائروں کا ہجوم رہا کرتا تھا۔ مگر زیارت گاہوں میں سب سے بڑا مرکز یروشلم تھا جہاں عیسائیوں کے خیال کے مطابق حضرت عیسیٰ کا مقبرہ تھا۔ یروشلم اب تک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا اور مسیحی زائروں کو وہاں آنے جانے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ مگر گیارھویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں نے پھر مشرق (ایشیائے کوچک) اور مغرب (ہسپانیہ) میں پیش قدمی شروع کر دی تھی قسطنطنیہ سے امداد کی دردناک صدائیں آنے لگیں اور یروشلم کے زائر یا تو راستے ہی میں روک دیئے جاتے تھے۔ یا اگر وہاں پہونچتے تو انھیں طرح طرح کے خطروں سے دوچار ہونا پڑتا تھا اور ذلتیں بھی اٹھانا پڑتی تھیں۔

پوپ اور شہنشاہان مشرق (قسطنطنیہ) جنگ ہائے صلیبی کے حقیقی بانی تھے اور ان کی حقیقت کو بخوبی سمجھنے کے لئے قسطنطنیہ کی سیاسی حالت پر غائر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ شارلی مین کے زمانے کے بعد سے مشرقی شہنشاہی یورپ کی تاریخ سے علیحدہ ہو گئی مگر مشرق میں وحشیوں کے حملوں کے دفع کرنے اور یورپ کے تمدن کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک سد سکندری تھی۔ مشرق میں بھی جاگیریت کو کچھ فروغ حاصل ہوا تھا مگر فرانس یا جرمنی کی سی حالت نہ تھی۔ شہنشاہ انتظام مملکت کا مرکز تھا، کلیسا سے اس کے تعلقات اسقدر گہرے تھے کہ ملکی اور مذہبی قوتوں میں کسی ایسی کشمکش کے پیدا ہونے کا خوف نہ ہو سکتا تھا، جیسا کہ مغربی یورپ میں گیارھویں بارھویں اور تیرھویں

صدیوں میں پیدا ہو گیا تھا انتظام مملکت کی بنیادیں رومی قانون کے اصول پر تھیں اور سرکاری زبان بھی یونانی ہی تھی۔ فوج مختلف قوموں کے اجیر سپاہیوں پر مشتمل تھی اور حسن انتظام کی بدولت اپنا فرض بخوبی ادا کرتی تھی بارھویں صدی کے آخر تک فنون لطیفہ، تبحر علمی اور تمدن کا معیار قسطنطنیہ میں نہایت بلند تھا۔

قسطنطنیہ بطور خود ایک قلعہ تھا جس کی تسخیر ناممکن تھی مگر جزیرہ نمائے بلقان میں وحشیوں کی جماعتیں یکے بعد دیگرے چلی آ رہی تھیں۔ آٹھویں صدی میں سلاؤ قوم نے حملہ کیا اور پیلو پونیس تک پہونچ گئی۔ ان کے ایک گروہ عظیم نے یونان میں مستقل بود و باش اختیار کر لی نویں صدی کے آخر میں ایک جدید قوم وارد ہوئی۔ یہ بلغاری تھے جنکی فتح مند جماعتیں کورنتھ تک پہونچ چکی تھیں اور اندیشہ تھا کہ یہ جزیرہ نما میں تفوق حاصل کر لیں گے۔ مگر عین اس زمانے میں ایک زبردست شہنشاہ بے سل "بلغاریوں کا قاتل" تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا جس نے ۱۰۱۴ء میں انھیں زبردست شکست دی اس شکست سے بلغاریوں کا بہت بڑا نقصان ہوا۔ جو مصیبتیں انھوں نے اہل ملک پر ڈھائی تھیں اس کا بدلہ ان سے انتہائی بے دردی کے ساتھ لیا گیا۔ ہزاروں کی آنکھیں نکال لی گئیں اور اس حالت میں انھیں ان کے گھروں کی طرف واپس کر دیا گیا تاکہ ان کے ہم قوموں کو عبرت حاصل ہو اور وہ لوگ شہنشاہی علاقوں پر حملہ کرنے کی پھر جرات نہ کریں۔ دسویں صدی میں ایک دوسرا دشمن قسطنطنیہ کی فصیلوں تک پہنچ گیا جس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ آئندہ کن کن خطروں کا سامنا ہو گا۔ روس پر اہل شمال کا حال ہی میں قبضہ ہوا تھا اور ۱۰۴۳ء میں ان کا بیڑا بحیرۂ اسود سے ہوتا ہوا دارالسلطنت کے پاس لنگر انداز ہوا مگر یہ جہاز "آتش یونانی" سے بھگا دئے گئے اور انھیں پھر اسکی جرات نہ ہوئی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اطالیہ اور سسلی کے مقبوضات شہنشاہ کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ مگر ایشیائے کوچک میں ایک زرخیز علاقہ اس کے زیر حکومت تھا۔ نیز اساریا کا کوہستان بھی شہنشاہی کے زیرنگیں تھا جس کے باشندے بہت جنگجو تھے۔ مگر گیارھویں صدی میں اس نواح میں بھی ایک جدید خطرہ پیدا ہو گیا۔ ترکان آل سلجوق نے بغداد پر قبضہ کر کے اسلام میں ایک نئی روح پھونک دی تھی (۱۰۵۵ء) شام اور فلسطین پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ اور یروشلم کے مسیحی زائروں کو ان سے تکلیفیں پہنچنے لگیں۔

اور تمام یورپ زائروں کی داستان مصائب سے گونج اٹھا۔[1] ترک اس کے بعد ایشیائے کوچک میں گھس گئے۔ ۱۰۷۱ء میں مَن زِی کرت میں انھوں نے ایک شہنشاہی فوج کو شکست دی اور شہنشاہ کو گرفتار کر لیا۔

مسلمانوں کی طرف سے یورپ کو آٹھویں صدی کے بعد سے کوئی ایسا خطرہ نہیں ہوا تھا کیونکہ مشرق کے علاوہ مغرب میں بھی اُن کے فتوحات کا سلسلہ جاری تھا ہسپانیہ میں جو چھوٹی چھوٹی عیسائی سلطنتیں تھیں وہ کچھ کچھ سنبھلنے لگی تھیں مگر یہاں بھی مسلمانوں کا اقبال زور پر تھا اور ۱۰۸۶ء میں زلاقہ کی عظیم الشان جنگ میں مسیحیوں کو شکست ہوئی۔ اس طور سے آٹھویں صدی کی طرح سے پھر یورپ کے دونوں محاذوں پر خطرہ موجود تھا اور سخت ضرورت تھی کہ مسلمانوں[2] کو پیچھے ہٹا دیا جائے۔ پوپ گرے گری ہفتم نے جس کے کارنامے گیارھویں صدی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اہل یورپ کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر یہ سعی قبل از وقت تھی ۱۰۹۵ء میں پوپ اُربَن دوم نے ایک عظیم الشان مجلس کلیر مون میں منعقد کی۔ حاضرین کی تعداد اس قدر تھی کہ کسی ایک مکان میں اُن سب کے لئے گنجائش نکل سکتی نہ تھی چند فروعی امور کے تصفیے کے بعد پوپ نے مجمع کو مخاطب کیا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی سب کو ترغیب دی۔ اس نے معنے بدل کے انجیل کی ایک آیت پڑھی جس کا مطلب وہ نہ تھا جو اس نے بیان کیا تھا۔ مگر قرون وسطیٰ میں ہر قسم کی معنے آفرینیاں آئے دن ہوتی ہی رہتی تھیں۔ پادری نے آیت کا مطلب یہ بتایا کہ جو اپنی صلیب

---

[1] باخبر ناظرین سے مخفی نہ ہوگا کہ اس عہد میں مذہبی قوت (پوپ اور کلیسیہ) اور دنیاوی حکومتوں میں سخت کشمکش جاری تھی اور جیسا کہ خود فاضل مصنف نے صراحتہً یا کنایتہً بعض مقامات پر اس کتاب میں لکھا ہے۔ جنگ ہائے صلیبی کی اصل غایت یہ تھی کہ بادشاہ اور امراء اس طرف متوجہ ہو جائیں اور کلیسیہ کو اپنے منصوبے پورے کرنے کا موقع مل جائے۔

[2] ۔ فاضل مصنف نے یہاں (Heathen) (بت پرست) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کا اطلاق بقول آکسفورڈ ڈکشنری عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں پر نہیں ہوتا۔

نہ اُٹھائے گا اور میرے ساتھ نہ چلے گا وہ میرا پیرو نہیں"۔ حاضرین میں اس سے ایک مجنونانہ جوش پیدا ہوگیا اور سب چلا اٹھے "یہی خدا کی مرضی ہے یہی خدا کی مرضی ہے" سرخ کپڑوں کی صلیبیں اپنے سینوں پر لگا کر تمام لوگ اس عظیم الشان مہم کے لئے تیار ہوگئے۔ کیونکہ انھیں تائید آسمانی اور ہدایت خداوندی کا یقین ہوگیا تھا۔

جو لوگ ابتداءً اس جنگ میں شریک ہوئے ان کی نیک نیتی اور گرم جوشی میں کلام نہیں مگر آغاز تحریک کے بعد ہی اس خالص جذبۂ مذہبی میں حرص و ہوا، خود غرضی، ظلم و ستم، انتقام و منافرت اور قتال و خونریزی کے عنصر شامل ہوگئے منافرت صرف مسلمانوں ہی سے نہ تھی بلکہ غریب یہودی بھی جو مغرب میں آباد تھے گرفتار مصیبت ہوگئے۔ مالی نقصان کے علاوہ انھیں سخت جسمانی تکلیفیں بھی پہنچائی گئیں۔ اور طرفہ تماشا یہ تھا کہ ان بدکرداریوں کے بانی وہ لوگ تھے جو اُس سرزمین کو آزاد کرانے جارہے تھے "جہاں مسیح نے تمام بنی آدم کے لئے اپنی جان دی"۔

پہلی باقاعدہ جنگ صلیبی کے قبل مردوں عورتوں اور بچوں کا ایک انبوہ کثیر "پی ٹر" "زاہد" کے ساتھ روانہ ہوا جس کی مذہبی تقریروں اور زائروں کی تباہی کے تذکروں سے جنگ ہائے صلیبی کے لئے یورپ میں جوش پیدا ہوگیا تھا اس انبوہ میں کوئی نظام نہیں تھا کیونکہ ہر قدم پر انھیں معجزوں کے وقوع میں آنیکی امید تھی۔ اثنائے راہ میں انھوں نے سخت صعوبتیں برداشت کیں ان میں سے جو قسطنطنیہ پہونچے انھیں شہنشاہ نے ایشیائے کوچک کی طرف روانہ کردیا، کیونکہ وہ ان عجیب وغریب صلیبیوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ ایشیائے کوچک میں مسلمانوں نے ان کا کام تمام کردیا۔ مگر "پی ٹر" "زاہد" بچ گیا اور اپنی آرزوں کے پورے ہونے تک زندہ رہا۔

اس اثنا میں پہلی جنگ صلیبی کی تیاری ہو رہی تھی کوئی بادشاہ اس جنگ میں شریک نہیں ہوا۔ مگر مغربی یورپ کے امرا نے اپنے خدمات نہایت گرم جوشی سے پیش کئے۔ ان میں اہل فرانس زیادہ تر تھے۔ اور ان کی کثرت تعداد کی وجہ سے ایک وقایع نگار نے اس تحریک کا نام "جنگ صلیبی فرانس" رکھا ہے

جو بالکل بجا ہے۔

ریمون رئیس تولوز کے ساتھ پیپرؤوان سَال اور اطالیوں کی ایک جماعت تھی۔ دو نارمن سردار بوہے مون اور ٹانکریڈ جنوبی اطالیہ اور سسلی سے ایک فوج لے گئے شاہ فرانس کا بھائی ہیو رئیس ورمان ڈوئز فرانسیسیوں کا سردار تھا اور نارمنوں کا رابرٹ (شاہ انگلستان کا بھائی) تھا۔ گاڈفری رئیس بوائی لون رائین ندی کے نواح کے فرانسیسیوں اور جرمنوں کا سرغنہ تھا۔ اس تمام فوج میں کوئی سپہ سالار نہ تھا مگر اس مہم میں گاڈفری کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ فوجیں مختلف راستوں سے قسطنطنیہ پہونچیں۔ کچھ تو ڈینوب کی راہ سے گئیں کیونکہ ہنگری کا بادشاہ حال میں مسیحی ہو گیا تھا اور اس نے مسیحی فوجوں کو اپنے علاقے سے گزرنے کا بند وبست کر دیا تھا۔ اور کچھ سمندر کی راہ سے گئیں کیونکہ اطالیہ کی بحری سلطنتوں (پی سا، جی نوآ، وی نس وغیرہ) کے عروج کی بدولت مسلمانوں کے حملوں سے پناہ مل گئی تھی۔

قسطنطنیہ پہونچنے کے بعد ایک خاص دقت پیدا ہو گئی اور آخر کار اسی سبب سے مسلمانوں کے خلاف مسیحیوں کی کوششیں بالآخر عبث ثابت ہوئیں۔ سوال یہ تھا کہ جو علاقے ترکوں سے فتح کئے جائیں گے وہ کس کے قبضے میں رہیں گے ؟ شہنشاہ ایک رئیس کا دعوے تھا کہ جو ملک فتح کئے جائیں ان پر اس کا اقتدار اعلیٰ رہے۔ مگر حامیان جنگ صلیبی چاہتے تھے کہ یہ مقبوضات آزادانہ اپنے میں تقسیم کے لئے آزاد رہیں۔ بالآخر انھوں نے شہنشاہ کی وفاداری کا حلف لیا۔ مگر اس حلف کا انھیں کوئی پاس نہ تھا۔

آغاز مہم میں جو تعداد مسیحی مبارزوں کی بتائی جاتی ہے وہ بہت زیادہ تھی مگر اثنائے راہ میں یہ تعداد بہت گھٹ گئی۔ جنگ کے لئے وہ بخوبی تیار نہ تھے۔ انھیں زیادہ تر بھاری ہتیار والے جوانمردوں پر اعتماد تھا جن پر مغربی فوجوں کا دارومدار تھا۔ مگر آگے چل کر انھیں معلوم ہو گیا کہ سبک رفتار منگولوں کے مقابلے میں یہ نائٹ بے کار تھے۔ لیکن دست بدست جنگ میں انھیں فوقیت حاصل تھی۔ ایشیائے کوچک سے گزر کر انھوں نے انطاکیہ کو فتح کر لیا اور جو فوج اس شہر کی کمک کے لئے آئی تھی اسے شکست دی۔ اس کے بعد وہ یروشلم پہونچے۔ ان کی تعداد اب صرف پچیس ہزار رہ گئی تھی۔ جی نوا کے جہازوں کا ایک بیڑا یافہ کے قریب موجود تھا جس سے انھیں

پہلی اور چوتھی صلیبی جنگ

آلات محاصرہ کے لئے شہتیر مل گئے۔ ایک مذہبی جلوس بناکر انھوں نے پی ٹر زاہد کی سرکردگی میں شہر کا طواف کیا۔ مگر فصیلیں نہایت مضبوط تھیں اور دھاوے کئے بغیر فتح نہ ہوسکتی تھیں۔ ۱۵ر جولائی ۱۰۹۹ء کو ایک زبردست دھاوا کیا گیا۔ اور گادفری رمیس بوی لون اُن پہلے لوگوں میں تھا جو فصیل پر چڑھ گیا۔ اس مہم میں کامیابی ہوئی۔ مسیحیوں کے تمام افعال ان کے انتہائی مذہبی جوش اور دشمنوں سے منافرت پر مبنی تھے۔ دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا۔ پوپ کو حسب ذیل تحریر بھیجی گئی:-

"خدا ہمارے عجز وانکسار سے رام ہوگیا اور ہمارے عجز والحاج کے آٹھویں روز اس نے شہر کو دشمنوں سمیت ہمارے حوالے کردیا۔ . . . اور اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جو دشمن وہاں موجود تھے اُن کیسا ہم نے کیا سلوک کیا تو اسقدر لکھدینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمان کے معبد میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا۔"

اب صرف مفتوحہ علاقوں کو آپس میں تقسیم کر کے ان کا انتظام کرنا باقی تھا مگر فاتحوں کی کارروائیاں جاگیریت کے تباہ کن نظام پر مبنی تھیں۔ ایک واحد اور زبردست سلطنت قایم کرنے کے بجائے مفتوحہ علاقے چار لاطینی یعنے کاتھولیکی سلطنتوں میں تقسیم کئے گئے۔ اے ڈی سا کی سیاست پر بالڈون قابض ہوا، بوہی موں انطاکیہ کا رئیس ہوگیا۔ ری موں نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ یہ سب یروشلم کی حکومت شاہی کے تحت میں تھے جو گادفرے کے حصہ میں آئی۔ مگر اس نے بادشاہ کے خطاب سے انکار کر دیا اور "محافظ مقبرۂ مقدس" کا لقب اختیار کیا۔

زائروں کی امداد اور اس ملک کی حفاظت کے لئے جو نہایت دقت سے فتح ہوا تھا، خاص مذہبی سلسلے قایم کئے گئے جن میں سے نائٹ ٹیمپ لر، نائٹ پاس پٹالر اور سلسلہ ٹیوٹانک کے نائٹ قابل ذکر ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنی ذات میں راہبوں کے زہد و اتقا اور سپاہیوں کی بہادری اور جاں بازی کو یکجا کریں۔ مذہبی جوش بسا اوقات انتہائی بہادری کا محرک ہوتا ہے مگر راہبوں اور سپاہیوں کے خصایل کا مستقل اتحاد ناممکن ثابت ہوتا ہے۔ تعداد اور دولت کے لحاظ سے ان سلسلوں کو بہت فروغ ہوا اور نام آوری حاصل ہوئی مگر یہ نام آوری سپہ گری کے میدان میں تھی نہ کہ رہبانیت میں۔

مشرق کی لاطینی سلطنتیں غیر استوار ثابت ہوئیں۔ مسیحی فاتحوں کی تعداد بہت کم تھی، ان کی حیثیت محض ایک قلعہ نشیں فوج کی تھی۔ امراء کو ایک دوسرے سے حسد تھا اور دشمن کی قربت کے باوجود وہ آپس میں لڑنے سے باز نہ آتے تھے۔ شہنشاہیت مشرقیہ کو انھوں نے ترکوں کے حملوں سے بچا لیا تھا اور اس کے مقبوضات میں اضافہ ہوگیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کی تجارت بالکل تباہ ہوگئی کیونکہ وی نس جی نوا اور پی سا کے تاجروں کے قدم مشرق کے بندرگاہوں میں جم گئے تھے جس سے قسطنطنیہ کی تجارت قریب نصف کے ہوگئی۔ شہنشاہوں کو یہ نہایت شاق تھا اس لئے وہ اکثر اوقات اپنے مسیحی حلیفوں کے خلاف مسلمانوں سے ساز باز کر لیا کرتے۔

مسیحی سلطنتوں کی باہمی رنجشوں اور نقیضوں سے مسلمانوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ ۱۱۴۴ء میں اے ڈی سا پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ سینٹ برناڈ نے ایک نئی جنگ صلیبی

کے لئے وعظ شروع کیا۔ لوئی ہفتم شاہ فرانس اور شہنشاہ کون راڈ نے اس کا بیڑا اٹھایا مگر ان کی کوشش بے سود ثابت ہوئی اور برنارڈ نے ان کی ناکامی کو مغرب کی مسیحی سلطنتوں کی بدکرداری پر محمول کیا۔ مگر اس کے بعد ہی مشرق سے نہایت وحشتناک خبریں آنے لگیں جن سے مسیحیوں کو دوبارہ کمر ہمت چست کرنے کی ضرورت ہوئی۔

ایک زبردست مسلمان بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوا تھا جس نے مختلف اسلامی سلطنتوں کو متحد کر کے اپنے زیر نگیں کر لیا تھا۔ یہ سلطان صلاح الدین تھا جس کی جرات، فراخ دلی اور انسانیت کے افسانے اب تک مشہور رہیں۔ ان افسانوں میں ہر چند مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے مگر حقیقت سے دور نہیں ہیں۔ سلطان صلاح الدین نے مصر سے شام کا رخ کیا۔ مسیحیوں میں یروشلم کی سلطنت کی جانشینی کے متعلق سخت نزاعیں برپا تھیں، یہاں تک کہ طرابلس کے کاونٹ نے صلاح الدین سے اتحاد پیدا کر لیا تھا۔ بحیرہ تائی بے ریاس کے ساحل پر ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ ٹیمپلر اور نائٹ حقیقی صلیب کا ایک ٹکڑا لیکر مردانہ وار لڑے مگر صلاح الدین ایک بلائے بے درمان تھا اور اس کی فوج بھی زیادہ تھی اس لئے انھیں سخت ناکامی ہوئی صلاح الدین اس کے بعد یروشلم کی طرف متوجہ ہوا اور اسے فتح کر لیا (۱۱۸۷ء) مگر سلطان مفتوحین کے ساتھ نہایت انسانیت سے پیش آیا۔ مسیحی فتوحات کا شام میں اب صرف نام ہی نام باقی تھا، حالانکہ ان کے حاصل کرنے میں ہزارہا مسیحی کام آئے تھے اور ان کی شجاعت کے افسانے زباں زد خاص و عام تھے۔ اس لئے پھر صلیبی جنگ کی تحریک شروع ہوئی۔

دوسری جنگ کی طرح سے تیسری جنگ میں بھی بادشاہوں کو دخل تھا۔ شہنشاہ فریڈرک باربروسا، رچرڈ شیردل شاہ انگلستان اور فلپ دوم شاہ فرانس سب اس جنگ میں شریک ہونے پر رضامند ہو گئے تھے۔ ان بادشاہوں کو اپنی سلطنت کے کاروبار سے فرصت نہ تھی مگر پوپ کے دباؤ سے اپنے جھگڑوں اور منصوبوں کو خیرباد کہہ کے راہی مشرق ہوئے۔ کلیسہ کے اثر اور مذہبی مقاصد کے بغیر یہ جنگ کبھی نہ ہوتی مگر مسیحیوں کے سرگروہوں پر نہ تو مذہب کا اثر تھا اور نہ مقاصد میں یکجہتی تھی۔ جس سے اس جنگ میں ناکامی ہوئی۔ شہنشاہ فریڈرک ایشیائے کوچک

کی کسی ندی میں ڈوب گیا اور شاہ انگلستان اور شاہ فرانس اثنائے راہ میں لڑتے رہے اور جب ملک شام میں پہونچے تو وہاں بھی ان کی یہی حالت رہی۔ تاہم چند فتوحات انھیں بھی حاصل ہوئے۔ ۱۱۹۱ء میں قبرس فتح ہوا اور صلاح الدین کی فوج انھیں عکہ فتح کرنے سے نہ روک سکی۔ مگر فلپ فرانس واپس جانا چاہتا تھا کیونکہ صلاح الدین کی طرف سے اسے اتنا خطرہ نہ تھا جتنا کہ نارمن ڈی ین رچرڈ کی روز افزوں قوت سے۔ رچرڈ کچھ دن اور رہا اور اپنی شجاعت اور کمال سپہ گری کے جوہر دکھائے مگر انسانیت میں وہ صلاح الدین کے معیار سے بہت گرا ہوا تھا۔ عکہ میں اس نے اپنے قیدیوں کو قتل کر دیا برخلاف اس کے صلاح الدین نے یروشلم میں اسیران جنگ کو آزاد کر دیا۔ رچرڈ کے حالات زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیت کی تحریک محض لغو تھی، صلیبیوں پر مذہب کا اثر بہت کم تھا اور ان کے مذموم افعال سے کلیسیہ کی نیک نامی پر بھی حرف آتا تھا۔

دوسری اور تیسری صلیبی جنگوں سے کوئی اہم نتائج مترتب نہ ہوئے مگر چوتھی جنگ کو یورپ کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

پوپ انوسینٹ سوم اس جنگ کا حقیقی محرک تھا۔ اس کی پریشانیاں کم نہ تھیں مگر اس کی دیرینہ آرزو یہ تھی کہ عالم مسیحی کی فوجوں کو ان مسلمانوں کے خلاف متحد کرے جو ارض مقدس پر مدت سے قابض تھے۔ اس مہم میں اسے کچھ کامیابی ہوئی مگر اس کوشش میں وہ ایسی قوتوں کو حرکت میں لایا جو بہت جلد اس کے قابو سے باہر ہو گئیں اور بالآخر اس تحریک کے نتائج پر اسے کف افسوس ملنا پڑا جسے اس نے ایک مقدس فریضہ قرار دیا تھا۔ چوتھی جنگ میں بادشاہوں کے بجائے امراء کو زیادہ دخل تھا جو اکثر فرانس اور اس کے قرب وجوار کے تھے۔ سرغنوں میں تھیوبالڈ (شیم پین کا کاونٹ) بالڈون (فلاندرس کا کاونٹ) اور سائمن ڈی مانٹ فورٹ تھے۔ یہ لوگ وِی نِس پہونچے تاکہ جہازوں کے ذریعے سے راست شام کے سواحل پر پہونچ جائیں۔ شمالی اطالیہ کی تجارتی سلطنتوں نے صلیبی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور اس سے بہت مالی نفع حاصل کیا تھا۔ مشرق کے تمام بڑے بڑے بندرگاہوں میں انھوں نے تجارتی حقوق پیدا کر لئے تھے اور اس طرح قسطنطنیہ کی تجارت وِی نِس اور جی نوا کی

بندرگاہوں میں منتقل ہوگئی تھی۔ دوسرے شہروں کے مقابلہ میں وی نس کو مذہبی جنگوں سے بہت نفع حاصل ہوا تھا اور اسے اپنی قوت اور مواقع کا بخوبی احساس تھا۔ اس کا محل وقوع نہایت محفوظ تھا اور بحیرۂ ایڈریاٹک کی بحری قوتیں اس کا بال بیکا نہ کرسکتی تھیں۔ جزائر کی تمام آبادی کو اس نے ایک متحد حکومت کے تحت میں کرلیا تھا جس پر امرائی اور تجارتی رنگ غالب تھا۔ قسطنطنیہ میں اس نے پہلے ہی سے اہم تجارتی حقوق حاصل کرلئے تھے اور اسے جدید فتوحات کی قوی امید تھی جب کہ صلیبیوں نے اس سے ارض مقدس جانے کے لئے جہازوں کے فراہم کرنے کی درخواست کی۔ ان کے پاس نقد روپیہ نہ تھا اس لئے اہل وی نس نے ان کے ساتھ معاملہ نہایت سختی کے ساتھ کیا اور شرط پیش کی کہ جہاز انھیں اسی صورت میں مل سکتے ہیں کہ پہلے وہ زارا پر حملہ آور ہوں۔ یہ شہر ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر واقع تھا۔ اور مسیحی تھا مگر تجارت اور دریائی قوت میں وی نس کا رقیب تھا۔ وی نس کا ڈوج (رئیس اعلیٰ) بھی اس مہم میں شریک تھا باوجود اس کے کہ اس کی عمر نوّے سال سے کم نہ تھی۔ اور بالکل اندھا تھا۔ مگر اس کی ہمت بلند تھی۔ پوپ نے اس مہم کے خلاف میں صدائے احتجاج بلند کی کیونکہ صلیبی فوج ایک مسیحی شہر کی تسخیر کے لئے جارہی تھی۔ مگر زارا محاصرہ کے بعد فتح کرلیا گیا۔ اور وی نس کے حوالہ کردیا گیا۔ اس فتح کے بعد بھی یہ مہم ارض مقدس کی طرف روانہ نہ ہوئی۔ زارا کی لشکرگاہ میں ایک خوش آئند خبر آئی جس میں قسمت آزمائی کا زیادہ موقع تھا۔ اور جس سے وی نس کو زیادہ نفع کی امید ہوسکتی تھی۔ قسطنطنیہ کے محل شہنشاہی میں ایک زبردست مناقشہ پیدا ہوگیا تھا۔ متوفی شہنشاہ کا بیٹا الیکسس جو کہ موجودہ شہنشاہ کا بھتیجا تھا اپنے غاصب چچا کے خلاف صلیبیوں سے امداد طلب کرنے کے لئے وہاں پہونچا۔ اہل وی نس سے اس نے تجارتی مراعات کرنے اور صلیبیوں سے انھیں خاطر خواہ تنخواہ دینے کا وعدہ کیا۔ ان کے مذہبی جذبات کی تالیف کے لئے اس نے انھیں مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے اتحاد کا سبز باغ دکھایا۔ گو اس کی ضرورت نہ تھی اور صلیبیوں کو مذہب کا پاس کب تھا۔ اس لئے یہ سپاہی جنھوں نے مسلمانوں سے لڑنے کا حلف اٹھایا تھا۔ اور صلیب کا نشان لگائے ہوئے تھے پھر ایک دوسرے مسیحی شہر پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہ شہر قسطنطنیہ تھا جو

صدیوں سے مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپ کا حصن حصین تھا۔ حکمراں شہنشاہ کو تخت سے اتار کر انھوں نے الیگزیس چہارم کو تخت نشیں کرا دیا۔ مگر یہ ان کے ہاتھوں میں بالکل کٹ پتلی کی طرح سے تھا۔ اس لئے وہاں کے باشندوں نے اس کے اور اس کی حمایت کرنے والوں کے خلاف میں بغاوت کر دی۔ الیگزیس قتل ہو گیا اور اس کے قتل ہونے سے صلیبیوں کو شہر پر اپنی اغراض کے لئے حملہ کرنے کا معقول حیلہ مل گیا شہر کو قایم ہو کر نو صدیاں گذر چکی تھیں مگر اب تک کسی دشمن کا اس پر قبضہ نہیں ہوا تھا اور اگر اس کی بخوبی حفاظت کی جاتی تو قبضہ ہونا ناممکن تھا۔ مگر محافظ اول تو کمزور اور پھر بے ایمان تھے اس لئے صلیبیوں کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ ایک معاصر یہ چشم دید حالات بیان کرتا ہے کہ جب سے دنیا وجود میں آئی کبھی کوئی شہر اس برے طور سے نہیں لٹا۔ فنون لطیفہ اور آثار قدیمہ کے نادر نمونے جن کی قدر و قیمت سے اہل وینس اور ان کے حلیف واقف نہ تھے تباہ کر دیئے گئے۔ مگر سیم و زر کے خزانے اور قیمتی مصوّر پردے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے گئے اور تقسیم کر لئے گئے۔ شہر میں قتل عام ہوا مشرق کے بدعتی کلیسیہ کے عوض کیتھولک کلب روما کے نمونے پر قائم ہوا۔ اور صلیبیوں کی جماعت میں سے بالڈون رمیس فلاندرس شہنشاہ منتخب ہوا۔ وینس نے اپنی تجارت کے لئے شہر کے وسیع حصہ پر قبضہ کر لیا اور پیرانہ سال ڈوج کی تمام امیدیں بر آئیں۔ مگر اس کا یہ فعل خطرناک اور مہلک ثابت ہوا۔ گبن کا قول ہے کہ "یہ قسمت آزما سپاہیوں کی ایک زبردست غارت گری تھی جنھوں نے ریاکاری سے صلیبیت کا حلف لیا تھا" مسیحی یورپ کی سرحدوں کی حفاظت میں اس سے رخنہ پڑ گیا کیونکہ قدیم شہنشاہی کی طرح یہ نئی شہنشاہی قوی نہ تھی۔ ایشیا اور یورپ کے بعض بڑے بڑے علاقوں میں جدید لاطینی حکومت تسلیم نہیں کی گئی اور ۱۲۰۴ء سے صرف ۱۲۶۲ء تک قایم رہی۔ بالآخر کلیسیہ یونانی اور مشرق کے جذبۂ قومی نے اس کمزور لاطینی سلطنت کو تباہ کر دیا اور خاندان پےلوگی کے تحت میں ایک نئی یونانی شہنشاہی قایم ہوئی۔ مگر سابقہ قوت کبھی حاصل نہ ہوئی اور اسی چوتھی جنگ صلیبی کے قبیح اثرات کا نتیجہ تھا کہ دو صدیوں کے بعد ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس اندوہناک فتح کے بعد جنگ ہائے صلیبی کا حقیقی زمانہ ختم ہو جاتا ہے اور

چوتھی جنگ کے بعد ان جنگوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا بھی دشوار ہے کیونکہ پاپایان روما نے یہ قبیح عادت اختیار کرلی تھی کہ جس جنگ سے انھیں کچھ سروکار ہوتا اسے وہ "صلیبی" قرار دیتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف جو مہیں روانہ کی گئیں وہ کچھ بڑے پیمانہ پر تھیں ۱۲۱۸ء میں مصر کی تسخیر کے لئے ایک مہم روانہ کی گئی جسے پانچویں جنگ صلیبی کہتے ہیں مصر پر اس لئے حملہ کیا گیا کہ اسے اسلامی قوت کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ مہم کا کافرما پوپ کا نائب پی لاگیس تھا مگر وہ اسقدر درشت مزاج تھا کہ قطعی کامیابی نہ ہوئی۔ دمیاط پر قبضہ ہوگیا۔ جو دریائے نیل کے دہانے پر واقع ہے۔ مصر کے سلطان نے یروشلم حوالے کر دینے پر آمادگی ظاہر کی بشرطیکہ دمیاط کا تخلیہ کر دیا جائے مگر صلیبیوں نے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بالآخر شکست ہوئی اور نہ صرف دمیاط بلکہ تمام فتوحات ان کے قبضہ سے نکل گئیں۔ فریڈرک دوم (شہنشاہ جرمنی و شاہ سسلی و نیپلز) نے جو ۱۲۲۹ء میں یروشلم گیا زیادہ عقلمندی سے کام لیا۔ جنگ صلیبی میں وہ پوپ کے ایما سے شریک ہوا تھا چند روز کے بعد واپس آگیا۔ پوپ نے اسے کلیسیہ سے خارج کر دیا۔ مگر اسی حالت میں وہ دوبارہ روانہ ہوا۔ فلسطین میں پہونچکر اس نے سلطان مصر سے گفت و شنید شروع کی کیونکہ اپنی سلطنت میں مسلمانوں سے اس کے تعلقات اس قدر خوشگوار تھے کہ فلسطین میں ان سے نامہ و پیام کرنے میں اسے عار نہو سکتا تھا۔ فلسطین میں مسیحی زائرین کے داخل ہونے کی اس نے اجازت حاصل کرلی اور اپنا مدعا حاصل کرنے کے لئے صلاح الدین غازی سے وفاقی معاہدہ بھی حاصل کر لیا پہلی جنگ صلیبی کے بعد مسیحیوں کے لئے اس سے زیادہ مراعات کوئی حاصل نہ کر سکا تھا مگر جب فریڈرک واپس ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ کلیسیہ سے خارج ہونے کے باعث اور جنگ صلیبی میں شریک نہونے کی پاداش میں پوپ نے اس کی ریاست نیپلز کو بھی کلیسیہ سے خارج کر دیا تھا۔

جنگی فتوحات کی طرح یہ سفارتی کامیابی بھی عارضی ثابت ہوئی۔ مسلمانوں میں خانہ جنگی چھڑ گئی تھی مگر مسیحیوں نے اس سے کوئی نفع نہ اٹھایا۔ سلطان مصر نے اپنے دشمنوں پر غالب آکر باقیماندہ مسیحی فوجوں کو شام سے نکال دیا۔ ۱۲۴۴ء میں یروشلم پر مسلمانوں کا پھر قبضہ ہوگیا۔ اور اس تاریخ سے کسی مسیحی سلطنت کا اس پر قبضہ نہیں ہوا۔

مگر صلیبی تحریک کے ختم ہونے کے قبل اسے یہ شرف حاصل ہوا کہ فرانس کے بادشاہ سینٹ لوئی نے اس میں شرکت کی۔ عہد وسطے کے مسیحی بادشاہوں میں اپنے تقدس کی وجہ سے اس کا خاص درجہ تھا اور اس کی شرکت بے لوثی اور بے نفسی پر مبنی تھی۔ سینٹ لوئی فرانسیسی فوج کے ساتھ ۱۲۴۸ء میں راہی مصر ہوا۔ اس مہم کا مورخ ژوآن ول بھی اس کے ہمرکاب تھا۔ تاریخ میں اس نے بادشاہ کے تقدس کی نہایت دلفریب تصویر کھینچی ہے مگر اس کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں کامیابی کی امید شروع ہی سے بہت کم تھی۔ دمیاط فتح کرکے مسیحی فوج نے قاہرہ کی طرف پیش قدمی کی مگر منصورہ میں اسلامی فوج نے اسے بری طرح شکست دی۔ مسیحی فوج کی ایک تعداد قلیل بچکر ساحل کی طرف روانہ ہوئی مگر بیماری اور دشمن کے حملوں سے تنگ آکر سینٹ لوئی نے ہتیار ڈالدیئے تاکہ مسلمان اس کے سپاہیوں کے ساتھ بہتر سلوک کریں۔ دمیاط کے تخلیئے کے علاوہ اسے ایک رقم کثیر بطور زرفدیہ دینا پڑی۔ آزاد ہونے کے بعد وہ فلسطین پہونچا تاکہ وہاں کی باقی ماندہ محافظ فوجوں کی ازسرنو تنظیم کرے۔ اس نے اپنا کام نہایت خوبی کیساتھ انجام دیا مگر اس کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں کیونکہ مشرق سے اس کے روانہ ہوتے ہی مغلوں نے بیبرس کی سرکردگی میں حملہ کردیا۔ انطاکیہ اور یافہ اس کے قبضے میں ۱۲۶۸ء میں آگئے۔ عکہ کے مسیحیوں نے کچھ روز مقابلہ کیا مگر ۱۲۹۱ء میں یہ شہر بھی فتح ہوگیا اور باوجود اپنا خون بہا دینے اور مردانہ وار کوششوں کے فلسطین میں مسیحیوں کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ اپنے انتقال سے قبل سینٹ لوئی نے ہنری سوم شاہ انگلستان کے بیٹے ایڈورڈ کی امداد سے تونس پر حملہ کیا تاکہ وہاں کے سلطان کو مسیحی ہونے پر مجبور کرے۔ مگر اس کی فوج طاعون کی نذر ہوگئی اور اس نے خود بھی ۱۲۷۰ء میں انتقال کیا۔ حقیقی صلیبیوں کا اس کی آنکھ بند ہوتے ہی خاتمہ ہوگیا۔

اس کے بعد متعدد تحریکیں وقوع میں آئیں جو جنگ ہائے صلیبی کہی جاتی ہیں۔ مگر دراصل اس اصطلاح کا اطلاق ان پر نہیں ہوسکتا۔ پوپوں کی یہ روش ہوگئی تھی کہ جب کسی جنگ میں وہ شریک ہوتے اور انھیں امداد اور تقویت کی ضرورت ہوتی تو وہ اس جنگ کو جنگ صلیبی قرار دیتے تھے۔ اور ان میں شریک ہونے والے کو وہی مراعات عطا کرتے تھے جو گادفرے رئیس بوئی لون اور سینٹ لوئی کے ہمراہیوں

کے ساتھ ملحوظ رکھے گئے تھے مگر یورپ اب اس صدا پر لبیک کہنے کو تیار نہ تھا اور دنیاوی لڑائیوں کو جو حرص ہوا اور انتقام پر مبنی تھیں، مذہبی قرار دینے سے کلیسیا کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان لڑائیوں کا نتیجہ دراصل کیا ہوا ہے مشرق میں مسیحیت کو کسی قسم کا نفع ان سے نہ ہوا اور براعظم ایشیا میں کوئی مسیحی فوج باقی نہ رہی روڈز اور قبرس پر علی الترتیب ۱۵۲۲ء اور ۱۵۷۱ء تک مسیحیوں کا قبضہ تھا اور چودھویں اور پندرھویں صدی میں اس قبضے کی وجہ سے ترکان آل عثمان کی پیش قدمی میں رکاوٹ ضرور ہوئی مگر اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ چوتھی جنگ صلیبی سے قسطنطنیہ کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس لئے یہ کہنا قطعی بیجا ہے کہ جنگ ہائے صلیبی نے یورپ کو بچا لیا۔

جنگ ہائے صلیبی کے بالواسطہ نتائج البتہ عظیم الشان اور دیرپا تھے۔ اطالیہ کے شہروں کی تجارت کو فروغ انھیں لڑائیوں سے ہوا اور اسی تجارت کی بدولت انھیں فنون لطیفہ میں بھی کمال حاصل ہو گیا اور حکومت بلدی کو ترقی ہو گئی۔ وی نس کو سب سے زیادہ نفع ہوا۔ گو اپنے فتوحات کو مستحکم کرنے کے لئے اسے جی نوا سے دست و گریباں ہونا پڑا۔ مشرق اور مغرب کے جدید تعلقات سے دوسرے مفید نتائج بھی مترتب ہوئے مثلاً یورپ میں نئے اناج، پھل، درخت، مسالے اور کپڑے آنے لگے۔ مشرقی فنون لطیفہ سے یورپ اور خصوصاً وی نس کے فنون متاثر ہوئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یورپ پر مشرق کے تخیلات کا بھی اثر پڑا۔ یورپ کے مسیحی محض اس زعم میں جنگ کے لئے مستعد ہوئے تھے کہ خدا انھیں کامیاب کرے گا کیونکہ وہ اسکی راہ میں جنگ پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مگر نتیجہ یاس انگیز ثابت ہوا۔ کیونکہ فتوحات عارضی تھے اور ہزیمتیں قطعی کثیر نقصان جان و مال کے باوجود مسیحی سرحدوں میں کوئی وسعت نہ ہوئی۔ ہوش مند افراد نے ان باتوں پر ضرور غور کیا ہوگا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشرق میں مسلمانوں کے فتوحات سے جنوبی فرانس میں الحاد کا زور ہو گیا تھا۔

اپنے مخالفوں کے ساتھ کلیسیا کا جو برتاؤ تھا اس میں ان لڑائیوں کی وجہ سے

اور بھی برا ہو گیا اور مذہبی مظالم میں اضافہ ہو گیا۔ مذہبی مخالفوں کے خلاف کسی اعلان جنگ کی ضرورت باقی نہ رہی کیونکہ انھیں لقمۂ اجل بنانے کے لئے خود انکا مذہب ہی ایک کافی جرم تھا۔ دوسری اور تیسری لڑائیوں کے زمانہ میں یہودیوں کے قتل عام اور جنوبی فرانس کے ملحدوں کے خلاف (برائے نام) مذہبی جنگ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس اصل کا اطلاق مغربی یورپ میں ہو سکتا تھا۔ انسداد الحاد کے لئے جو مذہبی عدالتیں (Inquisition) قائم ہوئیں وہ بھی عدم رواداری کے اس اصول پر مبنی تھیں۔
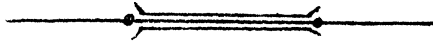
باب ہفدہم

تاریخ برطانیہ از ۱۰۶۶ء تا ۱۳۰۷ء

اتحاد قومی اور پارلیمنٹ کا آغاز

عہد زیر تذکرہ میں تاریخ انگلستان کی تین نمایاں خصوصیتیں نظر آتی ہیں۔ اول یہ کہ دوسرے ہم رتبہ ممالک کے مقابلے میں شاہی حکومت زیادہ قوی تھی۔ دوسرے انگریزی قوم میں باہمی اتحاد بڑھ رہا تھا اور انھیں اپنی ہستی کا احساس ہونے لگا تھا۔ تیسرے یہ کہ انگلستان میں نیابتی حکومت قایم ہوچکی تھی۔ ہر چند اس نیابتی حکومت کی مثالیں دوسرے ممالک میں بھی ملتی ہیں مگر یورپ کی کسی دوسری سلطنت میں اس طریقۂ حکومت کو اتنی کامیابی اور استواری نصیب نہیں ہوئی۔

(۱)

پہلی دونوں خصوصیتیں ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں بلکہ ایک ہی واقعے کی دو شکلیں ہیں۔ قوم کے متحد ہونے کی وجہ موجہ یہ تھی کہ شاہی حکومت زبردست تھی نارمن بادشاہوں سے بعض مظالم بھی سرزد ہوئے۔ مگر انگلستان کی جو سب سے بڑی خدمت انھوں نے کی وہ یہ تھی کہ انھوں نے مختلف اقطاع ملک کے ان تمام انفرادی خیالات کو دبا دیا جو اتحاد و شیرازہ بندی کے خلاف تھے اور مروجہ نظام جاگیری ـــــ سے وہ

منافی اتحاد آوارگی نہ پیدا ہونے دی جو فرانس اور جرمنی کی تاریخ میں اس نظام سے منسوب کی جاتی ہے۔ وہ زمانہ قریب تھا کہ شہری اور دیہاتی امرا اور عوام ملکر ایک مشترک حکومت قائم کریں۔ انگلستان میں وہ پیچیدگیاں پیدا نہ ہوئیں جو اس زمانہ میں فرانس اور جرمنی میں موجود تھیں۔ جہاں شارلیمین کی شہنشاہی تہ و بالا ہو جانے کے بعد نظام جاگیری از خود وجود میں آگیا تھا۔ امرائے جاگیری کے سرخیل عملاً شاہی اقتدار رکھتے تھے اور انکی حیثیت مقامی بلکہ قومی سرداروں کی سی تھی۔ اپنے مفاد کے لحاظ سے وہ بطور خود جنگ کر سکتے تھے اور جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کو جنگ میں شریک ہونے پر مجبور کر سکتے تھے اسی طرح یہ لوگ بھی اپنے کاشتکاروں کو میدان جنگ میں لاتے تھے اعلیٰ عدالتی اختیارات بھی انھیں حاصل تھے اور بعض اوقات اپنے نام کے سکے بھی جاری کرتے تھے گو یہ حق لوازمات شاہی میں سے تھا۔ فرانس میں تیرھویں صدی کے وسط تک بعض اضلاع ایسے تھے جن میں قانوناً بادشاہ کی فرمانبرداری لازم تھی اور بعض ایسے تھے جن میں لازم نہ تھی۔

انگلستان کی حالت بالکل اس کے برعکس تھی۔ ولیم فاتح نے راسخ عزم کر لیا تھا کہ انگلستان میں جاگیریت کے وہ قبیح اثر پیدا نہ ہونے پائیں جن سے وہ فرانس میں دوچار ہوا تھا۔ انگلستان کی فتح کے بعد اسے موقع مل گیا کہ اس ملک میں جو سیاسی نظام چاہے جاری کرے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ کس فراست سے اس نے امراء کے علاقوں کو مختلف حیثیتوں سے تقسیم کر دیا تھا اور ان کے اختیارات بھی کم کر دیئے تھے۔ اور زمانہ مابعد اس بات کا شاہد ہے کہ آخر کار اس کی یہ تدبیریں کارگر ہو کر رہیں۔ امرائے فرانس کی طرح امرائے انگلستان بھی یہ آرزو رکھتے تھے کہ وہ بہ حیثیت مجموعی سلطنت کی قوت کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ ولیم دوم ہنری اول اور اسٹیفن کے عہد ہائے حکومت اس کشمکش سے لبریز نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف انگلستان کے بادشاہوں کو صرف معمولی امرا ہی کے ہاتھوں زحمت اٹھانا نہیں پڑی بلکہ زیادہ تر اس کے خاندان والوں نے اسے تکلیفیں پہنچائیں۔ چنانچہ ۱۰۸۸ء میں ولیم روفس پر اس کے بھائی رابرٹ نے حملہ کیا تھا جو نارمنڈی پر حکمراں تھا۔ اور امرائے انگلستان اوڈو (بایوکا اسقف) کی سرکردگی میں اس کے معاون تھے۔ واضح رہے کہ

ولیم روفس بے رحم اور ظالم تھا پھر بھی انگریزوں سے وہ امداد طلب کر سکتا تھا۔
چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور انگریزوں کی اعانت سے اس نارمن بادشاہ کو نارمن
امرا پر فتح حاصل ہوئی۔ اس قسم کی دوسری بغاوت ہنری اول کے عہد حکومت میں
ہوئی تھی جب کہ رابرٹ رئیس نارمن ڈی نے پھر شاہ انگلستان کے خلاف تلوار اٹھائی
تھی اس وقت انگلستان کے بدخواہ امرا اس سے ملے ہوئے تھے۔ ان امرا کا سرغنہ رابرٹ
رئیس بلیسم تھا جو انگلستان اور نارمنڈی کے بعض وسیع علاقوں پر حکومت کرتا تھا
اور شروز بری کے سرحدی ارل ہونے کی وجہ سے انگلستان کے دوسرے امرا کے
مقابلے میں اسے بہت زیادہ آزادی حاصل تھی۔ یہ جدو جہد نہایت سخت تھی۔ اگر
انگلستان کے دیسی باشندے باغیوں کا ساتھ دیتے تو شاہی حکومت مزید خطرے میں پڑ جاتی
مگر حسب سابق انگریز یا تو بالکل الگ تھلگ رہے یا بادشاہ کی سرگرمی کے ساتھ
اعانت کرتے رہے۔ رابرٹ بلیم کا بہت زبردست قلعہ برج نارتھ میں تھا۔ اس کے
فتح ہو جانے کے بعد اس نے نارمنڈی میں پناہ لی۔ لیکن آگے بڑھکر اسٹیفن کی
حکومت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی حکومت کی قوت کی بدولت اہل انگلستان
کن مصائب سے بچ گئے۔ ہنری اول کا جب انتقال ہوا تو اس کا کوئی جائز بیٹا
نہ تھا جو اس کا جانشین ہوتا۔ اس لئے اس نے کوشش کی کہ اس کی بیٹی میٹلڈا
اس کی جانشین ہو۔ اس کی شادی پہلے شہنشاہ ہنری پنجم سے ہوئی تھی اور اسی وجہ سے
وہ شہنشاہ بیگم مٹل ڈا کے نام سے مشہور رہی۔ اس کی دوسری شادی جیا فری پلین ٹاجی
نیٹ، کاونٹ آنجو سے ہوئی جس سے ایک بیٹا یعنے انگلستان کا جلیل القدر بادشاہ
ہنری دوم پیدا ہوا۔ مگر عورت کے بادشاہ ہونے کی اس وقت تک کوئی نظیر نہ تھی
اور پھر وہ ہر دلعزیز بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے امرائے اسٹیفن کو جو ولیم فاتح کا نواسہ تھا
بادشاہ بنا دیا۔ یہ شخص شجاع ہر دلعزیز اور بہادر تھا۔ اور اخلاقی حیثیت سے ہنری دوم سے
بہتر تھا مگر اس سے بھی ایسی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی تاریخ انگلستان میں نظیر
نہیں مل سکتی۔ مٹل ڈا اور ہنری برابر اس کی مخالفت پر آمادہ تھے۔ کیونکہ انگلستان
کے تخت و تاج کو وہ قانوناً اپنا خیال کرتے تھے۔ ان کے حملوں کو دفع کرنے کے لئے
انگریزوں کی اعانت کے بجائے اسٹیفن نے امرائے جاگیری سے امداد چاہی اور

ان پر اسقدر آزادی اور مراعات کی بارش کی جس کی فتح انگلستان کے بعد کوئی نظیر نہیں تھی۔ امرائے بڑے بڑے زبردست قلعے بنائے اور من مانی حکومت کرنے لگے ان کے مظالم کے متعلق ممکن ہے کہ مبالغے سے کام لیا گیا ہو مگر ایک معاصر وقائع نگار بیان کرتا ہے کہ اس بادشاہ کے زمانے میں جرایم اور تباہی و بربادی کا سلسلہ جاری تھا اور مجرموں سے نہ کوئی پرسش ہوتی تھی اور نہ انھیں سزا ہی کا خوف تھا۔ اس عہد میں انگلستان کی بعینہ فرانس اور جرمنی کی سی حالت تھی۔ مگر اسٹیفن کے اکلوتے بیٹے کا مرجانا انگلستان کے لئے رحمت ثابت ہوا کیونکہ اس سے دونوں دعویداران حکومت میں یہ سمجھوتہ ہوگیا کہ اسٹیفن اپنے حین حیات تک حکومت کرے اور اس کے مرنے کے بعد ہنری اس کا جانشین ہو اس لئے ہنری دوم ۱۱۵۴ء میں بلا کسی مزید پرخاش کے بادشاہ ہوگیا۔

قرون وسطیٰ میں ہنری سے زیادہ نمایاں حیثیت کا بادشاہ شاید ہی کوئی گزرا ہو۔ ہم اس کی سیاسی اہمیت کا ذکر کر چکے ہیں۔ فرانس میں بھی اسے دخل تھا کیونکہ اس ملک کا تقریباً نصف حصہ اس کے قبضے میں تھا۔ انگلستان میں بھی اسکی حکومت نہایت ہی اہم ہے۔ اس کی خارجی حکمت عملی بھی نہایت قوی تھی۔ کلیسیہ اور اسقف اعظم بے کیٹ کے ساتھ کلیسائی تفوق کے معاملے میں ایک عرصہ تک جدوجہد جاری رہی۔ آئرلینڈ پر اس نے حملہ کیا اور حکومت انگلستان کو منتظم بنا دیا۔ چنانچہ ہم اس آخری امر پر بحث کریں گے۔ بارھویں صدی میں اس نے ثابت کر دیا کہ ایک زبردست شاہی حکومت فی الحقیقت کیسی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات سے بجائے خود ایک "سلطنت" تھا یعنی سلطنت میں کوئی اور فرد یا جماعت اس کے افعال میں مخل نہ ہوسکتی تھی۔ فرانس میں یہ بات صدیوں کے بعد لوئی چہار دہم کو حاصل ہوئی۔ اس نے شخصی مطلق العنان حکومت قایم کی جس سے قوم کو ترقی کرنے کا موقع ملا۔ ایک قومی پارلیمنٹ وجود میں آئی اور بالآخر قومی حکومت قائم ہوگئی۔

اولاً اس نے امرا کا کام تمام کیا۔ ان کے نئے قلعے مسمار کر دیئے گئے۔ رشی لیو نے بھی سترھویں صدی میں فرانس میں یہی کیا۔ بہت سی جاگیریں امرا سے چھین لی گئیں اور انھوں نے بلا چون و چرا اطاعت قبول کر لی۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ وہ

ایک زبردست بادشاہ کے پنجے میں آگئے ہیں۔ شاہی اقتدار کو رفتہ رفتہ ترقی دینے کے بجائے انگلستان کے بادشاہوں کا مقصد اب تک صرف یہ تھا کہ امرا کی قوت بڑھنے نہ دیں۔ یہ کام بالآخر ہنری دوم نے کیا۔ اسے نظام عدالتی کی طرف بہت توجہ تھی کیونکہ ابھی تک اس کا کوئی خاص نظام قایم نہیں ہوا تھا۔ انگلستان کی قومی عدالتیں اب تک قایم تھیں اور ان کے دوش بدوش جدید نارمن عدالتیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک ایسی معدلت کی بنیاد ڈالی جس پر اس وقت انگلستان کا عدالتی و انتظامی نظام قائم ہوا ہے یا بہ الفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے حکومت آئینی قائم کر دی۔

اولاً اس نے دورہ کرنے والے جج مقرر کئے جو تمام ملک کا دورہ کر کے مختلف عدالتوں کی صدارت کرتے تھے۔ شارلی مین کے زمانہ میں بھی قریب قریب یہی طرز عمل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہم مقدمات میں امرا دخل نہ دے سکتے تھے۔ ان عدالتوں میں جس قانون پر عمل ہوتا تھا وہ شاہی قانون تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امرا کی عدالتوں کی اہمیت زائل ہو گئی۔

اس کے بعد ججوں کی امداد کے لئے جیوریاں مقرر کی گئیں۔ جیوری کا لفظ تمام دنیا میں مشہور ہو گیا ہے مگر اس زمانے میں اس کے وہ معنے نہ تھے جس سے اس وقت ہمارے کان آشنا ہیں ہنری دوم کے زمانے میں جیوریاں ضلع کے سربرآوردہ افراد پر مشتمل تھیں جن کا کام یہ تھا کہ دورہ کرنے والے ججوں کے سامنے اپنے ضلع کے جرایم پیشہ افراد کے نام پیش کریں جن پر الزامات قائم کر کے ان کے مقدمات کی سماعت ہوتی تھی۔ جیوری کے ذریعے سے ان مقدمات کی سماعت بھی ہونے لگی جن میں پہلے "فیصلہ بذریعہ جنگ" کا وحشیانہ طریقہ رائج تھا۔

انگلستان کے نظام فوجی کی تنظیم میں بھی اہم تغیرات عمل میں آئے ۱۱۸۱ء کے قانون اسلحہ کی رو سے تمام احرار پر یہ لازم کر دیا گیا کہ اسلحہ تیار رکھیں اور ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کے مقابلے میں سلطنت کی حفاظت کے لئے تیار رہیں۔ انگلستان کے چھوٹے زمینداروں سے فوجی خدمات لینے کا طریقہ روز بروز متروک ہوتا جاتا تھا۔ بیرونی ممالک پر جو مہمیں بھیجی جاتی تھیں ان کے اخراجات کی پابجائی کے لئے ہنری نے ایک محصول اسکوٹج کے نام سے (زر سپر) جاری کیا جس کے ادا کرنے سے فوجی خدمت

معاف ہو جاتی تھی اور پادشاہ کو موقع ملتا تھا کہ فرسودہ جاگیری فوجوں کے بجائے ان سے بہتر سپاہی بھرتی کرے جو صرف اس کی ذات سے وابستہ ہوں۔

ان تدابیر کی بدولت ملک بہت جلد متحد ہو رہا تھا۔ زبان و رواج کا ابھی تک نارمنوں اور انگریزوں میں بہت اختلاف تھا مگر روز بروز مٹتا جاتا تھا۔ بادشاہ کی روز افزوں قوت سے امرا کی آزادی کا دروازہ بند ہو گیا تھا اس لئے وہ عامۂ قوم یعنی انگریزوں کی تائید حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہنری دوم جب تک برسر حکومت رہا انھیں سرتابی کا موقع نہ مل سکا مگر ان دونوں قوموں (یعنی انگریز اور نارمن) کے نتائج اتحاد اس وقت سامنے آئے جب کہ ایک کمزور اور غیر ہر دلعزیز بادشاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔

(۲)

باب کے اس حصے میں ہم نظام حکومت اور عام انتظامات کے علاوہ ان دیگر امور پر بھی بحث کریں گے جو ولیم فاتح کے انتقال (۱۰۸۷ء) سے ہنری دوم کے انتقال تک حکام انگلستان کے پیش نظر تھے۔

سب سے پہلے تو کلیسا اور شاہی حکومت کے تعلقات کا معاملہ تھا جسے اس وقت یورپ میں خاص اہمیت حاصل تھی اور جس کے باعث حکام انگلستان کو سخت دقتیں اٹھانا پڑتی تھیں۔ نارمن بادشاہ کلیسا کے قدرداں تھے اور اسے اپنا فائدہ رساں حلیف خیال کرتے تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے گرجے تعمیر کئے اور کلیسا کو پہلے سے زیادہ آزادی دی۔ ان کے معتمد علیہ وزرا میں اکثر پادری تھے۔ دوسری طرف پوپ اور انگلستان اور روما کے سربرآوردہ پادری نارمن بادشاہوں کے مداح تھے اور ان سے ان کی امیدیں وابستہ تھیں مگر اس مصالحت کے باوجود جانبین میں ایک سخت جد وجہد پیدا ہو گئی جس کے واقعات اسی قدر دردناک تھے۔ جتنے کہ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم کی جنگ کے واقعات تھے۔ دراصل انگلستان میں جو واقعات اس ضمن میں ہوئے ان کا اس عام کشمکش سے تعلق تھا جو کلیسا اور دنیاوی قوتوں کے درمیان اس وقت جاری تھی۔

اس جد وجہد میں دو جلیل القدر پادریوں کا نام آتا ہے۔ پہلا اینسیلم تھا

جو سینٹ کے لقب سے مشہور رہوا۔ یہ شخص بیک واقع نارمن ڈی کا راہب تھا اور اپنے علم وفضل اور خصایل حمیدہ کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا۔ کینٹربری کے اسقف اعظم لان فرانک کے انتقال کے بعد شاہ ولیم نے اس خدمت کو ایک عرصہ تک خالی رکھا تھا کہ اس کی آمدنی سے خود مستفید ہو۔ مگر ایک طولانی علالت کے سلسلہ میں اپنی اس حرکت پر نادم ہو کر اس نے اینسیم کو مقرر کیا۔ لیکن دونوں میں بہت جلد ان بن ہو گئی۔ اسقفوں کے تقرر کے مسئلہ نے اس وقت نہایت نازک شکل اختیار کر لی تھی۔ اور اس وقت یہ امر زیر بحث تھا کہ اسقفوں کو پوپ کی فرماں برداری کرنی چاہیئے یا بادشاہ کی۔ یہ مسئلہ ایسا نہ تھا جس کا تصفیہ جانبین کے نیک ارادوں سے ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے بہت کچھ غور و فکر اور تجربہ کی ضرورت تھی قبل اس کے کہ کلیسا اور سلطنت کے فرائض میں ایک حد فاصل قایم کی جا سکتی۔ اینسیم نے اجازت چاہی کہ روما جا کر اپنے عہدہ کا خلعت پوپ کے ہاتھوں سے حاصل کرے مگر ولیم نے انکار کر دیا۔ بالآخر اینسیم جلاوطن ہو کر نارمن ڈی چلا گیا۔

ہنری اول کے تخت نشین ہونے سے بھی مصالحت کی کوئی صورت نہ نکلی گو وہ عالم و فاضل اور مذہب کا دلدادہ تھا۔ یہ سوال اب بھی باقی تھا کہ اسقف اعظم پوپ کا تابع فرمان ہے یا بادشاہ کا۔ مگر بادشاہ کے علم وفضل کی بدولت بحث و مباحث میں سابقہ وحشیانہ پن باقی نہ رہا تھا اور چند روز کے بعد مصالحت ہو گئی جس کی شرائط قریب قریب وہی تھیں جو زمانۂ ما بعد میں پوپ نے ورمس کے معاہدہ کی رو سے تسلیم کرلیں۔ پادشاہ اپنے اس دعوے سے دست بردار ہو گیا کہ اسقف اعظم کو اس کے روحانی فرائض کے نشانات عطا کرے اور اسقف اعظم اس امر پر راضی ہو گیا کہ اپنی جاگیر کے لئے بادشاہ کی ماتحتی کا اعتراف کرے۔

ہنری دوم کے زمانے میں بھی اسی قسم کی نزاع پیدا ہو گئی جس کے نتائج اندوہناک ثابت ہوئے۔ ٹامس بے کیٹ لندن میں پیدا ہوا تھا اور اس کے والدین نارمن تھے۔ یہ ایک عجیب وغریب شخص تھا جس کی سیرت ایک معمے کی حیثیت رکھتی تھی علم وفضل اور حسن اخلاق کے علاوہ بہت کچھ عملی قابلیت بھی رکھتا تھا۔ پہلے بادشاہ کا وزیر تھا

اور بادشاہ کی اُس نے اس قدر وفاداری کے ساتھ خدمت کی تھی اور اُس کے حقوق کی تائید کی تھی کہ جب کین ٹربری کے اسقف اعظم کی خدمت خالی ہوئی تو بادشاہ نے اُس کا تقرر خدمت مذکور پر اس امید سے کرا دیا کہ کلیسا کی قوت اور اثر سے کام لے کر میری تائید کرے گا۔ مگر بادشاہ نے کیٹ کی سیرت کو بخوبی سمجھا تھا۔ "جو کام وہ کرتا تھا پوری دل دہی سے کرتا تھا۔ اس نے متعدد آقاؤں کی فرماں برداری کی، مگر ایک وقت میں اُس کا ایک ہی آقا تھا۔ اُس کا آقا پہلے اسقف تھا، پھر بادشاہ اور اُس کے بعد خدا۔"

یہ نزاع کلیسا کی آزادی اور اُس کے جداگانہ نظام سے متعلق تھی۔ پادریوں کا یہ مطالبہ تھا کہ اُن پر جو مقدمات ہوں اُن کی سماعت انھیں کی عدالتوں میں ہو اور سرکاری عدالتوں کو اُن کے متعلق اختیارات سماعت نہ ہوں۔ لیکن کلیسا کا قانون نہایت نرم تھا اور ملکی قوانین نہایت سخت تھے، اس کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی پادری سرقہ یا قتل یا کسی اور سخت جرم کا مرتکب ہوتا تو اُسے محض خفیف سی سزا ہوتی، اس کے برخلاف اگر کوئی معمولی آدمی ان جرموں کا مرتکب ہوتا تو اُسے سزائے موت دی جاتی۔ موجودہ تخیلات کے لحاظ سے اس نظام پر بادشاہ کا اعتراض بالکل بجا تھا مگر بیکیٹ کا یہ خیال تھا کہ کلیسا کا فرض یہ ہے کہ اپنے معاملات کے انصرام کے لئے ایک ایسا معیار رکھے جو سلطنت کے معیار سے اعلیٰ ہو۔ کلیسا اپنی جداگانہ ہستی برقرار رکھے اور سلطنت کے لئے ایک نمونہ قائم کرے۔ ۱۱۶۴ء میں بادشاہ نے "دستور کلیرینڈن" کے سولہ دفعات نافذ کئے جن میں یہ اصول ملحوظ رکھا گیا تھا کہ پادری سلطنت کے ماتحت ہیں۔ ان دفعات میں اہم تیسری تھی جس کا منشا یہ تھا کہ اگر کوئی پادری کسی جرم کا مرتکب ہو تو اس کے متعلق تحقیقات کلیسا کی عدالتوں میں ہو اور اگر جرم ثابت ہو جائے تو وہ اپنے مذہبی منصب سے علیحدہ کر دیا جائے اور اس کے بعد حکومت اُسے عام ملزموں کی طرح سزا دے۔ بیکیٹ نے پہلے تو یہ تجویزیں منظور کر لیں مگر پھر منکر ہو گیا۔ مصالحت کی کوششیں ہوئیں مگر بیکیٹ انگلستان سے بھاگ گیا۔ تاہم مصالحت سے ناامیدی نہیں ہوئی لیکن بیکیٹ اقتدار شاہی کی مخالفت سے باز نہ آتا تھا۔ ۱۱۷۰ء میں چار نائٹ

اس امر پر مستعد ہو گئے کہ بے کیٹ کو قتل کر دیں اور انھیں یہ خیال تھا کہ یہی بادشاہ کی خواہش بھی ہے۔ کینٹربری جا کر انھوں نے اُسے وہاں کے بڑے گرجے میں قتل کر دیا مگر اس واقعے سے ایک دھوم مچ گئی۔ اصلاح مذہبی کے زمانے تک یورپ میں بے کیٹ کی بڑی وقعت و حرمت تھی اور اُس کے مزار پر زائروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ہنری غصہ ور اور مستقل مزاج ضرور تھا مگر وہ سمجھ گیا کہ جس دشمن کا وہ مقابلہ کر رہا ہے وہ اُس سے قوی تر ہے۔ دُنیاوی لحاظ سے اُس کی قوت نہایت زبردست تھی مگر بے کیٹ کی "شہادت" کے جو قصے مشہور ہو گئے تھے ان کی وجہ سے لوگوں کو اس سے نفرت ہو گئی تھی جس کا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس لئے وہ بذات خود کینٹربری گیا۔ اور بے کیٹ کی قبر پر اپنی ندامت کا اظہار کیا۔ اُس زمانے سے پھر حسب سابق پادریوں کے مقدمات انھیں کی عدالتوں میں طے ہوئے اور اصلاح مذہبی تک کلیسیا کا نظام سلطنت سے بالکل علیحدہ رہا۔

ہنری میں سپہگری سے زیادہ حسن تدبیر کا مادہ تھا مگر وقت پڑ پر اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے لڑنے بھڑنے سے دریغ نہ کرتا تھا۔ انگلستان کے لئے بہتر ہوا کہ اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ ابھی تک اُس کے بادشاہوں کے تابع فرمان نہ تھے، کیونکہ اگر یہ غیر قومیں سلطنت میں شامل ہو جاتیں تو انگریز اور نارمن اس قدر جلد شیر و شکر نہ ہو جاتے۔ اب ہنری نے ان تینوں پر یورش کی اور نارمنوں کے طریقۂ جنگ سے جس کے ذریعے سے انگلستان فتح ہوا تھا، ہر جگہ کامیابی ہوئی۔ اور سوائے شمالی ویلز کے کہیں آزاد قومی سلطنت باقی نہ رہی۔ اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ ولیم اسد، بہادر اور فن سپہگری میں طاق تھا مگر این وک میں قید ہو گیا اور شاہ انگلستان کی ماتحتی کے اعتراف پر مجبور ہوا۔ اڈنبرو میں ایک انگریز محافظ فوج داخل ہو گئی۔ ہنری کے عہد حکومت ہی میں انگلستان اور آئرلینڈ کے تعلق کی طولانی اور دردناک داستان کا آغاز ہوا۔ اہل آئرلینڈ اپنے ملک کی گزشتہ تاریخ پر فخر کر سکتے تھے کیونکہ مذہب اور تمدن کی انھوں نے قابل قدر خدمات کی تھیں اور اہل ڈین مارک کو پسپا کر کے انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ اپنے انگریز معاصروں سے ان میں زیادہ جوش قومی اور

استقلال سے ہے۔ مگر بارھویں صدی میں خانہ جنگیوں اور مخالف جماعتوں کے پیدا ہو جانے سے آئرلینڈ کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ لینسٹر کا کے بادشاہ ڈرمٹ کو اس کے دشمنوں نے سلطنت سے خارج کر دیا اور وہ انگلستان آ کر امداد کا طالب ہوا۔

رچرڈ ڈیس کلیر جو پیمبروک کا نارمن ارل تھا اس مہم پر روانہ ہوا اور واٹرفرڈ کے قریب لنگر انداز ہو کر آس پاس کے رئیسوں پر چند فتوحات حاصل کیں۔ پانچ سال کے بعد شاہ ہنری بذات خود آئرلینڈ آیا اور "لارڈ آف آئرلینڈ" کا لقب اختیار کیا۔ یہ واقعات "فتح آئرلینڈ" کے نام سے موسوم ہیں مگر یہ لفظ ان پر صادق نہیں آتا۔ انگریزوں اور نارمنوں کا اثر جزیرہ کے جنوب و مشرق میں قائم ہو کر اور وسط ملک میں بھی پہونچ گیا تھا۔ مگر آئرلینڈ فی الحقیقت سولھویں صدی میں فتح ہوا۔ واقعات موجودہ کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ آئرلینڈ میں ایک زبردست اور آزاد حکومت کے قیام کا امکان باقی نہ رہا۔ مگر انگریزوں کی بھی حکومت وہاں قائم نہ ہوئی۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہنری کے جو مقبوضات فرانس میں تھے وہ شاہ فرانس کی سلطنت سے زیادہ وسیع تھے اور ان کے انتظامات میں اس کا بہت سا وقت صرف ہوتا تھا۔ مگر فرانس میں اُسے وہ کامیابی حاصل نہ ہوئی جو انگلستان میں حاصل ہوئی تھی اس کی بیوی ای لی آنور کے جہیز میں اسے وسیع علاقے جنوبی فرانس میں ملے تھے مگر یہ ملکہ اس کی سخت دشمن تھی اور خود اس کے لڑکے اس کے خلاف بغاوتیں کرتے تھے اور سازشوں میں مصروف رہتے۔ مگر ان جھگڑوں کو ہم یہاں بیان نہیں کر سکتے۔ مقابلہ میں بادشاہ کو ہمیشہ کامیابی ہوتی تھی مگر حسن انتظام اس صورت میں ممکن نہ تھا اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اسی گتھی کے سلجھانے میں مصروف تھا۔ اپنی بے چین زندگی کی لاانتہاہی مصروفیتوں اور اپنے عزیز ترین بیٹے جان کی غداری کی خبر نے اس زبردست بادشاہ کا کام ۱۱۸۹ء میں تمام کر دیا۔

(۴)

قریب ایک سو سال سے زیادہ تک انگلستان میں عنصر غالب حکومت شاہی کا تھا۔ بادشاہ اکثر خود پسند اور آئین و قوانین کے پابند نہ تھے اور ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو رعایا میں ہر دلعزیز ہو یا جسکے ساتھ انھیں محبت ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس

عہد میں آزادی کے مقابلہ میں یہ حکومت ملک کے لئے زیادہ مفید تھی اسی حکومت سے اہل انگلستان کو امن و امان اور قوانین کی برکتیں نصیب ہوئیں اور بالآخر ان میں قومی اتحاد کا احساس پیدا ہوگیا دوسرا امر قابل لحاظ یہ ہے کہ اس حکومت کی فتوحات اس کی نکبت کا باعث ہوئیں۔

انگلستان اور فرانس کی تاریخ میں متعدد امور ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ دونوں ملکوں میں اصل امتیاز یہ ہے کہ قرون وسطی میں فرانس میں بادشاہ عامۂ قوم سے امرا کے خلاف متحد تھے اس کے برخلاف انگلستان میں تیرھویں صدی کے اوائل میں قوم نے بادشاہوں کا دامن پکڑا۔ یہ امتیاز اتفاقی یا ناقابل توضیح نہیں ہے کیونکہ انگلستان کے بادشاہوں کو نارمن فتوحات سے وقت واحد میں مکمل اقتدارات مل گئے جو فرانس کے بادشاہوں کو صدیوں کے بعد حاصل ہوئے۔ انگلستان میں امرا اور عوام دونوں بادشاہ کے دست نگر تھے اس لیئے ان میں اتحاد پیدا ہوگیا اور فرانس میں بھی قریب قریب یہی صورت رونما ہوئی جبکہ بادشاہوں کو مطلق العنانی حاصل ہوگئی

اگر ہنری دوم کے جانشین بھی ذیعقل اور طاقتور ہوتے تو ممکن تھا کہ حالات دگرگوں ہو جاتے۔ مگر دنیا میں ابتک کوئی طریقہ ایسا دریافت نہیں ہوا ہے کہ اچھے بادشاہوں کا سلسلہ قائم کیا جائے۔ اس کے علاوہ تمام دشمنوں پر کسی بادشاہ کا غالب آجانا بجائے خود اس کے جانشینوں کی نااہلی کا باعث ہوتا ہے۔ مطلق العنان حکومت، حکومت کا بہترین طریقہ نہیں ہے لیکن رعایا کو اس سے کثیر فائدے حاصل ہوسکتے ہیں۔ البتہ کوئی شخص ایسے مطلق العنان بادشاہ کا مداح نہیں ہوسکتا جو نااہل ہو اور جسے صرف اپنے ذاتی اغراض کا خیال ہو۔

ہنری دوم کے تمام علاقوں کا مالک اس کا بڑا بیٹا رچرڈ شیر دل ہوا جس کا افسانوں میں بڑا نام ہے۔ چونکہ تاریخ کی کسی کتاب کو وہ قبولیت حاصل نہیں ہوسکتی جو اسکاٹ کے افسانوں ("آئی وین ہو" اور "طلسم") کو حاصل ہے اس لئے ان کے مطالعہ سے جو تخیل ناظرین کے دماغوں میں رچرڈ کے متعلق پیدا ہوگیا ہے زائل نہیں ہوسکتا اور صحیح تاریخی حالات ان کی جگہ نہیں لے سکتے۔ افسانوں میں رچرڈ کی شجاعت بہادری، سخاوت، موسیقی دانی اور شاعری کی بہت تعریف کی گئی ہے مگر اس کے حقیقی

خصائل اس سے ظاہر نہیں ہوتے سپہگری میں تو وہ طاق تھا مگر اچھا بادشاہ نہ تھا جنگ صلیبی میں اس کے شریک ہوتے اور قید ہو جانے کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور انھیں امور میں اس کی حکومت کا زیادہ تر حصہ صرف ہوا۔ ہنری دوم نے جو استوار نظام حکومت قائم کیا تھا اس کی بدولت ملک میں کوئی فساد نہیں ہوا مگر بالآخر اس کے بھائی جان نے پھر غداری پر کمر باندھی اور شاہ فرانس کی شرکت میں سلطنت انگریزی پر حملہ کر بیٹھا ۱۱۹۹ء میں رچرڈ شالو کے قلعہ کے محاصرہ میں زخمی ہوا اور مر گیا۔

اس کا بھائی جان اس کا جانشین ہوا۔ خاندان آنجو کے تمام قبیح خصائل اس میں موجود تھے اور بعض تو صرف اسی کی ذات سے مخصوص تھے اس کے علاوہ ان قبائح کے اثر کو کم کرنے کے لئے وہ خوبیاں اس میں نہ تھیں جو اسکے باپ اور بھائی میں پائی جاتی تھیں یعنی نہ تو اس میں سرگرمی تھی اور نہ قابلیت اور نہ اس کے مقاصد اعلیٰ تھے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگلستان کو دستوری آزادی بہت جلد مل گئی مگر جان کا کوئی مداح نہیں ہے۔ اسکے عہد حکومت کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ اہل ملک نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ مگر یہ بغاوت چند امرائے جاگیری کی نہ تھی جنھیں اب رعایا پر ظلم کرنے کی آزادی نہ تھی اور اس وجہ سے وہ بادشاہ سے روٹھ گئے تھے بلکہ یہ ایک حقیقی قومی تحریک تھی جس میں نارمن اور انگریز دونوں بتعداد کثیر شریک تھے

اس بغاوت کا سبب کیا تھا اور اس میں کامیابی کن وجوہ سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کی بدکرداری سے اہل ملک عاجز آ گئے تھے۔ اس کے علاوہ دو اور اسباب تھے یعنی اولاً فوجی شکست اور ذلت اور ثانیاً کلیسا سے ناموافقت۔ اس شاہی خاندان کو جنگی فتوحات سے انگلستان کی سلطنت ملی تھی اور فوجی قوت سے ملک ان کے قابو میں تھا۔ فوجی ہزیمتوں سے سلطنت کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ ناظرین جانتے ہیں کہ خود ہمارے زمانہ میں جرمنی آسٹریا اور روس کے شہنشاہی خاندانوں کا کیا حشر ہوا۔ ولیم فاتح کے تخت پر ایک شکست خوردہ اور کم ہمت بادشاہ بیٹھ نہ سکتا تھا۔ نارمنڈی جان کے ہاتھوں سے نکل گئی جو اس کے خاندان کی قوت کی بنیاد تھی۔ فرانس کے تخت پر اس وقت فلپ آگسٹس سا قابل اور جلیل القدر بادشاہ متمکن تھا جو متعدد امور میں ہنری دوم شاہ انگلستان سے مشابہت رکھتا تھا۔ جان اس کے مقابلے میں محض طفل مکتب تھا اور فلپ

کے ہاتھوں اسے شکست اور ذلت نصیب ہوئی ۔ شاتو گائی لارڈ کا قلعہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا جسے رچرڈ نے بنایا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے بھتیجے آرتھر کو قتل کردیا۔ ۱۲۰۴ء میں نارمنڈی پر فرانس کا قبضہ ہوگیا اور ۱۲۱۴ء میں آنجو مین اور تورین پر اس کے بعد اس نے آٹو سے سازو باز کیا جو تاج شہنشاہی کے لئے فریڈرک دوم اور پوپ انوسنٹ سوم سے لڑرہا تھا۔ مگر اس میں بھی اسے فلاح نصیب نہ ہوئی اور اسے اور اس کے حلیف کو بُودین میں سخت ہزیمت ہوئی۔ سلطنت فرانس کے مقبوضات کی وسعت اب لُوار اور سین ندیوں کے دہانوں تک تھی۔ ان واقعات کا اثر انگلستان پر بھی ہوا کیونکہ اکثر انگریز امرا کے علاقے فرانس میں تھے اور جان کی شکست سے انھیں نقصان پہونچا ہوگا۔ اس کی ہزیمت کو انھوں نے قومی ذلت خیال کیا ہوگا اور ان کے دماغوں میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا ہوگا کہ جان کے خلاف بغاوت کرنے میں اتنا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ ہنری یا رچرڈ سے بغاوت کرنے میں ہوسکتا تھا۔

جان کے تعلقات پوپ اور کلیسا سے بھی خوشگوار نہ تھے۔ اولاً اسقف اعظم کینٹربری کے تقرر کے متعلق پوپ سے سخت جھڑپ ہوگئی۔ گرجے میں جو راہب مقیم تھے انھوں نے اس خدمت کے لئے ایک شخص کا انتخاب کیا۔ مگر بادشاہ نے غصے میں آکر دوسرے کا تقرر کردیا۔ اس نزاع کے تصفیے کے لئے پوپ کی مداخلت ناگزیر تھی اس نے دونوں امیدواروں کو علیحدہ کرکے ایک انگریز کارڈنل اسٹیفن لنگ ٹن کو مقرر کیا جو اپنے زہد و اتقا اور علم و فضل کے لئے مشہور تھا۔ پوپ کی اس حرکت سے جان سخت ناراض ہوا لینگ ٹن کو ملک میں داخل ہونے سے منع کردیا اور اسقفیت کے محاصل پر متصرف ہوگیا۔ مگر پوپ انوسنٹ بھی دبنے والا نہ تھا اس کا وار نہایت سخت ہوا اس نے تمام ملک کو کلیسا کا تُولیک سے خارج کردیا جس سے انگلستان دیگر ممالک سے بالکل علیحدہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ پوپ نے شاہ فرانس کو آمادہ کیا کہ انگلستان پر حملہ کردے۔ جان کو ان مشکلات میں مبتلا دیکھکر انگریزوں اور اہل ویلز نے خیال کیا کہ اپنی گمشدہ آزادی کے دوبارہ حاصل کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ مگر ان خطرات سے بچنے کے لئے جان نے نہایت ذلیل طریقہ پر اطاعت قبول کرلی۔ اس اسٹیفن لینگ ٹن کا خیر مقدم کرنے کے علاوہ اس نے انگلستان کو پوپ کا ماتحت تسلیم کیا اور سالانہ خراج دینے

کا وعدہ کیا اور پادریوں کو بھی ان کے نقصانات کی تلافی کے لئے رقم کثیر دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس طرح پوپ کا غصہ اتر گیا اور استیفن لینگ ٹن نے اسے معافی نامہ دیدیا مگر اس جدوجہد کے اثرات باقی تھے اور اہل ملک یہ فراموش نہ کرسکے کہ بادشاہ خدا اور کلیسا کا دشمن قرار دیا گیا تھا۔

امرا اور عامۂ قوم کو جان سے نفرت پہلے ہی سے تھی اور اب اس کا خوف بھی ان کے دلوں سے نکل گیا۔ کلیسا اب اس کا مؤید نہ تھا۔ بُوڈین کی آخری شکست سے اس کی حالت اور بھی خراب ہوگئی یعنی اب وہ بالکل بے یار و مددگار ہوگیا امرا اور ان کے حلیفوں نے پہلے اپنے جلسے سینٹ اَل بَنس اور پھر سینٹ پال کے بڑے گرجے میں کئے اور پھر رانی میڈ میں جو ونڈزر کے قریب ہے بادشاہ اور امرا کے سرغنوں سے ملاقات ہوئی اور اسی مقام پر انگریزوں کی آزادی کے منشور اعظم پر دستخط ہوئے۔

منشور اعظم کے ۶۳ دفعات ہیں جن میں سے اکثر امرا کے حقوق کے تحفظ سے متعلق ہیں اور ان امور میں سے اکثر میں عوام کے مفاد بجائے امرا کے بادشاہ سے وابستہ تھے جن اہم امور کا تعلق بہ حیثیت مجموعی سلطنت سے تھا حسب ذیل ہیں۔
(۱) اگر معمولی جاگیری محاصل کے علاوہ بادشاہ کوئی اور محصول عائد کرنا چاہے تو اس پر لازم ہوگا کہ مجلس اعلیٰ منعقد کرے اس کے انعقاد کے لئے جو اطلاع نامے جاری ہوتے ان کی عبارت بھی معین کردی گئی۔ دارالعوام کا تفوق اس دفعہ پر مبنی ہے۔ (۲) انگلستان کے کلیسیہ کی آزادی کی ضمانت لی گئی گو اس آزادی کا تعین نہ ہوا۔ (۳) انگلستان کے رواجی قانون کے اصول ذیل کا اطلاق تمام آزاد اشخاص پر کیا گیا "بغیر اپنے برابر والے کے قانونی فیصلہ یا قانون ملکی کے اصول کے خلاف کوئی شخص نہ تو قید کیا جائے گا نہ حراست میں لیا جائے گا۔" (۴) لندن اور دوسرے شہروں کی آزادی کی توثیق کی گئی۔ دفعہ (۶) سے بادشاہ کی سخت ذلت تھی جس میں بیان کیا گیا تھا کہ اس منشور کے دفعات کو عمل میں لانے کیلئے ۲۵ امرا کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو ان پر عمل کرانے کیلئے خانہ جنگی سے بھی کام لے سکتا تھا۔

منشور اعظم کا مرتب ہونا یورپ کے عظیم الشان تاریخی واقعات میں سے ہے۔ اس کے متعلق افسانے مشہور ہوگئے ہیں جن سے اس کے اصلی معانی پر پردہ پڑگیا ہے

اور اس کے دفعات کے متعلق مبالغہ آمیز باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ اس کی موجودہ شہرت سترھویں صدی کے مقننوں کی بدولت ہے جنھوں نے خاندان اسٹوارٹ کے خلاف میں جو جدوجہد ہوئی اس میں اپنے دعاوی کی بنا اس منشور کے دفعات پر رکھی گو ان کا استدلال تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح نہ تھا۔ مگر منشور اعظم کی اہمیت اس سے کم نہیں ہوئی۔ اس منشور سے نہ تو جوری کے ذریعہ سے مقدمات کی سماعت لازم آئی اور نہ عوام کو سیاسی قوت حاصل ہوئی کیونکہ یہ منشور امرا کے مفاد کے لئے تھا نہ کہ عوام کے۔ مگر انگلستان کے دستور کے امتیازی خصائص کی بنا زیادہ تر اس پر ہے اور اس کے دفعات بلکہ ان کو غلط معانی پہنانے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انگلستان کے دستور کی تاریخ میں تسلسل قائم ہے۔

منشور اعظم پر عمل کرنے میں اولاً سخت دقتیں پیش آئیں بادشاہ نے اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور گو اس نے اس کی پابندی کا حلف لیا تھا مگر پوپ انوسنٹ سوم نے اس حلف سے اسے بری کر دیا۔ اس کے مخالفوں نے فوراً جنگ کا اعلان کر دیا اور لوئی شاہ فرانس کو بلایا کہ ملک پر قبضہ کرے۔ لوئی فوراً چلا آیا اور قریب تھا کہ ایک طولانی اور تباہ کن خانہ جنگی شروع ہو جائے جس کا اثر انگلستان کی آیندہ ترقی کے لئے نہایت اندوہناک ہوتا مگر اس کی خوش قسمتی تھی کہ جان نے سنہ ۱۲۱۶ء میں انتقال کیا۔

(۴)

جس تحریک کی بدولت انگلستان کو آزادی کا منشور اعظم حاصل ہوا تھا وہ ابتداً ناکام نظر آتی تھی کیونکہ اس کی وجہ سے خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے اور ایک غیر ملکی حکمراں انگلستان میں آکر اس کے تخت و تاج کا دعویدار ہو گیا مگر حقیقت میں یہ تحریک ناکام ہونے والی نہ تھی کیونکہ اس کی بنیاد ملک کی تمدنی زندگی کی مستقل قوت پر تھی۔ اہل ملک پر یہ امر بہت جلد روشن ہو گیا کہ یہ منشور ان کی تمام ضروریات کیلئے کافی نہ تھا اور یہ کہ بادشاہ سے نیک کرداری کا وعدہ لے لینا اور خانہ جنگی کی دھمکیوں سے اسے اپنے عہد و پیمان پر قائم رکھنا بھی کافی و وافی نہ تھا۔ آزادی کے بقا کے لئے ہر وقت خبردار رہنا ضروری ہے۔ اگر اہل انگلستان کی یہ آرزو تھی کہ انتظامات مملکت میں شریک ہوں یا اپنی قسمتوں کے آپ مالک ہوں تو ان کے لئے ضروری تھا

کہ اپنی خواہشوں کے اظہار اور ان کو عمل میں لانے کے لئے ایک مستقل نظام قائم رکھیں۔ انگلستان کی پارلیمنٹ نے زمانۂ مابعد میں جو ترقی یافتہ صورت اختیار کی اس کی محرک یہی خواہش تھی۔

اس کا جانشین ہنری سوم ہوا جو اپنے باپ سے بہتر تھا مگر اس کا دماغ ضعیف تھا اور اس کی قوت ارادی زبردست نہ تھی۔ عامۂ قوم کے ساتھ جو جد و جہد جان کے زمانہ میں تھی اسے وہ جاری رکھنا پسند نہ کرتا تھا اور امرا بھی یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آیا یہ نیا بادشاہ قابل اعتماد ہے یا نہیں۔ اس نے ۱۲۲۵ء میں منشور اعظم ترمیم کے ساتھ جاری کیا اور اس میں سے وہ دفعات حذف کر دئے جن کی رو سے نئے محاصل کے عائد کرنے کیلئے مجلس اعلیٰ کی منظوری کی ضرورت تھی۔ اس مرممہ منشور پر کسی فریق نے اعتراض نہ کیا۔ واضح رہے کہ منشور مذکور اس عہد کے دعاوی کا معیار تھا اور جب تک اس پر عمل تھا کسی فتنہ کے برپا ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔

مگر بادشاہ کی خارجی حکمت غلط اصول پر مبنی تھی اور اس میں اسے ناکامی ہوئی۔ اس کے علاوہ رعایا محاصل کے بوجھ سے زیر بار ہوگئی تھی۔ اس لئے بادشاہ کو قابو میں رکھنے کے لئے رعایا کو پھر ایک زبردست کوشش کرنی پڑی۔

بادشاہ ہر دلعزیز نہ تھا کیونکہ تخت نشین ہوتے ہی بادشاہ نے غیر ملکیوں کو اپنا معتمد علیہ بنا لیا جن میں سے اکثر اس کی ماں کے اعزا میں سے تھے ان مصاحبوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ انگریزوں کو ان سے نفرت اس وجہ سے نہ تھی کہ یہ غیر ملکی تھے یا اس لئے کہ ان کا اثر بادشاہ پر اچھا نہ تھا بلکہ اس لئے کہ یہ بادشاہ اور اس کے امرا اور رعایا کے درمیان حائل تھے منشور اعظم کے نافذ ہونے کے بعد سے امرا اور ان کے حلیفوں کا دعویٰ تھا کہ حکومت پر ہماری نگرانی ہونی چاہئے مگر ان مصاحبوں نے غاصبانہ طور پر وہ قوت حاصل کر لی تھی جو حقوق کے لحاظ سے سربرآوردہ انگریز امرا کی ہونی چاہئے تھی۔ ان مصاحبوں کے زیر اثر بادشاہ ایک ایسی خارجی حکمت عملی پر کاربند ہوا جس سے اسے ہزیمت ہوئی۔ اس زمانے میں پوپ اور شہنشاہی خاندان ہوہن اسٹافین کے درمیان سخت جد و جہد جاری تھی۔ فریڈرک دوم کا انتقال ہو چکا تھا اور پوپ اس فکر میں تھے کہ اس کے خاندان کو جس سے انھیں سخت نفرت

تھی ۔ نیپلز اور سسلی سے بالکل خارج کردیں ۔ ہنری پوپوں کا حلیف تھا اور اسکو وہ اپنے مقاصد کے حصول کا ایک مفید ذریعہ خیال کرتے تھے ۔ اسے یہ سبز باغ دکھایا گیا کہ اس کا بھائی رچرڈ آف کارن وال شہنشاہ بنادیا جائیگا اور اس کا بیٹا ایڈورڈ سسلی کا بادشاہ ہوجائیگا اگر یہ دونوں تدبیریں کارگر بھی ہوتیں تو ان سے انگلستان کے شاہی خاندان یا قوم کو کوئی تقویت نہ ہوتی ۔ مگر کامیابی کی ایک موہوم امید کے بعد دونوں منصوبوں میں ناکامی ہوئی ۔ ان تدابیر کو عمل میں لانے کیلئے بادشاہ نے کلیسا اور قوم سے رقوم خطیر وصول کی تھیں اس لئے بادشاہ کے مخالفوں کو ان دونوں طبقوں کی تائید حاصل ہوگئی ۔

امرا کی جماعت کو ایک قابل سردار بھی مل گیا ۔ یہ لیسسٹر کا کاونٹ سائمن ڈی ماونٹ فرٹ تھا اور اسی ماونٹ فرٹ کا بیٹا تھا جس نے نہایت بے رحمی کے ساتھ جنوبی فرانس میں الحاد کا انسداد کیا تھا اوائل میں اس کے تعلقات بادشاہ سے دوستانہ تھے اور بادشاہ کی ہمشیر سے اس کی شادی ہوئی تھی مگر اس کے بعد دونوں میں ان بن ہوگئی اور مصالحت کی صورت نہ ہوئی ۔ بادشاہ کے مخالفوں میں یہ سب سے زیادہ سرگرم تھا اب یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کی سیاسی زندگی میں کس حد تک بادشاہ کی ذاتی مخالفت کو دخل تھا اور کس حد تک حب وطن اور ملک میں ایک زبردست حکومت قائم کرنے کی خواہش کو ۔ اس کے خیالات بلند تھے اور سیاسیات کے علاوہ وہ کلیسا کی اصلاح بھی چاہتا تھا ۔ فقرا کی جماعتوں کے وجود میں آنے سے جن کا قیام اسی زمانہ میں عمل میں آیا تھا اور جن کا انگلستان میں بہت کچھ اثر تھا اس کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے ۔

۱۲۵۸ء میں پارلیمنٹ کا اجلاس آکسفورڈ میں منعقد ہوا اور متعدد مطالبات پیش کئے گئے جن میں سے بعض اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے سیاسی امور کے مماثل تھے ۔ مطالبات یہ تھے کہ پارلیامنٹ کے سال میں تین اجلاس ہوں مگر اس کے ارکان صرف بارہ ہوں تاکہ عوام زیربار نہ ہوتے پائیں ۔ بادشاہ کو مشورہ دینے کے لئے پندرہ ارکان کی ایک مجلس قائم ہو جو اس کے افعال و حرکات کی نگرانی کرے اور پارلیامنٹ کے بارہ نمائندے ان پندرہ ارکان سے برابر مشورہ کرتے رہیں ۔ اگر ان مطالبات پر عمل ہوتا تو بادشاہ گویا اپنے اقتدارات سے دست کش ہوکر امرا کا بندۂ حکم بن جاتا ۔

مگر جدید طریقۂ حکومت قابل عمل اور دیرپا ثابت نہ ہوا۔ امرا آپس میں لڑتے رہے اور انھیں عوام کے مفاد کا پاس نہ تھا۔ پوپ بھی اپنے قدیم حلیف یعنی بادشاہ کی طرف سے غافل نہ تھا۔ اور اس نے بادشاہ کو "مطالبات آکس فورڈ" کی پابندی کے حلف سے آزاد کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ جنگی چھڑ گئی اور اس کے مصائب سے بچنے کے لئے فرانس کے مقدس بادشاہ لوئی نہم سے ثالث بننے کی درخواست کی گئی۔ لیکن اس زمانے میں فرانس کے کسی بادشاہ سے یہ توقع کرنا کہ وہ باغی امرا کے حق میں فیصلہ کرے گا ایک امر محال تھا۔ اس نے "آکسفورڈ کے مطالبات" کو منسوخ کر دیا مگر امرا نے فیصلۂ ثالثی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور پھر جنگ شروع ہو گئی۔ لے وس کی جنگ میں بادشاہ شکست کھا کر قید ہو گیا۔ تاج شاہی تو اس سے چھینا نہ گیا مگر انگلستان کا حقیقی حکمراں سائی من ڈی مانٹ فورٹ تھا۔ سنہ ۱۲۶۵ء میں سائی من نے وہ کارنمایاں کیا جس سے اسے بقائے دوام حاصل ہوا یعنی اس نے ایک جدید پارلیمنٹ طلب کی جو بلحاظ ہئیت ترکیبی موجودہ پارلیمنٹ کے مشابہ تھی جو کہ ابتک انگلستان کی حکومت کا مرکز ہے۔ سائی من نے ہر کاونٹی (ضلع) اور ہر بورو (شہر) سے نمائندے طلب کیے تاکہ امرا اور پادریوں کے ساتھ مشوروں میں شریک ہوں۔ ابتک جو پارلیمنٹ منعقد ہوئے ان میں صرف امرا شریک تھے گو اضلاع اور شہروں کے نمائندے وقتاً فوقتاً بادشاہ سے اہم امور پر بحث کرنے کے لئے پہلے بھی آیا کرتے تھے مگر سائی من کے پارلیمنٹ کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ مملکت کے نمائندوں کا پہلا اعظم الشان مجمع تھا جس میں قوم کے ہر طبقہ کے نمائندے موجود تھے اور جس میں اضلاع اور شہروں کے نمائندے امرا اور پادریوں کے ساتھ مساوات کی حیثیت رکھتے تھے۔

امتداد زمانہ کے باعث ہم اس تجربہ کی اہمیت کو محسوس کر سکتے ہیں مگر معاصرین کی رائے اس کے برعکس ہوگی کیونکہ ملک ابھی اس کے لئے تیار نہ تھا۔ سائی من کے حلیف امرا میں باہمی نزاعیں پیدا ہوگئیں اور ویلز کی طرف سے اس پر حملہ ہو گیا۔ بادشاہ کا بیٹا ایڈورڈ جو لے وس کی جنگ کے بعد سے قید تھا کسی تدبیر سے بھاگ نکلا اور باغیوں سے جا ملا۔

سنہ ۱۲۶۵ء میں بمقام اے وی شیم سائی من کو ہزیمت ہوئی اور وہ قتل ہو گیا۔ بظاہر آثار یہ تھے کہ جو کچھ اس نے کیا دھرا تھا سب چوپٹ ہو جائے گا۔ امراء

امرائے جو اپنے آپ کو بادشاہ کے ترحم خسروانہ پر چھوڑ دیا۔ کے نل ورتھ میں یہ طے پایا کہ "بادشاہ کسی مخالفت یا رکاوٹ کے بغیر حکومت اور اقتدارات و اختیارات شاہی عمل میں لائے۔ آکس فورڈ کے مطالبات منسوخ کر دئے گئے لیکن بادشاہ نے ان منشوروں پر عمل کرنے کا وعدہ کیا جنکی پابندی کا اس نے بطیب خاطر حلف اٹھایا تھا۔ ان میں منشور اعظم بھی تھا جو پھر جاری کیا گیا۔

اہل ملک نے ان امور کو بلا چون وچرا تسلیم کر لیا اور امن و امان پورے طور سے قائم ہو گیا جس سے بادشاہ کا بیٹا ایڈورڈ جنگ صلیبی میں شرکت کے لئے چلا گیا اور وہ مشرق ہی میں تھا جب بادشاہ کا ۱۲۷۲ء میں انتقال ہوا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگلستان کو اپنے اچھے بادشاہوں کی خوبیوں سے اتنا نفع نہیں ہوا ہے جتنا کہ خراب بادشاہوں کے قبائح سے۔ مگر اس قول کی صحت مشکوک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جان کی بداعمالیوں کے بغیر منشور اعظم حاصل نہ ہوتا اور اگر ہنری سوم کمزور نہ ہوتا تو دستوری حکومت کے جس جدید تجربے کا ہم ذکر کر چکے ہیں امکان نہ ہوتا۔ مگر بہ حیثیت مجموعی ولیم فاتح اور ہنری دوم کی انصاف پسند حکومت کی بدولت اتحاد قومی پیدا ہوا اور قومی پارلیمنٹ کا وجود ممکن ہوا۔ اسی طور پر ایڈورڈ اول نے جو نہ تو کمزور تھا اور نہ بدکردار تھا، دستوری حکومت کی بنیاد مضبوط کر دی۔ اصولاً اسکی ۳۵ سالہ عہد حکومت سے زیادہ اہم کوئی عہد انگلستان کی تاریخ میں نہیں ہے۔ بلحاظ سلسلہ تاریخی ہم بیان کریں گے کہ پارلیمنٹی طریقۂ حکومت کا قیام کس طرح سے وہ عمل میں لایا۔

سائمن ڈی مانٹ فرٹ کا پارلیمنٹ اقتدار شاہی کا مخالف تھا۔ اس لئے اگر اقتدار شاہی کے دوبارہ قیام کے بعد ایڈورڈ ہر قسم کے دستوری ادارات کو کالعدم کر دیتا تو محل تعجب نہ ہوتا اور شاہان فرانس ان ادارات کے ساتھ یہی سلوک کرتے تھے جن سے ان کی قوت گھٹنے کا اندیشہ ہوتا۔ ایڈورڈ اول کا یہ قابل توصیف کارنامہ ہے کہ اس نے اس آلۂ مخالفت کو ایک طریقۂ حکومت بنا لیا اور اس نے بطیب خاطر بادشاہ اور رعایا کے اشتراک عمل کو باقی رکھا جسکو قبول کرنے پر اس کے باپ اور دادا مجبور کئے گئے تھے اس نے کئی تجربے کئے مگر قطعی کارروائی اس نے ۱۲۹۵ء میں کی جبکہ وہ بیس سال تک

حکومت کر چکا تھا۔ اس وقت وہ فرانس اور اسکاٹ لینڈ سے جنگ میں مصروف تھا۔ ایسے نازک موقع پر اگر کوئی کمزور بادشاہ ہوتا تو وہ کوشش کرتا کہ اندرون ملک جہاں تک کم مخالفت ہو بہتر ہے۔ مگر اس ہوشمند اور دور اندیش بادشاہ نے قوم کو انتظام مملکت میں پوری طور پر شریک کرنے کا اسے بہترین موقع خیال کیا اس نے "نمونہ کا پارلیمنٹ" طلب کیا جو مانٹ فرٹ کے پارلیمنٹ (۱۲۶۵ء) کے مماثل تھا مگر اس پارلیمنٹ میں عوام کی نمائندگی پوری تھی اور اس میں ارل، بیرن، اسقف، راہب بھی تھے۔ ان کے علاوہ ہر ضلع اور ہر شہر کے دو دو نمائندے تھے اور کم درجہ پادریوں کے بھی نمائندے تھے۔ بادشاہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ "عام خطروں کی مدافعت کی تدبیریں سب کو ملکر سوچنا چاہیئے"۔ ۱۲۹۵ء میں انگلستان کو جو حقوق نیابت دیئے گئے چند خفیف ترمیموں کے ساتھ ۱۸۳۲ء تک قائم تھے۔ دو سال کے بعد ایڈورڈ نے ان اصول کو دہرایا جن پر دستوری حکومت آجتک بنی ہے یعنی اس نے منشوروں کو مستقل کر دیا اور وعدہ کیا کہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی محاصل عائد نہ کئے جائیں گے۔ پارلیمنٹ کو کبھی عروج نصیب ہوا کبھی زوال کبھی اس کی قوت نصف النہار پر رہتی کبھی زائل ہو جاتی مگر اہل انگلستان کی زندگی میں اس کی جو مستقل حیثیت ہے اس کی ابتدا ایڈورڈ کے عہد حکومت سے ہے۔

چند سال کے بعد ۱۳۰۲ء میں فلپ چہارم شاہ فرانس نے بھی جبکہ وہ پوپ سے برسر جنگ تھا مشورہ کے لئے اسٹیٹس جنرل کو طلب کیا اور اس جماعت سے تائید کی درخواست کی جو فرانس کے پادریوں امرا اور عوام کی نیابت کرتی تھی۔ مگر پارلیمنٹ اور اسٹیٹس جنرل کی تاریخ مابعد میں بہت فرق تھا۔ جنگ لوائک تیر کے بعد اور اصلاح مذہبی کی تحریک کے اوائل میں معلوم ہوتا تھا کہ فرانس کی حکومت کی باگ اسٹیٹس جنرل کے ہاتھ میں آجائے گی مگر بالآخر یہ جماعت مضمحل ہو گئی اور حکومت کی باگ اس نے بادشاہوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دی۔ اس وسیع اختلاف کے وجوہ کیا ہیں؟

ان میں سے بعض وجوہ بالکل واضح ہیں انگلستان کے پارلیمنٹ کی طرح اسٹیٹس جنرل کی بنیاد قومی زندگی پر نہ تھی۔ سائمن ڈی مانٹ فرٹ اور ایڈورڈ اول نے اشتراک عمل کے ان طریقوں کو مجتمع کیا اور ترقی دی جو پہلے سے موجود تھے۔ ثانیاً انگلستان کے پارلیمنٹ کے صرف دو ایوان تھے یعنی بیت الامرا اور بیت العوام مگر اسٹیٹس جنرل

کے تین ایوان تھے یعنی پادری امرا اور عوام۔ سرسری طور پر تو یہ اختلاف محض انتظامی معلوم ہوتا ہے مگر فرانسیسی نظام میں خاص مراعات رکھنے والی دونوں جماعتوں یعنی پادریوں اور امرا کو خاص تفوق تھا جس سے اسٹیٹس جنرل پورے طور سے قوم کی نیابت نہ کر سکتا تھا تاتا اسٹیٹس جنرل کو محاصل کے عاید کرنے کا اقتدار کبھی حاصل نہ ہوا جسکے ذریعہ سے انگلستان کے پارلیمنٹ کو تمام انتظامی امور میں قطعی دخل ہوگیا۔ ۱۴۳۹ء میں شاہان فرانس کو مستقل فوجوں کے قیام کے لئے روپیہ وصول کرنے کا قطعی اختیار مل گیا۔ سب سے آخر میں جغرافیہ کے اثرات کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ انگلستان سمندروں سے گھرا ہوا ہے اسلئے اسے مستقل فوجوں کی ضرورت نہ تھی اور یہی مستقل فوجیں فرانس کی آزادی کے حق میں مہلک ثابت ہوئیں۔ اس لئے دونوں قوموں کا ارتقا مختلف طریقوں سے ہوا اور ہر طریقے میں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور تھا۔

(۵)

تیرھویں صدی میں وضع قوانین کے مسائل کی طرف خاص توجہ تھی۔ جامعات میں جو اس زمانے میں ہر ملک میں وجود میں آرہی تھیں۔ روما کے قوانین کا مطالعہ حد درجہ حرمت اور احتیاط کے ساتھ ہو رہا تھا اور اس کے اصول وسیع پیمانے پر اختیار کئے جا رہے تھے مگر انگلستان میں قوانین مذکور کو بالکلیہ اختیار کر لینے کی طرف رجحان بہت کم تھا۔ قوانین قومی رسم ورواج پر مبنی تھے جن میں اصولی تغیر کرنے کی کسی کو خواہش نہ تھی۔ مگر روما کے قوانین کا انگلستان کے قوانین پر یہ اثر ہوا کہ اس کے مختلف اجزا میں ایک منطقی تعلق پیدا ہو گیا اور تعریفات واضح ہوگئیں۔ ایڈورڈ کو وضع قوانین میں خاص دلچسپی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ انگلستان کے موجودہ قوانین اور رواج میں تسلسل اور وضاحت پیدا ہو جائے اس کو انگلستان کا جسٹی نین کہا گیا ہے مگر یہ مبالغہ ہے۔ البتہ وہ بھی اس مدح سرائی کا مستحق ہے جو شاعر دانتے نے جسٹی نین کی کی ہے یعنی اس نے قوانین سے ان کے لایعنی اور بے ضرورت اجزا کو خارج کر دیا۔ اقتدار شاہی کو تقویت دینے کا بھی اسے خاص خیال تھا اور اس کے اکثر قوانین کا منشا یہ تھا کہ جاگیریت کی جڑوں کو کھوکھلی کر دے۔ یہی اس زمانہ کا عام رجحان بھی تھا۔ فقرات ذیل میں اس کے اہم قوانین پر سرسری نظر ڈالی جائے گی۔

۱۲۷۸ء میں اس نے گلاسٹر کا قانون نافذ کیا۔ یہ امرائے جاگیری پر ایک سخت حملہ تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ ان اسباب اور احکام کے متعلق تحقیقات عمل میں آئے

جن پر ان کے عدالتی اختیارات مبنی تھے۔ مگر اس قانون سے اس قدر بددلی پھیل گئی کہ بادشاہ اپنے ارادے سے باز آیا۔ جاگیری عدالتوں کے اختیارات دوسرے طریقوں سے بھی سلب ہو رہے تھے۔ مثلاً دورہ کن ججوں کا تقرر جنکے اختیارات میں ایڈورڈ نے اضافہ کیا اور ان کے حلقوں کو معین کر دیا۔

قانون مارٹ مین ("دست مردہ") ۱۲۷۹ء کی رو سے بادشاہ کی اجازت کے بغیر کلیسیہ کو اراضی کا عطا کرنا ممنوع کر دیا گیا۔ اس امتناعی حکم میں کلیسیہ کی مخالفت مضمر نہ تھی کیونکہ بادشاہ جنگ صلیبی میں شریک ہو چکا تھا اور کلیسیہ کا وفادار فرزند تھا۔ اسکے مقاصد بالکلیہ مالی اور سیاسی تھے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ کلیسیہ کی اراضی جاگیری محاصل سے آزاد تھی جو بادشاہ کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ ۱۲۸۵ء میں بادشاہ نے ان معاملات کو محدود کر دیا جنکا تصفیہ کلیسیہ کی عدالتوں میں ہو سکتا تھا۔

قبضہ اراضی کی نوعیت کے متعلق بھی اسکے دو اہم قانون ہیں ۱۲۸۵ء میں قانون De Donis Conditionalibus نافذ ہوا تھا کہ زمینداروں کے علاقے تقسیم نہ ہونے پائیں بلکہ بلا تقسیم ان کے بڑے بیٹوں اور پھر ان کے بڑے بیٹوں کے قبضے میں آئیں زمانۂ حال کے انگریزی قانون میں اسے entail کہتے ہیں اور انگلستان کے موجودہ نظام اراضی کا ایک نمایاں پہلو اسی قانون سے ماخوذ ہے ۱۲۹۰ء میں Quia Emptoycs نافذ ہوا جس کی رو سے طریقہ جاگیری کی توسیع ممنوع کر دی گئی یعنی اگر کوئی زمیندار اپنی کسی اراضی کو فروخت کر دیتا یا دوسرے طریقہ سے علیحدہ کر دیتا تو جدید قابض بائع کے آقا کا رعایا ہو جاتا نہ کہ خود بائع کا۔ اس قانون کا اثر دہی ہوا جو ولیم فاتح کے زمانہ میں "سالزبری کے حلف" کا ہوا تھا۔

(۶)

ایڈورڈ کے عہد حکومت میں متعدد لڑائیاں ہوئیں جنکا انگلستان کی تاریخ پر مستقل اثر ہوا ہے۔ فرانس اسکاٹ لینڈ اور ویلز ہر ایک سے وہ وقتاً فوقتاً برسرجنگ تھا ان جنگوں کا ایک دوسرے سے تعلق ہے۔ مگر ہم ہر ایک کا علیحدہ ذکر کرینگے۔

فرانس میں احساس قومی وجود میں آرہا تھا اسلئے گیس کنی پر انگریزوں کے قابض ہونے سے فرانس سے ہمیشہ چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی اور یہ چھیڑ چھاڑ جنگ کی حد تک پہنچ

گئی جب کہ پوئن تھیوؔ کا علاقہ اس کی بیوی کے جہیز میں اسے مل گیا۔ فرانس کا تند مزاج بادشاہ فلپ اسکے مقابلہ پر آگیا مگر اس جنگ سے کوئی تغیر نہ ہوا۔ ایڈورڈ کے لئے خود انگلستان میں مشکلات تھے جن میں وہ بیرون ملک کی جنگ کا اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے ۱۲۹۹ء میں صلح کرلی اور فرانس کے بادشاہ کی ہمشیر سے عقد کرلیا۔

ویلز کی لڑائیاں اس سے زیادہ اہم تھیں۔ لوئے لن اہل ویلز کا قابل سردار تھا اس لئے کئی سال کی زبردست جنگ کے بعد ایڈورڈ اپنے بہادر دشمنوں کو اپنے قابو میں لاسکا اور بالآخر ویلز کا ملک اضلاع میں منقسم ہوکر براہ راست بادشاہ کے تحت میں ہوگیا مگر سرحدی اضلاع امرائے جاگیری کے تحت میں رہنے دیئے گئے۔ ان جدید انتظامات کی قانون ویلز ۱۲۸۴ء میں تصریح کی گئی ہے۔

مگر اسکاٹ لینڈ کی جنگ اہم ترین تھی اور اس سے بڑی امیدیں تھیں کیونکہ اپنی موت سے قبل ایڈورڈ اول نے اسکاٹ لینڈ کو انگریزی شاہی حکومت کی املاک میں قریب قریب شامل کرلیا تھا۔ الیگزینڈر سوم نے ۱۲۸۶ء میں انتقال کیا اور اسکی وارثہ اسکی پوتی مارگریٹ تھی۔ اس شہزادی کی منگنی ایڈورڈ کے بیٹے سے ہوگئی جو حال ہی میں شہزادۂ ویلز نامزد کیا گیا تھا۔ دونوں ملکوں کے پرامن طریقہ پر متحد ہوجانے کی یہ آسان تدبیر تھی۔ دونوں ملکوں کے تاج شاہی ایک ہی بادشاہ کے زیب سر ہونے والے تھے اور دونوں قوموں کی اندرونی آزادی کا بھی تہیہ کردیا گیا تھا۔ مگر شہزادی نے ۱۲۹۰ء میں انتقال کیا۔

اسکاٹ لینڈ کی جانشینی کا مسئلہ اب نہایت دقت طلب ہوگیا اور مختلف دعویداروں نے ایڈورڈ اول کی ثالثی قبول کی جس نے انکے دعاوی کی سماعت کے لئے ایک عدالت قائم کی۔ جان بے لیل بالآخر منتخب کیا گیا اور اس نے شاہ انگلستان کی ماتحتی کا اعتراف کیا۔ امید تھی کہ اس طور پر اس مسئلے کا خاطر خواہ حل ہوجائیگا۔ مگر یہ امید غلط ثابت ہوئی۔ انگلستان کی سیادت کے تسلیم کرنے سے اسکاچ سخت ناراض تھے اور اس جذبہ کا ترجمان خود بے لیل کو بننا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ چھڑ گئی۔ ایڈورڈ نے حملہ کرکے فتح حاصل کی۔ بے لیل تخت و تاج سے دست کش ہوگیا ایڈورڈ نے انگلستان سے اسکاٹ لینڈ کے الحاق کا اعلان کردیا مگر اس قضیہ کا خاتمہ کچھ اور ہی تھا۔ شکست

نے اسکاچ کا جذبۂ قومی برانگیختہ کر دیا جیسا کہ اسکاٹ لینڈ کی تاریخ میں اکثر ہوا ہے، اسکاچ کو سر ولیم والیس سا سرغنہ مل گیا جس نے اسکاٹ لینڈ کے انگریز صوبہ دار کو اسٹرلنگ کے پل کے پاس سنہ ۱۲۹۷ء میں شکست دی اور ایڈورڈ کو بذات خود پھر آنا پڑا۔ اس نے والیس کو سنہ ۱۲۹۸ء میں فال کرک کے پاس شکست دی اور جب چند سال کے بعد والیس نے اسکاٹ لینڈ میں پھر خروج کیا تو وہ گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔ مگر اسکاچ قوم کو پھر ایک نیا سردار مل گیا اور یہ شخص رابرٹ بروس تھا جسے اسکاٹ لینڈ کا شاہی تاج پہنایا گیا۔ ایڈورڈ کو پھر اسکاٹ لینڈ کی طرف کوچ کرنا پڑا مگر اثنائے راہ میں سنہ ۱۳۰۷ء میں وہ مر گیا اور اسکاٹ لینڈ کے معاملات کا تصفیہ نہ ہو سکا۔

باب ہیژدہم

جنگ صد سالہ

فلپ چہارم شاہ فرانس کے انتقال کے بعد خاندان شاہی کے ارکان کی تعداد کچھ کم نہ تھی اسکے تین بیٹے تھے اور ایک لڑکی اسابیلا جس کا عقد ایڈورڈ دوم شاہ انگلستان سے ہوا تھا اسلئے جانشینی کے متعلق کسی نزاع کا اندیشہ نہ تھا مگر عنقریب وہ زمانہ آنیوالا تھا جبکہ جانشینی کی نزاعوں سے فرانس ایک المناک جنگ میں پھنس گیا۔ فلپ چہارم کے تینوں بیٹے لوئی دہم، فلپ پنجم، چارلس چہارم یکے بعد دیگرے مر گئے اور کوئی اولاد نرینہ نہ چھوڑی۔ چارلس چہارم کے انتقال (۱۳۲۸ء) کے بعد جانشینی کا مسئلہ نہایت دقت طلب ہوگیا ایڈورڈ سوم شاہ انگلستان اولاد نرینہ میں فلپ چہارم سے قریب ترین تھا۔ چارلس خبیث شاہ نوار فلپ چہارم کے بڑے بیٹے کا نواسہ تھا فلپ جو فلپ ششم کے لقب سے بادشاہ ہوا فلپ چہارم[عہ] کا بھتیجا تھا۔ ان جھگڑوں میں قانونی موشگافیوں کے لئے بہت کچھ گنجایش تھی۔ ایڈورڈ سوم کے

عہ۔ نسب نامہ

- سینٹ لوئی ۱۲۲۶ء–۱۲۷۰ء
  - فلپ سوم ۱۲۷۰ء–۱۲۸۵ء
    - فلپ چہارم ۱۲۸۵ء–۱۳۱۴ء
      - لوئی دہم ۱۳۱۴ء–۱۳۱۶ء (کوئی بیٹا اس کے انتقال کے بعد زندہ نہ تھا)
        - زین زوجہ فلپ کاونٹ ایورد
          - چارلس خبیث شاہ نوار
      - فلپ پنجم ۱۳۱۶ء–۱۳۲۲ء (کوئی بیٹا نہ تھا)
      - چارلس چہارم ۱۳۲۲ء–۱۳۲۸ء (کوئی بیٹا نہ تھا)
      - اسابیلا زوجہ ایڈورڈ دوم
        - ایڈورڈ سوم شاہ انگلستان
    - چارلس کاونٹ دالوہ
      - فلپ ششم ۱۳۲۸ء–۱۳۵۰ء
        - جان دوم ۱۳۵۰ء–۱۳۶۴ء
          - چارلس پنجم ۱۳۶۴ء–۱۳۸۰ء
    - لوئی کاونٹ ایورد
      - فلپ شوہر زین دختر لوئی دہم
        - چارلس خبیث شاہ نوار

دعاوی کو کالعدم کرنے کے لئے قوم فرینک کے قبیلۂ سیلک کے قوانین کا دفعہ ذیل قبضہ اراضی کے متعلق پیش کیا۔ سیلک قبیلہ کی اراضی کا کوئی حصہ بطور میراث کسی عورت کو نہیں مل سکتا بلکہ پوری میراث وارثان ذکور کو ملیگی"۔ ایڈورڈ کے مخالفوں کا یہ استدلال تھا کہ گو قبضۂ اراضی کے اس اصول کا اطلاق فرینک قوم کے صرف ایک قبیلہ پر زمانہ قدیم میں ہوتا تھا مگر اس کا اطلاق شاہان فرانس کی میراث پر ہمیشہ ہونا چاہئے" مگر یہ مسئلہ محض قانونی نہ تھا' سیلک قانون کی پابندی تو ایک حیلہ شرعی سے زیادہ نہ تھی۔ اصل غرض یہ تھی کہ فرانس کے تخت و تاج کا مالک ایک غیر ملکی نہ ہو اور قومی آزادی باقی رہے۔

یورپ میں اس وقت صرف دو زبردست قومی سلطنتیں تھیں اور جنگ صد سالہ ان کی باہمی رقابت کا نتیجہ تھی۔ یورپ کی دوسری سلطنتوں کی حالت اس وقت اچھی نہ تھی۔ خاندان ہوہنس ٹافین کے زوال کے بعد سے جرمنی کی قوت منتشر ہو گئی اور سیاسیات اور محاربات میں اس کا کوئی شمار نہ تھا۔ اطالیہ ایک "جغرافیائی اصطلاح" تھی یعنی اس کے شہروں اور سلطنتوں میں کسی قسم کا سیاسی اتحاد نہ تھا۔ ہسپانیہ کی سلطنت باقی نہ تھی اور وہاں کی مختلف عیسائی ریاستوں کو اسلام کی قوت کے مقابلہ میں اپنی ہستی کا برقرار رکھنا دشوار تھا۔ مگر انگلستان میں اتحاد قومی بھی تھا اور اس کا نظام سلطنت استوار تھا۔ ایڈورڈ اول کی ہوشمندانہ تدابیر کی بدولت بادشاہ اور پارلیمنٹ میں پوری ہم آہنگی تھی اور بوقت ضرورت ایک زبردست فوج میدان جنگ میں بھیجنے کے ذرائع موجود تھے۔ فرانس میں ایسا مکمل اتحاد پیدا نہیں ہوا تھا مگر اس کے بیشتر حصہ میں بادشاہ کا اقتدار بلا چون و چرا تسلیم کیا جاتا تھا اور امرا ملک کے کسی حصہ میں نہ تو آزادی نہ ہمسری کے دعویدار تھے۔ چودھویں صدی میں لڑائیاں اکثر بلا سوچے سمجھے ہوا کرتی تھیں اور ان کا آغاز اکثر بادشاہوں کے باہمی بغض و حسد سے ہوا کرتا تھا۔ فرانس کے تخت و تاج اور مقبوضات کے لئے دونوں شاہی خاندانوں میں سو سال تک جنگ رہی گو بعض اوقات صلح بھی ہو جایا کرتی تھی۔

اس جنگ کے ابتدائی زمانے کی ایک نہایت ہی پر لطف تاریخ فرواسار کی لکھی ہوئی ہے۔ اس مورخ نے جنگ کی عظمت اور شان و شوکت کو اس قدر دلچسپ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ قریب قریب ہومر کے پہنچ گیا ہے۔ مگر یہ وقائع نگاری

ہے اگر حقیقی مورخ اس مضمون پہ خامہ فرسائی کرتا تو وہ کچھ اور ہی لکھتا کیونکہ تمدن پہ اس جنگ کا اثر نہایت مہلک تھا انگلستان اور فرانس کے نائٹ فروسیت کے محاسن اور شان کا اظہار میدان جنگ میں کر رہے تھے اور نام آوری حاصل کر رہے تھے مگر ملک لٹ رہا تھا سپاہی خواہ ادنی ہوں یا اعلیٰ وحشیوں اور درندوں سے بدتر تھے۔ فرانس کے ایک مورخ کا قول ہے کہ "فرانس اس زمانہ میں دوزخ کے شعلوں میں سے گزر رہا تھا۔

یہ جنگ دو رقیب سلطنتوں کی وحشیانہ کشمکش تھی مگر سیلک قانون کے علاوہ جنگ کے چھڑ جانے کی ایک اور اہم وجہ تھی۔ ایڈورڈ سوم اسکاٹ لینڈ سے برسرجنگ تھا اور فرانس اسکاچ کا حلیف تھا۔ فرانس کے بادشاہ پر شبہ تھا کہ وہ گوین کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا ہے جس پر ایڈورڈ سوم شاہ فرانس کے نائب کی حیثیت سے متصرف تھا۔ مگر جنگ کی چنگاریاں فی الوقت فلانڈرس سے چمکیں۔ انگلستان اور فلانڈرس کے درمیان گہرے تجارتی تعلقات تھے۔ یورپ میں فلانڈرس اونی کپڑوں کی ساخت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور بہترین اون انگلستان سے آتا تھا اس وقت شاہ فرانس فلارس کے کاونٹ کے ساتھ بڑے شہروں کے متمرد شہریوں کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا۔ اسکے بعد فلانڈرس میں جیکب وان آرٹی ویلڈ ساکن ژان کی سرکردگی میں پھر بغاوت ہو گئی اور باغیوں نے شاہ انگلستان سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے جسے اس طرح فرانس پہ حملہ آور ہونے کے لئے ایک عمدہ مرکز اور مفید حلیف ملگئے کیونکہ جنگ میں کامیابی کا دارومدار زیادہ تر ان حلیفوں پر تھا جو انگلستان کو مل سکیں۔ ابتداءً اسے کامیابی فلارس اور اس کے متصل اضلاع برابان اور ہے نول کی امداد سے ہوئی اور سو سال کے بعد انگلستان کو ناکامی ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اضلاع ڈیوک برگنڈی کے محکوم ہو کر شاہ فرانس کے مطیع ہو گئے

جنگ کے پہلے حصے میں انگلستان کو شاندار اور مسلسل فتوحات حاصل ہوئے اور ایسی فوجوں پر جو اسکی فوجوں سے تعداد میں بہت زیادہ تھیں۔ اسکے علاوہ انگلستان نے جنگ کے طریقوں میں بہت سی جدتیں کی تھیں اسکے سپاہی فوج میں بطیب خاطر داخل ہوتے تھے اور انھیں تنخواہیں ملتی تھیں۔ اسلئے ان کی وہ ابتر حالت نہ تھی جو جاگیری سپاہیوں کی تھی۔ "کالا شہزادہ" انگلستان کا ولی عہد ایک زبردست جنرل تھا جنگوں میں جب حالت نازک ہو جاتی تو اپنی موقع شناسی سے فوراً وہ سمجھ جاتا کہ کیا جدید تدابیر

اختیار کرنی چاہئیں۔ جنگ کے جدید طریقوں کے اختیار کرنے میں بھی اسے تامل نہ ہوتا۔ مثلاً کرے سی اور پواتیر کی لڑائیوں میں اس نے اپنے نائٹوں کو حکم دیا کہ گھوڑوں کو چھوڑ کر پیدل لڑیں۔ لڑائیوں کا خاکہ تیار کرنے میں بھی اسے کمال تھا گو سلسلہ وار معرکہ آرائیوں کے انتظام میں اس قدر طاق نہ تھا انگریزی فوج میں لانبی کمان کا استعمال تھا جو ایک خطرناک اور کارگر ہتھیار ہے۔ یورپ کی فوجوں میں اس کے برابر کوئی آلۂ حرب نہ تھا کیونکہ آڑی کمان کے مقابلہ میں جو فرانس میں مستعمل تھی اسکے تیر زیادہ دور جانے والے اور مہلک تھے۔ اس کمان سے جنگ کے طریقوں میں جو فوری انقلاب ہوا وہ بارود کی ایجاد سے بھی زیادہ تھا۔

جنگ کا اعلان ۱۳۳۷ء میں ہوا۔ زمانۂ حال کی مسلسل اور جلد ختم ہونے والی معرکہ آرائیوں کے مقابلہ میں اس جنگ کی رفتار نہایت سست معلوم ہوتی ہے۔ جب کسی جنگ کا قطعی نتیجہ برآمد ہونے کو ہوتا تو روپیہ کی کمی سے اکثر رکاوٹ پیدا ہو جاتی۔ بیس سال تک تو انگریزوں کا بول بالا تھا۔ سلیوئی (۱۳۴۰ء) کے قریب ایک بحری جنگ ہوئی جسمیں انگریزوں کا بحری تفوق ثابت ہوگیا۔ ۱۳۴۶ء میں ایڈورڈ سوم اور کالا شہزادہ دونوں لاہوگ میں لنگر انداز ہوئے اور کیالے کی طرف کوچ کیا۔ فرانسیسی فوج جو تعداد میں زیادہ اور کامیابی کا پورا یقین رکھتی تھی کرے سی میں انکے مقابلہ پر آگئی۔ اس عظیم الشان جنگ میں فرانس کے امرائے جاگیری انگریزوں پر ٹوٹ پڑے۔ مگر انگریزوں نے اپنا لشکر گاہ خوب مستحکم کر لیا تھا اور فرانس کے امرا گو بہادر تھے مگر ان میں ضبط فوجی نہ تھا بیان کیا گیا ہے کہ انگریزوں نے توپوں سے کام لیا تھا۔ لیکن یہ فتح فی الحقیقت لنبی کمانوں کے بدولت نصیب ہوئی جنکے تیر نائٹوں کی زرہوں کے اندر گھس گئے اور گھوڑوں کا تو بالکل خاتمہ کر دیا۔ انگریزوں کا نقصان نہایت خفیف ہوا۔ اسکے بعد کیالے کا محاصرہ ہوا اور اسکی ناکہ بندی کر دی گئی۔ گرسنگی سے اہل شہر نے بالآخر اطاعت قبول کرلی۔ مگر وہاں سے خارج کر دیے گئے اور انکی جگہ انگریز آبادکاروں نے لے لی تاکہ "دشمنوں کے دروازے" پر انگریزوں کا قبضہ ہمیشہ قائم رہے۔

اس کے بعد ایک مدت تک سکون رہا، جسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ انگلستان میں سیاہ مرض یعنی طاعون پھیل گیا تھا۔ ۱۳۵۵ء میں کالا شہزادہ گوین میں چند معرکہ آرائیوں میں مصروف تھا جنکی بدولت وہاں کے انگریزی مقبوضات میں کچھ وسعت ہوئی ۱۳۵۶ء

میں وہ مال غنیمت لئے ہوئے واپس جا رہا تھا کہ پوائیٹرز کے قریب جان نیک، اس کا سدراہ ہوا جو ۱۳۵۰ء میں فرانس کا بادشاہ ہوا تھا۔ اس بادشاہ کی نیکی جاگیری فروسیت کے معیار کے لحاظ سے تھی کیونکہ فرانس کے لئے وہ ایک منحوس بادشاہ تھا اور اہل فرانس پر جو مصائب اس کے عہد حکومت میں نازل ہوئے وہ اس کی نااہلی کی وجہ سے تھے۔ اس جنگ میں بھی جنگ کریسی کی سی کیفیت ہوئی یعنی فرانسیسیوں کو کامیابی کا یقین کامل تھا اور انھوں نے نہایت جوش کے ساتھ حملہ کیا۔ انگریزوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنا لشکرگاہ مستحکم کر لیا تھا۔ انگریز تیر اندازوں کے تیر پھر مہلک ثابت ہوئے۔ فرانسیسی پسپا ہو رہے تھے اور انگریزوں نے عین وقت پر حملہ کر کے انھیں بھگا دیا شاہ جان نیک خود گرفتار ہو گیا اور لندن بھیجدیا گیا۔

ہزیمتوں، روپیہ کی قلت، طاعون کے مصائب اور اجیر سپاہیوں کی جماعتوں کے مظالم نے اہل فرانس کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا اور ان ناقابل برداشت مصائب سے بچنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی تھی کہ اس کے طریقۂ حکومت میں کوئی انقلاب ہو۔ پیرس اس ٹیفن مارسیل، ملک التجار، کے زیر اقتدار ہو گیا تھا۔ یہ ایک ممتاز شخص تھا اور اگر اسے کامیابی ہوتی تو فرانس بلکہ یورپ کی تاریخ میں اس کا نام رہتا۔ مارسیل چارلس شاہ نوار (چارلس خبیث) کا شریک ہو گیا اور اس نے ایک جدید طریقۂ حکومت کی تجویز پیش کی۔ اگر اس تجویز پر عمل ہوتا تو فرانس کا سیاسی ارتقا اسی اسلوب پر ہوتا جیسا کہ انگلستان کا ان تجویزوں کی بنا پر ۱۳۵۷ء کے قوانین نافذ ہوئے جنکی غایت یہ تھی کہ فرانس میں نیابتی حکومت قائم ہو۔ اسٹیٹس جنرل کی وہی حیثیت رکھی گئی جو انگلستان کے پارلیمنٹ کی تھی۔ محاصل کے عائد کرنے کا حق اسے دیا گیا اور اس کے جلسوں کے جلد جلد ہونے کا انتظام کیا گیا۔ انگریزوں کو ملک سے خارج کرنے کے لئے ایک قومی فوج کے قیام کا منصوبہ بھی تھا جس میں جبری بھرتی کے ذریعہ سے ملک کا ہر فرد شریک کیا جاتا مگر یہ خیالات قبل از وقت تھے اور فرانس میں چودھویں صدی میں اس کا بار آور ہونا ناممکن تھا۔ چارلس شاہ نوار نے مارسیل کی تائید دل سے نہ کی۔ ولی عہد چارلس اپنے باپ کی قید کے زمانہ میں فرانس کا حقیقی حکمراں تھا۔ اہل ملک زیادہ تر اسی کی طرف مائل تھے اور انقلابی تحریک کا اثر پیرس میں محدود تھا کسان شورشوں اور بغاوتوں پر آمادہ

ہوگئے تھے جس سے بدامنی کے خطرات عیاں تھے۔ مارسیل قتل ہوگیا اور اہل پیرس نے ولیعہد کی اطاعت قبول کرلی۔ اس کے بعد جنگ کے انصرام کے متعلق حکومت شاہی جو تدبیریں کر رہی تھی ان میں دخل دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

سنہ ۱۳۶۰ء میں جان نے صلحنامہ برتیگنی کو قبول کرلیا جسکے ذریعہ سے ایڈورڈ سوم بادشاہ انگلستان نے یہ وعدہ کیا کہ وہ مستقبل میں فرانس کے تخت وتاج کا دعویدار بننے سے باز رہیگا۔ اسی صلحنامہ کے ذریعہ سے ضلع ایکوٹین لوار ندی کے جنوب تک اور شہر کیلیے اور اسکے قریب کا ایک ضلع ایڈورڈ کے غیر مشروط قبضے میں آگیا اور اسے ان مقبوضات پر بغیر بیعت یا وفاشعاری کے شرائط کے کامل اقتدار حاصل ہوا۔ بہ ظاہر انگلستان کے لیے یہ ایک بہت بڑی فتح تھی، لیکن درحقیقت یہ خیال بہت جلد غلط ثابت ہوا۔

سنہ ۱۳۶۴ء میں "اچھے جان" نے انتقال کیا اور اس کا بیٹا چارلس پنجم تخت نشین ہوا جو بدشکل کمزور اور بزدل تھا اور اس کی تخت نشینی سے فرانس کی حالت بظاہر اور نازک ہوگئی۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ناعاقبت بیں اور احمق باپ سے بہتر حکمران ثابت ہوا۔ حسن اتفاق سے اسے ایک برٹین نائٹ مسمی ڈی گویس کلین مل گیا جس نے فن سپہگری میں اپنی قابلیت کو بہت جلد ثابت کردیا اور انگریزوں کے حربی کمال کے غرور کو توڑنے کے لئے خاص تدبیریں اختیار کیں اور انھیں پھر کریسی یا پوائیٹرز ایسی شاندار فتوحات حاصل کرنے کا موقع نہ دیا۔ جنگ کو وہ طبقۂ نائٹ کی تفریح کا مشغلہ خیال نہ کرتا اور اس میں کامیابی کے لئے منہمک ہوگیا۔ اس نے انگریزوں کے بیٹ پر ٹھوکر ماری یعنی اس علاقہ کو بالکل ویران کردیا جس میں سے ان کی فوجیں گزرنے والی تھیں اور اہل ملک کو مشورہ دیا کہ فصیل دار شہروں میں پناہ گزین ہوں فرانسیسیوں کو انگریزوں کی طرح کوئی شاندار فتوحات حاصل نہ ہوئیں اور خود ڈی گویس کلین کو دو دفعہ کالے شہزادے نے گرفتار کرلیا۔ مگر انگریزی مقبوضات کی وسعت روز بروز گھٹنے لگی۔ ناقابل برداشت محاصل کے عاید کرنے سے کالا شہزادہ صوبۂ گوین میں بھی غیر ہردلعزیز ہوگیا تھا۔ سنہ ۱۳۷۲ء میں لاروشیل کے قریب ایک جنگ ہوئی جو زیادہ مشہور نہیں ہے مگر تاہم نہایت اہم ہے۔ اس بحری جنگ میں فرانس کو فتح ہوئی۔ ۱۳۷۷ء میں جب ایڈورڈ (شاہ انگلستان) نے انتقال کیا تو فرانس میں انگریزوں کے قبضہ

میں صرف کیالے، بورڈو، بایون اور ان شہروں کے اطراف کے علاقے رہگئے۔

ایڈورڈ سوم کے انتقال پہ فوجی لحاظ سے فرانس کی حالت امید افزا تھی مگر اب بھی وہ اہم تمدنی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا۔ انگریزوں کے خلاف دیوگیس کلیں نے اجیر سپاہیوں کی جماعتوں (کمپنیوں) سے کام لیا تھا جو تنخواہ اور مال غنیمت کے وعدوں پر بھرتی کی گئی تھیں۔ یہ جماعتیں اپنے افسروں کے ماتحت تھیں اور شاہان فرانس کی پرانی جاگیری فوجوں سے زیادہ کارگر تھیں۔ لیکن اس جنگی کارکردگی کے ساتھ ان میں خرابی یہ تھی کہ ایام امن میں ملک کے لیئے وبال جان تھیں کیونکہ لڑائیوں کے ختم ہونے کے بعد یہ سپاہی تمام ملک میں پھیل جاتے اور قتل و غارتگری کرتے۔ بعض اوقات نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کے انسداد کے لیئے دوسری فوجیں بھرتی کی جائیں اور ایک موقع پر ان کے خلاف میں صلیبی جنگ کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔ چارلس پنجم نے جو چارلس دانشمند کے نام سے بھی موسوم ہے ۱۳۸۰ء میں انتقال کیا اور اس کا یازدہ سالہ بیٹا چارلس ششم تخت نشین ہوا۔ اسکی کم سنی کی وجہ سے ملک کو وہ تمام مصائب برداشت کرنا پڑے جو نائب سلطنت regent کے تقرر سے پیدا ہوتے ہیں اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ بادشاہ سن بلوغ کو پہنچنے پر دیوانہ ثابت ہوا مگر کبھی کبھی اس کے ہوش و حواس برقرار ہو جاتے۔ فرانس کے لیئے بہت بہتر ہوتا اگر بادشاہ بالکل دیوانہ ہو جاتا کیونکہ اس صورت میں کسی نائب السلطنت کے تقرر سے استوار حکومت قائم ہو سکتی۔ مگر یہ اس کی قسمت میں نہ تھا اور وہ ان رقیب جماعتوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو گیا جو بادشاہ کے نام سے حکومت کرنا چاہتی تھیں۔

یہ جماعتیں برگنڈوی اور ارمانی نیاک کے ناموں سے موسوم تھیں اور خاندان شاہی کے دو رقیب شہزادوں کے پیرودوں پر مشتمل تھیں جو بادشاہ کے نام سے حکومت کرنا چاہتے تھے فرانس کے لیئے برگنڈی کے ڈیوک کا وجود باعث تباہی تھا اور یہ "اچھے جان" کی حماقت کا نتیجہ تھا۔ ۱۳۶۱ء میں برگنڈی کے حکمراں خاندان کا چراغ گل ہو گیا اور اسکے علاقے حکومت شاہی کی طرف عود کر گئے۔ اصولاً ان کو علاقہ جات شاہی میں شامل کر لینا چاہیئے تھا مگر جان نے یہ ریاست اور ڈیوک کا خطاب اپنے بیٹے فلپ بہادر کو عطا کیا جس نے پوائیر کی ہزیمت میں اس کا ساتھ نہ چھوڑا تھا جان بہادر کی اولاد سے چار پشتوں تک شاہان فرانس کے سب سے خطرناک رقیب اور دشمن پیدا

ہوئے ۔

فلپ بہادر، ڈیوک برگنڈی چارلس ششم کا چچا ہونے کی حیثیت سے نیابت سلطنت کا دعویدار تھا اور اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا جان نڈر بھی نیابت کا طالب ہوا۔ اس کے دعاوی کا مخالف بادشاہ کا بھائی لوئی تھا جو علاقہ آرلیان کا ڈیوک تھا اور ۱۴۱۰ء میں اس ڈیوک کے قتل ہو جانے کے بعد کاونٹ آف آرمانی نیاک اس کے دعاوی اور اس کی جماعت کا حامی ہوا۔ یہ کاونٹ نئے ڈیوک کا خسر تھا جو ابھی کمسن تھا اور اپنے حقوق کے لئے لڑ نہیں سکتا تھا۔ برگنڈیوں اور آرمانی نیاکیوں میں لڑائیاں جس وحشیانہ پن سے ہوئیں ان کی نظیر کم ملیگی گو انگلستان میں یارکیوں اور لنکاسٹریوں کی لڑائیاں ان کے قریب قریب ہیں۔ یہ کشمکش قوت کے لئے تھی اور دولت کے لئے جو قوت سے پیدا ہوتی ہے مگر دونوں حریف جماعتوں نے اپنے دعاوی کو مختلف اصول پر مبنی رکھا تھا۔ آرمانی نیاکیوں کا تعلق فرانس کے جاگیری امرا سے تھا اور ان کے معاون زیادہ تر جنوبی فرانس میں تھے۔ برخلاف اسکے برگنڈی کے ڈیوک نے شہر پیرس کے عوام کو اور شمالی شہروں کے تاجروں کو اپنا حلیف بنالیا تھا مگر یہ اتحاد صرف اس امر پر مبنی تھا کہ دونوں کو آرمانی نیاکیوں سے کد تھی کیونکہ برگنڈوی بوقت ضرورت جاگیری امرا سے بھی ساز باز کر لیا کرتے تھے۔ ان دونوں خاندانوں کی رقابت سے ایک زبردست خانہ جنگی پیدا ہو گئی۔ پیرس انقلاب پسند جماعت کے قبضہ میں آگیا تھا مگر برگنڈویوں کی تائید کے باوجود آرمانی نیاکیوں نے اسے پھر فتح کر لیا۔ بادشاہ اور ولیعہد ان کے قابو میں تھے اور قریب تھا کہ انھیں پوری کامیابی ہو کہ ۱۴۱۳ئہ میں انگلستان کے ساتھ جو جنگ جاری تھی اس نے ایک جدید اور پریشان کن صورت اختیار کر لی۔

اس وقت انگلستان کا بادشاہ ہنری پنجم تھا۔ نوجوانی، سرگرمی اور علوئے ہمت کی وجہ سے وہ ایسی نمایاں فتوحات کی تلاش میں تھا جن سے اہل انگلستان بھول جائیں کہ وہ ان کے تخت و تاج کا حقیقی حقدار نہ تھا۔ اس لئے اس نے فرانس پر حملہ کیا اور ہارفلیور فتح کیا جس میں اس کا سخت نقصان ہوا۔ اس جنگ اور بیماری سے اس کی فوج کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی اور وہ کیلے جا رہا تھا تاکہ وہاں سے انگلستان واپس ہو جائے۔ مگر آژان کور کے قریب ایک زبردست فرانسیسی فوج اسکی سدراہ

ہوئی۔ انگریز سخت خطرے میں پڑ گئے تھے۔ مگر بادشاہ کے حسن تدبیر اور سپاہیوں کی شجاعت اور ضبط فوجی نے انھیں بچالیا۔ دشمن کے غلط حربی تدابیر اور اسکی فوج کی ابتری سے بھی انگریزوں کو نفع ہوا۔ فرانسیسیوں کا حملہ اسی قبیل کا تھا جیسا کہ انھوں نے کری سی اور پواتیر میں کیا تھا اور گو ان کے نائٹ گھوڑوں سے اتر کر پیادہ پا لڑے مگر اس سے کوئی نفع نہ ہوا۔ انگریز تیر اندازوں کے تیر حسب سابق مہلک ثابت ہوئے اور ہنری پنجم کو ایسی شاندار فتح نصیب ہوئی جو کالے شہزادے کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

فرانس کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی تھی۔ ولی عہد اور اس کی والدہ کے درمیان سخت ناچاقی تھی اور مختلف جماعتوں کی خانہ جنگی کے دفع ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی مصالحت کی کوششیں صرف اس غرض سے ہوتی تھیں کہ دھوکے سے قتل کر دینے کا موقع ملے۔ برگنڈیوں نے پیرس پر قبضہ کر لیا اور ۱۴۱۸ء میں جان نیک ڈیوک برگنڈی نے اپنے باپ کے قتل کے انتقام کی غرض سے انگریزوں سے گہرا اتحاد پیدا کر لیا اسکی اعانت سے ہنری نے نارمنڈی بہت جلد فتح کر لیا اور ۱۴۲۰ء میں بمقام ترُوے معاہدہ ہوا جسکی رو سے فتوحات پر مہر توثیق ثبت ہو گئی۔ معاہدے کی شرطیں یہ تھیں کہ فاتر العقل بادشاہ چارلس ششم کی بیٹی کیتھرین کا عقد ہنری پنجم کے ساتھ ہو بادشاہ کے حین حیات وہ بطور نائب السلطنت حکومت کرے اور اسکے انتقال کے بعد فرانس کا بادشاہ ہو جائے۔ ڈیوک برگنڈی کو اس کی تائید کے صلہ میں ان علاقوں میں آزاد کر دیا گیا جن میں وہ شاہ فرانس کا ماتحت تھا۔ سال مابعد میں ہنری پنجم پیرس میں داخل ہوا۔ اس کی آئندہ کامیابیوں کے امکانات غیر محدود تھے مگر ۱۴۲۲ء میں اس نے دفعتہً انتقال کیا۔

چارلس ششم نے بھی اسی سال انتقال کیا اور اس کا جانشین اس کا بیٹا چارلس ہفتم ہوا جو بالآخر چارلس فتح مند کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس کا ایک دوسرا لقب چارلس مخدوم نما بھی ہے کیونکہ اس کے خدام کے زمرہ میں متعدد لائق و فائق اشخاص تھے جنکی بیش بہا خدمات سے اسے کامیابی نصیب ہوئی مگر فی الوقت انگریزوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔ نارمنڈی کے جنوب میں اور سین ندی کے بالائی حصہ کے قرب و جوار کے اضلاع میں جو فتوحات ہوئیں ان کی بدولت

برگنڈی سے اتحاد اور مستحکم ہوگیا اور وسطی اور جنوبی فرانس پر حملہ کرنے کی راہ کھل گئی جہاں چارلس ہفتم کا کچھ اثر باقی تھا فرانس کو اگر کچھ امید ہوسکتی تھی تو یہ تھی کہ انگلستان اور برگنڈی میں ان بن ہو جائے کیونکہ انگریزوں کی کامیابی کا دارومدار برگنڈی کے اتحاد پر تھا۔ ۱۴۲۵ء میں قریب تھا کہ دونوں حلیفوں میں بے لطفی ہو جائے کیونکہ ہمفری رئیس گلاسٹر نے کوشش کی تھی کہ ہے نول کی رئیسہ سے شادی کر کے بعض علاقے حاصل کرے۔ مگر یہ نزاع طول پکڑنے نہ پائی اور ۱۴۲۸ء میں انگریزوں نے اورلیان کا محاصرہ کرنے کا قصد کیا اور اس شہر کے دروازوں پر قلعے بنا دئے اسکے ارد گرد انھوں نے ناکہ بندی نہیں کی مگر انھیں امید تھی کہ رسد کی کمی سے اہل شہر بہت جلد اطاعت قبول کرینگے اور اس طرح فرانس کے جنوبی اور وسطی علاقوں پر حملہ کرنے کا موقع مل جائیگا۔ بظاہر آثار یہ تھے کہ فرانس کی شاہی حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے۔

عین اس وقت جون سائنٹ آرک میدان کارزار میں وارد ہوئی۔ اس کے حالات زندگی کے متعلق معاصرین کی شہادت کافی و وافی ہے اور ان تحریروں کو غور سے جانچنے اور معجزوں کو خارج کرنے کے بعد بھی تعجب کا عنصر کم نہیں ہوتا جو ایک جاہل مگر خوش اعتقاد کسان لڑکی تھی اور اسے جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر اس کی ہمت اور جوش سے دوسروں کی ہمت افزائی ہوتی تھی اور بعض وقت وہ ایسی تدابیر حربی سمجھایا کرتی تھی جنکی توقع صرف تجربہ کار سپاہیوں سے ہوسکتی ہے اسے یقین کامل تھا کہ خدا نے اسے حکم دیا ہے کہ اورلیان کو دشمن کے پنجے سے چھڑائے اور بادشاہ کی بمقام ریمز تاجپوشی عمل میں لائے حالانکہ یہ شہر اس علاقہ کے وسط میں تھا جس پر دشمن کا قبضہ تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کو یقین کامل تھا کہ اس لڑکی میں کوئی فوق الانسانی قوت ہے کیونکہ اسکی بدولت فرانسیسیوں کی انتہائی مایوسی ہمت اور اعتماد سے متبدل ہوگئی اور انگریزوں پر اس کا اثر بالکل برعکس ہوا یعنی وہ ہمت ہار گئے۔ اس کی سپاہی زندگی مختصر تھی اور اس کا اثر اتنا قطعی نہ تھا جتنا کہ بیان کیا جاتا ہے اورلیان دشمن کے پنجے سے چھوٹ گیا اور بادشاہ کی تاجپوشی ریمز میں عمل میں آئی۔ اس کا فریضہ ادا ہو چکا تھا جسے انجام دینے کا مقدس آوازوں نے

اسے حکم دیا تھا۔ فوجوں کے ساتھ رہنا اسے اب منظور نہ تھا اور اسکے بعد جو واقعات ہوئے سابقہ امیدوں کے بالکل برخلاف تھے۔ بادشاہ نے اس کی تائید نہ کی اور غالباً جنرلوں کی طرح اسے بھی اس لڑکی سے حسد تھا۔ فرانسیسی فوج نے پیرس پر حملہ کیا مگر پسپا کر دی گئی۔ اگر جون کے مشورہ پر عمل ہوتا تو شہر ضرور فتح ہو جاتا۔ اس کے بعد اس نے کوم پین کو آزاد کرانے کی کوشش کی مگر برگنڈیوں نے اسے گرفتار کر لیا اور انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ قصہ نہایت اندوہ افزا اور شرمناک ہے۔ انگریزوں کے زیر اثر اس کے مقدمہ کی سماعت ایک عدالت نے کی جسکا صدر بووائے کا اسقف تھا۔ عدالت نے اسے جادوگری کا مرتکب قرار دیا مگر جان بخشی کا وعدہ کیا۔ لیکن اسکے بعد ہی مرتد ملحد ہونے کی پاداش میں اسے سزائے موت اس بنا پر دی گئی کہ اس نے پھر مردانہ لباس اختیار کر لیا تھا۔ جون جلا دی گئی مگر تا دم مرگ وہ ان آوازوں پر اپنا اعتقاد ظاہر کرتی رہی جو اس کے افعال کی محرک تھیں۔

جون بہت کچھ کر چکی تھی مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا فرانس پر انگلستان کی کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی لیکن اب بھی باقی تھی اور اس کی کامیابی کا دارومدار برگنڈی کے اتحاد پر تھا۔ مگر ڈیوک جان "نڈر" اب انگریزوں سے بیزار ہو گیا تھا کیونکہ خود اسکے علاقوں میں بھی وہ اپنا اثر جمانے کی فکر میں تھے۔ ۱۴۳۵ء میں وہ قطعی فیصلہ کر کے انگریزوں سے علٰحدہ ہو گیا اور شاہ فرانس سے صلح کر لی۔ اس کے علاقوں میں اضافہ کیا گیا اور یہ طے ہو گیا کہ اپنے حین حیات وہ فرانس کی ماتحتی سے بالکل آزاد رہے گا۔

انگلستان میں اس وقت نہ تو کوئی حکومت تھی اور نہ کوئی ایسا مدبر تھا جو موجودہ مشکلوں کا سامنا کر سکتا۔ فرانس کی قطع و برید میں اس نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ چھوڑا تھا مگر جاگیر راجیاہ دریش اس کی حالت اب فرانس سے بھی بدتر ہو گئی تھی اور رقیب جماعتوں کی نزاعیں زور پکڑ رہی تھیں جو زمانۂ مابعد میں گلاب والی لڑائی کے نام سے موسوم ہوئیں۔ کامیابی سے اہل فرانس کی ہمت افزائی ہوئی اور وہ سلطنت کی از سر نو تنظیم میں سرگرمی اور اطمینان کے ساتھ مشغول ہو گئے۔ ۱۴۳۶ء میں چارلس ششم پیرس پر پھر قابض ہو گیا۔ آخر عمر تک اسے وفادار اور لائق معاون ملتے گئے جن میں سے اکثر تجار کے طبقہ سے تھے۔ ان ملازمین میں سے ایک مسمی جان بورو نے توپ خانے کی اصلاح کی طرف توجہ کی اس کے مساعی سے فرانس کا توپ خانہ یورپ میں بہترین ہو گیا اور جنگ کے آخری حصے میں اس نے

انگریزوں کے تیر اندازوں کو بیکار کردیا۔ ایک دوسرے افسر ژاک کر ساکن بورژ نے فرانس کے مالیہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا یہ کام نہایت دشوار تھا کیونکہ ملک سخت ابتری اور تباہی میں مبتلا تھا۔ ۱۴۳۸ء کے قانون اساسی سے فرانس کو مالی مدد ملی۔ اس قانون کی رو سے مجالس کلیسا پوپ سے بالاتر قرار دیگئیں اور کلیسیا کو اپنے عہدہ داروں کے انتخاب کا اختیار مل گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی بعض کثیر رقوم جو ابتک پوپ کو ملتی تھیں ان کے ادا کرنے سے انکار کردیا گیا اور ان میں سے بعض خزانۂ شاہی میں داخل ہونے لگیں ۱۴۳۹ء کے قوانین ان سے بھی اہم ہیں۔ ان میں وہ مشہور قانون بھی شامل ہے جو بادشاہ نے قومی فوج کی تنظیم کے متعلق جاری کیا تھا۔ یہ قانون انگریزوں کی وجہ سے جاری نہیں ہوا تھا کیونکہ ان کے ساتھ جو جنگ ہو رہی تھی کچھ روز کے لئے رک گئی تھی' بلکہ قزاقوں کے جتھوں کے انسداد کے لئے نافذ ہوا تھا جو فرانس میں بہ تعداد کثیر موجود تھے۔ ان کی وجہ سے امن و امان بالکل مفقود ہوگیا تھا اور اگر تھا تو صرف فصیل دار شہروں میں یہ قزاق اجیر فوجوں کے سپاہی تھے جو فوج سے علحدہ کردئے گئے تھے۔ یہ لوگ مختلف اقوام اور مختلف طبقوں کے تھے اور جس ملک کی حفاظت کے لئے ملازم رکھے گئے تھے اسی کو نہایت اطمینان سے تباہ و برباد کر رہے تھے۔ پندرھویں صدی میں اہل فرانس کے نزدیک اس تباہی سے بچنے کی صرف یہی تدبیر تھی کہ بادشاہ کی قوت میں اضافہ کیا جائے اس لئے یہ اہم قانون عامۂ قوم کی تائید سے نافذ ہوا۔ امرا اپنی جاگیروں میں ایک محصول موسومہ "تائی" (Taille) جائداد' اراضی اور مکانوں پر وصول کیا کرتے تھے۔ یہ محصول بادشاہ کی طرف منتقل کردیا گیا تاکہ اس کی آمدنی سے ایک مستقل فوج رکھ سکے۔ کسی شخص کو اب یہ اجازت نہ تھی کہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر فوج بھرتی کرے اور کپتانوں کی نامزدگی کا اختیار بھی صرف بادشاہ کو تھا۔ مگر اس قانون کی حقیقی اہمیت کو معاصرین پورے طور سے سمجھ نہ سکتے تھے۔ اس کی بدولت قزاقوں کا قلع قمع ہوگیا اور انگریزوں سے جب پھر جنگ ہوئی تو بادشاہ کے زیر حکم ایک زبردست فوج جمع ہوگئی۔ شاہان فرانس کو ایک ایسے محصول عائد کرنے کا حق حاصل ہوگیا جس میں حسب خواہش کمی و بیشی کا اختیار تھا اور جسکے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں مستقل فوج کے قایم رکھنے کے لئے وصول کی جاسکتی تھیں۔ اہل فرانس نے اپنے بادشاہ کو بطیب خاطر

محاصل کے وصول کرنے اور مستقل فوج کے رکھنے کا حق دیدیا، حالانکہ انگلستان کے بادشاہوں کو یہ حقوق کبھی حاصل نہ ہوئے مگر یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ صرف اسی وجہ سے فرانس میں مطلق العنان شاہی حکومت قایم ہوگئی اور انگلستان باوجود رکاوٹوں کے دستوریت کے طرف گامزن ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ملکوں کی ترقی کی اس مختلف رفتار پر ان کے جغرافیائی مواقع اور قدیم ادارات کا بہت کچھ اثر پڑا ہے مگر ۱۴۳۹ء کا قانون نہایت اہم ہے اور وہ ۱۷۸۹ء تک باقی تھا جبکہ انقلاب کے سیلاب نے حکومت شاہی کا خاتمہ کردیا۔

۱۴۴۹ء میں انگلستان سے پھر جنگ چھڑ گئی اہل نارمن ڈی نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی اور شاہی فوجوں نے ان کی تائید کی۔ رُواؤن پر قبضہ کرلیا گیا اور اس کے بعد فورمنی میں انگریزوں نے آخری مقابلہ کیا جس میں انھیں شکست ہوئی اور کیلے کے سوا شمالی فرانس کا تمام علاقہ ان کے قبضے سے نکل گیا۔ ۱۴۵۳ء میں گوین نے بھی فرانس کی اطاعت قبول کرلی اور صرف بورڈو انگلستان کے قبضے میں رہگیا۔ پیرانہ سال اور تجربہ کار ٹیل بٹ نے ان کھوئے ہوئے علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی آخری کوشش کی اور کاس تی لیون میں جنگ صد سالہ کی آخری لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں انگریز تیرانداز بیکار ثابت ہوئے اور گو انگریز نائٹ بہادری کے ساتھ لڑے مگر بُورُو کے نئے توپ خانے نے ان کا کام تمام کردیا۔

یہ طولانی کشمکش اس طرح ختم ہوگئی۔ اگر اس صدی کے خصائص اور بادشاہوں کے بلاسوچے سمجھے جنگ پر تیار ہوجانے کی عادت کا لحاظ نہ کیا جائے تو انگلستان کی یہ حرکت قابل نفرین قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ اس نے قریب ایک سو سال تک فرانس کو مورد آفات بنا رکھا تھا۔ انگلستان کو بھی اس حرکت کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اگر واٹ ٹائلر اور جیک کیڈ کی بغاوتوں اور "مرض سیاہ" (طاعون) کے پھیلنے کو اس پر محمول نہیں کیا جاسکتا تو گلابوں والی لڑائی ضرور اس کی وجہ سے ہوئی۔ فرانس کی عظیم الشان فتح اور کیلے کے سوا تمام علاقوں سے انگریزوں کے خارج کردیئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس ملک میں حقیقی جذبۂ قومی پیدا ہوگیا تھا جسکے سبب سے اہل ملک انگریزوں کی حکومت کو غیر ملکیوں کا جور و ظلم خیال کرنے لگے تھے۔

۱۴۶۱ء تک چارلس ہفتم نے شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی مگر اس میں اسکے ذاتی مساعی کو بہت کم دخل تھا۔ اسکے عہد حکومت کے اواخر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ گو امرائے جاگیری کی قوت سلب ہو چکی تھی اور وہ ملک کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے تھے مگر ابتک ان میں ہیجان کی سی کیفیت باقی تھی اور شاہی حکومت سے انکے دلوں میں عناد موجود تھا۔ انکے دعاوی کا موید خود ولیعہد تھا جو لوئی یازدہم کے نام سے مشہور ہوا۔ مگر شاہی فوجوں نے انھیں منتشر کر دیا ولی عہد نے برگنڈی کے ڈیوک کے علاقے میں جاکر پناہ لی اور بادشاہ کے آخری ایام سکون سے گزرے۔

اسکے عہد حکومت کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہی حکومت کو بادشاہوں کی حوصلہ مندی یا قوت سے ترقی نصیب نہیں ہوئی حقیقت یہ تھی کہ قوم نے بادشاہ کو اپنی قوت کا مرکز بنالیا اور وہ پارلیمنٹ یا اسٹیٹس جنرل کے مقابلے میں ان کا حقیقی نمایندہ تھا یورپ میں آئندہ صدی میں یہ مقولہ مشہور تھا کہ "حقیقی مسیحا بادشاہ ہے" مگر فرانس نے اس اصول کی حقیقت ایک سو سال قبل پہچان لی تھی۔

باب نوزدہم

کیتھولک کلیسہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں

کلی منٹ پنجم کے پوپ منتخب ہونے اور آدی ینون کو پاپائیت کا مستقر قرار دینے سے کلیسہ کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ارتقائے یورپ میں صدیوں سے پاپائیت ایک اہم قوت تھی۔ مغربی یورپ کی سلطنتوں پر نہ صرف مذہبی بلکہ دنیاوی معاملات میں بھی حکومت کرنے کا اسے دعوی تھا اور اس کی یہ دیرینہ آرزو بر آنے ہی کو تھی کہ فلپ چہارم شاہ فرانس کی کامیابی نے ان منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ پوپوں کے دعوے اب بھی زبردست تھے اور گری گوری ہفتم اور انوسینٹ سوم کی طرح ان کا لہجہ اب بھی تحکمانہ تھا مگر ان کے منصوبوں کے پورے ہونے کا اب وہم وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ دنیاوی حکمراں اب ان پر غالب آچکے تھے۔ اس عہد میں کلیسہ کی تاریخ کے تین دور ہیں۔ پہلے دور میں پوپ جلا وطنی کی حالت میں فرانس میں رہتے تھے اور بادشاہ کے قابو میں تھے۔ یہ دور "قید بابل" کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرے دور میں پوپ اطالیہ واپس آگئے مگر رقیب پوپوں کے انتخاب سے کلیسہ میں تفرقہ پیدا ہو گیا اور اس تفرقے کو دفع کرنے کی یہی صورت ہو سکتی تھی کہ کلیسہ کی مجالس (کونسل) منعقد کی جائیں۔ یہ "تحریک کونسلی" کا عہد تھا۔ اندیشہ تھا کہ اس تحریک سے کلیسہ کی قوت ضعیف ہو جائے گی مگر دراصل ایسا نہیں ہوا۔ پوپ پھر روما میں اقامت گزیں ہوئے اور کلیسہ میں ان کے اقتدار پر کسی قسم کی دستوری روک نہیں تھی مگر اس برائے نام تفوق کے حاصل کرنے میں انھیں اطالیہ کی بیرونی سلطنتوں میں اپنی قوت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اطالیہ میں انھوں نے اپنی قوت مستحکم کر لی اور اس جزیرہ نما کے سیاسیات میں منہمک ہو گئے اس تیسرے دور میں پاپائیت کی حیثیت

ایک اطالوی سلطنت کی تھی اور اس کے بعد ہی مذہبی اصلاح کا طوفان برپا ہوا۔
اوی نیون میں سات پوپ یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے اور وہاں کی سکونت انھیں حد درجہ مرغوب تھی۔ یہ شہر پہلے پر وو انس کے کاونٹ کے مقبوضات میں تھا مگر پوپول نے اسے خرید لیا تھا اور وہاں انھیں ذاتی آزادی حاصل تھی جو روما کے اولوالعزم امرا اور متمرد خلقت کے درمیان انھیں میسر نہ ہوسکتی تھی۔ پوپ کا دربار جب پھر روما کو منتقل ہوا تو کارڈنلوں کو اوی نیون کی عشرت و کامرانی اور وہاں کی متمدن زندگی مدت تک افسوس کے ساتھ یاد آتی رہی اور اہل روما کی ذنائت اور ان کے کمینہ پن کے وہ ایک زمانۂ دراز تک شاکی رہے۔ اوی نیون میں پوپ شاہ فرانس کے متوسلین میں سے تھے اور ان کی وہ آزادانہ حیثیت فنا ہوچکی تھی جس پر ان کا تمام اقتدار مبنی تھا۔ لیکن حقیقی قوت کے زوال کی تلافی کے لئے انھوں نے اپنے زبانی دعووں میں اور بھی اضافہ کردیا۔ شہنشاہی کو دنیاوی حکمرانوں میں تفوق کا دعوی تھا گو باب آئندہ میں ناظرین کو معلوم ہوگا کہ شہنشاہی کس قدر ضعیف ہوگئی تھی۔ پوپوں نے یہ دعوی اب قطعی طور پر پیش کیا کہ وہ شہنشاہی پر فوقیت رکھتے ہیں اور تخت شہنشاہی کے خالی ہونے کی صورت میں نیابت کے طور پر حکومت کرسکتے ہیں مگر شہنشاہ اس دعوی کو تسلیم نہ کرتے تھے جس سے مملکت کی نوعیت، مملکت میں اقتدار کی بنا اور روحانی اور دنیاوی قوتوں کے باہمی تعلق کے متعلق شدید مباحث پیدا ہوگئے شاعر دانتی نے چند سال قبل ایک رسالہ لکھا تھا جس میں اس نے ثابت کیا تھا کہ اطالیہ کی طوائف الملوکی اور ابتری دفع کرنے کے لئے ایک اعلیٰ دنیاوی حکمراں کی ضرورت ہے۔ مارسگ لیو جامعہ پیرس میں مدرس تھا اس نے ۱۳۲۴ء میں شہنشاہ لوئی چہارم کے ایما سے ایک رسالہ لکھا جس میں اس نے بیان کیا کہ پوپ ہی تمام فسادوں اور تفرقوں کا بانی ہے اور یہ کہ کلیسیہ کے صدر کو صرف تلقین و تقریر سے کام لینا چاہئے اور کسی پر جبر نہ کرنا چاہئے۔ شہنشاہی دعوے بھی اصول سے بہت ہٹ گئے تھے۔ مثلاً اس کا یہ دعوی تھا کہ جس شخص کو جرمنی کے ارباب انتخاب شاہ روما اور آئندہ شہنشاہ منتخب کریں اس کے لئے پوپ کی توثیق ضروری نہیں۔ شہنشاہ لوئی روما پہونچا اور وہاں پوپ کے دشمن اس کی تاج پوشی عمل میں لائے جس سے ظاہر ہے کہ پرانے اختلافات موجود تھے مگر ان سے سابق کی طرح مناقشے اور لڑائیاں نہ ہوتی تھیں۔

اَوِی نیون میں پاپائی دربار کی ایک اور خصوصیت تھی جس سے اوّلاً نفع کی بہت کچھ امید تھی مگر دراصل اسی سے زمانۂ آئندہ میں پاپائیت کو ہزیمت ہوئی۔ اس شہر کے تعیش سے اسراف کا دروازہ کھل گیا تھا اور شاہ فرانس کی سرپرستی کے باعث (جو روما میں موجود تھا) ذمہ داری کا احساس بھی جاتا رہا۔ روپیہ پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے گئے اور پاپائی خزانہ معمور ہوگیا۔ گناہوں کی معافی کے پروانے کثرت سے بکنے لگے اور ان کے دام بھی خاصے ہوتے تھے۔ پوپوں کو دعویٰ تھا کہ کلیسیہ کے مختلف عہدوں پر تقرر کرنے کا انھیں حق حاصل ہے اور جو لوگ ان عہدوں پر مقرر ہوتے تھے ان سے نذرانہ وصول ہوتا تھا جو عہدے خالی ہوتے ان کے متعلق یہ دعویٰ تھا کہ ان کی آمدنی پاپائی خزانے میں داخل ہو اور آمدنی کا یہ سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اسی وجہ سے اَوِی نیون کا قیام نہایت پرلطف تھا مگر پاپائی دربار کے تعیش معاصی اور بداعمالیوں سے تمام یورپ گونج اٹھا اور پاپائیت کی حقیقی قوت کی بنیاد کھوکھلی ہوگئی۔ شاہ فرانس کی سرپرستی سے بھی نقصان اور خطروں کا اندیشہ تھا۔ فرانس کے مخالف پاپائیت کی فرماں برداری سے منکر ہوگئے کیونکہ وہ پوپ کو فرانس کا بندۂ فرمانبردار خیال کرتے تھے۔ انگلستان اس وقت فرانس سے برسر جنگ تھا اس نے پاپائی خزانہ میں رقوم داخل کرنے اور پوپ کے مطالبات پورا کرنے سے انکار کر دیا۔

اطالیہ کے پاپائی علاقوں میں بھی سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ پوپ کی عدم موجودگی سے چھوٹے چھوٹے رئیسوں کو سرتابی کا موقع ملا اور انھوں نے آزادی کا اعلان کر دیا تمام ملک میں خانہ جنگی پھیلی ہوئی تھی۔ پوپوں کی واپسی کے اور اہم اسباب بھی تھے ملک کی مذہبی حالت نہایت ابتر تھی۔ فقرائیں سخت باہمی نزاع تھی اور ان میں سے اکثر شہنشاہ کے دعاوی کے سرگرم حامی تھے۔ لیکن یورپ میں ابھی مذہب کا اثر باقی تھا اس زمانے میں ایک مقدس خاتون گزری ہے جو سینٹ کیتھرین سائنہ سینا کے نام سے مشہور ہے۔ پوپ کو روما واپس بلانے میں اس نے اپنے پورے اثر سے کام لیا۔ بالآخر ۱۳۷۷ء میں پوپ گری گوری یازدہم روما کی طرف مراجعت پر رضا مند ہوا۔ اَوِی نیون کا عیش و عشرت چھوڑ کر پوپ کا اپنے قدیم مستقر کو واپس ہونا کلیسیہ کیلئے شگون نیک تھا۔ مگر ۱۳۷۸ء میں گری گوری یازدہم کے انتقال کے بعد اصلاح کے بجائے حالت

دگرگوں ہوگئی اور ایک جدید خطرہ پیدا ہوگیا۔

نئے پوپ کا انتخاب سخت شور و شغب کی حالت میں ہوا۔ خلائق کا جو انبوہ جمع تھا وہ مطالبہ کر رہا تھا کہ نیا پوپ رومی ہو یا کم از کم اطالوی۔ اربن ششم پوپ منتخب ہوا۔ یہ نیپلز کا باشندہ تھا اور خیال تھا کہ اوی نیون واپس جائے گا اس قصد سے وہ باز رہا مگر وہ بذات خود مغرور، خودسر اور مغلوب الغضب تھا جس سے اکثر لوگ اس کے مخالف ہوگئے جو کارڈنل فرانس کے طرفدار تھے انھوں نے جلسہ کرکے اعلان کیا کہ اربن کا انتخاب دھاندھلی سے ہوا تھا لہٰذا کالعدم ہے اور ایک دوسرے پوپ کا انتخاب کیا جس نے کلے منٹ ہفتم کا لقب اختیار کیا۔ یہ شخص مستقل مزاج تھا مگر اوی نیون چلا گیا کیونکہ اطالیہ میں اس کی کامیابی کی کوئی صورت نہ تھی۔ کلیسیہ میں اسطرح سے تفرقہ پیدا ہوگیا۔

کلیسیہ میں اس سے پہلے بھی تفرقے ہوئے ہیں مگر اتنا طولانی اور اہم کوئی نہ تھا۔ روما میں اربن کے کئی جانشین ہوئے اور اوی نیون میں کلی منٹ کے ۱۴۱۷ء تک عالم مسیحی پھر متحد نہ ہوا۔ علاوہ ازیں کلیسیہ کے اس تفرقہ کا باعث یورپ کی سلطنتوں کا باہمی اختلاف تھا اور دونوں دعویداران تخت پاپائی کے ساتھ مختلف سلطنتوں کے تعلقات سیاسی مصالح پر مبنی تھے۔ اربن کے جانشینوں کے مؤید زیادہ تھے کیونکہ ان میں انگلستان اطالیہ اور جرمن شامل تھے۔ کلی منٹ کے فریق کے حامی فرانس اور اسکاٹ لینڈ تھے گو چند روز کے بعد اکثر اہل ہسپانیہ ان کے شریک ہوگئے۔

اس تفرقے سے سخت بدنامی اور خرابی پیدا ہوئی چودھویں صدی میں یورپ کے بہترین دماغ کلیسیہ کی یکجہتی بدل و جان چاہتے تھے کیونکہ بغیر اس کے کلیسیہ کے مذہبی رسوم کی صحت کے ساتھ ادا ہونے کا تیقن نہ ہو سکتا تھا یہ خرابیاں صرف مذہب یا دینیات کی حد تک نہ تھیں۔ دونوں پاپائی دربار ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے، رقمی مطالبات کرتے اور ہر ملک میں اپنے اپنے سفیر رکھتے جو ایک دوسرے کے رقیب تھے ان کے وجود سے عالم مسیحی کو سخت خطرہ تھا۔ اہل یورپ میں سے عام خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ یہ شرمناک حالت بہت جلد ختم کردی جائے لیکن سوال یہ تھا کہ اس کے دفعیہ کی صورت کیا ہو سکتی ہے سب سے آسان تدبیر یہ تھی کہ ایک یا دونوں پوپ اپنی

خدمت سے دست کش ہونے پر آمادہ کئے جائیں۔ مگر دونوں پوپ اور ان کے کارڈنل مناصب اعلیٰ پر فائز تھے جن سے مالی آمدنی بھی خاصی تھی۔ اس کے علاوہ دست کش ہونے کے معنی یہ بھی ہو سکتے تھے کہ وہ خطاپر تھے۔ اسلئے گو پوپوں نے انتخاب سے قبل دست کش ہونے پر آمادگی ظاہر کی تھی مگر انتخاب کے بعد اپنے وعدہ سے منکر ہو گئے اس لئے ضروری تھا کہ کوئی بیرونی قوت ان پر اپنا دباؤ ڈالتی مثلاً شارلی من یا آٹو کا ساکوئی زبردست شہنشاہ ہوتا مگر رقیب دعویداروں کے وجود سے شہنشاہی خود معرض بحث میں تھی۔ فرانس انگلستان سے جنگ میں مشغول تھا کلیسیہ کا یہ تفرقہ بالآخر ایک شہنشاہ ہی کی حسن تدبیر سے دفع ہوا جب کہ شہنشاہی میں پھر کچھ دم آیا۔ لیکن اس کے دخل دینے کے قبل خود کلیسیہ کے اندر اس نااتفاقی کو دور کرنے کے لئے سعی بلیغ ہو رہی تھی۔

یورپ کی جامعات کا اثر روز افزوں تھا ان میں سب سے زیادہ ذی اثر پیرس کی جامعہ تھی اور چودھویں صدی میں اس کے مدرسۂ دینیہ کی بدولت علوم عقلی کو بہت فروغ ہوا۔ اس جامعہ کو ابتدا ہی سے کلیسیہ کے تفرقے دفع کرنے کا خیال تھا اور اسکے امیر مسمی گیرسان اور دیگر اشخاص کی یہ رائے تھی کہ کلیسیہ کی ایک عام مجلس (کونسل) منعقد کی جائے پوپوں کی شخصی حکومت سے لوگ فراموش کر گئے تھے کہ ان مجالس کو کلیسیہ کے انتظامات میں خاص دخل تھا لیکن اب پھر یہ خیال تازہ ہوا کہ ان مجالس کے ذریعہ سے جس طرح سے کہ زمانۂ قدیم میں ملحدانہ عقائد اور اختلافات مذہبی کا استیصال ہوا تھا اسی طرح یہ جدید تفرقہ بھی دفع کیو سکتا ہے۔

بالآخر سنہ ۱۴۰۹ء میں کارڈنلوں کی ایک جماعت کثیر کی تحریک سے پی سا میں ایک کونسل منعقد ہوئی۔ حاضرین کی تعداد اور ارکان کے جاہ و منصب کی وجہ سے یہ کونسل قابل وقعت تھی مگر یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اس کے اقتدار کی بنا کیا تھی اور کس حد تک اسے عالم مسیحی کی متحد آواز کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس نے اپنا کام بلا پس و پیش شروع کر دیا۔ دونوں حکمراں پوپوں یعنی بی نی ڈکٹ سیزدہم اور گری گوری دوازدہم کو حاضر ہونے کا حکم دیا گیا اور جب وہ نہیں آئے تو ملحد اور متمرد قرار دئے گئے اور معزول کر دئے گئے۔ کونسل میں جو کارڈنل موجود تھے انھوں نے اس کے بعد جدید پوپ کے انتخاب کی کارروائی شروع کی اور ایک پیرانہ سال یونانی الاصل شخص کو اس عہدے کے لئے منتخب

کیا جس نے سکندر پنجم کا لقب اختیار کیا۔
مگر اس تدبیر سے بھی تفرقہ دفع نہ ہوا اور دو کے بجائے تین پوپ وقت واحد میں قرار دئے گئے کیونکہ بی نی ڈکٹ اور گری گوری نے معزولی کا حکم تسلیم نہیں کیا اور پی سا کی کونسل کے زیر حکم کوئی ایسی فوج نہ تھی جسکے بل پر وہ ان دونوں کو مستعفی ہونے پر مجبور کر سکتی۔ نیا پوپ صرف چند مہینے زندہ رہا اور سنہ ۱۴۱۰ء میں دم واپسیں تک کارڈنلوں سے یہ کہتے ہوئے قضا کر گیا کہ "صلح و آشتی کے طالب رہو" اس کی جانشینی کے لئے پی سا کے کارڈنلوں نے جان بست وسوم کو منتخب کیا۔ یہ شخص بلند حوصلہ اور اولوالعزم تھا مگر اسکے ساتھ ہی نہایت ہی آوارہ منش تھا۔ ایسے شخص سے کلیسہ میں امن وامان کی امید نہ ہو سکتی تھی۔
لیکن موجودہ حالت سے سخت بدنامی ہو رہی تھی اور جو خرابیاں اس سے پیدا ہو رہی تھیں ایسی نہ تھیں کہ سکوت کیا جا سکتا "قید بابل" سے جو خرابیاں منسوب ہیں وہ ان قبائح کے مقابلے میں کچھ نہ تھیں جو اس تفرقہ کے زمانہ میں پیدا ہوئیں۔ مذہب اور اخلاق میں بعد المشرقین ہو گیا تھا۔ اطالیہ میں سخت ابتری تھی اور دوسرے مقامات کی طرح اس ملک میں بھی شہروں اور جماعتوں کے مناقشات میں اس قدر بے دردی اور بیرحمی برتی جاتی تھی کہ صفحات تاریخ میں اس کی نظیر مشکل سے ملیگی۔ تمام یورپ کاتھولکی اتحاد کے برقرار ہونے کا آرزومند تھا اس اثناء میں جرمنی میں سیاسی اتحاد پھر پیدا ہو گیا۔ مدت سے شہنشاہی تخت کے تین دعویدار تھے مگر سنہ ۱۴۱۰ء میں سگس منڈ شہنشاہ ہو گیا اور اس کا کوئی حریف باقی نہ تھا۔ شہنشاہی اس وقت کوئی زبردست قومی یا سیاسی قوت نہ تھی مگر سگس منڈ بذات خود ہنگری اور بوہے میا میں حکمراں تھا اور سرزمین یورپ میں اس وقت کوئی بادشاہ اس کا ہمسر نہ تھا۔ بوہے میا میں اس وقت ایک مذہبی تحریک سے ہل چل مچی ہوئی تھی جسکا بانی ہس تھا جو وکلف کے خیالات سے متاثر ہوا تھا۔ سگس منڈ زبردست شخصیت کا آدمی نہ تھا اس کے منصوبے اکثر لغو اور مضحکہ انگیز ہوا کرتے تھے مگر اس وقت اس کا نفع اسی میں تھا کہ کلیسہ کو متحد کرنے کی کوشش کرے جس سے اسے نام و نمود حاصل کرنے کی بھی امید ہو سکتی تھی۔

جان بست و سوم نے بھی اس سے درخواست کی کہ اس کے لئے کوشش کرے۔ وہ اس خیال خام میں تھا کہ شہنشاہ کو جس رخ چاہے گا پھیر دیگا۔ مگر شہنشاہ نے اپنا کام سرگرمی اور آزادگی سے شروع کیا جس سے پوپ ہراساں ہو گیا۔ شہنشاہ نے کونسل کے جلسوں کے لئے کانس ٹنس کو پسند کیا تاکہ اس مقام پر جو کام پی سا میں باقی رہ گیا تھا کامیابی کے ساتھ ختم ہو جائے۔ پوپ کی یہ خواہش تھی کہ کونسل کے جلسے اطالیہ کی کسی شہر میں ہوں تاکہ کارروائی اس کے زیر اثر ہو۔ مگر شہنشاہ کے انتخاب کو اسے تسلیم کرنا گو وہ ابتدا ہی سے کہا کرتا تھا کہ "لومڑیوں کو پکڑنے کیلئے یہ جال بنایا گیا ہے"۔

کانس ٹنس میں پادریوں اسقفوں اور کارڈنلوں کا بہت بڑا مجمع ہوا جو یورپ کے ہر ملک سے آئے تھے مگر اطالیہ کے نائبوں کی تعداد ہر ایک ملک کے نائبوں سے زیادہ تھی۔ پادریوں کے علاوہ دیگر اشخاص بھی موجود تھے۔ کانفرنس کے تین مقاصد تھے۔ (۱) کلیسیہ کا دوبارہ اتحاد (۲) الحاد کا انسداد (۳) کلیسیہ کی خرابیوں کی عام اصلاح۔ جان بست و سوم اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ وہ کاتھولیکی اتحاد کا مرکز خیال کیا جائے گا اس کے حریف پوپ معزول کر دئے جائینگے اور وہ خود پوپ تسلیم کر لیا جائے گا مگر اسکی آنکھیں جلد کھل گئیں۔ تینوں پوپوں سے مستعفی ہونے کو کہا گیا۔ اس مطالبہ کا مؤید خود شہنشاہ تھا اس لئے جان بست و سوم کی کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ اس کے مخالفوں کی دلیل یہ تھی کہ جب حضرت عیسیٰ نے اپنی امت کے لئے اپنی جان دیدی پھر پوپ کو اپنے جاہ و منصب سے دست کش ہونے میں کیوں تامل ہے"۔ پوپ مجبوراً اس حکم کی فرمانبرداری پر آمادہ ہوا یا کم از کم اپنی آمادگی ظاہر کی جس سے عالم مسیحی کے متحد ہو جانے کی امید بندھ گئی۔ لیکن اس جال سے بچ نکلنے کی وہ فکر میں تھا اور جبکہ لوگ قومی کرتب دیکھنے میں مشغول تھے بھیس بدل کر نکل بھاگا لیکن کونسل نے جو سگس منڈ کے احکام کی تابع تھی اس کے ساتھ رعایت کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کر دیا کہ "ہم لوگ روح القدس کے ایماسے جمع ہوئے اور پوپ پر فرض ہے کہ ہمارے احکام بجالائے"۔ پوپ اب بالکل بے یار و مددگار تھا اور بالآخر قید ہو کر پھر کانس ٹنس آیا۔ کونسل نے اس کے

خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست تیار کی جس میں الحاد کے سوا تمام جرم موجود تھے "عنفوان شباب سے وہ معاصی میں ڈوبا ہوا ہے۔ کوئی ایسا گناہ نہیں جس سے وہ بچا ہو" جان معزول کر دیا گیا اور اس کی رعایا اس کی فرمانبرداری سے آزاد کر دی گئی کلیسیا میں اتحاد کی اب امید ہو سکتی تھی کیونکہ حریف پوپوں میں سے ایک مستعفی ہو گیا تھا اور ایک معزول ہو چکا تھا۔ اس کے بعد از سر نو انتخاب ہوا اور ۱۴۱۷ء میں متحد کیتھولک کلیسا پر حکومت کرنے کے لئے مارٹن پنجم پوپ منتخب کیا گیا تھا۔

اس انتخاب سے قبل کونسل نے الحاد کے انسداد کے لئے کچھ کارروائی کی تھی وہ قابل اعتراض تھی۔ کلیسیہ کی ابتر حالت سے ایسے عقاید رائج ہو گئے تھے جو اس کے اصول اور طرز عمل کے خلاف تھے انگلستان میں دربار پاپائی کے مظالم اور دراز دستی کے خلاف وکلیف نے قومی حقوق کی تائید کی تھی۔ پادریوں کے اخلاق پر بھی وہ معترض تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ جن مذہبی رسوم کو یہ بدکردار پادری ادا کرتے ہیں وہ کالعدم ہیں۔ کلیسیہ کے مسلمہ عقائد پر اس کا عقیدہ نہ تھا اور صرف بائبل کے برحق ہونے کا قائل تھا۔ اس کے پیرؤوں کی تعداد کثیر تھی اور اس کی اس تحریک کا اثر انگلستان میں خاطر خواہ ہوا اسکے اور اسکے ہم خیال لوگوں کے ساتھ انگلستان میں اعتدال اور انسانیت کا سلوک ہوا۔ لیکن جب اس کی تعلیم کا اثر بوہے میا میں پہونچا تو وہاں اس سے ایک خطرناک ہلچل پیدا ہو گئی۔ بوہے میا کے باشندے سلادی نسل سے تھے اپنے آپ کو زیچ کہتے تھے اور اسی نام سے اب بھی مشہور رہیں لیکن ان کا ملک شہنشاہیت جرمنی میں شامل تھا ان کا شراب خوار بادشاہ وین زیل لاولد تھا۔ لیکن شہنشاہ سجس منڈ، وین زیل کا وارث تھا اس لئے بوہے میا کے معاملات سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ بوہے میا ایک زرخیز اور بڑا ملک تھا۔ اسی ملک میں پریگ میں ایک عظیم الشان جامعہ تھی جس کا شمار یورپ کی تین چار بڑی اثر جامعات میں تھا۔ مگر اس وقت اس ملک میں ایک عجیب ہیجان تھا۔ جرمن نو آبادوں کی وہاں خاصی تعداد تھی جن سے اہل بوہے میا کو سخت نفرت تھی اور چند روز سے کلیسیہ کا ثولیکی سے بھی سخت مخالفت پیدا ہو گئی تھی جو لحاظ اپنے

اصل اور رجحان کے ایک غیر ملکی عنصر خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وک لف کی تعلیم کا اثر پہنچا اور پریگ کی جامعہ میں اس کا خیر مقدم ہوا۔ وک لف کے عقائد کا بڑا حامی ہُس تھا جو اس جامعہ میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھا۔ اس کے مواعظ کا لب لباب یہ تھا کہ "پوپ بیا اہل پوپ میا کے لئے ہے" پادریوں کی بدکرداریاں کلیسیہ کی تباہی کا باعث ہو رہی ہیں' مذہبی معاملات میں ہر فرد واحد کا ضمیر قطعی فیصلہ کر سکتا ہے' عشار ربانی کا حضرت عیسیٰ کے خون سے بدل جانے کا مسئلہ بالکل غلط ہے صرف بائبل صحیح ہے"۔ اس کی تعلیم کو عام قبولیت حاصل ہوئی۔ روما میں اسے کافر قرار دیا گیا اور کلیسیہ سے خارج کر دیا گیا مگر عوام پر جو اس کا اثر تھا' اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

کانس ٹنس کی کونسل پوپوں کو معزول کر رہی تھی اس لئے وہ اپنے راسخ الاعتقاد ہونے کا ثبوت دینا چاہتی تھی اور سجس منڈ اس فکر میں تھا کہ کلیسیہ کو متحد کرنے کے علاوہ بوہے میا میں ملحدانہ عقاید کا استیصال کر دے اس لئے اس نے ہُس کو پروانۂ راہداری دے کر کانس ٹنس بلایا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ جب چاہے آئے اور جب چاہے چلا جائے ہُس نے اس دعوت کو منظور کر لیا کیونکہ وہ اپنے عقائد کے متعلق بحث کرنا چاہتا تھا مگر وہاں پہونچکر اسے معلوم ہوا کہ کونسل دلائل سننے پر آمادہ نہیں ہے۔ ہُس قید میں ڈال دیا گیا اور مرنے سے بال بال بچ گیا۔ کونسل میں جب بالآخر وہ پیش ہوا تو اس کے عقائد ملحدانہ قرار دئے گئے۔ سجس منڈ سے کہا گیا کہ وہ اپنے پروانۂ راہداری کو منسوخ کر دے کیونکہ ملحدوں کے ساتھ جو وعدہ کیا جائے اس کے ایفا کرنے کی ضرورت نہیں۔ بالآخر وہ کانس ٹنس کی فصیل کے باہر ۱۴۱۵ء میں جلا دیا گیا۔

مگر اس کونسل میں کلیسیہ کی خرابیوں کی اصلاح کے متعلق نہ تو کوئی کارروائی ہوئی نہ کوئی خاص توجہ کی گئی کیونکہ یہ معاملہ نہایت پیچیدہ تھا اور سجس منڈ اس فکر میں تھا کہ کانس ٹنس کو خیر باد کہے کیونکہ جلسے بہت طول کھینچ چکے تھے کونسل جب برخاست ہوئی تو یہ وعدہ کیا گیا کہ کلیسیہ کی خرابیوں کے دفع کرنے کی غرض سے دوسری کونسل عنقریب منعقد کی جائے گی۔

مگر حسب وعدہ کونسل کا اجلاس جلد نہ ہوا کیونکہ پوپ کونسلوں کے انعقاد کے اصول کے مخالف تھے جن سے ان کے شاہی اقتدار محدود ہونے تھے اور

اگر بوہے میا کی حالت نہایت نازک نہ ہو جاتی تو بے سل کی کانفرنس کبھی منعقد نہ ہوتی
ہَس کے نذرِ آتش ہونے سے اس ملک میں سکون نہ ہوا بلکہ اس کی چتا سے جو شعلے اٹھے
ان سے تمام ملک مشتعل ہو گیا۔ ہَس کے پیرووں کو قابل سردار مل گئے جن میں زِسکا
اور پروکوپ قابلِ ذکر ہیں۔ زِسکا طبقۂ امراء میں سے تھا اور پروکوپ پادری تھا
بوہے میا کی جنگ فوجی تاریخ کا ایک عجیب و غریب باب ہے۔ باغیوں نے توپخانے
سے بہت کم کام لیا اور ان کی فوجیں اس سرعت سے حرکت کرتیں کہ بھاری بھرکم شہنشاہی
فوجیں جو ان کے مقابلے کے لئے بھیجی جاتیں بیکار ثابت ہوتیں۔ بوہے میا اب بالکلیہ باغی
ملحدوں کے قبضے میں تھا اور ان کی فتوحات کا سلسلہ جرمنی تک پہنچ گیا۔

بوہے میا میں بغاوت زیادہ تر کلیسیہ کی بد انتظامی سے ہوئی تھی۔ اس لئے
اصلاحات پر غور کرنے کے لئے سنہ ۱۴۳۱ء میں ایک نئی کونسل بے سل میں منعقد ہوئی اور
سنہ ۱۴۴۹ء تک اس کے اجلاسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ کونسل کانسٹنس کی کونسل سے زیادہ
انقلاب پسند اور خود سر تھی مگر اس کا اثر بہت کم ہوا۔ کچھ روز تک تو اس کی وجہ سے
کلیسیہ میں پھر تفرقہ ہوا اور جب اس کے اجلاسوں کا سلسلہ ختم ہوا تو اس کا کسی کو افسوس
نہ ہوا۔ اولاً بوہے میا کے مسائل پر بحث ہوئی ہَس کے پیرووں کے نائبوں کو اپنے
عذر پیش کرنے کا موقع دیا گیا اور ان کے ساتھ بڑی بڑی رعایتیں منظور کی گئیں لیکن
بوہے میا کی جنگ ان مراعات سے ختم نہیں ہوئی بلکہ اس لئے کہ باغیوں میں
اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کی دو جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ سنہ ۱۴۳۴ء میں
انتہا پسندوں کو جن کا سردار پروکوپ تھا لی پا میں سخت نقصان کے ساتھ شکست
ہوئی جس کی وجہ سے بالآخر ایک ایسا تصفیہ ہو گیا جو دربارِ روما کے مقاصد کے موافق
تھا اور سجس مند طول طویل نامہ و پیام کے بعد بوہے میا کا حاکم ہو گیا۔ اس نے وعدے
بہت سے کئے تھے مگر ان کے ایفا کا قصد نہ رکھتا تھا۔ سنہ ۱۴۳۷ء میں اس نے انتقال کیا
کسی مورخ کا اس کے متعلق یہ خیال نہیں ہے کہ وہ ایک جلیل القدر شہنشاہ تھا کیونکہ
اس کے افعال میں خود نمائی اور تلون کو بہت دخل تھا۔ مگر ایک منصب جلیلہ پر
وہ فائز تھا اور اس کے مقاصد اعلیٰ اور مستحسن تھے۔ پندرھویں صدی کے اکثر اہم
واقعات سے اسے تعلق ہے اور اس کی سیاسی زندگی سے اس کے انتقال کے بعد

ایک سو سال تک جرمنی کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔
کونسل کے ساتھ شہنشاہ کا تعلق ہمیشہ یکساں نہ تھا اور کسی زمانہ میں بالکل دوستانہ نہ تھا لیکن پوپ ہمیشہ کونسلوں کے مخالف تھے۔ کانس ٹنس کی کونسل سے بھی زیادہ بے سل کی کونسل کا یہ مقصد تھا کہ پوپ کے اقتدار اعلیٰ کو نہ صرف محدود کردے بلکہ اسے تباہ کردے اور اقتدار پاپائی کے بجائے کلیسیہ میں ایک قسم کی دستوری حکومت قائم کرے۔ کانس ٹنس کی کونسل نے اعلان کیا تھا کہ کلیسیہ میں کونسلیں اعلیٰ ترین قوت ہیں اور بے سل کی کونسل نے اس اصول کا الفاظ ذیل میں نہایت زور کے ساتھ پھر اعلان کیا "عام کونسلیں اپنے اقتدار خود حضرت عیسیٰ سے حاصل کرتی ہیں اور ہر درجہ کے ہر فرد کو خواہ وہ پوپ ہی کیوں نہ ہو کونسلوں کے ان احکام کی پابندی کرنا چاہئے جو عقاید الحاد کے انسداد اور کلیسیہ کے صدر اور ارکان کی اصلاح سے متعلق ہوں"۔ بے سل میں یہ کوشش کی گئی کہ اس اصول کو کلیسیہ کا اہم ترین عقیدہ بنادیں اور پوپوں کو مجبور کریں کہ اپنے عہدہ پر فائز ہونے سے قبل اس اصول کو تسلیم کرنے کا حلف اٹھائیں۔ کونسل کی روش ایسی تھی کہ پوپ خواہ مخواہ اس کی مخالفت کرے۔ چنانچہ پوپ یوجے نیس چہارم نے دو مرتبہ کوشش کی کہ بے سل کی کونسل برخاست ہو جائے اور پھر اطالیہ کے کسی شہر میں منعقد ہو جہاں اس میں اطالوی پادریوں کی تعداد کثیر موجود ہو جو پوپ کے طرفدار تھے مگر پوپ کو کامیابی نہ ہوئی کیونکہ اکثر دنیاوی حکمراں کونسل کے معاون تھے۔ بالآخر پوپ اور کونسل کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ کونسل نے پوپ کو معزول کرنے کا قصد کر لیا۔ اصل بنائے مخاصمت یہ تھی کہ پوپ کونسلوں کے تفوق کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ کونسل نے ایک نیا پوپ منتخب کیا جس کا لقب فی لکس پنجم تھا۔ کونسل نے اب کلیسیہ کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ ان کے مقاصد یہ تھے کہ دربار پاپائی کے صیغۂ مالیہ میں جو ابتری تھی اسے دفع کریں گناہوں کی معافی کے پروانے کونسل خود اپنی طرف سے جاری کرے اور نامہ و پیام کے ذریعہ سے کلیسیہ مشرقی کو کلیسیہ روما سے انضمام پر آمادہ کرے۔ مگر ان مقاصد کا بر آنا کونسلوں کی قوت سے باہر تھا۔ یورپ کی حکومتوں کا جنکی تائید پر ان کی کامیابی کا دار و مدار تھا اب ان پر اعتماد باقی نہ تھا۔ بوہیمیا کے مسئلے کے تصفیہ

یں ان کا بھی حصہ تھا مگر اس ملک کی بغاوت کو بالآخر شہنشاہ اور پوپ نے بغیر کونسل کی مدد کے دفع کر دیا۔ کلیسا میں ایک جدید تفرقہ کوئی پسند نہ کرتا تھا اور کسی کو یہ امید نہ تھی کہ کونسل ان اصلاحات کو عمل میں لا سکے گی جس کا اسے دعویٰ تھا جرمنی اور فرانس کی حکومتیں کلیسیہ کی خرابیوں کو دفع کرنے کے لئے کونسل کے توسط کے بغیر پوپ سے راست نامہ و پیام کر رہی تھیں۔ اس لئے بے سل کی کونسل کی بنیاد کھوکھلی ہوگئی اس کا اثر زائل ہوتا گیا اور بالآخر ارکان کی تعداد بہت کم رہ گئی۔ فی لکس پنجم بھی مستعفی ہوگیا۔ بالآخر ۱۴۴۹ء میں یہ کونسل برخاست کردی گئی اور کسی نے اس جماعت کی تائید کا خیال نہ کیا جس نے باتیں بہت بنائیں مگر کام کچھ نہ کیا۔

کونسل کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ پوپ کا اقتدار پھر بڑھنے لگا۔ یونانیوں کے ساتھ جو نامہ و پیام شرقی اور مغربی کلیساؤں کے انضمام کے متعلق ہو رہے تھے ان میں پوپ یوجے نیس چہارم کو کامیابی ہوئی۔

لاطینی کلیسیہ کے لئے بظاہر یہ بہت بڑی فتح تھی بے سل کی کونسل کی خواہش کے خلاف اس نے خود ایک کونسل فلارنس میں منعقد کی جو کچھ روز کے بعد فے رارا کو منتقل کردی گئی اس کونسل میں بہت سے یونانی اسقف موجود تھے جو لاطینیوں کے مطالبات تسلیم کرنے پہ آمادہ تھے۔ ناظرین یہ نہ خیال کریں کہ یونانی اس اتحاد کو پسند کرتے تھے۔ یا دلایل و براہین سے وہ معقول ہوگئے تھے۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ قسطنطنیہ میں مسیحی سلطنت کا دم واپسیں تھا چوتھی جنگ صلیبی نے یونانی شہنشاہی کی کمر توڑ دی تھی۔ اور گو یونانی شہنشاہوں کا خاندان پھر بحال ہوگیا تھا مگر اب ان میں اتنی قوت نہ تھی کہ ترکوں کی مسلسل یورشوں کو دفع کرسکیں اگر انھیں مدد مل سکتی تھی تو صرف مغرب کی مسیحی سلطنتوں سے اور اس کا امکان اس وقت تک نہ تھا جبتک کہ وہ مغربی کلیسیہ کے مذہبی عقاید تسلیم نہ کرلیتے۔ اس لئے قسطنطنیہ کا بطریق اور متعدد یونانی اسقف فلارنس اور فے رارا کے جلسوں میں شریک ہوئے۔ امور زیر بحث حسب ذیل تھے:۔ عشائے ربانی میں خمیری روٹی استعمال کی جائے یا بلا خمیر کی، روح القدس باپ کا مظہر ہے یا باپ اور بیٹے دونوں کا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ روما کے اسقف کو تمام کلیسیہ پر تفوق حاصل ہے یا نہیں۔ یونانیوں نے نہایت باریک بحثیں نکالیں مگر بالآخر

ان میں سے اکثر نے کلیسیہ روما کے مطالبات تسلیم کر لئے جولائی ۱۴۳۹ء میں مشرقی اور مغربی کلیسائیوں کو اتحاد کا اعلان کیا گیا۔ پوپ کے لئے یہ ایک زبردست کامیابی تھی مگر تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ محض زبانی تھی کیونکہ یونانیوں نے اپنے پادریوں کا تصفیہ منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ "پوپ کے تاج سے ترکوں کی دستار بہتر ہے" کلیسائیوں کے اتحاد کی رسم دسمبر ۱۴۵۲ء میں منائی گئی جبکہ ترک قسطنطنیہ کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے اور اس کے چند مہینوں ہی کے بعد قسطنطنیہ میں ہلال کو صلیب پر وہ زبردست فتح حاصل ہوئی (۱۴۵۳ء) جس نے تمام دنیا کو ہلا دیا۔

بے سل کی کونسل کے برخاست ہوتے ہی کونسلی تحریک بھی ختم ہو گئی اور پوپوں کی شاہانہ حکومت کے بجائے کلیسیہ میں دستوری حکومت قائم کرنے کی کوشش میں سخت ناکامی ہوئی۔ انگلستان اور فرانس میں بھی اس قبیل کی سیاسی تحریکوں کا یہی حشر ہوا۔ چنانچہ فرانس میں اسٹیٹس جنرل کا اقتدار قایم نہ ہو سکا اور چارلس ہفتم اور لوئی یازدہم کی مطلق العنان شاہی حکومتوں پر اس صدی کا خاتمہ ہوا۔ انگلستان میں بھی لنکاسٹریوں کے قبل از وقت دستوری تجربوں کے بعد یارکیوں اور ٹیڈروں کی زبردست شاہی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اسی طرح کلیسیہ کے مظالم میں کلیسیہ کی اصلاح اور تنظیم جدید میں کونسلوں کی ناکامی سے پوپ کے اقتدار کو بظاہر تقویت ہوئی۔ یوجے نیس کے جانشین نکولاس پنجم نے عہد نشأت جدید میں ادبیات اور فنون لطیفہ کا مربی بنکر دربار پاپائی کی عزت افزائی کی۔ اس کے بعد پیس دوم پوپ ہوا یہ شخص جس کا اصلی نام اے نیاس سل دیس تھا بڑا عالم تھا اور اس نے کونسلوں کی تائید میں رسالے لکھے تھے اور تقریریں کی تھیں۔ مگر سن ۱۴۶۰ء میں اس نے ایک فرمان جاری کیا جو (Execrablis) کے نام سے مشہور ہے۔ اس فرمان میں اس نے کونسلوں کے انعقاد کی درخواست کو ایک قابل نفرین اور مذموم فعل قرار دیا جبکا زمانہ قدیم میں وہم و گمان بھی نہ تھا اور اعلان کیا کہ جو شخص اس قسم کی درخواست کرے گا اپنے اس فعل سے کلیسیہ سے خارج ہو جائے گا۔ مگر اس کے باوجود یہ سلسلہ جاری رہا گو فرمان مذکور کا شمار اقتدار پاپائی کی زبردست بنیادوں میں ہونے لگا۔

بظاہر پاپائیت اس تمام فتنہ و فساد سے صحیح وسلامت نکل آئی تھی اور پوپ پیس کے دل میں یہ خیال آتا ہوگا کہ اس کا مرتبہ حیثیت و اقتدار وہی ہے جو گریگری ہفتم یا انوسینٹ سوم کو حاصل تھا۔ مگر واقعہ اس کے برعکس تھا۔ کلیسیہ کے عقاید اور طرز حکومت پر جو اعتراضات وِکلِف اور ہَس نے کئے تھے وہ نہ تو خود لوگوں کے دلوں سے فراموش ہوسکتے تھے نہ جبراً فراموش کرائے جاسکتے تھے۔ علوم کے احیاء سے مخالفوں کو نئے ہتھیار مل گئے۔ ایراسمس ۱۴۶۷ء میں اور لیوتھر ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا اسوقت قرونِ وسطیٰ کی طبعی راسخ الاعتقادی ہمیشہ کے لئے زایل ہوچکی تھی۔ مذہبی تفرقوں اور کونسلوں کے باعث مذہبی معاملات میں بھی ایک خطرناک قومی احساس پیدا ہوگیا تھا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، بلکہ ہسپانیہ نے بھی مذہبی معاملات کو عالمگیر مسیحی کلیسیہ کے افراد کی طرح نہیں بلکہ انھیں من حیث القوم طے کرنا شروع کردیا۔ ملحوظ خاطر رہے کہ پاپائیت کو آئندہ چلکر اسی جذبہ قومی سے دست وگریبان ہونا پڑے گا اس زمانے میں پاپائیت خالص اطالوی ہوتی جاتی تھی۔ یورپ پر مذہبی اور سیاسی معاملات میں حکمراں ہونے کا اسے اب بھی دعویٰ تھا مگر اس دعوی کی کسی کو مطلق پروانہ تھی۔ مگر اطالیہ میں پوپ کی قوت اب بھی خاصی تھی گو وہ دوسرے حکمرانوں پر غالب نہ تھا۔ اصلاح مذہبی کے طوفان کے برپا ہونے تک پوپوں کو زیادہ تر توجہ اپنے علاقوں کے ذرایع کو ترقی دینے کی طرف تھی تاکہ اطالیہ کی حریف قوتوں میں ان کا اثر بڑھے۔ اس طرز عمل سے کچھ روز تک وہ محفوظ رہے مگر پیس دوم کے انتقال کے نصف صدی کے بعد یہی طرز عمل ان کے زوال کا باعث ہوا۔

جرمنی اور اطالیہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں

جرمنی

انگریزوں کے لئے چودھویں اور پندرھویں صدی میں جرمنی کی تاریخ سمجھنا ایک گونہ دشوار ہے کیونکہ اس عہد کی تاریخ انگلستان سے یہ بظاہر بالکل مختلف ہے اور خصوصیات کے لحاظ سے فرانس کی تاریخ بھی اس سے متغائر ہے۔ حکومت شاہی اور پارلیمنٹ کے مساعی کی بدولت انگلستان میں قومی اتحاد پیدا ہو گیا تھا اور نارمن فتوحات کے بعد اس اتحاد میں ترقی اور استحکام ہو رہا تھا، جس میں جان کی حکومت کی لامرکزیت اور گلابوں والی لڑائی کے ابتدائی خانہ جنگی سے کوئی فرق نہیں آیا۔ انگریزی قوم نے اپنے بادشاہ کے تحت میں متحد ہو کر ویلز اور آئرلینڈ کو اپنی سلطنت میں ملحق کر لیا تھا۔ فرانس نے جس نہج پر ترقی کی اسے بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ وہاں کے بادشاہ گیارھویں صدی سے اپنے علاقوں کو وسعت دے رہے تھے یہاں تک کہ تمام ملک فرانس ان کے زیر نگیں ہو گیا اور بڑے بڑے امراء آزادی یا بادشاہ کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتے تھے۔ بادشاہ کے تحت میں مرکزیت کی طرف رجحان ہسپانیہ میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ رجحان اس عہد کے عام سیاسی خصایص میں سے ہے۔

مگر جرمنی کا رجحان بالکل مختلف تھا یعنی اس کا رخ اتحاد کے بجائے لامرکزیت کی طرف اور جاگیری حقوق کو مٹانے کے بجائے انھیں بڑھانے کی طرف۔ ۱۲۵۴ء میں ہوہین اسٹافین کے شاہی خاندان کی شکست اور تباہی کے بعد جرمنی کی حکومت شاہی کو زخم کاری لگا۔ ایک زمانہ تک منصب شہنشاہی حالت تعطل میں تھا اور اس وقفہ کے بعد شہنشاہیت

جب پھر قائم ہوئی تو بس اس کا نام ہی نام تھا اور کسی دانشمند شہنشاہ نے پھر تمام یورپ پر عام حکومت کرنے کی کوشش نہ کی جس کی فریڈرک بار بروسا کو آرزو تھی۔

اس کے علاوہ جرمنی کی شاہی حکومت کارگر بھی نہ ہو سکتی تھی کیونکہ پاپائیت کے ساتھ جو کشمکش مدت تک جاری تھی، اس کے دوران میں جرمنی کے امرائے عظام نے قوت اور امتیاز حاصل کر لیا تھا اور جرمنی کا مستقبل انہیں کے ہاتھوں میں تھا۔ شہنشاہی کی قوت کا دار و مدار اب اقتدار شہنشاہی پر نہ تھا بلکہ اس خاندان کی قوت پر جس میں شہنشاہی عندالوقت ہوتی۔ اسی لئے جرمنی کی تاریخ میں امرائے عظام کے خاندانوں کے عروج و زوال کی اہمیت بہت زیادہ ہے اس کے برخلاف انگلستان کے بڑے بڑے خاندانوں (مثلاً نارفک وارک نارتھم برلینڈ، ویسٹ مورلینڈ وغیرہ) کے حالات کا دریافت کرنا چنداں ضروری نہیں ہے۔ لیکن جرمنی میں ملک کی سیاسی تاریخ قریب ایک درجن بڑے خاندانوں (مثلاً وٹیل باخ، وے ٹن، ویلف، ہیپس برگ، ہوہن زولرن وغیرہ) کی شادیوں وراثتوں، جھگڑوں وصیتوں اور علاقہ جات کے الحاق پر مبنی تھی۔ جس جس طرح یہ لوگ ایک خاندان کو دوسرے خاندان سے، ایک صوبہ کو دوسرے صوبہ سے اور ایک سلطنت کو دوسری سلطنت سے ملحق کرتے جاتے زمانۂ حال کا یورپ وجود میں آتا جاتا۔

شہنشاہی کی تباہی کا باعث صرف پاپائیت کی مخالفت نہ تھی بلکہ اس کا انتخابی ہونا بھی اس کی ترقی میں مانع تھا بعض اصولی اشخاص انتخابی حکومت کے موید ہیں مگر عملاً یہ طریقۂ حکومت کارگر ثابت نہیں ہوا ہے۔ جرمنی میں روایات کے لحاظ سے شہنشاہ کے انتخاب کا حق صرف چند بڑے کلیسائی اور دنیاوی حکمرانوں کو حاصل تھا اور یہ انتخاب کنندگان امیدواران شہنشاہت سے ایسے وعدے لے لیتے تھے جن سے شہنشاہت کی وقعت ایک خالی خولی خطاب سے زیادہ نہ رہ جاتی۔ ان وعدوں کو جرمنی میں (Capitulations) کہتے تھے۔ اس کے علاوہ انتخاب کنندگان عموماً کسی ایسے امیر کا شہنشاہت کے لئے انتخاب کرتے جو زیادہ طاقتور نہ ہوتا کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر کسی زبردست امیدوار کا انتخاب ہوگا تو وہ امرائے جاگیری کی قوت توڑ دے گا اور ان کے دعاوی کو پامال کر دیگا امرا کو یہ خیال بھی تھا کہ شہنشاہت اصولاً بالفی الواقع موروثی نہ ہونے پائے کیونکہ

جن حکومتوں نے سورثیت کا اصول اختیار کر لیا تھا۔ انھیں اس سے تقویت پہنچی تھی۔

لیکن اگر ہم جرمنی کے حالات پر غائر نظر ڈالیں تو وہاں بھی شاہی مرکزیت کا رجحان غالب پایا جائیگا۔ شہنشاہی تو امرائے عظام کے مقابلے میں بالکل کارگر نہ تھی مگر بڑے امرا نے چھوٹے امرا کو بالکل اپنے قابو میں کر لیا تھا اور ڈیل باخ ہوہین زولرن اور ہیبس برگ خاندانوں کے علاقوں کی حیثیت حقیقی شاہی حکومتوں کی تھی گو جرمنی کو بہ حیثیت مجموعی شاہی حکومت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس لئے جرمنی کی حقیقی تاریخ شہنشاہی کی تاریخ کے صفحوں میں شامل نہیں ہے۔ ہم اولاً ممتاز شہنشاہوں کی فہرست پر نظر ڈالیں گے اور اس کے بعد ان اہم واقعات کا ذکر کریں گے جنکا تعلق جرمنی کی برائے نام شہنشاہی سے نہ تھا۔

۱۲۷۳ء میں ۱۹ سال کے وقفے کے بعد جسمیں تخت شہنشاہی خالی تھا اڈولف جو خاندان ہیبس برگ سے تھا شہنشاہ منتخب ہوا اُسوقت اسکے خاندان کو جرمنی میں کسی قسم کا تفوق حاصل نہ تھا۔ ہیبس برگ جسکے لغوی معنے قلعۂ زاغان ہے سوئٹزرلینڈ میں واقع تھا اور قیاس تھا کہ اس خاندان کو اسی نواح میں فروغ حاصل ہوگا۔ اڈولف کے عہد حکومت کا اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ جرمنی کی مشرقی سرحد پر اس نے اپنے خاندان کے لئے بڑے بڑے علاقے حاصل کئے مگر اس الحاق سے اس کے خاندان اور اولاد کو نفع ہوا نہ کہ جرمنی کو۔

جرمنی کی مشرقی سرحد پر متعدد غیر جرمنی سلطنتیں تھیں اور ایک کے علاوہ سب کے باشندے سلاوی النسل تھے۔ پرشیا اور لتھوائے نیا کی سلطنتیں شمال میں تھیں اور ان کے جنوب میں پولینڈ بوہے میا اور ہنگری تھے۔ اہل ہنگری جو اپنے آپ کو مگ یار کہتے تھے تورانی النسل ایشیائی تھے اور اپنے ہم قوموں (تورانیوں) کی تیسری جماعت میں سے تھے۔ جو ڈینیوب کی وادی کی راہ سے یورپ میں داخل ہوئی تھیں بوہے میا اور جرمنی کے تعلقات جرمنی سے نہایت اہم تھے۔ ہنگری شہنشاہی کے حدود سے باہر تھا مگر بوہیمیا اس میں شامل تھا اور اسکے بادشاہ کو بعض اوقات شہنشاہی کے انتخاب کرنے والوں میں شریک کیا جاتا تھا۔ گو زبان اور قومیت کے لحاظ سے اسکے باشندے جرمنوں سے متغائر تھے بوہے میا میں اس وقت ایک زبردست بادشاہ اٹو کار حکمراں تھا جس نے بوہیمیا کے جرمن اضلاع آسٹریا اس ٹائی ریا اور کیارن تھیا پر قبضہ کر لیا تھا اور اڈولف کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے جنگ چھڑ گئی

۱۲۷۸ء میں مارچ فلڈ کی لڑائی میں آٹوکار شکست یاب ہوکر مارا گیا۔ اس کے جرمن مقبوضات اڈولف کے قبضہ میں میں آگئے اور ایک شادی کے ذریعہ سے ہیپس برگ کے خاندان کا اثر بوہے میا میں قایم ہوگیا جو زمانۂ مابعد میں اس سلطنت کے الحاق کا باعث ہوا۔ مارچ فلڈ کی جنگ کا اثر ابتک یورپ کے سیاسیات پر باقی ہے کیونکہ موجودہ شہنشاہی آسٹریا کی قوت کی بنیاد اسی جنگ پر ہے۔

تاج شہنشاہی اب خاندان ہیپس برگ میں موروثی ہونے والا تھا مگر اس میں ابھی دو سو سال باقی تھے۔ اڈولف کے عہد حکومت کی کامیابی نے انتخاب کنندگان کو خائف کردیا اس لئے انھوں نے اس کا جانشین دوسرے خاندان سے منتخب کردیا۔ اس کے بعد جو شہنشاہ گزرے ہیں ان کا ہم ذکر نہ کرینگے کیونکہ اگر ان کی کچھ اہمیت ہے تو اطالیہ کی تاریخ میں ہے نہ کہ جرمنی کی تاریخ میں۔ ۱۳۴۷ء میں چارلس شاہ بوہیمیا شہنشاہ منتخب ہوا جو خاندان لگ زم برگ سے تھا۔ اس کا انتخاب متعدد وجوہات سے ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ خاندان مذکور کا یہ پہلا فردنہ تھا جو اس منصب جلیلہ پر فایز ہوا مگر جرمنی کی تاریخ میں اس کی خاص اہمیت ہے اور اس کے افعال کا اثر جرمنی اور بوہے میا دونوں ملکوں پر دیرپا تھا۔ ۱۳۵۶ء میں اس نے "فرمان زرین" جاری کیا جس کی روسے اس نے جرمنی کی سیاسی زندگی کے لئے قطعی قواعد نافذ کئے گو قواعد کے اس مجموعہ کو باقاعدہ دستور نہیں کہہ سکتے اس سے نہ تو جرمنی متحد ہوا اور نہ اسکے تمام افراد ایک قانون اور ایک حکومت کے تحت میں آئے۔ برخلاف اس کے فرمان مذکور کی روسے بڑے بڑے فرمان رواؤں کی آزادی عملاً تسلیم کرلی گئی اور اسی وجہ سے یہ مقولہ صحیح کہا جاسکتا ہے کہ "چارلس چہارم نے لامرکزیت کو جائز قرار دیکر اسے دستور کا لقب عطا کیا" منجلہ دیگر امور کے فرمان مذکور کی روسے یہ طے ہوگیا کہ صرف سات مندرجۂ ذیل اشخاص شہنشاہ کا انتخاب کریں":-

(۱) مینز (۲) ٹریوز (۳) کالون کے اسقف اعظم (۴) برین ڈین برگ کا مارگریو (۵) رائن کا کاونٹ پلاٹائن (۶) سیک سنی کا ڈیوک (۷) شاہ بوہے میا۔ آخری چاروں سلطنتوں کی آزادی اور دوامی ہونے کا یقین دلایا گیا ان کے علاقوں کے متعلق طے ہوا کہ ان کی تقسیم نہو بلکہ وارثوں میں جو سب سے بڑا ہو پورے اسی کو ملیں

اور جرمنی میں جیسا کہ رواج تھا تمام بیٹوں میں تقسیم نہ ہوں۔ فرمان کے یہ اہم دفعات ہیں۔ ان اہم امور کے علاوہ اس فرمان میں بہت سے جزوی احکام رسوم و آداب سلطنت سے متعلق تھے۔

چارلس چہارم کو شہنشاہی کے متحد کرنے میں ناکامی ہوئی مگر اپنی سلطنت میں اسے خاصی کامیابی ہوئی۔ یہ ملک نہایت زرخیز تھا۔ جرمن آبادکاروں کی تعداد اس ملک میں بہت تھی مگر زیادہ تر باشندے چک قوم کے تھے۔ پریگ کی جامعہ کا یورپ کی جامعات میں بڑا درجہ تھا اور اعلیٰ تعلیم اور زبردست جذبۂ قومی کی بدولت یہ ملک ہس کی مذہبی تحریک کے لئے تیار ہو گیا جسکا ہم ذکر کرچکے ہیں۔ چارلس چہارم ایک وسیع علاقے پر حکمراں تھا۔ اس کے خاندان کے موروثی علاقے بیل جیم میں تھے مگر ان کے علاوہ مشرق میں بوہیمیا سائی لی شیا برین ڈین برگ اور موریویا پر بھی حکمراں تھا۔ شادیوں سے جو تعلقات پیدا ہوئے ان سے اس کے مقبوضات میں اور اضافہ ہوا۔ ان کا ہم اس مقام پر ذکر نہ کرینگے، صرف اتنا لکھدینا کافی ہے کہ اس نے اس قسم کے تعلقات ہیپس برگ کے خاندان اور ہنگری سے پیدا کئے جن سے ہنگری، بوہیمیا اور خاندان ہیپس برگ کے مقبوضات رفتہ رفتہ اس کی اولاد کے قبضے میں آگئے۔ زمانۂ مابعد میں آسٹریا کے متعلق یہ مشہور تھا کہ لڑائیوں سے زیادہ اسے شادیوں سے نفع ہوا ہے۔ چارلس چہارم اس طور سے خاندانِ ہیپس برگ کی عظمت کا بانی ہوا گو اسے خود اس کا احساس نہ ہوگا۔

چارلس چہارم کی تدبیریں اس کے شراب خوار بیٹے وین زیل نے خاک میں ملادیں مگر اس خاندان کی عظمت کو سگس منڈ نے زندہ کردیا جس کا ذکر کانسٹنس اور بیسل کی کونسلوں کے ضمن میں آچکا ہے اس کا کوئی بیٹا نہ تھا مگر اس کی بیٹی اور وارثہ کی شادی آسٹریا کے رئیس ال برٹ سے ہوئی جو ال برٹ دوم کے لقب سے شہنشاہ ہوا۔ شہنشاہی حکومت اس طرح سے پھر ہیپس برگ کے خاندان میں آگئی اور اس وقت سے تقریباً موروثی ہوگئی اور انیسویں صدی کے آغاز میں نپولین کی فتوحات کی بدولت نہ لاکر شہنشاہت کے ناپید ہوجانے کے زمانے تک صرف ایک شہنشاہ اس خاندان کے باہر سے ہوا ہے۔ شہنشاہت اس طور سے عملاً موروثی ہوگئی مگر موروثیت سے اسے تقویت

نہیں پہنچی کیونکہ اس کی قوت بہت کچھ زایل ہو چکی تھی۔ زمانۂ آیندہ میں آسٹریا کے شاہی خاندان نے بار بار کوشش کی (خصوصاً اصلاح مذہبی کے زمانہ میں اور جنگ سی سالہ میں) کہ شہنشاہی جرمنی میں فریق غالب ہو جاے مگر اس کی یہ کوشش بعد از وقت تھی شہنشاہت کی حیثیت صرف ایک اعلیٰ خطاب کی تھی اور اس کی یورپ میں ہر رئیس کو ہوس تھی۔

اگر شہنشاہی کی تاریخ جرمنی کی حقیقی تاریخ نہیں ہے تو پھر جرمنی کے حالات کہاں تلاش کیے جائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مختلف سلطنتوں، بڑے شہروں کی تجارت اور جماعات کی ترقی میں اور ملک کی تمدنی حالت میں۔ ہم ان موضوعوں میں سے ایک دو پر بحث کریں گے۔

شہنشاہی جرمنی کی چھوٹی سلطنتوں کی حفاظت سے مجبور تھی، اس لیے بطور خود ان میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ ایک دوسرے کی حفاظت کے لیے متحد ہو جائیں جرمنی میں چودھویں صدی اتحادوں کا زمانہ تھا اور ان میں اتحاد "ہان سا" سب سے اہم تھا اس اتحاد میں جرمن کے شمالی ساحل اور رائن ندی کے نواح کے شہر حفاظت ذاتی کے لیے شامل ہو گئے تھے کیونکہ اس طوائف الملوکی کے زمانے میں شہنشاہی ان کی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں تجارت کی آزادی کا خیال کسی کو بھی نہ تھا۔ سمندروں میں امن و امان نہ تھا، غیر ملکوں کے بندرگاہوں میں تاجروں کے ساتھ عناد کا برتاؤ ہوتا اور کوئی شہر اس قدر قوت نہ رکھتا تھا کہ اپنے رقیبوں سے اپنی تجارت محفوظ رکھ سکے۔ اس لیے تجارت اور ماہی گیری میں باہمی معاونت کے لیے شمالی جرمنی کے بڑے بڑے شہر متحد ہو گئے ان میں لیوبیک، ہمبرگ اوس ناک، اس ٹرال سنڈ، تھارن اور ۷۰ اور شہر شامل تھے۔ ان کا رشتۂ اتحاد زیادہ مضبوط نہ تھا اور ان میں حقیقی اتحادی طرز حکومت کی صورت کبھی پیدا نہ ہوئی۔ مگر اتحاد سے تجارت کو فروغ ہوا اور شمالی جرمنی کی مرفہ الحالی بڑھ گئی۔ زمانۂ حال میں جرمنی کی بحری عظمت کے دعوے اس اتحاد کے کارناموں پر مبنی ہیں ناروے سویڈن اور ڈین مارک کی سلطنتیں اس اتحاد کو پسند نہ کرتی تھیں جو ۱۳۹۷ء میں کل مار کے اتحاد سے ایک ہو گئی تھیں۔ ان سے متحد سلطنتوں اور اتحاد ہن سا

سے جنگ و جدال کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا جس میں کبھی ایک فریق غالب ہوتا کبھی دوسرا۔ مگر اس اتحاد کو زیادہ تر نقصان اپنے باہمی مناقشوں اور غیر معین دستوروں کے ہاتھوں پہنچا اس کے زوال کی آخری وجہ یہ تھی کہ پندرھویں صدی میں ہیرنگ مچھلیوں نے بحیرۂ بالٹک چھوڑ دیا جن کا پکڑنا اس اتحاد کے ماہی گیروں کے بڑے کا خاص کام تھا ان وجوہ سے یہ اتحاد پندرھویں صدی میں بالکل کس مپرسی کی حالت میں پڑ گیا گو اس کا عملاً خاتمہ نہیں ہوا۔ اگر جرمنی میں زبردست شہنشاہت ہوتی تو ان شہروں کی یہ بری گت نہ ہوتی۔

اسی زمانہ میں جرمنی کے جنوب میں شہنشاہت کے ضعف سے ایک دوسری تحریک بھی رونما ہو رہی تھی جو اتحاد ہان سا سے زیادہ دیرپا ثابت ہوئی اور جس سے بالآخر سوئٹزرلینڈ کی جمہوریہ وجود میں آئی۔ موجودہ سوئٹزرلینڈ کے شمال و مغرب کے علاقہ میں متعدد شہر اور اضلاع مختلف رئیسوں کے تحت میں تھے مگر ان میں آزادی کی روح موجود تھی اور جاگیریت کی جڑیں اس علاقے میں مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ شہروں کو عملاً آزادی حاصل تھی اور دیہات کے اضلاع بھی آزاد جماعتوں میں منقسم تھے جنہیں اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی اور جو جاگیرداروں کی علاقوں کی پروا نہ کرتے تھے۔ شہروں کی فصیلوں اور پہاڑوں کی بدولت یہ علاقہ آزادی کا گہوارہ ہو گیا تھا۔ شمال کی طرح اس نواح میں بھی باہمی محافظت کے لئے ایک اتحاد قایم ہوا جسمیں ۱۲۹۱ء میں یوری شوائز اور اَن تر والدن کے اضلاع ہمیشہ کے لئے شریک ہو گئے یہ اضلاع آسٹریا کے خاندان ہیپس برگ کے مقبوضات میں واقع تھے اور ان کے اس فعل سے خاندان مذکور کو نقصان کا اندیشہ تھا اس لئے ۱۳۱۵ء میں آسٹریا کے رئیس لیوپولڈ ان آزاد پہاڑیوں پر حملہ آور ہوا۔ اس کی فوج زیادہ تر نائٹ سواروں پر مشتمل تھی۔ اس جنگ کے ایک سو سال بعد تک جب اس قسم کی فوج کا مقابلہ دوسری فوجوں سے ہوا تو اسے ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جاگیری فوجوں کا کری سی، پواتیر، آژان کور، کورتراے اور بوہیمیا کی لڑائیوں میں کیا حشر ہوا لیکن مسلح اور زرہ پوش جوانمردوں کی جو بری گت ان لڑائیوں میں ہوئی جس سے سوئٹزرلینڈ کی آزادی کی بنیاد پڑی اس کی مثال کم ملیگی۔ ۱۳۱۵ء میں مورگارٹن کی جنگ میں

سوئٹزر لینڈ کے کسانوں سے لیوپولڈ کو سخت شکست ہوئی۔ جنگ میں کامیابی سے اتحاد کے ارکان میں اضافہ ہونے لگا اور نواح کے بڑے شہر زُورخ' زوگ اور برن بھی اس میں شریک ہو گئے۔ ۱۳۸۶ء میں آسٹریا کا ایک دوسرا رئیس حملہ آور ہوا اس کا نام بھی لیوپولڈ تھا اور اسے بھی اتحادیوں سے سیم پاخ میں سخت شکست ہوئی اس کے بعد اتحاد کی بنیاد اور مضبوط کی گئی اور موجودہ جمہوریہ اسی بنیاد پر قائم ہے۔ لیکن واضح رہے کہ سوئٹزر لینڈ کے اتحاد نے گو ہیپس برگ کے خاندان کو شکست دی تھی مگر شہنشاہت سے علٰحدہ نہیں ہوا تھا اس کا تعلق شہنشاہت سے برائے نام اور محض قانونی تھا مگر ۱۶۴۸ء تک قائم تھا۔

جنوب مغرب کے حالات بیان کرنے کے بعد اگر ہم جرمنی کے شمال مشرق کی طرف متوجہ ہوں تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی اہم واقعات رونما ہو رہے تھے جو بالآخر زمانۂ حال کی ایک دوسری سلطنت یعنی پرشیا کے وجود میں آنے کے باعث ہوئے جو سوئٹزر لینڈ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے ہم بیان کر چکے ہیں کہ وسچولا ندی کے کنارو پر دوبت پرست قومیں یعنی اہل لیتھوائے نیا اور اہل پرشیا آباد تھے۔ ان کے علاقے حدود شہنشاہی سے باہر واقع تھے اور برین ڈین برگ کی سرحدی ریاست ان کی نگرانی کے لئے قائم کی گئی تھی۔ تیرھویں صدی میں ایک نیا ذریعہ ان کے مسیحی بنانے یا نیست و نابود کر دیئے جانے کے لیئے نکالا گیا کیونکہ صلیبی تحریک کے اواخر میں یہ دونوں الفاظ مترادف تھے۔ فریڈرک کی بار بروسا کی جنگ صلیبی کے زمانہ میں "ٹیوٹانک نائٹس" کا سلسلہ قایم ہوا۔ صلیبی تحریک کی ناکامی سے اس سلسلہ کے لیئے بظاہر کوئی کام باقی نہ تھا اور کچھ روز تک وینس ان کا مستقر تھا لیکن ۱۲۲۸ء میں یہ سلسلہ جرمنی میں پرشیا کی سرحد پر بت پرستوں کو مغلوب کرنے اور انھیں مسیحی بنانے کے لئے منتقل کر دیا گیا اور وسیع علاقے انھیں وہاں دیئے گئے۔ ان لوگوں نے شہر آباد کئے اور گرجے اور خانقاہیں بنائیں ان کی شجاعت اور کمال سپہگری میں کلام نہ تھا اور یورپ کے ہر ملک کے نوجوان امرا اس "مقدس جنگ" میں بت پرستوں کے تہ تیغ کرنے اور قتل کے لیئے شریک ہوئے۔ ان کی کارروائیوں سے تمدن' حکومت' زراعت اور تجارت کے متعلق جرمن تخیلات کی اشاعت جرمنی کے حدود کے باہر

بھی ہو گئی۔ لیکن چودھویں صدی کے اواخر میں ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اتحاد ہانسا کی طرح ڈنمارک، ناروے اور سویڈن کے متحد ہو جانے سے اس سلسلہ کو نقصان کا اندیشہ تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ۱۳۸۶ء میں لیتھوائے نیا کا ڈیوک جے گیے لو مسیحی ہو گیا اور پولینڈ کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ اس واقعے سے فوجی قوت کا توازن بالکل دگر گوں ہو گیا۔ ۱۴۱۰ء میں پرشیا اور پولینڈ کی متحد فوج نے اس سلسلے کی فوج کو ٹینن برگ کی جنگ میں شکست دی۔ ان کی قوت فوراً زائل ہو گئی۔ دس چولا کے مغربی علاقے پولینڈ میں شامل ہو گئے۔ اس کے مشرقی علاقے پر سلسلۂ ند کو رحسب سابق حکمران تھا مگر پولینڈ کی ماتحتی میں۔ اوڈر ندی کے مشرق میں اب جرمنی کی قوت متزلزل ہو گئی۔

جرمنی کی جن تعمیری کوششوں کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں شہنشاہی کو مطلق دخل نہ تھا۔ متعدد مثالیں ایسی ملیں گی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کے حصے بکھرے ہونے لگے تھے جنوب مغرب میں سوئے بیا کا اتحاد وجود میں آگیا تھا اور شمال اور مغرب میں بہت سے زرخیز علاقے برگنڈی کے ڈیوک کے قبضہ میں آکر شہنشاہت کی ماتحتی سے خارج ہو رہے تھے۔ ان امور کا ذکر باب آئندہ میں آئے گا جو واقعات ہم بیان کر چکے ہیں ان سے پوپ پیس دوم کے الفاظ ذیل کی تصدیق ہوتی ہے جس میں اس نے جرمنی قوم کو مخاطب کیا تھا "تم حسب سابق تمام دنیا کے مالک ہو سکتے ہو بشرطیکہ تمھاری شاہی حکومت منقسم نہ ہو عقلمندوں کی نگاہ میں تمھاری ناکامی اور ہزیمت کا باعث یہی ہے"

اطالیہ

اس زمانے میں جرمنی کی طرح اطالیہ بھی سیاسی تفرقوں سے مبتلائے آلام تھا اور بلدیات کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ مگر ان دونوں امور کے علاوہ ترقی کی رفتار اور دیگر خصوصیات کے لحاظ سے دونوں ملکوں میں کوئی اور مشابہت نہ تھی، اطالیہ میں اس زمانہ میں عجیب ابتری پھیلی ہوئی تھی اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا مضمون تھا اس عہد کے اکثر واقعات اور ممتاز اشخاص کے حالات نہایت دلچسپ ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس عہد میں اطالیہ میں شور و شغب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

اور یہی وجہ تھی کہ یورپ کے سیاسیات میں اطالیہ کو کوئی دخل نہ تھا۔ اس عہد کے عام خصائص حسب ذیل ہیں :-

جرمنی سے کہیں زیادہ اطالیہ عدم اتحاد اور عدم حکومت کا شکار تھا اور اس ملک میں جرمنی کی برائے نام شہنشاہت بھی نہ تھی جو اس کے اعضا کو کم از کم بظاہر یکجا کر سکتی۔ سنہ ۱۲۵۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء تک اطالیہ کی بعینہ وہی حالت تھی جو یونان کی چوتھی صدی ق م میں تھی۔ بلدیاتی تمدن کو وہی فروغ تھا شہروں میں وہی سخت باہمی رقابت تھی ہر شہر میں ایک جماعت دوسرے کی دشمن جان تھی، مستقل اور استوار اتحادوں کے قیام کی یونان اور اطالیہ دونوں میں اہلیت نہ تھی، شمال کی طرف سے دونوں کو غیر ملکی حملوں کا اندیشہ تھا۔ اطالیہ میں یہ اندیشہ غلط نہ ثابت ہوا کیونکہ فرانسیسیوں نے پندرھویں صدی کے آخر میں حملے شروع کر دئے۔ بالآخر دونوں ملکوں کو فنونِ لطیفہ، تلاش حقیقت حسن پرستی اور فلسفے کے ساتھ شغف تھا۔

دونوں ملکوں میں ایک مزید مشابہت یہ ہے کہ اجیر سپاہیوں سے کام لیا جاتا تھا اور ان کے سرغنوں (Condottieri) کی خاص اہمیت تھی۔

تیرھویں صدی میں اطالیہ کے شہر اپنی لڑائیوں میں اپنے شہریوں سے کام لیتے تھے اور انھیں کی قوت و مقاومت سے اطالیہ میں فریڈرک باربروسا اور فریڈرک دوم کو ناکامی ہوئی مگر اب تجارتی مشاغل اور تعیش کے عادی ہو جانے اور جنگ کے لئے طویل اور باقاعدہ فوجی تربیت کے ضروری ہونے سے شہریوں نے اپنی حفاظت کا انتظام پیشہ ور سپاہیوں کی جماعتوں کے سپرد کر دیا تھا جنکے بھرتی کرنے والے ان کے سردار ہوتے تھے جو مختلف سلطنتوں کو بروقت ان کے خدمات مستعار دیدیتے تھے یہ سپاہی اور ان کے سردار مختلف قوموں میں سے تھے۔ مثلاً سر جان ہاک وڈ ایک انگریز سردار تھا، مگر پندرھویں صدی میں زیادہ تر اطالوی تھے یہ اجیر سپاہی خوب لڑتے تھے اور اکثر نمک حلال ہوتے تھے۔ مگر کسی شہر کی حفاظت کا کسی ایسی جماعت کے سپرد کر دینا جسے اس کی بھلائی یا برائی سے کوئی سروکار نہ ہو خطرہ سے خالی نہیں۔

اس زمانہ میں اطالیہ کی اخلاقی حالت کے بارہ میں کوئی عام رائے قائم کرنا دشوار ہے۔ ہم شاعر دانتے اور سینٹ کیتھرین سا کنۂ سی نا کا ذکر کر چکے ہیں مسیحی

مذہب کی تاریخ میں ان سے زیادہ مقدس یا اعلیٰ وارفع افراد کم ملینگے۔ مگر ان کے علاوہ دوسروں میں مذہب کا اثر اخلاق پر بہت معلوم ہوتا ہے اور اخلاق کا کوئی معیار ایسا نظر نہیں آتا جس کی پابندی کم از کم اصولاً لازمی ہو۔ ہوا و ہوس اور شہرت کے لئے اس زمانے کے افراد ہر قسم کی بے رحمی فریب اور سخت گیری سے اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرتے تھے

ہم نے اطالیہ کے حالات کی جو تصویر کھینچی ہے مہیب اور خوفناک ہے مگر چودھویں اور پندرھویں صدی میں اطالیہ کی حالت پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادبیات وفنون لطیفہ کے لحاظ سے تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جس کا ذکر آگے چلکر کسی باب میں آئیگا۔ اس موقع پر صرف یہ کہدینا کافی ہوگا کہ اس پر آشوب زمانے میں اطالیہ دنیا کے سامنے ادبیات، مصوری اور بت تراشی کے بہترین نمونے پیش کر رہا تھا جنکی بدولت بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ یہ اسفورزا، ماری انت زی اور نیپلز کی بدکردار شاہی خاندان کا زمانہ تھا مگران کے معاصرین میں دانتے، پیٹ رارک، جیوتو، ادگی نو، رافائل اور مائیکل این جیلو ایسے مشاہیر تھے اوران کے نور کی تجلی سے یہ عہد منور تھا۔

اس عہد میں اگر کوئی تاریخ ہے تو اطالیہ کی مختلف ریاستوں کی تاریخ ہے، اطالیہ کی بہ حیثیت مجموعی کوئی تاریخ نہیں ہے اس باب کے آخر میں ہم چند بڑی بڑی ریاستوں کا ذکر کریں گے۔ نیپلز کی حکومت شاہی کی حالت اطالیہ کے دوسرے حصوں سے بالکل مختلف تھی کیونکہ اس کا انحصار کوہ آلپ کی شمال کی سلطنتوں کی طرح جاگیری ادارات پر تھا۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ تیرھویں صدی کے اواخر میں یہ ریاست آنجو کے فرانسیسی خاندان کے قبضے میں آگئی مگر ۱۲۸۲ء میں ایسٹر کے زمانے میں سسلی کے باشندوں نے بغاوت کرکے فرانسیسی محافظ فوج کو قتل کر دیا اور تاج شاہی اراگان کے شاہی خاندان کو پیش کیا گیا جس نے قبول کر لیا۔ فرانس اور ہسپانیہ کے شاہی خاندان میں اس سے سخت رقابت ہوگئی جس کا سلسلہ دو سو سال تک جاری تھا۔ مگر نیپلز کے خاندان شاہی کے جرائم اور سازشوں کا حال بیان کرنے سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ اس خاندان کی شادیاں ہنگری کے شاہی خاندان سے ہوئیں جس سے دو دور دراز سلطنتوں کے معاملات میں ایک عجیب وغریب آویزش اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ایک دوسری شادی اراگان کے شاہی خاندان

میں ہوئی جس سے نیپلز اور سسلی کی سلطنتیں آل فان زو شاہ نیپلز و سسلی (۱۴۳۵ء تا ۱۴۵۸ء) کے زیر نگیں متحد ہوگئیں۔ اس صدی کے آخر میں اس علاقے میں امن و امان اور مرفہ الحالی تھی مگر تمدن اور تہذیب کے لحاظ سے یہ علاقہ اطالیہ کے دوسرے حصوں سے پست تھا۔

کلیسیہ کی ریاستوں نے شہنشاہ اڈولف کے عہد شہنشاہی میں شہنشاہت سے بالکلیہ آزادی حاصل کر لی مگر ان میں انقلاب کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ آوی نیون میں پوپوں کی مسلسل سکونت سے روما میں ایک آزاد بلدی حکومت قایم ہوگئی اور اہل روما کو اپنی قدیم تاریخ کی طرف پھر توجہ ہوئی اور وہ اپنی موجودہ پست حالت کو روما کی گذشتہ عظمت سے مقابلہ کرنے لگے جو اسی پوپ اور قیصر کے زمانہ میں اسے حاصل تھی۔

ان تخیلات نے رفتہ رفتہ ایک مستقل شکل اختیار کی اور ری انت زی ان پر کاربند ہوا۔ یہ شخص طبقۂ عوام سے تھا اور امرا سے اسے سخت دشمنی تھی۔ ری انت زی کو ابتداءً یہ امید تھی کہ اگر پوپ روما واپس آجائے تو امن و امان قایم ہوجائے گا۔ مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اس لئے اس نے اپنی دل ہلا دینے والی تقریروں سے اہل روما کو امرا کی حکمران جماعت کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا۔ اس انقلاب آفرینی میں اسے نہایت آسانی سے کامیابی ہوئی (۱۳۴۷ء) اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ روما کی گزشتہ عظمت عود کرنے والی ہے مگر ری انت زی کو حکومت کا عملی تجربہ نہ تھا اور اہل روما میں وہ جذبۂ قومی نہ تھا جس سے یہ تحریک بار آور ہو سکتی۔ سرگرمی اور فصاحت سے جہانتک وہ کام لے سکتا تھا اس نے لے لیا مگر اہل روما کو جب معلوم ہوا کہ انھیں حسب سابق محاصل ادا کرنا ہوگا تو وہ بگڑ گئے اور ۱۳۵۴ء میں ایک عام بغاوت کے سلسلے میں ری انت زی قتل کر دیا گیا اس کے بیس سال کے بعد پوپ پھر روما واپس آگیا اور اس زمانہ سے اس شہر کی تاریخ پاپائیت کی تاریخ کا جزو ہوگئی۔ حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کے لئے روما کو ابھی ساڑھے پانچ سو سال تک انتظار کرنے کی ضرورت تھی اور جس ذریعہ سے اسے آزادی حاصل ہوئی شہنشاہت کے ان تخیلات سے بالکل مختلف تھا جو ری انت زی کے دماغ میں موجزن تھے۔

اطالیہ کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں فلارنس کی تاریخ سے ہم زیادہ

واقف ہیں مگر وہ واقعات اور انقلاب سے پر ہے اس لئے اس کا خلاصہ پیش کرنا ذرا دشوار ہے۔ بالمختصر اس کی حالت وہی تھی جو یونان کی ریاستوں کی تھی یعنی عددیت اور جمہوریت کے طرفدار ایک دوسرے سے دست وگریباں تھے اور اگر آخر کار جمہوریت پسندوں کو فتح ہوتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ شخصی حکومت قایم ہو جاتی جسے یونانی اصطلاح میں جبریہ کہتے تھے۔ سیاسی جماعتیں انتہائی سرعت کے ساتھ وجود میں آتیں اور پھر ٹوٹ جاتیں اور ان کے باہمی اختلافات کی بنا بھی آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی ہے شہر فلورینس، میٹلڈا، ٹسکنی کے کاونٹس کے مقبوضات میں سے تھا۔ میٹلڈا کے انتقال اور اس کے مقبوضات کی تقسیم کے بعد اس شہر نے آزادی حاصل کرلی۔ حکومت کے بہت سے دعویدار تھے، شہر کے باہر جرمن نژاد امرا اطراف کے پہاڑی قلعوں میں مقیم تھے۔ شہر کے اندر ایک طرف تو فلورینس کے اسقف اور دوسری طرف ان شہریوں کو دعویٰ تھا جنکی تقسیم حسب ذیل ہوسکتی ہے:۔

(۱) ساتوں طاقتور اور متمول تجارتی انجمنوں کے اراکین (۲) اسی قسم کی دوسری چھوٹی چھوٹی انجمنوں کے اراکین (۳) اور وہ شہری جنکا شمار کسی تجارتی انجمن میں نہ تھا اور جو اس لئے سیاسی اقتدار سے کاملاً محروم تھے۔ ۱۲۸۲ء میں شہر کے جمہوری عنصر کو فتح ہوئی اور تقریباً ایک صدی تک فلورنس کا سیاسی نشو و نما ان تجارتی انجمنوں کے نمایندوں کے قبضے میں رہا مگر ان کی حکومت نہ تو ہر دلعزیزی حاصل کرسکی اور نہ استواری ثابت ہوئی کیونکہ امرا اس سے متنفر تھے اور غریب شہریوں کو معلوم ہوگیا کہ اب وہ بالکل تجارتی مشارکتوں کے سرداروں کے پنجے میں آگئے ہیں۔ ۱۳۷۸ء میں عوام نے بغاوت کی جو فرو کردی گئی اور انقلابی تحریک کے ناکام ہونے سے عددیت کی طرف پھر رجعت ہوئی۔ عوام کا حکومت میں کوئی دخل باقی نہ رہا اور ایک زمانہ تک فلارنیس میں امرا اور دولتمندوں کی حکومت تھی۔

عددی حکومت اولاً کامیاب ثابت ہوئی مگر سیاسی تفرقوں نے اسے تباہ کیا اور یہی تفرقہ پسندی فلارنس کے لئے بالآخر مہلک ثابت ہوئی۔ اس شہر میں دو ممتاز خاندان، اَل بزی اور می ڈی چی تھے جن میں سخت رقابت تھی۔ ال بزی کو اولاً غلبہ ہوا اور انھوں نے می ڈی چی کو جلاوطن کردیا مگر ۱۴۳۴ء میں وہ واپس

بلا لئے گئے اور ان کے سرغنہ کاس موڈی می ڈی چی نے اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ اس کا خاندان فلارنس میں دو سو سال تک حکمراں تھا۔ اس کی حکومت اس قسم کی تھی جو آگس ٹس نے روما میں قایم کی تھی اس نے موجودہ دستور کو درہم و برہم نہ کیا بلکہ اسی کے ذریعہ سے اپنا کام نکالا یعنی بالفاظ دیگر جبراً اقتدار قایم کرنے کے بجائے ایسی تدبیر کی کہ حقیقی اقتدار خود بخود اسے میسر ہو گیا۔ فلارنس میں اس نے امن و امان قایم کیا اور علوم و فنون لطیفہ کی سرپرستی کی۔ اس نے اور اس کے جانشینوں نے جن میں لورین زو "عالی شان" ممتاز ہے نہایت استقلال سے حکومت کی اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی سیاسی حیثیت غیر متعین تھی۔

میلان میں اس وقت جو حکام تھے ان کے اقتدار کا دار و مدار صرف فوجی قوت پر تھا۔ اس شہر پر دو خاندان وس کان ٹی اور اس فورزا یکے بعد دیگرے حکمراں تھے اور یہ دونوں بے رحمی اور بدعہدی کے عادی تھے۔ خاندان وس کان ٹی کے پہلے حکمراں کو شہنشاہ ہنری ہفتم نے میلان میں اپنا نائب مقرر کیا تھا اور اس کے جانشینوں نے اپنی قوت فریب اور فوج کے ذریعہ سے قایم رکھی۔ عوام الناس کے ساتھ ان حکام کو کوئی پرخاش نہ تھی مگر ان کے سیاسی مخالفوں کو ہمیشہ موت اور جسمانی ایذا کا خوف رہتا جب اسی خاندان میں ذکور میں کوئی باقی نہ رہا تو اس کی وارثہ بیانکا نے ایک اجیر سپاہی مسمی اس فورزا سے شادی کرلی جسکا باپ کسان تھا۔ جدید خاندان کا طرز حکومت بھی ویسا ہی تھا ان دونوں خاندانوں نے اس بیرحمی اور سنگدلی کے ساتھ حکومت کی ان کے وحشیانہ افعال سے میلان کی تاریخ سیاہ ہے۔

واقعات مذکورۂ بالا سے معلوم ہوگا کہ پندرھویں صدی کے اواخر میں نیپلز میں شاہی حکومت تھی اور اس کی بنیاد نظام جاگیری پر قایم تھی روما میں مذہبی حکومت تھی فلارنس میں ایک ہردلعزیز مطلق العنان حکومت تھی میلان میں فوجی جابریہ تھی۔ اب ہم وے نس کا ذکر کریں گے جس میں حقیقی عددیہ کی بہترین مثال ملتی ہے۔

ہم وے نس کی ابتدائی تاریخ اور اس کے جغرافیائی موقع کا ذکر کرچکے ہیں اس کی تمدنی حالت بھی غیر معمولی تھی۔ ایک زمانہ تک خشکی پر اس کا کوئی مقبوضہ نہ تھا اس لئے جاگیریت کا وجود اس کے علاقہ میں نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے شہری تمام تجارت میں مشغول تھے اور اس کے اکابر میں بڑے بڑے اور کامیاب تاجروں کا شمار تھا صلیبیوں نے اس کی تجارت کے لئے منڈیاں کھول دیں جس سے اس کی دولت بہت بڑھ گئی۔

چوتھی جنگ صلیبی (۱۲۰۴ئہ) کے دوران میں قسطنطنیہ کی فتح میں۔ جمہوریہ پیش پیش تھی اس لیے مشرق کی تمام تجارتی ریاستوں میں اسے تفوق حاصل ہو گیا۔ لیکن دولت کے ازدیاد کے ساتھ ساتھ اس کے دستور مملکت میں بھی تغیر ہوتا گیا۔ دولت مند اور سربرآوردہ خاندان جمہوریہ پر بالکل چھا گئے اور عوام کا حکومت میں کوئی دخل نہ تھا۔ مگر دولتمندوں کو اقتدار ان کی سرگرمی قابلیت اور جذبۂ قومی سے حاصل ہوا تھا اور جمہوریہ کے آخری زمانہ تک اندرونی اور خارجی معاملات میں وے نس کا طرز عمل کامیاب تدبیر مملکت کی بہترین مثال ہے۔ بیرحمی اور سازشوں کا جو الزام اس پر لگایا جاتا ہے اکثر بلا وجہ ہے یہ خصوصیت دوسری اطالوی ریاستوں کی ہے۔ وینس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی حکومت استوار تھی اور اس کے باشندے مرفہ الحال تھے۔ وے نس کے حکام کا دعویٰ تھا کہ ان کی حکومت کی غایت یہ تھی کہ شہریوں اور رعایا کو ان سے محبت پیدا ہو۔ ان کا یہ دعویٰ بے دلیل نہ تھا۔

وے نس کے دستور کا عدد یہ شکل اختیار کرنا تین منزلوں پر قایم ہے۔ اس عدد یہ کا مقصد یہ تھا کہ ڈوجے (رئیس جمہوریہ) محض ایک نمایشی حاکم رہے اور عوام کو انتظامات سے کوئی سروکار باقی نہ رہے۔ اولاً ۱۱۷۲ئہ میں مجلس اعلیٰ قایم ہوئی جو وے نس کے امرا پر مشتمل تھی اور اسی کو حق انتخاب حاصل تھا۔ عوام اس میں شریک نہ تھے ثانیاً ۱۲۹۷ئہ میں مجلس اعلیٰ کی فہرست بند کر دی گئی۔ یعنی ان خاندانوں کی فہرست جنھیں مجلس اعلیٰ میں شرکت کا حق تھا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس فہرست میں کوئی نیا نام شامل نہ کیا جائے گا۔ وے نس اب حقیقی طور پر عدد یہ ہو گئی تھی کیونکہ (۱۲۱۲) خاندانوں کے افراد کے علاوہ کوئی شخص نہ تو ڈوجے کے انتخاب میں شریک ہو سکتا تھا اور نہ کسی عہدے پر فائز ہو سکتا تھا۔ دستور کے اس جدید طریقے سے ڈوجے اور عوام دونوں ناراض تھے مگر ان کی جدوجہد کا کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ ثالثاً ۱۳۱۰ئہ میں عوام کے حقوق کے بحال کیے جانے کی غرض سے ایک بغاوت ہوئی اس کے فرو کر دیے جانے کے بعد "مجلس عشر" وجود میں آئی جس کا فرض تھا کہ سلطنت کے دشمنوں کا فوراً اور خفیہ طور سے کام تمام کر دے یعنی اس کے فرائض وہی تھے جو انقلاب فرانس میں مجلس حفاظت عامہ کے تھے یا اس پارٹا میں اے فوروں کے مجلس عشر کا تقرر ہر سال ہوتا

اور بہت جلد یہ وے نس کی حقیقی حکمراں جماعت ہوگئی۔ اس کا ایک خاص کام یہ تھا کہ ڈوجے کو دست درازی سے باز رکھے۔

چودھویں صدی میں سرزمین اطالیہ میں وے نس کے مقبوضات میں بہت اضافہ ہوا۔ جی نوا اس کا رقیب تھا مگر کی آگ جیا کی عظیم الشان جنگ (سنہ ۱۳۸۰ء) میں اس کا استیصال ہوگیا۔ چند روز کے بعد پاڈوا اوی جینت جیا اور وے رونا بھی اس کے قبضہ میں آگئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ میلان اس کا رقیب ہوگیا اور اس سے کشمکش شروع ہوگئی مگر میلان سے کہیں زیادہ وے نس کو ترکوں کی روز افزوں قوت سے خطرہ تھا۔ سنہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہوجانے سے بحیرۂ روم کے مشرق میں وے نس کی قوت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کا ذکر ہم باب آئندہ میں کریں گے۔

باب بست ویکم

یورپین تہذیب کا بیرونی دائرہ

باب ماسبق میں ہم نے زیادہ تر اطالیہ، فرانس اور جرمنی کے معاملات سے بحث کی ہے۔ اس باب میں ہم ان وسطی سلطنتوں کے علاوہ دیگر ممالک کی تاریخ کے اہم امور کا تذکرہ کریں گے کیونکہ ان میں بھی ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا اثر یورپ کے تمدن پر قابل لحاظ ہے۔ موضوع کے اعتبار سے انگلستان کی تاریخ کو بھی اسی باب میں شامل رہنا چاہئے تھا مگر کتاب کی ترتیب کے لحاظ سے اس کا تذکرہ علٰحدہ ہوگا۔

(۱) ہسپانیہ

ہسپانیہ کے کچھ حالات اس کے قبل بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ روما کی زبان اور تہذیب کا اثر اس ملک پر نہایت گہرا ہوا تھا وزی گاتھ (مغربی گاتھ) قوم نے یہاں اپنی سلطنت قایم کی تھی۔ جس ٹی نین نے کوشش کی تھی کہ اس ملک کو شہنشاہی میں پھر شریک کرے اور عارضی طور پر اسے کامیابی بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۷۱۱ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس کا اثر ہسپانیہ کی تاریخ پر اب تک باقی ہے، طارق کے تحت میں اسلامی عسکر مراقش سے ہسپانیہ پہنچے اور انھوں نے وسی گاتھ قوم کے آخری بادشاہ راڈرک کو گوادالیت (Guedalete) ندی کے کنارے شکست فاش دی۔ اس کے بعد مسلمان اس جزیرہ نما پر سیلاب کی طرح پھیل گئے، وسی گاتھ سلطنت میں اتحاد یا یکجہتی کا نام تک نہ تھا۔ دیسی باشندوں اور وسی گاتھ قوم میں امتزاج نہ ہوا تھا اور خود وسی گاتھ امرا ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس لئے مسلمان پی ری نیز

(جبل البرانس) تک پہنچ گئے۔
مسلمانوں کے فتوحات اس سلسلۂ کوہی تک محدود نہ رہے بلکہ جنوبی فرانس پر بھی وہ حملہ آور ہوئے اور بہت سے شہروں اور زرخیز علاقوں پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن تورس کی جنگ (سنہ ۷۳۲ء) میں چارلس مارٹل نے انھیں سخت شکست دی اور اس کے پوتے شارلی مین کی زیر نگرانی فرنگی فوجیں پھر پی ری نیز کے جنوب میں جا پہنچیں اور مسیحیت اور یوروپین تہذیب کے لئے ہسپانیہ کی دوبارہ فتح کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آئندہ چھ صدیوں تک عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان اس ملک میں کشمکش جاری تھی ہسپانیہ کی آزاد مسیحی ریاستیں فی الحقیقت بالکل تباہ نہ ہوئی تھیں۔ پی ری نیز کے سلسلۂ کوہی میں متعدد قبیلے اور جماعتیں پناہ گزیں تھیں جنھوں نے عرب حکومت کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور رفتہ رفتہ عیسائیوں کی آزاد ریاستیں وجود میں آنے لگیں۔ آس توریاس کی ریاست سب سے پہلے وجود میں آئی اور اس کے بعد لیون نوار اور اراگون۔ اس کے بعد مسلمان ہسپانیہ کے وسط سے خارج کردیئے گئے اور کیس ٹیل کی سلطنت وجود میں آگئی۔ اراگون کی سلطنت میں ایبرو ندی کے پار کے زرخیز علاقے بھی شامل تھے۔ بالآخر پندرھویں صدی میں اراگان اور کیس ٹیل کے متحد ہوجانے سے اسلامی سلطنت کے باقی ماندہ اضلاع بھی فتح ہوگئے اور پرتگال کے سوا تمام جزیرہ نما ایک بادشاہ کے زیر نگیں ہوگیا۔
ہسپانیہ کی تاریخ قرون وسطیٰ کے آخر تک ایک طویل جنگ صلیبی ہے لیکن دونوں قوموں اور مذہبوں کی باہمی منافرت کے متعلق بہت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ مسیحی سلطنتیں جب مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوتیں تو آپس میں لڑتی رہتیں۔ قرطبہ غرناطہ اور دوسرے مقامات کے مسلمان مہذب، روادار اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے ہسپانیہ کے باشندے ان کی حکومت کے زمانے میں خوشحال تھے اور خود مسیحی حکمراں ان سے مناکحت کے تعلقات پیدا کرنا کسر شان خیال نہ کرتے، اکثر ان سے اتحاد رکھتے اور اپنے مسیحی مخالفوں کے خلاف ان سے مدد کے طالب ہوتے یورپ کی تاریخ میں ہسپانی مسلمانوں کے تمدن کی تباہی سے دردناک کوئی واقعہ نہیں ہے کیونکہ انھوں نے یورپ کے تمدن میں بہت کچھ اضافہ کیا اور اگر تباہ نہ ہوتے تو اس میں اور اضافہ کرتے۔

ہسپانیہ میں مسلمانوں کی حکومت کو کبھی استحکام نصیب نہ ہوا۔ ان کی قوت بہت جلد رو بزوال ہوگئی اور اگر شمالی افریقہ سے مسلمانوں کے نئے جتھے نہ آتے تو بہت جلد تنگی ہوتی گیارھویں صدی میں جبکہ سلجوقی ترک مشرق کی طرف سے یورپ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے ہسپانیہ میں بھی اسلام نے پھر زور پکڑا۔ "موحدین" کی جماعت نے جو پکے اور گرمجوش مسلمان تھے ہسپانیہ پر یورش کی اور مسیحی سپاہ کو پسپا کر کے کیس ٹیل اور نوار کی فوجوں کو زلاقہ کی عظیم الشان جنگ (۱۰۸۶ء) میں شکست دی اور اس جنگ کے بعد سے مسلمانوں نے پھر زور پکڑا۔

مگر ان کا زوال دور نہ تھا۔ مسلمانوں کی آبادی زیادہ نہ تھی اور ان میں جو ہر سپہگری باقی نہیں رہا تھا۔ مسیحی فوجوں کو پھر تفوق حاصل ہوگیا یہی زمانہ سڈ (سید) کے فرضی یا حقیقی کارناموں کا تھا جو کبھی مسلمانوں سے لڑتا اور کبھی عیسائیوں سے اور کبھی مسلمانوں سے متحد ہوجایا کرتا مگر بہ حیثیت مجموعی اس کے کارناموں سے عیسائیوں کو فائدہ پہنچا ٹمپ اور سینٹ جان کے نائٹس کے نمونے پر متعدد فوجی جماعتیں قائم ہوئیں اور کامیابی کے باعث ایک حد تک وہ بھی تھیں۔ عیسائیوں کو قطعی فتح ۱۲۱۲ء میں حاصل ہوئی جب ال فانسو ہشتم شاہ کیس ٹیل نے لاس ناواس دی تولوسا کی جنگ میں مسلمانوں کو شکست دی جس سے ان کا قبضہ صرف جزیرہ نما کے جنوبی مشرقی حصہ پر رہگیا اور اگر مسیحی سلطنتوں میں اتفاق ہوتا تو وہاں سے بھی ان کی حکومت اٹھ گئی ہوتی۔

اس کے بعد ڈھائی سو سال تک مسلمانوں اور عیسائیوں میں جدوجہد جاری تھی عیسائیوں نے اس مدت میں خاصی سیاسی ترقی کرلی اور پندرھویں صدی کے وسط میں جزیرہ نما میں تین بڑی سلطنتیں قایم کرلیں یعنی پرتگال کیس ٹیل اور اراگان ۱۴۶۹ء میں کیسٹل کی رئیسہ ایزابیلا کی شادی اراگان کے بادشاہ فرڈی نینڈ سے ہوئی جس سے ان دونوں سلطنتوں کے اتحاد کا امکان ہوگیا۔ ۱۴۷۴ء میں ایزابیلا کیس ٹیل پر بھی حکمراں ہوگئی اسی زمانہ سے ہسپانیہ کی تاریخ کا عہد زریں شروع ہوتا ہے اس کی ترقی کی رفتار نہایت غیر معمولی تھی امرائے جاگیری کی لامرکزی قوت توڑ دی گئی ملک میں امن و امان ہوگیا۔ ایک معاصر کا قول ہے کہ "نائٹ (جنگجو) اور اسکوائر (شرفا) جو مزد در پیشہ لوگوں پر ظلم کرتے تھے انھیں معلوم ہوگیا کہ ظلم کی انھیں سزا ضرور ملے گی سڑکوں سے ڈاکو معدوم ہوگئے امرا کے قلعے جو ان کے مظالم کے مرکز تھے مسمار کردئے گئے امن و امان کے قیام سے تمام

قوم کو اطمینان ہو گیا کہ قوانین سے ان کے نقصانات کی پوری تلافی ہو سکتی ہے' ہسپانیہ کا شمار اب یورپ کی سربر آوردہ سلطنتوں میں تھا۔

ہسپانیہ کے جدید حکمراں متعصب کاتھولیک تھے اور ان کے تمام افعال' جنکا اثر تاریخ مابعد پر باقی ہے' مذہب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ مجلس انسداد الحاد (Inquisition) ہسپانی طرز پر ۱۴۸۱ء میں قایم ہوئی۔ اس کا مقصد فی الوقت یہ تھا کہ یہودیوں کو جبراً عیسائی کر لیا جائے یہودیوں کی تعداد ہسپانیہ میں بہت تھی اور وہ امور سلطنت میں بھی انھیں خاص دخل تھا۔ اس مجلس سے بسا اوقات سلطنت کے ان سیاسی مخالفین کے خلاف بھی کام لیا جاتا جن پر کوئی مذہبی الزام عاید ہو سکتا۔ مگر اس زمانہ میں یہ مجلس ہر دلعزیز تھی اور اس عہد کے خیالات کے مطابق تھی۔ اس کی زیادتیاں فی الحقیقت عہد مابعد میں شروع ہوئیں۔ مگر اس کا شمار ان قوتوں میں ہے جن کی بدولت یورپ میں ہسپانیہ کی عظمت باقی نہ رہی اور جو بالآخر اس کی رسوائی اور انحطاط کا باعث ہوئیں۔

ہسپانیہ کی نئی عیسائی حکومت مسلمانوں کی زوال پذیر قوت کو بالکلیہ تباہ کرنے کی فکر میں تھی۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اب صرف غرناطہ باقی تھا اور وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اگر عالم اسلامی میں اتحاد ہوتا تو اس کی فوجی قوت جس نے چالیس سال قبل قسطنطنیہ فتح کر لیا تھا مغرب کے اس آخری اسلامی سلطنت کو تباہی سے بچا لیتی۔ مگر ترکوں کو ہسپانی مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور ۱۴۸۹ء میں جب غرناطہ پر آخری حملہ ہوا تو وہاں کے مسلمانوں کی کوئی قوت یار و مددگار نہ تھی۔ ملکہ ایزابیلا جو جوش مذہبی سے بھری ہوئی تھی حملہ آوروں کے ساتھ تھی۔ ۱۴۹۱ء میں غرناطہ کا محاصرہ شروع ہوا اور جنوری ۱۴۹۲ء میں اس خوبصورت شہر کے باشندوں نے ہتھیار ڈالدیئے۔ چاندی کی صلیب جو عیسائی فوج کے آگے آگے تھی شہر کے سب سے اونچے مینار پر آویزاں کر دی گئی۔

اس عہد میں جو نئے ممالک دریافت ہوئے ان کا ذکر نشأت جدید کے باب میں آئے گا۔ یہاں صرف یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ جن محققین نے جدید ممالک مشرق و مغرب کے علم سے یورپ کو روشناس کیا ان میں سے اکثر جزیرہ نمائے

ہسپانیہ کے باشندے تھے اور ان کے مربی اراگان کیس ٹیل اور پرتگال کے رو سار تھے ان جدید ممالک کے دریافت ہونے سے ہسپانیہ اور پرتگال کی وقعت اہل یورپ کی نگاہوں میں بہت بڑھ گئی اور ان کی بقائے ہستی کی جدوجہد کے ختم ہونے سے قبل ہی دنیا کی بڑی بڑی قوتوں میں اس کا شمار ہونے لگا وسیع ممالک جن پر حکمراں ہونے کا انھیں دعویٰ تھا' ان کی دولت اور قوت کے ذرائع خیال کیے جاتے تھے۔ مگر یہی مقبوضات بالآخر اس کے زوال کا باعث ہوئے یا بالفاظ دیگر ہسپانیہ اپنی شہنشاہت کے بارگراں سے دب گیا۔

(۲) اسکان ڈی نے ویا کی ریاستیں

(ڈین مارک' ناروے' سویڈن)

ان ممالک کے باشندے وسطی یورپ کی جرمن قوم کے ہم نسل تھے یورپین تہذیب کے دائرے میں وہ بہت دیر کے بعد داخل ہوئے اور مغربی یورپ کی قوموں میں انھوں نے سب سے آخر میں مسیحی مذہب اختیار کیا۔ مگر مغربی یورپ پر ان کا اثر کچھ کم نہ ہوا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ نویں اور دسویں صدی میں ان شمالی قوموں کے حملوں نے یورپ کی ترقی روک دی یا کم از کم اس کی رفتار بدل دی کینوٹ کے تحت میں اسکان ڈی نے ویا کی ایک عظیم الشان سلطنت کے قیام کا امکان ہو گیا تھا جس میں انگلستان' ڈین مارک' ناروے اور سویڈن کے جنوبی مغربی علاقے شامل تھے۔ کینوٹ ہی کے عہد حکومت میں اس کی سلطنت کے تمام علاقوں میں مسیحی مذہب کی اشاعت ہوئی اور تمدن میں سرعت کے ساتھ ترقی ہونے لگی لیکن اس کے انتقال (سنہ ۱۰۳۵ء) کے بعد سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور پھر اسے کبھی سیاسی اتحاد نصیب نہ ہوا۔ لیکن چودھویں صدی میں ڈین مارک کا ستارۂ اقبال پھر چمکا اور والڈے مار سوم (سنہ ۱۳۴۰ء تا سنہ ۱۳۷۵ء) کے تحت میں اتحاد ہنسا سے ایک سخت جدوجہد کا آغاز ہوا جس میں اس بادشاہ کو شکست ہوئی' مگر اس ہزیمت سے ڈین مارک کی قوت میں کوئی فرق نہ آیا اور بالآخر اسے اتحاد ندکور کے شہروں پر غلبہ حاصل ہوا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی

بیٹی مارگریٹ نے اولاً بہ حیثیت نائب السلطنت اور پھر بہ حیثیت ملکہ نہایت دانشمندی اور استقلال سے حکومت کی اور اس کان ڈی نے دیا کے اچھے دن پھر آئے۔ خوش قسمتی سے سفارتی کارروائیوں اور جنگی کامیابیوں کی بدولت سویڈن، ڈین مارک اور ناروے اس ملکہ کے زیر نگیں ہوگئے اور ۱۳۹۷ء میں کل مار کے قربان سے یہ طے ہوگیا کہ یہ تینوں سلطنتیں ہمیشہ ایک ہی حکمراں کے قبضے میں رہیں اور کسی کے قوانین و دستور مملکت میں کوئی دست اندازی نہ ہوگی۔ اگر یہ اتحاد مستقل اور دیرپا ہوتا تو یورپ کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی مگر پندرھویں صدی کے آخر میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ ناروے اور ڈین مارک متحد رہے مگر سویڈن علیحدہ ہوگیا اور باقی ماندہ دونوں ممالک کا سخت مخالف ثابت ہوا۔

(۳) پولینڈ اور روس

متمدن جرمنی کی مشرقی سرحد پر جو سلادی قومیں آباد تھیں، ان کے ابتدائی حالات کا بیان ضروری ہے تاکہ یورپ کے سیاسیات میں آگے چل کر انھیں جو دخل ہوا اسے ناظرین آسانی سے سمجھ سکیں۔

روس کی ابتدائی تاریخ کے متعلق تین امور قابل ذکر ہیں (۱) اقوام شمالی روس میں رُدرک کی سرکردگی میں ۸۶۲ء میں داخل ہوئیں اور اس سے روس کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ روسی مورخ اسے فتح نہیں خیال کرتے بلکہ ان کی رائے میں اصل واقعہ یہ ہے کہ روسیوں نے طوائف الملوکی سے تنگ آکر اس فاتح قوم کی ماتحتی قبول کی "ہمارا ملک وسیع اور زرخیز ہے لیکن امن و امان نہیں ہے۔ آؤ اور ہم پر حکومت کرو" یہ ان کی طلبی کے الفاظ تھے۔ رُورک کے ورود سے ملک میں امن و امان ہوا اور اس نے ایک مستقل شکل اختیار کی۔ (۲) ۹۸۸ء میں زار ولاڈ میر نے مسیحی مذہب اختیار کیا جو ملک میں بہت جلد پھیل گیا۔ زار نے یہودیت، اسلام، رومی کاتھولیکیت اور قسطنطنیہ کی "راسخ" مسیحیت کا بغور مطالعہ کیا تھا مگر بالآخر شخصی اغراض اور سیاسی مصالح کی بنا پر مشرقی مسیحیت کو اختیار کیا اور شہنشاہ وقت کی ہمشیر اینا سے نکاح کیا۔ ولاڈ میر کے اس فعل کا شمار روسی تاریخ کے تعمیری اثرات

میں ہے۔ قسطنطنیہ کے مذہب کے ساتھ روس میں مشرقی شہنشاہیت کی مطلق العنانی کے اصول بھی جاری ہوگئے اور مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے عقاید اور کلیسیہ کے طرز حکومت کے اختلافات سے روس ایک زمانہ تک مغربی یورپ کی تہذیب سے بہرہ مند نہ ہو سکا۔ (۳) تیرھویں صدی میں روس میں مغل تاتاریوں کا سیلاب آیا۔ چنگیز خاں نے ۱۲۲۳ء میں دیسی فوج کو بمقام کال کا شکست دی۔ اس کے بعد تاتاریوں کے متعدد حملے ہوئے اور تمام ملک پر انکا قبضہ ہوگیا۔ ان حملوں سے روسیوں کے تمدن اور خوش حالی کو بہت نقصان پہنچا مگر بالآخر اسی سے قوم کے اتحاد اور حکومت کی مطلق العنانی کو تقویت پہنچی کیونکہ جب کسی قوم کو بہ حیثیت مجموعی کسی غیر ملکی دشمن سے نقصان پہنچتا ہے تو ان میں اس سے جذبۂ قومی پیدا ہوتا ہے اور وہ مطلق العنان حکام کی ماتحتی قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے بشرطیکہ یہ حکام اسے غیر ملکیوں کی چیرہ دستیوں سے بچا سکیں۔

پولینڈ بھی وسطی روس کی طرح ایک ہموار میدان ہے اور قومیت اور زبان کے لحاظ سے اس کے باشندے روسیوں سے ملتے جلتے ہیں مگر اس کی ترقی کی رفتار کچھ اور ہے۔ روس میں ایک مطلق العنان شاہی حکومت قایم ہوئی اور اس کے بادشاہوں نے اسکے علاقوں کو بے انتہا وسعت دی مگر اس کے برعکس پولینڈ نے ملکی اتحاد کو امرا کی خطرناک آزادی پر قربان کر دیا اور چند روز کی عارضی خوشحالی کے بعد اندرونی اور بیرونی امور میں اس کی قوت مضمحل ہونے لگی یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں یورپ کی سلطنتوں میں اس کا شمار نہ رہا اور اس کے علاقے اس کے زبردست رقیبوں نے آپس میں تقسیم کر لیئے۔ ایک ہی نسل کی دو شاخوں میں اس قدر اختلاف ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی! البتہ روسی تاریخ کی دو خصوصیتیں پولینڈ میں موجود تھیں۔ یعنی پولینڈ نے مسیحیت میں کلیسیہ روما کی پیروی کی اور تاتاریوں کے کبھی محکوم نہ ہوئے گو ان کے حملہ سے پولینڈ کو بھی نقصان پہنچا۔

پندرھویں صدی کے آخر تک مسیحیت قبول کرنے کے بعد پولینڈ کی تاریخ میں دوسرا اہم واقعہ یہ تھا کہ ۱۴۱۰ء میں ٹانن برگ میں ٹیوٹانک سلسلہ کے نائٹوں کو شکست دی گئی جنھوں نے بالٹک کے ساحل پر ایک وسیع علاقہ میں مذہب مسیحی اور جرمن تہذیب کی اشاعت کی تھی یہ فتح جاگے لو رئیس لتھوائے نیا سے منسوب ہے جس نے پولینڈ کا

بادشاہ ہوکر لاڈس لاس کا نام اختیار کیا اور اس کا خاندان پولینڈ میں ۱۵۷۲ء تک حکمراں تھا۔ اس فتح سے بالٹک کے سواحل پولینڈ کے زیر حکم ہوگئے اور تجارتی ترقی کا اسے اچھا موقع مل گیا مگر اس سے نفع اٹھانے کی اس میں صلاحیت نہ تھی کیونکہ اسکے باشندوں کو تجارت سے مناسبت نہ تھی۔ پولینڈ میں شہر بھی تھے مگر ان کے باشندے جرمن یا یہودی تھے۔ پولینڈ کے تمدن کی حقیقی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں جاگیردار امراء تھے جو اپنے وسیع علاقوں میں رہتے اور اپنے غلاموں پر آزادی کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔ ان امرا کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کے اختیارات کو جاگیریت کے اصول کے لحاظ سے بالکل محدود کردیں اور مرکزی حکومت کی قوت سلب کرکے پولینڈ کو ایک امرائی جمہوریہ بنادیں۔ اس مقصد میں وہ کامیاب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولینڈ تباہ و برباد ہوگیا۔

ترکی فتح قسطنطنیہ

۱۴۵۳ء میں مغربی یورپ کو اس خبر نے ششدر کردیا کہ ترکوں نے قسطنطنیہ پر دھاوا کرکے اسے فتح کرلیا یعنی یہ شہر بالآخر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ قسطنطین نے اس شہر کی بنا ڈالی تھی، مغربی شہنشاہیت کی تباہی کے بعد بھی شہر قدیم روما کی روایات کا حامل اور اس کے اصول حکومت پر کاربند تھا اور صدیوں تک یورپ کو اس نے مسلمانوں کے پے در پے حملوں سے محفوظ رکھا تھا۔

مشرقی شہنشاہیت جو چوتھی جنگ صلیبی کے زخم کاری سے کبھی سنبھلی نہ تھی اس کے مقبوضات اب کچھ نہ تھے۔ مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے لاتناہی مناقشات اور سیاسی تنازعات سے اس کی حالت ابتر ہورہی تھی۔ قوت کا کوئی عنصر باقی نہ تھا البتہ قسطنطنیہ کا عظیم الشان شہر اس کے قبضے میں تھا، تجارت کے لئے اس کا جغرافیائی موقع لاثانی تھا، اس کی فصیلیں نہایت زبردست تھیں اور اب تک کسی دشمن کو کسی غدار کی مدد کے بغیر شہر میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن وہاں نہ تو دولت تھی، نہ فوج نہ حسن تدبیر اس لئے اس کے دشمن روز بروز اس کے لئے خطرناک ہوتے جاتے تھے۔ اسلام کی تاریخ عجیب و غریب ہے کبھی انحطاط کے آثار

نظر آتے ہیں کبھی احیار کے۔ ایک حکمراں قوم جب زوال پذیر ہوتی ہے تو دوسری اقبالمند قوم کسی نئے حکمراں کے تحت میں اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ترکان آل عثمان کو تیرھویں صدی میں عروج نصیب ہوا۔ ان کے بادشاہ یکے بعد دیگرے جنگجو اور اولوالعزم ہوتے تھے انھیں کی سرکردگی میں ترکوں نے کوسووو کی جنگ میں سربیا کی سلطنت تباہ کردی (۱۳۸۹ء) جس سے یورپ میں ان کے قدم جم گئے۔

ترکوں کو کامیابی زیادہ تر اپنے سرداروں کی وجہ سے ہوئی مگر ینگ چیریون کو بھی اس کامیابی میں بہت کچھ دخل ہے۔ یہ عجیب و غریب سپاہی مسیحی والدین کے بچے تھے جو بطور خراج لئے جاتے یا زبردستی چھین لئے جاتے تھے اور لڑکپن سے انھیں سپہگری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ حد درجہ احتیاط کی جاتی تھی کہ یہ لڑکے اپنے والدین کو معلوم نہ کرسکیں۔ لشکر گاہ ان کا گھر تھا اور فوجی عزت کا پاس انھیں مذہب اور حبّ قوم سے زیادہ تھا۔ دنیا میں کوئی اور فوج نہیں ہے جس سے ان کا مقابلہ کیا جاسکے اور ترکوں کا عروج وزوال انھیں کی ذات سے وابستہ ہے۔

تیمور لنگ نے ۱۴۰۲ء میں ترکوں پر حملہ کردیا تھا ورنہ قسطنطنیہ پچاس سال قبل فتح ہوگیا ہوتا۔ ترکی سلطان بایزید کو تیمور نے شکست دیکر قید کرلیا۔ مگر یہ خوشی بہت جلد رفع ہوگئے اور ترک پھر اس مقصد اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ متعدد صلیبی ان سے لڑنے آئے۔ شہنشاہ سجس منڈ، جان بے خوف، شاہ برگنڈی اور جان ہن یا ڈی شاہ ہنگری نے قسطنطنیہ کو بچانے کی کوشش کی۔ مگر یورپ میں مذہبی اتحاد اور مذہبی سرگرمی کا نام نہ تھا اس لئے اس عظیم الشان شہر کو بچانے کے لئے واقعی طور پر کوئی کوشش نہ ہوئی۔

محمد دوم نے ۱۴۵۳ء کے موسم بہار میں محاصرہ شروع کیا۔ قسطنطنیہ کا آخری عیسائی شہنشاہ بھی قسطنطین تھا اور اس نام کا وہ نااہل نہ تھا۔ ترک ڈیڑھ لاکھ فوج لائے تھے اور شہر کی محافظ فوج کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ محاصرہ قابل یادگار واقعات سے لبریز ہے۔ ترک بڑی بڑی مگر بھدی توپیں لائے تھے جو مشکل سے سر ہوتی تھیں مگر ان سے فصیلوں میں شگاف ہوگئے۔ محمد دوم اپنے جہاز خشکی کی راہ سے گولڈن ہارن میں لائے۔ آخری دھاوا ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو ہوا اور

شہنشاہ ینگ چربون کے ہاتھوں قتل ہوا۔ شہر میں لوٹ مار مچ گئی اور موذن نے مومنین کو اباصوفیہ کے گرجے میں نماز کے لئے آواز دی۔

اگر دول مسیحی نے ذرا سے استقلال سے کام لیا ہوتا تو ترکوں کو یہ فتح نصیب نہ ہوتی اور اگر چند روز کے لئے ترک روک لئے جاتے تو پھر انھیں یہ زرّیں موقع نہ ملتا کیونکہ دو سو سال کے بعد ترکی قوت روبزوال ہو گئی اگر قسطنطنیہ یورپین تمدن کا حصن حصین رہتا تو ترکی فوجوں کو وائینا پر حملہ آور ہونے کا موقع کبھی نہ ملتا ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی کم تعداد محافظ فوج کو مدد نہ دینے کی پاداش میں یورپ کو ساڑھے چار سو سال تک جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑا اور اس کی حالت ابتر رہی۔

باب بست و دوم

لوئی یازدہم اور بہادر چارلس

پندرھویں صدی میں فرانس کی شاہی حکومت یورپ کے سیاسیات میں اہم ترین قوت ہے اس لئے قبل اس کے کہ ہم نشاۃ جدیدہ اور علمی تحریک کا ذکر کریں، مناسب ہوگا کہ اس حکومت کے ارتقاء پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

جنگ صد سالہ کے دوران میں فرانس کی شمالی اور مشرقی سرحدوں پر ایک نئی قوت وجود میں آرہی تھی۔ یہ برگنڈی کا ڈیوک تھا جس کی قوت کے آغاز کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ شاہ جان "اچھے" باوجود اس مبارک لقب کے فرانس کے اکثر مصائب کا باعث تھا۔ برگنڈی کے رئیسوں کے خاندان میں جب کوئی وارث باقی نہ رہا تو اس نے اس ڈچی (ریاست) کو فرانس میں ملحق نہ کیا بلکہ اپنے بیٹے فلپ کو اس کا رئیس بنا دیا۔ اسے امید تھی کہ خاندان کا پاس فلپ اور اس کی اولاد کو فرانس کا حلقہ بگوش رکھیگا۔ مگر جنگ صد سالہ میں برگنڈی نے انگلستان کا ساتھ دیا اور اس جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد برگنڈی فرانس کا رقیب اور پھر اس کا دشمن جانی ہو گیا۔

فلپ کے رئیس برگنڈی ہونے کے ایک صدی کے اندر اس خاندان کے مقبوضات میں اضافہ کثیر ہوا۔ پہلے ڈیوک کو اس کی بیوی کے ذریعہ سے فلانڈرس آرتوا اور نیدرلینڈ کے بعض اضلاع ملے جس سے اس خاندان کو عروج حاصل ہوا اس زمانہ سے برگنڈی کے ڈیوک گو ان کے بعض علاقے شاہان فرانس کے تحت میں تھے مگر ان کے قبضے میں ان علاقوں سے وسیع تر دوسرے علاقے بھی تھے

جن سے شاہ فرانس کو کوئی تعلق نہ تھا اور جو اصولاً شہنشاہی کے تحت میں تھے۔ اس کے بعد ۱۴۴۱ء میں وراثت کے ذریعہ سے فلپ نیک تیسرے ڈیوک کے قبضہ میں ہالینڈ فریس لینڈ، زی لینڈ اور ہے نول کے علاقے بھی آگئے۔

فلپ نیک اس طور سے ان تمام علاقوں پر حکمراں ہوگیا جو اب ہالینڈ اور بلجیم میں شامل ہیں اور اس کے علاوہ ساؤن ندی کے پار برگنڈی کی ڈچی اور کاونٹی کے علاقے بھی ان کے قبضے میں تھے۔ وسعت کے علاوہ ان علاقوں کے باشندے دولتمند اور مرفہ الحال بھی تھے۔ تجارت کو جو فروغ نیدرلینڈ کے شہروں میں تھا وہ یورپ کے کسی حصے کو یہاں تک کہ شمالی اطالیہ کے شہروں کو بھی نصیب نہ تھا۔ ان کی دولت کا اصل ذریعہ اون کی تجارت تھی مگر ماہی گیری اور دوسرے اقسام کی تجارت سے بھی انھیں خاصہ نفع تھا۔ عمارات کی خوبصورتی اور مصوروں کے اعلیٰ درجے کی تصاویر کے لحاظ سے بروژ، ایپر، گنٹ، "گاں"، تورنائی اور متعدد دوسرے شہر وینس اور فلارنس کے ہمسر تھے۔ مگر ان دولتمند اور وسیع علاقوں کی حکومت میں سخت دقتیں تھیں کیونکہ نہ تو ان میں سیاسی ہم آہنگی تھی اور نہ ایک جگہ واقع تھے مثلاً ڈیوک کے جو مقبوضات نیدرلینڈ میں تھے ان کے اور برگنڈی کی ڈچی اور کاونٹی کے درمیان میں اَل ساس اور لورین کے اضلاع حائل تھے۔ سیاسی حالات کے لحاظ سے ڈیوک کے مختلف مقبوضات میں بہت فرق تھا۔ اس کے علاقوں میں علیحدہ علیحدہ صوبے تھے جن کے دستور، مراعات اور مقاصد جداگانہ تھے۔ ان کے علاوہ متعدد شہر تھے گنٹ، یاگاں مثلاً اور بروژ جن کی حیثیت فی الجملہ آزاد جمہوری سلطنتوں کی تھی۔ برگنڈی کے ڈیوکوں کا طرز عمل انھیں وجوہ پر مبنی تھا۔ ان کے مقاصد یہ تھے کہ اولاً اَل ساس اور لورین کا الحاق کرلیں تاکہ ان کے شمالی اور جنوبی صوبوں میں فصل باقی نہ رہے۔ ثانیاً تمام علاقوں میں ایک مشترک طریقہ حکومت یا دستور مملکت قائم کریں اور ثالثاً جاگیری ماتحتی کی ان زنجیروں کو توڑ دیں جن کے سبب سے وہ شاہان فرانس اور شہنشاہ کے ماتحت تھے اور یورپ میں ان کی حیثیت آزاد بادشاہوں کی سی ہو جائے۔

رئیسان برگنڈی کے عہد زوال تک بظاہر ستارۂ اقبال بلندی پر تھا۔ جنگ صد سالہ کے اختتام پر فرانس کا ساتھ دینے کے صلے میں شاہان فرانس نے انھیں عطا کئے

علاقہ جات سے سرفراز کیا اور وعدہ کیا کہ سوم ندی کے کنارے کے شہران کے حوالہ کردیئے جائیں گے جس سے ان کی سرحد فرانس کے وسط تک پہنچ جاتی۔ اس کے بعد بہادر چارلس (برگنڈی کا ڈیوک) ان اضلاع ال ساس و لارین پر قابض ہوگیا جن پر متصرف ہونے کی اسے عرصہ سے آرزو تھی۔ ال ساس کا ایک حصہ اس کے آقا سجس منڈ رئیس آسٹریا نے قرضہ میں اس کے پاس مکفول کردیا تھا اور لارین پر اسے اس کے ڈیوک کی صغر سنی سے قبضہ کر لینے کا موقع مل گیا۔ ان دونوں اضلاع میں کسی میں اسے حقوق شاہی حاصل نہ تھے مگر اس کے پنجہ سے ان کا نکلنا دشوار تھا۔ اس کے علاقوں کے باشندے دولت مند اور جنگجو تھے اور بہ حیثیت مجموعی وفادار بھی تھے آثار اس وقت یہ تھے کہ فرانس اور جرمنی کے درمیان وہ ایک ویسی ہی وسطی سلطنت قایم کرے گا جیسی کہ شارلیمین کی سلطنت کے انتزاع کے بعد وجود میں آئی تھی اس قسم کی ایک مستقل سلطنت کے قیام سے یورپ کی تاریخ کچھ اور ہی ہوگئی ہوتی۔

مگر مشیت کا یہ مقصود نہ تھا۔ برگنڈی کا آخری ڈیوک بہادر چارلس تھا جو فرانس کے ذی فہم بادشاہ لوئی یازدہم کا رقیب اور حریف تھا۔ لوئی کے طرز عمل اور حالات زندگی پر ہم ایک سرسری نظر ڈالیں گے کیونکہ چارلس کے زوال کا باعث فرانس کی سپاہ نہ تھی بلکہ اس کی سازشیں اور سفارتی کارروائیاں۔ میدان جنگ میں اسے اگر شکست دی تو سوٹ زرلینڈ کے پہاڑی کسانوں نے جنھیں ال ساس پر اس کا قبضہ ناگوار تھا کیونکہ اس زرخیز ضلع کے وہ خود خواہاں تھے۔ چارلس کے نائب باگین باخ کے مظالم سے ال ساس میں بغاوت ہوگئی۔ سوٹ زرلینڈ کے لوگ ان کی مدد کے لئے آئے اور ۱۴۷۶ء میں گران سون اور مورا کی لڑائیوں میں ان کے نیزہ بازوں نے برگنڈی کے امرائے جاگیری کا خاتمہ کردیا جیسا کہ مورگارٹین اور سیم پاخ کی لڑائیوں میں انھوں نے آسٹریا کے امرا کا کام تمام کردیا تھا ال ساس کی کامیابی سے اہل لارین بھی بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ چارلس نہایت جوش کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا اور نان سی کا محاصرہ کردیا لیکن محاصرہ اٹھانے کے لئے ایک امدادی فوج پہنچ گئی جس میں سوئس سپاہی بھی شریک تھے۔ اس فوج سے جو جنگ ہوئی اس میں ڈیوک کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا اور اسکی

بیٹی میری ناکتخدا تھی۔ برگنڈی کے ان اہم علاقوں کے مستقبل کا دار و مدار اس شہزادی کی شادی پر تھا۔ مگر قبل اس کے کہ ہم برگنڈی کے مزید حالات بیان کریں فرانس کے حالات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

چارلس ہفتم (شاہ فرانس) کے عہد کے اواخر میں فرانس کی قوت برابر بڑھتی جاتی تھی مگر خود اس کے خاندان کے افراد کی سازشوں اور تنازعوں نے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ خود اس کا بڑا بیٹا اور ولی عہد لوئی' اس کا مخالف تھا اور امرائے جاگیر سے مل گیا تھا۔ بالآخر فرانس سے وہ بھاگ گیا اور ڈیوک برگنڈی کا مہمان ہوا۔ دونوں میں گہری دوستی ہو گئی تھی اور ۱۴۶۱ء میں چارلس ہفتم کے انتقال کے بعد جب لوئی یازدہم کے لقب سے وہ بادشاہ ہوا تو برگنڈی کی ایک زبردست فوج اس کے ہمرکاب آئی۔

لوئی یازدہم ایک عجیب و غریب شخص تھا۔ قرون وسطیٰ کے حکمرانوں سے اسے کوئی مناسبت نہ تھی۔ اگر وہ مشابہ ہے تو شہنشاہ فریڈرک دوم سے یا اطالیہ کے جابر حکام یعنی وس کان ٹی اور اس فورزا وغیرہ سے ہنری ہفتم شاہ انگلستان غالباً اس کے طرز عمل سے متاثر ہوا تھا اور اسی ڈھب کا تھا۔ دربار کے رسوم اور آداب اور شاہانہ کرو فر کا اسے مطلق خیال نہ تھا' اسی طرح نہ فروسیت اور جاگیریت کے مقاصد کا اسے پاس تھا نہ مذہب کا۔ اس کے افعال سے یہ معلوم ہوتا کہ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ سیاسیات میں اصل چیز کامیابی ہے اور اس کامیابی کے لئے ہر قسم کے ذرائع استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ وہ خود حسب موقع بے رحمی دغا فریب سے بھی کام لیا کرتا تھا اور اس کا مقولہ تھا کہ جو شخص مکر و فریب سے کام نہیں لیتا وہ حکومت نہیں کر سکتا وہ خود اسی اصول پر کاربند تھا۔ مگر تاریخ اسے محض ایک بطلان پرست اور جھوٹا جابر خیال نہیں کر سکتی اس نے جو کچھ بھلا یا بُرا کیا اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ فرانس کے لئے کیا جس کی ترقی میں وہ محو تھا۔ چارلس ہفتم نے جو انتظامات شروع کئے تھے ان کی تکمیل لوئی نے کی اور سولھویں صدی میں فرانس کی عظمت کا اصل بانی وہی ہے سیرت' طرز عمل اور اصول کے لحاظ سے سینٹ لوئی میں اور لوئی یازدہم میں کوئی مناسبت نہیں لیکن سینٹ لوئی کی طرح وہ بھی فرانس کو متحد کرنے اور اس کے نظام

میں یکسانی اور کارکردگی پیدا کرنے کے لئے بھی کوشاں تھا۔

اس کا عہد حکومت دلچسپ واقعات سے لبریز ہے اس لئے ڈراما اور افسانے لکھنے والوں نے اپنے مضامین کا موضوع اسی عہد سے لیا ہے۔ فلپ دی کومین نے جو پہلے اسکے رقیب بہادر چارلس کے متوسلوں میں سے تھا اس نے اس کے سوانح نہایت قابلیت سے لکھے ہیں۔ کمئین کی تاریخ سے زمانے کے تغیرات کا پتا چلتا ہے۔ اپنے آقا کی طرح اس میں بھی قرون وسطیٰ کے خصائص مطلق نہیں ہیں کیونکہ نہ تو کاتھولیکیت، نہ جاگیریت، نہ صلیبیت کا اس پر اثر ہے۔ سلطنت کی خدمت میں باریکی اور فراست سے کام لینے کا وہ مداح تھا۔

لوئی یازدہم کا عہد حکومت واقعات سے بھرا ہوا ہے مگر اس کا خلاصہ آسانی سے ہوسکتا ہے۔ اپنے پیشرووں کی طرح اسے بھی امرا کے دعاوی کو رد کرنا پڑا۔ نظام جاگیری کا اب دم واپسیں تھا کیونکہ کری سی پواتیر اور آنژان کورکی لڑائیوں میں انکی شہرت خاک میں مل گئی تھیں اور اکثر خاندان کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ لوئی یازدہم کو جس قوت کا مقابلہ کرنا پڑا وہ امرائے جاگیری کی قوت کے بجائے بلکہ خود خاندانِ شاہی کے افراد کی قوت تھی جاگیری امرائے عظام میں سے صرف ایک یعنی برٹنی کا ڈیوک باقی تھا اور اس کی حیثیت وہی تھی جو زمانۂ سابق میں نارمنڈی کے ڈیوکوں کی تھی یا پروونس کے کاونٹوں کی۔ بادشاہ کا بھائی ڈیوک بیری اس کا سخت دشمن تھا۔ ڈیوک بوربون سینٹ لوئی کی اولاد میں سے تھا اور بادشاہ کی بہن اس سے بیاہی ہوئی تھی ڈیوک اورلیاں بھی اسکا قریب عزیز تھا اور بادشاہ کی بیٹی کا اُس سے عقد ہوا تھا چارلس رئیس برگنڈی بھی اسکے بنی اعمام میں تھا اور بادشاہ کی ایک بہن اس سے بھی بیاہی ہوئی تھی۔ مگر نہ تو قرابت اور نہ مناکحت کے تعلقات ان شوریدہ سر رئیسوں کو وفاداری پر مجبور کرسکتے تھے فرانس کے بادشاہوں خصوصًا لوئی یازدہم کے حقیقی دشمن خود ان کے خاندان کے افراد تھے۔ اس کے دشمن اپنی حاسدانہ روش اور اپنے مقاصد کو "عام مفاد" کے دعوی سے چھپائے رکھتے تھے لیکن وہ ایسے مراعات کے لئے کوشاں تھے جنکا مل جانا فرانس کی قطع وبرید کا موجب ہوتا۔ میدان جنگ میں لوئی کو کئی مرتبہ اپنے دشمنوں سے زک اٹھانا پڑی مگر ایسے موقعوں پر اس نے سازشوں سے کام نکالا انگلستان کی گلابوں والی جنگ کا فرانس کی اس کشمکش سے تعلق تھا۔ برگنڈی کے خاندان کا یارکیوں سے تعلق تھا اور لوئی یازدہم

لنکاسٹریوں کا حامی تھا۔

لوئی یازدہم ہزیمت پاکر اپنے دشمنوں کے لیئے اور زیادہ خطرناک ہوجاتا مگر اس جدوجہد کو ہم تفصیل سے بیان نہیں کرسکتے۔ بس اس قدر بیان کردینا کافی ہے کہ بالآخر بادشاہ کو اپنے تمام دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوا اور حکومتِ شاہی کے مقبوضات میں اضافۂ کثیر ہوا۔ اس کا جب انتقال ہوا تو برٹنی کے دوم خم وہی تھے اور اس کی آزادی برقرار تھی۔ مگر ڈیوک کی جانشین اس کی لڑکی ہونے والی تھی اس لئے یہ امر قرینِ قیاس تھا کہ یہ ریاست بھی شاہ فرانس کے علاقوں میں ضم ہوجائے گی۔ جو علاقے واپس لئے گئے ان میں سے اکثر ایسے تھے جو کسی فرانسیسی شہزادے کو بطور لوازم شاہی دئے گئے تھے مگر جدید علاقے بھی اس زمانے میں شاہ فرانس کے قبضے میں آگئے۔ آن ژو کا الحاق اسی زمانے میں ہوا۔ پرووانس جو سلطنتِ فرانس کے حدود کے باہر تھا شاہ فرانس کو بذریعۂ وراثت ۱۴۸۱ء میں مل گیا۔ یہ بڑے بڑے علاقے تھے مگر ان سے بھی بڑے علاقے ۱۴۷۷ء میں جنگِ نان سی میں بہادر چارلز رئیس برگنڈی کی شکست اور موت سے حاصل ہوئے۔ لوئی یازدہم کو اولاً یہ امید تھی کہ اگر چارلس کی وارثہ میری کی شادی اس کے بیٹے چارلس سے ہوجاتی تو فرانس کو اتنے ہی وسیع علاقے مل جاتے جتنے کہ انگریزوں کے اخراج سے ملے تھے۔ مگر میری نے اس کی تجویز رد کردی کیونکہ شاہِ فرانس کو وہ اپنے خاندان کا دشمن خیال کرتی تھی اور خیال اس کا بالکل بجا تھا اس لئے اس نے میک سی می لین رئیس آسٹریا سے عقد کرلیا جو تاجِ شہنشاہی کا وارث تھا صفحاتِ تاریخ میں کوئی شادی ایسی نہیں ہے جسکے نتائج اس قدر دوررس ہوں مگر اس کی اہمیت کا اس زمانے میں پورے طور پر احساس نہ ہوگا۔ برگنڈی کے بیشتر مقبوضات خاندانِ ہیپس برگ کے علاقوں میں ضم ہوگئے جس سے یورپ کے توازنِ قوت میں بہت فرق آگیا۔ لیکن عہدِ مابعد میں اس وقت اس شادی کے نتائج اور بھی اہم ہوگئے جیسا کہ میری کے بیٹے فلپ کی شادی شاہ ہسپانیہ کی بیٹی اور وارثہ جوآنا سے ہوئی اور ان دونوں کا بیٹا چارلز (میری رئیسۂ برگنڈی اور میک سی می لین رئیس آسٹریا کا پوتا) ہسپانیہ برگنڈی اور خاندان ہیپس برگ کے مجموعی مقبوضات کا مالک ہوگیا اور اسکے

دولت ہپسبرگ کا نشوونما تا ۱۵۲۲
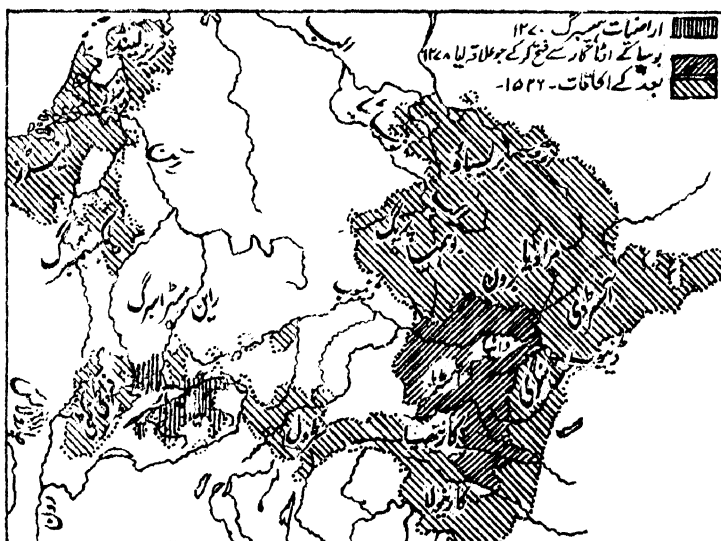
علاوہ تاجِ شہنشاہی بھی اس کے سر پر رکھا گیا۔ ان واقعات کا ہم آئندہ ذکر کرینگے مگر میری (برگنڈی) اور میک سی می لین (آسٹریا) کی شادی کا اثر جو ۱۴۷۷ء میں لوئی یازدہم کی مرضی کے بالکل خلاف ہوئی، سولھویں صدی اور اصلاح مذہبی کے ہر واقعہ پر ہوا ہے۔

لوئی یازدہم کے تمام منصوبے پورے نہیں ہوئے مگر اپنی مملکت میں جو اضافہ اس نے کیا وہ کچھ کم نہیں تھا۔ اس نے میری اور میک سی می لین کو مجبور کیا کہ شمال میں سوم ندی کی وادی اور فلانڈرس کا ایک ٹکڑا اور مشرق میں برگنڈی کی ڈچی جو ساڈون ندی کے مغرب میں تھی اس کے سپرد کردیں۔ لوئی نے ۱۴۸۳ء میں انتقال کیا مگر فرانس کے الحاقات کا سلسلہ جاری تھا جسکا ذکر کرنا یہاں مناسب ہوگا اس کا جانشین چارلز ہشتم ہوا جسے تخت نشینی کے پانچ سال بعد شاہی حکومت کے علاقوں میں ایک آخری اضافہ کرنے کا موقع ملا۔ برٹنی میں ایک کیل ٹی قوم آباد تھی جو فرانس سے علیحدہ تھی اور فرانسیسی زبان سے بھی نا آشنا تھی۔ اس کے ساحلوں پر قابل قدر بندرگاہ تھے اور باشندے اچھے ملاح تھے۔ شاہانِ فرانس کے مقابلہ میں جو بغاوتیں ہوئی تھیں اس میں اس ریاست نے اکثر شرکت کی تھی۔ یہاں کے آخری ڈیوک نے ۱۴۸۸ء میں انتقال کیا اس کی جانشین اس کی بیٹی تھی۔ فرانس کے لئے یہ بہت اچھا موقع تھا۔ اسکی نسبت پہلے ہی ہوچکی تھی مگر باوجود اس کے لوئی یازدہم نے کوشش کی تھی کہ اس لڑکی کا عقد اس کے بیٹے سے ہو جائے۔ چارلز ہشتم نے موقع پاکر فوراً برٹنی پر حملہ کردیا اور اس کے ساتھ ہی ریئسہ کو شادی کا پیغام دیا جس نے مقابلہ سے مایوس ہوکر ملکہ فرانس ہونے پر رضامندی ظاہر کی۔ اب صرف ایک جاگیری علاقہ یعنی خاندانِ بوربون کی املاک باقی رہ گئی تھیں ان کے علاوہ تمام ملکِ فرانس شاہی حکومت کے تحت میں آگیا۔ انگلستان کے سوا یورپ میں فرانس ہی ایک ملک تھا جسمیں قومی اتحاد پیدا ہوچکا تھا۔

فرانس کا طرزِ حکومت وہی تھا جو چارلز ہفتم کے زمانہ میں تھا۔ لوئی یازدہم نے شہروں اور صنائع کو فروغ دیا اور فنِ طباعت رائج کیا۔ طبقۂ متوسط کا وہ حلیف اور کسانوں کا پشت پناہ تھا صوبوں میں پارلیمنٹ قائم کی گئی ان کا مقصد

بھی وہی تھا جو پیرس کے پارلیمنٹ کا تھا یعنی شاہی حکومت رقیبوں کو مغلوب کر کے اقتدار شاہی کو وسعت دی جائے فرانس اب متحد ہو چکا تھا اور اس کی حکومت کارگر تھی۔ دولت اور تجارت میں وہ ترقی کر رہا تھا۔ یورپ کی تاریخ میں اب جو ڈراما ہمارے پیش نظر ہوتا ہے اس میں فرانس کو بہت دخل ہوگا۔

باب بست و سوم

تاریخ برطانیہ از سنہ ۱۳۰۷ء تا ۱۴۸۵ء

دستوری طریقۂ حکومت کی ناکامی

یورپ کے دوسرے ممالک کی طرح انگلستان میں بھی تیرھویں صدی میں قرون وسطیٰ کے اختتام کا آغاز ہوتا ہے۔ انگلستان کے شاہ ایڈورڈ اول اور فرانس کے شاہ لوئی نہم کے عہد حکومت میں چند خفیف اختلافات کے باوجود اکثر امور میں مشابہت ہے مثلاً دونوں ملکوں میں ابتری کے بعد امن و امان کا قیام عمل میں آیا حکومتِ شاہی اور کلیسیہ ایک دوسرے کے معاون ہو گئے مگر دونوں کی آزادی یا وقار میں فرق نہ آیا اور دونوں ملک ترقی کی طرف گام زن تھے گو مختلف راہوں سے ایڈورڈ اول نے سنہ ۱۳۰۷ء میں انتقال کیا اور فلپ چہارم شاہ فرانس نے سنہ ۱۳۱۴ء میں انتقال کیا۔ ان دونوں کے انتقال سے انگلستان اور فرانس کی حالت ابتر ہو گئی۔

انگلستان کی حالت میں جو تغیر ہوا اس کے اسباب مختلف بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا باعث پارلیمنٹ کی ناکامی تھی جس کے قیام پر ایڈورڈ اول فخر کر سکتا تھا بادشاہ اور پارلیمنٹ کی شراکت عمدگی سے چل رہی تھی۔ مگر ایڈورڈ شریک غالب تھا اور جب اس کا جانشین کمزور ثابت ہوا تو پارلیمنٹ میں اس قدر اہلیت نہ تھی کہ تنہا حکومت کر سکتا بلکہ امرا نے اسے اپنے جلب منفعت کا آلہ بنا لیا۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ انگلستان کے عوام ملک کی حکومت میں

دخیل ہو سکتے۔ اس باب میں ہم ۱۸۲ سالوں کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالیں گے۔ اس عہد کی خصوصیت یہ ہے کہ امرانے اقتدار حاصل کر لیا تھا جو ملک کے لئے خطرناک تھا فرانس کی جنگ میں کامیابی سے کچھ روز تک ان کی قوت دبی ہوئی تھی مگر ہزیمت کے آثار کے ظاہر ہوتے ہی انھوں نے پھر زور پکڑا۔

(۱)

ایڈورڈ دوم کی حکومت پر ایک سرسری نظر ڈالنا کافی ہے جس سے عہد زیر تذکرہ میں شاہی حکومت کے ضعف کے اسباب ظاہر ہوتے ہیں ایڈورڈ دوم کا معتمد علیہ گیس کنی کا ایک نائٹ مسمی پی ئر گاویس ٹن تھا۔ کسی غیر ملکی کا بادشاہ کے مزاج میں دخل پانا انگلستان کے امرا کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور گاویس ٹن اپنی نوع کا بدترین انسان تھا امرانے بادشاہ کو مجبور کیا کہ ۲۱ امرا کی ایک جماعت کا اقتدار تسلیم کرے۔ گاویس ٹن کو امرانے انگلستان سے خارج کر دیا مگر اس حکم کی اس نے پروانہ کی اور پھر واپس آیا امرانے اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

ایڈورڈ دوم کو اگر بیرون ملک کی کسی جنگ میں فتح ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ بچ جاتا مگر اس کی قسمت میں ہزیمت لکھی ہوئی تھی۔ اسکاٹ لینڈ میں بروس نے اپنا اقتدار قایم کر لیا تھا۔ ۱۳۱۴ئہ میں ایڈورڈ دوم ایک انگریزی فوج لیکر اسے مغلوب کرنے کے لئے روانہ ہوا مگر ۱۳۱۴ئہ میں بینوک برن کی جنگ میں انگلستان کی فوج کو قطعی شکست ہوئی جس سے اسکاٹ لینڈ کا آزاد ہونا یقینی ہو گیا۔

اس کی عہد حکومت کے باقی ماندہ حصہ میں یا تو خانہ جنگی جاری رہتی یا اسکا اندیشہ رہتا اپنے چچا ارل آف لنکاسٹر سے بھی اسے لڑنا پڑا جسے ۱۳۲۲ئہ میں اس نے مغلوب کرایا۔ اس کے بعد گاویس ٹن کی جگہ دوسرے مصاحبوں نے لی اور بالآخر اسکے اور ملکۂ اسابیلا کے درمیان علانیہ جنگ شروع ہو گئی۔ اس نے سرزمین یورپ میں ایک فوج جمع کی اور جب اس فوج کے ساتھ وہ انگلستان آئی تو بادشاہ کے خلاف میں عام بغاوت ہو گئی۔ بادشاہ بھاگا مگر گرفتار ہو گیا اور معزول کر دیے جانے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ ۱۳۲۷ئہ کا واقعہ ہے یعنی ایڈورڈ اول کے انتقال کے ۲۰ سال بعد کا۔ اس ۲۰ سال کے عرصہ میں انگلستان کی ساکھ عالم سیاسی میں بہت کچھ گر گئی تھی

اس عہد حکومت میں ایک اہم دستوری ترقی ہوئی یعنی ۱۳۲۲ء میں یہ طے ہوا کہ جن امور کا تمام سلطنت سے تعلق ہو ان کا تصفیہ "اسقفوں اور امرا (ارل و بےرن) کی ایک مجلس اور عامۂ قوم کرے" اس تصفیہ سے عوام کو پارلیمنٹ میں قطعی طور پر ایک مستحکم جگہ مل گئی۔

(۲)

ایڈورڈ سوم چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اس نے پچاس سال حکومت کی اس کے عہدِ حکومت ہی میں جنگِ صد سالہ (مابین انگلستان و فرانس) کے پہلے پچاس سال ہیں۔ اس جنگ کے مختصر حالات ہم کسی دوسرے باب میں بیان کر چکے ہیں اس لئے یہاں انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس باب میں صرف ملک کے اندرونی حالات بیان کریں گے گو جنگ سے اس کا گہرا تعلق ہے جس وقت تک جنگ میں فتح ہوتی رہی خصوصاً ایڈورڈ سوم کے زمانہ میں جبکہ کوئی نمایاں ہزیمت نہیں ہوئی تھی سیاسیات کی طرف کسی کو توجہ نہ تھی اور ملک میں سکون تھا۔ مگر ہزیمت کے سلسلہ کا آغاز ہوتے ہی خانہ جنگی اور بغاوت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ایڈورڈ سوم کے عہدِ حکومت کے پہلے تین سالوں میں حکومت دراصل اس کی ماں اسابیلا اور اس کے آشنا مارٹی مر کی تھی جنھوں نے ملکر ایڈورڈ دوم کو معزول اور قتل کیا تھا۔ اس زمانہ میں اندرونِ ملک میں ابتری تھی اور دوسرے ممالک میں انگلستان کی ذلت ہو رہی تھی ۱۳۲۸ء میں نارتھیمپٹن کے صلح نامہ سے اسکاٹ لینڈ کی پوری آزادی تسلیم کر لی گئی اور انگلستان اپنے جاگیری تفوق کے دعوی سے باز آیا۔ سالِ ماسبق میں گیس کنی میں شاہِ فرانس سے جنگ ہوئی تھی اور وہاں بھی انگلستان کے حکام مصالحت پر مجبور ہوئے جس سے صرف بورڈو اور بایون کے شہر اور ان کے نواح کے علاقے انگلستان کے قبضہ میں رہ گئے ایڈورڈ سوم کو جب ہوش آیا تو اسے معلوم ہوا کہ قوم اور حکومتِ شاہی کی حالت کس قدر ذلیل ہو گئی ہے اس کی ماں اور اس کے آشنا کے خلاف میں ایک سازش ہوئی جس میں وہ بھی شریک ہو گیا۔ مارٹمر گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور ایڈورڈ سوم حکومت کرنے لگا۔

ایڈورڈ سوم کا شمار انگلستان کے جلیل القدر بادشاہوں میں نہیں ہو سکتا

فتوحات فرانس سے جو نام و نمود اسے حاصل ہوا' اس کی شہرت کا باعث ہے۔ ان فتوحات کے بغیر اندرون ملک میں وہ فتنہ و فساد کو فرو نہ کر سکتا تھا۔ جنگ کے سبب سے صرف اتنا ہوا کہ امور متنازعہ فیہ کا تصفیہ ملتوی ہو گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ملتوی ہونے سے ان کا تصفیہ اور دشوار ہو گیا۔ اس کی تعریف صرف یہ ہے کہ مصنوعی لڑائیوں اور جنگوں میں خوب لڑتا تھا۔ فرو آسار اسے فروسیت کا گل سرسبد اور آرتھر کے بعد انگلستان کا بہترین بادشاہ خیال کرتا تھا۔ لیکن اگر وہ فروسیت کا بہترین نمونہ ہے تو اس کی وجود سے فروسیت قابل نفریں ہوتی ہے' کیونکہ وہ خود غرض اور کم ظرف تھا اور اسے عزت اور انسانیت کا مطلق پاس نہ تھا۔

فرانس کی جنگ کے حالات ہم اس موقع پر دوبارہ بیان نہ کریں گے بلکہ صرف (۱) انگریزی فتوحات اور (۲) اسکاٹ لینڈ کی جنگ کے اسباب پر نظر ڈالیں گے۔

(۱) انگریزوں کے فتوحات قابل لحاظ ہیں کیونکہ اس کا سلسلہ ۲۵ سال کی ناکامیوں اور بدنظمیوں کے بعد پھر شروع ہوا تھا۔ کریسی کی جنگ کے قبل جو آخری بڑی جنگ ہوئی تھی' بینوک برن کی تھی جس میں نہ تو انگریزوں کی تدابیر حربی اور نہ فوجی جوش سے کسی کامیابی کی امید ہو سکتی تھی۔ لیکن فرانسیسی جنگ کے پہلے دور میں یہ خیال عام ہو گیا کہ انگریز سپاہی اپنے سرداروں' اسلحہ اور جوش کی وجہ سے کبھی مغلوب نہیں ہو سکتے۔

ایڈورڈ سوم فن سپہگری میں طاق تھا اس کے برخلاف فرانس کے بادشاہ برن یعنی فلپ ششم اور جان میں قیادت کی اہلیت نہ تھی۔ لڑائیوں اور خصوصاً زمانۂ قدیم کی لڑائیوں میں قیادت کو بہت کچھ دخل تھا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کا اصل ہتھیار یعنی کمان تھی جس کا ذکر آ چکا ہے۔ لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ فرانس میں جاگیریت کا اس وقت بھی زور تھا۔ انگلستان میں جاگیریت کا زور ٹوٹ چکا تھا اور اسکے بجائے ایک سلطنت قایم ہو گئی تھی جو فرانس سے زیادہ متحد تھی۔ فرانس کی فوجوں میں زیادہ تر زرہ پوش نائٹ جوان مرد تھے جو بلا لحاظ تدابیر حربی دشمن پر خط مستقیم میں حملہ کرنا باعث عزت خیال کرتے اور بادشاہ کے ساتھ ان کے تعلقات وفادارانہ نہ تھے۔ انگریزی فوجیں ان سے بالکل مختلف تھیں۔ انگریزوں میں بھی نائٹ تھے جو فروسیت کے تخیلات کے دلدادہ تھے۔ مگر ان کے علاوہ تیر انداز

اور پیادے بھی تھے جنکی پوری قدر ہوتی تھی۔ مسلح جوانمردوں کا تفوق یورپ میں زائل ہو رہا تھا اور کریسی اور پوائے تیرز کی لڑائیوں سے ان کا زوال اور جلد ہوا۔ انگریزی فوج جاگیرداروں کی بھرتی کی ہوئی نہ تھی بلکہ ایسے سپاہیوں پر مشتمل تھی جنھیں بادشاہ کے افسروں نے بھرتی کیا تھا۔ بادشاہ انھیں تنخواہ دیا کرتا تھا اور بادشاہ کے وہ جاں نثار تھے۔

(۲) شاہِ انگلستان نہ صرف پیرس بلکہ ایڈن برا کا بھی خواہاں تھا اور فرانسیسی جنگ کے شروع ہونے سے قبل وہ اسکاٹ لینڈ سے برسرپیکار تھا۔ اسکاٹ لینڈ کے تخت کے دو دعویدار تھے۔ ایڈورڈ بے لیل اور ڈے وڈ۔ ایڈورڈ سوم نے کچھ تامل کے بعد بے لیل کی تائید کا قصد کیا۔ جنگ میں انگریزوں کا پلہ بھاری تھا سے لی ڈن ہل کی جنگ (۱۳۳۳ء) گویا ان فتوحات کا پیش خیمہ تھا جو فرانس میں حاصل ہوئیں انگریز پیادہ پالٹے اور لمبی کمان سے خوب کام لیا۔ اسکاچ کو شکست ہوئی اور برُوک پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا لیکن اس کے بعد انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی انگریز بے لیل کے مؤید تھے اس لئے اسکاچ اس سے متنفر تھے اور ڈے وڈ کو اپنا حقیقی بادشاہ خیال کرتے تھے فرانس سے جب جنگ شروع ہوئی تو اسکاٹ لینڈ نے فرانس کا ساتھ دیا اور جس سال کریسی کی جنگ ہوئی ڈے وڈ نے انگلستان پر حملہ کر دیا نے ول کراس میں جو ڈرہم کے قریب ہے اسے شکست ہوئی اور قید کر لیا گیا گیارہ سال تک وہ انگلستان میں قید تھا فرانس میں مسلسل فتوحات کے بعد ایڈورڈ کو اسکاٹ لینڈ فتح کرنے کا خیال آیا اور اس نے بے لیل کے جانشین کی حیثیت سے اسکاٹ لینڈ کی حکومت کا دعویٰ کیا کیونکہ بے لیل نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی ۱۳۵۶ء میں وہ اپنے حقوق کے تسلیم کرانے کے لئے اسکاٹ لینڈ پر حملہ آور ہوا۔ انگریزی فوجوں نے خوب لوٹ مار کی اور بستیوں کو آگ لگا دی مگر شکست سے بھی اسکاچ ہمت نہ ہارے اور ایڈورڈ کو اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ تسلیم نہ کیا۔ اس لئے ۱۳۵۷ء میں ایڈورڈ نے شاہ ڈیوڈ کو ایک زبردست فدیہ ادا کرنے کے وعدہ پر رہا کر دیا۔ مگر اس اثنا میں ڈیوڈ بالکل انگریز ہو گیا تھا۔ انگلستان کی فوجی قوت اس وقت نہایت زبردست تھی مگر فرانس اور اسکاٹ لینڈ کے مسائل اس فوجی قوت سے طے نہ ہو سکے۔

فرانس کے ساتھ مدت سے جنگ جاری تھی اس کا اثر انگلستان پر یہ ہوا کہ انگریزوں کو ہر فرانسیسی چیز سے نفرت ہو گئی تھی انگلستان کے دربار کی زبان فرانسیسی تھی اور اکثر امرا بھی یہی زبان بولتے تھے گو انگریزی زبان آہستہ آہستہ اس کی جگہ لے رہی تھی مگر اب تقاضائے حب وطن یہ تھا کہ فرانسیسی زبان بہت کم بولی جائے ۱۳۶۲ء میں دو اہم واقعات ہوئے یعنی عدالتوں میں انگریزی زبان رائج ہو گئی اور پارلیمنٹ کے افتتاح کے موقع پر بادشاہ کی تقریر انگریزی زبان میں ہوئی۔

فرانسیسی چیزوں سے جو نفرت پیدا ہو گئی تھی اس کا اثر مذہبی معاملات پر بھی پڑا۔ ایڈورڈ سوم کے عہد حکومت میں "قید بابل" کا سلسلہ جاری تھا یعنی پوپ اوی ینوں میں مقیم تھے۔ یہ شہر مقبوضات پاپائی میں سے تھا مگر فرانس سے اتنا قریب تھا کہ لوگوں کا خیال ہو گیا تھا کہ پوپ بالکل شاہ فرانس کے قبضے میں ہیں اسلئے انگریز بدظن ہو گئے اور وضع قوانین پر اس کا اثر پڑا پوپ زمانۂ دراز سے انگلستان کے چھوٹے اور بڑے پادریوں کا تقرر کرتے تھے اور انگریز اس طرز عمل پر اب تک معترض نہ ہوئے تھے۔ مگر ۱۳۵۱ء میں پارلیمنٹ نے قانون Provisors کی رو سے اسے ممنوع قرار دیا۔ پوپ کو انگلستان کے مقدمات کا مرافعہ سننے کا بھی اختیار تھا جس سے انھیں انگلستان میں خاص قوت حاصل تھی۔ مگر ۱۳۵۳ء میں قانون Praemunire کے ذریعے سے اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص بیرون ملک کی کسی عدالت میں مقدمہ پیش کرے گا اسے قید کر دیا جائیگا اور اس کی جائداد ضبط کر لی جائے گی اس قانون میں گو پوپ کا ذکر نہیں ہے مگر مفہوم بالکل واضح ہے شاہ جان نے پوپ کو جس خراج کے دینے کا وعدہ کیا تھا وہ مدت سے ادا نہیں ہوا تھا اور اب اس کے ادا کرنے سے بالکل انکار کر دیا گیا۔ اہل ملک کا عام رجحان بھی پاپائیت کے خلاف تھا۔ اسی زمانے میں انگریزی ادب بھی وجود میں آیا اور چاسر اور لینگ لینڈ (پیرس پلومن کا مصنف) کی صدائیں بلند ہوئیں۔ پیرس پلومن میں پادریوں اور کلیسیہ کی خرابیوں پر سخت حملے ہیں۔ کچھ روز کے بعد وِکلف نے کلیسیۂ کاتھولیکی کے عقاید اور نظام کے بنیادی اُصول پر اعتراضوں کی بوچھار کر دی۔

جنگ کا اثر انگریزی پارلیمنٹ کی ترقی میں بھی نمایاں ہے۔ اس محاربۂ عظیم کے دوران میں بادشاہ ملک کے اندر کسی نزاع کو روا نہ رکھ سکتا تھا اور اوائل میں

جنگ سے اہلِ ملک کو عام دلچسپی تھی۔ اسی عہدِ حکومت میں پارلیمنٹ کے ارکین دو ایوانوں میں منقسم ہو گئے یعنی بیت الامرا اور بیت العوام کا قیام عمل میں آیا۔ انگلستان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ فرانس کی طرح پارلیمنٹ تین ایوانوں میں منقسم نہ ہوئی محاصل کے عاید کرنے میں پارلیمنٹ کے حقوق پھر تسلیم کر لئے گئے۔ مگر ایڈورڈ سوم کے عہدِ حکومت کے اواخر میں فرانسیسی جنگ میں ناکامی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے بادشاہ بوڑھا ہو گیا تھا اور اس کا دماغ ضعیف ہو گیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک آوارہ عورت ایلس پیررس کے دامِ گیسو میں اسیر ہو گیا۔ اس کے بعد امرا میں نزاعات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پارلیمنٹ بھی مخالفت پر آمادہ ہوئی یہ گلابوں والی لڑائی کا آغاز تھا جو فرانس میں شکست یابی کے بعد شروع ہوئی ان واقعات کے اثنا میں ایڈورڈ سوم کے سپاہی منش اور نیک خصلت بیٹے ایڈورڈ (یعنی کالے شہزادہ) نے حُبِ وطن کے ساتھ ملک کی خدمت کی مگر اس کے بھائی جان آف گانٹ کی روش معاندانہ تھی لیکن ۱۳۷۷ء میں ایڈورڈ سوم کی موت کے قبل کوئی اہم نتائج مترتب نہیں ہوئے۔

۱۳۴۸ء اور ۱۳۴۹ء میں انگلستان میں مرض طاعون (مرض سیاہ) پھیل گیا جو اس سے قبل اس ملک میں کبھی نہ آیا تھا۔ اس مرض کے باعث غالباً چوہے تھے اور اس زمانے کے طبیب اس کے علاج سے ناواقف تھے۔ امیر غریب شہری دیہاتی سب اس کے شکار ہو گئے۔ اموات کا صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے مگر قیاس کیا جاتا ہے کہ انگلستان کے ایک ثلث باشندے لقمۂ اجل ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کی تعداد میں بہت کمی ہو گئی اور جو مزدور بچ گئے وہ زیادہ مزدوری مانگنے لگے اس معاشی بدنظمی سے ۱۳۵۱ء میں مزدوروں کا قانون نافذ ہوا جس کی رو سے اشیا کی قیمتیں اور مزدوری کی شرح وہی کر دی گئیں جو طاعون سے پہلے تھیں۔ اس قانون پر عمل کرانے کے لئے خاص عدالتی عہدہ دار مقرر کئے گئے مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ ملک کی معاشی حالت نہایت پیچیدہ ہو گئی تھی اور اس کی اصلاح پارلیمنٹ کے ایک معمولی قانون سے نہ ہو سکتی تھی۔ کسانوں کی بغاوت ۱۳۸۱ء میں شروع ہو گئی مگر اس کے آثار ابھی سے نمایاں تھے۔

آئرلینڈ کی تاریخ پر اس موقع پر ایک سرسری نظر ڈالنا مناسب ہو گا اگر انگلستان فرانس کی جنگ سے خستہ حال نہ ہو گیا ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ

آئرلینڈ کی طرف متوجہ ہوتا اور اپنی فوجی قوت اور حسن تدبیر سے کام لیکر وہاں ایک بہتر نظام حکومت کی بنیاد ڈالتا۔ ایڈورڈ سوم فرانس کی حکومت کے درپے تھا مگر آئرلینڈ میں انگلستان کی محافظ فوج کمزور ہوتی جاتی تھی۔ اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ ایڈورڈ برس نے شاہ آئرلینڈ ہونے کی کوشش کی تھی۔ اسے ناکامی ہوئی مگر انگریزی حکومت کو آئرلینڈ میں اپنی قوت کو مستحکم کرنے کی کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ البتہ ایک قانون (قانون کِل کے نی) نافذ کیا گیا جو "مزدوروں کے قانون" کی طرح بیکار ثابت ہوا۔ انگریز اور نارمن جو آئرلینڈ میں آباد تھے اہل آئرلینڈ میں جذب ہوتے جاتے تھے جیسے کہ نارمن انگلستان کی آبادی کا جزو ہو گئے تھے۔ جدید قانون کا منشا یہ تھا کہ یہ سلسلے منقطع ہو جاتے اور اس کی رو سے حکم دیا گیا کہ کوئی انگریز اہل آئرلینڈ کی طرح لمبے بال نہ رکھے، آئرلینڈ کی زبان نہ بولے اپنے مکان میں کوئی آئرش شاعر نہ رکھے، کلیسیۂ انگریزی میں کوئی آئرش شخص داخل نہ کیا جائے اور دونوں قوموں میں تعلقات تا حدِ امکان کم ہوں۔ آئرلینڈ کے جو انگریز زمیندار انگلستان میں مقیم تھے انھیں حکم دیا گیا کہ آئرلینڈ چلے جائیں۔

(۳)

ایڈورڈ "کالے شہزادے" کا بیٹا رچرڈ دوم دس سال کی عمر میں انگلستان کے متزلزل تخت پر بیٹھا۔ اسے زیادہ تر اپنے اعزہ سے خطرہ تھا۔ ایڈورڈ سوم کثیر الاولاد تھا جن میں کالا شہزادہ بہترین تھا۔ اس کے بھائی لیونیل ڈیوک کلارنس، جان آف گانٹ (ڈیوک لنکاسٹر) ایڈمنڈ ڈیوک یارک اور ٹامس ڈیوک گلاسٹر ذی حوصلہ حاسد اور سازش پسند تھے بادشاہ کے کمسن ہونے سے اس کی نیابت کے لئے ہر ایک کوشاں تھا اور ان کی رقابت بالآخر "گلابوں والی" لڑائی کا باعث ہوئی۔

فرانسیسی جنگ میں ناکامی سے اہل ملک کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ فرانس کی تسخیر میں قوم نے سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ ملک میں اب سپاہیوں کی تعداد کثیر تھی جو فرانس کی جنگوں میں دست درازی کے عادی ہو گئے تھے اور انگلستان میں بھی انھیں طریقوں سے کام لینے کے لئے تیار تھے۔

مذہب اور کلیسیہ میں بھی اب بدنظمی پیدا ہو گئی تھی حالانکہ یہی قوتیں انگریزی

تمدن کے لئے زمانۂ گزشتہ میں باعثِ استحکام تھیں۔ اس صدی میں ان تحریکوں کا آغاز ہوا جن سے سولھویں صدی میں پراٹیس ٹنٹ مذہب وجود میں آیا۔ وک لف آکس فرڈ کا ایک جید عالم اور پادری تھا۔ کلیسیہ کے عقاید کی اس نے تنقید شروع کردی۔ اس کے عقاید حسب ذیل تھے:۔ پوپ کلیسیہ کا سردار نہیں ہے، مذہب کی بنیاد صرف بائبل پر ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں ہونا چاہئے، کلیسیہ کی رسوم بیکار بلکہ لغو ہیں عشائے ربانی میں روٹی اور شراب کا حضرت عیسیٰ کے جسم اور خون سے تبدیل ہوجانے کا مسئلہ غلط ہے۔ ان خیالات کو اس کتابوں میں لکھنے پر قناعت نہیں کی جنکے پڑھنے والے صرف چند افراد ہوتے بلکہ بائبل کا ترجمہ کردیا اور "غریب پادریوں" کی ایک جماعت بنائی جو اسکے عقاید کی عامۂ قوم میں اشاعت کرسکیں۔ وک لف اور کسانوں کی بغاوت میں کوئی خاص تعلق نہیں ہے مگر متعدد امور ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہبی مباحث انقلاب کا پیش خیمہ تھے۔

مختلف معاشی اسباب بھی انقلاب کے معاون تھے۔ تجار بار محاصل سے دبے ہوئے تھے۔ مگر شورش کا اثر زیادہ تر زراعت پیشہ لوگوں میں تھا۔ کسانوں کو کوئی سخت تکلیف نہ تھی مگر انقلاب محض تکالیف کے وجود سے پیدا نہیں ہوتے۔ جاگیرت کا نظام تمدن پاش پاش ہورہا تھا۔ غلامی Villeinge کا طریقہ متروک ہورہا تھا کیونکہ زمیندار شخصی خدمت کے بجائے لگان وصول کرنا اپنے لئے زیادہ مفید خیال کرنے لگے تھے۔ مزدوروں کے قانون سے مزدوری کی شرح گھٹانے میں کامیابی نہیں ہوئی مگر اس کا نفاذ مزدوروں کو شاق گزرا۔ فی الجملہ انقلاب کی طرف عام رجحان ہوگیا تھا گو واضح نہ تھا۔

حکومت کمزور تھی اور اس کے مخالف بہت تھے۔ یہ مخالفت زیادہ تر جدید خیالات کی اشاعت سے پیدا ہوئی تھی اور ایک حد تک معاشی دقتوں سے بھی اسکا تعلق تھا حریت و مساوات کا مطالبہ ہورہا تھا گو یہ اصلاحیں چار صدیوں کے بعد رفع ہوئیں۔ مگر صورتِ حال فی الجملہ وہی تھی جو فرانس میں انقلاب کے آغاز میں تھی۔

۱۳۸۱ئہ میں وقتِ واحد میں انگلستان کے مختلف حصوں میں بغاوت

کے شعلے بھڑک اٹھے۔ باغیوں میں ایک پادری جان بال اور ایک کسان واٹ ٹائلر پیش پیش تھے مگر ان میں کوئی ایسا نہیں جسے سرغنہ کہہ سکیں۔ ایک عرصہ تک انھیں خاصی کامیابی ہوئی یہاں تک کہ لندن پر انھوں نے قبضہ کر لیا۔ وکیلوں اور انکے دستاویزوں سے ان باغیوں کو خاص عناد تھا۔ مگر باغیوں کے نہ تو کوئی واضح مقاصد تھے نہ ان کے سرگروہ قابل تھے اس لئے انھیں کوئی مستقل فتح حاصل نہ ہوسکتی تھی۔ نوعمر بادشاہ اور لنڈن کے لارڈ میئر وال ورتھ نے اِس مِتھ فیلڈ میں بہادری سے باغیوں کا مقابلہ کیا جسمیں واٹ ٹائلر مارا گیا۔ بادشاہ نے جسکی عمر صرف چودہ برس کی تھی باغیوں کو ہمت افزا الفاظ میں مخاطب کیا اور انھوں نے اطاعت قبول کر لی یا منتشر ہوگئے۔ اس کے بعد بغاوت کا انسداد ہر جگہ نہایت بیرحمی سے ہوا۔ غلامی کا طریقہ حتمی وعدوں کے باوجود موقوف نہیں کیا گیا مگر معاشی رجحان اس کے بقا کے خلاف تھا اس لئے چند ہی روز میں انگریزی تمدن میں اسکا نام و نشان باقی نہ رہا۔

رچرڈ کے عہد حکومت کے باقی ماندہ زمانے کے پیچیدہ حالات بیان کرنے کی ہم کوشش نہ کرینگے۔ بادشاہ کی ذات اور قوت کو ہر وقت امرا کی طرف سے خطرہ تھا۔ مگر یہ امرا قدیم امرائے جاگیری میں سے نہ تھے بلکہ یہ ایک نئی جماعت تھی جس میں بعض بادشاہ کے اعزہ میں سے تھے اور بعض کو حال ہی میں علاقے عطا ہوئے تھے۔ یہ لوگ قدیم امرا کے روایات اور ان کے ایثار سے ناآشنا تھے۔ رچرڈ کی شخصیت زبردست نہ تھی اور اس زمانے کے بادشاہوں کی طرح اسے بھی خیال تھا کہ "قانون اسکے سینے میں ہے اور قوانین مملکت میں وہی ترمیم کر سکتا ہے"۔ مگر اسکے مخالف امرا مثلاً گلاسٹر ارنڈیل وارک ناٹنگ ہیم یا ہنری آف لنکاسٹر بھی نہ تو دستوری آزادی کے حامی تھے اور نہ خودغرضی سے خالی تھے۔ خود بادشاہ ہو جانا اور یا بادشاہ کو اپنے قابو میں کر لینا دولت اور قوت کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ امرانے بادشاہ کو اس طرح گھیر لیا جیسے درندے اپنے شکار کو گھیر لیتے ہیں اور درندوں کی طرح جب شکار مل گیا تو آپس میں لڑنے لگے"

مدت تک ذلت و خواری میں بسر کرنے کے بعد ۱۳۹۷ء میں بادشاہ کو قطعی فتح حاصل ہوئی اور اس نے ارل ہرفرڈ (جو بعد میں شاہ ہنری چہارم ہوا) اور ارل نارفک کو جلاوطن کر دیا۔ اس کی قوت اب بظاہر مستحکم ہوگئی تھی۔ فرانس سے اسنے

صلح کرلی اور ایک فرانسیسی شہزادی سے عقد کرلیا۔ اسکے بعد وہ آئرلینڈ چلا گیا تاکہ وہاں کے حل طلب معاملات طے کرے۔ مگر اس کی غیبت میں ہنری لنکاسٹر انگلستان میں وارد ہوا۔ اسکے ہوا خواہوں نے اس کا راستہ صاف کردیا تھا اور امرا سب اس سے مل گئے۔ رچرڈ جب واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ ملک کا کوئی طبقہ اس سے خوش نہیں اس لئے اس نے مجبوراً اطاعت قبول کرلی اور پان ٹی فراکٹ کے قلعہ میں گمنامی کی حالت میں مرگیا۔

(۴)

گلابون والی لڑائیوں کا آغاز ۱۴۵۳ء سے شمار کیا جاتا ہے۔ مگر خیال ہے کہ ایڈورڈ اول کی موت کے بعد انگلستان کی تاریخ 'گلابون والی لڑائی' میں شامل ہے کیونکہ جو نزاعیں ۱۴۵۳ء میں شروع ہوئیں ان کا خمیر ایک سو سال قبل سے پک رہا تھا اور اس آخری تصادم سے قبل بھی اکثر جھڑپ ہو جایا کرتی تھی۔

ہنری چہارم نے فتح خاندانی حقوق کی بنا پر بادشاہی کا دعویٰ کیا تھا یعنی اس کے بقول مجھے خدا نے اپنے فضل وکرم اور اپنے اعزہ اور دوستوں کی مدد سے اس سلطنت کے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے جو حکام کی بداعمالیوں اور قوانین کے کالعدم ہوجانے سے تباہ ہونے کو تھی پارلیمنٹ نے اس کا دعویٰ تسلیم کرلیا اور پارلیمنٹ اور اس کے مویدوں کی مدد سے تیرہ سال تک اس نے حکومت کی ہنری چہارم قابل آدمی تھا اور اپنی خوش سلیقگی ہمت اور فوجی کمال سے اس نے اپنے آپ کو تخت پر برقرار رکھا حالانکہ اس کے دشمن بہت تھے جو اس کے درپے آزار بھی تھے۔ مگر اس کی فتح سے دوسروں کو ترغیب ہوتی تھی کہ بغاوت کامیابی کی موجب ہوسکتی ہے اور متعدد اشخاص اس کی پیروی کے لئے آمادہ تھے۔ رچرڈ دوم کے شرکا، کو تو اس نے آسانی سے زیر کرلیا مگر اس کے علاوہ اور بھی خطرے تھے۔ ویلز میں قومی آزادی کے لئے جدوجہد شروع ہوگئی تھی۔ ان کا سرغنہ اوین گلنڈاور تھا جس نے سرحد کے بعض انگریز امرا اور نارتھمبرلینڈ کے زبردست خاندان پرسی سے ساز باز کرلیا تھا۔ شروزبری میں جنگ ۱۴۰۳ء میں ہوئی اور پرسی اہل ویلز کی معاونت نہ کرسکے اس کے بعد اس خاندان کو بھی ہزیمت ہوئی ہنری چہارم نے اس جنگ کے

بعد بالآخر قسنہ حکومت کی مگر اسکی عہدِ حکومت کے آخر میں دربار میں سازش کا بازار پھر گرم ہوگیا جس میں بادشاہ کا بیٹا ہنری خود شریک تھا ان سازشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ نے ۱۴۱۳ء میں انتقال کیا۔

اس عہدِ حکومت میں مذہبی مظالم میں بہت اضافہ ہوا جنکا پتہ ایڈورڈ سوم اور رچرڈ دوم کے زمانے میں نام ونشان تک باقی نہ رہا تھا۔ الحاد کے اصل بانی وک لف لٹروتھ میں امن وامان کے ساتھ اپنے دن گزارے تھے اور وہ وہیں مرگیا۔ مگر ہنری چہارم پادریوں کی تائید کا خواہاں تھا اس لئے ملحدوں کو جلانے کے لئے ایک قانون ۱۴۰۱ء میں اس کے ایما سے نافذ ہوا۔ وک لف کے متعدد پیرووٗں نے نذر آتش ہوکر اپنی صداقت کا ثبوت دیا۔

بادشاہ میں اس قدر قوت نہ تھی کہ پارلیمنٹ کا مقابلہ کرسکتا اور لنکاسٹری بادشاہوں کے زمانے میں جو قوت پارلیمنٹ کو حاصل تھی وہ پھر سترھویں صدی تک حاصل نہ ہوئی۔ اس ضمن میں دو امور قابلِ ذکر ہیں پارلیمنٹ نے کئی مرتبہ ہنری چہارم کو مجبور کیا کہ اپنے وزراء اس کے انتخاب سے مقرر کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسی کے زمانے میں یہ طے ہوا کہ رقمی معاملات کے متعلق تمام تجویزیں پہلے بیت العوام میں پیش ہوں۔

ہنری پنجم کی تخت نشینی سے حکومت میں استواری پیدا نہ ہوئی اور ابتدا ہی میں اسے دو حملوں کو دفع کرنا پڑا۔ پہلی دقت جو اس نے محسوس کی اس کا تعلق خاندان لنکاسٹر کے ظالمانہ مذہبی طرزِ عمل سے تھا جس سے "ملحدوں کے جلانے کے قانون" کے نفاذ کے بعد وک لف کے بہت سے پیرو جلا دیئے گئے تھے مگر اس میں سیاسی مقاصد بھی شامل تھے۔ ہنری پنجم نے ان ملحدوں کا انسداد نہایت سختی سے کیا اور اس کے بعد تو لارڈری (یعنی وکلف کے مذہب) کا ذکر بہت کم سننے میں آتا ہے ہنری جب فرانس پر حملہ آور ہورہا تھا تو ایک دوسری سازش کا انکشاف ہوا جس میں اس کا عم زاد بھائی ارل کیمبرج بھی شریک تھا یہ شخص غداری کی پاداش میں فوراً قتل کردیا گیا۔

انگلستان کے قدیم دشمن فرانس پر فتحیاب ہونے سے ہنری کو ہردلعزیزی حاصل ہوئی اور بغاوتوں کا سلسلہ بالکل ختم ہوگیا۔ آژان کور کی فتح کری سی کی

فتح سے بھی زیادہ شاندار تھی اور اس کے نتائج بھی زیادہ اہم تھے ہنری جب پیرس
میں داخل ہوا اور فرانس کا بادشاہ تسلیم کیا گیا تو انگریزوں کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا
اور وہ بھول گئے کہ لنکاسٹر کا خاندان غاصب ہے ۱۴۲۲ء میں ہنری پنجم عین عنفوان
شباب میں مر گیا جس سے یہ اندازہ کرنا ممکن ہے کہ اس کی ہر دلعزیزی کا اثر کب تک
رہتا۔ عہد مابعد میں امرا کے سبب سے پھر طوائف الملوکی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۵

ہنری ششم کے باپ کا جب انتقال ہوا اس کی عمر صرف نو ماہ کی تھی۔ اس وقت کسی کو یہ
نہ معلوم ہوگا کہ اپنی فرانسیسی ماں سے اسے دماغی کمزوری بھی ورثہ میں ملیگی جو خاندان والوا
(فرانس کا شاہی خاندان) میں اس سے قبل نمودار ہو چکی تھی بادشاہ بوجہ صغر سنی زمانہ
دراز تک ذی اقتدار نہ ہو سکتا تھا۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ جس ملک پر بچہ حکمراں
ہو اس کی خیریت نہیں۔ اور انگلستان میں یہ ضرب المثل پایۂ ثبوت تک پہونچگئی
بادشاہ کا چچا جان ڈیوک بیڈفورڈ "محافظ" کے لقب سے نائب السلطنت
تھا۔ یہ شخص انگلستان کے بہترین حکام میں سے تھا اور اس کی سرکردگی کی بدولت
فرانس کی جنگ میں بھی کامیابی ہوئی ۱۴۲۴ء میں انگریزوں کو ورنئی کی جنگ میں
فتح ہوئی جس سے فرانس کی حالت نہایت ابتر ہو گئی۔ مگر فتوحات سے انگریز امرا کے
باہمی مناقشات دور نہ ہو سکتے تھے اور انگریزی فتوحات کا سلسلہ اس کے بعد بہت جلد
منقطع ہو گیا۔ جون آف آرک میدان کارزار میں ۱۴۲۹ء میں وارد ہوئی۔ بیڈفورڈ
جس زمانہ میں فرانس کی جنگ میں مشغول تھا انگلستان کی حکومت کی باگ بادشاہ
کے ایک دوسرے چچا ہمفری ڈیوک گلوسٹر کے ہاتھوں میں تھی جسکے داخلی اور خارجی
طرز عمل سے بیڈفورڈ کو سخت پریشانی ہوئی تھی۔ گلوسٹر ۱۴۲۹ء میں اپنی خدمت
سے ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ بادشاہ کے باپ کے چچا کارڈنل بوفورٹ کا تقرر ہوا
فرانسیسی جنگ کے علاوہ انگلستان کی تاریخ میں اس زمانہ میں سازشوں اور مختلف
جماعتوں کی نزاعوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ۱۴۳۵ء میں بیڈفورڈ نے انتقال کیا
فرانس نے مصالحت کی درخواست ایسی شرطوں پر کی تھی جس سے دونوں ملکوں کی
عزت برقرار رہتی مگر بیڈفورڈ نے مرنے سے قبل مصالحت سے انکار کر دیا۔

سال ہائے مابعد میں انگلستان کی تاریخ جسقدر مایوس کن ہے شاید ہی کسی اور ملک کی ہوگی۔ ملک میں سرگرمی اور نیک نیتی کی کمی نہ تھی مگر افسوس ہے کہ انگلستان کی سیاست سے یہ دونوں خوبیاں مفقود ہوگئی تھیں۔ بادشاہ جب سن شباب کو پہونچا تو اس کی خوبیاں ظاہر ہونے لگیں۔ مذہب کا دلدادہ تھا اور امن وامان کا خواہاں اپنے دشمنوں سے درگزر کرتا تھا۔ فیاض اور تعلیم کا حامی تھا۔ مگر اس پرآشوب زمانہ میں ایسے نیک نہاد اشخاص کا گزر نہ تھا اور واقعات کی رفتار پر اس کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ دربار اور مجلس شاہی کارڈنل بوفورٹ اور ڈیوک گلاسٹر کی رقابتوں کے اکھاڑے بنگئے تھے۔ بادشاہ کا عقد مارگرٹ رئیسۂ آنجو سے ہوا مگر یہ شادی راس نہ آئی کیونکہ یہ شہزادی نہ تو عقلمند تھی نہ کوئی جہیز ہی ساتھ لائی۔ ۱۴۴۷ء میں گلاسٹر اور بوفورٹ نے انتقال کیا اور ڈیوک سفک بادشاہ کا مشیر خاص ہوگیا۔ یہ شخص حسن تدبیر سے عاری تھا اور اگر مدبر ہوتا بھی تو زمانہ ناموافق تھا۔ ۱۴۴۹ء میں فرانس میں اپنی حکومت قایم کرنے سے انگریزوں کو قطعی مایوسی ہوگئی کیونکہ نارمنڈی سے وہ خارج کردئے گئے اور جنوبی فرانس میں بھی ان کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ فرانس میں فتوحات سے انگریزوں کا دماغ پھر گیا تھا اور ان جنگوں میں جو کثیر مال غنیمت لاتا اس سے ان کا لالچ بڑھ گیا تھا اس لئے جس حکومت کے تحت میں پانسہ پلٹا اس سے اہل ملک کا ناراض ہوجانا بعید نہیں۔

سفک پر مقدمہ قایم کیا گیا جس سے خائف ہوکر اس نے فرانس بھاگ جانے کی کوشش کی مگر بحیرۂ انگریزی میں اس کا جہاز روک لیا گیا اور ۱۴۵۰ء میں وہ گرفتار کرکے قتل کر دیا گیا۔ اسی سال جیک کیڈ کی بغاوت ہوئی۔ کسانوں کی بغاوت کی طرح اس بغاوت میں کوئی خاص امر قابل تذکرہ نہیں ہے البتہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کی نااہلی اور ناکامی سے جو ناراضی پیدا ہوگئی تھی وہ امرا تک محدود نہ تھی باغی زیادہ تر کینٹ کے تھے اور خطرناک تھے۔ بادشاہ فرار ہوگیا اور انھوں نے لندن پر قبضہ کر لیا۔ مگر اس کے بعد رجعت شروع ہوئی کیڈ قتل کر دیا گیا اور بغاوت فرو ہوگئی۔ اس زمانہ کی بغاوتوں کے حالات بھی دلچسپ نہیں ہیں۔

گلابوں والی لڑائیوں کا آغاز ۱۴۵۳ء سے ہوتا ہے اسی سال انگریز

جنوبی فرانس سے بھی خارج کردیے گئے اور ان کا قبضہ صرف کیلے پر رہ گیا۔ اس کے بعد ہنری ششم کے دماغ میں خرابی پیدا ہوگئی اور کسی نائب السلطنت کا تقرر ضروری ہوگیا اسی اثنا میں ملکہ مارگریٹ کے لڑکا ہوا۔ ان سب واقعات کا تعلق خاندان یارک کے دعادی سے ہے جواب پیش ہوئے۔

رچرڈ ڈیوک آف یارک، شاہ ایڈورڈ سوم کا پرپوتا تھا اور اگر ہنری ششم کے اولاد نہ ہوتی تو وہ قانوناً تخت کا وارث ہوتا۔ فرانس اور آئرلینڈ میں اس کی فوجی خدمات قابل قدر خیال کی گئی تھیں۔ ہنری ششم کی کمزور حکومت یا عدم حکومت کے مقابلہ میں رچرڈ کارکردہ اور سرگرم تھا۔ اس کے علاوہ اسے مارچ اور السٹر کی جاگیریں اپنی ماں سے ورثہ میں ملی تھیں جن سے وہ بہت دولتمند ہوگیا تھا۔ اپنے عہد کے امرا کا وہ ایک اچھا نمونہ ہے۔ ان امرا کا قدیم امرائے جاگیری سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ شاہی عنایات اور ایسی شادیوں کے ذریعہ سے جنکا خاص مقصد حصول دولت تھا، ان امرا نے زر کثیر جمع کرلیا تھا۔ یہ لوگ قلعوں میں رہتے تھے جنکے استحکام کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا تھا اور انکے مسلح ملازم تھے جنکے سہارے پر وہ اپنے مخالفوں کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ بادشاہ یا پارلیمنٹ کسی کی انھیں پروانہ تھی لنکاسٹری بادشاہوں کے تحت میں پارلیمنٹ کی آزادی اور حقوق میں اضافہ ہوا مگر اس کی حقیقی قوت بہت کم تھی انتخابات امرا کی نگرانی میں ہوتے تھے، اور وہ پارلیمنٹ جو ان انتخابات کا نتیجہ تھی ساتھ ہی ساتھ حکومت اور بدنظمی کا ذریعہ بھی تھی۔ خاندان نیوِل کا یارک کے خاندان سے گہرا تعلق تھا اور اس سے بھی زیادہ دولتمند تھا وارک "شاہ گر" خاندان نیوِل کا سرغنہ تھا۔

خاندان یارک کا نشان سفید گلاب تھا اور خاندان لنکاسٹر کا سرخ گلاب (گو اس میں شک ہے۔) اسی وجہ سے اس جنگ کو گلابوں والی لڑائی کہتے ہیں اور اسکے دو حصے ہوسکتے ہیں اولاً ایک کمزور بادشاہ اور اسکے نااہل وزیروں کے خلاف مفاد عامہ کے لئے ایک اتحاد قایم ہوا مگر اس کی صورت دو رقیب خاندانوں کی وحشیانہ کشمکش کی ہوگئی اسکے حالات سلسلہ وار بیان کرنا ہر صورت میں مشکل ہیں اور اس کی ہم مطلق کوشش نہ کرینگے۔ جنگ کی اہم منزلیں حسب ذیل تھیں:-

(۱) ڈیوک یارک اولاً صرف "محافظ" کے لقب کا دعویدار تھا مگر اسکے بعد اس نے

دعویٰ کیا کہ ہنری ششم کی زندگی میں بھی تخت سلطنت کا حقیقی دعویدار وہی تھا۔ غریب بادشاہ جسے کبھی کبھی ہوش آجایا کرتا اسکے مقابلہ سے مجبور رہتا اس لئے یہ طے ہو گیا کہ اسکے انتقال کے بعد رچرڈ ڈیوک یارک بادشاہ ہو۔

(۲) بادشاہ تو راضی ہو گیا مگر اس کی سرگرم اور پرجوش بیوی مارگرٹ رئیسہ آن نزو اپنے بیٹے کے حقوق سے دست کش نہو سکتی تھی۔ شمال میں اس نے ایک فوج تیار کی اور رچرڈ کو شکست دیکر اسے قتل کر دیا۔ ہنری ششم چند روز کے لئے پھر بادشاہ ہو گیا مگر ایڈورڈ رئیس یارک اپنے باپ رچرڈ کی طرح تخت کا دعویدار ہوا اور وارک اور شہر لندن کی تائید سے بچ گیا۔ ٹاؤٹن کی جنگ (۱۴۶۱ء) نے لنکاسٹریوں کو تباہ کر دیا اور ایڈورڈ ایڈورڈ ششم کے لقب سے بادشاہ ہو گیا۔

(۳) ایڈورڈ فن سپہگری میں طاق تھا اور وارک کی مدد سے ملک میں ایک زبردست حکومت قائم کر سکتا تھا جسکی ملک کو سخت ضرورت تھی۔ مگر دونوں میں ناموافقت ہو گئی ایڈورڈ کو وارک سے حسد تھا اس لئے اس نے وارک کو دھوکا دیکر بے دست و پا کرنا چاہا۔ وارک نے جب دیکھا کہ اس کے جان و مال کی خیر نہیں تو پھر اس جماعت سے مل گیا جس کے ساتھ اس نے غداری کی تھی یعنی فرانس جاکر اس نے ملکہ مارگریٹ سے ساز باز کر لیا اور لوئی یازدہم شاہ فرانس کی تائید حاصل کی یہ جنگ بھی عجیب و غریب تھی فتح کا سہرا کبھی ایک فریق کے سر ہوتا کبھی دوسرے کے کیونکہ نہ تو یہ قومی جنگ تھی نہ کسی خاص اصول کی حمایت کے لئے تھی بلکہ قسمت آزما سپاہیوں اور اجیر فوجوں کی جنگ تھی۔ ایڈورڈ چہارم کو بھاگنا پڑا اور ہنری ششم پھر بادشاہ ہو گیا۔ مگر ایڈورڈ بھی اپنے دشمنوں کے طرز عمل کی نقل کر سکتا تھا۔ اس نے چارلس بہادر ڈیوک برگنڈی سے فوجی اور مالی امداد حاصل کی اور حملہ کرکے وارک شاہ گر کو بارنیٹ (۱۴۷۱ء) میں شکست دیکر قتل کر دیا۔ چند روز کے بعد ملکہ مارگریٹ کو بھی شکست ہوئی۔ ایڈورڈ اور اس کے شرکا نے اپنے مخالف امرا میں سے بہت کم کی جان بخشی کی۔

اس کے بعد بارہ سال تک ایڈورڈ نے امن و امان سے حکومت کی مگر کمینہ مقصدوں، بے ایمانیوں، سخت گیریوں سازشوں اور قتل و غارت کا

سلسلہ آخر تک جاری رہا ۱۴۷۸ء میں اس کا بھائی کلارینس قتل کردیا گیا۔ پارلیمنٹ کے اجلاس بہت کم ہوتے اور کسی کو اس کا افسوس بھی نہ تھا بادشاہ نے ۱۴۸۳ء میں انتقال کیا۔

سال ہائے ماقبل جرائم اور سخت گیری کے واقعات سے پُر تھے مگر ابھی اس سے بدتر زمانہ آنے والا تھا۔ شاہ متوفی کے دو بیٹے تھے جن میں سے بڑا بارہ سال کا تھا جو ایڈورڈ پنجم کے لقب سے تخت نشین ہوا مگر اس وقت انگلستان میں سب سے سربرآوردہ شخص رچرڈ ڈیوک گلوسٹر تھا جو ایڈورڈ چہارم کی وصیت کے لحاظ سے بادشاہ کا ولی اور محافظ مقرر ہوا یہ شخص قابل اور اولوالعزم تھا مگر بدہیئت اور بدطینت بھی تھا شکسپیر نے اپنے ایک مشہور و معروف تاریخی ڈرامہ میں اس کی سیرت پر بحث کی ہے اور اس کی بیرحمی اور خباثت کے عیاں کرنے میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ اس کی دیوانہ وار نفس پرستی سے اطالوی نشائت جدید کے عہد کے اشخاص یاد آتے ہیں۔ مگر اس کتاب میں ہم اس کی دروغ گوئیوں، سازشوں اور خونریزیوں کا ذکر نہیں کرسکتے۔ اولاً اس نے بطور محافظ سلطنت، حکومت شروع کی۔ اس کے بعد اس کے حوصلے اور بلند ہوگئے اور اس نے بادشاہ ہونے کا قصد کیا۔ ایڈورڈ پنجم اس حیلۂ شرعی سے ولد الحرام قرار دیا گیا کہ اسکے باپ کی منگنی پہلے ایک دوسری عورت سے ہوئی تھی۔ رچرڈ اب رچرڈ سوم کے لقب سے بادشاہ بن بیٹھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خوبی کے ساتھ حکومت کرسکتا تھا اور اپنی سرگرمی سے کام لیکر بدامنی کا انگلستان میں خاتمہ کرسکتا تھا۔ مگر اس نے ہر طرف دشمن پیدا کرلئے تھے اور باغیوں کو متعدد مرتبہ کامیابی ہوچکی تھی اس لئے بغاوت کا پھر رونما ہونا ناممکن نہ تھا۔

اگر اتفاقات زمانہ اور تیغ جلاد نے رقیبوں کو اس کی راہ سے دور نہ کردیا ہوتا تو ہنری ٹیوڈر، ارل آو رچمنڈ کو تخت کا دعویدار ہونے کا کبھی موقع نہ ملتا۔ اس کی رگوں میں فرانس اور انگلستان کا شاہی خون تھا۔ اس کے دادا نے جو کچھ روز کے بعد ایڈورڈ چہارم کے حکم سے قتل کردیا گیا تھا۔ فرانس کی شہزادی کیتھرین سے عقد کیا تھا جو شاہ ہنری پنجم کی بیوہ تھی لیکن فرانس کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے سے نہ تو وہ خاندان لنکاسٹر کا رکن ہوسکتا تھا اور نہ انگلستان کے تاج شاہی کا دعویٰ کرسکتا تھا۔

انگلستان کے شاہی خاندان سے اس کا یہ تعلق تھا کہ اپنی ماں کی طرف سے وہ خاندان بوفورٹ کی اولاد سے تھا جس کا سلسلہ ایڈورڈ سوم کے بیٹے جان آف گانٹ سے ملتا تھا۔ خاندان لنکاسٹر میں ہنری ٹیوڈر کے علاوہ کوئی فرد باقی نہ تھا۔ ہنری ٹیوڈر سے بہت کم لوگ واقف تھے کیونکہ اس کا قیام زیادہ تر بیرونی ممالک میں تھا۔ یہ بھی کسی کو نہ معلوم ہوگا کہ اسکے مزاج میں کس قدر استقلال اور احتیاط ہے یا اس کی قوت فیصلہ کس قدر زبردست ہے۔ مگر اس گمنامی کے باوجود وہ بدنام نہ تھا اس لئے جو لوگ رچرڈ سوم کو دفع کرنا چاہتے تھے انھوں نے اسے اپنا سرغنہ بنالیا۔ ہنری ٹیوڈر ویلز کے ساحل پر لنگر انداز ہوا اور بادشاہ کی فوجوں کا اس نے پاس ورتھ میں مقابلہ کیا جو لیسٹر کے قریب ہے۔ رچرڈ کو درحقیقت شکست نہیں ہوئی بلکہ اس کے ساتھ سخت غداری ہوئی۔ جنگ میں وہ مارا گیا اور ہنری ٹیوڈر' ہنری ہفتم' کے لقب سے بادشاہ ہو گیا۔ اس کے عہد حکومت کے واقعات کی طرف نسل ہائے مابعد کو زیادہ توجہ نہیں مگر فی الحقیقت انگلستان کے بہت کم بادشاہ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس سے زیادہ احسانات ملک پر کیے ہیں۔

(۶)

اس عہد اور خصوصاً اس کے نصف آخر میں اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ قومی سیرت کوئی ایسی مستقل قوت ہے جسکا فعل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ انگریزوں کا دعویٰ ہے اور بعض غیر ملکی مبصرین نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ سیاسیات سے انھیں عملی مناسبت ہے' ان کی سیاسی ترقی درجہ بدرجہ ہوتی ہے' دوسری قوموں کی طرح شدت جذبات سے وہ اپنے آپ سے باہر نہیں ہوجاتے بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں اور شدید مباحث کے دوران میں بھی ان کی سیاسی زندگی کا معیار نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس عہد کا ذکر ہم نے ابھی ختم کیا ہے' جسقدر ظلم و ستم قتل اور غارتگری کے نظارے اس میں نظر آتے ہیں' نہ اطالیہ میں سیزر بورجیا کے زمانے میں ملتے ہیں' نہ ہسپانیہ میں (فلپ دوم کے عہد حکومت میں) اور نہ فرانس ہی میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے برگنڈیوں اور آرماگ ناک فریقوں کی وحشیانہ لڑائیوں میں اور نہ کیتھرین ڈی میڈی چی

کے عہد حکومت میں ایسی کوئی مثال پائی جاتی ہے انگلستان میں اس عہد کی خصوصیت یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد مفقود تھے اور ایک ذلیل قسم کی مادہ پرستی رائج تھی۔

اس عہد کے نصف اول میں یعنی ہنری پنجم کے زمانے تک بعض قابل تحسین خصایص پائے جاتے ہیں کری سی اور آژان کور کے شاندار فتوحات انگریزوں کیلئے باعث فخر ہو سکتے ہیں گو اب ہر شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ فرانس سے جنگ چھیڑ کر ہنری پنجم ایک مجرمانہ غلطی کا مرتکب ہوا تھا جس سے یورپ کو سخت نقصان پہونچا۔ اسی زمانے میں مشہور نظم پیرز پلاؤمن (Piers Plowman) شائع ہوئی اور چاسر نے کینٹربری کے قصے لکھے جن سے یہ عہد گویا منور ہے۔ نظم مذکور سیدھی سادی ہے مگر شاعر نے طنز سے خوب کام لیا ہے چاسر کے قصے انگریزی قوم کے لئے مایۂ ناز ہیں ان میں حقیقی شاعری موجود ہے اور مذاق کا پہلو غالب ہے اس تاریک زمانے میں ان نظموں سے زندگی میں ایک عجیب لطف پیدا ہوتا ہوگا اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رچرڈ دوم کے پر آشوب زمانے میں قومی زندگی میں کوئی سقم نہ تھا۔ مگر عہد مذکور کے نصف آخر کے ادبیات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں زمانۂ حال کے ناظرین کو لطف آئے۔ سرسری نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرور انگلستان ایک دلدل میں پھنس گیا تھا۔ مگر کون جان سکتا تھا کہ یہی زمانہ انگلستان کی تاریخ کے ایک نہایت ہی شاندار عہد کا پیش خیمہ ہے اس جدید اور بہتر عہد کے آنے کے کیا آثار تھے؟

حسن پرستی ابھی انگلستان میں باقی تھی اور انگریزی طرز تعمیر کے نمونوں میں اضافہ ہو رہا تھا جنکی قدر و قیمت ابھی تک پہچانی نہیں گئی ہے۔ تیرھویں صدی کا نوکدار طرز جو اس زمانہ کے حسب حال تھا متروک ہو رہا تھا اور عمودی طرز اختیار کیا جا رہا تھا جو عملاً زیادہ مفید تھا۔ عہد مذکور کے اواخر تک اس طرز کی عمارتیں بنتی رہیں۔ فن تعمیر کے ساتھ جو شغف تھا شہروں اور جامعات تک محدود نہ تھا۔ ویسٹ منسٹر کے بڑے گرجے کا بیشتر حصہ اسی زمانہ کا بنا ہوا ہے اور کیمبرج کے کنگز کالج کا گرجا بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ ان کے علاوہ انگلستان کے ہر گوشے میں خوبصورت گرجے بن رہے تھے۔ خانگی مکانات کی تعمیر میں بھی بہت ترقی ہوئی جسکے شاہد امرا کے متعدد شاندار محل ہیں۔

اس زمانے میں نشأت جدید کی تحریک اطالیہ میں معراج کمال پر پہونچ گئی تھی اور فرانس اور نیدرلینڈ پر بھی اس کا گہرا اثر ہوا تھا مگر انگلستان اس سے بہت کم متاثر ہوا اطالیہ میں جمالیات اور فلسفیانہ تخیلات کے ساتھ جو شغف تھا انگلستان میں نظر نہیں آتا اور نہ اخلاق کے مسلمہ اصول زیر بحث تھے اس زمانے کے انقلابات کا ایک عملی اثر البتہ انگلستان کے ساحل تک پہونچا یعنی ولیم کیکس ٹن نے ۱۴۷۶ء میں ویسٹ منسٹر میں اپنا مطبع قایم کیا۔ یہ ایجاد انگلستان میں نیدرلینڈ سے آئی تھی کیونکہ کیکس ٹن مدت تک بروژے میں مقیم تھا اور وہیں اس نے انگریزی کتابیں چھاپی تھیں۔ کیکس ٹن بذات خود اس فن کا موجد نہیں تھا بلکہ اس نے فن طباعت جو یورپ میں بیس سال قبل سے رائج تھا انگلستان میں جاری کیا کسی کے وہم و گمان میں بھی اس وقت نہ آسکتا ہوگا کہ اس ایجاد سے دنیا میں کیا انقلاب ہونگے۔ اس نے کتب ذیل پہلے انگریزی میں چھاپیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا مذاق کیا تھا تاریخ ٹراے[1] شطرنج کا کھیل[2] افسانۂ زرین[3] چاسر کی نظمیں[4]۔ اس کے بعد عہد عتیق کے مصنفین بوتھیوس[5] ورجل[6] اور سسرو[7] کی کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے۔ طباعت میں امرا اور اہل دربار کو بھی خاص دلچسپی تھی۔

تجارتی طبقۂ متوسط کے عروج اور ترقی بلاد کو عہد آئندہ کا پیش خیمہ خیال کرسکتے ہیں۔ انگلستان میں اطالیہ جرمنی یا فرانس کے بلدیات کے مثل کوئی شئے نہ تھی کیونکہ مرکزی حکومت اس قدر قوی تھی کہ فلارنس یا کالون کی طرح کوئی شہر آزادی حاصل نہ کرسکتا تھا۔ مگر اس زمانہ کی ابتری اور وحشیانہ پن کے باوجود جنکا اثر صرف حکمراں جماعتوں پر تھا تجارت کو فروغ تھا اور آبادی بڑھ رہی تھی۔ غیر ملکی تجارت مشارکتوں کے ہاتھوں میں تھی جن میں سے اہم ترین "قسمت آزما تجار" کی جماعت تھی جتنی جتنی تجارت پیشہ لوگوں کی دولت اور اہمیت بڑھتی گئی شہروں کو بلدی حقوق کے دستور ملتے گئے اور ہنری ہفتم کے

---

[1] The History of Troy.
[2] The Play and Games of Chess.
[3] The Golden Legend
[4] The Poems of Chancer
[5] Boethius
[6] Virgil
[7] Cicero

عہد سے قبل اکثر شہروں میں مجالس شہر، صدر بلدیہ اور دیگر عہدہ دار موجود تھے جن کے اختیارات واضح اور معین تھے۔ گلابوں والی لڑائی کی ابتری درحقیقت شہروں کے حق میں مفید تھی۔
طبقۂ متوسط کے عروج نے انگلستان کو ان خطرات سے بچالیا جن میں وہ پھنسا ہوا تھا۔ عہد زیر تذکرہ میں پولینڈ کی طرح انگلستان میں بھی لامرکزیت کے پیدا ہونے کے آثار تھے امراء سلطنت کو اپنا شکار خیال کرتے تھے، حب وطن سے بالکل عاری تھے اور لڑنے بھڑنے کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ مگر طبقۂ امراء نے اپنے آپ کو گلابوں والی لڑائی کی خانہ جنگیوں میں تباہ کردیا۔ لیکن ایک زبردست حکومت شاہی کے تحت میں ایک نیا طبقہ وجود میں آرہا تھا جس سے انگلستان کے تمدن کی اصلاح ہوئی۔

باب بست وچہارم

نشأت جدید اور قرون وسطیٰ کا اختتام

ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرون وسطیٰ کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جبکہ شہنشاہ قسطنطین نے کلیسیۂ مسیحی کی دستگیری کی تھی اور مظلومی اور کس مپرسی کی حالت سے اٹھا کر اسے عالم متمدنہ کی حکومت میں شہنشاہی کا ہم پلہ بنا دیا تھا۔ کلیسا ہی کی قوت اور اثر سے قرون وسطیٰ کو ان کی نمایاں خصوصیات حاصل ہوئیں۔ نظام جاگیری کی لامرکزیت اور وحشیوں کی حملوں سے ابتری پیدا ہو گئی تھی مگر اس بدنظمی میں بھی جو تیسری صدی سے پندرھویں تک جاری تھی یورپ میں اتحاد کا احساس باقی تھا اور یہ احساس کلیسا ہی کی بدولت تھا۔ اس لئے قرون وسطیٰ کا اختتام اسی زمانہ پر ہوگا جبکہ مغربی یورپ کا مذہبی اتحاد پراٹس ٹنٹ فرقہ کے وجود میں آنے سے باقی نہ رہا۔ کلیسا اور فلپ چہارم شاہ فرانس کے درمیان جو کشمکش ہوئی اس میں کلیسا کو ایک زخم کاری لگا جس سے سنبھلنے کا اسے پھر موقع نہ ملا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں کلیسا میں الحاد اور تفرقہ کا بازار گرم تھا کلیسیہ کو بالآخر فتح ہوئی مگر اسے پھر وہ سطوت اور جبروت حاصل نہ ہوئی جو گری گوری ہفتم یا انوسنٹ سوم کے زمانہ میں پائی جاتی تھی عالم مسیحی کلیسا کے قابو سے نکلا جا رہا تھا۔ مگر لیوتھر کے احتجاج تک برائے نام قایم تھا۔ اس کے بعد ایک ایسی جدوجہد شروع ہوئی جس سے یورپ کی مذہبی حالت بالکل متغیر ہو گئی کئی ملکوں میں بجائے کاتھلکی کلیسیہ کے قومی کلیسا قائم ہو گئے اور بالآخر مذہبی عقائد میں جبر و اکراہ سے کام لینے کا طریقہ متروک ہو گیا۔ پندرھویں صدی کے اواخر میں قرون وسطیٰ کی ایک اور نمایاں خصوصیت زایل ہونے لگی۔ قرون وسطیٰ میں جذبۂ قومیت بالکل مفقود تھا جو یورپ کے موجودہ سیاسیات کا جزو اعظم ہے۔ مختلف ممالک کے باشندوں میں ابھی تک اپنی علٰحدہ ہستی کا احساس

پیدا نہیں ہوا اور قوموں میں زمانۂ حال کی طرح مکمل جدائی عمل میں نہیں آئی تھی بین الاقوامیت قرون وسطیٰ کی امتیازی خصوصیت تھی۔ حکومتوں کو ایک دوسرے سے حسد رہتا تھا اور وہ آپس میں خونخواری کے ساتھ لڑتی تھیں متعدد خیالات اور مختلف ذرائع ایسے تھے جن سے مختلف قوموں میں بلا امتیاز باہمی تعلق پیدا ہوتا تھا اور جس سے مغربی یورپ کے باشندوں میں اتحاد قایم تھا جو اب باقی نہیں کلیسا کو قومی حدود کی مطلق پروا نہ تھی ہر قوم کے، اور ہر زبان کے بولنے والے اشخاص پادریوں یا فقرا کی جماعتوں میں داخل ہوتے۔ اختلاف السنہ سے کلیسا کو کوئی دقت نہ تھی کیونکہ تمام تعلیم یافتہ اشخاص کی زبان لاطینی تھی۔ جاگیریت کو بھی قومیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بہادر چارلس کے جو حالات ہم نے بیان کئے ان سے ظاہر ہے کہ جاگیریت کے تحت میں ایک ایسی قوت وجود میں آسکتی تھی جسے قومی حدود یا اتحاد لسانی یا اتحاد قومی کی مطلق پروا نہ تھی۔ نظام جاگیری میں اعلیٰ ترین قوت شہنشاہی تھی جسکی حیثیت بالکل بین الاقوامی تھی اور جس کے دعاوی کلیسا کی طرح عالمگیر تھے۔ جرمنوں کے علاوہ اسکے حدود میں فرانسیسی، اطالوی اور سلاوی موجود تھے اور مختلف اقوام کا ایک حکومت کے تحت میں ہونا اس زمانہ کے خیالات کے بالکل مطابق تھا اس لئے شہنشاہی کی ہیئت کذائی پر کسی کو تعجب نہ ہوتا ہوگا۔ جامعات پر محل وقوع کا کوئی اثر نہ تھا اور ان ملکوں سے انکا تعلق بالکل خفیف تھا جن میں وہ واقع تھیں استاد اکثر غیر ممالک کے باشندے ہوتے اور طالب علم اطالیہ سے جرمنی اور فرانس سے انگلستان بلا کسی دقت کے چلے جاتے پندرھویں صدی کے اواخر میں جذبۂ قومی قوی ہونے لگا خصوصاً فرانس انگلستان اور ہسپانیہ میں گو جرمنی میں بھی یہ جذبہ باوجود متعدد حکومتوں کے وجود کے پیدا ہو گیا تھا۔ فرانس اور انگلستان میں جنگ صد سالہ کی بدولت دونوں قوموں کو اپنی علٰحدہ ہستی کا احساس ہو گیا اور ہسپانیہ میں بھی یہ احساس اس طویل کشمکش سے پیدا ہوا جو مسلمانوں اور ہسپانی عیسائیوں میں عرصہ تک جاری تھی۔

قرون وسطیٰ کے دونوں نمایاں خصائص یعنی سیاسی بین الاقوامیت اور کلیسا کی عالمگیری پندرھویں صدی کے آخر میں دھندلی ہوتی جاتی تھی۔ مگر نئے جذبات میں صرف احساس قومی نہ تھا جدید تخیلات وجود میں آرہے تھے جن سے

اہل زمانہ کے خیالات متاثر ہورہے تھے اور ان خیالات کا اثر ان کے افعال پر تھا۔ نشاۃ جدید پندرھویں صدی کے اواخر میں معراج کمال پر پہونچ گئی طباعت کی ایجاد ہوچکی تھی جس سے یورپ میں علمی خیالات کے تبادلہ میں بے انتہا سہولت ہوگئی سیاحوں نے بتادیا تھا کہ بحراوقیانوس کے پار ایک نئی دنیا ہے۔ تاریخ عالم کا ہر ایک عہد عہد تغیر ہے اور تاریخ عالم کو مستقل دوروں میں تقسیم کرنے سے غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے لیکن پندرھویں صدی کے آخر میں متعدد قوتیں یکجا ہورہی تھیں جنکے مجموعی فعل نے یورپ کو اس راہ سے ہٹادیا جس پر وہ عرصہ سے چل رہا تھا۔ اس باب میں ہم ان قوتوں پر سرسری طور سے بحث کریں گے۔

نشاۃ جدید سے مراد اس عہد کی دماغی اور فنون لطیفہ کی تحریک سے ہے (Renaissance) کے معنی "نئے جنم" کے ہیں اور اس کا اطلاق یونانی زبان اور ادبیات عہد عتیق کے احیا پر ہوتا ہے جنکا مطالعہ اس زمانہ میں نہایت سرگرمی سے جاری تھا لیکن نشاۃ جدید کے متعلق دو سخت غلط فہمیاں ہیں جنکا دفع کرنا ضروری ہے۔ اولاً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تحریک کا آغاز اس وقت سے ہے جبکہ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا اور جو یونانی وہاں سے بھاگے یونانی قلمی کتابیں اپنے ساتھ اطالیہ لائے اور یونانی زبان کی تعلیم دینے لگے۔ مگر اس خیال کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے کیونکہ قسطنطنیہ کے سقوط کے پچاس سال قبل سے یونانی زبان کے مطالعے کا سلسلہ اطالیہ میں جاری تھا اور اس ہزیمت عظیم سے تحریک مذکور کو کوئی مزید تقویت نہیں ہوئی ثانیاً نشاۃ جدید یونانی علوم کے احیا تک محدود نہیں۔ احیائے علوم تحریک کا ایک اہم جزو تھا مگر کسی صورت میں اس کے وجود میں آنے کا باعث نہ تھا کیونکہ اطالیہ میں جو نظمیں احیاء علوم کے بعد لکھی گئیں ان سے وہ نظمیں بہتر اور بلند پایہ کی ہیں جو اسکے قبل لکھی گئی تھیں۔ یورپ بیدار ہوگیا تھا اور جدید علوم سے اسے رغبت ہوگئی تھی اسی بیداری کا نتیجہ تھا کہ عہد عتیق کے ادبی خزانوں کی طرف اسے پھر توجہ ہوئی جو کس مپرسی کی حالت میں تھے مگر جنکے وجود کو یورپ نے فراموش نہیں کیا تھا۔

نشاۃ جدید کی حقیقت سمجھنے کے لئے اسے یورپ کے ارتقائے تخیل کی ایک منزل خیال کرنا چاہئے جو اس دماغی اور فنون لطیفہ کی تحریک سے ملتی جلتی ہے

جو یونان میں پانچویں اور چوتھی صدی ق۔م میں رونما ہوئی تھی یا اسے اس انقلاب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو بنی نوع انسان کے خیالات میں مسیحی مذہب کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا تھا نشاۃ جدید کے باعث بیرونی واقعات نہ تھے بلکہ تجربوں کی وسعت اور تغیر پذیر ضروریاتِ زمانہ سے وہ از خود وجود میں آئی تھی۔

قرونِ وسطیٰ کو جہالت اور عدم واقفیت سے عہد تاریک کہا جاتا ہے مگر اس صفت کا ان پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ پانچویں صدی سے بارھویں صدی تک یورپ میں دماغی کاوش اور فلسفیانہ تخیلات کا پتا بہت کم چلتا ہے نشاۃ جدید فی الحقیقت بارھویں صدی کے بعد ہی سے شروع ہوئی گو اصطلاحاً اس کا آغاز زمانہ مابعد سے وابستہ بتایا جاتا ہے۔ تیرھویں صدی سے سرخیل فلاسفہ یونان' ارسطو' کا اثر یہیں شروع ہوتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے اوائل میں اس کا نام بالکل غیر معروف تھا مگر تیرھویں صدی میں اس کی اصلی یونانی تصنیف کے عربی ترجمہ کا لاطینی میں ترجمہ ہوا جس سے مغربی یورپ اس کے تخیل سے بھر واقف ہوا۔ یورپ نے اس کی اہمیت کو فوراً تسلیم کر لیا اور تیرھویں صدی کے بڑے بڑے علما (''مدرسین'') اس کی توضیح میں مصروف تھے اور جدید خیالات اور ضروریات سے اسے مطابق کرنے لگے۔ ان کے اصطلاحات اور خیالات اور بیسویں صدی کے تخیلات میں بُعد عظیم ہے مگر دینی علوم سیاسیات' مابعد الطبیعیات اور اخلاق کے متعلق انھوں نے جدید تخیلات پیش کئے' جس سے اس زمانے کے لوگوں میں ایک ہل چل پیدا ہو گئی۔ ''مدرسین'' میں سب سے بڑا نام سینٹ ٹامس اے کوئی ناس (۱۲۲۵ء تا ۱۲۷۴ء) کا ہے جو نیپلز کی جامعہ میں درس دیتے تھے۔ مگر مدرسین کی خشک تحریروں کے مقابلہ میں شاعر دانتی کی تصنیفوں میں تیرھویں صدی کے تخیلات زیادہ دل پذیر صورت میں موجود ہیں۔ اسکی نظم (Devine comedy) (افسانۂ الٰہی) اس عہد کے احساسات' تمناؤں اور علوم کا آئینہ ہے اور اس کا شمار دنیا کی ان نظموں میں ہے جنھیں بقائے دوام حاصل ہوا ہے۔ نظم مذکور میں شاعر نے اپنے ایک سفر کا ذکر کیا جس میں شاعر ورجل کی رہنمائی سے وہ دوزخ اور عرفات کے منازل طے کرتا ہوا اپنی محبوبہ بیٹرس سے ملاقی ہوا جو اسے بہشت بریں میں لے گئی اور وہاں کے راز ہائے سربستہ سے اسے آگاہ کیا قرونِ وسطیٰ کو بخوبی سمجھنے کے لئے افسانۂ الٰہی

کا پڑھنا لازمی ہے دانتی کو علم سے شغف تھا اور دینیات، اخلاق اور علوم طبعی پر اس نے اپنے خیالات آزادی سے ظاہر کئے ہیں۔ یونانی سے خالی وہ بالکل نابلد تھا مگر یونانی اور دیگر قدیم ادبیات کی اہمیت کا اسے پورا احساس تھا۔ ایتھنز کو وہ 'منبع علم' ہومر کو 'سرخیل شعرا' اور ارسطو کو "شیخ ارباب عرفان کہتا ہے۔ دانتی گویا احیار ادبیات قدیم کا پیغمبر ہے۔ اس کے علاوہ اطالیہ میں دوسرے شاعر بھی گزرے ہیں مگر اسکا کوئی ہمسر نہیں۔ شاعر پیٹ رارک (۱۳۰۴ء تا ۱۳۷۴ء) کا اثر بھی اس زمانے کے تخیل پر بہت ہے اور یونانی علوم کے حصول کو وہ بھی ضروری خیال کرتا تھا۔ چودھویں صدی کے آخر میں قسطنطنیہ سے ایک سفارت ترکوں کے خلاف امداد طلب کرنے کے لیے آئی۔ اپنے اصل مقصد میں تو اسے کامیابی نہ ہوئی کیونکہ یورپ میں صلیبیت کا جوش باقی نہ تھا مگر ایک یونانی مسمی میا نویل کری سولوراس فلارنس میں رہ گیا اور ۱۳۹۹ء سے اس نے یونانی زبان کا درس دینا شروع کیا اور یونانی کا پڑھنا اطالیہ میں ایک فیشن ہو گیا جس کا ہر شخص دلدادہ تھا خانقاہوں کے کتب خانوں میں قلمی کتابوں کی تلاش ہونے لگی اور کچھ روز کے بعد ہی دے نس کے مطبع آل ڈائن سے عہد قدیم کے ادبیات کی اشاعت شروع ہو گئی پوپ نکولاس پنجم اور فلارنس کا حکمراں خاندان (مے ڈی چی) جدید علوم کے دو بڑے مربی تھے جنکی اشاعت ہر ایک جامعہ میں ہو گئی تھی۔ نہ صرف اطالیہ بلکہ جرمنی، فرانس اور انگلستان میں بھی علوم کو فروغ حاصل ہوا اور قدیم یونان اور روما کے ادبیات اور تمدن کا علم یورپ کی علمی زندگی کا جزو بن گیا۔

علوم قدیم کے احیار سے اہل یورپ کے دماغ پر گہرا اثر ہوا اس کے مطالعے سے انھیں معلوم ہوا کہ مسیحیت کے غلبے اور عروج سے قبل ایسے تمدن موجود تھے جو محاسن ظاہری و باطنی سے مزین تھے اور اہل یورپ فلسفہ و اخلاق کے ایسے تخیلات سے دوچار ہو گئے جو راسخ مسیحیت سے متغائر تھے انجیل کی اصلی زبان (یونانی) سے واقف ہو جانے سے احتجاجیت (Protestantism) کے نو مانۂ ابتدائی کے مناظرین کو ایک کارآمد ہتھیار مل گیا۔ علاوہ ازیں ان علوم کے پڑھنے سے یورپ کو حسن اور حقیقت کا ایک خزانہ مل گیا اور زمانۂ حال کے فلسفے

اور سائنس کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو اس اپیل علمی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ یورپ میں ایک نیا خمیر پیدا ہوگیا تھا اور اب قریب تھا کہ وہ قرون وسطیٰ کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کرے۔

مگر جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کرچکے ہیں کہ نشاۃ جدیدہ سے صرف علوم قدیم کے احیار سے مراد نہیں ہے بلکہ اس میں فنون لطیفہ کی بھی ایک تحریک تھی۔ یورپ کی تاریخ میں پیریکلیس کے زمانے کے بعد کوئی ایسی اہم تحریک نہیں ہے احیار علوم کے اس زمانہ میں معرکۃ الآرا نظمیں لکھی گئیں، نہایت نفیس عمارتیں بنائی گئیں اور تصویروں اور مجسمات کے ذریعہ سے حسن کا ایک نیا احساس پیدا ہوا۔ یونانی علوم کی ترویج سے قبل جو نظمیں لکھی گئیں وہ ان نظموں سے بہتر ہیں جو اس کے بعد لکھی گئیں۔ اطالیہ میں کوئی شاعر دانتی کا ہمسر نہیں جس نے ۱۳۲۱ء میں انتقال کیا اور یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی صرف ایک یا دو ہی شاعر ہوں گے جو اس کی ہمسری کا دعویٰ کرسکیں۔ پیٹ رارک اور بوکاچیو کی نظمیں بھی احیائے علوم کی تحریک کے بارآور ہونے کے قبل کی ہیں نشاۃ جدیدہ کے عہد مابعد کے بڑے شاعر آریوستو (۱۴۷۴ء تا ۱۵۳۳ء) اور تاسو (۱۴۹۳ء تا ۱۵۶۹ء) ہیں۔ طرز تحریر میں دونوں احیار علوم سے متاثر ہوئے تھے مگر آریوستو کے افسانے قرون وسطیٰ کے سورما شارلی مین سے متعلق ہیں جنہیں شاعر نے مذاق اور طنز سے کام لیا ہے۔ تاسو نے رزمیہ نظم لکھی ہے اور اس کا موضوع پہلی جنگ صلیبی میں فتح یروشلم ہے اس نے لاطینی شاعر ورجل کا طرز اختیار کیا ہے مگر کاتھولیکیت کے احیار سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ جسطرح اطالیہ کی بہترین نظمیں احیار علوم سے قبل لکھی گئی تھیں اسی طرح زمانۂ حال کے معصر اس زمانہ کے فن تعمیر کو بھی زمانۂ مابعد سے بہتر خیال کرتے ہیں نشاۃ جدیدہ کے فن تعمیر نے ایک زمانہ تک قرون وسطیٰ کی عمارتوں کو مات کردیا تھا مگر زمانہ حال میں یہ خیال ہے کہ اکثر امور میں ترجیح کی کوئی وجہ نہیں اطالیہ نے اپنے فنون لطیفہ سے تمام دنیا پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے کسی تعریف و تحسین کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ اطالیہ کے فنون لطیفہ عہد عتیق کے مرہون منت نہیں گو زمانۂ مابعد میں عہد عتیق کے مجسمات اور نظم کا ضرور کچھ اثر ہوا اور بعض تصویریں عہد عتیق کے واقعات اور اشخاص سے متعلق تھیں

تیرھویں صدی میں جو تصویریں اطالیہ میں موجود تھیں پچی کاری کے ذریعہ سے گرجوں میں بنی ہوئی تھیں۔ یہ زمانۂ سابق کے مصوروں کا کام تھا جن میں سے اکثر قسطنطنیہ اور دیگر ممالک شرقی کے رہنے والے تھے یہ تصویریں دلپذیر اور دلفریب ہیں مگر رنگین شیشے کے ٹکڑوں کی بنی ہوئی ہیں اس لئے اشکال میں تکلف ہے اور چہرے انسانی صورتوں کے مطابق کم ہیں۔ اطالیہ میں جو تصویریں ابتداءً کھینچی گئیں ان میں بھی یہ تکلف موجود ہے۔ لیکن تیرھویں صدی کے اواخر سے آئندہ ڈھائی سو سال میں بڑے بڑے مصوروں نے فن مصوری کو ترقی دی اور یورپ میں جمالیات کا ایک نیا احساس پیدا کر دیا ابتدائی تصویریں بلحاظ خصائص اور موضوع مذہبی تھیں کیونکہ کلیسا مصوروں کا بڑا مربی تھا۔ مگر مصوروں نے بہت جلد دوسرے موضوع آزادی کے ساتھ اختیار کر لئے انکی تصویریں بالکل صورت انسانی کے مطابق ہوگئیں اور عمیق ترین انسانی جذبات کا اظہار کرنے پر قادر ہوگئے۔ رنگ صورت اور صنعت کے ایسے محاسن ان کی تصویروں میں پیدا ہوگئے جو اب تک مفقود تھے اس جدید فن کے مرکز سی اے نا اور فلارنس تھے۔ وے نس کی تصویروں میں وہ چمک دمک تھی جس سے فلارنس کے مصور ناآشنا تھے۔ اطالیہ کی بلدیات جدید تحریک کی معاون تھیں اور مصوروں کی حوصلہ افزائی اور ان کی تصویریں خریدنے میں ایک شہر دوسرے شہر سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ ناموں اور تاریخوں کی زیادہ اہمیت نہیں ہے البتہ تین اشخاص بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ گیوٹو (۱۲۶۶ء تا ۱۳۳۶ء) اس تحریک کے بانیوں میں تھا۔ میکائیل اینجی لو (۱۴۷۵ء تا ۱۵۶۴ء) کی زندگی میں اطالیہ کا فن مصوری معراج کمال پر پہونچگیا۔ مجسمہ سازی اور مصوری دونوں فنون میں وہ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ تیسرا مصور رافائیل (۱۴۸۳ء تا ۱۵۲۰ء) تھا۔ ان کے بعد بھی مصوری کا سلسلہ اطالیہ میں جاری تھا مگر اس فن کی قدیم شان اور قوت جاتی رہی اور مصور تکلفات ظاہری میں پھنس گئے۔

مگر فن مصوری کی اس بے نظیر ترقی کے زمانے میں اطالیہ کی سیاسی اور تمدنی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ کسی قوم یا عہد کے اخلاقی خصائص کے متعلق صائب رائے قائم کرنا مشکل ہے مگر واقعات سے ظاہر ہے کہ چودھویں اور

پندرھویں صدیوں میں مذہب یا اخلاق کا اثر اہل اطالیہ پر بہت کم تھا۔ اطالیہ میں فریب سخت گیری اور بے رحمی کا زور تھا اور کامیابی کے لئے ہر قسم کے ذرائع استعمال کئے جاتے تھے۔ سیاسی تخیلات کی طرف خاص توجہ تھی قدیم خیالات متروک ہو رہے تھے۔ ماہرین سیاست میں سب سے بڑا نام میکیاوے لی (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء) کا ہے اور اس کے رسالہ "رئیس" کا اثر اس کے ہمعصروں اور عہد مابعد پر بہت کچھ ہوا ہے اس نے بہت غور و فکر سے کام لیا ہے مگر اس کی اصل تعلیم یہ ہے کہ مدبر اخلاقی اصول کے پابند نہیں ہو سکتے۔ اس کا قول ہے کہ "سلطنت کے قیام اور بقا کے لئے رئیس کو اکثر اوقات معاہدوں، نیک نیتی، انسانیت اور مذہب کے خلاف عمل کرنا چاہئے" سولھویں صدی کے مدبروں نے اس تعلیم پر عمل کیا اور اس کا خمیازہ بھگتا۔

طباعت کی نہ تو ایجاد اطالیہ میں ہوئی اور نہ ابتدائی ترقی اس ملک میں ہوئی۔ یہ کام کوہ آلپ کے شمال کے ممالک میں ہوا۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم کہ اس کا موجد کون ہے، گو اس کے دریافت کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ مگر پہلی ضخیم کتاب جو متحرک ٹائپ سے چھپی لاطینی بائبل ہے جو گوٹین برگ نے مینز میں ۱۴۵۵ء میں طبع کی۔ اس ایجاد کی پوری اہمیت کا ابتداءً احساس نہ ہو سکتا تھا اور اس نے ترقی نہایت آہستگی سے کی۔ مگر لوگوں کو یہ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس طریقے سے کتابوں کی نقل بہت جلد ہو سکتی ہے اور پھر پڑھنے میں بھی آسانی تھی جو قلمی کتابوں میں موجود نہ تھی۔ اصلاح مذہبی کے آغاز کے بعد لوگوں کو اس ایجاد کی دوسری خوبی معلوم ہوئی یعنی طباعت سے بمقابلہ ہاتھ سے لکھنے کے کتابیں اس قدر جلد چھپتی ہیں کہ ان کا انسداد ناممکن ہے۔ "مجلس انسداد الحاد" کی کامیابی میں جو موانع تھے ان میں طباعت اہم ترین ہے۔ اطالیہ میں پہلا مطبع ۱۴۶۷ء میں قائم ہوا اور چند سال کے بعد وے نس کے مشہور مطبع آل ڈاین نے یونانی اور لاطینی ادب کی کتابوں کی اشاعت شروع کی۔ انگلستان میں پہلی کتاب ۱۴۷۴ء میں چھپی۔

اہل یورپ کے دماغوں میں جب یہ جدید اور خطرناک خیالات موجزن تھے ایک نئی دنیا بھی دریافت ہو گئی۔ اس عہد انکشاف میں ۱۴۹۲ء میں کولمبس کا غرب الہند کا دریافت کر لینا ایک عجیب و غریب واقعہ تھا۔ بنی نوع انسان

کے دماغوں میں مدت سے یہ خیال تھا کہ بحر اقیانوس کے پرے ایک زرخیز اور خوشگوار ملک ہے اور یہ موہوم خیال اب صحیح ثابت ہوا۔ یہ دریافت کے بحری سفروں میں پہلا تھا۔ متعدد اشخاص نے بحری سفر کئے اور نئے نئے ممالک دریافت کئے جن کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ یونانیوں بلکہ ان کے قبل سے انسان کے دل میں ان ممالک کا حال دریافت کرنے کی کاوش تھی جن سے وہ واقف نہ تھے۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شمال کے برف سے ڈھکے ہوئے ملکوں میں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ نیل کا منبع کہاں ہے وغیرہ وغیرہ لیکن امریکہ کے دریافت کرنے کی وجہ موجہ یہ ہے کہ اہل یورپ ممالک شرق جانے کے لئے ایک نئی راہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ صلیبی جنگوں کا اصل منشا یہ تھا کہ مغربی یورپ کا قبضہ ان راہوں پر ہو جائے جنکے ذریعے سے ہند، چین اور خطا کی تجارتی اشیا یورپ آتی تھیں۔ تیرھویں صدی کے آغاز میں مارکو پولو کے عجیب وغریب سفرناموں سے ممالک مذکور کا کچھ حال معلوم ہوا۔ مگر ترکوں کی قوت کے بڑھنے سے ایشیا کی تجارتی راہیں دشوار گزار اور پرخطر ہو گئیں تھیں۔ اس لئے یورپ کے تجار دوسری راہیں تلاش کرنے لگے پرتگیزیوں نے شہزادہ ہنری ملاح کی سرکردگی میں افریقہ کے مغربی ساحل کے متعدد سفر کئے۔ افریقہ کے سواحل پر ہوا اکثر بند ہو جاتی ہے اور امراض کثرت سے ہیں مگر باوجود ان دقتوں کے ہلکے سواحل سے واقفیت حاصل کی گئی یہاں تک کہ ۱۴۸۶ء میں ڈائز راس امید پہنچا اور اسے معلوم ہوا کہ اس کے آگے دوسرے ممالک بھی ہیں ۱۴۹۸ء میں واسکوڈاگاما ہندوستان کے ساحل ملیبار پر پہنچا۔

واسکوڈاگاما کو کامیابی کوششوں کے ایک طویل سلسلہ کے اختتام پر ہوئی کولمبس کی حالت بالکل مختلف تھی۔ یہ شخص جی نوآ کا باشندہ تھا اور مدت سے وہ اس آرزو میں تھا کہ بحر اقیانوس میں براہ راست سفر کرے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح ہندوستان اور خطا، پہنچ جائے گا۔ کامیابی کے لئے اسے سب سے پہلے ایک مربی کی ضرورت تھی۔ شاہ ہسپانیہ نے بالآخر اس کی سرپرستی قبول کی۔ ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو بجالت امید وبیم وہ جزائر باہاما میں ایک ایسے سفر کے بعد لنگر انداز ہوا جو صفحات تاریخ میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ مگر تادم مرگ اس کا خیال

تھا کہ جو ملک اس نے دریافت کیا وہ ایشیا تھا۔ اسی خیال سے ان جزائر کا نام اس نے غرب الہند رکھا۔

دریافت کا سلسلہ ایک سو سال تک برابر جاری رہا اصل غرض یہ تھی کہ خطا کے زرخیز ملک تک پہنچیں جس کے لئے چھ راستے اختیار کئے گئے۔ مغرب کی طرف (۱) شمالی امریکا سے ہوکر (۲) جنوبی امریکا سے ہوکر (۳) خاکنائے پاناما کے قریب کسی خلیج تیں سے' اور مشرق کی طرف (۴) راس امید سے (۵) ایشیا کے شمالی سواحل سے ہوکر اور (۶) روس اور ایشیا میں خشکی کی کسی ایسی راہ سے جہاں ترکوں کا قرب نہ ہو۔ سولھویں صدی کے اختتام تک سب روئے زمین کے خاکے سے اہل یورپ واقف ہو گئے تھے' گو آسٹریلیا کا کسی کو وہم و گمان نہ تھا۔

نئی دنیا کے دریافت ہونے سے پرانی دنیا میں بے حد تغیرات ہوئے۔ اس دریافت کا پہلا اثر یہ تھا کہ تجارت بحیرۂ روم سے بحری راستوں پر منتقل ہو گئی جس سے وے نس اور جی نو آ تباہ ہوگئے اور لندن اور اینٹ ورپ مالا مال ہو گئے۔ اس کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ نئی دنیا میں ایسی قومیں آباد ہیں جو یورپ کے طریقۂ جنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو یورپ کی بحری سلطنتوں نے ان پر اپنا قدم جمانا شروع کیا اور آپس میں لڑنے لگیں اور اس کشمکش سے جو رقابتیں پیدا ہوئیں وہی یورپ کی آئندہ لڑائیوں کا باعث ہوئیں۔ ۱۴۹۳ء میں پوپ نے بغرض مصالحت امریکہ کے شمال سے جنوب تک ایک خط کھینچ دیا۔ اس خط کے مشرقی ممالک پرتگال کو دیئے گئے اور مغربی علاقے ہسپانیہ کو مگر تقسیم کا یہ طریقہ مناسب نہ تھا اور بہت جلد وہ زمانہ آگیا جبکہ پوپ کے فیصلے کی یورپ میں کوئی وقعت نہ رہی۔

نئی دنیا کا جو اثر پرانی دنیا پر ہوا' ایک وسیع مضمون ہے جسکے صرف دو ایک پہلوؤں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ لیکن پرانی دنیا کا جو اثر نئی دنیا پر ہوا' ایک ایسا مضمون ہے جس پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے مگر تاریخ میں اس سے

دردناک کوئی حادثہ نہیں ہے امریکہ میں بہت سی قومیں تھیں جنکے خاص محاسن تھے، ان میں سے بعض اعلیٰ درجے کا تمدن رکھتی تھیں۔ مگر یہ سب کی سب تباہ ہوگئیں یورپ کی تلوار اور بیماریوں نے لاکھوں کا خاتمہ کر دیا اور بقیۃ السیف ذلت وخواری کی زندگی بسر کرنے لگے۔ مگر بالآخر فاتحوں کا ضمیر انھیں ملامت کرنے لگا اور انھیں زندہ رکھنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ مسیحی مبلغوں نے انھیں یورپین تہذیب سے آشنا کیا۔ شمالی امریکہ میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ مگر جنوبی امریکہ میں دیسی باشندے زیادہ ہلاک نہیں ہوئے اور ہسپانیوں اور پرتگالیوں سے مل گئے جنوبی امریکہ کے تمدن کی بنیاد اب بھی انھیں پر ہے۔

حصّہ سوم

یورپ بزمانۂ حال

باب اول

اطالوی جنگ

اٹلی پر مکرر چڑھائی

سلطنت روما کی تباہی کے بعد سے اٹلی یورپ کی قومی سلطنتوں کا جولان گاہ بنا رہا وزی گاتھ Visigoth و فرنیک Frank قوموں کے حملے برابر ہوتے رہے۔ عرب اور نارمن لوگوں نے ساحل اٹلی پر آبادیاں قائم کر لی تھیں اس کے سوادسویں اور تیرھویں صدی کے درمیان شہنشاہی فوجیں بھی وقتاً فوقتاً جرمنی کی طرف سے یہاں آتی رہیں لیکن تیرھویں صدی کے آخر سے اٹلی کی سرزمین خارجی حملوں سے ایک حد تک محفوظ ہو گئی۔ باب آخر میں ہم نے بتایا ہے کہ اس زمانے میں اٹلی کی دولت و حشمت کو کس قدر فروغ حاصل ہوا۔ لیکن ذہنی و علمی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کی فوجی طاقت نے کچھ ترقی نہ کی۔ اس کے تمام شہر ایک دوسرے سے جنگ و جدال میں مصروف تھے اور اجیر سپاہی ان کی حفاظت کرتے تھے۔ اس طرح اٹلی دولتمند تو ضرور تھا مگر اس کے ساتھ غیر محفوظ تھا اور اس نے فرانس کی مضبوط اور متحدہ بادشاہی کے حملوں کا شکار بنا رہا۔

چارلس ہشتم شاہ فرانس

جب لوئی یازدہم فوت ہوا تو اس نے اپنے جانشین چارلس ہشتم کے لیے ایک ایسی سلطنت چھوڑی جو اپنے وسائل و ذرائع سے پوری

کی تمام سلطنتوں سے بڑھ کر کام لے سکتی تھی۔ فرانس کی رعایا جنگ جو تھی اور اس کی زبردست فوج تاج کی وفادار تھی۔ اس کے علاوہ انگلستان اور برگنڈی سے جدوجہد کے دوران میں اس نے یورپ میں اپنا توپ خانہ سب سے بہتر بنا لیا تھا۔ چارلس ہشتم نے اپنے باپ کا سا دماغ نہیں پایا تھا اور نہ اس میں کوئی غیر معمولی اوصاف ہی تھے۔ لیکن وہ اپنے وسائل قوت سے باخبر تھا اور کوئی نہ کوئی غیر معمولی کام کرکے اپنے آپ کو نامور بنانا چاہتا تھا اس لئے قدرتاً اس کی نظر اٹلی پر پڑی۔ فرانس کے شاہی خاندان نیپلز Naples میں کچھ حقوق کا دعویٰ تھا۔ اگرچہ یہ دعویٰ بالکل کمزور تھا لیکن یورشس کرنے کے لئے کافی حیلہ ہو سکتا تھا چنانچہ ۱۴۹۴ء میں میلان کے حکمران لوڈویکو Ludovico نے جس وقت فلارنس Florence کے حملہ سے حفاظت کے لئے فرانس سے امداد چاہی تو چارلس ہشتم اس حیلے سے اٹلی میں فوراً داخل ہوگیا۔

چارلس ہشتم کے ابتدائی فتوحات

اٹلی میں فرانس کی یہ پہلی یورشس کئی لحاظ سے خصوصیت رکھتی ہے فرانسیسی اطالوی شہروں کی دولت و خوشنمائی سے متحیر تھے۔ اور اطالوی فرانسیسی فوج کی کارگزاریوں اور چابک دستیوں پر انگشت بدنداں تھے۔ خصوصاً جس خوبی اور آسانی کے ساتھ وہ اپنے توپخانے سے کام لیتے تھے اہل اطالیہ اسے دیکھ کر دنگ تھے فرانسیسی فوجوں کے مقابلے سے اہل اطالیہ قاصر تھے۔ فلارنس Florence پیزا Pisa روم Rome اور نیپلس Naples یکے بعد دیگرے بلا مقاومت سر ہوگئے اور فرانس پورے جزیرہ نما کا مالک بن بیٹھا۔

توازن طاقت

لیکن دیکھتے ہی دیکھتے حالت بدل گئی اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں اس لئے کہ سولھویں صدی میں یورپ اور اٹلی کے اندر ایسے انقلابات برابر ہوتے رہے ہیں۔ یورپ کے "توازن طاقت" کا اصول معرض بحث میں لایا گیا۔ اس اصطلاح کا کوئی خاص مفہوم نہ تھا بلکہ اس کا یہ مفہوم سمجھا جاتا تھا کہ یورپ کی سلطنتوں کی معینہ قوت و طاقت میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ یعنے اگر کوئی سلطنت اپنا اقتدار و قوت بڑھاتی نظر آئے تو دوسری سلطنتیں ان کے مقابلہ و مزاحمت کے لئے آپس میں متحد ہو جائیں اور اسی وجہ سے اس زمانے کی پیچیدہ سیاست میں ہم بار بار دیکھتے ہیں کہ جب کبھی کسی سلطنت کو کوئی بڑی فتح نصیب ہوئی۔ تو فوراً ہی اس کے

مقابل دوسری طاقتیں متحد ہو کر آ کھڑی ہوئیں چنانچہ چارلس ہشتم کے شاندار فتوحات کا یہی نتیجہ ہوا کہ ایک خطرناک اتحاد اس کے خلاف قائم ہو گیا۔ اس اتحاد میں اطالوی سلطنتوں نے خاص طور پر شرکت کی اور ان کے ساتھ فرڈیننڈ شاہ اسپین اور شہنشاہ مکسیملین بھی شریک ہو گئے۔ یہ دیکھ کر شاہ چارلس ہشتم فوراً سمجھ گیا کہ اگر مینے واپسی میں توقف کیا تو اٹلی سے نکلنا محال ہو جائے گا اور جس آسانی کے ساتھ میں شہر میں در آیا ہوں اس آسانی کے ساتھ واپسی ناممکن ہو جائے گی۔ اس لیے نیپلس چھوڑ کر سرعت کے ساتھ وہ واپس چلا۔ ۱۴۹۵ء میں بمقام فارنووا Fornova کو اتحادی فوج اس کے مقابلے پر آئی۔ ایک سخت جنگ ہوئی جس میں فرانس کو فتح ہوئی اور اس کے بعد فرانسیسی فوج سلامتی سے واپس آ گئی۔ مگر فوج کی واپسی کے بعد سب مفتوحہ ملک چھن گیا اور فرانس کا رعب جاتا رہا۔ ۱۴۹۸ء میں جب چارلس ہشتم کی وفات ہوئی تو اس کے فتوحات کا کوئی حصہ باقی نہ تھا۔

لوئی دوازدہم شاہِ فرانس

چارلس ہشتم کا جانشین اس کا چچازاد بھائی لوئی دوازدہم ہوا اس کا ملکی انتظام انسانیت پر مبنی تھا اور اس وجہ سے کامیاب بھی ہوا چنانچہ اس کو "پدرِ ملک" کا لقب دیا گیا۔ خارجی معاملات میں اس نے اپنے پیشرو چارلس ہشتم کے اطالوی منصوبوں کی طرف توجہ کی۔ اور مثل دیگر فرانسیسی سلاطین کے جن کو اٹلی فتح کرنے کا خیال ہوا تھا اس نے بھی ابتداءً چند شاندار فتوحات حاصل کیے جو انجام کار ناکامی سے مبدل ہو گئے۔ وہ پہلے پہل میلان پر ۱۴۹۹ء میں حملہ آور ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ میلان پر اس کا کچھ خاندانی حق بھی تھا۔ میلان بلا کسی دشواری کے اس کے قبضہ میں آ گیا۔ اس کامیابی کی وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ وینس Venice نے رقابت کی وجہ سے میلان کے خلاف فرانس کو امداد دی تھی۔ اس کے بعد لوئی نے نیپلس کا رُخ کیا لیکن وہاں اس کو اس مشکل کا سامنا کرنا پڑا کہ فرانس کی طرح اسپین کو بھی نیپلس کے متعلق دعوٰی تھا اسپین کی بنائے دعوے فرانس کے مقابلے میں قوی بھی تھی۔

صلح غرناطہ Granada و تقسیم نیپلس Naples

اسی لیے اندیشہ تھا کہ نیپلس فرانس کے حملے کو اسپین کی فوجیں بھی روکینگی۔ اسی لیے صلح گرینڈا Granada کے ذریعے سے یہ مشکل حل کی گئی۔ فرانس اور اسپین دونوں نے نیپلس پر متحدہ حملہ کر کے آپس میں تقسیم کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ یہ تصفیہ اور نا چاقی نیپلس Naples اس

اتحاد کا مقابلہ کیا کر سکتا تھا۔ شہر پر قبضہ ہو گیا اور نیپلس کا تاجدار فرانس کی قید میں آ گیا لیکن حقیقی مشکل اب پیش آئی۔ باہمی تقسیم کرنے کا جو معاہدہ ہوا تھا وہ مبہم سا تھا۔ اس لئے اب یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ مفتوحہ ملک کا کونسا حصہ اسپین کو ملے اور کونسا فرانس کو۔ اور اسی بنا پر اب دونوں غارت گر سلطنتوں میں جنگ چھڑ گئی۔ مسلسل لڑائیوں میں فرانس کو شکست ہوتی رہی اور آخر کار نیپلس سے فرانسیسی نکال دیئے گئے۔

پوپ جولیس دوم Julius II

اس اثنا میں اطالوی سیاسیات میں ایک نئی طاقت یعنی پوپ جولیس دوم Julius II کی شخصیت نمایاں ہوئی۔ اب تک فرانسیسیوں کو الیگزنڈر (اسکندر) ششم Alexader VI سے نامعقول پوپ سے سابقہ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو فرانسیسیوں کا آلۂ کار بنا رکھا تھا لیکن جولیس دوم اور طرح کا آدمی تھا۔ اس کے خصایل پسندیدہ تھے اور وہ ایک سرگرم مدبر تھا۔ روحانی و مذہبی معاملات میں تو اسے کم دلچسپی تھی۔ لیکن علم و فن کا وہ مربی تھا۔ خصوصاً مائیکل آنجیلو Michael Angeto کا بڑا قدردان تھا۔ اس کے علاوہ اٹلی کے سیاسیات میں بھی نمایاں حصہ لینے کا اس کو اشتیاق تھا۔ پہلا معاملہ جس میں وہ دخیل ہوا اس کے لئے کچھ مفید ثابت نہ ہوا۔ وینس Venice کی دولت، اس کی حکومت کی استواری، اس کے مدبرین کی زیرکی و فراست اور اٹلی میں اس کے مقبوضات کی وسعت کا ذکر آ چکا ہے۔ اس کے خلاف جنگ کا کوئی سبب نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے مقبوضات پر فرانس، شہنشاہی اسپین فلارنس اور پوپ کی نگاہ تھی اس لئے ان تمام طاقتوں نے وینس کو فتح و برباد کرنے کے لئے

اتحاد کیمبرائے League Cambrai

کیمبرائے Cambrai کا نصرت انگیز اتحاد قائم کیا وینس ایسے زبردست اتحاد کا کیا مقابلہ کرتا۔ اس کی فوج شکست کھا گئی اور خشکی پر جو اس کے مقبوضات تھے اسی کے ہاتھ سے جاتے رہے اس فتح کے بعد متحدین میں خود نزاع پیدا ہو گئی اس وقت جولیس دوم کو احساس ہوا کہ اطالوی زمین پر دوسرے ملک والوں کو بلا کر حملہ کرا دینے میں اس نے کیا غلطی کی تھی۔ کیونکہ خود کلیسہ کی مملکتوں کے لئے غیر ملکیوں کا درود مضر تھا۔ اس اثنا میں اٹلی کی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے تعلقات آپس میں بدلتے رہے گو عموماً اصول یہی تھا کہ کمزور طاقتیں قوی سلطنتوں کے مقابل متحد ہوتی رہیں۔

اتحاد مقدس

سنہ ۱۵۱۱ء میں جولیس نے فرانسیسوں کو اٹلی سے خارج کرنے کے لئے ایک اتحاد مقدس قائم کیا۔ وینس۔ اسپین اور شہنشاہ کو فرانس کے خلاف متحد ہونے کی ترغیب دی گئی۔ کچھ دن بعد انگلستان بھی اس مقدس اتحاد میں شریک ہوگیا۔ شروع میں فرانس اپنے مخالفین کا مستعدی اور کامیابی سے مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن سنہ ۱۵۱۳ء میں قلعہ میلان کے سوا اس کے بقیہ اطالوی مقبوضات چھن گئے اور خود اس کے ملک میں انگلستان کے حملے سے اس کو نقصان پہنچا۔ لیکن اس وقت فرانس کی سفارتی کارروائیوں سے یہ اتحاد درہم برہم ہوگیا اور سنہ ۱۵۱۴ء میں لوئی کے زمانہ حیات ہی میں صلح ہوگئی۔

جنگ مارگ نینو Marignano سنہ ۱۵۱۵ء

اس کا جانشین اس کا ابن عم فرانسس اول Francis I ہوا۔ فرانسس نوعمر۔ جوشیلا اور فوجی امتیاز کا جویا تھا۔ اس نے فوراً ہی عزم کیا کہ فرانسیسی مکرر اطالوی مہم پر روانہ ہوں۔ اس کی اعانت پر وینس Venice کے سوا کوئی نہ تھا۔ اسپین۔ شہنشاہ اور پوپ اس کے مقابلے کے لئے متحد ہوگئے۔ فرانسس اول نے کوہ الپس Alps طے کرکے مارگ نینو Marignano میں دو دن کے کشت وخون کے بعد اپنے غنیم کو شکست فاش دی اس واقعہ کو اس کے خوشامدی ہنی بال Hannibal کے کارنامے سے کم نہ سمجھتے تھے۔ اس جنگ میں یہ بات خاص طور پر قابل فخر سمجھی جاتی تھی کہ فرانس کی پیادہ فوج نے سوِیس Swise قوم کے ابیسر سپاہیوں کو نیچا دکھایا۔ اس لڑائی سے اہم نتائج مترتب ہوئے اول تو فرانس کو سوئیس قوم سے یہ عہد کرلینے کا موقع ملگیا کہ ان کی فوج آئندہ کبھی فرانس کے خلاف نہ لڑیگی۔ دوسرے یہ کہ پوپ سے ایک میثاق کی شکل پیدا ہوگئی Concordat, فرانس پوپ کی وہ رقمیں ادا کرد یگا جن کے ادا کرنے سے اسے ایک سو سال سے انکار تھا۔ اور اسی کے معاوضے میں شاہ فرانس کو تمام اعلیٰ مذہبی عہدہ داروں کی نامزدگی کا اختیار دیا گیا۔ اس سے پوپ کی دولت اور فرانس کی قوت وجبروت میں اضافہ ہوگیا۔ تقریباً یہی تعلقات فرانس کی حکومت اور کلیسہ اور پوپ کے درمیان اٹھارھویں صدی کے آخر تک قائم رہے۔

شہنشاہ چارلس پنجم کی تخت نشینی

لیکن عین اس وقت فرانس کے مقابل ایک نئے اتحاد اور ایک نئے غنیم کے ظہور سے صورت حال بدل گئی۔ سنہ ۱۵۱۹ء میں دست اجل نے

شہنشاہ میک سی می لین Maxmilian کی بے اثر و عجیب ہستی کو سیاسیات یورپ کے صفحے سے مٹا دیا۔ سلطنت کی جانشینی کا تصفیہ انتخاب کے ذریعے سے کیا جاتا تھا اور اس وقت اس کا حل ذرا دقت طلب معلوم ہوتا تھا۔ خصوصاً جرمنی کے مذہبی مناقشات کے باعث صدیوں سے شہنشاہ جرمن نسل کا ہوتا چلا آیا تھا لیکن ایسا کوئی ضابطہ نہ تھا کہ کسی دوسری قوم کا کوئی فرد شہنشاہ نہ ہو سکے اس لئے فرانسس اول بھی اس کا امیدوار ہوا۔ دوسری طرف میک سی می لین اور میری رئیسۂ برگنڈی Burgundy کا پوتا چارلس شاہ اسپین کھڑا ہوا۔ چارلس کو نسبی تعلق کی وجہ سے اسپین کے علاوہ برگنڈی کی ریاست اور خاندان ہیپس برگ Hapsburg کے مقبوضات بھی مل گئے تھے۔ فرانسس اول کے حق میں یہ بات مفید تھی کہ لوگ سمجھتے تھے کہ اگر چارلس شہنشاہ منتخب ہوا تو "توازن قوت" کا اصول درہم و برہم ہو جائیگا۔ کیونکہ ایک ہی شخص کے قبضے میں یورپ کی سب سے بڑی سلطنت آجائے گی جو کہ شارلیمین Charlemagne کے زمانے سے اب تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ہر دو فریق نے رشوت دہانی شروع کی لیکن ۱۵۱۹ء میں جب فیصلۂ آخر کے لئے یہ معاملہ پیش ہوا تو چارلس بغیر کسی دشواری کے منتخب ہو گیا اور شہنشاہ چارلس پنجم کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا گیا۔

فرانسس اول Francis I اور چارلس پنجم کی لڑائی

لوگوں کو اندیشہ تھا کہ رقابت کی وجہ سے فریقین نبرد آزمائی ضرور کریں گے کیونکہ اس زمانے میں جنگ ایک معمولی سی بات تھی اور لڑائی کی ذمہ داری کا احساس لوگوں کو اس قدر نہ تھا جتنا کہ اب ہے دونوں فریق دوسری سلطنتوں سے اتحاد پیدا کرنے کے خواہاں تھے چارلس اول کا انگلستان طرفدار ہو گیا ۱۵۲۲ء میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی لیکن فیصلہ کن واقعہ ۱۵۲۵ء میں پیش آیا۔ فرانسس نے اٹلی پر اس امید میں حملہ کر دیا کہ دس سال قبل جیسے فتوحات اسے نصیب ہوئے تھے پھر حاصل ہو جائیں گے۔

جنگ پیویا Pavia

پیویا Pavia کا محاصرہ کیا گیا اور فتح کے آثار نمایاں تھے کہ عین موقع پر جرمنی سے ایک تازہ دم فوج ڈیوک بوربن Bourbon کی سرکردگی میں آ پہنچی جو فرانسس ہی کا باجگذار تھا گر باغی ہو گیا تھا۔ اب جو لڑائی ہوئی تو

فرانسس شکست کھا گیا اور آخر کار تلوار ڈال دی اور اپنے آپ کو غنیم کے حوالے کر دیا۔ ایک خط میں اس نے لکھا تھا کہ "جان اور عزت کے سوائے کچھ باقی نہ رہا" چنانچہ وہ مقید کر کے اسپین روانہ کر دیا گیا اور وہاں ۱۵۲۶ء میں صلح نامہ میڈرڈ Madrid پر جبراً اس سے دستخط کرائے گئے۔ اس صلح نامے کی رو سے فرانس کا ایک بڑا حصہ دیدینا پڑا جس سے فرانس کی عظمت تباہ ہو گئی۔

چارلس کی اس عظیم فتح پر پھر یورپین سلطنتوں نے اس کے خلاف ایک جتھا قائم کیا۔ لیکن مالی مشکلات کے باعث پھر بھی وہ اپنے غنیم کو فنا کر دینے کے لئے دوسرا حملہ نہ کر سکا صلح نامہ میڈرڈ کی پابندی سے فرانس نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ جبراً لکھایا گیا تھا اور اسٹیٹس جنرل سے مشورہ نہیں ہوا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر جنگ شروع ہو گئی۔ ۱۵۲۷ء میں ایک مشہور واقعہ پیش آیا گو براہ راست اس کا اثر فرانسس اور چارلس کی لڑائی پر نہیں پڑا۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ چارلس کی فوج اٹلی میں فتح یاب تو ضرور ہوئی تھی مگر ان کی تنخواہیں ادا نہیں ہوئیں اس وجہ سے فوج نے بغاوت شروع کر دی جیسا کہ سولہویں صدی میں اکثر ہوا کرتا تھا۔ باغی سپاہی اٹلی کے دولتمند شہروں کو لوٹ کر اپنا پیٹ بھرنا چاہتے تھے، اور جب فلارنس پر ان کی یورش ناکام رہی تو انھوں نے روما کا رخ کیا۔ شہر کی حفاظت کا انتظام معقول نہ تھا

روما کی تباہی وغارتگری	پوپ کلمنٹ ہفتم Clement VII کا اسیر تھا ان کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گیا۔ اور شہر اس بری طرح سے غارت کیا گیا کہ وسی گاتھ وانڈال لمبارڈ Lombard Vandal اور فرینک قوموں

نے اسے اس طرح تباہ نہیں کیا تھا۔ تاریخ انگلستان پر اس واقعہ کا بہت اثر پڑا کیونکہ پوپ کلمنٹ ہفتم چارلس پنجم کی قید میں تھا اس لئے وہ ہنری ہشتم (شاہ انگلستان) کی اس درخواست کا فیصلہ نہ کر سکتا تھا جو اس نے ارگان Arragon کی شہزادی کیتھراین Catherine کے عقد کی تنسیخ کے لئے پیش کی تھی۔ اسی واقعے سے انگلستان میں مذہبی اصلاحات کی ابتدا ہوئی۔ لیکن فرانسس اور چارلس کی لڑائی پر روما کی تباہی کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ اس کے بعد عارضی وقفوں کے ساتھ ساتھ لڑائی جاری رہی۔ اور فارنوو Fornova مارگنانو Marignano پیویا Pavia کی لڑائیوں کی طرح کوئی اہم جنگ نہ ہوئی۔ اب ہم جنگ کی صرف اہم منزلوں کا ذکر کریں گے۔

جرمنی کی مذہبی اصلاح اور جنگ کا تعلق

واضح رہے کہ اس کے بعد سے جرمنی کی اصلاحی تحریک کا اثر جنگ پر نمایاں ہے۔ جب کبھی چارلس کو فرانس کی جنگ سے فرصت ملتی تھی تو وہ اپنے مذہب کے ان مخالفین کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا جو جرمنی میں پیدا ہو گئے تھے۔ دوسری جانب فرانسس گو خود مذہباً کاتھولیک تھا مگر وقتاً فوقتاً پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلقات پیدا کرتا رہا تاکہ اس کے غنیم کی مشکلوں میں اضافہ ہوتا جائے۔ اگر فتنۂ جرمنی نہ اٹھا ہوتا تو غالباً فرانس کا قلع قمع ہو جاتا اور اگر فرانسیسی جنگ نہ ہوتی تو جرمنی میں پروٹسٹنٹ فرقے کو فروغ حاصل ہونے میں دشواری ہوتی۔

آخر کار ۱۵۲۹ء میں بمقام کیمبرائے Cambrai خدا خدا کر کے صلح کی ایک صورت نکلی جو بمشکل سات برس تک قائم رہ سکی۔ چنانچہ ۱۵۳۶ء میں میلان کا تخت خالی ہوا تو فرانسس وچارلس دونوں اس کے مدعی ہوئے چنانچہ پھر جنگ چھڑ گئی۔ گو فریقین میں سے کسی نے کسی قسم کی مستعدی ظاہر نہیں کی۔ ۱۵۳۸ء میں بمقام نیس Nice ایک عارضی مصالحت طے پائی اور دس سال تک جنگ ملتوی ہو گئی یہ بھی طے ہوا کہ جس سلطنت نے جو ملک فتح کر لیا ہے وہ اسی کے قبضے میں چھوڑ دیا جائے۔ لیکن یہہ مصالحت صرف چار سال تک باقی رہی۔ اور ۱۵۴۲ء میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ چارلس نے میلان اپنے بیٹے کو دیدی تھی اور یہ حیلہ (خواہ حقیقی اسباب کچھ ہی کیوں نہ ہوں) جنگ کے لئے کافی سمجھا گیا۔ فرانسیسیوں کو پھر اٹلی میں فتوحات نصیب ہوئے مگر یورپ کے دوسرے حصوں میں فریقین کی توجہ منعطف ہونے سے کریپی Crespy کی صلح نے جنگ کا خاتمہ کر دیا اور اس مرتبہ بھی فریقین اپنے مفتوحات پر قابض رہے۔

ہنری دوم شاہ فرانس

۱۵۴۷ء میں فرانسس اول کا انتقال ہو گیا اس کا جانشین اس کا بیٹا ہنری دوم ہوا اس زمانے سے فرانس اور اسپین کی جنگ پر جرمنی کی پروٹسٹنٹ تحریک کا اثر اور بھی نمایاں ہو گیا اب بھی ایک مستقل صلح ہونے تک اس جنگ کے مختلف منازل کا بغور معاینہ مناسب ہوگا۔ جرمنی کے خلفشار سے ۱۵۵۲ء میں جنگ شروع ہو گئی اور ہنری دوم باوجودیکہ وہ خود پکا کاتھولیک تھا فوراً جرمنی کے پروٹسٹنٹ فرقے کے سرداروں کے ساتھ شریک ہو گیا۔ چارلس کو

جرمنی میں سخت ناکامی ہوئی جس کا تذکرہ آئندہ باب میں آئیگا۔ لیکن فرانسیسی سرحد پر اس کو فتوحات حاصل ہوتے رہے جس سے اُس ناکامی کی تلافی کی امید ہو گئی۔ اس نے شہر میٹز Metz کا جو فرانسیسیوں کے قبضے میں تھا محاصرہ کر لیا اور فتح عنقریب ہونے والی تھی کہ موسم کی خرابی اور تازہ دم فرانسیسی فوج کے وارد ہونے سے اس کے توقعات مایوسی سے متبدل ہوگئے اور آخرکار کثیر نقصان کے ساتھ اس کو واپس ہونا پڑا۔ اس کی زندگی کی یہہ آخر مہم ثابت ہوئی۔

چارلس پنجم کی دست برداری

صحت کی خرابی ضعف و مایوسی کے باعث مختلف سلطنتوں کے تخت و تاج سے دست بردار ہو جانے کا اس نے تہیہ کر لیا اور مستعفی ہو کر کسی خانقاہ میں روحانی سکون کے لئے پناہ گزیں ہونے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے اسے خیال تھا کہ اپنی وسیع سلطنت اپنے بیٹے فلپ Philip کو دیدیے۔ لیکن جرمنی کی شورش سے یہہ ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ شہنشاہ کا لقب اور آسٹریا کے ممالک اس کے بھائی فرڈینینڈ کو ملے اور اسپین، نیدر لینڈ netherlands اٹلی اور نئی دنیا کے وسیع مقبوضات اس کے بیٹے فلپ کے حصے میں آئے۔ چارلس کی خانقاہ

فلپ دوم کی تخت نشینی Philip II

یوست Youste میں گوشہ نشینی کے بعد فلپ ہی پر جنگ کا بار پڑا۔ خانقاہ میں بھی چارلس جنگ کی رفتار کو دلچسپی اور غور سے دیکھتا رہا۔ فلپ کو اہم فتوحات نصیب ہوتے رہے۔ فرانسیسیوں کو اٹلی میں شکست ہوئی۔ اور ۱۵۵۷ء میں فرانس کے شمال میں بمقام سینٹ کوئینٹن St. Quentin فرانسیسی فوج کچل دی گئی۔ یہہ ایسی کامل فتح تھی کہ چارلس خانقاہ میں ہر وقت اس بات کا منتظر رہتا تھا کہ اسی کے بیٹے کے پیرس میں داخل ہو جانے کی اطلاع آجائے لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ فرانسیسیوں کی ایک ہی فتح پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۵۵۸ء میں فرانسیسیوں نے انگریزوں سے کیلے Cailais چھین لیا۔ ملکہ میری Marry کا فلپ سے عقد ہونے سے انگریز اسپین کے حلیف ہو گئے تھے۔

صلح کیٹو کیمبریسیس Catean Cambresis

۱۵۵۹ء میں کاتو کام برے سی کی اہم صلح طے پائی جس کی رو سے اٹلی میں ہسپانیہ والوں کا قبضہ بحال رہا اور نیپلس و میلان دونوں پر ان کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ جوئیس دوم کہا کرتا تھا کہ اٹلی کی سرزمین میں فرانسیسیوں کا وجود گھانس پھونس کی طرح ہے۔ جسے ہر وقت اکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔

لیکن ہسپانیہ اس پودے کے مانند ہے جس کی جڑیں بہت دور تک زمین میں پہنچ گئی ہوں۔ چنانچہ اب جو تصفیہ ہوا اس سے جولیس Julius کے قول کی تصدیق ہوگئی۔ اٹلی غیر ملکیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اسی زمانے میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسی انجام پر متاسف تھے۔ آغاز صدی میں مکیاویلی Machiavelle نے اٹلی کے متعلق لکھا تھا کہ "یہاں نہ کوئی سردار ہے نہ کوئی انتظام۔ تباہی و بربادی کے آثار ہر طرف پائے جاتے ہیں۔ ملک غارت ہو چکا ہے۔ مختصر یہ کہ" ہم ہر طرح کی ذلت" سے دوچار ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ" یہ غیر ملکی حکومت ہم سب کو ناگوار معلوم ہوتی ہے" لیکن اس غیر ملکی حکومت سے آزاد ہونے کے لیے اٹلی میں اتحاد جذبۂ قومی کی ضرورت تھی جو تین صدی کے بعد حاصل ہوا فرانس کو بھی کچھ نفع حاصل ہوا۔ شمال و مشرق کے تین اضلاع میٹز Metz ٹول Toul ورڈن Verdun فرانس کو مل گئے تھے۔ اور ان پر قبضہ ہونے کے باعث دو صدیوں کے بعد فرانس کو پورے صوبے لورین Lorraine پر قابض ہوگیا۔ اور جب فلپ Philip کی بیوی میری Mary کا انتقال ہو گیا تو اس نے فرانس کی شہزادی الزبیتھ Elizabeth سے عقد کرنا چاہا جس سے امید ہوگئی کہ اب دونوں سلطنتیں متحد ہو سکینگی۔

فرانس و اسپین کے مابین "دو صد سالہ جنگ"

یہ صلح بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اس سے فرانس اور اسپین میں وہ اتحاد نہ قائم ہو سکا جس کی لوگوں کو امید تھی بلکہ ڈیڑھ سو برس تک دونوں سلطنتوں میں چھیڑ چھاڑ جاری رہی جس کا مستقل اور نمایاں اثر یورپ کی سیاست پر پڑا۔ سولھویں اور اٹھارھویں صدی کے درمیان فرانس اور اسپین میں جو جنگ جاری تھی وہ انھی معنوں میں دو صد سالہ جنگ" کے نام سے موسوم ہونے کے قابل ہے جس طرح اس سے پہلے فرانس اور انگلستان کی لڑائی "جنگ صد سالہ" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے فرانس اور اسپین میں اب بھی عداوت قائم تھی۔ لیکن اس کے بعد سے مذہبی جد وجہد کا اثر اس کے باہمی تعلقات پر اور بھی زیادہ نمایاں تھا۔ اطالوی جنگ کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور اب مذہبی جنگ کا آغاز

ہو رہا تھا اور اس کا دوران صلح کا تو کام بڑے سی سے صلح ویسٹ فیلیا Westphalia تک رہا جو ۱۶۴۸ء میں ہوئی۔

باب دوم

جرمنی میں مذہبی اصلاح

مارینگنانو Maregnano کی لڑائی کے دو سال بعد جرمنی میں ایک معمولی واقعے نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالدی جس کا اثر یورپ پر اطالوی جنگ سے بھی زیادہ ہوا۔ ۱۵۱۷ء میں پاپائی اقتدار و دعاوی کے خلاف لوتھر Luther جنگ آزمائی کے لئے خم ٹھونک کر کھڑا ہوگیا۔

لوتھر Luther لوتھر ایک کسان کا لڑکا تھا اور بڑی جد جہد کے بعد وٹن برگ Wittenberg کی جدید البناء جامعہ کا پروفیسر الٰہیات مقرر ہوا تھا۔ آگستینی سلسلہ کا وہ ایک درویش تھا۔ اس نے انجیل کا لاطینی ترجمہ بغور مطالعہ کیا تھا اور سینٹ آگسٹین St. Augustine کی تصنیفات زیر مطالعہ رکھتا تھا۔ یہ وہی تصنیفات ہیں جو کیتھلک فرقہ کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوئیں۔ نو سال تک وٹن برگ میں پروفیسر رہا اور اس اثناء میں کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے قیاس کیا جاتا کہ وہ بھی بحث مباحثہ میں زبردست حصہ لینے والا ہے۔ لیکن ۱۵۱۷ء میں پوپ کا ایک فرستادہ تیتزل Tetzel نامی اس جوار میں آیا۔ یہ شخص روم میں سینٹ پیٹر St. Peter کے نام سے ایک کلیسہ تعمیر کرانے کے لئے چندہ لینے آیا تھا۔ چندہ وصول کرنے کے لئے اس نے لوگوں کے سامنے معافی کے پروانوں کی

تیتزل Tetzel پروانہ جات معافی فروخت شروع کی۔ یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ گر پھر بھی اس کی تائید و تحسین کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے لیکن تیتزل Tetzel کے افعال کی کوئی توجیہ یا صفائی پیش کرنا ممکن نہیں وہ

جاہل کسانوں کو باور کراتا تھا کہ اگر وہ چندہ دیں گے تو اس کے معاوضہ میں ان کے اعزا و احباب دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیں گے اکثر لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ ان پروانہ جات معافی کی فروخت سے اہل ملک کو گناہ کرنے کی ترغیب دی جاری ہے اور اس کے بُرے اخلاقی نتائج پر بہت سے اعتراضات ہوئے۔ لوتھر کی آتش غیظ مشتعل ہو رہی تھی اور آخر کار ۱۵۱۷ء میں پروانہ جات معافی کے متعلق اس نے پچانوے اعتراضات لکھ کر وٹن برگ کے صدر کلیسے کے پھاٹک پر لگا دئے۔ اپنے اعتراضات کی تائید میں دلائل بھی پیش کرنے کی اس نے آمادگی ظاہر کی۔

وہ قوتیں اور حالات جو مذہبی اصلاح کے موافق تھے

اول اول تو اس واقعے میں کوئی خاص اہمیت نہ معلوم ہوئی کیونکہ پوپ کے اقتدارات کے خلاف اس سے بھی زیادہ سخت اور اصولی اعتراضات ہس (Huss) وکلف (Wycliffe) نے کئے تھے مگر ان دونوں کی تحریکیں یا تو فنا ہوگئیں یا دبا دی گئیں۔ بخلاف اس کے لوتھر کی تحریک کو یوروپین سوسائٹی میں نمایاں کامیابی اور استحکام نصیب ہونا لکھا تھا۔ اس کے ذہن نشین کرنے کے لئے یورپ اور جرمنی کے حالات پر ایک نظر ڈالنی پڑےگی کیونکہ یہ مذہبی تحریک یوں تو سیدھی سادی معلوم ہوتی تھی لیکن جرمنی کی معاشری و سیاسی حالت اور یورپ کے بین الاقوامی تعلقات کی وجہ سے پیچیدہ ہوگئی۔ لوتھر کی تحریک کو سازشوں۔ سیاسی رقابت و چالبازیوں اور خانہ جنگیوں و بین الاقوامی لڑائیوں کی وجہ سے جو آئندہ صدی میں پیش آتی رہیں بہت کچھ امداد ملی اور یہی اسباب اس کی کامیابی کے ہوئے۔

چارلز پنجم

یورپ کی حالت بیان کرنے کے لئے ہم کو پھر انھیں واقعات کی تکرار کرنا پڑے گی جو گزشتہ باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ۱۵۱۹ء میں چارلز شاہ اسپین و برگنڈی کا شہنشاہ منتخب ہوا اس کا شمار دنیا کے سلاطین اعظم میں نہیں ہوتا اور نہ اس کا شمار یورپ کے مشہور مدبروں یا سپہ سالاروں میں ہے۔ بعض لوگ اس کو پروٹسٹنٹ فرقہ اور انجیل کی صداقت کا بدترین دشمن سمجھتے تھے اب بھی بعض لوگوں کا یہی خیال ہے لیکن اس کی سیرت اور اس کی حالت اور اس کے طرز عمل کو انصاف اور بے تعصبی سے دیکھا جائے تو اصل واقعہ کچھ اور ہی معلوم ہوگا۔

اس کی مشکلات ناکامی و کامیابی

اس کی سلطنت ایسی وسیع تھی کہ شارلیمین (Charlemagne) کے بعد سے اب تک کوئی سلطنت ایسی قائم نہوئی تھی۔ یہ سلطنت متعدد حصوں میں منقسم تھی جو ایک دوسرے سے بالکل علٰحدہ و بے تعلق تھے اور ہر ایک کا سیاسی نظام عمل بھی جداگانہ تھا۔ نیدرلینڈز (Netherlands) کی سترہ ریاستیں ہر ایک اپنا اپنا جدا نظام حکومت رکھتی تھیں خود اسپین میں کاستیل (Castile) اراگان (Arragon) ولنشیا (Valencia) کیٹالونیا (Catalonia) کے دساتیر اور پارلیمنٹ علٰحدہ علٰحدہ تھے۔ اس کے اطالوی مقبوضات بھی اسپین اور ایک دوسرے سے بے تعلق تھے اس کے لئے سب سے اہم مسئلہ اپنے مقبوضات کو یکجا کرکے ان میں فروغ دینا تھا۔ جرمنی میں اس کی ناکامی اس کی حکومت کے دوسرے محاسن پر پردہ نہیں ڈال سکتی اپنے امریکن مقبوضات میں اس نے نہایت عمدہ اور صلاحیت آمیز طرز حکومت جاری کیا۔ افریقہ کے شمالی ساحل پر مسلمانوں کی قوت توڑنے میں اس نے بہت حصہ لیا اور اپنے نیدرلینڈز کے مقبوضات میں اتحاد قائم کرنے میں بھی ایک حد تک کامیاب ہوا۔ جرمنی میں بے شک اس کو بالکل ناکامی ہوئی لیکن وہاں بھی اس کے مقاصد بتذل و قابل اعتراض نہ تھے وہ فطرتاً و عقیدتاً پکا کیتھلک تھا اور اس کی تعلیم و تربیت بھی ایسی ہی ہوئی تھی لوتھر کی تحریک کے مذہبی پہلو سے نہ اس کو ہمدردی تھی نہ وہ اس کو سمجھتا تھا لیکن اس تحریک سے جرمنی میں بدامنی کا جو اندیشہ تھا اس کے دفعیہ کا وہ عمر بھر کوشاں رہا اور جرمنی میں امن و سکون قائم کرنے کا خواہاں تھا مذہبی معاملات میں وہ مجنونانہ متعصب نہ تھا۔ اسے امید تھی کہ لوتھر کی تحریک خود بخود رفتہ رفتہ فنا ہوجائے گی۔ اسے بھروسہ تھا کہ کسی مصالحت کے ذریعہ امن و سکون قائم ہوجائیگا وہ منتظر تھا کہ کانسٹنس (Constance) یا بیسل (Basel) کی کونسلوں کی طرح کلیسہ کی کوئی زبردست کونسل ان مذہبی مناقشات کا تصفیہ کردیگی۔

لوتھر (Luther) کا اثر

وہ اسباب جن کی بدولت لوتھر کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ حسب ذیل ہیں پہلے تو خود لوتھر کی ذاتی ذہانت اور جدت کا خاص اثر تھا۔ لوتھر میں بلند ہمتی بھی تھی۔ اور اسے اپنے عقاید کی تلقین میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ جرمنی کے اکثر لوگ یقین کرنے لگے کہ لوتھر کی

بدولت وہ حقیقت سے آشنا ہوگئے تھے۔ جو اب تک کیتھلک فرقہ کے توہمات و خرافات نے چھپا رکھی تھی۔ یہ بھی ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اگر اس کی نشر و اشاعت کی جائے تو تمام دنیا اس کو تسلیم و قبول کریگی اور بجز نالائق اور حریص لوگوں کے کوئی اس سے انکار نہ کرے گا۔ اس طرح جرمنی میں مذہب۔ سیاسیات۔ اور معاشرت کے مستقبل کا ایک شاندار تصور پیدا ہوگیا۔ اس تصور کو واقفیت کا جامہ پہنانے میں بہت کچھ مایوسی ہوئی لیکن اس تحریک کی رفتار سمجھنے کے لئے اس کے متعلق جو شدت جوش اور جو توقعات رکھی گئیں تھیں ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جرمنی کی سیاسی حالت اس تحریک کی کامیابی کے لئے موزوں تھی۔ کہنے کو تو سلطنت تھی لیکن حقیقت میں جرمنی خود مختار ریاستوں کا ایک مجموعہ تھا جن کو

جرمنی کے مختلف حصے

مرکزی حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ شہنشاہ بذات خود بلا اتمزاج و رضامندی دیگر ریاستہائے جرمنی محاصل میں اضافہ یا فوج کی بھرتی یا جنگ کا اعلان نہ کرسکتا تھا۔ اُن کی رضامندی حاصل کرنا ایک امر محال تھا۔ یہ سچ ہے کہ چارلس کی سلطنت کے دوسرے حصوں میں یہہ قضیے نہ تھے۔ اتنی وسیع سلطنت کے کسی صوبہ میں وہ ایسا بے دست و پا نہیں تھا جیسا جرمنی میں اور اگر اس کو دوسرے مشاغل سے فرصت ملتی تو وہ اسپین۔ اٹلی۔ نیدرلینڈ اور آسٹریا سے فوج جمع کرکے لوتھر کے معتقدین کا قلع و قمع کردیتا لیکن اس کے احوال نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ فرانس سے لڑنے میں گزر گیا۔ پھر

چارلس پنجم کے مشاغل کی کثرت

نیدرلینڈ میں ایک شورش برپا تھی حتی کہ خود اسپین بھی ہمیشہ اطاعت گزار نہ رہا۔ شمالی آفریقہ میں مسلمانوں سے بھی اس کو مقابلہ کرنا پڑا۔ آسٹریا میں جہاں اس کا بھائی اس کی جانب سے حکمراں تھا ہر وقت ترکوں کے خوفناک حملوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ ان وجوہ سے اس کو بہت کم موقع ملا کہ جرمنی کا ہنگامہ فرو کرتا۔ یہہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ لوتھر کی تحریک

پروٹسٹنٹ تحریک جرمنی کے قومی جذبہ کے موافق تھی۔

صرف مذہبی کشش نہیں رکھتی تھی بلکہ جرمنی کے ایک بڑے طبقہ میں غیر ملکی حکمراں کے خلاف ایک قومی جذبہ بھی اس نے پیدا کردیا تھا جرمنی میں فرانس۔ اسپین و انگلستان کی طرح ایک ہی قوم نہ تھی

لیکن پھر بھی ملکی معاملات میں ایک غیر ملک کی دست اندازی سب کو ناگوار تھی۔ چارلز سے لوگ اس وجہ سے متنفر تھے کہ وہ ہسپانوی تھا اور پوپ سے اس لئے کہ وہ اطالوی تھا۔ لوتھر کے مریدوں کا حلقہ اس لئے، وسیع ہوگیا کہ وہ جرمنی میں جرمن لوگوں کی حکومت چاہتا تھا اس لئے لوتھر کے فرقے کو اپنے اعتقاد کی وجہ سے بھی تقویت حاصل تھی اور اسی کے ساتھ اس کے دوسرے معاملات و مشکلات کی وجہ سے چارلز پنجم کی وسیع سلطنت اس کے مقابل کوئی قطعی کارروائی بھی نہیں کر سکتی تھی یہی سبب ہے کہ تیس سال تک جرمنی میں (پروٹسٹنٹ) تحریک بغیر کسی فوجی مقابلے کے سرسبز ہوتی رہی۔ مداخلت کرنے کا ذکر اکثر ہوتا رہا۔ اور سلطنت کی مذہبی مجالس نے اس نئی تحریک کو ناجائز بھی قرار دیا لیکن لوتھر کی وفات تک تلواریں نیام سے نہیں نکلیں۔

۱۵۱۷ء میں لوتھر صرف پروانہ جات معافی کی فروخت پر معترض ہوا تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں مباحثہ کا دائرہ وسیع ہوگیا اور لوتھر کو معلوم ہوا کہ کلیسیہ روما سے اس کی مخالفت اہم اور اساسی اصول سے متعلق تھی حالانکہ پہلے اس نے یہ نہیں سمجھا تھا

لوتھری تحریک کا فروغ

اور یہ بھی اسے معلوم ہوا کہ اس کے خیالات ہس (Huss) اور وکلف (Wycliffe) کے خیالات سے بہت ملتے جلتے ہیں یہ بھی وہ جانتا تھا کہ اس کے بعض اصولوں کو کانسٹنس (Constance) کی کونسل نے ناجائز قرار دیا تھا مگر پھر بھی وہ سکوت پر آمادہ نہ تھا۔ اس طرح پوپ کے اختیارات اور کیتھلک مذہب کے بنیادی اصول کی مخالفت کرنے والوں کا وہ سرگروہ ہوگیا۔ ۱۵۲۰ء میں پوپ نے بذریعہ فرمان اسے کلیسیہ سے خارج کر دیا لیکن لوتھر پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا نہ اہل ملک اور نہ سیکسنی (Saxony) کے حکمراں نے اس کا ساتھ چھوڑا لوتھر نے یہ فرمان وٹن برگ میں برسر بازار نہایت اطمینان سے جلا دیا اور اس کے ساتھ ہی کیتھلک کلیسا کے مجموعہ قوانین کو بھی جلا ڈالا۔

ورمز (Worms) کی مجلس ڈیئٹ (Diet)

۱۵۲۱ء میں بمقام ورمز (Worms) ایک مجلس منعقد ہوئی جس کی صدارت کے لئے چارلز پنجم جرمنی آیا دیگر اہم امور کے منجملہ لوتھر کا معاملہ بھی زیر بحث تھا وہ طلب کیا گیا اور خود شہنشاہ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی بعض لوگوں نے اسے جانے سے روکا

اور کہا کہ جیسے ہس (Huss) کے ساتھ جو بدعہدی ہوئی تھی وہی تمہارے ساتھ بھی ہوگی لیکن لوتھر نے ایک نہ سنی سلاطین جرمنی کے مجمع میں جا کھڑا ہوا اور اپنی کتابوں کی تصنیف سے اقرار کر کے انھیں واپس لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا "لو میں یہاں کھڑا ہوں اور اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا میری مدد کرے" اس پر اسے سلطنت سے باہر نکال دینے کا حکم ہوا مگر اسکے دوست شاہ سکسنی نے اسے بچا لیا اور بھیس بدلوا کر وارٹ برگ (Wartburg) کے قلعے میں اسے پہنچا دیا۔ جہاں لوتھر ایک مدت تک پوشیدہ رہا۔ اسی اثنا میں وہ انجیل کا ترجمہ جرمنی زبان میں کرتا رہا۔ یہ ترجمہ جرمن زبان کے لئے ایسا ہی مفید ثابت ہوا جیسا کہ ۱۶۱۱ء کا انگریزی ترجمہ انگریزی زبان کے لئے۔

۱۵۲۲ء میں پھر بمقام نیورمبرگ (Nuremberg) ایک دینی مجلس منعقد ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ لوتھر کے متعلق جو سزا تجویز ہوئی تھی غالباً اب اس کو عمل میں لایا جائے گا مگر شہنشاہ چارلز کو دوسرے معاملات میں انہماک تھا۔ اٹلی کے معاملات اور دوسری شورشوں نے اس کی کل توجہ اپنی طرف کر لی تھی اور مجلس نے اس کے منشا کے مطابق عمل کرنے سے بھی انکار کر دیا اور پاپائے روم کے خلاف جو شکایتیں جرمنی والوں کو تھیں ان کا ایک محضر تیار ہوا اس طرح یہ تحریک ایک قومی جذبہ کے قالب میں آگئی۔

اس کے تھوڑے دنوں بعد ایک اور اہم واقعہ پیش آیا جس کا خاص اثر جرمنی کے مذہبی ارتقا پر ہوا یہ تو معلوم ہے کہ ملکی سیاسی حالت لوتھر کے مذہب کے فروغ کے موافق تھی۔ مگر معاشرتی حالت ایسی نہ تھی۔ زراعت پیشہ لوگ خصوصاً مغربی اور جنوبی حصۂ ملک کے کسان تکلیف و مصیبت میں تھے یوں تو ملک کی عام حالت بہت اچھی تھی

جنگ مزارعین کی ابتدا

اور شہری متوسط طبقہ کے لوگ عیش و عشرت میں بسر کر رہے تھے لیکن زراعت پیشہ لوگ جمود کی حالت میں تھے۔ اور گزشتہ نصف صدی کی مدت میں ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی ان کی حالت غلاموں کی سی تھی مالکان اراضی ان سے طرح طرح کی جبریہ خدمت لیتے۔ یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بہتوں کی حالت موجودہ زمانے کے مزدوروں سے بہتر ہو لیکن پھر بھی ان

مزارعین پر لوتھری تحریک کا اثر۔

کی حالت اشتعال انگیز ضرور تھی اور جرمنی کے معاشی تغیرات نے اس میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ لوتھر کی مذہبی تحریک نے انھیں پہلے ہی سے

مشتعل کر رکھا تھا۔ ان کو امید تھی کہ لوتھر کی موعودہ آزادی سے ان کی تمدنی حالت بھی اچھی ہو جائے گی اس لیے انھوں نے بغاوت کردی اور ملک کے جنوب و مغربی حصے میں ورزبرگ (Wurzburg) کے اطراف میں ہنگامہ برپا کردیا۔ جس طرح مذہبی معاملات میں لوتھر اپنے مطالبات کو انجیل کی صحیح روشنی میں دیکھے جانے کا طالب تھا یہ لوگ بھی انجیل کے مطابق ہر شخص کے لیے آزادی کے خواہاں تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ جب حضرت مسیحؑ نے انھیں آزادی کی نوید دی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اب وہ قیدیوں کی طرح رکھے جائیں اس لیے رئیسوں اور امرا نے ان پر جو پابندیاں عاید کردی تھیں ان کو مٹا دینے کے وہ طالب ہوئے اور انجیل کی صحیح اور سچی تعلیم پر عمل کرنے کے خواستگار ہوئے ان مطالبات سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کرلی (۱۵۲۵ء) جانبین سے سخت مظالم سرزد ہوئے گو بلوہ فرو کرنے والوں کے مظالم بلوائیوں کے مظالم سے زیادہ ہی تھے لوتھر نے اس ہنگامے کو خوف کی نگاہوں سے دیکھا اس کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس شورش سے اس کی مذہبی تحریک خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس لیے اس نے کسانوں کی مخالفت سخت تحریروں اور تقریروں سے کی اس نے امرا سے مطالبہ کیا کہ اس شورش کو سختی سے فرو کیا جائے حتی کہ ظلم کرنے سے بھی اس نے منع نہیں کیا۔ چنانچہ ہنگامہ فرو ہو گیا اور اسی طرح شمالی جرمنی میں ایک ہنگامہ ہوا تھا وہ بھی دبا دیا گیا۔ لیکن اس شورش کا اثر مذہبی تحریک پر دائماً قائم رہا۔ کسانوں نے لوتھر سے امداد چاہی تھی مگر اس نے بجائے مدد کرنے کے ان کی مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تحریک کی عام مقبولیت باقی نہ رہی۔ غربا کی کثیر آبادی میں اس کی تحریک زائل ہو گئی اس زمانے سے لوتھر کو متوسط اور مقتدر طبقہ کے بھروسہ پر کام کرنا پڑا اور اس کی تحریک حکومت سے وابستہ ہو گئی۔ اس کے بعد سے یہ خصوصیت ہمیشہ قائم رہی۔

خانہ جنگی

اس اثنا میں لوتھر کی تحریک کو دبانے کے لیے مرکزی سلطنت نے کچھ نہ کیا ۱۵۲۶ء بمقام اسپیر (Speer) ایک دینی مجلس منعقد ہوئی تھی مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا صرف یہ اعلان کردیا گیا کہ اس معاملہ میں جرمنی کی ہر ریاست فرداً فرداً ذمہ دار سمجھی جائیگی مجلس نے یہ قرار دیا کہ ہر ریاست اس طرح انتظام اور عمل کرے کہ خدا اور قیصر کے سامنے

جوابدہی کرسکے۔ لوتھری تحریک کے حامی مثلاً سیکسنی (Saxony) اور ہیس (Hesse) کی ریاستوں نے اس حکم کے دوسرے ہی معنی لیے اور اپنی اپنی سلطنتوں میں پروٹسٹنٹ کلیسیہ قائم کر دیا تین سال بعد اسپیر میں ایک مذہبی مجلس منعقد ہوئی جس میں بغلبۂ آرا اور یہ طے پایا کہ ورمز کا فیصلہ اب بھی نافذ اور قابل پابندی ہے اور مذہب میں کوئی تغیر و تبدل جائز نہیں ہے" مگر دوسرے فریق نے جس کی تعداد قلیل تھی اس کے خلاف حسب ذیل اعلان کیا: "ہم اس تحریر کے ذریعے سے احتجاج کرتے ہیں کہ ہم آپ کے فیصلے سے نہ اتفاق کر سکتے ہیں نہ کریں گے بلکہ اس فیصلہ کو کالعدم قرار دیتے ہیں" اس احتجاج کی وجہ سے اس تحریک کا نام احتجاجی (پروٹسٹنٹ) پڑ گیا جو اب تک باقی ہے سنہ ۱۵۳۰ء میں

لفظ پروٹسٹنٹ کی ابتدا

لوتھر کے مذہبی عقائد کے تعین و تخصیص سے اس تحریک کو اور تقویت حاصل ہوگئی اور آوگزبرگ (Augsburg) میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان میں جس میں لوتھری عقائد ایک معین صورت میں اعتدال کے ساتھ پیش کیے گئے لیکن قیصر نے فوراً ہی ان عقائد کو ناجائز قرار دیا اور جو لوگ کیتھلک مذہب کے منکر ہو گئے تھے ان پر حملہ کرنے کی دھمکی دی اس وجہ سے سنہ ۱۵۳۱ء میں بمقام شمال کالڈین (Schmalkaldon) پروٹسٹنٹ ریاستوں نے اپنی حفاظت کے لیے آپس میں ایک اتحاد قائم کیا جس میں سیکسنی (Saxony) ہیس (Hesse) اور برینڈین برگ (Brandenberg) کی مشہور ریاستیں شامل تھیں یہ اتحاد صریحاً مرکزی سلطنت کے مقابلہ کے لیے قائم ہوا تھا مگر تیرہ برس تک شہنشاہ کو اس کے خلاف جنگ آزمائی کا موقع نہیں مل سکا۔ کیونکہ اس زمانے میں وہ اطالوی معاملات کے سلجھانے میں مصروف تھا اور ادھر ڈینیوب ندی کے کنارے سے جرمنی میں ترکوں کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ ایسے وقت میں جرمن مخالفین سے نبرد آزمائی کرنا مناسب نہ تھا اس لیے شہنشاہ نے سردست سکوت کیا اور اس کو سنہ ۱۵۴۴ء تک اسی جانب توجہ کرنے کی فرصت بھی نہ ملی۔ سنہ ۱۵۴۴ء میں اس نے شاہ فرانس سے صلح کر لی اور ترکوں کی یورش کا اندیشہ بھی جاتا رہا اس تحریک کی توسیع اشاعت سے اس نے سمجھ لیا کہ اب جرمنی پر حملہ کرنے کا وقت آگیا ہے ورٹمبرگ اور باڈن (Baden) نے پروٹسٹنٹ مذہب کا اعلان کر دیا تھا اور کولون (Cologne) کا اسقف اعظم بھی احتجاجیت کی طرف مائل نظر آتا تھا

۱۵۴۶ء میں چارلس نے ایک بڑی فوج جمع کرکے لڑائی کا انتظام کیا۔ اسی سال کے شروع میں لوتھر کا انتقال ہوگیا اور وہ اس خانہ جنگی کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے نہ کرسکا جس کا اسے پہلے سے اندیشہ تھا ابتدائی مذہبی جوش اب ٹھنڈا ہورہا تھا اور اس نازک وقت میں بھی پروٹسٹنٹ ریاستیں متفق و متحد نہ رہ سکیں۔ شہنشاہی فوج کی پہلی ہی یورش میں جنوب کی پروٹسٹنٹ ریاستوں نے شہنشاہ کی اطاعت قبول کرلی سیکسنی کا ڈیوک مارس وہاں کے حکمراں رئیس کا رقیب تھا اس لیئے شہنشاہ کے ساتھ ہوگیا مارس کو توقع تھی کہ اسے اپنے بھائی کا ملک اور اقتدار حاصل ہوجائے گا۔ مقابلہ کا بار زیادہ تر سیکسنی کے حکمراں فرڈرک اور ہیس کے والی فلپ پر پڑا۔

جنگ موہل برگ (Muhlburg)

اصل جنگ دریائے ایلب (Elbe) کے کنارے بمقام موہل برگ (Muhlberg) ہوئی۔ شہنشاہی فوج نے اور شہنشاہ اور اس کے ہسپانی سپہ سالار الوا کی سرکردگی میں دریا پار کرکے غنیم کو شکست فاش دیدی اور خود سیکسنی کے حکمراں اور والی ہیس کو گرفتار کرلیا۔ لڑائی چنداں زبردست نہ تھی مگر فتح ایسی کامل ہوئی کہ اسوقت تمام یورپ شہنشاہ کے قدموں پر نظر آنے لگا۔ نہ تو جرمنی میں نہ اس کے باہر کوئی ایسی طاقت نظر آتی تھی جو اس کے مقابلہ کی تاب لاسکے۔ مذہبی مسئلہ کو جس رواداری سے اس نے طے کرنا چاہا وہ قابل ستائش ہے بمقام اگزبرگ ایک مجلس منعقد کی گئی اور عارضی مصالحت (Interim) کے احکام جاری ہوئے اس تحریر میں کیتھلک رسوم جاری رکھنے کی ضرورت بتائی گئی مثلاً مسیحی عبادت (Mass) کی پابندی مردوں کے لیئے دعائے خیر کرنا۔ روزہ داری اور کیتھلک مذہب کے متبرک ایام کا احترام کرنا ضروری بتلایا گیا۔ لیکن اس حکم کے آخری شرط کے ذریعے سے پروٹسٹنٹ مذہب والوں کو بھی رعایتیں دی گئیں۔ مثلاً جن پادریوں نے شادی کرلی تھی ان کو اپنی بیویوں سے قطع تعلق کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ (۲) اور جو لوگ عشائے ربانی (Communion) بطریق پروٹسٹنٹ ادا کرتے تھے ان کو اپنا طریقہ بدلنے کا حکم نہیں دیا گیا) (۱) اس وقت تک کہ ٹرنٹ کی مذہبی مجلس ان اہم امور کا کوئی قطعی تصفیہ نہ کردے) یہ سب کوششیں نیک نیتی سے کی گئی تھیں اس لیئے میلنک تھان (Melancthon) نے جو لوتھر کی وفات کے بعد سے پروٹسٹنٹ فرقے کا سرگروہ مانا جاتا تھا۔ ان شرائط کو قبول کرلیا لیکن جرمنی میں عام طور پر یہ شرائط مقبول نہیں ہوئیں کیونکہ کیتھلک مملکتیں اپنی پروٹسٹنٹ رعایا کو اس قدر آزادی دینا پسند نہیں کرتی تھیں جتنی کہ اس مصالحت کی رو سے واجب تھی۔ اور بہت سی پروٹسٹنٹ مملکتیں بھی اپنے حدود میں کیتھلک

کلیسے کے دوبارہ قیام کو ناپسند کرتی تھیں شہنشاہ ممکن ہے اپنی مرضی کے مطابق بہ جبر تعمیل کراتا مگر بین الاقوامی تعلقات بدل جانے سے پروٹسٹنٹ فرقہ کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔

موریس والی سیکسنی (Maurice)

اولاً تو سیکسنی کا ڈیوک — موریس جس نے موہل برگ کی فتح میں بہت حصہ لیا تھا شہنشاہ سے ناراض ہوگیا جس قدر ملک ملنے کی اسے توقع تھی اتنا اس کو نہیں دیا گیا اور شہنشاہ کے پاس اس کا اتنا اثر نہ تھا جتنا کہ وہ چاہتا تھا۔ وہ فطرتاً حوصلہ مند اور رجلیلا تھا۔ اور اپنی غرض حاصل کرنے کے لیے وہ دوسری تدبیریں سوچنے لگا۔ علاوہ اس کے ادھر چارلس اور اس کے بھائی فرڈیننڈ والی آسٹریا کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ ۱۵۲۶ء میں فرڈیننڈ کی عظمت بڑھ گئی تھی کیونکہ اس سال ترک

جنگ موہیکز (Mohacz)

ہنگری میں گھس آئے تھے اور انھوں نے موہیکز (Mohacz) کی جنگ میں فتح بھی حاصل کرلی تھی۔ نتیجہ کے لحاظ سے یہ جنگ اس صدی کی لڑائیوں میں خاص اہمیت رکھتی تھی۔ ہنگری اور بوہیمیا (Bohemia) کی سلطنتوں کو ترکوں نے مغلوب کرلیا تھا اور خود دارالسلطنت وائنا خطرہ میں تھا۔ بوہیمیا اور ہنگری کا تاجدار جنگ میں کام آچکا تھا بہنوئی ہونے کی وجہ سے اس کا وارث فرڈیننڈ ہی تھا۔ لیکن یہ ترکہ بغیر مصیبتیں برداشت کے حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ بہرحال اس زمانہ سے بوہیمیا اور ہنگری کی ریاستیں ہیپس برگ خاندان میں منتقل ہوگئیں اور اس خاندان کے بہترین مقبوضات میں ان کا شمار تھا۔ آسٹریا کے دور جدید کی تاریخ کا مدار اسی جنگ اور اس کے نتیجہ پر ہے۔

عارضی مصالحت کے بعد چارلز کی مشکلات

عارضی مصالحت کے بعد سے چارلز نجم کو اپنا جانشین منتخب کرنے کی فکر ہوگئی اس کا جانشین تو اس کا بھائی فرڈیننڈ تسلیم کرلیا گیا تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ فرڈیننڈ کے بعد تخت اس کے بیٹے فلپ کو ملے۔ یہ وہی فلپ ہے جو اسپین کے فلپ دوم کے نام سے بعد میں مشہور ہوا۔ اس طریقہ سے وہ چاہتا تھا کہ یورپ میں جو عظیم الشان اقتدار اسے حاصل ہوگیا تھا اسی کے گھر میں ایک مدت تک رہ سکے۔ لیکن فرڈیننڈ خود اپنے خاندان کے فائدہ کے لیے اس تجویز کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اور نہ اس وقت وہ شہنشاہ کی رائے سے اتفاق کرنے پر آمادہ تھا لیکن ان دونوں واقعات سے بڑھکر یعنی موریس (Maurice) کی ناراضگی اور فرڈیننڈ کی

رقابت سے زیادہ اہم فرانس کی مداخلت تھی۔ فرانس میں ہنری دوم حکمراں تھا اور وہ ہسپانوی آسٹری طاقت کے مقابلہ پر تلا ہوا تھا۔ اس لئے اس نے موریس (Maurice) اور پروٹسٹنٹ سرداروں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرلئے اور ان سے اس نے یہ عہد لے لیا کہ میٹز (Metz) ٹول (Toul) اور ورڈن (Verdun) کے اضلاع اس پروٹسٹنٹ تحریک کی معاونت کے صلہ میں اسے دیدئے جائیں گے۔ چارلس پنجم بیمار تھا اور اس میں وہ مستعدی اور بیدار مغزی باقی نہ رہی تھی جس سے وہ اب تک کام لیتا رہا۔ ۱۵۵۲ء میں جب موریس (Maurice) نے اس کے خلاف علم اٹھایا تو وہ حیران ہوگیا۔ جرمنی میں

جرمنی سے چارلس کا فرار ہونا

جو اقتدار اس کو حاصل ہوگیا تھا بغیر ایک وار چلائے جاتا رہا۔ وہ انس بروک (Innsbruck) کو بھاگا اور وہاں اپنے غنیم کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بال بال بچا۔ بڑی مصیبت سے وہ ٹائرل (Tyrol) کے برف سے ڈھنکے ہوئے دروں کو پار کرکے اٹلی میں داخل ہوسکا۔ اس طرح ایک ہی حملہ میں اس کا وقار جاتا رہا۔ اور مارس (Maurice) جرمنی کا مالک نظر آنے لگا۔ موریس کے حوصلا ور منصوبوں اور بیشتر زندگی اس کی کارروائیوں سے متعلق مورخوں کے متعدد قیاس ہیں۔ لیکن ۱۵۵۳ء میں وہ ایک معمولی لڑائی میں مارا گیا اور جرمنی میں کوئی سردار نہ ہونے کی وجہ سے گڑبڑ مچ گئی۔ چارلس (Charles) کو اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کرنے کی توقع تھی۔ اصل میں شاہ فرانس نے اس کو زیر کر رکھا تھا اس لئے پہلے اس نے فرانس ہی پر حملہ کردیا۔ شہر

میٹز (Metz) پر چارلس کی ناکامی

میٹز (Metz) کا اس نے محاصرہ کرلیا اور اس کو کامیابی کا یقین کامل تھا۔ اگر یہ شہر فتح ہوجاتا تو اس کی قوت بہت بڑھ جاتی اور اس کے منصوبوں کی تکمیل کا راستہ نکل آتا۔ لیکن بقول اس کے قسمت نوجوانوں کا ساتھ دیتی ہے اور شہر میٹز کو خلاف امید گیز کے والی (ڈیوک) نے بچالیا۔

صلح آوگزبرگ ۱۵۵۵ء (Augsburg)

چارلس سلطنت کا بار اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا تھا اور اس سے سبکدوش ہونے کا اس نے قصد بھی کرلیا تھا۔ چنانچہ جرمنی کی مشکلات سلجھانے کا بار اس نے فرڈینینڈ پر ڈالدیا۔ آوگزبرگ (Augsburg)

میں ایک مجلس منعقد کی گئی جس نے مذہبی اصلاح (Reformation) کی پہلی منزل کو مکمل کر دیا اس کی خاص خاص شرائط یہ تھیں۔ اولاً جرمنی میں ایک ہی مذہب قائم کرنے کی کوششوں کا سدباب کیا گیا۔ ہر ریاست کو یہ اختیار تھا کہ اپنے حدود میں جو مذہب چاہے قائم رکھے۔ یہ واضح رہے کہ جرمنی میں تقریباً تین سو ریاستیں اس وقت موجود تھیں۔ اس طرح ہر شخص کے ساتھ رواداری کا اصول تو نہیں اختیار کیا گیا۔ لیکن چونکہ ہر ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کی اجازت تھی اس لیے ایک ایسے شخص کے لئے جو اپنے ملک کا مذہب نہ رکھتا ہو یہ ممکن تھا کہ وہ کسی ایسے ملک میں چلا جائے جہاں اس کا مذہب رائج ہو۔ دوسری شرط یہ تھی کہ جرمنی میں صرف دو مذہب رائج رہیں جن ریاستوں کو اپنا اپنا مذہب اختیار کرنے کی اجازت تھی وہ یا تو لوتھر کا مذہب اختیار کریں یا کیتھولک رہیں تمام لوگ جو ان دونوں مذہبوں میں سے کسی کے پیرو تھوں۔ اس صلح میں شریک نہ سمجھے جائیں گے بلکہ وہ اس سے خارج متصور ہوں گے اس شرط سے جو فساد ہونے والا تھا پہلے تو نہیں نظر آیا۔ لیکن جرمنی میں پروٹسٹنٹ مذہب کی ایک اور شاخ کیلونزم (Calvinism) یعنی مذہب کیلون کے نام سے وجود میں آچکی تھی اور یہ فرقہ ملک میں روز بروز لوتھر کے فرقہ سے زیادہ پھیلتا جاتا تھا۔ لیکن صلح آگزبرگ کی اس شرط کی رو سے کیال ون کے (Calvin) مذہب کے لئے جرمنی میں گنجائش نہ تھی اس شرط سے بہت سی دقتیں پیش آئیں اور آخر کار "سی سالہ جنگ" کا آغاز ہوا۔ ایک اور شرط جو قابل توجہ ہے جرمنی کی اُن مذہبی یاستوں سے متعلق تھی جنھوں نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ مذہبی ریاستوں کے والیوں کے لئے نیا مذہب زیادہ کشش رکھتا تھا کیونکہ یہ مذہب اختیار کرنے سے وہ اپنے مقبوضات کو بجائے حین حیاتی قبضہ میں رکھنے کے موروثی بنا سکتے تھے اور کیتھولک مذہب میں رہنے سے ان کا قبضہ ان کی حیات تک ہی رہ سکتا تھا۔ لیکن جرمنی میں ایسی مذہبی ولایتوں کی ایک کثیر تعداد تھی اور ان کی وسعت بھی بہت زیادہ تھی اس لیے یہ مسئلہ خاص اہمیت رکھتا تھا کہ ان ریاستوں کے ساتھ کیا عمل کرنا چاہئے جنھوں نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لیا تھا کیتھولک لوگوں کا یہ مطالبہ تھا کہ ایسی سب ریاستیں کلیسہ کو واپس ملنا چاہئیں اور کسی اسقف یا اسقف اعظم کو یہ حق نہ ہوگا کہ مذہب تبدیل

کرکے اپنے مقبوضات کو کلیسا کے قبضہ سے نکال لے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کا یہ کہنا تھا کہ ایسے انتقالات جو پہلے ہوچکے ہیں قائم رکھے جائیں اور آئندہ بھی ایسے انتقالات جائز رکھے جائیں صلح آوگزبرگ میں درمیانی پہلو اختیار کیا گیا۔ یہ اعلان کیا گیا کہ جن مذہبی ریاستوں نے ۱۵۵۲ء کے پہلے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کرلیا تھا اور اپنے پروٹسٹنٹ قابض کے ملک رہیں گے لیکن آئندہ یہ طریقہ مرعی نہ رکھا جائیگا بلکہ جن ریاستوں نے ۱۵۵۲ء کے بعد تبدیل مذہب کیا تھا وہ کیتھلک کلیسا کو واپس کردی جائیں۔ صلح آوگزبرگ کے خاص اور اہم شرائط بس یہی تھے۔ ایک مدت سے اس قسم کے جھگڑوں میں بتلا رہنے سے جرمنی عاجز آگیا تھا اور پھر پچیس سال قبل والا مذہبی جوش بھی اب باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے یہ نیا انتظام بغیر چون وچرا کے قبول کرلیا گیا لیکن جرمنی اور یورپ کے لئے ابھی اس مذہبی جھگڑے کا خاتمہ نہیں ہوا تھا اور صلح آوگزبرگ کی بھی شرائط آگے چلکر ایک خونریز مذہبی لڑائی کا باعث ہوئیں جو جرمنی میں آیندہ صدی کے آغاز میں شروع ہوئی۔

باب سوم

سولھویں صدی کے نصف آخر کی مذہبی تحریکات

جب لوتھر نے وٹن برگ (Wittenberg) کے کلیسہ کے پھاٹک پر اپنے اعتراضات لکھکر آویزاں کردئے تھے تو وہ امورِ متنازعہ فیہ کو بہت معمولی سمجھتا تھا۔ رومن کلیسا کی بے عنوانیوں پر وہ معترض تھا کلیسا رومائی روایات اور رسوم پر وہ انجیل کو ترجیح دیتا تھا اور اسی کو وہ قابل وثوق خیال کرتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ جس نتیجہ پر وہ پہنچا ہے ہر شخص اگر انصاف اور عقل سے کام لے تو لازماً اسی نتیجہ پہنچے گا لیکن اس کی تحریک ابھی زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی کہ یہ واضح ہوگیا کہ امر متنازعہ فیہ اس قدر معمولی نہ تھا جیسا کہ ابتداءً سمجھا گیا تھا۔ مذہب کا معاشرت میں اتنا دخل تھا کہ مذہب میں کسی قسم کا خلل لازماً معاشری و سیاسی حالت میں بھی خلل انداز ہوتا اور لوتھر اس سے بہت بچنا چاہتا تھا۔ سیاسی و معاشری تغیرات بھی لوتھر کی تحریک پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہے تھے۔ علاوہ اس کے لوتھر کی حیات ہی میں یہ بھی روشن ہوگیا تھا کہ فقہی مسائل میں جس نتیجہ پر وہ پہنچا تھا اس کو وہ لوگ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے جو خود لوتھر کی طرح رومن کلیسا کی بدعنوانیوں سے نالاں تھے اور مقدس انجیل کو عقائد کا مخزن و منبع سمجھتے تھے۔

زوینگلی (Zwingli) و لوتھر (Luther)

سنہ ۱۵۱۹ء میں سویزرلینڈ میں بمقام زیورخ (Zurich) زوینگلی (Zwingli) نے اپنا کام شروع کردیا۔ اس نے بھی ابتداءً لوتھر کی طرح پروانہ جات معافی پر اظہار نفرین کیا تھا۔ سویزرلینڈ

کے اکثر لوگوں نے اس کی تتبع کی اور روما کی اطاعت سے منحرف ہوگئے۔ کچھ زمانے تک تو اس کی تحریک لوتھر کے خیالات کے مطابق رہی۔ لیکن جب اس نے الٰہیات اور کلیسے کے نظام کے متعلق اظہار رائے کیا تو دونوں میں اہم اختلافات ظاہر ہوئے کلیسائی حکومت کے معاملے میں اس کے خیالات لوتھر کی بہ نسبت جمہوریت کی طرف زیادہ مائل تھے کیونکہ جن لوگوں میں وہ رہتا تھا وہ سیاسی معاملات میں جرمنی والوں سے زیادہ جمہوریت پسند تھے۔ لیکن سب سے بڑا اختلاف زونگلی اور لوتھر میں "عشائے ربانی" کے متعلق تھا۔ کیتھولک کلیسہ کا عقیدہ تھا کہ عشائے ربانی میں روٹی اور پینے (Communication) شراب حضرت عیسیٰؑ کے جسم اور خون سے بدل جاتے ہیں۔ لوتھر اس مسئلہ کا قائل نہ تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ کے جسم اور خون دونوں بذات خود عشائے ربانی میں روٹی اور شراب کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اس کا قول تھا کہ روٹی اور شراب عشائے ربانی میں اپنی نوعیت پر قائم رہتے ہیں مگر رسم کے بعد ان میں ایک نیا عنصر داخل ہوتا ہے جیسے کہ لوہے کو گرم کرنے سے اس میں آگ داخل ہوتی ہے۔ لیکن زونگلی ان دونوں مسئلوں کا مخالف تھا اس کے خیال میں "عشائے ربانی" ایک یادگاری رسم سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہت کوشش کی گئی مگر بیکار ثابت ہوئی۔ یہ الفاظ کہ "یہ میرا جسم ہے" لوتھر کے نزدیک زونگلی کی تاویل کو ناقابل قبول بنا دیتے تھے۔ چنانچہ اس نے زونگلی کو صداقت کا دشمن کہا اور ان دونوں پروٹسٹنٹ پیشواؤں کے تبعین کبھی آپس میں متفق نہ ہو سکے۔

کیلون (Calvin)

اس کے علاوہ لوتھر کی وفات کے پہلے ہی ایک اور پروٹسٹنٹ تحریک سلطنت کے ایک گم نام گوشے میں وجود میں آئی تھی جو زونگلی کی تحریک سے بھی زیادہ شہرت حاصل کرنے والی تھی ۱۵۰۹ء میں کیلون (Calvin) فرانس کے شمالی حصے میں پیدا ہوا اور ابتدا اس نے کلیسہ کی خدمت کا قصد کیا۔ کچھ دنوں تک پیرس (Paris) میں اس نے الٰہیات کا درس لیا لیکن پادری بننے کا خیال ترک کرکے قانون کی تعلیم حاصل کرنے وہ آرلینس (Orleans) کو چلا گیا۔ یہاں اس کا بیان ہے کہ ۱۵۳۳ء میں اس کے

ذہن میں تبدیل مذہب کا خیال یکایک پیدا ہوا اس نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لیا گو ابھی تک اس مذہب نے کوئی معین صورت اختیار نہیں کی تھی چونکہ فرانس میں مذہبی مظالم زوروں پر تھے اس نے فرانس کو خیرباد کیا اور کچھ دنوں دریائے رائن (Rhine) کے اطراف کے شہروں میں اس نے بسر کیا۔ بیسل (Basel) میں اس نے اپنی مشہور کتاب "اصول مسیحیت" تصنیف کی ۱۵۳۶ء میں وہ جی نووا (Geneva) چلا آیا۔ جی نووا کا شمار شہنشاہی شہروں میں تھا۔ مگر حقیقی حکومت کے لئے وہاں کے اسقف (بشپ) اور سیوائے کے ڈیوک میں نزاع تھی۔ جی نووا کے لوگوں نے برفاقت باشندگان برن (Bern) وفریبرگ (Freeberg) ڈیوک اور بشپ دونوں کے خلاف ہنگامہ کر دیا ان لوگوں نے پروٹسٹنٹ مذہب کا اعلان کر دیا اور ۱۵۳۶ء میں حلفاً اقرار کیا کہ "اب وہ خدا کے الفاظ اور اس کی کتاب پر ہی عمل کریں گے" اس واقعے کے تھوڑے ہی دنوں بعد کیلون جی نووا پہنچا اسے یہاں قیام کرنے کی ترغیب ہوئی اور گو ۱۵۳۸ء میں خارج البلد کر دیا گیا مگر پھر واپس آکر اپنی وفات تک وہیں رہا۔ جی نووا اس کے قیام سے یورپ کے بڑے شہروں میں شمار ہونے لگا اور کیلون کا جو اثر دوسرے ممالک میں تھا اس سے یہ خیال ہوتا تھا کہ جی نووا بھی روما کے مقابلہ کا شہر ہے

کیلونی تحریک کے خصوصیات

کیلون اور دوسرے پروٹسٹنٹ تحریکوں میں حسب ذیل فرق تھا۔ (۱) کیلون کی تعلیم کے مطابق کلیسیا اور حکومت دو علیحدہ چیزیں تھیں سلطنت کلیسیہ کے معاملات میں دخل دینے کا مجاز نہ تھا جیسا کہ لوتھر کے آخری زمانہ میں لوتھری کلیسیہ میں ہوا یا جیسا کہ انگلستان میں ہنری ہشتم کے زمانے میں ہوا (۲) کلیسہ کی حکومت ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہونی چاہئے تھی جو پادریوں اور عامہ قوم دونوں پر مشتمل ہو۔ اس حکمراں جماعت کا نام کانسسٹری رکھا گیا۔ جس میں چھ پادری اور بارہ اکابر قوم ہوتے تھے اور انھیں کے ہاتھ میں کلیسہ کا سب انتظام رہتا تھا (۳) اس فرقہ کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ضبط اخلاقی نہایت سخت تھا یہ لوتھر کے مخالفین یہ اعتراض کرتے تھے کہ لوتھر کی تعلیم سے

آوارگی اور بداخلاقی کا اثر ہو گیا تھا! اور کاتھولیکت کے اخلاقی معیار کی اصلاح نہ ہوی تھی لیکن کیال ون نیت پر الزام نہیں عائد ہو سکتا تھا۔ جی نی وا میں جب اس کے عقائد کی ترویج ہوی تو ایک قسم کا سخت اخلاقی احتساب قائم کیا گیا اور اسی محکمۂ احتساب کی نگرانی میں اور مذہبی جماعت کے ہدایات کے مطابق عمل کیا جاتا تھا جو اصل میں کیال ون کی ہدایات تھیں اس بنا پر کیلون کے سب سے بڑے شاگرد جان ناکس (John Knox) نے یہ لکھا ہے کہ مسیحؑ کی انجیل مقدس پر لوگوں کو اعتقاد تو ہر جگہ ہے لیکن اس کے مطابق عمل بجز جی نوا کے اور کہیں نہیں ہوتا۔

کیلونی اصول و عقائد

کیال ون کا مذہب زونگلی اور لوتھر کے مذہب سے جدا تھا۔ جی نوا کے کلیسیہ اور یورپ کے دوسرے پریسبیٹری کلیساؤں کی بنیاد کیال ون کی تصنیف "اصول مسیحیت" پر قائم تھی۔ یہ نظام الٰہیات منطقی صحت مد نظر رکھ کر مرتب کیا گیا تھا اور "جبر و قدر" کے اصول پر مبنی تھا۔ اس میں بہت سی باتیں ایسی تھیں کہ ان کو زونگلی اور لوتھر کے متبعین تسلیم کر سکتے تھے لیکن عشائے ربانی کے مسئلہ میں کیال ون نے ان دونوں سے

عشائے ربانی کے متعلق کیال ون کے خیالات

علٰحدہ ایک عقیدہ قائم کیا۔ زونگلی کی طرح وہ عشائے ربانی کو محض ایک یادگاری رسم نہیں مانتا تھا نہ لوتھر کا عقیدۂ "ہم جنسیت" کا وہ قائل تھا۔ ان اجزا (روٹی و شراب) میں خود کوئی اعجازی کیفیت وہ تسلیم نہیں کرتا تھا اور نہ رسم نیاز کو محض یادگاری رسم سمجھتا تھا بلکہ اس کو فضل الٰہی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اختلافات تھے لیکن ایک فرق ایسا تھا جس سے جب کیال ون کا مذہب جرمنی میں پھیلا تو خود پروٹسٹنٹ گروہ میں ایسا نفاق ہوا کہ اس سے سی سالہ جنگ شروع ہو گئی۔ کیال ون نے انجیل کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا جس کا اثر لوتھر کے ترجمہ کی طرح خود اس کے زمانے اور اس کے بعد کی پشتوں تک بہت زبردست تھا یونانی اور لاطینی کا وہ بڑا عالم تھا لیکن اپنے

زمانہ کی علمی اور فنی تحریکوں میں اس کو دلچسپی نہ تھی۔ جب تک وہ جنیوا میں تھا بلکہ اس کے بعد تک بھی جنیوا میں اس کا سلسلۂ احتساب باقی تھا حالیہ زمانہ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی مقام کے لوگ اپنی معاشرتی زندگی میں اس طرح پر کسی حاکم کے احکام و ہدایات کی تعمیل کرتے ہوں اس شہر میں تفریح اور دل لگی کے کاموں پر ایک باضابطہ نگرانی رہتی تھی دینی حکام یہ مقرر کر دیتے تھے کہ کھانے میں کیا کیا چیزیں دی جا سکتی ہیں اور شادیوں میں کس قسم کے تحفے پیش ہو سکتے ہیں بعض اوقات اس قسم کی سختی انتہا کو پہنچ جاتی تھی۔ چنانچہ اس کا ایک مذہبی

سروِیٹس (Servetus) کی شہادت

مخالف جنیوا میں قتل کر دیا گیا اور ہسپانوی سرویٹیس (Servetus) جس نے کیتھلک عقائد کی مخالفت کی تھی جب اس امید پر جنیوا بھاگ کر آیا کہ یہاں اس کو پناہ ملے گی تو اسے معلوم ہوا کہ کیا لون اور اس کے کلیسہ کے عقائد سے بالکل متفق نہ ہونے سے اس کی سخت مخالفت ہوگی اور آخر کار ایک تحقیقات کے بعد جس میں خود کیا لون شریک تھا اس کو سزائے موت دی گئی اور شہر کی فصیل کے باہر وہ جلا دیا گیا۔

کیالوینی تحریک کی تاریخی خدمات

بہر حال سولھویں اور سترھویں صدی میں کیلوونیت کا جو اثر تھا اس کو ہم اس قسم کے مظالم کی وجہ سے نظرانداز نہیں کر سکتے اس تحریک نے پروٹسٹنٹ مذہب کے عقائد کو معین و محدود کر دیا۔ اس کی بدولت پروٹسٹنٹ مذہب میں دینداری کا ایسا جوش پیدا ہو گیا کہ سولھویں صدی کے آخر میں خود لوتھر کے متبعین میں ایسا جوش نہ تھا اور تمدنی و معاشرتی معاملات میں اس کے مبالغہ آمیز قیود و پابندیوں سے ان لوگوں میں مصائب برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو گئی تھی اور تمام یورپ میں پروٹسٹنٹ مذہب کے حامی و مددگار بس یہی لوگ رہ گئے تھے انھوں نے ایسے وقت میں جب کہ لوتھر کی تحریک سست ہو چکی تھی پروٹسٹنٹ مذہب کے مخالفوں

کا ہمت سے مقابلہ کیا انھیں نے فرانس میں پروٹسٹنٹ تحریک کو کامیاب بنایا اور انہی کی بدولت نیدرلینڈز میں ڈچ جمہوریت قائم ہوئی اور اسکاٹلینڈ کا اثر یورپ میں ہو گیا انگلستان میں پروٹسٹنٹ تحریک کو تقویت ہوئی جس سے سترھویں صدی کی پیورٹن تحریک کی بنیاد پڑی۔

کیتھولک فرقہ کی مکرر بیداری

اس زمانہ میں جب کہ پروٹسٹنٹ تحریک کی نوعیت بدل رہی تھی اور اس کا نظام قوت پکڑ رہا تھا رومن کیتھلک کلیسہ میں بھی عظیم انقلابات ہو رہے تھے۔ سولھویں صدی کے ابتدائی نصف اول کے پوپ اٹلی کے سیاسیات میں مصروف تھے نشات جدید اور فنون لطیفہ سے انھیں شغف تھا اور اپنے اصلی منصب یعنے مذہبی اور روحانی معاملات سے لاپروا تھے پروٹسٹنٹ تحریک کی طرف ابتداءً انھوں نے بہت کم توجہ کی حتی کہ پوپ کلیمنٹ ہفتم (Clèment VII) نے شہنشاہ چارلس پنجم (Charles V.) کی مخالفت میں لیوتھر کے متبعین سے ایک گونہ اتحاد قائم کر لیا تھا لیکن پروٹسٹنٹ تحریک کی روزافزوں ترقی سے یہ سکوت و بے اعتنائی ناممکن ہو گئی جب جرمنی کا سہ ربع حصہ منحرف ہو گیا فرانس و ہالینڈ نئے المانوی خیالات سے بہت متاثر ہو گئے انگلستان نے روما سے قطع تعلق کر لیا ڈنمارک سوئیڈن و ناروے نے لیوتھر کا مذہب قبول کر لیا اور اس نئے عقیدہ کے سینکڑوں معتقدین پولینڈ و بوہیمیا میں پیدا ہو گئے حتی کہ خود اٹلی میں اس تحریک کا اثر پھیل گیا تو اس وقت اس خطرے کی اہمیت محسوس کر کے رومی کلیسہ بیدار ہوا اور عملی کارروائی کرنے پر آمادہ ہوا اسی وجہ سے سولھویں صدی کے نصف آخر کے پوپ سابق کے پوپوں سے مختلف تھے۔ یہ لوگ کبھی کبھی تو ادبیات کی اشاعت کرتے تھے کبھی روما کی آرائش کے سلسلے میں فن تعمیر کو بھی فروغ دیتے تھے لیکن پروٹسٹنٹ مذہب کے حملوں سے اپنے مذہب کو بچانے کی غرض سب پر مقدم تھی اور اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی پروٹسٹنٹ

انقلاب روما
۱۵۲۰ تا ۱۵۸۰
لوتھیرن
انگلیکن
رومن کیتھولک
بحیرہ شمالی
ناروے
سویڈن
بحیرۂ بالٹک
موراویا
بوہیمیا
سوئزرلینڈ
فرانس
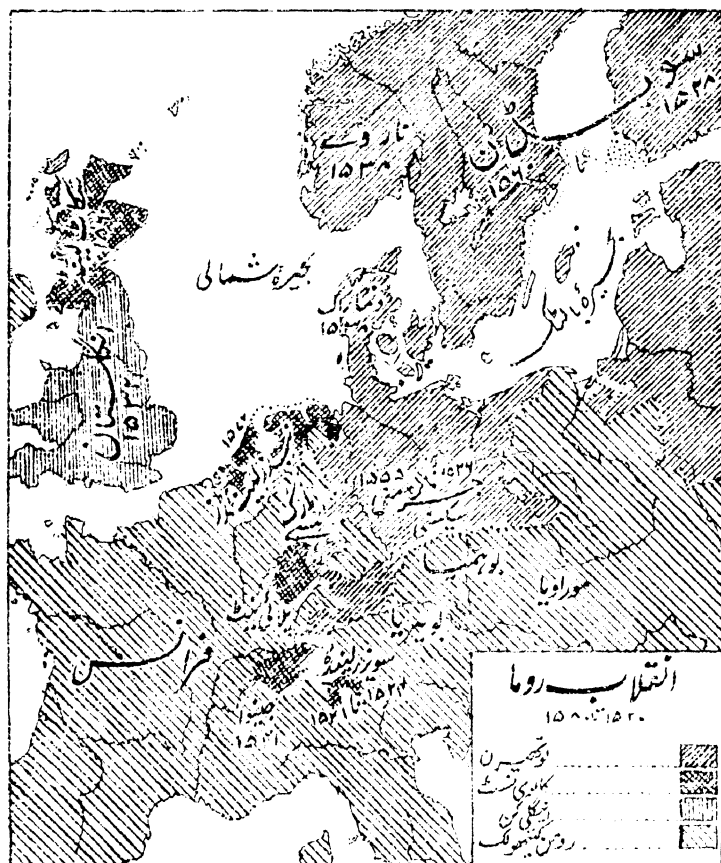
تحریک کا سیلاب رک گیا تھا یہاں تک کہ کیتھلک قائد اپنے مخالفوں کے حدود میں گھس رہے تھے۔ انھوں نے پھر بہت سا ملک رومن کیتھلک مذہب کے تابع کرلیا اور بقیہ کو بھی اپنی اطاعت میں واپس لانے کی امید رکھتے تھے۔ یہ تحریک "اصلاح معکوس" یا رومن کیتھلک رد عمل کے نام سے مشہور ہے۔

یسوعی گروہ

اس زبردست تغیر کے بانی جیسوئیٹ سلسلے کے لوگ تھے۔ یہ ہم دیکھتے آئے ہیں کہ ابتدا سے کلیسہ کی سب کامیابیاں کسی نہ کسی ایک خانقاہی سلسلے کی بدولت ہوتی ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً قائم ہوئے کلیسہ کی تاریخ میں بنی ڈکٹی کلونیاک (Benedictines Cluniacs) سسٹرشین (Cistercians) فرانسسکی (Franciscans) اور ڈومینیکی (Dominicans) سلسلوں کی کارگزاریوں کے آثار موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کا اثر ایسا دائمی نہوا جیساکہ جیسوئیٹ سلسلے کا۔

اگنیشس لویلا (Ignatius Loyola)

اس نئی تحریک کا مرکز اسپین تھا اور قدرتاً ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ اسپین میں کیتھلک مذہب کی تبلیغی اور زور آور قوت جیسی تھی ویسی کہیں بھی نہ تھی۔ مسلمانوں سے ایک عرصہ تک جنگ آزمائی کی بدولت کیتھلک مذہب اسپین میں بطور مذہب ہی کے قائم نہ تھا بلکہ اس نے ایک قومی اتحاد بھی قائم کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں حال ہی میں فتوحات حاصل ہونے سے ہسپانیوں میں مذہبی جوش بہت بڑھ گیا تھا ڈان انیگو لوپیز ڈی ری کالڈ (Don Inigo Lopez de Recalde) ایک ہسپانوی رئیس تھا جو ہسپانوی سپاہ میں بہت دنوں رہ چکا تھا۔ پمپلونا کے محاصرہ میں وہ زخمی ہو گیا اور صحت ہونے پر معلوم ہوا کہ عمر بھر کے لئے وہ لولا ہو گیا ہے۔ یہ شخص بڑا جوشیلا کیتھلک تھا۔ اس لئے اس کا خیال دنیادی جنگ سے اب روحانی و مذہبی جنگ کی طرف مائل ہو گیا۔ یہ طرز عمل اس نے ایک عرصہ کے بعد اختیار کیا اور فقیرانہ مذہبی ریاضت

میں مشغول ہوا۔ بیت المقدس کی زیارت کو بھی گیا ایک وقت اس کے ملحد ہونے کا بھی شبہ کیا گیا۔ پیرس میں الہیات کے درس کے لئے گیا جہاں اس کی زندگی میں ایک انقلاب ہوگیا۔ اس نے اپنے ہم خیال لوگوں سے دوستی پیدا کی اور یہیں اس نے اور اس کے دوستوں نے عہد واثق کیا کہ بیت المقدس کی زیارت کو جائینگے اور پوپ کے احکام وہدایات کی کامل پابندی کریں گے لیکن ترکی سلطنت بہت مضبوط تھی اور یہ لوگ وینس (Venice) سے آگے نہ بڑھ سکے

یسوعی سلسلہ کا قیام

اسی مقام پر معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل ایک نیا "سلسلہ" قائم کرنے کا خیال ڈان انیگو کے ذہن میں آیا۔ آئندہ صفحات میں ڈان انیگو کو اس کے مشہور نام اگنیشیس لو یو لا (Ignatius Loyola) سے موسوم کیا جائے گا اس نے ایسے لوگوں کی ایک جماعت قائم کرنا چاہی جو کیتھلک کلیسہ کی طرف سے ضبط اور مردانگی سے جنگ آزمائی کریں جس طرح کہ فوج باقاعدہ میں ہوتی ہے۔ پوپ نے پہلے اس "سلسلہ" کو شبہ کی نظر سے دیکھا مگر ۱۵۴۰ء میں جاکر اس "سلسلہ" کے باضابطہ قیام کے متعلق پوپ کا فرمان جاری ہوا اس وقت سے یہ جماعت پوپ کی قومی

یسوعی سلسلہ کی خصوصیات

مذہبی جماعتوں میں شمار ہونے لگی اس "سلسلہ" میں جو لوگ شامل ہوتے تھے ان کو حلف لینا پڑتا تھا کہ وہ افلاس اور پاکبازی کی زندگی بسر کریں گے اور اطاعت وفرماں برداری خصوصاً پوپ کی اطاعت حد درجہ ملحوظ رکھیں گے۔ اس جماعت کا صدر ایک سپہ سالار ہوگا جس کا اقتدار اس جماعت پر سب سے اعلیٰ ہوگا۔ جیسویٹ سلسلہ ڈامنیکن سلسلہ سے بہت مشابہ تھا مگر ڈامنیکن سلسلہ سے بعض اہم امور میں یہ لوگ اختلاف بھی رکھتے تھے چنانچہ ان کا کوئی امتیازی لباس نہیں قرار دیا گیا اور نہ بے انتہا ریاضت سے اپنے قویٰ کو مضمحل کرنے کا ان کو حکم تھا۔ ان کو دنیا میں رہ کر کلیسہ کی طرفداری میں لڑنا تھا اگنیشیس نے اپنی

جماعت کے ارکین میں قومیت کا احساس زائل کر دیا تھا اس جماعت کا اولین اصول یہ تھا کہ اس کے کسی فرد کو قومیت کا پاس نہ ہونا چاہیے اور جرمن فرانسیسی اور انگریز سب بلا لحاظ قوم و ملت مل کر کلیسہ کی خدمت کریں ان لوگوں نے دنیا پر اثر ڈالنے کا

یسوعی فرقہ کی تعلیم و تعلم

ذریعہ تعلیم و تبلیغ کو قرار دیا ابتدا ہی سے ان کے مدارس باثر تھے اور وہ مفت تعلیم دیتے تھے اور انکی تعلیم اس زمانہ کے لحاظ سے یورپ میں بہترین ہوتی تھی اس وجہ سے جس ملک میں وہ پہنچے وہاں کے نوجوانوں پر ان کا خاص اثر ہوا۔ آئندہ صدی کے اوائل تک کیتھلک یورپ کے کل مدارس و جوامع کا انتظام انہی کے ہاتھوں میں آ گیا۔ ان کا شوق و جذبہ صادق تھا ان کی ہمت بڑھی ہوئی تھی اور جس طرح ان کو کہا جائے وہ پوپ کی خدمت کرنے کو تیار رہتے ان کو ایک تلوار سے تشبیہ دیجاتی ہے جو یورپ کے اوپر لٹکی ہوئی تھی اس تلوار کا قبضہ پوپ کے ہاتھ میں تھا اور اس کا وار ہر مقام پر ہو سکتا تھا انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ فرانس جرمنی اور پولینڈ میں پروٹسٹنٹ تحریک کا سیلاب رک گیا۔ انگلستان اور اسکاٹلینڈ میں بھی پروٹسٹنٹ مذہب پر زور دار حملے کئے گئے۔

ٹرنٹ (Trent) کی مجلس۔

اصلاح عکسی میں ٹرنٹ (Trent) کی کونسل کو بھی دخل تھا چارلس پنجم کا شروع سے یہ خیال تھا کہ پروٹسٹنٹ مسئلہ کو ایک موتمر مذہبی میں پیش کر کے تصفیہ کرانا چاہیے پوپوں نے اس تجویز کی مخالفت محض اس وجہ سے کی کہ ان کے شاہی اقتدارات پر حملہ کا شائبہ بھی تھا۔ لیکن خطرہ کی اہمیت اور چارلس پنجم کے اثر سے آخر ۱۵۴۵ء میں موتمر منعقد ہوئی۔ اس کے لئے ٹرنٹ (Trent) کا شہر انتخاب کیا گیا۔ اس لئے کہ گویا یہ مقام جرمنی کے سیاسی حدود میں تھا مگر جغرافی لحاظ سے اٹلی میں واقع تھا۔ یہاں اطالوی پادری باسانی آ سکتے تھے اور انھیں پادریوں پر پوپ کو بھروسہ تھا کہ موتمر میں اس کے خیالات کی تائید کریں گے ۱۵۶۳ء میں آخری اجلاس ہوا لیکن اس اثنا میں اس میں

بہت سے تغیرات واقع ہوئے۔ ۱۵۴۷ء میں یہ موتمر بمقام بولونا (Bologna) منتقل کر دیا اور ۱۵۴۹ء میں برخاست کر دیا گیا۔ پھر ۱۵۵۱ء میں سب اراکین جمع ہوئے اور ۱۵۵۲ء میں پھر منتشر ہو گئے۔ مگر اسی سال پھر ایک مرتبہ سب لوگ جمع ہوئے اور ۱۵۶۳ء میں آخری اجلاس ختم ہوا۔

مجلس ٹرنٹ پوپ کے زیر اثر

چارلس پنجم نے یہ مجلس اس غرض سے قائم کی تھی کہ یورپ کی دینوی حکومتیں کلیسہ کے معاملات میں اصلاحات پیش کر سکیں۔ لیکن نتیجہ اس کے خلاف برآمد ہوا۔ مجلس کی صدارت پوپ کے نائبوں کے ہاتھ میں تھی اور جب تک یہ لوگ کسی مسئلہ پر رضامندی نہ ظاہر کریں وہ منظور نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بھی توقع کی گئی تھی کہ یہ مجلس لوتھری اور کیتھلک فرقہ کے درمیان کوئی سمجھوتہ کرا سکے گی جس سے مسیحی دین میں پھر یگانگت قائم ہو جائے گی لیکن یہ توقع بھی پوری نہ ہوئی۔ انجیل کا صرف لاطینی ترجمہ جس کو "وُل گیٹ" (Vulgate) کہتے ہیں مستند قرار دیا گیا۔ انجیل کے علاوہ کلیسہ کے روایات بھی مذہبی معاملات میں مستند قرار دی گئیں۔ یہ مسئلہ کہ حضرت مسیح پر محض ایمان لانا کافی ہے جس پر لوتھر مصر تھا اور جسے بعض نامور کیتھلک لوگوں نے بھی تسلیم کر لیا تھا بہت رد و قدح کے بعد نامنظور کر دیا گیا اور پروٹسٹنٹ گروہ کے دلائل و خواہشات کا مطلق لحاظ نہ کیا گیا کیونکہ بجز چند دنوں کے اس گروہ کا کوئی نمائندہ بھی مجلس میں شریک نہ تھا۔ اس مجلس نے کلیسہ کے عقائد معین کر دیئے اور ضبط کلیسہ کی اصلاح کا انتظام کیا۔ آخری اجلاس میں اس مجلس نے دینی معاملات میں پوپ کے اقتدار کا صاف طور پر اعتراف کیا اور اس مجلس سے جو پوپ کے طرفداروں کی نظر میں پہلے اس قدر خطرناک معلوم ہوتی تھی کلیسہ کے ہر شعبہ میں پوپ کے اقتدار کو تقویت و استحکام ہوا۔

مجلس ٹرنٹ (Trent) کے انعقاد کے نتائج

حقیقت میں یہ مجلس کیتھلک رد عمل

کی تحریک کی معاون ہوئی کیتھلک مذہب کے عقائد اس نے مدون کر دیئے اور آپس کے مذہبی مناقشات کو مٹا دیا۔ اس کے علاوہ پادریوں اور فقرا کے گروہوں میں جو نقائص پیدا ہو گئے تھے اس نے دور کر دیئے اور کلیسہ کی حکومت اور نظام کی اصلاح کر کے تقویت پہنچائی۔ عالم مسیحی کے متحد ہونے کی اس سے کوئی صورت پیدا نہ ہوئی مگر کیتھلک مذہب کو حفاظت و جوابدہی کے قابل بنا دیا اور مقابلے کے لئے ایک باا‌ثر نظام قائم کر دیا۔

اصلاح معکوس کا ایک اور قابل ذکر جزو عدالت انسداد الحاد تھی اس پر بحث کرنا نہایت دشوار ہے۔ الحاد کے انسداد کے لئے کلیسہ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ذریعہ تھا۔ قرون وسطیٰ میں انسداد کا تعلق اسقفوں سے تھا۔ ۱۴۸۳ء میں ایک خاص ہسپانوی عدالت انسداد الحاد قائم کیا گیا تھا تاکہ جزیرہ نما ہسپانیہ میں یہودیوں اور مسلمانوں کا قلع قمع ہو سکے ۱۵۴۲ء میں کارڈنل کارافا (Cardinal Caraffa) کی تحریک پر جو بعد میں پوپ پال چہارم (Paul IV) کے لقب سے مشہور ہوا ایک عام پاپائی عدالت انسداد قائم ہوئی۔ اس تجویز کے مطابق پھر کیتھلک ملک میں جن نے اسے پسند کیا کفر و الحاد کی تحقیقات و سزا کے لئے عدالتیں قائم کی گئیں۔ اس عدالت کی کارروائی ظلم و ناانصافی کے مترادف خیال کیجاتی ہے اور اس کی تائید نہیں کیجا سکتی اس کے متعلق اتنا البتہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی بہت سی کارروائیاں جو ہمکو بہت نفرت انگیز معلوم ہوتی ہیں اس زمانہ میں یورپ کی عدالتوں میں عام طور پر رائج تھیں چنانچہ شہادت بہم پہنچانے کے لئے جبر سے کام لیا جاتا تھا اور گواہ ملزمین کے سامنے نہیں پیش کئے جاتے تھے حتیٰ کہ گواہوں کے نام تک ان کو نہیں بتلائے جاتے تھے مگر ملزم پر جرم ثابت ہو جاتا تھا اور مقررہ سزا کی تعمیل کے لئے وہ دنیوی طاقت یعنے حکومت کے حوالے کر دیا جاتا تھا ۱۵۴۲ء میں اس محکمہ کی ہدایات میں یہ خاص طور پر تاکید تھی کہ کسی قسم کی تاخیر یا طوالت نہ ہونے پائے۔ اور کسی رئیس یا اسقف کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ کی جائے بلکہ ایسے لوگوں کے ساتھ خاص طور پر سختی کیجائے جو اپنے کو کسی اعلیٰ عہدہ کے پردے میں بچانا چاہتے ہوں ملحدوں کے ساتھ بھی کوئی رعایت روا نہ رکھی جائے کیلون کے متبعین کو چن چن کر سزا دیجائے

مطابع پر نظارت و نگرانی قائم کرنے کا اختیار بھی اس عدالت کو دیا گیا یورپ کے بعض حصوں میں تو کوئی کتاب بغیر اس کی منظوری کے طبع نہیں ہوسکتی تھی۔ ۱۵۵۵ء میں ممنوعہ کتب کی وہ مشہور فہرست مرتب ہوئی جن کے پڑھنے کی اجازت کسی کیتھلک کو نہ تھی۔

عدالت انسداد الحاد کا اثر۔

یہ صحیح ہے کہ سولھویں صدی کے آخر میں کیتھولک مذہب کو جو شاندار کامیابیاں ہوئیں اس کا باعث ٹرنٹ کی مجلس اور جیسوئیٹ کا سلسلہ تھا لیکن یہ مشتبہ ہے کہ عدالت مذکور نے بھی ان کامیابیوں میں کچھ امداد کی یا نہیں۔ اکثر اوقات اس عدالت سے ایسے ناجائز اغراض حاصل کئے جاتے تھے جو اس کی اصلی غرض سے کوسوں دور تھے۔ خصوصاً اسپین (Spain) میں تو اس عدالت سے شاہی اغراض کی تکمیل کا کام اسی طرح لیا جاتا تھا جس طرح کہ کلیسائی اغراض کے لئے جہاں اس سے نیدرلینڈز کی طرح زیادہ سختی سے کام نہیں لیا گیا وہاں مخالفت اس حد تک پہنچ گئی کہ اطاعت یا مصالحت کا سوال ہی پیدا نہ ہوسکتا تھا اور اس عدالت کے مظالم نے کلیسہ کی شہرت کو انتہائی نقصان پہنچایا۔

حوالۂ کتب متعلقہ باب ہذا :-

"تاریخ پاپایان روم" از رینکے (Ranke) "تاریخ اصلاح مذہبی" از لینڈسے (Lindsay) مجلس ٹرنٹ بر فراوڈ (Froude) کا لکچر " عہد مذہبی اصلاح" از ہاوسر (Hausser) "حیات کیالون" از ڈائر (Dyer) "تاریخ محکمۂ تفتیش" از لی (Lea) "کیالون پر ایک مضمون" از مارک پیٹی سن (Mark pattison)

باب چہارم

اسپین اور نیدرلینڈ

اسپین کی جغرافی علیحدگی و بے تعلقی

اسپین کو پیرنیز (Pyrenees) کے پہاڑ بقیہ یورپ سے الگ کرتے ہیں اس لئے یہ ملک یورپ کے دوسرے ممالک سے علیحدہ شمار ہو سکتا تھا چنانچہ اس کی تاریخ یورپ کی دوسری مملکتوں سے جداگانہ ہے یہ ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی سلطنت سے جنگ آزمائی کا خاص اثر اس کی ترقی پر پڑا جب مسلمان نکالدئے گئے تو بہت سی چھوٹی چھوٹی عیسائی سلطنتیں قائم ہو گئیں اور ایک مدت تک ان مملکتوں میں بجز اس کے کوئی اتحاد نہیں قائم ہوا کہ سب کیتھلک مذہب کے دلدادہ تھے لیکن پندرھویں صدی میں اسپین میں ایک مرکز اور اتحاد قائم کرنے کا ولولہ پیدا ہوا۔ اراگان (Aragon) کے فرڈیننڈ کی شادی کاسٹیل (Castile) کی ازابیلا (Isabella) کے ساتھ ہو جانے سے یہ دونوں مملکتیں ایک ہو گئیں تھیں اور ان دونوں کا پوتا چارلس اول شاہ اسپین جو شہنشاہ چارلس پنجم کے نام سے مشہور ہوا پرتگال کے علاوہ تقریباً کل جزیرہ نما پر حکمراں تھا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں بقیہ یورپ سے اسپین کی بے تعلقی باقی نہ رہی سسلی اور نیپلس میں اس کو حقوق حاصل ہو گئے تھے اور نیدرلینڈز سے بھی اس کا مستقبل وابستہ ہو گیا کیونکہ اسپین کی شہزادی جوانا (Joanna) کی شادی میری رئیسۂ برگنڈی اور میکسیملین شہنشاہ آسٹریا کے بیٹے فلپ سے کردی گئی تھی اس لئے اسپین ایک عظیم الشان سلطنت کا مرکز ہو گیا۔ اس کا حوصلہ پورا ہو گیا اور وقار بڑھ گیا۔ لیکن اس کی وجہ سے جو زبردست ذمہ داریاں عائد ہوئیں وہی بالآخر اس کے

زوال کا باعث ہوگئیں۔
سولھویں صدی میں لیکن اس کا زوال اس قدر جلد نہیں شروع ہوا۔

اسپین (Spain) کی قوت

سولھویں صدی میں اور سترھویں صدی کے بیشتر حصہ تک اس کی عظمت اور قوت باقی تھی یورپ کے تمام مدبر اس کی اصلی طاقت سے بھی بڑھ کر اسے سمجھتے رہے۔ اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس کے امریکن مقبوضات سے جس کو اس زمانہ میں "ہند" کے نام سے موسوم کرتے تھے لا انتہا ہی دولت اس کو حاصل ہوتی ہے اور اس کے رعایا کے کیتھلک مذہب کی فدائی ہونے سے آپس میں متحد ہے اس کے سپاہی ایک صدی تک یورپ میں بہترین مانے جاتے تھے اس کے بیڑے نے نئی دنیا کا وجود دریافت کیا تھا اور اسپین کو اس طور پر توسیع تجارت کا بہترین موقع حاصل ہوگیا تھا۔ لیکن بعد کے تجربوں سے معلوم ہوا کہ ان فوائد کے ساتھ ساتھ نقصانات بھی تھے مثلاً اس کے امریکن مقبوضات کا خرچ حکومت کی بدنظمی سے اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اخراجات وضع ہونے کے بعد کوئی بچت نہ ہوتی تھی دوسرے مذہبی جوش کی وجہ سے محکمۂ تفتیش کی آزادی بہت بڑھی ہوئی تھی اور آزادی خیالات کا دروازہ مسدود ہوگیا تھا۔ اور یورپ کی آزادی وروشن خیالی سے اسپین محروم رہا۔ تیسرے وسعت مقبوضات سے اسے ہمیشہ جنگ میں مبتلا رہنا پڑتا تھا جس سے اس کے ذرائع ترقی وآمدنی بند ہوگئے تھے۔

چارلس پنجم (Charles V) کی فتوحات

چارلس پنجم کی حکومت جرمنی میں تو ناکام تھی لیکن اسپین میں بہت شاندار ثابت ہوئی کل مخالف سلطنتوں کے مقابلہ میں شاہی فوج کامیاب رہی۔ ٹیونس (Tunis) کے بحری قزاقوں اور مسلمانوں کی قوت توڑ دی گئی اور امریکہ کی نوآبادیوں کا انتظام درست ہوگیا۔ خود یورپ میں ہسپانوی اقتدار بہت بڑھ گیا۔ اٹلی پر استیلا ہوگیا اور نیدرلینڈز میں بھی چارلس کی حکومت کامیاب اور ہردل عزیز تھی۔ چارلس پنجم کی

دست برداری کے وقت اس کے بیٹے فلپ کو زبردست اقتدار حاصل ہوا۔ اسپین کے لئے یہ بات کچھ مضر نہوئی بلکہ مفید ثابت ہوئی کہ سلطنت روم اور جرمنی کے

فلپ دوم (Philip II)

مشرقی مقبوضات بجائے فلپ کے فرڈیننڈ کو ملے فلپ کے لئے ہر ایک کام آسان تھا کیونکہ نئی اور پرانی دنیا میں اس کے وسیع مقبوضات تھے ایک جنگجو آبادی اس کے تحت میں تھی دولت وافر تھی اور پھر رومن کیتھلک کلیسہ کی اعانت اسے حاصل تھی۔

فلپ دوم (Philip II) کی ناکامیاں

فلپ کی حکومت ناکام کہی جاتی ہے۔ اس کے زمانہ میں ہمیشہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب وہ کوئی کار نمایاں کر گزرے گا۔ چنانچہ یہ بھی وقت آیا کہ گویا فرانس اور انگلستان کو بھی وہ اپنی سلطنت میں شامل کرلے گا مگر اس کی سب کوششیں ناکام رہیں انگلستان میں اس کے آخری زمانے تک اس کے مذہب کی منکر ایلزابتھ سریر آرائے سلطنت تھی اور فرانس بھی اس کے غنیم ہنری رئیس نوار (Henry of Navarre) کے قبضہ میں تھا لیکن سب سے بڑا صدمہ یہ تھا کہ نیدرلینڈز کا ایک بڑا حصہ اس کی سلطنت سے الگ ہو کر خود مختار ہو گیا اور اس خطہ میں پروٹسٹنٹ مذہب رائج ہو گیا۔

اس کی فتوحات وکامیابیاں

لیکن بعض مواقع پر اس کو کامیابی بھی ہوئی چنانچہ ۱۵۷۱ء میں ہسپانوی امیرالبحر اور ڈان جان (Don John) کی سرکردگی میں جو بادشاہ کا بھائی بھی تھا ایک بیڑے نے جو تمام کیتھلک سلطنتوں سے منتخب ومرتب کیا گیا تھا خلیج کارنتھ (Corinth) میں بمقام لیپانٹو (Lepanto) ترکی بیڑے کو ایسی شکست دی کہ پھر ترکی بیڑا آج تک سنبھل نہ سکا۔ سب سے بڑی کامیابی ۱۵۸۰ء میں ہوئی جب

(۱) لیپانٹو

شاہ پرتگال کی وفات پر فلپ نے پرتگال کے تخت کا دعویٰ کیا اور اس میں کامیاب ہوا اس طریقہ پر پورا جزیرہ نما ہی اس کے قبضہ میں نہ آگیا بلکہ ہندوستان

پرتگال (۲)
(Portugal)

اور امریکہ کے پرتگالی مقبوضات بھی اس کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ اسپین کی عظمت اور ان جنگوں اور فتوحات تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس زمانے میں اس نے علوم وفنون میں بھی نام پیدا کیا۔ ۱۶۰۵ء میں سروینٹیز (Cervantes) نے جو لیبانٹو کے جنگ میں شریک تھا، ڈان کوئیکزوٹ (Don Quixote) تصنیف کی جس کا شمار بہت جلد یورپ کی بہترین تصنیفوں میں ہونے لگا

علوم وفنون (۳)

کالڈرن (Calderon) (۱۶۰۱ تا ۱۶۸۰) کے ناٹک انگلستان اور فرانس کے بہترین ناٹکوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں فن مصوری کو بھی علم ادب کے ساتھ ساتھ ترقی ہوئی گو اسپین کا نامور مصور ویلاس کوئے (Velasquez) بعد میں پیدا ہوا۔

نیدرلینڈز
(Netherlands)
کی بغاوت

لیکن اب ہم کو نیدرلینڈز کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جس کی بغاوت سے فلپ کے زمانہ میں اسپین کو سب سے بڑا صدمہ پہنچا تھا بغاوت نہ صرف اسپین کے اضمحلال کا باعث ہوئی بلکہ اس سے یورپ میں ایک آزاد ترقی پذیر اور پروٹسٹنٹ ریاست کا اضافہ بھی ہو گیا جو ایک صدی تک آزادی اور روشن خیالی کے میدانوں میں تمام یورپ کی پیشوائی کرتی رہی۔

نیدرلینڈز
(Netherlands)
کی حالت

نیدرلینڈز میں کل سترہ ریاستیں شامل تھیں یہ سب فلپ دوم کو برگنڈی کے رئیس چارلس کے ترکہ میں ملی تھیں ہر ریاست کا نظام حکومت جداگانہ تھا اور کسی طرح کا ان میں اتحاد بھی نہ تھا حالانکہ چارلس پنجم نے ان سب میں یکساں طرز حکومت قائم کرنے کی بہت کوشش کی تھی اور اس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی۔ نام کو تو یہ ریاستیں شہنشاہیت میں شامل تھیں۔ لیکن اس سے ان کا تعلق ایسا ہی برائے نام تھا جیسا کہ سوئیزرلینڈ کی متحدہ ریاستوں کا یہ ملک صنعت و

حرفت ہی کا مرکز تھا اور ان ریاستوں کے بڑے بڑے شہروں اور بندرگاہوں سے شاہ اسپین کو جو آمدنی تھی وہ امریکن مقبوضات کی آمدنی سے زیادہ تھی ان ریاستوں کے خاص خاص شہر اور بندرگاہ اینٹورپ (Antwerp) گان یا گینٹ (Ghent) بروژ (Bruges) اور امسٹرڈام (Amsterdam) تھے ان پر حکومت رکھنا آسان نہ تھا اور چارلس پنجم کو بھی بہت دقتیں اٹھانی پڑی تھیں لیکن پھر بھی یہ ریاستیں ایک حد تک اس کی مطیع رہیں۔

فلپ دوم (Philip II) کی طینت و طبیعت

فلپ دوم کو اپنے باپ کا سا وسیع تجربہ نہ تھا۔ زیادہ تر وہ اسپین ہی میں رہا اور اپنی وسیع سلطنت کا انتظام میڈرڈ سے بیٹھے بیٹھے مراسلت کے ذریعہ سے کرتا تھا۔ اس میں جفاکشی، صبر اور فرض شناسی کی صفات موجود تھیں اور مذہب کا پکا اور سچا فدائی تھا لیکن تاریخ یورپ میں مشکل سے ایسا کوئی حکمراں نظر آئیگا جس کے متعلق اسکے معاصرین یا بعد والوں نے اس سے نفرت کا اظہار کیا ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ایسی تحریک جس میں آزادی یا ترقی کا شائبہ ہوتا وہ نہایت جابرانہ اور ظالمانہ طریقہ سے دبا دیتا تھا۔

نیدرلینڈز (Netherlands) کے ساتھ برتاؤ

نیدرلینڈز کے ساتھ اس کا طرز عمل معمولی تھا اور بہت سی باتوں میں زمانہ کی حالت کے مناسب تھا نیدرلینڈز کی سترہ ریاستوں کو اپنی ماتحتی میں وہ ایک سلطنت بنانا چاہتا تھا اور ان کی مقامی خود مختاری کو مٹا دینا چاہتا تھا یعنی نیدرلینڈز پر اسی مطلق العنانی سے حکومت کرنا چاہتا تھا جس طرح سے کہ اسپین میں یا جس طرح ایلزابتھ اور ہنری چہارم انگلستان اور فرانس میں حکومت کرتے تھے۔ اس زمانہ کے مطابق وہ بھی یہی خیال کئے ہوئے تھا کہ مذہبی یگانگت کے بغیر سیاسی یگانگت قائم نہیں ہوسکتی اس وجہ سے مذہبی اور سیاسی مصالح کی بنا پر پروٹسٹنٹ تحریک کو فنا کر دینے کا اس نے ارادہ

کیا جس نے خصوصاً شمالی ریاستوں میں مضبوط جڑ پکڑ لی تھی۔

نزاع کی ابتداء فلپ کی تخت نشینی کے بعد ہی ان ریاستوں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ شہنشاہ ہمارے سرداروں میں سے کسی کو اپنا نائب مقرر کرکے حکومت کرے گا اور عام طور پر کاونٹ اگمانٹ (Count Egmont) اور ولیم (William) شاہزادہ آرنج (Orange) کو اس کا اہل سمجھا جاتا تھا آخر الذکر جرمن نسل کا تھا گو اس کا لقب فرانس کی ریاست آرنج کے نام پر مشہور ہو گیا تھا۔ نیدرلینڈز میں اس کی بہت جائداد تھی اور ان لوگوں سے اسے خاص ہمدردی تھی فلپ نے ان کی خواہش کا لحاظ نہ کیا اور اپنی ایک بہن مارگرٹ (Margaret) رئیسۂ پارما (Parma) کو اپنا نائب مقرر کر دیا جو ہسپانوی مشیروں کی رائے پر کام کرتی تھی علاوہ اس کے اس موقع پر مذہبی معاملے میں بھی اختلاف تھا۔ فلپ پروٹسٹنٹ مذہب کو جبر و تعدی سے مٹا کر پھر پادریوں کا تفوق قائم کرنا چاہتا تھا ریاستوں نے احتجاج کیا کہ اس طرز عمل سے ان کے حقوق محصلہ پر اثر پڑتا ہے چنانچہ ایک مدت تک تصفیہ کی گفت و شنید رہی مگر آخر کار کوئی بات طے نہ ہوسکی فلپ نے اس عقدے کو تلوار سے حل کرنا چاہا اور ۱۵۶۷ء میں اس نے ایک زبردست فوج

ڈیوک آف آلوا (Duke of Alva) کی روانگی۔ آلوا (Alva) کے ڈیوک کی سرکردگی میں روانہ کی آتے ہی اس نے سخت حملہ کیا اگمانٹ (Egmont) قتل کر دیا گیا ولیم رئیس آرنج (William of Orange) جان بچا کر بھاگا بغاوت اور کفر کے جرائم کی سرسری تحقیقات اور سزا کے لئے ایک مجلس قائم کی گئی جس کو نیدرلینڈز والے خونی کونسل کہتے تھے باغیوں کی سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں ۱۵۶۹ء میں تمام ملک آلوا کے قابو میں آ گیا لیکن پھر بھی تین سال بعد ایسی بغاوت ہوئی کہ جسے اسپین فرو نہ کرسکا

۱۵۷۲ء کی شورش مالی معاملات میں آلوا کی سختی اور ناواقفیت

اس دوسری شورش کا باعث ہوئی۔ اس نے محاصل عائد کئے اور ان کے وصول کرنے کا ایسا طریقہ اختیار کیا جو محاصل سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا یہ اسباب نیدرلینڈز کی تجارت کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے کافی تھے ان محاصل کی وصولی دو ماہ تک کے لئے بند کر دی گئی مگر خارجی امداد یا کم از کم خارجی امداد کی امید پر رعایا نے بلوہ کر دیا ملکۂ الیزابتھ سے نیدرلینڈز والوں کے تعلقات

ولیم خاموش (William the Silent) کی سرگرمی

دوستانہ تھے۔ اور فرانس کو بھی اسپین کے شمالی فتوحات پر حسد تھا۔ اپریل ۱۵۷۲ء میں "بحری قزاقوں" نے جو کچھ حب وطن بھی رکھتے تھے اور قزاقی بھی کرتے تھے اور الوا کی بدسلوکی کی وجہ سے ترک وطن کر چکے تھے صوبۂ ذی لینڈ (Zeeland) میں برل (Brill) اور فلشنگ (Flushing) پر قبضہ کر لیا۔ ہالینڈ اور ذی لینڈ کے دونوں صوبوں نے الوا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور آرنج (Orange) کے ولیم کو جو "خاموش" ولیم کے نام سے مشہور ہوا حکمرانی کے لئے طلب کیا۔ اس طور پر آزادی کی اصل جنگ کا آغاز ہوا اور یہ جنگ چالیس سال تک جاری رہی۔ یہ جنگ ایک ایسا غار ثابت ہوئی جس میں اسپین کی دولت فوج اور بیڑا سب کچھ غارت ہوتا گیا اسپین کی تباہی کا سب سے بڑا سبب نیدرلینڈز کو مطیع کرنے کی کوشش ثابت ہوئی۔

اس جدوجہد کی خصوصیات

آئندہ باب میں ہم کو معلوم ہوگا کہ سینٹ بارتھولومیو کے دن قتل عام سے فرانسیسی امداد کی توقع جاتی رہی لیکن پھر بھی شمالی صوبوں نے اپنے بل بوتے پر جنگ جاری رکھی اور آخر کار ان کو فتح نصیب ہوئی۔ مقابلہ عجیب وغریب تھا مگر اسپین کی ناکامی کے اسباب بھی ظاہر تھے متعدد مہمات میں مصروفیت اور زیر باری سے آخر کار اس کا دیوالہ نکل گیا علاوہ اس کے اسپین نے نیدرلینڈز کی بحری طاقت توڑنے کی کوشش نہیں کی اور جب تک اس کو بحری قوت حاصل تھی، وہ عاجز نہیں کئے جا سکتے تھے کھلے میدان میں

تو وہ ہسپانوی سپاہ کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتے تھے لیکن شہر پناہوں کی آڑ سے اور بعض اوقات ڈائیک[۱] (بند) توڑ کر سمندر کے سیلاب سے وہ اپنے غنیم کو بھگا دینے میں کامیاب رہے۔ علاوہ اس کے خاموش ولیم کی کارگزاری بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی خود تو وہ سپاہی نہ تھا لیکن اس نے شجاعت اور استقامت کی روح اپنے ہموطنوں میں پھونک دی تھی اور اپنی تدبیر و فراست سے مختلف المزاج باغیوں کو متحد کر رکھا تھا۔ کوئی ملک کسی حکمراں کا اس طرح مرہونِ منت نہیں ہو سکتا جیسا کہ ہالینڈ خاموش ولیم کا۔

ہسپانوی فوج کی بغاوت۔ ۱۵۷۳ء میں الوا کنارہ کش ہو گیا اور اس کے جانشین نے فتوحات حاصل کر کے ڈچ لوگوں کا ناطقہ بند کر دیا لیکن پھر بھی جنگ ختم نہ ہوئی۔ ۱۵۷۶ء میں ہسپانوی گورنر کی وفات پر اس کی فوج نے عدمِ ادائی تنخواہ کی وجہ سے بغاوت کر دی جس سے ولیم کو اپنے توقعات سے بھی زبردست کامیابی کی امید ہو گئی۔ ان باغی سپاہیوں نے اپنے سردار مقرر کر لئے۔ اور تمام ملک میں لوٹ مار کرنے کے لئے پھیل گئے۔ اب تک ہسپانوی سپاہ کو صرف شمالی ریاستوں سے مقابلہ کر رہا تھا۔ شمالی اور جنوبی ریاستوں میں بہت اختلاف بھی تھا۔ شمال والے زیادہ تر پروٹسٹنٹ اور جمہوریت پسند تھے اور ان کی زبان جرمنی تھی اس کے برخلاف جنوب والے یا تو فرانسیسی زبان بولتے تھے یا اس کے مثل کوئی دوسری زبان۔ لیکن ہسپانوی باغی سپاہ کے مظالم کے اندیشہ سے دونوں حصے متحد ہو گئے۔ ۱۵۷۶ء میں

صلح گنٹ ولیم نے صلح گان یا گنٹ طے کی جس کے ذریعہ سے تمام سترہ ریاستوں نے اسپین کو باہر نکال دینے اور ایک قومی سلطنت قائم کرنے اور مذہبی مسئلہ میں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا سلوک رکھنے کا اقرار کیا۔

یہ تحریک ایسی زبردست تھی کہ شروع شروع میں اسپین کو

[۱] نیدرلینڈ کی سطح سمندر کی سطح سے نیچی ہے اس لئے سمندر کے پانی کو روکنے کے لئے اکثر مقامات پر بند (Dyke) بنا دیئے گئے ہیں تاکہ ملک طغیانی سے محفوظ رہے۔

ہٹنا پڑا۔ اگر یہ اتحاد قائم رہتا تو یورپین تمدن کو بہت بڑا فائدہ پہنچتا لیکن یہ ان ہونی بات تھی۔ مذہبی جوش اور تعصب اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کسی صلح کے ذریعہ سے اس کا ازالہ ممکن نہ تھا۔ پروٹسٹنٹ مذہب والے بھی عدم رواداری میں کیتھلک مذہب والوں سے کم نہ تھے۔ اس زمانہ میں جسویٹ پادریوں کی تبلیغ و اشاعت سے کیتھلک مذہب کو بھی فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اگر نیدرلینڈ کی یہ نئی حکومت کامیاب ثابت ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ قائم رہ جاتی۔ مگر ۱۵۷۸ء میں بمقام گان بلور (Geniblours) آسٹریا کے ڈان جان (Don John) نے اس قومی فوج کو شکست دیدی۔ ولیم کو یہ دیکھکر بہت افسوس ہوا کہ بجز شمالی پروٹسٹنٹ ریاستوں کے اس کی امداد کے لئے کوئی نہ تھا۔ ۱۵۷۹ء میں ان (شمالی) ریاستوں نے وفاقیت کے طرز پر آپس میں اتحاد قائم کرکے اسپین کے خلاف جنگ جاری رکھنے کا تہیہ کر لیا۔ جنوبی ریاستوں نے اسپین سے کچھ رعایتیں حاصل کریں اور آئندہ کے لئے اسپین کی حلیف بن گئیں۔

باغی ریاستوں کی حالت مایوس کن ہوگئی اور جنگ کی شدت بڑھتی گئی۔ فلپ نے یہ محسوس کرکے کہ بغاوت فرد کرنے میں ولیم ہی سدِّراہ تھا ۱۵۸۰ء میں اس کے خلاف ایک اعلان کرادیا کہ وہ بنی نوع انسان کا دشمن ہے۔ اور جو شخص اس کو زندہ یا مردہ لائیگا یا مارڈالے گا بہت بڑا انعام پائیگا۔ اب تک یہ ریاستیں کہنے کو فلپ کی سلطنت ہی میں تھیں لیکن اب انھوں نے باضابطہ طور پر اس سے قطع تعلق کر لیا اور اعلان کر دیا کہ "جب بادشاہ اپنی رعایا کی حفاظت ونگہبانی کے بجائے ان کو پیس ڈالنے کی فکر کرے اور ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کرے تو ملک قانوناً اس کو علٰحدہ کرکے اس کی جگہ دوسرے کو بادشاہ کر سکتا ہے۔ یہ ایک اہم اصولی اعلان تھا جس کا اثر انگلستان امریکہ اور فرانس کے انقلابات میں نمودار ہوا۔

اب ولیم نے خارجی دول سے امداد حاصل کرنے کی کوشش کی اور شاہ فرانس کے بھائی ڈیوک آف انجو (Duke of Anju نے) ان ریاستوں کی حفاظت اور امداد پر رضامندی ظاہر کی لیکن اس کی نیت کی صداقت کا اظہار عملاً نہیں ہوا۔ وہ ملک میں مطلق العنان حکومت چاہتا تھا اور محدود اختیارات سے جو اسے حاصل تھے راضی نہ تھا اس نے کمینہ پن سے شہر انٹیورپ (Antwerp) پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور جب اس میں ناکام رہا تو فرانس چلدیا اور وہیں مرگیا۔ انگلستان البتہ اپنی رفاقت پر قائم رہا اور انگریز رضا کار ڈچ فوج میں بھرتی ہوتے رہے لیکن ولیم کی زندگی تک انگلستان نے کھلم کھلا کوئی امداد نہیں کی۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد یہ ریاستیں ولیم کی رہبری سے محروم ہوگئیں فلپ کے انعام مقرر کردینے سے بہت سے سفاک اس کی تاک میں لگے ہوئے تھے اور ۱۵۸۲ء میں وہ بری طرح زخمی ہوا اور بالآخر ۱۵۸۴ء میں ڈلفٹ (Delft) قتل کردیا گیا۔ اپنے صبر و استقامت تدبیر و فراست انسانیت اور بے غرض حب الوطنی سے اپنے زمانے کے بہترین مدبرین میں اس کا شمار تھا۔ موجودہ ہالینڈ کا وجود اسی کی ذات سے ہے۔ وہ پہلا یورپین مدبر تھا جس نے مذہبی رواداری کی بنا پر سلطنت قائم کی تھی۔

پارما کی فتوحات

اب معلوم ہونے لگا کہ اس کی وفات پر نیدرلینڈ کی حالت تباہ ہوجائے گی۔ اسپین کے زبردست سپہ سالار پارما نے انٹیورپ فتح کرلیا اور پروٹسٹنٹ ریاستوں کا اتحاد متزلزل ہوگیا کچھ تھوڑی سی امداد ملکہ الزابتھ نے اس طور پر کی کہ ارل آف لیسٹر (Earl of Leicester) کی سرکردگی میں ایک بے ترتیب فوج بھیجدی لیکن اصل مدد نیدرلینڈ والوں کو یورپ کی سیاسی حالت میں انقلاب پیدا ہونے سے ملی۔ ۱۵۸۸ء میں اسپین کے بیڑے (ارمڈا Armada) کو انگلستان نے

ایسی شکست دی جیسی کہ اب تک اسپین کو نہ ہوئی تھی اسی زمانہ میں ہنری
کو جو اب تک پروٹسٹنٹ مذہب کا پیرو تھا اور اسپین کا سخت دشمن تھا
فرانس کا تخت و تاج مل گیا۔ اب انگلستان۔ فرانس اور ہالینڈ نے
آپس میں اسپین کے خلاف ایک اتحاد قائم کر لیا اور اسپین کی کامیابی
کی امید جاتی رہی۔ ولیم (William) کا بیٹا مارس ڈچ فوج کی کمان اپنے
باپ سے بہتر طریقے پر کر رہا تھا۔ آخر کار ۱۵۹۷ء میں بمقام ٹرن ہوٹ
(Turn hout) ڈچ فوج نے ہسپانوی سپاہ کو شکست دیدی پھر بھی
کئی سال تک جنگ جاری رہی یہ زمانہ ایسا گزرا کہ دونوں سلطنتیں
زیر بار ہوئیں مگر جنگ کے باوجود ہالینڈ کی صنعت وحرفت ترقی پذیر
تھی اور اسپین کو اس قسم کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا آخر کار ۱۶۰۹ء میں
بارہ سال تک کے لئے صلح ہوگئی۔

ڈچ جمہوریت کی خدمات

اصل میں ڈچ قوم کی جنگ آزادی کا یہ خاتمہ ہی تھا
اس بہادرانہ جنگ سے ایک ایسی سلطنت قائم ہوگئی
جس نے آئندہ صدی تک یورپ کو بیش بہا فوائد
پہنچائے زراعت اور جہازرانی کو ڈچ قوم نے بہت فروغ دیا۔
اور گروٹیس (Grotius) کی تصانیف سے بین الاقوامی قانون کی طرف
خاص توجہ ہوئی لیڈن (Layden) میں علم طبیعیات کو بہت ترقی
ہوئی۔ ادب میں ڈچ لوگوں نے کوئی گراں قدر اضافہ تو نہیں کیا
لیکن مصوری میں انھوں نے بہت شہرت ضرور پیدا کی ہالینڈ میں
پروٹسٹنٹ جذبات کی وجہ سے وہاں کے مصور حضرت مسیح علیہ السلام
کی زندگی کے واقعات یا بڑے بڑے بزرگوں کے روایات کا
اظہار اپنے تصاویر میں نہیں کرسکتے تھے لیکن اپنے ملک سے جسے
انھوں نے اس قدر جد و جہد کے بعد اسپین کے قبضے سے
چھڑایا تھا انھیں عشق تھا۔ اپنے ملک کی ہموار زمین کو اپنے قلم
کی کوشش سے شاندار مناظر میں پیش کرتے تھے۔ انھوں نے

ظاہر کر دیا کہ زندگی کے معمولی اور ذرا ذرا سے واقعات کے دکھانے میں بھی اتنا ہی کمال چاہیئے جتنا کہ رافائل تیتیاں کو (Raphael Litian) حاصل تھا۔

نئی سلطنت کی مشکلات

خارجی خطرہ تو جاتا رہا تھا مگر ملک کی اندرونی مشکلات ابھی باقی تھیں یوٹریخٹ (Utrecht) کے اتحاد سے نظام حکومت کی بنیاد تو پڑ گئی تھی اور موجودہ زمانہ کی اتحادی حکومت کی پہلی نظیر قائم ہو گئی تھی لیکن اس کو سنبھال لے چلنا ذرا مشکل تھا۔ اب تک کوئی ڈچ سلطنت یا قوم نہیں بنی تھی۔ ساتوں صوبے کامل آزادی و خود مختاری کے مدعی تھے اور کل صوبوں کی اتفاق آرا کے بغیر مرکزی حکومت کچھ نہ کر سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ دو پارٹیاں قائم ہو گئیں ایک طرف تو آرنجی جماعت تھی جس کا سردار شہزادہ مارس (Maurice) تھا وہ کل ریاستوں کو آرنج (Oronge) خاندان کی سیادت میں حقیقی طور پر متحد کرنا چاہتا تھا اور خود بادشاہی اختیارات چاہتا تھا گو بادشاہ کے لقب کا خواستگار نہ تھا۔ دوسری جماعت کا سردار اولڈن بارنیولٹ (Olden barneveldt) تھا، جو لفظاً اور معناً جمہوری حکومت چاہتا تھا اور آرنج خاندان کے مقاصد کا مخالف تھا اُدھر پروٹسٹنٹ مذہب والوں میں خود ہی مذہبی نفاق پیدا ہو جانے سے حالت اور بھی نازک ہو گئی کیلون (Calvin) کے سخت اصول کے پیرووں کا سردار گومرس (Gomarus) تھا جو آزاد خیال طبقہ کے سردار آرمینس (Arminus) سے برسرپیکار رہتا تھا۔ موریس (Maurice) گومرس کے پیرووں کا ساتھی ہو گیا اور ۱۶۱۹ء میں ڈارٹ (Dort) کی مذہبی مجلس نے گومرس کے مخالفین کے خلاف فتویٰ دیدیا اور جو لوگ گومرس کی مخالفت پر قائم تھے ان کو خدمات سے علیحدہ کر کے شہربدر کر دیا گیا مارس کے لئے یہ بڑی فتح تھی اس کے بعد اس نے مجرمانہ طریقہ پر اپنے مخالف اولڈن بارنیولٹ کو سرسری تحقیقات کے بعد قتل کرا دیا جس سے اس کی فتح مکمل ہو گئی۔

خاندان آرنج (Orange) کی شکست

لیکن جمہوریت پسند جماعت بالکل نیست و نابود نہیں ہوی۔ ماریس تو ۱۶۲۵ء میں فوت ہوگیا لیکن یہ مخاصمت اس کے جانشین فریڈرک ہنری (Frederick Henry) ولیم دوم (William II) کے زمانہ تک باقی تھی بادشاہ کی وفات پر بجز ایک کمسن بچہ کے جو انگلستان کا شاہ ولیم سوم (William III) کے نام سے مشہور ہوا کوئی وارث نہ تھا اور جمہوری سردار جان ڈی وٹ (John De Witt) نے آرنج خاندان کی ہوس پر آخری اور قطعی ضرب لگادی کمسن شہزادہ کو سات صوبوں میں سب سے زرخیز اور زبردست صوبۂ ہالینڈ کی حکومت اور فوجی وبحری کمان سے محروم کردیا گیا لیکن نیدرلینڈز کی قسمت میں روز ازل سے خاندان آرنج کے ساتھ وابستہ رہنا لکھا تھا اور کمسن شہزادہ نے سن شعور کو پہنچ کر نیدرلینڈز اور انگلستان پر حکومت کی اور یورپ کی سیاسیات پر اپنے جد ولیم خاموش کی طرح اثر ڈالا آرنج خاندان والے فوجی تھے اور ایک بڑی فوج قائم رکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ ہمسایہ سلطنتوں پر ان کا اثر رہے ان کے مخالف بحری فوج پر زیادہ اعتماد رکھتے تھے اور بری فوج پر ان کو اعتبار نہ تھا کیونکہ یہ فوج خاندان

ولیم سوم (William III)

آرنج کی معین تھی جب ۱۶۷۲ء میں لوئی چہاردہم شاہ فرانس نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے اس سلطنت پر حملہ کرنا چاہا اور سلطنت کو وہی خطرہ ہوگیا جو ولیم خاموش کے زمانہ میں تھا تو از خود اس کے پوتے کو مکرر تخت نشینی کے لئے بلانے کی تحریک شروع ہوگئی۔

سترھویں صدی کے وسط تک کی تاریخ ہالینڈ توضیح کے خیال سے بیان کردی گئی ہے اب ہم فرانس کے سولھویں صدی کے کارناموں کو بیان کریں گے ؛

باب پنجم

"فرانس اور مذہبی اصلاح"

ہنری دوم (Henry II) کی وفات

۱۵۵۹ء میں صلح کاتو کامبریسی (Calean cambresis) سے فرانس کی سلطنت یورپ میں با اثر ہوگئی تھی۔ مشرقی سرحدوں پر اس کو اہم مقبوضات حاصل ہوگئے تھے اور کیلے (Calais) کا شہر بھی انگریزوں سے فرانس نے چھین لیا تھا۔ اس صلح کے جشن میں جو پیرس (Paris) میں منعقد ہوا تھا۔ فرانس کا بادشاہ ہنری دوم ایک اتفاقی صدمے سے جو کھیل تماشے کے دوران میں اسے پہنچا تھا ہلاک ہوگیا اس کے انتقال سے فرانس کی حالت بالکل متغیر ہوگئی۔

فرانس میں کیلوِنی تحریک کی اشاعت

مذہبی اصلاح کی وجہ سے اب تک فرانس میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ اس تحریک کو مٹا دینے کے لئے احکام جاری ہوئے تھے اور بعض لوگ ان احکام کے شکار بھی ہوئے لیکن فرانس کا مذہبی اتحاد متزلزل نہیں ہوا تھا البتہ دوسرے ملکوں کی طرح فرانس میں بھی جوش پھیلا ہوا تھا۔ کیلوِن جیسا کہ ہمیں معلوم ہے فرانسیسی تھا اور اس کی تصانیف زیادہ تر فرانسیسی زبان میں تھیں فرانسیسی لوگوں پر ان تصانیف کا گہرا اثر ہوا

اس کے پیرو ہر طبقے کے لوگوں میں موجود تھے خصوصاً مزدور پیشہ لوگوں میں ان کی تعداد بہت تھی فرانس میں پروٹسٹنٹ تحریک کی نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ بہت سے رؤسا بھی اس گروہ میں شامل ہوگئے تھے۔ اس لحاظ سے فرانس کی پروٹسٹنٹ تحریک اسکاٹلینڈ میں اصلاحات کے ابتدائی دور سے بہت مشابہت رکھتی ہے اور فرانسیسی امراء کو اسکاچ شرفاء کی طرح اس نئی تحریک کی طرف زیادہ رجحان محض مذہبی عقیدہ تمندی کے باعث نہ تھا بلکہ اس نئی تحریک کی ذریعہ سے بادشاہ وقت کی مخالفت کرنے کا ان کو حیلہ مل جاتا تھا اور ساتھ ہی اس کے لوٹ مار کی بھی امید رہتی تھی۔ مغربی اور جنوبی فرانس میں پروٹسٹنٹ مذہب کا چرچا زیادہ تھا۔ خود شہر پیرس تو ہمیشہ سے سخت مخالف تھا اور وسطی و مشرقی فرانس میں بھی بہت کم لوگ اس مذہب کے پیرو تھے۔

کیالون (Calvin) اپنی تحریک کی رفتار کو جنیوا (Geneva) سے بغور دیکھتا رہا اور ایک زمانہ میں وہ سمجھتا تھا کہ اگر تبلیغ و اشاعت کی آزادی دی جائے تو فرانس سے کیتھلک مذہب نیست و نابود ہو جائے لیکن واقعہ یہ ہے کہ فرانس میں پروٹسٹنٹ فرقہ کبھی کیتھلک فرقہ سے تعداد میں نہ بڑھ سکا کیالون کی سختی اور پابندی کے لزوم کی وجہ سے بہت سے لوگ جو کیتھلک مذہب کی تخیل و حسن آفرینی کے دلدادہ تھے اس طرف رجحان نہ رکھتے تھے اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا پروٹسٹنٹ مذہب کا ساجوش وخروش کیتھلک مذہب میں بھی پیدا ہوگیا۔ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ فرانس میں اس خیال کے لوگ بھی تھے جو ان دونوں مخالف فرقوں سے علحدہ تھے ڈچ عالم ایرازمس (Erasums) کے ایسے بہت سے لوگ یورپ میں تھے جو دونوں فرقوں میں سے کسی میں اپنی شمولیت پسند نہیں کرتے تھے اور لوتھر کے ساتھ شریک ہونے سے قطعاً انکار کرتے تھے یہی درمیانی رویہ فرانس میں بھی

ابتداءً رابلے (Rabelais) نے اختیار کیا اور آخر زمانہ میں مانتائین (Montaigne) کی تحریریں امید افزا ہیں لیکن آخر الذکر اصلاح کی طرف سے مایوس تھا یہ دونوں اگرچہ کیتھلک گروہ میں سے تھے مگر کیتھلک تحریک ردعمل سے بالکل بے تعلق تھے رواداری کی تلقین کرتے تھے اور عقل و فراست سے کام لینے کو کہتے تھے اور دونوں فرقوں کے پیشواؤں کے دلائل سے ان کی تشفی نہ ہوتی تھی آئندہ نصف صدی تک تو امور عامہ پر ان لوگوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا لیکن بعد کی صدیوں میں رابلے اور مانتائن کا اثر فرانس پر اتنا ہی پڑا جتنا کہ کیالون یا اگناشیس لیبولا (Ignatius Loyalla) کا۔

ہنری دوم کی وفات پر اس کے بیٹوں میں کوئی سن شعور کو نہیں پہنچا تھا کہ فرانس کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتا۔ بیوہ ملکہ مشہور (بلکہ بدنام کہنا زیادہ موزوں ہوگا) کیتھرین ڈی میڈی چی (Catherine de Medichi) تھی اس کے خاوند نے اسے کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا تھا اور اب اس کو اقتدار حاصل کرنے کا موقع ملا بعض مواقع پر اس کو کیتھولک مظالم کا حامی بتلایا گیا ہے اور اس کے افعال مذہبی تعصب پر مبنی بتلائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اصل حقیقت نہیں ہے اس کے طرز عمل کا باعث اس کا مذہبی جوش نہ تھا بلکہ اس کے سیاسی مقاصد تھے میڈی چی خاندان سے تعلق رکھنے سے اس کا مذہب کیتھلک ہی تھا لیکن مذہبی عقیدتمندی اس میں بہت کم تھی اور اس کی عقیدتمندی کا کوئی اثر اس کے اعمال پر نہ تھا۔ کیتھلک مذہب کے عقائد سے زیادہ نجوم کے توہمات کو اس کے مزاج میں دخل تھا اس کے کئی بچے تھے مگر سب کم عمر تھے اور نہ کسی میں دماغی یا جسمانی قوت کے آثار تھے۔ چند سال تک تو ان میں سے کوئی فرانس پر حکومت کرنے کے قابل نہ تھا۔

اس لئے کیتھرین | بوربان (Bourbon) اور گیز (Guise) کے خاندان

خالی تخت پر خود قبضہ کرنا چاہتی تھی لیکن ان رؤسا سے اس کو مقابلہ کرنا تھا جو خود اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے اور جن کی باہمی رقابت مذہبی اختلافات کی وجہ سے بڑھی ہوئی تھی ایک طرف تو بوربان (Borbon) خاندان تھا جس کے سردار انٹنی نوار (Antony — Navaire) کا کمزور حکمراں اور اس کا جوشیلا بھائی شہزادہ کانڈی (Conde) تھے ان لوگوں نے کیلون کا مذہب حصول منفعت کے لئے اختیار کر لیا تھا دوسری طرف گیز (Guise) کا خاندان تھا۔ یہ خاندان اصل میں لورین (Loraine) کا تھا مگر رفتہ رفتہ فرانسیسی دربار میں حاوی ہوگیا تھا اپنے اغراض کی وجہ سے اور عقیدۃً بھی یہ لوگ کیتھولک کلیسہ سے وابستہ تھے کارڈنل ڈی گیز جو اپنے زمانہ کے بڑے با اثر پادریوں میں تھا اور گائز کا ڈیوک فرانسس (Francis). اپنے ملک میں بہترین سپاہی سمجھا جاتا تھا۔ درباریوں میں صرف ایک شخص تھا جسے کیتھرین تاج کا خیر خواہ سمجھ سکتی تھی اور یہ سلطنت کا چانسلر لوپی تال (L Hopital) تھا۔ وہ مذہبی آدمی تھا۔ لیکن دونوں مذہبی فرقوں میں مصالحت کرانے کا خواہاں تھا اور یورپ کے ان لوگوں میں تھا جو صدق دل سے مذہبی رواداری کے امکان کا اعتقاد رکھتے تھے۔

چارلس نہم (Charles IX) اسکاٹلینڈ (Scots) کی ملکہ میری (mary) کے خاوند فرانسس دوم (Francis II) کی مختصر حکومت مذہبی مناقشات سے بھری ہوئی تھی۔ سنہ ۱۵۶۰ء میں وہ فوت ہوا اور اس کا بھائی چارلس نہم (Charles IX) اس کا جانشین ہوا اس بات کی کوشش کی گئی کہ دونوں فرقوں کا ایک مشترک جلسہ منعقد کرکے کوئی تصفیہ کر لیا جائے لیکن یہ کوششیں قبل از وقت اور بیکار ثابت ہوئیں لوپی تال نے شاہی حکم سے ایک فرمان جاری کیا کہ پروٹسٹنٹ فرقہ والے چند شرائط کے ساتھ اپنے طریقہ پہ عبادت کر سکتے ہیں۔ لیکن دونوں فرقے تو ایک دوسرے پر

کامل فتح کے خواستگار تھے اس لئے کسی مصالحت کا خیال ان کے ذہن میں نہ آسکتا تھا مارچ ۱۵۶۲ء میں ڈیوک آف گیز ایک فوج لے کر شہر واسی سے گزرا۔ اس وقت کیا لوتی فرقہ کی ایک جماعت عبادت میں مشغول تھی سپاہیوں کے گزرنے سے ان کی عبادت میں خلل ہوا اس کی وجہ سے جو شور وشغب ہوا تو اس میں کئی ایک عبادت کرنیوالے مارے گئے یہ واقعہ جو واسی کے قتل عام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے خانہ جنگی کا باعث ہوا۔

جنگ کی خصوصیات

اس کے بعد سے تیس سال تک فرانس کو امن نصیب نہ ہوا۔ یورپ میں اس ملک کا وقار بھی گھٹ گیا اور اس کی دولت اور مرفہ الحالی بھی کم ہو گئی اور معاشرتی لحاظ سے بھی یہ جنگ یورپ کی بدترین جنگ تھی۔ یہ جنگ سات آٹھ لڑائیوں پر مشتمل ہے جن میں کوئی اہم لڑائی نہ ہوی۔ اور ہمیشہ رواداری کی جھوٹی مصالحت سے ان کا خاتمہ ہوتا رہا۔ ان سب لڑائیوں میں عموماً کیتھلک فرقہ فائق میں رہا۔ اور پروٹسٹنٹ فرقے والے بے یار و مددگار ہونے کے باعث اپنے غنیم پر کوئی نمایاں فتح نہ حاصل کر سکے اگر اس وقت کوئی زور دار حکمراں ہوتا تو غالباً کیتھلک فرقے کو کامل فتح حاصل ہوجاتی لیکن کیتھرائن ایسی فتح کی خواستگار نہ تھی جس سے کیتھلک سردار خطرناک طور پر حاوی و با اثر ہو جاتے اس لئے دونوں فرقوں میں توازن قائم رکھنا ہی اس نے مناسب سمجھا او لا پروٹسٹنٹ فرقہ کی قوت کا دار و مدار رؤسا پر تھا۔ مگر آخر میں مغربی وجنوبی شہر والے اس کے زبردست علمبردار ثابت ہوئے۔ اینٹھنی رئیس نوار (Antony of Navarre) اور شہزادہ کانڈی (Conde) اس کے پیشوا تھے لیکن سب سے مشہور امیر البحر کالی نی تھا جو اپنی فوجی مہارت اور راستبازی کے لحاظ سے اس صدی کے پاکبازوں اور ناموروں میں سے تھا۔

ہیوگوناٹ (Huguenot)

پہلی جنگ میں ملکہ ایلزابتھ (Elizabeth) نے پروٹسٹنٹ لوگوں کو جو عام طور پر فرانس کے ہیوگینو (Huguenot) کے نام سے مشہور تھے کچھ مدد دی لیکن ناکامی کے باعث انگلستان کی ملکہ نے پھر امداد دینے سے گریز کیا۔ دونوں مبارزین باہر کی امداد کے متوقع تھے پروٹسٹنٹ گروہ کو وقتاً فوقتاً جرمنی اور سوئزرلینڈ سے امداد ملتی رہی اور کیتھلک گروہ کو اسپین کی امداد پر بھروسہ تھا نیدرلینڈ میں ہسپانوی سپاہ کی موجودگی نے جس کا ذکر گزشتہ باب میں کیا گیا ہے فرانس کی جنگ کی رفتار پر خاص اثر کیا پہلی تین لڑائیوں کا ذکر ہم سرسری طور پر کئے دیتے ہیں۔ ان لڑائیوں کے دوران میں حکمران اور شہزادہ کانڈی دونوں کام آئے اور ڈیوک آف گائز ارلیون (Orleans) کا محاصرہ کرتے وقت مارا گیا تیسری جنگ البتہ بہت سخت تھی اس جنگ میں پروٹسٹنٹ فرقہ والے دو لڑائیاں لڑے اور دونوں ہار گئے ۱۵۷۰ء میں جبکہ پروٹسٹنٹ

صلح سینٹ ژرمین (St. Germain)

گروہ پر زبردست حملہ ہونے کی امید تھی ایک صلح ہوگئی جو صلح سینٹ ژرمین (St. Germain) کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے دوران میں اس طرح کی کئی صلحیں ہوئیں لیکن یہ صلح سب سے بہتر تھی ہر شخص کو اپنے ضمیر کے مطابق عقائد و خیالات رکھنے کی آزادی دی گئی اور رؤسا کے قلعوں میں اور دو شہروں میں جو فرانس کے دونوں حصوں میں منتخب کئے جائیں۔ عبادت کی آزادی بھی دی گئی۔ ساتھ ساتھ مدارس اور سرکاری ملازمت میں پروٹسٹنٹ فرقہ والوں کو مساویانہ حقوق عطا ہوئے۔ کامل رواداری تو نہیں حاصل ہوئی لیکن اگر اس کے مطابق عمل جاری رکھا جاتا تو اس نوبت پر پہنچنا بھی ممکن تھا اور اس سے کم از کم اتنا تو ضرور ہوا کہ پروٹسٹنٹ فرقہ کی حالت سنبھل گئی۔

چارلس نہم اور کاتھرائن ۱۵۷۰ء و ۱۵۷۲ء کے درمیان کا زمانہ نہایت نازک اور پُراسرار ہے اسی زمانہ میں یوم سینٹ بارتھلومیو کا قتل عام ہوا جس کے متعلق بہت سی باتیں اب تک معرض بحث میں ہیں۔ ان سنین کی نمایاں خصوصیات یہ معلوم ہوتی ہیں کہ نوعمر پادشاہ چارلس نہم کو اپنے فرائض اور فرانس کی حالت کا احساس و اندازہ ہوگیا تھا اس کو معلوم تھا کہ خانہ جنگی سے ملک کی قوت کمزور ہوجاتی ہے۔ اور ہسپانیہ کی ہم پلہ سلطنت بظاہر ترقی کی شاہ راہ پر گامزن ہے اس کو کاتھرائن سے انس پیدا ہوگیا۔

فرانس کی جدید حکمت عملی اور اس پر پروٹسٹنٹ قائد اعظم کے حبّ وطن اور ہمت سے وہ متاثر ہونے لگا۔ ایک نیا طرز عمل اختیار کرنے کی تجویز ہوئی کہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں اتفاق و ارتباط کے ساتھ فرانس میں رہیں اور قوم کی متفقہ قوت نیدرلینڈز کی حمایت میں اسپین کے خلاف جنگ کرنے میں صرف کی جائے۔ یہ حکمت عملی ایسی ہی تھی جو بیس سال بعد ہنری رئیس نوار نے اختیار کی اور اس سے نہایت شاندار نتائج مرتب ہوئے اور اس کے بعد کی صدی میں ریشلیو نے بھی اسے اختیار کیا۔ یہ بھی خیال تھا کہ ایلزبتھ (Elizabeth) ملکۂ انگلستان سے اتحاد قائم کیا جائے اور بادشاہ کے بھائی ہنری سے اس کا عقد ہو اور بادشاہ کی ہمشیرہ مارگریٹ آف والوا (Margarret of velois) کا عقد پروٹسٹنٹ فریق کے آئندہ پیشوا ہنری رئیس نوار (Henry of Navarre) سے ہو۔ یہ خیال تھا کہ ۱۵۷۲ء کے خزاں کے اوائل میں فرانس اس جنگ میں شریک ہوجائے گا ایلزبتھ کا عقد تو نہ ہوا لیکن اتحاد قائم ہوگیا ہنری رئیس نوار کا عقد البتہ مارگریٹ سے ہوگیا اور اب فرانس کے

یوم سینٹ بارتھلومیو کا قتل عام۔ طرز عمل میں تغیر ہونے کی توقع ہوگئی کہ یکایک ۲۴ اگست ۱۵۷۲ء کو سینٹ بارتھلومیو (Bartholomews) کی برسی کے دن قتل عام کی خبر پھیل گئی اپنے مخالفین کا قتل عام کرا کے مذہبی مشکلات کا حل کرنا کیتھرائن کے ذہن میں پہلے سے تھا لیکن

اس قتل عام کی تجویز بہت پہلے سے نہیں سوچی گئی تھی اس کا اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کالگنی کے روز افزوں اثر کو دیکھ کر کیتھرین کے دل میں حسد اور خوف پیدا ہوا کہ اگر کوئی تدبیر نہ کی گئی تو بہت جلد اس کا اقتدار زائل ہو کر سلطنت کے امور میں اس کا اثر گھٹ جائے گا۔ اطالوی تجربات کی بناء پر اس کو ایک تدبیر سوجھی کہ کالی نی قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ جب کالی نی اپنے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک قاتل نے اس پر حملہ کر کے اسے زخمی کیا لیکن جان کا خطرہ نہ تھا اس کے ہم مذہب پروٹسٹنٹ لوگوں نے کامل تحقیقات کا مطالبہ کیا کالی نی کے قتل میں ناکام رہنے سے کیتھرائن اس سے بھی سنگین جرم کے ارتکاب پر آمادہ ہو گئی اور بادشاہ کے بھائی ہنری اور ہنری ڈیوک گائز اور پیرس کے دیگر عمائد کے ساتھ شریک ہو کر اس نے یہ طے کیا کہ پیرس کے مذہبی دیوانوں اور عوام کو ہیوگوئی نوں کے خلاف برانگیختہ کیا جائے بادشاہ باوجودیکہ کالی نی سے انس رکھتا تھا قتل عام کی اجازت دینے پر آمادہ ہو گیا کیونکہ اس کو یہ باور کرایا گیا کہ خود اسی کی زندگی خطرہ میں ہے۔ کالی نی کے قتل کے لئے خود ڈیوک آف گیز مامور ہوا اور پیرس اور فرانس کے دوسرے حصوں میں ہیوگینو کی ایک بڑی تعداد قتل کی گئی ان مقتولین کی تعداد دس ہزار[1] تک بتلائی جاتی ہے۔

قتل عام کی ناکامی۔

مگر اس قتل عام کے بعد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ یہ مجرمانہ فعل سخت حماقت پر مبنی تھا ہیوگوئی نو اپنے سردار اور بہت سے آدمیوں کے ضائع جانے سے کمزور تو ضرور ہو گئے مگر انھوں نے فوراً ہتھیار اٹھا لئے اور اپنی جانیں بچانے کے لئے استقلال کے ساتھ جنگ پر آمادہ ہو گئے اس فعل کو بجز چند کیتھلک لوگوں کے تمام یورپ نے مذموم قرار دیا۔ انگلستان بھی فرانس سے علیحدہ ہو گیا اور اس کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں ان میں ہیوگوئی نو کو

[1] مقتولین کی تعداد کا تعین دشوار ہے مورخ سولی ستر ہزار کا اندازہ کرتا ہے لارڈ ایکٹن کا خیال ہے کہ صرف آٹھ ہزار قتل ہوئے

کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اس قتل عام کے ایک سال بعد ۱۵۷۳ء میں حکومت نے ان کو امان دی اور اس صلح میں سینٹ ژرمین کی (St. Germain) صلح کی سی بہت سی باتیں طے ہوئیں۔

شاہ ہنری سوم

چند روز کے بعد چارلس نہم کا انتقال ہو گیا اور اس کا بھائی ہنری سوم کے نام سے تخت نشیں ہوا پروٹسٹنٹ فرقہ کے خلاف ابتدائی مہم میں اس نے بہت سرگرمی دکھائی تھی اور پولینڈ کا تاجدار بھی منتخب ہوا تھا لیکن اپنے بھائی کی وفات کی خبر سنتے ہی پولینڈ سے روانہ ہو کر فرانس آگیا قتل عام کی تحریک میں یہ خاص طور پر شریک تھا اس لئے اس کے آتے ہی پھر جنگ شروع ہو گئی لیکن جنگ میں کوئی مستعدی نہیں دکھلائی گئی کیونکہ بادشاہ تن آسانی اور عیاشی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ہر چند کبھی کبھی وہ مجنونانہ مذہبی ریاضت میں بھی مشغول ہو جاتا لیکن یہ ریاضتیں کسی مذہبی عقیدت مندی اور خلوص پر مبنی نہ ہوتی تھیں اس وجہ سے معمولی جنگ و جدال کے بعد پھر حسب سابق صلح ہو گئی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس قسم کی لڑائیاں اور صلحیں مدت تک جاری رہیں گی جس کا انجام بجز فرانس کی تباہی کے اور کچھ نہ تھا۔

سیاسوں کی جماعت

لیکن پھر بھی صورت حال میں تغیر ہو رہا تھا اور نئی قوتیں پیدا ہو رہی تھیں جس کی وجہ سے ہنری کے ذاتی طرز عمل کی اہمیت کم ہوتی جارہی تھی ایک طرف تو ایک ایسی جماعت تیار ہو رہی تھی جو اہل سیاست کے نام سے موسوم تھی یہ جماعت ملک کی بہبودی کو مذہبی خیالات پر مرجح خیال کرتی تھی اور اس غرض کے حصول کے لئے چند رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ آپس میں متفق و متحد ہو گئے ان کی علانیہ غرض یہ تھی کہ حکومت کی بنیاد مذہبی رواداری پر رکھی جائے۔ کچھ دنوں تک اس جماعت کی قیادت کا مسئلہ زیر بحث تھا اس جماعت میں تقریباً سب ہیوگوناٹ شامل تھے۔ لیکن جب ہنری ڈیس نوار کیتھلک مذہب سے برگشتہ ہو گیا۔

جیسے وہ قتل عام کے وقت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا تھا اور پیرس سے بھاگ کر جنوب میں پروٹسٹنٹ لوگوں سے جا ملا تو انھوں نے اسے اپنا پیشوا تسلیم کر لیا۔ کیالون (Calvin) کے عقائد اور ضوابط کا مستقل اثر کبھی بھی ہنری پر نہ ہوا اور وہ محض خاندانی تعلق کی وجہ سے پروٹسٹنٹ گروہ میں شامل ہوا تھا

نویر کا ہنری ہیوگوناٹ لوگوں کے سردار کی حیثیت سے۔

مگر اس نے وفاداری کے ساتھ بہت دنوں اس گروہ کی خدمت کی گو وہ کوئی بڑا سپہ سالار نہ تھا لیکن دست بدست لڑائیوں میں وہ بڑا جری سردار ثابت ہوا اور پروٹسٹنٹ گروہ کے لئے اس کی قیادت یوں بھی زیادہ اہم معلوم ہوئی کہ فرانس کے تخت پر اس کے بیٹھنے کی توقع تھی کیونکہ نہ تو فرانسس دوم نے کوئی اولاد نرینہ چھوڑی تھی اور نہ چارلس نہم نے۔ ہنری سوم کے کوئی اولاد ہی نہ تھی اور یہی حالت اس کے بھائی ڈیوک آف الان سون (Duke of Alencan) کی تھی جس نے (Angel) کا خطاب اختیار کیا تھا۔ مردوں میں ہنری رئیس نوار ہی قریبی وارث تھا۔

کیتھولک انجمنیں

پروٹسٹنٹ اور رواداری کی تحریکوں کا نظام جب اس طور پر تقویت حاصل کر رہا تھا کیتھولک لوگوں میں بھی نئی تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ بادشاہ کے طرز عمل اور افعال سے لوگوں کو نفرت ہو گئی تھی اور زیادہ جوشیلے کیتھولک بجائے بادشاہ ہنری سوم کے ڈیوک آف گائز کو اپنا سردار سمجھتے تھے۔ ایک کیتھولک اتحاد قائم کرنے کی تجویز پیش ہو چکی تھی اور روما و اسپین نے اسی تجویز پر لبیک کہا تھا ۱۵۸۴ء میں ڈیوک آف آن ژو کی وفات سے اس انجمن کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی کیونکہ کیتھرین کی اولاد نرینہ میں سے کوئی باقی نہ تھا۔ وراثت کے معمولی قواعد کے لحاظ سے ہنری رئیس نوار ہی تخت فرانس کا وارث تھا اور وہ مذہباً پروٹسٹنٹ تھا۔ اس کو روکنے کے لئے یہ کیتھولک اتحاد قائم ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ

تمام ملحدوں اور ان کے طرفداروں کو تخت فرانس سے علٰحدہ رکھا جائے

کیتھلک مدعیان تخت و تاج

اس اتحاد نے ہنری آف نوار (Henry of Navorres) کے چچا کارڈنل بوربون کو بادشاہت کے لئے منتخب کیا مگر اس فیصلہ سے بجز طوالت کے کوئی قطعی تصفیہ نہ ہوسکا کیونکہ منتخب شدہ شخص خود ضعیف اور لاولد تھا۔ اس لئے یہ سوال کہ فرانس کے تخت کو کونسا کیتھلک بادشاہ زینت بخشے زیادہ اہم تھا۔ ہسپانیہ کا شاہ فلپ دوم خود اپنے لئے کوشاں تھا اور اگر وہ کامیاب رہتا تو اس کو نیدرلینڈز اور انگلستان میں جو ہزیمتیں اٹھانا پڑی تھیں ان کا معاوضہ مل جاتا۔ لیکن فلپ کے ہاتھ میں فرانس کا تخت اگر چلا جاتا تو فرانسیسیوں کے قومی جذبہ کو ٹھیس لگتی اس لئے ایک کثیر تعداد ہنری ڈیوک گیز کی حامی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہنری سوم کا رجحان بمقابلہ اس مقدس اتحاد کے "جماعت سیاسی" کی طرف زیادہ تھا لیکن اتحاد کا برملا مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی اس لئے برائے نمائش اس کا حامی ہوگیا اور پروٹسٹنٹ لوگوں کے خلاف پھر ایک مرتبہ جنگ کرنے پر مجبور ہوا۔ اس جنگ کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس جنگ پر مذہبی مسئلہ کے تصفیہ کا دارومدار ہے خود بادشاہ نے اس جنگ میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا اس کا سپاہیانہ ولولہ ٹھنڈا ہوگیا تھا اور فوج کی کمان اس نے اپنے معتمدین کے سپرد کردی۔ انہی میں سے ایک کے مقابل ۱۵۸۷ء میں ہنری رئیس نوار نے ایک شاندار فتح بمقام کوترا (Coutras) حاصل کی لیکن فوراً اس کا بدلہ ہوگیا کہ جرمن اور سوئس جو اسی کی مدد کو آرہے تھے ہنری آف گائز کے ہاتھوں شکست کھاگئے۔ اب فرانس کے کیتھلک گروہ کا مرد میدان ڈیوک ہنری قرار پایا وہ پیرس آیا جہاں کیتھلک کا زور سب مقاموں سے زیادہ تھا لیکن ہنری سوم نے اسے شہر میں داخل ہونے سے منع کردیا لیکن اس ممانعت کے

باوجود وہ شہر میں داخل ہوا اور لوگوں نے نہایت جوش وخروش سے اس کا استقبال کیا۔ بادشاہ اس کی ہلاکت کی فکر کرنے لگا اور شہر کا محاصرہ کرنے کے لئے باہر سے فوج طلب کی۔ اس دھمکی پر شہر کے باشندے بلوہ کر بیٹھے جگہ جگہ مورچے تیار کئے گئے۔ بادشاہ اس ہنگامہ کو فرو کرنے سے مجبور تھا۔ آخر کار اسے اپنے رقیب کی منت سماجت کرنی پڑی اور اس کی درخواست پر ہنری آف گیز نے بلوہ فرو کیا۔ بادشاہ ایسے شہر میں رہنا پسند نہ کر سکتا تھا جس نے اس کی توہین کی تھی اس لئے وہ راتوں رات محل سے نکل بھاگا۔

لیکن امداد کے لئے وہ جاتا تو کس کے پاس۔ تمام کیتھلک فوج تو ہنری گیز کی دلدادہ تھی اور ہنری آف نوار اور اس کے ساتھی پروٹسٹنٹ گروہ سے ابھی صلح کرنا ممکن نہ تھا۔ لامحالہ اس کو پھر ہنری گیز کی خوشنودی حاصل کرنا پڑی اور ایک مرتبہ پھر وہ مقدس اتحاد میں گو برائے نام سہی لیکن شریک ہو گیا۔

مجلس طبقات مجتمعہ بمقام بلوآ۔ (Blois)

ہنری سوم کو اب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پیرس کے باہر بھی اس کی کچھ نہیں چلتی اور جو کچھ زور تھا اتحاد کا تھا۔ فرانس کی تاریخ میں نازک موقعوں پر جیسا ہوتا رہا ہے۔ اس نے بھی وہی پرانی تدبیر سوچی۔ اس نے مملکتوں کی ایک عام مجلس بمقام بلوآ (Blois) منعقد کی۔ اسے امید تھی کہ رعایا کے نمایندے اس کی اعانت کریں گے۔ لیکن نتیجہ سے اسے معلوم ہوا کہ تینوں طبقوں (رؤسا۔ پادری۔ عوام) میں کثرت رائے اس کے خلاف ہے۔ بادشاہ تو برائے نام وہی تھا لیکن حکومت حقیقت میں ہنری گیز کرتا تھا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یوم بارتھلومیو کے قتل عام میں بادشاہ نے خاص طور پر حصہ لیا تھا اور اس وجہ سے وہ اطالوی عیاریاں اور چالاکیاں خوب جانتا تھا۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ ہنری گیز ہی اس کا حقیقی دشمن ہے اور اسی کی وجہ سے اسے یہ تمام ذلتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اس لئے اس سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے قتل کی تجویز نکالی

خاندان گیز (Guise) کا قتل

ڈیوک کو معلوم تھا کہ میں خطرے میں ہوں۔ مگر اس نے خیال کیا کہ بادشاہ کو اتنی جرأت نہیں ہو سکتی ۱۵۸۸ء میں جب وہ بادشاہ کی قیام گاہ میں داخل ہو رہا تھا مار ڈالا گیا۔ اس کا بھائی بھی جو کارڈنل تھا کچھ ہی دنوں بعد مار ڈالا گیا اور بادشاہ اپنی کامیابی پر مسرور ہو کر اپنی ماں کیتھرین کو اس واقعے کی اطلاع دینے گیا حالانکہ وہ بیمار اور قریب الموت تھی اس نے بادشاہ کو تنبیہ کیا کہ فرانس کے حقیقی بادشاہ ہونے کی دھن میں اس نے اپنے اقتدار کو بالکل گھٹا دیا ہے جس کا نتیجہ وہ خود دیکھ لے گا۔

ہنری سوم اور نوار کے ہنری (Henry of Navarre) کا اتحاد۔

اور انجام بھی یہی ہوا۔ "اتحاد کا بادشاہ" جیسا کہ لوگ ہنری آف گیز کو سمجھتے تھے ہلاک ہو چکا تھا لیکن اتحاد ہنوز قائم تھا اور وہ سب لوگ جو کسی مصلحت یا غرض سے کیتھلک مذہب سے وابستہ تھے کسی حالت میں اتحاد کے سردار و حامی کے قاتل کی اطاعت پر آمادہ نہ تھے۔ اس نا امیدی میں ہنری کے لئے لازم تھا کہ کہیں نہ کہیں اور سہارا ڈھونڈھتا۔ بحالت مایوسی وہ بالکل خلاف امید ہنری رئیس نوار اور اس کے ہم مذہب پروٹسٹنٹ لوگوں اور اہل سیاست کی طرف رجوع ہوا۔ یہ جماعت اس وقت یہ دعویٰ کر رہی تھی کہ تخت شاہی کے موروثی حقوق کو کوئی چیز زائل یا ساقط نہیں کر سکتی اور اسی اصول ملوکیت کی بنا پر ہنری کو ان لوگوں کی ساتھ اتحاد قائم کرنے کا حیلہ مل گیا۔ دونوں غنیم اور مخالفین کی ملاقات ہوئی ہنری سوم نے مسیحیت کا رشتہ قایم رکھنے پر زور دیا اور کہا کہ یہ رشتہ جزئی اختلافات سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ الفاظ ایسے شخص کے منہ سے جو سینٹ بارتھولومیو کے قتل عام کے بانیوں میں سے تھا عجیب اور بے محل تھے بہر حال اس نے ہنری رئیس نوار سے

پھر اتحاد قائم کر لیا اور دونوں کی متفقہ فوج دشمنوں پر حاوی نظر آنے لگی اتحادیوں کی فوج کھلے میدان میں ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی اس لئے پیرس پر حملہ کیا گیا اگر پیرس فتح ہو گیا اور اس کا فتح ہونا یقینی تھا۔ تو پھر ہنری چہارم ہی بادشاہت کرتا حالانکہ وہ ہیوگینو تھا۔ لیکن پیرس میں مذہبی جوش دیوانگی کے حد تک پہنچ گیا تھا۔ ڈامنیکن سلسلہ کا ایک درویش محصور شہر میں سے باہر آیا اور سیدھا ہنری سوم کے حضور میں پہنچا اور وہیں ایک مہلک وار بادشاہ پر کیا۔

ہنری سوم کا قتل

ہنری کی موت نے سیاسی اکھاڑے سے صرف ایک معمولی ہستی کو مٹا دیا مگر اس کی وجہ سے سیاسی حالت دگرگوں ہو گئی۔ بہت سے کیتھلک ایسے تھے جو کیتھلک مذہب والے ہنری سوم کی اطاعت پر آمادہ تھے مگر پروٹسٹنٹ مذہب والے ہنری نوار کی اطاعت کرنے کی ان کا ضمیر اجازت نہیں دیتا تھا اسی وجہ سے گو ہنری نوار نے ہنری چہارم کا لقب اختیار کر لیا مگر اس کی فوج اتنی قوی نہ رہی کہ وہ پیرس کا محاصرہ قائم رکھ سکتا اور اس کی حالت پھر ایک قسمت آزما سپاہی کی سی ہو گئی جو تخت کے لئے لڑ رہا تھا

جنگ ایوری (Ivry) سنہ ۱۵۹۰ء

اس کو نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں ملکۂ ایلزبتھ سے تعلقات پیدا کرنے کی غرض سے وہ ڈیپ (Dieppe) کی طرف روانہ ہوا اس کو معلوم تھا کہ اسپینی ارمڈا (Armada) کی شکست کے بعد سے ملکہ بہت آسانی سے اس کی مدد کر سکتی تھی ڈیپ کے پاس بمقام آرک (Arques) اس کو ایک بہت بڑی فتح حاصل ہوئی اور اس کے بعد ایوری (Ivory) کی جنگ میں اس نے پھر اپنے غنیم کو شکست دی اس کو کامل فتح حاصل کرنے کی امید ہو چلی تھی اور اس کی شجاعت اور ہمدردی کے ایسے قصے مشہور ہو گئے تھے کہ اس کے مخالفین میں سے بہتوں کا دل اس کی طرف سے

کھینچ رہا تھا ایوری کی فتح کے بعد وہ پیرس کی طرف بڑھا اور شہر کا محاصرہ کر لیا شہر میں فاقہ کی نوبت پہنچ گئی اور باوجود کیتھلک جوش و خروش کے یہ معلوم ہونے لگا کہ بہت جلد فرانس کا دارالسلطنت ہیوگینو بادشاہ کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ لیکن ہنری سوم کی وفات سے مقدس اتحاد کی حالت میں بھی تغیر ہو گیا تھا فلپ دوم شاہ اسپین نے یہ خیال کیا کہ اس اتحاد کی امداد سے وہ فرانس کو فریق مخالف کے ساتھ ملنے سے روک سکتا ہے اور یہ خود اپنے لئے تخت فرانس بھی حاصل کر سکتا ہے کیونکہ کیتھلک اتحاد پیرس ہنری چہارم کا اس قدر مخالف تھا کہ ہر قسم کی کارروائی پر رضامند ہو جاتا بعض لوگ اس میں ایسے بھی تھے کہ وہ فرانس کو بالکل ہی اسپین کے قبضہ میں دیدینا چاہتے تھے اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ جو اس کے سخت مخالف بھی تھے اور وہ مقتول ڈیوک آف گیز کے بھائی مئینن (Mayenne) کے طرفدار تھے ان خیالات و امیدوں کی وجہ سے جو اگر پوری ہو جاتیں تو انگلستان اور نیدرلینڈز کی ہزیمتوں کا معاوضہ ہو جاتا فلپ پیرس کا سقوط کسی طرح گوارا نہ کر سکتا تھا اس نے اپنے سپہ سالار پارما (Parma) کو جو اسوقت نیدرلینڈز میں جنگ کر رہا تھا حکم دیا کہ پیرس کی طرف بڑھکر شہر کو بچائے۔ ہنری چہارم محاصرہ کی حالت میں ہسپانوی سپاہ سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا اس لئے وہ محاصرہ کو اٹھا کر ہسپانوی فوج سے جنگ کرنے کے لئے ان کی طرف بڑھا مگر پارما کی غرض تو حاصل ہو چکی تھی اس لئے وہ واپس چلا گیا ایک سال بعد ہنری نے شہر رُوادن (Rouen) کا محاصرہ کیا جس کی اہمیت یہ تھی کہ ناروے سے پیرس کو جانے کا راستہ اسی طرف سے تھا۔ یہاں بھی قریب تھا کہ اسے فتح حاصل ہو کہ پارما نے اپنی فوج کو ہوشیاری سے نقل و حرکت میں لاکر اسے اس فتح سے بھی محروم کر دیا۔ ہسپانوی سپہ سالار کا یہ آخری کارنامہ تھا

پارما (Parma) کی مدد سے پیرس کا محاصرہ اٹھ جانا۔

اور اسی مہم میں وہ زخمی ہو کر مر گیا۔

نوار کا تبدیل مذہب کرنا

اس وقت بھی اس لا متناہی جنگ کا خاتمہ ہمیشہ کی طرح بعید ہی معلوم ہوتا تھا۔ ہنری اپنے غنیم کو شکست نہیں دے سکتا تھا اور فرانس ہسپانوی بادشاہ کی حکومت نہیں چاہتا تھا کیتھلک اتحاد نے سب صوبوں کا ایک جلسہ منعقد کیا مگر اس میں اس قدر اختلاف آرا تھا کہ کسی بات کا تصفیہ نہ ہو سکا۔ کچھ دنوں سے ایک نیا خیال ہنری چہارم کے دماغ میں اس دیرینہ خلفشار سے نجات پانیکا پیدا ہو رہا تھا۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جب تک وہ پروٹسٹنٹ رہے گا فرانس والے اس کی اطاعت قبول نہیں کریں گے لیکن اگر وہ اس کو کیتھلک سمجھنے لگیں تو اغلب ہے کہ اس کی اطاعت قبول کرلیں گے۔ مذہبی عقائد میں تو وہ ہمیشہ سے ڈھل مُل یقین تھا، کالونی دیپوریٹین (Puritan) فرقوں کی زہد و تقویٰ کی اس نے کبھی پیروی نہ کی تھی بلکہ اس کے تعیش سے کالونی طبقے کے پادری خود نالاں تھے اس وجہ سے تبدیل مذہب کے لئے بہت سی تحریکیں موجود تھیں اور خود اس کے بعض پروٹسٹنٹ مشیر بھی اس طرز عمل کے حامی تھے۔ ایک طرف فرانس کا اسے فلاح و امن مدنظر تھا اور دوسری طرف اعتقادات کا مسئلہ تھا جس کی اسے زیادہ پروا نہ تھی بالآخر فرانس نے کیتھلک بن جانے کا فیصلہ کرلیا اور دکھاوے کی خاطر کیتھلک مذہب کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد مذہب میں اپنے عقیدہ کا اظہار کر کے کیتھلک عبادت میں شریک ہوا۔ (۱۵۹۳ء)۔

فرانس کا ہنری چہارم کی اطاعت قبول کرلینا۔

اس تبدیل عقائد نے سحر کا کام کیا یکے بعد دیگرے تمام شہروں نے ایسے شخص کے لئے جن کی شجاعت اور زندہ دلی کے وہ مدت سے مداح تھے اپنے دروازے کھول دئے حتیٰ کہ جن اضلاع میں کیتھلک اتحاد کا بہت زور تھا وہ بھی اس کے مطیع ہوگئے۔ پیرس البتہ کچھ دنوں تک اس کے خلاف تھا۔ اس لئے کہ وہاں ہسپانوی فوج کا ایک دستہ موجود تھا۔ لیکن پیرس کی آبادی کا بیشتر حصہ انجمن کے تعصب کے

باعث اس سے برگشتہ ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ فرانس پھر ایک بادشاہ کے تحت میں متحد ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سازش سے شہر کا پھاٹک کھولدیا گیا اور ہنری اندر داخل ہو گیا۔

ہنری پاپائے روم کو بھی ہموار کر لیتا ہے

نہایت جوش سے اس کا خیر مقدم کیا گیا اور جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے پیرس کے لوگ پھر ایک بادشاہ کا چہرہ دیکھ کر مسرت سے دیوانے ہو رہے تھے۔

پاپائے روم نے کچھ دنوں تک تبدیلی مذہب کو تسلیم نہیں کیا اور جب تک کہ پوپ اس کو نہ بخشدے کیتھلک فرانس میں اس کا اقتدار قائم و محفوظ نہیں ہو سکتا تھا۔ ۱۵۹۵ء میں خدا خدا کرکے اس کی بھی تکمیل ہو گئی اور توبہ و استغفار کے مقررہ رسومات ادا کرنے کے بعد پوپ نے شاہ ہنری چہارم کو کیتھولک مذہب میں شامل کر لیا۔

صلح وروین (Vervins)

ہسپانیہ سے ابھی تک جنگ جاری تھی اور پہلے پہلے تو ہنری اور فرانسیسی فوج آگے نہ بڑھ سکی ہنری کو اپنی تمام قوت سے کام لینا پڑا قبل اس کے کہ وہ ہسپانیوں کو پیرس کے نواح سے جہاں انھوں نے یورش کر دی تھی ہٹا سکے لیکن اسپین خستہ حال ہو گیا تھا۔ اسپین کے بادشاہ کی سب امیدوں پر رفتہ رفتہ پانی پھرتا جارہا تھا اور آخر کار ۱۵۹۸ء میں اس نے صلح وروین (Vervins) کے شرائط قبول کر لئے اور اسپین و فرانس میں پھر صلح ہو گئی۔

فرانسیسی نظم و نسق کی از سر نو ترتیب۔

اس طریقے پر ہنری کو خارجی و داخلی مخالفوں سے امن پاکر فرانس کی حکومت نصیب ہو گئی۔ لیکن نظم و نسق اور ترتیب کا کام جس کی سخت ضرورت تھی اور دقت طلب تھا۔ سی سالہ خانہ جنگی سے فرانس تباہ ہو چکا تھا۔ بہت سے اضلاع کی زراعتی زمین افتادہ پڑی تھی بلوصعات اور کبھی کبھی شہروں میں بھی بھیڑیوں کے غول

آکر تباہی پھیلاتے تھے اور رعایا کے خصائل میں وحشت آگئی تھی ہسپانیہ کو شکست دینے سے زیادہ مشکل تمام ملک کو اس فلاکت و تباہی سے نکال کر پھر یورپ کے متمدن و ترقی پذیر ملکوں میں شامل کرنا تھا۔

فرمان نانت (Nantes)

سب سے پہلے تو مذہبی مسئلہ کا تصفیہ تھا۔ کیتھلک لوگ تو اپنے نئے بادشاہ سے خوش تھے لیکن بادشاہ کے سابق معین پروٹسٹنٹ لوگ رشک کر رہے تھے اور ناراض تھے اس کی آخری مہم میں جن لوگوں نے عین مصیبت کے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا اور برابر کے مقابلہ میں لڑ کر پوری کی فتح حاصل کی تھی انھوں نے اب اس کی سپاہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا ۱۵۹۸ء میں ان کے فائدے کے لئے اس نے نانت (Nantes) کا مشہور فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کو اس نے دائمی قرار دیا اور اس فرمان کی بدولت فرانس کے پروٹسٹنٹ گروہ کو ایسے حقوق ملے کہ کسی دوسرے ملک میں مذہبی مخالفین کو کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ ان کو اجازت تھی کہ ان حدود کے اندر جو پہلی مصالحتوں کے ذریعہ قرار پائے تھے وہ آزادی سے عبادت کریں جامعات اور سرکاری خدمات میں ان کو مساوی حقوق عطا ہوئے۔ انصاف رسانی کے لئے ان کے علٰحدہ عدالتیں قائم ہوئیں جن میں پروٹسٹنٹ حکام مقرر کئے گئے اور کل مقدمات جن میں پروٹسٹنٹ مذہب والے فریق ہوں انھی عدالتوں میں پیش کرنے کا حکم ہوا چند شہر اور قلعے تقریباً ان کے قبضہ میں دیدئے گئے۔ سپاہ کی تنخواہ شاہی خزانہ سے دیجاتی اور عہدہ داروں کے تقرر کا اختیار پروٹسٹنٹ جماعت کے سرداروں کو دیا گیا اس طریقے پر ان کو اپنے شہروں میں ایک پناہ کی جگہ مل گئی جہاں سے وہ اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے آئندہ کسی خطرے کے وقت مقابلہ کر سکتے تھے یہ فرمان بے مثل تھا۔ اب تک یورپ نے مذہبی اختلافات میں اس قسم کا

انصاف اور دور اندیشی دیکھی نہ تھی اور جب تک اس پر عمل رہا معاشی حالت کے ساتھ ساتھ فرانس کی مذہبی حالت بھی سنبھلی رہی۔ لیکن اس میں نقص اور خطرہ یہ تھا کہ یہ تجویز اس زمانے کے مطابق نہ تھی۔ صرف بادشاہ اور اس زمانے کے چند مدبرین تو رواداری کے اصول کو سمجھتے تھے مگر پروٹسٹنٹ اور کیتھلک لوگ اصولاً اس کے قابل نہ تھے۔ اس وجہ سے سو سال کے اندر ہی موقع پاکر ہنری چہارم کے ایک جانشین نے اس فرمان کو منسوخ کر دیا۔

ہنری چہارم اور یسوعی فرقہ۔

یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہنری کو کیتھلک جماعت کے راسخ گروہ جیسویٹ (Jesuit) کی شورش کا مقابلہ کرنا پڑا کسی نے اس کے قتل کا اقدام کیا [illegible] جرم کا تعلق اسی جماعت سے کچھ پایا گیا تھا اور اس لئے فرانس سے یہ لوگ خارج کردئے گئے مگر کچھ دنوں بعد یہ [illegible] واپس آگئے اور [illegible] پاپائے روم کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف نہ تھا۔

بادشاہ کی مزید مطلق العنانی۔

دستوری امور میں یہ حکومت سابقہ حکومت سے بھی زیادہ مطلق العنان تھی جیسا کہ فتنہ و فساد کے بعد عموماً ہوا کرتا ہے۔ اس خانہ جنگی کی وجہ سے حکومت کا اقتدار بڑھ گیا مملکتوں کی مجلس عامہ کا کوئی جلسہ منعقد نہ ہوا کیونکہ اس مجلس نے اکثر تاج کے خلاف اور کیتھلک مذہب کی تائید کی تھی جب کبھی بادشاہ کو رائے عامہ حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ مشاہیر کی ایک مجلس منعقد کرکے ان کے سامنے معاملات پیش کرتا اور ان سے رائے لیتا تھا۔ یہ مشاہیر خود بادشاہ کے انتخاب سے مقرر ہوتے تھے پیرس کی پارلیمنٹ میں ایک اہم تغیر یہ کیا گیا کہ اراکین اگر ایک محصول جس کو پالیت

محصول پالیت (Paulet)

(Paulette) کہتے تھے ادا کریں تو ان کی رکنیت دائمی اور وراثتی کر دیجائے گی۔ اس طور پر اب پہلے کی طرح بادشاہ کا

دباؤ ان پر باقی نہ رہا اور یہی وجوہ تھے کہ آئندہ صدی کے ہنگاموں میں اس جماعت نے خاص حصہ لیا تھا۔

سُلی (Sully)

معاشی مسئلہ کا تصفیہ نہایت اہم تھا اور بادشاہ کو اس معاملہ میں اپنے مشہور وزیر سُلی (Sully) سے بیش بہا امداد ملی سلی (Sully) نے بادشاہ کو تبدیل مذہب کی رائے دی تھی مگر وہ خود پروٹسٹنٹ رہا۔ یہ شخص ایماندار اور مستقل مزاج اور نیک خصلت تھا اور جزدی معاملات پر بھی اس کی نگاہ تھی مالیات کے اُلجھے ہوئے مسائل کو اس نے خوب سلجھایا سڑکیں اور نہریں بنوا کر اور نئے طریقوں سے زراعت میں سہولت پیدا کر دی۔ فرانس میں اس نے ریشم کے کیڑے کی پرورش شروع کی جس سے فرانس میں ریشم کی صنعت بہت بڑھ گئی صنعت و حرفت کی طرف اسے زیادہ توجہ نہ تھی لیکن اس کے آقائے نامدار کو اس میں خاص دلچسپی تھی اور فرانس کی صنعت و حرفت کی ابتدا جس کا عروج آئندہ صدی کے وسط میں ہوا ہنری چہارم کے زمانہ میں ہوی۔

ژولیئے (Juliers) کا واقعہ اور ہنری چہارم کا قتل۔

ایک عرصہ تک بادشاہ کے کوئی اولاد نہوئی اور تخت کی وراثت کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا تھا لیکن والوا (Velois) ملکہ مارگریٹ سے اس کا عقد فسخ کر دیا گیا اور سنہ ۱۶۰۰ء میں ٹسکنی (Tuscony) کے ڈیوک اعظم کی ایک رشتہ دار میری ڈی می ڈی چی سے اس نے عقد کر لیا۔ اس کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جو لوئی دوازدہم کی لقب سے اس کے بعد اس کا جانشین ہوا۔ اس کی حکومت کے آخری زمانے میں جرمنی کی حالت نازک ہوئی تھی ژولیئے (Juliers) کی ریاست خالی ہو گئی تھی اور دریائے رائن (Rhine) پر واقع ہونے سے نیز جرمنی سے نیدرلینڈز کے راستے پر ہونے کے باعث تمام یورپ کے لئے اس ریاست کی خاص اہمیت تھی، سوال یہ تھا کہ یہ ملک پروٹسٹنٹ

گروہ کے قبضے میں دیا جائے یا ہپس برگ (Hapsburg) کے کیتھلک خاندن کو ملے یہ معلوم ہونے لگا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے ایک جنگ عظیم چھڑ جائے گی کیونکہ جرمنی میں اشتعال کے لئے کافی مصالحہ موجود تھا جیسا کہ ہم آئندہ باب میں بیان کریں گے ہنری چہارم نے پروٹسٹنٹ لوگوں کی طرفداری کی اور جولیرس کی حفاظت کے لئے ایک بڑی فوج لیکر جانے کو تیار ہو گیا اس طرز عمل سے انتہا پسند کیتھلک طبقہ اس کے خلاف ہو گیا اور ۱۶۱۰ء میں عین اس وقت جب کہ وہ کوچ کی تیاری کر رہا تھا ایک قاتل نے اسے ہلاک کر دیا۔

باب ششم

انگلستان سولھویں صدی میں

(۱)

سولھویں صدی میں دول یورپ کے ارتقا کا خاکہ ہم نے گذشتہ ابواب میں پیش کردیا ہے اس باب میں ہم جرمنی اسپین اور فرانس سے انگلستان کے نشوونما اور ارتقا کا مقابلہ کریں گے۔

برطانیہ کی الگ دنیا

براعظم سے علحدگی و بے تعلقی کے باعث بعض اوقات انگلستان کو بقیہ یورپ سے ایک الگ دنیا خیال کیا جاتا ہے اور اسی سبب سے اس کی تاریخ بھی دوسرے دول یورپ کی تاریخ کے حوالے کے بغیر بیان کی جاسکتی ہے لیکن اس کی یہ علحدگی و بے تعلقی جس قدر دیکھنے میں معلوم ہوتی تھی حقیقتاً اتنی نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ "مغایرت پیدا کرنے والے" سمندر نے اس کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا مثلاً دوسری دول یورپ کی طرح ۱۹۱۴ء تک سمندر کی وجہ سے اس کو فوج کا بار اٹھانے کی چنداں ضرورت نہ ہوئی اس کو مستقل فوج رکھنے کی نہ ضرورت تھی نہ اس نے کبھی رکھی۔ اسی وجہ سے اس کے تاجداروں کے اختیارات محدود تھے اور اس کے تاجدار پارلیامنٹ کی مخالفت کو فوجی کارروائی سے دبا نہیں سکتے تھے جیسا کہ فرانس اور اسپین اور جرمنی کے اکثر حکمرانوں نے کیا۔ انگلستان کا دستور اور اس کی سلطنت دونوں سمندر کے عطیات ہیں۔ جغرافی علحدگی سے ہی کل مذہبی و سیاسی و ملی تحریکوں نے اس ملک میں ان تحریکوں سے جو براعظم پر جاری ہوئیں ایک مختلف شکل اختیار کرلی۔

آئین و دستور انگلستان کا عطیہ بحر ہونا۔

تاہم تاریخ انگلستان کی بے تعلقی کے متعلق مبالغہ ہو سکتا ہے۔ مذہبی سیاسی و جغرافی ہر حیثیت سے انگلستان یورپ میں شامل ہے اور اس کی تاریخ کا یوروپین تمدن کی کل تحریکوں پر بغیر نظر ڈالے سمجھنا مشکل ہے۔ سولھویں صدی میں تو خاص طور پر انگلستان کی تاریخ بقیہ یورپ کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے اور اس ملک کی نشو و نما فرانس کی نشو و نما کے متوازی تھی۔

طرز حکومت میں یہ مشابہت خاص طور پر نمایاں تھی۔ لنکاسٹرین (Lancastrian) خاندان کے عہد میں حکومت انگلستان کو پارلیمنٹ کے قابو میں لانے کی قبل از وقت کوشش کی وجہ سے گلابوں والی لڑائی ہوئی تھی اور اس غمناک عہد کے مصائب و خلفشار کا قدرتی ردعمل یہ ہوا کہ شاہی حکومت کو اور زیادہ مرکزیت و تقویت و آزادی حاصل ہوگئی ٹیوڈر بادشاہوں کی حکومت کو مطلق العنان کہنا غلط ہے کیونکہ وہ عام پسند تھی پارلیمنٹ سے بھی زیادہ مقبول تھی اور رعایا کی نگاہ میں یہ حکومت ان کی محافظ اور نمایندہ تھی ہنری ہفتم کا زمانہ بہت مبارک سمجھا گیا ہے کہ خانہ جنگی سے لوگوں کو پناہ ملی اور صنعتی و اقتصادی ترقی کا موقع ملا اس کی حکومت اور اس کا رویہ فرانس کے لوئی یازدہم سے بہت مشابہ ہے دونوں کے زمانہ میں ان کے ملک کو خانہ جنگی کے بعد امن نصیب ہوا اور دونوں شان و شوکت کے قدیمی روایات کا مطلق لحاظ نہ کرتے تھے ہنری ہشتم کا زمانہ اس کے پیش رو کے عہد جمود سے مختلف تھا اس کی دلیر اور پرجوش خارجی حکمت عملی لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہوگئی اپنی حکومت کے آخری زمانہ میں جب اس نے مذہبی اور دینی تغیرات پیش کئے تو کچھ لوگوں نے انھیں بخوشی تسلیم کرلیا مگر اکثر نے محض اس وجہ سے اختیار کرلیا کہ یہ بادشاہ کے نافذ کئے ہوئے ہیں اور بادشاہ کو اس سے تقویت پہنچیگی ایڈورڈ ششم اور ملکہ میری کا زمانہ بالکل ہی مختلف تھا ہنری ہفتم و ہنری ہشتم کی طرح ان میں سے کوئی بھی قوی حکمراں نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ دونوں یورپی قوم

کے نائب ہونے کے بجائے کسی ایک مذہبی یا سیاسی فرقہ کے ہاتھوں میں رہے اور ملک میں بھی ایسی شورشیں برپا ہوئیں جن میں خانہ جنگی کے آثار نمایاں تھے لیکن جب ملکہ ایلزبتھ تخت پر بیٹھی تو پھر شاہی حکومت مضبوط قوی العد عام پسند ہوئی اس کی حکومت عام لوگوں کی نیابت اس زمانہ کی دستوری حکومتوں سے بہتر کرسکتی تھی بلکہ جبر واستبداد سے حکومت نہ کرتی تھی اور نہ کرسکتی تھی کیونکہ جبر واستبداد کا ذریعہ یعنے فوج اس کے پاس بالکل کم تھی حتی کہ انگلستان، اسکاٹلینڈ و آئرلینڈ میں اگر ہنگامے برپا ہو جاتے تو یہ فوج ان کو فرو کرنے کے لئے بھی کافی نہ ہوتی۔ اصل میں ملک کی پرجوش وفاشعاری نے تخت وتاج کو سنبھالے رکھا اور انگلستان ان خانہ جنگیوں سے محفوظ رہا جو اس عہد میں یورپ کے دوسرے ممالک کو متزلزل کررہی تھیں۔

سولھویں صدی میں ایک "نئی شہنشاہی" کا ظہور ہوا جتنا جتنا کیتھلک کلیسہ کا اقتدار گھٹتا گیا اتنا اتنا یورپ کے بادشاہوں کا اقتدار بڑھتا گیا۔ کلیسہ اور سلطنت کی طولانی جنگ میں کلیسہ کو اس صدی میں سخت ہزیمت نصیب ہوی اور اس کے بہت سے اختیارات بادشاہوں کے قبضہ میں چلے گئے جو سلطنت کے حقیقی نائب تھے۔ یہ حالت دونوں قسم کے ممالک میں پیش آئی۔ ان میں بھی جو کلیسہ سے واسطہ رکھتے تھے جیسے اسپین و فرانس اور ان میں بھی جنھوں نے کلیسہ سے قطع تعلق کرلیا تھا جیسے انگلستان۔ اس حیثیت سے ہنری ہفتم و ہنری ہشتم و ایلزبتھ (Elizabeth) کا مرتبہ و اقتدار چارلس پنجم۔ لوئی دوازدہم (Louis XII) فرانسیس اول و ہنری نیوِس لوار (Henry of Navarre Francis I) سے بہت مشابہت رکھتا ہے بلکہ فلپ (Philip) سے بھی مشابہ ہے تو بادی النظر میں یہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ اسپین میں فلپ کی حکومت عام طور پر پسند کی جاتی تھی اور نیدرلینڈز میں اس کا طرز عمل ایلزبتھ کے طرز عمل سے جو اس نے آئرلینڈ میں اختیار کیا تھا بہت ملتا جلتا ہے۔

انگلستان کی بادشاہت کا فرق امتیازی

لیکن انگلستان کی بادشاہی کی بنیاد اسپین اور فرانس سے مختلف تھی اصل میں یہ بادشاہی ایک قسم کی عارضی خودمختار حکومت تھی جو ملک کی دستوری و مقامی اداروں میں کوئی دستوری تغیرات نہیں کرتی تھی جب احول بدل گیا اور ٹیوڈر خاندان کے بجائے اسٹوارٹ حکمراں تخت نشین ہوئے مذہبی و سیاسی فرقہ بندی کا زور پیدا ہوا اور بادشاہ وقت کمزوری و نالایقی کی وجہ سے ان کا سد باب نہ کرسکا تو پارلیمنٹ آگے بڑھا اور اپنے اسلحہ خانہ سے غیر مستعملہ اسلحہ باہر نکال کر قوم کے بیشتر و با اثر حصہ کا نمایندہ بن گیا۔ لیکن فرانس و اسپین میں یہ نہیں ہوا وہاں تو بادشاہت نے دستوروں کے انتخابی جزو کو بالکل مٹا دیا کسٹیل کی کورٹس (Courts of Castille) کے سابقہ اقتدارات کا اب صرف ایک دھندلا سا نشان باقی رہ گیا تھا۔ اور اراکین کے تقرر کے طریقہ میں بھی رد و بدل کر دیا گیا۔ فرانس میں مملکتوں کی مجلس عامہ (States Generat) نے مذہبی جنگ کے ابتدا و آخر میں نمایاں حصہ لیا تھا لیکن اس کا اثر و اقتدار قوم کے روایات و طرز زندگی میں گہرے طور پر نفوذ نہیں کرسکا تھا بادشاہوں نے اس کے جلسے بند کر دئے اور اس طرح حکومت کرنے لگے گویا اس مجلس کا وجود ہی نہ تھا۔

(۲)

انگلستان میں مذہبی اصلاح

مذہبی انقلاب میں انگلستان نے ایسی روش اختیار کی جس نے اس کو براعظم کے پروٹسٹنٹ کلیسہ سے اتنا ہی دور کر دیا جتنا کہ پوپ (Pope) کی اطاعت سے۔ ہنری ہشتم کا یہ طرز عمل ذاتی اور سیاسی وجوہ پر مبنی تھا اور تحریک مذہبی یا اخلاقی سے اسے کوئی سروکار نہ تھا جب لیوتھر (Luther) کی تحریک کا آغاز ہوا تو ہنری ہشتم نے لیوتھر کے اصول و عقائد کی تردید میں ایک رسالہ لکھا جس کے صلہ میں پوپ (Pope) نے اس کو "محافظ دین" کا خطاب عطا کیا

جو اب تک انگلستان کے بادشاہوں میں چلا آتا ہے پوپ سے جھگڑا کرنے پر وہ اس وجہ سے مجبور ہوا کہ وہ کیتھرین آف اراگان (Caberine of Arragon) کے عقد کی تنسیخ چاہتا تھا اور اس کے لئے پوپ کے فرمان کی ضرورت تھی جو پوپ نے دینے سے انکار کیا۔ ثانیًا وہ اپنی قوم کے مذہبی معاملات میں کسی غیر شخص کی مداخلت کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور یہ شک ایک عرصہ سے

ہنری ہشتم کے مقاصد و اغراض

چلا آرہا تھا۔ قومی احساس بڑھتا جارہا تھا تو اس لئے اس میں بھی شدت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ انگریزی کلیسہ کے عقائد و پرستش میں وہ کوئی خاص تغیر نہیں چاہتا تھا بلکہ صرف پوپ کے اختیارات کم کرکے انھیں اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا خانقاہیں ویران کردی گئیں۔ روما سے تعلقات قائم رکھنے کے حامی جیسے مور (Moore) فشر (Fisher) وغیرہ قتل کردئے گئے لیکن اسی کے ساتھ ہی انگلستان کے کلیسہ میں لیوتھر (Luther) کالون (Calvin) کے عقائد و رسوم کے مطابق عمل کرنے کی کوششوں کی بھی اس نے سخت مخالفت کی ۱۵۳۹ء میں بادشاہ نے پارلیمنٹ سے چھ شرائط والا قانون منظور کرایا اس قانون کے دیکھنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اب بھی عقائد میں وہ روما سے متفق تھا۔ کوئی انگریز جو عشائے ربانی میں روٹی شراب کا حضرت مسیح کے جسم اور خون سے متبدل ہونے کے عقیدے کا منکر ہوتا اسے ملحد قرار دیکر جلا دینے کا حکم تھا۔ اور پادریوں کے تجرد کی بھی سخت تاکید کی گئی۔

ہنری ہشتم کے انتظام و بندوبست کی مخالفت۔

اس بندوبست کی عام مخالفت تو نہیں ہوی مگر انگلستان میں بہت سی زبردست جماعتیں اس سے آزردہ ضرور ہوئیں نیچے رومن کیتھلک لوگوں کے نزدیک پوپ کے اقتدارات کا استیصال ایک ایسا جرم تھا جس کی پابجائی کیتھلک عقائد و پرستش کے قائم رکھنے سے نہ ہوسکتی تھی ان کے علاوہ وہ کالون و لیوتھر کے معتقدین تھے جو خالص پروٹسٹنٹ

عقائد کے موئید تھے اور ملحدانہ کیتھلک عقائد کی تعلیم سے سخت ناراض تھے ایسے انگریزی طریقۂ عبادت کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ "ایک حماقت ہے جو جائز رکھی جاسکتی ہے" ہنری ہشتم کی وفات اور کمسن ایڈورڈ (Edward) کی تخت نشینی سے کچھ دنوں کے لئے پرجوش پروٹسٹنٹ کے طبقہ کو کامیابی حاصل ہوگئی عبادت کی ایک نئی کتاب زیر نگرانی کرینمر (Cranmer) مرتب ہوئی چھ شرائط والا قانون منسوخ کر دیا گیا اور انگلستان کے کلیسہ اور براعظم کے پروٹسٹنٹ کلیسیوں میں ایک حد تک ہم آہنگی پیدا ہوگئی گو اب بھی زمانۂ ماضی سے اس نے اپنا سلسلہ قائم رکھا اور قرون وسطیٰ کے کلیسہ کی جانشینی کا اسے دعویٰ تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ بادشاہ کی کمسنی اور ڈیوک آف سومرسٹ (Duke of Somerset) و ڈیوک آف نارتھمبرلینڈز (Duke of Northamberland) کی وزارت سے حکومت کمزور ہوگئی اور ملک میں بدامنی شروع ہوگئی انگلستان کے مشرقی اور جنوب و مغربی حصوں میں شورشیں ہوئیں جو فرو تو کر دی گئیں لیکن بدمزگی باقی رہ گئی اس کمزور عہد حکومت میں انگلستان میں اس قسم کی خانہ جنگیوں کے آثار نمایاں ہونے لگے جیسی کہ فرانس جرمنی اور نیدرلینڈز میں اس وقت برپا تھیں

ایڈورڈ ششم کا عہد حکومت

اسی وجہ سے ملکہ میری (Mary) کی تخت نشینی پر خوشیاں منائی گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ حسن تدبیر سے کام لیتی تو انگلستان پھر کیتھلک مذہب قبول کر لیتا کیونکہ ایڈورڈ ششم کے زمانہ کی شورشوں سے ناراضی پیدا ہوگئی تھی میری دختر کیتھرین آف اراگان (Catherine of Arragon) کیتھلک مذہب کی شیدا تھی اور ذاتی طور پر لوگوں میں ہر دلعزیز بھی تھی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حکومت شاہی عام طور پر پسند کی جاتی تھی اور ایک قوی حکمراں کے پیش کردہ مذہبی عقائد کو قوم ضرور قبول کر لیتی۔ مگر ملکہ میری کے زمانہ میں یہ واضح ہوگیا کہ انگلستان کیتھلک مذہب کا ساتھ نہ دے گا۔

ملکہ میری

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملکہ نے پھر روما کو انگلستان سے راضی کر لیا اور اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوا لیکن اس کے سوا بقیہ امور میں غلطی پر غلطی ہوتی رہی ملکہ نے اسپین کے شاہ فلپ سے عقد کر لیا جس کی وجہ سے انگلستان فرانس سے جنگ آزمائی پر مجبور ہوا اور انگلستان کے قبضے سے کیلے (Calis) جاتا رہا۔ اس سے بڑھ کر یہ غلطی ہوئی کہ کچھ تو مخالفتوں سے تنگ آ کر اور کچھ سولھویں صدی کے عام خیال کے مطابق کہ حکومت کا فرض ہے کہ کفر و الحاد کا ازالہ کرے اس نے مذہبی مظالم کا ایسا سلسلہ قائم کر دیا جس کی نظیر تاریخ انگلستان میں نہیں پائی جاتی گو مذہبی تعصب میں فرانس۔ اسپین۔ نیدرلینڈز و آئرلینڈ کے مظالم ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ ملکہ میری کے عہد حکومت میں کیتھلک مذہب اس امر کا مترادف تھا کہ اسپین کے فائدہ کے لئے انگلستان قربانیاں کرے داخلی و خارجی معاملات میں ناکام رہے اور ظلم و تشدد کا شکار بنا رہے۔ اگر فلپ اور میری کا کوئی بیٹا ہوتا تو ملک کے آئندہ مذہب کا قیاس کرنا مشکل ہو جاتا لیکن ان کے کوئی اولاد ہی نہ ہوئی اور میری کی وفات کے بعد اس کے انتظامات کا بقا ناممکن تھا۔

مذہبی آزار

ملکۂ الیزابتھ

سنہ ۱۸۵۵ء میں پچیس سال کی عمر میں ملکہ الیزابتھ تخت نشین ہوئی۔ اس کی والدہ اینی بولین (Anne Boleyn) کا عقد ہنری ہشتم کے ساتھ انگلستان اور روما کے کلیسیوں میں تفرقہ پیدا ہو جانے کا باعث ہوا تھا۔ الیزابتھ نے اپنی عمر میں ایسے تغیرات اور خطرے دیکھے تھے ہر کام میں بڑی احتیاط برتتی تھی اور اس کو ان قوتوں کا احساس بھی تھا جن پر قومی زندگی کا دار و مدار تھا۔ اس کے وزراء برلے (Burleigh) والسنگھم (Walsingham) بیکن (Bacon) اسقف اعظم پارکر (Parker) نے دل و جان سے اس کی خدمت کی مورخین اس معاملہ میں اختلاف رکھتے ہیں اس کے عہد کی کامیابی کا باعث خود اس کی

بیدار مغزی و فراست تھی یا اس کے وزراء اور مشیروں کی بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس کی حکومت بہت کامیاب رہی انگریزی تاریخ کے کسی عہد میں انگلستان کی سیاسی زندگی کی ایسی پائدار بنیاد نہیں ڈالی گئی جیسی کہ ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں

ملکہ کا مذہبی طرز عمل

عام طور پر اس کا مذہبی طریق انتظام ہنری ہشتم سے بہت ملتا جلتا تھا گو جزوی فرق ضرور تھا اس نے کلیسۂ انگلیس کا سلسلہ قرون وسطیٰ کے کلیسہ سے قائم رکھا زمانہ سابق کے ایسے رسوم ادارات اور عقائد قائم رکھے گئے جن سے انکار ضروری نہ خیال کیا گیا یہ کلیسہ تعصب سے بری تھا اور حتی الامکان اس کی کوشش تھی کہ تمام قوم اس کی حلقہ بگوش ہو جائے۔ لیوتھر یا کیالون کے اصول کی پابندی اس کلیسہ میں لازمی نہ خیال کی گئی۔ ملکہ کے خیال میں دینی پابندی سے زیادہ قومی اتحاد اور مصلحت وقت کا لحاظ ضروری تھا۔ اپنے آپ کو وہ غیر متعصب اور روادار خیال کرتی تھی اور اگر یورپ کی دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں اور سولھویں صدی کے معیار سے دیکھا جائے تو اس کا یہ خیال صحیح تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ کسی شخص کی قلبی واردات دیکھنے کی خاطر اس کے دل کا دریچہ توڑنا پسند نہیں کرتی۔ مجھے صرف ظاہری عقائد اور قانون کی بدیہی خلاف ورزی کی حد تک تعلق ہے۔ لیکن وہ اس بات پر تلی ہوئی تھی کہ جو اصلاحی کلیسہ (مذہب) اس نے قائم کیا تھا اسی کا

قانون یکسانیت (Act of Uniformity)

رواج تمام ملک میں ہو۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے ۱۵۵۹ء میں "قانون یکسانیت" جاری ہوا جس میں بجز کلیسۂ انگلیسی کے کسی اور قسم کی پرستش یا عبادت مستوجب سزا قرار دی گئی اور جو لوگ انگلیسی کلیسہ کی عبادت میں شریک نہ ہوں ان کے لئے بھی سخت سزا مقرر کی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ گو اس نے کلیسہ کی صدارت عظمیٰ سے انکار کر دیا

لیکن "قانون صدارت" کے منظور ہونے سے کلیسہ کا کل انتظام اس کے اختیار میں آگیا۔ اور اس کو مذہبی فرائض میں امداد دینے کے لئے ایک "مجلس اعلیٰ مرتبت" کورٹ آف ہائی کمیشن (Court of High Commission) کا تقرر ہوا۔

کلیسۂ انگلیسی کا فرق

اس طرح اصلاح شدہ انگلیسی کلیسہ یورپ میں اپنی نوع کا ایک ہی تھا اور انگلستان کے باہر لوگ نہ اس کو سمجھ سکے نہ اس کی قدر کر سکے۔ لیوتھر اور کیلون کے تبعین اسے محض ایک درمیانی منزل سمجھتے تھے اور اس کو ایک ایسے سمجھوتہ پر مبنی سمجھتے تھے جو بلا کسی اصول کو مدنظر رکھے محض دنیاوی فوائد کے لئے قائم ہوا تھا۔ رومن کیتھلک لوگ اس مذہب کو کیتھلک مذہب سے خارج سمجھتے تھے اور لیوتھر و کیلون کے مذاہب کی طرح اسے بھی الحادی کہتے تھے انگلستان میں بھی ملکہ کے مذہبی طرزعمل کو مقبولیت ہوئی مگر اس کے مخالف بھی تھے انگریزوں کی ایک بہت بڑی تعداد رومن کلیسہ کی اطاعت پر قائم رہی اور انھوں نے کتاب عبادت عام کے مطابق عبادت کرنے سے انکار کر دیا۔

کیتھلک

۱۵۸۰ء میں جیسوئٹ لوگوں کے آنے سے ان لوگوں کی ہمت اور بھی بڑھ گئی اور وہ ہر لحظہ موقع کے منتظر و متوقع رہنے لگے کہ پھر سابقہ طرزعمل اختیار کریں۔ الزبتھ کے اقتدار و زندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے ادھر ادھر دو ایک سازشیں بھی ہوئیں مگر ان میں

پروٹسٹنٹ اور مخالفت

صرف برائے نام دو ایک کیتھلک شریک تھے ورنہ مجموعی حیثیت سے باوجودیکہ ان کے خلاف سخت انسدادی تدابیر اختیار کی گئی تھیں کیتھلک لوگ اطاعت و وفاشعاری سے منحرف نہیں ہوئے۔ پروٹسٹنٹ مخالفین کے ساتھ بھی ملکہ کو دقتیں پیش آئیں لیوتھر کے عقائد کو انگلستان میں قبولیت حاصل ہو چکی تھی ملکہ میری کے مظالم کے زمانہ میں چند جلا وطن شرع

انگریز سوئٹزرلینڈ وغیرہ چلے گئے تھے جہاں کیالون کے متعین سے وہ ملے اور وہاں سے کیالون کے خیالات لے کر واپس آئے تھے ان کے نزدیک پوپ مسیح کا مخالف تھا اور کیتھلک مذہب کی کوئی بات برائی سے خالی نہ تھی۔ انگلستان کے کلیسہ کی مقررہ عبادت اور پادریوں کا لباس انھیں پسند نہ تھا ان کا خیال تھا کہ کلیسیہ کا انتظام صرف واعظین مجالس کلیسہ کے ہاتھوں میں رہنا چاہئے نہ کہ اسقفوں وغیرہ کے کلیسہ کے ساتھ ان کی مخالفت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی لیکن اسی عہد حکومت میں پروٹسٹنٹ گروہ میں دو فرقے ہو گئے ایک تو پرسبیٹرین جو جنیوا اور کیالون کے پیرو تھے دوسرے "حریت پسند" جو انگلیسی کلیسہ کے مقررہ نظام و رسوم کا اس حد تک مخالف تھا کہ عبادت کرنے والوں کی ہر جماعت کو آزاد خیال کرتا تھا۔

احکام تشدد رومن کیتھلک لوگوں کے خلاف سخت احکام نافذ کئے گئے کسی شخص کو کیتھلک بنانا سلطنت کے خلاف بغاوت کرنے کے مترادف قرار دیا گیا۔ جیسوئٹ اور صاحب خانقاہ پادریوں کے لئے سزائے موت مقرر کی گئی اور عام رومن کیتھلک لوگوں پر ملکہ کے دینی قوانین کی خلاف ورزی کی علت میں سنگین جرمانے کئے گئے ان میں سے اکثر تو قتل کر دیئے گئے اور جو بچ رہے تھے تقریباً ان سب کو مخبروں کا خوف ہر وقت لگا رہتا تھا۔ ان مخبروں کو معقول انعامات ملنے کے باعث اور بھی ترغیب ہوتی تھی پروٹسٹنٹ مخالفین کے ساتھ نسبتاً نرمی کا برتاؤ کیا گیا گو آخری زمانے میں ان کے خلاف بھی سخت احکام جاری ہوئے۔ اور ان میں سے بھی بعض جو ملکہ کے دینی طرز انتظام کی مخالفت کرتے تھے قتل کر دیئے گئے۔

ملکہ ایلزابتھ کا خیال تھا کہ رواداری اور انسانیت اس کے عہد حکومت کے خصوصیات میں سے ہیں اور سب لوگوں سے

وہ کہا کرتی تھی کہ اپنے مذہبی مخالفین کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا اس کا ان مظالم سے مقابلہ کرو جو فلپ دوم نے نیدرلینڈز میں اور فرانسیسیوں نے فرانس میں کئے۔ اس کے اس دعویٰ کی اکثر تردید کی گئی ہے لیکن اگر ہم اپنی تحقیقات کو انگلستان کی سرزمین تک محدود رکھیں تو اس کا دعویٰ بالکل صحیح تھا۔ وہاں واقعی اس نے ایسی رواداری اور نرمی سے کام لیا جس کی تقلید فلپ دوم اور کیتھرین ڈی میڈی چی سے نہ ہو سکی لیکن آئرلینڈ میں اس کا طرز عمل دیکھا جائے تو بالکل مختلف نتیجہ نکلتا ہے۔ وہاں اس کا طرز عمل میبت تشدد اور مظالم سے مملو پایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس صدی کے اختتام پر فرانس میں نانٹ کا فرمان جاری ہوا جو وسعت خیال اور فراخ دلی کے اعتبار سے مذہبی رواداری کا بہترین نمونہ تھا جس کی نظیر انیسویں صدی تک انگلستان میں نہیں ملتی۔

ملکہ کی رواداری

(۳)

انگلستان کے خارجی تعلقات

مذہبی اصلاحات کی وجہ سے انگلستان کے خارجی تعلقات (بہ نسبت سابق کے) بالکل بدل گئے۔ چنانچہ ہنری ہفتم و ہنری ہشتم کے اوائل عہد کے خارجی طرز عمل میں اور ٹیوڈر خاندان کے طرز عمل میں جو ۱۵۲۹ء کے اصلاحی پارلیمنٹ کے انعقاد کے بعد اس نے اختیار کیا کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ ہنری ہفتم خانہ جنگیوں کے بعد تخت نشین ہوا اور اس کی رعایا گلابوں والی لڑائی (Roses) کی ابتری و پریشان حالی سے تباہ ہو گئی تھی۔ اس لئے اس کا کام صرف اتنا تھا کہ اپنے آپ کو تخت پر قائم رکھے اور امن و امان قائم کر کے تجارت کو فروغ دے۔ اس کی قوت کا اظہار اسی میں تھا کہ وہ موجودہ حالت پر قائم رہ سکے اور اپنے عہد حکومت میں جن لڑائیوں سے ممکن تھا وہ

ہنری ہفتم کا طرز عمل

بچتا رہا اور جن میں اسے مجبوراً شریک ہونا پڑا ان کو اس نے بہت جلد اختتام کو پہنچانے میں رسمی خودداری اور آبرو کا لحاظ نہ کیا۔ اس نے تجارتی معاہدے کئے جس سے انگلستان کے اون فروخت کرنے والوں کو نیدرلینڈز سے تجارت کرنے کا موقع مل گیا اور اپنے بڑے بیٹے ارتھر (Arthur) کی شادی کیتھرین آف اراگان سے کر کے اس نے اسپین سے اچھے تعلقات قائم کر لئے اسی طرح اپنی سب سے بڑی بیٹی مارگیرٹ کا عقد اسکاٹلینڈ کے بادشاہ جیمس چہارم سے کر کے اسکاٹلینڈ سے بھی روابط پیدا کر لئے۔ ان دونوں شادیوں کا اثر سولھویں صدی کے واقعات پر بہت کچھ پڑا اس لئے کہ آرتھر کی وفات پر کیتھرین ہنری ہشتم سے منسوب کی گئی جس کی تنسیخ عقد کے سلسلے میں روم سے مفارقت ہو گئی۔ مارگیرٹ میری ملکہ اسکاٹس کی دادی تھی اور انگلستان کے تخت و تاج کے متعلق مارگیرٹ کے جو حقوق تھے ان کی وارث میری ہوئی۔ اس کے ان حقوق اور دعاوی کی وجہ سے ملکہ ایلزابتھ کے عہد حکومت میں متعدد مشکلات پیدا ہوئیں ہنری ہشتم اور اس کے باپ کے عہد حکومت میں بہت فرق تھا۔

ہنری ہشتم ہوشیار۔ ہر دلعزیز اور حوصلہ مند تھا اور رعایا بھی ہنری ہفتم کی رو کھی پھیکی کامیابیوں سے اکتا کر ایک نئے نظام حکومت اور حوصلہ افزا خارجی طرز عمل کی خواہاں تھی۔ ہنری ہشتم کو ولزے (Wolsey) ایسا مدبر اور منتظم مل گیا تھا اس کی ہدایت و صلاح سے یورپ کی پیچیدہ سیاست میں انگلستان کامیابی کے ساتھ دخل دیتا رہا اور یورپ کے اصول "توازن طاقت" کو سنبھالنے میں شریک رہا۔ اگر اس حالت میں کوئی تغیر نہ ہوا ہوتا اور مذہبی مسئلہ دوسرے امور پر غالب نہ آ گیا ہوتا تو اس کی سفارتی کارروائیوں کا تذکرہ اور اس کی کامیابی کی حدود کا اندازہ کرنا ضروری ہوتا۔ بہر حال اس پر بھی ولزے نے اس ملک کی تاریخ میں بڑا نام چھوڑا ہے لیکن انگلستان کی تاریخ پر اس کا اثر صرف ضمنی ہے ۱۵۲۹ء کے بعد

انگلستان کا طرز عمل مذہبی مصالح پر مبنی تھا گو ہنری ہشتم آخری وقت تک یورپ کی پروٹسٹنٹ تحریک کا ساتھ دینے سے انکار کرتا رہا اس مختصر خاکہ میں ایڈورڈ ششم (Edward VI) اور میری کے عہد حکومت کے خارجی طرز عمل کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر کے عہد میں انگلستان دوسرے پروٹسٹنٹ دول سے اتحاد قائم کرنیکا خواہاں تھا اور میری کے زمانہ میں اسپین کا ہم نوا تھا۔ اسپین کے شاہ فلپ کے ساتھ ملکہ کی شادی ہو جانے سے یہ تعلق اور بھی مضبوط ہو گیا لیکن ملکہ ایلزابتھ کا عہد حکومت جس طرح کہ اور معاملات میں ممتاز ہے انگلستان کے خارجی طرز عمل

ملکہ ایلزابتھ (Elizabeth)

میں بھی خاص امتیاز رکھتا ہے۔ ابتدائے عہد میں اس کے تعلقات اسپین سے دوستانہ اور فرانس سے مخالفانہ تھے لیکن آخری زمانہ میں اس نے فرانس سے اتحاد قائم کر لیا اور فلپ شاہ اسپین کے طرز عمل کی مسلسل مخالفت کرتی رہی۔ لیکن یہ تبدیلی یکایک نہیں واقع ہوئی کیونکہ کسی معاملے میں قطعی فیصلہ کر دینا ملکہ کی فطرت کے خلاف تھا اور وہ ایک مدت تک یعنی ۱۵۸۸ء میں ارمڈا کی روانگی تک اسپین کی دلجوئی کرتی رہی۔ لیکن دوسرے قوی اسباب نے انگلستان کو اسپین کی مخالفت پر مجبور کر دیا یورپ کی تمام سلطنتوں میں اسپین ہی رومن کیتھلک مذہب کا سب سے پرجوش حامی تھا اور کیتھلک تحریک ردعمل کا مرکز تھا اسی بات نے رفتہ رفتہ ملکہ کی مرضی کے خلاف اسپین سے سمجھوتہ ناممکن بنا دیا۔ ان مذہبی اغراض کے ساتھ ساتھ تجارتی اغراض بھی شامل ہوگئیں۔ بحری قوت کے فوائد و امکانات انگلستان کو محسوس ہو چلے تھے اس کے بحری ناخدا سیاح تاجر، بحری ڈاکو محققین اور قسمت آزما سپاہی ہسپانیہ کے امتناعی احکام کے

ایلزابتھ کے زمانہ میں بحری سیاحت

باوجود "نئی دنیا" میں جا پہنچے تھے حتیٰ کہ ہسپانوی حکومت کے صریحی احکام کے خلاف ہاکنس (Hawkins)

نے ہسپانوی نو آبادیوں میں غلاموں کی تجارت کی۔ڈریک (Drake) نے بھی نما کناٹے میگیلن سے گزر کر جنوبی امریکہ کے ساحل پہ ہسپانوی نوآبادیوں کو لوٹ لیا۔ اور کرۂ ارض کا چکر لگاتا ہوا انگلستان کو واپس آگیا انگریزی حکومت نے ان یورشوں کے روکنے کی کوشش نہیں کی اور اگر کرتی بھی تو شاید کچھ کامیاب نہ ہوتی۔ اسپین کے خلاف یہ حرکتیں نہایت اشتعال انگیز تھیں اور اگر فلپ دوم فرانس اور نیدرلینڈز کے پیچیدہ معاملات میں نہ پھنسا ہوتا تو پہلے ہی جنگ چھڑ جاتی ادھر تو انگلستان اسپین سے برسرِ پیکار ہو رہا تھا اور ادھر فرانس سے روابط بڑھ رہے تھے اس وجہ سے کہ دونوں ملک اسپین کے مخالف تھے۔ یہ وجہ وغرض ابتدائے حکومت سے موجود تھی اور مذہبی خانہ جنگی و سینٹ بارتھولومیو (St. Bortholomew) کے قتلِ عام کے باوجود ان دونوں ملکوں کے تعلقات میں فرق نہیں پیدا ہوا تھا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی بمقابلہ اسپین کے فرانس اتحاد کے لئے زیادہ موزوں تھا کیونکہ وہاں پروٹسٹنٹ لوگوں کی ایک زبردست جماعت موجود تھی جس کے ساتھ فرانسیسی حکومت محض انگلستان کے اثر کی وجہ سے وقتاً فوقتاً اچھا سلوک کرتی تھی۔ ہنری سوم کی وفات کے بعد ہنری چہارم کی تخت نشینی پر ان دونوں سلطنتوں کا تعلق اور بھی زیادہ گہرا ہو گیا فرانسیسی تخت کے مدعی (ہنری رئیس نوار) کی امداد کے لئے انگلستان نے روپیہ اور فوج بھیجی اور اس کے تبدیلِ مذہب سے بھی باہمی تعلقات میں فرق نہیں آیا کیونکہ جو اس کے دشمن تھے وہی ملکہ کے بھی دشمن تھے۔ انگلستان کے تخت پر جیمس اول کی تخت نشینی کے موقع پر یہ فرانسیسی اتحاد بدقسمتی سے شکست ہو گیا اور محض بادشاہ کی جدت پسندی کی بدولت ہوا

فرانس و انگلستان کا اتحاد۔

(۴)

تاریخ انگلستان کی سولھویں صدی کا یہ خاکہ مکمل کرنے کے لئے

اسکاٹلینڈ و آئرلینڈ سے جو تعلقات تھے ان پر بھی ایک نظر ڈالنی ضروری ہے اسکاٹلینڈ کے تعلقات ملکہ کے طرز عمل کی کامیابی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں لیکن آئرلینڈ کے تعلقات کا بیان فاحش غلطیوں کا ایک دفتر ہے جس میں بہت سے غمناک ابواب ہیں اور آئندہ اس سے بھی زیادہ غمناک واقعات ہونے کا امکان ہے۔

انگلستان و اسکاٹلینڈ عہد ٹیوڈر کے اوائل تک اسکاٹلینڈ ہمیشہ انگلستان کا مخالف تھا گو اس کی آبادی و ذرائع بالکل محدود تھے یعنے کل آبادی پانچ لاکھ کے قریب تھی۔ پھر بھی جغرافی موقع اور انگلستان سے مخالفانہ تعلقات کی وجہ سے اسکاٹلینڈ کو یورپ میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی دوسری حالت میں ممکن نہ تھی امور حربی کے لحاظ سے اسکاٹلینڈ انگلینڈ کا عقبی دروازہ تھا اور جب تک اسکاٹلینڈ مخالفین سے ملا ہو انگلستان اپنے آپ کو محفوظ نہ خیال کرسکتا تھا۔ دونوں ملکوں کے بعض دور اندیش لوگوں کو اتفاق و اتحاد کا خیال ہوا تھا لیکن سولھویں صدی کے اوائل میں یہہ اتحاد دائرۂ امکان سے خارج تھا - ہنری ہفتم کی بیٹی مارگریٹ کا عقد اسکاٹلینڈ کے شاہ جیمس چہارم (James IV) کے ساتھ ہوجانے سے اتحاد خواہوں کی یہ تمنا پوری ہوگئی کیونکہ ان کا پرپوتا اسکاٹلینڈ کے جیمس ششم اور انگلستان کے جیمس اول کے نام سے دونوں سلطنتوں پر حکمراں ہوا۔ لیکن اس شادی سے قدیم عنادیں کوئی فرق نہوا چنانچہ ہنری ہشتم کو اسکاٹلینڈ سے مقابلہ کرنا پڑا اور ۱۵۱۳ء میں اس نے بمقام فلاڈن (Flodden) اسکاٹلینڈ کو شکست دی سولوئے موئر (Solwaymoor) کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد ۱۵۴۲ء میں جب جیمس پنجم (James V) کی وفات ہوئی تو صورت حال بالکل بدل گئی کیونکہ اس کی اکلوتی بیٹی میری اس کی وفات کے وقت صرف چند دنوں کی تھی اگر انگلستان کے شہزادہ سے اس کا عقد ہوجاتا تو اسکاٹلینڈ و

انگلستان ایک ہو جاتے جس طرح کہ ۱۴۹۱ء میں فرانس کے بادشاہ چارلس ہشتم کا عقد بریٹنی (Brittony) کی رئیسہ اینی (Anne) کے ساتھ ہو جانے سے بریٹنی کی ولایت سلطنت فرانس میں شامل ہو گئی تھی میری (Mary) کی نسبت ایڈورڈ ششم (Edward VI) سے طے کی گئی لیکن نائب السلطنت سمرسٹ (Somerset) کی احمقانہ زبردستی کی وجہ سے اسکاٹلینڈ والے متنفر ہو گئے۔ میری کو فرانس بھیجکر انھوں نے ڈافن (Dauphin) سے اس کا عقد کرا دیا۔ اب تو انگلستان کو اسکاٹلینڈ کی طرف سے اور بھی خطرہ ہو گیا اور باہمی عناد میں شدت ہو گئی۔

میری ملکۂ اسکاٹلینڈ۔

فرانس اور اسکاٹلینڈ میں مذہبی اصلاح کا رنگ

اصل میں اسکاٹلینڈ میں مذہبی اصلاح کے پھیلنے سے دونوں ملکوں میں اتحاد وارتباط قائم ہوا۔ اسکاٹلینڈ میں مذہبی اصلاح کیلون کے عقائد اور کلیسائی انتظام کے مطابق تھی۔ یہ تحریک فرانس کی ہیوگینو (Hegonet) تحریک سے کچھ مشابہ تھی دونوں تحریکیں پرسبیٹیرین تھیں (Presbyterian) اور غالباً ناکس (Knox) کیلون کا سب سے بڑا پیرو تھا۔ دونوں تحریکوں کو رؤسا و امرا کی زبردست تائید حاصل تھی جس کا اثر دونوں تحریکوں کی ابتدائی تاریخ پر نمایاں پایا جاتا ہے جس طرح فرانسیسی امرا کو اس تحریک کے آڑ میں سیاسی انقلاب عمل میں لانے کا حیلہ مل گیا تھا اسی طرح اسکاٹلینڈ کے رؤسا کو بھی کلیسہ کے مقبوضات پر قابض ہونے کی امید تھی ناکس کہتا تھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ اگر حرص ان کو مجبور نہ کرتی تو وہ انجیل کی طرف رجوع نہ ہوتے یعنے پروٹسٹنٹ مذہب نہ اختیار کرتے دونوں ملکوں میں یہی ہوا کہ سرداروں کی خودغرضی کے باوجود بہت سے لوگ اس تحریک کو صدق دلی اور جوش سے قبول کرتے رہے۔ لیکن فرانسیسی ماحول کی وجہ سے ہیوگونی تو فرانس میں

اس قدر غالب نہ ہو سکے جتنا کہ اسکاٹلینڈ کے پرسبیٹیری اس ملک کے معاملات پر اختیار و قابو رکھتے تھے۔

صلح ایڈنبرا (Edinbrough) ۱۵۶۰ء۔ ناکس کی تبلیغ و تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵۵۹ء میں پروٹسٹنٹ لوگ ہنگامہ آرائی پر آمادہ ہو گئے حکومت کی فوجیں شکست کھا گئیں لیکن لیتھ (Leith) اور ایڈن برا (Edinbrough) اب بھی ان کے قبضہ میں رہے۔ اگر لیتھ (Leith) کے بندر پر ان کا قبضہ قائم رہتا تو بہت جلد فرانس سے امداد آجاتی اور ان کا پلہ بھاری ہو جاتا لیکن اس مصیبت کے موقع پر پروٹسٹنٹ لوگوں نے انگلستان سے امداد مانگی اور ملکہ الیزابتھ نے بہت غور و تامل کے بعد انھیں امداد بھیجی لیتھ کا بندرگاہ فتح ہو گیا اور فرانسیسی و اسکاچ لوگوں سے ایڈنبرا کی صلح طے ہوی۔ فرانسیسی محافظ فوج اسکاٹلینڈ سے واپس چلی گئی اور پرسبیٹیری مذہب وہاں قائم ہو گیا ۱۵۶۰ء میں ناکس Knox کی کامیابی پوری ہو گئی۔ اسکاٹلینڈ کا مذہبی نظام انگلستان سے بالکل مختلف تھا لیکن رومن کیتھلک دل سے مخالفت کی وجہ سے دونوں متحد ہو گئے اور صدیوں کی منافرت رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی اسکاٹلینڈ سے ملکہ الیزابتھ کے تعلقات کا یہ سب سے اہم واقعہ تھا لیکن اس کے بعد کے واقعات اس سے زیادہ دلچسپ اور مشہور ہیں ۱۵۶۰ء میں اپنے شوہر فرانسس دوم کی وفات پر میری اسکاٹلینڈ واپس آگئی اور وہاں حکومت کرنے لگی۔ اس کی زندگی کے عبرت خیز و دردناک واقعات اسکاٹلینڈ کی سیاسی و معاشری تاریخ سے وابستہ ہیں۔ یہاں تو ہم اس کی زندگی کے ذاتی واقعات نہیں بیان کر سکتے مگر ان اسباب پر ہم غور کر سکتے ہیں جو اس کی تباہی کا باعث ہوئے اور جن کی وجہ سے اسے اسکاٹلینڈ ترک کر کے انگلستان میں قید رہ کر ایک غدار کی موت نصیب ہوی۔ خود

میری ملکۂ اسکاٹلینڈ کی تباہی۔

اس کچے چال چلن کا اثر بھی نہ روپر تھا۔ مگر وہ دو مضبوط قوتوں کے بیچ میں پھنس گئی تھی۔ ایک طرف تو اسکاٹلینڈ کے نیم جاگیرداری شرفا کا طبقہ تھا جو کسی قسم کی باتحتی کا روادار نہ تھا اور اپنے زور و اثر کے مناسبت سے کسی قسم کی حکومت کی اطاعت کا متحمل ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ حتی کہ اپنی جماعت میں سے بھی کسی کا اپنے اوپر حکمراں ہونا اسے ناگوار تھا۔ فرانس کے رؤسا کی بھی تقریباً یہی حالت تھی لیکن وہاں کی شخصی حکومت نے ایک حد تک امراء کو سدھا رلیا تھا برخلاف اس کے اسکاٹلینڈ کے رؤسا کی قوت عروج پر تھی۔ اگر اسکاٹلینڈ کی شخصی حکومت سے زبردست کوئی طاقت ان کو قابو میں نہ رکھتی تو اسکاٹلینڈ میں بھی پولینڈ کی سی بے سروپا ابتری پھیل جاتی اسکاٹلینڈ کے بعض شرفا وارسا (Warsaw) کی مجلس ڈائٹ (Diet) میں بیٹھنے کے موزوں تھے اور اپنے مطلق العنان اختیارات کو پولینڈ کے رؤسا کی طرح لاپروائی سے استعمال کرنے میں عار نہ کرتے دوسری طرف میری کو پریسبٹیرین فرقہ کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ ناکس کا قائم کردہ کلیسہ اسکاٹلینڈ کی حکومت کا زبردست حریف بن گیا تھا میری متعصب کیتھلک تو نہ تھی اور نہ اپنے عقائد کی خاطر وہ قصداً شہید ہوتی لیکن فطرتاً اور تاریخی و دیگر امور کے لحاظ سے کیتھلک مذہب کی پیرو ضرور تھی۔ اس طور پر پریسبٹیرین و جاگیرداری گروہ کے متفقہ قوت سے اس کو مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک وقت کہ اس کی فتحیابی کا امکان ہو گیا تھا۔ اس کے مخالفین شکست کھاتے ہوئے نظر آتے تھے اور تدبیر و حکمت عملی میں انگلستان بھی ہار گیا تھا۔ اس وقت اس پر نفس پرستی کا غلبہ ہوا اور اس کے غنیم بھی اس پر غالب آگئے ۱۵۶۷ء میں وہ جبراً تخت و تاج سے دست بردار کرادی گئی اور اس کے بعد اس کا بیٹا جیمس اسکاٹلینڈ کے تخت پر بیٹھا اور چونکہ ملکہ ایلزابتھ عقد

کرنے سے انکار کرتی رہی ۱۶۰۳ء میں انگلستان کا تخت بھی جمیس کو مل گیا۔ بادشاہ کے اقتدار کو اس طرح بڑھتے ہوئے دیکھکر رؤسائے اسکاٹلینڈ خوفزدہ ہوگئے۔

(۵)

انگلستان اور آئرلینڈ

آئرلینڈ کے لئے بھی سولھویں صدی کا زمانہ انتہائی اہمیت رکھتا تھا جب ہنری ہفتم تخت نشین ہوا تھا تو انگلستان کی حکومت کا اقتدار آئرلینڈ پر بہت کم ہوگیا تھا۔ حدود معینہ یعنے آئرلینڈ کے جنوبی و مشرقی حصے کے ایک چھوٹے سے ضلع کے باہر مشکل سے انگلستان کی حکومت کا وجود کہا جاسکتا تھا۔ خود ان حدود کے اندر بھی انگلستان کا اقتدار زوال پذیر تھا جنگ صد سالہ دگلابون والی لڑائی (Roses) میں انگلستان کی توجہ دوسری طرف تھی اسی لئے آئرلینڈ میں اسکی قوت گھٹنے لگی ٹیوڈر (Tudor) خاندان کی حکومت انگلستان میں مستحکم تھی اس لئے آئرلینڈ پر بھی اس کی قوت کا اثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آئرلینڈ کے امرا کی مطلق العنانی کا خاتمہ ہوگیا ان کے قلعے تباہ کردئے گئے اور ۱۴۹۴ء میں قانون پائننگ (Poynings Act) کے ذریعہ سے اسکاٹلینڈ بھی پارلیمنٹ کے اختیار قانون سازی کے حدود میں آگیا۔ ہنری ہشتم بھی اپنے باپ ہی کے نقش قدم پر چلا جب روما سے انگلستان کا انقطاع ہوگیا تو اس نے نواب کا لقب اختیار کرنے کے بجائے شاہ آئرلینڈ کا لقب اختیار کیا مذہبی اصلاح نے گو آئرلینڈ میں ایک بری صورت اختیار کی کہ خانقاہوں کو جو وہاں کے مذہب کی سنگ بنیاد تھیں برباد کردیا اور روما سے بھی زیادہ اجنبی کلیسہ اس ملک میں

آئرلینڈ میں اصلاحی تحریک۔

قائم کردیا اور عبادت کو انگریزی زبان میں کردیا جس کو وہاں کے لوگ لاطینی سے بھی کم سمجھ سکتے تھے پھر بھی اول اول اس کی کوئی ظاہری مخالفت نہ ہوئی۔ آئرلینڈ کے قلب کی حرکت سست تھی اور رائے عامہ کے اظہار کا کوئی باضابطہ ذریعہ بھی نہ تھا نہ قومی خود شناسی کا

احساس پیدا ہوا تھا۔

ایڈورڈ ششم و میری کے عہد حکومت پر غور کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں لیکن ایلزابتھ کی حکومت نے آئرلینڈ کی تاریخ میں ایک انقلاب کردیا جہالت کمزوری ظلم اور ناکامی کی یہ ایک داستان ہے۔ صرف آئرلینڈ کے کارنامہ پر نظر کی جاتی تو ملکہ کو کبھی "نیک ملکہ بس" (Bess) کا خطاب نہ ملتا۔ وہاں اس کے کیا اغراض و مقاصد تھے۔ اور ان کے حصول کے لئے اس نے کیا تدبیریں اختیار کیں ایک ناگوار سوال ہے۔

کوئی دو ملک بھی ایسے مختلف النوع نہیں ہوسکتے جیسے کہ آئرلینڈ و نیدرلینڈ سولھویں صدی میں ایک دوسرے کے مقابل میں تھے مگر پھر بھی جو مقصد فلپ دوم کا الوا (Alva) کو ۱۵۶۷ء میں نیدرلینڈز بھیجنے کا تھا۔ وہی ایلزابتھ اور اس کے مشیروں کا آئرلینڈ کے معاملات میں تھا۔ فلپ دوم نیدرلینڈز میں بھی اسی طرح حکومت کرنا چاہتا تھا جیسا کہ اسپین میں کرتا تھا۔ سترہ صوبوں کے لئے وہ ایک ہی دستور قائم کرنا چاہتا تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ ایک ملک کا اتحاد صرف دینی اتحاد پر قائم ہوسکتا ہے۔

ملکہ ایلزابتھ اور آئرلینڈ کے تعلقات کا مقابلہ فلپ اور نیدرلینڈز کے تعلقات سے۔

ملکہ ایلزابتھ بھی اسی طرح آئرلینڈ پر حکومت و سلطنت کرنا چاہتی تھی اور مقامی اختلافات و رسومات کو مٹا کر آئرلینڈ کو انگلستان سا بنا دینا چاہتی تھی اور انگلیسی کلیسہ کو عام طور پر قبول و تسلیم کراکے آئرلینڈ کا اتحاد قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس نے یہ بھی تجویز کیا اور اس کی کوئی نظیر فلپ کے طرز عمل میں نہیں پائی جاتی کہ آئرلینڈ کے وسیع خطوں کو ضبط کرکے ان میں انگلستان والوں کو آباد کیا جائے تاکہ انگریزی نظام کے قائم و جاری رکھنے میں ان لوگوں سے مستقل فوج کا کام لیا جاسکے۔

ملکہ کے آیرش طرز انتظام کے ہر لفظ پر ناکامی لکھی ہوئی ہے تو ناموزوں کلیسہ ترقی نہ کر سکا اور انگریز جو لا کر بسائے گئے تھے نکال دیئے گئے انگلستان کے غنیم یعنی پوپ و ہسپانیہ کے علمبردار آئرلینڈ میں سازشیں کرنے لگے اور جب بغاوت ہوئی تو آئرلینڈ والوں کا ساتھ دیا ملک فتح و تباہ ہو گیا لیکن کسی جدید دور کی بنیاد نہیں ڈالی گئی۔

آئرلینڈ میں الیزابتھ کی ناکامی	آئرلینڈ میں اس حکومت کا دائمی اثر یہ ہوا کہ رومن کیتھلک کلیسہ آیرش قوم و آزادی کا نشان بنگیا۔ اس صدی کی مذہبی تحریکوں نے انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ کو تو متفق کر دیا۔

لیکن انگلستان و آئرلینڈ میں افتراق پیدا کر دیا۔ لارڈ برلی (Burleigh) نے آئرلینڈ کے طرز انتظام کے متعلق حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں "فلیمنگ لوگوں کو ہسپانیہ کے مظالم سے تنگ آ کر بغاوت کرنے کی اس قدر وجہ نہیں تھی جس قدر کہ آئرلینڈ والوں کو انگلستان کے مظالم سے"

(۶)

الیزابتھ کے زمانہ کا علم ادب	سولھویں صدی کے انگلستان کا سب سے بڑا واقعہ اب تک نہیں بیان کیا گیا۔ کوئی شخص سولھویں صدی میں اطالیہ کی تاریخ بغیر رافائل (Raphael) مائیکل (Michal)

آنجیلو (Angelo) ٹیشیان (Titian) مکیاویلی (Machiavellies) کا نام لئے بغیر نہیں لکھ سکتا ہے۔ اسی طرح انگلستان کے اس صدی کے حالات بیان کرنے میں صرف جنگ و سیاست اور مذہبی جدو جہد کی حکایت تک محدود رہنا اور انگلستان کے اس علمی تحریک کو جو شروع صدی سے ختم صدی کے بعد تک بارآور ہوتی رہی بیان نہ کرنا ایک فعل عبث ہے علمی شغف کا یکایک نشو و نما تاریخ کے ان مظاہرات میں سے ہے جن کا سبب دریافت نہیں ہو سکتا اور ہم بھی یہاں سولھویں صدی میں انگریزی ذہنیت کے غیر معمولی نشوو ارتقا کے اسباب و علل پر غور نہیں کریں گے فن نقاشی میں تو انگلستان کوئی

ملکی صاحب فن اس رتبہ کا نہیں پیدا کر سکا جیسا کہ نیدر لینڈز جرمنی اطالیہ و فرانس نے کیا۔ اعلیٰ درجہ کی نقاشی انگلستان میں ہوتی تھی لیکن اس کے عامل ملکی لوگ نہیں ہوتے تھے بلکہ ہالبین (Holbein) ایسے غیر ملکی۔ انگلستان نے کوئی مشہور سنگتراش بھی نہیں پیدا کیا۔ لیکن علمی شغف کے دوسرے شعبوں میں انگلستان نے دوسرے ممالک کے سے کارنمایاں کئے بلکہ بعض شعبوں میں ان سے سبقت بھی لے گیا اس کے علمائے الٰہیات زونگلے (Zwingli) کیالون (Calvin) اور لوتھر (Luther) کیطرح کسی نئے طریقے کے بانی تو نہ تھے لیکن سر ٹامس مور (Sir Thomas More) کرینمر (Cranmer) صدر اسقف پارکر (Parker) ایسے لوگوں کے مذہبی اثرات بہت زبردست تھے علم ادب میں بیکین (Bocon) نہایت نامور ہوا لیکن تاریخ حکمت میں اس کا درجہ اس سے بھی بلند ہے (سائنس) حکمت میں اس کی فضیلت مابہ البحث رہی ہے اور اس کی حیثیت کا سمجھ لینا ذرا مشکل ہے اس کی فضیلت غالباً اس میں ہے کہ اس نے خود تو کوئی جدید چیز دریافت نہیں کی لیکن اس نے راستہ بتلا دیا اور خس و خاشاک سے راستہ کو صاف کر دیا۔ جہاں اس میں ڈارون (Darwin) اور نیوٹن (Newton) کے خصوصیات ہیں وہاں اس کی تصنیفات سائنس میں شکسپیر (Shakespeare) کے زمانے کا بھی رنگ پایا جاتا ہے۔

بیکن

شکسپیر

شکسپیر (Shskespeare) کے نام سے ہی یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ سولھویں صدی میں شعر و شاعری میں انگلستان سب سے ممتاز تھا جس طرح کہ اٹلی اس سے پہلے نقاشی میں ممتاز رہ چکا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اٹلی کے نقاشوں نے مسرت اندوزی کی ایک نئی قوت اور طرب کا ایک خاص احساس دنیا کے سامنے پیش کیا۔ الزابتھ کے زمانے کے انگلستان کی شاعری بھی اس سے کم جدت فروش اور نتیجہ خیز نہ تھی۔ شاعری اس میں شک نہیں کہ دنیا کے اعلیٰ و قدیم ترین علوم میں سے ہے اور اگر شکسپیر اور الیزابتھ کے زمانہ کے لوگ نہ بھی ہوئے ہوتے تو بھی اعلیٰ شاعری کا وجود دنیا میں ضرور ہونا۔ البتہ

شاعری کی موجودہ صورت ایلزابتھ کے زمانے کے اثرات سے خالی نہیں ہے انسان اور قدرت کا ایک نیا تصور پیدا ہوگیا، شاعری کو ایک نئی صورت دی گئی اور ادراکِ حسن کا ایک نیا طریقہ معلوم ہوا۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ بنی نوع انسان کے بیش بہا خزانے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔

حوالۂ کتب متعلقۂ باب ہذا:-

"انگلستان کی سیاسی تاریخ" جلد پانچ و چھ از ایچ اے ایل فشر (Fisher) و اے ایف پالرڈ (A. F. Pollard) (۲) "تاریخ انگلستان" از فراوڈ (Frouds) "انگریزوں کی ایک مختصر تاریخ" مصنفۂ گرین (Green) "تاریخ وساتیر انگلستان" از ہیلم (Hallam) "حیات وولسی" (Wolsey) از کرائٹن (Creighton) "و حیات ہنری ہشتم" از پالرڈ (Pollard) "و حیات ایلزابتھ" از بیسلی (Beesly)-

باب ہفتم

جنگ سی سالہ

۱۶۱۷ء میں جرمنی نے اس یادگار میں ایک جشن منایا کہ ایک صدی قبل انھیں ایام میں لوتھر نے پوپ کے مقابلہ کا اعلان کیا تھا جس کی وجہ سے جرمنی کا دو ثلث حصہ روما کی اطاعت سے منحرف ہو گیا تھا۔ ۱۵۵۵ء میں صلح آوگزبرگ (Augsbergh) ہوئی تھی۔ اس وقت سے جرمنی کے امن میں کوئی خلل نہیں واقع ہوا تھا۔ بڑے بڑے شہر اور مفصل کے اضلاع رونق پر تھے اور گزشتہ نصف صدی میں جرمنی کی ثروت بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد کے سال میں جنگ سی سالہ چھڑ گئی جو یورپ کی لڑائیوں اور خصوصاً قرونِ وسطیٰ کے بعد کی لڑائیوں میں سب سے زیادہ خوفناک تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انگلستان کو ایسی کوئی جنگ پیش ہی نہیں آئی۔ البتہ آئرلینڈ سولھویں اور سترھویں صدی میں اسی قسم کی کشمکش میں ضرور مبتلا ہوا تھا۔

لوتھری تحریک کا زوال

اس زبردست آتش زدگی کا مصالحہ پہلے ہی سے جمع ہو چکا تھا۔ صلح آوگزبرگ (Augsbergh) کے بعد سے اس ساٹھ برس کے زمانہ میں مذہبی صورت حال میں ایک سکون پیدا ہو گیا تھا۔ لوتھری تحریک کا جوش ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لوتھر کی تعلیم و تلقین سادگی معقولیت اور انسانیت پر مبنی تھی لیکن اس کی وفات کے بعد سے اس کی تحریک

سخت مذہبی اختلاف میں پھنس گئی۔ بڑی ردّ و قدح کے بعد لوتھری عقائد کا تعین ہوا تھا۔ بعض مملکتوں میں جہاں یہ نیا مذہب اختیار کیا گیا تھا۔ ایسے مذہبی مظالم برپا ہو گئے تھے کہ جرمنی نے مذہبی اصلاح کے پہلے دیکھا ہی نہ تھا۔ صلح آدگز برگ کے مطابق مذہبی معاملات کی نگہداشت مختلف مملکتوں کے حکمرانوں کے ہاتھ میں رکھ دی گئی تھی اور اکثر آزادی رائے و آزادی پرستش کے یہ لوگ روادار نہیں ہوتے تھے۔ اگر لوتھری

کیالونی فرقہ کا فروغ

لوگوں ہی کی قوت پر انحصار ہوتا تو پروٹسٹنٹ مذہب کا مستقبل بہت ہی مایوس کن ہوتا۔ لیکن کیالون کے عقائد کی اشاعت بہت دور تک پھیل گئی تھی اور جو لوگ اسے قبول کرتے تھے ان کا جوش و سرگرمی لوتھر کے متبعین سے بڑھا ہوا ہوتا تھا اور انسانیت میں بھی یہ لوگ اپنے ہمسروں سے کم نہ تھے۔ دونوں فرقوں کے حامی ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے۔ دونوں میں کسی قسم کا اتحاد فقط اسی وقت ممکن تھا جب کہ دونوں کے مقابل میں کوئی زبردست خطرہ پیدا ہو جائے۔ جرمنی کی مشہور پروٹسٹنٹ مملکتوں میں سیکسنی (Saxony) اور برینڈن برگ Brandenburgh کی بڑی مملکتیں لوتھر کی پیرو تھیں۔ گو تھوڑے ہی دنوں بعد

پیلاٹائینٹ کا فریڈرک

برینڈن برگ Brandenburgh کا حکمراں کیالون کے گروہ میں شامل ہو گیا کیالونی فرقہ کا خاص حامی فریڈرک والی پیلاٹائینٹ تھا۔ جو جیمز اوّل شاہ انگلستان کا داماد بھی تھا۔ کیالون کا فرقہ انجیلی کلیسہ کے نام سے مشہور تھا اور لوتھری فرقہ (اصلاحی) کلیسہ کے نام سے فریڈرک کچھ ایسا نامور حکمراں تو نہیں تھا لیکن عالی ہمت و بلند حوصلہ تھا۔ بخلاف اس کے سیکسنی اور برینڈن برگ کے والی پست ہمت اور متلوّن مزاج تھے۔

بیویریا کا مکسمیلین

پروٹسٹنٹ گروہ تو اس طرح منشق و بیدم تھا۔ لیکن کیتھلک فرقے میں کیتھلک ردِّ عمل کی تحریک کی بدولت

جس کے زور و قوت کا ذکر کسی باب سابق میں کیا گیا ہے۔ ایک زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا مجلس ٹرنٹ (Trent) کے فیصلوں نے کیتھلک عقائد کو ایک ضابطے کی صورت میں قائم کر دیا تھا۔ اور تمام ملک میں جیسوئیٹ لوگ پھیلے ہوئے نہایت قابلیت سے تبلیغ و تعلیم دے رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ جرمنی کی کیتھلک مملکتوں کو تقدیمی کارروائی کرنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔ جرمن حکمرانوں میں تحریک "ردِّ عمل" کا سب سے بڑا حامی مکسملین (Maximilian) والی بویریا (Bavaria) تھا۔ تمام پروٹسٹنٹ لوگ اِس کی سلطنت سے نکال دیے گئے تھے۔ اور بہت سی مملکتیں جو روما کی اطاعت میں متزلزل تھیں حقیقی طور پر اس کی اطاعت گذار بن گئیں۔ ایک وقت ایسا تھا کہ کولون (Cologne) کی ولایت پروٹسٹنٹ ہو جانے والی تھی اور وہاں کے صدر اسقف (آرچ بشپ) نے کیلونی مذہب اختیار بھی کر لیا تھا۔ لیکن وہ فوراً ہی معزول کر دیا گیا۔ اور تحریک دی گئی۔ کیتھلک گروہ اس قدر خطرناک ہو گیا۔ کہ ۱۶۰۸ء میں ایک انجیلی اتحاد قائم کرنا پڑا۔

۱۶۰۸ء کا انجیلی اتحاد

اس کا خاص رکن والی پیلاٹائینٹ (Palatinate) تھا اور ہس (Hesse) باڈن Baden ورٹمبرگ (Wurtemburgh) نے بھی اس کی تتبع کی۔ لیکن سیکسنی اور برینڈن برگ کی ممتاز لوتھری مملکتیں بالکل الگ رہیں دوسرے ہی سال ۱۶۰۹ء میں اس "انجیلی اتحاد" کو "کیتھلک انجمن" سے مقابلہ کرنا پڑا۔ نئی تحریک (ردِّ عمل) کی روح رواں

کیتھلک انجمن

مکسلین (Maximilian) والی بویریا (Bavaria) تھا سربرآوردہ مذہبی ولایتوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اور خود شہنشاہ قیصر بھی انجمن کے حامیوں میں تھا۔ دونوں عنوتیں یعنی "کیتھلک انجمن" و "انجیلی اتحاد" صرف حفاظت و تحفظ کا دعویٰ کرتے تھے لیکن "انجمن" کو قوی امید تھی کہ پروٹسٹنٹ تحریک اپنے مولد ہی میں فنا ہو کر رہیگی۔ بس اتنی بات ایک زبردست مذہبی جنگ کے لئے کافی تھی۔

جنگ کے سیاسی اسباب

اس جنگ کے سیاسی اسباب بھی واضح ہیں۔ تمام سلطنت آسٹریا میں حقیقی حکومت قایم کرنے میں خاندان ہیپسبرگ (Hapsburg) ناکام رہا تھا جس کا ثبوت خود صلح آوگز برگ میں نمایاں تھا۔ لیکن اب بھی ایسا کر لینے کی امید باقی تھی اور بجز انگلستان کے ہر جگہ اس قسم کا رجحان تھا کہ شہنشاہ کو اقتدار و اختیارات کا مرکز گردانا جائے جرمنی کی مختلف مملکتوں میں یہ رجحان نمایاں تھا تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ جرمن لوگوں میں مجموعی طور پر اس کا وجود نہ ہو۔

روڈالف دوم (Rudolf II)

اس زمانے کے شہنشاہ کوئی غیر معمولی قابلیت نہیں رکھتے تھے اور نہ خاندان ہیپسبرگ میں کوئی ایسی قابلیت والا پیدا ہوا اور جرمنی کے حکمرانوں میں بھی قابلیت کا معیار گرا ہوا تھا۔ ۱۵۷۶ء میں روڈالف دوم (Rudolf II) قیصری تخت پر جلوہ افروز ہوا اور ۱۶۱۲ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس کی تعلیم و تربیت ہسپانیہ میں ہوئی تھی اور وہ جیسوئٹ لوگوں کا شاگرد تھا اور اسی وجہ سے کیتھلک ردِ عمل کی تحریک کا پُر جوش حامی تھا۔ لیکن اس کے عہد حکومت کے آخری زمانہ میں خلل دماغ کے آثار نمودار ہوئے جیسا کہ ہیپسبرگ خاندان میں اکثر ہوا ہے۔ اسی وقت سے اس کا بھائی میتھیاس (Milthias) حقیقی حکمراں ہو گیا۔ گو تخت پر وہ بہت بعد میں بیٹھا۔ خاندان ہیپسبرگ کے مقبوضات بہت وسیع تھے۔ اور شاہ ہسپانیہ بھی شہنشاہ کا حلیف تھا۔ خود

آسٹریا و اسپین

اسپین میں بھی ہیپسبرگ کے خاندان ہی کی ایک شاخ حکمراں تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ شہنشاہ اپنے ذاتی مقبوضات واقع جرمنی و ہنگری (Hungary)، و بوہیمیہ (Bohemia) و دیگر مقامات سے اور نیز شاہ اسپین کی امداد سے ایسی قوت حاصل کرے گا جو جرمن مخالفین کی بیخ کنی کے لئے کافی ہوگی اور پھر قیصری حکومت اتنی ہی وسیع ہو جائے گی جتنی کہ ہنری چہارم یا فریڈرک باربروسا (Barbarossa) کے عہد میں تھی۔ کیتھلک انجمن پر بھی بھروسہ تھا۔ کیونکہ قیصری اقتدار کے اصل مخالف

پروٹسٹنٹ مملکتیں تھیں۔

اس جنگ کے مذہبی و سیاسی مقاصد ابتدائً باہم متفق تھے لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یہ اتفاق آخر تک نہیں بحال رہا اور ان دونوں مقاصد میں اختلاف پیدا ہوجانے سے دونوں کی توقعات پر پانی پھر گیا۔ ۱۶۲۹ء میں جب جرمنی قیصر کے قدموں کے نیچے آگیا تو بویریا (Bavaria) کے حکمراں اور دوسری کیتھلک دول کو محسوس ہونے لگا کہ خود ان کی محبوب آزادی معرض خطر میں ہے۔ اِن کی اس رقابت کی وجہ سے مظلوم پروٹسٹنٹ لوگوں کو حیاتِ تازہ نصیب ہوگئی۔

بوہیمیا میں فساد

جنگ شروع ہونے سے پہلے دھمکیاں دی جانے لگیں اور سب سے پہلے بوہیمیا میں تلوار کھینچی۔ بوہیمیا میں خاص طور پر پروٹسٹنٹ اور لوتھری مذہب رائج تھا۔ اور وہاں کے اکثر روساء اس نئے عقیدے کے حامی تھے۔ ابتدائً بوہیمیا کی بادشاہی انتخابی تھی۔ میتھیاس (Milthias) بوہیمیا کا بادشاہ بھی تھا اور (آسٹریا کا) شہنشاہ بھی اور ۱۶۱۷ء میں بوہیمیا والوں نے آسٹریا کے فرڈنینڈ (Ferdinand) کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ یہ شخص بڑا پُرجوش اور کیتھلک انجمن کا طرفدار تھا۔ اس کے شہنشاہ ہونے کا بھی یقین تھا۔ لیکن مذہبی معاملات میں بوہیمیا والوں سے نزاع پیدا ہوگئی۔ اس نے پروٹسٹنٹ کلیساؤں کو منہدم کرادیا تھا۔ جس پر بوہیمیا والے معترض ہوئے کیونکہ اس کے برعکس شہنشاہ سے عہد ہوچکا تھا

بوہیمیا کی تاجداری کے لئے فرڈنینڈ کا انتخاب

پراگ (Prague) میں ہنگامہ ہوگیا۔ شاہی کارندے قلعہ کی کھڑکیوں میں سے باہر پھینکدیے گئے جس کو (Defenestation) (کھڑکی سے پھینک دینا) کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس طریقہ سے تمام جرمنی میں تیس سال تک مصائب و تکالیف کا دروازہ کھل گیا۔ بوہیمیا والوں کی چشم امید لوتھری حکمرانوں پر لگی ہوئی تھی اور اپنا تخت و تاج بھی انھیں دینے کا ان لوگوں نے وعدہ

پراگ میں فساد

کیا مگر سب بے سود ہوا۔ آخر پیلاٹائینٹ کے کیالونی حکمراں فریڈرک نے اسے قبول کرلیا۔ اور جنگ شروع ہوگئی۔

اس جنگ کی خصوصیات

اس جنگ کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں کہ جنگ میں سخت مظالم ہوئے اور گو اس جنگ کا تعلق صرف جرمنی سے تھا مگر غیر دول بھی اس میں دخل انداز ہوئیں۔ اور اس کا دوران بھی غیر معمولی طور پر بڑھا رہا۔ اور جرمن قوم کو ناقابل بیان تکالیف ومصائب برداشت کرنا پڑے یہ سب باتیں خود جرمنی کی سیاسی حالت کی وجہ سے پیدا ہوئیں شہنشاہی سلطنت کا اقتدار تو بہت کم تھا۔ مگر اس کی بدولت جرمنی کی مختلف ریاستیں ایک قومی بنیاد پر متحد نہ ہوسکیں۔ لڑائی میں جو فوج رکھی گئی وہ محض کرائے کے سپاہی تھے جو تنخواہ اور لوٹ مار کی حرص سے آئے تھے۔ صرف سوئیڈن کی فوج اس کلیے سے مستثنیٰ تھی۔ لیکن ۱۶۳۲ء میں شاہ سوئیڈن کی وفات کے بعد اس فوج میں بھی وہ بات باقی نہ رہی۔ جرمنی ایسی فوج کے قابو میں تھا جس کو لڑائی سے

اجورہ دار سپاہی

کوئی تعلق یا غرض نہ تھی اور نہ ملک کی فلاح وبہبودی کی اسے کچھ پروا تھی۔ جوں جوں لڑائی بڑھتی گئی بہت سے سپاہی ایسے تھے کہ جنگ اور غارتگری کو انھوں نے ذریعۂ معاش بنالیا اور بیچاری امن پسند رعایا ان کا شکار ہوئی۔ علاوہ اس کے تمام یورپ کو اور خصوصاً جرمنی کی پڑوسی سلطنتوں کو اس جنگ میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ڈنمارک اور سوئیڈن اپنے مقبوضات اور پروٹسٹنٹ مذہب کی حفاظت کے لئے شریک ہوگئے اور آسٹریا کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے کے لئے فرانس بھی کود پڑا۔ اگر جرمنی اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو بہت جلد کیتھولک مذہب کو فتح حاصل ہوجاتی مگر

خارجی مداخلت

غیر ملک والوں نے مداخلت کرکے پروٹسٹنٹ مذہب کو بچالیا۔ لیکن ان کی مداخلت کی وجہ سے جرمنی ایسی تباہی میں پڑ گیا جو ناقابل بیان ہے۔

بوہیمیا میں لڑائی

پہلی یورش تو بہت جلد اختتام کو پہنچ گئی۔ فریڈرک

شاہ پیلاٹائنیٹ کو جو (Palatine) اب بوہیمیا کا بھی حکمراں ہو گیا تھا۔ جرمنی سے کوئی امداد نہ ملی۔ قیصری فوج جمع تو آہستہ آہستہ ہوئی۔ مگر اس کے بعد ٹیلی (Tilly) کی کمان میں یہ فوج سرعت کے ساتھ بوہیمیا میں گھستی چلی گئی اور ۱۶۲۰ء میں پریگ (Prague) کے قریب ہی جنگ کوہ سفید میں فریڈرک کی فوج کو شکست فاش دیدیا۔ اس مصیبت کے وقت کسی نے فریڈرک کو مدد نہیں دی۔ خود اس کے ملک پر قبضہ غنیم کا ہو گیا۔ اور وہ ہالینڈ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ وہاں سے اس نے اپنے خسر شاہ انگلستان سے عود شاہی کے لئے امداد چاہی مگر بے سود۔ بوہیمیا کے نصیب میں ہیبت ناک تباہی رکھی ہوئی تھی جو اس لڑائی کی آیندہ تباہی و بربادی کا پیش خیمہ تھی۔ شہنشاہ قیصر کے بہت سے مخالفین قتل کر دیے گئے ملک کا بہت سا حصہ ضبط کر لیا گیا۔ اور سنگین جرمانے وصول کر لئے گئے۔ اور بہت سے لوگ جلاوطن کر دیے گئے۔ بوہیمیا کا ملک انتہائی مصائب میں مبتلا ہو گیا اور یہ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اس جنگ کے سی سالہ عرصہ میں وہاں کی آبادی چار کروڑ سے گھٹ کر صرف ایک کروڑ رہ گئی۔ قیصر کے کارندوں نے وہی طرز عمل اختیار کیا۔ جو کچھ دنوں بعد کرامول (Cromwell) نے آئرلینڈ میں کیا۔ بوہیمیا جو پہلے خالص پروٹسٹنٹ تھا۔ اب ایک کیتھولک ملک بنا دیا گیا۔

پروٹسٹنٹ تحریک خطرہ میں

بوہیمیا کی اس لڑائی نے فوراً ایک معرکۃ الآرا جنگ کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ شاہی فوجوں نے پیلاٹائنیٹ پر قبضہ کر لیا۔ اس فتحیاب فوج کی موجودگی سے شمال کی پروٹسٹنٹ مملکتیں سہمی ہوئی تھیں۔ اور شہنشاہ نے کیتھلک لیگ سے جو وعدے کئے تھے ان کے پورا کرنے کا اب موقع آگیا تھا۔ فریڈرک کی سلطنت کا ایک حصہ یعنے شمالی پیلاٹائنیٹ بویریا کے مکسملین کو منتقل کر دیا گیا۔ اور ساتھ ہی اس کو "منتخب حکمراں" کا خطاب بھی ملا اس کی وجہ سے مذہبی مجلس میں کیتھلک فرقہ کی قوت بوجہ اکثریت بڑھ گئی۔ یہ ظاہر تھا کہ

پروٹسٹنٹ مملکتیں اگر اپنی آزادی و حقوق کو بچانا چاہتی تھیں تو اب ان کو بیدار ہونا چاہیئے تھا۔

ڈنمارک کی مداخلت

ان کی حمایت پر شاہ ڈنمارک آمادہ ہوا۔ وہ ڈیوک آف ہولسٹائن (Holstein) ہونے کی وجہ سے جرمن دول میں شمار کیا جاتا تھا۔ پروٹسٹنٹ فوج کو مینس فیلڈ (Mansfeld) ایسا ہونہار اور لائق سپہ سالار بھی مل گیا تھا۔ اور شہنشاہی سلطنت کے مشرق بعیدہ میں بلوہ ہوجانے سے بھی ان کو موقع مل گیا۔ یہ بلوہ ٹرانسلوانیا (Transylvania) میں بیتھلن گبور (Bethlen Gabor) نے برپا کیا تھا ان سب باتوں کے باوجود پروٹسٹنٹ مقاومت کی کامیابی کی امید بہت جلد جاتی رہی۔ شہنشاہ قیصر کی طرف ٹلی (Tilly) سے بھی زبردست ایک نبرد آزما پیدا ہو گیا تھا۔

والنسٹائن

جس کا نام والنسٹائن (Wallenstein) تھا۔ یہ شخص بوہیمیا کے شرفاء میں تھا اور اس کا آبائی مذہب پروٹسٹنٹ تھا لیکن تبدیل مذہب کرکے اس نے شہنشاہ قیصر کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ اس جنگ کے دوران میں یہی ایک شخص جرمن لوگوں میں اعلیٰ قابلیت کا سپہ سالار پیدا ہوا۔ لیکن یہ بھی اصل میں جرمن نہیں تھا۔ بلکہ بوہیمیا کا رہنے والا تھا۔ اس نے معمولی کرایہ کے سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کی اور چونکہ اس کی قابلیت مسلمہ اور سپاہیوں کے ساتھ اس کی دریا دلی مشہور تھی۔ اس کی فوج میں بڑے بڑے حوصلہ مند اور من چلے شامل ہو گئے۔ والنسٹائن نے بھی دوسری سپہ سالاروں کی طرح غریب کاشت کاروں کو بیدردی سے غارت کیا۔ لیکن ذرا سلیقہ سے بڑے بڑے انعام اور سخت سزاؤں سے اس نے اپنی فوج کو قابو میں رکھا۔ ترتیب و انتظام و صف آرائی میں اس کی اعلیٰ قابلیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس کا حوصلہ اس قدر بلند تھا کہ آخر میں وہ خود کو جرمنی کا حکمراں بھی بنانا چاہتا تھا اس کی زبردست اور باقاعدہ فوج نے بہت جلد مینس فیلڈ اور شاہ ڈنمارک کی فوجوں کو شکست دیدی مینس فیلڈ تو مر گیا اور ڈنمارک کا بادشاہ ہار گیا شمالی و مغربی

اضلاع و شہر سب والنسٹائن کے قبضہ میں آ گئے۔ ۱۶۲۸ء میں اس نے اسٹرال سنڈ (Stralsund) کا محاصرہ کر لیا۔ اور قسم کھائی کہ اس کو فتح کر کے چھوڑیگا چاہے وہ آسمان سے کیوں نہ لٹکا ہو لیکن محصورین کی شجاعت اور سوئیڈن کی فوج کے ایک دستہ کی موجودگی سے شہر بچ گیا۔ یہیں سے فریقین کے توازن میں ردّ و بدل کے آثار پیدا ہو گئے۔ بہر حال فی الوقت تو والنسٹائن نے شہنشاہ کو تمام جرمنی کا ایسا مالک بنا دیا تھا جیسا کہ مذہبی اصلاحات کے بعد سے کوئی شہنشاہ نہ ہوا تھا۔

آئینِ اعادہ یہ ممکن ہے کہ یہ حالت قائم رہ جاتی اور اگر زیرکی و دانائی سے کام لیا جاتا تو اس کو بقائے دائمی حاصل ہو جاتی لیکن کیتھلک مذہب کے ساتھ ساتھ شہنشاہی کو بھی فتح حاصل ہوئی تھی اور اب ان دونوں کے مقاصد و اغراض میں اختلاف رونما ہو گیا تھا۔ جرمنی میں شہنشاہ کی خاص مدد و معاون کیتھلک انجمن تھی اور اس کا صدر بویریا کا مکسملین تھا۔ جو والنسٹائن کی قوت کو بڑھتے دیکھ کر رشک کرنے لگا تھا۔ اور وہ اس بات کا آرزومند ہوا کہ کلیسہ کو اب صلہ ملنا چاہیے۔ اس لئے ۱۶۲۹ء میں شہنشاہ نے "آئین اعادہ" جاری کیا۔ جس میں حکم تھا کہ جو دینی مملکتیں ۱۵۵۲ء کے بعد دنیاوی لوگوں کے قبضے میں آ گئی تھیں۔ پھر دینی حکام کو واپس کر دی جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ آئین قانوناً درست تھا اصل میں یہ صرف مصالحت آوگزبرگ (Augsburgh) کا اتباع تھا اور مصالحت آوگزبرگ کو فریقین نے قبول کر لیا تھا۔ لیکن اس فرمان میں ایک زبردست انقلاب مضمر تھا۔ دو صدر اسقفوں کی ولایت اور بارہ اسقفوں کی ولایت اور بہت سی خانقاہیں موجودہ قابضین سے چھین لی جانے والی تھیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض تقریباً نصف صدی سے بلا مزاحمت قابض تھے لیکن اس کا چارہ کیا تھا۔ والنسٹائن کی فوج کا مقابلہ تو کوئی جرمن دل نہیں کر سکتی تھی۔

والنسٹائن کی مخالفت

پروٹسٹنٹ طرفداروں کو رہائی کی پہلی علامت والنسٹائن کے ذاتی اقتدار کے خلاف اس کے حلیفوں کے عناد میں نظر آئی۔ میکسملین اس سے خوف و نفرت کرتا تھا اور شہنشاہ بھی اُس سے بدگمان ہو چلا تھا کیونکہ "آئین اعادہ" کے متعلق وہ نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ سنہ ۱۶۳۰ء میں بمقام ریٹس بن (Ratisbon) مجلس ڈائیٹ (Diet) کا انعقاد ہوا۔ فرانس نے وہاں پادری جوزف (Joseph) کو بھیجا۔ جو رشی لیو (Richelieu) کا معتمد کارندہ تھا۔ اِس نے مجلس کے اراکین کو والنسٹائن کے خلاف بھڑکایا۔ انھوں نے شہنشاہ سے اس کی فوری برطرفی کی استدعا کی اور شہنشاہ چونکہ خود اس سے جلا ہوا تھا اور پھر مجلس سے دوسری رعایتیں حاصل کرنے کا امیدوار تھا اس لئے اس نے فوراً احکام جاری کر دیے۔ لوگوں کو شبہ تھا کہ والنسٹائن اِس حکم کی تعمیل بھی کرے گا یا نہیں۔ لیکن اس نے بغیر چون و چرا کے تعمیل کر دی اور بوہیمیا کو واپس چلا گیا۔ اس میں ایسی لیاقت تھی اور اس کی کارگزاری ایسی شاندار تھی کہ ابھی سے اس کا زمانہ ختم نہیں سمجھا جا سکتا تھا پھر جب وہ آیا تو اس نے زیادہ

والنسٹائن کی دست کشی

انانیت پسند طریقہ اختیار کیا۔ اور شہنشاہ کی مرضی کا کچھ لحاظ نہ کیا۔

شہنشاہ کا سب سے بڑا سپہ سالار جاتا رہا۔ اور اس کی فوج گھٹ گئی۔

گسٹیوس ایڈولفس

اور اس وقت ایک نیا غنیم میدان میں اتر آیا۔ یہ گسٹیوس ایڈولفس والئی سوئیڈن (Gustavus Adolphus) تھا جو سنہ ۱۶۳۰ء کی جولائی میں جرمنی کے ساحل پر اُترا۔ اوائل سولھویں صدی کرسچین دوم (Christian II) کے عہد میں ناروے اور ڈنمارک بھی سوئیڈن میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن اسی کے عہد میں مذہبی و سیاسی وجوہ کی بناء پر بغاوت ہو گئی۔ وہ معزول اور مقید کر دیا گیا۔ ناروے اور ڈنمارک نے نیا بادشاہ منتخب کیا اور سوئیڈن گسٹیوس واسا (Gustavus Vasa) کے قبضے میں آگیا۔ جس نے بغاوت کر کے پروٹسٹنٹ مذہب

قائم کر دیا تھا تخت و تاج اس کے خاندان کا موروثی قرار دیا گیا بشرطیکہ لوتھری مذہب سے روگردانی نہ کیجائے گسٹاوس ایڈولفس ۱۶۱۱ء میں تخت نشین ہوا۔

سویڈن کی مخالفت کی وجہ

وہ بڑا سچا اور پکا پروٹسٹنٹ تھا اور جرمنی میں اپنے ہم مذہبوں کی مایوسی دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ لگی۔ لیکن علاوہ مذہبی غرض کے جرمنی میں اس کے وارد ہونے کے اور اسباب بھی تھے کیونکہ بحر بالٹک پر سویڈن اپنا قبضہ چاہتا تھا اور اس کے ساحل پر شہنشاہی فوج کی کامیابی دیکھ کر اسے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ پولینڈ کا شاہی خاندان جو واسا خاندان کی کیتھلک شاخ سے تھا۔ سویڈن کے تخت و تاج کا مدعی تھا اور جرمنی میں کیتھلک ردِ عمل کی کامیابی سے اس کو بہت تقویت حاصل ہو جانے کا احتمال تھا۔ مذہبی، تجارتی اور خاندانی فائدہ کے لئے گسٹاوس کا جرمنی میں داخل ہونا ضروری تھا۔ اس جنگ کے مبارزین میں سے اسی میں یہ صفت تھی کہ مذہبی غرض کو دیگر اغراض پر مقدم رکھتا تھا۔ اس کی فوج ایسی تھی کہ

سوئیڈن کی فوج

جرمنی نے اب تک دیکھا ہی نہ تھا۔ سوئیڈن بہت مفلس تھا اور وہاں کے سپاہی دوسرے اجرہ دار سپاہیوں سے ایسے ہی ممتاز ہوئے جیسے جنوبی سپاہیوں میں سوئزلینڈ والے قومی نخوت اور مذہبی جوش کی بناء پر وہ ایک قومی فوج بن گئے اور ان میں انضباط و پابندی قائم ہو گئی۔ گسٹاوس بھی اپنے زمانہ کا بڑا سپاہی تھا بمقابلہ دیگر متقدمین کے اس نے توپ خانے سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور دائماً فوجی قواعد کرنے سے اس کے سپاہی اپنے حریف سے زیادہ چابکدست ہو گئے تھے۔

جرمنی میں ابتداءً داخل ہونے کے وقت تو اس کی کچھ زیادہ ہمت افزائی نہ ہوئی۔ شاہی فوج کی کامیابی ایسی زبردست تھی اور اس کے حریفوں کی حالت ایسی زار کہ پھر مقابلہ کو کھڑے ہونے کا شوق باقی نہ رہا تھا۔ برینڈن برگ کا منتخب حکمران جارج (George William)

میجبرگ (Magdeburg)

ولیم اور سیکسنی کا جان جارج (John George) جن پر گسٹاوس کو بہت کچھ بھروسہ تھا۔ خود غرضی اور تلون کے بندے بنے رہے دریائے ایلب (Elbe) کے کنارے شہر میجبرگ (Magdeburg) کی طرف ٹلی (Tilly) بڑھ رہا تھا۔ یہ شہر "قانون اعادہ" میں شامل تھا مگر اس نے تعمیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ برینڈن برگ اور سیکسنی کی مدد سے گسٹاوس اس شہر کو بچا سکتا تھا۔ لیکن ان دونوں کے انکار کی وجہ سے اس شہر کی شامت آگئی وہ فتح ہو گیا اور اس کے باشندے ایسے قتل و غارتگری کے شکار ہوئے جس سے تمام جرمنی کانپ اٹھا۔ آخر کار شہنشاہ کی دھمکیوں سے خائف ہو کر برینڈن برگ و سیکسنی شریک ہوئے اور گسٹاوس جس کو لوگ "شمالی شیر" کہنے لگے تھے حملہ کرنے کے قابل ہو گیا۔

بریٹن فیلڈ (Breitenfeld) کی لڑائی

ستمبر ۱۶۳۱ء میں لائپزک (Leipzic) کے قریب بریٹن فیلڈ کے مقام پر ٹلی (Tilly) سے آمنا سامنا ہوا گسٹاوس کے کمال فن سپہ گری اور اس کی فوج کی چالاکدستی کی بدولت اسے عالیشان فتح نصیب ہوئی۔ ایک ہی حملہ میں شہنشاہ کی عظمت جرمنی میں جاتی رہی اور وائینا (Vienna) گسٹاوس کے ہاتھوں میں نظر آنے لگا لیکن بجائے وائینا کی طرف بڑھنے کے اس نے ڈینیوب (Danube) کے کنارے مین (Main) اور رائن (Rhine) کی دینی سلطنتوں پر حملہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ کہیں پھر باقاعدہ مقاومت نہیں ہوئی۔ ٹلی کو دریائے لیک (Lech) پر پھر شکست ہوئی اور وہیں وہ زخموں کی تاب نہ لاکر مر گیا۔ بویریا اور میونچ (Munich) بھی جو کیتھلک انجمن کے مرکز تھے گسٹاوس کے قبضہ میں آگئے۔ پروٹسٹنٹ مذہب کو جس کی زندگی کی کل تک کوئی امید نہ تھی آج اس کی فتح و کامیابی کا اطمینان ہو گیا۔ کہ پھر وہی مظفر و منصور ہوگا۔

گسٹاوس کی وفات

اس مایوسی کی حالت میں شہنشاہ پھر والنسٹائن کی طرف رجوع ہوا۔ صرف وہی سویڈن کے تاجدار کا مقابلہ کرنے کا اہل تھا۔ لیکن وہ خود بڑے لمبے چوڑے منصوبے

سوچ رہا تھا، اور یہ یقین نہیں تھا کہ شہنشاہ کی مدد پر وہ آئے گا لیکن شہنشاہ نے اس سے برابری کا برتاؤ کیا اور فوج پر اس کو کامل اختیار دینے کا وعدہ کیا تھا تو اس نے پھر ایک مرتبہ اپنا زرہ بکتر سنبھالا۔ اس کے نام کی عظمت ہی سے ایک زبردست فوج جمع ہو گئی اور صف آرائی و فن سپہ گری میں اس نے خود کو گسٹاوس کا مدِ مقابل ثابت کر دیا پہلے نیورن برگ (Nürnburg) کے جوار میں لڑائی ہوتی رہی جہاں گسٹاوس کو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ نومبر ۱۶۳۲ء میں بمقام لوٹزن (Lutzen) جو اس میدان جنگ سے قریب ہی ہے جہاں ٹلی (Tilly) کو شکست ہوئی تھی گسٹاوس اپنے زبردست حریف سے دوچار ہوا۔ گھرے کھرے کے اندر فریقین میں ایک خونناک و طویل لڑائی ہوئی جس میں والنسٹائن (Wellenstein) کو شکست ہوئی اور اس نے اپنی فوج میدان سے ہٹا لی۔ لیکن پروٹسٹنٹ لوگوں کے لئے یہ حقیقی فتح نہ تھی کیونکہ لڑائی کی گرم بازاری میں گسٹاوس ہلاک ہو گیا۔ اور اس کی قائم مقامی کے لئے ایسا ساونت اور مدبر کوئی نظر نہ آتا تھا۔

والنسٹائن کے منصوبے

اس وجہ سے پھر پانسا اُلٹ گیا لیکن ایسا اس سے پیشتر ہی والنسٹائن کی زندگی میں ایک عجیب و دردناک واقعہ رونما ہوا۔ گسٹاوس کی وفات کے بعد والنسٹائن کی ضرورت باقی نہ رہی تھی لیکن اسی کے ساتھ والنسٹائن کے منصوبوں کی ایک رکاوٹ جاتی رہی لوٹزن کی جنگ کے بعد منصوبوں کا مقصد بتلانا ناممکن ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا مقصد رعایا یا تحت کی حیثیت سے بڑھ کر کچھ اور حاصل کرنے کا تھا۔ اس نے شہنشاہ کے احکام کو کچھ نہ مانا اور فرانس و سویڈن والوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ بہت ممکن ہے کہ خاندان ہیپسبرگ کو اتار کر وہ خود جرمنی کے تخت پر بیٹھنے کا متمنی ہو۔

والنسٹائن کی وفات

(Wallenstein) شہنشاہ فرڈیننڈ (Ferdinand) کے پاس کوئی مسلح فوج والنسٹائن کے مقابلے کے

لئے نہ تھی لیکن اس کے عہدہ داروں میں ایسے لوگ تھے جو شہنشاہ کی اغراض پورا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ چنانچہ اپنے ہی سپہ سالار کے خلاف ایک سازش کرنے میں شہنشاہ شریک ہوا اور ۱۶۳۴ء میں والنسٹائن کو اسی کے سرداروں نے قتل کر دیا۔ ان کے نام ڈیوریو (Devereux) بٹلر (Butler) اور گارڈن (Gordon) تھے۔ یہ لوگ آئرلینڈ اور اسکاٹلینڈ کے ان منچلوں میں تھے جنھوں نے والنسٹائن کی فوج میں آکر نام و دولت پیدا کیا تھا۔

نارڈلنگن (Nordlingen) کی لڑائی۔

والنسٹائن کی فوج اب شہنشاہ کی فوج ہوگئی گسٹاوس کی وفات کے بعد سوئیڈن کی فوج دوسرے عہدہ داروں کی طرح ہوگئی اور جہاں کہیں پھرتی پھراتی پہنچتی تھی تباہی و بربادی پھیلاتی جاتی تھی لشکریوں سے زیادہ تو ہمراہیان لشکر کی تعداد تھی جو مظالم و طمع میں مبارزین سے کم نہ تھے۔ جولائی ۱۶۳۴ء میں بمقام نارڈلنگن (Nordlingen) پھر پروٹسٹنٹ فوج مقابلہ پر آئی اور شکست فاش کھا گئی۔ یہ جنگ بھی ایسی ہی اہمیت رکھتی ہے جیسی بریٹن فیلڈ (Breitanfield) کی جنگ کیونکہ بریٹن فیلڈ کی جنگ نے پروٹسٹنٹ مذہب کو بچا لیا تھا تو اس جنگ نے کیتھلک مذہب کو تباہی سے بچا لیا۔

فرانس کی مداخلت

اب بھی اس جنگ کے اختتام کو چودہ برس باقی تھے اور اس اثنا میں فلاکت زدہ ملک کو امن نصیب نہ ہوا۔ اور اب بھی اگر پروٹسٹنٹ مذہب کو مدد مل سکتی تھی تو جرمنی کے باہر ہی سے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ مدد رومن کیتھلک اسقف اعلیٰ (کارڈنل) رشیلیو (Richelue) سے ملی جو شاہ فرانس کا عقل کل تھا۔ اس نے جنگ کی رفتار کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اسی نے ۱۶۳۳ء میں والنسٹائن کو برطرف کرا دیا تھا اور گسٹاوس کو مالی امداد دی تھی۔ پروٹسٹنٹ اتحاد کی منتشر فوج کو اس نے فرانس کی ملازمت میں رکھ لیا اور ویمر کے برنارڈ (Bernard of Weimer) کی کمان میں اس فوج نے اپنے کو قائم رکھ کر

فتوحات حاصل کیئے۔ سنہ ۱۶۳۵ء میں فرانس نے اسپین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جو ہمیشہ سے شہنشاہ کا حلیف رہا تھا اور اس طور پر فرانس خود بھی شریک جنگ ہو گیا۔

جنگ کا خاتمہ

اس کے بعد ہر قسم کے خلفشار کے باوجود یہی تقسیم قائم رہی۔ سویڈن والے ٹارس ٹن سن (Tors Tenson) کی ماتحتی میں مشرقی جرمنی میں مصروف بہ پیکار رہے اور انھوں نے فتوحات بھی حاصل کیئے جو برٹین فیلڈ اور لوٹزن کی فتوحات یاد دلاتی تھیں۔ اُدھر فرانسیسی فوج رائن (Rhine) اور بلجیم کے سرحدات پر لڑ رہی تھی ٹارس ٹن سن بحیثیت سپاہی کے گسٹاوس کا جانشین ہونے کی اہلیت رکھتا تھا۔ فرانسیسی شروع شروع تو ناکام رہے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں پرنس کونڈے (Prince Conde)

تیورن وکانڈی

اور تیورن (Turenne) ایسے نامور سپاہی پیدا ہوئے تیورن تو فن سپہ گری میں بہت مشہور ہوا۔ رشیلیو کی حکمت عملی سے خود اسپین کے جزیرہ نما میں اسپین کے دشمن پیدا ہو گئے چنانچہ سنہ ۱۶۴۰ء میں کیٹالونیا (Cattalonia) نے بغاوت کر دی۔ صلح مصالحت کی بات چیت ایک عرصہ سے ہو رہی تھی مگر ہر فریق کو کسی فیصلہ کن انجام پر پہنچنے کی امید تھی اور دونوں فوجوں کے سپاہی پیشہ ور لڑنتیے ہونے کی وجہ سے لڑائی جاری رکھنے کے متمنی تھے۔ مصیبت زدہ ملک والوں کی بھلا کون سنتا تھا۔ فیصلہ کن لڑائیوں میں فرانس ہی کو فتح نصیب ہوی۔ سنہ ۱۶۴۳ء میں بمقام راکروا (Rocroy) ہسپانوی آزمودہ کار پیدل فوج کو کونڈی نے پہلی مرتبہ شکست دی اور پھر لان (Lens) کے مقام پر اس شکست کو بالکل مکمل کر دیا۔ سنہ ۱۶۴۲ء میں رشیلیو (Rihelieu) فوت ہو گیا مگر اس کا جانشین مزارین (Mazarin) ایسا لایق شخص ہوا۔ اور اسی نے صلح کی گفت وشنید کو انجام تک پہنچایا۔ فرڈنینڈ سوم فرڈنینڈ دوم کا

۱۶۳۷ء میں جانشین ہوا۔ ضرورت کے سامنے اسے سر جھکا دینا پڑا اور آخر کار بڑی رد و قدح کے بعد ۱۶۴۸ء میں ویسٹ فیلیا (Westphalia) کی صلح طے پائی۔

یورپ میں اس سے زیادہ اہم کوئی صلح نہیں ہوئی ہے اسی نے مذہبی اصلاح کا دور اختتام کو پہنچایا اور اس کے فیصلوں کا اثر اب بھی یورپ میں پایا جاتا ہے

صلح ویسٹ فیلیا (Westphalia)

مذہبی نقطۂ نظر سے جنگ کا انجام دونوں فریق کے لئے یکساں رہا۔ گسٹاوس (Gustavus) اور ریشیلیو (Richelen) اور مازارین (Mazarin) نے پروٹسٹنٹ مذہب کو فنا ہونے سے بچا لیا تھا مگر کیتھلک ردعمل کی تحریک بھی قائم رہی۔ جنوبی اور مغربی جرمنی کا مذہب رومن کیتھلک ہی رہا لیکن شمالی حصہ پروٹسٹنٹ ہو گیا تھا۔ "قانون اعادہ" منسوخ ہو گیا۔ تمام دینی ملکیت جو ۱۶۲۴ء کے قبل پروٹسٹنٹ قبضے میں تھی اس کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی۔ کیالونی فرقہ کو وہی استحقاق ملے جو لوتھری فرقہ کو حاصل تھے۔ دوسری باتوں میں صلح آگزبرگ (Augsberg) کی متابعت کی گئی۔ ہر شخص کو فرداً فرداً مذہبی آزادی نہیں دی گئی بلکہ ایک ایک مملکت کو۔ لیکن رفتہ رفتہ مذہبی آزادی کا اصول قائم ہو گیا۔

مذہبی جنگ برابری پر ختم ہوئی

اور مذہبی تعصب و تشدد کا دور ختم ہو گیا۔

کیتھلک مذہب سے بڑھ کر شہنشاہیت کو البتہ صدمہ پہنچا تھا اسے کچھ فائدہ

شہنشاہی قوت کی شکست

نہ حاصل ہوا۔ جرمنی میں پہلے سے بھی زیادہ نااتفاقی تھی۔ برینڈنبرگ۔ سیکسنی بیویریا اور دوسری بڑی بڑی مملکتیں سب خود مختار ہو گئی تھیں۔ زبانی طور پر تو وہ سلطنت کا دم بھرتی رہیں لیکن خارجی جنگ اور عدل گستری کے

معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کی روادار نہ تھی۔ جرمنی میں اس وقت (۳۴۳) خود مختار مملکتیں تھیں جن میں سے (۱۵۸) تو دنیوی اور (۱۲۳) دینی تھیں، اور (۶۲) شہنشاہی شہر تھے اب ہیپسبرگ (Hapsburgh) خاندان نے اپنے موروثی مملکتوں تک اپنے کو محدود و مصروف رکھا۔ اور چونکہ ان مملکتوں میں غیر جرمن رعایا کی تعداد جرمن رعایا سے بہت زیادہ تھی اس لئے اب اس کا شمار جرمن دول میں نہیں رہا۔ شہنشاہی سلطنت کا تقریباً خاتمہ ہوگیا تھا جو کچھ رہا سہا تھا اس کی وجہ سے جرمنی میں ایک قومی زندگی قائم ہونے میں دقت تو ضرور ہوئی لیکن اور کچھ اثر نہیں ہوا۔

جرمن دول میں البتہ چند اہم تغیرات واقع ہوئے

بویریا | پیلاٹائینیٹ (Palatinate) اور "منتخب" (Elector) کا خطاب بویریا کے تاجدار کے قبضہ میں رہا۔ زیرین پیلاٹائینٹ (Lower Palatinate) ایک علٰحدہ مملکت ہوگئی اور بوہیمیا (Bohemia) کے بد قسمت تاجدار کے بیٹے کو ملی۔ بوہیمیا (Bohemia) کا تاجدار وہی تھا جس کی ہوس کی وجہ سے یہ جنگ شروع ہوئی تھی۔ فریڈرک ولیم والی برنڈن برگ نے جسے بعد میں منتخب اعظم کا لقب ملا اور جو ۱۶۴۰ء میں تخت نشین ہوا تھا پامیرینیا

میجبرگ | (Pomerania) کا کچھ حصہ اور میجبرگ کا مشہور شہر اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ میجبرگ (Magdeburg) دریائے ایلب (Elbe) پایاب ہونے کے سبب سے بڑے گھاٹ پر واقع تھا سوئزرلینڈ اور

برینڈنبرگ | نیدرلینڈز کی متحدہ ریاست" خودمختار مملکتیں تسلیم کرلی گئیں۔

فرانس | میٹز (Metz) ٹول (Toul) اور ورڈون (Verdun) کی اسقفی ولایتوں پر فرانس کا حق تسلیم کرلیا گیا اور پورا السیس (Alsace) باستثنا اسٹراسبرگ (Strassburg) و چند دیگر اضلاع فرانس کے قبضہ میں آگیا۔ دونوں صورتوں میں حدود کا

تعین صاف طور پر نہیں کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے لوئی چہاردہم کے زمانہ میں فرانس حملہ آور ہوا۔

سویڈن

سویڈن کو بے انتہا فوائد حاصل ہوئے۔ مغربی پامیرینیا (Pomerania) اور دریائے اوڈر (Oder) کے دہانے کے اضلاع ورڈون (Verden) بریمن (Bremen) وغیرہ اس کے قبضہ میں آ گئے۔ آئندہ اور فتوحات کا دروازہ اس کے لئے کھل گیا۔ اور اس کا امکان نظر آنے لگا کہ شمالی جرمنی میں وہ مستقل حکومت قائم کرے گا۔ خود اس کی آبادی بالکل تھوڑی اور اس کی زمینیں بیکار تھیں اور اس زمانے اور آنیوالی نسل کی مہم نے اس کا خزانہ خالی کر دیا اس کے لئے یہ اچھا ہوا کہ اس کے فتوحات کا سلسلہ بند ہو گیا اور خود اپنے ملک کی ترقی کی طرف اس کی توجہ ہوی۔ چنانچہ اس کام میں اس کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوی۔

جرمنی کی تباہی

صلح ویسٹ فیلیا (Westphalia) میں حکمت عملی سے جو نتائج پیدا ہوے ان کے محض بیان کر دینے سے جنگ کے نتائج پر روشنی نہیں پڑتی بہت بڑا اثر جنگ کا یہ ہوا کہ نصف صدی تک یورپین سیاست میں جرمنی کا کوئی شمار نہ ہوتا تھا اور کامل ایک صدی کے بعد جرمنی سنبھل سکا۔ اسی سالہ مدت جنگ میں ملک کے کسی حصے میں بھی امن قائم نہیں رہا تھا۔ مفصل کے اضلاع بالکل خالی ہوگئے تھے مورخین کا اندازہ ہے کہ دو ثلث آبادی کے قریب کم ہوگئی۔ بوہیمیا کی آبادی تو ایک ربع سے بھی کم رہ گئی تھی۔ اور برلن کی آبادی چوبیس ہزار سے چھ ہزار ہو گئی صنعت و حرفت علوم و فنون کا فقدان ہو گیا تھا۔ لوگوں کے خیالات و اعمال میں ایک وحشیانہ انداز پیدا ہو گیا تھا۔ نہ مذہب کا کوئی بلند معیار تھا نہ تدبیر و سیاست کا۔ بجز آئرلینڈ کے اور کوئی ملک ایسے جہنمی عذاب میں نہیں

مبتلا ہوا۔ جرمنی کے مٹ جانے سے فرانس کو اپنی ہوس پورا کرنے کا صاف راستہ مل گیا۔ اور ہنری چہاردہم کے عہد کی ممتاز خصوصیات کا یہی سبب ہے۔

حوالۂ کتب متعلقۂ باب ہذا:-

"جنگ سی سالہ" از اس۔ آر گارڈنر-(S. R. Gardiner) "گسٹاوس ایڈولفس" Gustavus Adolphus" از فلیچر (C. R. Fletcher) "جنگ سی سالہ" از شلر (Chillar) " اسکینڈینیویا" (Scandinavia) از بین (Bain) شلر کے غمناک ڈرامے "پکولومینی" (Piccolomini) "ولینسٹائن"

فرانس کی شاہی کا عروج ۔ رشیلیو (Richeleu) اور مزارین (Mazarin)

فرانس میں ردعمل

سنہ ۱۶۱۰ء میں ہنری چہارم کی وفات پر اس کی سب تدبیریں جو داخلی و خارجی معاملات میں اس نے سوچی تھیں الٹ پلٹ ہوگئیں اور اس کی ملکہ میری ڈی میڈیسائی (Marie de Madic.) ولی مقرر ہوگئی۔ چونکہ اس کے شوہر نے اس سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا اب اس نے اس کی تجاویز کے خلاف عمل کرنیکا ارادہ کرلیا۔ اس کا ارادہ ہوا کہ فرانس کے شاہی خاندان میں اور اسپین کے شاہی خاندان میں رشتہ قائم کرکے دونوں سلطنتوں کو متحد کردے۔ گو کہ اسپین جواب تک فرانس کا سخت دشمن تھا۔ فرانس کی رائے عامہ اس کی تجویز کے خلاف تھی۔ اور اعیان دولت و پروٹسٹنٹ لوگوں میں فتنہ انگیز تحریکیں شروع ہوچکی تھیں مگر اس نے غیر معمولی استقامت و قوت سے کام لیا اور سنہ ۱۶۱۲ء میں عقد کے معاہدوں پر دستخط بھی ہوگئے۔ لوئی چہاردہم جو اس وقت صرف گیارہ سال کا تھا

خلفشار

فلپ سوم (Phlips III) شاہ اسپین کی بیٹی آسٹریا کی این (Anne of Austria) سے منسوب کیا گیا اور ہسپانوی شہزادہ جو بعد میں فلپ چہارم کے نام سے مشہور ہوا۔ فرانس کی شہزادی ایلزابتھ سے منسوب ہوا اس کے بعد فرانس کے معاملات میں

بڑی پیچیدگی پیدا ہوگئی جس کو سلجھانے کی ہم یہاں کوشش نہیں کریں گے۔ ۱۶۱۴ء میں ملکتوں کی ایک مجلس عام (States General) منعقد ہوئی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ تاریخ میں یہ مجلس اس وجہ سے یاد کی جاتی ہے کہ اپنی نوعیت کی یہ آخری مجلس تھی جس میں مختلف ملکتوں کے نمائندے جمع ہوئے تھے البتہ ۱۷۸۹ء میں جا کر پھر ایک مرتبہ ایسی مجلس منعقد ہوئی تھی جس نے انقلاب عظمیٰ کا دور شروع کرایا۔

عہد رشیلیو

۱۶۲۴ء میں کارڈنل رشیلیو (Richelieu) کا بادشاہ کی کونسل میں داخل ہونا ایک خاص اور اہم واقعہ ہے ملکی معاملات میں پہلے پہل وہ ملکہ کے مشیر کی حیثیت سے دخیل ہوا اور اب تک اپنی زندگی تک اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس سے اس کے آئندہ عظیم الشان کارناموں کا کچھ پتا چلتا۔ لیکن ۱۶۲۴ء سے اس کی وفات ۱۶۴۲ء تک یورپ کی تاریخ میں وہ سب سے زیادہ بااثر اور مشہور رہا۔

رشیلیو کی حیثیت اور حکمت عملی

وہ استقامت کا پتلا تھا اور کارڈنل (بطریق) بھی اور ایک پکا کیتھولک بھی لیکن پھر بھی روما کا پوپ یورپ کے مدبرین میں اس کو سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا "ہیوگنیو کا پوپ" اور "ملحدوں کا باوا" اس کو خطاب دیئے گئے تھے۔ اس کی حالت بھی واقعی میں عجیب و غریب تھی۔ خود کیتھولک اور ایک کیتھولک بادشاہ کا وزیر ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ یورپ کی پروٹسٹنٹ دول کے ساتھ شریک رہتا تھا اور ایسے وقت میں جب کہ پوپ اور شہنشاہ پروٹسٹنٹ مذہب کو اس کے مقام تولد یعنے جرمنی میں فنا کر دینے کے متوقع تھے رشیلیو نے درمیان میں پڑ کر پروٹسٹنٹ مذہب کو بچا لیا اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی مخالفت کا وہ جوش نہیں باقی رہا تھا جو اصلاحات مذہبی کے دور میں تھا بلکہ سیاسی قومی اور خاندانی اغراض اس زمانے میں مذہبی اغراض و مقاصد پہ مقدم رکھے جاتے تھے رشیلیو

(Richelieu) کے مد نظر دو مقصد تھے جن کو وہ ایک ہی مقصد کی دو شکلیں کہا کرتا تھا اولاً تو وہ اندرون ملک شاہ فرانس کا اقتدار مطلق قائم کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے حصول میں اعیان و پروٹسٹنٹ و پارلیمنٹ اور صوبوں کی جماعتوں سب کے اختیارات و اقتدارات کو ختم کر دینا چاہتا تھا اور دوسرے فرانس کو یورپ میں سب سے زیادہ باعظمت بنا دینا چاہتا تھا۔ اور اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے اسپین اور آسٹریا کی متحدہ طاقت توڑنا ضروری تھا۔ وہ نحیف جثہ اور ضعیف صحت رکھتا تھا لیکن اس کی قوت ارادی ایسی قوی تھی اور فرانس و یورپ کے سیاسی و ملکی معاملات سے وہ ایسا واقف تھا کہ ایسے زمانہ میں جب کہ مادی و جسمانی قوت کا زور شور تھا وہ سب پر حاوی رہا۔ وہ فرانس کا سب سے اعلیٰ مدبر اور غالباً سب سے بڑا چارہ ساز گزرا ہے۔ اس کا ملکی و خارجی طرز انتظام ایک دوسرے سے پیوستہ ہے۔ لیکن توضیح کے خیال سے دونوں کو علحدہ علحدہ بتلانا زیادہ بہتر ہوگا اور پہلے ہم اس کے ملکی و داخلی طرز انتظام کو لیتے ہیں۔

ریشیلیو کا ملکی انتظام

اپنے غنیموں میں سب سے پہلے پروٹسٹنٹ لوگوں کی طرف اس کی توجہ ہوئی۔ ان کے مذہب یا عقیدہ سے اس کو کوئی عداوت نہیں پائی جاتی بلکہ تمام یورپ میں کوئی مدبر اس کے ایسا نہ تھا جو ملک کے حیات و بقا کے لئے مذہبی رواداری کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا رہا ہو۔ لیکن نیٹز (Nautes) کے فرمان کی رو سے جو حقوق و اختیارات پروٹسٹنٹ لوگوں کو مل گئے تھے اس کی اس تجویز میں حائل ہوتے تھے جو اس نے کل ملک کو بادشاہ کے قابو میں لانے کے لئے سوچی تھی۔ کیونکہ ہیوگوناٹ لوگوں کو مجلس منعقد کرنے کا اختیار دیا گیا تھا جو ایک قسم کی پارلیمنٹ ہوتی تھی اور پھر بعض شہروں کی فوج بھی ان کے اختیار میں رہنے سے ایک فوجی قوت حاصل ہو جاتی تھی جس پر بادشاہ کو کچھ قابو نہ رہتا تھا۔ بہت سی لڑائیاں ہوتی رہیں لیکن ۱۶۲۸ء میں ریشیلیو نے پروٹسٹنٹ گروہ کے

سب سے زبردست قلعہ لاروشل (La Rachelle) پر حملہ کر دیا۔ یہ قلعہ بندرگاہ پر واقع

لاروشل کا محاصرہ (La Rachelle)

تھا۔ ہیوگوناٹس نے انگلستان کی امداد کے بھروسہ پر مقابلہ کی جرأت کی تھی اور ان کو یہ بھی امید تھی کہ اعیان دولت بھی ریشلیو (Richelieu) پر حملہ کر دیں گے کیونکہ وہ ان کے حقوق کو پامال کرنا چاہتا تھا۔ ریشلیو نے خود محاصرہ کا انتظام کیا حالانکہ وہ ایک بطریق تھا۔ تاریخ فرانس میں یہ محاصرہ خاص طور پر امتیاز و شہرت رکھتا ہے۔ انگلستان کی امدادی فوج کو شکست ہوئی اور امرا کی سازشیں بیکار ہوئیں۔ اور باوجودیکہ ہیوگوناٹ لوگوں نے بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا مگر

صلح آلے (Alais)

فاقہ کشی کے سبب سے شہر ریشلیو اور بادشاہ کے قبضہ میں آگیا۔ اس کے بعد چند مقامات اور رہ گئے تھے اور اگست ۱۶۲۹ء تک سب کچھ ہو گیا۔ ریشلیو نے ہیوگوناٹ لوگوں سے ایک نیا معاہدہ کیا جو صلح آلے (Alais) کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ میں اس نے پروٹسٹنٹ لوگوں کو وہ مذہبی آزادی جو صلح نیانٹز سے ان کو ملی تھی دینے کا اقرار کیا لیکن اس نے ان کے فوجی اقتدارات سلب کرلئے اور آئندہ کے لئے بادشاہ کا وعدہ اور عزت پر اعتماد رکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ خود اپنے وعدوں میں بالکل سچا تھا لیکن ستر سال سے کم ہی عرصہ میں پروٹسٹنٹ لوگوں کو تجربہ ہوگیا کہ بادشاہوں کا وعدہ اور عزت کیسی ناقابل اعتبار چیزیں ہیں جب کہ وہ مذہبی تعصب کے زیر اثر ہوں۔

ریشلیو اور اشرافیہ

فرانس کے پروٹسٹنٹ لوگوں کو تاجدار سے مقابلہ کرنے میں اعیان دولت سے امداد ملنے کی توقع تھی اس لئے ریشلیو تمام عمر ان رؤسا کے اقتدارات و دعاوی کو مٹانے کے درپے رہا جاگیریت کا دور ختم ہو چکا تھا اور اب کوئی رئیس ایسا نہ تھا جو حکومت سے مساویانہ تعلق رکھتا ہو لیکن رؤسا اب بھی دولتمند، طاقتور اور جنگجو تھے اور اپنے گروہ کے حقوق و امتیازات

کا احساس بھی ان میں باقی تھا۔ تمام صدموں اور حملوں کے باوجود جوان پر ہوئے وہ لوگ فرانس کے شاہی اقتدارات کی ہمسری کرتے رہے۔

ریشیلیو کے خلاف سازشیں۔

ریشیلیو کے عہد انتظام کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ ادھر وہ تو رؤسا کی مقابلہ میں شاہی اقتدار کو بڑھانا چاہتا تھا ادھر خود شاہی خاندان کے لوگ رؤسا و امراء کا ساتھ دے رہے تھے۔ خود بادشاہ طبعاً ان لوگوں سے ہمدردی رکھتا تھا ملکہ رؤسا کی امداد کرتی رہی والدہ سلطانہ میری ڈی مچی (Marie de 'Medici) اور بادشاہ کا بھائی گاستون (Gaston) والی آرلیون (Orleans) ہمیشہ ریشیلیو کے خلاف سازشیں کرتے رہے حالانکہ شاہی اقتدار و قوت کو وہی سنبھال رہا تھا۔ ریشیلیو کی زندگی میں طرح طرح کی سازشیں ہوتی رہیں جس کی وجہ سے اس کو اپنی تدابیر کو عملی جامہ پہنانے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ ان سازشوں کے مواد سے بہت سے فسانے اور ڈرامے تصنیف ہوئے ہیں۔ ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریشیلیو تباہی کے غار پر کھڑا ہوا ہے مگر انجام کار وہ ہمیشہ فتحیاب رہتا تھا۔ والدۂ سلطانہ انگلستان اور بلجیم کو جلا وطن کر دی گئی آرلیون (Orleans) گاستون رئیس آرلیون کو متعدد بار شکست ہوئی اور پھر معاف کر دیا گیا۔ آخر کار مایوس و مجبور ہو کر اس نے ریشلیو کی اطاعت قبول کر لی۔ شرفا کے ساتھ اس نے ایسی رعایت نہیں کی جیسی کہ شاہی خاندان والوں کے ساتھ۔ چنانچہ ۱۶۳۲ء میں مان مورانسی (Montmorency) کا ڈیوک گاستون اور لورین (Lorraine) کے ڈیوک کے ساتھ شریک ہوا تو اس بغاوت کی پاداش میں وہ جان سے مارا گیا۔ ۱۶۴۱ء میں کانت دی سواسوں (Comte de soissons) نے بغاوت کر دی مگر اثناء بغاوت میں وہ ہلاک ہو گیا۔ ورنہ اس کے لئے بھی ریشیلیو نے سولی تیار کرا رکھی تھی اپنی زندگی کے آخر زمانہ میں ریشیلیو کو معلوم ہوا کہ بادشاہ کا ایک مقرب سین مار (Cinq Mars) نامی اس کے خلاف اسپین میں سازش کر رہا ہے۔

سین مار (Cinq Mars) کی سازش

لیکن یہ شخص بھی اپنے مرتبہ اور بادشاہ کی مقاربت کے باوجود سولی پر چڑھایا جانے سے نہ بچ سکا۔ ریشیلیو نے بادشاہ کے دشمنوں کے لئے یہ سولی قائم کر رکھی تھی لیکن صرف جنگ اور جلاد کی کلہاڑی کے ذریعہ سے ریشیلیو نے شرفا کی قوت نہیں توڑی بلکہ اس سے بھی زیادہ پر مغز اور مستقل تدبیریں اختیار کی گئیں۔ دو آدمیوں کی باہمی جنگ کو اس نے تعزیری جرم قرار دیا خانگی لڑائیوں کی یہ آخری یادگار تھی۔ وہ قلعے جنکی بدولت رؤسا کا اس قدر رعب و دبدبہ ملک میں قائم تھا بارود سے اڑا دیئے گئے۔ اور سب سے بڑھ کر رؤسا کے وقار کو صدمہ پہنچانے والا سرکاری عہدہ داروں کا نیا طبقہ تھا۔ صوبوں کے حاکم ہونیکی وجہ سے رؤسا کا اقتدار بہت بڑھا ہوا رہتا تھا حتیٰ کہ بعض اوقات یہ لوگ بادشاہ کا مقابلہ کر بیٹھتے تھے لیکن ریشیلیو نے ایک نیا طریقہ نکالا کہ صوبجات کی کارندگی اوسط طبقہ کے لوگوں کو دینے لگا۔

مہتممان امور عامہ (Intendants)

جنکو مہتمم پولس و مالیات (Intendants) کے نام سے موسوم کیا گیا ان لوگوں کو عام طور پر مہتمم امور عامہ کہا جاتا تھا بعض صوبوں میں تو اب بھی روسا و امراء ہی حاکم رکھے گئے مگر برائے نام کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ حکومت تو در اصل نئے عہدہ داروں کی تھی جن کو فوج بھرتی کرنے کا۔ محصول عاید کرنے کا اور معدلت گستری کا کامل اختیار تھا۔ اس وقت سے انقلاب عظمیٰ تک فرانس میں ان مہتموں کا رتبہ وزراء کے بعد سب سے بلند رہا۔ اپنے اپنے ضلع میں یہ لوگ سیاہ سفید کے مالک ہوتے تھے اور بعض اوقات ان کو فرانس کے صوبوی بادشاہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا لیکن یہ لوگ شاہی اختیارات میں کچھ دخل نہیں دیتے تھے بلکہ شاہی اقتدار کو بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔

نیابتی حکومت پر حملہ

نیابتی حکومت ریشیلیو کے اغراض و مقاصد کے باہر تھی۔ سنہ ۱۶۱۴ء کی اسٹیٹس جنرل (States-General) مملکتوں کی مجلس کا وہ خود ایک رکن تھا۔ لیکن ایسی مجلس منعقد کرنیکا وہ سخت مخالف تھا جو اسکے تجاویز و طرز انتظام

کی یقیناً مخالف تھی۔ اور فرانس کی پارلیمنٹ کی بھی اس سے زیادہ وقعت نہ تھی قانون سازی اور حکومت کے طرز عمل میں ان کو دخل دینے کا اختیار نہ تھا۔ صوبوں کی نیابتی انجمنوں کا بھی وہ مخالف تھا جس کو مملکت صوبہ دار کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ جہاں کہیں شورش یا خطرناک بدامنی کا ظہور رہتا تھا تو یہ مملکتیں توڑ دیجاتی تھیں اور انکے

اضلاع بجائے سرکاری حکام مقرر ہوتے تھے جن کو "ایلوس" (Elus) کہتے تھے۔ اور جہاں کہیں ایسی صوبائی مملکتیں قائم تھیں وہاں انکے ساتھ بہت سختی کا برتاؤ کیا جاتا تھا اور انکے بہت سے اختیارات شاہی افسروں کو دیدئے گئے تھے۔ ایک ہی مجلس تھی جس کی مشاورت کو ریشلیو قبول کرتا تھا یہ مجلس ملک کے ان بڑے بڑے لوگوں کی

"مخصوصین" ہوتی تھی جن کو بادشاہ انتخاب کرکے طلب کرتا تھا یہ لوگ "مخصوصین" (Notables) کے نام سے مشہور تھے ان کا کام صرف اپنی رائے بتلانا تھا یہ بالکلیہ بادشاہ کی مرضی پر رہتا تھا کہ چاہے وہ قبول کرے یا انکار کرے۔ اس لئے وہ کسی طور پر شاہی اختیارات میں مخل نہیں ہوسکتے تھے اور اسی وجہ سے ریشلیو ان کو پسند کرتا تھا۔

شاہی کونسل شاہی کے کل پرزے اسی نے سنبھالے اور درست کئے۔ بادشاہ کی کونسل ہی سب اختیارات کام میں لاتی تھی اور اس کونسل (Council) کی مختلف شاخیں تھیں۔ ہر شاخ کے ذمہ ایک خاص کام رہتا تھا یہی کونسل لوئی چہاردہم کے عہد میں اور بعد کو بھی انقلاب کے پہلے تک فرانس کی حکومت کرتی رہی جس کو آخرکار انقلاب نے درہم برہم کردیا۔

ریشلیو بحیثیت مدبر وسیاس ملکی معاملات سے زیادہ خارجی معاملات میں ریشلیو کو دلچسپی تھی اور جنگ سی سالہ اور یورپ کے بین الاقوامی تعلقات پر اس کا اثر بین تھا۔ یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا بسمارک سے پہلے کوئی شخص ریشلیو کی طرح با اثر گزرا ہے اس کے تدبر کی داستان بڑی پیچیدہ و دلچسپ ہے۔ لیکن یہاں ہم صرف اس کے نتائج مختصراً لکھدیں گے۔

درۂ والٹلائن (Valteltine)

آسٹریا اور اسپین کی متفقہ ہیپسبرگ قوت کو وہ توڑنا چاہتا تھا کیونکہ یہی قوت فرانس کی ہمسری کا دعویٰ کرسکتی تھی اور فرانس کی عظمت و وسعت میں سدراہ ہورہی تھی اسپین اور آسٹریا کے مابین آمدرفت دشوار کرنے کے لئے اس نے درّہ والٹلائن (Valtelline) پر ایک مخالف طاقت کا قبضہ کرا دیا تھا۔ یہ درّہ الپس (Alps) کے پہاڑوں میں سے ہوکر میلان (Milan) سے آسٹریا کو جاتا ہے۔ اور ہسپانوی فوج اکثر اس میں سے گزرا کرتی تھی۔ جرمنی کی جنگ کو وہ بڑے غور سے دیکھتا رہا اور کئی مرتبہ نازک وقت میں اس نے اس پر اپنا اثر بھی ڈالا۔ گسٹاوس ایڈولفس کو جیسا کہ ہمیں معلوم ہے۔ فرانس کی مدد پر زیادہ بھروسہ تھا جب کہ اس نے پروٹسٹنٹ لوگوں کی طرفداری میں جرمنی پر حملہ کیا تھا۔ اور ۱۶۳۰ء میں ریشیلیو نے اس سے ایک معاہدہ بھی کیا جس کی رو سے

گسٹاوس ایڈولفس (Gustavus Adolphus) سے مصالحت

سوئیڈن کی فوج کو فرانس تنخواہ دینے لگا سوئیڈن کی طاقت کے متعلق وہ کہتا تھا کہ ایسا زہر ہے جو بطور تریاق استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن اگر ضرورت سے زیادہ استعمال کیا جائے تو مہلک ہوگا۔ اس لئے جنگ لوٹزن میں گسٹاوس کی ہلاکت اسے کچھ ناگوار نہوئی جب پروٹسٹنٹ گروہ کو نارڈلنگن میں شکست ہوئی تو فرانس کے کیتھلک ملک سے ہی ان کو مدد ملنے کی امید تھی۔ اور اس کے بعد بھی اس جنگ کے آخری زمانہ میں برابر فرانس کا دخل نمایاں رہا جو حقیقت میں خود ریشیلیو کا دخل تھا برنارڈ ڈیوک وِیمار کا برنارڈ (Bernard of Weimar) اور اس کی فوج فرانس ہی سے تنخواہ پاتے رہے۔ اور جب برنارڈ فوت ہوگیا تو اس کی فوج راست فرانس کی ماتحتی میں آگئی جنگ کے آخری زمانہ میں لڑائی زیادہ تر فرانس اور اسپین کے درمیان فرانس کے شمالی و مشرقی سرحد پہ ہوتی رہی۔ البتہ مشرق میں سوئیڈن والے آسٹریا کو بھی دبا رہے تھے ابتداءً فرانس کی فوج کو کامیابی نہیں ہوی لیکن ریشیلیو کی حکمت عملی سے

خود ہسپانوی جزیرہ نما میں اسپین کے دشمن پیدا ہو گئے۔ پرتگال (Portugal) جسکو فلپ دوم کی فوج نے اسپین میں شامل کر لیا تھا ۱۶۴۰ء میں بغاوت کر بیٹھا۔ اور کیٹالونیا (Catalonia) کے صوبہ میں بھی شورش ہو گئی جو کئی سال تک جاری رہی ۱۶۴۲ء

ریشلیو کی وفات

میں ریشلیو کی وفات کے وقت لڑائی کا فیصلہ تو نہیں ہوا مگر فرانس کا پلہ بھاری نظر آنے لگا تھا۔ اس کا آقا لوئی سیزدہم بھی اسی سال مئی کے مہینے میں فوت ہو گیا اور فرانس و یورپ میں ایک نئے دور کے آغاز کے آثار معلوم ہونے لگے۔

مزارین

لیکن پھر بھی تغیر نہیں ہوا جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا ریشلیو کی زندگی کے آخری زمانہ میں مزارین (Mazarin) سے وہ امداد لیتا رہا اور اسی کو ریشلیو نے اپنا جانشین نامزد کیا۔ نیا وزیر اطالوی نسل سے تھا اور فرانسیسی زبان اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا نہ فرانسیسیوں کی خصلت سے واقف تھا۔ ملکی معاملات میں وہ ریشلیو کی سی قوت واستقامت نہیں رکھتا تھا لیکن خارجی معاملات میں اس نے خود کو ریشلیو کا ہم پلہ ثابت کر دیا اور ریشلیو کی تدابیر کو اسی اندازہ و دلچسپی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا دیا۔ لوئی چہاردہم پانچ ہی سال کا تھا اس لئے ایک طویل مدت تک کوئی ولی مقرر ہونے کی امید تھی۔ والدۂ سلطانہ آسٹریا کی اینی بلا کسی چون وچرا کے ولی ہو گئی۔ اور وہ برابر مزارین کی حمایت و اعانت کرتی رہی بعضوں کا خیال ہے کہ مزارین گو بطریق تھا لیکن پوری طرح وہ پابند نہیں تھا اور اس نے

کونڈے اور تیورن

خفیہ طور پر ملکہ سے عقد بھی کر لیا تھا۔ اس کی توجہ سب سے پہلے اس جنگ کی طرف مبذول ہوئی۔ اس میں فرانس کی فوج کو ابتدائی ناکامیوں کے بعد سے اب شاندار فتح نصیب ہو رہی تھی فرانس کی طرف دو بڑے نامور سپاہی ڈیوک آف کونڈے (Duke of Conde) و مارکوئس تیورن (Marquis Turenne) پیدا ہو گئے تھے کانڈے تو شاہی خاندان سے تھا۔ اور تیورن سے زیادہ جری نکلا تھا۔ شروع شروع فرانس میں اس کی بہت شہرت ہوئی لیکن فن سپہ گری

وصف آرائی میں نیز شائستگی کے لحاظ سے تو زین یورپ کا بہترین سپاہی تھا۔ اور اس کو اپنے شاندار رقیب و ہمسر سے بڑھ کر فتوحات نصیب ہوئے اور فرانس کی خدمت بھی اس نے زیادہ وفاداری سے کی

راک روا (Rocroi) کی لڑائی۔

سنہ ۱۶۴۳ء میں بلجیم سرحد کے قریب بمقام راک روا (Rocroi) کانڈی کو (Conde) کو عظیم الشان فتح نصیب ہوی۔ یہ لڑائی اس وجہ سے مشہور ہے کہ چارلس پنجم کے عہد کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اسپین کی اصل پیدل فوج کو شکست فاش نصیب ہوی۔ اس کے بعد ہی صلح کی گفت و شنید شروع ہو گئی مگر بے نتیجہ کیونکہ آسٹریا فوری رعایتیں منظور کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ لیکن ۱۶۴۸ء میں پھر اسی جوار

لان (Lens)

میں بمقام لان (Lens) کانڈی کو اور ایک فتح حاصل ہوگئی اور اب مجبور ہو کر دوسرے سال میں صلح ویسٹ فیلیا طے ہو گئی گذشتہ باب میں بتلایا گیا ہے کہ اس صلح کے کیا شرائط تھے اور کس طرح فرانس کے ملک و عظمت میں اس کی وجہ سے اضافہ ہو گیا اور آئندہ اضافہ ہونے کی امید ہو گئی۔

مزارین کی مخالفت

صلح ویسٹ فیلیا مزارین کی سب سے بڑی کامیابی تھی لیکن پھر بھی فرانس کی رائے عامہ اس کے موافق نہ ہوئی۔ بلکہ جنگ کا اصلی بار کم ہو گیا تو فرانس کے مختلف عناصر بدامنی نے شاہی اختیارات کی مخالفت پر سر اٹھایا۔ حالانکہ اسپین سے لڑائی کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اور گیارہ سال تک جاری رہا۔ ادھر اس جنگ کی وجہ سے فرانس کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی گو جرمنی کے ایسا دور ابتلا تو نہیں تھا۔ ایسی حالت میں محاصل کا بار اٹھا دینے کا مطالبہ کیا گیا اور ہر دُو سا بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ ریشیلیو کے مقابلہ میں تو ان کو کامیابی نہیں ہوی تھی لیکن اس کے کمزور جانشین کے مقابلہ میں وہ اپنا اثر و اقتدار ملک میں قائم کر سکیں گے۔

فرونڈ (Fronde) کی شورش

اس کے بعد فرانس کی تاریخ کا وہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کو "فرونڈ" (Fronde) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ لفظ محض ایک فرقے کا عرف تھا مختلف و متضاد اسباب کی بنا پر یہ تحریک شاہی اختیارات کے خلاف ہنگامہ کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ اور اختلاف و تضاد کی وجہ سے ہی ناکام بھی ہوئی۔ اس کے دو اصلی سبب تھے۔ ایک تو پارلیمنٹ پیرس کا محاصل کے متعلق اعتراض و اصلاح کا مطالبہ تھا۔ اور دوسرے رؤسا کی عام مخالفت جس میں شہزادہ کانڈے خاص طور پر شریک تھا۔

پیرس کی پارلیمنٹ

پیرس کی پارلیمنٹ دستوری اصلاحات کو بروئے عمل لانے کے لئے موزوں نہ تھی کیونکہ اس کے ذمہ صرف عدل گستری کا ایک کام تھا اس کی رکنیت ارث یا اشتراک کے ذریعے سے حاصل ہو سکتی تھی اور یہ اراکین نہ تو شاہی تقرر سے ہوتے تھے اور نہ عام انتخاب سے۔ وضع قوانین اور حکومت کے معاملات میں صرف ایک طریقہ پر پارلیمنٹ کا دخل تھا۔ وہ یہ کہ بادشاہ کے احکام کو پارلیمنٹ درج رجسٹر کرتی تھی۔ اور جب تک یہ احکام پارلیمنٹ کے رجسٹر میں درج ہوں ان پر قانون کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کا کوئی تصفیہ اب تک نہیں ہوا تھا کہ پارلیمنٹ رجسٹری

شاہی فرامین کی رجسٹری سے انکار

کرنے سے انکار بھی کر سکتی ہے یا نہیں۔ گو یہ مسلمہ تھا کہ اگر کسی مجوزہ قانون کے متعلق پارلیمنٹ کوئی اعتراض یا عذر کرنا چاہے تو حکومت سے اس کا اظہار کر سکتی ہے۔ پارلیمنٹ نے یہ پیچیدہ و مبہم اختیارات اب استعمال کرنا چاہے۔ اور ۱۶۴۸ء میں اس کے پاس "مالیات" (Financial) کے متعلق احکام بھیجے گئے تو اس نے رجسٹری کرنے سے انکار کر دیا اور پھر اس کے بعد پیرس اور مفصلات میں مالیاتی نظم و نسق کے متعلق

عام بے اطمینانی دیکھ کر پارلیمنٹ نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔

پارلیمنٹ کے مطالبات

اسی قسم کی دوسری مجلسیں بھی تھیں جو شاہی کونسل سے نکلی تھیں۔ مثلاً ایوان محاسبی۔ ایوان کروڑگیری اور مجلس اعلیٰ پارلیمنٹ نے ان سب کو ہموار کرلیا اور سب نے متفقہ طور پر حسب ذیل مطالبات اسی انداز میں پیش کئے جیسے کہ اس وقت لی انگلستانی پارلیمنٹ نے کئے تھے۔ وہ مطالبات یہ تھے کہ محاصل کم کردئے جائیں اور بلا تحقیقات کے محض شاہی حکم پر گرفتار اور قید کرنے کا طریقہ منسوخ کردیا جائے۔ اور اینٹنڈنٹ (Intendents) (مہتمم امور عامہ) جو شاہی حکام کے بجائے مقرر ہوئے تھے۔ برطرف کردئے جائیں۔ پہلے تو حکومت نے کچھ پس وپیش کیا مگر بعد میں لان (Lens) کی لڑائی کی خبر پاکر ان پارلیمنٹی مخالفین کی اچھی طرح خبرلی۔ پارلیمنٹ کے سردار گرفتار کرلئے گئے تو سخت جنگ و جدال کا اندیشہ ہوگیا۔ اس وقت حکومت ذرا دب گئی۔ کیونکہ انگلستان کی مثال پیش نظر تھی۔ اور وہاں چارلس اول کے قتل ہونے سے زیادہ مخالفت کا انجام بادشاہ کی نگاہ میں خوفناک نظر آنے لگا تھا۔ اس وقت اگرچہ مزارین نے ہار ہی مان لی لیکن محض اس لئے کہ بعد میں اس سے بھی زیادہ سخت حملہ کرسکے۔ شاہی فوج جمع کی گئی

فرونڈ (Fronde) کی پہلی شورش کا خاتمہ

اور رکانڈی کی کمان میں رکھی گئی۔ پیرس کا معمولی طور پر محاصرہ کرلیا گیا۔ یہ ظاہر تھا کہ پارلیمنٹ کے مقننین اور رؤسا میں کوئی مستقل اتحاد نہیں قائم ہوسکتا اور آخرکار ۱۶۴۹ء میں مصالحت ہوگئی۔ شرفا تو محض اس وجہ سے خوش ہوکر اس شورش میں شریک ہوئے تھے کہ اینٹنڈنٹ (Intendents) لوگوں پر بھی پارلیمنٹ نے حملہ کیا تھا۔ اس مصالحت کے بعد حکومت نے مالیاتی معاملات میں رعایت کرنے کا وعدہ کیا۔ اور پارلیمنٹ نے جو عوام کی حمایت میں کھڑی ہوئی تھی

اب اس سے علیحدہ ہوگئی۔

دوسری فرونڈ (Fronde)

اس طریقے پر پہلی فرونڈ کا اختتام ہوا لیکن اس کے بعد ہی سے دوسری فرونڈ ہوی جو پہلے سے بالکل ہی مختلف نمونہ کی تحریک تھی۔ دوسری فرونڈ کے مدنظر کوئی دستوری اصلاح نہ تھی۔ اور نہ حقوق عامہ کی حمایت میں یہ تحریک شروع ہوی اصل میں ناخوش و ناراض شرفا کی یہ آخری کوشش مقابلہ تھی۔ انکو شہزادہ کانڈی (Conde) کے حوصلہ و کارگزاری پر بھروسہ تھا۔ مزارین محسوس کر رہا تھا کہ شاہی اقتدار کے خلاف کانڈی ایک خطرناک رویہ اختیار کر رہا ہے۔ اسلئے اس نے ۱۶۵۰ء میں اسے اور چند دیگر شرفا کو گرفتار کر الیا۔ اس پر بڑا غم و غصہ ہوا حتی کہ تیورین (Turenne) بھی جو انتہا کا وفا شعار تھا کانڈی کی ہمشیرہ کے کہنے پر اس کے طرفداروں میں ہوگیا۔ پیرس نے باغیوں کا ساتھ دیا اور شہزادہ کانڈی کی رہائی اور مزارین کی جلا وطنی کا مطالبہ کیا عقلمند وزیر کو سر تسلیم خم کرنا پڑا

کانڈی کی گرفتاری

اور کانڈی کو رہا کرکے وہ ملک سے باہر چلا گیا لیکن یہ شکست محض ظاہری تھی کیونکہ جلا وطنی کی حالت میں بھی والدہ سلطانہ اور حکومت وقت اس کے مشورہ پر اسی طرح عمل کرتی تھی جسطرح کہ اس کے برسر اقتدار ہونے کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔

تیورین کا فیصلہ کن شکست

ایک بے سروپا جد وجہد شروع ہوگئی۔ اس کی حکایت ان تذکروں اور سرگزشتوں میں پائی جاتی ہے جو کارڈنیال دی ریٹز (Cardinal de Retz) مادام دی لونگوی (madam de Longeville) وغیرہ نے لکھے ہیں اور جن میں انھوں نے اس زمانہ کی سازشوں اور دو اشخاص کی لڑائیوں کا نہایت دلکش نقشہ پیش کیا ہے۔ لیکن یہ جھگڑے تھے بھی نجس اور غلیظ

اور سب بکھیڑے کا باعث ذاتی ہوس تھی تیورین پھر بادشاہ کی طرف آگیا۔ اور بہت جلد اس نے شاہی فوج کی فوقیت ثابت کر دی۔ ۱۶۵۲ء میں شہر پیرس کی فصیل کے باہر کانڈی کو شکست فاش ہوئی اور وہ خود گرفتار ہونے سے بال بال بچا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ فرانس سے نکل گیا اور ہسپانیہ والوں کے ساتھ جاکر شریک ہو گیا۔ جن کے خلاف کہ اس سے پہلے وہ نہایت شان سے لڑ چکا تھا۔ شہر پیرس نے فوراً ہی بادشاہ سے صلح مصالحت کر لی اور مزارین واپس آگیا پارلیمنٹ کو امور عامہ میں دست اندازی کرنے سے قطعاً منع کر دیا گیا۔ انٹینڈنٹ (Intendents) پھر بحال کر دئے گئے اور رشیلیو کا طرز انتظام پھر کامل طور پر قائم ہو گیا۔ اب صرف

اسپین سے جنگ

اسپین سے جنگ باقی رہ گئی تھی۔ اسو اسمیں بھی جانبین مالی مشکلات سے تنگ آکر صلح مصالحت کے خواہاں تھے لیکن صلح کے لئے کچھ ایثار کی ضرورت تھی جس کے لئے دونوں میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ اس لڑائی کو دو تھکے ہوئے گھوڑوں کی دوڑ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور حالانکہ کئی مقابلوں میں فرانس کو کامیابی ہو چکی تھی لیکن قطعی اور فیصلہ کن حملہ نہیں ہوا تھا۔ ۱۶۵۷ء میں ایک سیاسی چال کی وجہ سے فرانس کو فتح و کامیابی حاصل ہو گئی۔ آلیور کرامول (Oliver Cromwell) کے کارناموں نے یورپ کو متوجہ کر لیا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ انگلستان میں کرامول (Cromwell) اور اس کے رفیق "آئیرن سائڈ" کی بدولت نہایت اعلیٰ درجہ کی فوجی طاقت

فرانس اور کرامول کا اتحاد

قائم ہو گئی ہے۔ فرانس اور اسپین کے بادشاہ اسے جمہوری اور بادشاہ کش سمجھکر اس سے بہت متنفر ہو گئے تھے۔ اور فرانس کے بادشاہ کا انگلستان کے شاہی خاندان سے قریبی رشتہ بھی تھا کیونکہ چارلس اول کی بیوہ لوئی سیز دہم کی بہن تھی۔ لیکن ان دونوں

ملکوں کی فوجی ضرورت ایسی شدید تھی کہ دونوں نے اس انگریز "محافظ قوم" سے امداد چاہی۔ پہلے تو اس نے کچھ پس وپیش کیا مگر چونکہ اسپین کی نوآبادیات پر اس کا دانت لگا ہوا تھا۔ اسلیئے آخرکار اس نے مزارین سے اتحاد کرلیا۔ لاک ہارٹ (Lockhart) کی کمان میں ایک فوج بھیجی گئی اور ۱۶۵۸ء میں ڈنکرک (Dunkirk) کے قریب ہی ڈونس Dunes کی لڑائی ہوی۔ کانڈی ہسپانوی فوج کی کمان کر رہا تھا اور ٹیورین و لاکھارٹ پہلو به پہلو اس کا مقابلہ کر رہے تھے نتیجہ میں مزارین اور اس کے حلیف کو زبردست فتح نصیب ہوی انگریزوں کو اس اعانت کے معاوضہ میں ڈنکرک (Dunkirk) مل گیا اور صلح کے دیگر اہم شرائط کے متعلق گفت وشنید شروع ہوگئی اور ۱۶۵۹ء میں پیری نیز (Pyrennes) کی صلح طے پائی جو دراصل صلح ویسٹ فیلیا کا ضمیمہ یا تکملہ کہی جاسکتی ہے

ڈونس Dunes کی لڑائی

اور اسی صلح سے جنگ سی سالہ کا خاتمہ سمجھنا چاہیئے جنوب اور شمال میں فرانس کو مقبوضات ملے۔ شمال میں توآرتوا (Artois) اور پیری نیز (Pyrenees) کی طرف روسی لون (Roussillon) کے مقامات ملے۔

صلح پیرنیز Pyreneese

ان ارضی مقبوضات سے بڑھ کر فرانس کو یہ فائدہ ہوا کہ اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ کیونکہ فرانس ہی نے پہلے توجرمنی کو صلح کرنے پر مجبور کیا اور اب اسپین کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق شرائط قائم کئے۔ کانڈی کا قصور معاف کردیا گیا اور وہ پھر فرانس میں واپس آکر مرتے دم تک وفاداری سے رہا یہ بھی توقع تھی۔ کہ دونوں ہمسر اور مخالف ملکوں میں اب دوستانہ تعلق کا ایک دور شروع ہوجائے گا اور دونوں آپس میں متحد و متفق ہوجائینگے کیونکہ لوئی چہاردہم کی نسبت اسپین کی شہزادی ماریا تیریزا (Maria) (Teresa) سے طے ہونے لگی۔ عقد کا معاہدہ جو ہوا اس میں لوئی چہاردہم

نے ہسپانوی ملک وتاج کے متعلق اپنے کل حقوق سے جو میریا تیریزا کی وجہ
سے اس کو حاصل ہوسکتے تھے دست برداری کرلی تھی مگر یہ دست برداری
اس شرط کے ساتھ تھی کہ ایک بہت بڑی رقم اس کو جہیز میں دی جائے
اسپین یہ رقم ادا نہیں کرسکا۔ اس لئے لوئی چہاردہم اپنے کو اس معاہدہ
کا پابند نہیں سمجھتا تھا اور بعد میں اپنی بیوی کی طرف سے ہسپانوی تخت وتاج کا
اس نے دعویٰ کیا جس میں اس کے عہد حکومت کا بقیہ زمانہ صرف
ہوا۔

یہ صلح مزارین کی بہت بڑی کامیابی تھی لیکن وہ اس کے بعد
زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا اس نے بہت دولت جمع کرلی تھی
جو ایک عالیشان کتب خانہ قائم کرنے اور علوم وفنون کی ترقی میں
اس نے صرف کی اس کی وفات سے پہلے ہی یہ اندازہ ہوگیا
تھا کہ نوعمر بادشاہ امور سلطنت وطرز انتظام میں زیادہ
آزادی کا خواستگار ہے۔ مزارین کی وفات کے بعد
فرانس اور یورپ کی حالت میں ایک بیّن فرق
واقع ہوگیا۔

مزارین کی وفات
سنہ ۱۶۶۱ع

حوالۂ کتب متعلقۂ باب ہذا:-

"لوئی چہار دہم و مزارین" از ہسیل (Hassal). "ریشلیو" از لاج (Lodge) فرانس
بزمانۂ "ریشلیو و کابڈن" (Cabden) از برجز (Bridges) ریشلیو از ہینوٹاکس (Honotaux)

لوئی چہاردہم کا زمانہ

کچھ مدت سے فرانس میں بادشاہ تو برائے نام حکومت کرتا تھا حقیقی حکومت تو وزیر اعظم کی ہوتی تھی۔ اس وجہ سے جب مزارین (Mazarin) فوت ہوا تو یہی خیال ہوا کہ اس کا کوئی جانشین ضرور ہوگا۔ مگر نوعمر بادشاہ لوئی چہاردہم اس بات پر تلا ہوا تھا کہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لے اور جب اس نے اس کا اعلان کردیا کہ وہ خود اپنا وزیر اعظم رہے گا تو اس کے درباریوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ وہ اپنے ارادے پر قائم رہا اور اپنے طویل عہد حکومت کے آخر تک کی فرانس کے داخلی و خارجی معاملات کو خود ہی سلجھاتا رہا لوئی چہاردہم جب تخت نشین ہوا تھا تو اس کی عمر صرف پانچ سال کی تھی اور اب تک اسے اپنی لیاقت ظاہر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس کی

لوئی چہاردہم کی خصوصیات

قابلیت و اطوار کے متعلق اختلاف آرا ہے لیکن اس طویل مدت میں جب کہ فرانس یورپ کی سب سے مضبوط طاقت تھا اس نے جس طرح فرانس کے معاملات درست رکھے اس سے اس کے اعلیٰ تدبر اور یورپ کے سیاسی حالات کی

کما حقہٗ واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ خود کوئی بڑا سپاہی نہ تھا اور نہ کسی بڑی مہم میں وہ شریک ہوا لیکن محاصرے کے فن میں اس کو بڑی دلچسپی تھی اور ان محاصروں میں خود بھی موجود رہتا تھا جن کے ذریعے سے بڑے بڑے قلعے فرانس کے قبضے میں آ گئے۔ یورپ کی تاریخ اسے سپاہی یا مدبر کی حیثیت سے نہیں پیش کرتی بلکہ موجودہ زمانے کا اعلیٰ و بہترین شخصی حکومت کا نمونہ ثابت کرتی ہے وہ بڑے رکھ رکھاؤ کا آدمی تھا اور صورت شکل بھی اس کی بہت اچھی تھی اور اخلاق و طرز عمل کے لحاظ سے بھی وہ یورپ کی سب سے زیادہ قوی اور اعلیٰ ترین شخصی حکومت کا موزوں نمائندہ تھا۔ اس کا دربار بڑا عالیشان و گراں خرچ تھا۔ اور فن تعمیر مصوری و علم ادب کی ترقی کے باعث اسکا عہد حکومت بے مثل سمجھا جاتا ہے۔

یورپ میں آزادی کا ظاہری زوال

اور یورپ کے تمام سلاطین بھی سمجھتے تھے کہ بادشاہ ہونا چاہیئے تو ایسا اور حکومت ہونا چاہیئے تو ایسی جیسی فرانس میں ہے ہر جگہ پارلیمنٹ اور نیابتی ادارے رو بہ زوال تھے البتہ انگلستان میں ان کا زور تھا لیکن ۱۶۶۰ء میں جب چارلس دوم پھر تخت نشین ہو گیا تو انگلستان میں بھی ان پر سخت ذلیل حملے شروع ہو گئے۔ اس زمانے کی حالت کے لحاظ سے کوئی یہہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دنیا کے متمدن ممالک میں کبھی بھی کوئی نیابتی ادارے قائم ہو سکیں گے۔ مستقبل میں شاہی مطلق ہی کے آثار پائے جاتے تھے۔

بادشاہ اور متوسط طبقہ۔

فرانس میں مرکز حکومت خود بادشاہ کی ذات تھی۔ پارلیمنٹ پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا جاتا تھا۔ اسٹیٹس جنرل (States-General) (مملکتوں کی مجلس عامہ) کا انعقاد ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہر مقام کے صوبہ داری و شہری ادارے شاہی حکومت کے تابع بنا دئیے گئے تھے۔ حکومت کی اصلی کل شاہی کونسل

اور اس کی متعلقہ کونسلیں تھیں۔ ان چھوٹی چھوٹی کونسلوں کے ذمے سلطنت کے مختلف محکمے دیدئے گئے تھے۔ ان کونسلوں میں امرا نہیں رکھے گئے تھے۔ بلکہ متوسط طبقے کے لوگ شریک کئے گئے تھے۔ بادشاہ کے طرز حکومت کا یہی خاص جزو تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ میں عوام کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ میں اپنے مشیر کار ایسے طبقے سے اس وجہ سے منتخب کرتا ہوں۔ کہ یہ معلوم ہو جائے کہ میں اپنے اقتدارات میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہتا ملک کے اہم مسائل کا تصفیہ شاہی کونسل ہی سے ہوتا تھا۔ ان فیصلوں کی بجاآوری شاہی کارندوں کے ذمے تھی خصوصاً این تاندان (Intendent) (مہتمم امور عامہ) کے ذمے جن کا ذکر ہم گزشتہ باب میں کرچکے ہیں۔

اِس عہد کے شاندار علمی کارنامے

یہ دور فرانس کے لئے بڑی شان و شوکت کا ثابت ہوا۔ کیونکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ممتاز ہستیاں نمودار ہوئیں اس عہد کی شان و شوکت کا اندازہ ان بڑے علما، واہل تصنیف سے ہو سکتا ہے جو خود بادشاہ کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے فرانسیسی ڈراما کے تین سب سے بڑے مصنف کورنئی (Corneille) راسین (Racine) (مولیر (Moliere) اسی عہد میں گزرے ہیں گو اول الذکر نے اپنی سب سے زیادہ مشہور تصنیف لوئی چہاردہم کے عہد حکومت سے پہلے ہی شائع کردی تھی۔

مولیر (Molicre)

بادشاہ اور مشہور ڈراما نویس مولیر (Moliere) میں ذاتی دوستی تھی اور درباریوں و پادریوں کے حملے سے مولیر کو بچانے میں بادشاہ خود حصہ لیتا تھا اس عہد کے ڈراموں اور خصوصاً مولیر کے تصانیف سے ہم کو شاہی دربار کے انداز اور ذہن کی رسائی کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دربار والے اس پایہ کے ڈراموں کی داد دے سکتے تھے علم و ادب کے ہر شعبہ میں یہی حالت تھی فلسفہ دے کارت (Descartes) پاسکال (Pascal) بوسوے (Bossuet) فے نے لون (Fenelon) نے نام پیدا کیا۔

سین سی مون (Saint Simon)

اس عہد کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے تذکرے اور سرگزشتیں تصنیف ہوئیں۔ ان میں سب سے بڑی تصنیف تذکرہ سین سی مون (Saint Simon) ہے جو لکھی تو گئی تھی اسی زمانہ میں مگر اس وقت شائع نہیں کی گئی۔ اس کا مصنف شاہی مطلق العنانی کا سخت مخالف تھا اور اعیان و اشرافیہ کے دعاوی و حقوق کا بڑا طرفدار تھا۔ اس نے اس زمانہ کی روایتوں اور ذلیل و بدنام کن واقعات کو بالتفصیل لکھا ہے خصوصاً ایسے واقعات جن سے بادشاہ اور اس کے درباریوں پر حرف آسکے ان میں بہت سے واقعات کی صداقت تو مشتبہ ہے مگر پھر بھی یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی مواد موجود ہے کہ بادشاہ کے دربار کا ایک رخ ایسا بھی تھا جو دیانت و اخلاق اور صحیح المذاقی سے گرا ہوا تھا۔ کارزار میں بادشاہ کے ماتحتین نے قابل تعریف خدمت کی۔ گذشتہ عہد کے بڑے بڑے سپہ سالار اس کو ملے تھے۔

کانڈی۔ ٹورین

کانڈی (Conde) اور ٹورین (Turenne) عروج پر تھے اور مغربی یورپ میں کوئی سپہ سالار ان کے مقابل کا نہ تھا۔ انھی کے ساتھ مشہور انجنیر وو بون (Vauban) کا نام بھی شریک کرنا چاہیئے جس کی فوجی قابلیت مذکورۂ بالا اشخاص سے کم نہ تھی اور اس عہد کے آخری حصہ میں بادشاہ کے خطرناک طرز عمل کی مانعت کرکے اس نے اپنے کو ایک سچا اور پکا محب وطن بھی ثابت کر دیا۔ ان ہی لوگوں کی طرح جو فوجوں کی کمان کرتے تھے اور لڑائی کی تجویزیں عمل میں لاتے تھے بادشاہ کا وزیر فوج لوووابی (Louvois) قابل قدر تھا۔

لوووا (Louvois)

یہ شخص بڑا تنک مزاج اور سخت گیر تھا اور کئی صورتوں میں اس کا اثر حکومت وقت کے لئے مضر بھی ثابت ہوا لیکن فوجوں کو آراستہ کرنے میں اور ان تمام کاموں میں جو ایک وزیر فوج کو کرنا چاہیئے تمام یورپ میں کوئی اس کا عدیل نہ تھا۔

جب لوئی چہاردہم تخت نشین ہوا تو فرانس اپنے عروج پر

تھا۔ کوئی سلطنت یورپ میں ایسی نہ تھی جو تنہا اس کے مقابلہ پر آسکے بلکہ بڑے بڑے اتحادی جتھوں کا بھی وہ مقابلہ کرسکتا تھا۔

فرانس کی عظمت و فوقیت

لیکن اس کی مالی حالت بہت ابتر اور افسوس کے قابل تھی۔ فوکے (Fouquet) وزیر مالیات نے گذشتہ جنگ کے زمانہ میں کچھ تدبیریں نکالیں تھیں لیکن اس کے متعلق یہ خیال تھا کہ اس نے ناجائز ذرائع سے بہت بڑی دولت جمع کرلی ہے۔ لیکن اس کا اثر ایسا تھا اور اس کے معاونین اتنے تھے کہ اسے نکالدینا مشکل تھا۔ بادشاہ کو اپنے ہی وزیر کے خلاف سازش کرنا پڑی اور آخرکار فوکے (Fouquet) برطرف کردیا گیا اور دائمی قید میں ڈالا گیا۔ اسکے بجائے مالیات کا انتظام کولبر

کولبر (Colbert)

کے ہاتھوں میں دیدیا گیا (Colbert) کولبر کا نام اس کے عہد کے معروف ترین ناموں میں ہے اور اس سے زیادہ لایق اور قابل اعتماد وزیر فرانس کو نصیب ہی نہیں ہوا۔ وہ مزارین (Mazarin) کی ماتحتی کرچکا تھا۔ اور مزارین نے اس کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ وہ متوسط طبقہ کا آدمی تھا۔ خودنمائی و معاشری ہوس سے وہ ناآشنا تھا۔ فرانس کی مالی حالت سنبھالنے میں وہ ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ اس کے کاموں کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوے اس کی کارگزاری کا ایک خاکہ پیش کردینا ضروری ہے۔ سب سے پہلے محاصل کے وصول و انتظام کی طرف اس نے توجہ کی۔

محاصل کا انتظام

اس مد میں اس نے کوئی اصولی تبدیلی نہیں کی اس نے تقریبًا وہی محاصل قائم رکھے اور وصول کا طریقہ بھی وہی رکھا جو پہلے تھا۔ لیکن سخت نگرانی اور حکومت کے ان ملازمین کو جو ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے سخت سزائیں دیکر اس نے ملک پر جو بار محاصل کی وجہ سے تھا بہت ہلکا کردیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ آمدنی محاصل بھی سابق سے زیادہ ہوگئی۔ لیکن اس نے محاصل کے انتظام و نگرانی تک اپنے کو محدود نہیں رکھا بلکہ فرانس کے لئے نئے ذرائع آمدنی و دولت کی بھی فکر کرنے لگا۔ فرانس

تجارت کا فروغ و تحفظ

اب تک تجارتی ملک نہ تھا بلکہ تمام مصنوعہ اشیاء وہ قریب کے ممالک سے درآمد کرتا تھا۔ کولبر نے یہ حالت بدل دینے کا ارادہ کیا۔ جراب بننا۔ اور کپڑا بننا، اور لیس بنانا اور شیشہ کے آلات بنانا یہ سب سکھانے کے لئے اس نے انگلستان ہالینڈ اور اٹلی کے کاریگروں کو فرانس میں آنے کے لئے ترغیب دی اور جب یہ صنعتیں فرانس میں قائم ہوگئیں تو اس نے غیر ملکی اشیاء پر زبردست محصول عائد کرکے ملکی اشیاء سے مقابلہ کرنے سے روکدیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے گماشتوں کے ذریعے سے اشیاء کی تیاری پر بھی نگرانی رکھتا تھا۔ اس کا یہ کام بہت مشہور ہے جس کی وجہ سے کولبرٹزم (Colbertism) کالبرٹ بعض ملکوں میں محفوظ تجارت کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس کی قائم کردہ صنعتیں

تجارتی جماعتیں

بہت سی تو تھوڑے ہی دنوں میں جاتی رہیں لیکن ان میں سے بعض تو فرانس کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بنگئیں ساتھ ہی ساتھ اس نے تجارت کو بہت فروغ دیا۔ یورپ کی بحری تجارت اس زمانہ میں انگلستان اور ہالینڈ کے ہاتھوں میں تھی اور منشوری جماعتوں کے ذریعہ سے یہ ممالک تجارت کرتے تھے۔ کولبر نے سوچا کہ کیا یہی طریقہ فرانس کے لئے بھی کارآمد نہیں ہوسکتا بحر ہند۔ بحر بالٹک۔ بحر متوسط اور امریکہ میں تجارت کرنے کے لئے کمپنیاں قائم کی گئیں اس میں بھی ایسا ہوا کہ بہت سی کمپنیاں (جماعتیں) تو ٹوٹ گئیں لیکن بعض بہت دنوں تک قائم رہیں بہرحال اس میں کلام نہیں کہ اس کے زمانے میں فرانس کی تجارت بہت بڑھ گئی۔

بحری بیڑا

یہی نہیں بلکہ سڑکیں عمدہ عمدہ بنوائی گئیں نہریں جاری کی گئیں اور جہاز سازی کو بہت ترقی دی گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ فرانس بھی انگلستان کی طرح تجارتی و صنعتی اغراض کو سب چیزوں پر مقدم رکھے گا۔ کولبر نے فرانس کے بیڑے کو بھی انگلستان اور ہالینڈ کے بیڑوں کے برابر کا بنا دینا چاہا۔
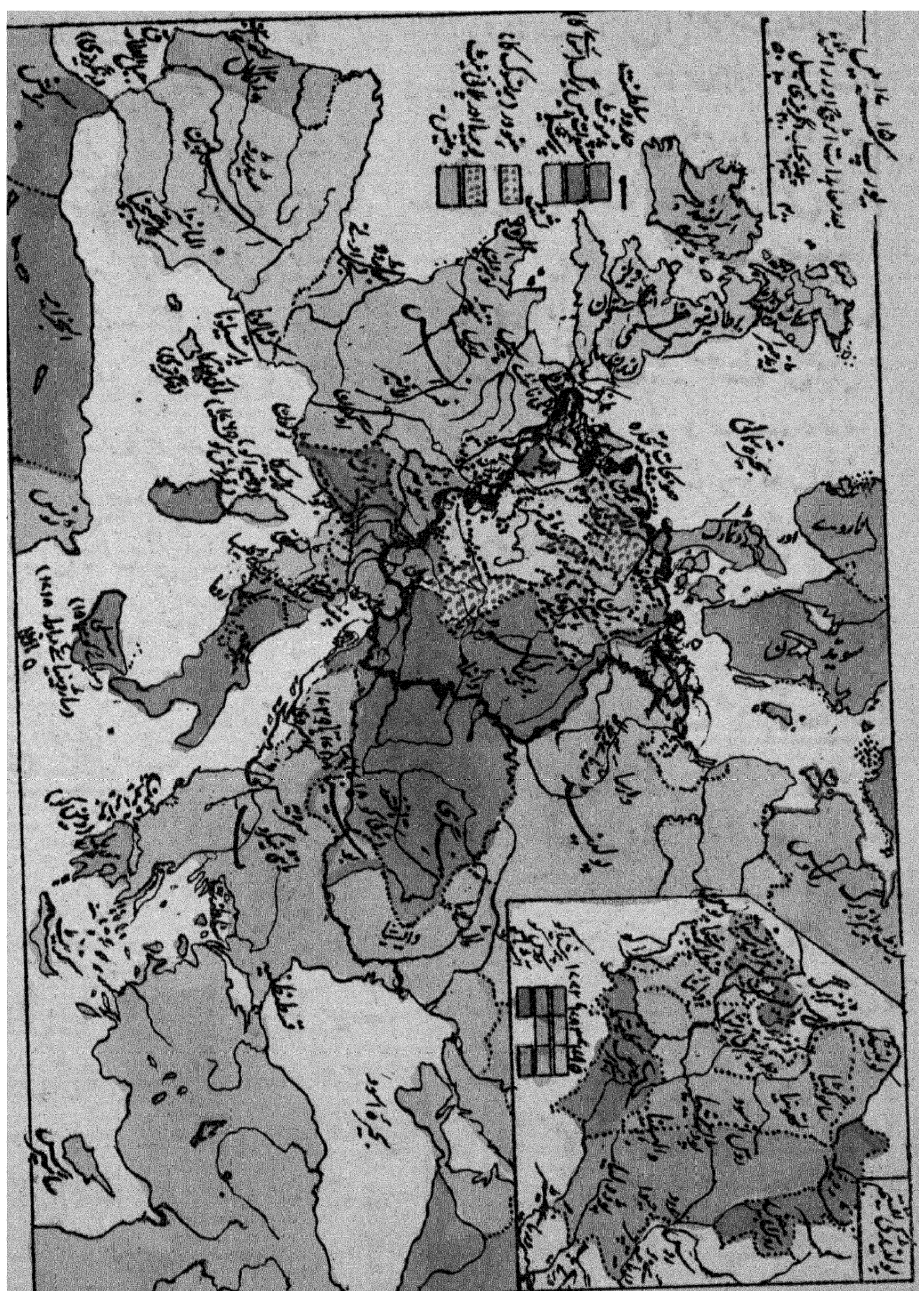
لوئی چہاردہم

لوئی چہاردہم کے ابتدائی عہد حکومت میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جس کی وجہ سے اس کی حکومت عام پسند سمجھی جاتی تھی۔ وہ سب کے ساتھ یکساں انصاف کرتا تھا اور اس نے یہ ظاہر کر دیا کہ قانون کے مقررہ تعزیرات سے کوئی شخص اپنی امارت یا ریاست کی وجہ سے نہیں بچ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ فرانس کے اکثر و بیشتر لوگ اس کی حکومت کو صدق دل اور جوش سے پسند کرتے تھے۔ لیکن اس کے عہد حکومت کا پر امن زمانہ تھوڑے ہی دنوں تک رہا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ جنگ کے ایسے سلسلے میں پھنس گیا جس میں شروع شروع تو وہ فتحیاب رہا لیکن جس کی وجہ سے روز بروز یورپ کی سلطنتوں کا جتھا اس کے خلاف قائم ہوتا رہا اور بالآخر فرانس اس بار گراں کو برداشت نہ کر سکا اور اس کے ذرائع خالی ہوگئے اور لوئی چہاردہم کے عہد کی شان و شوکت ناکامی اور بدنامی سے بدل گئی۔

جنگ ارث

اس سلسلہ کی پہلی لڑائی "جنگ ارث" یا جنگ ملکہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ لوئی چہاردہم نے جب اسپین کی شہزادی میریا تھریسا سے عقد کیا تھا تو اس نے عہد کیا تھا کہ اسپین کے ملک و تاج کے متعلق اپنی بیوی کی طرف سے وہ دعویدار نہ ہوگا۔ لیکن ۱۶۶۵ء میں جب فلپ چہارم (Philip IV) شاہ اسپین کا انتقال ہوا تو لوئی چہاردہم نے فوراً ہسپانیہ کے مقبوضات نیدر لینڈز کے متعلق اپنی بیوی کی طرف سے دعویٰ کر دیا۔ وہ اس بات پر قائم تھا کہ معاہدہ پیرینیز (Pyrennese) کی شرط کے مطابق جہیز کا روپیہ نہیں دیا گیا اس لئے وہ بھی اپنے وعدہ کا پابند نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی جتایا کہ نیدر لینڈز کے قانون وراثت کی عجیب خصوصیت یہ ہے کہ پہلی بیوی کے بطن کی بیٹی کا حق دوسری بیوی کے بطن کے بیٹے سے زیادہ مرجح ہے۔ اس لئے اس ملک پر اس کی بیوی کا حق بمقابلہ اسکے سوتیلے بھائی چارلس دوم (Charles II)

شاہ اسپین کے زیادہ بھاری حقوق تسلیم نہیں کئے گئے اس لئے لامحالہ جنگ چھڑ گئی۔ ہسپانوی بھلا فرانس کی شائستہ و آراستہ فوج کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے اور اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ کل ہسپانوی نیدرلینڈز بہت جلد تاخت و تاراج ہو کر فرانس کی سلطنت میں شامل ہو جائے گا کہ یکایک ایک تغیر رونما ہوا۔ فرانس کی پیش دستی سے تمام دول یورپ کے سینے میں حسد و خوف پیدا ہو گیا تھا اور انگلستان۔ سویڈن و ہالینڈ نے فرانس کا سیلاب روکنے کے لئے ایک اتحاد قائم کر لیا۔ ایک طویل جنگ کا مصالحہ جمع ہو گیا تھا لیکن لوئی چہاردہم نے سر خم کر دیا۔ فرانس کی شمالی سرحدیں تو کچھ اضافہ ہوا لیکن بقیہ سب مفتوحہ ملک ۱۶۶۸ء میں اسپین کو واپس کر دیا گیا اس کے بعد چند سال تک فرانس کو امن حاصل رہا لیکن ۱۶۷۲ء میں اس سے بھی بڑھ کر ایک لڑائی ہالینڈ سے شروع ہوئی جس کے اسباب آسانی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ تجارت میں ہالینڈ والے فرانسیسیوں کے حریف تھے۔ اس لئے کولبرٹ نے بھی جو بہت امن پسند تھا اس جنگ کا خیر مقدم کیا جو ایک حریف کو فنا کر کے فرانس کی تجارتی ترقی کی شاہراہ صاف کر دی گئی۔ علاوہ اس کے ہالینڈ ایک ایسی جمہوریت کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ جو شاہ فرانس کی مطلق العنانی کو ناگوار تھی اس کے علاوہ فرانس کے سیاسی اور مذہبی مہاجرین کا یہ ملک ملجا بنا ہوا تھا اور حال ہی میں ایسی کتابیں بھی ہالینڈ میں شائع ہوئی تھیں جس میں شاہ فرانس کے طرز حکومت و طرز عمل پر حملہ کیا گیا تھا اور ۱۶۶۷ء کے اتحاد ثلاثہ کے قیام میں جو حصہ ہالینڈ نے لیا تھا اس کو بھی لوئی چہاردہم نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کئی وجوہ سے ہالینڈ کی چھوٹی سی مگر سرسبز سلطنت اس عظیم الشان بادشاہ کی سدراہ ہو رہی تھی۔ اس جنگ کے چھیڑنے میں بھی لوئی چہاردہم نے اپنی معمولی حکمت عملی سے کام لیا۔

اتحاد ثلاثہ

ہالینڈ سے جنگ

ڈوور کا خفیہ معاہدہ

ڈوور (Dover) کے خفیہ معاہدہ کی بنا پر شاہِ انگلستان نے وقت ضرورت پر لوئی چہاردہم کی مدد کرنے کا وعدہ کرلیا تھا۔ سوئیڈن کو بھی کچھ دے دلا کر ہموار کرلیا گیا تھا اس لیے سنہ ۱۶۷۲ء میں جب جنگ چھیڑ دی گئی تو ہالینڈ بے یار و مددگار تھا اور تنہا فرانس کے حملہ کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ فرانسیسی فوج نے دریائے رائن (Rhine) پار کرکے کئی شہر اور قلعے فتح کرلیے اور امسٹرڈم (Amsterdam) (دارالسلطنت) کے قریب فوج پہنچ گئی۔ ہالینڈ والوں نے بیکار و بے سود فرانسیسیوں سے منّت سماجت کی لیکن کامل اطاعت سے کم تو لوئی (Louis) منظور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور معلوم بھی یہی ہوتا تھا کہ عنقریب ایسا ہو جائیگا۔ لیکن عین

ہالینڈ کی تباہی اور پھر سلامتی

اس نوبت پر حالت بدل گئی ہالینڈ میں ایک انقلاب ہوا اور ولیم خاموش (William the Silent) کا پڑپوتا ولیم آف آرینج (William of Orange) برسراقتدار ہوگیا۔ ولیم خاموش وہی ہے جس نے ایک صدی قبل ہالینڈ کے پروٹسٹنٹ باشندوں کی بیش بہا خدمت انجام دی تھی۔ ولیم آرینج کے ہاتھ میں فوجی اور سیاسی اختیارات زبردستی دیے گئے اور اس سے کہا گیا کہ جس طرح اس کے پڑدادا نے اس سے بھی زیادہ دشوار موقع پر ملک کو بچایا تھا وہ بھی اسے بچائے ولیم آف آرینج نے جو بعد میں ولیم سوم (William III) شاہ انگلستان کے نام سے مشہور ہوا اپنے کو اس کام کا اہل بھی ثابت کردیا اور خود بڑا سپاہی تو نہ تھا لیکن تدبر و سیاست میں یورپ نے اس کا ثانی کم دیکھا ہے۔ پہلے تو بند کاٹ دیے گئے اور ہالینڈ کے زرخیز میدانوں پر سمندر کا پانی بہنے لگا اور پھر دانشمندانہ گفت و شنید سے فرانس کے خلاف پھر ایک اتحاد قایم ہوگیا۔ اسپین نے اپنے پُرانے غنیم ہالینڈ کا ساتھ دیا۔ برینڈن برگ (Brandenburg) کی حکومت جواب تک فرانس کی طرفدار تھی اس کے خلاف ہوگئی۔ سلطنت (آسٹریا) نے بھی فرانس کی چیرہ دستی کا مقابلہ کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔ اور آخر کار انگلستان کے لوگوں نے اپنے بادشاہ کو اُس وعدے کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا جو اس نے لوئی چہاردہم

کیا تھا۔ انگلستان، ہالینڈ پر حملہ کرنے سے باز رہا اور کچھ دنوں کے بعد اس کی تائید میں اُلٹا فرانس پر حملہ کر بیٹھا۔

فرانس کے خلاف اتحاد عظیم

اس کے بعد جو لڑائی ہوئی اس میں فرانس کی سپاہ نے یورپ کی دوسری فوجوں پر اپنی فوقیت ثابت کردی اور ۱۶۷۸ء میں جب صلح نیمے گوین (Nimeguen) طے ہوئی تو فرانس بہت سی رعایتوں کا مدعی ہوا۔ اس کی شمالی سرحد میں اور اضافہ ہوگیا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کی مشرقی سرحد پر اسپین سے فرانشی کامٹی (Franche Comte) کا علاقہ مل گیا۔ جتنا وہ ملک چاہتا تھا اُتنا تو اُسے نہیں ملا لیکن پھر بھی اُس کے مقبوضات میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا اور اس کی عظمت میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

"الحاق مکرر" (Reunions)

اس جنگ میں جو فائدے اُسے حاصل ہوئے اس سے کہیں بڑھ کر امن وصلح کے زمانے میں اُسے مقبوضات حاصل ہوئے۔ یہ واقعہ "الحاق مکرر" کے نام سے مشہور ہے جسے سمجھنے کے لیے ہمیں پھر صلح ویسٹ فیلیا کے شرائط دیکھنا پڑینگے اس صلح کی رُو سے ایلسس (Alsace) اور لورین (Lorraine) کا کچھ علاقہ "مع زمین وحقوق ملحقہ" کے فرانس کو ملا تھا۔ ان حقوق کی کوئی صراحت نہ تھی اور اب ایسے پُرامن وقت میں جبکہ یورپ تھک کر اور جنگ سے عاجز آکر امن وسکوت کا طالب تھا لوئی چہاردہم نے ان فقروں کی تشریح کے لیے یکطرفہ تحقیقات جاری کرائی۔ اُس نے ایک عدالت قائم کرکے اس کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کیا اور اس طرح خود ہی مدعی اور خود ہی منصف بن گیا۔ ایک ایسی کارروائی کے ذریعہ سے جو بالکل ناجائز و خلاف قانون تھی۔ الساس (Alsace) کا بہت بڑا علاقہ اس کے حق میں فیصلہ کردیا گیا حتیٰ کہ جرمن شہر اسٹراسبرگ (Strassburg) بھی اس کو مل گیا۔ اسی قسم کی ناجائز کارروائی سے شمال میں لکسمبرگ (Luxemburg) کا شہر اور ایلپس (Alps) کے اُس پار

اسٹراسبورگ کیسل اور لکسمبرگ پر قبضہ (Cassale Strasburg)

اٹلی میں کیسل (Cassale) کا شہر بھی اس کو مل گیا۔ یہ مقامات یوں بھی اہم تھے اور اس وجہ سے

آئندہ فتوحات کا راستہ کھل گیا ان مقامات کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی - اس کا رروائی اور قبضہ پر جرمنی برانگیختہ ہو گیا اور ۱۶۸۴ء میں ریٹس بن (Ratisbon) ایک مجلس ڈیٹ (Diet) اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئی - لیکن اس مجلس کی بدولت فرانس کا رعب و دبدبہ اور بھی نمایاں ہو گیا - لوئی (Louis) نے اس مجلس کو ایک اعلان جنگ بھیجا کہ جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا بیس سال کے لیے فوراً اس کو دیدیا جائے ورنہ وہ جنگ شروع کر دیگا - پہلے تو بے آبروئی کے خیال سے مجلس نے پس و پیش کیا مگر آخر کار اس کے حکم کی تعمیل کر دی - یہی سال ۱۶۸۴ء اور مجلس ڈیٹ (Diet) میں یہ گستاخانہ فتحیابی فرانس کی عظمت و اقتدار کا معراج سمجھنا چاہیئے -

اس کے بعد سے فرانس کی قوت رو بہ زوال ہوئی اور بہت جلد لوئی (Louis) پھر ایک سلسلہ جنگ میں پھنس گیا جس میں ابتدا بڑی بڑی مشکلوں سے اسے فتح ملتی رہی مگر پھر بعد میں تو اسے فتح نصیب ہی نہ ہوئی بلکہ شکست ہوتی رہی - اس وجہ سے اس عظیم الشان بادشاہ کی حکومت کا آخری زمانہ اس کے شاندار آغاز سے بالکل مختلف تھا - اور اب ہمیں اس انقلاب کے اسباب ڈھونڈھنا چاہیے - مناسب ہوگا کہ اس عہد کی مذہبی زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے

اس عہد کے مذہبی کارنامے

شباب کے زمانہ میں بادشاہ نے آزادہ روی اختیار کی تھی اور اس کے عمال پر مذہب کا کوئی اثر نہ تھا اُس نے صرف سیاسی امور میں خود کو فرانس کا مالک بنانا نہیں چاہا بلکہ مذہبی معاملات میں بھی ایسے ہی اختیارات حاصل کرنے کا عزم کیا اور دینی و مذہبی حکام کے مقابل میں وہ اپنا حکم قایم رکھنے میں کامیاب بھی رہا - اس طرح ۱۶۸۲ء میں پوپ سے ایک نزاع کی بناء پر اس نے ایک اعلان کر دیا جو گیلیکن آزادی (Gallican Liberty) کی بابت تھا گیلیکن آزادی سے مراد فرانس کے رومن کیتھلک کلیسہ کے حقوق تھے - اس مشہور اعلان میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ "پوپ کا اختیار صرف روحانی معاملات تک محدود ہے اور شاہی اختیارات پر کسی طرح مؤثر نہیں ہوسکتا اور یہ

گیلیکن آزادی کا اعلان

کہ پوپ کو کوئی اختیار بادشاہ کو معزول کرنے کا نہیں ہے نہ رعایا کو اطاعت وفرانبرداری کے غرض سے سبکدوش کرنے کا" اس اعلان کے ایک حصہ میں یہ بھی درج تھا کہ "پوپ کا حکم اسی وقت قطعی ہوسکتا ہے جبکہ ایک کونسل بھی اس پر منظوری دے۔" پوپ نے اس پر اعتراض کیا مگر بے سود کیونکہ لوئی چہاردہم نے اس معاملہ کو اپنی مرضی کے مطابق طے کیا۔

ژان سینی تحریک گو اس معاملہ میں تو اس نے پوپ کی مخالفت کی لیکن مذہبی پابندی کا قاعدہ اس نے ان لوگوں کے لیے جو اس کی ممانعت کرتے تھے قائم رکھا۔ خود رومن کیتھلک فرقہ میں ایک تحریک ژان سینی (Jansenism) کے نام سے اٹھی تھی۔ یہ نام ایپر (Ypres) کے اسقف ژان سینی (Jansen) کے نام پر رکھا گیا کیونکہ اسی کی تصانیف سے اس تحریک کے حامیوں کے خیالات ماخوذ تھے جو لوگ اس تحریک میں شریک ہوئے انھوں نے اپنے کو کیتھلک کلیسہ کا تابع اور پابند ظاہر کیا اور عقائد و رسومات میں بھی کیتھلک کلیسہ کے خلاف عمل کرنے سے انھوں نے قطعاً انکار کیا۔ لیکن انھوں نے فرانس کے دوسرے کیتھلک لوگوں سے زیادہ تقویٰ کی پابندی کا لزوم رکھا۔ اور اس لحاظ سے ابتدائی کیتھلک مذہب اور انجیل کو حالیہ روایات پر ترجیح دیتے تھے۔ بہت سے بڑے بڑے لوگوں کی شرکت سے یہ تحریک مشہور ہوگئی۔ راسین (Racine) اس میں شریک ہوگیا اور اس کے آخر میں اس نے اپنی بہترین کتاب لکھی پاسکال (Pascal) جو فلسفے اور حکمت میں نام پیدا کرچکا تھا اس تحریک کا روح رواں تھا۔ بادشاہ نے اس تحریک کو اپنے اور پوپ کے اختیارات میں خلل انداز خیال کیا۔ پوپ نے متعدد فرامین اس تحریک کے خلاف جاری کیے اور بادشاہ نے بھی اس تحریک کو مٹا دینے میں اپنی تمام قوت صرف کردی حالانکہ اگر اس تحریک کو دوسرے طور پر ابھارا جاتا تو فرانس کی قوت وحیات کا باعث ہوتی اور پھر رومن کلیسہ کے اختیارات پر بھی کوئی برا اثر نہ پڑتا۔

ہیوگینولوگ لیکن پروٹسٹنٹ لوگوں سے بادشاہ کی معاملت اس سے بھی زیادہ

اہم اور قابل مطالعہ ہے اور یہاں بھی وہی مطلق العنانی آزادی کا خون کرتی رہی۔ اور ایسا کرنے سے خود اس کی تقویت اور بنیاد کمزور ہوتی گئی۔ فرانس کے پروٹسٹنٹ لوگوں میں اب وہ قوت باقی نہ تھی جو ہنری چہارم اور ریشلیو (Richelieu) کے زمانہ میں ان کو حاصل تھی ان کی تعداد بھی گھٹ گئی تھی اور ان کی معاشرتی فوقیت بھی جاتی رہی۔ اشرافیہ سے بھی ان کا تعلق منقطع ہو گیا تھا۔ انھوں نے غداری کی کوئی علامت ظاہر نہیں کی اور فرانڈی (Fronde) شورش میں انھوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ ان کا انہماک زیادہ تر تجارت اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں رہتا تھا۔ چنانچہ فرانسیسوں کے کسی طبقہ نے کالبرٹ کو ایسی بیش بہا امداد نہیں پہنچائی جیسی کہ ان لوگوں نے لوئی چہاردہم کے ابتدائی عہد میں ان سے کچھ زیادہ تعرض نہیں ہوا گو ان کے حقوق و امتیازات کو محدود کرنے کا رجحان ضرور تھا۔ لیکن بعد میں بادشاہ کا

مادام دی مینتون
(Madame de Maintenon)

رجحان مذہبی معاملات میں زیادہ ہو گیا۔ اس معاملہ میں مادام دی مینتون (Madame de Maintenon) نے اُس پر بہت اثر ڈالا۔ یہ عورت اولاً تو لوئی کی ناجایز اولاد کی انا تھی لیکن ماریا تھیریزا (Maria Theresa) کی وفات پر اُس کی زوجیت میں آگئی۔ بادشاہ کو اب مذہب سے بجی اور گہری دلچسپی ہوگئی اور پروٹسٹنٹ مذہب کو وہ شاہی اختیارات کی توہین کا باعث ہی نہیں بلکہ کفر کے ہم معنے سمجھنے لگا جس کی بیخ کنی اس نے ضروری خیال کی۔ ان تدابیر میں فرانسیسی کلیسہ کے سرداروں نے اس کو اور بھی بڑھایا حتیٰ کہ بوسویٹ (Bossuet) تو اُس کے مظالم ہی کو اس کی شہرت و ناموری کا سبب بتلاتا تھا۔ پہلے تو پروٹسٹنٹ لوگوں کے حقوق و امتیازات کی تحقیق و تخفیف شروع ہوئی۔ اُن پر سخت نگرانی قائم کی گئی اور معمولی معمولی باتوں پر ان کی عبادتگاہیں ڈھا دی گئیں اور ان کی جائدادیں حتیٰ کہ ان کی اولاد بھی ان سے چھین لی گئیں ان کی حالت شکار کی سی ہوگئی جس کو شکاریوں نے حلقہ میں گھیر لیا ہو اور آہستہ آہستہ اس حلقہ کو تنگ کرتے جاتے ہوں رشوت اور جبر سے ان کو کیتھلک مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور بہت سے

لوگ ان دونوں میں سے کسی ایک طریقے کے شکار ہو گئے۔

تب آخر کار ۱۶۸۵ء میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ پروٹسٹنٹ گروہ کے بیشتر حصہ نے کیتھلک مذہب اختیار کر لیا ہے اور فرمان نین نانت (Nantes) جو دائم النفاذ سمجھا جاتا تھا اب اس کی پابندی بادشاہ پر لازم نہیں ہے۔

فرمان نین نانت (Nantes) کی تنسیخ

اس لئے وہ منسوخ کر دیا گیا۔ عبادت کی آزادی یک لخت سلب کر لی گئی گو ضمیر کی آزادی ایک مضحکہ خیز طریقہ پر قائم رکھی گئی۔ کسی شخص کو فرانس سے ترک سکونت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن اس امتناع کی تعمیل نہ ہو سکی اور ہزاروں پروٹسٹنٹ لوگ سوئٹزرلینڈ۔ پراشیا و ہالینڈ و انگلستان میں جا کر پناہ گزیں ہوے۔ فرمان نین نانت کی تنسیخ کے نتائج کے متعلق پروٹسٹنٹ مورخین نے مبالغہ ضرور کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اہم اور برے نتائج ضرور مترتب ہوے۔ فرانس کی کئی ہزار رعایا نکل گئی جن میں سے بعض تو انتہا کے صلح جو محنتی اور کارگزار تھے۔ اور یہ لوگ اپنے ساتھ وہ صنعتیں بھی دوسرے ملکوں کو لیتے گئے جو وہ یہاں کرتے تھے۔ اور اس حکومت سے ان کو دائمی منافرت ہو گئی جس نے ان کو نکالا تھا۔ ہالینڈ اور انگلستان دونوں نے ان کی آمد سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن پراشیا (Prussia) میں ان کی آمد اس سے بھی زیادہ نتیجہ خیز ہوئی (وہاں کے والی) فریڈرک ولیم (Fr: William) منتخب اعظم نے برلن اور اس کے جوار میں ان لوگوں کو مکانات و زمینات دیئے۔ یہی لوگ اس شہر کے عروج کا باعث ہوے جو آخر میں فرانس کے لیے اس قدر خطرناک ثابت ہوا۔ یہ لوگ ایک ایسے بادشاہ کے مذہبی دیوانگی اور کورانہ مظالم کی بدولت ہجرت کر گئے تھے جو بعض لحاظ سے واقعی میں عظیم الشان بادشاہ تھا۔

بادشاہ کی مذہبی پالسی (طرز عمل) اور اس کا انجام جس کی بدولت فرانس کے علمی و تجارتی حیات کو صدمہ و ضعف پہنچا اس ملک کی قوت کے زوال کا باعث ہوا۔ اس کے سوا اور اسباب بھی تھے جو بادشاہ

ترکی شکست

ترکی شکست کے قابو سے باہر تھے فرانس اور ترکی میں عرصہ سے ایک غیر رسمی لیکن اہم موافقت تھی اور ترکوں کے وائنا پرحملہ اور حملہ کی دھمکی کی وجہ سے اکثر مرتبہ شہنشاہ آسٹریا فرانس کے خلاف لڑائیوں میں شریک نہیں ہوسکا تھا۔ اب ۱۶۸۳ء میں ترکوں کو سب سے بڑی شکست ہوئی ان لوگوں نے بڑی شدت سے وائنا (Vienna) کا محاصرہ کرلیا تھا اور شہر فتح ہوجانے کو تھا کہ جان سوبسکی شاہ (John Sobieski) پولینڈ (Poland) نے اسے بچالیا ترک بے ترتیبی سے پسپا ہوگئے اور اُن کا کثیر نقصان ہوا۔ ترکوں کی بڑی طاقت کا زوال اسی تاریخ سے شروع ہوا۔ ہنگری (Hungary) کا بیشتر حصہ ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا اور اب فرانس کو سلطان کی معقول امداد کی توقع نہ رہی۔ انگلستان میں بھی تغیرات

لوئی چہار دہم اور انگلستان

ہو رہے تھے جو انجام کار فرانس کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔ بادشاہ (لوئی) کا تعلق چارلس دوم سے کچھ خوشگوار نہ تھا لیکن پھر بھی اور تدبیروں سے اس نے انگریزی حکومت کو فرانس کے خلاف عملی مخالفت کرنے سے باز رکھا جب جیمز دوم تخت نشین ہوا تو لوئی چہار دہم کو زیادہ خوشگوار تعلق قائم کرنے کی توقع ہوگئی کیونکہ دونوں بادشاہ کیتھلک مذہب کے پیرو تھے اور یکساں مذہبی اغراض کی وجہ سے دونوں میں گہری موافقت ہونی لازمی تھی۔ لیکن جیمز دوم سرپھرا اور ناعاقبت اندیش حکمراں تھا اور اس میں ایک قسم کی قومی نخوت تھی جس کی وجہ سے فرانسیسی بادشاہ کی استعانت کو وہ

۱۶۸۸ء کا انگریزی انقلاب

حقیر سمجھتا تھا اور اس طرح کی حماقت کرتے کرتے اپنی رعایا کے مذہبی و قومی جوش و تعصب سے خود متصادم ہوگیا جس کی وجہ سے تین سال بعد ۱۶۸۸ء میں انگلیسی انقلاب واقع ہوا جس نے صرف پروٹسٹنٹ مذہب اور نیابتی حکومت کو انگلستان میں قائم نہیں رکھا بلکہ فرانس کے مقابل میں ایک ایسے دشمن کو کھڑا کردیا کہ لوئی چہار دہم کو ایسے خطرناک اور پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑنے والے

غنیم سے کبھی سابقہ نہ ہوا تھا۔

۱۶۸۸ء میں لوئی چہاردہم کا اقبال نازک حالت میں ہوگیا۔ ایک طرف تو جیمز دوم (James II) انگلستان میں انقلاب کرائیکے درپے تھا اور لوئی چہاردہم کو خوب معلوم تھا کہ فرانس پر اس انقلاب کا کیا اثر پڑیگا۔ جیمز دوم کے غرور اور قومی حمیت نے اُس کی امداد قبول کرنے سے انکار کردیا

۱۶۸۸ء کے غیر ملکی مشکلات

تو اُس نے اپنی توجہ مشرقی سرحد کی طرف منعطف کی وہاں کولون (Cologne) کی انتخابی مملکت اُسقفی انتخاب کے جھگڑوں میں مبتلا تھی اور یہ شہر اس وجہ سے اہمیت رکھتا تھا کہ یہاں سے ایک سڑک نیدرلینڈز (Netherlands) کو جاتی تھی اور دریائے رائن (Rhine) پر ایک پُل بھی یہاں بنا ہوا تھا۔ اس لیے شاہ فرانس چاہتا تھا کہ یہاں کا والی اور اسقف اعلیٰ کوئی ایسا شخص منتخب ہو جو فرانس کا طرفدار ہو۔ پہلے تو معلوم ہوا کہ یہ مقصد آسانی سے حاصل ہو جائیگا۔ لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ

کولون (Cologne)

کولون کو فرانس کے زیرِ اثر لانے میں فوجی امداد کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے اس نے اپنی فوج کی نقل و حرکت شروع کردی۔ اور کولون کی طرف بڑھنے کے لیے فوج کو تیار کر رکھا۔

ان واقعات کا گہرا تعلق انگلیسی انقلاب سے تھا۔ انگلستان کے شورش پسند سرداروں نے ہالینڈ کے ولیم اسٹاڈ ہولڈر (William Statthalter) کے پاس اپنا مشہور محضر

ہالینڈ میں ولیم سوم

بھیجدیا تھا۔ کیونکہ جیمز دوم کے رشتہ داروں میں وہی ایک غیر کیتھلک تھا ولیم بھی اس مہم کے لیے آمادہ تھا لیکن صوبہ جات متحدہ اُسے ایسے وقت میں روانگی کی اجازت دینے پر تیار نہ تھے جبکہ فرانس کا طرزِ عمل نامعلوم تھا کیونکہ اگر فرانسیسی فوج ہالینڈ پر حملہ آور ہوتی تو ہالینڈ کو اپنی قوت کے کل ذرائع اور ولیم کو اپنی تمام طاقت کے دفع کرنے میں صرف کردینا پڑتی۔ کولون پر فرانسیسیوں کے حملے کرنے سے یہ خوف جاتا رہا۔ اور ولیم کو انگلستان

جانے کی فرصت مل گئی جہاں اُس نے بڑی ہوشیاری اور خوش نصیبی سے اپنے کو پروٹسٹنٹ اور پارلیمنٹی انگلستان کا بادشاہ بنا لیا وہ اس رتبہ کی اسی وجہ سے قدر کرتا تھا کہ فرانس ایک زبردست حلیف کی اعانت سے محروم ہوگیا اور فوراً انگلستان کے مخالف گروہ میں شریک ہوگیا۔

فرانس کے خلاف زبردست اتحاد

کولون پر فوج کشی اور انگلیسی انقلاب نے ایک جنگ عظیم کا سلسلہ ڈال دیا۔ فرانس کا ایسا خوف اور حسد چھا گیا تھا کہ ولیم سوم یورپ کی تمام دول کو شاہ فرانس کے خلاف متحد کرنے میں کامیاب رہا۔ پہلے تو شہنشاہ (آسٹریا) اور ہالینڈ انگلستان کے ساتھ شریک ہوگئے اس کے بعد اسپین Spain اور برینڈن برگ (Brandenburg) بھی شامل ہوگئے اور آخر میں سویڈن ڈنمارک نے بھی اس جتھے کا ساتھ دیا۔ جنگ بڑی سخت اور عرصہ تک رہی لیکن برِ اعظم یورپ میں کوئی ممتاز و دلچسپ واقعات نہیں پیش آئے۔ یہ لڑائی اصل میں محاصرہ کی لڑائی تھی اور واوبن (Vauban)

اس جنگ کی خصوصیات

نے فرانس کی سرحدی قلعہ بندی ایسے اعلیٰ پیمانہ پر کی تھی کہ تمام جنگ محاصروں کا ایک سلسلہ بن گئی تھی۔ اس لیے اس مہم کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اس کے مطالعہ سے فرانس کی فوجی قوت اور اس کے سپہ سالاروں کی فوقیت اور فن سپہ گری کی واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ جنگ کے شروع میں خشکی اور تری میں دونوں جگہ فرانس غالب نظر آتا تھا سنہ ۱۶۹۰ء میں فرانس کے بیڑے نے بیچی ہیڈ (Beachy Head) کی لڑائی میں انگلستان اور ہالینڈ کے متحدہ بیڑے کو شکست فاش دی۔ حیرت ہے کہ لوئی چہاردہم نے اس فتح سے اور فائدہ کیوں نہ اٹھایا لیکن سنہ ۱۶۹۲ء میں نصیب نے اُس کی یاوری نہ کی اور لاہوگ (La Hogue) کی لڑائی میں پھر انگلستانی بیڑے نے اپنی برتری ثابت کردی اور پھر ایک عرصہ تک کے لیے انگلستانی ساحل پر فرانس کی فوج کشی کا اندیشہ جاتا رہا۔ یہ جنگ سمندر اور نیدرلینڈز (Netherlands) تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کا سلسلہ آئرلینڈ میں بھی تھا جہاں جیمز دوم (James II)

انگلستان سے بھاگ کر گیا تھا اور جہاں سے قوت حاصل کر کے پھر انگلستان فتح کر لینے کی اسے توقع تھی۔ ہم مذہب اور انگلستان سے عداوت ہونے کی وجہ سے بہت سے آیر لینڈ والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کی فوج کو فتوحات بھی ایسے حاصل ہوئے کہ کل جزیرہ اس کے قابو میں آجاتا لیکن اس نوبت پر اس کے عدم استقلال

بوائن (Boyne) کی لڑائی۔

اور بے ثباتی کا اظہار ہو گیا ولیم سوم دس بارہ قوموں کی ملی جلی فوج لے کر آپہنچا اور بوائن (Boyne) کی لڑائی میں بھی پھر انگریزوں کا سکہ آئرلینڈ والوں پر بٹھا دیا۔ برّاعظم پر لڑائی بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہی تھی۔ اور اس کے لیے بہت روپیہ کی بھی ضرورت تھی اور باوجودیکہ فرانس جو لڑائی لڑا اس میں فتحیاب ہوا اور جس شہر کا محاصرہ کیا اس کو فتح کر لیا۔ لیکن اس کی مالی حالت ایسی ابتر ہو گئی کہ وہ مصالحت پر مجبور و آمادہ ہو گیا۔

صلح رزوک (Ryswick)

نو برس کی مسلسل لڑائی کے بعد آخر کار ۱۶۹۷ء میں صلح رزوک (Ryswick) نے اس لڑائی کا خاتمہ کیا اس صلح کی رو سے فرانس کو اُن مقبوضات میں کچھ دینا پڑا جو اس کے پہلے کی لڑائیوں میں حاصل کیا تھا اور نیز ان میں سے جو اس نے "الحاق کرر" (Reunion) کی عدالتوں سے حاصل کیا تھا۔ لیکن اب بھی السیس (Alsace) اور اسٹراسبرگ (Strassburg) اس کے قبضہ میں رہے اور گو اس لڑائی میں اس کا تھوڑا سا ملک جاتا رہا۔ لیکن اس فوجی عظمت اور وقار میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ اب بھی وہ یورپ میں سب سے اعلیٰ درجہ کی فوجی طاقت رکھتا تھا۔ ولیم سوم کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ اپنے کو انگلستان کے تخت پر قائم رکھ سکا اور اس صلح کی رُو سے لوئی چہاردہم نے یہ عہد کر لیا کہ حصول تخت انگلستان کی سعی و کوشش میں وہ کوئی امداد اسٹوارٹ (Stuart) خاندان کو نہ دیگا۔

لوئی چہاردہم نے ایک اور خاص وجہ سے صلح رزوک (Ryswik) قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ جس معاملہ کی بابت یہ

اسپین کا معاملہ

لڑائی ولیم سے ہو رہی تھی۔ اس سے بھی زیادہ اہم ایک مسئلہ مدبرین یورپ کے سامنے آنیوالا تھا۔ کئی سال سے چارلس دوم (Charles II) شاہ اسپین (Spain) کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی اور اب میڈرڈ (Madrid) کی اطلاعوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا خاتمہ قریب ہے اور اس کی وفات پر یورپ کے مدبرین کو ایسا نادر موقع ہاتھ آنے والا تھا۔ جس کی کوئی مثال یورپین سیاست میں نہیں مل سکتی تھی۔

اسپین کی حالت

گذشتہ باب میں اس رائے پر اعتراض کیا گیا ہے کہ سولھویں صدی کے آخر میں یا سترھویں صدی کے شروع میں ہسپانیہ رو بہ زوال ہو چکا تھا اس لیے کہ وسط سترھویں صدی تک اس نے بڑی استقامت اور فوجی قابلیت کا ثبوت دیا اور وہاں کے مصنفین و مصورین نے یورپ کی دوسری سلطنتوں سے اسے ممتاز بنا رکھا تھا سترھویں صدی کے آخر میں البتہ اسپین کمزور ہو گیا اور اس کا سبب اس کے دساتیر اور معاشرتی طرز انتظام کی خصوصیات میں مضمر تھا۔ ان دونوں امور میں سے کونسا اصل باعث زوال ہوا اس کے متعلق اختلاف ضرور رہیگا مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے اسباب مل کر اسپین کی تباہی کا باعث ہوئے۔ سب سے پہلے تو اس کا مالی انتظام یورپ میں سب سے بدتر تھا۔ کلیسہ اور اشرافیہ کو مالی امتیازات حاصل ہونے سے جو خرابیاں فرانس میں انقلاب تک پیدا ہوتی رہیں۔ وہ سب

اسپین کی مالی حالت

اسپین میں بھی تھیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بعض نقائص وہاں پیدا ہو گئے تھے۔ اس کے محاصل کا طریقہ بھی ایسا تھا کہ اس کی تمام صنعتیں تو برباد ہو گئیں اور پھر بھی سرکاری خزانہ میں کوئی معقول اضافہ نہ ہوا۔

اسپین کی ذہنی حالت

علاوہ اس کے اسپین کی ذہنی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی سولھویں صدی اور اوائل سترھویں صدی میں کیتھلک ردعمل کی تحریک کی حمایت کرنے میں تو اس کی رعایا اس سے متفق تھی

لیکن کیتھلک مذہب کی اس ملک میں کامل فتح ہو جانے سے اور ان مظالم کے وجہ سے جو کیتھلک کلیسہ نے محکمۂ تفتیش کے ذریعہ سے ڈھائے ایک تباہ کن ذہنی جبر و تعدی کا سلسلہ قائم ہو گیا جو اسپین کی تباہی کا باعث ہوا۔ اس وجہ سے کہ اسپین اس کو محسوس ہی نہیں کرتا تھا۔ جب کہ یورپ میں سائنس (حکمت) کی تحریک شروع اور کامیاب ہو رہی تھی جس کی بدولت ان ممالک کو جہاں اس کا چرچا تھا۔ دولت و قوت حاصل ہو رہی تھی۔ اُس وقت اسپین میں اس قسم کی تحریک کی سرسبزی کا امکان ہی نہ تھا۔ کیونکہ سیاسی۔ علمی۔ مذہبی۔ کسی معاملے میں آزادی خیال کی اجازت ہی نہ تھی۔ سولھویں اور سترھویں صدی کے اوائل میں علوم و فنون کا یہاں اس قدر زبردست چرچا تھا کہ یورپ کے کسی ملک میں نہیں ہوا۔ لیکن سترھویں صدی کے وسط تک سب کچھ ختم ہو گیا اور پھر اسپین سیاسی و دماغی بیکاری میں پڑ گیا۔ علاوہ ان باتوں کے یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ دو صدی سے اسپین دنیا کے ہر حصہ میں فوج کشی کرتا رہا۔ اس نے امریکہ کے دونوں براعظم کو فتح اور آباد کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ اٹلی پر بھی وہ حکومت کرنا چاہتا تھا اور اس ارادہ میں قریب قریب کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ جنگ سی سالہ میں بھی اس کو اتنی ہی وابستگی رہی جتنی کہ آسٹریا کو نیدرلینڈز کو واپس لینے کے لیے اور انگلستان کو فتح کرنے کے لیے وہ کس طرح لڑا ہم دوسرے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان لڑائیوں میں اس کی فوج اور اس کے مدبروں کو بعض عظیم الشان کامیابیاں حاصل ہوئیں لیکن ان کی بدولت اسپین کے خزانہ اور قوت پر زبردست اور خطرناک بار پڑا۔ اس کے سلاطین تو اس قسم کی دُور دراز اور خیالی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھے اور ادھر ہسپانوی رعایا کی بہبودی کا کچھ خیال نہ ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے اصل بنیاد ہی جس پر شہنشاہیت کی عمارت کھڑی تھی کمزور اور ناکارہ ہو گئی۔ اسپین ایک ایسے ملک کی نظیر ہے جو اپنے ہی شہنشاہی منصوبوں کی بدولت تباہ ہوا۔

شاہ چارلس دوم

ایسے لوگوں پر جو کئی لحاظ سے ناموز تھے چارلس دوم حکمران تھا اس کے آباو اجداد جس قسم کے دماغی مرض میں مبتلا ہوئے تھے۔ اسی مرض کا شدید حملہ اس پر بھی ہوا۔ یوں بھی ان مسائل کے حل کرنے کا اہل نہ تھا جو اسپین کے حکمراں کو پیش آسکتے تھے نہ حکمرانی کی اس میں قابلیت تھی اور آخر زمانے میں تو وہ تقریباً بالکل مخبوط الحواس ہوگیا تھا۔ اس کی بیوی اور اس کے محرم راز پادری کا اس پر بہت اثر تھا اور اپنے فرائض منصبی کے انجام دینے کی اس نے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کو کوئی اولاد نہ تھی۔ اور تیس سال سے یورپ اس فکر میں تھا کہ چارلس دوم کی وفات پر اسپین کا کیا حشر ہوگا یہ طے کرنا کہ کون حقدار تھا ذرا مشکل تھا۔ اور اگر حقیقت کا تصفیہ بھی ہو جاتا تو رقابت کی وجہ سے دول یورپ ایسے تصفیہ کو کیوں تسلیم کرتیں جس سے ان کی ہوس کی تکمیل نہ ہو سکتی تھی۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ کل تین دعویدار تھے۔ لوئی چہاردہم نے فلپ چہارم شاہ اسپین کی بیٹی سے عقد کرلیا تھا اور اپنی بیوی کے حق کی بنا پر کل متروکہ اپنے بیٹے کے نام سے وہ چاہتا تھا دوسرے شہنشاہ لیوپولڈ اوّل (Leopold 1) فلپ چہارم (Philip IV) کی بہن میریا (Maria) کا بیٹا تھا اور وہ اپنی ماں کی طرف سے ہسپانوی تخت کا دعویدار تھا۔ ان دونوں میں لوئی چہاردہم کا دعویٰ زیادہ قوی تھا۔ لیکن صلح پیرینیز (Pyrenees) میں اس نے اس قسم کے دعوے سے دست برداری حاصل کرلی تھی گو ہم یہ بتا چکے ہیں کہ وہ اپنے کو اس دست برداری کا پابند نہیں سمجھتا تھا۔ تیسرا دعویدار بویریا (Bavaria) کا انتخابی (Electoral) خاندان تھا۔ میکس مینویل (Max Emmanuel) نے چارلس دوم کی بھتیجی اور فلپ چہارم کی پوتی سے عقد کیا تھا۔ اس کے دعوے میں بھی دست برداری کا عذر عارض ہوتا تھا لیکن خاندان بویریا نے کئی وجوہ سے اس دست برداری کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ پھر اب یہ معاملہ کس طرح طے ہوتا۔ انگلستان کے ولیم سوم کو بھی اس معاملہ میں گہری دلچسپی تھی۔

کیونکہ اس کے ذریعے سے اس کے حریف لوئی چہاردہم کی قوت میں زبردست اضافہ ہونے کا امکان تھا لیکن انگلستان کی رعایا اس کے ساتھ کسی تازہ جنگ میں شریک ہونے کے لیئے آمادہ نہ تھی۔ اس لیے اُسے حکمت عملی سے کام لینا پڑا۔ اس نے لوئی چہاردہم سے گفت وشنید شروع کی اور دو معاہدے تقسیم کے طے کیے۔ اس معاملہ میں نہ تو شاہ اسپین کا عندیہ لیا گیا اور نہ اسپین والوں کا۔ پہلے معاہدے کی رو سے یہ طے ہوا تھا کہ متروکہ کا بیشتر حصہ تو بیویریا کے شہزادہ کو دیا جائے کیونکہ تخت اسپین پر اس کے بیٹھنے سے توازن طاقت میں کوئی فرق نہ آئیگا اور آسٹریا وفرانس اسپین دور دراز مقبوضات حاصل کریں۔ ممکن ہے کہ یہ انتظام قائم رہتا۔ کیونکہ شاہ اسپین نے بیویریا کے شہزادہ کے حق میں وصیت لکھدی تھی۔ لیکن شہزادہ کی ناگہانی وفات سے پھر کل معاملہ از سر نو طے کرنا پڑا۔ ایک جدید معاہدہ تقسیم وعلیحدگی مرتب ہوا۔ اس مرتبہ متروکہ کا بیشتر حصہ آسٹریا کے شہزادہ چارلس کے حصہ میں رکھا گیا۔ شہزادہ چارلس شہنشاہ کا دوسرا (منجھلا) فرزند تھا۔ فرانس کو ہسپانیہ کے اطالوی مقبوضات دیے گئے۔

چارلس دوم کی وصیت

ادھر ولیم سوم سے گفت وشنید ہو رہی تھی اور اُدھر فرانسیسی سفیر میڈرڈ (Madrid) میں بادشاہ اور اس کے درباریوں کو فرانس کی حمایت پر آمادہ کر رہا تھا۔ پہلے تو اس کی کوششیں بیکار معلوم ہوئیں لیکن جب چارلس دوم فوت ہوا تو معلوم ہوا کہ اس نے لوئی چہاردہم کے پوتے فلپ آف آن ژو (Philip of Anju) کے حق میں وصیت کی ہے اور کل ملک کا اسی کو حقدار بنا دیا ہے اس خیال سے کہ فرانس کی قوی سلطنت تمام ملک کو ایک شیرازہ میں قائم رکھ سکے گی۔

لوئی چہاردہم وصیت کے مطابق وراثت تسلیم کرتا ہے۔

سوال یہ تھا کہ کیا لوئی چہاردہم اس معاہدہ تقسیم پر قائم رہیگا جس پر اس نے دستخط کر دی تھی۔ یا اب وہ اس وصیت کی تعمیل کریگا اس کی اطلاع فوراً ہی ورسیلیس

(Versailles) میں اس کو پہنچا دی گئی تھی۔ بمقابلہ معاہدہ تقسیم وصیت کے ذریعہ سے زیادہ عظیم الشان فوائد حاصل ہونے کی امید تھی علاوہ اس کے آسٹریا نے معاہدہ تقسیم سے انکار کر دیا تھا اور اب اس کی تعمیل بغیر جنگ کے ممکن بھی نہ تھی۔ اس لیے شاہ فرانس نے خیال کیا کہ جب جنگ ہی کرنا ہے تو بڑے انعام کے لیے کیوں نہ لڑا جائے۔ اس نے اپنے پوتے کو فلپ پنجم شاہِ اسپین تسلیم کر لیا اور ایک بڑی جنگ کے لیے تیاری شروع کر دی۔ لیکن اس کی نادانی سے جنگ غیر ضروری طور پر بڑھتی گئی۔ فلپ کے ہسپانوی تخت پر بیٹھنے میں یورپ کوئی تعرض نہ کرتا۔ اگر یہ صاف طور پر ظاہر کر دیا جاتا کہ فرانس اور اسپین اب بھی علیحدہ علیحدہ دو سلطنتیں رہیں گی۔ لیکن لوئی ابتدا ہی سے فرانس اور اسپین کو ایک سمجھنے لگا تھا اور فرانسیسی و ہسپانوی فوج کا ادل بدل ممکن سمجھنے لگا تھا۔ چنانچہ ہسپانوی نیدرلینڈز کے شہروں میں فرانسیسی دستہ متعین کر دیا گیا۔ ادھر انگریزوں کے جذبہ کو بھی اس سے ایک اور بڑی غلطی سے بھڑکا دیا۔ جیمز دوم جلا وطنی کی حالت میں پیرس (Paris) میں فوت ہو گیا تو انگلستان کی بیوہ ملکہ نے لوئی چہاردہم کی منت و سماجت کی کہ اس کے بیٹے کو جو بعد میں نوعمر اور مدعی تخت (Young Pretender) کے نام سے مشہور ہوا کم از کم بادشاہ کا خطاب تو عطا کر دے۔ حالانکہ صلح رزوک میں لوئی چہاردہم نے وعدہ کیا تھا کہ اسٹوارٹ (Stuart) کے شاہی خاندان کو کوئی امداد نہ دے گا۔ اس وجہ سے انگلستان میں اس کی یہ حرکت عہد شکنی سمجھی گئی۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے اس نے ملکہ کی استدعا قبول کر لی اور شہزادہ کو جیمز سوم شاہ انگلستان کے نام سے خطاب کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کی پارلیمنٹ جو اب تک ولیم سوم کی مرضی کے مطابق لڑائی میں شریک ہونے پر رضامند نہ تھی اب فوج کشی کی ضرورت کی قائل ہو گئی اور اس نے حسب ضرورت سپاہی اور روپیہ دینے کی منظوری دیدی

ہالینڈ کو اشتعال

اور انگلستان کو

ولیم سوم کا آخری کارنامہ اور اس کی زندگی سب سے بڑا کام یہ تھا کہ فرانس کے خلاف اس نے پھر اتحادِ اعظم قائم کر دیا فوج کشی سے پہلے ہی وہ مر گیا۔ لیکن تدبر و سپہ گری میں ڈیوک آف مارلبرا (Duke of Marlborough) اس کا جانشین ہوا اور ان امور میں اس نے خود کو اپنے آقائے نامدار سے بھی بڑھ کر ثابت کر دیا گو تدین اور حسن اخلاق میں اس سے کم رتبہ رکھتا تھا۔

ہسپانوی وراثت کی جنگ

اس طور پر لڑائی شروع ہو گئی۔ اسپین اور بیویریا (Bavaria) کی رفاقت سے فرانس مضبوط نظر آتا تھا۔ اور بیویریا نے تو واقعی میں بہت مدد دی لیکن اسپین باوجودیکہ اس قدر وسیع الرقبہ تھا اور اس کی رعایا میں اعلیٰ فوجی اوصاف تھے کچھ بھی مدد نہ کر سکا اصل میں اسپین کا شیرازہ ہی بکھر گیا تھا۔ نظم و نسق اور اس کی حکومت بالکل ناقص تھی۔ فرانس اور ہسپانیہ کا ساتھ ایسا ہی تھا جیسا کہ ایک زندہ جسم کے ساتھ ایک نقش بندھی ہو۔ دوسری جانب یورپ کی تمام بڑی سلطنتیں انگلستان ہالینڈ۔ سلطنت (آسٹریا) اور ولایت برینڈنبرگ جس نے ۱۷۰۱ء میں سلطنت پر اشیا (Prussia) کا لقب اختیار کر لیا تھا شریک تھیں اور بڑی بات یہ تھی کہ یہ اتحاد اختلاف مقاصد اور شرکاء کے باہمی جھگڑوں سے محفوظ رہا جس میں کہ اکثر اتحادی مبتلا رہتے تھے۔ انگلستان نے فوجی امداد تو سب سے زیادہ نہیں دی لیکن رقمی امداد اس نے سب سے بڑھ کر دی اور انگلستان کے فرستادہ مارلبرا اور شہنشاہ کے فرستادہ

مارلبرا (Marlborough) اور یوجین (Eugene)

یوجین میں گہری دوستی اور بڑی موافقت بھی رہی اور تمام دوران جنگ میں ہالینڈ کے گرانڈ پنشنری "ہائن سی" (Heinsius Grand Pensionary) اس کے ساتھ ان دونوں نے پوری طرح مل جل کر کام کیا۔ بمقابلہ فرانس کے ان اتحادیوں میں زیادہ اتفاق تھا حالانکہ اسپین کا تاجدار فرانس کے بادشاہ کا پوتا تھا۔ اب جو لڑائی شروع ہوئی

اس کا اثر بہت وسیع رہا یورپ کی جنگ کو اتنی سلطنتوں اور ممالک سے تعلق نہیں رہا ہے

روس و سویڈن کی لڑائی ۔

یہ لڑائی وراثت اسپین کی جنگ کے نام سے مشہور ہے ایک زمانہ میں اسکا سلسلہ ایک دوسری لڑائی سے جا ملا تھا جو مشرقی یورپ میں ہو رہی تھی اور جس میں سویڈن کی سلطنت پر روس ۔ پولینڈ اور جرمن مملکتوں نے فوجکشی کر دی تھی اس کا تذکرہ آئندہ باب میں آئے گا یہاں پر ہم صرف اس لڑائی کے نتائج بیان کر دیں گے جو مغربی یورپ میں ہو رہی تھی ۔

اس جنگ کو چار حلقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک تو نیدر لینڈز تھا جہاں کے ہسپانوی مقبوضات پر ڈچ اور انگریز حملہ کر رہے تھے دوسرے اٹلی میں آسٹریا والے فرانسیسیوں اور اسپین والوں کو میلان (Milan) سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ تیسرے بویریا (Bavaria) تھا جو شروع جنگ میں اصل

جنگ کے خاص خاص محاذ ۔

لڑائی کا مرکز تھا اور جب تک وہاں فرانس و بویریا والوں کی فوج رہتی اسوقت تک آسٹریا والوں کے لئے ناممکن تھا کہ کافی تعداد میں آکر مارلبرا کی امداد کر سکیں اور اس میدان کارزار میں اکثر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ فرانس کو قطعی فتح حاصل ہو جائے ۔ چوتھا عرصۂ جنگ اسپین تھا جہاں لڑائی کی حالت ہمیشہ بدلتی رہی اور آخرکار ایسے انجام کو پہنچی جسکی توقع نہ تھی ایک پانچواں حلقہ بھی شامل کر لینا چاہیئے کیونکہ جب فرانس کی فوجیں ان لڑائیوں میں مصروف تھیں تو سیوینز کے (Cevennes) علاقہ کے لوگوں نے شدید بغاوت کر دی اور اسوقت ایسا معلوم ہونے لگا کہ فرانس اس شورش کو فرو نہ کر سکیگا۔

اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس جنگ کی رفتار اور وہ لڑائیاں جن میں فرانس و انگلستان نے شہرت حاصل کی بیان کیجا سکیں ۔ ہم صرف اس لڑائی کے خاص خاص حصے بتلا دیں گے اور اس کے آخری انجام کے اسباب۔

سنہ ۱۷۰۴ء میں جنگ بلن ہیم (Blenheim) نے اس لڑائی کو دو حصوں میں منقسم کر دیا اس لڑائی تک فرانس کی قسمت نہیں پھری تھی لیکن اسوقت مارلبرا نے نہایت حکمت سے اپنی فتحیاب فوج کو شہزادہ یوجین (Eugene) کی فوج سے ملا لیا ۔ اور دونوں نے ملکر فرانس کو ایسی زبردست شکست دی جسکی نظیر فرانس کی تاریخ میں نہیں ہے ۔ اسوقت سے بویریا میں لڑائی

رُک گئی۔ اور اب صرف بقیہ حلقوں میں جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے لڑائی ہوتی رہی اور ایک عرصہ تک لڑائی کا چڑھاؤ اُتار متحدین کے موافق ہی رہا۔ مالبراکی فوج نے ہسپانوی نیدرلینڈز کو تاخت و تاراج کردیا۔ اور اٹلی سے بھی

اٹلی اور نیدرلینڈز کا فرانس کے قبضہ سے نکل جانا۔

فرانسیسی نکال دئے گئے۔ اسپین میں بھی فرانس اور اسکے رفیقوں پر یہی مصائب گذرے ۱۷۰۴ء میں جبل الطارق (Gibralter) انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد آسٹریا کا آرچ ڈیوک میڈرڈ (Madrid) میں بھی داخل ہوگیا اور اس نے چارلز سوم (Charles III) شاہ اسپین کا لقب اختیار کرلیا۔

اب ایسا معلوم ہوتے لگا کہ انجام کار فرانس بالکل ہی عاجز و مجبور ہوکر رہیگا لیکن دو وجہ سے فرانس اس نوبت پر پہنچنے سے بچ گیا۔ اولاً تو اسپین کا قومی جذبہ جوش میں آیا جیسا کہ نازک حالتوں میں اکثر ہوا تھا۔ اور باوجودیکہ فرانسیسی اب اس قابل نہ تھے کہ کوئی مدد کرسکیں لیکن اسپین والوں نے خود اپنے بل بوتے پر اپنا کھویا

اسپین کی بیداری

ہوا ملک حاصل کرلیا اور اتحادیوں کو شکست دیکر فلپ پنجم کو فاتحانہ میڈرڈ لے آئے انھوں نے اپنے دشمن کو جنوب میں جبل الطارق (Gibralter) اور مشرق میں بارسلونا (Barcelona) کے سوا سب مقامات سے نکال باہر کیا۔ دوسرا سبب جس سے فرانس کو فائدہ پہنچا خود اتحادیوں

اتحادیوں کا غرور

کا غرور اور خود اعتمادی تھی۔ ۱۷۰۹ء میں جب لوئی چہاردہم نے صلح کے شرایط پیش کرنیکی درخواست کی تو ایسی شرایط پیش کی گئیں جو تباہ کن اور بے حد ذلیل تھیں۔ اور باوجودیکہ ملک کی قوت بالکل صرف ہوچکی تھی لوئی چہاردہم نے بھی لڑائی جاری رکھنے کا عزم کرلیا اور اسوقت سے فرانس کی حالت سنبھلنے لگی گو شکستیں اب بھی اسکو ہوتی رہیں۔ علاوہ اسکے ۱۷۱۰ء میں انگلستان میں ایک تغیر ہوا جو فرانس کو تباہی سے بچانے کا بہت بڑا سبب ہوا۔ شروع سے یہ جنگ وھگ (Whig) فرقہ کی رائے سے ہوئی تھی اور ٹوری Tory

انگلستان میں ٹوری فرقہ کی فتح۔

فرقہ ہمیشہ سے صلح کا خواہاں تھا۔ وھگ فرقہ کے مخالفین کیطرف خود ملکہ کا رجحان ہونے سے اور نیز اس لڑائی کے اخراجات و نقصانات سے نیز مذہبی

مناقشات کیوجہ سے وھگ جماعت کمزور ہوگئی۔ ملکہ اور اس کی محبوب نظر بیگم مارلبرا (Lady Marlbrough) میں جھگڑا ہو جانے سے وھگ فرقہ معزول ہوگیا اور ٹوری فرقہ نے برسر اقتدار ہوتے ہی صلح کی بات چیت شروع کردی اور شاہ فرانس کے سامنے ایسی شرایط پیش کی گئیں کہ اس کو کبھی توقع بھی نہ تھی۔ اور شہزادہ یوجین

صلح یوٹرے (Utrecht)

ڈیوک آف مارلبرا کے اصرار کے باوجود انگلستان بہت جلد اس جنگ سے کنارہ کش ہوگیا۔ اب تنہا آسٹریا والوں کو فرانسیسیوں نے ڈینین (Denian) کی لڑائی میں سخت شکست دی اور آخرکار مصالحت ہوگئی۔ برطانیہ عظمےٰ سے فرانس نے ۱۷۱۳ء میں بمقام یوٹرے (Utrecht) صلح کی اور آسٹریا سے ۱۷۱۴ء میں بمقام ریسٹاٹ (Rastadt)۔

اسپین کے نقصانات

اس صلح کے خاص شرایط یہ تھے۔ فلپ پنجم اسپین کا بادشاہ مان لیا گیا۔ لیکن اس وعدہ کے ساتھ کہ فرانس اور اسپین دونوں علحدہ علحدہ دو سلطنتیں رہیں۔ اسپین کے مقبوضات میں البتہ بہت کمی ہوگئی۔ نیدرلینڈز (Nehtherlands) میلان (Milan) نیپلس (Naples) اور سارڈینیا (Sardinia) آسٹریا کو مل گئے۔ انگلستان نے جبل الطارق (Gibralter) اور مینارکا (Minorca) کا بندرگاہ میہن (Mahon) سے لیا۔ سسلی (Sicily) سیوائے Savoy کی مملکت میں شامل کردیا گیا۔ لیکن اسپین کے قومی جذبہ کو اس بات سے بہت تسلی تھی کہ اس نے اپنی تنہا قوت سے اپنی مرضی کا حکمران اپنے تخت پر قائم رکھا۔ فرانس کو اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا کہ ایک وقت خیال کیا گیا تھا۔ انگلستان میں

فرانس کی حالت میں تغیر

پروٹسٹنٹ تاجداری تسلیم کرلیگئی اور فرانس سے دو جھوٹے مدعی کو نکالدیا گیا۔ فرانس سے نیوفاؤنڈلینڈ (Newfoundland) خلیج ہڈسن (Hudson Bay) اور نوواسکاشیا (Nova Scotia) کے مقبوضات انگلستان کو ملنا بہت مفید ثابت ہوا گو اسوقت اسکی اہمیت ظاہر نہیں ہوئی۔ آسٹریا اور ہالینڈ کو فرانس سے جو کچھ ملا وہ نسبتاً کم تھا۔ اس جنگ کا سب سے اہم نتیجہ فرانس کے لئے ان مقبوضات کا نقصان نہیں تھا گو پشت مابعد میں اسکا بہت بڑا اثر پڑا بلکہ اصل نقصان یہ ہوا کہ اس جنگ کی بدولت فرانس بالکل چور چور ہوگیا اس کی مالی حالت

بالکل ابتر ہوگئی اور قرضہ کا بار بہت بڑھگیا اور پھر یورپ میں اسکی ساکھ بھی جاتی رہی گو بالکل تو نہیں جاتی رہی اور تاج کیساتھ رعایا کی وفاداری بھی متنزل ہوگئی اور اور بہت سے امور میں تو قطعی بے اعتباری ہوگئی۔ اس لڑائی کے دوران میں پہلے پہل بادشاہ کے طرز عمل کی کھلم کھلا مخالفت کی گئی۔ ان معترضین میں خاص طور پر فینلان (Fenelon) اور وو بون (Vaubon) ممتاز تھے۔ فینلان فرانسیسی کلیسہ کا قابل ترین نمایندہ تھا۔ واوبن کی انجنیری اور سپہگری کا ذکر تو پہلے ہی آچکا ہے ان لوگوں نے مختلف طور پر علانیہ بادشاہ کے اعمال پر نکتہ چینی کی۔ واوبن نے ملک کے خوفناک افلاس کی طرف توجہ دلاکر سب پر مساویانہ طور پر محصول عائد کرنے اور پروٹسٹنٹ لوگوں کو ان کے سابقہ شہری حقوق عطا کرنے کی تجویز پیش کی فینلان تو ہمیشہ سے بادشاہ کی مطلق العنانی کا مخالف تھا اب اس نے اعلان کر دیا کہ بادشاہ کے طرز عمل نے فرانس کو تہی دست و مفلس بنا دیا ہے اور بادشاہ نے رعایا کے کل طبقوں کو تباہ کرکے اپنے تخت کی عمارت کھڑی کی ہے۔

لوئی چہاردہم کے بڑھاپے کے غمناک حالات۔

اس جنگ کے اختتام کے وقت لوئی چہاردہم بہت بڈھا ہوگیا تھا اور مسلسل یکے بعد دیگرے داخلی و خارجی مصیبتیں اس پر پڑتی رہیں۔ اس کی وراثت تو فیصل شدہ تھی لیکن اس زمانہ میں اس کا بڑا بیٹا مرگیا اور اس کے بعد ہی اس کے پوتے اور پڑپوتے کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب تخت کا وارث ایک دو سالہ بچہ رہ گیا تھا اور اگر اس کا بھی انتقال ہو جاتا تو وراثت کا مسئلہ جھگڑے میں پڑ جاتا اور اگر زندہ بھی رہتا تو ایک عرصہ تک کسی مدارالمہام کی ضرورت ہوتی اسی لئے لوئی چہاردہم آخری زمانہ میں

مجلس مدارالمہامی

مدارالمہامی کے لئے ایک کونسل مقرر کرنے میں مصروف رہا تاکہ اس کے بعد یہ کونسل حکومت کرسکے۔ سب سے بڑی خواہش اس کی یہ تھی کہ اس کا چچیرا بھائی ڈیوک آف آرلینس (Duke of Orleans) برسر حکومت نہ آسکے کیونکہ اس کے سیاسی خیالات سے لوئی کو خوف تھا اور اس کے مذہبی عقائد کو وہ نفرت سے دیکھتا تھا۔ اپنی آخری وصیت میں اس نے مدارالمہامی کے لئے ایک کونسل مقرر کی جس کے ارکین خود اس کے ولدالحرام بیٹے مقرر ہوئے البتہ صدارت

ڈیوک آف آرلینس (Duke of Orleans) کو دی گئی۔ اس طور پر اس نے توقع کی تھی کہ اس کی وفات کے بعد بھی (جو ۱۷۱۵ء میں واقع ہوئی) اسی کا طرز حکومت قائم رہے گا۔

یورپ کی تاریخ میں اس کی وفات ایک اہم واقعہ ہے۔ تقریباً ایک صدی سے یورپی تہذیب و تمدن کا فرانس ہی رہبر و پیشوا بنا رہا۔ اور تمام سلطنتیں صلح و جنگ نیز حکمرانی میں اس کی تقلید و تتبع کرتی رہیں۔ گذشتہ جنگ کی مالی تباہی اور بعد کی نااہلی حکومت کی وجہ سے فرانس اس بلند مرتبہ سے بہت جلد گر گیا اور دوسرے مجاہدین کے لئے یورپ کا اکھاڑہ اس نے خالی کر دیا۔

حوالۂ کتب متعلقۂ باب ہذا:-

تاریخ فرانس مولفۂ لیوس (Lewisse) جلد ہفتم و ہشتم تذکرہ سینٹ سائمن (St. Simon's Memoirs) "لوئی چہار دہم" از ہسیل (Hassal) وتخت کی وراثت کی جنگ پر میکالے (Macaulay) کا زوردار مضمون۔

باب دہم

انگلستان و برطانیہ عظمیٰ سترھویں صدی میں

(۱)

سترھویں صدی میں یورپ کی خاص خاص سلطنتوں کی تاریخ ہم نے بیان کردی ہے اس باب میں انگلستان کی سترھویں صدی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے گی اور اس خاکے میں ہم جارج اول کی تخت نشینی ۱۷۱۴ء تک کے حالات قلمبند کردیں گے۔ کیونکہ ۱۷۰۲ء میں ملکہ این (Anne) کی تخت نشینی سے زیادہ جارج اول کی تخت نشینی ہماری تاریخ میں ایک امتیازی واقعہ ہے۔

سترھویں صدی میں برطانیہ کی بے تعلقی۔

یہ ہم نے بتلا دیا ہے کہ سولھویں صدی میں ہمارے جزیرہ کی تاریخ خاص خاص امور میں مغربی یورپ کی سلطنتوں سے بہت مشابہت رکھتی تھی مثلاً نیابتی حکومتوں پر شہنشاہیت کا غلبہ۔ مذہبی مناقشات اور تمناؤں کا اثر۔ اور احیاء علوم میں خاص طور پر حصہ لینا۔ لیکن سترھویں صدی میں انگلستان و برطانیہ عظمیٰ کی تاریخ مغربی یورپ کی دول سے بالکل مختلف ہے اور بہت سی خصوصیات ایسی ہیں جنکی نظیر دوسرے ممالک میں نہیں ملتی حالانکہ بقیہ یورپ سے تعلقات ویسے ہی قائم رہی اور پورے عہد اسٹوارٹ میں فرانس کی حکومت کی تمثیل کا اثر بھی انگلستان کی حکومت پر گہرا اور خطرناک رہا۔ اسٹریفرڈ (Strafford) نے چارلس اول کیلئے وہی سب کرنا چاہا جو ریشلیو نے لوئی سیزدہم کے لئے کیا تھا اور جب

پیورتن (Puritan) شورش کے بعد عود شاہی کی بدولت چارلس دوم تخت نشین ہوا تو وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ہر حکمراں کو حکومت کا وہی نمونہ قائم کرنا چاہیے جو فرانس میں تھا اور مذہب وسیاست دونوں میں وہ اسی نمونہ کی تقلید کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ۱۶۸۸ء کے انقلاب ۱۶۸۸ء کے انقلاب نے ان خیالات کو خاک میں ملادیا۔ یورپ کی اہمیت۔

کی سیاسی زندگی میں پارلیمنٹ کی اس فتح (انقلاب) کا خاص حصہ ہے۔ ۱۶۸۸ء کے اوائل میں اگر ہم ایک نظر یورپ پر ڈالیں تو عام رجحان پارلیمنٹی اداروں کے خلاف اور شخصی حکومت کے مرکزی نظم ونسق کے موافق پایا جاتا ہے ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ رعایا کو حکومت کے معاملات میں شریک کرلینے سے سلطنت کی تقویت زائل ہوجاتی ہے ۱۶۸۸ء میں انگلستانی پارلیمنٹ کی فتح اور مابعد کی صدی میں اس کی جنگی تجارتی۔ مالیاتی کامیابیوں نے نیز نوآبادیات کے معاملہ میں اس طرز حکومت کی کامیابی نے یورپ کی تاریخ میں ایک نیا رجحان پیدا کردیا۔ اور پھر مدبرین واصول قائم کرنے والوں میں سیاسی آزادی کا دور دورہ شروع ہوگیا۔

جیمز اول۔

۱۶۰۳ء میں جب انگلستان میں جیمز اول تخت نشین ہوا تو ملکہ الزابتھ کے طرز حکومت میں تغیر وتبدل ہونے کا یقین تھا۔ کیونکہ ٹیوڈر (Tudor) لوگوں کا طرز حکومت غیر محسوس طریقہ پر محض اس وجہ سے اختیار کیا گیا تھا کہ داخلی وخارجی خطرات کا دفعیہ ہوسکے اور جب یہ خطرات دفع ہوگئے تو پھر اس طرز حکومت میں تغیر ہونا لازمی تھا۔ لیکن جیمز اول کے رویہ کی وجہ سے یہ تغیر بہت جلد اور خطرناک واقع ہوا جیمز اول ملکہ الزابتھ کا بالکل ضد تھا۔ اس میں ملکہ کی سی احتیاط و دانشمندی نہ تھی۔ نہ یورپ کی سیاسی حالت سے وہ اتنا واقف تھا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ملکۂ الزابتھ ملک کی نیابت کرتی تھی برخلاف اس کے جیمز اول نے مذہبی وسیاسی معاملات میں انانیت پسندی اختیار کی۔ بادشاہوں کے "خدائی حقوق" کا وہ بڑا قایل تھا۔ سولھوی صدی میں تو اس نامبارک فقرہ کے یہ معنے لئے جاتے تھے کہ دنیاوی سلطنت جن کی نمایندگی بادشاہ یا حکمراں کرتا تھا بغیر کلیسہ کی تائید کے قائم رہ سکتی تھی۔ ابتدائً یہ عقیدہ پروٹسٹنٹ لوگوں سے مخصوص تھا

لیکن سترھویں صدی میں اس فقرے کے معنی بالکل بدل گئے - جیسا کہ اکثر فقروں کے معنی بدلتے رہتے ہیں اور اس فقرہ کا یہ مطلب لیا جانے لگا کہ بادشاہ کی ذات

بادشاہوں کے خداداد حقوق

تقدس مآب ہوتی ہے اور خدا کی مرضی جس طرح انجیل میں ظاہر ہوئی تھی بادشاہوں کی مطلق العنانی کی تائید کرتی ہے اور ان کے شاہی حقوق و اختیارات میں مداخلت کو ناجائز قرار دیتی ہے اور یہ کہ بادشاہ خاص معنوں میں آدم کا جانشین ہوتا ہے اس لئے تمام دنیا پر حکومت کرنے کا اُسے حق ہے - دوسرے ممالک میں بھی یہ مسئلہ معلوم تھا مگر انگلستان میں جس بلند آہنگی سے اس کا چرچا اٹھا اور کہیں ایسا نہیں ہوا پارلیمنٹ

پارلیمنٹ سترھویں صدی میں -

بھی ایک جوش حیات سے لبریز تھی - سولھویں صدی میں اگر انگلستان اور فرانس کا ہم مقابلہ کریں تو ایک سطحی تشابہ تو ضرور معلوم ہوگا لیکن تخالف اس سے زیادہ نمایاں تھا - ۱۶۶۰ء یا اس کے قریب کے زمانہ میں ایک سرسری نظر والا یہ کہ سکتا تھا کہ فرانس میں اسٹیٹس جنرل کا اثر بمقابلہ انگلستان کے پارلیمنٹ کے اثر کے زیادہ رہیگا لیکن یہ رائے بالکل سرسری وسطحی ہوتی کیونکہ اسٹیٹس جنرل (States-General) گو دعوی بہت

فرانس کی مجلس اسٹیٹس جنرل اور انگریزی پارلیمنٹ

لمبا چوڑا کرتی تھی - لیکن اس کے اختیارات ایسے ہی ہوتے تھے جیسے کہ حکومت وقت کی کمزوری سے وہ حاصل کر سکے - اور جب کبھی حکومت وقت قوی ہوتی تھی وہ اسکی پرواہ بھی نہیں کرتی تھی اور اُس کو علحدہ کر دیتی تھی چنانچہ ۱۶۱۴ء میں اسی طرح یہ معدوم کردیگئی اور پھر صرف ایک مرتبہ انقلاب کے زلزلہ خیز زمانے میں نمودار ہوئی - اور جب اسٹیٹس جنرل کی جڑ اتنی کمزور تھی تو پارلیمنٹ پیرس (Paris) کے لئے آزادی کا دم بھرنا دشوار تھا - قانون پیشہ لوگوں نے آزادی کے حق میں بہت کچھ کیا ہے مگر یہ لوگ اس لفظ کو تنگ اور یک طرفہ معنی پہنانے کے عادی ہیں - اور پارلیمنٹ پیرس (Paris) اگر اس سے زیادہ روشن خیال ہوتی تو بھی اُسے ایسے دستوری اختیارات حاصل نہ تھے کہ وہ حکومت پر کوئی روک قائم کر سکتی چہ جائیکہ حکومت کی مخالفت لیکن انگلستان کی پارلیمنٹ انگلستان کے

پارلیمنٹ انگلستان کی قوت۔

امور ملکی میں صدیوں سے نمایاں طور پر حصہ لے رہی تھی۔اس کے اختیارات کی تعیین تو نہیں ہوئی تھی نہ اس کے متعلق کوئی نظریہ یا اصول قائم ہوا تھا لیکن عہد ٹوڈر (Tudor) میں بھی اس کو نیست ونابود کر دینے کا خیال نہیں ہو سکا۔جب کبھی شخصی حکومت کمزور و بدنام ہوتی اور خارجی خطروں سے ملک محفوظ ہوتا تو پارلیمنٹ اپنا قدم آگے بڑھاتی تھی۔اور ملکی معاملات میں "من ہم چیزے ہستم" کی مصداق دخل دیتی تھی حتیٰ کہ انجام کار کُل اختیارات کا خود کو ہی منبع قرار دیدیا۔علاوہ اس کے انگلستان میں یہ بھی ممکن نہ تھا کہ مخالف گروہ فوجی امداد سے پارلیمنٹ کو زیر کرلے۔کیونکہ سمندر کی وجہ سے یہاں کبھی مستقل فوج قائم ہی نہ رہی۔اس طور پر گویا سمندر نے ہماری آزادی کو بچا لیا۔

شاہی اقتدار پر مذہب کا اثر۔

مذہب نے بھی بادشاہ اور پارلیمنٹ کی مخالفت کو زیادہ کر دیا ایلزابتھ اور ہنری ہشتم نے جو کلیسہ (مذہب) قائم کیا تھا وہ بہتوں کے نزدیک ایک درمیانی منزل تھا بعض ایسے تھے جو عہد ماقبل کے سے رسم رواج کی پابندی کرنا چاہتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو جنیوا (Geneva) کے عقاید کو کنٹربری (Canterbury) میں رواج دینا چاہتے تھے اور پرسبٹیرین (Presbytarian) طریقہ کو اپیسکوپل (Episcopal) (جس میں پادریوں کی حکومت ہوتی تھی) طریقہ سے بہتر سمجھتے تھے۔

جیمز اول اور پارلیمنٹ۔

اس جدوجہد کی تیاریاں جیمز اول کے عہد میں ہونے لگیں۔پارلیمنٹ بخلاف مرضی بادشاہ خود کو محاصل عاید کرنے کا مجاز قرار دینے لگی۔اور امور مملکت میں بادشاہ کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرنے لگی جیمز نے ان اعتراضات کی تردید میں شایان شان طریقہ نہیں اختیار کیا اور نہ دور اندیشی و مصلحت ہی سے کام لیا۔اور اسوجہ سے مرنے کے بعد اپنے بیٹے چارلز اول (Charles I) کے ذمہ ایک کٹھن کام چھوڑ گیا فرانس کی تاریخ اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے انگلستان ہی اس جھگڑے کی ایک اور خصوصیت ہم تبلا دیتے ہیں اور وہ انگلستان کی حکومت کے خارجی طرز عمل کی

ناکامی تھی۔ انگلستان کے تاجداروں نے بعض اوقات یہ سوچا ہوگا کہ انگلستان میں بھی اسی نمونہ کی حکومت کیوں قائم کی جائے جیسی کہ فرانس میں تھی۔ اس کا ایک جواب جو شاید سب سے اہم تو نہیں یہ ہے کہ انگلستان کے خارجی طرزعمل میں

خارجی طرزعمل کا اثر آئین پر۔

ان لوگوں نے کوئی شان یا کامیابی حاصل نہیں کی۔ ریشلیو اور مزارین نے فرانس کو یورپ کا پنچ بنادیا تھا برخلاف اس کے انگلستان کے پہلے دو اسٹوارٹ (Stuart) حکمرانوں نے غیر قوموں کی نظر میں انگلستان کو مضحکہ خیز بنادیا۔ اسپین نے اسے شکست دی اور ذلیل کیا اور فرانس نے پھر بار ہرایا اور مات دی۔ انگلستان کی دستوری حکومت اور اس کے خارجی طرزعمل میں ایسا گہرا تعلق نہیں رہا جیسا کہ دوسرے ممالک میں تھا مگر یہ تعلق اہمیت ضرور رکھتا تھا۔

چارلز اول۔

جب چارلز اول کو پہلی پارلیمنٹ سے سامنا ہوا تو اسپین اور فرانس سے جنگ میں ناکامی اور بدنام ڈیوک آف بکنگھم کی طرفداری کی وجہ سے وہ ناقابل اعتبار ٹھہرایا گیا پہلی دو پارلیمنٹیں غصہ میں برخاست کردی گئیں لیکن ہیوگوناٹ (Heugonot) لوگوں کی طرفداری میں راچیلی (Rachelli) کو مہم بھیجنے کی اسے فکر تھی۔ اس لئے اس نے ایک تیسری پارلیمنٹ منعقد کی۔ محاصرۂ راچیلی (Rachelli) فرانس و انگلستان دونوں کی تاریخ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی بدولت ریشلیو (Richelun) کا سکہ بیٹھ گیا اور انگلستان کے بادشاہوں کے لئے یہ مہلک ثابت ہوا بادشاہوں کی مالی ضرورتوں کی وجہ سے اکثر پارلیمنٹ کو اپنے اختیارات اور رعایا کی آزادی حاصل کرنے میں سہولت ہوتی تھی ایسی صورت ۱۶۲۸ء میں مجبوراً چارلز اول کو (Petition of Rights) "عرضداشت حقوق"

عرضداشت حقوق یا (Petition of Rights) درخواست

منظور کرنا پڑا جس میں یہ درج تھا کہ بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے محصول عاید نہیں کیا جاسکتا۔ اور کوئی انگریز بلاسبب و بلا تحقیقات قید نہیں کیا جاسکتا اور نہ سپاہی و ملاح بغیر مالک مکان کی اجازت کے اس کے گھر میں ٹھہرائے جاسکتے انگلستان کی آزادی کا یہ زبردست

دستاویز تھا۔ لیکن اسپر بھی بادشاہ اور پارلیمنٹ کی باہمی مخالفت کا خاتمہ نہیں ہوا۔ اور تھوڑے دنوں میں یہ پارلیمنٹ بھی مثل سابقہ پارلیمنٹوں کے برخاست کردی گئی۔ ۱۶۲۹ء سے ۱۶۴۰ء تک گیارہ سال کا عرصہ گزر گیا۔ اور اس درمیان میں چارلس اول اپنے نائب وینٹ ورتھ (Wentworth) کی امداد سے جو بعد میں ارل اسٹریفرڈ (Earl Strafford) کے نام سے مشہور ہوا بغیر پارلیمنٹ کے حکومت کرتا رہا۔ اور انگلستان کی حکومت کو فرانس کے نمونہ پر لانے کی کوشش کرتا رہا امن کے زمانہ میں ملک کے اخراجات پورا کرنے کے لئے آمدنی کے ذرائع بھی نکالے گئے۔ اور جب ناظم عدالت نے یہ فیصلہ کردیا کہ جہاز سازی کے لئے جب اور جس قدر روپیہ بادشاہ چاہے وصول کرسکتا ہے تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ شاہ انگلستان کو فرانس کی سی مطلق العنانی حاصل ہوگئی۔ اگر نظائے عدالت کی یہی رائے قائم رہتی تو انگلستان میں اس کا وہی اثر ہوتا۔ جو فرانس میں ۱۴۳۹ء کے دوفوجی قانون ،، کا ہوا۔ اور پھر بھلا اس کی تنسیخ کس طرح ممکن تھی۔ اگر مخالفت کی جاتی تو جو فوج وینٹ ورتھ (Wentworth) نے آئرلینڈ میں جمع کر رکھی تھی وہ اس کو دبا دینے کے لئے کافی تھی۔

بغیر پارلیمنٹ کے یازدہ سالہ حکومت

(۲)

لاڈ (Laud) اور انگلیسی کلیسہ۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذہبی جوش و تعصب سیاسی اغراض کے ساتھ شامل نہ ہوا ہوتا تو کیا چارلز اول مغلوب ہوسکتا تھا؟ بہرحال اسی مذہبی جوش نے کام تمام کردیا۔ بادشاہ نے لاڈ Laud کی تائید میں جو ۱۶۳۳ء میں کنٹربری (Canterbury) کا اسقف اعلے مقرر ہوا تھا انگلیسی کلیسہ کو وہ رسومات و تبرکات بحال کردیے جیسے پیورٹن Puritan لوگ باقیات روما سمجھتے تھے۔ اس کے بعد اس نے اسکاٹلینڈ کے کلیسہ کے لئے بھی ایساہی کرنا چاہا۔ اسقفوں کا تقرر تو جیمز اول ہی کے زمانہ میں ہوگیا تھا۔ اب اسی قسم کی ایک کتاب صلواۃ عام جیسی انگلستان میں رائج تھی وہاں بھی اس نے جاری کرنا چاہا۔ پرسبیٹیرین (Presbytarian) لوگوں نے اسکو

بت پرستی اور پاپائیت پسندی کے برابر قرار دیکر اس کی مخالفت شروع کردی۔ اس شکایت نے بشمول دیگر شکایات دینوی ایک شورش برپا کردی۔ جو اسکاٹلینڈ کے اسقفوں کی

اسکاٹلینڈ کے اسقفوں کی لڑائی اور طویل پارلیمنٹ کا انعقاد

جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ بس فوراً ہی چارلس اول کی مجوزہ تدابیر الٹ گئیں اُس کی یازدہ سالہ حکومت صرف امن کے زمانہ میں کارگر تھی یا لڑائی کی صورت میں اکثر برابر کامیابی ہوتی رہتی۔ اور اب تو جنگ ناکامی کے ساتھ شروع ہوگئی۔ پھر ان اخراجات کی پابجائی کہاں سے ہوتی۔ لامحالہ بادشاہ کو پارلیمنٹ منعقد کرنی پڑی۔ چنانچہ ۱۶۴۰ء میں اس نے بھی ایک پارلیمنٹ منعقد کی جو طویل پارلیمنٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اور غالباً تمام پارلیمنٹی مجالس سے زیادہ ممتاز اور اہم سمجھی جاتی ہے بشرطیکہ ۱۷۹۲ء کی فرانسیسی کان ونیشن (Convention) (مجلس) کو اس کا ہم پلہ نہ سمجھا جائے۔

پیوریٹن (Puritan) شورش اور سی سالہ جنگ کا مقابلہ۔

۱۶۴۰ء سے ۱۶۶۰ء تک کا زمانہ زیادہ دلچسپی اور توجہ کا باعث سمجھا گیا ہے اور اس عہد کے متعلق جتنی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں شاید کسی دوسرے عہد کے متعلق نہیں ہوئی ہیں لیکن ہم یہاں اس زمانہ کا ایک خاکہ بھی پیش نہیں کرسکتے البتہ اس خانہ جنگی جسکو اصلی انگلستانی انقلاب کہنا چاہیئے اور اسی زمانہ کی فرانس وجرمنی کی خانہ جنگیوں میں جو فرق ہے اس کو چند الفاظ میں بتلا دیا جاتا ہے پیوریٹن شورش اور جرمنی کی جنگ سی سالہ میں کچھ زیادہ مماثلت نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ دونوں میں مذہبی و سیاسی اسباب مشترک ہوگئے تھے۔ آیرستان (آیرلینڈ) کا قصہ تو مختلف ہے لیکن انگلستان میں یہ لڑائی ناشایستہ یا وحشیانہ انداز میں نہیں ہوی۔ جان و مال کا نقصان بھی زیادہ نہیں ہوا علاوہ اس کے خود مبارزین کو معاملہ نزاعی میں غرض و دلچسپی تھی۔ اس لئے ان کو اجارہ دار نہیں کہا جاسکتا اس جزیرہ کے لوگوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ خود ہی کرلیا اور غیر قوموں کی کوئی مداخلت نہیں ہوی نہ غیر ملک کی فوج ہمارے ساحل پر کبھی اُتری۔ جنگ سی سالہ میں مغربی یوروپ کی تمام سلطنتیں شریک تھیں لیکن پیوریٹن بغاوت کا تعلق صرف انگلستان۔ آیرستان (آئرلینڈ)،

اور اسکاٹلینڈ سے ہی رہا۔

فرانس کی شورش فرونڈ (Fronde) سے البتہ اس دپیورٹن شورش، کو مشابہت ہے لیکن وہ بھی بہت زیادہ نہیں - فرانس میں بھی مذہبی غرض موجود تھی لیکن ژران سینی (Jansenism) تحریک جسکے زیر اثر پیرس کی بہت سی پارلیمنٹیں تھیں اتنی قومی اور وسیع الاثر نہ تھی جتنی کہ انگلستان کی پیورٹن تحریک دونوں شورشوں میں وہی فرق تھا۔ جو ژران سینی اور پیورٹن تحریک میں پیرس اور ویسٹ منسٹر (Westminister) کی پارلیمنٹ میں کیرامول (Cromwell) اور کانڈے (Conde) میں انگریزی اور فرانسیسی اعیانیت میں تھا۔

طویل پارلیمنٹ کی کامیابی - طویل پارلیمنٹ کے طرز عمل کی بدولت فوراً خانہ جنگی شروع ہوگئی پارلیمنٹ والوں نے ارل اسٹریفورڈ (Earl Straffod) کو پھانسی دیدی - اور رچارلس نے بھی اسی بچانے کی کوئی کوشش نہ کی - (اگر لوئی سیزدہم بھی اسیطرح رشیلیو کو اس کے مخالفین کے پنجے میں دیدیتا تو فرانس کی تاریخ پر کیا اثر پڑتا) اس کے بعد ان لوگوں نے بادشاہ کے مذہبی و ملکی طرز انتظام پر اعتراض کرنا شروع کیا پارلیمنٹ کے بڑے بڑے سرداروں کو گرفتار کراکے بادشاہ نے رعب ڈالنا چاہا مگر اس میں اُسے کامیابی نہوئی اور اس حرکت کو لوگوں نے اعلانِ جنگ سمجھ لیا - پہلے دو سال تک تو لڑائی برابر کی رہی لیکن اس کے بعد دو وجوہ سے پارلیمنٹ کو فتح مل گئی - ایک سبب تو یہ تھا کہ پارلیمنٹ نے اسکاٹلینڈ سے اتحاد قائم کرلیا۔ اس وجہ سے کہ انگلستان نے "اتحاد وارتباط کے معاہدہ" (Solemn League and Covenant) کو تسلیم و قبول کرلیا تھا اور اب اسکاٹلینڈ کی فوجیں پارلیمنٹ کی طرف سے لڑنے کے لئے انگلستان میں وارد ہوگئیں دوسرے یہ کہ کرامول اپنی نئے طرز کی فوج تیار کر رہا تھا - یہ فوج بالکل باقاعدہ تھی - اس کو تنخواہ بھی باقاعدہ دی جاتی تھی - اور قواعد وغیرہ کی خوب مشق کرائی جاتی تھی - اور ساز و سامان سے بھی خوب آراستہ تھی اور مذہبی جوش بھی اس میں اس قدر تھا کہ پرسبیٹرین سے بھی بڑھکر یہ فوج بالکل آزادی کی خواہاں تھی - ان وجوہات سے ۱۶۴۴ء میں چارلس کو مارسٹن مور (Marston moor) پر

شکست ہوئی اور ۱۶۴۵ء میں بمقام نیس لی (Naseli) اس کا قلع قمع ہوگیا۔

فوج کا پارلیمنٹ کے خلاف ہونا۔

جس فوج نے یہ سب کیا وہ کوئی معمولی فوج نہ تھی مذہبی و سیاسی معاملات میں وہ اپنا الگ اُصول رکھتی تھی۔ اور پارلیمنٹ کے حکم کی تعمیل سے اس نے قطعاً انکار کردیا اُس نے بادشاہ سے گفت و شنید شروع کی اور اگر بادشاہ اُسکے تجاویز کو قبول کرلیتا اور فوج کے سرداروں سے اتحاد کرلیتا تو شاید ممکن ہے کہ اس کو پھر تخت اور کچھ اقتدار حاصل ہوجاتا۔ لیکن وہ استحسانیت کا معتقد اور اپنے کمال تدبر و حکمت عملی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد رکھتا تھا اسکاٹلینڈ اور انگلستان کے فوجی سرداروں کے باہمی نفاق اور اختلاف سے اس نے فایدہ اٹھایا اور اسکاٹلینڈ والوں کو اپنی حمایت میں انگلستان پر حملہ کردینے کی ترغیب دی۔ اس واقعہ کے پہلے اُسکے قتل کا کوئی خیال بھی نہیں ہوا تھا۔ دستور حکومت پر اسکا پہلا حملہ نہیں بلکہ یہ دوسری خانہ جنگی اُسکے قتل کا باعث ہوئی کیونکہ ادھر تو فیرفیکس نے (Fairfax) اُس کے انگریز حامیوں کو کولچسٹر (Colchester) میں روک رکھا اور اُدھر کرامول (Cromwell) نے اسکاٹلینڈ والوں کو اور اُنکے انگریز ساتھیوں کو پرسٹن (Preston) میں پیس ڈالا اس کے بعد فوج فتح سے سرخرو اور قتل و خون کی عادی ہوکر لندن کی طرف بڑھی کہ "اس آدمی" چارلز اسٹوارٹ سے تصفیہ کرے۔ پارلیمنٹ کو فوج نے قابو میں کرلیا جو ارکین فوج کی رائے سے متفق نہ تھے وہ نکالدئے گئے۔ طویل پارلیمنٹ کے قلیل التعداد ارکین رہگئے جنکو

چارلز اول کا قتل۔

رمپ (Rump) (ٹھٹھا۔ پچھلا یا باقی حصّہ) کہتے ہیں۔ انہی لوگوں نے فوج کے حکم سے بادشاہ کے متعلق تحقیقات اور اُس کے قتل کے لئے ایک عدالت قائم کی (جنوری ۱۶۴۹ء)۔

(۳)

جمہوریت۔

اس کے بعد جمہوریت قائم ہوگئی جس کے مخالفین ہر طرف تھے۔ انگلستان کی بیشتر رعایا جمہوریت والوں کے خلاف تھی آئرلینڈ اور اسکاٹلینڈ بھی اسکے خلاف تھے۔ اسکا امکان بھی نہیں پایا جاتا تھا کہ یہ نئی حکومت گیارہ سال تک قائم رہ سکے گی

جیساکہ اس کی قسمت میں تھا فوجی اور انتظامی امور میں جمہوریت کی طرف کرامول ایک غیر معمولی قوت وقابلیت رکھتا تھا۔ اور وہ جوشیلا بھی تھا اور عملی بھی۔ پارسا بھی تھا

کرامول اور آئرلینڈ

اور پھر انگلستان کے مالیاتی و اقتصادی نفع نقصانات سے باخبر وہ حالات کیوجہ سے انقلاب پسند ہوگیا تھا مگر وہ حقیقت میں اتنا ہی قدامت پسند بھی تھا۔ آیرستان (آئرلینڈ) کی مخالفت تو اس نے فرو کردی لیکن اس کے مظالم اور رعایا کو ان کے زمینات سے جبراً و بلاوجہ بیدخل کردینے سے

کرامول اور اسکاٹلینڈ۔

آیرستان میں ایسی بدمزگی پھیل گئی اور اسکی حکومت میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں کہ انگلستان اب تک نہیں سلجھا سکا اسکاٹلینڈ کی طرف سے جمہوریت کو زیادہ خطرہ کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ ایڈن برگ (Edinburgh) میں چارلس دوم کو بادشاہ کا لقب دیا جاچکا تھا۔ اور تمام اسکاٹلینڈ باوجودیکہ ان کے آپس میں بہت سی باتوں میں اختلاف تھا فوج کی ان حرکتوں پر جو اس نے انگلستان میں کی تھیں یکساں متنفر تھا۔ لیکن جنگ کے شروع زمانہ میں اسکاٹلینڈ کو جو فوجی فوقیت حاصل تھی اب وہ انگلستان کو حاصل ہوگئی تھی۔ اسکاٹلینڈ کی فوج خلاف امید ۱۶۵۰ء میں بمقام ڈونبر (Dunbar) شکست کھاگئی۔ اور جب چارلس دوم نے انگلستان پر فوجکشی کی تو ورسسٹر (Worcester) کے مقام پر وہ شکست کھا گیا۔ یہ دونوں فتوحات کرامول کی کارگزاری سے ہوئے اور اسکا اثر ملک میں بڑھتا گیا حتیٰ کہ وہی ایک شخص رہ گیا جسکا حقیقی اثر ملک میں تھا۔

انگلستان کی آئندہ حکومت کے متعلق بہتوں کو فکر تھی۔ ملک کی رعایا کا تو کوئی اثر نہ تھا۔ جو کچھ اقتدار تھا فوج کا تھا ۱۶۵۳ء میں کرامول نے رمپ (Rump) پارلیمنٹ کو بھی ختم کردیا۔ کیونکہ اب یہ پارلیمنٹ ملک کی نمایندگی کا دعویٰ ہی نہیں کرسکتی تھی۔ عہدہ داران فوج نے ایک نئی تجویز پیش کی جس کو انسٹرومنٹ آف گورنمنٹ (Instrument of Government) آلۂ قانون حکومت میں ظاہر کیا گیا۔ اس کی رو سے ایک پارلیمنٹ کا قیام جس میں صرف ایک بیت العوام ہو تجویز کیا گیا۔

کرامول کا مؤید الملک ہونا

اور بیت العوام کے اراکین کا انتخاب ہر حلقۂ انتخاب سے کیا جائے یہ تجویز ۱۶۵۳ء

کے اصلاحی قانون کا پیش خیمہ تھی۔ سب کا صدر ایک حامیِ ملک قرار دیا گیا جس کی مدد کے لئے ایک مجلس نظامیہ رکھی گئی۔ حامی ملک (موئد الملک) کی خدمت عمر بھر کے لئے کرامول کو دی گئی۔

کرامول کی سیاسی کمی و ناکامی

گو کرامول ایک بڑا آدمی تھا اور اُس کی نیت بخیر تھی۔ لیکن صورتِ حال کچھ اطمینان بخش نہ تھی اور نئی تجویز حکومت ناقابلِ عمل۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ رعیت کا بیشتر حصہ پیورٹن لوگوں کو برسرِ اقتدار نہیں پسند کرتا تھا۔ اور شاہی حکومت کا خواہاں تھا۔ کرامول کے طرزِ حکومت کو عام لوگ بالکل ناپسند کرتے تھے اور اس کے اقتدار کا دارومدار صرف فوج پر تھا۔ لیکن وہ ایسا سمجھنے سے قاصر تھا اُس نے اِس نئے طرزِ حکومت کو کچھ ردو بدل کرکے ٹھیک کرنا چاہا تاکہ انگلستان کی رعایا کا بیشتر حصہ اُس کو قبول کرے لیکن اُس نے جو رتبہ حاصل کیا تھا وہ محض تلوار کی مدد سے حاصل کیا تھا۔ اس لئے صرف تلوار ہی کی مدد سے وہ حکومت بھی کرسکتا تھا اُس کی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۶۶۵ء میں فرانس و اسپین دونوں ایک دوسرے کے خلاف اُس کی اعانت کے خواستگار تھے اور جب اس نے فرانس کا ساتھ دیا تو فرانس کو قطعی فتح حاصل ہوگئی۔ اور صلح پیرنیز (Pyrennese) طے ہوئی لیکن کرامول اِس صلح تک زندہ نہ رہ سکا اور ستمبر ۱۶۵۸ء میں فوت ہوگیا۔

کرامول کی وفات پر بد امنی

اُس کی وفات کے بعد ایک ابتری پھیل گئی جس کا خاکہ اس طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ انگلستان کی بیشتر رعایا اس نئے طرزِ حکومت کی مخالف تھی۔ شاہی پسند۔ عمومیت پسند۔ پریسبٹیرین (Prysbetarian) انگلیسی کلیسہ والے اور پارلیمنٹ والے سبھی تو کرامول کے قائم کردہ "محمیہ" کے ملکی و مذہبی طرزِ انتظام سے ناراض تھے۔ اس حکومت کا دارومدار فوج پر تھا اور فوج اب اپنی حالت پر قائم نہ رہی۔ رچرڈ کرامول (Richard Cromwell) جو حامی ملک کے عہدہ پر اپنے باپ کا جانشین ہوا کمزور طبیعت کا آدمی تھا اور وہ بہت جلد مستعفی ہوگیا۔

فوج کے سردار سب آپس میں لڑنے لگے ۔ اس خلفشار میں رمپ (Rump) پارلیمنٹ کو پھر برسرکار آنے کا موقع مل گیا ۔ اور وہ لوگ سمجھنے لگے کہ اب ان کو پھر اقتدار بھی حاصل ہوگیا لیکن اس مرحلہ کا حل فوج ہی سے ممکن تھا ۔ منک

منک (Monk)

(Monk) اسکاٹلینڈ کی فوج کا سردار تھا وہ ابتداً استادپسند تھا لیکن بعد میں بالکل کرامول کا ہیرو ہوگیا یہ شخص انگلستان میں معہ فوج کے آگیا ۔ اور بڑے تشویشناک سکوت کے بعد اس نے اعلان کیا کہ انگلستان میں اپنی قسمت کا فیصلہ ایک آزاد پارلیمنٹ کے ذریعہ سے کرے اس نئی پارلیمنٹ نے سب سے پہلے تو یہ اعلان کردیا کہ حکومت بادشاہ دارالامرا اور دارالعوام کے ذریعہ سے ہوگی اور اس کے بعد اس نے چارلس دوم کو اپنے آبائی تخت پر جلوہ افروز ہونے کے لئے طلب کیا وہ آیا اور نہایت جوش و خروش اور اظہار وفاداری کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا ۔

(۴)

چارلس دوم کے مقاصد ۔

مغربی یورپ کی دوسری سلطنتوں کے مانند انگلستان میں بھی ایک شخصی حکومت قائم ہوگئی بادشاہ کا منشا تھا کہ اس مماثلت کو اور بڑھا دے یعنے یہ کہ مذہبی و سیاسی امور میں انگلستان بھی فرانس کی تقلید کرے ۔ لیکن اس مقصد کے حصول کی سب کوششیں بے سود ہوئیں ۱۶۶۰ء میں بھی انگلستان فرانسیسی نمونہ سے اتنا ہی مختلف تھا جتنا کہ ۱۶۴۰ء میں ۔ فوج کی حکومت اور پیورٹن اقتدار سے نفرت ہونے کی وجہ سے شاہی حکومت کا عود ہوا تھا ورنہ شاہی مطلق العنانی کے اشتیاق میں ایسا نہیں کیا گیا تھا ۔ جس طرح کہ شاہی کا عود ہوا تھا ۔ اسی طرح پارلیمنٹ کا عود بھی ساتھ ساتھ ہوا تھا ۔ شاہی اور پارلیمنٹ پھر دست بگریبان ہوگئے دونوں کے مخالف دعووں کا کوئی تصفیہ نہیں ہوا تھا ۔ اور یہ جنگ محض نظریہ کی نہ تھی ۔ نہ آگے پیچھے کا جھگڑا تھا بلکہ اصل نزاع اقتدار و اختیار کی تھی کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ "جب دو آدمی ایک گھوڑے پر بیٹھینگے تو ایک آگے ہوگا اور ایک پیچھے ہوگا"۔

چارلس دوم اور پارلیمنٹ

ایک عرصہ کی جلا وطنی کے بعد اب شاہانہ زندگی چارلس دوم کو بہت بھلی معلوم ہونے لگی اور اس نے تہیہ کر لیا کہ پھر ایسی سیاحت کو نہ جائے گا۔ وہ بڑا ذہین تھا اور اس کو وقت پر خوب سوجھتی تھی۔ کسی بات کے لئے وہ دیوانہ وار جوش میں نہیں آتا تھا۔ اور پھر خطرہ کا احساس اسے بہت جلد ہو جاتا تھا۔ پارلیمنٹ سے بہت جلد کشیدگی شروع ہو گئی۔ نہ تو مذہب میں پارلیمنٹ اور بادشاہ کے خیالات ایک تھے نہ سیاست میں۔ پارلیمنٹ انگلیسی کلیسہ کی پابند تھی اور اس سے اختلاف رکھنے والوں کے لئے سخت قوانین نافذ کرتی تھی۔ اور بادشاہ کا رجحان رومن کیتھلک مذہب کے طرف تھا۔ اور وہ مذہبی روا داری کے اصول کی آزمائش کرنا چاہتا تھا۔ خارجی معاملات کا بھی اثر پڑا۔ اگر بادشاہ کو فتح و نصرت نصیب ہوتی تو اس کا بہت کچھ لحاظ کیا جاتا۔ لیکن انگلستان نے

ہالینڈ سے جنگ

حماقت سے ۱۶۶۵ء میں تجارتی اغراض اور نو آبادیات کے لئے ہالینڈ سے جنگ کر دی۔ ہالینڈ کا بیڑا دریائے ٹیمس (Thames) تک چڑھ آیا اور چیتھم (Chatham) پر حملہ کر کے لندن کو ہفتوں محصور کر رکھا۔ ایسی ذلت انگلستان کو کبھی نصیب نہیں ہوئی اور داخلی سیاست میں اس کا فوری ردعمل شروع ہو گیا۔ پلیگ اور لندن کی آتشزدگی کی وجہ سے بھی ملک جھنجھلایا ہوا تھا۔ آخرکار بادشاہ نے اپنے وزیر کلیرینڈن (Clarendon) کو قربان کر دیا اور مالی معاملات میں پارلیمنٹ کی نگرانی و اختیارات اور زیادہ ہو گئے۔

اتحاد ثلاثہ اور ڈوور کا خفیہ معاہدہ۔

۱۶۶۸ء میں جنگ ارث کے دوران میں جب فرانس اسپین کے بلجیمی (Belgian) صوبوں پر حملہ کر رہا تھا تو چارلس دوم نے ایسا طرز عمل اختیار کیا جس سے تمام ملک کو اطمینان و مسرت حاصل ہوئی۔ لوئی چہاردہم کی زیادتی کو روکنے کے لئے وہ سوئیڈن (Sweden) اور ہالینڈ کے ساتھ اتحاد ثلاثہ میں شامل ہو گیا۔ اس انتظام سے بہت کامیابی ہوئی۔ اور

لوئی نے ایگزلاشاپل (Aix La Chapelle) کی صلح قبول کرلی - لیکن انگلستان کے خارجی طرز انتظام کی یہ نئی روش بہت جلد چھوڑ دی گئی چارلس دوم کی ذات کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا - کیونکہ پارلیمنٹ نے اس کے اخراجات پر نگرانی میں کوئی کمی نہیں کی - اور نہ تو پروٹسٹنٹ و کیتھلک مخالفین کے ساتھ روا داری برتنے کی اسے اجازت دی - فرانس کی مثال اب بھی اسے دلکش معلوم ہوتی تھی فرانس کے تاجدار کی اعانت سے وہ اپنے کو انگلستان کا حقیقی حکمراں بنا لینے کی توقع رکھتا تھا - اور یہ بھی امید تھی کہ وہ علانیہ کیتھلک مذہب کی پیروی بھی کرسکے گا - اس لئے ۱۶۷۰ء میں اس نے فرانس سے ڈوور (Dover) کا خفیہ معاہدہ کرلیا - اس نے فرانس سے وعدہ کیا کہ جب کبھی فرانس ہالینڈ پر حملہ کرے گا تو وہ بھی فرانس کی اعانت کرے گا - اس کے معاوضہ میں اس کی شخصی حکومت کو پارلیمنٹ کے پنجہ سے چھڑانے کے لئے اور کیتھلک مذہب کو انگلستان میں روا رکھے جانے کے لئے فرانس نے رقمی اور فوجی امداد دینے کا وعدہ کیا - کوئی بادشاہ اپنی رعایا کے خلاف ایسے غدارانہ معاہدہ میں کبھی شریک نہ ہوا ہوگا - چارلس اول جن افعال کی پاداش میں قتل ہوا وہ تو نسبتاً درگزر کرنے کے قابل تھے اور لوئی چہاردہم کی غداری بھی ایسی سنگین نہ تھی -

چارلس دوم کی یورپ میں مشکلات

یہ ایک جرم بھی تھا اور حماقت بھی - اس کے عہد کی دوسری خرابیاں اسی وجہ سے پیدا ہوئیں - اور اسی کی بدولت جیمس دوم اور اسٹوارٹ خاندان کو انگلستان کے تخت و تاج سے محروم کردیا گیا - یہ پہلے بتلایا جاچکا ہے کہ ہالینڈ پر فرانس کا حملہ کس طرح ناکام رہا اور شہزادہ آرینج (Orange) کا اقتدار کس طرح بڑھ گیا - وہی آرینج جو انگلستان کے ولیم سوم کے نام سے موسوم ہوا - اس معاہدہ کو بہت راز میں رکھا گیا مگر شبہ پیدا ہوگیا تھا اور آخرکار اس کا انکشاف ہوگیا - پروٹسٹنٹ لوگ اور پارلیمنٹ بادشاہ کے سخت مخالف ہوگئے ۱۶۷۴ء میں ہالینڈ سے صلح کرنے پر وہ مجبور کیا گیا لیکن پھر بھی اس کے معاندین کا شبہ اور مخالفت کم نہ ہوئی چارلس دوم کو کوئی صحیح النسب اولاد نہ تھی

اس لیے یہ اغلب تھا کہ اس کا بھائی جیمس اُس کے بعد تخت کا وارث ہوگا۔ اور جیمس تو علانیہ کیتھلک مذہب کا پیرو تھا مخالفین جو پہلے تو "ملکی جماعت" کے نام سے موسوم تھے اور بعد میں وھگ کہلائے اِس بات پر تُلے ہوئے تھے کہ

"قانون اخراج" (Exclusion Bill)

"قانون اخراج" جاری ہو جائے جس کے ذریعہ سے جیمس کو اُس کے مذہب کی وجہ سے محروم الارث کرنا مقصود تھا۔ اگر یہ مسودہ قانون منظور ہو جاتا تو وھگ فرقہ کی بڑی کامیابی ہو جاتی۔ جو کچھ ۱۶۸۸ء کے انقلاب کی بدولت ہوا وہ اِسی قانون کے ذریعہ حاصل ہو جاتا۔ کیونکہ اس قانون کی رو سے "شاہی بربنا حق خداداد" جو اکثر شاہی مطلق کے مترادف ہوتی تھی ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جاتی۔ اور اس کی رو سے آیندہ کی شخصی حکومت پارلیمنٹ کی منظوری کی محتاج ہو جاتی۔ لیکن چارلس دوم نے اِس تجویز کو اپنی پوری قوت سے رد کرنا چاہا۔ اس مقابلہ میں اُس نے بڑی قوت و مستقل مزاجی سے کام لیا۔ خاندانی حقوق کے اُصول کو وہ قایم رکھنا چاہتا تھا اور اس اُصول کے صحیح ہونے کا اس کو کامل یقین تھا پارلیمنٹیں باربار برخاست کر دی جاتی تھیں کیونکہ وہ مسودہ "قانون اخراج" پر زور دیتی تھیں۔ اُدھر وھگ جماعت نے بھی جس کا سردار شافٹسبری (Shaftesbury) تھا اپنا مقصد حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ انگلستان کی تاریخ بھر میں شافٹس بری ایسا سازشی اور چال باز آدمی کوئی نہیں گزرا ہے پاپائی سازش کے بیہودہ اور مصنوعی قصے اُنھوں نے پھیلانے شروع کیے اور ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہونے کے قریب ہو گیا۔

اس میں فتح بادشاہ کو نصیب ہوئی اس کے مخالفین اپنی بے انتہا بے اصولی اور غیض و غضب کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے مانمتھ کے ڈیوک (Duke of monmath) کو تخت و تاج کا مدعی کھڑا کیا جو بادشاہ کا ولدالحرام بیٹا تھا۔ اور نہایت کمزور طبیعت اور کم لیاقت کا آدمی تھا۔ بادشاہ نے ضروری اخراجات کے لیے روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے پھر لوئی چہاردہم سے گہرے تعلقات قائم کر لئے۔ کیونکہ اس جنگ و جدال کا دارومدار روپیوں پر تھا۔ کیا بغیر پارلیمنٹ کے

منظورہ محاصل کی مدد کے بادشاہ امور سلطنت کو سنبھال سکتا تھا۔ یہی ایک سوال تھا جس کے جواب پر سب کچھ منحصر تھا لوئی چہار دہم کی اعانت سے چارلس دوم پارلیمنٹ کا محتاج نہ رہا اور ۱۶۸۱ء سے ۱۶۸۵ء وفات تک اس نے کوئی پارلیمنٹ منعقد نہیں کی۔ اتنا ہی اُس کی کامیابی کے لیے کافی تھا اور پھر رائے عامہ بھی پلٹ کر اس کے موافق ہوگئی۔ پاپائی کے کنوئیں میں وہی گر پڑے جنھوں نے اس کو وضع کیا تھا یا کام میں لائے تھے۔ وھگ لوگ بالکل اعتبار سے گر گئے۔ شافٹس بری ہالینڈ کو بھاگ گیا اور وہیں فوت ہوا۔ رائے عامہ کے ردعمل کی وجہ سے جیمس ڈیوک آف یارک (Duke of York) جس کے خلاف مسودہ "قانون اخراج" مرتب ہو رہا تھا بادشاہ کے دربار میں لایا گیا اور اس عہد حکومت کے آخری دو سال میں اس کا بہت اثر رہا۔

انگلستان اور لوئی چہار دہم

لیکن بادشاہ کی کامیابی کی بدولت خارجی امور میں انگلستان کمزور ہوگیا۔ جب چارلس دوم پارلیمنٹ منعقد نہیں کر سکتا تھا تو یہ ظاہر تھا کہ وہ کوئی حربی یا بحری مہم کا بھی خیال دل میں نہیں لا سکتا تھا کیونکہ اس کے لیے سرمایہ پارلیمنٹ ہی کے ذریعہ سے جمع ہو سکتا تھا اور یہی زمانہ لوئی چہار دہم کے "الحاق مکرر" (Reunions) کی عدالتوں کا تھا جس کے ذریعہ سے اس نے لکسمبرگ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اگر پارلیمنٹ ہوتی تو وہ ضرور مداخلت کرنے پر اصرار کرتی اور دوسرے ممالک کی نظر بھی انگلستان پر تھی کہ وہ اس معاملہ میں کچھ رہبری کر دے گا۔ لیکن کوئی رہبری نہ ہوئی اور اسٹراسبرگ (Strassberg) لکسمبرگ (Luxemberg) و کیسل (Casselle) بلاکسی مقاومت کے بجز جرمنی کی ایک ناکام احتجاج اور اسپین کی ایک بے سود حربی کوشش کے فرانس کے قبضہ میں آ گئے۔

(۵)

جیمس دوم کے آثار

۱۶۸۵ء میں جیمس دوم جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو شاہی اقتدارات میں اضافہ ہونے کے آثار تھے۔ وھگ فرقہ تو ساقط الاعتبار ہو چکا تھا۔ پارلیمنٹ بھی مطیع تھی۔ اگر

جیمس دوم دانشمندی سے کام لیتا اور سیاست کو مذہب سے جدا رکھتا تو ۱۶۸۸ء کا انقلاب ممکن ہے کہ شاہی طرز حکومت کی کامیابی کا باعث ہو جاتا۔ اور انگلستان کی حکومت فرانسیسی نمونہ کی ہو جاتی لیکن اس میں دانشمندی کی صفت نہ تھی اور اپنے مذہب کی خاطر وہ خطرہ میں پڑنا اور قربان ہو جانا پسند کرتا تھا۔ اس کی نیت تھی کہ انگلسی کلیسہ سے اختلاف رکھنے والے پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھلک لوگوں کے ساتھ رواداری کا سلوک جائز کرا دے۔ لیکن پارلیمنٹ میں پروٹسٹنٹ احساس شاہیت سے زیادہ قوی تھا اور پارلیمنٹ والوں نے بادشاہ کے ساتھ اتحاد عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ پارلیمنٹ برخاست کر دی گئی۔ اور اس کے بعد بادشاہ سے حماقت پر حماقت سرزد ہوتی رہی۔ اس کے مذہبی مراعات کے اعلان کو ملک یوں بھی تسلیم نہ کرتا۔ لیکن فرانس میں "فرمان نینٹیز" (Nantes) کے استرداد کی وجہ سے اور بھی مخالفت بڑھ گئی کیونکہ اس سے یہ عیاں ہو گیا کہ رومن کیتھلک مذہب کبھی مساوات پر قائم نہیں رہ سکتا۔

انقلاب کی ابتداء

انگلستان کے رومن کیتھلک لوگوں کو عبادت کی آزادی دینے کے متعلق بادشاہ کی رائے بالکل درست و حق بجانب تھی کیونکہ سلطنت کے خلاف غداری کرنے کا خیال انھوں نے مدتوں سے ترک کر دیا تھا۔ لیکن فرانس میں پروٹسٹنٹ لوگوں کے ساتھ لوئی چہاردہم کا ظالمانہ سلوک اور پھر لوگوں کے ذہن میں یہ خیال کہ رومن کیتھلک مذہب اور مطلق العنانی میں چولی دامن کا ساتھ ہے یہ باتیں ایسی تھیں کہ کسی ایسے تغیر کا امکان بھی جو حقیقت میں درست و منصفانہ تھا جاتا رہا۔ سات اسقفوں پر غداری کا الزام لگایا گیا اس وجہ سے کہ انھوں نے ایک خلاف قانون فرمان کے خلاف ایک محضر پیش کیا تھا۔ اس الزام سے عام ناراضی پھیل گئی۔ اور جب یہ اسقف عدالت سے بری ہو گئے تو لوگوں کے جوش و خروش کی انتہا نہ تھی۔ اسی اثناء میں خلاف امید بادشاہ کے یہاں ایک صاحبزادہ پیدا ہوا اور اس سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ بادشاہ کی وفات سے بھی

شاہی طرز حکومت میں کوئی فرق رونما نہ ہوگا۔ کیونکہ نوزائیدہ بچہ اپنے باپ کے مذہب کی تعلیم پائے گا۔ اور آئندہ اُسی کے سیاسی تدابیر پر عمل کرے گا۔

ولیم سوم کی آمد

اس لئے بادشاہ کے داماد ہالینڈ کے اسٹیتھالٹر (Stathalter) ولیم سوم (William III) کو جو یورپ میں پروٹسٹنٹ مذہب کا حامی اور فرانس کا سخت دشمن مشہور تھا طلب کیا گیا کہ وہ آکر پروٹسٹنٹ مذہب اور انگلستان کی پارلیمنٹی آزادی کو بچائے۔ اس واقعہ کا یورپی سیاسی حالت پر کیا اثر پڑا۔ ہم تبلا چکے ہیں۔ اور یہ بھی ہم تبلا چکے ہیں کہ ہالینڈ میں لوئی چہاردہم اگر چڑھائی کر دیتا تو ولیم سوم وہاں سے ہرگز نہ روانہ ہوسکتا لیکن اس نے ایسا کرنے کے بجائے رائن (Rhine) کے شہروں پر حملہ کردیا۔ اس لئے ولیم جہاز پر سوار ہوا اور ۵ ر نومبر ۱۶۸۸ء کو ٹوربے (Torbay) پر آکر اترا۔ جیمس نے کچھ تو ضعف ارادت سے اور کچھ صورت حال کا غلط اندازہ کرکے یہ خیال کیا کہ فرانس کی مدد سے وہ انتقام و فتح حاصل کرے گا۔ اسی خیال سے مقاومت ترک کرکے وہ فرانس کو چل دیا۔ ولیم سوم بادشاہ بنا دیا گیا۔ اور اس طرح ۱۶۸۸ء کا انقلاب تکمیل کو پہنچا اس کے بعد جو لڑائی ہوئی۔ اس کا ذکر ہم نے فرانس کے حالات میں کردیا ہے۔ ولیم کو ایک عرصہ تک جنگ وجدال میں مصروف رہنا پڑا اور اس اثنا میں بعض نازک مواقع بھی پیش آئے تب جاکر کہیں ۱۶۹۷ء میں صلح رزوک (Reswiek) کے ذریعہ سے یہ انقلابی بندوبست قائم ہوا۔

۱۶۸۸ء کا انقلاب

یہ انقلاب تھا کیا جس کو ایک مدت تک "شاندار انقلاب" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ گو اب اس فقرہ کا رواج نہیں رہا۔ اس کے بعد سے یورپ میں ایسے نتیجہ خیز و تہلکہ خیز انقلابات ہوئے ہیں کہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب کو شاندار انقلاب کہنا کسی طرح موزوں نہیں ہے نسبتاً یہ انقلاب بہت باقاعدہ و باضابطہ ہوا تھا اور انگلستان میں اس کی بدولت خونریزی بھی بہت کم ہوئی۔ ۱۶۸۸ء اور

۱۷۸۹ء یا ۱۸۴۸ء کے خیالات میں کتنا تخالف ہے لیکن ۱۶۸۸ء کا (انقلاب) زیادہ کامیاب رہا اور اس کے نتائج دو مدات کے تحت تبلائے جا سکتے ہیں - ایک تو یہ کہ بادشاہ اور حکومت کے مقابل میں ہر انگریز کو کامل آزادی حاصل ہوگئی - آیندہ یہ جھگڑا باقی نہ رہا کہ بادشاہ بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے محاصل عاید کرسکے یعنی بادشاہ بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے محاصل اجرا نہیں کرسکتا تھا اور بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے نہ مستقل فوج رکھ سکتا تھا نہ کسی کو بلا تحقیقات قید کرسکتا تھا - دوسرے یہ کہ جو اختیارات کہ پہلے بادشاہ کو حاصل تھے وہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب کی بدولت گو فوراً تو نہیں لیکن رفتہ رفتہ پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آگئے حالانکہ اس وقت

حکومت اعیان

تک پارلیمنٹ عوام کی نمایندہ نہیں ہوی تھی - دار الامراء و دار العوام دونوں کی وجہ سے اصل قابو اعیان دولت کا ہوتا تھا اور تقریباً ڈیڑھ سو برس تک انگلستان کے زمیندار شرفا پارلیمنٹ کے حل و عقد کے مالک بنے رہے فرانس اس معاملہ میں کسی قدر انگلستان سے مختلف تھا - وہاں اشرافیہ بے دخل ہوچکی تھی اور بادشاہ اپنے مقرر کردہ انٹنڈنٹ (Intendant) و دیگر ملازمین کے ذریعہ سے حکومت کرتا تھا جو عموماً متوسط طبقہ کے لوگ ہوتے تھے - پارلیمنٹ میں زمیندار اشرافیہ کے قائم رہنے سے ہی سلطنت برطانیہ قائم ہوسکی - ان کی مثال روما کے سنیات (Senate) کی سی تھی جس نے سلطنت روم قائم کی -

آئرلینڈ اور اسکاٹلینڈ میں انقلاب

ولیم سوم کی حکومت کو خارجی امور سے زیادہ تعلق رہا جس کا تذکرہ لوئی چہاردہم کے عہد کے بیان میں آچکا ہے - ہم کو اس حکایت کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے البتہ اتنا بتلا دینا چاہتے ہیں کہ پرسبیٹرین مذہب جس کو اسٹورٹ خاندان نے اکھیڑ دینے کی کوشش کی تھی اسکاٹلینڈ میں مستقل جڑ پکڑ چکا تھا - اسکاٹلینڈ اب بھی ایک خود مختار ملک تھا جس کو انگلستان سے اس قدر تعلق ضرور تھا کہ دونوں ملک کا حکمراں ایک ہی شخص ہوتا تھا - اس انقلاب نے دونوں ملکوں کے روابط کو اور زیادہ مضبوط کردیا اور اس کے بعد کے عہد میں

وھگ وزارت نے اسکاٹلینڈ کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اسکاٹلینڈ اور انگلستان دونوں کی پارلیمنٹیں ایک میں ضم کرکے برطانیہ عظمیٰ کی پارلیمنٹ قائم کردی جائے۔ سترھویں صدی میں آئرلینڈ کی تاریخ ایک طویل و غمناک حکایت ہے۔ کیتھلک مذہب کے جوش اور انگلستان کی منافرت کے باعث یہ ملک جیمس دوم کا طرفدار ہوگیا تھا۔ ایک زمانے میں بڑی کامیابی کی امید بھی ہوگئی تھی مگر جنگ بوائن (Bayne) میں ولیم سوم نے اور بعد میں ڈیوک آف مارلبرا نے اسٹورٹ خاندان کی سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آئرلینڈ کے پروٹسٹنٹ زمینداروں کی عظمت ملک میں قائم تھی اور ایک صدی تک اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچا۔

قانون وراثت اس عہد حکومت کے آخری زمانے میں جب ولیم سوم کے کوئی اولاد ہونے کی امید نہ باقی رہی اور اس کی سالی شہزادی این (Anne) سے اولاد کی امید رہی جو تخت نشین ہوسکے تو ایک "قانون وراثت" (Act of Settlement) منظور کیا گیا جس کی رو سے جیمس دوم (James II) کی اولاد اور دوسرے کیتھلک مذہب کے متبعین کو تخت سے محروم الارث قرار دیا گیا اور تخت و تاج ہنوور (Electoress of Hanover) الکٹرس (منتخب حکمران) کو منتقل کردیا گیا۔ جو جیمس اول کی نواسی اور پروٹسٹنٹ مذہب کی پیرو تھی۔ اس طور پر گویا شاہی کا دار و مدار پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہونے کا دوبارہ ثبوت و اظہار ہوگیا۔

ملکہ این (Anne) ملکہ این (Anne) کے عہد حکومت کا مختصر حال بھی درج کیا جاتا ہے۔ اس عہد کا خاص واقعہ تخت اسپین کی وراثت کی جنگ تھی جس کا حال بیان کیا جاچکا ہے۔ اس عہد کے داخلی امور کے متعلق بھی ہم کو کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کو ان کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ٹوری Tory فرقہ پھر برسر اقتدار آگیا اور یہ لوگ "قانون وراثت" (Act of Settlement) کو مسترد کرکے بجائے ہنوور کے الکٹر (منتخب حکمران) کے جیمس دوم کے بیٹے کو جو رومن کیتھلک تھا تخت پر بٹھانے کے کوشاں تھے۔ اس میں کوئی راز کی بات نہ تھی کیونکہ

۱۶۸۸ء کا انقلاب اقلیت کا فعل تھا۔ اور پاپائی اقتدار کی منافرت وخوف کی وجہ سے قوم بھی شریک ہوگئی تھی۔ لیکن ولیم سوم کبھی ہر دلعزیز نہ ہوسکا۔ اور خاندان اسٹوارٹ کی محبت ابتک لوگوں کے دلوں میں باقی تھی۔ انگلیسی کلیسہ بھی اس جذبۂ وفا شعاری کی آبیاری کرتا رہا کیونکہ بادشاہوں کے خداداد حقوق کے مسئلہ کی اب بھی وہ تلقین وتبلیغ کرتا تھا۔ ملکہ این کے عہد میں ٹوری فرقہ کو موقع مل گیا۔ خود ملکہ کو ان لوگوں سے ہمدردی تھی۔ کلیسہ بھی اُن کی پرجوش تائید کرنے لگا۔ یہ جدوجہد اصل میں وہگ لوگوں کی ایک لڑائی تھی اور شروع شروع تو وہگ فرقہ ہی برسر اقتدار رہا۔ لیکن جیوں جیوں یہ لڑائی بڑھتی گئی تو ملک بھی جان ومال کے نقصان سے تنگ آگیا اور ٹوری لوگوں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا مارلبرو کی ڈچس (Duches of marlbrough) سے ملکہ کا جھگڑا ہو جانے سے یہ تغیر اوربھی جلد ظہور پذیر ہوگیا۔ یہ ایسی سازشوں کا زمانہ تھا کہ انگلستان کی حالیہ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں پائی جاتی اور اس میں آکسفورڈ (Oxford) و بولنگ بروک (Bolingbroke) نے خاص طور پہ حصہ لیا۔

ہنوور خاندان کی تخت نشینی

ملکہ این (Anne) کی ناگہانی موت سے اور خود ٹوری سرداروں میں جھگڑا پڑ جانے سے اسٹوارٹ خاندان کا کوئی شخص تخت پر بیٹھ نہ سکا اگر ہنوور خاندان کی تخت نشینی روکنا مقصود تھا تو پھر ایک جنگ کرنا پڑتی۔ لیکن بولنگ بروک (Bolingbroke) میں اتنی ہمت نہ تھی۔ ۱۷۱۴ء میں بغیر کسی مخالفت کے جارج اول بادشاہ تسلیم کرلیا گیا اور انگلستان کی تاریخ کا ایک اہم وممتاز دور ختم ہوگیا۔

(۶)

ہماری تاریخ میں سترھویں صدی کا زمانہ غیر ملک والوں کی زیادہ دلچسپی کا باعث ہوا ہے اس عہد میں بڑے مشہور اور حیرت انگیز واقعات پیش آئے ہیں اور ان واقعات میں بڑے بڑے لوگوں اور خاص اصول کا دخل رہا ہے۔ اس تمام عہد میں ایک سلسلۂ مبارزت قائم رہا اور ان مبارزین میں بعض ایسی

شریف ہستیاں گزری ہیں جن کی نکونامی کی وجہ سے انگلستان والے اس عہد پر ناز کر سکتے ہیں۔ علم و ادب میں اس عہد نے وہ مرتبہ نہیں حاصل کیا جو سولھویں صدی نے کیا تھا لیکن اس سے بہت کم بھی نہ رہا۔ انگلستان کی سیاسی و معاشرتی زندگی کے لیے شاہی کا اعادہ انحطاط کا دیباچہ تھا۔ انگلستان والوں نے فرانس کے طرز معاشرت و خیالات کے معائب تو اختیار کر لیے اور لوئی چہار دہم کے عہد کے محاسن کی تقلید سے بے بہرہ رہے لیکن چارلس دوم (Charles) اور اس کے عیش پرست مصاحب اور لندن کے رنگین مزاجوں کو انگلستان کا نمونہ نہ سمجھنا چاہیے۔ ہم لوگ انگلستان کے صرف ایک طبقۂ خاص کے نمایندے کہے جا سکتے ہیں۔ جس عہد میں چارلس دوم بکنگھم (Buckingham Charles II) ٹائٹس اوٹس (Titus Oats) ہوئے تھے اسی عہد میں ملٹن۔ (Milton) نیوٹن۔ (Newton) رن۔ (Wren) بنیین۔ (Bunyan) اور پن (Penn) ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں۔

نیوٹن کی کتاب پرنسپیا ۱۶۸۷ء

رن (Wren) حیاے علوم کے بعد انگلستان کا سب سے بڑا معمار ہوا ہے اور سینٹ پال (St. Paul) اور دیگر گرجاؤں کی خوبصورتی کا صحیح اندازہ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے نیوٹن (Newton) کی کارگزاری بھی انسانی ذہن کی سب سے بڑی کامیابی کا نمونہ ہے انگریزی کے اس ہیئت سے در کہ قدرت اور قانون قدرت اخفا میں تھے خدا کے حکم سے نیوٹن کا ظہور ہوا تو سب روشنی پھیل گئی،، نیوٹن کے پیش رووں کی جد و جہد کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا جس کی بدولت خود نیوٹن ایسی زبردست کامیابی حاصل کر سکا لیکن اس میں شک نہیں کہ اصول ریاضی کو ترقی دے کر اور کشش اراضی کے صحیح قانون کو معلوم کر کے اس نے اجرام فلکی کی گردش کے صحیح قانون کو دریافت کر لیا اور اس طور پر نظام عالم کا ایک صحیح پتہ اس نے انسان کے ہاتھوں میں پہنچا دیا۔

مذہبی سردار

یہ صدی پرجوش مذہبی مناقشات سے بھی پڑ تھی صدر اسقف لاڈ (Laud) کی حیات کے سیاسی اثرات کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لیکن اس کے افعال کے سیاسی نتائج کے سوا انگلستان کی تاریخ میں اس کا نام یوں بھی ممتاز ہے کہ انگلستان کے مقررہ مذہب کا قرون

وسطیٰ کے کیتھلک مذہب سے صاف وصریح تعلق ہونا تسلیم کرلیا گیا۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ انگلستان کے مقررہ مذہب سے انحراف کرنے والوں میں بڑے بڑے لوگ یا کم ازکم ان کی تصانیف پیورٹن فرقہ کی فتح وکامیابی کے زمانہ میں نہیں بلکہ اس کی شکست کے زمانہ میں ظہور پذیر ہوئیں انجمن احباب کے بانی مبانی (Society of Friends) مسٹر فاکس (Fox) نے ۱۶۴۷ء میں کام شروع کیا اور چارلس دوم وجیمس دوم کے عہد حکومت تک سرگرم کار رہا اور ۱۶۹۱ء میں فوت ہوا۔ پن (Pen) بھی اس انجمن کا سربراوردہ رکن تھا اور فاکس سے کم اس کو شہرت نہیں ہوئی۔ بلکہ امریکہ سے اُسے تعلق ہونے کی وجہ سے اور پنی سلوینیا (Pennisylvania) آباد کرنے سے اُس کو اور بھی شہرت نصیب ہوئی۔ بنیان (Bunyan) کی مشہور کتاب پلگرمس پراگرس (Pilgrim's Progress) ۱۶۷۸ء میں طبع ہوئی۔ اس کی زندگی اور تصانیف سے اس زمانہ کے انگلستان کے مقررہ مذہب سے انحراف کرنے والوں کی قوت وعظمت کا پتہ چلتا ہے

ملٹن (Milton) انگلستان کے مقررہ مذہب سے انحراف کرنے والوں کی خصوصیت بتلانے کے لیے ملٹن (Milton) کا نام فاکس۔ پن اور نیسن کے نام کے ساتھ بھی شریک کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی روح مثل "ایک ستارہ کے تھی جو سب سے علحدہ وممتاز ہو" انگلستان کے شعرا میں اس سے اعلیٰ کوئی نہیں ہے اور اس کے کمال کو سمجھ لینا شعرفہمی کی دلیل ہے۔ پیراڈ ایز لاسٹ (فردوس گم شدہ) ۱۶۶۷ء میں طبع ہوئی جبکہ انگلستان ہالینڈ والوں کے ہاتھ سے ہزیمت وخفت اٹھا چکا تھا اور چارلس دوم کے دربار کی بُری حالت لوگوں کو نظر آنے لگی تھی۔

ہابز (Hobbes) اس صدی میں علم السیاست کا بھی مشغلہ جاری رہا جو کہ ہمیشہ تجربات ومسائل وقت کے زیر اثر رہتا ہے۔ ابتداءً بادشاہوں کے خداداد حق کا غلغلہ رہا جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ خانہ جنگیوں کے زمانے میں انگلستان کے مصائب دیکھ کر ہابز (Hobbes) نے لیویتھن (Leviathan) تصنیف کی جو سلطنت جمہوری کے مادہ۔ صورت اور اقتدار کے متعلق تھی۔

اس قسم کی خرابیوں کا علاج (جیسی کہ خانہ جنگی کے زمانے میں رونما ہوئی تھیں) اس کے نزدیک صرف ریاست (سلطنت) اور اُس کے حکمراں کی قوت کے ذریعے سے ممکن تھا اس کی اس تصنیف کا اثر تمام دنیا پر پڑا۔ اور ریاست (حکومت) کے بڑھانے میں اس کی تصنیف ٹرائٹشکے (Treitschke) اور دوسرے جرمن مصنفین کے فلسفۂ سیاست سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ جن کے تصانیف کا موجودہ جنگ (جرمن) کے آغاز اور رفتار پر خاص اثر ہے پیورٹن بغاوت کا عکس جس طرح ہابز (Hobbes) پر پڑا اسی طرح ۱۶۸۸ء کے انقلاب کے عقاید کو لاک (Lock) نے اختیار و بیان کیا۔ بادشاہوں کے خدائی حقوق کا بھی وہ مخالف تھا۔ اور ہابز (Hobbes) کی مطلق العنان ریاست (حکومت) کا بھی۔ اس کے خیال کے مطابق ریاست (حکومت) کی بنا ایک باہمی معاہدہ پر تھی اور اس وجہ سے ایک محدود شاہی اور محدود دستور کے قیام کی ضرورت اس نے بتلائی۔ ایک صدی تک وھگ اور انگلستان کے دستور اسی کی تصانیف کے تابع رہے۔

حوالہ کتب متعلقہ باب ہذا:۔

"انگلستان کی سیاسی تاریخ" از مانٹیگ (Montague) ولاڈر (R. Loder)
"تاریخ انگلستان عظیم خانہ جنگی تک" مصنفہ گارڈنرو (Gardiner) "تاریخ خانہ جنگی اعظم" از مصنف مذکور "تاریخ جمہوریہ و محمیہ" از مصنف مذکور۔ "تاریخ انگلستان" از رینکے۔ (Ranke) "و تاریخ انگلستان" از میکالے (Macaulay) "تاریخ دساتیر انگلستان" از ہیلم (Hallam) "دوسرے زمانے کی تاریخ" از برنٹ (Burnett) "عہد ملکہ اینی" (Anne) از برٹن "الیور کرامول" (Oliver Cromwel Burton) از فرتھ (Firth) "چارلس دوم" از ایری۔ (Airy) "ولیم سوم" از ٹریل۔ (Trail)
"برطانوی حکمت عملی کی ترقی" از سیلی۔ (Seeley)

باب یازدہم

ممالک بحر بالٹک و عروج روس

بحر بالٹک و بحر متوسط

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بحر بالٹک (Baltic) کی تاریخ میں وہ شہرت نہیں حاصل کی جو بحر متوسط (Mediterranean) کو میسر ہوئی۔ اس وجہ سے کہ بحر بالٹک کے ساحل کی زمینیں نسبتاً کم زرخیز ہیں۔ اور اُس کے بہت سے بندرگاہ سال کے بیشتر حصے میں۔ برف کیوجہ سے بند پڑے رہتے ہیں۔ سترھویں۔ اور اٹھارھویں۔ صدی میں اس کے ساحل پر بڑے بڑے دول قائم ہوئیں۔ اور اب ہم اِن ممالک بالٹک کا ایک اجمالی خاکہ پیش کریں گے۔

اسکینڈنیویا کی تینوں سلطنتوں کا عارضی طور پر یکجا ہونا۔

سولھویں۔ صدی کے آغاز میں اس کا امکان پایا جاتا تھا کہ پورے بحر بالٹک پر صرف اسکینڈنیویا (Scandinavia) سوئیڈن ناروے (Sweden Norway) کی سلطنت قابض و متصرف رہے گی۔ کیونکہ کرسچین دوم (Christian II) ڈنمارک (Denmark) ناروے (Norway) سوئیڈن (Sweden) تینوں ممالک پر حکمراں تھا۔ گو یہ تینوں ملک ایک میں ضم تو نہیں کردیے گئے تھے۔ لیکن اس قسم کا امکان ضرور تھا۔ کیونکہ ایک مرتبہ یہ تینوں ملک ملا دیئے گئے تھے۔ اس وجہ سے اب بھی ایسی صورت کا پیدا ہوجانا محال تھا۔ اور یورپ کے لیے بہت مفید

ثابت ہوتا۔ کیونکہ صلح و جنگ میں اسکینڈینیویا (Scandinavia) والوں نے اپنے کو یورپ کی سر برآوردہ اقوام کا مدمقابل ثابت کر دیا تھا۔ لیکن یہ ان ہونی بات تھی۔ مذہبی اصلاحات کے طوفاں خیز زمانے نے اس اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ کیونکہ کرسچین دوم (Christian II) نے سویڈن (Sweden) میں جبراً رومن کیتھلک مذہب قائم کرنے کی کوشش میں ایک شورش و بغاوت برپا کرادی جس کو وہ فرو نہ کرسکا۔ ناروے (Norway) البتہ اس کے قبضے میں رہا۔ اور سویڈن کے جنوبی اضلاع پھر ایک مدت تک اس کے قبضے میں رہے۔ لیکن سویڈن اور ڈنمارک ہم مذہب ہونے اور ایک ہی طرز معاشرت رکھنے کے باوجود دو صدی تک آپس میں وقتاً فوقتاً لڑتے رہے۔ وسط صدی کے پہلے ہی ڈنمارک نے لوتھری مذہب اختیار کرلیا تھا۔ لیکن اس طور کی مذہبی مماثلت کے باوجود اتحاد علمی یا اتحاد سیاسی قائم نہیں ہوسکا۔

سویڈن میں گسٹیوس (Gustavus)

سویڈن میں گسٹیوس (Gustavus Vasa) واسا نامی ایک شخص شاہ ڈنمارک اور اس کی مذہبی حکمت عملی کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا تھا۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۵۲۳ء میں۔ سویڈن کا تخت اُسے مل گیا۔ اور یورپ کے قابل ترین شاہی خاندانوں میں ایک کا وہ بانی ثابت ہوا۔ خاندان واسا (Vasa) کے شاہان سویڈن مختلف اوضاع و اطوار کے گزرے ہیں۔ اور ان میں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے مکاری اور ظلم و استبداد سے کام لیا ہے۔ لیکن پرائشیا (Prussia) کے خاندان ہاہن زالرن (Hohenzollern) نے بھی ایسے بادشاہوں کا سلسلہ پیدا نہیں کیا۔ جو قابلیت اور حب الوطنی میں خاندان واسا (Vasa) کے تاجداروں سے زیادہ ممتاز ہو۔ اس خاندان کے عہد حکومت میں سویڈن نے یورپ کے معاملات میں اپنی

سویڈن کا افلاس اور کمی آبادی

دولت اور آبادی کی مناسبت سے بہت زیادہ حصہ لیا کیونکہ سویڈن کا ملک بالکل مفلس تھا۔ اور اٹھارھویں صدی کے آخر تک بھی اسکی آبادی کبھی ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ نہ ہوسکی۔ اور اس کے کل مقبوضات کو ملانے پر بھی جملہ آبادی ڈھائی کروڑ سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اس آبادی کا بیشتر حصہ مضبوط اور قوی کسانوں اور زبردست پہاڑیوں پر

مشتمل تھا۔ اور فوجی اغراض کے لئے یہ لوگ بہت کارآمد تھے۔ ان کے بہادری کے کارناموں کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ جو ایک صدی بعد (سترھویں صدی میں) انھوں نے گسٹاوس ایڈالفس (Gustavus Adolphus) کی ماتحتی میں جنگ سی سالہ کے دوران میں دکھائے تھے۔ اس کے بعد ایک مدت تک یہ لوگ یورپ کے بہترین سپاہی مانے جاتے تھے۔ حالانکہ اپنی سابقہ شجاعت و مستعدی یہ لوگ کھو چکے تھے۔ اور اب ان کو صرف تنخواہ سے غرض رہتی تھی۔ اور اس وجہ سے ان کی حیثیت اجورہ داروں کی سی ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ سوئیڈن میں دستوری طرز زندگی و حکومت کا بھی بہت چرچا رہا۔ اور وہاں کے تاجداروں نے اس کے فنا کر دینے کی ہر چند بہت کوشش بھی کی۔ لیکن وہ بالکل نیست و نابود نہ کر سکے۔ اٹھارھویں صدی میں جب کہ ہر جگہ مطلق العنانی کی طرف لوگوں کا میلان طبع پایا جاتا تھا۔ صرف انگلستان و سوئیڈن ایسے ملک تھے جہاں سیاسی آزادی کے کچھ بھی آثار نمایاں تھے۔

پولینڈ میں خاندان واسا (Vasa)

۱۵۸۷ء میں واسا خاندان نے ایک اور تخت حاصل کر لیا۔ کیونکہ سگسمنڈ واسا (Sigismund Vasa) پولینڈ کا تاجدار منتخب ہوگیا۔ لیکن اس سے سوئیڈن کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا۔ کیونکہ سگسمنڈ کیتھلک مذہب رکھتا تھا۔ اور واسا خاندان کی سوئیڈن اور پولینڈ کی دونوں شاخوں میں بہت جلد زبردست عداوت پیدا ہوگئی۔ پولینڈ کی شاخ والے خود کو سوئیڈن کی تاجداری سے محروم نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اور سوئیڈن والوں کی نظر میں پولینڈ کا تاجدار ایک خطرناک اور جھوٹا مدعی تھا۔ پولینڈ کے تاجدار کی طرف سے یہی خوف تھا جس کی وجہ سے گسٹوس ایڈالفس جنگ سی سالہ میں شریک ہوا تھا۔

ہان سیاتی انجمن کا زوال (Hanseatic)

اب ہم کو بحر بالٹک کے جنوبی ساحل پر ایک نظر ڈالنا چاہیے۔ اصلاحات کے ابتدائی زمانے میں جرمنی کی متعدد مملکتیں سلطنت کے مشرقی حاشیہ پر ڈنمارک سے آگے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے ہولسٹائن (Holstein) میکلن برگ (Mecklenberg) اور ولایت پامیرینیا (Pomerania) انجمن ہان سیاتی (Hanseatic) جس کا مرکز لیوبک (Lubeck) تھا بحر بالٹک کے تجارت کی مالک تھی۔ لیکن سولھویں صدی

اور سترھویں صدی کے اوائل میں بہت سے تغیرات ہو گئے۔ سویڈن اور ہالینڈ کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے ہان سیاتی انجمن دب گئی۔ صلح ویسٹ فیلیا (Westphalia) کے ذریعہ سے سویڈن جرمنی کے مقبوضات میں شامل ہو گیا۔ بریمن (Bremen) اور وردن (Verden) کی اسقفی ولایتیں اس کے قبضہ میں آگئیں۔ اور اسی طور پر دریائے ویزر (Weser) اور دریائے ایلب (Elbe) کے دہانے کی کنجی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ مغربی پامیرینیا (Pomerania) بھی اس کے تصرف میں تھا۔ اس وجہ سے دریائے اوڈر (Oder) کے نشیبی گھاٹ اسی کے قابو میں رہے۔ اور ریوگن (Rugen) کے جزیرہ پر بھی اسی کا قبضہ تھا۔ برینڈنبرگ (Brandenberg) کی انتخابی ولایت نے جو بعد میں سلطنت پرشیا (Prussia) بن گئی۔ مشرقی پامیرینیا (Pomerania) حاصل کر لیا تھا۔ اس لئے بحر بالٹک کے معاملات میں اسکو درخور حاصل ہو گیا تھا۔

بحر بالٹک کا جنوبی و مشرقی ساحل

مشرقی پامیرینیا (Pomerania) سلطنت (آسٹریا) کی آخری سرحد تھی۔ اس کے اوپر جو ملک تھا۔ وہ اصل میں جرمن نہ تھا۔ یہ ملک حلقۂ ٹیوٹانک (Teutonic Knights) اور شمشیر کے نائیٹس (Knights of the Sword) یعنی شہسواروں کا معرکہ کارزار رہا ہے۔ ان لوگوں کی بدولت اس ملک سے تجارت کرنے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ سلیوانی (Slavonic) باشندوں کا بیشتر حصہ تو ہلاک ہو چکا تھا۔ اور جو کچھ رہ گئے تھے۔ انھوں نے مسیحی دین اختیار کر لیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسیحیت اور جرمن تجارت کے ان مسلح مبلغین پر کیا کیا مصائب گزرے ہیں۔ پرشیا تو برینڈنبرگ کی انتخابی ولایت میں شامل کر دیا گیا تھا۔ اور ۱۶۶۰ء تک پولینڈ کا باجگزار رہا۔ مشرقی پرشیا اور جرمنی کے مقبوضات کے درمیان سمندر تک پولینڈ نے قبضہ کر رکھا تھا۔

بحر بالٹک کے مشرقی ساحل پر سویڈن کے مقبوضات

اور پرشیا کے مشرق میں پولینڈ کی سرحد بحر بالٹک سے جا ملتی تھی۔ اس کے بعد لیوونیا (Livonia) استھونیا (Esthonia) انگریا (Ingria) کیکس ہولم (Kexholm) اور فن لینڈ (Finland) کے ممالک تھے۔ جو خلیج فن لینڈ

(Finland) کے اطراف میں واقع تھے - یہی ممالک روس اور سوئیڈن کے درمیان وجہ مخاصمت ثابت ہوئے اِن کی ابتدائی غیر معروف تاریخ بیان کرنیکی ضرورت نہیں - اتنا بتلادینا کافی ہے کہ گستاوس ایڈالفس کی سخت جنگ وجدل کے بعد ۱۶۱۷ء میں یہ سب مملکتیں سوئیڈن میں شامل ہوگئیں - روس جس کو اس زمانے میں ماسکووی (Moscovy) کہتے تھے - بحر بالٹک اور بحری تجارت سے بالکل محروم کردیا گیا - بحر بالٹک کی دول میں سوئیڈن بلاشبہ قوی ترین تھا - حالانکہ ابھی تک وہ اپنے کمال عروج کو نہیں پہنچا تھا - لیکن جرمنی کے غیر ملکی مقبوضات اسکے لئے ایک بار ہوگئے تھے - فن لینڈ اور دیگر مفتوحات جدیدہ اور خوداسکی قلیل آبادی باوجود قومی وحربی جوش وخروش کے جرمنی کے مقبوضات کو قابو میں نہیں رکھ سکتی تھی -

وسط یورپ کے مشرقی حصے کے عام تغیرات

اِن ملکوں کے سیاسی جغرافیہ میں اب بہت تغیرات ہوگئے ہیں - سترھویں صدی کی حدبندیوں کا اب کوئی نشان یورپ کے موجودہ نقشہ پر باقی نہیں - برینڈ برگ جو بعد میں پرشیا کے نام سے موسوم ہوا - جرمنی کے شمال میں پھیل گیا ہے - اور اپنی ہمسر ورقیب مملکتوں کو بیدخل کردیا ہے - ڈنمارک کا ملک جزیرہ نما کے شمالی حصہ تک محدود رہ گیا ہے - ناروے خود مختار ہوگیا - سوئیڈن کے حدود میں صرف وہی ملک رہ گیا - جہاں سوئیڈنی زبان بولی جاتی ہے - روس نے اِن تمام رکاوٹوں کو جو سوئیڈن نے اپنی حکمت عملی اور اپنی بہادری سے اسکے مغربی راستے میں پیدا کردیئے تھے صاف کردیا ہے - اور پولینڈ کی سلیوانی سلطنت جو سترھویں صدی میں روس کی طرح آباد تھی - اور تمدن میں روس سے بڑھی ہوئی تھی - موجودہ نقشے سے بالکل مٹ گئی ہے - حتیٰ کہ کسی صوبے کے نام سے بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ کبھی یہ سلطنت بحر اسود سے لیکر بحر بالٹک تک پھیلی ہوئی تھی -

روس اور پولینڈ کا تقابل

روس اور پولینڈ کے کارناموں کا مقابلہ اس لئے بھی زیادہ دیچسپ ہے کہ دونوں ملکوں کے باشندے ہم قوم اور ہم زبان ہونیکے علاوہ دونوں ملک کے ادارے اور معاشرتی مدارج ومراتب بھی یکساں تھے - لیکن روس کی حکومت رفتہ رفتہ ایک ذی اثر مطلق العنان حکومت ہوگئی - اور پولینڈ آزادی کی تمنامیں بدامنی کا شکار ہوگیا - جس کی بدولت پڑوس کی سلطنتوں نے اُسے دبوچ لیا -

پولینڈ کی مذہبی تاریخ

خاص پولینڈ میں لتھوانیا (Lithuania) شامل کر دینے سے پولینڈ کی وسعت بڑھ گئی تھی۔ یہ فخر پولینڈ کے خاندان جیگیلن (Jagallon) کو حاصل ہوا تھا کہ اس نے دونوں ملکوں میں اتحاد پیدا کر کے اُسے قائم بھی رکھا۔ لتھوانیا والے زیادہ تر مشرقی کلیسہ کے پابند تھے۔ اور پولینڈ والے بالکل کیتھلک تھے۔ شروع شروع پروٹسٹنٹ مذہب نے پولینڈ میں کچھ فروغ حاصل کیا تھا۔ لیکن کیتھلک ردعمل اور جیسوٹ (Jesuit) پادریوں نے اس کو بڑھنے نہ دیا۔ مگر پولینڈ کو یہ فخر اور امتیاز حاصل تھا کہ یہاں کیتھلک مذہب کے حاوی ہونے کے باوجود ظلم و استبداد سے کام نہیں لیا گیا۔ پولینڈ ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں مذہبی مظالم کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا تھا۔

پولینڈ کا تخت انتخابی ہو گیا

۱۵۷۲ء میں جیگیلن (Jagallon) خاندان فنا ہو گیا۔ اور اس وقت سے پولینڈ کا تخت و تاج انتخابی ہو گیا۔ اور وہاں کے خرفا و روسا انتخاب کنندہ بن گئے۔ انتخابی شاہی حکومت کے سب نقائص و معائب پولینڈ میں ظہور پذیر ہوئے۔ مثلاً امیدواران تخت اور ان کے حامیوں کی باہمی عداوت و منافرت۔ خارجی دول کی مداخلت اور پھر امیدواران کا حصول مقصد کے لئے خطرناک رعایتیں منظور کر لینا اور اِس قسم کی حاصل کردہ حکومت کی کمزوری وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں پولینڈ میں پیدا ہو گئیں اور یہی نہیں کہ حکومت کمزور رہتی تھی۔ بلکہ حکومت کے مقابلہ کے جتنے ادارے تھے سب کی یہی حالت تھی۔ ایک مجلس ڈیٹ تھی جو اختیار نامنظوری کی وجہ سے بالکل مجہول ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ حق نامنظوری ہر رکن کو حاصل تھا۔ جس کی وجہ سے

اختیار نامنظوری

کوئی رکن بھی کسی مسئلے کو اپنی تنہا نامنظوری سے رد و بیکار کر سکتا تھا۔ اور اس طور پر جب چاہتا مجلس کو برخاست کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک زمانے میں اسی "اختیار نامنظوری" کی وجہ سے مسلسل پندرہ مرتبہ وہاں کی مجلس یعنی ڈیٹ (Diet) منعقد ہوئی۔ اور بغیر کوئی کام کئے ہوئے برخاست کر دی گئی دوسرے ممالک میں تو جاگیریت مرکزی و قومی حکومت کے قیام میں ممد و معاون بن رہی تھی۔ لیکن پولینڈ میں جاگیریت کا شورش انگیز اثر زیادہ نمایاں ہوتا گیا اضلاع کے زمیندار جنکی تعداد تقریباً اسی ہزار تھی۔ اپنے اپنے حدود میں بادشاہ تھے۔ جسکے سبب سے کاشتکار رعایا ان کے ظلم و ستم کا شکار بنی ہوئی تھی۔ اور مرکزی حکومت بھی تباہی میں پڑ گئی تھی سلاطین نے

حکومت کے کل پرزے درست کرنے اور اپنی قوت کو بڑھانے کی ہر چند بہت کوشش کی۔

پولینڈ میں بدامنی

مگر اولاً تو خود پولینڈ والوں کی مخالفت سے اور پھر بعد میں پڑوس کی سلطنتوں کے حرکات سے جو پولینڈ کو مستعد و مضبوط دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ آخرکار ان سلاطین کی کل کوششیں بیکار ہوئیں۔

پولینڈ کی مفصل تاریخ لکھنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔لیکن یہ تاریخ دلچسپی سے خالی نہیں ہے اور پولینڈ کے فوجی کارنامے بھی کچھ کم شاندار نہیں ہیں۔ جان سوبی اسکی (John Sobieski) (۱۶۷۴ء سے ۱۶۹۶ء تک) پولینڈ کے نامور بادشاہوں میں آخری تھا۔ اسکی شہرت زیادہ تر اس واقعے سے ہے کہ جب ترکوں نے وی اینا (Vienna) کو محصور کر لیا تھا تو اسی نے اپنی فوج بڑھا کر ترکوں کو ایک تاریخی شکست دی تھی۔ اس واقعے کے بعد وی اینا (Vienna) میں جب شکر کے سجدے ہونے لگے تو اس میں اس کے متعلق یوں کہا گیا کہ "خدا نے اپنی طرف سے ایک شخص بھیجا جس کا نام جان تھا"۔ اسکے بعض اور بھی فوجی کارنامے ہیں لیکن ان سے پولینڈ کو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوئی۔ اُس نے خود مجلس یعنی ہیئت (Diet) میں کہا کہ آنیوالی نسل کو حیرت ہوگی کہ اس قدر فتوحات کے بعد بھی جن پر پولینڈ بجا طور پر ناز کر سکتا ہے اور دنیا میں ہمیشہ اس کا نام زندہ رہیگا۔ بجز تباہی و بربادی کے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ چالیس روز گزر جانے دو اور نینوا (Nenuva) تباہ و برباد ہو جائیگا۔ یہ الفاظ تمام پولینڈ کی تاریخ پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ پولینڈ کی تباہی چالیس روز کے بجائے کچھ کم سو سال میں ہوئی۔ لیکن ہر دسویں سال تباہی و بربادی کے آثار زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔

روس کی رفتار ترقی

روس کی رفتار ترقی اس سے بالکل مختلف تھی۔ وہاں بھی ایک قسم کی انتخابی شاہی حکومت تھی۔ جیسی کہ عموماً شاہی حکومتیں ہوتی تھیں۔ اور وہاں بھی پھر اُمرا کا طبقہ تھا۔ جن کو "بایرس" (Boyars) کہتے تھے۔ اور یہ لوگ بھی اپنے امتیازات و حقوق کی پاسداری ملحوظ رکھتے تھے۔ اور بادشاہی کے اقتدارات کو کم کرنے کے

کوشاں رہتے تھے۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی مشابہت پولینڈ و روس میں نہ تھی۔ البتہ ابتدائی زمانے میں کچھ اور مماثلت بھی تھی۔ پولینڈ بدامنی و انفراق کی راہ پر لگ گیا۔ اور روس کی مطلق العنان و استبدادی حکومت نے ٹھوک بجاکر ایک قوی سلطنت قائم کرلی۔ اور چاروں طرف فتوحات کا سلسلہ قائم کردیا۔ اس تقابل و تخالف کے اسباب بتانا ذرا مشکل ہے۔ پولینڈ کیتھلک مذہب رکھتا تھا۔ اور روس مشرقی کلیسا کا پابند تھا۔ اور مشرقی کلیسائی مذہب اکثر مطلق العنانی کا آلہ ثابت ہوا ہے۔ علاوہ اسکے پولینڈ اُس تاتاری حملہ سے محفوظ رہا۔ جسکی بدولت روس کی تمام قوت ایک مرکز پر قائم ہوگئی تھی۔ سب سے بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سولھویں صدی کے بعد سے روس کے تخت پر وقتاً فوقتاً قابل و ممتاز تاجدار رونق افروز ہوئے۔

آئیوان مہیب (Ivon the Terrible)

آئیوان (Ivon) جسکو "مہیب" کے لقب سے پکارتے تھے روس کی موجودہ تاریخ کا سب سے پہلا حکمراں تھا۔ وہ ۱۵۳۳ء سے ۱۵۸۴ء تک رہا۔ اور ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا اس کی سفاکی و بیرحمی وحشیانہ تھی اور نوگوروڈ (Novgorod) کے شہر کی تباہی کے بعد سے مرد عورت اور بچوں کی اذیت میں اس کو خاص لطف آتا تھا۔ لیکن ادنےٰ و اوسط طبقے کے لوگوں کے ساتھ وہ رعایت کرتا تھا اور مغربی یورپ سے تجارت کا بھی اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اوسے علوم کی ترقی میں بھی دلچسپی تھی۔ نزلہ تمام تر امراہی پر گرتا تھا۔ اور اس میں وہ پیٹر اعظم (Peter) کا مرشد تھا۔ اسکے عہد میں روس کی شاہی حکومت عوام کی حامی اور امرا کی سخت دشمن بن گئی تھی۔

پیٹر اعظم

آئیوان (Ivon) کی وفات کے بعد روس میں دور ابتلا شروع ہوگیا۔ قحط۔ وبا اور خارجی و داخلی جنگوں کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ آئیوان (Ivon) کا خاندان فنا ہوگیا۔ ۱۶۱۳ء میں مائیکل رومانف (Michael Romanof) نامی ایک شانزدہ سالہ لڑکا حکمرانی کے لئے منتخب کیا گیا۔ اسکے بعد روس کے جتنے حکمراں گزرے ہیں اسی کی نسل سے تھے رومانف (Romanof) کے بعد چھپتر سال کا زمانہ گو دلچسپی سے خالی نہیں پھر بھی نظرانداز کردینے کے قابل

روس کی تاریخی عظمت کا زمانہ اُس وقت سے شروع ہوا۔ جب کہ ۱۶۸۹ء میں پیٹر اعظم (Peter) تخت نشین ہوا۔ ۱۷۲۵ء تک وہ سریر آرائے سلطنت رہا۔ اس کا عہد حکومت بھی اس کے پیشروؤں خصوصاً آئیوان "مہیب" کے نمونے کا ہی تھا بلکہ اسے اسی سلسلہ کی ایک کڑی کہنا چاہیئے۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں ان قوتوں کو جو ابتک جدوجہد میں مصروف تھیں بیّن فتح حاصل ہوئی حالیہ موجودہ روس کی تاریخ اس کے عہد حکومت کے واقعات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

پیٹر اعظم (Peter) کی متضاد صفات

اس کا بچپن خونی مناظر میں سے گزرا تھا۔ اس نے اپنے چچا کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ اور اپنی ماں کے خاص مشیر کے پرخچے اڑتا بھی اس نے دیکھا تھا۔ اور جانتا تھا کہ یہ سب مظالم رؤسا و امرار کے کرتوت ہیں۔ روسیوں سے زیادہ عجیب الخلقت ہستی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ وہ سخت سے سخت بہیمانہ مظالم کر سکتے تھے۔ اپنے ایک سو باغی محافظین کو طرح طرح کی اذیت دیکر قتل کر کے اور خود اپنے بیٹے کو بیرحمی سے تہ تیغ کر کے اس نے اپنے کو آئیوان " مہیب کا سچا جانشین ثابت کر دکھایا لیکن یہ خونخوار وخودسر درندہ علوم وفنون اور صنعت وحرفت میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ اور اپنے نیم وحشی ملک میں یورپ کی تہذیب وتمدن رائج کرنیکا خواہاں تھا۔ اس کی زندگی کا ایک رخ تو ہن (Hun) سردار اٹیلا (Attila) کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ لیکن دوسرا رخ لوئی چہاردہم (Louis XIV) اور کولبر (Colbert) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

پہلے ہم ان امور کا ذکر کرینگے، جو اس نے ملک کی اندرونی حالت کو سنبھالنے کے لئے کیا۔ اور پھر اس کے بعد اس کی خارجی لڑائیوں کا ذکر کرینگے۔ یہ دونوں باتیں گو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ لیکن ان کا ذکر علیحدہ علیحدہ بھی ممکن ہے۔

ملکی انتظام

اس کے سوانح سے اِس کے مقاصد کا صاف پتا چلتا ہے شخصی حکومت کے اختیارات کو وہ سب چیزوں پر بالا رکھنا چاہتا تھا۔ اور یورپین طرز معاشرت کو رواج دینا چاہتا تھا۔ اسکے علاوہ

تجارت وصنعت کے ذریعے سے روس کی دولت بڑھانے کا بھی خواہاں تھا۔ امراء اطاعت پر مجبور کئے گئے تھے۔ اور شرافت نسلی کے بجائے تعلیم اور فوجی خدمت بادشاہ کی نظر عنایت حاصل کرنے کا وسیلہ بنی ہوئی تھی روسا کے حقوق و امتیازات اور انکی مالی بدعنوانیوں پر وہ خاص طور پر نظر رکھتا تھا۔ لیکن خاصہ برداروں (Strelitz) کو وہ اپنے تدابیر کی تکمیل میں سد راہ سمجھتا تھا۔ یہ سپاہی شاہ روس کے خاص برمار تھے۔ جس طرح سلطان ترکی کے ینی چری یا جاں نثار یا شہنشاہ روما کے پرٹیوری (Praetorian) سپاہی تھے۔ اسی طرح یہ لوگ کاہل اور نااہل تھے۔ لیکن خاص امتیازات رکھتے تھے۔ اس وجہ سے پیٹر کی نئے نئے طریقوں سے مخالفت کرتے تھے۔ انھوں نے بغاوت کردی۔ مگر شکست کھا گئے۔ لیکن پیٹر فتح سے آسودہ نہوا۔ ان میں سے ہزاروں کو اس نے تہ تیغ کردیا۔ اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فوج پر اس کا کتنا قابو تھا۔

روس کو یورپ کے نمونہ کا بنانیکی کوشش

اس نے روس کو یورپ کے سانچے میں ڈھالنے کی جد وجہد میں اپنی تمام عمر صرف کردی۔ لیکن روایات اور عادات کے باعث نیز کلیسہ کی تائید کی وجہ سے لوگوں نے اسکے تجاویز کی سخت مخالفت کی۔ اس نے ڈاڑھی چھوڑنیکی ممانعت کردی تھی۔ حالانکہ یہ روس کا ایک قدیم طریقہ تھا۔ اور گو پیٹریارک (Patriarch) (مہتمم کلیسہ) نے ان لوگوں کو جو اس حکم پر چلتے تھے۔ بیدین قرار دیدیا تھا۔ لیکن پھر بھی شاہی فرمان پر عمل ہوکر رہا۔ اور بعض امرا کی ڈاڑھی پیٹر نے اپنے ہاتھ سے کتر دی۔ اس نے یورپین لباس اور یورپین رقاصی کو بھی رواج دیا۔ اور روسی عورتوں میں مشرق والوں کی طرح جو پردہ کا رواج ہوگیا تھا۔ اُسے اٹھا دینے کی بھی اُس نے جان توڑ کوشش کی۔ اب تک روسیوں کے یہاں سال کا آغاز یکم ستمبر سے ہوتا تھا کہ وہ "تخلیق عالم" کی سالگرہ کا یہی دن تھا۔ مگر پیٹر نے مغربی طرز پر جنوری سے سال کا آغاز رکھا۔ اس نے حکمت (Science) و ریاضی کی تعلیم کو خاص طور پر ترقی دی۔ اور نظم ونسق کے کل پرزوں کو از سر نو درست کیا۔ اِس معاملے میں اس نے جرمن فلسفی لیب نیز (Leibnitz) کی رائے پر عمل کیا۔ بچپن سے اس کو جہاز اور بحری سفر سے دلچسپی تھی۔ اور بعد کے تجربوں سے اسکی اِس رائے کی تائید ہوگئی کہ روس کی

موت و زندگی کا دارومدار سمندر پر ہے محض اِس غرض سے کہ بیڑے کو کسی طرح ترتیب دینا چاہئے۔ اُس نے ہالینڈ (Holland) انگلستان و فرانس کا سفر کیا۔ ہالینڈ میں اس نے

روس کی بحری طاقت

جہاز بنانے کا کام سیکھا اور ڈٹ فورڈ (Detford) میں رہکر انگلستان کے بحری طرز انتظام کے سمجھنے کی بے انتہا کوشش کی۔ واپس آکر اس نے ایک زبردست بیڑا تیار کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دریائے ڈون (Don) پر سفر کر کے ایزوو (Azov) پہنچا اور اس مستحکم قلعے کو ترکوں سے چھین لیا۔

روس میں بندرگاہوں کی کمی

ایسے منصوبوں اور ایسے اغراض کے ساتھ ناممکن تھا کہ پیٹر روس کے قائم شدہ حدود میں کچھ اضافے کی خواہش نہ کرتا۔ کھلے سمندر پر وہ اپنا قبضہ چاہتا تھا۔ لیکن سمندر تک پہنچنے کا راستہ اسکے لئے بالکل بند تھا۔ جنوب میں بحر اسود ترکوں کے قبضے میں تھا۔ شمال میں بحر بالٹک کا راستہ پولینڈ بلکہ سب سے زیادہ توسوئیڈن نے بند کر رکھا تھا۔ روسی حدود سے تھوڑے ہی فاصلے پر عمدہ عمدہ بندرگاہ تھے مگر روسی ملاحوں کی وہاں تک رسائی نہ تھی۔ صرف آرچ انجل (Archangel) پر روسی سرحد سمندر سے ملتی تھی۔ لیکن بحر آرکٹک (Arctic) کے ذریعہ سے روسی تجارت کو فروغ حاصل ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔

چارلز دوازدہم

یہ دیکھنے کے لئے کہ روس بحر بالٹک تک کیونکر پہنچا۔ ہم کو پھر سوئیڈن کی تاریخ اُلٹنا پڑیگی۔ گسٹاوس ایڈالفس کی بیٹی کرسٹانا (Christian) کے عجیب و غریب عہد حکومت کا مطالعہ کرنیکی ضرورت نہیں۔ اور نہ چارلس دہم (Charles X) و چارلس یازدہم (Charles XII) کے عہد حکومت کا گو چارلس دہم نے ایک کام یہ کیا تھا کہ ڈنمارک والوں کو سوئیڈن کے جنوبی اضلاع سے نکال باہر کر دیا تھا۔ اور چارلس یازدہم نے سوئیڈن کی دستوری شاہی حکومت کو مطلق العنان شخصی حکومت بنا دیا تھا۔ جس میں بادشاہ مختار کل ہو گیا تھا۔ اور بجز خدا کے کسی دوسرے کے سامنے جوابدہی کا ذمہ دار نہ تھا۔ لیکن ۱۶۹۷ء میں چارلس دوازدہم پندرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اور ۱۷۱۸ء یعنی اس کے وفات سے پہلے ہی بحر بالٹک کی ساحلی مملکتوں کا توازن بگڑ گیا تھا۔ نوعمر بادشاہ عمر کے ساتھ ساتھ جری حوصلہ مند اور ہونہار

ہوتا گیا۔ سپہگری میں گسٹاوس ایڈالفس کی طرح یکتا تھا۔ لیکن گسٹاوس کا سا تدبر و تفکر نہ رکھتا تھا۔ شمالی جنگ میں جس نے شمالی و مشرقی یورپ میں تہلکہ مچا دیا۔ چارلس دوازدہم محض مدافعت کر رہا تھا۔ اُدھر مغربی یورپ ہسپانوی عرب کی لڑائی میں مبتلا تھا۔ سویڈن کے مقبوضات عدم موقع ہونے کے باعث ڈنمارک۔ پولینڈ و روس کو حرص پیدا ہوئی۔ بادشاہ کی کم سنی اور ملک کے افلاس و تنگدستی و کمی آبادی کی وجہ سے سویڈن کے مقبوضات کو فتح و تقسیم کر لینا آسان معلوم ہوا۔ اس لئے ان تینوں دول نے سویڈن پر فوج کشی کرنے کے لئے ۱۶۹۹ء میں رابطۂ اتحاد قائم کر لیا۔

سویڈن پر حملہ

لیکن ان کے نوعمر حریف کے شاندار کارناموں نے ان کی آنکھیں کھولدیں سب سے پہلے تو اس نے ڈنمارک کا رخ کیا۔ ایک عالیشان فتح کے بعد وہ کوپن ہاگن (Copenhagen) کی شہر پناہ تک پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد جو صلح ہوئی تو اس نے ڈنمارک اور اس کے حلیفوں کو تاوانِ جنگ ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ تب اس نے روس کا رخ کیا۔ اور خلیج فن لینڈ کے قریب انگریا میں (Ingria) بمقام ناروا (Narva) اس نے صرف آٹھ ہزار

ناروا (Narva) کی لڑائی

سپاہیوں سے اپنی چگنی فوج کو شکست فاش دیدی۔ اس کا آخری حملہ پولینڈ پر ہوا۔ جہاں کے تاجدار آگسٹس نے سب سے پہلے سویڈن کے مقبوضات کو تقسیم کر لینے کی تجویز نکالی تھی۔ عظیم الشان فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پولینڈ والے شجاعت میں کم نہ تھے۔ لیکن ان میں ترتیب و انضباط معدوم تھا۔ اور حربی و دیگر لحاظ سے ان میں عضویت نہ تھی۔ علاوہ اس کے رعایا بھی تاجدار کا ساتھ دینے

پولینڈ کی تباہی

پر آمادہ نہ تھی۔ اس لئے سویڈن والوں کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ چارلس کے راستے میں کثرت تعداد کوئی چیز نہ تھی۔ آگسٹس پولینڈ کا بھی تاجدار تھا۔ اور سیکسنی (Saxony) کا الکٹر (Elector) (منتخب حکمراں) لیکن سکسنی کی فوج بھی پولینڈ کی فوج کی طرح بیکار ثابت ہوئی۔ وارسا (Warsaw) فتح ہو گیا اور وقت آگیا تھا کہ شاید جنگ کا خاتمہ ہو جاتا۔ کہ چارلس آگسٹس کو معزول کر کے اپنی پسند کا ایک حکمراں مسمی اسٹین سیلاس لِک زنسکی (Stainslas Leczinski) کو اسکی جگہ قائم کرنے پر اڑ گیا۔ لیکن یہ بھی منظور کرنا پڑا۔ جب سیکسنی برباد ہو گیا تو پولینڈ کے

تاجدار نے تخت سے دست بردار ہوجانے پر رضامندی ظاہر کرکے صلح کرلی۔ اسکے بعد روس کی باری آئی۔ جب ادھر چارلس سیکسنی میں مصروف جنگ تھا تو زار روس نے موقع پاکر سویڈن کے بالٹک اضلاع کو برباد کردیا تھا۔ لیکن ان اضلاع پر وہ اپنا قبضہ قائم نہ رکھ سکا۔ اور چارلس نے ماسکو (Moscow) پر فوج کشی کرکے اسے فتح کرلینا چاہا کہ جنگ کا خاتمہ ہوجائے۔ لیکن یہ بات اسکی طاقت سے باہر تھی۔ جب خود ان کے ملک پر فوج کشی ہوئی تو روسی سخت جان توڑ مقابلہ پر آمادہ ہوگئے۔ اس لئے چارلس نے ماسکو پر قبضہ کرنیکا خیال ترک کردیا۔ اور مزیپا (Mazeppa) نامی ایک کاسک (Cossacks) سردار کو اپنے ساتھ شریک کرنے کے لئے جنوب کی طرف چلا گیا۔ یہ کاسک سردار روس سے باغی ہوگیا تھا۔ اب بھی اسکو اپنے سے بڑی بڑی فوجوں پر غلبہ حاصل ہوتا رہا لیکن اتنے میں روس کا موسم سرما شروع ہوگیا۔ جسکی شدت سے اسکے بہت سے سپاہی مرگئے اور جو بچ رہے تھے اُن کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ روس کی جنوبی سرحد پر پلٹووا (Pultowa) نام کا ایک قلعہ تھا۔ جہاں روسیوں کی کثیر تعداد خیمہ زن تھی۔ سویڈن والوں نے اس قلعے پر حملہ کردیا۔ (۱۷۰۹ء)۔ لیکن مغلوب ہوکر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔ بادشاہ (چارلس) بھاگ کر ترکی چلا گیا بعد میں پھر اوس نے سر اٹھایا۔ اور سازشیں کرتا رہا اور ۱۷۱۴ء میں فوت ہونے سے پہلے کئی لڑائیوں میں شریک رہا آخرکار اسی سنہ میں ناروے کی ایک معمولی لڑائی میں مارا گیا۔

پلٹووا (Pultowa) کی لڑائی

سویڈن کی فوجی شیرازہ بندی پراگندہ ہوگئی اور اس قدر کہ پھر درست ہی نہ ہوسکی اسکی انتہائی قوت مقابلہ صرف ہوچکی تھی۔ ہر ایک کاریگر اور ہر دو کسانوں میں ایک شخص فوج میں بھرتی کرلیا گیا تھا۔ چارلس دوازدہم کی وفات کے بعد کئی صلحیں طے پائیں۔ مشرقی پامیرینیا پرائشیا کو مل گیا۔ جو اُسوقت سے بہت سے قومی بالٹک طاقت اور روس کا اصل مدمقابل بن گیا۔ لیکن روس کو سب سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا۔ اُس نے سویڈن کے وہ تمام اضلاع لے لئے جو خلیج فن لینڈ کے اطراف میں واقع تھے۔ اور یہیں پیٹر نے سینٹ پیٹرس برگ (St. Petersburg) کا

سویڈن کے علاقوں کی تقسیم

شہر آباد کیا۔ جو روسی بیڑے اور تجارت کا مرکز ہو گیا۔ اور مغربی یورپ سے تعلق قائم
رکھنے کا ذریعہ ثابت ہوا۔ ۱۷۲۱ء میں اسے "پدر وطن" اور روسیوں کے شہنشاہ
پیٹر اعظم کا لقب دیا گیا۔ روس نے اب تک اس شاہ راہ کو ترک نہیں کیا۔ جو پیٹر اعظم
نے اُسکے بنا دی تھی۔

روس کی توسیع

روس میں اب تک ایک استبدادی حکومت اور پائدار نظم و نسق کا
قیام ہو گیا۔ اور پیٹر اپنے جانشینوں کو جارحانہ تدبیر و حکمت عملی کا
راستہ بتلاتا گیا۔ اطراف میں سویڈن ایسی کمزور، ترکی ایسی رو بہ زوال
اور پولینڈ ایسی پُرشورش اور وسطی ایشیا ایسی بے سروپا سلطنتیں تھیں۔ اس لئے روس
کی روز افزوں وسعت کوئی معجزہ نہ تھا۔ روس نے مغربی یورپ یا کسی ایسی سلطنت
سے جس کا انتظام معقول ہو کوئی ملک نہیں حاصل کیا۔ پیٹر کے بعد کے حکمرانوں کے
عہد حکومت کے واقعات درج کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ پیٹر کے جانشینوں میں
کیتھرائین دوم (Catherine II) نامی ایک عورت خاص طور پر ممتاز ہے۔ یہ جرمن
نژاد عورت پیٹر سوم کی بیوی تھی۔ اور ۱۷۶۲ء میں اپنے خاوند کو قتل کر کے تخت نشین
ہوئی تھی گو خود وہ جرمن نژاد تھی۔ لیکن اس میں وہ سب خصوصیات موجود تھے۔ جن کے
لئے روسی شاہی حکومت ممتاز ہے۔ شر انگیزی اور بے رحمی میں وہ کسی سے کم نہ تھی۔
اور فرانس و مغربی یورپ کی علمی تحریکوں میں اسکو خاص دلچسپی تھی۔ اور اس لحاظ سے
وہ ڈیڈرو (Diderot) و والٹر (Voltaire) سے مشابہ تھی۔ لیکن اپنے عہد حکومت بھر وہ
اپنے قلمرو میں بغیر کسی شریک و سہیم کے حکمراں رہی۔ اور ہر طرف اپنے ملک میں اس نے
اضافہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس کے زمانے ہی میں فرانسیسی انقلاب رونما ہوا۔
دوسرے باب میں ہم بتلائینگے کہ اس تحریک سے اس کو کیا تعلق تھا۔ اور شروع
شروع اس نے اس سے کیا کیا فائدے اٹھائے۔

باب دوازدہم

پرشیا اور آسٹریا اٹھارھویں صدی میں

موجودہ جرمنی سلطنت کے قیام پرشیا کی اہمیت

اگر یورپ کے موجودہ نقشے پر ہم ایک نظر ڈالیں تو ٹھیک جرمنی کے شمال میں روسی سرحد سے لیکر ہالینڈ و بلجیم و فرانس کی سرحد تک پرایشیا (Prussia) ملک پھیلا ہوا معلوم ہوگا۔ بڑے بڑے دریاؤں کے دہانے اور بڑے بڑے بندرگاہ اُسی کے قبضے میں ہیں۔ جزیرہ نمائے ڈنمارک کا نشیبی حصہ بھی اُسی میں شامل ہوگیا ہے۔ اس کے سوا شمالی جرمنی میں جو خود مختار ریاستیں ہیں۔ وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں پرایشیا (Prussia) کی بدولت جرمنی میں اتحاد قائم ہوا۔ اور جرمنی کی خارجی پالسی کا انحصار بھی پرایشیا (Prussia) ہی پر ہے۔ انگریز اکثر پرایشیا و جرمنی کو ایک سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہ ایک سہو ہے مگر قابل معافی کیونکہ جرمنی بحیثیت ایک سلطنت کے محض پرایشیا کی تاریخ وسعی کی بدولت قائم رہے۔

پرایشیا جرمنی کا نمایندہ

وہ تاریخی واقعات جن کی بدولت یہ صورت حال قائم ہوگئی ہے عجیب و غریب ہیں۔ موجودہ پرایشیا ایک مصنوعی اور بناوٹی مملکت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ایسے اضلاع پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے علیحدہ اور مختلف ہیں۔ اور محض مصاہرت

پرشیا کا عروج
۱۴۱۸ - ۱۹۱۴
پیمانہ بحساب انگریزی میل
بحیرہ شمالی
سویڈن
ڈنمارک
بحر بالٹک
پولینڈ
روس
حدود پرشیا ۱۹۱۴ میں

یا وراثت کے اتفاقی اسباب سے اس میں مل گئے ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیئے جنگ وتدبیر کے اثر نے ان دونوں کو متحد کر دیا تھا۔ لیکن اگر ہم اس ملک کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ اشتمال اتفاقی یا مصنوعی نہیں ہے۔ پرایشیا کے عروج سے جرمنی کو نیا جنم ملا۔ اور پرایشیا موجودہ مرتبے تک محض اس وجہ سے پہنچ سکا کہ جرمنی کی تمام ریاستوں میں صرف یہی ایک ریاست ایسی تھی جس میں حقیقی جرمنیت پائی جاتی تھی اور تمام رعایا کے خواہشات وخصوصیات کی صحیح نمایندگی بھی یہی ریاست کرتی تھی۔

پرایشیا کے عروج کے تین اجزا و اسباب

پرایشیا کے عروج و ترقی کے خاص اجزا تین ہیں ایک تو ولایت برینڈنبرگ (Brandenburg) ہے جس کو کہ اس سلطنت کی اصل بنیاد و مرکز کہا جا سکتا ہے۔ اسکے بعد وہ ملک ہے جو کہ اصل پرایشیا کہلاتا تھا۔ یہ ملک والی برینڈنبرگ نے اپنی مملکت میں اضافہ کر لیا تھا۔ اور بعد میں تمام سلطنت اسی نام پر پرایشیا کہی جانے لگی۔ تیسرا جزو خاندان ہوہن زالرن (Hohenzollern) تھا جس نے حکمت عملی وفتوحات وخوش نصیبی سے کل ملک کو ایک متحدہ سلطنت بنا دیا۔

برینڈنبرگ کی ابتدائی تاریخ

برینڈنبرگ کے عروج کا کچھ حال گزشتہ ابواب میں بتلایا گیا ہے۔ شروع شروع یہ مملکت ایک سرحدی چوکی تھی جس کو مارک (Mark) یا سرحد کہتے تھے۔ قبائل سلیوانک (Slavonic) اور دوسرے غیر جرمن اقوام جو دریاے ایلب (Elbe) کے اوس پار آباد تھیں۔ اُن کی روک تھام کے لئے اصل میں یہ چوکی قائم کی گئی تھی۔ یہ سرحدی صوبہ اسکینین (Ascanian) خاندان کے عہد میں بہت بڑھ گیا لیکن ۱۳۱۹ء میں جب یہ خاندان فنا ہو گیا ایک صدی تک بدنظمی رہی۔ اور اس اثنا میں حکمران بھی بدلتے رہے اور صوبہ کی وسعت بھی کم ہوتی گئی۔ آخرکار ۱۴۱۵ء میں شہنشاہ سگس منڈ (Sigismund) نے یہ صوبہ اور اس کا لوازمہ وخطاب منتخبی اپنے دوست فریڈرک (Frederick) کو دیدیا جو خاندان ہوہن زالرن سے تھا۔ اور نیورن برگ (Nurnberg) کا برگراو (Burgrave) بھی اور جس نے کانسٹنس (Constance) کی

مجلس کے زمانے میں شہنشاہ کا بہت ساتھ دیا تھا۔ اِس شخص کے لیئے بڑا مشکل کام امن قائم کرنے کا تھا۔ اور اپنی کھوئی ہوئی اراضی پر اُسے پھر قبضہ کرنا تھا۔ جرمنی میں ہمیشہ اِس قسم کا میلان طبع رہا ہے کہ بڑی بڑی مملکتوں کے ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے۔ حالانکہ فرمان طلائی کی شرائط کے لحاظ سے بغیر کسی تقسیم و تخفیف کے ہر ولایت اولاد نرینہ کو ترکے میں ملنا چاہیئے تھی۔ لیکن ۱۴۷۳ء میں اکیلس کے قانون توریث (Dispositio Achillea) نے ولایت برینڈنبرگ کو ہمیشہ کے لیئے ناقابل تجزیہ قرار دیا۔ (اکیلی قانون توریث (Dispositio Achillea) البرٹ (Albert) اکیلس (Achilles) والی برینڈنبرگ کے خاندانی وراثت کے بندوبست و تصفیہ کو کہتے ہیں۔ اِس تصفیے کی رو سے خاندان کے دوسرے مقبوضات تو ایک حد تک تقسیم ہونے کے لائق قرار دیئے گئے۔ مگر برینڈنبرگ کی ولایت سائے بڑے بیٹے کا حق قرار دی گئی۔

۱۵۱۱ء میں ہاہن زالرن (Hohenzollern) خاندان کا البرٹ آقائے نامدار منتخب ہوتا ہے

اِس طور پر ہاہن زالرن خاندان برینڈنبرگ میں جم گیا۔ لیکن پرائیشیا کو اب تک اِس خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس غیر جرمن ملک میں ٹیوٹانی مبارزین فتح و تبلیغ کر رہے تھے۔ اور اس کو برینڈن برگ سے بجز پڑوس اور ہم مذہب ہونے کے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ بتلایا جا چکا ہے اِن مبارزین کی حالت ابتر ہو رہی تھی ٹینین برگ (Tanningburg) کی مشہور لڑائی میں پولینڈ والوں نے اسکو شکست دیدی تھی۔ اور ان کے ملک کا کچھ حصہ جسکو مغربی پرائیشیا کہتے تھے پولینڈ والوں نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ اور بقیہ ملک پر بھی شاہ پولینڈ کی جاگیری سرواری قائم ہو گئی تھی اسوجہ سے اُن کی حالت نازک ہو گئی تھی۔ اور اب انھیں کسی غیر ملکی حامی و مددگار کی ضرورت پیدا ہوئی اس لیئے ۱۵۱۱ء میں انھوں نے ہاہن زالرن خاندان کے البرٹ کو اپنا آقائے نامدار بنا لیا۔ یہ شخص اُسی خاندان کا رکن تھا۔ جو کہ برینڈنبرگ میں حکمراں تھا۔ جب مذہبی اصلاحات کا دور شروع ہوا تو البرٹ نے سمجھ لیا کہ اگر وہ پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کرلے تو مبارزین کا کل ملک اس کے زیر اقتدار ایک دنیاوی مملکت بن جائیگا۔ جو اس کے بعد اسکی اولاد کو

منتقل ہوسکیگا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور اِس طور پر پرایشیا میں ہاہن زالرن (Hohenzollern) خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔

پرایشیا اور برینڈنبرگ کا اتصال ۱۶۱۱ء

۱۶۱۱ء میں البرٹ کے خاندان کا کوئی وارث نہ رہا۔ اس لیئے جوکم فریڈرک (Joachim Frederick) والی برینڈنبرگ پرایشیا کا بھی وارث و مالک بن گیا۔ لیکن اِس زمانے میں بھی پرایشیا پولینڈ کا جاگیردار ماتحت بنا رہا۔ اور برینڈنبرگ و پرایشیا کے درمیان پولینڈ کے مقبوضات بھی حائل تھے۔ ٹھیک اِسی زمانے میں ایک اور ترکہ برینڈنبرگ کے ہاہن زالرن خاندان کو بوجہ مُصاہرت مل گیا۔ جو اہمیت میں اس سے کم نہ تھا۔

ڈیولیخ۔ کلیوز (Cleves Julich) اور برگ (Berg) کا اضافہ

۱۶۰۹ء میں ڈیولیخ (Julich) کلیوز (Cleves) اور برگ (Berg) کا ڈیوک جب فوت ہوا تو اوس کی وراثت کے بارے میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ والی برینڈنبرگ نے اسکی بھتیجی سے عقد کیا تھا۔ اس لیئے وہ بھی دعویدار ہوا۔ آخرکار اس ولایت کا بیشتر حصہ برینڈنبرگ میں شامل ہوگیا۔ یوں بھی یہ اضلاع اہمیت رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اُن کے اطراف کے مقبوضات بھی شامل ہوجانے سے اِن اضلاع کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ اِس طور پر والی برینڈنبرگ مختلف لقب کے ساتھ تین مختلف قطعات پر حکومت کرنے لگا۔ اِن میں سے ایک تو مقبوضات رائن (Rhine) تھے۔ دوسرے ولایت برینڈنبرگ اور تیسرے ولایت پرایشیا تھی۔ اِن منتشر مقبوضات سے ایک ایسی متحد و قوی سلطنت قائم ہوجانا جو تمام یورپ سے زیادہ متحد و متفق ہوجائے۔ ممکن نہیں معلوم ہوتا تھا۔

(Brandenbarg) برینڈنبرگ جنگ سی سالہ میں

الکٹر اعظم

جنگ سی سالہ میں برینڈنبرگ نے کوئی نمایاں حصہ نہ لیا۔ والی ملک مسمی جارج ولیم خود کالونی مذہب کا پیرو تھا۔ اور اسکی رعایا لوتھری مذہب کی۔ وہ غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا۔ لیکن دونوں فریقوں نے اسکے ملک کو برباد کردیا۔ اور جرمنی کا کوئی صوبہ ایسے ابتلا میں نہیں پڑا۔ ۱۶۴۰ء میں فریڈرک ولیم و "منتخب اعظم" اس کا جانشین ہوا۔ موجودہ پرایشیا کا بانی یہی شخص ہے۔ اِس قسم کے

لوگ پرایشیا کے تخت پر اکثر متمکن ہوئے ہیں - وہ قوی دل و دماغ رکھتا تھا۔ اس میں استبدادیت بھی ایک حد تک تھی - اوس میں کوئی کشش نہ تھی۔ نہ دلچسپی نہ تخیل آفرینی کا سامان رکھتا تھا۔ لیکن سلطنت کی فلاح وبہبودی کا اس کو بہت خیال تھا۔ اور اس وجہ سے نہ وہ خود کام اور محنت سے جی چراتا تھا نہ دوسروں ہی کو پہلوتہی کا موقع دیتا تھا۔ صلح ویسٹ فیلیا (Westphalia) میں برینڈن برگ کو بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ چنانچہ میگڈ برگ (Magdeberg) اور مشرقی پامیرینیا (Pomerania) اس میں شامل کردی گئی۔ آخرالذکر کی اہمیت اس وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ سمندر سے آمد و رفت کا اس نے راستہ کھولدیا۔ لیکن فریڈرک ولیم کے نتیجہ خیز مشاغل اس صلح کے بعد شروع ہوئے اس کا سب سے بڑا کام اتحاد قائم کرنے کا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس نے پرایشیا کی تجارت کو بھی فروغ دیا - اور جنگ سی سالہ میں پراشیا کی فوج پر جو دھبہ لگ گیا تھا اسکو مٹا دیا۔

آزاد اداروں کی بربادی

تمام ملک کے نیابتی اداروں کو فنا کردینے کے بعد کہیں سلطنت کا اتحاد قائم ہوسکا۔ برینڈنبرگ - پرشیا و کلیوز (Cleves) ہر جگہ انتظامی انجمنیں (Estates) قائم تھیں۔ لیکن سب مٹا دی گئیں۔ ان جماعتوں نے اپنے بقا کے لئے ہرچند بہت کوشش کی اور اون کے قائد بھی ہنرمند و مستعد تھے۔ لیکن سب بے سود ہوا۔ مرکزی سلطنت کے احکام سب سے بالا قرار دئے گئے۔ اور اسکی کونسل تمام نظم و نسق کا ذریعہ قرار دی گئی۔ اداروں میں بہت سے اختلافات اب بھی باقی رہے۔ لیکن اتحاد کی طرف پہلا قدم اُٹھ چکا تھا اور یہ امر قابل لحاظ ہے کہ پہلے ہی قدم میں آزاد اداروں کو ٹھکرادیا گیا۔

الکٹر اعظم (Elector) کی جنگی فتوحات

"منتخب اعظم" بہت سی لڑائیوں میں شریک ہوا۔ اور کبھی ایک طرف سے اور کبھی دوسرے طرف ہوکر وہ لڑائی لڑتا رہا۔ لیکن سب سے زیادہ بارآور وہ لڑائی تھی۔ جب میں وہ پولینڈ کے خلاف لڑا تھا۔ سوئیڈن کے بادشاہ کا ساتھ دیکر فتح وارسا (Warsaw) میں وہ شریک ہوگیا۔ لیکن اس جنگ کا خاص نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے شاہ پولینڈ کو اس پر آمادہ کرلیا کہ پرایشیا پر اُس کو جاگیری سرداری جو حاصل تھی اُس سے

دست کش ہو جائے اور خود والی برینڈنبرگ کو پرایشیا کا تاجدار تسلیم کرلے ۱۶۷۵ء میں اس کا سب سے بڑا فوجی کارنامہ ہوا۔ اُس وقت وہ سویڈن والوں سے برسرپیکار تھا۔ جو شاہ فرانس کے حلیف بن گئے تھے۔ سویڈن والوں نے برینڈنبرگ پر فوج کشی کی۔ مگر فریڈرک ولیم نے جنگ فہربیلن (Fehrbellin) میں اس کو شکست فاش دی۔ اسی فتح کے باعث اس کو ”منتخب اعظم“ کا لقب ملا۔

صنعت و حرفت کی ترقی

اس نے اپنے علاقہ میں نہریں بنوائیں۔ اور باہر کی اشیا پر محصول عائد کرکے اپنی ملک کی صنعت و حرفت کو بھی ترقی دی۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے سب سے کارگر تدبیر اس نے ۱۶۸۵ء میں اختیار کی۔ وہ اس طور پر کہ فرانس کے ہیوگینو (Huguenots) لوگوں کو جب لوئی چہاردہم نے اپنے ناعاقبت اندیش طرز حکومت کے بدولت جلاوطن کردیا تو اس نے ان کو برلن (Berlin) میں پناہ دی۔ اُنھیں لوگوں کے بسنے سے برلن اس قدر سرسبز ہوگیا۔ ان مہاجرین کے ساتھ بڑی رعایتیں کی گئیں۔ اور زراعت و صنعت و حرفت میں ترقی کرکے ان لوگوں نے ملک کی دولت بڑھادی۔

فریڈرک اول شاہ پرایشیا

۱۶۸۸ء میں فریڈرک ولیم کا جانشین اس کا بیٹا فریڈرک سوم ہوا۔ یہ شخص اپنے باپ کے برعکس اپنے عہدہ کی شان و شوکت کا دلدادہ تھا۔ اور سلطنت کے نظم و نسق کا بھی اس میں مادہ نہ تھا۔ لیکن اس کا عہد حکومت اس وجہ سے ممتاز ہے کہ فریڈرک سوم والی برینڈنبرگ فریڈرک اول شاہ پرایشیا کے لقب سے بھی ممتاز ہوگیا۔ جرمنی کے (۳) شہزادوں (Princes) نے شاہی کا خطاب حاصل کرلیا تھا۔ مثلاً ہینوور (Hanover) کا والی انگلستان کا بادشاہ ہوگیا تھا اور سیکسنی (Saxony) کا والی پولینڈ کا بادشاہ بن گیا تھا۔ اور ہالسٹین (Holstein) کا ڈیوک ڈنمارک کا تاجدار ہوگیا تھا۔ اس لئے اب برینڈنبرگ کا والی بھی اسی طرح بادشاہ بننے کا مستحق تھا۔ ہسپانوی وراثت کی جنگ شروع ہونے سے پہلے جو کارروائی و گفت و شنید ہوئی اسکی وجہ سے شہنشاہ (آسٹریا) کو برینڈنبرگ کی رفاقت بہت کارآمد معلوم ہوئی۔ ابتداءً تو تاجداران فرانس و انگلستان کے مجوزہ معاہدہ تقسیم کی مخالفت کے لئے

اور بعد میں لوئی چہاردہم (Louis XIV) کی اُس کوشش کو بیکار کرنے کے لئے جو
تختِ اسپین اپنے پوتے فلپ (Philip) کو دیئے جانے کے لئے وہ کر رہا تھا۔
اِن وجوہ سے شہنشاہ لیوپولڈ اول (Leopold I) نے بادشاہ کے خطاب کی منظوری
دیدی۔ اِس شرط کے ساتھ کہ سلطنت آسٹریا کے کسی حصے پر قبضہ نہ کیا جائے۔
پرشیا حدود سلطنت کے باہر تھا۔ اسوجہ سے تاریخ کے طالب علم کو یہ دیکھ کر کہ جرمنی کی سربرآوردہ
سلطنت ایسے ممالک پر مشتمل تھی۔ جو اصل میں جرمن نہ تھے۔ خلجان پیدا ہوتا ہے۔ یہ جدید عمل محض
نام ونمود کی خاطر نہ تھا۔ بلکہ اس شاہی خطاب کے حاصل کرنے سے حکومت کو اور بھی مطلق العنانی
واستبدادیت کا موقع مل گیا۔ ہسپانوی وراثت کی جنگ اور اُسی زمانے کی شمالی نبرد آزمائی
میں پرائشیا کی شرکت کا بیان ہم نہیں کرینگے۔ یہ وہی لڑائیاں ہیں۔ جن میں چارلس دوازدہم
شاہ سوئیڈن نے ناموری بھی حاصل کی تھی اور پھر آخرکار تباہ بھی ہوگیا۔ لیکن اتنا ہم ضرور
بتلادیتے ہیں کہ پرائشیا کے سپاہیوں نے بلین ہیم (Blenheim) اور دوسری لڑائیوں میں
اپنی وہ شہرت قائم رکھی جو وارسا و فہربیلن (Fehrbellin Warsaw) کی لڑائیوں میں انھوں نے
حاصل کی تھی۔

فریڈرک ولیم اول

۱۷۱۳ء میں فریڈرک ولیم اول اپنے باپ (فریڈرک سوم) کا جانشین
ہوا۔ یورپ کا کوئی تاجدار ایسا عجیب وغریب نہ تھا۔ اِس میں "منتخب
اعظم" کے صفات تھے۔ لیکن حد سے متجاوز اور ایک گونہ بہیمیت لئے ہوئے جو دیوانگی کی
حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ کفایت کے خیال سے وہ اپنے باپ کی سی شان وشوکت
کے خیالات کا مخالف تھا۔ اور تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے باپ کے زمانے کے
رنگیلے مصاحبوں کو علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد وہ ملک کے نظم ونسق کی اصلاح اور اقتصادی
فلاح وبہبود میں مصروف ہوگیا۔ پرائشیا میں نیابتی حکومت یا آزادی کا ذکر تو کجا۔ بادشاہ کے

اسکی مطلق العنانی

افعال پر نکتہ چینی کا بھی کسی کو یارہ نہ تھا۔ وہ (فریڈرک ولیم اول)
کہا کرتا تھا۔ کہ ہم بادشاہ اور آقا ہیں۔ ہم کو حق ہے کہ جو چاہیں کریں
سلطنت کا انتظام شاہی عہدہ داروں کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ جنکی تنخواہیں کم اور نگرانی
زیادہ رکھی جاتی تھی اور اگر کوئی جرم اِن پر ثابت ہوجاتا تھا تو سخت سزا دی جاتی تھی۔ بادشاہ
نے تعلیمی امور میں بھی دلچسپی ظاہر کی جس سے اب تک پرائشیا کے تاجدار بے اعتنائی

برتتے آئے تھے۔ مذہبی مباحث میں بھی اس کو خاص دلچسپی تھی۔ لیکن ہر معاملے میں وہ پرلشیائی تنگ نظر و مطلق العنان تھا۔ وہ کہتا تھا کہ قدیم تاریخ یا دوسرے ممالک کی تاریخ پڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ صرف برینڈنبرگ کی تاریخ اسکے نزدیک اہمیت رکھتی تھی۔ اور برینڈنبرگ یا پرلشیا میں دو باتوں پر اسکی خاص توجہ تھی۔ ایک تو وصول محاصل دوسرے انتظام فوج۔ یورپ کی دوسری قدیم سلطنتوں کے مقابلے میں اسکے ملک کی زمینیں خراب تھیں لیکن وہ ان زمینوں سے جتنا بھی ممکن ہو سکتا تھا پیدا کرانیکی کوشش کرتا تھا۔ اور اس پیداوار سے بڑا حصہ سلطنت کے خدمات کے معاوضے میں وصول کرلیتا تھا۔ مالی بدعنوانیوں کو دیکھ کر اس کے غصہ کی انتہا نہ رہتی تھی۔

پرشوی فوج میں اضافہ

بجز دو ایک مرتبہ کے وہ اپنے عہد حکومت بھر امن امان قائم رکھ سکا۔ لیکن اُس نے پھر پرلشیا (Prussia) کی پناہ کو بے انتہا بڑھا دیا اور ساتھ ساتھ بہت کارآمد بھی بنا دیا۔ جب وہ تخت پر بیٹھا ہے تو صرف (۳۸۰۰۰) سپاہی اس کے پاس تھے۔ لیکن ۱۷۳۹ء میں ان کی تعداد (۸۳۰۰۰) ہوگئی فرانس کے پاس (۱۶۰۰۰۰) اور آسٹریا کے پاس بمشکل ایک لاکھ کی فوج تھی۔ مگر پرلشیا کی فوج تعداد کے علاوہ زیادہ کام کی بھی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر موقع آتا تو خود بادشاہ سپاہ سالاری کرنے سے تو قاصر رہتا۔ لیکن قواعد کرانے کے کام میں وہ کسی سارجنٹ سے کم نہ تھا۔ اور پھر اس نے اپنے فوج کو اچھی طرح مسلح و آراستہ کر رکھا تھا۔ اور اسکی فوج کا انضباط بھی اعلیٰ پیمانے کا تھا۔ لیکن جس طرح کہ اسکے ہر کام میں بدمذاقی و بےشعوری پائی جاتی ہے۔ یہاں بھی اسکے قوی ہیکل گرینڈیر (Grenadier) (پیادہ) سپاہیوں میں موجود تھی۔ جن کے ساتھ وہ اتنی ہی محبت رکھتا تھا۔ جتنا کہ ایک کتا پالنے والا اپنے کتوں کے ساتھ اور جن کی خاطر وہ خود اپنا اور اپنے پڑوسیوں کا ملک غارت کرنے سے بھی نہیں شرماتا تھا۔

باپ بیٹے

اسکی خانگی زندگی بھی یورپ کے لئے اہم ثابت ہوئی۔ اسلئے کہ فریڈرک اعظم اسی کا بیٹا تھا۔ شروع ہی سے باپ بیٹے میں نزاع رہی تھی۔ باپ تو ظالم، جاہل اور کندۂ ناتراش تھا اور بیٹا علم کا سرپرست تھا۔ اور اس کا طرز معاشرت جرمن ہونیکے بجائے فرانسیسی تھا۔ اور بظاہر پرلشیا کے معاملات میں اس کو دلچسپی بھی نہ تھی فنون لطیفہ کا وہ شایق تھا اور مذہب کے متعلق اُسے شکوک تھے۔ اپنے

باپ کی بلانوشی و بسیار خوری اور تمباکو کشی سے اسکو سخت نفرت تھی۔ اس وجہ سے درباری زندگی اسکے لئے وبال ہو گئی۔ اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ گرفتار ہو گیا۔ اور دربار میں لایا گیا۔ وہاں اسکو سزائے موت سنائی گئی۔ آخر میں اسکی جان بخش دی گئی۔ مگر اسکا ہمراہی دوست قتل کر دیا گیا اور دوسرے لوگوں کو بھی بلا سبب و بلا تحقیقات سخت سے سخت سزائیں دی گئیں۔ نوعمر شاہزادے کو مجبوری کے آگے سر جھکا دینا پڑا۔ اور دل پر جبر کر کے اس نے اپنے باپ کے مذہب کی پیروی کا اعلان کیا نظم و نسق کے کاموں میں سچے شوق سے منہمک ہو گیا۔ اپنے باپ کے حکم سے اس نے ایک ایسی عورت سے عقد بھی کر لیا جسکو نہ تو وہ پسند کرتا تھا اور نہ جس سے اسے محبت ہی تھی۔ اس کا دل و دماغ بہت قوی تھا لیکن پھر بھی جب ۱۷۴۰ء میں وہ تخت پر بیٹھا تو اس میں پہلی سی شائستگی اور انسانیت باقی نہ تھی وہ بدظن اور تلخ ہو گیا تھا۔ اور ہر بات میں جبر زنی کا عادی

فریڈرک اعظم کا شباب

فریڈرک دوم کی تخت نشینی اسی تاریخ کو ہوئی جس تاریخ کو شہنشاہ چارلس ششم کی وفات واقع ہوئی۔ جس کے باعث خاندان آسٹریا کی تاریخ میں ایک نیا باب کھل گیا۔ جس میں فریڈرک بہت بڑا حصہ لینے والا تھا۔ آسٹریا کے خاندان نے جنگ سی سالہ میں اپنی سب تدبیروں پر پانی پھرتے دیکھا تھا۔ مگر بعد ازاں اسکے مقبوضات و اقتدار و قوت میں معقول اضافہ ضرور ہوا۔ لیکن یہ جدید مقبوضات غیر جرمن ملک میں تھے۔ اور آیندہ کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اسی وجہ سے جرمنی کا حقیقی سردار آسٹریا نہیں بن سکا۔

شہنشاہ چارلس ششم کی وفات

رومن کیتھلک تحریک ردعمل تمام ملک (آسٹریا) میں کامیابی کے ساتھ پھیل گئی تھی تعلیمی حالت بھی پست تھی۔ اور علوم و فنون حکمت و ادب کسی کی ترقی نہ ہوئی لیکن آسٹریا کی فوج ہسپانوی وراثت کی جنگ میں اور ترکوں کے مقابلے میں برابر کامیاب رہی۔ ترکوں پر جنوب و مشرقی سمت میں اسنے مسلسل فتوحات حاصل کئے۔ چنانچہ ۱۵۷۱ء کی جنگ لیپانٹو (Lepanto) میں ترکی کی بحری قوت بالکل ٹوٹ گئی۔ گو اسکی بری طاقت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ ۱۶۸۳ء میں یہ طاقت بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھی لیکن انجام کار اس کا زوال شروع ہو گیا۔

ترکوں کے مقابلہ میں آسٹریا کی فتح

ترکی فوج نے وی اینا (Vienna) پہنچ کر اس شہر کا محاصرہ

وی اینا

کرلیا۔ شہنشاہ لیوپولڈ اول (Leopold I) وہاں سے بھاگ نکلا۔ اور شہر فتح ہوجانیکو تھا کہ سوبیسکی (Sobieski) شاہ پولینڈ نے فوج کشی کرکے بچالیا۔ اور ترک بے سروسامانی سے پسپا ہوگئے۔

موہیکز (Mohacz) سنہ ۱۶۸۰ء میں ترک موہیکز (Mohacz) کے میدان میں شکست فاش کھا گئے۔ جہاں سنہ ۱۵۲۶ء میں انھوں نے عظیم الشان فتح حاصل کرکے ہنگری پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس کے بعد ہر دسویں سال ان کا ملک اور ان کی طاقت گھٹتی گئی۔ سنہ ۱۶۹۹ء میں سلطان المعظم نے صلح کرکے کل ہنگری کا ملک خالی کردیا۔ اس سے قبل ہیپسبرگ (Hapsburg) خاندان والے گو اپنے کو شاہ ہنگری کہتے تھے۔ لیکن ان کے قبضے میں صرف مغرب و شمال کی تھوڑی سی زمین کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی زمانے میں شاہی قوت کو ہنگری و بوہیمیا (Bohemia) میں جاگیردار روسا کی قوت و قومی آزادی کے جذبے کو پامال کرتے میں کامیابی ہوئی۔ اب تک ہنگری کا تخت و تاج انتخابی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۶۸۷ء میں اس تخت پر آسٹروی خاندان کا موروثی حق تسلیم کرلیا گیا۔ مخالفت تو اب بھی باقی رہی۔ لیکن ہنگروی دساتیر کے عناصر آزادی کمزور پڑ گئے تھے۔

سنہ ۱۷۱۱ء میں چارلس ششم شہنشاہی تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اسکی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ خاندان ہیپسبرگ (Hapsburg) کے مقبوضات اس کی بیٹی ماریا تھیریزا (Maria Theresa) کو مل جائیں۔ اور شاہنشاہی کا لقب

چارلس ششم و ماریا تھیریزا

اس کے خاوند لورین کے فرانسس (Francis of Lorraine) کو۔ اس لئے اس نے پرگیمٹک سنکشن (Pragmatic Sanction) (فرمان شاہی جو قانونی اثر رکھتا ہو) مرتب کیا جس میں اس نے اپنی لڑکی کے حقوق کا اعلان کیا۔

اس فرمان پر اس نے تقریباً تمام دول یورپ کی دستخط لے لی۔ اور خود اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں کی بھی۔ اس کے بہادر سپہ سالار پرنس یوجین (Eugene) نے اسے متنبہ کردیا کہ اس قسم کے معاہدوں سے زیادہ محفوظ طریقہ تو یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی فوج قائم رکھی جائے۔ لیکن چارلس ششم اپنی وفات تک بھی سمجھتا رہا کہ اس نے اس تدبیر سے اپنی بیٹی کا حق وراثت استوار کردیا ہے۔

فریڈرک کا حملہ سائیلیشیا پر

۱۷۴۰ء میں چارلس ششم کی وفات پر معلوم ہوگیا کہ یہ کاغذی ضمانت بالکل بیکار تھی۔ پرائیشیا کے فریڈرک نے سائیلیشیا (Silesia) کے زرخیز صوبہ پر فوج کشی کی۔ یہ صوبہ دریائے اوڈر (Oder) کے بالائی حصہ میں تھا۔ اس کے کچھ حصے کے متعلق فریڈرک جائز طور پر دعوے بھی کرسکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ اس نے اپنے تذکرے میں خود بیان کیا ہے کہ اس صوبے کی دولت لینے اور اپنی ہوس بجھانے کے لئے اس نے اس پر حملہ کیا تھا۔ اسکے باپ کی تیار کردہ فوج باوجود ناتجربہ کاری کے کارآمد ثابت ہوئی۔ اور سائیلیشیا پرائیشیا کے قبضے میں آگیا۔

آسٹروی وراثت کی جنگ

ایک زبردست یوروپین جنگ شروع ہوگئی۔ اور پریگمیٹک فرمان کا کسی نے بھی لحاظ نہ کیا۔ فرانس پرائیشیا کے ساتھ شریک ہوگیا۔ اور انگلستان چونکہ تمام صدی فرانس سے مخالف رہا تھا۔ اس وجہ سے وہ ماریا تھیریزا کو نقدی امداد دینے لگا۔ پرائیشیا و فرانس نے چارلس والی بویریا (Bavaria) کو شہنشاہی تخت پر بٹھانے کا قصد کرلیا۔ یہ جنگ ۱۷۴۸ء تک جاری رہی اور صرف یورپ تک محدود نہیں رہی بلکہ فرانس و انگلستان کے سپاہی امریکہ و ہندوستان میں بھی ایک دوسرے سے لڑنے لگے کیونکہ انگلستان کا اصلی مقصد اس جنگ میں شرکت کرنے سے تجارتی اور نوآبادیاتی فوائد حاصل کرنے کا تھا۔

ماریا تھیریزا اور ہنگری

اس جنگ کے دوران میں بہت سی بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں لیکن یہاں ہم ان کی رفتار سے بحث نہ کرینگے پہلے پہل تو ماریا تھیریزا کی حالت نازک معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ سائیلیشیا میں اسکی فوج شکست کھاگئی تھی۔ اور بوہیمیا میں بھی فرانس و بویریا کے سپاہی گھس آئے تھے۔ آخر لاچار ہوکر اس نے ہنگری والوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ حالانکہ ہنگری والے بارہا اس کے مورثوں سے لڑچکے تھے۔ اور اسوقت بھی دستوری آزادی کا مطالبہ کررہے تھے۔ ملکہ نے ان کے بہت سے حقوق و امتیازات بھی ان کو دیدئے اور ان کی مجلس یعنی ڈیئیٹ (Diet) کی خودمختاری و آزادی کا لحاظ رکھنے کا وعدہ کیا۔ ہنگری

والے جن کو میگیرس (Magyars) کہتے ہیں حسین ملکہ کی حمایت پر جو اپنے بچہ کو گود میں لے کر ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی جوش و خروش سے آمادہ ہوگئے۔ انھوں نے کہا "ماریا تھیریزا ہم اپنے بادشاہ کے لیئے جان دینگے"۔ اور انھوں نے اپنے عمل سے اپنے قول کی تصدیق کردی۔ ایک بڑی زبردست ہنگری والوں کی فوج مغرب کی طرف روانہ ہوئی۔ اور بوہیمیا میں پہنچکر آسٹریا کا پلہ بھاری کردیا۔ فرانسیسی فوج بڑی مشکل سے فرانس تک واپس جاسکی۔ انگریزوں نے ملکہ کی زیادہ تر نقد سے مدد کی۔ لیکن نیدرلینڈز و رائن کی طرف انھوں نے بھی ایک

فونٹنوا (Fontenoy)

دستہ فوج کا بھیجدیا جس کی وجہ سے غنیم کی توجہ تقسیم ہوگئی۔ ڈیٹگن (Dettigon) میں محض ایک چال سے (انگریز) بچ گئے مگر آخر کار ۱۷۴۵ء میں فرانس کے ہاتوں سے بمقام فونٹنوا (Fontenoy) ان کو شکست فاش ہوئی۔ اور تمام نیشبی اضلاع کو فرانس نے برباد کردیا۔ فریڈرک نے سخت مقابلہ کے باوجود سائلیشیا پر قبضہ کیا۔ ان وجوہ سے ۱۷۴۸ء میں صلح ایکس لاشپیل (Aix-la-Chapelle) طے پائی۔ فریڈرک کا مفتوحہ ملک اس کے قبضے میں چھوڑدیا گیا۔ لیکن فرانس اس ملک پر قبضہ نہ رکھ سکا۔ جو اس کی فوجوں نے جیتا تھا۔ اور اس کے سب مفتوحات جاتے رہے۔

اس صلح نے فریقین کو محض دم لینے کی مہلت دی۔ اسلئے کہ ماریا تھیریزا کے دل میں سائلیشیا واپس لینے کا خیال باقی تھا۔ اور فرانس اور انگلستان کے مابین ابھی نوآبادیات کا کوئی تصفیہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن دوبارہ جنگ شروع ہونے سے پہلے سابقہ اتحاد میں عجیب وغریب تغیرات ہوگئے جس کو انقلاب سیاسی کہتے ہیں۔

انقلاب سیاسی

سولھویں صدی کے اوائل سے فرانس اور آسٹروی خاندان میں خصومت چلی آرہی تھی۔ یورپ کی سیاسی فضا میں ان دونوں کے ایسے تعلقات مستقل سمجھ لیئے گئے تھے۔ اور تمام دول یورپ انہی دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کے ساتھ شریک ہوجاتی تھیں۔ برطانیہ عظمےٰ اور فرانس کی عداوت اتنی قدیم نہ تھی اور نہ مدبرین کی توجہ ہی اس طرف زیادہ منعطف تھی۔ اب فرانس اور آسٹریا متفق ہوگئے تو برطانیہ نے فریڈرک والی پراشیا سے اتحاد قائم کرلیا۔ یہ تحریک آسٹریا نے اوبھاری تھی۔ اور ماریا تھیریزا کے وزیر کاؤنٹز (Kaunitz) نے فرانس کی رفاقت کی ضرورت کا اسکو یقین

جنگ کی مکرر ابتدا

دلایا تھا۔ فرانس کے لئے تو غالباً یہی مناسب تھا کہ وہ اس جھگڑے سے الگ ہی رہتا۔ مگر لوئی پانزدہم کے دربار میں کوئی دانشمند مشیر نہ تھا۔ اور بادشاہ زیادہ تر اپنی داشتہ مادام دی پومپادور (Madame de pompadour) کے کہنے پر چلتا تھا۔ فرانس نے آسٹری تجاویز کو دل سے پسند کیا۔ اور پھر جنگ شروع ہوگئی۔ کچھ تو آسٹریا پرشیا کی باہمی کشیدگی کے باعث اور کچھ ہندوستان و کنیڈا مین فرانس و برطانیہ کے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے۔

نئے جتھے

نوآبادیات میں جو لڑائیاں ہوئیں۔ اور برطانیہ کو کینیڈا و ہندوستان میں جو فتوحات حاصل ہوئے ہم اُن کا ذکر نہیں کرینگے۔ یورپ میں البتہ فریڈرک والی پرشیا کے خلاف آثار پائے جاتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ایک طرف تو آسٹریا کی فوج تھی۔ جو گزشتہ جنگ کے بعد سے اچھی طرح تیار ہوگئی تھی۔ اور دوسری طرف مغرب میں فرانس کی فوج تھی۔ جس نے گزشتہ جنگ میں بہت کچھ نام پیدا کیا تھا۔ اور زیادہ مدت نہیں گزرنے پائی تھی کہ روسی فوج بھی اس کے مقابلے پر آ کھڑی ہوئی۔ یہ اس طور پر ہوا کہ میریا تھیریزا نے بہت گفت و شنید کے بعد زارینہ کو اپنی مدد پر آمادہ کرلیا تھا۔ تدبیر و حکمت عملی میں بھی فریڈرک کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ ان تین زبردست مخالفین کا مقابلہ کرنیکے لئے بجز برطانیہ کے اور کوئی اس کا حلیف اور مددگار نہ تھا۔ اور پھر برطانیہ کی قوت کا دارومدار بھی صرف بحری طاقت اور دولت پر تھا۔

جنگ ہفت سالہ

اس جنگ ہفت سالہ میں پرشیا ایسے ہی دور ابتلا میں پڑا جیسے کہ جنگ سی سالہ میں شروع میں تو اس کے سپاہیوں نے زبردست فتوحات حاصل کئے۔ مگر آخر میں روس و آسٹریا دونوں نے اُسے شکست دی۔ برلن غنیم کے قبضے میں آگیا۔ اور فریڈرک کے دل میں خودکشی کرنے کا خیال بھی ایک وقت پیدا ہوگیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شکست و تباہی میں پرشیا بالکل مٹ جائیگا۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی پرشیا آخرکار اس جنگ سے صحیح سلامت نکل آیا۔ اسکے مقبوضات میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی عظمت و سطوت بڑھ گئی۔ اور اسکے کئی وجوہ تھے۔

روزبک اور لیوتھن (Rosbach and Leuthen)

فریڈرک نے سپہگری کے ایسے جوہر دکھائے کہ دنیا کے

سب سے بڑے سورماؤں میں شمار ہونے لگا۔ دعاوا اور لڑائی دونوں میں اس نے خود کو یکتا و یگانہ ثابت کر دیا ۱۷۵۷ء میں بمقام روزبک (Rosbach) اس نے فرانسیسی فوج کو شکست دیدی۔ اور شکست بھی ایسی آسانی اور اس قدر فوجی تفوق کے ساتھ کہ فرانس بہت خفیف ہوا۔ اسی سال بمقام لیوتھن (Leuthen) بھی ایک شاندار فتح حاصل کی اور اس نے ایسے جدید طریقے سے حملہ کیا کہ آئندہ طریقۂ نبرد آزمائی ہی بدل گیا

انگلستان کی قوت پٹ کے ہاتھ میں

اسکے علاوہ برطانیہ کی رفاقت بھی بیش بہا ثابت ہوئی پٹ (Pitt) جو بعد میں لارڈ چیتھم (Chatham) کے نام سے مشہور ہوا۔ انگلستان میں برسر اقتدار تھا۔ اس نے براعظم پر کثیر فوج بھیجنے کا عزم کرلیا تھا۔ جسکی وجہ سے کینیڈا اور ہندوستان کے معاملات سے روگردانی کرکے فرانس کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور چیتھم کے بقول انگلستان نے جرمنی کے میدان میں کینیڈا کو فتح کیا۔ فریڈرک نے پٹ (Pitt) کے خدمات کا شکریے کے ساتھ اعتراف کیا۔ فریڈرک کے بچ جانے کا اصل سبب یہ تھا کہ فرانس کی حکومت بالکل ناکارہ تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں فرانس نے نہ کوئی نامور سپاہی پیدا کیا نہ کوئی مدبر۔ پھر بھی ۱۷۶۱ء میں ہرچند فریڈرک کا سا فن سپہگری کا ماہر جوانمرد موجود تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ بچ نہیں سکتا۔ جنگ کیونرس ڈارف (Kunersdrof) ۱۷۵۹ء میں روسیوں نے

فریڈرک مصیبت میں

اس کو سخت شکست دیدی تھی ۱۷۶۰ء میں روسی اور آسٹروی بھی برلن میں داخل ہوگئے تھے اور ۱۷۶۱ء کے ختم سال تک پرایشیا کے ملک پران کا قبضہ رہا۔ فریڈرک کی وہ عظیم الشان فوج جس سے اس نے جنگ کا آغاز کیا تھا۔ تقریباً معدوم ہوگئی تھی۔ اور اسکی مالی حالت بہت نازک تھی۔ اور سب سے خطرناک بات یہ ہوئی کہ جارج سوم شاہ انگلستان کے طرز عمل کی وجہ سے پٹ نے ۱۷۶۱ء میں استعفا پیش کردیا۔ اور اس کی جگہ پر ایسے وزرا کا تقرر ہوا جو براعظم پر لڑائی جاری رکھنے کے سخت مخالف تھے۔ پرایشیا

زار پیٹر سوم (Peter III) کی تخت نشینی

کی تباہی قریب تھی کہ زارینہ الیزابتھ (Elizabeth) کا انتقال ہوگیا۔ جس کو فریڈرک سے دلی بغض و عناد تھا

اوس سے نجات مل جانا بہت غنیمت ہوا۔ اس کا جانشین اس کا بھتیجا پیٹر سوم ہوا۔ یہ شخص کمزور طبیعت کا تھا۔ اور شاہ پرایشیا کا وہ اتنا مداح تھا کہ اس کو اپنا استاد کہا کرتا تھا۔ اس لئے روس نے فریڈرک سے صلح کرلی۔ اور جنگ کا رخ بالکل پلٹ گیا۔ لیکن چار ہی ماہ بعد اس کی جرمن نژاد بیوی نے اس کو قتل کردیا۔ اور خود کیتھرائن دوم کے نام سے تخت پر متمکن ہوگئی۔ اس نے فوراً ہی پرایشیا سے قطع تعلق کرلیا۔ مگر فریڈرک اور پرایشیا کو نجات مل گئی تھی۔ یورپ جنگ سے عاجز آگیا تھا۔ اور آخر کار ۱۷۶۳ء میں صلح پیرس (Paris) نے اس کا خاتمہ کردیا۔ سائیلشیا اب بھی فریڈرک کے قبضہ میں رہا۔ تمام یورپ پرایشیا کو حیرت و استعجاب کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ فریڈرک کے طریقۂ حکومت و جنگ کی سب پڑوس کی سلطنتیں تعریف کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ جن ریاستوں کو اس سے نقصان پہنچا تھا۔ وہ بھی اس کی تتبع اور تقلید کرنے لگیں۔

فریڈرک اعظم (Frederick)

روشن خیال مستبدین

اٹھارھویں صدی کو روشن خیال مستبدین کا عہد کہا جاتا ہے کیونکہ بہت سے ملکوں میں ایک نیک نیت فرمانروا کے ہاتھ میں کل اختیارات آجانے سے بہت سے مفید اور سودمند انقلابات ہوئے۔ ڈنمارک۔ سویڈن۔ روس و آسٹریا اسکی تمثیل ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھکر پرایشیا۔ فریڈرک کی سلطنت نوئی بہار دہم کا بالکل ضد تھی۔ اس کے یہاں رسمی یا شان شوکت کی باتیں نہ تھیں۔ خدامان سلطنت میں خود بادشاہ پر سب سے زیادہ کام کا بار تھا۔ وہ خود بھی بھاری بھاری فرائض اپنے سر لیتا تھا۔ اور اپنے زیردستوں اور رعایا پر بھی بھاری فرائض ڈالتا تھا۔ ہر شخص پر لازم تھا کہ ملک کی فلاح و بہبودی کو سب پر مقدم سمجھے۔ اور بادشاہ کے لئے تو یہ مذہبی عقیدہ بن گیا تھا۔ صلح پیرس کے بعد پھر فریڈرک کسی قابل ذکر لڑائی میں پڑا ہی نہیں جنگ سے ایسی تباہی و بربادی پھیل گئی تھی کہ سلطنت کو از سر نو بنیاد ہی سے قائم کرنا تھا۔ زراعت و تجارت کی تحریص و ترغیب سلطنت نے دینا شروع کی۔ اور خود حکومت کی نگرانی بھی رہتی تھی۔ جس کا مفید نتیجہ اس کے عہد حکومت میں ظاہر ہوگیا۔ شباب کے زمانہ میں وہ فرانس کے فلسفیوں کے زیر تعلیم رہا تھا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ ظلم و تعدی کا اس نے استیصال کردیا۔ اور تمام ملک میں مذہبی رواداری قائم کردی۔

پولینڈ کی پہلی تقسیم

۱۷۸۶ء تک وہ حکومت کرتا رہا۔ ۱۷۷۲ء میں پرائیشیا کے حدود میں اس نے ایک اور بیش قیمت علاقہ کا اضافہ کر دیا۔ کیونکہ اسی سال پولینڈ کی پہلی تقسیم ہوئی۔ پرائیشیا روس و آسٹریا کے شکنجہ میں پولینڈ بے دست وپا ہوگیا تھا۔ اس کی رعایا میں فرقہ بندی ہوگئی تھی۔ اور کسانوں کی حالت زرعی غلاموں کی سی ہوگئی تھی۔ اس کے دساتیر ناقابل عمل تھے۔ اور اس کا تاجدار روس کی زارینہ کا منظور نظر بن گیا تھا۔ ۱۷۷۲ء میں ایسا معلوم ہونے لگا کہ مشرقی یورپ میں پھر جنگ چھڑ جائیگی۔ بارے فریڈرک کے مشورے پر تینوں دول نے اپنی پرانی خصومتیں اور ترکی سرحد کے باہمی نزاعات کو بھلا کر بیچارے پولینڈ کو آپس میں تقسیم کرلینے پر آمادگی ظاہر کردی۔ میریا تھیریزا کو پہلے تو تامل ہوا کہ یہ طرز عمل اس کے خیال میں اتنا ہی خلاف انصاف تھا جیسا کہ پرائیشیا کا سائیلیشیا Silesia پر قبضہ کرلینا۔ لیکن آخر میں وہ بھی سب کے ساتھ شریک ہوگئی۔ روس کو سب سے زیادہ وسیع ملک ملا۔ لیکن پرائیشیا کو سب سے زیادہ بیش قیمت حصہ ملا۔ کیونکہ اس نے مغربی پرائیشیا پر ہاتھ مارا۔ اور اسکی وجہ سے پرائیشیا کی سلطنت کا سلسلہ برینڈنبرگ تک قائم ہوگیا۔ اور یہ سلسلہ قائم ہونے سے سلطنت کی قوت واتحاد میں بہت اضافہ ہوگیا۔

ماریا تھیریزا Maria Theresa

۱۷۸۰ء میں ماریا تھیریزا (Maria Theresa) کا انتقال ہوگیا۔ تاریخ یورپ میں وہ ایک نامور اور شریف ہستی تھی ہیپسبرگ خاندان کے کسی ابتداء کے ساتھ مابعد کی نسل کو اتنی ہمدردی ومحبت نہیں ہوئی جتنی کہ اس خوبصورت دیندار محب وطن اور مستقل مزاج عورت کے ساتھ تھی جس کا عہد حکومت ناکام وناشاد نہیں کہا جاسکتا ہے ۱۷۶۵ء تاریخ وفات تک اس کا خاوند شہنشاہی لقب سے ممتاز رہا۔ اسکے بعد اس کا بیٹا جوزف دوم (Joseph II) سلطنت کا وارث ہوا۔ اور ۱۷۸۰ء میں تمام ہیپسبرگ علاقہ پر وہی حکمران تھا۔

جوزف ثانی (Joseph II) شاہ آسٹریا

جوزف ثانی فریڈرک کا مداح بھی تھا۔ اور اس سے متنفر بھی وہ اس کو اپنے خاندان کا جانی دشمن سمجھتا تھا۔ لیکن اس زمانہ کے حکمرانوں میں اس کو سب سے بہتر اور قابل تقلید خیال کرتا تھا۔ جوں ہی وہ تخت پر بیٹھا اس نے پرائیشیا کے تاجدار کی تقلید میں

اس کے ویسے ہی اصلاحات اپنے ملک میں جاری کرنا شروع کر دیا۔ سلطنت کو متحد اور تاجدار کے اختیارات کو لامحدود کر دینا یہی دو باتیں اسکے مدنظر تھیں ۔ مذہبی رواداری سے افتراق وانشقاق کو بہت کچھ مٹا دیا ۔ تمام ملک میں جرمن زبان سرکاری زبان قرار دی گئی ۔ اور تمام ملک کو مختلف اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا ۔ جہاں بلالحاظ قوم وملت انصاف برتنے کا اہتمام کیا گیا ۔ وہ چاہتا تھا کہ ہیپسبرگ خاندان کے مختلف النوع مختلف الزبان ومختلف النسل مقبوضات ورعایا کو پرایشیا کے مانند ایک سلطنت میں قائم کر دے لیکن اُس نے فریڈرک کی سلطنت اور اپنی سلطنت کے مابہ الامتیاز فرق کو محسوس نہیں کیا تھا ۔ پرایشیا بھی متفق نہ تھا ۔ لیکن اُس کی تمام رعایا جرمن نسل سے تھی اور سب کا مذہب پروٹسٹنٹ تھا ۔ برخلاف اسکے آسٹریا ایسی مملکتوں کا مجموعہ تھا ۔ جو پانچ سو برس سے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریبان رہتی چلی آئی تھیں ۔ بلکہ بعض تو جاگیری عہد وقرون وسطےٰ سے اسی حالت میں تھیں ۔ اسکے ملک کے خاص خاص حصے یہ تھے ۔ (۱) آسٹریائے خاص جو ہیپسبرگ خاندان کا ابتدائی ملکیت تھا ۔ اِس حصہ میں جرمن قوم آباد تھی ۔ اور سب کا مذہب رومن کیتھلک تھا (۲) ہنگری جس میں ٹران سلوینیا (Transylvania) بھی شامل تھی ۔ اِس حصہ میں میگیر (Magyar) لوگ آباد تھے ۔ جن کو اپنی قومیت پر بہت ناز تھا ۔ یہاں جاگیری ادارے قایم تھے ۔ جو آخر وقت تک قایم رہے ۔ (۳) بوہیمیا (Bohemia) و موریویا (Moravia) جہاں چک (Czech) قوم آباد تھی ۔ اور یہاں عام طور پر پروٹسٹنٹ مذہب کی پیروی کی جاتی تھی ۔ ان لوگوں میں بھی قومیت کا احساس پیدا ہو گیا تھا ۔ (۴) اطالوی مقبوضات یہ ملک آسٹریا کا ہم مذہب تھا ۔ لیکن زبان وطرز معاشرت وخیالات میں دونوں بالکل ایک دوسرے سے مختلف تھے (۵) آسٹروی نیدرلینڈز (بلجیم) جو ضلع یوٹریکٹ (Utrecht) میں ملا تھا ۔ یہاں کیتھلک مذہب تھا ۔ اور یہاں کی زبان وطرز معاشرت بہ نسبت آسٹریا کے فرانس سے زیادہ ملتی جلتی تھی ۔ یہ تقسیم مکمل تو نہیں ہے ۔ لیکن اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جوزف ثانی نے کتنے مشکل کام کو اپنے سر لیا تھا ۔ اور ایسی مختلف النوع مملکتوں کو ایک کر دینا اور سب جگہ جرمن زبان قائم کر دینا کتنا دشوار تھا ۔

پرایشیا (Prussia) اور آسٹریا میں فرق و امتیاز

اس کی مذہبی رواداری اور تعلیم کو عام کر دینا اس کے بہترین اصلاحات تھے۔ مگر انھیں دونوں پر سب سے زیادہ مخالفت ہوئی۔ اس کی زندگی قابل تحسین کوشش میں صرف ہوئی۔ لیکن انجام بجز مایوسی و ناامیدی کے کچھ نہ ہوا بوہیمیا (Bohemia) و ہنگری (Hungary) میں اس کی تجاویز کی برملا مخالفت کی گئی اور بلجیم تو

جوزف ثانی (Joseph II) کے منصوبوں کی ناکامی

کیتھلک مذہب کے حقوق و امتیازات کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے شورش پر آمادہ ہو گیا۔ اس کی خارجی تجاویز بھی ناکام ہوئیں۔ اور یہ ناکامیاں اس کی موت کا باعث ہو گئیں۔ اپنے بھائی لیوپولڈ دوم کے سپرد وہ ایک مشکل کام کر گیا لیوپولڈ (Leopold) کا پہلا کام تو اپنی سلطنت کے مختلف عناصر کو ہموار کرنا تھا۔ جو اس کے پیشرو کے طرز عمل کی وجہ سے برافروختہ ہو گئے تھے۔ ابھی اس کو اس کام سے فرصت نہ ہوئی تھی کہ فرانسیسی انقلاب کی وجہ سے سیاسی پیچیدگیوں کا سامنا ہو گیا۔

باب سیزدہم

فرانس کا زوال اور قدیم طرزِ حکومت کا خاتمہ

کسی عہد کی تاریخ کو واقعات مابعد کی روشنی میں مطالعہ نہیں کرنا چاہیے یورپ اور فرانس کے لیے فرانسیسی انقلاب کا وقوعہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں سب سے بڑا واقعہ ہے اس وجہ سے لوئی چہاردہم کی وفات کے بعد کے تمام واقعات کو قدیم شاہی کے ادبار و زوال کی علامت سمجھا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ اس اثنا میں انقلاب کا بیج پڑ رہا تھا لیکن یوں دیکھا جائے تو کئی لحاظ سے فرانس کی حکومت کامیاب رہی تھی اور کوئی شخص ایسے انقلاب کے واقع ہونے کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا تھا

عہد نیابت اور اسکے اثرات

لوئی چہاردہم کی کوشش کہ اس کی وفات کے بعد پھر فرانس کے طرزِ حکومت میں کوئی تغیر نہ ہو بیکار ہوئی۔ اس لیے کہ اس کی وصیت کے مطابق کوئی عمل نہیں ہوا۔ آرلینس (Orleans) کا ڈیوک (Loius XV) لوئی پانزدہم کے مدار المہام کی حیثیت سے کل اختیارات کام میں لاتا تھا جو روایتاً اس عہدے سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ خود لوئی چہاردہم کے خیالات و عقائد سے فرانس بیزار ہو چکا تھا اسلئے مدار المہامی کے زمانے میں ہر طرف ردِ عمل شروع ہو گیا۔ سب سے اہم مسئلہ فرانس کی مالی حالت کا تھا۔ گزشتہ عہدِ حکومت کی طویل لڑائیوں کی وجہ سے خصوصاً ہسپانوی

فرانس ایک زبردست روز افزوں قرضہ کے بار سے دبا ہوا تھا۔ جس کے برداشت کرنے کی طاقت اس کی رعایا میں باقی نہ تھی۔ عین اس وقت جان لا (John law) نامی ایک اسکاٹ لینڈ کا منچلا وہاں آیا اور اُس نے مدارالمہام (Regent) کے پاس ایک تجویز پیش کی جس کے ذریعہ سے فرانس کا قرضہ بھی ادا ہو سکتا تھا اور جو کچھ بچ رہتا وہ سالانہ منافع کی صورت میں جمع ہوتا مالیاتی مسائل کے صحیح اصول اور علم المعیشت کی بنیاد اب پڑنی شروع ہوئی تھی اور لا حقیقت میں مکار یا دغاباز نہ تھا

لا کی تجاویز (Law)

جیسا کہ اُس کو سمجھا جاتا ہے گو اُس کی تجاویز بار آور نہیں ہوئیں خلاصہ یہ کہ فرانس کے شمالی امریکہ کے مقبوضات کی ضمانت پر اوس نے سکۂ قرطاس (Paper Money) جاری کرنے کی تجویز پیش کی۔ شمالی امریکہ کے مقبوضات ایک کمپنی کی تحویل میں تھے جس کو مغربی کمپنی کہتے تھے لانے یہ خیال نہیں کیا کہ سکۂ قرطاس کی ادائی کے لئے کچھ سونا یا چاندی بطور سرمایہ کے رہنا چاہئے اُس کا عقیدہ تھا کہ ہر ملک کی مالی حیات کا دارومدار اس کی حکومت کے اعتبار پر رہتا ہے اور اُس نے سمجھا کہ شمالی امریکہ کے مقبوضات اس قسم کا اعتبار قائم کرنے کے لئے کافی تھے۔ یہ تمام تجویز مشکل اور الجھی ہوئی تھی۔ لوگوں کا قیاس ہے کہ لا (Law) کو بہت کچھ کامیابی حاصل ہو جاتی۔ اگر خلاف امید

لا (Law) کی ناکامی

مغربی کمپنی کے حصص کی خرید و فروخت میں قماربازی نہ شروع ہو جاتی۔ کیونکہ شمالی مقبوضات جن پر لا بھروسہ کئے ہوئے تھے اسی کمپنی کے قبضے میں تھے کچھ دنوں کے لئے تو یورپ کے مالی معاملات میں لا کی حیثیت ایک ثالث کی سی ہوگئی تھی مگر آخر کار وہ شہر بدر کر دیا گیا اور فرانس کو بدستور مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بلکہ ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی تجویز سوجھا پڑی ۱۷۲۳ء میں مدارالمہام کا انتقال ہو گیا۔ نام کو تو لوئی پانزدہم نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی لیکن کمسنی کی وجہ سے کچھ دنوں تک سلطنت کا کاروبار وہ خود نہ سنبھال سکا اور فرانس کا وزیر اعلیٰ اُس کا قدیم معلم کارڈنل فلری (Fleury) مقرر ہوا۔

فلری (Fleury)

کارڈنل (شناس) فلری کئی لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتا تھا

اور یورپ کی تاریخ میں شاید ہی کسی شخص نے اُس سن میں اس قدر اقتدار قائم رکھا ہو نوے سال کی عمر میں جب اس کا انتقال ہوا تو وہ فرانس کا سب سے اعلیٰ حاکم تھا اور فرانس کا شمار یورپ کے سربرآوردہ دول میں تھا۔ اُس نے مرنج و مرنجاں طرز عمل اختیار کیا اور انگلستان کی رفاقت و امداد کا امیدوار تھا۔ فلری اور والپول (Walpole) میں ایسی مفاہمت ہوگئی تھی جس سے دونوں ملکوں کو فائدہ پہنچا اور یورپ میں ایک حد تک امن و امان قائم رہا۔ اُس کا عہد حکومت صلح و آشتی کا زمانہ تھا۔ لیکن آخر وقت میں ایک مختصر مگر اہم جنگ ہوگئی جس پر ایک سرسری نظر اب ہم ڈالینگے۔ سیاسی اغراض کی وجہ سے بادشاہ کا عقد پولینڈ کے جلاوطن شدہ حکمران اسٹینِ سیلاس (Stansilas) کی بیٹی میریا لک زنکا (Maria Lezinska) سے ہوگیا تھا اس زمانہ میں پھر پولینڈ کا تخت خالی ہوا تو فرانس کی ملکہ کا والد بھی دعویدار ہوا اور پولینڈ کا بیشتر حصہ اس کی موافقت میں تھا۔

وراثت تخت پولینڈ کی جنگ

کہنے کو تو پولینڈ کا تخت انتخابی تھا اور اگر انتخاب کے ذریعہ سے فیصلہ کیا جاتا تو نتیجہ ظاہر تھا لیکن اس ملک کے ادبار و ابتری کی وجہ سے پولینڈ کے معاملات میں بڑی بڑی سلطنتوں کو دلچسپی ہوگئی تھی۔ اور پولینڈ کی وراثت کے مسئلہ نے یورپ کی دول عظمیٰ کو پھر ایک جنگ کے لئے آمادہ کر دیا فرانس۔ اسپین اور سارڈینیا اسٹین سیلاس (Stansilas) کی تائید پر کھڑے ہوئے اور روس و آسٹریا دوسرے دعویدار سکسینی کے آگسٹس (Augustus) کی امداد پر تیار ہوگئے۔ ہم کو فوجی کارروائیوں کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

صلح وائنا (Vienna)

اٹلی میں فرانس کو اہم فتوحات حاصل ہوچکی تھیں کہ صلح مفاہمت کی گفت و شنید شروع ہوگئی اور جنگ کا خاتمہ ہوگیا دوسرے سال ۱۷۳۵ء میں صلح وائنا (Vienna) کے ذریعہ سے دول یورپ کے حدود میں کچھ تغیرات واقع ہوئے لورین (Lorraine) پر فرانس کی حکومت تسلیم کرلی گئی انقلاب کا طوفان برپا ہونے سے قبل فرانس کی شاہی حکومت کی یہ آخری کامیابی تھی۔ اسپین کو نیپلس (Naples) اور صقالیہ (سسلی)

مل گیا۔ فرانس اور اس کے حلیف اسٹین سیلاس (Stansilas) کو تخت دلانے میں کامیاب نہیں ہوئے اور اس کو لورین (Lorraine) کی صوبہ داری پر قناعت کرنی پڑی فلری کا یہ آخری کارنامہ تھا اس کے بعد پھر وہ کئی سال تک زندہ رہا۔

فلری کی وفات

فلری (Fleury) لیکن انحطاط قوی کی وجہ سے آسٹروی وراثت کی جنگ کے پہلے جو سیاسی مسائل پیش آئے ان کو وہ سنبھال نہ سکا۔

یورپ میں فرانس کی حیثیت کا بدل جانا

آسٹروی وراثت کی جنگ اور جنگ ہفت سالہ کی حکایت گزشتہ باب میں بیان ہوچکی ہے یورپ میں فرانس کی حیثیت بدل جانے کی یہ خصوصیت ہے کہ ان لڑائیوں کا تذکرہ بجائے پیرس کے وانیا و برلن کے نقطۂ نظر سے بیان کرنا پڑتا ہے۔ فرانس کا وہ مرتبہ جو اُسے یورپ کی مرکزی و سربرآوردہ طاقت ہونے کی وجہ سے حاصل تھا جاتا رہا لوئی چہاردہم کی طرح اس کو صرف شکست نہیں ہوئی بلکہ اس کا سیاسی وقار بھی جاتا رہا لیکن ان لڑائیوں میں فرانس کو جو ہزیمتیں نصیب ہوئیں اس کے بیان کرنے میں مبالغہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اول الذکر (آسٹروی وراثت کی) جنگ میں تو اُسے کوئی ایسی ہزیمت نہیں ہوئی بلکہ فرانسیسی فوج نے فانٹینائے (Fontenoi) و لافیلٹ (Lawfeldt) کی مشہور لڑائیوں میں انگلستان کو شکست دیدی تھی۔ اور ہنالینڈز کو تاراج کر کے فتح بھی کر لیا تھا جس کیلئے لوئی چہاردہم نے بارہا کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا دوسرے یعنی جنگ ہفت سالہ کے شروع میں بھی فرانس کو تابناک فتوحات حاصل ہوئے مگر بعد میں پانسہ پلٹ گیا اور فرانس شکست کھاکر تباہ و رسوا ہوگیا اس ہزیمت کا سبب ایک حد تک تو یہ ہے کہ فرانس کو یورپ کے دو سب سے بڑے اور قوی فوجی سرداروں سے مقابلہ کرنا پڑا ایک تو انگلستان کے وزیر چیتھم سے اور دوسرے پراشیا کے تاجدار فریڈرک سے اور کچھ یہ بھی تھا کہ بادشاہ اور اس کے وزرا و مصاحبین کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ لوئی پانزدہم میں فوجی جوش و قابلیت موجود تھی۔ لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی اور بادشاہ عیاشی و آوارگی میں مبتلا ہوگیا

لیکن پھر بھی فرانس کے خارجی معاملات کو اس نے اپنے ہی ہاتھوں میں رکھا حالانکہ اس نے نہ تو حب الوطنی سے کام کیا نہ دانائی سے۔ اس کو اپنی وزراء پر اعتماد نہ تھا اور اکثر ان کے پیٹھ پیچھے سازشیں کرتا رہا۔ اور اُمور سلطنت میں اس کے

لوئی یازدہم اور اسکے دربار کی حالت

اعلےٰ ملازموں کو اتنا دخل نہ تھا جتنا کہ ان عورتوں کو جو وقتاً فوقتاً اس کے تصرف میں آتی رہتی تہیں ان میں سے مادم ڈی پمپاڈور (Modame de Pompadour) اس کے اوائل عہد حکومت

مادم ڈی پانپاڈور Madam de Pomepadour

میں زیادہ دخیل رہے اور بعد میں مادام دیو باری (Madame du Barri) آسٹروی وراثت جنگ اور جنگ ہفت سالہ کے درمیان میں جو سیاسی انقلاب ہوا اور جس میں فرانس نے پراشیا سے قطع تعلق کرکے آسٹریا سے اتحاد قائم کیا اس کی ذمہ داری کلیتاً میڈم پمپاڈور پر نہیں عاید ہوسکتی جیسا کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے مگر اتنا ضرور تھا کہ اس عورت کو بھی اس معاملے میں دخل تھا۔ اس عورت کا دخل پھر ایک حد تک فرانس کے زوال کا باعث ہوا۔ اس میں ذاتی صفات ضرور تھے۔ لیکن ملکی معاملات میں اس کی دست اندازی مضر ثابت ہوئی۔

فرانس کے قبضے سے ہند اور کنیاڈا کا نکل جانا

ان لڑائیوں کا ایک اہم نتیجہ جس سے یورپ کے مدبروں کو کوئی خاص دلچسپی تو نہ تھی یہ ہوا کہ ہندوستان اور کنیاڈا فرانس کے ہاتھوں سے جاتے رہے ان دونوں ملکوں میں اس کی حکمت عملی ایک زمانے تک کامیاب رہی اور اچھے اچھے لائق لوگوں

ڈوپلے

کے ہاتھ میں انتظام تھا ڈوپلے (Dupleix) نے ہندوستان کے والیان ریاست کے باہمی لڑائی جھگڑوں میں نہایت

مانکام Montcalm

ہوشیاری سے کبھی ایک فریق کے ساتھ شریک ہو کر اور کبھی دوسرے کا مددگار بنکر نیز ہندوستانی سپاہیوں کو یورپین طریقے پر تعلیم دیکر ہندوستان میں فرانس کا علاقہ بہت کچھ بڑھا لیا تھا۔ اور اسی نے اپنے انگریز رقیبوں کو وہ راستہ بتا دیا جس کے ذریعے سے وہ بلا کشت و خون تمام ملک پر قابض ہوگئے۔ کنیاڈا میں بھی فرانس کا علاقہ بہت

وسیع تھا اور وہاں کی حکومت کا انتظام بھی اچھا تھا یہاں مانٹکام نامی ایک مشہور مدبر و سپاہی فرانس کی طرف سے متعین تھا اور شمالی مقبوضات کے سوا جنوب میں بھی نیو آرلینس (New Orleans) اور دریائے مسی سی پی (Mississippi) کی وادی پر فرانسیسیوں کا قبضہ رہنے سے شمالی امریکہ کا مستقبل بجائے انگریزوں کے انھیں کے قبضے میں نظر آتا تھا ہندوستان اور نو آبادیات کے لحاظ سے پہلی لڑائی برابری پر ختم ہوئی۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ ابھی قطعی تصفیہ نہیں ہوا ہے۔ ہندوستان اور امریکہ کی خاطر ہی انگلستان دوسری جنگ میں شریک ہوا اور اس لڑائی میں بہت جلد قطعی فتح انگلستان والوں کو حاصل ہوگئی ۱۷۶۳ء میں جب صلح پیرس (Paris) ہوئی تو کنیڈا سے فرانس کا جھنڈا نکال دیا گیا اور ہندوستان میں بھی چھوٹے چھوٹے مقامات پر ہی قائم رہا اور وہ بھی برطانیہ کی رعایت و اجازت سے۔

فرانس کی ناکامی کے اسباب اس جدوجہد کے واقعات بیان کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اِن اسباب و علل پر غور کیا جائے جو فرانس کو اس تباہی کے انجام کو پہنچانے کا باعث ہوئے۔ فرانس کا ان دور دراز ممالک میں اپنے نائبوں کو معقول و کامل آزادی عمل نہ دینا بھی ایک سبب

مرکزی حکومت کی مداخلت ہو سکتا ہے۔ خصوصاً کینیڈا میں مرکزی حکومت کی مداخلت نے مقامی سرداروں کی پیش قدمی کو روک دیا۔ سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انگلستان کو براعظم کی لڑائی سے کچھ زیادہ تعلق نہ تھا اور وہ جب چاہتا سمندر کی آڑ میں پناہ گزین ہو جاتا برخلاف اس کے فرانس کو اپنی تمام قوت اور اپنے تمام ذرایع اس لڑائی میں

یورپ کی پیچیدگیاں صرف کرنے کی ضرورت تھی یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ براعظم کے پیچیدہ معاملات میں پھنس جانے کی وجہ سے اسپین کی نوآبادیات ضائع ہوگئیں اور یہی واقعہ فرانس کے ساتھ بھی پیش آیا۔ یورپ کی لڑائیوں میں ہر ایک پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ بحری طاقت پر ہر بات کا انحصار تھا جنگ

برطانیہ کی بحری فوقیت

ہفت سالہ میں فرانس وانگلستان کے بحری بیڑوں میں کوئی لڑائی دور دراز کے سمندروں پر نہیں ہوئی لیکن ہندوستان اور کنیاڈا دونوں جگہ فرانسیسی اس وجہ سے ناکام رہے کہ وہاں تازہ فوج نہیں پہنچ سکی اور نہ ان ممالک کے نائبوں سے کے ساتھ مراسلت ہی کا سلسلہ قائم رکھا جا سکا فرانس کو ان عظیم نقصانات کا احساس تو نہیں ہوا لیکن یورپ کی شکست و ذلت کا اس پر بڑا اثر ہوا فرانس کی مطلق العنان شاہی حکومت کو محض اس کی کارگزاری اور جنگی فتوحات کی وجہ سے عروج حاصل ہوا تھا اس لئے اب لوئی پانزدہم کے عہد حکومت کی فوجی ناکامیوں نے لوگوں کی وفاشعاری حکومت کی بنیاد کو متزلزل کردیا۔

شاہی فرانس کی کمزوری

نپولین کا قول ہے کہ راسبک کی لڑائی فرانسیسی انقلاب کا باعث ہوئی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ جنگ راسبک وہی ہے جس میں فریڈرک نے فرانس کو تباہ کن شکست دی تھی۔

لوئی پانزدہم کے عہد حکومت کے آخری زمانہ میں بعض غیر ملکی واقعات پیش آئے جن کا ایک مختصر خاکہ پیش کردینا مناسب ہے ۱۷۷۲ء میں پولینڈ کی

پولینڈ Poland

پہلی تقسیم واقع ہوئی جس کے ذریعہ سے اس کے سرحدی علاقہ کو روس پھر پرشیا و آسٹریا نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ فرانس نے اس میں دست اندازی کرنا چاہا مگر ناکام رہا اور یہ ناکامی بھی اس کی عظمت کے زوال کی ایک علامت تھی لیکن اس عہد حکومت کے ختم ہونے سے پہلے ایک مشہور علاقہ کا اضافہ بھی ہوا۔ جزیرہ کارسیکا ایک عرصہ سے جنیوا (Genoa) کی مرکزی حکومت

کارسیکا Corsica

سے باغی ہوگیا تھا یہ جزیرہ فرانس کے حوالہ کرکے اس جھگڑے کا خاتمہ کیا گیا جزیرہ والوں کی مخالفت فرو کردی گئی اور اسطور پر فرانس کو ایک قیمتی علاقہ مل گیا جو بحر متوسط میں بحری بیڑے کا مرکز بنانے کے لیے بہت کارآمد تھا۔
اس عہد حکومت کی ملکی حالت کا اب ہمیں مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس میں

ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ شاہی حکومت کی کس طرح مخالفت ہو رہی تھی اور وہ مسالہ جمع ہو رہا تھا جس نے پچیس سال بعد انقلاب پیدا کر دیا حکومت کی کمزوری کی یہ علامت تھی کہ وہ لوگ اور وہ ادارے جو لوئی چہاردہم کی مخالفت کرنے کی جراءت نہیں کر سکتے تھے اب لوئی پانزدہم کی حکومت کے خلاف پے در پے حملے کرنے لگے تھے اور اکثر اوقات انھوں نے حکومت کے مقابلے میں فتح حاصل کی۔

ژان سینی تحریک Jansenism

ژان سینی (Jansenism) مذہبی تحریک کے آغاز کا ذکر کیا جا چکا ہے اور یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ پوپ اور فرانس کے تاجدار نے متحد ہو کر کس طرح اس کے استیصال کی کوشش کی تھی مگر یہ تحریک اب بھی زندہ تھی۔ اور اس تحریک کے حامیوں نے مذہبی وسیاسی حکام کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا نہ اُس کے جوش میں کوئی کمی ہوئی حالانکہ ان کے ساتھ بہت ناانصافی کا سلوک ہوتا رہا۔ ان کی حمایت پر پیرس کی پارلیمنٹ آمادہ ہو گئی۔ پارلیمنٹ پیرس اصل میں عدالت عالیہ تھی لیکن فرانس کے قوانین کی محافظت کا کام بھی اس نے اپنے ذمہ کر لیا تھا۔ سابقہ زمانہ میں یہ اختیار اس کام میں لایا جاتا تھا کہ جاگیری عدالتوں کے اختیار سماعت سے مقدمات کو نکال کر شاہی عدالتوں کے اختیار سماعت میں دیدیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس کی مدد سے بادشاہ کے مذہبی احکام کی مخالفت

پیرس کی پارلیمنٹ اس کی تائید میں

شروع کر دی گئی کیونکہ ژان سینی مذہب کے متبعین پر تکلیف دہ اور ناگوار مظالم توڑے جاتے تھے۔ جس کسی کے متعلق ژان سینی عقائد کی پیروی کا شبہ ہوتا تھا وہ کلیسہ کی آخری ''تسلی سے'' Consolation سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ پارلیمنٹ نے اس کو قوانین فرانس کے خلاف قرار دیا اور بار بار ژان سینی لوگوں کی طرف سے اعتراضات کئے جس ہمت سے حکومت پر حملہ کیا جاتا تھا اس کی پیرس والے تعریف کرتے تھے اور اکثر اوقات پارلیمنٹ کو کامیابی بھی ہوئی۔

لیکن ژان سینی تحریک میں کچھ دم نہ تھا اس لئے پارلیمنٹ نے اس کی

امداد و اعانت سے دستکش ہو کر رومن کیتھلک کلیسہ کی قوی ترین جماعت یعنے

جیزوئٹ فرقہ پر حملہ

جیزوئٹ فرقہ پر حملہ شروع کر دیا ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ روما کے یہی جیزوئٹ عمال تھے جنھوں نے پروٹسٹنٹ سیلاب کو روکا تھا۔ صلح ویسٹ فیلیا (Westphalia) اور مذہبی لڑائیوں کے بعد سے یہ لوگ دوسرے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے خصوصا غیر ملکوں میں تبلیغ و اشاعت میں انھوں نے عجیب و غریب کامیابی حاصل کی تھی فرانس میں وہ اس وجہ سے بدنام ہوئے کہ وہ بادشاہ کے ہم خیال تھے۔ اور بادشاہوں کے بعض سخت ترین مظالم کے محرک یہی لوگ سمجھے جاتے تھے۔ ان کا رتبہ بلند اور ناقابل زوال سمجھا جاتا تھا کہ ایک ایسی سمت سے مخالفت کا طوفان اٹھا جہاں سے ایسا ہونے کی کبھی اُمید نہ تھی مغربی ہند کے ایک جیزوئٹ دارالاشاعت کا مہتمم دوران جنگ میں انگریزی جہازوں کی یورش سے تنگ و مقروض ہو گیا تھا۔ اس کے قرضخواہوں نے کل جیزوئٹ جماعت سے اپنے قرضہ کا مطالبہ شروع کر دیا اور یہ معاملہ پارلیمنٹ تک پہنچا۔ پارلیمنٹ تو پہلے ہی سے جیزوئٹ لوگوں کے خلاف تھی اس لئے اس نے اس موقع کو غنیمت جان کر کل جزوئٹ سلسلہ کی عضویت و انتظام کے متعلق تحقیقات شروع کر دی بادشاہ نے بہت کوشش کی کہ اس معاملے کو پارلیمنٹ کے ہاتھ سے نکال کر اپنی پسند کی ایک عدالت میں بغرض تحقیقات پیش کرا دے مگر اس کی کون سنتا تھا اور پارلیمنٹ نے اپنی تحقیقات جاری رکھی اور آخر کار یہ فیصلہ کر دیا کہ جزوئٹ گروہ موجودہ حیثیت سے

فرانس سے جیزوئٹ فرقہ کا خروج

فرانس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے شرکا اپنے سپہ سالار کی کامل اطاعت کرنے کا حلف لیتے تھے اور یہ سپہ سالار کسی ملک کا بھی آدمی ہو سکتا تھا اور اب تک کوئی فرانسیسی اس عہدہ پر مقرر ہی نہ ہوا تھا جیزوئٹ گروہ اپنی بین الملی حیثیت کی وجہ سے ہی سولھویں و سترھویں صدی میں اس قدر قوت حاصل کر سکا تھا اور اب یہی اس کی بیخ کنی کا سبب اور حیلہ بن گئی مصالحت کی تدبیریں

کی گئیں اور یہ کہا گیا کہ فرانس کے جیزوئٹ خود وہیں کی رعایا میں سے کسی کو اپنا سردار مقرر کریں گے اور ہمیشہ فرانس ہی کا باشندہ ان کا سردار رہیگا لیکن سب درخواستیں رد کردی گئیں یہی جواب دیا جاتا تھا کہ وہ رہیں تو ایسی حالت میں ورنہ نہ رہیں لوئی پانزدہم حالانکہ ان کو بچانا چاہتا تھا مگر آخر کار مجبور ہو گیا اور ۱۷۶۴ء میں یہ فرقہ فرانس سے منتشر کردیا گیا صرف فرانس ہی میں ایسا نہیں ہوا بلکہ تمام کیتھلک ممالک خصوصاً اسپین و پرتگال میں بھی جیزوئٹ فرقہ پر حملے ہونے لگے اور ان کی تحقیقات ہونے لگی اس زمانہ کے خیالات متداولہ کا نتیجہ تھا کہ اس طور پر عام مخالفت ہونے لگی اور اصل میں یہ خصومت رومن کیتھلک کلیسہ کے تشدد و جبری احکام و اختیارات کے سبب سے پیدا ہوئی تھی۔ جب پرتگال اسپین فرانس اور اٹلی کی مملکتوں سے جیزوئٹ لوگ خارج کردئیے گئے تو پوپ

جیزوئٹ Jesuits سلسلہ کا برخاست ہونا

پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ بھی اس سلسلہ کی موقوفی کا اعلان کردے آخر کار ۱۷۷۳ء میں پوپ کلیمنٹ چہاردہم Clement XIV کو مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اپنا سیدھا ہاتھ قطع کر رہا ہوں مگر کیا کروں کہ اس نے گناہ کیا ہے اس طور پر جیزوئٹ فرقہ برخاست ہو گیا لیکن یہ موقوفی زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہی۔ یہ گروہ کلیسہ کا بہت کارآمد ہتھیار تھا اور اس طور پر اس کو قربان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے یہ سلسلہ پھر بحال اور قائم کردیا گیا اور پھر کلیسہ کا اثر و اقتدار قائم کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

پارلیمنٹ اور محاصل

بہر حال پارلیمنٹ کو اس معاملے میں بھی فتح حاصل ہوئی اور پھر ایک مرتبہ وہ بادشاہ کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئی۔ اس مرتبہ ان فرامین کی مخالفت کی گئی جو اجرائے محاصل کے لیے آخری زمانے میں جاری ہوئے تھے اور اندراج کے لیے پارلیمنٹ میں آئے تھے۔ پارلیمنٹ کی مخالفت ہمیشہ کے لیے باعث آزار ہوگئی تھی اور حکومت خواہ اچھی ہو یا بری دونوں صورتوں میں رکاوٹ پیدا کرنے کا ذریعہ بن گئی تھی۔ بادشاہ کی داشتہ ڈوباری نے بھی بادشاہ کے

آتش غضب کو اور بھڑکا دیا۔ اس لئے فرانسیسی پارلیمنٹ کا مقابلہ انگلستان کی سترھویں صدی کی پارلیمنٹ سے کیا اور چارلس اول کی ایک تصویر بتلا کر کہا کہ تمھاری پارلیمنٹ بھی اسی طرح تمھارا سر اڑا دے گی۔

پارلیمنٹ پر جبر و تشدد

آخر کار بادشاہ نے تشددی کارروائی کرنے کا عزم کرلیا۔ پارلیمنٹ کے اراکین گرفتار و جلاوطن کئے گئے۔ ان کے اجلاس ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیئے گئے اور پارلیمنٹ کی عدالتی خدمت انجام دینے کے لیے ایک شاہی عدالت قائم کی گئی جس کو ملکی معاملات میں پارلیمنٹ کی طرح کسی قسم کی مداخلت کا اختیار نہ تھا (۱۷۷۱ء)

لوئی پانزدہم ۱۷۷۴ء میں فوت ہوا۔ یورپ کے تاجداروں میں شاید ہی ایسا کوئی گذرا ہو جس کی حکومت اس کے ملک کے لیے اتنی مضر ثابت ہوئی ہو۔ وہ فطرتاً ظالم نہ تھا نہ فرانس کی ترقی و خوش حالی کو صدمہ پہنچانے کا خواہاں تھا لیکن اس کو اپنی اور اپنے عیش و آرام کی پڑی رہتی تھی۔ کاہلی و تن آسانی کا وہ بندہ تھا۔ اس کو آیندہ کی کچھ فکر نہ تھی۔ اس کو یہ گمان ضرور ہو گیا تھا کہ موجودہ طرز حکومت زیادہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتا لیکن اس کے لیے اتنا ہی بس تھا کہ اس کی زندگی تک قائم رہے وہ کہتا تھا کہ میرے بعد پھر طغیانی ہی طغیانی ہے اور واقعی اس کی وفات کے بعد ہی طغیانی آئی۔

قدیم عہد کی خصوصیات

اس نوبت پر واقعات مابعد کے بیان کرنے سے پہلے اس طغیانی کے قبل کی ملکی حالت کا نقشہ پیش کردینا زیادہ مناسب ہے۔ اس زمانہ کے متعلق جس کو قدیم عہد حکومت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے بہت سی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں لیکن ہم اپنی حکایت چند صفحات تک ہی محدود رکھینگے۔ فرانس میں جو صورت حال تھی وہ کچھ فرانس ہی تک محدود و مخصوص نہ تھی بلکہ تمام مغربی یورپ میں تقریباً یہی حالت تھی حتےٰ کہ بعض ممالک میں خرابیاں اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوگئی تھیں پولینڈ۔ اسپین یا جنوبی جرمنی کے کسان فرانس بھیجدیئے جاتے

تو وہاں ان کو اپنی معاشرتی حالت بمقابلہ اپنے ملک کے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی اور آزادی بھی نسبتاً زیادہ حاصل رہتی۔ رعایائے فرانس کے مصائب کی شدت انقلاب کا باعث نہیں ہوئی بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہی تھے جس کا ذکر ہم آگے کرینگے۔

حکومت فرانس کی مطلق العنانی

فرانس کی حکومت انتہا کی مستبد تھی۔ بجز ترکی کے یورپ کی تمام سلطنتوں سے زیادہ یہاں کی حکومت مطلق العنان تھی۔ اس کو محض اس وجہ سے قوت حاصل ہوگئی تھی کہ ایک زمانہ میں اس نے رعایا کی نیابت وحمایت کی تھی اور امراء یا کسی جماعت منتخبہ سے زیادہ بہتر طریقہ پر اس نے فرانس کی خدمت انجام دی تھی۔ اس کی مطلق العنانی تو اب تک قائم رہی لیکن قومی ومعاشری خدمت ختم ہوچکی تھی۔ اس لیے رعیت اب اس کو اپنا حامی نہیں سمجھتی تھی اب حکومت نے امراء سے رشتہ قائم کرلیا تھا۔ حالانکہ امراء اور حکومت کے مابین

اس کے مخالفین کی شکست

قدیم تاریخی دشمنی تھی۔ جاگیری شرفا کے مقابلے میں اس (حکومت) کو فتح حاصل ہوچکی تھی فرانس کے نیابتی ادارے یا تو مٹ گئے تھے یا اُس کے قابو میں تھے۔ مجلس طبقات مجتمع (States-General) باقی نہ تھی صوبوں کے طبقات نیست ونابود ہوگئے تھے شہری ادارے مرکزی حکومت کے تابع ہوگئے تھے پروٹسٹنٹ اور ژان سینی مذہب دب گئے تھے ۱۵۱۶ء کے معاہدہ کی رو سے کیتھلک کلیسہ شاہی طرز حکومت کا آلہ بن گیا تھا مطلق العنان حکومت اگر قوی ہو تو کار آمد بھی ہوتی ہے لیکن جب کمزور ہوئی تو اس

اسکا ضعف

کا قائم رہنا بھی مشکل ہے۔ فرانس کی شاہی حکومت ایسی نوبت کو پہنچ گئی تھی۔ لوئی چہاردہم کے آخری زمانہ میں ہونے والے تغیرات کے آثار نظر آتے تھے لیکن لوئی پانزدہم کے عہد میں حالت دگرگوں ہوچکی تھی اس کی حکومت نے نہ تو حب وطن کا اظہار کیا نہ عمال کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا جس کی بدولت

ناکامی سے ہم کنار ہونا پڑا۔

فرانس کی سیاسی حالت غیر مستحکم و متزلزل تھی اور اس کی معاشرتی حالت بھی فرسودہ نا معقول۔ گراں بار و مکلف ہوگئی تھی! انقلاب سے قبل فرانس کی

جاگیرداری کی تباہی

معاشرتی حالت کو جاگیریت سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یہ غلطی ہے بمقابلہ دیگر ممالک یورپ کے فرانس میں جاگیرات بالکل فنا ہو چکی تھی بمقابلہ انگلستان و جرمنی کے فرانس میں اعیان کو سیاسی حقوق و اقتدارات بہت کم حاصل تھے۔ لیکن جاگیریت کے تباہ کن اثرات اب بھی باقی تھے مثلاً وہ ادارے و رسوم اور حقوق جن کی حفاظت امرائے فرانس برسر اقتدار ہونے کے زمانے میں کر سکتے تھے اب بھی باقی تھے اور شاہی حکومت کی فتح اور روسا کے اپنے علاقوں سے علیحدہ ہو کر وارسیلیس یا پیرس میں آ بسنے سے اب بھی موجب تکلیف و زحمت تھے۔

امرا کے عدالتی حقوق اور مالیاتی امتیازات بھی دو یادگاریں جاگیریت کی باقی تھیں اپنے علاقہ کے رعایا پر اب بھی اُن کو کچھ عدالتی اختیارات حاصل تھے اور محاصل عاید کرنے میں بھی ان کے ساتھ رعایت کی جاتی تھی۔ لیکن یہ رعایت انھیں تک محدود نہ تھی۔ بلکہ پادری لوگ بھی ایک حد تک محاصل سے مستثنیٰ رہتے تھے اور بعض دولتمند جو نہ تو اعیانیت کے حلقہ میں تھے

امتیازی طبقہ

نہ پادریوں میں اُن کا شمار تھا کچھ دے دلا کر اس قسم کی مالی رعایت حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن یہ امتیازی لوگ بھی "بلا واسطہ" محاصل سے بالکل معاف نہ تھے۔ لوئی چہاردہم کے زمانہ سے یہی اس قسم کی کوشش جاری تھی کہ ان لوگوں پر بھی محاصل کا بار ڈالا جائے اور آبکاری و کروڑ گیری کے محاصل ان سے بھی وصول ہونے لگے تھے۔ اور جائداد کے متعلق بھی بعض محاصل ان سے لئے جاتے تھے۔ البتہ تائی Taille کے محصول سے یہ لوگ بالکل مستثنےٰ تھے اور یورپ کی موجودہ سلطنتوں میں اس حیثیت کے لوگ جیسا محصول ادا کرتے ہیں۔ اس سے کہیں کم محصول

ان لوگوں سے وصول ہوتا تھا جن محاصل سے یہ لوگ محفوظ رہتے تھے اس کا کل بار کسانوں پر پڑتا تھا اور اب ہم انہی کی حالت بیان کرینگے۔

مزارعین کی حالت

زرعی غلامی فرانس کی سرزمین سے مفقود ہوگئی تھی۔ اراضیات پر روزمرہ کام کرنے والے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد اب بھی تھی مگر اراضیات زیادہ تر چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے قبضہ میں تھیں جن کو مے تائیے (Metayer)

مالکان اراضی

(قابض اراضی) یا مالک اراضی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ قابضین اراضیات پیداوار کا کچھ حصہ بطور لگان کے مالک اراضی کو دیدیا کرتے تھے اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ غریب اور غیر آسودہ تھے۔ لیکن مالکان اراضی کا طبقہ خاص طور پر ممتاز تھا اراضی کا بیشتر حصہ ان کے قبضے میں تھا۔ آرتھر ینگ (Arthur Young) نامی ایک انگریز جو انقلاب سے پہلے فرانس کی حالت دیکھ چکا تھا ملک کی اس تقسیم در تقسیم پر افسوس کرتا ہے اور اسی کو زراعت کے نقصان وخرابی کا باعث قرار دیتا ہے۔ انقلاب سے پہلے جو بدنظمی پھیلی اس میں ان کسانوں نے خاص طور پر حصہ لیا اور ان کی غیر آسودگی کا سبب بھی ظاہر ہے جس زمین کو وہ کاشت کرتے تھے وہ ان کی مملوکہ تو ہوتی تھی اور گو اسے بیع یا انتقال کرنے کا بھی ان کو اختیار تھا مگر اس کے ساتھ ہی بہت سے من مانے اور تکلیف دہ قیود لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ بعض اوقات جاگیردار کو کچھ غلہ دینا پڑتا تھا یا بھیڑ مرغی کی سربراہی کرنی پڑتی تھی یا نہیں تو جاگیردار کی چکی پر غلہ پیسنا پڑتا تھا یا جاگیر کی بھٹی میں انگور لے جاکر نچوڑنا پڑتا تھا۔ ان سب سے زیادہ تکلیف وہ فرانس کا قانون شکار تھا۔ جس کی وجہ سے قرب وجوار کے زمینداروں کے شکارگاہ کے چھوٹے بڑے جانور کسانوں کی کھیتیاں تباہ وبرباد کردیتے تھے یہ سب پابندیاں فرانس کے عہد جاگیریت کی یادگار تھیں۔ اس زمانہ میں جب کہ شرفا برسر حکومت تھے یہ سب باتیں جائز اور قابل

معافی سمجھی جا سکتی تھیں لیکن جب شاہی حکومت نے جاگیریت کا قلع قمع کر دیا اور شرفا و اعیان زیادہ تر پیرس (Paris) یا ورسائی (Versailles) میں رہنے لگے تو یہ پابندیاں بے محل و نامناسب معلوم ہونے لگیں۔

غیر مستثنیٰ طبقہ پر سرکار کے محاصل

ان جاگیری مطالبات و قیود کی مصیبت بہت بڑھ گئی تھی۔ لیکن اصل بار سرکاری محاصل کا تھا۔ شہر والے ایک حد تک اس سے بچ گئے تھے۔ لیکن اصل بوجھ اضلاع و دیہات کے غریب کسانوں پر ڈالا گیا۔ کسانوں پر بھاری بھاری محاصل لگا دئے گئے تھے اور اُن کے اجرائی و تحصیل کا طریقہ بھی ایسا تکلیف دہ اور اشتعال انگیز تھا کہ ضرورت سے زیادہ ناراضی و مخالفت پھیل گئی۔ خاص خاص محاصل یہ تھے۔ پندرھویں صدی کے بعد

تالی Taille

سے "تالی" (Taille) کا محصول حکومت کی آمدنی کا خاص ذریعہ بنا ہوا تھا۔ یہ ایک محصول ہوتا تھا جو غیر مستثنیٰ لوگوں کے مکانات و جائداد غیر منقولہ پر عاید کیا جاتا تھا۔ اس کو مرکزی حکومت عاید کرکے اپنے نائبین و ملازمین کے ذریعہ سے مختلف اضلاع پر تقسیم کر دیتی تھی۔ محصول ادا کرنے والے اس محصول کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ کسی مکان یا مقام پر ترقی یا رونق کے آثار دیکھتے ہی اس محصول میں اضافہ کر دیا جاتا تھا انقلاب سے پہلے کے سیاحوں نے جو فرانس کے مواضعات کی ردّی حالت کا ذکر کیا ہے اس کا سبب کچھ تو لوگوں کا افلاس تھا اور کچھ یہ تھا کہ اس محصول سے بچنے کے لئے لوگ اپنی حالت بہت سقیم ظاہر کرتے تھے۔

"گابل" Gabelle

دوسرا محصول نمک تھا جس کو "گابل" Gabelle کہتے تھے یہ اصل میں کوئی محصول نہ تھا بلکہ نمک پر حکومت کا حق اجارہ تھا۔ صرف حکومت نمک فروخت کرنے کی مجاز تھی اور اس کو اختیار تھا وہ جس مرد عورت یا بچے کو چاہے سالانہ نمک کی ایک معین مقدار خریدنے پر مجبور کردے۔ قیمت بھی من مانی لگادی جاتی تھی اور

مختلف مقامات پر قیمت میں اختلاف بھی رہتا تھا۔ اس وجہ سے جہاں نمک گراں ہوتا تھا وہاں والے ایسے مقام سے جہاں نمک ارزاں ہوتا تھا پوشیدہ طور سے چرا کر نمک لاتے تھے۔ چنانچہ ایسے چوروں سے محبس بھر گیا تھا۔

ایک اور محصول "گاروی" Carvee کے نام سے مشہور تھا یہ ایک قسم کی جبریہ خدمت تھی جو کسانوں سے لی جاتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں مفت کی سرکاری بیگار تھی۔ لیکن یہ قید بہت کم باقی رہ گئی تھی اور انقلاب کے ذرا پہلے یہ بیگار کا طریقہ کچھ بار نہ رہا تھا گو اشتعال انگیز ضرور تھا۔

محاصل کا بار

محاصل اور جاگیری مطالبات کا بار کسانوں پر بہت گراں تھا تخمینہ کیا گیا ہے کہ بعض اضلاع میں ایک کسان جو کچھ پیدا کرتا تھا اس میں سے پچپن فی صدی اس طرح چلا جاتا تھا اس وجہ سے رفتہ رفتہ وہ اس طرز حکومت ہی کو اس کا باعث سمجھنے لگے اور اس حکومت کو مٹا دینے کے دل سے متمنی تھے تاکہ ان سب قیود سے ان کی زمین بچ جائیں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ انقلاب کی ابتدائی تحریکوں میں ان لوگوں نے خاص طور سے حصہ لیا۔

حکومت سے عام بددلی

شروع شروع ہی کسانوں کا طبقہ سب سے زیادہ انقلاب پسند نظر آتا تھا۔ گو کوئی طبقہ بھی استبدادی یا قدامت پسند نہیں تھا۔ شہروں میں بھی نئے خیالات پھیل گئے تھے اور تجارتی طبقہ بھی سرکاری قیود سے تنگ آ گیا تھا اور انگلستان کی روز افزوں تجارت وضاعت دیکھ کر آزادی کا خواستگار ہو گیا تھا۔ اعیانیت بھی شاہی حکومت کو رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور گو بڑے بڑے عہدوں کے پادری نظام مقررہ کی حمایت کرتے تھے مگر مفصل کے پادری انقلاب و تغیر کے خواہاں تھے۔

دماغی و ذہنی تحریک

اب ہم کو اُن نئے خیالات کی طرف توجہ کرنا چاہیئے جو ہر سمت پھیل رہے تھے اور کلیسہ وحکومت کے نظام مقررہ

الٹ دینا چاہتے تھے تاکہ اس سے بہتر اور مساویانہ طرز معاشرت قائم ہوسکے۔ کسی نہ کسی قسم کا تغیر ہونا تو ضروری تھا کیونکہ پرانا طرز حکومت فرسودہ ہوگیا تھا اور لوگوں کی واجبی شکایتیں بڑھ گئی تھیں جس کی وجہ سے قابل عمل اصلاحات کا مطالبہ ہونے لگا لیکن انقلاب اس قدر جلد برپا ہونے کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ کے اہل قلم حضرات نے فرانس والوں کو نظام مقررہ کی مخالفت پر خوب اُکسایا۔ اور فرانس کے امکان ترقی کی شدید امید اور اس کا یقین دلایا غالباً دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی زمانہ نہیں آیا ہے جب کہ علماء نے جن کو کلیسہ یا سلطنت کے عہدوں سے کوئی تعلق نہ تھا عوام کے خیالات و افعال پر اس قدر اثر ڈالا ہو اس لیے یہ ضروری ہے کہ لوئی پانزدہم کے عہد حکومت کے ختم پر ان اثرات کی اصل وحقیقت دریافت کی جائے۔

اس تحریک کا عام رُجحان

یہ تحریک کئی پہلو رکھتی تھی اور اس زمانہ کے سب سے نامور مصنفین جو اس تحریک میں شریک ہوئے۔ جرمنی۔ انگلستان اور امریکہ کے باشندے تھے اس تحریک کی بعض خصوصیات بتلائی جا سکتی ہیں۔

اول تو یہ ہے کہ سب اہل قلم نظام مقررہ کے مخالف تھے ان میں سے بعض کے مزاج میں قدامت پسندی تھی اور بعض بالکل انقلاب پسند تھے مگر کلیسہ اور سلطنت کے موجودہ نظام کو سب ناپسند کرتے تھے اس تحریک کی دوسری خصوصیت شائستگی و ہمدردی تھی تمام ادارے اسی کسوٹی پر امتحان کئے جاتے تھے اور سب اہل تصنیف مذہبی مظالم انتقامی سزاؤں اور عدالتی تحقیقات میں اذیت رسانی اور قدیم عہد حکومت کے دیگر مظالم کو سخت الفاظ میں بُرا بھلا کہتے تھے یہ امر بھی نوٹ کے قابل ہے کہ بہت سے مصنفوں نے فرانس کے قرون وسطیٰ کی صحیح تاریخ سے نفرت و حقارت کی وجہ سے روگردانی کرلی تھی قرون وسطیٰ کی ہر بات کو بربریت سے مملو بتلاتے تھے قدیم یونان و روما کا تذکرہ البتہ نہایت جوش وخروش سے کرتے تھے یونان و رومہ کے ادارے و تاریخ کے متعلق

یہ لوگ بہت سی غلطیاں کرتے تھے اور منگھڑت قصوں وافسانوں کو بھی تاریخی واقعات کا درجہ دیدیتے تھے تاریخ قدیم سے یہ لوگ تمثیلات پیش کرکے نتایج اخذ کرتے تھے۔ شجاعت ومحاسن حسنہ کی مثالیں پلوٹارک (Plutarch) کی تصنیف "مشاہیر یونان و رومہ" سے اور استبداد و معائب کی مثالیں ٹیسی ٹس (Tacitus) کے اس بیان سے جو اوس نے سلطنت رومہ کے متعلق لکھا ہے۔ ماخوذ ہوتی تھیں فرانس میں اس وقت تک تعلیم عام نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے اس زمانہ کی فلسفی تصانیف گو سہل وعامیانہ انداز میں لکھی گئی تھیں لیکن زیادہ تر اعلیٰ ومتوسط طبقہ میں گردش کرتی تھیں مگر جب کوئی خیال یا نظریہ متداول ہوجاتا ہے تو پھر وہ کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں رہتا چنانچہ نظام موجودہ پر اعتراضات اور آئندہ کی موہوم امیدیں فرانس کے ہر طبقہ میں عام ہوگئیں۔

والٹیر (Voltaire) اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی علم ادب میں والٹیر (Voltaire) کا نام سب سے زیادہ ممتاز ہے (۱۶۹۴ء سے ۱۷۷۸ء) یہ شخص علم ادب کے ہر شعبے میں دخل رکھتا تھا ڈراما۔ شاعری۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ فسانہ سب میں کمال توضیح وشوخی سے ادبی کام لیا ہے اوس نے اپنی تمام عمر تعلیم پھیلانے میں اور اپنے زمانہ کے مذہبی عقائد واداروں کی مخالفت میں صرف کی سیاسی ومعاشرتی امور میں اوس کا نقطۂ خیال واضح نہ تھا وہ عمومیت کا خواہاں نہ تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ فرانس کی شاہی حکومت کمزور وناکارہ ہے۔ فریڈرک اعظم والی پراشیا (Prussia) کے ابتدائی عہد میں وہ اکثر اوس کی مصاحبت میں رہا تھا اس لئے فرانس کے لئے بھی وہ ایسے ہی قوی اور بے اصول حکمراں کی خواہش کرتا تھا جو تربیت وتعلیم پھیلانے کے لئے مستبدانہ حکومت کرسکے۔

مانٹسکیو (Montesouieu) دوسرا شخص جس کا نام اس چھوٹی سی کتاب میں بھی ذکر کرنا ضروری ہے مانٹسکیو تھا (Montesquieu) (۱۶۸۹ء سے ۱۷۵۵ء تک) اس کی مشہور تصنیف "روح قوانین"۔

ہے جس میں اس نے حکومت کے متعلق تاریخی نتائج جمع کر دیے ہیں۔ انگلستان کے اداروں کا وہ ثناخواں تھا جس کا اثر اس کے خیالات پر پڑا۔ چنانچہ وہ فرانس میں آزاد اور متوازن اعیانی حکومت چاہتا تھا۔ سیاسی خیالات میں اس نے ایک جدید اضافہ اس تجویز سے کیا کہ وضع قوانین۔ معدلت گستری اور عاملانہ فرائض ایک دوسرے سے علٰحدہ رکھے جائیں اور اس مسئلہ پر اس نے اپنی کتاب میں جو باب قائم کئے ہیں اس کا اثر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دساتیر بنانے میں بہت ہوا ہے اور فرانس کے سنہ ۱۷۹۱ء والے دساتیر پر بھی۔

روسو (Rousseau) ان دونوں سے بھی زیادہ اور فوری اثر روسو (Rousseau) کا ہوا ہے جو کئی لحاظ سے ان لوگوں سے جدا حیثیت رکھتا ہے اس کی پرجوش طبیعت والٹیر۔ وماٹسکیو کی ذہنیت ومقبولیت سے مختلف تھی۔ کئی امور میں اپنے زمانہ کے متداولہ خیالات سے الگ وہ اپنی ایک رائے رکھتا تھا۔ اس نے "معاودت بہ قدرت" کے اصول کی تبلیغ کی اور اس مشہور فقرہ کے منشا کے مطابق موجودہ طرز تعلیم وتعلم کو یکسر بدل دینا چاہتا تھا۔ ٹھیٹھ مسیحی مذہب کا وہ منکر تھا۔ لیکن خدا کے وجود کا قائل تھا۔ اور اس عقیدہ کی پرجوش اشاعت کرتا تھا۔ اس کے سیاسی خیالات اس کی بہت سی کتابوں میں ہیں۔ لیکن ان سب کو اسی نے اپنی مختصر کتاب

معاہدۂ معاشری "معاہدۂ معاشری" (Social contract) میں مدون کردیا ہے جس کا اثر خود اس کے زمانے میں اور اس کے بعد کی نسلوں میں بہت زیادہ رہا۔ اور صحیح طور پر اس کتاب کو انقلاب کی "انجیل" کہا گیا ہے۔ اس کتاب میں اس نے بتایا ہے کہ تمام حکومتوں کی ابتدا

خود قوم خود قوم (People) سے ہوتی ہے حکومت کی بنیاد بادشاہوں کے خداداد حق یا محکوم وحکمراں کے باہمی معاہدہ پر نہیں ہے۔ حکومت کا حق شروع سے رعیت کے ہاتھ میں تھا اور یہ حق انھیں کا ہے ابھی چونکہ حکومتیں وہ قائم کرتے ہیں اس لئے اُن کو حکومت کے الٹ دینے کا بھی اختیار رہے اس کے یہ

اختیارات نہ تو سیاسی امور میں اور نہ مذہبی امور میں کسی حد یا قید کے پابند ہو سکتے ہیں اس طور پر جہاں وہ وحشیانہ انقلاب کی تعلیم دیتا ہے وہیں انقلاب کے جابر سر گروہ اپنے مستبدانہ افعال کی تائید میں اس کی کتاب کو بطور سند پیش کرتے ہیں۔ اس کتاب کے مضامین و عقائد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے طرز بیان کی شوخی کی وجہ سے اس کو اس درجہ مقبولیت عام حاصل ہوئی۔

خلاصہ انجام آخر میں انقلاب کے پہلے فرانس کی حالت کا تصور کرنے میں ہم کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بمقابلہ دیگر ممالک کے وہاں کی رعایا زیادہ تکلیف و مصیبت میں تھی۔ بلکہ اصلیت یہ تھی کہ اس کو اپنی تکلیف کا احساس نسبتاً زیادہ تھا اور اس کے اسباب علل کو عزم بالجزم کے ساتھ مٹا دینے کے لئے وہ آمادہ ہو گئے تھے۔ اور ان کو ایک ایسی حکومت سے مقابلہ تھا جو بظاہر قوی معلوم ہوتی تھی۔ مگر دراصل بہت کمزور تھی اور جس کو تباہ کرنے کے بعد باغیوں کو کامل اختیار و آزادی حاصل ہونے کی امید تھی۔

حوالۂ کتب متعلق باب ہذا:-

(۱) "عہد قدیم" مصنفۂ ٹین (Taine) (۲) "عہد قدیم و انقلاب" مصنفۂ ڈی ٹاکوئیویل" (De Tocqueville) (۳) "سفر نامۂ فرانس" مصنفۂ آرتھر ینگ (Arthur Young) (۴) "والٹیر" (Voltaire) "روسو" (Rousseau) مصنفۂ جان مارلے (John Morley) (۵) "معاہدۂ معاشرتی" مصنفۂ روسو (Rousseau) نیز ترجمۂ ایچ - جے - ٹوزر (H. J. Tozer) (٦) تاریخ "انگلستان" باب تسلیم مصنفۂ لیکی (Lecky)-

انقلاب فرانس

لوئی شانزدہم اور میری انتوانت

لوئی شانزدہم جو ۱۷۷۴ء میں تخت فرانس پر بیٹھا تمام بادشاہوں سے زیادہ نیک نیت تھا۔ لوئی پانزدہم کے دربار کی ذلیل حالت کو وہ نفرت سے دیکھتا تھا اور اپنے زمانے کے خلق پرور خیالات سے بھی وہ متاثر ہو چکا تھا یورپ میں فرانس و آسٹریا کو متحد العمل کرنے کے زمانے میں اس کی شادی آسٹریا کی شہزادی۔ میری انتوانت (Marie Antoinette) سے ہو گئی تھی۔ اس کی بیوی قوی دل و دماغ کی عورت تھی۔ بلکہ دماغی قابلیت میں اپنے شوہر سے بڑھی ہوئی تھی۔ لیکن فرانس میں وہ بالکل اجنبی تھی اور وہاں کے مسائل وطرز حکومت کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ چنانچہ اس کی صحبت کا نتیجہ اس کے خاوند کے لئے بُرا ہوا۔ کیونکہ آسٹروی اور غیر ملکی ہونے کے باعث شروع ہی سے لوگ اس کے مخالف ہو گئے تھے اور آخر وقت میں تو اس کو انقلاب کا بدترین دشمن خیال کیا جاتا تھا اور ایک حد تک یہ خیال صحیح بھی تھا۔

۱۷۷۴ء میں مالی حالت بہت نازک تھی۔ فرانس بہت مقروض تھا

اور یہ قرضہ سال بسال بڑھتا جاتا تھا۔ گذشتہ باب میں اس ناقابل اطمینان حالت کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی جا چکی ہے جب تک دولتمند بوجہ امتیاز و رعایت محاصل کا معقول بار اٹھانے سے محفوظ تھے۔ اس وقت تک فرانس کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں ہو سکتی تھی۔ اور نہ ملک کے ضروریات کے موافق آمدنی ہو سکتی تھی اس عہد کے ابتدائی سنین کے حالات کا پتا ان مالی امتیازات کے مٹانے کی ضرورت اور اس مقصد کے حصول کی کوششوں سے ملتا ہے لوئی شانزدہم نے پہلی وزارت کے اراکین نہایت اعلیٰ درجے کے منتخب کیے تھے۔ ان میں تیورگو (Turgot) نامی ایک شخص سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ یہ شخص ایک افلاس زدہ ضلع پر نہایت عمدگی و دانائی سے حکومت کرنے کی وجہ سے نیک نام ہو چکا تھا اور صاحب قلم ہونے اور اس زمانے کے خیالات کا حامی ہونے کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کر چکا تھا جیسی طرح لوئی سیزدہم نے رِچلو (Richelieu) کی رعایت کی تھی لوئی شانزدہم بھی اس شخص کی تائید کرتا تو نہایت سہولت اور امن کے ساتھ عظیم الشان اصلاحات ہو جاتے اور فرانس انقلاب کے مصائب سے بچ جاتا۔ ٹرگوٹ نے امتیازات مٹانے کی اور طرز حکومت بہتر بنانے کی بہت سی تجویزیں تیار کیں۔ اور ان میں سے بعض کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ لیکن اس کی مخالفت کے لیے دربار میں سازشیں ہونے لگیں۔ جن میں خود ملکہ شریک تھی اور آخرکار اُسے علٰحدہ کرنے پر بادشاہ مجبور ہو گیا۔ دوسرا وزیر مالیات جنیوا (Geneva) کا ایک ساہوکار مسمی نیکر (Necker) مقرر ہوا یہ شخص پروٹسٹنٹ مذہب کا پیرو تھا۔ اس کے تقرر میں کچھ آئینی دقتیں پیش آئیں۔ ٹرگاٹ کی طرح وہ بڑا مدبر یا مصلح کار تو نہ تھا لیکن مالیات کا وہ ماہر تھا۔ چنانچہ کفایت شعاری کر کے اور ہوشیاری کے ساتھ قرضہ لے کر اس نے ملک کی آمدنی و خرچ میں ایک قسم کی مناسبت قائم کر دی۔ لیکن اس کے زمانے میں انگلستان اور اس کی نوآبادیات شمالی امریکہ میں جنگ چھڑ جانے سے فرانس بھی اس میں شریک ہوا۔ یہ جنگ فرانس کی بڑی سرخروئی کا باعث ہوئی۔

خشکی اور سمندر دونوں جگہ انگلستان کی رسوائی ہوئی اور نوآبادیات کو ہرگز فتح نہ حاصل ہوتی۔ اگر فرانس نے ان کو مختلف طریقہ سے مدد نہ پہنچائی ہوتی لیکن اس فتح و کامیابی سے فرانس کی شاہی حکومت کو تقویت یا استحکام نہیں حاصل ہوا نہ گزشتہ عہد حکومت کی ہزیمتوں کی اشک شوئی ہوسکی۔ فرانس والوں کی آنکھ فرانسیسی فوج کی فتح کے بجائے ریاستہائے متحدہ کی کامیابی پر لگی ہوئی تھی ایک عمومیت و جمہوریت کے قیام کا انہوں نے جوش کے ساتھ خیرمقدم کیا اور اس حکومت کو جو اس فتح کا باعث ہوئی تھی مدد دینے کی بجائے لوگ یہ سوچنے لگے کہ یہی خیالات جو بحر اٹلانٹک (Atlantic) کے اس پار اس قدر کامیاب ثابت ہوئے تھے فرانس میں بھی کیوں نہ پھیلائے جائیں۔ ایک دوسری حیثیت سے بھی اس لڑائی نے شاہی کی امیدوں پر پانی پھیر دیا نیکر (Necker) کا مجوزہ مالی انتظام صرف صلح و امن کے زمانہ میں کارگر و کامیاب ہوسکتا تھا۔ فتح کی باوجود فرانس اس جنگ میں بہت زیر بار ہوگیا اور نیکر کی کفایت شعاری کچھ کام نہ دے سکی۔ آخر کار وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچا کہ امتیازات مٹا دینے چاہئیں اس لئے اس نے فرانس کی اقتصادی حالت کی ایک کیفیت مرتب کی تاکہ اس کے بعد دیگر تدابیر اختیار کئے جائیں اتنا ہونا تھا کہ اس کے خلاف بھی ویسی ہی مخالفت شروع ہوگئی جیسی کہ اس کے پیشرو کے خلاف ہوئی تھی اور ۱۷۸۱ء میں اُسے بھی خدمت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اب مالی نظم و نسق کے لئے نئی تجویزیں اختیار کی گئیں۔ کچھ دنوں تو بھاری بھاری شرح سود پر خوب قرضہ لے کر حکومت کا کام چلایا گیا۔ اور جب یہ بھی ناممکن ہوگیا تو بادشاہ نے شاہی فرمان کے ذریعہ سے کل طبقوں پر محاصل عائد کرنا شروع کیا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ رویہ اس نے اپنی پیشرؤں کی طرح اختیار کیا تھا۔ لیکن اب شاہی کی وہ حالت باقی نہ رہی تھی

نیکر (Necker)

جنگ امریکہ

نیکر کا زوال

جو پہلے زمانہ میں تھی۔ تاجدار کی سقیم حالت کی وجہ سے شاہی کمزور ہوگئی تھی اور اس کے مخالفین کا اعتماد بھی بڑھا ہوا تھا کہ وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے پیرس کی پارلیمنٹ نے اس کے فرامین کی مخالفت شروع کر دی حالانکہ اسی نئے پارلیمنٹ کو دوبارہ قائم کیا تھا پارلیمنٹ کی مخالفت گویا فرانس کے لوگوں کی مخالفت تھی اس خلفشار میں اکثر یہ صدا بلند ہوتی تھی

طبقات مجتمعہ کے انعقاد کا مطالبہ

کہ خود قوم سے مشورہ لیا جانا چاہیے اور طبقات مجتمعہ (States General) کو دوبارہ قائم کرنا چاہیئے فرانس کے تینوں طبقہ کی قدیمی مجلس جس کو اسٹیٹس جنرل کہتے تھے سنہ ۱۶۱۴ء سے موقوف ہوگئی تھی۔ اس کی عضویت یا کارروائیوں کا کچھ پتا نہ تھا لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے ایک عام نیابتی مجلس قائم کر لی تھی اور اب اسٹیٹس جنرل قائم کرنے کا بڑے شد و مد سے تقاضا ہونے لگا۔ بادشاہ کچھ تو کمزوری سے اور کچھ تو فرانس کی ہر دل عزیز جماعت کی حمایت کے خیال سے اس مطالبے کو منظور کرنے پر آمادہ ہوگیا اس نے نیکر کو پھر بحال کر دیا اور اسٹیٹس جنرل کے انعقاد کے لئے آمادگی ظاہر کر دی۔

مجلس طبقات مجتمعہ سنہ ۱۷۸۹ء

اس فیصلہ کا نہایت جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا اور بادشاہ ہر دل عزیز ہوگیا لیکن دو ابتدائی مسائل تصفیہ طلب تھے ایک (۱) تو یہ کہ عوام کے نمائندوں کی تعداد پادریوں اور شرفا کے امتیازی طبقوں کے برابر ہوگی یا ان کی دوگنی۔ نیکر کی اصلاح پر بادشاہ نے اس مسئلہ کا تصفیہ عوام کی رائے کے مطابق کر دیا جس کو دوگنی نیابت کے نام سے موسوم کیا گیا اس کے بعد اب یہ مسئلہ پیش ہوا کہ اجلاس کس طور پر ہوگا اور رائے زنی کس طرح ہوگی۔ آیا سب نمائندے ایک ہی اجلاس میں شریک ہوکر غلبۂ آرا سے فیصلے کیا کریں گے یا تین ایوان قائم رہیں گے اور ان میں سے دو ایوان جس مسئلہ کے موافق رائے

دے دیں وہ منظور سمجھا جائے گا اول الذکر صورت میں عوام پادریوں کی تائید سے اور بعض شرفا کی مدد سے سب کام اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے تھے۔ لیکن صورت آخرالذکر میں ان کی دوگنی نیابت بے کار اور مضحکہ خیز ہو جاتی اور امتیازی طبقے تمام قوم کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر دیتے اس مشکل مسئلہ کا حل نہیں ہو سکا تو ۵ مئی ۱۷۸۹ء کو شرفا۔ پادری اور عوام کے بارہ سو نمایندے ورسیلز (Versailles) پہنچے۔ بادشاہ نے ایک خوش آیند تقریر کے ساتھ کارروائی کا آغاز کیا لیکن انجام کار وہی مسئلہ پھر حائل ہوا اور معلوم ہوا کہ جب تک رائے زنی کے مسئلہ کا تصفیہ نہ ہوگا کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ تینوں طبقوں میں گفت و شنید کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ فرانس کی عام تائید اور درخواستوں سے عوام کو تقویت حاصل تھی اور بہت سے پادریوں نے بھی ان کا ساتھ دینے کا اقرار کر لیا تھا۔ بڑی گفت و شنید اور پس و پیش کے بعد ۱۷ جون ۱۷۸۹ء

قومی مجلس

کو عوام نے قومی مجلس کا لقب اختیار کر لیا۔ اور اعلان کر دیا کہ امتیازی طبقے خواہ ساتھ دیں یا نہ دیں فرانس کے لئے دساتیر بنانے کا کام وہ جاری رکھیں گے اس فعل سے گویا تیسرے طبقہ یعنی عوام نے کل قوم کی طرف سے عمل کرنے کا خود کو مجاز بنا لیا تھا اس وقت بادشاہ کو مجبوراً مداخلت کرنا پڑی۔ دربار کی فسادی جماعتوں کی وجہ سے اب تک بادشاہ پس و پیش کرتا رہا لیکن اب اس نے عزم کر لیا کہ نمایندوں پر اپنا منشاء ظاہر کر دے اس نے متعدد اصلاحات کا وعدہ کیا اور اقرار کیا کہ اسٹیٹس جنرل فرانس میں دائماً قائم رکھی جائے گی لیکن یہ کہہ کر اس نے سب بگاڑ دیا کہ اسٹیٹس جنرل سہ ایوانی نمونہ پر قائم کی جائے گی یہ ایسی تجویز تھی جس کے ذریعہ سے امتیازی طبقوں کو اقتدار حاصل ہو جاتا تھا۔ عوام نے سخت مخالفت شروع کر دی ان کا سردار میرابو (Mirabeau) زبردست مقرر اور پر مغز مدبر تھا۔ یہ شخص اصل میں شرفا سے تھا لیکن عوام کا شریک حال ہو گیا تھا۔ بادشاہ

فوج کو کام میں لانا نہیں چاہتا تھا حالانکہ خود اس کے اختیارات کی صریح مخالفت بھی ہو رہی تھی۔ اس کی لمبی چوڑی تقریر کے باوجود چند ہی روز میں عوام کو فتح کامل حاصل ہو گئی بہت سے شرفا اور پادری تو خود بخود عوام کے طرفدار ہو گئے بقیہ لوگوں کو خود بادشاہ نے ایسا ہی کرنے کو کہا۔ اس طور پر

بادشاہ کی مغلوبیت کے اسباب

سلخ ماہ کو فرانس کے کل بارہ سو نمایندے ایک حجرہ میں جمع ہوئے اور آئین و دستور بنانے میں مصروف ہو گئے۔ ہر مسئلہ کا تصفیہ کثرت آرا پر ہوتا تھا اور عام طبقہ اس مجلس میں سب پر حاوی رہا بادشاہ کی اس مغلوبیت کا سبب مالی حالت تھی بادشاہ کو زر نقد کی ضرورت تھی۔ سابق عہد حکومت میں معمولی وسائل سے یہ ضرورت پوری نہ ہوسکتی تھی۔ اب صرف لوگوں کی (رعیت) کی مدد سے قرضہ ادا کرنے کی قابلیت حاصل ہوسکتی تھی اور لوگوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ان کے شرایط قبول کر لئے جائیں۔ لیکن بادشاہ کی یہ مغلوبیت ایک حد تک محض ظاہری تھی۔ اس کے مصاحبین اس کو عمل کرنے پر اکسا رہے تھے اور پیرس کی تحریک کو جو روز بروز خطرناک ہوتی جارہی تھی فوج کی مدد سے دبا دینے کی صلاح دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر بادشاہ اس تجویز پر رضامند ہوگیا اور بہت سی فوج اور پلٹنوں کو پیرس میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ نیکر میں انتظامی قابلیت نہ ہونے سے وہ بھی علیحدہ کردیا گیا۔ حالانکہ پیرس کے لوگوں میں اب بھی وہ ہردل عزیز تھا اس کی جگہ پراعیانیت پسند لوگوں کا تقرر کیا گیا جب ان واقعات کی اطلاع پیرس میں پہنچی تو مخالفت کا ایک طوفان برپا ہوگیا تمام شہر سیاسی جوش و ہیجان سے تڑپ رہا تھا مجلس تو بارہ میل کے فاصلہ پر ورسلیز میں اجلاس کررہی تھی لیکن خود پیرس میں مارا (Marat) اور کامیل دے مولین (Camille Desmoulins) کے ایسے مدبرین اور مقررین موجود تھے

قلعۂ باستیل (Bastille) کا فتح ہو جانا۔

جو عوام کی رہنمائی کے لیے کافی تھے پیرس کی متعینہ پلٹن کے کچھ سپاہی عوام کی طرف چلے گئے ایک اسلحہ خانہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا گیا۔ اور چودہ جولائی کو مجمع قلعۂ باستیل پر حملہ کرنے کے لیے بڑھا۔ فوجی لحاظ سے یہ کوئی اہم مقام نہ تھا یہاں صرف ایک مٹھی سپاہی متعین تھے اور چند قیدی لیکن یہ بھی سیاسی قیدی نہ تھے ایک صدی پیشتر یہ بہت مشہور محبس رہ چکا تھا اور استبداد یت کی یادگار سمجھا جاتا تھا اور اگر یہاں ایک معقول دستہ متعین ہوتا تو پیرس پر قابو رکھنے کے کام میں لایا جاسکتا تھا اب بھی یہ قلعہ ایک عرصہ تک مدافعت کر سکتا تھا لیکن خوراک ہی نہ تھی اور فوج بھی کچھ کچھ باغی تھی۔ قلعہ کے سردار کو باور کرایا گیا کہ خود بادشاہ نے اطاعت کر لی ہے سبب ہر ہیں اس شرط پر اس نے قلعہ حوالہ کر دینے پر رضامندی ظاہر کی کہ اس کی اور اس کی پلٹن کی جان بچادی جائے چنانچہ اس قسم کا وعدہ ہوگیا لیکن جیوں ہی کماں دار اور اس کے عہدہ دار باہر آئے مجمع بادشاہ کی روانگی انپر ٹوٹ پڑا اور بری طرح سے ان کو قتل کر ڈالا۔

پیرس کو۔

باستیل (Bastille) کے فتح ہو جانے سے بادشاہ اور اس کے مصاحبین خوف زدہ ہو گئے ناپسند وزرا علیحدہ کر دئے گئے اور نیکر بھی بحال کر دیا گیا شاہی کے مقابلہ میں انقلاب کی یہ پہلی عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔ چند ماہ بعد اکتوبر ۱۷۸۹ء میں بھی اس کو ایسی ہی اور شاندار فتح حاصل ہوئی شروع سے پیرس کے لوگ چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کے بیچ میں رہے لیکن اب تک ورسائی کا محل چھوڑنے سے وہ انکار کرتا رہا پیرس میں اناج کی کمیابی کے باعث ۵۔ اکتوبر کو ایک عورت فریادی ہوئی اور اس پر ورسیلز کے محل کو ترک کرانے کی ایک تحریک شروع ہوگئی ایک بہت بڑا مجمع جس میں کچھ لوگ مسلح بھی تھے وہاں گیا اور بادشاہ سے استدعا کی کہ پیرس میں

آگر قیام کیا جائے بادشاہ نے ایک مبہم جواب دیا۔ اس پر دوسرے دن ۶ ہر اکتوبر کو مجمع شاہی محل میں گھس پڑا اور بادشاہ و ملکہ کے حجرہ تک پہنچ گیا بادشاہ و ملکہ خطرہ میں پڑ گئے تھے کہ لافایت (Lufayette) قومی خاصہ برداروں کو لے کر پہنچا اور بادشاہ کو فوری خطرہ سے بچا لیا۔ لیکن وہ خود پیرس کی شہری مجلس کے پاس سے یہی پیغام لے کر آیا تھا کہ بادشاہ پیرس میں چل کر قیام کرے وہ اب بھی جانے کے لئے راضی نہیں تھا کیونکہ پیرس کا محل ٹوئلیریز اس کے لئے موزوں نہ تھا اور وہ وہاں جا کر تقریباً مقید ہو جاتا تھا لیکن اگر انکار کرتا تو پھر جبر و سختی کا برتاؤ شروع ہو جاتا۔ آخر کار ۶ ہر اکتوبر کو سہ پہر میں شاہی جماعت پیرس کو روانہ ہوئی اور ٹوئلیریز میں جا کر رونق افروز ہوئی اس وقت سے بادشاہ اپنے کو عوام کا قیدی سمجھنے لگا اور ہر وقت بھاگ جانے کی فکر میں رہنے لگا۔

مجلس وضع قوانین

ان واقعات کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لئے انقلاب میں کسی قسم کی مزاحمت یا دست اندازی کا احتمال باقی نہ رہا اور مجلس نے اب مجلس واضع دساتیر و آئین کا لقب (Censtituent Assembly) اختیار کر لیا اب یہ مجلس اپنی غرض پوری کرنے کے لئے آزاد تھی ان کی غرض یہی تھی کہ فرانس کے لئے ایسا دستور بنا دیا جائے جو سابقہ شاہی مطلق العنانی اور اعیانی امتیازات کا بدل ہو جائے۔ آئین سازی کا کام شروع کرنے سے پہلے "انسانی حقوق" کا ایک اعلان کیا گیا جس میں روسو کی تعلیم کی صاف جھلک نظر آتی تھی اس مشہور اعلان میں یہ درج تھا کہ ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے اور سب کے حقوق یکساں و مساوی ہوتے ہیں آزادی اور جائداد کا برقرار و محفوظ رکھنا اور ظلم و تعدی کی مخالفت کرنا ہر حکومت کا مقصد ہوتا ہے اور یہ کہ ہر شہری کو قانون بنانے میں خود یا کسی نمائندے کے ذریعے سے حصہ لینے کا حق و اختیار ہے اور یہ کہ فرماں روائی کا حق بھی قوم ہی کو حاصل ہوتا ہے اس وجہ سے کوئی حاکم بجز اس کے کہ وہ قوم کا نائب ہو کوئی

اختیار کام میں نہیں لا سکتا اس کے بعد جب آئین سازی کا اصل کام
شروع ہوا تو زیادہ تر انگلستان کے دستور کا اتباع کیا گیا۔ لوئی شانزدہم
ان تغیرات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا جو اب پیش کئے گئے حالانکہ اس
کی وہ حیثیت اب باقی نہیں رہ سکتی تھی جو اس کے پیشروؤں کو حاصل
تھی لیکن اس نئے دستور کی ایک شرط سے وہ بہت آزردہ ہوا۔ مجلس نے
تمام کلیسائی طرز حکومت کو ایک نئی عضویت میں ڈھالنے کا ارادہ کر لیا تھا
اور اسقفوں اور ان کے حلقوں میں تغیر و تبدل کر دیا گیا تھا۔ پادریوں
کی آمدنی برابر کر دی گئی اور سب اعلےٰ و ادنےٰ پادریوں کے تقرر کا اختیار
بادشاہ و پوپ سے چھین کر رائے دہندوں کے اختیار میں دے دیا گیا
خواہ ان کا مذہب کچھ ہی ہو۔ یہ تغیرات جن میں مساوات و جمہوریت (Democracy)
کی بو پائی جاتی تھی اور جو انقلاب کی خاص خصوصیت تھی پوپ کو بہت ہی
ناگوار گذرے آخر میں اس نے ان کے عدم جواز کا فتویٰ دے دیا اور جو
لوگ اس کے ذمہ دار تھے ان کو دین سے خارج کر دیا۔ چونکہ بادشاہ
کے دستخط بھی اس پر جبراً لئے گئے تھے اس وجہ سے اس کا ضمیر بھی مضطرب
تھا وہ موقع کا منتظر تھا کہ اس ناپاک تجویز کو منسوخ کر دے۔

پیرس میں بادشاہ کی حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی بہت سے

بادشاہ کی فراری

اخبارات اور سر برآوردہ مقررین کو اس کے ارادہ کی سُن
گُن لگ چلی تھی اور یہ لوگ اس کو انقلاب کا دشمن بتلانے
لگے تھے۔ اس کو عرصہ سے نکل بھاگنے کی فکر تھی اور اس
کی ملکہ میری انتوانت (Marie Antoinette) بھی اس کو اکسا رہی تھی۔
اسلئے شمال و مشرقی سمت کے سپہ سالار کے ذریعہ سے اس نے بندوبست
کیا اور اس سمت کی فوج کے سپرد اپنے کو کرکے نئے دستور میں کچھ تغیرات
کا حکم دینے کا اس نے قصد کیا جون ۱۷۹۱ء میں وہ پیرس سے بچ کر نکل
گیا لیکن منزل مقصود کے قریب پہنچ کر وہ گرفتار ہو گیا اور وہاں سے پیرس
لایا گیا اب تو حالت بہت نازک تھی مگر مجلس نے دستور مکمل ہونے تک

اُسے اپنے عہدہ سے معطل رکھا - اور یہ طے پایا کہ دستور مکمل ہونے کے بعد اس کے پاس پیش کیا جاوے اگر وہ قبول کرے تو ان اختیارات کے ساتھ جو اس طور پر اس کو دیئے جائیں وہ حکومت کرنے کا مجاز گردانا جائے اور اگر وہ انکار کرے تو اس کو اس کی دست برداری سمجھ لیا جائے مگر پیرس میں چند سیاس ایسے تھے جن کے خیال میں یہ تجویز بے سود تھی اور یہ لوگ بادشاہ کی فوری معزولی اور جمہوریت کے قیام پر مصر تھے - ایک محضر مرتب ہوا اور تائید میں اس پر دستخط کرنے کے لئے ایک انبوہ کثیر جمع ہوگیا مگر قومی محافظین نے مجمع کو منتشر کر دیا اور اس خلفشار میں کئی آدمیوں کی جانیں بھی ضائع ہوئیں ستمبر ۱۷۹۱ء میں دستور مکمل ہو گیا جس میں یہ قرار پایا کہ فرانس

دستور کی تکمیل

پر ایک بادشاہ کی حکومت ہو گی جس کو تقرر وزرا کا اختیار ہوگا اور فوج و بیڑا بھی اسی کے اختیار میں ہوگا - لیکن وضع قوانین میں اس کو کوئی اختیار منظوری یا نامنظوری کا نہ ہوگا وضع قوانین کا کام (۷۵۰) اشخاص کی ایک مجلس کے سپرد کیا گیا ان لوگوں کا تقرر انتخاب سے ہونا قرار پایا اور انتخاب کرنے کے وہی لوگ مستحق ٹھہرائے گئے جن کے پاس ایک معینہ مقدار کی جائداد ہو اور اس میں کسان لوگ بھی شامل تھے البتہ شہر کے مزدور اس حق سے محروم رکھے گئے - کل اراکین کا ایک ہی ایوان مقرر کیا گیا جس کے اجلاس کی مدت تقرر صرف دو سال رکھی گئی - فرانس کی صوبوی حکومت کا بھی از سر نو انتظام کیا گیا قدیم صوبے مع ان کی تاریخی یادگاروں کے مٹا دیئے گئے اور ان کے بجائے (۸۳) چھوٹے چھوٹے محکمے قائم کیے گئے جن کے نام کسی مقامی دریا یا پہاڑ کے نام پر رکھ دیئے گئے یہ دستور اب بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا رسمی طور پر تو اس نے قبول کر لیا اور سب کے مطابق حکومت کرنے کا اقرار بھی کیا بہت سے مقامی لوگوں نے اور نیز باہر والوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب انقلاب ختم ہو چکا اور انگلستان کی سی دستوری حکومت فرانس میں جاری رہ گئی ؎

لیکن انقلاب ابھی ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے شدت کا زمانہ ابھی شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ دوبارہ انقلابی جبر و سختی کا مظاہرہ کئی سبب سے وجود پذیر ہوا دستور کی تعمیل دشوار تھی۔ بادشاہ بھی قائل نہ تھا۔ اور ملکہ تو اس کی سخت مخالف تھی اس کے علاوہ اب تک جس قدر انقلاب ہوا تھا اس سے لوگوں کی ان توقعات و خواہشات کی تکمیل نہیں ہوئی تھی جن کو لوگ شروع سے خیال کئے ہوئے تھے۔ مساوات اور جمہوریت کی کسی تحریک کو اب روکنا مشکل تھا۔ لیکن اب ایک نیا اثر فرانسیسی انقلاب پر پڑا فرانس اور ایک یوروپی اتحاد کے درمیان جنگ شروع ہوگئی اور اس جنگ نے اس تحریک کا رخ ہی بدل دیا۔

دوبارہ ظہور انقلاب کے اسباب

جنگ

اس زمانے میں یورپ کی سیاسی صورت حال میں سلطنت پولینڈ کی حالت کا سب سے زیادہ دخل رہا۔ گزشتہ کسی باب میں اس کے ضعف و زوال کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ ۱۷۷۲ء میں پراشیا روس و آسٹریا نے اس کے سرحدی علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب اس کے اچھے دن پلٹ آئیں گے۔ ہر طبقے کے لوگ خطرے کو محسوس کرنے لگے تھے اور ان کا تاجدار اسٹین یسلاس دوم (Stanislas II) بھی جو کسی معنی میں بڑا یا قوی نہ تھا۔ اس فکر میں پڑ گیا تھا کہ اعیانیت کے خطرناک اختیارات سلب کر کے ایک مجلس قائم کر دے جو واقعی میں قوانین وضع کر سکے اور ایک ایسی وزارت قائم کر دے جو معقول طور پر فرمانروائی کر سکے اس تجویز کے مطابق ایک قابل عمل دستور بنا دینے کا اس نے ارادہ کیا۔ ملک میں ہر طرح کی ترقی شروع ہوگئی۔ لیکن پولینڈ کی پڑوسی سلطنتیں

پولینڈ (Poland)

خصوصاً روس اپنے شکار کو قوت حاصل کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور

پولینڈ کی دوسری تقسیم

اس وجہ سے جب ۱۷۹۱ء میں اصلاحی دستور جاری ہوا تو ان سلطنتوں نے مداخلت کردی نہایت بے بنیاد حیلے لگائے گئے اور پولینڈ پر فوج کشی کردی گئی اس کے پڑوسیوں نے اس کا ملک آپس میں تقسیم کرلینے کی ٹھان لی مگر مغروقہ ملک کی تقسیم کے اصول میں سخت اختلاف و تنازعہ ہوگیا۔ آسٹریا کو اس تجویز سے خارج کردیا گیا۔ ملک کا بیشتر حصہ روس نے لیا اور پراشیا نے ان قیمتی علاقوں کو لے لیا جو اس کی سرحد سے ملے ہوئے تھے اس سے ذرا زیادہ اس ملک کے آخری انجام پر بھی ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

ملک لوٹا کھسوٹا جا ہی چکا تھا اب اس میں استواری بھی باقی نہ تھی۔ لوگ غیر آسودہ اور آمادہ بہ فساد تھے آخر میں روس نے پولینڈ کی فوج برخاست و تخفیف کر دینے کا حکم دے کر اور بھی آگ لگا دی پولینڈ کے جانباز کوسکیوسکو (Kosciusko) کی سرداری میں بغاوت ہوگئی اس کو بعض نمایاں فتوحات بھی حاصل ہوئیں لیکن اتنی زبردست دول کے جتھے کے مقابلہ میں اس کو فتح کامل حاصل ہونا غیر ممکن تھا۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء

پولینڈ کا خاتمہ

میں پولینڈ کی تیسری و آخری تقسیم عمل میں آئی۔ پراشیا و آسٹریا اور روس تینوں اس غنیمت کو آپس میں تقسیم کرلینے پر تیار ہوگئے اور انھوں نے طے کرلیا کہ پولینڈ کا نام و نشان بھی اب یورپ کے نقشہ پر باقی نہ رہے۔

پولینڈ کا اثر فرانس پر

ہم نے پولینڈ کی پیچیدگیوں کا ذکر فرانسیسی انقلاب کے ابتدائی خارجی تعلقات کے سلسلہ میں اس وجہ سے کردیا ہے کہ دول یورپ کے طرز عمل اور بہ وقت ضرورت فرانس کے مقابل میں ایک زبردست اور باثر اتحاد قائم کرنے میں ان واقعات کا خاص دخل رہا ہے یورپ میں دو انقلاب

اس زمانہ میں ہوئے ایک تو پولینڈ کا دوسرے فرانس کا اور پولینڈ کے انقلاب نے فرانسیسی انقلاب کو کامیابی حاصل کرنے میں بہت مدد دی کیونکہ دول عظمےٰ کی قوت و توجہ اُسی کی طرف مبذول رہی۔

فرانس سے جنگ کے اسباب

ابتداء سے فرانسیسی انقلاب کی طرف لوگوں کی توجہ تھی پہلے تو یورپ نے قدیم شاہی حکومت کو معدوم ہوتے ہوئے خوشی اور اطمینان سے دیکھا کیونکہ گذشتہ دو صدیوں سے اس نے یورپ کو خوف زدہ کر رکھا تھا اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ نئی دستوری حکومت کمزوری کی وجہ سے اتنی خطرناک ثابت نہ ہوگی لیکن چند ہی دنوں میں فرانس کے طرز عمل نے کئی سلطنتوں کو اس کے خلاف برانگیختہ کر دیا۔ انقلاب کے اعلانی اصول کے مطابق تمام دول یورپ کا موجودہ نظام حکومت درہم برہم ہو جاتا تھا۔ آسٹریا اور جرمنی کی دوسری مملکتوں کو دوسری شکایتیں بھی فرانس کے خلاف تھیں کیونکہ فرانس نے جاگیریت کو

فرانس سے جرمنی کی شکایتیں

موقوف کر دیا تھا۔ "دہم" اور دوسرے جاگیری مطالبات یکسر اٹھا دئے گئے تھے اور مشرقی سرحدات کے بہت سے "دہم" اور دیگر جاگیری محاصل کی آمدنی جرمنی کے خزانہ میں جمع ہوتی تھی۔ کیونکہ ۱۶۴۸ء کی صلح ویسٹ فیلیا (Westphalia) میں ان مطالبات کی روانگی کی ضمانت دی گئی تھی۔ فرانسیسیوں نے اس نقصان کا معاوضہ دینے سے قطعاً انکار کر دیا اور کہا کہ جرمن دول کا یہ اعتراض کرنا فرانس کی آزادی و خود مختاری کی توہین کرتا ہے خود فرانس والوں کو بھی جرمنی کی سلطنتوں سے کچھ شکایت تھی۔

مہاجر امرائے فرانس

چند شرفائے فرانس جن میں بادشاہ کے بھائی بھی شامل تھے آغاز انقلاب کے زمانہ میں فرانس سے چلے گئے تھے۔ کچھ تو خوف سے اور کچھ اس خیال سے کہ وہ ایسی تحریک میں شریک نہ ہوسکیں جس سے وہ سخت متنفر تھے

ان لوگوں نے سرحد کے باہر ٹریوز (Treves) اور مینز (Mainz) میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں ایک شاہی دربار کا نمونہ قائم کر رکھا تھا اور فرانس میں گھس کر انقلاب کو فنا کر دینے کے لیے کھلم کھلا فوج بھرتی کر رہے تھے اور قواعد وغیرہ کراتے تھے۔ شاہ فرانس نے رسمی طور سے اس پر اعتراض کیا تھا۔ اور شہنشاہ لیوپولڈ (Leopold) نے جس کو جوزف دوم کے بعد ۱۷۹۰ء میں تخت ملا تھا۔ اپنے اثرات سے ان فوجوں کو برخاست کرا دیا۔ لیکن دونوں طرف لڑائی کا جوش بڑھتا رہا۔ فرانس کے سب طبقے جنگ کے خواستگار تھے بادشاہ یہ سمجھتا تھا کہ اس جنگ میں غیر ملکی فوج کی مدد سے وہ آزاد ہو سکے گا قدامت پسند فرقہ یہ سمجھتا تھا کہ اس سے دستور کو تقویت حاصل ہو جائے گی اور بہت سے انقلاب پسندوں کا یہ خیال تھا کہ اس لڑائی میں بادشاہ کی دو رخی ظاہر ہو جائے گی اور پھر جمہوریت کا قیام جلد سے جلد ممکن ہو جائے گا صرف ایک جماعت جنگ کی مخالف تھی انقلابیوں کی یہ انتہا پسند جماعت تھی جسکو جیکوبن (Jacobin) کہتے تھے اس جماعت کے قائدین۔ مارا (Marat) روبسپیر (Robespierre) اور دانتون (Danton) احتجاج و اعلان کرتے تھے کہ موجودہ صورت حال میں ایک یورپی (European) جنگ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اپریل ۱۷۹۲ء میں فرانسیس اول (Francis I) شہنشاہ آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔

اعلان جنگ

فرانسیس کی عمر ۲۴ سال کی تھی اور حال ہی میں وہ اپنے دور اندیش و محتاط باپ کا جانشین ہوا تھا۔

شروع جنگ میں فرانس کی جانب سے بڑے جوش و خروش کا اظہار ہوا اور فتح کا اطمینان بھی تھا۔ لیکن پہلی مہم جو بلجیم (Belgium) کو بھیجی گئی تھی بالکل ناکام ہوئی اور جنگ کا فوری اثر یہ ہوا کہ لوگ بادشاہ سے ناراض ہو گئے اور یہ شبہ کیا گیا کہ بادشاہ کو فرانس کی فوج سے

جنگ کا اثر بادشاہ پر

زیادہ غنیم کی فوج سے ہمدردی تھی اور وہ اپنی اور اپنے مصاحبوں کی رہائی کے خیال سے آسٹروی فوج کی فتح و نصرت کا خواہاں تھا۔ مجلس کو قطعی طرز عمل اختیار کرنا نہیں آتا تھا اور انقلاب کا دوسرا قدم جیکوبن (Jacobin) لوگوں کی ایک خفیہ سازش کے ذریعہ سے بڑھا ایک معقول حیثیت کا بیرسٹر مسمی ڈینٹن جو انقلاب میں صدق جوش سے شریک ہوا تھا اس تحریک کا بانی مبانی تھا۔ اِسی کے اشارہ پر دسویں اگست ۱۷۹۲ء کو پیرس کے انقلابیوں نے محل پر حملہ کر دیا اور ایک پلٹن بھی جو سرحدات کی طرف جا رہی تھی اور اس وقت پیرس میں مقیم تھی ان کے ساتھ شریک ہوگئی۔ حملہ سے پہلے ہی بادشاہ ملکہ اور شاہی جماعت کے لوگ محل سے نکل گئے تھے اور اس دالان میں جا کر پناہ گزیں ہوئے تھے جہاں مجلس اجلاس کر رہی تھی۔ محل پر بڑے زور کا حملہ کیا گیا اور سوس (Swiss) قوم کے سپاہی جو پہرہ پر تھے بری طرح قتل کر دیئے گئے۔ فتح مند بلوائی مجلس کے کمرہ میں گھس گئے اور بادشاہ کی معزولی کا مطالبہ کرنے لگے

بادشاہ کی معزولی

اب یہ استدعا نامنظور نہیں ہوسکتی تھی اور لوئی شانزدہم معزول کر دیا گیا اور فرانس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک مجلس قائم کی گئی جس کا تقرر تمام بالغ مردوں کی رائے و انتخاب پر رکھا گیا اس مجلس کا نام کنونشن (مجلس شوریٰ) رکھا گیا۔

پیرس کی شہری کونسل و "کمیون" (Commune)

اس ہنگامہ کے بعد ہی اس سے بھی زیادہ خوف ناک واقعہ پیش آیا۔ اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت فرانس میں کوئی باضابطہ حکومت نہ تھی مجلس وضع قوانین بھی شکست ہونے والی تھی۔ اس کے اراکین نو آموز و ناتجربہ کار تھے۔ اور ان کا کوئی اثر و اقتدار بھی نہ تھا۔ سب سے قوی جماعت پیرس کی شہری کونسل تھی جس کو کمیون (Commune) کہتے تھے دسویں اگست کو اس جماعت کی ساخت میں

کچھ تغیر ہوا اور اب اس میں انتہا پسند جمع ہو گئے جو زیادہ تر مارات (Marat) کے زیر اثر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ پیرس میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو شاہی کی تباہی پر متاسف تھے اور دس اگست کے فیصلہ کو منسوخ کر دینے کے لیے موقع کے متلاشی تھے۔ اب یہ الزام لگایا جانے لگا کہ جدید حکومت کو الٹ دینے کے لیے سازشیں ہو رہی ہیں اس لیے پیرس میں پوشیدہ ہتھیاروں اور غداروں کی تلاشی ہونے لگی اور آخر ماہ اگست تک اس قسم کے گرفتار شدہ اشخاص سے محبس کھچا کھچ بھر گیا اور ۲ ستمبر کو کمیون (Commune) (مجلس شہری) کے حکم سے فوری عدالتیں قائم کی گئیں جن کے سامنے ان قیدیوں کا مقدمہ پیش ہوا۔ معمولی مجرمین تو محبس کو واپس

ماہ ستمبر کا قتل عام

بھیج دئے گئے لیکن جو لوگ شاہی کے حامی اور موجودہ حکومت کے مخالف پائے گئے ان کو محبس سے نکال کر بر سر راہ قتل کر دیا گیا۔ تین بلکہ پانچ دن تک یہی خوفناک عمل جاری رہا اور تقریباً پندرہ سو

مارات

آدمی جن میں بہت سی عورتیں بھی شامل تھیں ذبح کر دئے گئے۔ کمیون اور اس کی مجلس عاملہ پر جس کا ایک رکن مارات بھی تھا اس واقعہ کی ذمہ داری تھی۔ اس کے بعد ہی ایک مراسلہ اضلاع کو بھیجا گیا جس میں درج تھا کہ ان غداروں سے لوگوں کا یہ قدرتی انتقام تھا جو ایسے وقت میں غداری پر تلے ہوئے تھے جب کہ فرانس ایک خطرناک جنگ میں مبتلا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ حرکت لوگوں کے غصہ اور شبہ کا نتیجہ تھی۔ لیکن ایک حد تک یہ پہلے سے سوچی اور تیار کی ہوئی تدبیر تھی۔

سرحدوں کی طرف اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ہمیں ایک

والمی کی لڑائی اور (Valmy) اتحادیوں کی شکست

غیر متوقع نتیجہ نظر آتا ہے پراشیا بھی آسٹریا کا شریک ہو گیا تھا اور ڈیوک آف برنزوک (Duke of Brunswick) کی سرکردگی میں دونوں نے مل کر فرانس پر حملہ کر دیا تھا۔

سرحدی شہران کے قبضے میں آگئے اور بغیر کسی مقابلے یا مزاحمت کے وہ آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ آرگون (Argonne) کی پہاڑیوں تک ان کی فوجیں پہنچ گئیں یہاں البتہ ڈیومورسیے (Dumouriez) کی کمان میں ایک فوج متعین تھی والمی (Valmy) کے مقام پر لڑائی ہوئی اور اتحادیوں کی فوج یہاں پر روک دی گئی اس مقاومت اور مقابلے کی اہمیت بعد کے واقعات سے اور بھی بڑھ گئی۔ ڈیوک آف برنزوک ابتدا سے پیرس کی جانب بڑھنے سے منع کر رہا تھا۔ موسم بھی بہت خراب تھا اور اس کے سپاہی بیمار ہو رہے تھے اور خوراک کی سربراہی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اسلئے غنیم کی فوج میں در آنے کے بجائے وہ ڈیومورسیے (Dumouriez) سے مراجعت کی گفت و شنید کر کے جرمن سرحدات کی طرف واپس ہو چلا اور بہت جلد دریائے رائن (Rhine) کو عبور کر کے چلا آیا والمی کی لڑائی تھی تو مختصر سی مگر یورپ کی تاریخ پر اس کا خاص اثر ہوا۔ انقلابی افواج کو اپنے پر اعتماد ہو گیا اور فوجی فتوحات کا ایسا سلسلہ پڑ گیا کہ اسی سلسلہ میں نپولین نے مغربی یورپ کے تمام دارالسلطنتوں پر جا کر فرانس کا علم نصب کر دیا۔

مجلس شوریٰ، جمہوریت اور بادشاہ کا قتل

دسویں اگست کو جس کا نونشن (مجلس شوریٰ) کے تقرر کا وعدہ کیا گیا تھا اوائل ستمبر میں اس کا انتخاب عمل میں آیا اور ابتداءً یہ خیال ہوا تھا کہ اس انتخاب میں اعتدال پسندوں کو بہت بڑی کامیابی ہوئی ہے لیکن واقعات مابعد نے انتہائی انقلاب پسند فرقہ کو حاوی بنا دیا۔ جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا اور بادشاہ عدالت میں پیش کیا گیا اور ۱۷۹۱ء کے دستور کی شرائط کے خلاف اسے غداری کا مجرم قرار دے کر جنوری ۱۷۹۳ء میں اس کی گردن ماردی گئی۔

خوفناک حکومت

۱۷۹۳ء سے دور ہیبت کا آغاز ہوا۔ انتہائی انقلاب پسند جن کو جیکوبن (Jacobin) کہتے ہیں برسر حکومت ہو گئے حالانکہ

ان کی تائید میں رعایا کی صرف ایک قلیل تعداد تھی۔ لیکن یہ جماعت مطمئن اور جری تھی برخلاف اس کے مخالفین یعنے ژرونڈ (Gironde) کے مقاصد واضح نہ تھے اور ایک قسم کی پست ہمتی اُن میں تھی اِس اثنا میں فرانس ایک لامتناہی جنگ میں مبتلا ہوگیا تھا اور پھر غیر ملکی جنگ کے ساتھ ساتھ خانہ جنگی بھی پھوٹ پڑی فرانس کے ایک مغربی ضلع لاوانڈے (Lavendee) میں کسان لوگ جمہوریت سے باغی ہوگئے اس بنا پر کہ ان کو فوج میں جبراً بھرتی کیا جاتا تھا اور مذہب و کلیسہ پر جمہوریت حملہ کررہی تھی جنوب اور مشرق خصوصاً لیون (Lyons) اور تولون (Toulon) میں خطرناک تحریکیں پھیل گئی تھیں سرحدات کے پار بھی فرانس کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی برطانیہ۔ ہالینڈ اور اسپین۔ ۱۷۹۳ء میں متحد ہوگئے اور اس طور پر فرانس کے مقابل میں تقریباً یورپ کی تمام دول عظمیٰ کھڑی ہوگئی تھیں البتہ اب تک روس الگ رہا لیکن وہ بھی فرانس کے موافق نہ تھا فرانسیسی فوج کو شکست ہوئی اور فرانس کی تباہی یقینی معلوم ہونے لگی جیکوبن لوگوں کو ایسے تباہ کن خطرات کا مقابلہ کرنا تھا آئینی دستوری طریقہ اختیار کرنے کا موقع نہیں تھا۔ کیونکہ آزاد انتخاب میں جیکوبن فرقہ اکھڑ جاتا اس لئے ہیبت سے انھوں نے حکومت کرنا شروع کیا یعنے جس طرح ان کے پہلے دوسری حکومتوں نے کیا تھا انھوں نے بھی اپنے دشمنوں کو ہیبت زدہ کرکے مطیع کرنا چاہا۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا ذریعہ کمیٹی تحفظ امن عامہ تھی جو بارہ اشخاص پر مشتمل تھی۔ پہلے ڈینٹن (Danton) اس کمیٹی کا سردار تھا پھر روبسپیر (Robespierre) ہوا یہ کمیٹی تمام دوسرے حکاموں پر حاوی تھی۔ لیکن اس کا خاص فریضہ فوج بھرتی کرنا اور مہمات کا انتظام کرنا تھا اور آخر میں مسلسل فتوحات حاصل کرنے میں بھی اس کو کامیابی ہوئی پیرس میں انقلابی عدالت قائم ہوگئی تھی اور اس کے اجلاس پر بہت سے مرد عورت ملک کے

کمیٹی تحفظ امن عامہ

انقلابی عدالت

خلاف جرائم کرنے کی علت میں پیش ہوئے تھے۔ جیکوبن فرقہ کی مخالفت سنگین غداری قرار دی جاتی تھی اور ایک سرسری تحقیقات کے بعد جو لوگ مجرم قرار پاتے تھے ان کو گلوٹین کے ذریعے قتل کر دیا جاتا تھا مجرمین کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی بادشاہ کے بعد ملکہ دار پر چڑھادی گئی۔ اور بہت سے لوگ جنھوں نے انقلاب کے ابتدائی زمانہ میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی طرح مار ڈالے گئے تھوڑے دنوں بعد تو اعتدالی جمہوریت پسند لوگ بھی ملک کے بدخواہ قرار دئے جانے لگے اور وہی ژرونڈ فرقہ والے جو کسی زمانہ میں برسراقتدار تھے ایک ایک کر کے محبس یا سولی کو بھیجے جانے لگے۔

اس کے چند دنوں کے بعد جیکوبن لوگ آپس ہی میں لڑنے لگے ہر فرقے کے اغراض و مقاصد کا فرق بتانا مشکل ہے ان میں جو زیادہ اعتدال پسند فرقہ تھا اور ملک میں زیادہ رحم و انسانیت کا متقاضی تھا اور غیر ملکی لڑائیوں کو بھی ایک حد تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا سردار ڈینٹن تھا دوسرے فرقے کے سردار ہیبر (Hebert) اور شومت (Chaumette) تھے اس فرقے کا مرکز پیرس کی کمیون (مجلس شہری) تھی اور یہ لوگ بالکل نئے معاشرتی اور تمدنی تغیرات کے خواہاں تھے۔ اس جماعت کے اثر سے ایک نئے سنہ کا آغاز جمہوریت کے اعلان کی تاریخ ستمبر ۱۷۹۲ء سے کیا گیا اور فرانس کی سرکاری تواریخ کا شمار اس سنہ سے ہونے لگا یہاں تک کہ نپولین اور یورپ میں مصالحت ہونے کے بعد کہیں جا کر پھر سنہ عیسوی کی پابندی ہونے لگی سال کی ترتیب بھی از سر نو کی گئی۔ پرانے مہینوں کے ناموں کے بجائے نئے نام رکھے گئے جو کہ عموماً موسم کی مناسبت سے ہوتے تھے۔ سات روز کے ہفتہ کے بجائے دس روز کا ہفتہ قرار دیا گیا اوزان پیمانہ کا ایک نیا اعشاریہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ پھر کمیون (مجلس شہری) کے زیر اثر مذہب مسیحیت کو اڑا کر اس کے بجائے "عقل" کی پرستش کا حکم دیا گیا ایک تیسری جماعت روبسپیری کی ماتحتی میں تھی

عقل کی پرستش

جو ڈینٹن کے اعتدالی مشوروں کے بھی خلاف تھی اور ہبرٹ کے جبر و سختی کی بھی۔ اس فرقے کی قوت کا دار و مدار کمیٹی تحفظ امن عامہ پر تھا۔ روبسپیر اپنے زوال کے پہلے کئی مہینے تک اس کمیٹی پر حکومت کرتا رہا تھا۔ ان مختلف فرقوں کی باہمی لڑائیوں کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں گو ان لڑائیوں میں فتح و ناکامی کا انحصار اکثر معمولی واقعات پر رہتا تھا اور اس فتح و ناکامی پر ان فرقوں کی موت و حیات منحصر ہوتی تھی فرانس یا پیرس کے عوام الناس کا ان معاملات میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا ہر جماعت کا یہ پہلا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دارالسلطنت کے جوشیلے انقلاب پسندوں اور مسلح عوام کو اپنا طرفدار بنالے۔

آخر میں روبسپیر کو فتح ہوئی اور اس کے مخالفین دار پر چڑھا دیئے گئے اس وقت کسی قسم کی باقاعدہ اور ایک با اثر حکومت کے قیام کا امکان معلوم ہونے لگا روبسپیر مخصوص مگر مجنونانہ خیالات رکھتا تھا اس نے روسو کی تعلیم قبول کی تھی اور حتے الامکان اسی کے مطابق عمل کرنا چاہتا تھا۔ "عقل" کی پرستش سے اسے نفور تھا مگر وہ مسیحیت بھی نہیں چاہتا تھا بلکہ وہی روسو کی بے معنے و مبہم خدا پرستی کو قائم کرنا چاہتا تھا۔ مجلس نے بلا چون و چرا اس کی تائید کی اور رائے دی کہ فرانس کے لئے صرف "قادر مطلق" کی پرستش مناسب و جائز ہے۔ اس نئے مذہب کے انعقاد و افتتاح کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا گیا اور بہت سے رسومات و لوازمات کے ساتھ خود روبسپیر نے اس کا افتتاح کیا لیکن یہ سب ہونے پر بھی ہیبت کا دور ختم نہیں ہوا۔ روبسپیر کے دل میں خوف ہونے کی وجہ سے وہ بہت سے مظالم کا مرتکب ہوا۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ جو اگر کامیاب ہو گئے تو اسے فنا کر دیں گے اس لئے اس نے ہر سمت میں وار کرنے شروع کر دیئے اور دار کے مظلومین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی اور ایک خود مختار اعلےٰ حاکم کے تقرر کا بھی منشاء علانیہ ظاہر کرتا تھا جس کی تائید روسو نے بھی کی تھی۔ اسی رتبہ

ذات مطلق کی پرستش

حیثیت سے وہ سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ فلاح وبہبودی کا وہ معیار جو اس کے پیش نظر تھا قائم ہو جائے۔ لیکن اس کا اقتدار زیادہ دنوں تک بحال نہیں رہ سکتا تھا مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی اور اس کے بہت سے ہمسر اس سے ڈرنے لگے وہ کسی کی ہمسری کو پسند نہیں کرتا تھا اور جہاں کوئی رقیب اٹھا کہ اس نے دار پر کھنچوا دیا آخر کار اس کے خلاف ایک سازش شروع ہو گئی بہت سے لوگ جو ایک دوسرے سے خیالات وچال چلن میں بالکل مختلف تھے آپس میں متحد ومتفق ہو گئے کہ اس خودسر مطلق العنان کو تباہ کر دیں۔ جولائی ۱۷۹۴ء میں کن ونشن (مجلس شوری) کے کمرہ میں اس پر حملہ کیا گیا۔ اس نے اس کا مقابلہ کمیون (مجلس شہری) میں کرنا چاہا۔ جو ہیبر (Hebert) کی وفات کی بعد سے اس کے قابو میں آ گئی تھی لیکن مجلس شوری تواب برخاست نہیں ہو سکتی تھی۔ قریب تھا کہ پیرس ایک

روبسپیر کا زوال
Robespierre

لڑائی کا میدان بن جائے لیکن روبسپیر کے متبعین خود اس سے علیحدہ ہو گئے اور وہ گرفتار کر لیا گیا مشتہرہ باغی اور قانون کی حفاظت سے خارج ہونے کی وجہ سے وہ بلا تحقیقات دار پر چڑھا دیا گیا۔

دورہیبت کا خاتمہ

روبسپیر کی تباہی کے بعد دور ہیبت بھی ختم ہو گیا جن لوگوں نے اس کا خاتمہ کیا تھا ان میں بعض تو اس سے بھی زیادہ خوفناک اور ہیبت پھیلانے والے تھے لیکن چونکہ خودسر حاکم اعلی کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لئے کئی طریقوں سے رائے عامہ کا اظہار ہونے لگا اور یہ روشن ہو گیا کہ عام خیالات اس ظلم وتعدی کے سخت خلاف تھے جس کے بارسے اب تک پیرس وفرانس کراہ رہا تھا۔ جو اراکین مجلس شوری سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے وہ بھی آ گئے اور سال کے ختم ہونے سے پہلے ہی اوسط حالت قائم ہو گئی تھی۔ گو کبھی کبھی سخت اور تشدد آمیز احکام بھی نافذ ہوتے رہتے تھے۔

جنگ کی رفتار

علاوہ اس کے جس سبب سے دور ہیبت شروع ہوا تھا وہ اب باقی نہ رہا۔ اس کی ابتدا فرانس کی ضروریات کے غلط مگر

پیرس میں ایک شورش برپا ہوگئی مجلس شوریٰ نے اس شورش کو فرو کرنے کے لئے اس طرز عمل سے بالکل جداگانہ طرز اختیار کیا جو انقلاب کے ابتدائی زمانہ میں اس قسم کے مطالبات عامہ کے مقابلہ کے لئے اختیار کیا جاتا تھا مجلس

مجلس شوریٰ کے خلاف کی شورش کو نپولین فرو کرتا ہے۔

شوریٰ کی محافظت کا کام سپاہیوں کے ذمہ تھا جن کا سردار نپولین بونا پارٹ (Napoleon Bonaparte) تھا جب مجلس پر حملہ ہوا تو توپوں سے اس کو رد کر دیا گیا اور اس طور پر نیا دستور فرانس میں نافذ کر دیا گیا ۲۶ اکتوبر ۱۷۹۵ء کو مجلس شوریٰ (Convention) شکست کر دی گئی۔

اس کے بعد سے انقلاب کی رفتار کا انحصار نپولین کی سیاسی حیات پر ہو گیا۔ اب تک تو اُس نے ایک معمولی سا حصہ لیا تھا لیکن شورش فرو کرنے میں اس نے نمایاں خدمت انجام دی اور اس وقت سے وہ درجہ بدرجہ ترقی کرنے لگا حتیٰ کہ وہ فرانس کا شہنشاہ اور تمام یورپ میں ممتاز ترین ہستی بن گیا اس لئے اب مناسب یہ ہے کہ پہلے جنگ کی حالت بیان کر دی جائے اُس کے بعد یورپ کی سیاسی حالت کا نقشہ پیش کیا جائے کیونکہ اس وقت سے جنگ کا اثر خاص طور پر اس زمانے کے حالات پر پڑا۔ برک (Burke) کی پیشینگوئی کی تصدیق قریب تھی فرانس اپنے اندرونی خلفشار و بدنمائیوں سے اعراض کر کے نہایت جوش و مسرت سے اپنے سپاہیوں کی حالت پر نظر لگائے ہوئے تھا عوام کے ذہن سے سیاست دانوں کا اثر زائل ہو کر سپاہیوں کا اثر قائم ہو گیا تھا اور

نپولین کا عروج

اسی میلان طبع کا نتیجہ تھا کہ نپولین جو فرانسیسی فوج کا محبوب دلاور تھا بہت جلد حکومت فرانس کا حاکم اعلےٰ بن گیا۔

فرانس کے مخالفوں کا اتحاد بھی شکست ہونے لگا ہم بتا چکے

صلح بیسل (Basel)

ہیں کہ پولینڈ کے معاملات اور یورپ کے دوسرے حصوں میں رقابت کی وجہ سے آسٹریا و پرشیا میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی ۱۷۹۴ء میں

فرانس کو جو فتح حاصل ہوئی اس سے پرشیا اور بھی جنگ ختم کر دینے کا خواہاں ہوگیا اور ۱۷۹۵ء میں صلح بیسل (Basel) طے پائی۔ پرشیا نے دریائے رائن کے بائیں کنارہ کا کچھ ملک فرانس کو دے دیا اس وعدے پر کہ معینہ حدود سے شمال میں جرمنی کا ملک جنگی کارروائیوں سے مصئون رہیگا اور یہ کہ پرشیا کو شمالی جرمنی کی سربرآوردہ سلطنت تسلیم کرلیا جائیگا۔ اسپین بھی الگ ہوگیا اور اب فرانس کو صرف آسٹریا اور برطانیۂ عظمےٰ سے مقابلہ کرنا تھا اس کی تمام کوششیں آسٹریا کے مقابل کی صرف بڑی دو سمتوں سے فوج کشی کرنے کی تجویز ہوئی ایک فرانسیسی فوج تو دریائے ڈینیوب (Danube) کی وادی سے وائنا (Vienna) کا رخ کرے دوسری فوج اٹلی (Italy) میں آسٹریا کا مقابلہ کرے اور اگر وہاں فتح حاصل ہوجائے تو کوہ ایلپس (Alps) کے دروں میں سے گزر کر وائنا (Vienna) کی طرف کوچ کر دے جو فوج اٹلی جانے والی تھی اس کی کمان نپولین کو دی گئی یہیں پر اُس نے اپنی فوجی قابلیت و ذہانت کا ثبوت دیا اور آسٹروی فوج کے مقابلہ میں فرانسیسی فوج کی فوقیت و برتری ظاہر کردی کوہ ایلپس (Alps) کے ساحلی حصہ کو اس نے طے کر کے شاہ سارڈینیا (Sardinia) کو آسٹریا سے قطع تعلق کرنے پر مجبور کر دیا اور آگے بڑھ کر میلان (Milan) پر قبضہ کرلیا یہاں پر اٹلی والوں کی ایک بڑی جماعت نے اس کا خیر مقدم کیا کیونکہ یہ لوگ آسٹروی حکومت سے متنفر ہوگئے تھے۔ اور قومی آزادی حاصل کرنیکے لیئے ان کو فرانسیسوں سے بہت کچھ امید تھی۔ اس کے بعد نپولین نے بڑھ کر مینٹوا (Mantua) کا محاصرہ کرلیا۔ اٹلی میں آسٹریا والوں کا یہ سب سے زبردست قلعہ تھا آسٹریا

مینٹوا کا محاصرہ
(Mantua)

والوں نے اس کو بچانے میں اپنی تمام قوت صرف کردی پانچ فوجیں اس شہر کی حفاظت کے لیئے باری باری سے بھیجی گئیں اور سب کو نپولین نے مقابلہ کرکے شکست دے دی جنوری ۱۷۹۷ء میں ریوولی (Rivoli) کی شکست سے واضح ہوگیا کہ آسٹروی نپولین کو ہٹا نہیں سکتے تھے آخر کار دوسرے مہینہ میں مینٹوا فتح ہوگیا۔ اب نپولین اٹلی کا مالک ہوگیا تو بحر اڈریاٹک (Adriatic) کے شمال سے وہ آسٹروی حدود میں داخل ہوا اسکو روکنے کی تمام کوششیں بے سود ہوئیں لیکن خود اس کو اپنی حالت محفوظ نہیں نظر آئی اس وجہ سے

صلح کیمپو فورمیو (Campo Formio)

اپریل ۱۷۹۷ء میں ایک عارضی صلح ہوگئی جس کے بعد ہی اکتوبر ۱۷۹۷ء میں صلح کیمپو فورمیو (Campo Formio) طے پائی اس صلح میں شہنشاہ (آسٹریا) نیدرلینڈز سے دستکش ہوگیا جو پہلے ہی سے فرانسیسوں کے قبضہ میں آچکا تھا اور شمالی اٹلی میں آزاد اطالوی مملکت نئے قیام کو اس نے منظور کرلیا اس سلطنت کا نام سیسل پاین (Cisalpine) جمہوریت رکھا گیا اُدھر ایک بدنما چال بازی سے وینس (Venice) کی آزاد جمہوریت آسٹریا کے قبضہ میں دے دی گئی حالانکہ یہ مملکت یورپ کی قدیم ترین مملکتوں سے تھی۔

وینس نے اس جنگ میں غیر جانبدار رہنے کی انتہائی کوشش کی مگر بے سود دونوں فوجیں اس کے حدود میں اِدھر اُدھر پھریں اس کے افعال و حرکات کے غلط معنے لئے گئے اور آخر کار فرانسیسوں نے خود شہر پر ہاتھ ڈالدیا۔ اس میں مقابلہ کی کہاں تاب تھی وہ قدیمی سپاہیانہ جوش جس کی وجہ سے ترکوں کے حملہ کے مقابلہ میں وینس کو یورپ کا شہر پناہ کہتے تھے اب باقی نہ تھا اور نپولین کی توڑ دار توپوں کے سامنے جھیلوں کے پانی کا پھیلاؤ کیا کرسکتا تھا اس وجہ سے اس نے نپولین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اس کے بعد وہاں کے لوگوں کا عندیہ لئے بغیر وینس آسٹریا والوں کے حوالے کردیا گیا حالانکہ وینس والے اس کے سخت مخالف تھے آسٹریا کو تو ان نقصانات کا جو دوسری جگہ اس کو ہوئے تھے معقول معاوضہ مل گیا۔

صلح کیمپو فورمیو کے بعد فرانس کا مدمقابل صرف برطانیۂ عظمیٰ رہ گیا لیکن

مصری مہم

برطانیہ کی بحری طاقت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس کو شکست دینا محال معلوم ہوتا تھا اس جنگ میں دوسرا قدم عجیب و غریب تھا ڈائرکٹروں (Directors) (ہادیوں) نے نپولین کو مصر پر فوج کشی کرنے کی ہدایت کی حالانکہ مصر ترکی سلطنت کا جزو تھا اور سلطان سے فرانسیسوں کو کوئی شکایت بھی نہ تھی لیکن خیال یہ تھا کہ خود مصر کا اضافہ بیش بہا ہونے کے علاوہ برطانوی وقار و قوت کو اس سے صدمہ پہنچے گا اگر فرانسیسی ایسے ملک پر قبضہ کرلیں جسکی وجہ سے انگریزوں کو ہندوستان سے بعد ہوجائے۔ نہر سویز (Suez) کا راستہ

بند کرنے کی انھوں نے تجویز کی تھی اور ہندوستانیوں کے جذبات کا پتہ لگانے کے لئے فرستادے بھی بھیجے گئے۔

مصری مہم کی ناکامی

مصر جاتے جاتے نپولین نے راستہ میں مالٹا (Malta) پر قبضہ کرلیا جو اب تک سینٹ جان (St. John) کے مبارزین کے قبضہ میں تھا مصر بھی وہ خیریت سے پہنچ گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کل ملک کا وہ مالک ہوگیا لیکن جنگ نیل (Nile) میں نیلسن (Nelson) اور برطانوی بیڑے کو مقابلہ حاصل ہو جانے سے صورت حال بالکل بدل گئی فرانس سے نپولین (Napoleon) کے رسل ورسائل منقطع ہوگئے اور وہ خود خطرے میں پڑگیا۔ اس نے سیریا (Syria) پر فوج کشی کی مگر ایکر (Acre) کا محاصرہ اُسے اوٹھا لینا پڑا مصر میں واپس آکر اُس نے ترکی فوج کو جو اس کے مقابلے پر آئی آسانی سے شکست دے دی لیکن یورپ سے خبر آئی کہ ایک دوسرا اتحاد فرانس کے خلاف قائم ہوگیا ہے اور فرانسیسی فوجوں کو شکست بھی ہوئی ہے اس لئے اس نے فرانس واپس جانے کا قصد کرلیا۔ مصری فوج کو ماتحت عہدہ داروں کی کمان میں چھوڑکر وہ خود فرانس کے ساحل پر پہنچ گیا حالانکہ تمام بحر متوسط پر برطانوی جہازوں کی نگرانی تھی۔

نپولین کی عظمت

یہ نیا جتھا واقعی میں ایسا ہی مخدوش تھا جیسا کہ نپولین نے سمجھا تھا پراشیا تو الگ ہی رہا مگر زار روس دل سے اس میں شریک ہوا اور روس کے مشہور سپہ سالار سووراف (Suvorof) نے فرانسیسیوں کو اٹلی میں شکست دے کر ان کی فوج کو جنیوا (Genoa) میں محصور کرلیا تھا نپولین کے فرانس میں وارد ہونے کے قبل ہی حالت کچھ سنبھل گئی تھی اتحادی آپس میں لڑنے لگے تھے اور اب فرانس کو فوری یورش کا اندیشہ بھی نہ تھا۔ اٹلی میں نپولین کے سابقہ فتوحات نے اس کو فرانس کا محبوب مبارز بنا دیا تھا اور مصری مہم سے بھی اس کی شہرت پر کوئی دھبہ نہیں لگا تھا کیونکہ جتنی لڑائیاں وہ لڑا تھا سب میں فتحیاب ہوا تھا اور برطانوی بحری طاقت کا مقابلہ کرنے کا کوئی ذریعہ اس کے پاس نہ تھا عام لوگ اس کو مستقبل کا آدمی جاننے لگے تھے تقریباً ہر

فرقہ یہی سمجھتا تھا کہ فرانس کو امن صلح وہی دے سکتا ہے اور اس کی اصلی غرض کے بجائے لوگ اسے نیک نیت سمجھتے تھے۔ ڈائرکٹری (صدارت عظمیٰ) خود مشکلوں میں تھی پہلے تو ڈائرکٹر لوگوں میں اور مجلس وضع قوانین میں اختلاف

صدارت عظمیٰ کی بے اعتباری

پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ یہ اختلاف بڑھتا ہی گیا مذہبی و معاشرتی امور میں ان لوگوں نے ایسا رویہ اختیار کیا جس سے عوام کو آزردگی ہوئی اور پھر اس طرز عمل میں کامیابی بھی نہیں ہوئی۔ کئی مرتبہ مجالس (پارلیمنٹ۔ ایوان ادنٰے و اعلٰے) سے بھی ان کا مقابلہ ہو گیا اور ان لوگوں نے جبراً ان مجالس سے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرایا نئے اتحاد کے مقابل میں فرانس کو جو شکستیں ہوئیں اس سے بھی ڈائرکٹری کا اقتدار زائل ہو گیا اور اب یہ عیاں تھا کہ فرانس کا موجودہ ادارہ اس حالت پر قائم نہیں رہ سکے گا۔ نپولین کی ہوس پہلے ہی سے کامل اختیارات حاصل کر لینے کی تھی۔ پیرس میں پہنچ کر اس نے مختلف سیاسوں سے ساز باز شروع کر دی اور سییس (Sieyes) نامی ایک شخص خاص طور پر اس کے کام کا معلوم ہوا۔ یہ شخص انقلاب کے ابتدا میں بحیثیت ایک سیاسی نظریہ ساز کے خاص طور پر مشہور ہو چکا تھا اور اب بھی اس کو دعویٰ تھا کہ وہ فرانس کے لئے ایسا دستور تیار کر سکتا ہے جس سے فرانس کو عمدہ حکومت حاصل ہو جائے جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی بلا اس کے تمام خیالات کی موافقت کئے ہوئے نپولین اس شخص کے ساتھ شریک ہو گیا یہ توقع کی جاتی تھی کہ نپولین اس قدر ہر دل عزیز اور سرفراز ہو چکا تھا کہ بغیر کشت و خون و جبر و تعدی کے وہ ایسے تغیرات کر سکتا تھا جس سے اس کو اور اسکے ہمراہیوں کو قوت و اقتدار حاصل ہو سکے پیرس کے متعینہ سپاہی اُسکی ماتحتی میں دیدئے گئے اور مجالس وضع قوانین پیرس سے چند میلوں کے فاصلے پر بمقام سین کلو (St. Cloud) منتقل کر دیگئیں۔ بعض ڈائرکٹر جو نپولین سے ساز باز کر چکے تھے مستعفی ہو گئے اور بقیہ کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ نپولین اور سییس (Sieyes) کو امید ہو گئی کہ فرانس پر حکومت کرنے کے لئے اور نیا دستور بنانے کے لئے مجلسیں نپولین سیئیس (Sieyes) اور ... لوکو

تین آدمیوں کی ایک کمیٹی قائم کرنے کی منظوری دے دیگی ۔ پہلے تو سب ٹھیک رہا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ مجلس کو اپنی آزادی زیادہ محبوب تھی اور جب تک وہ مجبور نہ کی جائے گی وہ ایسی منظوری دینے سے گریز کرتی رہے گی اس لئے نپولین پر ایک فرضی حملہ ہونے کا عذر کرکے گرانڈیرس (Grenadiers) سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ باغی قانون سازوں کو منتشر کر دیا جائے جو لوگ باقی رہ گئے تھے انھوں نے مطلوبہ حکم کثرت رائے سے جاری کر دیا اس طرح شام تک ہی انقلاب برومیئر[1] (Brumaire) مکمل ہو گیا۔ اس وقت تک نپولین کامل حاکم اعلیٰ یا شہنشاہ نہیں ہوا تھا لیکن اس شاہراہ پر وہ گامزن ہو چکا تھا جس کے ذریعہ سے وہ فرانس کا مختار کل ہو جانے والا تھا۔

---

[1] یہ نام اس وجہ سے پڑا کہ سنہ انقلابی کا برومیئر ایک مہینہ تھا اور یہ انقلاب اسی مہینہ میں ہوا مسیحی سنہ کے حساب سے اس انقلاب کی تاریخ ۱۰ نومبر ۱۷۹۹ء ہوتی ہے ۔

حوالۂ کتب متعلقۂ باب ہذا

انقلاب فرانس کے متعلق صدہا کتابیں تصنیف ہوئی ہیں مگر انگریزی داں طبقہ کے لئے مسز گارڈینر (Mrs. Gardiner) اور جی۔ ایچ۔ روز (J. H. Rose) کے خلاصے بہت کار آمد ہیں۔ کارلائل (Carlyle) مگنیٹ (Mignet) اور مورس اسٹیفنس (Morse Stephens) کی طویل تاریخیں مختلف نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کرتی ہیں۔ نپولین کے ابتدائی حالات و جنگ کے "سوانح نپولین" مصنفہ جی۔ ایچ۔ روز (J. H. Rose) بہت کار آمد ہے۔ "یورپ کا عصر جدید" مصنفہ فائفز (Fyffes) ۱۷۹۲ء کے بعد کے واقعات کے متعلق بہترین تاریخ ہے۔ "سوانح نپولین" مصنفہ والٹر اسکاٹ (Walter-Scott) سے بھی مدد مل سکتی ہے۔

باب پانزدہم

نپولین

نپولین کے ابتدائی حالات

انقلاب برومیر (Brumiare) کی بدولت نپولین برسر اقتدار ہوگیا
تاریخ عالم میں نپولین پر جتنے مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں
کسی اور شخص کے متعلق نہیں لکھی گئی ہیں اور اس کی حیات سیاسی
و عادات و اطوار میں بعض باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہمیشہ اختلاف آرا رہیگا ابتدا گو وہ
انقلاب کا بڑا سرگرم حامی اور روبسپیر (Robespierre) کے گروہ کا ہم مشرب تھا۔ انقلابی فوج
میں بھی وہ مامور رہا اور محاصرۂ طولون (Toulon) میں اپنی شجاعت و ذکاوت و فراست
کی بدولت اس نے بہت نام بھی پیدا کیا تھا یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ واندیمیر
(Vendemieire) کی شورش فرو کرنے کے لئے اسی کو اطالوی فوج کی کمان دی گئی
تھی اور اس وقت سے بلا کسی وقفے کے اس کا عروج شروع ہوگیا اس کے سوانح سے
معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی فوجی قابلیت و ذہانت رکھتا تھا دھاوے اور لڑائی
دونوں میں یکساں ماہر تھا اور فرانس کی حکومت کا اس نے جیسا معقول انتظام کیا اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ امور عامہ کے انتظام میں بھی اس کو ایسا ہی کمال حاصل تھا اس کی قوت
متخیلہ ایسی زبردست تھی کہ وہ بڑی سے بڑی تجویزیں سوچتا تھا اور پھر اس تفصیل کے
ساتھ کہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانا آسان ہوجاتا تھا اس کے بہت سے منصوبے
انقلابی جذبے اور فرانس کی گزشتہ تاریخ کے موافق تھے اور چاہتا تھا کہ سلطنت
متحد رہے اور اس کا انتظام ایک مرکز سے ہوسکے۔ تمدنی و قانونی معاملات میں مساوات
کا خواہاں تھا اور کسی قسم کے امتیاز کا روادار نہ تھا جہاں تک ممکن ہو وہ ہر طبقے کو ہموار

کرنا چاہتا تھا صرف انھیں لوگوں پر اس کا عتاب ہوتا تھا جو اس کے اقتدار یا فرانس کی بہبودی کے دشمن تھے اگر قوت و اقتدار حاصل کرنے کی لامحدود ہوس اس میں نہ ہوتی جیسا کہ اس کے سوانح سے مترشح ہے تو یقیناً وہ تہذیب و تمدن کے سب سے بڑے مصلحین میں شمار کیا جاتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ گو اس نے فرانس و یورپ میں بہت سے سودمند تغیرات کئے مگر اسی کے باعث پندرہ سال کی ایک مسلسل جنگ شروع ہو گئی۔

سی اِس Sieyes کی تجاویز۔ اس کا پہلا کام جدید دستور ترتیب دینا تھا جس کا وعدہ انقلاب برومیر کے دن کیا گیا تھا۔ اس معاملے میں بھی اس اور نپولین کے مقاصد ایک دوسرے سے متضاد و متبائن تھے۔ سی اس (Sieyes) کی غرض ایک عجیب و غریب متوازن دستور کے قائم کرنے کی تھی جس کا صدر ایک مجسٹریٹ ہوتا اور اس مجسٹریٹ کو منتخب اعظم (Grand Elector) کا لقب دیا جاتا مگر اس کی حیثیت ایک نمائشی حکمراں سلطنت سے زیادہ نہ ہوتی۔ نپولین اس بات پر تلا ہوا تھا کہ سلطنت کی باگ ایک مضبوط اور با اثر حکمراں کے ہاتھ میں ہو۔ اپنی قوت ارادی اور امور عامہ میں مہارت تامہ کے بل پر اس نے اپنے رفیق کو میدان عمل سے علیحدہ کر دیا۔

دستور مجوزہ۔ نپولین کی تجویز کے مطابق عاملانہ حکومت ایک قونسل اعلیٰ (First Council) کے ہاتھ میں دی گئی جس کے دو رفیق مقرر کئے جائے ان کو بھی کونسل (Council) کے نام سے موسوم کیا جاتا لیکن یہ لوگ وزیر اعلیٰ کے بالکل تابع ہوتے۔ فوج کا انتظام سفیروں کا تقرر اور سلطنت کے تمام عاملانہ کل پرزے اسی وزیر اعلیٰ کے اختیار میں ہوتے اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے اسی کی نامزد کی ہوئی ایک مجلس نظامیہ (State Council) بھی رکھی گئی۔ اور یہی مجلس واضع قوانین قرار دی گئی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ایک مجلسیں قائم کی گئیں جن کا قیام ایک حد تک عوام کی رائے پر تھا لیکن جدید نظام کی یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ حتی الامکان انتخاب کے حلقے کو تنگ کر دیا جائے اوائل انقلاب کے زمانہ میں ہر شعبۂ عمل میں انتخاب کا جو زور و شور تھا اب اس کا ردعمل شروع ہوا۔

مجلس سینات ساٹھ اراکین کا ایک قدامت پسند سینات (Senate) قائم کیا گیا جس کا تقرر ابتداءً انہی کانسلوں (وزرا) نے کیا لیکن بعد میں جگہ خالی ہونے پر خود سینات کو اس کے انتظام و انتخاب کا اختیار دیا گیا دوسرے تمام

کونسلوں (مجلس) کا انتخاب اسی سینات کے اختیار میں تھا اور تمام تجاویز کے متعلق تصفیہ کرنا کہ وہ دستور کے مطابق ہیں یا نہیں یہ بھی اسی کے ذمہ تھا ساٹھ اراکین کے اس سینات کے علاوہ ایک مجلس ٹرائبیونٹ (Tribunate) تھی جس میں ایک سو اراکین ہوتے تھے اور ان سب کا تقرر سینات کرتا تھا۔ یہی ایک مجلس تھی جس کو بحث مباحثہ کی کامل آزادی دی گئی تھی۔ قانون سازی کی تمام تجویزیں اسی مجلس میں پیش اور بحث کی جاتی تھیں اگر ٹرائبیونٹ کسی تجویز کو منظور کر لیتی تھی تو پھر یہ تجویز ایک مجلس واضع قوانین میں پیش ہوتی تھی جس میں تین سو اراکین ہوا کرتے تھے اور ان سب کا تقرر سینات سے ہوتا تھا۔ اس مجلس کا صرف اتنا کام تھا کہ ٹرائبیونٹ کے مقررین کی تقریر سماعت کر کے بلا کسی بحث مباحثہ کے اپنی رائے کا اظہار کر دے اس قسم کا دستور زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا تھا اور جب تک وہ قائم رہا وزیر اعلیٰ اور اس کی مجلس نظامیہ کا اثر و اقتدار بڑھتا رہا۔

آسٹریا پر حملہ

دستور منظور ہوتے ہی نپولین اطالوی مہم پر روانہ ہو گیا۔ اتحادیوں کی ابتدائی فتوحات کا سلسلہ جاری نہ رہا تھا لیکن آسٹروی اور ان کے حلیف اب بھی شمالی اٹلی پر قابض و متصرف تھے اور دریائے رائن (Rhine) کے سرحدات کی طرف بڑھنے کی دھمکی دے رہے تھے ۱۷۹۶ء کی طرح پھر نپولین نے خود اٹلی پر فوج کشی کرنے کا ارادہ کیا اور سپہ سالار موریو (Moreau) کو ڈینیوب (Danube) کے کنارے سے آسٹروی فوج پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا دوسری تمام مہمات کی طرح جن میں نپولین شریک ہوا اس مہم میں بھی اس کے لئے فتح حاصل کرنا ازبس ضروری تھا۔ کیونکہ فرانس میں اس کی قوت و اقتدار کا دارومدار اس کی فوجی کارگزاریوں ہی پر تھا اس کے برسر اقتدار رہنے کے لئے یہ شرط تھی کہ جنگ میں وہ برابر فتحیاب رہے۔ فوجی ناکامی کلیتاً اس کی بیخ کنی کا باعث ہو جاتی اور اگر صلح ہو جاتی تو فرانسیسی پھر اپنے قدیم نصب العین کی طرف رجوع ہو جاتے اور ایک حقیقی جمہوریت اور آزاد و مساویانہ دستور کے قایم کرنے کا خیال پیدا ہو جاتا۔

آغاز مہم اور مارنگو (Marengo) کی لڑائی

سنہ ۱۸۰۰ء کی مہم شروع سے آخر تک شاندار رہی اور آخر میں کامیابی و فتح بھی نصیب ہوئی سب سے پہلے کوہ ایلپس (Alps) کے پار کرنے

کا مشہور واقعہ ہوا جس کی تعریف ضرورت سے زیادہ کی گئی ہے۔ اس عمل سے نپولین اور اس کی فوج یکایک آسٹروی فوج کے پیچھے سے اٹلی میں داخل ہو گئی اس نے میلان (Milan) پر قبضہ کر لیا اور پھر جنیوا (Genoa) کی طرف بڑھا جس کو حال ہی میں آسٹریا والوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ جون میں مارنگو (Marengo) کی لڑائی ہوئی۔ پہلے تو ایسا معلوم ہوا کہ فرانسیسی روک دیئے جائیں گے۔ لیکن وقت پر تازہ کمک نپولین کو مل جانے سے کھوئی ہوئی زمین پر پھر اس نے قبضہ کر لیا اور آسٹروی فوج کا ملیح ملیامیٹ کر دیا ایک عارضی صلح ہوئی اور آسٹریا والوں نے اپنی فوج کو اٹلی کے شمال و مشرقی گوشہ میں ہٹا لیا لیکن اس پر بھی آسٹریا مستقل صلح پر آمادہ نہ تھا مگر جب دسمبر ۱۸۰۰ء میں سپہ سالار مورو (Moreau) نے بھی آسٹریا کو مارنگو (Marengo) ایسی زبردست شکست بویریا (Bavaria) میں بمقام ہوہن لنڈن (Hohenlinden) دے دی تو آسٹروی حکومت کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور اس نے صلح کی درخواست کی۔ آخر کار فروری ۱۸۰۱ء میں صلح لونیول Lunivile طے پائی اس صلح میں صلح کیمپو فورمیو کے شرائط کا اعادہ کیا گیا۔

صلح لونیول (Lunivile)

اور آسٹریا نے اٹلی میں دریائے اویج (Adige) کے اس پار کا کل علاقہ چھوڑ دیا اور دریائے رائن (Rhine) سے مغرب میں جتنا جرمن ملک تھا سب فرانس کو دے دیا اس کے بعد اب فرانس کے مقابلے پر صرف برطانیہ عظمیٰ رہ گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک زبردست اتحاد کے دباؤ سے وہ بھی ایسی شرائط قبول کر لیگا جو اس کے حق میں مضر ہوں۔ برطانیہ کی بحری طاقت کے مستبدانہ استعمال سے بہت سی دول کو شکایت تھی۔ کیونکہ وہ ایسے جہازوں کو روکنے اور تلاشی لینے کا خود کو حق سمجھتا تھا جن کے متعلق اُسے شبہ ہوا کہ وہ غنیم کا سامان لے جا رہے ہیں اس طریق کارروائی کے خلاف کئی مرتبہ صدائے احتجاج بلند ہو چکی تھی اور اب پروس ڈنمارک۔ سویڈن و پراشیا نے برطانیہ کے اس استحقاق و دعوے کی مخالفت کے لئے اتحاد قائم کیا۔ روس کا زار پال اول (Paul I) جو نقریباً پاگل تھا اس تجویز میں دل و جان سے شریک ہو گیا اور نپولین کا پرجوش حلیف بن گیا۔ لیکن برطانیہ کی بحری طاقت اس قدر مضبوط تھی کہ اب بھی اُس کا

برطانیہ کے خلاف اتحاد

مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ اپریل ۱۸۰۱ء میں کوپن ہیگن (Copenhagen) کی لڑائی نے اس اتحاد کو درہم برہم کر دیا۔ پال اول قتل ہو چکا تھا اور ابھی تک برطانیہ کی بحری قوت وعظمت کو صدمہ پہنچانے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا اس لئے ۱۸۰۲ء میں فرانس و برطانیہ میں صلح امینز (Amiens) ہوجانے سے یورپ میں امن وامان قائم ہوگیا۔

امینز یا امیان (Amiens)

جزائر ٹرینیڈیڈ (Trinidad) ولنکا (Ceylon) کے سوا بقیہ تمام برطانوی فتوحات واپس کر دیے گئے۔ اس صلح کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ جزیرہ مالٹا (Malta) جس کو انگریزوں نے فرانس سے چھین لیا تھا چند شرائط کے ساتھ مبارزین سینٹ جان کو واپس دے دیا جائے آگے چل کر ہمیں معلوم ہوگا کہ یورپ کی دوسری جنگ عظیم اسی شرط کے باعث برپا ہوئی۔

جرمنی میں تغیرات

اس اثناء میں نپولین کو بے مثل فوجی فتوحات کے ساتھ ساتھ شہرت بھی حاصل ہوگئی کہ اسی کی بدولت یورپ کو وہ امن وسکون حاصل ہوگیا جس کی دس سال سے تمنا تھی۔ حال کے واقعات کی وجہ سے جرمنی میں بہت تغیرات ہورہے تھے فرانس کے فتوحات سے یہ بات کئی مرتبہ ثابت ہو چکی تھی کہ قدیم شہنشاہی نظام جرمنی کے تحفظ کے لئے موزوں نہ تھا اور صلح کیمپو فورمیو اور صلح لونیویل میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا تھا کہ جرمنی میں تغیرات کئے جانے والے ہیں شہنشاہی مجلس وضعیت کے نمایندے طلب کئے گئے کہ جرمن مملکتوں کے مقبوضات وباہمی تعلقات میں وہ تغیرات قبول کرلیں جن کا روس وفرانس اور ایک حد تک آسٹریا نے تصفیہ کیا تھا نپولین کی حقیقی خواہش یہ تھی کہ آسٹریا وپراشیا کو جرمنی کے مشرقی حصے کی طرف کھسکا کر مغربی وجنوب ومغربی حصہ فرانس کی نگرانی میں لے لے اس وجہ سے بیڈن (Baden) ، لویریا (Bavaria) اور ورٹمبرگ (Wartenburg) کی مملکتوں میں مغربی جرمنی کی بہت ساری دینی مملکتوں کو شامل کرکے اضافہ کر دیا گیا نپولین کو یہ اعتماد تھا کہ یہ علاقے چونکہ فرانس کی کارسازی سے حاصل ہوئے تھے اور فرانس ہی کی حفاظت واعانت سے قائم رکھے جاسکتے تھے اس وجہ سے مغربی جرمن مملکتیں فرانس کی حلیف بنی رہینگی دینی مملکتیں بالکل ناکارہ تھیں اور ان میں طرح طرح کی بدعنوانیاں

جرمنی میں فرانس کی اغراض

پھیل گئی تھیں اس وجہ سے یہ تغیرات ملک کی فلاح و بہبودی کا باعث ہوئے شہنشاہی برائے نام اب بھی قائم تھی۔ مگر ایک عرصہ سے محض پرچھائیں کی طرح باقی رہ گئی تھی اور وہ بھی رفتہ رفتہ محو ہو رہی تھی غرض یہ پرچھائیں بھی پانچ سال تک اور رہی۔

نپولین کا ملکی انتظام

صلح ایمینس (Amiens) سے نپولین کو اپنے ملک کے اندرونی معاملات کے درست کرنے کا موقع مل گیا اور سب سے پہلے مذہبی مسئلہ پیش آیا جو اس وقت سے فرانس کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب ہو گیا تھا جب سے کہ مجلس وضع قوانین نے "دستور کلیسائی" (Civil constitution of the Clergy) جاری کر دیا تھا۔ مذہبی پالیسی میں نپولین کا مقصد بالکل سیاسی تھا۔ کیتھلک مذہب کے وسیع اثر کو اس نے محسوس کیا اور یہ بھی اس کو معلوم تھا کہ فرانس کی آبادی کا بیشتر حصہ اسی مذہب کا پیرو تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جس ملک کا مذہب ایک مستقل حالت پر قائم نہ ہو اس کی بنیاد کبھی پائدار نہیں ہو سکتی بمقابلہ دوسرے جمہوری فوجی قائدین کے اس نے پہلے ہی سے اپنے کو پاپائیت کا طرفدار ظاہر کر دیا تھا۔ مارنگو (Marengo) کی لڑائی کے بعد ہی اس نے پئیس ہفتم (Pius VII) گفت و شنید شروع کر دی۔ جو علاقے پوپ سے چھین لئے گئے تھے وہ بھی اس کو بحال کر دئے گئے اور اس کے معاوضے میں اس نے معاہدہ مذہبی

پوپ سے مذہبی معاہدہ۔

(Concordat) یعنے فرانس کے مذہبی معاملات کا تصفیہ منظور کر لیا۔ (اپریل سنہ ۱۸۰۲ء) اس کے ذریعہ سے کیتھلک مذہب پھر سلطنت کی سرپرستی میں فرانس کا مذہب تسلیم کر لیا گیا۔ بحیثیت وزیر اعلےٰ کے کل اعلےٰ مذہبی عہدوں کا تقرر نپولین کے اختیار میں آگیا اور اس طور پر اس کو وہ حیثیت حاصل ہو گئی جو انقلاب کے پہلے فرانس کے بادشاہوں کو حاصل تھی۔ لیکن اس معاہدے کے ساتھ مذہبی جبر و سختی روا نہیں رکھی گئی بلکہ عام رواداری کا صریح اعلان کر دیا گیا۔ کیتھلک مذہب کے علاوہ دوسرے فرقوں کے متبعین بھی سرکاری خدمات پر مقرر کئے گئے اور ان کو بھی سرکاری خزانہ سے تنخواہیں ملنے لگیں اس معاہدے کے بس یہی خصوصیات ہیں اس معاہدہ کی منظوری پوپ کو اور زیادہ کھلنے لگی کیونکہ تھوڑے دنوں بعد

شرائط اساسی

نپولین نے بلا پوپ کے استمزاج کے چند "عضوی" (اساسی) شرائط" نافذ کیئے اور اعلان کر دیا کہ فرانس کے کلیسہ پر اس کی پابندی لازم رہیگی۔ اس کی رو سے فرانس میں پاپائی فرامین کی ممانعت کر دی گئی اور یہ قرار پایا کہ بغیر حکومت کی اجازت کے کلیسہ کی کوئی مجلس منعقد نہ ہو اور نہ کوئی اسقف پوپ کی طلبی پر اپنے حدود کے باہر جانے کا مجاز رہیگا اور ۱۶۸۲ء کی گیلیکن (Galican liberty) آزادی کا اعلان جس پر پاپائے وقت نے سخت ناراضگی ظاہر کی تھی اب بھی فرانس کے لوگوں اور کلیسہ پر قابل پابندی قرار دیا گیا۔ اگر پوپ کو ان "اصولی شرائط" کا علم ہوتا تو وہ ہرگز معاہدۂ مذہبی کو نہ قبول کرتا اب تو وہ منظور ہو چکا تھا اور کل اسقفوں کو پادریوں نے اس کے مطابق خدمات انجام دینا منظور کر لیا تھا۔ فرانس میں اب مذہبی یگانگت قائم ہوگئی اور اس کی وجہ سے ملک کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔

لیجین آف آنر

انقلاب نے ہر قسم کے خطاب و اعزاز کو مٹا دیا تھا لیکن ۱۸۰۲ء میں نپولین نے "لیجین آف آنر" (Legion of Honour) کا اعزازی خطاب پھر جاری کر دیا۔ اس نے کہا کہ فرانسیسیوں کی فطرت ایسی ہے کہ کسی نہ کسی قسم کا امتیازی طرہ ان کو ضرور ملنا چاہیئے یہ نیا ادارہ بہت مرغوب عام ہوا اور اب تک وہ قائم ہے۔

تعلیم

نپولین نے تعلیمات کی طرف بھی توجہ کی اس نے فرانس میں ایک جامعہ (University) اور پیرس میں ایک مرکزی دار العلوم قائم کیا جن کے تحت میں سترہ مدارس اضلاع میں قائم کیئے گئے اس نے ابتدائی و ثانوی و امتحانی تعلیم کا بھی انتظام کیا گو اس وقت تک اس معاملے میں کوششیں تو کئی بار ہوئیں لیکن اب تک کوئی عملی صورت اختیار نہیں کی گئی تھی۔

نیپولیانی قوانین

فرانس کے عدالتی انتظام کے متعلق اس نے جو کچھ کیا وہ غالباً اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس کو خود قانونی معاملات میں خاص واقفیت نہ تھی کیونکہ اس کی تعلیم زیادہ تر بحیثیت ایک سپاہی کے ہوئی تھی۔ لیکن اس نے بہت جلد اپنے کو فرانس کے قوانین و قانونی مسائل و ضروریات سے واقف

کرلیا جس طرح کہ شاہ تھیوڈوسیس (Thedosius) و شاہ جسٹینین (Justinian) نے صدیوں پہلے روما کے قوانین کو منضبط و مدون کیا تھا۔ اسی طرح اس نے بھی فرانس کے قوانین ترتیب دینے کا ارادہ کیا اس کام کے لئے اس نے ایک کمیشن کا تقرر کیا۔ جس نے تھوڑے ہی دنوں میں پانچ زبردست ضابطے مرتب کردئیے بعض امور میں یہ ضابطے ترقی معکوس ظاہر کرتے تھے۔ انقلاب کے واضعان قوانین نے جوری کا جتنا دخل رکھا تھا اتنا اب بھی باقی نہیں رکھا گیا۔ تعزیرات میں داغدورزی کی سزا رکھی گئی جائداد کی ضبطی بھی روا رکھی گئی اور شقت سخت ایسی رکھی گئی کہ اذیت کی حد تک پہنچتی تھی لیکن تعزیرات کا عام اثر و نتیجہ سود مند تھا اور اس کے اصول معقول تھے۔

برطانیہ سے پھر چھیڑ چھاڑ۔

نپولین ادھر ایسے قابل تعریف اور آشتی آمیز کام میں معروف تھا اور ادھر فضائے یورپ میں ایک نئی لڑائی کا بادل منڈلا رہا تھا۔ صلح امئینس کے بعد سے برطانیہ اور نپولین کے تعلقات کچھ قابل اطمینان نہیں ہوئے تھے اور اب دونوں میں انفراق و انشقاق کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس جدید جنگ کے اسباب و علل اب بھی معرض بحث میں ہیں ان کی ظاہری صورت صاف ہے۔ نپولین کے خلاف یہ ماننا پڑیگا کہ صلح کے بعد سے اس کا طرز عمل نہایت اشتعال انگیز ہو گیا تھا۔ اس نے فرانس کے مقبوضات میں بہت اضافہ کرلیا تھا اس نے سیسلپاین (Cisalpine) کو ہ ایلپ کے اس جانب یعنی روما کی جانب سے جو ایلپ کے جنوب جانب ہے جمہوریت کو تقریباً بالکل فرانس میں شامل کرلیا تھا حالانکہ اب تک اٹلی کے شمال میں یہ ایک خود مختار سلطنت تھی۔ اس ملک کو اس نے اس طور پر فرانس میں شامل

اٹلی اور سوئیزرلینڈ پر قبضہ۔

کرلیا کہ ۱۸۰۲ء میں اس جمہوریت کا وہ خود صدر منتخب ہوا اور بعد میں اس کو بادشاہت اٹلی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ پیڈمونٹ (Piedmont) بھی شامل کرلیا گیا اور پارما (Parma) ایلبا (Elba) بھی فرانس جزو قرار دئیے گئے سوئیزرلینڈ سے اس کی مفاصمت اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز ثابت ہوئی ہیلویٹی (Helvetic) جمہوریت چودھویں صدی سے بالکل خود مختار تھی

کچھ عرصہ سے اس کے عمومیت پسندوں اور معدودیت پسندوں میں نزاع شروع ہو گئی تھی اور نیز ان لوگوں میں جو مرکزی حکومت کا قیام چاہتے تھے اور ان میں جو ہر پرگنہ کو خود مختار رکھنا چاہتے تھے۔ نپولین نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر کل ملک پر قبضہ کر لیا اور ظاہر یہ کیا کہ سوئیزرلینڈ کو خود وہاں کے باشندوں سے بچانا چاہئے سوئیزرلینڈ کی آزادی برائے نام باقی رہے۔ اور اس وقت سے فرانسیسی فوج کے لئے بہت بڑی تعداد سپاہیوں کی یہیں سے بھرتی ہونے لگی۔ تقریباً تمام دوسری ضروریات و اغراض کے لئے بھی یہ فرانس کا علاقہ سمجھا جانے لگا۔ ادھر زمین خاص پر تو فرانس کا علاقہ اس طرح بڑھ رہا تھا اور ادھر نپولین کی آنکھ پھر مصر پر پڑ رہی تھی۔ بلکہ ہندوستان پر بھی۔ اور جو فرستادے مشرق کو بھیجے گئے تھے ان کی اطلاع سے معلوم ہوتا تھا کہ جس منصوبہ کو جنگ نیل (Nile) کی وجہ سے اس نے ملتوی کر دیا تھا پھر اس کو حد تکمیل تک پہنچانے کی

توازن قوت کا درہم برہم ہو جانا

کوشش کرنے والا تھا صلح لونیول (Luniville) سے جو توازن طاقت قائم ہوا تھا وہ صریحاً درہم برہم ہو گیا تھا اور یہ معلوم ہے کہ ایسے مواقع پر کئی بار یورپ جنگ میں مبتلا ہو چکا ہے۔

مسئلۂ مالٹا

ادھر انگلستان کو صلح کے نتائج سے بہت مایوسی ہوئی تھی اس کو امید تھی کہ اس کی بدولت تجارت کو فروغ ہوگا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں ملکوں کے درمیان کوئی تجارتی معاہدہ منظور کرنے پر فرانس تیار نہ تھا اور نپولین برطانیہ کی تجارت بند کرنے پر تلا ہوا تھا علاوہ اس کے انگریزی حکومت نے مالٹا دینے سے انکار کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ صلح کے شرائط کی تعمیل نہیں ہوئی تھی لیکن خود برطانیہ نے ان شرائط کی تعمیل کرنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ صلح کے زمانہ میں براعظم پر فرانس کی طاقت اس طرح بڑھتے دیکھ کر اس جزیرہ کو برطانوی قبضہ میں رکھنا ضروری معلوم ہوا جو کہ بحر متوسط میں جنگ ہونے کی صورت میں ایک فوجی مرکز کا کام دیتا۔ ایک برطانوی سفیر پیرس (Paris) بھیجا گیا تھا مگر شروع ہی سے اس کو تاکید کر دی گئی تھی کہ کسی حال میں مالٹا کے تخلیہ پر رضامند نہ ہو اور چونکہ نپولین اس جزیرہ کو حاصل کرنے پر اڑا ہوا تھا کچھ تو فوجی اغراض سے اور کچھ اس خیال سے کہ اگر وہ اپنا

دعویٰ چھوڑ دیگا تو اس کی سبکی ہو جائیگی۔ اس وجہ سے شروع ہی سے گمان تھا کہ جنگ چھڑ جائیگی آخرکار مارچ ۱۸۰۳ء میں اعلان جنگ ہو گیا۔

قبل اس کے کہ ہم جنگ کی تفصیل بیان کریں یہ مناسب ہے کہ نیپولین کی ذاتی حیثیت کے ان تغیرات کو ظاہر کر دیں جن کی بدولت اس نے اس قدر جلد شہنشاہی عہدہ کا نسلی ٹپیوین القب اختیار کر لیا صلح امیئنس کے بعد ہی یہ تجویز پیش کی گئی کہ کانسلی اوزارت کی خدمت جواب تک اسے ایک میعاد مقررہ کے لئے حاصل تھی تاحیات اس کو دے دی جائے یہ مسئلہ رائے عامہ کے لئے پیش ہوا اور ساڑھے تین کروڑ آدمیوں نے اس کی تائید کی اور صرف آٹھ ہزار

کانا حیات ناموں ہونا۔

رائیں اس کے خلاف تھیں دستور میں بھی کچھ تغیرات مائل بہ استبداد بت کئے گئے خصوصاً مجلس ٹرائبیونٹ کو جس کے مباحثہ میں اب تک آزادی کا جذبہ ظاہر ہوتا تھا حکم دیا گیا کہ وہ صیغۂ راز میں بحث و مباحثہ کرے اور اس کی کارروائی کی رپورٹ با اطلاع شائع کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد بہت سی سازشیں نیپولین کی جان لینے کے لئے کی گئیں فرانس کے بعض نامور سپاہی جیسے جلاوطن شدہ پیچگرو (Pichegru) اور موریو (Moreau) جس نے ابھی ہی جرمنی میں فتوحات حاصل کئے تھے ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو گئے تھے جو نیپولین کے اقتدار و قوت سے ناراض تھے۔ سازشوں کا سراغ لگ گیا اور اس کے سرغنوں کو مختلف سزائیں دی گئیں۔ بوربن خاندان کا ایک شہزادہ ڈیوک آف انگیان (Duke of Enighien) نامی فرانس کی سرحدات کے باہر رہتا تھا نیپولین نے خیال کیا کہ

ڈیوک آف انگیان (Enighien) کا قتل

وہ بھی ان سازشوں میں شریک تھا۔ قانون بین الاقوام کے خلاف اس کو گرفتار کر کے پیرس لایا گیا اور فوجی عدالت نے اس کو مجرم قرار دیکر قتل کرا دیا نیپولین کی زندگی کے کسی واقعے نے یورپ کے جذبات و احساس کو اتنا صدمہ نہیں پہنچایا جتنا کہ اس واقعے نے نیپولین کے اقتدار پر اس قسم کے حملوں کی وجہ سے نیز ایک یورپین جنگ کے آثار دیکھ کر اس کے طرفداروں نے یہ خیال کیا کہ نیپولین پر فرانس کا کمال اعتماد ظاہر کرنے کے لئے یہ مناسب ہے کہ اس کو ایسے خطاب سے سرفراز کیا جائے جو اب تک اسے حاصل نہیں ہوا تھا۔ کچھ دنوں سے شہنشاہ کے لقب کا چرچا ہو رہا تھا۔ مئی ۱۸۰۴ء میں ایسی ایک تجویز

نیپولین کو شہنشاہ کا لقب دیا جانا۔

ٹرائیبیونٹ میں پیش کی گئی اور سینیٹ کے حکم سے یہ خطاب اس کو مل گیا! یہ اس کی سیاسی معراج تھی اور اس واقعے کی شان اس وجہ سے بھی بڑھ گئی کہ پوپ پائس ہفتم نے پیرس آکر رسم تاجپوشی کی صدارت کی نئے شہنشاہ نے فوراً ہی مارشل (سپہ سالار) کا قدیم فوجی خطاب جاری کیا اور تقریباً بیس مشہور سپاہیوں کو اس خطاب سے سرفراز کیا جو پہلے ہی فرانس کے جھنڈے کے نیچے لڑکر تمام یورپ میں مشہور ہوچکے تھے۔

فرانس کے خلاف تیسرا اتحاد۔

اس جنگ میں فرانس نے جبراً اسپین کو اپنا حلیف بنالیا تھا لیکن صرف یہی ایک رفیق اس کو ملا ورنہ یورپ کی بقیہ تمام سربرآوردہ سلطنتیں اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئیں ابتداءً تو برطانیہ عظمےٰ ہی تنہا رہا کیونکہ پراشیا نے بھی یہ سمجھ کر کہ جرمنی میں اس کو کوئی خطرہ نہیں تھا کسی قسم کی معقول امداد برطانیہ کو نہیں دی لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد روس آسٹریا و سوئڈن اس کے ساتھ شریک ہوگئے اور اعلان کردیا کہ سب کی غرض یہی ہے کہ فرانس کو اپنی قدیم حدود کے اندر محدود رکھا جائے نیپولین نے پہلے ارادہ کیا کہ انگلستان پر فوج کشی کرکے ایسی فتح حاصل کرلے کہ جس سے کل مہم کا فیصلہ ہوجائے اور خود لندن میں شرائط صلح طے کئے جائیں اس لئے اس نے

انگلستان پر چڑھائی کی کوشش کا بے سود ہونا۔

ایک فوج اور کشتیوں کا بیڑا بولونی (Boulogne) کے پاس آبنائے انگلستان میں تیار و آراستہ کیا اور اپنی تجویز کی کامیابی پر بھروسہ کئے رہا لیکن برطانوی بحری بیڑہ ایسا زبردست تھا کہ یہ تجویز خالی از خطرہ نہ تھی۔ بیڑے کو دھوکا دینے یا ہٹانے کی سب کوششیں بیکار ہوئیں اور قبل اس کے کہ اکتوبر ۱۸۰۵ء میں نیلسن (Nelson) جنگ ٹرافلگر (Trafalgar) میں فرانسیسی و ہسپانوی بیڑے کو شکست دے نیپولین نے اپنی یہ تجویز ترک کردی اس طرح اس مہم کی ابتدا ناکامی سے ہوئی لیکن یہ اثر ناکامی بہت جلد نیپولین کی اُن حیرت انگیز فتوحات نے محو کردیا جو اس کو جرمنی میں پے در پے حاصل ہوتی رہیں اس نے اپنی فوج مختلف راستوں سے دریائے ڈینیوب کے بالائی وادی میں جمع ہونے کے لئے روانہ کردی اس طور پر جو چڑھائی کی گئی وہ ترتیب اور دور اندیشی کا حیرت انگیز کرشمہ تھی پہلے تو آسٹریوی سپہ سالار جس کو گھمنڈ تھا کہ فتوحات حاصل کریگا۔ بمقام الم (Ulm) محصور کرلیا گیا اور تیس ہزار

اُلم (Ulm)

سپاہیوں کے ساتھ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد نپولین وائنا (Vienna) کی طرف بڑھا۔ اگر اس وقت پرشیا بھی اتحادیوں کے ساتھ شریک ہو جاتا تو فرانس کی حالت بہت خطرناک ہو جاتی۔ لیکن وہاں کے تاجدار فریڈرک ولیم سوم نے ایک مذبذب اور بے اثر طرز عمل اختیار کیا اور نپولین کو صرف آسٹریا

آسٹرلٹز (Austerlitz)

و روس سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ۲ر دسمبر ۱۸۰۵ء کو دونوں طرف کی فوجیں آسٹرلٹز (Austerlitz) کے میدان میں صف آرا ہوئیں اور اس لڑائی میں جو فتح حاصل ہوئی وہ نپولین کے کمال صف آرائی کی سب سے زیادہ حیرت انگیز مثال ہے۔ غنیم کو شکست فاش ہوئی وائنا (Vienna) نپولین کے ہاتھوں میں آگیا اور زار روس اسی پر خوش تھا کہ وہ خطرے سے بچ کر نکل آیا۔ آسٹریا تاب مقاومت

صلح پریسبرگ (Pressburg)

نہ لا سکا اور دسمبر ۱۸۰۵ء میں صلح پریسبرگ (Pressburg) منظور کرنے پر مجبور ہو گیا یہ تیسری صلح تھی جو اس نے نپولین سے نباہ کن شکست کھا کر قبول کی تھی۔

آسٹریا کی تباہی کے ساتھ ساتھ روما کی مقدس سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا جو دسویں صدی کے اٹو اعظم Otto کے عہد سے چلی آرہی تھی بلکہ آٹھویں صدی یعنی شارلیمن (Charlemagne) کے زمانے سے اور روما کے قدیم قیصری شاہی خاندان کی (سیزر) یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ

روما کی مقدس سلطنت کا خاتمہ

کرتی تھی ہم بتلا چکے ہیں کہ اس سلطنت کو تقویت پہنچانے کی بہتری کوششیں کی گئیں۔ لیکن سب بیکار ہوئیں ہر دسویں سال اس کی کمزوری بڑھتی گئی اور آخر میں محض برائے نام اس کا وجود باقی رہا۔ نپولین نے جب شہنشاہ کا لقب اختیار کیا تھا اس وقت شہنشاہ فریڈرک اپنے کو شہنشاہ آسٹریا کہتا تھا۔ اب ۱۸۰۶ء میں رومی سلطنت بالکل فنا ہو گئی اور کسی کو اس کا افسوس بھی نہ ہوا۔

پرشیا سے جنگ

آسٹریا کی شکست کے تھوڑے ہی دنوں بعد نپولین اور پرشیا میں لڑائی شروع ہو گئی اب تک فرانس نے حکمت عملی سے پرشیا کو اپنے قابو میں رکھا تھا اور ۱۷۹۵ء سے پرشیا فرانس کے مقابلے میں صف آرا نہیں ہوا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ جرمنی میں اس کی حیثیت روز بروز ایک غیر ملی ریاست کی ہوتی جاتی ہے۔ نپولین نے مغربی جرمنی کی مملکتوں کو یک کر کے عہدیہ رائن (Rhine) قائم کر دیا تھا اسی طریقے

برگویا پراشیا کا ایک مد مقابل کھڑا ہوگیا تھا۔ علاوہ اس کے بہت سے نیم ٹر و عدے جو پراشیا سے کیے گئے تھے پورے نہیں ہوئے اس کو توقع تھی کہ ہنوور (Hanover) کی راجدھانی اس میں شامل کردی جائیگی مگر یہ بھی نہ ہوا۔ یہ بھی تجویز تھی کہ پراشیا کو شاہنشاہی کا خطاب دیدیا جائے لیکن اس تجویز کو بھی عملی جامہ پہنانے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی آخرکار یہ دیکھ کر کہ تاخیر سے اور بھی اس کی حالت ابتر ہوجائیگی اور روس و سیکسنی کی رفاقت کے بھروسے پر اس نے فرانس کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔

پراشیا کی شکست

اب جو لڑائی شروع ہوئی وہ غالباً نپولین کی فتوحات میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے پراشیا کی فوج کی دھاک اب تک قائم تھی۔ فریڈرک اعظم کا نام اور اس کی قائم کردہ روایات پراشیا کی فوج کی فتحیابی کی ضمانت تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ فریڈرک اعظم کی روایات پراشیا کی فوج کے لئے مضر ثابت ہوئی تھیں۔ کیونکہ ان روایات کی وجہ سے پراشیا کی فوج نے وہ جدید طریقے لڑائی کے نہیں اختیار کئے جو نپولین نے ایجاد کئے تھے۔ جب اکتوبر ۱۸۰۶ء میں ییینا کی دوہری لڑائی میں پراشیا کی دو فوجیں بالکل تباہ ہوگئیں تو تمام یورپ کو حیرت ہوئی ییینا میں تو پراشیا کی فوج صرف ہار گئی لیکن اس کے بعد جو واقعہ ہوا اس سے پراشیا کی فوج بے انتہا ذلیل ہوئی نہایت مستحکم قلعے یکے بعد دیگر فرانس کے معمولی فوجی دستوں کے قبضے میں آتے گئے حالانکہ ان قلعوں میں بڑی بڑی پلٹنیں اور وافر خوراک و سامان موجود تھا۔ ایک ہی یورش میں پراشیا کا نام دول عظمٰے سے خارج ہوگیا۔ شمال و مشرقی حصہ میں روس کے بھروسے پر خود شاہ (پراشیا) مقابلے پر جما رہا لیکن جون ۱۸۰۷ء میں پھر پراشیا اور روس کی فوجیں فریڈلینڈ (Friedland) کی مہلک جنگ میں ہار گئیں اور دونوں نے صلح قبول کرلی۔

صلح ٹلسٹ (Tilsit)

یہی ٹلسٹ (Tilsit) کی مشہور صلح ہے جس کو نپولین کی سیاسی حیات کا معراج کہنا چاہئے یہ معاہدہ صلح گویا نپولین اور زار روس میں ایک دوستانہ اتحاد تھا جس میں روس نے نپولین کے منصوبوں کی تائید کرنے کا اقرار کیا خصوصاً انگلستان کی مخالفت کا اس صلح میں

ویسٹ فیلیا کی راجدھانی اور وارسا کی ولایت۔

روس کا تو کچھ نقصان نہیں ہوا لیکن پراشیا پر فاتح نے کاری ضرب لگائی پراشیا کا مغربی علاقہ لیکر ویسٹ فیلیا (West phalia) کی سلطنت قائم کی گئی اور نپولین کا ایک بھائی وہاں کا حکمراں کردیا گیا۔ پراشیا کا وہ علاقہ

جو پولینڈ سے لیا گیا تھا وارسا (Warsaw) کی آزاد ولایت (Duchy) کے نام سے شاہ سیکسنی کے تفویض کر دیا گیا۔ پراشیا کی فوج معین و محدود کر دی گئی اور فرانسیسی پلٹنیں ملک میں قائم رکھی گئیں۔

برطانیہ کے خلاف تجارتی احکام۔ اب صرف ایک غنیم انگلستان باقی رہ گیا تھا اور جنگ ٹرافلگر (Trafalgar) کے بعد سے وہ ناقابل شکست سمجھا جانے لگا تھا نپولین کو امید تھی کہ اگر سمندر پر وہ اس کو شکست نہیں دے سکتا تو کم از کم اس کی تجارت بند کر کے اُسے تباہ کر سکے گا۔ اس لئے نومبر ۱۸۰۶ء میں اس نے برلن کے مشہور فرامین جاری کئے جس کے ذریعہ سے اس نے ان تمام بندرگاہوں کو برطانوی تجارت کے لئے بند کر دیا جو یورپ کے ساحل پر اس کے قبضے میں تھے اس حکمت سے اس نے برطانیہ کے تجارتی طبقہ کو برباد کر کے برطانیہ کو مجبور کرنا چاہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ برطانیہ کا تجارتی طبقہ سب سے زیادہ قوی ہے۔ لیکن فن تجارت میں اس کو اتنا دخل نہ تھا کہ وہ یہ سمجھ سکتا کہ اس حرکت سے خود اس کے علاقے کو بمقابلہ انگلستان کے زیادہ نقصان پہنچیگا۔ برطانیہ نے بھی اس فرمان کا جواب "احکام مجلس" (Orders in Council) سے دیا جس کے ذریعے سے یورپی ساحل پر تجارت مسدود کر دی گئی اور حکم دیا گیا کہ جب تک فرمان برلن منسوخ نہ کیا جائے اس وقت تک نپولین کے علاقے کے کسی بندرگاہ سے تجارت نہ کی جائے۔ مغربی یورپ میں صرف

ڈنمارک اور پرتگال پر برطانیہ کا قابو و اثر۔ ڈنمارک اور پرتگال نپولین کے زیر اثر نہیں تھے انگلستان کے وزیر کیننگ اور برطانوی بیڑے کی پرزور کارروائی نے نپولین کے اس منصوبے کو رد کر دیا جو اس نے ڈنمارک کے خلاف سوچے تھے پرتگال کو البتہ فرانسیسی فوجوں نے تاراج کر دیا اور وہاں کا شاہی خاندان برازیل (Brazil) میں جا کر پناہ گزیں ہوا

نپولین کی فتوحات کے اسباب۔ اگر صلح تلسٹ کے بعد ہی نپولین فوت ہو جاتا تو وہ فوق الانسانی قوے کا آدمی سمجھا جاتا اب تک اس نے

جتنی چڑھائی کی تھی سب میں فتحیاب ہوا تھا۔ برطانوی بیڑے کے مقابلہ میں جو ناکامی اس کو ہوئی تھی اس پر ان کثیر التعداد و پرشکوہ فتوحات نے پردہ ڈالدیا تھا جو خشکی پر اسے نصیب ہوئیں۔ ہر یورپی سلطنت باری باری سے اس کے مقابلہ پر آئی اور ہر ایک کے مقابلہ میں فرانسیسی فوج نے اپنی برتری و فوقیت ثابت کردی یہ نتیجہ حیرت انگیز ضرور تھا لیکن کوئی اعجاز نہ تھا۔ اس کا سبب اولاً نپولین کی فوجی ذہانت۔ فن سپہگری میں اس کی مہارت اور صف آرائی میں جدت آفرینی اور سب باتوں کو نہایت جوش سے کام میں لانا تھا لیکن دوسری

فرانس ایک مسلح قوم

بات یہ بھی ہے کہ جو افواج فرانس میدان میں لاتا تھا اور جو اس کے مقابلہ پر آتی تھیں دونوں میں بہت فرق بھی ہوتا تھا۔ کیونکہ فرانس من حیث القوم ہتھیار بند تھا اور اس کے سپاہیوں کو اپنے افسر پر ناز تھا اور ہر سپاہی کو جنگ کے انجام و مقصد سے ذاتی لگاؤ تھا۔ دوسری طرف مقابلے میں کوئی قوم نہ تھی بلکہ محض حکومتیں تھیں جنکو رعایا کی ہمدردی و نفع و نقصان سے تعلق نہیں ہوتا تھا اور ایک ایسی فوج پر ان کا دارو مدار ہوتا تھا جو طمع زر سے یا جبراً میدان جنگ میں لڑنے کیلئے لائی جاتی تھیں ظاہر ہے کہ ایسی فوج کو جنگ کے نتیجہ سے کیا دلچسپی ہوتی۔ نپولین یورپ کی حکومتوں کو شکست دیسکتا تھا لیکن جب ان حکومتوں کی تائید پر یورپ کے "لوگ" آمادہ ہوگئے اور انکو یقین ہوگیا کہ ان کے اغراض و فوائد بھی اس جنگ سے وابستہ ہیں۔ اور حکومتوں کے دباؤ و جبر سے نہیں بلکہ ولولۂ انتقام سے بھرے ہوئے وہ لڑنے پر آمادہ ہوئے تو نپولین کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یورپ کے بہت سے حصوں میں انقلاب کا نظام العمل مقبول ہوچکا تھا خصوصاً ان ممالک میں جو انقلاب کے مجسمہ نپولین سے برسر پیکار تھے۔ اور آخر کار فرانس کو انہی خیالات و اصلاحات و جدید جنگی تدابیر کی بدولت شکست ہوئی جسکا موجد وہ خود تھا

فرانس کو انہی اسباب سے شکست ہوئی جن کا وہ موجد تھا

صلح ٹلسٹ کے بعد سے ہماری دلچسپی فرانس اور اس کے شہنشاہ سے باقی نہیں رہتی بلکہ ان اقوام سے وابستہ ہوجاتی ہے

جو بگڑنے کے بعد وہ بگڑے اس کے مقابلہ پر غیظ و غضب سے آمادہ ہوئیں۔ پرشیا میں ایک

پرشیا میں اصلاحات

نیا جذبہ پرورش پا رہا تھا اور فوج و ملکی معاملات میں نہایت اہم اصلاحات رونما ہو رہے تھے۔ پرشیا کی تاریخ کا یہ سب سے بہادرانہ عہد ہے کہ اس خوفناک صدمے کے باوجود اس کی فوجوں کو پہنچا تھا اس نے نہایت اطمینان و ہمت سے کام لیا اور اپنی فوج و حکومت کو از سر نو ترتیب دیا اس امید میں کہ شاید آئندہ اس کے بھلے دن پلٹ آئیں ان اصلاحات کے بانیوں میں اسٹین (Stein) کا نام خاص طور پر ممتاز ہے جس نے

اسٹائن (Stein)

مسلسل فرامین کے ذریعے سے غلامی کا انسداد کر دیا اور اپنی مملکت میں کسانوں کی بھی دلچسپی پیدا کرادی اس کے ساتھ ہی ساتھ شارن ہورسٹ (Scharnhorst) نے فوج میں سنے نئے طریقے رائج کئے۔ فوجی نوکری تو پہلے سے ہی جبری تھی مگر اس کا بار صرف زرعی غلاموں پر پڑتا تھا اب ہر شخص پر اس کی پابندی و تعمیل لازم کردی گئی۔ فوج کی صفوں میں ایک نیا احساس عزت اور ایک اعلےٰ وطنیت کا جوش پیدا ہوگیا اور اس طرح ایک ایسی فوج تیار ہوگئی کہ جس کے مقابلہ کی تاب نپولین کی قوت و طاقت بھی نہ لاسکی۔

مگر پہلا کامیاب حملہ پرشیا سے نہیں ہوا بلکہ یورپ کے ایسے حصہ سے ہوا جہاں سے اس کی توقع نہ تھی یورپ کے کسی حصہ میں ایسی نسلی اور سیاسی بے حسی نہیں پھیلی ہوئی تھی جیسی کہ ہسپانیہ

اسپین

میں نپولین کی نظروں میں اسپین ایسا حقیر و مشتبہ معلوم ہوتا تھا کہ بمقابلہ دوسرے خارجی دول کے وہ اسپین کے ساتھ زیادہ حقارت آمیز برتاؤ کرتا تھا۔ وہاں کے حکمراں وقت چارلس چہارم (Charles IV) اور اس کے بیٹے فرڈیننڈ (Ferdinend) میں جھگڑا ہوا تو نپولین نے فرڈیننڈ کو پھسلا کر فرانس میں بلا لیا اور دونوں کے جھگڑے کے تصفیہ کے لئے خود ثالث بن گیا آخر میں اس نے دونوں باپ بیٹے کو تخت سے علیحدہ کر دیا اور زبردستی کرکے اپنے بھائی جوزف (Joseph) کو اسپین کا بادشاہ بنادیا گھنے کو تو جزیرہ نما ہسپانیہ فرانس میں شامل نہیں کیا گیا مگر اصل میں

جوزف بوناپارٹ اسپین کا بادشاہ ہوجاتا ہے

دونوں ایک ہو گئے تھے شروع شروع تو خیریت سے گزری۔ اور حکومت ہسپانیہ کمزور ہونے سے میڈرڈ (Madrid) (دارالسلطنت) میں جوزف کی آمد پر کوئی مخالفت نہیں ہوئی لیکن جب ہسپانیہ کے لوگوں نے دیکھا کہ حکومت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو وہ خود فرانسیسی حکومت کے خلاف احتجاج کرنے لگے اور دارالسلطنت و اضلاع میں خود بخود عضویتیں قائم ہونے لگیں فرانسیسی فوجوں پر حملے ہوئے اور ان کو قلعوں میں بھاگ کر پناہ لینی پڑی آخر کار جولائی ۱۸۰۸ء میں سپہ سالار ڈیوپون (Dupont) جو ایک شورش فرو کرنے کے لئے جنوب کی طرف بھیجا گیا تھا بمقام بیلن (Bailen)

بیلن کی شکست

دھوکے سے گھیر لیا گیا اور اپنی پوری فوج کے ساتھ اسکو ہتھیار ڈالدینے پڑے۔ نپولین کے عروج کے بعد سے یہ پہلی قابل ذکر شکست تھی جو فرانسیسی فوج کو ہوئی۔ یورپ میں اسکا بہت بڑا اثر ہوا۔ اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ فرانس کی فوج ناقابل شکست نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ بغاوت شروع ہو گئی انگلستان نے ہسپانیہ والوں کی اعانت پر کمر باندھی اور اسی غرض سے ایک فوج پرتگال کو بھیجی گئی۔ یہ تمام قصہ یہاں بیان نہیں ہو سکتا خلاصہ یہ ہے

اسپین میں ولنگٹن کی فتوحات

کہ انگلستان کی جو فوج جزیرہ نما پر اتری تھی اس کی سپہ سالاری آخر میں ولنگٹن (Wellington) کو ملی اور اس کی سرکردگی میں یہ فوج فتح پر فتح حاصل کرتی رہی ۱۸۱۲ء میں سلامنکا (Salamanca) کی فتح ہوئی اور اس کے بعد ۱۸۱۳ء میں تو خود فرانس کی سرزمین پر اس نے قدم رکھدیا اس میں شک نہیں کہ برطانوی فوج نے ہسپانیہ میں بڑا کام کیا مگر خود ہسپانیہ والوں کی ہمت قابل ستایش ہے کہ انھوں نے اس بیباکی سے بغاوت کردی اور اس استقلال سے اس کو کامیاب انجام پر پہنچایا یورپ کے جنگی کارناموں میں کوئی واقعہ اس سے زیادہ بہادرانہ نہیں ہے جیسا کہ مارچ ۱۸۰۹ء میں محاصرہ سیرا گوسا (Saragossa) میں ہسپانیہ والوں کی مدافعت ومقاومت کا واقعہ اسپین درحقیقت وہ سرطان تھا جس نے نپولین کے شہنشاہی جباریت کے قوی کو مضمحل کر دیا۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ نپولین کی فوج اس کا قلع قمع کر دیتی لیکن دوسرے بہت سے ہنگامے جن میں بعض بہت زبردست

تھے کہ بعد دیگرے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وجہ سے ہسپانوی جنگ کا خاتمہ مشکل ہو گیا اس جنگ میں نپولین کی بعض بہترین فوجیں اور سپہ سالار کام آئے اور ایسے وقت میں جبکہ وہ جینے مرنے کے لئے لڑ رہا تھا اور اس کو اپنی تمام قوت کام میں لانے کی ضرورت تھی۔

آسٹریا سے چوتھی لڑائی

۱۸۰۹ء میں آسٹریا سے بھی لڑائی شروع ہو گئی اور گو اس لڑائی میں برطانیہ بھی اس کا طرفدار تھا لیکن اصل بار آسٹریا پر پڑا۔ آسٹریا بھی ایک عرصہ سے تیاری کر رہا تھا اور اس لڑائی میں وہ نپولین کے لئے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا بہ نسبت پہلے کے جبکہ اسکی اعانت پر ایک یورپی اتحاد تھا لیکن اب بھی ایک مرتبہ اور نپولین کو یہاں فتح نصیب ہوئی اس نے وائنا (Vienna) پر قبضہ کر لیا آخر کار واگرام (Wagram) کی لڑائی میں بہت بے جگری سے لڑ نکلنے بعد جولائی ۱۸۰۹ء میں

آسٹریا اور فرانس میں مصالحت اور رشتہ مندی

شہنشاہ آسٹریا نے چوتھی مرتبہ صلح قبول کر لی اس صلح کے شرائط کی تفصیل بیان کرنیکی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ بتا دینے کی بات ہے کہ آسٹریا کی حکمت عملی میں ایک نئے شخص شہزادہ میٹرنخ (Metternich) کا دخل نمایاں ہو گیا تھا یہ شہزادہ چالیس سال تک یورپ کی تاریخ میں ممتاز ہستی سمجھا جاتا رہا۔ اسی کی بدولت صلح ہوئی اور اسی نے نپولین سے رشتۂ اتحاد قائم کیا اور بعد میں نپولین کا عقد آسٹریا کی شہزادی میری یا ماری لوئیز سے کر کے اس رشتہ کو اور مضبوط کر دیا۔ شہزادی میری مقتول ملکہ میری انتوانت (Antoinette) کی بھتیجی تھی اور یورپ کو اس واقعہ سے حیرت ہوئی کہ کارسیکا (Carsica) کے ایک غاصب کو یورپ کی شاہی خاندان میں شامل کر لیا گیا۔

روس سے جنگ

اس کے بعد ہی نپولین کو ایک بہت ہی خوفناک جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ صلح ٹلسٹ میں اس نے روس کے زار اسکندر سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے تھے اور روس کی دوستی و موانست پر وہ اپنے منصوبوں کا دارومدار سمجھتا تھا۔ لیکن کچھ

عرصہ سے اس رشتہ میں کشیدگی پیدا ہو رہی تھی نپولین کو یہ گلہ تھا کہ انگلستان کے خلاف تجارتی جنگ کرنے سے زار نے گریز کیا اور زار نپولین کی اس حرکت سے ناخوش ہو گیا تھا کہ اس نے جرمنی کا بہت سا علاقہ فرانس میں شامل کر لیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وارسا (Warsaw) کی پولی ولایت کے قیام سے پولی قومیت کو تقویت ہوتی تھی اور چونکہ روس نے پولینڈ کا بہت سا حصہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اس لئے یہ بات روس کے لئے خطرناک تھی کچھ دنوں کی سیاسی کشمکش کے بعد نپولین نے روس کے مقابل اعلان جنگ کر دیا اور اپنے جرمن۔ پروشی۔ سیکسن اور آسٹروی رفقا و نیز اپنی وسیع سلطنت کی تمام رعایا سے اس مہم میں امداد و اعانت چاہی نپولین کو امید تھی کہ اس مہم کے ذریعہ سے وہ فرانس کا سکہ یورپ پر بٹھا دیگا اور ضمنی طور پر برطانیہ

۱۸۱۲ء کی قوت بھی توڑ دیگا۔ اب جو لڑائی شروع ہوئی وہ غالباً یورپ کی جنگی تاریخ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اندوہناک ہے چھ لاکھ آدمیوں کی ایک فوج نے روسی سرحد کو پار کیا اور روسی سپہ سالار اس عظیم الشان فوج کے مقابلے کے بغیر پیچھے ہٹتے گئے یہاں تک کہ فرانسیسی فوج دریائے بوروڈینو (Borodino)

بوروڈینو (Borodino) پہنچ گئی وہاں ایک زبردست اور مہلک جنگ ہوئی جس میں آخر کار نپولین کو فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی اور وہ ماسکو (Moscow) کی طرف بڑھتا گیا اُسے تعجب ہوا کہ بغیر کسی مقاومت و مزاحمت کے اسے کیوں سابقہ دار السلطنت میں داخل ہونے کا موقع دیا گیا اور اسے امید ہو گئی کہ اب صلح و مصالحت کی گفت و شنید شروع ہو جائیگی لیکن کوئی تحریک نہیں ہوئی اور ادھر شہر میں آگ لگ جانے سے ماسکو کا بہت بڑا حصہ خاکستر ہو گیا۔ روس کا موسم سرما قریب آرہا تھا اور نپولین کے پاس خوراک کا ذخیرہ بھی کافی نہ تھا اس لئے اس نے وسطی یورپ کی طرف مراجعت کا قصد کیا

مہم کا اندوہناک انجام لیکن روس کی ہوشیار فوج پہلے ہی سے گھات میں لگی ہوئی تھی اور روس کی خوفناک سردی نے ایک تباہی پھیلا دی اس پر بھی جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں فرانسیسی ہی کامیاب رہے لیکن خوراک

قحط، سپاہیوں کے فرار اور شدید سردی کی ہلاکت آفرینیوں کی بدولت فوج کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ آخر میں اصلی فوج کا ایک مختصر سا حصہ باقی رہ گیا تھا جب نپولین روسی حدود سے باہر ہوا اس خوفناک مصیبت نے یورپ کو بیدار کر دیا۔ جرمنی بھی ہاتھ پیر ہلانے لگا اور اس مہم میں آسٹروی فوج بھی شروع سے آخر تک بیدلی سے نپولین کا ساتھ دیتی رہی اور گو پرشیا کا تاجدار تو اب بھی اپنے کو فرانس کا حلیف ظاہر کرتا تھا مگر اس کی پلٹنیں کئی مرتبہ روسیوں سے مل گئیں اور روسیوں نے جو فرانسیسیوں کا تعاقب کئے چلے آرہے تھے آخر میں جرمنی پر حملہ کر دیا اب جو لڑائی ہوئی وہ غالباً نپولین کی سب سے بڑی مہمات میں سے ہے فوجیں بہت زیادہ تھیں اور ان کی نقل و حرکت بے انتہا دشوار و پیچیدہ۔ ہم یہاں اس کا انجام بیان کر سکتے ہیں نپولین اب بھی مایوس نہیں ہوا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جس قدر میرے دشمن پیرس کے قریب ہیں اس سے زیادہ میں وائنا (Vienna) سے قریب ہوں۔ اس کو ایک آخری فتح ڈریسڈن (Dresden) پر نصیب ہوئی لیکن لائپزگ (Liepzic) میں اسے ایک لاکھ پچاسی

جنگ لائپزک
(Liepzic)

ہزار کی فوج سے غنیم کی تین لاکھ کی فوج کا مقابلہ کرنا پڑا اور دو دن کی لڑائی کے بعد شہنشاہ فرانس بالکل تباہ و پامال ہو گیا اب جرمنی بھی اس کے مقابلہ پر کھڑا ہو گیا اور وہ اپنی بچی بچائی فوج کے ساتھ بڑی مشکلوں سے فرانس واپس آیا۔ اب فرانس نے اپنے پرانے کمال سپہگری و استقلال کا ثبوت دیا لیکن اب انجام کو صرف چند دنوں کے لئے ٹالنا تھا۔ فوجیں پیرس کی طرف بڑھتی آئیں اور آخر کار نپولین کو ہتھیار ڈال دینے پڑے اور وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گیا۔ اور ایک حقیر گزارہ پر اسے جزیرہ ایلبا (Elba) میں عزلت گزیں رہنے کی اجازت دی گئی سنہ ۱۸۱۴ء

نپولین کی واپسی

اب نپولین کی سیاسی حیات کا خاتمہ سمجھ لیا گیا اور یورپ کے مدبرین وائنا (Vienna) میں جمع ہوئے کہ نپولین اور فرانسیسی انقلاب کی بدولت جو افراتفری پھیل گئی تھی اسکو سلجھائیں لیکن ادھر مدبرین اس مشکل کام میں مصروف ہی تھے اور سوچ رہے تھے کہ یورپ کی تنظیم
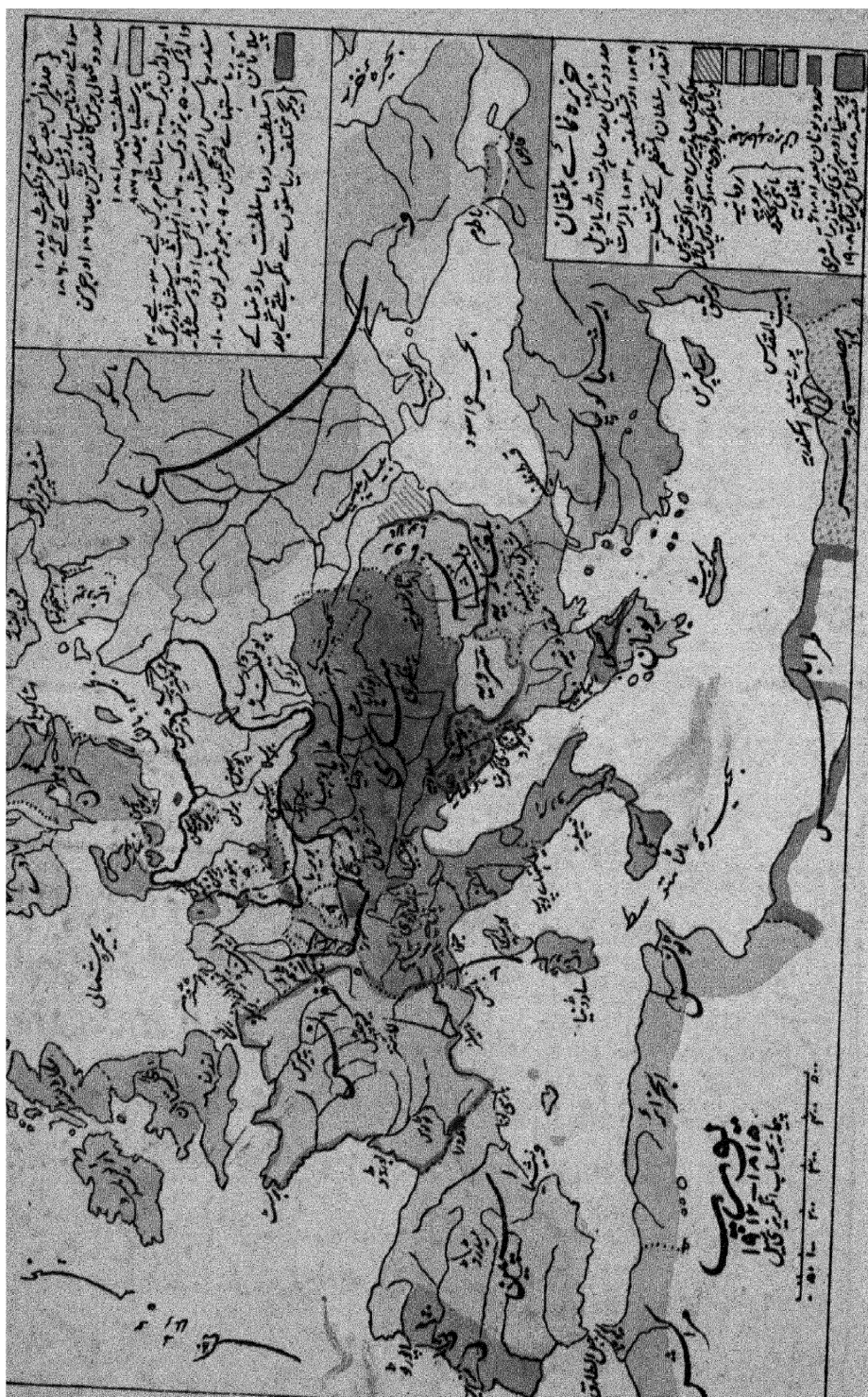
جدید بغیر ایک نئی جنگ کے طے نہیں ہو سکتی کہ یکا یک یہ خبر پہنچی کہ نپولین
ایلبا (Elba) سے نکل کر فرانس میں آگیا ہے اور تمام رعایا اس کے خیر مقدم پر کمربستہ
ہو گئی ہے اور وہ پھر ایک بار یورپ کی افواج کا مقابلہ کرنیکے لئے تیار ہے۔

لوئی ہیژدہم کی حماقت

یہ واقعہ محض نئے بادشاہ لوئی ہیژدہم (Louis XVIII) کی
حماقت سے ہوا۔ لوئی ہیژدہم لوئی شانزدہم کا بھائی تھا۔ اس
نے جو حکومت قائم کی اس کی غلطیوں سے فرانس کے لوگ برافروختہ ہو گئے۔
ملک کی جنگی سطوت خاک میں مل گئی تھی اس کے حدود کم کر دئے گئے تھے
اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نئی حکومت انقلاب کے قائم کردہ بندوبست
اراضیات میں دست اندازی کرنا چاہتی تھی جس کا احترام خود نپولین بھی
کرتا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ کلیسہ کی جائدادیں ضبط ہو کر چھوٹے چھوٹے قطعات
میں منقسم کر دی گئی تھیں اب یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس اراضی پر کلیسہ و نواب دوبارہ
پھر دعوے کرینگے۔ جائداد کے ایسے انقلاب کے اندیشے نے فرانس کی صلح جو طبیعتوں
کو بھی مجبور کر دیا کہ پھر نپولین کو واپس آنیکی دعوت دیں۔

واٹرلو

یورپ میں اس کی باقی ماندہ حیات سیاسی کا خلاصہ چند سطور میں بیان
کیا جا سکتا ہے اس نے بہت سے وسیع مطالبات کو منظور کر لیا
اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے سابقہ مستبدانہ شہنشاہی پسند
و عادی کو اس نے ترک کر دیا ہے لیکن جبتک فرانس و انگلستان میں جنگ
کا تصفیہ نہو جائے اس وقت تک دستوری مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں
ہو سکتی تھی وائنا (Vienna) کے مدبرین نے نپولین کو قانون کی حفاظت سے
خارج کر دیا تھا اور ہر سلطنت نے فرانس کو شکست دینے کے لئے ایک ایک
زبردست روئیں تن فوج تیار کرنے کا اقرار کیا۔ برطانوی پروشی تقریباً تیار
تھے اس وجہ سے انھیں کے مقابلے پر نپولین پہلے آیا۔ اوسے امید تھی کہ دونوں
فوجوں کے درمیان آکر ہر ایک فوج کو علیحدہ علیحدہ شکست دیدیگا اور
پھر ان کو صلح کرنے پر مجبور کرے گا لیکن کاتر برا (Quatrebrass) اور لینی (Ligny)
کی دو لڑائیاں نیم فتح کرنے کے بعد میدان واٹرلو (Waterloo) میں اس کو برطانیہ اور

اس کے رفقا سے مقابلہ کرنا پڑا اُس نے براہ راست ان پر خوفناک حملہ کیا مگر انھیں ہٹا نہ سکا سہ پہر میں پروشی فوج نے آکر اس کے یمین پر حملہ شروع کر دیا اور ولنگٹن کی فوج گو کم ہو گئی تھی مگر اب بھی مقابلہ پر جمی رہی برطانوی اور پروشی افواج کے متحدہ حملوں نے فرانسیسیوں کو پراگندہ کر دیا اور ان کا شہنشاہ فرار ہو گیا وہ پیرس پہنچا اور وہاں مقابلہ کرنے کے لئے ازسرنو انتظام کرنے لگا۔ مگر سب بے سود ہوا کیونکہ سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا آخرکار وہ مستعفی ہو گیا اور برطانیہ کے رحم و کرم پر اپنے کو چھوڑ دیا اگر وہ پراشیا والوں کے ہاتھ میں پڑ جاتا تو شاید اس کا انجام اور بھی برا ہوتا برطانیہ نے اس کو قید کر کے جزیرہ سینٹ ہلینا (St. Helena) کو روانہ کر دیا جہاں وہ چند سال رہ کر ۱۸۲۱ء میں فوت ہو گیا۔

حوالۂ کتب متعلقہ باب ہذا

"سوانح نپولین" مصنفہ جے۔ ایچ روز (J. H. Rose) لین فری (Lanfrey) تھائرس Thiers فائف (Fyffe) اور ایلی سن (Allson) کی مصنفہ "تواریخ مفید ہیں" "سوانح اسٹین (Stein)" مصنفہ سیلی (Seely) اور "سوانح بلوخر" (Bluchor) مصنفہ ہینڈرسن (Henderson) کارآمد ہیں۔

باب شانزدہم

برطانیۂ عظمیٰ اٹھارھویں صدی میں (سنہ ۱۷۱۴ء تا ۱۸۱۵ء)

اٹھارھویں صدی کے خصوصیات

جس صدی کا خاکہ ہم اس باب میں پیش کرینگے اس کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اسی سو سال کے اندر برطانیہ کی حکومت میں وہ خصوصیات پیدا ہوگئے جنکی وجہ سے وہ دوسرے ممالک کی حکومتوں سے فرق و امتیاز رکھتی ہے اور اسی زمانے میں اس کی نوآبادیاتی۔ اور ہندوستانی سلطنت کی بنیاد مستحکم کی گئی اور اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی ہوئی اس پر تمام دنیا کی نظر پڑنے لگی۔ مختصر یہ کہ انگلستان کی تاریخ کی حد تک اٹھارھویں صدی کا سب سے بڑا نتیجہ "کابینی" طرز حکومت کا قیام اور سلطنت نوآبادیات کا استحکام تھا۔

نظام کابینی

کابینی طرز حکومت کا علم کسی کو پہلے سے نہ تھا۔ نہ کسی فرضی سلطنت (Utopia) میں اس کا وجود بتایا گیا تھا نہ کسی پیغمبر نے اس کی پیشین گوئی کی تھی۔ یہ بات محض برطانوی سیاسیوں کی عملی قابلیت کا نتیجہ تھی جنھوں نے ضروریات و مواقع کے لحاظ سے بہترین مداوا تجویز کیا۔ سنہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب نے شاہی حکومت کے بجائے پارلیمنٹ کو سیاسیات کا مرکز و منبع بنادیا تھا لیکن ابتداءً پارلیمنٹ کی حقیقی حکومت نہیں ہوتی تھی ولیم سوم کو ایک مدبر اور سپاہی کی حیثیت سے جو اختیارات حاصل تھے وہ کسی بڑی مجلس کو دینا نہیں چاہتا تھا اور جب تک

وہ زندہ رہا پارلیمنٹ کو ایک آقا کی طرح نہیں بلکہ ایک رفیق کی طرح سمجھتا رہا جس کو ہموار و موافق رکھنا ضرور تھا۔ ملکہ این (Anne) کی تخت نشینی کے بعد سے پارلیمنٹ کا اقتدار بہت بڑھ گیا ملکہ کا اثر اتنا کم اور نا قابل لحاظ نہیں تھا جتنا کہ اکثر بیان کیا جاتا ہے لیکن قوم کا مستقبل سنبھالنے کی نہ اُس میں قوت تھی نہ اُس کو اس کی خواہش ہی تھی اس کے عہد حکومت میں روز بروز یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ وزراء کے اقتدار کا انحصار شاہی مرضی سے زیادہ پارلیمنٹ پر تھا برطانوی حکمت عملی کا وہ انقلاب جس کی بدولت ہسپانوی وراثت کی جنگ یکایک ختم ہو گئی اور مبارزین کی صف سے برطانیہ علیحدہ ہو گیا ایک عام انتخاب کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے دارالعوام میں ٹوری (Tory) فرقہ کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی ملک کی پالیسی (طرز عمل) پر فرقوں کی فتح و شکست کا اتنا اثر نہیں ہوا لیکن اب بھی کوئی قوی دل و دماغ کا بادشاہ ہوتا تو خود حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتا۔

ہنوور ی خاندان (Honover) کا آئینی اثر

ملکہ این کی وفات پر بھی کوئی زور دار بادشاہ نہیں ہوا بلکہ ہنوور (Honover) کے جارج (George) حکمراں ہوئے انکی حکومت اس وجہ سے کمزور تھی کہ برطانیہ کے پیچیدہ سیاسی نظام کو سمجھنے سے وہ قاصر تھے اور انکی اصل توجہ ہنوور (Honover) کی انتخابی ولایت کی طرف رہی وہ لوگ تھے بھی معمولی قابلیت کے اور چونکہ جارج اول (George I) جارج دوم (George II) انگریزی زبان سے ناواقف تھے اس وجہ سے کونسل کے اجلاسوں میں انکی صدارت کچھ کارآمد نہ تھی ان وجوہ سے گویا تاجدار صرف فرمانروائی کر سکتا تھا مگر انتظام نہیں کر سکتا تھا لیکن حکمرانی کی سخت ضرورت تھی۔ پھر آخر اس خدمت کو کون انجام دیتا خود رعایا تو ایسا کر نہیں سکتی تھی بلکہ اب بھی ایسا تو ممکن نہیں اور اٹھارھویں

بادشاہ کے بجائے آخر کسکی حکومت ہوتی

صدی میں تو عام جلسہ اور سیاسی اختیارات بھی نہ تھے کہ عوام کے خیالات کا اظہار ہو سکتا پوری پارلیمنٹ کو بھی حکومت کا انتظام کرنا مشکل تھا کثرت اراکین کی وجہ سے وہ ایسے فرائض انجام نہیں دے سکتی تھی جیسے کہ روما کی سینیٹ کرتی تھی اور پھر روما کی سینیٹ بھی کام نہ چلا سکی جب سلطنت روما بڑھنے لگی۔ مگر ملک کو ایسی حکومت کی سخت

ضرورت تھی جو وقت پر فوری اور فیصلہ کن کارروائی کر سکے اور اس حکومت کو مختصر مگر باضابطہ ہونیکی بھی سخت ضرورت تھی اور یہ بھی ضرور تھا کہ پارلیمنٹ کی اکثریت اس حکومت کی طرفدار ہو کیونکہ جب پارلیمنٹ کی اکثریت مخالف ہونیکی صورت میں شاہی کیلئے خطرناک تھی تو وہ یقیناً اس حکومت کیلئے بھی خطرناک ثابت ہوتی جو شاہی کی جگہ پر ہونے والی تھی نظام کابینہ نے جس کا صدر وزیر اعظم ہوتا تھا اس مسئلہ کو قابل اطمینان طریقہ پر حل کر دیا۔

نظام کابینی

مکمل ہونیکے بعد کابینی نظام کی حسب ذیل خصوصیات ہوتی ہیں جن اراکین کے ہاتھ میں سلطنت کے خاص خاص محکمہ جات ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اس فرقہ کے ہوتے ہیں جو دارالعوام میں اکثریت رکھتا ہے (مگر یہ حکومتیں بھی ہوتی ہیں مگر اس کو کلیہ متذکرہ کا استثنا نہیں کہا جا سکتا) ایک معنی کرکے ہر وزیر جملہ محکمہ جات کے عمل کا ذمہ دار رہتا ہے کل محکمۂ جات کی ایک عام تائید اس پر لازمی ہے کوئی وزیر ایک محکمہ کے انتظام کو نامناسب سمجھتا ہے تو وہ ایک حد سے زیادہ اعتراضات نہیں کر سکتا اور اپنے مفوضہ فرائض کی انجام دہی

کابینہ کی یک جہتی

میں مصروف ہو جانا پڑتا ہے اس کے لئے وہ ہی طریقے ہیں یا تو سکوت اختیار کر لے یا مستعفی ہو جائے نظام کابینہ کی ایک جہتی کا یہی اصول ہے کابینہ گویا وزراء کی ایک مجلس (کمیٹی) ہوتی ہے جو زیر نگرانی وزیر اعظم کام کرتی ہے ابھی تھوڑے دنوں پہلے تک اس عہدہ (وزیر اعظم)

وزیر اعظم

کو سرکاری طور سے منظور نہیں کیا گیا تھا اور بہت دنوں تک اس لقب کو ناپسند کیا جاتا تھا اس وجہ سے کہ اس لفظ کا استعمال ابتداءً فرانس سے شروع ہوا تھا اور اس کے مفہوم میں ایسے شخصی اختیارات پنہاں تھے جو انگلستان کے پارلیمنٹی خیالات کے خلاف تھے مگر صورت حال کے لحاظ سے وزارت عظمی کی خدمت کا ہونا ضروری تھا خواہ اس کا نام کچھ ہی رکھا جائے جتنے جتنے بادشاہ کے شخصی اختیارات سلب ہوتے گئے وزیر اعظم کی حکومت بڑھتی گئی لیکن اس کی حکومت کا انحصار پارلیمنٹ کی تائید پر ہوتا تھا اور خود اس کی ذاتی قابلیت و طبیعت کی مناسبت سے یہ اقتدار گھٹتا بڑھتا تھا

لیکن اس کا اثر ہمیشہ زیادہ رہا گویا نظام کابینہ کا یہی سنگ بنیاد تھا وہی کل کابینہ کو ایک رشتے میں منسلک رکھتا ہے اور اس کی حکمت عملی کو یکسانیت پر قائم رکھتا ہے اور علیحدہ علیحدہ محکمہ واری حکومت قائم ہونے سے بچاتا ہے۔

نظام کابینہ کا ارتقا

اس نظام حکومت نے بتدریج ترقی کی ہے کوئی ایک مدبر اس کا بانی نہیں ہے لیکن والپول (Walpole) سے زیادہ کسی نے اس کی ترتیب و انضباط میں کام نہیں کیا (والپول (Walpole) جارج اول (George I) کا وزیر تھا اور برائے نام جارج دوم کا بھی) اس نے کوئی قانون یا صریح اعلان اس کے متعلق نہیں کیا اسی کے طویل عہد حکومت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظام حکومت کی باضابطہ پیروی کی گئی اور ایک مجلس موتمر کے ذریعہ سے باثر حکومت قائم کرنے کا مسئلہ طے ہوا اس کے لیئے فرقوں کی خاص خاص عضویت قائم کرنا ضروری تھا یعنی جماعتوں کی تخصیص و تنظیم لازمی تھی اور اس معاملہ میں بھی والپول نے بہت کچھ کیا اور بعض اوقات اپنے طرفداروں کو برسر اقتدار رکھنے کے لئے اس نے ناجائز تدابیر اختیار کئے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔

پارلیمنٹ کی صورت

انگلستان کی پارلیمنٹی حکومت کلیۃً نمونہ تھا اس کو یہ کہنا کہ رعایائے انگلستان کی نیابت کرتی تھی ایک لغو سی بات ہے گو انتخاب کے حلقے مختلف قسم کے ہوتے تھے لیکن پارلیمنٹ کو تمام رعایا کی نیابت کا فخر کسیطرح حاصل نہ تھا۔ اضلاع میں حق رائے وہی شہروں کے مقابلہ میں زیادہ عام پسند تھا کیونکہ یہ حق شہروں کی ایک محدود اور مختصر سی رشوت خوار جماعت کے اختیار میں رہتا تھا۔ معاشرتی طبقوں میں انگلستان کے زمیندار شرفا کا طبقہ بلاشبہ پارلیمنٹ کے ذریعے سے حکومت کرتا تھا وھگ (Whig) اور ٹوری (Tory) فرقوں میں بعض سیاسی اصول میں اختلاف تھا مگر جوں جوں یہ صدی گزرتی گئی یہ اختلافات مٹتے گئے ہر حال میں یہ دونوں فرقے بھی انگلستان کے زمینداروں کے ماتحت تھے۔

جارج سوم کی کوشش حقیقی بادشاہ بننے کیلئے

اس نظام حکومت (کابینہ) کو الٹ دینے کی بعض

کو شکستیں بھی ہوئیں چنانچہ جارج سوم کو ایسی ہی تعلیم دی گئی تھی کہ خواہ کچھ ہو جائے ۔ اسے "ایک بادشاہ کی طرح حکومت کرنا چاہیئے" وہ بولنگ بروک (Bolingbroke) کے عقائد سے متاثر ہو چکا تھا جس نے اپنی کتاب وطن پرست بادشاہ" (Patriot King) میں اسکی تعلیم دی تھی کہ فرمانروائی کے ساتھ ساتھ بادشاہ کو حقیقی حکومت بھی کرنا چاہیئے اس وجہ سے ۱۷۶۰ء میں جب وہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے وہی طرز عمل اختیار کیا جو ایک صدی قبل لوئی (Louis XIV) چہاردہم شاہ فرانس نے کیا تھا اور آپ اپنا وزیر اعظم بنا رہا اس نے وزرا کو ان کے مفوضہ محکمہ جات تک محدود رکھا اور پارلیمنٹ کو خود اپنا طرفدار بنا لینا چاہا اس نے وہگ (Whig) فرقہ کی حکومت توڑدی جو ۱۷۱۴ء سے قائم تھی انگلستان میں بھی اس کی سخت مخالفت شروع ہو گئی اور امریکن جنگ کے شروع ہو جانے کا بھی وہی ذمہ دار ہے لیکن اس جنگ میں انگلستان کی ناکامی کے ساتھ بادشاہ کے منصوبے بھی بیکار ہو گئے اور پٹ (Pitt خرد) کی ماتحتی میں پھر سابقہ نظام حکومت قائم ہو گیا لیکن ایسے پیرایہ میں کہ بادشاہ کو زیادہ ناگوار نہ ہو۔

پارلیمنٹ کی اصلاح کی تجاویز

پارلیمنٹ کے اصلاح کے تجاویز بھی پیش ہوئے تاکہ قدیم انتخابی حلقوں کی نمایاں بے ربطی و ناموزونیت کو مٹا کر پارلیمنٹ کو حقیقی طور پر رعایا کی نیابتی مجلس بنا دیا جائے بڑے بڑے لوگوں نے بھی نیم گرم تائید کی چیتھم (Chatham) اور پٹ (Pitt) دونوں کچھ دنوں تک اس خیال کی تائید کرتے رہے یارک شایر (Yorkshire) نے اس کی سرگرم تائید کی لیکن انقلاب فرانس کے رونما ہوتے ہی اس تحریک کی کامیابی کی امید جاتی رہی کیونکہ انقلاب فرانس نے اصلاحی خیالات قبول کرنے کا ایک خوفناک انجام

انقلاب فرانس کا اثر

انگریزوں کے سامنے پیش کر دیا ہر قسم کے تغیر کی مخالفت کے لئے خوفناک حکومت بلا کسی معقول وجہ کے ایک زبردست دلیل بن گیا بعضوں کی رائے میں فرانسیسی انقلاب اور نپولین کے مقابلہ میں جو لڑائیاں لڑی گئیں وہ محض سابقہ نظام حکومت قائم رکھنے کے لئے تھیں اس لئے جنگ واٹرلو (Waterloo) تک ملک اسی غیر اصلاح شدہ پارلیمنٹ کا پابند رہا حتےٰ کہ جنگ مذکور

نے خوف و نفرت کے جذبہ کو مٹا دیا۔

اٹھارھویں صدی کی عظمت

بعض مصنفین اٹھارھویں صدی کو حقیر اور ذلیل کہتے تھے اور اس کو دیوالیہ صدی کہتے تھے۔ کیونکہ اس صدی کا کوئی خاص عقیدہ نہ تھا اور اس کی اہمیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ اس نے انقلاب کا راستہ صاف کر دیا۔ لیکن یہ ایک لغو سی بات ہے۔ اٹھارھویں صدی اپنی کارگزاری کی ایک معقول فہرست پیش کر سکتی ہے اس صدی نے عظمت شجاعت اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ علم ادب (Swift) اور پوپ (Pope) سے لیکر آخر میں ورڈزورتھ (Wordsworth) اسکاٹ (Scott) کالرج (Coleridge) اور شیلی (Shelly) بائرن (Byron) تک عظیم الشان شعرا و مصنفین کا سلسلہ قائم رہا۔ یہ لوگ ایسے ہوئے ہیں کہ ہر عشیرہ (دسویں سال) کے بعد اس کی قدر و منزلت بڑھتی گئی اور اب ان کے چہرے آفتاب مقبولیت کی شعاعوں سے جگمگا رہے ہیں۔ نقاشی مصوری میں بھی یہ صدی مشہور رہتی گینزبرو (Gainsborough) ہوگارتھ (Hogarth) سر جوشوا رینلڈز (Sir Joshua) (Reynolds) اسی عہد میں ہوئے ہیں اور فلسفہ حکمت میں ہیوم (Hume) اور پرنسلی (Princeley) ایسے نامور گزرے ہیں۔ اوّل الذکر ۱۷۷۶ء میں اور آخر الذکر ۱۸۰۴ء میں فوت ہوا۔

تجارتی انقلاب

لیکن وہ تغیرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اس صدی کے آخر میں وقوع پذیر ہوئے اور جن کو صرفتی انقلاب کے نام سے کہا جاتا ہے تقریباً ۱۷۶۴ء سے اون اور کپاس کی صنعت میں کلوں کا استعمال شروع ہوا شمال کے شہر ترقی کرنے لگے اور جنوب کے لوگ شمال میں منتقل و آباد ہونے لگے۔ سڑکیں اور نہریں تیار کرائی گئیں جن کی وجہ سے تجارت کو فروغ ہوا۔ انگلستان کی بہت سی شاملاتی زمین محصور کر لی گئی اور ان محصورہ زمینوں کی پیداوار بہت بڑھ گئی گو بعض اوقات اس سے عوام کا نقصان ہوا انگلستان کی حالت ہی بدل گئی دیہاتوں میں جو اب تک رسم و رواج کے پابند تھے نئے طریقوں نے ایک ہل چل مچادی مگر یہ نئے طریقے صرف انگلستان ہی نے نہیں اختیار کئے تھے لیکن یورپ کے دوسرے

ممالک کے مقابلے میں اس نے سب سے پہلے انہیں اختیار کیا تھا اس وجہ سے کہ کلوں کی ایجاد و اختراع زیادہ تر خود انگلستان میں ہوئی اور جغرافی حالات کی وجہ سے انگلستان کو کسی چڑھائی کا خوف بھی نہ تھا دولت خوب بڑھی ہوئی تھی اور لوگوں نے اس وقت یہ نہیں دیکھا کہ دیہاتوں میں افلاس و تنگدستی کے تکالیف و مصائب اتنے نہیں تھے جس قدر کہ اب تجارتی شہروں میں ہو رہے تھے انگلستان کے اس صدی کے صنعتی عہد میں بعض خرابیاں ایسی تھیں کہ فرانس میں انقلاب کے پہلے بھی نہیں تھیں۔

جان وزلی John Wesley کی تحریک

اس صدی میں ایک بڑی نتیجہ خیز مذہبی تحریک بھی ہوئی۔ جان وزلی John Wesley (۱۷۰۳ء تا ۱۷۹۱ء) نے انجیلی عقائد کو حیات تازہ بخشی اور اپنی پرجوش تبلیغ و تنظیم کی قابلیت کے زور سے اس نے اس تحریک کا اثر بہت وسیع اور پائدار کر دیا اس نئی تحریک نے وسلین میتھاڈسٹ (Wesleyan Methodist) گرجے قائم کر دیئے اور ساتھ ہی اس کے انگلیسی مذہب میں ایک نئی روح پھونک دی ہر طبقہ میں اس تحریک کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ گو شروع میں شہروں کے اہل حرفہ اور دیہاتوں کے مزدور ہی زیادہ تر اس کے پیرو ہوئے۔

انگلستان میں فرانس کی طرح انقلاب کیوں نہیں ہوا

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ انقلاب بجائے انگلستان میں ہونے کے فرانس میں کیوں شروع ہوا اور جب فرانس میں پھیلا تو پھر انگلستان نے بجائے ہمدردی کرنے کے کیوں سخت مخالفت کی۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان کی حالت ایسی بری نہ تھی جیسی کہ فرانس کی۔ گو اس میں شبہ نہیں کہ فرانس کے کسانوں کو اپنی کاشت کردہ زمین کا مالک دیکھ کر انگلستان کے کسانوں کو رشک ہوتا تھا۔

استبدادیت کی عدم موجودگی

انگلستان کی سیاسیات و طرز معاشرت کی حسب ذیل خصوصیات رد انقلاب کا باعث کہی جا سکتی ہیں۔ (۱) انگلستان کے نظام سیاسی میں مطلق العنانی و استبدادیت کا وجود نہ تھا۔ انتظام مملکت میں آبادی کا بیشتر حصہ شریک رہتا تھا مقامی

حکومتیں زیادہ تر مفصل کے شرفا کے ہاتھوں میں تھیں عمومی حکومت تو نہیں تھی لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت تھی ان کی تعداد بہت بڑی تھی اور وہ لوگ مالدار بھی تھے۔ قوی بھی تھے۔ اور قابل بھی تھے اور فرانس کی ساقط الاعتبار شاہی سے زیادہ ان میں تاب مقاومت تھی۔

خیالات میں بھی فرق تھا

فرانسیسی انقلاب کا اصلی سیاسی سبب فرانسیسی شاہی کا استبداد تھا (۲) انگلستان میں انقلاب کی طلب بھی نہیں تھی۔ فرانس کی علمی تحریک نے جسطرح انقلاب کا راستہ صاف کیا اس کا ذکر گزشتہ باب میں ہوچکا ہے۔ انگلستان کو بھی اس تحریک نے چھولیا تھا مگر صرف چھونے کے حد تک ہی۔ وہ اشتیاق انگیز امیدیں وہ عالمگیر خیالات کہ سب انسان مساوی ہیں اور وہ خوفناک دیوانگی جو فرانس میں پھیلی ہوئی تھی اس سے انگلستان کے صرف چند اشخاص واقف تھے ویسلین تحریک کی توسیع اشاعت سے وہ طبقہ انقلاب کے اثرات سے محفوظ رہا جو فرانس میں سب سے زیادہ انقلاب پسند ثابت ہوا۔

(۳)

خارجی اور شہنشاہی تاریخ

توسیع سلطنت کے بیان کے سلسلے میں انگلستان کے خارجی تعلقات کی تاریخ بھی آسانی سے بیان ہوسکے گی۔ یہ بھی اس صدی کی خصوصیت ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک سلسلے میں بیان ہوسکتی ہیں اس وجہ سے کہ اس زمانے کے مدبرین کو بمقابلہ دیگر امور کے ہندوستان اور نوآبادیات کے مسئلے سے زیادہ دلچسپی رہی اور اس صدی میں کوئی لڑائی ایسی نہیں ہوئی جس میں اصلی غرض یا کم از کم سب سے اہم ثانوی غرض شہنشاہی کی توسیع نہ رہی ہو ہندوستان اور امریکہ دونوں ملکوں میں فرانس کا اثر و اقتدار بہت تھا بلکہ بعض لحاظ سے انگلستان سے بھی زیادہ تھا اور انہیں دور دراز مقبوضات کی رقابت کی وجہ سے جتنی لڑائیاں اس صدی میں ہوئیں سب میں انگلستان فرانس کے خلاف لڑا۔

والپول (Walpole) اور فرانس

آغاز صدی میں امن و سکون رہا جارج اول اور اس کے وزرا کو ملکی مشکلات سے فرصت نہ تھی اسٹوارٹ (Stuart) خاندان کے حملوں سے تخت کو بچاتا تھا اور امن داشتی اور آسان قوانین کے ذریعہ سے ملک کو منو دری حکومت سے مانوس کرتا تھا والپول (Walpole) بھی جو پہلے دو جارجوں (Georges) کے عہد میں ایک عرصہ تک انگلستان پر حکومت کرتا رہا نہایت صلح جو مدبر تھا اور شہنشاہیت کی چمک دمک سے وہ متاثر نہیں ہوا تھا ۱۷۲۱ء میں وہ وزیر اعظم ہوا اور ۱۷۴۲ء میں وہ اس خدمت سے معزول ہوا لوئی پانزدہم کے وزیر اعظم فلری سے

اس نے گہرے تعلقات قائم کر لئے تھے اور فرانس سے ایسا رشتہ قایم کرنا چاہتا تھا جس کو اب اتحاد دلی (Entente cordiale) کہتے ہیں پارلیمنٹی نظام کے نشو و نما کے لئے اس نے جو کچھ کیا ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ مالیات میں وہ بہت ماہر تھا اور اس کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس نے برطانیہ کے معاملات کو ایک قابل اطمینان کاروباری اصول پر قائم کیا سرگرمی اور تصوریت سے وہ خود بے بہرہ تھا اور دوسروں میں بھی ان صفات کو وہ پسند نہیں کرتا تھا بہت سی باتیں انگلستان میں ایسی تھیں جو بھلے یا بُرے وجوہ سے والپول کے موافق نہ تھیں خصوصاً اس کی خارجی حکمت عملی کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ انگلستان کے شایان شان نہیں ہے ہم لوگوں انگریزوں کو صلح یوٹریکٹ (Utrecht) میں ہسپانوی نوآبادیات

اسپین سے جنگ

سے تجارت کرنے کا جو محدود حق دیا گیا تھا اس کی وجہ سے ۱۷۳۹ء میں ہسپانیہ و انگلستان میں جنگ ہوگئی والپول کے خیال میں بنائے مخاصمت بہت معمولی تھی اور اس کی وجہ سے کسی انگریز کا خون بہانا وہ غیر ضروری سمجھتا تھا لیکن حکام کا فوجی جذبہ مشتعل ہو چکا تھا۔ اور والپول کو مجبوراً ہسپانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دینا پڑا۔

آسٹروی وراثت کی جنگ

ابھی یہ جنگ اچھی طرح شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ آسٹروی وراثت کا جھگڑا پیش آیا اب بھی والپول ساکت رہا اور آخر ۱۷۴۲ء میں معزول کر دیا گیا اور جیسا کہ ہم بتلا چکے ہیں برطانیہ بھی اس جنگ میں فرانس کا مخالف اور آسٹریا کا طرفدار بن کر شریک ہو گیا اس جنگ میں برطانیہ کی حکمت عملی یا فوجی کارگزاری کچھ قابل تعریف نہیں رہی اس لڑائی میں جبکہ ماریا تھیریزا اپنی زیست و بقا کے لئے فریڈرک اعظم سے مصروف بہ پیکار تھی ہم نے اس کی کچھ مدد نہ کی ڈیٹنگن (Dettingen) کی فتح سے مقابلہ میں فونٹنوا (Fontenoy) کی شکست تھی (۱۷۴۵ء) فونٹنوا (Fontenoy) کی شکست نے

فونٹنوا (Fontenoy)

جارج دوم کے سر کا تاج ہلا دیا تھا خاندان اسٹوارٹ کے طرفداروں کا ملک میں اب بھی زور تھا بادشاہوں کے موروثی حق خداداد کا وہ اب بھی دعویٰ کرتے تھے اور ۱۶۸۸ء کے انقلاب اور اس کی وجہ سے جو ہنووری تاجدار تخت نشین ہوئے تھے دونوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جیمز دوم کا

طرفداران جیمز (Jacobites) کی ناکامی

پوتا چارلس ایڈورڈ (Charles Edward) جو تاریخ و افسانہ میں "نوجوان بہانہ ساز مدعی" (Young Pretender) کے نام سے مشہور ہے پہاڑیوں کی ایک عمدہ فوج آراستہ کر کے ایڈنبرگ (Edinburgh) پر قبضہ کر لیا اور لنڈن کا رخ کیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ملک مقاومت کی تاب

نہ لاسکے گا چنانچہ وہ بغیر کسی مزاحمت کے ڈربی (Derby) تک پہنچ گیا۔ لیکن یہاں پر اس کی مہم کی ناکامی ظاہر ہوگئی ہنوورئی شاہی کے طرفداروں کو دھوکہ ہو گیا تھا اور اب مقابلے کے لئے وہ لوگ جمع ہوئے اور اس کو سرعت کے ساتھ اسکاٹلینڈ واپس ہونا پڑا جہاں ۱۷۴۶ء کی جنگ کلوڈن (Culloden) میں اس کا قلع قمع ہو گیا۔ اس فوج کشی سے اسٹوارٹ (Stuart) خاندان کے حامیوں کی قوت کا نہیں بلکہ برطانوی حکومت کی عدم تیاری کا اظہار ہوتا ہے۔

آسٹروی وراثت کی جنگ

آسٹروی وراثت کی جنگ جیسا کہ ہم بتلا چکے ہیں ایک ایسی خوفناک جنگ عظیم کا دیباچہ تھی جس میں سلطنت جرمنی اور سلطنت برطانیہ کا وجود معرض خطر میں پڑ گیا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز تضاد ہے کہ ۱۹۱۵ء میں جب کہ میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں وہی دونوں سلطنتیں جنھوں نے ایک دوسرے کے اقتدار و عظمت کو بڑھانے کے لئے ایک دوسرے کو مدد دی تھی اب ایک ایسی جنگ میں مبتلا ہیں جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ برطانیہ عظمیٰ کو نہ تو پر اشیا سے کوئی انس تھا اور نہ ماریا تھیریزا (Maria Theresa) سے کوئی بغض۔ سلطنت نوآبادیات کے باعث فرانس سے جو رقابت ہوگئی تھی وہی اس کے اس طرز عمل اور شرکت جنگ کا باعث ہوئی۔ یورپ میں جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہندوستان و کینیڈا میں لڑائی شروع ہوگئی تھی۔

چیتھم کی خصلت و مقاصد

انگلستان کی فوجی تاریخ میں جو سب سے زیادہ کامیاب لڑائی ہے اس کی ابتدا اچھی نہیں ہوی لڑائیوں میں ہندوستان امریکہ اور جرمنی میں ہر جگہ شکست حاصل ہوئی حتیٰ کہ سمندر پر بھی۔ حالانکہ برطانوی بیڑا ناقابل شکست سمجھا جاتا تھا لیکن ۱۷۵۶ء میں پٹ (Pitt) جو بعد میں آرل آف چیتھم (Chatham) کے نام سے مشہور ہوا اور جس کو ہم آئندہ اسی نام سے موسوم کریں گے) اور نیوکاسل (Newcastle) کی متفقہ ماتحتی میں ایک مضبوط حکومت قائم ہوگئی نیوکاسل کا تعلق زیادہ تر ملکی انتظام سے تھا اور چیتھم جنگ کے انتظام میں سرگرم رہا مدبرین انگلستان میں اس کی ہستی سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے اور چونکہ اپنے زمانے کے لوگوں سے وہ بالکل الگ تھا

اس وجہ سے اور بھی ہماری دلچسپی کا باعث ہے اس کی صحبت کے مدبرین جوش و سرگرمی ناپسند کرتے تھے اور مادی فوائد پر زیادہ نظر رکھتے تھے اور رمالی تغلب و تصرف پر چشم پوشی کر جاتے تھے غرض کہ اس کے ہمعصر رسم درواج کے مطابق اسی راستہ پر گامزن تھے جو قدیم سے چلا آرہا تھا۔ پٹ سب سے الگ تھا وہ بے لوث تھا اور خیالات وعمل میں جدت پسند ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ کسی دوسرے کا شریک ہو کر کام کرنا مشکل تھا اور خوش تقریر ایسا تھا کہ شاید برطانوی پارلیمنٹ میں کوئی اس کا سا ہوا ہو۔ انصاف و آزادی کا صحیح معنوں میں دلدادہ تھا اور اس کے ذہن میں مشرق و مغرب میں سلطنت برطانیہ کا نقشہ شمارہ گیا تھا خود وہ جوشیلا آدمی تھا اور اس میں عجیب صفت یہ تھی کہ دوسروں کو بھی سرگرم عمل کر دیتا تھا کہا جاتا ہے کہ جو شخص اس کے حجرہ میں جاتا تھا وہاں سے زیادہ ہمت لے کر نکلتا تھا۔ لیکن اس کی قوت صرف الفاظ و خیالات تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں عمل کرنے کا بھی مادہ تھا فتح و شادکامی کا راستہ اس نے دیکھ لیا تھا اور قوم کو اسی راہ پر لگانا چاہتا تھا یورپ میں فریڈرک اعظم والی پرا شیا کا ساتھ دے کر اس نے فرانس کو مشغول و مصروف رکھنے کے لئے کافی سامان کر دیا اور ادھر اپنے بیڑے کی مدد سے فرانس کی تازہ فوج کو سمندر پار کرنے سے روک کر امریکہ و ہندوستان میں اپنی فتح مستقل کر لی۔

جنگ ہفت سالہ کی فتوحات

اس تدبیر سے اس کے ملک کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی انگلستان کی فوج نے پروشی فوج کی رفاقت سے یورپ میں فرانس کو شکست دیدی اور ۱۷۵۹ء میں خلیج کوئبرن (Quiberon) کی لڑائی جیت کر برطانوی بیڑے نے سمندر پر اپنا قابو رکھ لیا ۱۷۵۷ء میں کلائیو نے پلاسی (Plassey) کی لڑائی فتح کرکے ہندوستان میں برطانیہ کی سلطنت قائم کر دی ۱۷۵۹ء میں بمقام کوبک (Quebec) وولف (Wolfe) نے فتح حاصل کرکے کینیڈا (Canada) پر ایک طرح سے تسلط قائم کر لیا کسی رہبر یا فوجکشی نے اس طرح دنیا کی تاریخ نہیں بدل دی ہے۔ جس دانائی و فراست سے یہ مہمات انجام کو پہنچائی گئیں اس کی ہم تعریف کرتے ہیں

اور ہم سمجھتے ہیں کہ تمدن و تہذیب کے لئے یہ انجام اچھا تھا لیکن فرانس کے خلاف جو نفرت کا جذبہ اس جنگ کی وجہ سے پھیل گیا تھا اور جس سے خود چیتھم بھی متاثر تھا اس پر ہم افسوس کرتے ہیں اور اس کو خلاف انصاف سمجھتے ہیں اگر فرانس سے وہ اتحاد جس کی بنیاد والپول (Walpole) نے ڈالی تھی قائم رکھا جاتا تو کیسی خرابیوں اور کتنے مصائب سے دونوں ملک بچ جاتے۔

جارج سوم کی تخت نشینی

جنگ ہفت سالہ ختم ہونے سے پہلے ہی جارج سوم کی تخت نشینی سے بہت کچھ تغیر ہوگیا تھا پٹ نے سیاست سے قطع تعلق کر لیا اور پٹ (Pitt) خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا اور جارج سوم حقیقی معنی میں "بادشاہ رہنے" کا تجربہ کرنے لگا اس کے منظور نظر مارکوئس آف بیوٹ (Marquis of Bute) کی ماتحتی میں نئی وزارت قائم ہوئی جس نے صلح پیرس (۱۷۶۳ء) کے ذریعے سے اس لڑائی کو ختم کر دیا معاصرین وقت کی رائے تھی کہ برطانیہ عظمیٰ نے اتنا فائدہ حاصل نہیں کیا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ کو فوائد عظیم حاصل ہوئے۔ صلح کے الفاظ سے اصل فوائد کا اندازہ نہیں ہوتا ہے جنگ کا اصلی نتیجہ یہ ہوا تھا کہ شمالی امریکہ میں برطانیہ کا اثر اور ہندوستان پر اس کا قابو ہو گیا گو دونوں ممالک میں آئندہ حیرت انگیز واقعات ہونے والے تھے۔

(۴)

۱۷۶۳ء میں برطانیہ کے قبضے میں ایک وسیع سلطنت نوآبادیات تھی گو اتنی وسیع نہیں جتنی کے پرتگال و ہسپانیہ کی ہم کو معلوم ہے کہ ان دونوں ممالک کو اپنی نوآبادیاتی سلطنت سے کچھ فائدہ نہیں ہوا اور نہ اس کا زیادہ حصہ ان کے قبضہ میں رہ سکا۔ یہی حال برطانوی سلطنت کا اس وجہ سے نہیں ہوا کہ برطانوی مدبرین نے نوآبادیات امریکہ کے طرز عمل سے بہت جلد سبق حاصل کر لیا۔

نوآبادیات امریکہ کی بغاوت ناگزیر نہیں کہی جا سکتی بشرطیکہ انسانی زندگی کے ہر واقعہ کو اس صفت سے متصف نہ سمجھا جائے۔ یہ ایسی صورت تھی کہ اگر دانشمندانہ تدبیر سے اس نازک موقع پر کام لیا جاتا تو تاریخ کی صورت بدل جاتی۔

کیا امریکہ سے جنگ لابدی تھی

اٹھارھویں صدی کا یہ عام نظریہ تھا کہ جب نو آبادیات میں قوت و توانائی آجاتی تھی تو وہ باغی ہو جاتی تھیں اور اگر ان میں اپنا انتظام سنبھالنے کی قابلیت ہوتی تھی تو وہ خود مختار بن بیٹھتی تھیں قدیم نظام نو آبادیات کے متعلق یہ نظریہ صحیح بھی ہے جب کہ نو آبادیات مادری ملک (Mother country) کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں اور اسی کے فوائد و اغراض کے لحاظ سے حکومت ہوتی تھی۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں برطانوی سلطنت کا تجربہ بتاتا ہے کہ "جنگ خود مختاری" میں جس قدر نو آبادی امریکہ میں برطانیہ کی تھی اس سے بجز کوئی آبادی بھی آج مادر ملک سے علیحدہ ہونے کی خواہش نہیں ظاہر کرتی ہے بلکہ سلطنت کے اتحاد و بقا کے لئے نہایت پر جوش اور مستحکم وفاشعاری اور جان و مال نثار کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کرتی ہے یہ سب آزادی کا معجزہ ہے اور اگر اٹھارھویں صدی کے مدبر اس حقیقت سے آگاہ ہوتے تو غالباً امریکہ میں بغاوت نہ ہوتی کیونکہ امریکہ والے عموماً وفاشعار تھے جنگ ہفت سالہ میں وہ شوق سے شریک ہوئے تھے اور برطانوی حکومت کی فاش غلطی کے باوجود ان میں سے اکثر جنگ کے اختتام تک وفادار رہے بعض برطانوی مدبر خصوصاً چیتھم اور برک (Burke) اعتماد اور آزادی دے کر اس کا اثر دیکھنا چاہتے تھے لیکن بادشاہ اور پارلیمنٹ دوسرے خیالات کے زیر اثر تھے۔

نو آبادیات امریکہ والوں کی شکایات

خود مختاری کے اعلان میں ریاست ہائے متحدۂ امریکہ نے یہ درج کیا تھا کہ "برطانیہ عظمیٰ کے موجودہ تاجدار کی سرگذشت مسلسل مضرت رسانی و دست درازی کی ایک داستان ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ان ممالک پر استبدادیت و جباریت قائم ہو جائے" اب اس زمانے میں یورپ یا امریکہ میں شاید ہی کوئی ایسا طالب علم تاریخ ہو جو اس بات کو تسلیم کرے جارج سوم معمولی لیاقت کا آدمی تھا لیکن فرض شناس اور باضمیر آدمی تھا۔ نو آبادیات کی بغاوت ظلم و دست درازی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس زمانے کے نو آبادیاتی نظام حکومت اور امریکہ والوں کے

روز افزوں قوت و حوصلہ کی کشمکش کا نتیجہ تھی در اصل دیکھا جائے تو اس نازک زمانے کے برطانوی مدبرین کی کوتاہ نظری کا یہ انجام تھا۔

امریکہ پر محصول عاید کرنے کا مسئلہ

جنگ ہفت سالہ میں برطانیہ نے جو مصارف کئے تھے اسی پر یہ جھگڑا شروع ہوا۔ یہ لڑائی در اصل امریکہ کی نوآبادیات کے فائدہ کے لئے لڑی گئی تھی۔ تاکہ ان کو فرانسیسیوں کی تخویف سے بچایا جائے اور اس روک کو توڑ دیا جائے جو فرانسیسی لوگ کینیڈا (Canada) اور لوئی زیانا (Louisiana) کے درمیان میں دریائے اوہیو (Ohio) اور مسی سی پی (Mississppi) کے کنارے قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ برطانوی نوآبادیات والوں کا تعلق وسطی و مغربی ممالک سے منقطع ہو جائے اس وجہ سے یہ جائز معلوم ہوتا تھا کہ امریکہ والوں سے اس جنگ کے مصارف کا کچھ حصہ وصول کیا جائے جس کی وجہ سے ان کی اسقدر فائدہ ہوا تھا امریکہ والوں نے جواب دیا کہ انھوں نے اب تک ہی مصارف جنگ کا ایک معقول حصہ ادا کر دیا ہے۔ اس لئے اب انھوں نے برطانوی پارلیمنٹ کے مزید اجرائی محاصل پر احتجاج کیا ہم اس بحث و تکرار کی تفصیل بیان کرنے کے بجائے اس زمانہ کے برطانوی سیاسوں کی مختلف رائیوں کا اظہار کر دیں گے جارج سوم کو یہ مسئلہ صاف معلوم ہوتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ امریکہ والے اسکی رعایا ہیں اس لئے ان کو اطاعت پر مجبور کرنا چاہئے۔ کل ٹوری فرقہ قریب قریب اسکا ہم خیال تھا اور لارڈ نارتھ (Lord North) جو لڑائی کے زمانے میں وزیر اعظم رہا تھا اس کا

لارڈ نارتھ اور ٹوری فرقہ

کارندہ بن گیا۔ وھگ فرقہ عام طور پر امریکہ والوں کا طرفدار تھا۔ اور مارکوئس آف راکنگھم (Marquis of Rockingham) کے قلیل عہدۂ وزارت (۱۷۶۶ء) میں خفیف مفاہمت کی کامیاب کوشش بھی کی گئی۔ وھگ جماعت میں سب سے اعلےٰ دماغ والا برک تھا جو بحیثیت ایک سیاس کے ناکام رہا۔ مگر بحیثیت ایک فلسفی کے اس نے اپنا دائمی اثر انگریزوں کے خیالات

برک (Burke) اور وھگ فرقہ

پر ڈالا ہے اور اس کی تقریریں انگریزی علم ادب میں شامل ہو گئیں ہیں اور یہ فخر کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا۔

اس نے دارالعوام سے التجا کی کہ امریکہ والوں کے ساتھ تعصب کا برتاؤ چھوڑ دیا جائے اور ان کو ایک انگریز کی طرح سمجھا جائے جیسا کہ وہ واقعی تھے۔ کیونکہ ان میں انگریزوں کی بہت سی خصوصیات نمایاں تھیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ پارلیمنٹ کا حق اجرائی محاصل اصولاً قائم رکھتے ہوئے اس وقت امریکہ والوں پر محاصل عاید کرنے سے باز رہنا چاہیئے چیتھم کی رائے حسب معمول سب سے الگ تھی اور وہ دونوں فریق میں سے کسی سے متفق نہیں تھا اس نے امریکہ والوں کی نعمت آزادی کی قدر کرنے پر تعریف کی اور کہا کہ پارلیمنٹ کو کوئی حق امریکہ پر محاصل عائد کرنے کا نہیں تھا اور ایسا کرنا ظلم تھا لیکن ساتھ ہی اس کے انگلستان اور امریکہ کے انقطاع تعلق کو نہایت مکروہ سمجھتا تھا اور ہر حال میں برطانوی مجلس وضع قوانین کی نگرانی و سرپرستی قائم رکھنے کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کرتا تھا ٹھیک ٹھیک طور پر یہ بتلا دینا کہ چیتھم کیا کرتا مشکل ہے مگر جبر و سختی کی کوشش وہ یقیناً ترک کر دیتا اور امریکہ والوں کی تمیز و وفا شعاری پر چھوڑ دیتا کہ وہ انگلستان سے اپنا تعلق قائم رکھیں اور غالباً اس کا یہ اعتماد بارآور ہوتا۔

چیتھم (Chatham)

امیریکن خود مختاری کی جنگ

جب ۱۷۷۵ء میں جنگ شروع ہوئی تو حکومت برطانیہ اپنی کثرت تعداد و دولت اور سمندر پر قابو ہونے کے باعث فتح کا یقین کئے ہوئی تھی اور گو امریکہ والوں کو واشنگٹن (Washington) ایسا آدمی مل گیا تھا جو مقابلہ و مقاومت کے لئے بہت موزوں تھا اور جس نے امریکہ میں وہی کام کیا جو ولیم خاموش نے ہالینڈ میں کیا تھا بلکہ سپہگری میں وہ ولیم خاموش سے بھی بڑھا چڑھا تھا تاہم امریکہ کو فتح حاصل ہونا مشکل تھا اگر اسے غیر ملکی امداد نہ ملی ہوتی۔ لیکن فرانس کو پرانی عداوت نکالنے کا موقعہ مل گیا اور جب امریکہ والوں نے خود مختاری کا اعلان کیا تو فرانس اس نئی جمہوریت کی اعانت پر کھڑا ہو گیا لڑائی میں تقریباً ہر جگہ انگریزوں کو ہزیمت اٹھانا پڑی بیڑے نے کچھ کام نہ دیا اور سپہ سالار

فرانس ریاستہائے متحدہ کی مدد کرتا ہے

کارنوالیس (Cornwallis) نے اکتوبر ۱۷۸۱ء میں بمقام یارک ٹاؤن (York Town) ہتھیار ڈال دیئے اس کے بعد حالانکہ برطانیہ نے فرانسیسیوں کو ایک زبردست بحری شکست دی اور جبیر الٹر (جبل الطارق) پر باوجود سخت حملوں کے اپنا قبضہ قائم رکھا لیکن ممالک متحدہ کو پھر فتح کرنے کا کوئی موقع نہ ملا۔

امریکن فتوحات کا اثر

اس فتح سے اہم نتائج مترتب ہوئے۔ اگر امریکن نوآبادیات کا تعلق انگلستان سے قائم رہتا تو وہ بہت زیادہ سرسبزی اور عظمت حاصل کرتیں اور غالباً آخر میں متحد ہو جاتیں مگر ان میں یورو پینیت کے بجائے انگریزیت زیادہ آجاتی کیونکہ ریاستہائے متحدہ کی زبان گو ہمیشہ انگریزی رہیگی لیکن یورپ کے تمام ممالک کی وہ نمائندہ ہے نئے ملک میں تمام یورپ کے لوگوں نے آکر ایک نئی زندگی شروع کردی ہے۔ ریاستہائے متحدہ گویا از سر نو قائم شدہ یورپ ہے امریکہ کے اس انجام کا اثر انگلستان پر بھی بہت کچھ ہوا۔ نوآبادیات کے متعلق برطانوی حکومت کے خیالات

سلطنت برطانیہ پر

بالکل بدل گئے اور استبدادی طرز عمل یک قلم موقوف ہوگیا بہت دنوں تک نوآبادیاتی سلطنت قائم کرنے کا خیال ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن انیسویں صدی میں آزادی اور خودمختاری کی جدید و مستحکم بنیاد پر بجائے نوآبادیات یعنی (Colonies) کے مقبوضات یعنی (Dominions)

یوروپی سیاست پر

قائم ہوئے اور اس مبارک انجام پر پہنچنے میں ریاستہائے متحدہ کی کامیاب مخالفت نے بہت کام کیا اور امریکہ میں آزادی کا جو مشعل روشن ہوا اس کی روشنی فرانس تک پہنچی جس جمہوریت نے یہ اعلان کیا تھا کہ "حکومتیں رعایا کی زیست و بقا آزادی اور فلاح کے لئے ہوتی ہیں" اس کی فتحیابی انگلستان کے مقابلہ پر دیکھ کر فرانسیسیوں کے دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا اور فرانسیسی انقلاب کا یہ بھی ایک محرک ثابت ہوئی۔ نیویارک (New York) کے بندرگاہ کے سامنے "آزادی" کا جو مجسمہ ہاتھ میں مشعل لئے یورپ کو روشنی بتلا رہا ہے وہ ایک تاریخی واقعہ کا اظہار کرتا ہے۔

جنگ امریکہ کے بعد برطانوی پارلیمنٹ

(۵)

امریکہ کے نوآبادیات کو دبانے کی کوششوں کا ناکام ہونا تھا کہ جارج سوم کے ملکی منصوبوں پر بھی پانی پھر گیا پارلیمنٹ پھر سابقہ سیاسی اقتدار کا مرکز بن گئی۔ ارل چیتھم کا بیٹا پٹ (Pitt) خرد ایسا مدبر ہوا کہ پارلیمنٹ کی تائید کے ساتھ ساتھ اس نے خود کو بادشاہ کی نگاہ میں بھی مقبول بنا لیا۔ وہ اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا اور اس کے باپ میں جو عجیب و غریب صفات ہم نے بتائے ہیں وہ ایک بھی اس میں نہ تھے۔ وہ مقرر اچھا تھا لیکن زیادہ بلیغ نہ تھا وہ باضمیر و باضابطہ کام کرنے والا آدمی تھا اور مالیات کا بڑا ماہر۔ اس کا رجحان آزاد تجارت کی طرف زیادہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مصلح کی حیثیت سے وہ تاریخ میں نام پیدا کریگا

پٹ (Pitt) اور انقلاب فرانس

کیونکہ ہندوستان کی حکومت کی اسی نے از سر نو تنظیم کی اور مالی اصلاحات جاری کیئے اور فرانس سے ایک تجارتی معاہدہ کر لیا جس سے دونوں ممالک کی بہت سی رکاوٹیں دور ہو گئیں اس نے بردہ فروشی پر اعتراض کیا اور پارلیمنٹ میں بھی اصلاحات کرنے سے اس نے گریز نہیں کیا لیکن انقلاب فرانس اور اس کے مقابل کی لڑائیوں نے اس کی سیاسی حیات کو دو مختلف النوع ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور اس کی حیثیت وزیر خارجہ اور وزیر جنگ کی سی ہو کر رہ گئی اور اس کی تمام عمر انقلاب اور نپولین کے خلاف لڑنے میں صرف ہو گئی

انگلستان اور انقلاب فرانس

شروع شروع انگلستان انقلاب کا حامی تھا۔ کئی پشت سے ہم فرانسیسی شاہی کے خلاف لڑتے آئے تھے اس وجہ سے ایک ایسی تحریک کو اٹھتے دیکھ کر جو شاہی کو بدل دینے والی تھی اور اس کو کمزور کر دینے والی تھی ہم کو کوئی افسوس نہیں ہوا فرانسیسیوں پر بڑا الزام یہ تھا کہ وہ اپنے بادشاہ کی غلامانہ خدمت کرتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ۱۶۸۸ء میں انگلستان نے جیسا کیا تھا اسی کی نقل اب ۱۷۸۹ء میں فرانس والے کرنا چاہتے تھے اس وجہ سے ایک طرف تو شعرا اس نئی تحریک کو سراہنے لگے کہ امن و آشتی سرسبزی و شادابی کا زمانہ آ رہا ہے اور دوسری طرف

انگلستان کے مدبرین اس تحریک کو خوش آمدید کہنے لگے جس کی مدد سے یورپ کی بدامنی کا ایک سبب فنا ہوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا صرف ایک برک ایسا تھا جو شروع سے یہی کہتا تھا کہ فرانسیسی تحریک میں ایک ایسا جذبہ کام کر رہا ہے جس کی کوئی علامت بھی انگلستانی انقلاب میں نہیں تھی اور اس کی وجہ سے بجائے امن قائم ہونے کے خونریزی ہو گئی۔

۱۷۹۳ء میں فرانس سے جنگ

فروری ۱۷۹۳ء میں انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ کا اعلان ہو گیا اس موقع پر ایک مشکل سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کا روکنا ممکن نہ تھا؟ انگلستان اور بقیہ ممالک متحدہ نے فرانسیسی انقلاب کے بہت سے اصول تسلیم و قبول کر لئے ہیں فرانس اور انگلستان میں اگر اس وقت کوئی اتحاد یا مفاہمت ہو جاتی تو انقلاب کے خوفناک نتائج ظہور پذیر نہ ہوتے اور یورپ بچیس سال کی جنگ و خونریزی سے بچ جاتا۔ آبنائے (انگلشیہ) کے دونوں جانب (یعنی فرانس وانگلستان میں) ایسے سیاس موجود تھے جو کسی کسی قسم کے اتحاد کا امکان سمجھتے تھے لیکن انقلاب کے جبر و استبداد نے شروع ہی سے انگلستان کے قدامت پسندوں کو برافروختہ کر دیا تھا اور پھر بادشاہ (لوئی شانزدہم) کیساتھ جو سلوک ہوا اس نے اور بھی آگ لگا دی۔ تجارتی طبقہ میں (جس کا اثر اٹھارھویں صدی میں برطانیہ کی حکمت عملی پر سب سے زیادہ تھا) دریائے شیلٹ (Scheldt) کے کھل جانے سے بلاوجہ ایک سراسیمگی پھیل گئی کیونکہ دریائے شیلٹ کے کھل جانے سے اینٹورپ (Antwerp) لندن کا ہمسر و ہم رتبہ بندرگاہ بن جاتا تھا۔ پٹ (Pitt) نے بجا طور پر احتجاج کیا کیونکہ ملکوں میں جو معاہدے کئے گئے تھے اس کے یہ بالکل خلاف تھا

دریائے شیلٹ (Scheldt) پر تجارت کا اذن عام

اور اس نے جمہوریت فرانس کے اس اعلان کا بھی حوالہ دیا کہ جس میں فرانس نے ہر قوم کو اپنی حکومت کے خلاف مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا اور کہا کہ اس سے فرانس کے خوفناک اغراض و مقاصد کا پتا چلتا ہے آخر میں بادشاہ کا قتل

ہوتا تھا کہ اعلان جنگ ہو گیا۔

اس جنگ عظیم میں برطانیہ کا حصہ

اس طویل جنگ کی حکایت گزشتہ باب میں بیان ہو چکی ہے یہاں صرف اتنا بتایا جائیگا کہ برطانیہ نے اس میں کیا حصہ لیا ایک مدت تک خشکی پر اس نے کوئی قابل قدر کام نہیں کیا اس کی فوجیں اچھی طرح تیار نہ تھیں اور نہ اس کے سپہ سالار ہی اچھے تھے۔ پٹ نے بالکل غلط اندازہ کیا تھا کہ دو ایک لڑائیوں میں جنگ ختم ہو جائیگی" اور کچھ مدت کے بعد برطانیہ کو معلوم ہوا کہ اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے اسے کتنی کوشش کرنا پڑیگی لیکن اس ناکامی کے باوجود شروع ہی سے برطانیہ کی اہمیت سب سے زیادہ سمجھی جاتی تھی اس کے تین وجوہ تھے ایک تو پٹ کی سیاسی چالبازی جس کی وجہ سے جتھے کے بعد جتھا قائم ہوتا گیا دوسرے انگلستان کی دولت جس کی بدولت براعظم کی فوجیں میدان کارزار میں ٹھہر سکیں اور تیسرے برطانیہ کا بیڑا جس نے بغاوتوں کے باوجود اپنی فوقیت وعظمت قائم رکھی تھی۔

ٹرافلگر (Trafalgar)

۱۸۰۲ء میں صلح امینز (Amiens) نے انگلستان کو صرف دم لینے کی مہلت دی آئرلینڈ کی پیچیدگیوں کی وجہ سے پٹ عارضی طور پر خدمت سے ہٹ گیا تھا مگر پھر لڑائی شروع ہوتے ہی وہ اپنی خدمت پر آ گیا۔ انگلستان پر نپولین کے حملہ آور ہونے کی دھمکی کے باوجود اس نے ملک والوں کا دل بڑھا رکھا اور ٹرافلگر میں نیلسن (Nelson) کی شاندار فتح نے لوگوں کا جوش اور بھی بڑھا دیا۔ لیکن اس لڑائی کی اہمیت اس زمانہ کے لوگوں کو اتنی نہیں معلوم ہوتی تھی جیسی کہ اب ہم کو۔ آلم (Ulm) اور آسٹرلیٹز (Austerlitz) کی خبروں سے پٹ کا دل بیٹھ گیا اور جنوری ۱۸۰۶ء میں وہ فوت ہو گیا۔

فاکس (Fox) کاسلری (Castlereagh) اور کیننگ

اس کے بعد وزارت میں جو تغیرات ہوئے اس کی تفصیل بیان کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں ہے اس کی وفات پر اس کا زبردست وھگ مخالف فاکس (Fox) اس کی جگہ پر مامور ہوا اور نپولین سے مصالحت و دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی اسے بہت امید تھی

لیکن ستمبر ۱۸۰۶ء میں وہ بھی فوت ہوگیا اور اس کی چلین حیات اس کی سب کوششیں بیکار رہیں۔ جنگ کا اہتمام اور اسکو کامیاب انجام تک پہنچانے والے وزرا کیننگ (Canning) اور کاسلری (Castlereagh) تھے۔ کیننگ کو بعض اوقات پٹ کا وارث بھی کہتے ہیں۔ کیننگ بالکل ایک نئے طرز کا ٹوری تھا اور ۱۸۱۲ء سے ۱۸۲۲ء تک وزیر خارجہ رہا اور کاسل ری نے جنگ کے آخری دور میں نہایت ہوشیاری اور استقلال و تیقن کے ساتھ انگلستان کی خارجی حکمت عملی کی رہنمائی کی۔ اس کے بعد نپولین کے مقابلے میں انگلستان کی جنگ کے دو نمایاں خصوصیات تھے۔ اول تو یہ کہ ایک سخت تجارتی جنگ شروع ہوگئی۔ جب نپولین کو بحری لڑائی میں کامیابی کی امید نہیں تو اس نے خیال کیا کہ یورپ میں برطانیہ کی تجارت مسدود کرکے دکانداروں کی قوم میبوں کو عاجز کردے گا لیکن یہ کوشش بارآور نہ ہوئی اور اس کے جواب میں برطانیہ نے یورپ کے اس ساحل سے جو نپولین کے قابو میں تھا قطعاً تجارت بند کردی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ برطانوی بری فوج کی کارگزاری بھی ویسی ہی قابل قدر ہونے لگی جیسی کہ بیڑے کی ابتدائے جنگ سے تھی اس تغیر کا باعث ڈیوک آف ولنگٹن ہوا اسپین گویا اس کی فوج کے لئے میدان مشق ثابت ہوا اور اس نے بعض نہایت شاندار فتوحات بھی اسی ملک میں حاصل کئے یہ دیکھنے کے لئے کہ ۱۸۱۲ء میں آسٹریا کی لڑائی اور روس کی مقاومت میں اس نے کس طرح ساتھ دیا ناظرین کو گذشتہ باب ملاحظہ کرنا چاہیے ۱۸۱۴ء میں نپولین کو مغلوب کرنے میں اس نے خاص حصہ لیا اور ۱۸۱۵ء میں اس سے بھی زیادہ۔ آخر جب یورپ میں امن و امان قائم ہوا تو ولنگٹن سے زیادہ کوئی شخص مشہور و معروف نہیں تھا اور برطانیہ کے استقلال و انجام کار اس کی فتح نے تمام یورپ پر اس کی رعایا اور اس کے نظام حکومت کی دھاک بٹھادی

فرانس سے تجارتی جنگ

(۶)

اور بھی چند واقعات جن کو اب تک نظر انداز کیا گیا تھا بیان کردیئے جائیں تو نپولین کی لڑائی کا بیان مکمل ہوجائیگا۔

آئرلینڈ

آئرلینڈ خانہ جنگی اور انقلاب کے دور سے گزر رہا تھا جس کے سمجھنے کے لئے ہم کو آغاز صدی کی حالت دیکھنا پڑیگی۔ ولیم سوم اور مارلبرا (Marlborough) کی فتح کے بعد آئرلینڈ میں تاب مقاومت نہ ہونے سے برطانیہ عظمیٰ میں شامل ہوگیا تھا۔ گو ڈبلن (Dublin) میں اب بھی ایک پارلیمنٹ قائم رکھی گئی لیکن اس پارلیمنٹ میں صرف پروٹسٹنٹ مذہب کے اراکین کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اور انتخاب کا حق بھی صرف پروٹسٹنٹ فرقے کو حاصل تھا جس نوع کے قوانین ہیوگینو (Huguenots) کو نیست و نابود کرنے کے لئے لوئی چہاردہم نے فرانس میں جاری کئے تھے اسی قسم کے قوانین کیتھلک فرقے کے آزار کا باعث ہوئے اور انھیں قوانین کی بدولت ان کو اپنے خدمات اور اپنا ملک چھوڑ دینا پڑا۔ قومی جذبہ فنا ہوچکا تھا۔ اس وجہ سے کوئی مخالفت نہ ہوسکی۔ صرف ایک رومن کیتھلک کلیسہ باقی رہ گیا تھا جس نے آئرلینڈ کے روایات و قومیت کو زندہ رکھا۔ اسی زمانے میں لوگوں نے آئیری (Irish) زبان کے بجائے انگریزی زبان اختیار کرلی۔ لیکن جنگ امریکہ میں انگلستان کی مصیبت کے وقت آئرلینڈ والوں کو اچھا موقع ہاتھ آیا السٹر (Ulster) کے پروٹسٹنٹ لوگوں نے وضع قوانین کی آزادی و اختیار حاصل کرنے کے لئے ایک تحریک پیدا کی جو چند ہی روز میں تمام ملک میں پھیل گئی۔ رضا کاروں کی ایک بڑی جماعت منظم کی گئی جسے انگریزی حکومت روک نہیں سکتی تھی کیونکہ آئرلینڈ پر چڑھائی ہونے کی صورت میں وہ خود آئرلینڈ کی حفاظت نہیں کرسکتی تھی اس طرح کے مستعد رضا کاروں نے پہلے تو انگلستان سے آزاد تجارت کا مطالبہ کیا اور پھر وضع قوانین کی آزادی و اختیار کے مقتضی ہوئے آئرلینڈ کی پارلیمنٹ میں اس تحریک کی نمائندگی کرنے والا گریٹن (Grattan) تھا ۱۷۸۲ء

گریٹن کی پارلیمنٹ

میں اس نے یہ تحریک منظور کرالی کہ آئرلینڈ اسی قانون کا پابند رہیگا جس کی منظوری بادشاہ سلامت اور آئرلینڈ کی پارلیمنٹ سے ہوئی ہو انگریزی حکومت کی حالت ایسی نہ تھی کہ انکار کرتی اس لئے آئرلینڈ کو وضع قوانین کے اختیارات دیدیئے گئے آئرلینڈ کی یہ خودمختار

پارلیمنٹ گریٹن (Grattan) کی پارلیمنٹ کہی جاتی ہے۔

نئی حکومت کی کمزوری

آئرلینڈ کی خود مختار پارلیمنٹ نے بہت سے اوصاف ظاہر کیئے۔ حالانکہ وہ پروٹسٹنٹ تھی مگر اس نے رومن کیتھلک کو حق انتخاب عطا کیا (۱۷۹۳ء) لیکن رشوت ستانی میں وہ اس زمانہ کی انگریزی پارلیمنٹ سے بڑھی ہوئی تھی۔ اور چونکہ ملک کا نظم ونسق اس سے متعلق نہ تھا اس وجہ سے وہ نہایت بے پروائی سے اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔ ملک کی زرعی ومعاشرتی حالت ناگفتہ بہ تھی اور انقلاب فرانس کے اثر سے ایک ایسی تحریک پھیلی جس نے دلوں میں یہ خواہش پیدا کی کہ تلوار کے زور سے آزادی حاصل کی جائے چنانچہ ۱۷۹۸ء میں ایک شورش رونما ہوئی اور گو فرانس سے کچھ امداد نہیں ملی لیکن پھر بھی بہت خونریزی کے بعد یہ ہنگامہ فرو ہو سکا۔ جس سے باہمی منافرت پھیل گئی۔

پٹ (Pitt) کا خیال تھا کہ آئرلینڈ کی علیحدہ پارلیمنٹ رہنے سے ہمیشہ کھٹکا لگا رہیگا خصوصاً کسی غیر ملک سے جنگ کے زمانے میں تو یہ اور بھی خطرے کا باعث ہوگی۔ اس لیئے اس نے یہ بات تجویز کی کہ اسکاٹلینڈ کی پارلیمنٹ جس طرح ۱۷۰۷ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں ضم کردی گئی تھی اسی طرح آئرلینڈ کی پارلیمنٹ بھی برطانوی پارلیمنٹ میں ملادی جائے۔ آئرلینڈ کی پارلیمنٹ کو

برطانوی پارلیمنٹ میں پارلیمنٹ آئرلینڈ کا انضمام

اس بات پر آمادہ کرنے کے لیئے بہت کچھ رشوت دی گئی اور پٹ نے یہ بھی وعدہ کیا کہ رومن کیتھلک لوگوں کو بھی پارلیمنٹ میں شریک ہونے اور خدمات حاصل کرنے کی اجازت دیدی جائیگی ان مختلف اثرات کی وجہ سے آئرلینڈ کی پارلیمنٹ نے مجوزہ تجویز منظور کرلی اور ۱۸۰۰ء میں "قانون اتحاد" (Act of Union) منظور ہوگیا۔ لیکن کیتھلک لوگوں کی رہائی کی تجویز نے جس کی وجہ سے آئرلینڈ والوں کو

کیتھلک لوگوں کی گلوخلاصی

ایک گونہ سکون واطمینان ہوجاتا قانون کی شکل نہیں اختیار کی اس کا الزام بالکلیہ بادشاہ جارج سوم کے سر ہے اس کا دماغ خراب ہوچلا تھا اور پھر جنون کا دورہ شروع ہوگیا تھا

اس نے کہا کہ تاجپوشی کے حلف کی وجہ سے وہ کیتھلک لوگوں کے مجوزہ حقوق واستحقاقات کی منظوری نہیں دے سکتا اور بادشاہ کے حال پر ترس کھا کر پٹ نے عہد کر لیا کہ پھر اس معاملے کو پیش نہیں کریگا اور وہ وزارت سے مستعفی ہو گیا کیونکہ آئرلینڈ کے لوگوں کو اس نے جو امیدیں دلائی تھیں ان کو پورا نہیں کر سکتا تھا اس طرز عمل سے اس کی عزت پر حرف نہیں آیا مگر آئرلینڈ کی آتش غضب ٹھنڈی نہیں ہوئی آئرلینڈ کی تاریخ اور اس کے سنین دشہور رکھوئے ہوئے مواقع کی داستانیں ہیں، چنانچہ ۱۸۰۱ء بھی انھیں میں سے ایک ہے۔

انگلستان میں تشدد جنگ انقلاب (فرانس) کے سلسلے میں ان لوگوں کے ساتھ سخت جبر وتشدد کا سلوک کیا گیا جو فرانسیسیوں اور ان کے عقائد کے معتقد وحامی تھے قانون ہیبس کارپس (Habeas corpus) تھوڑے دنوں کے لئے ملتوی کر دیا گیا سیاسی زعیموں کو محبسوں میں ڈالدیا گیا اور لڑائی کے نتائج نے لوگوں کو سکوت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ آخر کار جب واٹرلو (Waterloo) کی لڑائی نے ایک قسم کا سکون واطمینان پیدا کر دیا تو پھر لوگوں کے بجبر ضبط کئے ہوئے جوش وخروش کا اظہار ہونے لگا۔

سلطنت کی وسعت جب سے کہ ۱۷۹۳ء کی جنگ شروع ہوئی تھی برطانیہ کے مقبوضات غیر ممالک میں بہت بڑھ گئے تھے صلح وامنا میں جزیرۂ لنکا راس گڈ ہوپ (Good-hope) (Ceylon) اور جزائر مغربی ہند برطانیہ کے مان لئے گئے تھے ہندوستان میں مشرقی ہندوستان کی کمپنی (Good Hope Ceylon) کے مقبوضات فرانسیسی حملوں کے باوجود بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ فرانسیسی حملوں کی وجہ سے بہت بڑھ گئے تھے اور اس عظیم جزیرہ نما کے معاملات میں برطانوی حکومت نے بھی براہ راست دخل دینا شروع کر دیا تھا لیکن حاکموں اور محکوموں کا آئندہ کیا حشر ہونے والا تھا اس کا کسی کو بھی علم نہ تھا۔

حوالۂ کتب متعلق باب ہذا:-

انگلستان کے اس عہد کی سیاسی تاریخ جو آئی۔ ایس۔ لیڈم (I. S. Leadam) سنہ ۱۷۰۲ء تا سنہ ۱۷۶۰ء ڈبلیو ہنٹ (W. Hunt) سنہ ۱۷۶۰ء تا سنہ ۱۸۰۱ء وسی۔ جی براڈرک (C. G. Brodrick) جے۔ کے۔ فادرنگھم (J. K. Fotheringham) سنہ ۱۸۰۱ء تا سنہ ۱۸۳۷ء نے لکھی ہے اور اسٹین ہوپ (Stanhope) اور لیسکی (Lecky) نے تفصیل کتب لکھی ہے "تاریخ انگلستان" مصنفۂ (Massey O'Connor Morris) ومضامین میکالے (Macaulay) اور سوانح برک (Burke) وچیتھم (Chatham) وفاکس آئرلینڈ کی مختصر تاریخ مصنفۂ اوکانر ماریس (O'Connor Morris) اور تاریخ اسکاٹ لینڈ مصنفۂ ہیوم براون (Hume Brown) ریاستہائے متحدۂ امریکہ مصنفۂ چیننگ (Channing)

باب ہفتم

ردعمل ۔ انقلاب ۔ اور پھر ردعمل

۱۸۱۵ء کے بعد ردعمل

نپولین کی جلاوطنی کے بعد جب یورپ کو اس ہنگامۂ تسخیر سے پناہ ملی جو نپولین نے ایک مدت سے برپا کر رکھا تھا تو ان مدبرین کو جو یورپ کے معاملات سلجھانے کے لئے وائینا (Vienna) میں جمع ہوئے تھے فکر دامنگیر ہوئی کہ معاملات کو اس نہج پر طے کیا جائے کہ آئندہ کسی انقلاب کا خطرہ اور امکان باقی نہ رہے، ان کے نزدیک انقلاب (فرانس) محض ایک بغاوت تھی جو حکومت و حکام کے خلاف برپا کی گئی تھی لیکن اس کی تہ میں عمدہ اور منصفانہ معاشرتی تنظیم کا جو پرجوش ولولہ تھا اس سے یہ لوگ بالکل ناآشنا تھے یہ خیالات پھر بروئے کار آئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے مگر اس وقت یورپ کو امن و امان کی ضرورت سب باتوں سے زیادہ تھی اور وائینا میں جو مدبر جمع ہوئے تھے وہ گویا ردعمل کے کارکن تھے ۔ کل یورپ کا نقشہ ان کے سامنے پھیلا ہوا تھا اور تقریباً کل سرحدیں ایک جدید تعیین اور نظر ثانی کی محتاج تھیں ۱۶۴۸ء کی صلح ویسٹ فیلیا کے بعد سے ایسا اہم کام مدبرین کے ایسے مجمع کے سامنے پیش نہیں ہوا تھا۔

وائینا (Vienna) کی کانگریس کے نتائج

فرانس کی سرحد تقریباً اتنی ہی ہوگئی جتنی کہ ۱۷۹۲ء میں تھی بعضوں کی رائے تھی کہ دریائے رائین (Rhine) کے مغرب کا وہ کل علاقہ اس سے لیا جائے جو کسی زمانے میں سلطنت (آسٹریا) کا جزو تھا اور جس میں اب بھی زیادہ تر جرمن قوم آباد تھی لیکن ڈیوک آف ولنگٹن نے اس تجویز کی مخالفت کی ۔ جرمنی کے مستقبل کا سوال ٹیڑھا تھا

نپولین کی لڑائیوں کی وجہ سے قومی جوش بہت بڑھ گیا تھا اور جرمنوں کو امید تھی کہ اتحادیا

جرمنی

کے مدبر ایک آزاد متحد اور خود اختیاری حکومت جرمنی کو عطا کر دینگے لیکن یہ امید بر نہ آئی - سابقہ بتذل شاہنشاہی تو نہیں قائم ہوئی لیکن جدید نظام شروع سے کمزور اور عوام کی مرضی کے خلاف تھا اور پہلے ہی سے یہ معلوم تھا کہ وہ بہت مدت تک باقی نہ رہیگا۔ اُنتالیس تاجدار اور آزاد شہر قائم ہوئے گویا صلح ویسٹ فیلیا (Westphalia) کی تین سو پچاس مملکتیں انھیں اُنتالیس میں شامل کر دی گئیں ان اُنتالیس مملکتوں کو "جرمنی" کے نام سے موسوم

عہدیہ جرمنی

کیا گیا اور فوجی امور کے لئے آسٹریا کو اس عہدیہ کا صدر بنایا گیا۔ اس میں آسٹریا کو چھوڑ کر جتنی مملکتیں شامل تھیں سب میں پراشیا سب سے زیادہ قوی تھا تعزلت سے پراشیا ایک نیا قومی جوش و جذبہ لیکر اٹھا تھا اس نے پولینڈ کی زمینیں چھوڑ دیں مگر اس کے معاوضے میں اس کو

پراشیا کا نفع

دریائے رائن کے کنارے بہترین علاقہ مل گیا اور بحر بالٹک کے ساحل کی سوئڈی زرخیز زمینیں تھیں جن کی اسے ایک مدت سے خواہش تھی اس کو مل گئیں اس کی رعایا میں زیادہ تر جرمن قوم کے لوگ تھے اسی وجہ سے وہ جرمنی کی سربرآوردہ طاقت بن گیا۔ پراشیا کے بعد بویریا (Bavaria) کا درجہ تھا۔ بویریا (Bavaria) ایک مدت سے نپولین کا حلیف بنا ہوا تھا مگر اس صلح میں اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ کیونکہ جنوبی جرمنی میں بھی ایک کیتھلک سلطنت تھی جو شمالی جرمنی کی پروٹسٹنٹ سلطنت پراشیا کی ہمسری کی جا سکتی تھی

آسٹریا

نپولین کے ہاتھوں آسٹریا کے برابر کسی ملک کو نقصان نہیں پہنچا تھا مگر اب وائنا (Vienna) کی کانگرس میں ملک آسٹریا اور وہاں کا مدبر میٹرنک (Metternich) سب سے نمایاں حصہ لے رہا تھا آسٹریا کو بلجیم سے دست بردار ہو جانا پڑا مگر وینس (Venice) لمبارڈی (Lombardy) الیریا (Illyria) اور بویریا (Bavaria) کے مشرقی حصے کے حاصل ہو جانے سے اس کی تلافی ہو گئی لیکن یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان جدید مقبوضات میں کوئی جرمن ملک نہیں تھا شہنشاہ آسٹریا تقریباً (۲۸) کروڑ رعیت

پر حکمراں تھا لیکن ان میں صرف چار کروڑ جرمن قوم کے لوگ تھے۔ بقیہ رعایا مختلف القوم مختلف اللسان اور مختلف الملت تھی۔ بوہیمیا والے (Bohemians) ہنگری والے (Hungarians) پولینڈ والے (Poles) سرویہ والے (Servian) اور نیز روبانیہ (Roumanians) اور اٹلی والے سب کے سب محض ایک شہنشاہ کے باجگزار ہونے کی وجہ سے باہم ملے جلے ہوئے تھے ہیپسبرگ (Hapsburg) خاندان کا علاقہ اس زمانے کی طرح اتنا مستحکم و مضبوط کبھی نہیں رہا تھا۔ لیکن غیر جرمن اقوام کی کثرت آبادی کی وجہ سے جرمنی آسٹریا کو اپنا سردار اور نمائندہ نہیں سمجھتی تھی اور نہ ایسا ممکن تھا علاوہ اس کے ہر لحاظ سے وائینا (Vienna) میں ردعمل شروع ہوگیا تھا اور جبر و استبداد کی وجہ سے علوم و فنون۔ آزاد خیالی و مذہبی زندگی سب چیزیں نیم مردہ اور روبہ زوال تھیں، لیکن ایک علم موسیقی کو البتہ فروغ حاصل ہوا۔

اٹلی

کانگریس وائینا نے جو دوسرے تغیرات کئے ان کو بھی مختصراً درج کیا جاتا ہے اطالیہ مختلف مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا لیکن زیادہ اقتدار آسٹریا کا رہا کیونکہ وینشیا (Vienna) اور لمبارڈی (Lombardy) آسٹریا کے زیر نگیں تھے ہی موڈنیا (Modena) پارما (Parma) و ٹسکینی (Tuscany) کے حکمراں بھی آسٹری نسل ہونے کے باعث آسٹریا کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے تھے۔ کلیسائی مملکتیں پاپائے روم کو پھر مل گئیں نیپلس (Naples) اور سسلی (Sicily)۔ صقالیہ) کا تخت و تاج بوربان خاندان کو ملا شمالی و مغربی جانب پیڈمانٹ (Piedmont) وسیوائے (Savoy) سارڈینیا (Sardinia) کے تاجدار کو دیدیئے گئے اور آئندہ ابواب میں ہم بتلائینگے کہ اس تاجدار کی اولاد کس طرح اٹلی کی آزاد و خود مختار بادشاہ بن گئی۔

بلجیم اور ہالینڈ

بلجیم (Belgium)۔ ہالینڈ میں شامل کر دیا گیا اور ہالینڈ (Holland) کا تاجدار بلجیم پر بھی حکومت کرنے لگا یہ انتظام اس خواہش کی وجہ سے ہوا کہ فرانس کی شمالی سرحد پر ایک قوی سلطنت رہے لیکن دونوں ملک والے ایک دوسرے سے مختلف اور بعض امور میں صریحاً مخالفت رکھتے تھے اس وجہ سے بہت جلد یہ انتظام درہم برہم ہوگیا۔ ناروے (Norway)

سوئیڈن (Sweden) میں شامل کر دیا گیا اور نپولین کے قدیم سپہ سالار برنادوت (Bernadotte) کے زیر حکومت ہوگیا جو شاہ چارلز چہاردہم (Charles XIV) کے لقب سے سوئیڈن پر حکمراں تھا۔ یہ اتحاد بلجیم اور ہالینڈ کے اتحاد سے زیادہ دیرپا ثابت ہوا لیکن ۱۹۰۵ء میں یہ اتحاد بھی ٹوٹا۔ اور ناروے علیحدہ ایک سلطنت بن گیا۔ روس نے فن لینڈ (Finland) فتح کر لیا تھا وہ اس کو دیدیا گیا اور فن لینڈ والوں کی سخت مخالفت و جد وجہد کے باوجود اب تک یہ ملک روس ہی میں شامل ہے۔

فن لینڈ (Finland)

۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۰ء تک کا زمانہ اس کے ماقبل اور مابعد کے سنین سے نسبتاً پر امن رہا۔ یورپ کی چاروں بڑی دول روس۔ آسٹریا پراشیا و برطانیہ عظمی نے صلح و ائینا کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے ایک اتحاد قائم کیا اور ہر چار سال کے بعد سفرا (Plenipotentiaries) کا جلسہ کر کے تمام مسائل اور پیچیدگیوں کا جو اس مدت میں رونما ہوں تصفیہ کرنے کی رائے طے پائی۔

اتحاد مقدس

اس اتحاد کو بعض اوقات "اتحاد مقدس" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور اس کے بعض اراکین کا منشاء صرف صلح کے شرائط کا قیام ہی نہ تھا بلکہ اس صورت میں انقلابی تحریک کو حتی الامکان فرو کر دینے کی بھی تمنا پوشیدہ تھی ۱۸۱۸ء میں فرانس بھی اس اتحاد میں شریک ہوگیا لیکن فوراً اس بات کا احساس پیدا ہوگیا کہ ان پانچوں دول کا اتحاد و اتفاق بھی اس قسم کی تحریکوں کو فرو کرنے کے لئے کافی نہ ہوگا جتنی جتنی جنگ عظیم کی یاد محو ہوتی گئی اتنا اتنا انقلابی خیالات کا سلسلہ نشر و اشاعت بڑھنے لگا

اسپین میں آزادی کی تحریکیں۔

سب سے پہلے اسپین (Spain) میں شورش پیدا ہوئی جہاں بوربان (Bourbons) خاندان قدیم ناقص طریقے پر حکمرانی کر رہا تھا ۱۸۲۰ء میں فوج نے بغاوت کر دی اور مطالبہ کیا کہ وہی آزاد دستور جو ۱۸۱۲ء میں نافذ ہوا تھا۔ مکرر جاری کیا جائے بادشاہ کو سر جھکا دینا پڑا اور کلیسا اور خانقاہوں کے خلاف تجاویز عمل میں آئے لیکن کوہ پیرینیز (Pyrenees) کے جنوب میں ان خیالات و عقائد کا احیا شمالی اور وسطی یورپ اور خصوصاً فرانس کے لئے مہلک نظر آنے لگا اس وجہ سے

اس تحریک کو فنا کر دیا گیا اور پھر استبدادیت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ لیکن اس شورش

اسپین (Spain) کی نوآبادیات کی بغاوت

کا اثر دنیا کے ایک دور دراز ملک پر ہمیشہ کے لئے پڑ گیا وسطی و جنوبی امریکہ میں اب بھی اسپین کی وسیع نوآبادیات تھیں۔ ان نوآبادیات سے نے جدید بحال شدہ شخصی حکومت کی اطاعت سے انکار کر دیا اور برطانیہ عظمی نے بھی بسر کردگی کننگ (Canning) ان نوآبادیات کی تائید کی ۱۸۲۳ء تک آٹھ جمہوری سلطنتیں قائم ہو گئیں جنہیں سے میکسیکو (Mexico) پیرو (Peru) چیلی (Chili) اور بیونس آیرس (Buenos Ayres) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کی حیات بہت تلاطم خیز رہی ہے اور اب بھی ان کو سکون و طمانیت کی آئینی زندگی نصیب نہیں ہوئی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ تہذیب و تمدن کی آئندہ نشو و ارتقا میں یہ ریاستیں خاص حصہ لینگی۔

ترکی کے خلاف یونان کی بغاوت

ہسپانوی شورش سرد ہونے کے قبل ہی یونانی مسئلہ درپیش ہوا یونان جو یورپی حریت و آزادی کا مسقط الراس تھا صدیوں سے آزادی سے بے بہرہ ہو گیا تھا گو پہاڑی علاقوں میں وہاں کے باشندے جو کسی قدر وطن پرستی کے ساتھ قزاقی کرتے تھے ایک قسم کی وحشیانہ آزادی و خود مختاری قائم کئے ہوئے تھے عام رعایا تباہ ہو گئی تھی۔ کیونکہ نیم وحشی منچلے غول کے غول دورہ کرجاتے تھے یونان کو اٹلی سے کہیں زیادہ خارجی اقوام کے حملوں اور یورشوں کا صدمہ اٹھانا پڑا لیکن یونانیوں نے اپنی پارینہ عظمت کو یاد سے محو نہیں کر دیا تھا اور ایک طرح کی یونانی زبان تمام رعایا میں رائج تھی خفیہ انجمنوں نے راستہ صاف کر دیا تھا اور ۱۸۲۱ء میں بغاوت کا مواد پھوٹ پڑا۔ ہر محب آزادی کا خون جوش میں آگیا بائرن (Byron) نے اس تحریک کی تائید میں اپنی جان دیدی غضبناک یونانی جوش و ہمت سے لڑے مگر ان میں انضباط نہ تھا اور ترک حسب موقع خونخوار انتقام

یونان کی خود مختاری

لیتے رہے اگر خارجی مداخلت نہ ہوتی تو شورش فرو ہو جاتی لیکن برطانیہ عظمی نے اس معاملے میں خاص دلچسپی لی اور آخر کار ترکوں کو زیر کرنے کے لئے روس کے ساتھ شریک ہو گیا ۱۸۲۷ء میں ترکی بیڑا جنگ ناوارینو (Navarino) میں تباہ و برباد ہو گیا اور یونان کی خود مختاری و آزادی مسلم ہو گئی

"قومیت کا جذبہ"

یونانی شورش ایک خصوصیت رکھتی تھی یورپ کے مستقبل پر جس کا اثر پڑنے والا تھا اور وہ یہ کہ یونانی بغاوت گویا ایک قومی شورش تھی جو ایک غیر ملکی قوم کے تسلط و حکومت کے خلاف برپا کی گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی بعض قومی ہنگامے ہوئے تھے مگر یورپ کی تاریخ پر اس احساس "قومیت" کا آئندہ نصف صدی تک ایک گہرا اثر پڑنے کے باعث یہ امر بغور مطالعے کا مستحق ہو جاتا ہے یہ سوال کہ ایک قوم سے کیا مراد ہے بیکار و فضول ہے اس لئے کہ (۱) قوم سے یہ مراد نہیں ہے کہ نسل، زبان اور مذہب ایک ہو کیونکہ یہ ناممکن ہے بلکہ اغراض کا مشترک ہونا بھی لازمی نہیں ہے، یہ سب اجزا اہمیت ضرور رکھتے ہیں لیکن یہ سب اجزا مجتمع ہو کر لازمی طور پر قوم نہیں بنا دیتے چنانچہ ان میں سے بعض اجزا کی عدم موجودگی میں بھی "قومیت کا احساس" بہت زبردست ہو سکتا ہے جہاں کہیں بھی "قومیت کا جذبہ" پرورش پاتا ہو بس وہیں "قوم ہے" اور قومیت کا جذبہ کئی اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ خصوصاً تاریخی نشوونما سے۔ اغراض مشترکہ و خصوصیات مشترکہ اور مشترکہ زبان کا رفتہ رفتہ یہ اثر ہوتا ہے کہ آدمیوں کی بڑی بڑی جماعتیں یہ محسوس کرنے لگتی ہیں کہ ان کے آپس میں ایک خاص رشتہ ہے

انقلابی خیالات

اور پھر وہ اپنے کو ایک قوم کہنے لگتے ہیں انیسویں صدی میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ایک قوم کے لوگ ایک ہی سلطنت و حکومت کے تابع رہیں اور ہر قوم اپنے معاملات سنبھالنے سلجھانے کی مالک و مختار سمجھی جائے اور اس پر کسی غیر قوم کا تسلط و اثر نہ ہو قومیت کا یہ عقیدہ نہایت مبہم اور انقلاب انگیز تھا اس کی رو سے دول کی ایک جدید ترتیب لازم آتی تھی جس میں بعض دول ایک دوسرے میں شامل ہو جائیں اور بعض ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں چنانچہ اسی عقیدے کی رو میں اٹلی اور جرمنی تو اتحاد سے پینگ بڑھانے لگے اور آسٹریا پر انشقاق و افتراق کا آسمان ٹوٹ پڑا پولینڈ والے۔ آئرلینڈ والے۔ بلجیم والے۔ فن لینڈ والے۔ اور ناروے والے۔ سب کے سب اپنے اپنے دعوے پیش کرنے لگے جو بالکل مناسب نہ تھے۔

۱۸۳۰ء میں بلجیم (Belgium) کی بغاوت

۱۸۳۰ء میں دو زبردست انقلاب مغربی یورپ میں رونما ہوئے ایک بلجیم کا انقلاب تھا۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ بلجیم کا ملک ہالینڈ میں شامل کردیا گیا تھا اور دوانا کی کانگریس نے بلجیم کو شاہ ہالینڈ کی حکومت میں کردیا تھا یہ انتظام کسی حال میں قائم رہنے والا نہیں تھا کیونکہ بلجیم والوں کی تعداد ہالینڈ والوں سے بہت بڑھی ہوئی تھی وہ لوگ کیتھلک مذہب کے پیرو تھے اور ان کی زبان بھی بہ نسبت ہالینڈ والوں کے فرانسیسی زبان سے زیادہ مشابہ تھی ان سب باتوں کے باوجود اس کو پروٹسٹنٹ مذہب والے شاہ ہالینڈ کی حکومت میں کردیا گیا تھا۔ بلجیم کے کل فرقے وجماعتیں متحد و متفق ہوگئیں اور ہالینڈ والے بیچارے کچھ نہ کرسکے۔ بلجیم کی خود مختار سلطنت کا اعلان ہوگیا اور سکس کوبرگ (Saxe-coburge) کا لیوپولڈ (Leopold) خود مختار بلجیم کا پہلا بادشاہ مقرر و منتخب ہوا۔

فرانس میں انقلاب

اس سے بھی زبردست شورش فرانس میں اٹھی۔ بوربون (Bourbon) کا بحال شدہ خاندان یعنی ۱۸۲۴ء تک لوئی چہاردہم (Louis XIV) اور اس کے بعد چارلس دہم (Charles X) نے اس طرح پر فرانس میں حکومت شروع کی گویا فرانس میں کبھی انقلاب ہوا ہی نہ تھا۔ دستور کے مطابق حکومت کرنے کے عہد و پیمان شکست کردیئے گئے یا ان سے انحراف کیا گیا حتیٰ کہ ۱۸۳۰ء میں سین کلو کے احکام (Ordinances of St. Clouds) نے آزاد عمومی حکومت کا رنگ ہی مٹادیا۔ اس کے سبب سے جو احتجاج و اعتراض ہوا اس میں پھر پیرس نے ویسی ہی سرگرمی سے حصہ لیا جیسا کہ انقلاب کے زمانہ میں تھیر (Thiers) نامی ایک نوعمر مضمون نگار یا رسالہ نگار نے "ان احکام" (Ordinances) پر سخت نکتہ چینی شروع کردی۔ چارلس دہم کی آنکھوں کے سامنے سابقہ شاہان فرانس کی حالت کا نقشہ پھر گیا اور اس نے مقابلہ و مقاومت کی ہمت نہ کی بلکہ انگلستان کو بھاگ گیا اور اس کے بجائے لوئی فلپ (Louis Philip) والی اور لیون (Orleans) بادشاہ ہوگیا۔

آرلیون خاندان کی بادشاہت

نئی بادشاہی نے بوربون بادشاہوں کے طرز حکومت سے

بالکل ہی مختلف طرز حکومت اختیار کیا۔ دستوری حکومت کا قیام ہوا اور انگلستان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی ٹھہری اور ساتھ ہی ساتھ فرانس کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی ہر طرح کوشش کی گئی اور ان مقاصد کے حصول کے لئے بہت کچھ انتظام ہوا چنانچہ تمام ملک میں ریل اور تار کا جال بچھا دیا گیا اور مشترکہ سرمایہ دار جماعتیں (Joint Stock Companies) قائم کی گئیں اور چونکہ حال ہی میں الجزایر (Algiers) کا صوبہ بھی سلطنت فرانس میں شامل ہو گیا تھا اس لئے تجارت کے لئے ایک نیا میدان بھی فرانس والوں کو مل گیا اور ملک کی دولت روز بروز بڑھنے لگی اور رعایا کی حالت بھی فارغ البالی کی ہو گئی مگر پھر بھی اٹھارہ سال کے بعد ہی ایک دوسرا انقلاب رونما ہوا۔

فرانس میں نیا انقلابی جذبہ واحساس

لوئی فلپ کی تباہی کے دو خاص اسباب تھے۔ ایک تو قومی غرور و تفاخر اس لئے کہ نپولین کے عروج کا زمانہ ابتک فرانس کو یاد تھا جب کہ اس کے سپاہی یورپ کی قسمت کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور نپولین کی فوجی سطوت و جبروت کے ناخوشگوار نتائج و انجام لوگوں کی نظروں سے محو ہو رہے تھے۔ اس پرشکوہ عہد حکومت کے مقابلہ میں لوئی فلپ کا زمانہ ہیچ معلوم ہوتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ فرانس تو انگلستان کا حلقہ بگوش ہو گیا ہے اور کسی معاملے میں اپنی رائے نہیں رکھتا تھیر (Thiers) نے مدح سرائی کے پیرائے میں نپولین کے سوانح لکھے اور جب دسمبر ۱۸۴۰ء میں نپولین کی نعش جو سینٹ ہیلینا (St. Helena) میں دفن کر دی گئی تھی لائی گئی اور بہتم بالشان جلوس و رسوم کے ساتھ پیرس کے "ہوٹل ڈیزانیولیڈ" (Hotel des) (Invalides) میں رکھی گئی تو لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ متوفی سپہ سالار پھر زندہ ہو کر آرلینسی (Orleanist) حکومت کو اکھاڑ کر پھینک دے گا۔

نئے نئے خیالات

شہنشاہی خیالات کے ساتھ ساتھ دماغی و ذہنی تحریکات بھی شروع ہوئیں جیسے کہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے قبل ہوئی تھیں۔ پھر لوگوں کے ذہن میں ایک نایاب نظریہ گردش کرنے لگا اور موجودہ نظام سے بہتر و مناسب و خوش آئند نظام قائم کرنے کا امکان نظر آنے لگا۔

فوریئے (Fourier) اور سین سیموں (St. Simon) نے معاشرتی اصلاح وتنظیم کی تفصیلی تجویزیں پیش کیں لیکن مستقبل قریب کے لئے لوئی بلانک (Louis Blanc) کی تحریک اشتراکیت زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی

لوئی بلانک

اس کی تحریک موجودہ زمانہ کی اشتراکیت سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے اس کے خیالات جدید نہ تھے بلکہ ان خیالات وعقائد کا ظہور انقلاب کے زمانہ میں بھی ہو چکا تھا بلکہ یونان کے فلسفی بھی ان خیالات سے آشنا تھے۔ فرق اسقدر تھا کہ اب زیادہ تعین وتصریح کے ساتھ ان خیالات کی اشاعت وتبلیغ ہونے لگی اور عمدہ تقریروں کے ذریعے سے یہ خیالات ذہن نشین کرائے جانے لگے لوئی بلان نے فرانس کی موجودہ تمدنی حالت کا نہایت بدنما اور خوفناک نقشہ پیش کیا اس نے مطالبہ کیا کہ حکومت کو چاہئیے کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام دے ورنہ ہم کام کرکے زندگی بسر کرینگے یا لڑکر مرجائینگے" یہ اصول سارے پیرس کی زبان پر تھا۔

جمہوریت ثانی

مخالفین حکومت کی کل توجہ طریقہ انتخاب کی اصلاح سے وابستہ تھی تاکہ رعایا کو حقیقی اختیارات حاصل ہوسکیں ممکن تھا کہ لوئی فلپ تشدد یا گفت وشنید سے اس مسئلہ کا تصفیہ کرلیتا مگر وہ تاب مقاومت نہ لاکر فوراً انگلستان کو چلدیا اس کے جانے کے بعد ایک جمہوری حکومت کا اعلان ہوا جس میں لوئی بلانک اور اس کے خیالات وعقائد کا زیادہ اثر تھا۔

قومی کارخانے

لیکن اس حکومت کو شروع سے ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مجلس (Assembly) کے انتخاب میں اعتدال پسندوں کی اکثریت رہی۔ پیرس میں ایک "قومی کارخانہ" قائم ہوا جس میں ہر طالب روزگار کو کام پر لگانے کا انتظام تھا لیکن جو لوگ اس کے منتظم تھے ان کو اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ یہ تجویز کامیاب ہو چنانچہ اخراجات بہت بڑھ گئے اور کام جو ہوتا تھا وہ کسی کام کا نہیں۔ آخر کار جون ۱۸۴۸ء میں کارخانے بند کردئے گئے جس کے سبب سے پیرس کے مزدوروں نے ہنگامہ بپا کردیا کیونکہ وہ پہلے ہی سے لوئی بلانک کے خیالات وعقائد کے زیر اثر تھے۔ راستے رک گئے اور چار روز تک لڑائی جھگڑا ہوتا رہا آخر کار کاوی نیاک (Cavaignac) نے

بڑی خونریزی کے بعد بلوہ فرو کیا، اور دو ہزار آدمی الجزائر (Algiers) کو جلا وطن کر دیئے گئے مجلس (Assembly) پھر برسر اقتدار ہو گئی اور دستور سازی کے کام میں معروف ہو گئی لیکن کوئی جماعت یا فرقہ مجلس کو محبوب نہیں رکھتا تھا خصوصاً پیرس کے مزدور پیشہ لوگ تو اس سے نفرت کرتے تھے۔

لوئی نپولین

ایسی حالت میں لوئی نپولین کو اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ لوئی نپولین اسی لوئی بوناپارٹ کا بیٹا تھا جس کو اس کے مشہور بھائی نے ہالینڈ کا تخت و تاج دیدیا تھا نپولین کے خاندان کا بزرگ ترین رکن اس وقت لوئی نپولین ہی تھا فرانس سے وہ جلاوطن کر دیا گیا تھا اور دوبارہ بغاوت پھیلانے کی بھی احمقانہ کوشش کر چکا تھا اب وہ مجلس (Assembly) کا ایک رکن ہو گیا اور جب یہ تصفیہ ہو گیا کہ جمہوریہ کی صدارت کا تصفیہ کل رعایا کی رائے پر ہو گا تو وہ بھی صدارت کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اس کا خاندانی نام ہی اس کی سفارش کے لیے کافی تھا اور دوسرے امیدوار کسی نہ کسی وجہ سے ہر دلعزیز بھی نہ تھے ۵½ کروڑ رائیں اس کے موافق آئیں دوسرے تمام امیدوار مل کر بھی دو کروڑ رائے نہ حاصل کر سکے

نپولین کا آخری داؤں

صدارت سے شاہی تخت پر اس کا عروج اس کے چچا کی کانسلی سے شاہی تخت پر پہنچنے سے بھی زیادہ جلد ہوا موجودہ مجلس ایک محدود حلقہ رائے دہندگان کی منتخب کردہ تھی اور نپولین عام انتخاب کا حامی تھا لیکن مجلس اس قسم کا تغیر نہیں چاہتی تھی اور اکثریت بھی اسی خیال کی تھی لیکن یہ اکثریت اس قدر نہیں تھی جتنی کہ دستور کے بموجب ہونی چاہیئے تھی۔ یہ دیکھکر نپولین ویسا ہی داؤں چلا جیسا کہ اس کا چچا برومیر (Brumaire) کے انقلاب میں چلا تھا۔ مخالفین کے سرگروہوں کو اس نے گرفتار کرا لیا اور مجلس کو برخاست کر دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں اس کے مخالفین گرفتار ہوئے اور ہزاروں ہی کی تعداد میں وہ جلاوطن کر دیئے گئے اس کے بعد اس نے رعایا کے سامنے دستور کا ایک خاکہ پیش کیا۔ عوام کی منتخب کردہ ایک مجلس وضع قوانین قائم ہونا طے پایا۔ جس کو قانون بنانے اور محاصل جاری کرنیکا اختیار ہو اور جس کا صدر نشین دس سال کے لئے منتخب کیا جائے۔

ساڑھے سات کروڑ نے اس نئے دستور کی موافقت میں رائے دی اور نصف کروڑ سے کچھ زیادہ نے مخالفت کی اس طور پر اس کو با اقتدار و ذی اثر حیثیت حاصل ہو گئی لیکن اس کے تو دل سے لگی ہوئی تھی کہ اس سے بھی بلند رتبہ اور موروثی عہدہ حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے اس لئے قوم سے دریافت کیا گیا کہ کیا قوم اس کو بادشاہ بنانا چاہتی ہے یا نہیں اور ۱۸۵۲ء میں (۷۸۰۰۰۰۰) رائیں اس کے موافق اور (۲۳۳۰۰۰) اس کے خلاف آئیں چنانچہ نپولین سوم کے لقب سے وہ حکمرانی کرنے لگا۔ اس کی قسمت میں اٹھارہ سال کی حکومت لکھی تھی جو ابتداءً تو بہت ہی شاندار رہی پھر اس کے بعد کامرانی و ناکامی یکے بعد دیگرے رونما ہوتی رہیں اور انجام ایسا افسوس ناک ہوا کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔

فرانس میں اتنے سالوں تک انقلاب اور ردعمل کی وجہ سے بقیہ یورپ وسطی میں بھی اسی قسم کے تغیرات ہوتے لگے کسی انگریزی شاعر نے جو جمہوری خیالات کا تھا کیا خوب کہا ہے کہ:

ایک قوم دوسری قوم کو بیدار کرتی ہے

اور ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو فنا کردیتا ہے

یورپ میں انقلاب اور ردعمل

تقریباً تمام یورپ میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ پیرس سے لوئی فلپ کی فراری کا حال تو بیان ہی ہو چکا تھے۔ فریڈرک ولیم چہارم کو بھی برلن سے بھاگنا پڑا اور فرڈیننڈ اول کو بھی اپنا دارالسلطنت وی آینا خطرناک انقلابیوں کا مرکز نظر آنے لگا تھا سسلی میں شاہ فرڈیننڈ دوم معزول کر دیا گیا تھا اور روم کے ہنگاموں و شورش کی وجہ سے پوپ پایس یازدہم (Pius XI) کو وہاں سے بھاگنا پڑا بہتوں کو خیال ہوا تھا کہ اب یورپ سے شاہی حکومت کا ازالہ ہو جائے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ردعمل بھی شروع ہو گیا۔ اور جبر روم کی واپسی کے ساتھ ساتھ بجز فرانس کے بقیہ تمام جلاوطن شدہ بادشاہ اپنے ملک کو واپس

آ گئے اور بعضے آخر زندگی تک بعضے چند سالوں تک حکمراں رہے۔

وائینا (Vienna) میں بغاوت

ان تمام شورشوں کا مقصد آزاد دستور کا قیام اور قومی نصب العین کا حصول تھا معاشرتی اصلاح کی کوشش جس کا پیرس میں بہت زور تھا دوسرے ممالک میں زیادہ کارگر نہ ہوئی۔

میٹرنک (Metternich) نے آسٹریا کے لوگوں کو ان خیالات سے بے خبر رکھنے کی بہتری کوشش کی اور بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا ہے مگر اندرونی طور پر ایک خطرناک جذبہ پرورش پا رہا تھا اور بجز میٹرنک کے آسٹروی حکومت میں کوئی با اثر آدمی نہیں تھا۔ بادشاہ ضعیف العقل تھا اور کسی دوسرے کو میٹرنک نے اپنا جانشین ہونے کا اہل نہیں بنایا تھا ۱۸۴۸ء میں بمقام وائینا ایک ہنگامہ ہوا جس کی وجہ سے میٹرنک استعفا پیش کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس کے بعد ہی ایک "نیابتی مجلس" (Constituent Assembly) منعقد ہوئی اور جاگیری عہد کی خرابیوں کا ازالہ کیا گیا اور تمام سلطنت کے لئے ایک نیا دستور تیار ہونے لگا۔

بوہیمیا (Bohemia)

لیکن وائینا (Vienna) میں فساد ہونے کی وجہ سے تمام آسٹروی سلطنت میں ایک خوفناک ہنگامہ و شورش کی آگ لگ گئی۔ کچھ عرصے سے بوہیمیا میں قومی جذبہ و احساس بڑھ رہا تھا اور آسٹروی حکومت کا جوا اس کے کندھوں پر ناگوار معلوم ہو رہا تھا اب اس نے مطالبہ کیا کہ چیک (Czechs) قوم والے اصلی باشندوں کو جرمن رعایا کے مساوی حقوق عطا کئے جائیں اور بعد میں ایک عام سلیوانی (Pan-Slavist) کانگرس کے پراگ (Prague) میں منعقد کرنے کی تجویز ہوئی تاکہ جملہ سلیوانی قوم کے مستقبل کے متعلق کوئی انتظام اور کاروائی کی جائے

ہنگری (Hungary)

ہنگری کے صوبہ میں اس سے بھی زیادہ شورش ہو رہی تھی وہاں کے ماگیار (Magyar) باشندوں کے ساتھ دیگر ممالک شلاً رومانیہ، پولینڈ، سردیا وغیرہ کے لوگ آکر آباد ہو گئے تھے گو ماگیار قوم سب سے زیادہ با اثر تھی ۱۸۴۸ء

میں ایک مجلس دئیت (Diet) منعقد ہوئی جس میں انھوں نے بہت سے اصلاحات کا مطالبہ کیا اور بالآخر اعلان کر دیا کہ ہنگری - آسٹریا کی ماتحتی سے بالکل آزاد و خود مختار ہے البتہ شہنشاہ کی ظاہری اطاعت اب بھی انھوں نے قائم رکھی۔ اور اپنے کو جس حیثیت میں وہ رکھنا چاہتے تھے وہ تقریباً نصف صدی قبل کے نمونے کی سوراجی حکومت کی تھی۔ کوسوتھ (Kossuth) نامی ایک شخص جو اب تک بحیثیت ایک صحاف کے مشہور تھا اس خیال و تحریک کا بانی مبانی تھا۔

اٹلی میں انقلاب

آسٹریا کے اطالوی مقبوضات بھی مسلح بغاوت پر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے یہ علاقہ بہت زرخیز خوش حال اور آسٹریا کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا اطالوی اتحاد و خود مختاری کا خیال نپولین کے فتوحات اور اس کے طرز عمل کی بدولت پیدا ہو گیا تھا اور مازینی (Mazzini) کے پرجوش تصانیف نے اس جذبہ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا اور اس نے اس مقصد کے حصول کے لئے "نوجوان اٹلی" (Young Italy) کے نام سے ایک عضوبت بھی تیار کر لی تھی۔ میلان (Milan) نے بغاوت کر دی اور آسٹریا والوں کو نکال باہر کر دیا وینشیا (Venice) نے جمہوری حکومت کا اعلان کر دیا آسٹریا کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ کرنے کی طاقت و قابلیت تو باغیوں میں نہیں تھی مگر ان کو پیڈمانٹ (Piedmont) اور سارڈینیا (Sardinia) کی دلی امداد کا بھروسہ تھا اور ان کو یہ بھی علم تھا کہ آسٹروی خود اپنے وطن کے مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ شروع شروع وہ لوگ کامیابی سے سرخرو ہوتے رہے اور آسٹروی فوج میلان کے علاقہ سے نکال دی گئی۔

سلطنت آسٹریا میں ردعمل کی کامیابی

آسٹروی سلطنت کی تباہی و بربادی کے آثار نمایاں تھے لیکن اس کی محکوم اقوام کی باہمی جنگ و جدال اور روس کی بروقت امداد نے اس کو اس انجام سے بچا لیا روس نے بہت مستعدی سے سرحدی بغاوت کے فرو کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ شہنشاہ فرڈیننڈ تخت سے دست بردار ہو گیا اور اس کی جگہ فرانسس جوزف (Francis Joseph) جو صرف اٹھارہ سال کا تھا

شہنشاہ ہو گیا اصلی وحقیقی انتظام توشوا رزن برگ (Schwarzenberg) نامی ایک شخص کے ہاتھ میں تھا جو نہایت مستعد اور پختہ مغز آدمی تھا سب سے پہلے بوہیمیا کی تحریک وشورش کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد شمالی اٹلی کی باری آئی آسٹروی سپہ سالار راڈز کی (Radetzky) کی مدد کے لئے تازہ دم فوج بھیجی گئی۔ اور ادھر البرٹ (Albert) شاہ سارڈینیا نے اپنی فوجوں کو سنبھالنے میں نالایقی ظاہر کی جس کا انجام یہ ہوا کہ جولائی ۱۸۴۸ء میں بمقام کسٹوزا (Custozza) اس کو شکست ہوئی اور مارچ ۱۸۴۹ء میں بمقام نووارا (Novara) اس کا قلع قمع ہو گیا۔ اس طور پر آسٹریا کو اپنے مقبوضات واپس مل گئے۔ شاہ سارڈینیا تخت سے دست بردار ہو گیا اور اس کی جگہ پر اس کا بیٹا وکٹر امانوئیل (Victor Emmanuel) سارڈینیا کا بادشاہ ہوا جس نے اپنے خاندان کے آزاد و آئینی روایات کو زندہ رکھا اور آخر میں "متحدہ اٹلی" کا تاجدار ہو کر مرا۔ ہنگری اب تک آسٹریا کے مقابلہ میں پامردی سے کھڑا رہا۔ مگر رفتہ رفتہ یہاں بھی آسٹریا کا پلہ بھاری ہوتا گیا۔ دستوری آزادی کی تحریک کو نقصان پہنچا۔ وائینا سے کوئی مدد ملنے کی امید باقی نہ رہی تھی کیونکہ وہاں تو ردعمل کامیاب ہو چکا تھا اور احرار کو سخت سزائیں مل چکی تھیں۔ اپریل ۱۸۴۹ء میں کاسُتھ نے حماقت سے اعلان کر دیا کہ ہنگری صرف آسٹریا کے دستور سے قطع تعلق کر کے آزاد نہیں ہے بلکہ شہنشاہ سے بھی اور اس کی اطاعت سے ہنگری کو کوئی تعلق نہیں ہے

ہنگری میں انقلاب کی ناکامی

شروع میں کچھ کامیابی حاصل ہونے سے اس کو امید بندھ گئی تھی مگر سرویا اور رومانیا والے اور کروٹی لوگ ماگیار (Magyar) قوم کے خلاف آسٹریا کے طرفدار ہو گئے کاستھ خود فن سپہگری سے بے بہرہ تھا اور فوجی سرداروں سے وہ لڑتے جھگڑنے لگا سب سے زبردست صدمہ روس نے پہنچایا کیونکہ اس فتنہ انگیز تحریک کو فنا کر دینے کے لئے زار روس بھی آمادہ ہو گیا اور اس نے اپنی افواج قاہرہ آسٹروی فوج کی مدد کے لئے بھیجدیں۔ اگست ۱۸۴۹ء میں مگیر فوج نے ولاگوس (Villagos) کے مقام پر ہتھیار ڈال دیئے۔ کاستھ دوسرے ملک میں بھاگ کر پناہ گزین ہوا۔ اسکی تحریک کی قطعی تباہی و بربادی نظر آنے لگی لیکن بیس ہی سال

کے اندر اس کے ہموطنوں نے اس میں سے بہت کچھ حاصل کر لیا۔

جرمنی

جرمنی کی حالت زیادہ پیچیدہ تھی۔ عام طور پر جرمنی میں ایک آئینی تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ کل جرمنی کو ایک باثر وفاقی دستور حاصل ہو جائے اور پر اشیا میں تو سخت انقلابی تحریک نشوونما پا رہی تھی۔ شروع میں تو دونوں کامیاب رہے مگر آخر کار دونوں کو ناکامی ہوئی۔ ۱۸۱۵ء میں جو جرمن وفاقیہ قائم ہوئی تھی وہ حقیقت میں کوئی حکومت نہ تھی بلکہ مدبرین کی ایک مجلس تھی جو تاوقتیکہ کلیتاً متفق نہ ہو کوئی کارروائی نہیں کر سکتی تھی اور اس مجلس میں آسٹریا سب پر حاوی تھا۔ جس کی وجہ سے جرمن قوم کو کوئی فائدہ اس سے نہیں پہنچا ۱۸۴۸ء کے کامیاب فرانسیسی انقلاب سے نئی امیدیں پیدا ہو گئیں تھیں اور آسٹریا بھی متعدد شورش و ہنگاموں کی وجہ سے کچھ مخالفت نہ کر سکا۔ چنانچہ حیرت خیز سہولت سے فرینک فورٹ (Frankfort) میں ایک

فرینک فورٹ (Frankfort) کی پارلیمنٹ

جرمن پارلیمنٹ منعقد ہوئی تاکہ جرمنی کے لئے کوئی دستور ترتیب دیا جائے۔ حریت پسندوں کو کامیابی کی قوی امید تھی لیکن حالات ایسے موافق نہ تھے جیسا کہ پہلے پہل معلوم ہوا تھا پارلیمنٹ بحث مباحثہ تو کر سکتی تھی مگر قطعی فیصلہ کا اس کو کوئی اختیار نہ تھا۔ جو کچھ تصفیہ بھی ہوتا اس کو جرمنی کی مختلف مملکتوں کے پاس پیش کرنا ضروری تھا اور جب بحث مباحثہ کا وقت آیا تو آسٹریا کی وجہ سے بہت

آسٹریا کی مشکلات

دشواریاں پیش آنے لگیں۔ سوال یہ تھا کہ آیا آسٹریا بھی سلطنت جرمنی کا جزو سمجھا جائے یا نہیں اور اگر اس کو شامل کر لیا جائے تو کیا آسٹریا کی کل اٹھائیس کروڑ رعایا کو جرمن پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق حاصل ہو گا یا صرف چار کروڑ جرمن نژاد رعایا کو اگر کل آسٹریا کو شریک کر لیا جاتا تو پھر جرمنی کے اغراض و مقاصد پورے نہیں ہو سکتے تھے اور اگر آسٹریا کے غیر جرمن رعایا کو خارج کر دیا جاتا تو آسٹروی شہنشاہ اپنی جرمن رعایا کو بھی شرکت کی اجازت نہ دیتا اور اگر آسٹریا کو بالکل ہی خارج کر دیا جاتا تو وہ نئے دستور کا سخت دشمن ہو جاتا اور اس کی دشمنی خطرناک ثابت ہوتی۔

سلطنت جرمنی پراشیا کو دی جاتی ہے

آخرکار آسٹریا کو خارج ہی کر دینے کی صلاح ہوئی گو اس کی وجہ سے اس کی مخالفت وعداوت کا خمیازہ بھی کیوں نہ برداشت کرنا پڑتا باوجود سخت مخالفت کے اکثریت نے پھر سے سلطنت جرمنی کے قیام کا اعلان کر دیا اس سلطنت کے صدر کو "شہنشاہ جرمن" کا لقب دیا گیا اور یہ عہدہ موروثی قرار دیا گیا پھر اس کے بعد یہ عہدہ فریڈرک ولیم چہارم شاہ پراشیا کو پیش کیا گیا (مارچ ۱۸۴۹ء)۔

پراشیا انکار کرتا ہے۔

اب ہم بتلانا چاہتے ہیں کہ پراشیا (Prussia) تو خود انقلابی تحریک کے روک تھام میں مصروف تھا اور اس کے بادشاہ کو اس نئے اور خطرناک لقب کے اختیار کرنے میں تامل بھی تھا کیونکہ یہ لقب ایک ایسی مجلس دے رہی تھی جس کو اس قسم کا اختیار حاصل ہونا بھی مشتبہ تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی آسٹریا کی عداوت مول لینا پڑتا تھا اس لئے اس نے انکار کر دیا اور اس کے انکار کے ساتھ یہ تحریک ہی ہوا ہو گئی کچھ دنوں تک تو پارلیمنٹ قائم رہی مگر روز بروز اس کے اراکین کی تعداد کم ہوتی گئی یہاں تک کہ شاہ ورٹمبرگ نے اس کو توڑ دیا۔ جرمنی کے قومی نصب العین کا حصول پارلیمنٹی ذرایع سے ممکن نہ تھا۔

پراشیا

پراشیا (Prussia) کے حالات تو اس سے بھی زیادہ نازک صورت اختیار کی۔ ملک میں آئینی و دستوری زندگی کا وجود ہی نہ تھا۔ مرکزی حکومت کے کل اختیارات بادشاہ کے ہاتھوں میں تھے۔ عام فوجی ملازمت کا رواج تھا اور تعلیم کا انتظام بھی بہت معقول تھا۔ لیکن رعایا میں سیاسی احساس کا فقدان تھا۔

برلن میں انقلاب

۱۸۴۷ء میں بادشاہ نے ایک مجلس لینڈٹیگ (Landtag) کے نام سے منعقد کی جس کو اس نے اجرائے محاصل پر رائے زنی کرنے کا اختیار دیا اور قانون سازی میں مشورے کی حد تک اس مجلس کو اختیار دیا گیا لیکن قطعی حکم اور فیصلے کا اختیار نہیں دیا گیا وہ کہتا تھا کہ "خدا اور ملک کے قوانین کے مطابق بادشاہ کو اپنی آزاد رائے سے حکومت کرنا چاہیئے اور اکثریت کی رائے کا پابند رہنا

بالکل غیر ضروری ہے" اس لئے جب مجلس نے کامل اختیارات کا مطالبہ کیا تو اس کو برخاست کر دیا گیا لیکن عین اس وقت پیرس میں فساد و انقلاب برپا ہونیکی خبرنے تمام برلن میں جوش پھیلا دیا راستے بند ہو گئے اور شہر میں سخت جنگ و جدال کی صورت پیدا ہو گئی اور آخر میں بادشاہ نے ہار مان لی اس نے اعلان کر دیا کہ آج کی تاریخ

پراشیا کو جرمنی میں ضم کر دینے کی تجویز

سے پراشیا جرمنی میں شامل سمجھا جائیگا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ایک قومی مجلس کے انعقاد کی منظوری بھی دیدی جس کو ایک تفصیلی دستور مرتب کرنے کا اختیار دیا گیا اس مجلس نے آزادانہ انداز میں کام کرنا شروع کیا اور جاگیرداری و شخصی اختیارات کو منسوخ کر دیا

پراشیا میں ردعمل کی کامیابی

لیکن وائینا میں انقلابیوں کی شکست اور شہنشاہی فوجوں کے فتوحات کی خبر نے شاہ پراشیا کی ہمت بڑھادی اور اس نے مجلس پر پھر حملہ کرنے کی ٹھان لی جس کے ناگوار مباحث باعث اہانت ہو رہے تھے اس نے برینڈنبرگ (Brandenburg) کو جو انتہا کا رجعت پسند تھا وزیر بنا لیا۔ مجلس کو حکم دیا گیا کہ برلن چھوڑ دے اور اس کے انکار پر فوج نے اس کو برخاست کر دیا۔ دسمبر ۱۸۴۸ء میں بادشاہ نے اپنی مرضی کے مطابق ایک دستور تیار کیا اور اب شاہی اقتدارات محفوظ ہو گئے۔

پراشیا اور آسٹریا کی رقابت

اندرون ملک کے انقلاب پر فتح پانے کے بعد بھی فریڈرک ولیم چہارم جرمنی کے تخت و تاج کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا حالانکہ یہ عطیہ فرینک فورٹ (Frankfort) کی انقلابی جماعت اس کے سامنے پیش کر رہی تھی چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس نے "اس مٹی اور لکڑی کے تاج" کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس نے جرمنی میں ایک نئی عضویت اور ایک نیا نظام قائم کرنا چاہا کل جرمن حکومتوں کو برلن میں مدعو کیا گیا تاکہ از سر نو ایک وفاقی دستور مرتب کیا جائے پہلے ہی سے یہ ظاہر تھا کہ اس طور کی نئی حکومت تمام جرمنی پر حاوی نہ ہوگی کیونکہ آسٹریا (Austria) و بویریا (Bavaria) نے شرکت سے انکار کر دیا اور ہنوور و سیکسنی بھی بعد میں الگ ہو گئے آخر میں پراشیا کو صدر بنا کر شمالی جرمنی کی ایک وفاقیہ قائم ہوئی اور تقریباً

اٹھائیس مملکتوں نے اس دستور کو منظور کر لیا آسٹریا نے جواب میں فرینکفورٹ کی مجلس وفاقی کو پھر قائم کر دیا اس طور پر جرمنی میں دو ہمسر مجلسیں پیدا ہو گئیں جن میں جرمنی کی دو ممتاز مملکتیں صف آرا تھیں اور دونوں مملکتیں اپنی اپنی مجلس میں حاوی تھیں۔

آسٹریا کی فتح

شروع سے ان دونوں مجالس میں تصادم کے آثار نمایاں تھے۔ ہسی کیسل (Hesse Cassel) کی مملکت کے متعلق نزاع ہونے سے آخر کار کھلم کھلا مخالفت شروع ہو گئی۔ پروشی مجلس وفاقیہ تو ہسی کیسل کی مختلف "مملکتوں" کی طرفدار تھی اور ہسی کیسل کی حکومت نے فرینکفورٹ کی مجلس وثیت سے فریاد کی ممکن تھا کہ اس کشمکش میں پراشیا کو فتح حاصل ہوتی مگر اس کا تاجدار اور اس کے مدبرین بزدل اور پست ہمت تھے۔ برخلاف اس کے آسٹریا کی طرف شوارزن برگ (Schwarzenburg) ایسا حوصلہ مند۔ دوراندیش اور مستعد آدمی کام کر رہا تھا بعضوں کا خیال ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو آسٹریا کی ویسی ہی خدمت کرتا جیسی کہ بسمارک نے پراشیا کی کی۔ ہسی کیسل کا معاملہ زار روس کے پاس بغرض تصفیہ پیش ہوا جس نے ہربات آسٹریا کی مرضی کے مطابق تصفیہ کی۔ اس کامیابی کے بعد شوارزن برگ نے اس مجلس وفاقیہ کے شکست کر دینے کا مطالبہ کیا جو پراشیا کی سرکردگی میں قائم ہوئی تھی اور فرینکفورٹ میں آسٹریا نے جو مجلس وثیت قائم کی تھی اس کو سب سے تسلیم کرانے کا مطالبہ کیا پراشیا نے مقابلہ کا خیال چھوڑ دیا اور بمقام المٹز (Olmutz) نہایت ذلت کے ساتھ ہر شرط کو قبول کر لیا۔

اب کل جرمنی پر آسٹریا حاوی نظر آنے لگا اور پراشیا کے تفوق کی ساری امیدیں خاک میں ملتی ہوئی معلوم ہونے لگیں مگر قسمت میں بالکل ہی مختلف واقعات دونوں ممالک کے لئے لکھے تھے۔ اور المٹز (Olmutz) کی ذلت آمیز ہزیمت نے دوسری پشت کے مدبرین کو پراشیا کا طرز عمل بدل دینے پر آمادہ کر دیا۔

حوالۂ کتب متعلق باب ہذا:-

(۱) تاریخ یورپ مصنفۂ فائف (Fyffe)
(۲) "حالیہ یورپ" مصنفۂ الی سن فلپس (Alison Philips)
(۳) "حالیہ فرانس میں انقلاب و ردعمل" ڈکنسن (Dickinson)
(۴) کیمبرج کی "تاریخ حال" باب دہم۔
(۵) "حالیہ یورپ کی سیاسی تاریخ" از سینو باس (Seignobos)

باب ہیژدہم

اطالوی اتحاد کا حصول

نپولین سوم کی حیثیت اور اس کا مرتبہ

۱۸۵۲ء میں نپولین سوم تمام یورپ میں سب سے زیادہ قوی و مقتدر نظر آتا تھا اس کی قابلیت اور چال چلن کا صحیح اندازہ تو ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کی کامیابی میں کوئی شبہ باقی نہ تھا۔ فرانس کی کثیر التعداد رعایا اعلان کر چکی تھی کہ اس کو بے انتہا مسرت اس بات سے ہوتی تھی کہ فرانس میں پھر نپولین کے نام کا شہنشاہ حکومت کر رہا تھا اسلیئے موجودہ نپولین کا سابقہ نپولین سے تقابل ایک قدرتی امر تھا اور گو دونوں کے سوانح و مراتب میں ایک گونہ مماثلت ضرور تھی مگر دونوں میں فرق بھی بہت زیادہ تھا اور یہ فرق امتداد زمانہ سے اور بھی نمایاں ہوتا جاتا تھا نپولین سوم ہونہار آدمی تھا مگر اس میں نپولین اول کی سی مستقل مزاجی اور مستعدی نہیں تھی اور سیاسی و معاشرتی اُموریں اتنی وسعت نظر بھی اسے نہیں حاصل تھی اور فوجی قابلیت و ذہانت تو بالکل مفقود تھی۔ وہ فطرتاً خوش دل اور تخیل پسند واقع ہوا تھا اور ہمیشہ خیالی گھوڑے دوڑایا کرتا گو بعض اوقات یہ خیالات واقعیت کا جامہ بھی پہن لیتے تھے تدبیر و دانشمندی میں بھی وہ کم نہ تھا مگر بعض اوقات زندگی کے حقیقی و امکانی واقعات کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا ایک بات میں البتہ وہ نپولین اول کے بالکل مماثل تھا یعنے یہ کہ وہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا تھا اس کے اقتدار کا دارومدار اس پر تھا کہ وہ اپنے ہموطنوں کو نئے نئے کارناموں اور جدید فتوحات اور جدت آفرینیوں سے حیرت میں ڈالے رکھے معمولی اور درمیانی طرز عمل

اس کی طاقت کو کمزور کر دینا تھا اور ناکامی و شکست کے بعد تو اس کا تخت پر رہنا ممکن نہ تھا۔

ترکی کا زوال و انحطاط

سب سے پہلا یورپی معاملہ جس میں اس کو دخل دینا پڑا ترکی طاقت کے انحطاط و زوال کی وجہ سے پیش آیا۔ سترھویں صدی سے ترکی مسلسل رو بہ زوال رہی اس کے اسباب و علل بھی ظاہر ہیں یورپ میں ترک اقلیت میں تھے اور تلوار کے بل پر اپنا اقتدار قائم و برقرار رکھے ہوئے تھے جن اقوام کو انھوں نے فتح کیا تھا ان کو ملا لینے یا ان سے کوئی مفاہمت کر لینے کی بھی انھوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ یورپین تہذیب و تمدن کو وہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے اس کو اختیار بھی نہیں کیا ترکی میں گویا فوجی استبدادی حکومت تھی جہاں نہ تو صنعت و حرفت تھی نہ علم و حکمت اور نہ آزادیٔ خیال۔ تاریخ میں کوئی کلیہ قائم کرنا خطرناک ہے لیکن یہ کہنے میں کوئی ہرج نہیں کہ اس نمونے کی سلطنت زیادہ دنوں ہرگز نہیں ٹھہر سکتی تھی ۱۵۷۱ء میں بمقام لیپانٹو (Lepanto) ہسپانیہ اور اس کے شرکاء نے ترکوں کو جو بحری شکست دی تھی اس سے دولت عثمانیہ

روس کا خطرناک پڑوس۔

اب تک سنبھلنے نہ پائی تھی اور ۱۶۸۳ء میں محاصرۂ وائنا میں جو ہزیمت و تباہی ہوئی اس سے ظاہر ہوگیا کہ ترکی کی بڑی فوج بھی مغربی یورپ کی فوجوں کا مقابلہ اب نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں اس کی شمالی سرحد پر اٹھارھویں صدی میں روس اس کے لئے ایک بہت خطرناک سخت گیر اور جنگجو پڑوسی بن گیا تھا یہ عداوت کچھ تو اختلاف مذہب کی وجہ سے تھی اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ بحر اسود سے باہر نکلنے کا راستہ قسطنطنیہ کے ہاتھوں میں تھا اور بحر اسود کا شمالی ساحل روس کے قبضے میں تھا۔

جنگ کریمیا کی ابتدا

جنگ کریمیا (Crimea) کا سبب ایک معمولی واقعہ تھا۔ بیت المقدس (Jerusalem) کے گرجا اور تعلق

عیسائیوں میں مقامات مقدسہ کے متعلق کچھ نزاع پیدا ہوئی اور اس جھگڑے میں روس اور فرانس بھی آپڑے کہ دونوں فرقوں کے یہی دونوں ممالک حامی و مددگار تھے۔ اس جھگڑے کے حیلے سے ایک روسی فرستادہ نے قسطنطنیہ میں آکر یہ مطالبہ پیش کیا کہ تمام ترکی سلطنت کی مسیحی رعایا کا حامی و مددگار روس کو تسلیم کر لیا جائے۔ یہ مطالبہ اگر تسلیم کر لیا جاتا تو دائمی مداخلت و دست اندازی کا ایک حیلہ روس کو ہاتھ آجاتا۔ اس وجہ سے ترکی نے انگریزی سفیر لارڈ اسٹرٹفرڈ ڈی ریڈکلف (Stratford de Redcliffe) کے اشارہ پر اس مطالبہ کو رد کر دیا۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے وائنا میں کانفرنسیں (مجلسیں) منعقد ہوئیں مگر کوئی تصفیہ نہ ہو سکا اور بالآخر ۱۸۵۳ء میں جنگ کا اعلان ہو گیا۔ دوسرے سال میں فرانس اور انگلستان ترکی کے ساتھ شریک ہو گئے۔ انگلستان تو تجارتی اغراض و فوائد کی حرص سے اور روس کے بڑھتے ہوئے اقتدار و قوت کے خوف و حسد سے، اور نپولین سوم فوجی فتوحات سے اپنی قوت و اقتدار کو تقویت پہنچانے کے خیال سے شریک ہو گئے تھے۔

کریمیا پر چڑھائی

روس نے پہلے بلقان (Balkan) پر چڑھائی کی لیکن خلاف امید وہاں سخت مقابلہ و مدافعت ہوئی اور مغربی دول کی افواج کے آتے ہی روس کو واپس ہونا پڑا۔ اب وقت صلح ممکن تھی مگر نپولین سوم اور برطانوی وزراء نے جزیرہ نمائے کریمیا پر فوج کشی کرنے کی ٹھان لی کیونکہ ان کو امید تھی کہ وہاں پر روسی بیڑے کو شکست دے کر تباہ و برباد کر دینا آسان ہے لیکن ایک مختصر لڑائی کے بجائے جیسا کہ پہلے خیال ہوا تھا دو سال تک جنگ کا دوران رہا جس میں مصارف بے انتہا بڑھنے لگے روسیوں کو الما (Alma) میں شکست ہوئی اور اگر اس کے بعد ہی فوراً حملہ

سباستاپول (Sebastapol) کا محاصرہ

کر دیا جاتا تو سباستاپول (Sebastapol) بھی فتح ہو جاتا لیکن روسیوں کو حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی مہلت مل گئی اور ٹوڈلبن (Todleben) کی سرکردگی

میں انھوں نے سخت مقابلہ کیا۔ انگریز۔ فرانسیسی اور ترکوں کی مدد کے لئے شاہ سارڈینیا نے ایک اطالوی فوج بھیجدی۔ ان لوگوں کو کوئی شکست تو نہیں ہوئی لیکن خوراک اور پوشاک کی قلت اور سرما کی شدت اور امراض کے شیوع سے ان لوگوں کو بہت مصیبت اور نقصان برداشت کرنا پڑا۔ روس سباستاپول کے درمیان کا راستہ بند نہیں ہوسکا اس وجہ سے ستمبر ۱۸۵۵ء تک وہ فتح نہیں ہوسکا۔

صلح پیرس

اور اس وقت جاکر جنگ ختم ہوئی صلح پیرس میں روسی لوگ ترکی کی مسیحی رعایا کی حمایت سے دست بردار ہو گئے اور روسیوں نے عہد کیا کہ بحر اسود میں وہ کوئی جنگی جہاز نہ رکھینگے ترکی کے تمامی حقوق تسلیم کر لئے گئے لیکن یہ معاہدہ ردی کا غذ تھا کیونکہ ترکی کا زوال رک نہیں سکتا تھا اور تھوڑے ہی دنوں بعد روس نے خشکی وتری دونوں طرف سے دوبارہ فوج کشی کر دی۔

جنگ کریمیا میں وہ خصوصیات مفقود تھیں جو انیسویں صدی کی لڑائیوں میں عام طور پر پائی جاتی تھیں۔ قومی جذبہ کا کوئی دخل ہی نہ تھا توازن طاقت اور سیاست کا سوال تھا اور اس حیثیت سے یہ جنگ اٹھارھویں صدی کی لڑائیوں سے مشابہ تھی لیکن نپولین سوم کو اس کے بعد ہی ایک دوسرے طرح کا سوال حل کرنا پڑا۔

۱۸۴۸ء کے بعد اٹلی کی حالت

۱۸۴۸ء کا اطالوی ہنگامہ ناکام ہوا تھا آسٹریا کی رجعت پسند حکومت ہمیشہ سے زیادہ مستحکم نظر آتی تھی۔ کوہ ایلپس (Alps) سے لے کر بحر آئی اونین (Ionian) تک جتنی حکومتیں تھیں بجز ایک کے سب کی سب قومیت و اغراض و جذبات کے لحاظ سے بالکل مختلف تھیں۔ اٹلی ہمیشہ کے طرح محض ایک "جغرافی نام" تھا یعنے اٹلی کے مختلف صوبے ایک دوسرے سے کوئی مماثلت وتعلق نہ رکھتے تھے لیکن اطالوی جذبہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا نہ وہاں کی رعایا ابھی تک آسٹروی حکومت سے مانوس ہوسکی تھی۔ اور اس قدر مختلف ومتفرق حکومتوں میں ایک حکومت خلاف دافتراق سے مستثنےٰ ابھی تھی

پیڈمانٹ اور سارڈینیا

پیڈمانٹ (Piedmont) میں جو کہ شاہ سارڈینیا کے زیر نگیں تھا ایک ایسی حکومت قائم تھی جو واقعی عام پسند تھی اور ترغیب و تحریص کے باوجود اس نے اب تک بہت سے آزاد اور نیابتی ادارے قائم کر رکھے تھے شاہ وکٹر امانوئل عظیم الشان شہرت حاصل نہیں کر سکا تھا مگر وہ بہادر سپاہی اور ایماندار مدبر تھا اسکے وزیر کاوور (Cavour) نے اعلےٰ خدمات انجام دیں اور جنگ

وکٹر امانوئل اور (Victor Emanuel) واٹر کے بعد سے تاریخ یورپ میں غالباً وہ سب سے

کاوور۔

نمایاں ہستی تھا۔ وہ پر جوش اطالوی محب وطن تھا اور سیاسی چالوں میں اپنی ذہنی خصوصیات رکھتا تھا لیکن انگلستان اور انگلستانی دساتیر سے وہ خوب واقف تھا اور اس کو اس بات پر فخر تھا کہ اس کو انگریزی طرز کا سیاس سمجھا جاتا تھا۔ اطالوی آزادی کی جدو جہد میں اس کی زندگی ختم ہوئی اور اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ اپنی عزت دنیا بھی گوارا کر سکتا تھا۔

کاوور (Cavour) اور نپولین سوم

کاوور کو دو قوتوں پر اعتماد تھا ایک تو اٹلی کے جذبہ حریت اور دوسرے پیڈمانٹ کی فوج پر لیکن یہ دونوں قوتیں آسٹریا والوں کو اٹلی سے نکال باہر کرنے کے لئے کافی نہ تھیں اس لئے با اثر امداد کے لئے اس کی آنکھ فرانس کی طرف اٹھتی تھی۔ نپولین کو اطالوی آزادی سے دلی ہمدردی تھی اور وہ ایسے موقع کا متلاشی تھا کہ اپنی سیاسی قابلیت اور فرانس کی طاقت کا مظاہرہ کر سکے۔ جولائی ۱۸۵۸ء میں اس نے کاوور سے بمقام پلومبیرز (Plombieres) ایک خفیہ ملاقات کی۔ دونوں میں یہ طے ہوا کہ اگر آسٹریا اور شاہ سارڈینیا

فرانس کے وعدے

میں لڑائی ہو جائے تو نپولین ۲ لاکھ کی فوج سے شاہ سارڈینیا کی امداد کرے گا۔ آسٹریا کو اٹلی سے بالکل ہی خارج کر دینے کی رائے ہوئی لمبارڈی (Lombardy) وینشیا (Venetia) اور وسط اٹلی کی ولایتیں پیڈمانٹ میں شریک کر دینے کی رائے ہوئی

فرانس کو بطور معاوضہ سیوائے (Savoy) اور نیس (Nice) کا علاقہ دینا طے پایا۔ خاندان سیوائے (Savoy) کا اصلی وطن یہی ملک تھا۔

کاوور جنگ کی آگ لگاتا ہے

یہ اب کاوور کا کام رہ گیا تھا کہ وہ جنگ چھیڑے۔ آخر وقت میں نپولین پس و پیش کرنے لگا لیکن کاوور نے اُسے اپنے وعدہ کے مطابق عمل کرنے پر تیار کر لیا اُس نے کہا کہ "بارود کو آگ تو میں لگا دوں گا اور جب اٹلی توپوں میں لت پت ہو جائے تو آپ قدم رنجہ فرمائے گا"۔ اٹلی کی فوجی تیاری دیکھ کر آسٹریا کو اندیشہ ہوا اور آسٹریا نے پیڈمانٹ کو فوج کو صلح و امن کے زمانہ کی تعداد تک محدود و تخفیف کرنے کا مطالبہ کیا اس طور پر کاوور نے توپ کی آواز سن لی جس کا وہ مدت سے منتظر و متمنی تھا پارلیمنٹ میں اُس نے کہا کہ "پیڈمانٹ کی یہ آخری پارلیمنٹ ہے آئندہ پارلیمنٹ سلطنت اٹلی کی پارلیمنٹ کے نام سے ہوگی"۔

میگنٹا (Magenta) اور سالفرینو (Solferino) کی لڑائیاں

نپولین سوم اپنے وعدہ پر قائم رہا فرانسیسی فوج کو لے کر بہ نفس نفیس وہ اٹلی میں داخل ہوا جون ۱۸۵۹ء میں سخت جدال و قتال کے بعد اس نے میگنٹا (Magenta) کی لڑائی فتح کی اور ختم ماہ پر پھر اس نے آسٹریوں کو سالفرینو (Solferino) کی جنگ میں شکست دی۔ گو دوران جنگ میں بڑی دیر تک پلہ برابر رہا اور بارہ ہزار فرانسیسی کام آئے۔ کاوور کو اپنی کل توقعات کے پورا ہونے کی اُمید قوی ہو گئی۔ لیکن نپولین سوم نے یکایک فرانسس جوزف

نپولین سوم کی دغابازی

(Francis Joseph) شاہ آسٹریا سے گفت و شنید کر کے صلح کر لی اس میں اس کی کیا غرض یا مصلحت تھی صحیح طور پر نہیں معلوم ہو سکا غالباً سالفرینو کے قتل و خونریزی کا اثر اس پر ہوا ہوگا اور فرانس کی فوجی قوت پر اس کو کامل بھروسہ نہیں باقی رہ گیا تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اٹلی والے اس کے کہنے کے مطابق ہر کام کرنے پر آمادہ نہیں ہیں حالانکہ اس نے برعکس توقعات قائم کر رکھے تھے سب سے

بڑی بات غالباً جرمنی کا خطرناک رویہ تھا کیونکہ پراشیا اپنی افواج کی نقل و حرکت کر رہا تھا۔ اس لئے صلح ہو گئی لمبارڈی و پارما (Parma) کو پیڈمانٹ میں شامل کر دیا گیا۔ وینس (Venice) حسب سابق آسٹریا کے تسلط میں رہا۔ پوپ (Pope) کی صدارت میں ایک اطالوی وفاقیہ کے قیام کی امیدیں دلائی گئیں۔ وکٹر امانویل کو آسٹریا و فرانس کی تجاویز رد کرا دینے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا لیکن کاوور اٹلی کی غداری سے آزردہ ہو کر اپنی خدمت سے مستعفی ہو گیا اور زندگی کے معمولی کاروبار میں مصروف ہو گیا۔

وسطی اطالیہ بھی قومی تحریک میں شریک ہوتا ہے۔

کاوور بڑی جلدی مایوس ہو گیا تھا۔ اٹلی کا فطرتی و خودرو جذبۂ حریت واتحاد اس قدر قوی تھا کہ فرانس اور آسٹریا کے شہنشاہوں کا روکا رک نہیں سکتا تھا۔ وسطی اٹلی، پارما (Parma) موڈینا (Modena) ٹسکنی (Tuscany) اور پاپائی مملکت کا شمالی حصہ یعنے روماگنا (Romagna) نے اپنے تاجداروں کو معزول کر دیا اور آپس میں متحد ہو گئیں۔ یہ تحریک ابتداءً جمہوری رنگ لئے ہوئی تھی جس کی وجہ سے پیڈمانٹ اس میں شریک نہیں ہوا اور گو ان مملکتوں نے پچیس ہزار کی فوج جمع کر لی لیکن آسٹریا اور پاپائے روم کے مقابلے کے لئے یہ فوج ناکافی تھی۔ اس لئے ان سب نے وکٹر امانوایل سے درخواست کی اس نے پہلے تو بظاہر انکار کر دیا لیکن کاوور چونکہ پھر وزارت پر بلا لیا گیا تھا اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ نئی تحریک بغیر فرانس کی اعانت کے کامیاب نہیں ہو سکتی اس لئے اس نے نپولین سوم سے گفتگو شروع کر دی اور سیوائے (Savoy) نیس (Nice) جس کے دینے کا وعدہ پلومبیرس (Plombieres) میں ہوا تھا مگر نپولین کے عدم تکمیل معاہدہ کی وجہ ایفا نہیں ہو سکا تھا۔ اب بھی دینے کا وعدہ کیا۔

سیووا (Savoy) اور نیس (Nice) فرانس کو مل جاتے ہیں۔

شاہ فرانس کو یوں بھی رضامند کیا گیا کہ وسطی اٹلی کے متعلق رعایا کی عام رائے لی جائے گی اور اگر رعایا کی خواہش نہ ہوگی تو اس کو پیڈمانٹ میں

پہلی اطالوی پارلیمنٹ

شریک نہ کیا جائے گا عام انتخاب میں تین لاکھ چھیاسی ہزار کی کثیر تعداد نے بمقابلہ پندرہ ہزار پیڈمانٹ میں شامل کر دینے کی رائے دی اپریل ۱۸۶۱ء میں وکٹر امانویل نے تورن (Turin) میں پہلی اطالوی پارلیمنٹ کا افتتاح کیا گو یہ شہر اٹلی کا دار السلطنت نہیں بننے والا تھا۔ گزشتہ تاریخ کے لحاظ سے روما ہی سب سے بہتر دار السلطنت ہو سکتا تھا لیکن روما اب تک پوپ کے قبضے میں تھا۔

اب کیا باقی رہ گیا تھا۔

اطالوی اتحاد کے قیام کی طرف قدم بڑھ چکا تھا لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ کل پاپائی مملکتیں انقلابی خیالات سے معمور تھیں لیکن پوپ پائس نہم (Pius IX) شروع میں ہی تربیت کے نتائج اور انجام سے مایوس ہو چکا تھا اس وجہ سے سیاسی آزادی اور اطالوی نجات کے سخت خلاف تھا جنوب میں صقالیہ (Sicily) کی دونوں مملکتیں بوربان خاندان کے فرانسس دوم کے تکلیف دہ و روبہ زوال حکومت میں تھیں۔ رعایا جاہل اور اوہام پرست تھی لیکن تغیر و آزادی کا مبہم تخیل ان کے دماغوں میں بھی پیدا ہو چکا تھا بغاوت کی بھی متعدد کوششیں ہوئیں مگر سب فرو کر دی گئیں۔

گیری بالڈی (Garibaldi) کا صقالیہ پر فوج کشی کرنا

اطالوی آزادی کی دوسری منزل کاوور سے زیادہ گیری بالڈی (Garibaldi) نے طے کی اس تحریک کا حامی سپاہی مبارز گویا گیری بالڈی تھا اور مدبر و سیاس کاوور اور واعظ و پیغمبر مزینی (Mazzini) تھا گیری بالڈی (Garibaldi) نے ۱۸۵۹ء کی فوج کشی میں نام پیدا کیا تھا جب کہ وہ ایک پلٹن کا جس کو "ایلپس کے شکاریوں" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے سردار تھا۔ اس مرتبہ اس نے ایک بہت بڑی مہم کی تیاری کی ایسی مہم جو کہ تاریخ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہی جا سکتی ہے۔ کاوور کے اشارہ پہ مئی ۱۸۶۰ء میں ایک ہزار بہتر رضاکاروں کو لے کر جنیوا (Genoa) سے وہ روانہ ہوا ان

رضا کاروں میں بہت سے تو اس کی پرانی پلٹن کے آدمی تھے اور بہت سے سچے دل کے وطن پرست تھے اور کچھ تھوڑے سے معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ اُن کی سُرخ قمیصیں ان کا خاص لباس تھیں اور یہ قمیصیں بہت جلد تمام یورپ میں قومی آزادی کا نشان مشہور ہوگئیں۔

صقالیہ (Sicily) اور نیپلس (Naples) فتح ہو جاتے ہیں

جنیوا (Genoa) سے وہ مارسلا (Marsala) کے بندرگاہ پر آکر اترا اور یہ دیکھکر کہ جرأت وشجاعت کے بغیر پناہ ملنا مشکل ہے اس نے بڑھکر پالرمو (Palermo) پر حملہ کر دیا اگرچہ غنیم ہمت اور استقلال سے کام لیتا تو گیری بالڈی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا مگر پالرمو والوں نے ہتھیار ڈالدیئے اور کل جزیرۂ سسلی اس کے قبضے میں آگیا۔ اتنا ہی بہت تھا مگر اس کے بعد اس سے بھی زیادہ اہم کارنمایاں ہوا نیپلس والوں کی غیر آسودگی و بے چینی پر بھروسہ کر کے اس نے آبنائے کو اگست ۱۸۶۰ء میں عبور کیا فرانسس دوم نے پہلے کوئی مقاومت نہیں کی اور مضحکہ خیز سہولت کے ساتھ گیری بالڈی اور قومی تحریک تمام ملک پر حاوی ہوگئی۔

کاوور اور گیری بالڈی

گیری بالڈی کی اس فاتحانہ رفتار سے کاوور کو مسرت بھی ہوتی تھی اور خوف بھی ہوتا تھا۔ حکومت نیپلس کی تباہی پر تو اس کو مسرت ہوئی مگر گیری بالڈی کے آیندہ کے منصوبوں کے متعلق اس کو خوف تھا کیونکہ گیری بالڈی کی بے کلی اور پرجوش طبیعت کاوور کے سے چالباز و صابر انسان سے مختلف تھی اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں سسلی (Sicily) اور نیپلس کو شمالی اٹلی کی حکومت کے ماتحت کرنے سے گیری بالڈی انکار نہ کردے جنوب میں کسی جمہوری حکومت کے قیام سے وہ خائف تھا اور اس کو یہ بھی خوف تھا کہ اگر "لال قمیص والے" اپنے قول کے مطابق پاپائی علاقے پر چڑھائی کریں گے تو غیر ملکی مداخلت اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائینگی آخرکار اس نے تہیہ کرلیا کہ گیری بالڈی پاپائی علاقہ میں گھس پڑے اور غیر ملکی مداخلت سے اس نے اس طور پر حفاظت کرلی کہ نیپولین سوم سے اس نے

پھر ایک ملاقات کی اس کے بعد ایک فوج تیار کر کے پاپائی علاقہ پر فوج کشی کر دی۔

پاپائی علاقہ پر چڑھائی۔

پاپائی حکومت نہ تو عمدہ تھی نہ ہر دلعزیز مگر جملہ یورپی دول نے اس کو تسلیم کر لیا تھا اس لئے کاوور کی چڑھائی بین الملی حقوق پر صریح حملہ تھی۔ وکٹر امانویل کو پوپ سے کوئی نسکایت نہ تھی لیکن پوپ کی بیس ہزار فوج کا البتہ شکوہ تھا اور اس نے اس فوج کے برخواست ہونے کا مطالبہ شروع کیا۔ جب پوپ نے اس مطالبے کو رد کر دیا تو اطالوی افواج نے حملہ کر دیا اور پوپ کی فوج کو بمقام کسل فیدارڈو (Castel Fedardo) شکست دیدی اور اس کے بعد فتحمند فوج نیپلس کی طرف بڑھی کاوور اب گیری بالڈی سے برابری پر ملنے کا مستحق ہو گیا تھا اور غالباً گیری بالڈی کے متعلق شبہ کرنے میں اس نے غلطی کی تھی۔ گیری بالڈی نے اپنے جدید مفتوحات وکٹر امانویل کے حوالہ کر دیئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں بادشاہ اور گیری بالڈی کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔

بادشاہ اور گیری بالڈی میں اختلاف

گیری بالڈی کو خیال ہوا کہ اس کے لال قمیص والے رضاکاروں کی خدمات کا واجبی اعتراف نہیں کیا گیا اور نہ ان کو معقول صلہ دیا گیا علاوہ ازیں کاوور کے ملکی و خارجی طرز عمل سے بھی اس کو اختلاف تھا اس وجہ سے ۱۸۶۰ء میں وہ بادشاہ کی ملازمت سے کبیدہ خاطر ہو کر علٰحدہ ہو گیا۔

اطالوی اتحاد کے حصول کی راہ بہت کچھ طے ہو چکی تھی لیکن پاپائی علاقہ کا ایک ٹکڑا جس میں روما بھی شامل تھا اب تک الگ تھا اس حصے پر ایک فرانسیسی دستۂ فوج نے قبضہ کر لیا تھا اور وینس دریائے ایدیج (Adige) سے مغرب کا علاقہ اب تک آسٹریا کے قبضے میں تھا۔ یہ دونوں علاقے آنے والے دس سال میں فتح ہو کر اٹلی میں شامل کر دیئے گئے لیکن اطالوی آزادی کی جنگ کا بہادرانہ زمانہ نیپلس اور سسلی کی فتح کے بعد ہی ختم ہو گیا جون ۱۸۶۱ء میں کاوور کا بھی انتقال ہو گیا۔

کاوور کی وفات

نئی سلطنت کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اقتصادی، سیاسی مادہ

مذہبی ہر قسم کے مشکلات کا سامنا تھا رعایا کا بہت بڑا حصہ جو محض حکومت خود اختیاری کا خواہاں نہ تھا۔

وینس کی فتح

وینیشیا (Venetia) ۱۸۶۶ء میں جاکر اٹلی میں شامل ہوا اور گو اٹلی والے بھی اس کے لئے لڑتے تھے لیکن ان کے قوت بازو سے یہ صوبہ فتح نہیں ہوا اس مقام پر اٹلی کی تاریخ جرمنی کی تاریخ سے مل جاتی ہے جس کا تفصیلی بیان آیندہ باب میں آئے گا یہاں اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ ۱۸۶۶ء میں پرشیا آسٹریا سے نبرد آزمائی کرنے پر تلا ہوا تھا اور اس کو رفقائے کار کی تلاش تھی یہ ظاہر تھا کہ اگر اٹلی وینیشیا پر حملہ کر دے تو آسٹریا کی توجہ بٹ جائے گی اور جرمنی میں اس کی سرگرمی کم ہو جائے گی۔ بسمارک نے وکٹر امانوئل کو یہ کہہ کر اپنی طرف ملا لیا کہ جب تک وینس اٹلی میں شامل نہ کر دیا جائے گا وہ صلح نہ کرے گا۔

۱۸۶۶ء کی جنگ

اپریل ۱۸۶۶ء میں جنگ شروع ہوئی آیندہ باب میں ہم بتلائیں گے کہ کس طرح پرشیا نے اپنے دشمنوں پر قابو پا لیا اور بغیر کسی ہمسر و رقیب کے تمام جرمنی کا سردار بن گیا لیکن اٹلی میں اس کے رفقائے کار کو کسی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اٹلی والوں میں کوئی شخص کاور ایسا مدبر نہ تھا اور گیری بالڈی بھی اپنی بے قاعدہ فوج کے ساتھ ٹائرل (Tyrol) میں کچھ نہ کر سکا۔ اطالوی فوج میں نہ تو کوئی قابل افسر تھا نہ ان میں انضباط تھا اور نہ ان کے پاس کافی ساز و سامان تھا اور چڑھائی کا کوئی خاص منصوبہ پہلے سے نہیں سوچا گیا تھا۔ کسٹوزا (Custozza) میں ان کو شکست ہوئی بلکہ ان کی فوجی عزت جاتی رہی ان کا بحری بیڑا بھی آسٹروی بیڑے سے شکست کھا گیا۔ حالانکہ آسٹروی بیڑا نہایت حقارت و ذلت کی نظر سے اب تک دیکھا جاتا تھا۔ اگر اس جنگ میں خارجی امداد نہ ملی ہوتی تو اٹلی کا مستقبل ستیاناس ہو جاتا لیکن اٹلی والوں نے اتنا تو ضرور کیا کہ آسٹریا کی ایک بڑی فوج کو اٹلی میں مشغول رکھا جس کی وجہ سے پرشیا کو بہت سہارا مل گیا۔ بسمارک نے اٹلی کی خاموش وفاداری کی تعریف کی اور خود بھی

پرشیا کی بدولت وینس (Venice) اٹلی کو ملا

اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اٹلی کو اُتنا تو نہیں ملا جتنا کہ وہ چاہتا تھا کیونکہ جنوبی ٹائرل (Tyrol) اب بھی نہ ملا مگر ونیس کو اختیار دیا گیا کہ وہ جس حکومت میں چاہے رہے۔ چھ لاکھ چالیس ہزار رائیں سلطنت اٹلی میں شریک کئے جانے کے موافق اور صرف ساٹھ رائیں خلاف میں آئیں۔

اٹلی و روما روما اب بھی فتح نہیں ہوا اور روما کا مسئلہ ونیس سے بھی زیادہ پیچیدہ تھا۔ پائس نہم (Pius IX) کے عہد میں روما خیالات حریت کا اور بھی سختی سے مخالف ہو گیا تھا دسمبر ۱۸۶۴ء میں جو پاپائی فرمان (Bull) جاری ہوا اس میں درج تھا کہ "یہ محض غلط ہے کہ پوپ کو جذبہ حریت یا جدید تمدن کی موافقت کرنا چاہیئے یا وہ کر سکتا ہے" شاہ اٹلی نے فرانس سے وعدہ کیا تھا کہ پاپائی علاقہ میں مداخلت نہیں کی جائے گی اس وجہ سے جب اکتوبر ۱۸۶۷ء میں گیری بالڈی نے روما کی ایک بغاوت کا سہارا لے کر فوج کشی کی تو فرانسیسی فوج نے اس کو آسانی سے شکست دیدی یہ فرانسیسی فوج بعجلت تمام پوپ کی امداد پر بھیج گئی تھی حکومت فرانس نے اعلان کیا کہ روما پر کبھی اٹلی کا قبضہ نہ ہونے دے گی۔

مذہبی مجلس۔ ۱۸۷۰ء میں جب کہ ایلپس کے اُس پار کا یورپی ملک فرانس اور جرمنی کی کشاکش میں مصروف تھا اُس وقت ادھر روما میں ایک عام مذہبی مجلس منعقد ہو رہی تھی عین اُسی وقت جب کہ پوپ کا دنیاوی اقتدار معدوم ہو رہا تھا اور جرمنی و فرانس میں جنگ کا اعلان ہونے کے دوسرے ہی دن یہ اعلان ہوا کہ "جب کبھی عقائد و اخلاقیات کے مسئلہ میں پوپ کوئی فتویٰ دے تو وہ ناقابل انکار و بے خطا ہو گا۔

فرانس و جرمنی کی جنگ میں فرانس کو ہزیمت اٹھانے کی وجہ سے فرانسیسی دستہ روما سے برخاست کر دیا گیا اب اٹلی نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے اُس وعدہ کا پابند نہیں ہے جو اس نے پاپائی علاقہ میں عدم مداخلت کا کیا تھا۔ ایک اطالوی فوج نے سرحد عبور کر کے ۲۰ ستمبر ۱۸۷۰ء کو روما پر قبضہ کر لیا رعایا سے رائے لی گئی کہ وہ آیندہ کے لئے کیا انتظام پسند کرتے ہیں۔ پندرہ سو

روما پر قبضہ

کے مقابلہ میں ایک لاکھ تینتیس ہزار رائیں سلطنت اٹلی میں شامل کرنے کے موافق آئیں۔ پوپ نے حملہ آوروں کو دین بدر کیا مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور مصالحت کی گفت و شنید کو بھی اس نے رد کرنا چاہا مگر سب بے سود۔ اٹلی کا دارالسلطنت روما بن گیا۔ دانتے (Dante) سے لے کر ماتزینی (Mazzini) تک کے اطالوی وطن پرستوں کے خواب کی تعبیر اس دن سچی ہو گئی۔ اٹلی اب غیر ملکی حکومت کے بار سے سبکدوش ہو گیا اور ایک حکومت کے ماتحت متحد اور اپنی قسمت کا اب فیصلہ کرنے والا بن گیا۔

حوالۂ کتب متعلقۂ باب ہذا:-

(۱) "یورپ بزمانہ حال" مصنفۂ الی سن فلپس (Alison Phillips)، (۲) "اتحاد اطالیہ" مصنفۂ اسٹل من (Stillman) (۳) تاریخ اتحاد اطالیہ مصنفۂ بالٹن کنگ (Bolton King) (۴) "سوانح کاوور" (Life of Cavour) مصنفۂ کاونٹس سسارسکو (Cesaresco) (۵) قائم کنندگان سابقۂ اٹلی از میریٹ (Marriott)

باب نوزدہم

اتحاد جرمنی اور سلطنت جرمنی کا قیام

۱۸۴۸ء کے انقلابات سے اتحاد جرمنی کی تحریک کو کچھ فائدہ نہ پہنچا تھا فریڈرک ولیم چہارم شاہ پراشیا کے لمبے چوڑے وعدے پورے نہ ہوئے۔ کل جرمنی کے لئے ایک قومی حکومت قائم کرنے کی جو کوشش پراشیا نے کی تھی وہ ایسی ہی ناکام ہوئی جیسی کہ فرینک فورٹ کی پارلیمنٹی تحریک۔ انقلاب والے سال کی بڑی بڑی اُمیدیں اور جد وجہد نے فریب کاریوں کا ازالہ کرکے حقیقی وعملی تدابیر کا راستہ صاف کردیا اور المٹز (Olmutz) کی شکست نے پراشیا پر اس حقیقت کا انکشاف کردیا کہ اگر اس کو آسٹریا کے مقابلہ میں جرمنی کی سیادت حاصل کرنا مقصود ہے تو اُسے دوسرا ہی طرزِ عمل اور دوسری تیاریاں کرنا چاہئے۔

ولیم اول (William I) شاہ پراشیا

دماغی شکایات کی وجہ سے ۱۸۵۸ء میں فریڈرک ولیم کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا اور شہزادہ ولیم ۱۸۶۱ء تک بحیثیت نائب السلطنت کارگزار رہا اور اس کے بعد شاہ ولیم اول کے لقب سے تخت نشین ہوگیا۔ ۱۸۴۸ء میں آزاد خیالی کا وہ سخت مخالف تھا اور جب اس تحریک کو برلن میں کچھ کامیابی ہونے لگی تو وہ انگلستان چلا گیا لیکن انگلستان کے دستوری خیالات سے اس کو کوئی دلبستگی نہ ہوئی وہ ہمیشہ سے سپاہی منش تھا اور شاہی اختیارات اور اقتدارات کا حامی تھا۔ تخت نشینی کے موقع پر اس نے کہا "کہ میں پہلا بادشاہ ہوں جو کہ جدید اداروں کی تائید کے بعد تخت نشین ہوا ہے لیکن میں اس بات کو نہیں بھولتا کہ تخت وتاج مجھکو خدا ہی سے ملا ہے" اس کا تمام

عہد حکومت بادشاہ کے خدائی حقوق اور جدید اداروں کی کشاکش میں گزرا اور انجام کار فتح بادشاہ کے خداداد حقوق کو حاصل ہوئی۔

پرشوی تسالفرائن (Zollverein)

پرانشیا کی رہبری میں جرمنی کے اتحاد کا راستہ دراصل مالیاتی اور فوجی انتظامات نے صاف کیا۔ ۱۸۱۵ء کے بعد پرانشیا کا علاقہ مختلف حصوں میں تقسیم ہوگیا جن کے علٰحدہ علٰحدہ سرحدات اور چنگی کے متعدد ناکے دچوکیاں قائم ہوئیں۔ پرانشیا کی ابتدائی کوشش یہ تھی کہ ملک کی اندرونی تجارت میں آزادی پوری طور سے قائم ہو جائے اور سرحدی محاصل کر وڑگیری کو اس قدر تخفیف کر دیا جائے کہ بلا ادائی محصول چوری سے مال لے جانے کی ترغیب لوگوں کو کم ہو اور ساتھ ہی ساتھ غیر ممالک کا جو مال پرانشیا کے حدود سے گزرے اس پر سنگین محاصل عاید کر دئے جائیں یہ پہلا تسالفرائین* (Zollverein) تھا اس انتظام سے پرانشیا کو بہت نفع تھا اور جرمنی کے دوسرے حصوں کی تجارت کو نقصان اسی قسم کے دوسرے جتھے قائم ہوئے بویریا (Bavaria) ورٹمبرگ (Wurtemberg) نے جنوبی جرمن اتحاد قائم کیا اور ایک وسطی جرمن اتحاد قائم ہوا جسمیں ہنوور (Hanover) سب سے ممتاز مملکت شامل تھی۔ ان تینوں جتھوں میں ابتداءً بڑی رقابت رہی لیکن تمام

جرمنی کا تجارتی اتحاد

جرمنی میں آزاد تجارت کر دینے سے جو فوائد حاصل ہو سکتے تھے وہ بدیہی تھے جنوبی جرمن اتحاد کی بہت سی مملکتیں ۱۸۳۴ء میں پرانشیا کے ساتھ شامل ہو گئیں اور ۱۸۵۴ء میں ہنوور بھی شریک ہو گیا اس طور پر قبل اس کے کہ تمام جرمنی سیاسی اتحاد میں منسلک ہوتا تجارتی اتحاد بہت پہلے تمام جرمن مملکتوں میں قائم ہو گیا اور آسٹریا اس اتحاد سے باہر رہا۔

پرانشیا کے فوجی نظام کی جدید ترتیب

پرانشیا کے فوجی انتظام کی جدید ترتیب بھی خاص اہمیت رکھتی تھی۔ گو شروع شروع یورپ نے کچھ توجہ نہ کی۔ یہ جدید ترتیب تقریباً اُن خیالات و تدابیر کی عملی صورت تھی جو مصلحان قوم نے ۱۸۰۶ء

*نوٹ (Zollverein) ایک سلطنت کے مختلف علاقوں کے باہمی معاہدہ کو کہتے ہیں جو آپس میں آزاد تجارت رکھنے کا عہد کریں اور غیر ملکی اشیا پر مقررہ و سنگین محاصل عاید کریں تاکہ ملکی صنعت کو ترقی ہو۔ (مترجم)

کے بعد جرمنی میں نپولین کی طاقت توڑنے کے لئے سوچی تھیں۔ ولیم اول کا پہلا وزیر فوج رون (Roon) تھا۔ جن تدابیر کی بدولت پراشیا یورپ کی قوی ترین سلطنت ہوگیا اُن کو عملی جامہ پہنانے والوں میں مولٹکے (Moltke) اور بسمارک (Bismarck) کی طرح رون (Roon) بھی تھا۔ تین سال کی عام فوجی ملازمت کے علاوہ اور چار سال محفوظ فوج ((Landwehr)) میں خدمت کرنے کی شرط اضافہ کردی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ نئے اسلحہ خصوصاً توپ سوزن (Needle gun) کا استعمال شروع کر دیا گیا اور قواعد و فن سپہ گری کی خاص طور پر درس و تدریس ہونے لگی۔

بادشاہ اور مجلس میں نااتفاقی۔ — تاجدار پراشیا کو اپنے مقاصد کی تکمیل میں نیابتی ایوان کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا ۱۸۶۱ء میں ترقی پرور (Progressive) جماعت کی اکثریت تھی اور اس نے مطالبہ کیا کہ انگلستان کی طرح یہاں کے وزرا بھی مجلس میں اپنے افعال کے ذمہ وار کر دیئے جائیں اور ایوان اعلیٰ کی اصلاح کی جائے اور فوجی ملازمت کا لزوم صرف دو سال تک کے لئے محدود کیا جائے۔ جب بادشاہ نے اس مطالبہ کو رد کر دیا تو ستمبر ۱۸۶۲ء میں مجلس نے اُس رقم کی منظوری دینے سے انکار کر دیا جو فوج کے لئے معین کر دی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ بادشاہ کو سر جھکا دینا پڑے گا اور وہ تخت و تاج سے دست بردار ہونے کا خیال بھی اپنے دل میں لانے لگا تھا۔ لیکن اس موقع پر اس نے بسمارک کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر لیا اور اس طور پر جرمنی کی تاریخ میں ایک جدید باب قائم کر دیا جو غالباً شارلیمن کے وفات کے بعد سے سب سے اہم باب تھا۔

بسمارک (Bismarck) — بسمارک (Bismarck) جرمنی کے زمینداروں میں سے تھا انقلاب کے زمانہ میں وہ مجلس کا رکن بھی رہا تھا اور پراشیا کو جرمنی میں شامل کر کے جرمن اتحاد قائم کرنے کا وہ سخت مخالف تھا وہ کہتا تھا "ہم پروشی ہیں اور ہمیشہ ہم پروشی ہی رہیں گے اور کہلائیں گے"۔ کئی اہم سیاسی کاموں پر وہ بھیجا جا چکا تھا اور آسٹریا کے مقابلہ میں اس نے پراشیا کے حقوق کا ادعا نہایت استقلال سے کیا اور ان کو مستقل کرا یا تھا جب بادشاہ نے اس کو اپنا

وزیر اعظم بنایا تو اس نے اقرار کیا کہ وہ کبھی ہاری نہ مانے گا۔ واضح رہے کہ انگلستان کی طرح پراشیا کے نظم و نسق کا انحصار مجلس پر نہ تھا بلکہ کل اختیارات بادشاہ کو تھے تقاریر و رایوں پر بسمارک کو کوئی اعتقاد بھی نہ تھا ایک موقع پر اس نے بیان کیا کہ "ان اصولوں کا فیصلہ پارلیمنٹی بحث یا کثرت رائے کے ذریعہ نہیں ہو سکے گا بلکہ خدا جو اس کشمکش کو دیکھ رہا ہے کبھی نہ کبھی اپنا فولادی پانسہ پھینک دے گا اور تصفیہ ہو جائے گا

بادشاہ اور رعایا

انگلستان کے تجربہ کے لحاظ سے بسمارک ایک ایسی جنگ میں مبتلا تھا جس کا انجام مایوسی و ناکامی کے سوا کچھ نہ معلوم ہوتا تھا۔ ولیم اول اور بسمارک رعایا کے نمایندوں کے روبرو اس طرح آئے جس طرح کہ چارلس اول اور ونٹورتھ (Wentworth) "طویل پارلیمنٹ" کے روبرو حاضر ہوئے تھے یا جس طرح لوئی شانزدہم اور اس کے وزراء طبقات مجتمعہ (States General) یا مجلس وضع قوانین کے روبرو آئے تھے لیکن ولیم اول کا وہ حشر نہیں ہونے والا تھا جو چارلس اول اور لوئی شانزدہم کا ہوا۔ اس کے عہد حکومت نے دنیا کے سامنے پارلیمنٹی مخالفت کے مقابلہ میں شاہی اقتدار کی عظیم الشان فتح کی مثال پیش کی۔ اس انجام کی وجہ کچھ تو پراشیا کے خاص حالات تھے اور کچھ شاہ پراشیا اور اس کے وزیر کی غیر معمولی ذی اقتدا شخصیت لیکن سب سے بڑی وجہ جنگ میں فتح اور خارجی معاملات میں غیر معمولی کامیابی تھی۔ اور انگلستان و فرانس کی شاہی حکومت کو انہی دو شعبوں میں ناکامی کی وجہ سے تباہی کا منہ دیکھنا پڑا۔

بسمارک اور مجلس میں مقابلہ۔

حکومت روس کے خلاف پولینڈ (Poland) والوں نے ایک بغاوت کی اس کے سلسلہ میں بسمارک کو مجلس سے دوبدو ہونا پڑا کیونکہ "ترقی پرور" جماعت پولینڈ والوں کی طرفدارتھی اور بسمارک نے شورش فرو کرنے میں روس کا ساتھ دیا۔ آسٹریا کا وہ سخت مخالف تھا اور اس مخالفت کا اظہار اس نے اس طور پر کیا کہ جب آسٹریا نے جرمنی کے لئے ایک نیا آئین پیش کیا تو اس نے اس کو مسترد کر دیا سب سے اہم مسئلہ جو اُسے طے کرنا پڑا اشلزوگ ہولسٹائن (Schleswig Helstein) کے مستقبل کا

سوال تھا۔ تفصیلی طور پر یہ معاملہ اس قدر مبہم تھا کہ یورپ کی حکومتوں کی توجہ اس طرف بہت کم مبذول ہوئی مگر یہی معاملہ بسمارک کی شہرت و عظمت کا باعث ہوا۔

شلزوگ (Schleswig) اور ہولسٹائن کا مقابلہ

فریڈرک سوم شاہ ڈنمارک شلزوگ (Schleswig) اور ہولسٹائن (Holstein) ڈیوک بھی تھا لیکن ان دونوں ولایتوں اور شاہی سلطنت میں کوئی آئینی اتحاد یا تعلق نہ تھا۔ اور چونکہ فریڈرک سوم لاولد تھا اس وجہ سے اس کی وفات پر ان ولایتوں کی وراثت کا سوال پیچیدہ ہو جاتا تھا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ شلزوگ اور ہولسٹائن میں کوئی عورت وارث نہیں ہو سکتی تھی اور نہ کوئی عورت حق وراثت منتقل کر سکتی تھی برخلاف اس کے ڈنمارک میں ایسا کوئی قانون (Salic Law) نہیں تھا۔ یہ سوال جس کا تصفیہ کسی قانونی حق پر ہی کیوں نہ ہوتا نہایت مبہم تھا۔ لیکن بسمارک نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس معاملے کو ایک ایسا مسئلہ بنا دینا چاہیئے جس میں "لڑائیوں کا خدا اپنا فولادی پانسہ ڈالے"۔

ان ولایتوں کا مستقبل

سوال یہ تھا کہ کیا یہ ولایتیں مستقلاً سلطنت ڈنمارک میں شامل کر دی جائیں یا ڈنمارک سے ہمیشہ کے لئے جدا کر کے جرمنی میں شامل کر دی جائیں یا یہ کہ شلزوگ کو ڈنمارک میں شامل کر دیا جائے اور ہولسٹائن کو جرمنی میں ان مختلف اشکال کے حامی جرمنی میں بھی تھے اور جرمنی کے باہر بھی بسمارک نے رفتہ رفتہ ایسی تجویز نکالی کہ یہ ولایتیں (Duchies) نہ تو جرمنی میں شامل ہو سکیں اور نہ ڈنمارک میں بلکہ پرشیا میں شامل ہو جائیں۔

ڈنمارک (Denmark) میں شامل کرنے کی رائے۔

شاہ ڈنمارک نے وفات سے قبل ایک حکم دے دیا کہ یہ دونوں ولایتیں ڈنمارک میں شامل کر دی جائیں یہ حکم جرمنی کے لئے گویا پیغام جنگ تھا اور فرینکفورٹ کی مجلس وفاق نے اس پر احتجاج کیا کیونکہ مجلس جمعیت (Diet) کا وجود اب بھی تھا گو اس کا اقتدار آسٹریا و پرشیا کا سا قوی نہ تھا اس مجلس نے اعلان کر دیا کہ تا تصفیہ ان ولایتوں میں جرمن فوج متعین و مامور کر دی جائے اور اس کا

رجحان اس طرف تھا کہ یہ دونوں ولایتیں اگسٹن برگ (Augustenburg) کے ڈیوک کو دے دی جائیں جس کا دعوی بہت مضبوط تھا۔ ہولسٹائن کی ولایت پر قبضہ ہو گیا لیکن پراشیا اور آسٹریا اس معاملہ کو مجلس ڈیئٹ کے ہاتھوں میں ہی چھوڑ دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے اور دونوں نے شاہ ڈنمارک کی مخالفت کی اور ان ولایتوں سے اس کو جبراً بیدخل کرنا چاہا۔ اُس (شاہ ڈنمارک) نے تمام یورپ سے التجا کی مگر بے سود۔ ہر ملک میں ہمدردی تو اس کے ساتھ ضرور ظاہر کی گئی مگر عملی امداد پر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ اس پر بھی اُس نے بغیر مقابلہ کے چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا لیکن آسٹریا و پراشیا کی متحدہ فوج کے مقابلہ میں ڈنمارک کی سپاہ کچھ نہ کر سکتی تھی اور بہت جلد یہ چھوٹی سی سلطنت لاچار ہو گئی۔

جنگ

ان ولایتوں پر پراشیا اور آسٹریا کا قبضہ

لیکن ان دونوں سلطنتوں کی فتح سے یہ مسئلہ بالکل طے نہیں ہوا کیونکہ بسمارک نے پہلے ہی دل میں ایک منصوبہ سوچ رکھا تھا۔ اور شاہ ڈنمارک کو اس نے اس لئے بے دخل نہیں کیا تھا کہ یہ ولایتیں آگسٹن برگ کے ڈیوک کے حوالے کر دی جائیں۔ کسی نہ کسی حیلے سے ان کو پراشیا میں شامل کرنا ضروری تھا۔ اُدھر آسٹریا ڈیوک آف آگسٹن برگ کی حمایت پر تلا ہوا تھا اور ڈیئٹ کے ممتاز اراکین بھی اسی خیال کے تھے۔ مصالحت کی کوششیں ہوئیں مگر عارضی۔ شاہ پراشیا تو امن و صلح کو پسند کرتا تھا مگر بسمارک نے جنگ کی ٹھان لی تھی۔ اس معاملے کو ڈیئٹ میں پیش کرنے کی وجہ سے آسٹریا پر اعتراض کیا گیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔

پراشیا اور آسٹریا میں جنگ

حق قانونی کی بحث تو پس پشت ڈال دی گئی۔ اور یہ جنگ حقیقت میں ان ولایتوں کے متعلق کوئی جنگ نہ تھی بلکہ جرمنی کی سیادت کیلئے آسٹریا اور بقیہ جرمنی کے مقابلہ میں پراشیا صف آرا ہوا تھا گزشتہ باب میں ہم بتلا چکے ہیں کہ بسمارک نے اٹلی سے اتحاد قائم کر لیا تھا جسکی وجہ

سے آسٹریا کی ایک بہت بڑی فوج کو کوہ ایلپس کے جنوب میں مصروف رہنا پڑا۔ جرمنی میں البتہ پراشیا کا کوئی مددگار نہ تھا اور اس کے مقابلہ پر آسٹریا۔ بیویریا سیکسنی۔ ہنوور کے علاوہ جرمنی کی بقیہ چھوٹی چھوٹی مملکتیں بھی آکھڑی ہوئی تھیں اس جنگ نے پہلے پہل یورپ کو اس بات سے آگاہ کیا کہ یورپ میں ایک نئی طاقت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ پہلی جنگ تھی جس میں جدید آلات و ذرائع کام میں لائے گئے مولٹکے (Moltke) برلن سے ہی بذریعہ تار جنگ کی رہنمائی کرتا رہا اور آخری فیصلہ کن حملہ کے وقت وہ جنگی محاذ پر خود آیا۔ فوج کی نقل و حرکت کے لئے ریلوں کا عام طور پر استعمال کیا گیا۔ اس جنگ کے مقابلہ میں کریمیا کی لڑائی ایک عہد گزشتہ کی لڑائی معلوم ہوتی تھی۔

سنہ ۱۸۶۶ء کی جنگ

پراشیا نے بہت سرعت کے ساتھ کامل فتح حاصل کرلی۔ ہنوور کی فوج بمقام لانگن سالزا (Langensalza) جون کے مہینہ میں شکست کھا گئی۔ بیویریا اور آسٹریا کی افواج سے ملنے کیلئے جا رہی تھی۔ فیصلہ کن لڑائی جولائی کے مہینہ میں بوہیمیا (Bohemia) میں بمقام کینی گراٹز (Koniggratz) ہوئی تھوڑی دیر تک تو پلہ برابر رہا لیکن ولی عہد فریڈرک کے پہنچ جانے سے پراشیا کا پلہ قطعی طور پر بھاری ہوگیا اور لڑائی ختم ہوگئی۔ اس جنگ کا زمانہ بہت کم رہا مگر اس سے زیادہ نتیجہ خیز کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

جنگ کے بعد بندوبست

جنگ کے بعد بسمارک نے سیاست و تدبیر میں وہی کمال دکھایا جو اثنائے جنگ میں مولٹکے نے فن سپہ گری میں دکھلایا تھا اور اس کامیابی نے پراشیا کی آئندہ عظیم الشان فتح کا راستہ صاف کردیا۔ جرمنی کے معاملات میں دست اندازی کرنے سے آسٹریا کو بالکل محروم کردیا گیا۔ شلزوگ (Schleswig) ہنوور ہس کیسل (Hesse cassel) کی شمالی مملکتیں جو پراشیا کے مقابلے میں لڑچکی تھیں سب کی سب پراشیا میں شامل کردی گئیں جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ پراشیا کا علاقہ جرمنی کی شمالی سرحد تک پھیل گیا۔

جنوبی مملکتیں

بیویریا۔ ورٹمبرگ اور باڈن کی جنوبی مملکتوں کے ساتھ بہت رعایت کی گئی۔ اس بات کا بڑا خطرہ تھا کہ یہ مملکتیں پراشیا کو اپنا جانی دشمن سمجھ کر اسکے خلاف کہیں فرانس سے اتحاد نہ کرلیں اور نپولین سوم بھی

اس قسم کے اتحاد کی جان توڑ کر کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بسمارک ان کے ساتھ فیاضی سے پیش آیا اُس نے ان کو جرمن قومیت کا جوش دلایا اور ان کو آزاد و خود مختار رہنے دیا۔ اس کے کچھ ہی مدت کے بعد ان مملکتوں نے پرآشیا سے خفیہ معاہدہ کرلیا کہ اگر جنگ ہو تو یہ مملکتیں اپنی فوجیں پرآشیا کی سپاہ کے ساتھ شریک کردینگی۔

عہدیہ شمالی جرمنی شمالی جرمنی کی جو مملکتیں ابتک خود مختار تھیں وہ سب ایک میں مل ملاکر "عہدیہ شمالی جرمنی" کے نام سے موسوم ہوئیں یہ سب بسمارک کا کیا کرایا تھا اور بعد کی جرمن سلطنت اسی عہدیہ میں جنوبی جرمن مملکتوں کے متحد کردینے سے قائم ہوئی یہ "حکومت عہدیہ" کئی لحاظ سے بالکل انوکھی تھی اور برطانوی آئین سے مختلف نمونے کی تھی حالانکہ براعظم میں اب تک برطانوی دستور کو ہی بہترین نمونہ تصور کیا جاتا تھا سب سے اعلیٰ کونسل وفاقیہ (Federal council) تھی جس کے اراکین منتخب شدہ نمایندوں کے بجائے جرمنی کی مختلف حکومتوں کے نمایندے ہوا کرتے تھے اور تمام نظم و نسق کا انتظام اور قانون سازی کا اہتمام اسی مجلس (Federal council) کے ہاتھ میں تھا اس کے بعد پارلیمنٹ کا درجہ تھا جس کو رائشٹاگ (Reichstag) کہتے تھے اس کی رکنیت کا انتخاب ہر بالغ مرد کی رائے لے کر ہوتا تھا کیونکہ بسمارک جرمنی کے متوسط طبقے کی آزاد خیالی سے متنفر تھا اور عام لوگوں سے اس کو اُمید تھی کہ اس کے تجاویز کی تائید کرینگے۔ مالیاتی اختیارات بھی اسی پارلیمنٹ کو حاصل تھے جس قانون کی تحریک کونسل وفاقیہ کرتی تھی اس کی منظوری نامنظوری کا اختیار بھی پارلیمنٹ کو حاصل تھا لیکن

رائشٹاگ برطانوی پارلیمنٹ کی طرح رائشٹاگ کوئی حکومت نہ تھی نہ وزراء اس کے قابو میں تھے اور عاملانہ صیغہ جات میں اس کو کچھ دخل نہ تھا۔

وزیر اعظم نظم و نسق وزراء کے ہاتھ میں اور وزراء کے اوپر چانسلر (وزیر اعظم) ہوتا تھا۔ چانسلر کے اختیارات برطانوی وزیر اعظم سے زیادہ تھے وزراء کو اس کے پاس جوابدہ ہونا پڑتا تھا اور وہ بادشاہ کے پاس اُن وزراء کے افعال کا ذمہ دار رہتا تھا چانسلر کے ایسا با اختیار شخص ڈھونڈھنا ہو تو ترکی کے

وزیر اعظم یا فرنگی لوگوں کے میر مجلس (Mayor) کا خیال ذہن میں لایا جائے۔ سب سے پہلا چانسلر (وزیر اعظم) بسمارک ہوا جنگ نے اس کو بچا دیا تھا شروع میں نزاع کی اہمیت کی وجہ سے مخالفین ساکت رہے اور بعد میں اس کی عظیم الشان فتوحات و کامیابیوں نے اسے عوام کا لاڈلا بنا دیا۔

ہنگری سے سمجھوتہ آسٹریا کے حق میں بھی اس جنگ کے نتائج بہت اہم ثابت ہوئے آسٹریا اور ہنگری کی دیرینہ آویزش کا اس جنگ نے تصفیہ کر دیا۔ ہنگری والوں کی ایک جدا مجلس دئیت (Diet) اور ایک جدا حکومت قائم کرنے کا مطالبہ ایک مناسب انداز میں ڈیک (Deak) نے پیش کیا اور آسٹریا نے اُسے منظور بھی کر لیا دوسرے اقوام کے مطالبات رد کر دیے گئے لیکن اس کے بعد سے شہنشاہ آسٹریا دو سلطنتوں پر حکومت کرنے لگا کیونکہ آسٹریا اور ہنگری میں بجز اس کے دونوں ایک ہی تاجدار کے ماتحت تھے اور کوئی تعلق نہ تھا۔

نپولین سوم اور جنگ جنگ چھڑ جانے سے نپولین کو کچھ بھی تشویش نہ ہوئی لیکن یہ دیکھ کر اسے وحشت ہونے لگی کہ جنگ کے مابعد تصفیوں میں اس کا کوئی دخل نہیں رکھا گیا۔ پرشیا و فرانس میں رقابت پیدا ہو گئی اور چار ہی سال کے عرصہ میں پھر "فولادی پالنسہ" کی توجہ مبذول کرانیکی ضرورت داعی ہوئی۔

نپولین سوم کے اقتدار کی بنیادیں نپولین سوم کا اقتدار مضبوط جڑ پکڑ چکا تھا۔ ملک کی صنعتی و تجارتی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی پیرس کا بیشتر حصہ از سر نو تعمیر ہوا اور یورپی فیشن کا وہ مرکز بن گیا شہنشاہ کو کلیسہ کی تائید کے ساتھ ساتھ تجارتی طبقہ کی تائید بھی حاصل تھی۔ اس کی مطلق العنانی کے باوجود فرانس کی بیشتر رعایا اس کو عزیز رکھتی تھی ایوان زیرین (Chamber) کا انتخاب تو بلاشبہ بالغ مردوں کی رائے پر ہوتا تھا مگر ایوان زیرین کو اختیارات برائے نام حاصل تھے اور کوئی تحریک ایوان پیش نہیں کر سکتا تھا اور اس کے مباحث بالکل خفیہ و پوشیدہ ہوا کرتے تھے اور حکومت کے کارندے رائے دہندوں کو اپنے قابو میں بھی کر لیا کرتے تھے۔ ایوان اعلیٰ یعنے سنانت (Senate) میں ڈیڑھ سو اراکین ہوتے تھے۔ جن کو خود بادشاہ نامزد کرتا تھا اور وہ بالکل اسکے

قابو میں رہتے تھے اس کا اصل کام ایوان (Chamber) کے افعال کی تنقیح کا تھا مجلس نظامیہ (Council of State) شاہی وزراء اور ان لوگوں پر مشتمل رہتی تھی جن کو بادشاہ مقرر کرتا تھا اور ملک کا نظم ونسق اسی مجلس کے ہاتھوں میں تھا لیکن یہاں بھی بادشاہ سب پر حاوی رہتا تھا۔ وزراء کو اس کے پاس جوابدہ و ذمہ دار ہونا پڑتا تھا اور ہر معاملہ میں وہ اپنا وزیر اعظم خود ہی ہوا کرتا تھا فرانس کی مقامی حکومت نظما (Praefects) کے ہاتھوں میں تھی۔ عدالتوں سے وہ اپنے سیاسی مخالفین کو سزا دلانے میں کچھ تامل نہ کرتا تھا اور اخباروں ومطابع پر خاص نگرانی رکھتا تھا اور سررشتۂ تعلیمات کے ہر شعبہ پر نگاہ رکھتا تھا۔

کامیابی کا لزوم

بعضوں کا خیال ہے کہ اگر وہ صلح وآشتی پر قائم رہتا تو اس کا تخت ہاتھ سے نہ جاتا لیکن اُس نے خود اس کے خلاف فیصلہ کیا اور یہ خیال کیا کہ فرانس کے سپاہیانہ جذبہ وخواہش کی تکمیل ازبس ضروری ہے ہم بتلا چکے ہیں کہ جنگ کریمیا میں اور اطالوی آزادی کی جنگ کے ابتدائی دوران میں اُس نے کس قدر سرگرمی دکھلائی۔ اور کس قدر زیادہ فوجی فتوحات فرانس کو حاصل ہوئی تھیں اس طریقہ کار سے وہ کسی قدر ہر دل عزیز ہوگیا۔ لیکن بعض زبردست حامی اسی وجہ سے اس سے علحدہ ہوگئے فرانس کے پادریوں کا طبقہ اس بات سے آزردہ ہوگیا تھا کیونکہ شہنشاہ فرانس نے خاندان سیوائے (Savoy) سے تعلقات مصاہرت قائم کرلئے تھے اور یہ خاندان پوپ کا شدید ترین مخالف تھا۔ بقیہ یورپ اُس کے اس فعل سے خوف زدہ ہوگیا تھا کہ اس نے سیوائے (Savoy) اور نائس (Nice) کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا جس سے یہ واضح ہوتا تھا کہ اس میں بھی نپولین اول کی سی جارحانہ وحریص خصوصیت موجود تھی۔

انگلستان سے تجارتی معاہدہ

اس کے علاوہ ۱۸۶۰ء میں انگلستان سے ایک تجارتی معاہدہ کرکے اس نے اپنے یہاں کے تجارتی اور زرداروں لوگوں کو بھی برگشتہ کردیا۔ کابڈن (Cobden) اور اسکے ہم خیالوں کے دلائل سے نپولین سوم آزاد تجارت کے فوائد کا قایل ہوگیا تھا اور سمجھتا تھا کہ

انگریزی سامان پر محصول درآمد کم کر دینے سے فرانس کی تجارت کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس وجہ سے فرانس کے بڑے بڑے تجار سے مشورہ لئے بغیر اُس نے اپنی ذاتی رائے کی بنا پر انگلستان سے معاہدہ کرلیا نپولین سوم تو ایک طرف آزاد تجارت کا قائل تھا اور اُدھر فرانس کے تاجر اس کے خلاف تھے اور اس وجہ سے انھوں نے نئے معاہدہ کو غداری اور دغابازی سے تعبیر کیا۔

مکسکو (Mexico) کی مہم

۱۸۶۰ء کے بعد سے پھر نپولین کی خارجی پالیسی (طرز عمل) کامیاب نہ رہی ۱۸۶۳ء میں اس نے مکسکو (Mexico) کے مقابلہ میں قسمت آزمائی کی ایک عرصہ سے اس کی توجہ وسطی امریکہ کی کی طرف منعطف ہو رہی تھی اور خاکنائے پناما (Panama) کاٹ کر ایک نہر بنانے کا خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ امریکہ کی حالت کے لحاظ سے دول یورپ کی مداخلت کا یہ موقع بھی اچھا معلوم ہوتا تھا ریاستہائے متحدہ خانہ جنگی کی مصیبت میں مبتلا تھیں۔ مکسکو میں بار بار بغاوت ہو رہی تھی اور چونکہ وہ (مکسکو) دول یورپ کا قرضدار بھی تھا اس وجہ سے یورپ والوں کو مداخلت کا اچھا موقع مل گیا پہلا منصوبہ یہ تھا کہ انگلستان۔ فرانس اور اسپین نیز مشترکہ قبضہ مکسکو پر کریں مگر بقیہ دونوں سلطنتیں تو کنارہ کش ہوگئیں اور فرانس اس معاملہ میں تنہا رہ گیا۔

آسٹریا کا مکسملین (Maximilian) مکسکو میں

یہ تجویز محض خیالی اور بظاہر بہت شاندار تھی ایک فرانسیسی دستے نے مکسکو پر قبضہ کرلیا۔ ایک انتخابی مجلس کا تقرر ہوا اور آسٹریا کے مکسملین (Maximilian) کو بادشاہ منتخب کیا گیا مگر اس کے بعد یہ کاغذی محل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ مکسکو والے اس جدید انتظام کو ناپسند کرتے تھے جسکی وجہ سے فرانسیسی فوج جو مکسملین کی حمایت کر رہی تھی چیدہ چیدہ فریبانہ حملوں کا شکار بنی اور جیسے ہی ریاستہائے متحدہ میں امن و امان قائم ہوا کہ وہاں کی جمہوریت نے نپولین کے منصوبے کو رد کرنے میں اپنی ساری قوت صرف کرنا شروع کر دی۔ اور اُسی سے فیصلہ ہوگیا۔ فرانسیسی فوجیں اٹھالی گئیں مکسملین کے ساتھ

اس کے افسروں نے دغا کی اور وہ بیچارہ گولی کا نشانہ بنادیا گیا اس مہم نے مالی
نقصان حسرت انگیز ناکامی کے سوا اور کوئی یادگار نہ چھوڑے۔

وسیع النظر سلطنت

نپولین کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی پادریوں اور
تاجروں کا طبقہ تو پہلے ہی سے برگشتہ ہوچکا تھا اس وجہ
سے اب کہیں اور سے مدد لینے کی ضرورت تھی اس لئے اس نے مزید آزادی
دینے کی تجویز پیش کی۔ اس نے آلیویئے (Olivier) کو اپنا وزیر بنایا جو انتہا
کا جمہوریت پسند اور خود نپولین کے اقتدار کا سخت مخالف تھا۔ ایک
نئے آئین و دستور کا وعدہ کیا گیا جس کی رو سے منتخبہ مجلس کو قوانین کی تحریک
پیش کرنے کا اختیار دیا گیا اور وزرا بھی اپنے اپنے افعال کے ذمہ دار گردیئے
گئے اور موازنہ کی منظوری کے لئے مجلس کو حقیقی اختیارات دئیے گئے۔ اس
کے بعد پھر ایک مرتبہ نپولین نے عوام سے رائے لی۔ بہتر لاکھ رائیں
نئے دستور کے موافق آئیں اور پندرہ لاکھ اس کے خلاف۔

مطلع صاف نظر آتا ہے

جون ۱۸۷۰ء میں عوام کی اس رائے زنی کے بعد ۳۰ جون ۱۸۷۰ء
کو آلیویئے (Olivier) نے بیان کیا کہ جس طرف بھی
نظر ڈالی جائے اب پیچیدہ مسائل کا کوئی وجود نہیں
پایا جاتا تاکسی زمانہ میں یورپ کے امن کا اس طرح
یقین نہیں ہوسکتا"۔ لیکن اس کے پندرہ ہی روز بعد پراشیا سے جنگ
کا اعلان ہوا اور دو ماہ سے کچھ زائد عرصہ میں دوسری سلطنت بھی لائپزک
(Leipsic) اور واٹرلو (Waterloo) سے بھی زیادہ تباہ کن شکست کے بعد
فنا ہوگئی۔

جنگ کے اسباب

اس طرح دفعتاً جنگ عظیم شروع ہوجانے کے اسباب دریافت
کرلینا کچھ مشکل نہیں ہے نہ تو فرانس ہی جنگ کا طالب تھا نہ جرمنی
لیکن نپولین سوم نے سمجھ لیا تھا کہ ایک جنگ میں فتح و کامیابی حاصل کرنے سے
اسکا متزلزل اقتدار استحکام حاصل کرسکیگا۔ وہ بیمار بھی تھا اسوجہ سے اسکی
سمجھ اور قوت ارادی میں پہلے کی سی پختگی اور استقلال نہ تھا غالباً وہ خود جنگ کا

بہت خواہشمند نہ تھا لیکن وہ جنگ کو ٹالنے کی بھی پر زور کوشش نہیں کرتا تھا اِدھر بسمارک (Bismarck) مولٹکے (Moltke) اور رون (Roon) جنگ چھیڑنے کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے کہ اس سے ان کی عمارت کی چھت مکمل ہو جاتی تھی۔ آسٹریا کی شکست سے تو جرمنی میں پراسشیا سربرآوردہ سردار بن ہی گیا تھا۔ فرانس کی شکست سے پراشیا کی سیادت میں ایک جرمن سلطنت کے قیام کا امکان نظر آتا تھا۔ فرانس اور جرمنی کے گزشتہ حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ دونوں ممالک میں تفوق اور برتری کے سوال کو دونوں کی نبرد آزمائی کے ذریعے سے طے کیا جائے۔

اسپین کا مقابلہ آغاز جنگ کا فوری سبب بہت ہی خفیف تھا۔ اسپین میں ایک بغاوت کے باعث ملکہ ایزابیلا (Isabella) فرانس کو چلی گئی تھی اور اس کے جانشین کا سوال درپیش تھا۔ شاہ پراسشیا کا ایک دور کا رشتہ دار مسمی لیوپولڈ (Leopold) بھی دعویدار ہوا۔ یہ شخص خاندان ہاہن زالرن (Hohenzollern) سے تھا اور کیتھلک مذہب رکھتا تھا۔ نپولین سوم نے اس بات پر اعتراض کیا کہ ہاہن زالرن خاندان کا کوئی شخص اسپین کے تخت پر متمکن ہو۔ شاہ ولیم نے اس اعتراض کو تسلیم کرلیا اور لیوپولڈ امیدواری سے علحدہ ہو گیا۔ نپولین نے سمجھا کہ سیاسی فتح حاصل کرنے کا یہ اچھا موقع ہے اس لئے اس نے اپنے سفیر بینے دیتی (Benedetti) کو سمجھا دیا کہ شاہ پراشیا سے اس قسم کا وعدہ لے لے کہ اگر آئندہ کبھی لیوپولڈ دعویدار ہو تو اس کی مخالفت کی جائیگی بینے دیتی (Benedetti) بمقام امز (Ems) بادشاہ سے ملا۔ بادشاہ نے مطلوبہ وعدہ دینے سے انکار کیا مگر لیوپولڈ کی موجودہ دست کشی کو بنظر استحسان دیکھا۔ دوران ملاقات میں جانبین نے کسی جوش و گرمی کا اظہار نہیں کیا اور یہ معاملہ یہیں ختم ہوتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

اِمز سے تار لیکن اسی واقعے نے ایک خوفناک جنگ کی آگ مشتعل کردی بادشاہ نے امز (Ems) بذریعہ تار اس واقعے سے بسمارک کو مطلع کردیا پہلے تو بسمارک افسردہ ہو گیا کہ جنگ کا امکان جاتا رہا اور وہ اپنی خدمت سے سبکدوش ہونیکا حیلہ سوچنے لگا لیکن بعد میں اس نے تار کے الفاظ میں کسیقدر ردوبدل کرکے ایسے پیرایہ میں

پیغام کو شائع کیا جس سے یہ اخذ ہوتا تھا کہ شاہ پراشیا کی ہتک ہوی ہے اور فرانس سے قطع تعلق کر لیا گیا ہے جرمنی میں جنگ کے لئے ایک شور اٹھا جس کا جواب حقارت آمیز لہجے میں پیرس سے دیا گیا۔

ہر دو افواج کا فرق

فرانس کو فتح کا یقین و اطمینان تھا لیکن کسی لڑائی یا مقابلے میں اسکو فتح حاصل نہوئی اور انتہائی ذلت و رسوائی اٹھانا پڑی جرمنی مکمل طور پر تیار تھا اور فرانس میں سرے سے بدنظمی و ابتری پھیلی تھی۔ جرمن فوج فرانسیسی فوج سے تعداد میں بھی زیادہ تھی اور صرف ایک ہی شخص مولٹکے کی سرکردگی میں تھی برخلاف اس کے فرانس کی فوجیں نہ تو ایک شخص کی کمان میں تھیں اور نہ چڑھائی و فوج کشی کا منصوبہ پہلے سے تیار کیا گیا تھا جرمن گولہ انداز بھی فرانسیسوں سے بہتر تھے۔

فرانس کا نقصان

الغرض کروڑ جرمن سپاہی تین حصہ بنا کر فرانسیسی حدود میں داخل ہوئے۔ فوج کشی و یورش اس پھرتی کے ساتھ ہوی کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور جنگ کے پہلے ہلہ میں فرانس کی فتح کی امید جاتی رہی میکموہن (MacMahon) کو بمقام ورتھ (Worth) کثیر نقصان کے ساتھ شکست ہوئی اس کے بعد سپہ سالار بازین (Bazaine) کی فوج بمقام میٹز (Metz) شکست کھا کر محصور ہو گئی۔ شہنشاہ (فرانس) اور میکموہن نے اگرچہ بادشاہ کا کوئی زیادہ دخل ان معاملات میں نہیں رہا تھا) پیرس کو پسپا ہونے اور شہر کے قلعہ سے مدافعت کرنیکی رائے کی لیکن ملکہ نے بذریعہ تار اطلاع دی کہ پسپائی کی صورت میں اپنے خاندان کا زوال ہو جائیگا اس وجہ سے فوج نے اپنا رخ بدل دیا اور پھر دشمن کی طرف اس امید میں بڑھنے لگی کہ شاید میٹز (Metz) کو محاصرہ سے بچا سکے یکم ستمبر ۱۸۷۰ء کو بمقام سیڈان (Sedan) جرمن فوج نے اسکو آن لیا اور سترہ ہزار جانوں کے ضائع ہونیکے بعد بیاسی ہزار سپاہیوں کے ساتھ نپولین نے شکست مان لی۔

سلطنت کا خاتمہ

اس تباہ کن حادثہ کی خبر پیرس میں پہنچتے ہی شاہی حکومت توڑ کر جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا۔ عنان حکومت جولس فیور (Jules Favre) اور گامبیٹا (Gambetta) (امور داخلی) کے ہاتھوں میں آگئی۔ نئی جمہوریت کو امن وسکون

حاصل ہو جاتا اگر اُس نے اسٹراسبورگ (Strassberg) اور میٹز (Metz) دیدیا ہوتا لیکن اس لئے اپنے زعم میں اعلان کر دیا کہ فرانس کی ایک انچ زمین بھی نہ دی جائیگی اس وجہ سے لڑائی جاری رہی جرمنی سپاہ پیرس کے اطراف جمع ہوگئی اور ایک طویل محاصرہ شروع ہوگیا۔ پیرس والوں کی قوت برداشت و مقاومت سے کسی کو انکار نہیں لیکن یورپ میں کوئی بھی ان کی مدد کیلئے ایک انگلی اٹھانے پر آمادہ نہ ہوا اور آخر کار ۲۸ جنوری ۱۸۷۱ء کو نتیجہ ظاہر ہوگیا پیرس نے ہتھیار ڈالدئے صلح فرینکفورٹ کے ذریعہ سے اسٹراسبورگ و میٹز اور السائس (Alsace) و لورین (Lorraine) کا علاقہ جرمنی کے حوالہ کر دیا گیا اور ایک کثیر رقم تاوان جنگ کی بابت بھی ادا کرنی پڑی۔

فتح پیرس کے بعد جنگ کا خاتمہ

سلطنت جرمنی کا قیام

پڑی۔ اس انجام کے پہلے ہی شاہ پراشیا شہنشاہ جرمنی کے لقب سے ملقب ہو چکا تھا اور اب ورسائی (Versailles) کے وسیع کمرہ میں اس نئے لقب کے ساتھ اسکا پرجوش خیر مقدم کیا گیا جہاں اسکے قبل لوئی چہار دہم شان و شوکت سے رہ چکا تھا شہنشاہ جرمن کے ساتھ بسمارک اور مولٹکے بھی کھڑے ہوئے تھے۔

جنگ تو ختم ہوگئی مگر قبل اس کے کہ فرانس معاشرتی و سیاسی اصلاح کی طرف متوجہ ہو اسکو ایک اور تلخ تجربہ بھگتنا پڑا۔ فرانس کے آئندہ آئین و دستور کو مرتب کرنے کیلئے ایک قومی مجلس ورسیلز میں منعقد ہوی مگر اس اثناء میں پیرس شدید انقلابی خیالات کا مرکز بن رہا تھا حالیہ ناکامیوں کی وجہ سے اشتراکیت اشتمالیت اور بد امنی کی تبلیغ و اشاعت کا زور اور بھی بڑھ گیا تھا۔ پیرس نے علیحدہ (Commune) حلقۂ حکومت قائم کر لیا۔ یعنی یہ کہ وہاں کی حکومت کو بقیہ فرانس سے کوئی تعلق نہ رہا یہ تحریک ان شاہی اصولوں کی تردید و مقابلہ کیلئے تھی جو ورسیلز کی مجلس اختیار کر رہی تھی اور یہ تحریک جمہوریت کا رنگ لئے ہوئے تھی اس تحریک کو دبانیکی راستہ ہوئی اسوجہ سے فرانس کی فوج نے دار السلطنت کا رخ کیا جرمن افواج جو ابھی تک بالکل ہٹا نہیں لی گئی تھیں اس خوفناک حال کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں بڑی کشت و خون کے بعد کمیون (شہری مجلس) کو شکست ہوگئی

پیرس کا حلقۂ حکومت (Commune)

تیسری جمہوریت

اس قسم کے مصائب کے ساتھ تیسری جمہوریت منصۂ شہود پر آئی کس نمونہ کی یہ جمہوریت ہو اس کے متعلق سخت اختلاف و مباحثہ رہا سب سے پہلا صدر تھایرس (Thiers) ہوا لیکن ۱۸۷۵ء سے پہلے اس جمہوریت کا باضابطہ قیام نہیں ہوا۔

حوالۂ کتب متعلقۂ باب ہذا:-

"حالیہ یورپ" از فائف (Fyffe) "حالیہ یورپ" از ایلی سن فلپس (Alison Philips) "بونا پارٹزم۔ از ایچ۔ ایل فشر (H. L. Fisher) "بسمارک" از ہیڈلم۔

اس باب میں ہم انیسویں صدی میں برطانیہ کے حالات کا خاکہ پیش کرنیکی کوشش کرینگے اور اسکا مقابلہ یورپ کے دیگر ممالک سے کرینگے جن کے حالات اسکے قبل بیان ہو چکے ہیں۔

انیسویں صدی کی خصوصیات

اس صدی کی چند خصوصیات کا اظہار کر دینا لازمی ہے (۱) اس زمانہ میں صنعتی اور تجارتی معاملات کو بہت وسعت دی گئی انیسویں صدی کی یہ خصوصیت تمام دنیا میں نمایاں تھی لیکن اس صدی کے ابتدائی سہ ربع حصہ میں برطانیہ عظمیٰ دیگر ممالک سے بڑھا ہوا تھا نپولین کی لڑائیوں نے بہ نسبت برطانیہ کے یورپ کو زیادہ نقصان پہنچایا تھا ہمارا ملک (انگلستان) حملہ اور جنگ سے محفوظ رہا اور جنگ واٹرلو (Waterloo) کے پہلے ہی سے صنعتی وتجارتی دور کا آغاز

(۱) صنعت وحرفت

ہو چکا تھا گو اس کی رفتار کی سرعت بعد میں بہت بڑھ گئی نو ایجادات کا تار بندھ گیا انگلستان کا ہیولیٰ ریل اور بعد میں بجلی کی بدولت بالکل تبدیل ہو گیا (۲) ملک کی آئینی زندگی بھی اس اثناء میں آزادی وعمومیت کا رنگ بھر رہی تھی ۱۸۱۵ء میں بہتیرے لوگ یہ سمجھتے

(۲) جمہوریت

تھے کہ نپولین اور فرانسیسی انقلاب کا مقابلہ انگلستان والوں نے اس وجہ سے کیا کہ یہاں کے سیاسی زندگی میں کوئی تغیر نہ ہو۔ لیکن طوفان کب رک سکتا تھا۔ صدی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ تمام بالغ مردوں کو رائے دہی کا حق حاصل ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ

نظام کابینہ کو وسعت دی گئی اور یہی نظام حکومت ہمیشہ کیلئے قائم رکھنا ضروری و مناسب سمجھا گیا
حق فرمانروائی گویا پارلیمنٹ کو حاصل ہوگیا اور پارلیمنٹ کا مرکز کشش دارالامراکے بجائے
دارالعوام ہوگیا یہ حالت دیکھکر بعضوں کا خیال ہوا کہ شاہی حکومت ٹوٹ کر جمہوری
حکومت قائم ہوجائیگی لیکن شاہی نے اپنے کو نئے خیالات کے مطابق بنالیا اور
اسی وجہ سے اس صدی کے آخری حصہ میں تمام رعایا کی وفاشعاری کا اس کو فخر حاصل
تھا سمندر پار کی سلطنت کے قیام سے کل سلطنت میں رشتۂ اتحاد قائم رکھنے کے
لئے تاج سلطانی بہترین ذریعہ ثابت ہوا (۳) مثل دیگر ممالک متمدنہ کے انگلستان
میں بھی معاشرتی مسائل نے انیسویں صدی میں وہی اہمیت حاصل کرلی جو سیاسی مسائل
کو حاصل تھی اس زمانے کی یہی ایک خاص خصوصیت تھی جو انگلستان و دیگر ممالک
میں پائی جاتی تھی۔ طرز حکومت کی اہمیت کم نہیں ہوئی مگر یہ سوال بہت شدت
سے کیا جاتا تھا کہ ان مختلف اشکال حکومت کا اثر رعایا کی حالت و
زندگی پر کیا پڑیگا؟ (۴) دیگر ممالک کے مقابلے میں انگلستان کی عام رعایا اس صدی
میں امن وسکون کے ساتھ رہی۔ اگر آئرلینڈ (Ireland) کی حالت کو مستثنیٰ کردیا
جائے تو کوئی باغیانہ شورش یا فتنہ انگلستان میں نہیں برپا ہوا اور آئرلینڈ کی تاریخ تو

(۶) انگلستان کی خاموش ترقی

سلطنت کے دیگر ممالک کے ساتھ شریک ہونا زیادہ موزوں
ہے۔ کوئی خانہ جنگی بھی نہیں ہوئی فرقہ وارانہ منافرت بعض اوقات
بہت بڑھ گئی لیکن سب فرقوں کو یہ تسلیم تھا کہ اس قسم کے
اختلاف کا تصفیہ آئینی طریقوں سے ہی کرنا درست ہے اس طور پر برطانیہ عظمیٰ دیگر
ممالک سے عجیب اختلاف و تقابل رکھتا ہے کیونکہ بعض لحاظ سے تو تمام سلطنتوں
سے زیادہ آزاد اور نئی روشنی کے مطابق ہے مگر ساتھ ہی اس کے بعض ایسے
ادارے۔ رسومات اور خیالات جو قدیم زمانہ کی یادگار چلے آرہے ہیں قائم ہیں
حالانکہ دوسرے ممالک نے ان کو قطعاً ترک کردیا ہے (۵) نوآبادیاتی اور

سلطنت کی وسعت

ہندوستانی سلطنت کے قیام کا بہت بڑا اثر خود انگلستان
کی تاریخ پر پڑا اور یہ اثر بجائے کم ہونے کے آئندہ بھی بڑھتا
نظر آتا ہے۔

(۲)

اصلاح کی مخالفت (Opposition) جیسے ہی نپولین کی تباہی کے بعد برطانیہ کو سکون و اطمینان حاصل ہوا موجودہ سیاسی و معاشرتی نظام کے خلاف مظاہرے ہونے لگے برطانیہ کی ۱۸۱۵ء کے عروج و فروغ سے فردور پیشہ جماعت کو فارغ البالی نصیب نہیں ہوئی تھی اور بہت سی انجمنیں ملک کے دستور و آئیں کو تبدیل کر دینا چاہتی تھیں لیکن اس قسم کی سب تحریکوں کی بیخ کنی کی گئی اور جو لوگ برسر اقتدار تھے وہ کسی قسم کا تغیر و تبدل قطعاً مکروہ خیال کرتے تھے ۱۸۲۰ء جب جارج سوم کی وفات پر بھی کوئی تغیر نہیں ہوا ایک عرصہ سے اس کا دماغ سست ہو گیا تھا اور جارج چہارم کی نہ تو طبیعت ایسی تھی نہ وہ ایسا ذی عقل تھا کہ ملک پر حقیقی فرمانروائی کرتا اس لئے کل اقتدار کے مالک ٹوری (Tore) بن گئے ان میں سب سے ممتاز حیثیت ڈیوک آف ولنگٹن کی تھی جس نے براعظم اسپین اور واٹرلو (Waterloo) کی لڑائیوں اور فتوحات کی بدولت بہت شہرت پیدا کر لی تھی اور

کاسلری کیننگ ویلنگٹن۔ اور پیل اب ملکی معاملات میں بھی اس کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کے بعد کیننگ (Canning) کا نمبر تھا جو بہت ذہین اور اعلیٰ درجہ کا مقرر تھا گو کسی قدر اس کے مزاج میں تلون بھی تھا۔ خارجی معاملات میں تو وہ ہر تحریک کی حمایت کرتا تھا لیکن نظام پارلیمنٹ میں کسی نوعیت کی تبدیلی یا تغیر وہ نہیں چاہتا تھا۔ کاسلری (Castlereagh) جو کسی قدر خشک مزاج تھا اور عوام کی رائے کے مطابق رجعت پسند تھا محنتی اور لائق تھا اور ایک حد تک اصلاح و ترمیم کا بھی قائل تھا سب سے آخر نمبر سر رابرٹ پیل (Sir Robert Peel) کا تھا۔ جس کا عروج تو ابھی نہیں ہوا تھا مگر جو سب سے زیادہ ممتاز ہونے والا تھا۔

آئرلینڈ کی حالت اور اس کا اثر آزادی و ترقی کے لئے پہلی کوشش آئرلینڈ میں ہوئی۔ قانون اتحاد کے شرائط میں کوئی تبدیلی اب تک نہیں ہوئی تھی۔ آئرلینڈ کی بیشتر رعایا رومن کیتھلک مذہب کی پیرو ہونیکی وجہ سے پارلیمنٹ کی رکنیت سے محروم تھی گو رائے دینے کا اختیار ان کو حاصل تھا

رومن کیتھلک لوگوں کی یہ معذوری بڑی شکایت کا باعث بن گئی تھی اور اسی کے آڑ میں آئرلینڈ کے دوسرے غیر آسودہ لوگ بھی شور کرنے لگے ۔ دانیال او کانل (Daniel O'Connel) آئرلینڈ کے مشہور رہبروں میں تھا اپنی قومی حمیت و خوش بیانی اور جرائت نیز اپنی بلند آواز کی وجہ سے وہ آئرلینڈ کی نیابت کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھا جاتا تھا انجمن رومن کیتھلک (Catholic Association) بھی اس کی مدد پر تھی اور تمام آئرلینڈ اس کی امداد کے لئے بڑے جوش و خروش سے اٹھ کھڑا ہوا ۱۸۲۸ء میں کلیر (Clare) کے حلقہ سے وہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے کھڑا ہوا حالانکہ رومن کیتھلک ہونے کی وجہ سے وہ پارلیمنٹ میں بیٹھ نہیں سکتا تھا دیہاتی رائے دینے والے جو اب تک پروٹسٹنٹ زمینداروں کے حکم و مرضی کے مطابق بے چون وچرا رائے دیدیا کرتے تھے اب او کانل کی امداد کے لئے تیار ہوگئے گو چٹھی

ڈین او کانل

کے ذریعہ سے رائے لینے کا طریقہ ابھی تک رائج نہیں ہوا تھا آخر کار اپنے حریف کے مقابلہ میں کثرت رائے کے ساتھ او کانل (O Connel) منتخب ہوگیا۔ یوں اس واقعے کی کوئی اہمیت نہ ہوتی مگر یہ ظاہر تھا کہ آئرلینڈ کا کیتھلک طبقہ اس شورش کو بڑھانے کے لئے اور اگر ضرورت ہو تو خانہ جنگی کے لئے بالکل آمادہ تھا اس وجہ سے اس کی مخالفت کرنا گویا خانہ جنگی کی

کیتھلک فرقہ کی آزادی

دعوت دینا تھا اس خیال سے ڈیوک آف ولنگٹن نے ہمت کر کے پارلیمنٹ سے استدعا کی کہ اس کو شرکت پارلیمنٹ کی اجازت دیدی جائے۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رو سے برطانیہ اور آئرلینڈ میں کیتھلک مذہب کے لوگ سیاسی معاملات میں پروٹسٹنٹ لوگوں کے ہم پلہ و ہم حیثیت تسلیم کر لئے گئے۔ اس تجویز سے بعض طبقوں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور بعض طبقوں کو بہت سی امیدیں ہوگئیں لیکن اس قسم کے کوئی انقلابی نتائج برآمد نہیں ہوئے جن کا اندیشہ کیا گیا تھا یا جن کی بعضوں کو امید تھی۔

اصلاح کی شورش

لیکن اسکی بدولت نظام مقررہ میں دست اندازی ہوگئی اور پارلیمنٹی آئین میں تبدیلی ہوگئی مزید اصلاح و ترمیم کے حامیوں کی ہمت

بڑھ گئی اور اس قانون کے منظور ہوتے ہی ٹوری فرقہ منشق ہو گیا کچھ دنوں قبل پارلیمنٹ کی از سر نو اصلاح کرنے کی تحریک وشورش اٹھی تھی۔ اس شورش نے پھر ایک ایسی تحریک کی صورت اختیار کر لی جو اٹھارھویں صدی میں بہت فروغ حاصل کر چکی تھی لیکن نپولین اور فرانسیسی انقلاب کی لڑائیوں کی وجہ سے پس پشت ڈال دی گئی تھی۔ اس تحریک کے حامی اب زیادہ اطمینان کے ساتھ کوشش کرنے لگے۔

موجودہ نیابتی نظام کے نقایص

موجودہ طریقۂ انتخاب محض اس وجہ سے قائم و بحال تھا کہ وہ نظام مقررہ کا جزو تھا لیکن اس نظام مقررہ میں کسی قسم کے تغیر کے ساتھ پارلیمنٹ کے طریقہ انتخاب میں بھی تغیر و تبدیلی ہونا ضروری تھا کیونکہ موجودہ حلقہ جات انتخاب ملک کی آبادی کی تقسیم کے مناسبت سے نہیں تھے۔ اٹھارھویں صدی کے تجارتی انقلاب کے بعد سے بہت سے لوگ شمالی انگلستان میں جا بسے تھے خصوصاً وسطی حصہ ملک کے مغربی اضلاع یارک شایر (Yorkshire) و لنکا شایر (Lancashire) میں۔ لیکن جنوبی و مغربی انگلستان کے آباد اضلاع دار العوام میں زیادہ اراکین بھیجتے تھے۔ مانچسٹر (Manchester) شفیلڈ (Sheffied) لیڈس (Leeds) اور برمنگھم (Beminghaın) کو نمایندگی کا حق حاصل نہیں تھا۔

سنہ ۱۸۳۰ء کا قانون اصلاح

ہمارے خیال میں قدیم نظام کو حق بجانب بتانا درست نہیں لیکن مقابلہ وجد و جہد سخت و طویل رہی۔ تغیر کا خوف بہت دنوں سے لوگوں پر چھایا ہوا تھا لیکن اتحاد مصلحین (Reformers Union) ملک کے مختلف حصوں میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہی تھی اور باہمی مخالفت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس نئی تجویز کے نتائج کے متعلق عجیب و غریب امیدیں قائم کی گئی تھیں بلجیم اور سنہ ۱۸۳۰ء میں فرانس کے انقلاب کا خاصہ اثر پڑا اور اس مرتبہ یہ اثر تغیر و اصلاح کے حق میں مفید ثابت ہوا ولنگٹن نے حتی الامکان مخالفت کی مگر دار العوام میں اصلاح پسندوں کی اکثریت تھی اگر ولنگٹن مخالفت پر قایم رہتا تو خانہ جنگی شروع ہو جاتی اس وجہ سے اُس نے دانشمندی سے تسلیم خم کر دیا اور جون سنہ ۱۸۳۲ء میں تحریک اصلاح (Reform Bill) کی منظوری دار الامرا سے ہو گئی اور بادشاہ کی مہر بھی ثبت ہو گئی۔

تحریک اصلاح کا اثر

سنہ ۱۸۳۲ء کے قانون اصلاح کا اثر ہماری تاریخ پر ایسا ہی اہم ہوا جیسا کہ سنہ ۱۶۸۸ء کے

انقلاب کا لیکن ۱۸۳۲ء کا انقلاب بطور خود مکمل تھا اور قانون اصلاح آئندہ نصف صدی کے دستوری و قانونی تغیرات و انقلاب کا محض دیباچہ تھا۔ یہ تغیرات ایسے تھے کہ برطانیہ میں سیاسی و معاشرتی قوت و اقتدار کا توازن ہی بالکل بدل گیا اس قانون کا فوری اثر یہ ہوا کہ متوسط طبقہ برسر اقتدار ہوگیا مزدور پیشہ طبقہ جس کی تائید کی وجہ سے اس قانون کی منظوری میں بہت سہولت ہوگئی تھی کافی رائیں حاصل نہ کرسکا اور اس وجہ سے اس طبقے کے سرداروں کو یہ خیال دامنگیر ہوا کہ اس قانون سے ان کو دھوکا اور نقصان ہوا۔ تمام ملک کی نمایندگی کا طریقہ پہلے سے زیادہ باضابطہ اور معقول ہوگیا لٹے چھوٹے اور غیر معروف مقامات کی نمایندگی برخاست کردی گئی۔ شہروں میں حق رائے دہی یکساں رکھا گیا اور اضلاع میں اس حقوق کو وسعت دی گئی اس تجویز کے موئدین خصوصاً امرا و متوسط طبقہ کے لوگوں کی دانست میں یہ تجویز اصلاح" قطعی و مکمل ہوچکی تھی اور اب اس میں کوئی تغیر و تبدل ہونے کی امید باقی نہ رہی تھی لیکن اُن لوگوں کا قیاس زیادہ صحیح تھا جو کہتے تھے کہ اس قانون کے سلسلہ میں مزید تغیرات کا ہونا لازمی ہے۔ جن دلائل و براہین سے ۱۸۳۲ء کا قانون نافذ و جاری ہوا تھا اُنھی وجوہات نے ملک کے آئین و دستور کو عمومی رنگ میں ڈھال دیا۔

(۳)

وھگ (Whig) فرقہ کا برسر اقتدار آنا

وھگ (Whig) جماعت کے سردار لارڈ گرے (Gray) جو تحریک اصلاحات کی صدارت کیا کرتے تھے اب نئی اصلاح شدہ پارلیمنٹ کے اولین وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ایک زبردست اکثریت ان کے ساتھ تھی جدید پارلیمنٹ نے بعض اہم قوانین نافذ کئے ۱۸۳۳ء کے ایک قانون سے تمام سلطنت برطانیہ کے غلام آزاد بنا دئے گئے۔ ایک جدید اور اہم قانون محتاجین و فقرا جاری ہوا۔ سب سے بڑھ کر ۱۸۳۵ء کا "قانون اصلاح شخصیہ شہری (Monicipal corporation Act) شہری زندگی کے ارتقا کا باعث ہوا جو برطانیہ کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ فرانس اٹلی جرمنی اور نیدرلینڈز (Netherlands)

کے مقابلے میں اب تک برطانیہ کی شہری زندگی ہیچ پوچ تھی۔ اب تمام شہر تقریباً خودمختار جماعتیں بن گئے اور گو ابتداً انھوں نے ان مواقع محصلہ سے استفادہ بہت کم کیا مگر پھر بھی انھوں نے ملک کو معقول فائدہ پہنچایا جیسا کہ اٹلی اور جرمنی کے بڑے بڑے شہروں نے دماغی علمی اور تجارتی فوائد اپنے اپنے ملکوں کو پہنچائے تھے۔

وکٹوریا (Victoria)

جارج چہارم سنہ ۱۸۳۰ء میں فوت ہو چکا تھا اور ولیم چہارم سنہ ۱۸۳۷ء تک حکومت کرتا رہا اس عہد حکومت کے واقعات بغیر اس تاجدار کا نام لئے بیان کئے جا سکتے ہیں اس سے یہ واضح ہو سکتا ہے کہ قوم کی زندگی و معاملات میں اُس کا دخل کسقدر کم و بے معنی تھا۔ ۱۸۳۷ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں وکٹوریہ ملکہ ہوئی۔

انگلستان اور براعظم

اس کی حکومت کے پہلے سال میں براعظم یورپ میں انقلاب سنہ ۱۸۴۸ء کا مواد و مصالحہ جمع ہو رہا تھا۔ انگلستان بھی اسکے اثرات سے محفوظ نہیں رہا لیکن برطانیہ میں یہ تحریک ایک عجیب انداز میں رونما ہوئی اور ممالک براعظم میں جو شدائد و سختیاں اس تحریک کی بدولت پیش آئیں ان کا وجود بھی برطانیہ میں نہیں پایا گیا تکالیف و مصائب ضرور پیش آئے مگر یہ معلوم ہو گیا کہ اس کا علاج موجودہ آئین و دستور سے ہو نا ممکن ہے البتہ آئرلینڈ میں اس تحریک نے ناگوار صورت اختیار کی جس کی وجہ سے خونریز انقلاب کا اندیشہ ہو گیا تھا۔

"چارٹزم" (Chartism)

انگلستان میں معاشرتی تحریک نے دو رخ اختیار کئے ایک طرف تو اصلی مزدور پیشہ لوگوں کی تحریک تھی جس کو "چارٹزم" (Chartism) کہتے ہیں اس تحریک کے پردے میں معاشرتی اغراض و مقاصد پنہاں تھے مگر مطالبہ سیاسی تغیر کا کیا جا رہا تھا۔ اس تحریک نے رعایا کے حق میں ایک منشور شاہی جاری کرنے کی شورش کا رنگ اختیار کر لیا۔ ہر بالغ مرد کو حق اظہار رائے چیٹھی سے رائے دینے کا طریقہ۔ سالانہ پارلیمنٹ۔ ممبران پارلیمنٹ کے لئے کسی جائداد کے مالک ہونے کی شرط کا عدم لزوم اور ممبران کو معاوضہ اس طرح پانچ مطالبات تھے جو طالبان منشور شاہی نے پیش کئے عام طور پر اس تحریک

کی حمایت ہونے لگی اور اس تحریک کے سخت و سست الفاظ نے ایک قسم کا خطرہ بھی پیدا کر دیا تھا لیکن ان میں کوئی شخص سیادت و رہبری کے لائق نہ تھا اور اس وجہ سے یہ تحریک بجھ گئی گو سیاسی خیالات پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکی اس تحریک کے بہت سے مطالبات تو اب تک منظور بھی ہو چکے ہیں یعنی چارٹزم۔

اس تحریک "مطلب منشور شاہی" کے ساتھ ساتھ بلکہ اکثر اسکے مقابلے میں "آزاد تجارت" کیلئے اور "قانون اجناس" کی تنسیخ کیلئے الچل مچی ہوئی تھی "قانون اجناس" کی رو سے ہر درآمد شدہ غلہ پر محصول عاید کر دینے سے غلہ ایک مصنوعی قیمت پر بکتا تھا "قانون اجناس" اسوقت جاری ہوا تھا جبکہ زراعت ہی ملک کا ذریعۂ معاش تھا لیکن اب حالت بدل گئی اور ہر طرف تجارتی شہروں

آزاد تجارت کی تحریک

کی آبادی سے کاریگروں کو غلہ کی گرانی سے سخت تکلیف ہونے لگی۔ آدم سمتھ (Adam Smith) کے بعد سے تمام ماہرین اقتصادیات اس نظریہ کی تائید کرتے تھے کہ ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان تمام اشیا کا مبادلہ آزاد یعنے بلا ادائی محصول ہونا چاہئے اور "آزاد تجارت" کے اس اصول کی پابندی سے "قانون اجناس" کی تنسیخ لازم ہو جاتی تھی ہمارے تمام تاریخ میں کوئی تحریک اصلاح کی ایسی منظم نہیں ہوئی۔ اور نہ ایسے شد و مد سے کسی دوسری تحریک کو انجام تک پہنچایا گیا کابڈن (Cobden)

کابڈن اور برائٹ

اور برائٹ (Bright) اس تحریک کے سرگرم لیڈر تھے مدلل اور معقول تقریر کرنے میں کابڈن اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا اور مالی مسائل و نظریوں کے سمجھانے میں اس کو کمال حاصل تھا۔ برائٹ کی تقریریں جوش زیادہ ہوتا تھا جس کی وجہ سے عوام پر اس کو اتنا قابو تھا کہ آج تک انگلستان میں کسی کو حاصل نہ ہوا۔ اس کی تقاریر انگریزی علم ادب میں ایک مستقل جگہ حاصل کرنے کی مستحق ہیں۔ یہ لوگ تمام ملک میں پھر پھر کر "قانون اجناس" کی مذمت کرتے اور آزاد تجارت سے ملکی فارغ البالی اور غیر ممالک سے میل جول پیدا ہونے کا نقشہ پیش کرتے تھے۔

پیل (Peel) اور قانون اجناس

ڈیوک آف ولنگٹن اور لارڈ پیل (Peel) کی ٹوری وزارت نے ایک عرصہ تک اس تحریک کی مخالفت کی لیکن پیل کے ذہن رسا نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ "قانون اجناس" کی تائید

عقلی طور پر نہیں کی جاسکتی علاوہ اس کے ۱۸۴۵ء میں آلو کی فصل خراب ہو جانے

قحط آئرلینڈ

سے آئرلینڈ میں قحط ہوگیا اور قحط زدہ کسانوں کو وہی گراں غلہ بھیجنا پڑتا تھا جس پر محصول غلہ عاید ہو چکا تھا پیل نے سمجھ لیا کہ آئرلینڈ سے "قانون اجناس" اٹھا لینا پڑیگا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایک مرتبہ اس کو اٹھا لیا گیا کہ پھر اس کا نفاذ غیر ممکن ہو جائیگا آخر کار وہ ہمت کر کے کو دپڑا اور کابڈن کی خدمات اعلی کا اعتراف کر کے دھاگ مخالفین کی امداد سے دارالعوام میں "قانون اجناس" کو منسوخ کرا دیا۔ انگلستان کی معاشی و تمدنی زندگی میں یہ ایک بہت بڑا قدم تھا اور سیاسی زندگی پر بھی اس کا اثر کچھ کم نہ پڑا کیونکہ پیل کی اس حرکت نے ٹوری جماعت کو دو حصوں میں منشق کر دیا جس کی وجہ سے وہ جماعت تباہ

قانون اجناس کی تنسیخ

ہو گئی۔ اس سے ایک قدامت پسند فرقہ پیدا ہو گیا جس نے انگلستان کے مستقبل پر اپنا بہت کچھ اثر ڈالا مگر یہ جماعت ٹوری فرقہ کی طرح اصلاح و تغیر کی مخالف و دشمن نہ تھی بلکہ اس فرقہ کا یہ اصول تھا کہ تبدیل و اصلاح اس طریقہ سے کی جائے کہ ملک میں کسی قسم کی بدامنی نہ ہو نے پائے۔ لیکن گو پیل (Peel) اس قدامت پسند فرقہ کا باوا آدم تھا مگر اس کی زندگی نے وفا نہ کی کہ وہ اس جماعت کی سرداری بھی کر لیتا ۱۸۵۰ء میں وہ یکایک مر گیا۔

(۴)

پامرسٹن (Palmerston)

اب ہم تاریخ برطانیہ کے اُس پندرہ سال کی حکایت پر آتے ہیں جس کے اثنا میں پامرسٹن (Palmerston) کی شخصیت خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے اُس کا شمار ہمارے سب سے بڑے مشہور مدبروں میں تو نہیں ہے اور گو والپول چیتھم اور پیٹ کے ایسا نام تو اس نے نہیں پیدا کیا اور نہ پیل۔ ڈزرائیلی (Disrach) گلیڈاسٹون یا چمبرلین کے ایسا مستقل اثر اس نے برطانیہ کی سیاسی زندگی پر ڈالا۔ وہ کوئی متبحر عالم یا فلسفی بھی نہیں تھا اور نہ روزانہ کے معاملات میں وہ ہمیشہ صائب الرائے ہی رہا۔ پھر بھی اُس نے اپنے بعد ایک ایسا نام چھوڑا ہے کہ جو ہر شخص کی توجہ و دلچسپی کا باعث ہوتا ہے وہ بڑا پرجوش اور طرار وطن پرست تھا یورپ کی شاہی حکومتوں کا دشمن

تھا اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ غیر ممالک کی ہر وسیع النظر تحریک کا حامی مگر اپنے ملک میں کسی قسم کے تغیر یا انقلاب کو شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن اسکے خیالات وراپوں سے اس کی شخصیت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

اس کا خارجی طرز عمل

سیاسیات کو وہ کھیل تماشے کی نظر سے دیکھتا تھا اور اسی وجہ سے انگلستان کے کھیل تماشا پسند کرنے والے طبقہ میں ہر دلعزیز تھا۔ برطانیہ کی خارجی حکمت عملی میں اس نے تحاکمانہ اور جارحانہ روح ڈالدی جسکی شکایت غیر ملک والے اس جذبہ کے فنا ہو جانے کے بعد بھی عرصہ تک کرتے رہے۔

پامرسٹن کے زمانہ کی لڑائیاں

اس پندرہ سال کے عرصہ میں برابر لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں سے بہتوں کا ذکر ہوچکا ہے یونان کی جدید سلطنت میں بھی کچھ گڑبڑ تھی اور چین سے بھی بیجا اور جابرانہ طور پر لڑائی کردی گئی تھی۔ مگر سب سے بڑھ کر جنگ کریمیا تھی جس کا تفصیلی بیان اوپر ہوچکا ہے علاوہ اس کے ہندوستان کا غدر تھا جس کی اہمیت سلطنت برطانیہ کے لئے جنگ کریمیا سے بھی زیادہ تھی اسوقت تک ہندوستان میں حکومت برائے نام ایسٹ انڈیا کمپنی (مشرقی ہند کی تجارتی جماعت) کے ہاتھ میں تھی جس کی عام نگرانی مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں تھی ہندوستان کی فوج زیادہ تر وہیں کے باشندوں پر مشتمل تھی البتہ بعض افسر برطانوی تھے۔ ہندوستان میں برطانوی علاقہ بہت وسیع ہو گیا تھا خصوصاً لارڈ ڈلہاوزی کے بعد سے جس لئے بہت سی دیسی ریاستیں جن کے وارث قریبی نہیں تھے انگریزی علاقہ میں ملالی گئیں اس کے علیحدہ ہونے کے بعد ۱۸۵۷ء میں غدر

بغاوت ہند

ہو گیا لفظ غدر سے ہی اس کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ ہنگامہ فوج کا غدر تھا رعایا کی کوئی بغاوت نہ تھی۔ ہندوستان میں انگریزی فوج اتنی کم تھی کہ کچھ دنوں تک حالت بہت خطرناک ہوگئی۔ فوج کے کچھ حصہ اور بعض دیسی ریاستوں کی وفاداری نے انگریزوں کو شورش فرو کرنے اور انگریزی راج قائم کرلینے کا موقع دیا اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت برخاست کر کے حکومت ہند کی باگ راست سلطنت کے ہاتھوں میں آگئی اس کے بعد

سے ہندوستان کا اصل حاکم وائسرائے ہوگیا اور انگلستان میں وزیر ہند ہندوستان کی حکومت کا ذمہ دار بن گیا۔

(۵)

۱۸۶۵ء میں پامرسٹن مرگیا۔ اپنے ملک میں اس نے اصلاح کی تمام تجاویز کو دبا رکھا تھا اس وجہ سے اس کی وفات کے ساتھ ہی پارلیمنٹ میں مزید عمومی اصلاحات کا دور شروع ہوا وزارت وھگ فرقہ کے ہاتھوں میں تھی اور لارڈ جان رسل (John Russel) وزیر اعظم تھا گلیڈ اسٹون (Gladstone) وزیر مالیات تھا ۱۸۶۶ء میں اس نے ایک قانون اصلاح پیش کیا اس کی مخالفت صرف ٹوری فرقہ نے نہیں کی بلکہ وھگ فرقہ کے بھی ان لوگوں نے شدید مخالفت کی جو اب تک پامرسٹن کی تائید و حمایت کر رہے تھے اقلیت کی وجہ سے حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔

۱۸۶۶ء کا قانون اصلاح

قانون اصلاح کے مباحثہ میں گلیڈ اسٹون (Gladston) کی تجویز کی مخالفت میں ڈزرائیلی (Disrachi) نے خاص حصہ لیا تھا۔ ڈزرائیلی کی وفات تک یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف رہے مخالفت اختلاف طبع۔ و مقاصد و خیالات کی وجہ سے تھی ہمارے نظام فرقہ بندی کی یہ خصوصیت ہے کہ سیاسی اختلاف بڑھتے بڑھتے فریقین کے سربرآوردہ حامیوں کی لڑائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے تاریخ میں پِم (Pym) اور ونٹورتھ (Wentworth) ہیلی فیکس (Hali fax) اور شافٹسبری (Shaftsbury) والپول (Walpole) اور چیتھم (Chatham) پٹ (Pitt) اور فاکس (Fox) یہ نام ساتھ ساتھ آتے ہیں لیکن گلیڈ اسٹون اور ڈزرائیلی ایسی جوڑ پارلیمنٹ کے اکھاڑے میں آج تک نہیں اُتری گلیڈ اسٹون ایٹون (Eton) اور آکسفرڈ (Oxford) کا نامشہور طالب علم اور انگلیسی کلیسہ کا بڑا پابند اور پرجوش معتقد تھا۔ پارلیمنٹ میں وہ انتہا پسند ٹوری کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور کیننگ (Canniug) کا بڑا مداح تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ ایک پرجوش مصلح بن گیا شروع شروع میں تو پیل کی مالی تجاویز کی حمایت کی وجہ سے اور بعد میں پامرسٹن کی جارحانہ خارجی حکمت عملی کی مخالفت کی

گلیڈ اسٹون اور ڈزرائیلی

وجہ سے جتنی جتنی عمر تجاوز کرتی گئی وہ نئے نئے تجاویز کو زیادہ قبول واختیار کرنے لگا اور عمومی اصلاحات کا روز بروز زیادہ قائل ہوتا گیا ڈزرائیلی یہودی النسل تھا مگر وہ بھی انگلیسی کلیسہ کا پیرو تھا۔ پہلے اس کی شہرت بحیثیت ایک فسانہ نگار کے ہوئی اور شروع شروع وہ ریڈیکل فرقہ (Radical) (انتہائی حریت پسند) کا حامی تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ مخالف گروہ میں شامل ہوگیا۔ خصوصاً اپنے شہنشاہی پسند خیالات کی وجہ سے اور اس وجہ سے بھی کہ وسیع خیالات والا فرقہ (Libaral) ان خیالات کی کچھ پروا نہیں کرتا تھا اور گو وہ قدامت پسند جماعت کا سردار بھی ہوگیا لیکن دوسرے قدامت پسندوں سے زیادہ تغیر و انقلاب کا حامی تھا اور کہتا تھا کہ میں تو اپنے فرقے کو تعلیم دے رہا ہوں ۱۸۶۶ء میں وہ وزیر مالیات مقرر ہوا لارڈ ڈاربی (Derby) وزیر اعظم اسکے بعد اس نے اسی قماش کا ایک قانون اصلاح ڈاربی (Derby) پیش کرکے جس کی وہ ابتک مخالفت کر رہا تھا اسی جماعت و نیز تمام انگلستان کو حیرت کے عالم میں ڈالدیا

ڈزرائیلی کا ۱۸۶۶ء والا قانون اصلاح

اس کی جماعت کے بعض امراء نے اعتراض کیا مگر لبرل فرقے کے مخالف گروہ کی تائید میں کوئی شبہ نہیں تھا اس قانون کی رو سے ہر مالک مکان کو اور بعض کرایہ داروں کو بھی رائے دینے کا حق حاصل ہوگیا۔ اضلاع میں بھی حق رائے دہی کو وسعت دی گئی گو شہروں کو تو تقریباً کامل عمومیت حاصل ہوگئی لیکن اضلاع اب بھی بیس سال تک متوسط طبقے کے ہاتھوں میں ہی رہے۔

لاؤ ہم ذرا اس مزید وسعت حق رائے دہی (اضلاع میں) کا مطالعہ کریں گو تاریخی سلسلے سے یہ تذکرہ قبل از وقت ہوگا ۱۸۸۴ء میں جاکر کہیں گلیڈ اسٹون کی وزارت نے اضلاع کو بھی وہی حقوق رائے دہی عطا کر دئے جو شہروں کو حاصل ہو چکے تھے بڑی رد و قدح کے بعد دونوں جماعتوں نے اس تجویز کو منظور کرلیا اور اس کے ساتھ ہی دو قانون تقسیم مکرر نشستیں (Adistribution Bill) بھی منظور ہوا جس کی وجہ سے نشستوں کی بدترین ناموزونیت و بے ترتیبی کا ازالہ ہوگیا اس تجویز سے برطانوی دستور کا عمومی اصول قائم ہوگیا جہاں تک برطانیہ کے بالغ ذکور کا تعلق و سوال

گلیڈ اسٹون کا قانون حق رائے دہی

تھا اس کا تو تقریباً تصفیہ ہو گیا لیکن طبقۂ اناث کے سیاسی حقوق اور حق رائے دہی کے متعلق بھی آوازیں اٹھنے لگی تھیں اور گو اس ادعا نے ہمارے سیاسی تاریخ میں ایک نئے اور اہم باب کا اضافہ کر دیا لیکن اس کتاب میں اسکا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں پائی جاتی۔

۱۸۶۸ء میں ڈزرائیلی نے جو لارڈ ڈربی کے بعد وزیر اعظم ہوا تھا پارلیمنٹ کو شکست کر دیا اور قانون اصلاح کی رو سے جو نئے حلقے انتخاب کے قائم ہوئے تھے ان سے رجوع کیا نئے حلقہ جات انتخاب نے صاف طور پر قدامت پسند فرقے کی مخالفت کی اور لبرل و آزاد خیال جماعت ایک سو کی اکثریت سے برسر اقتدار آ گئی۔ گلیڈ اسٹون وزیر اعظم ہو گیا اور اس نے اصلاحات کا ایک سلسلہ ڈال دیا۔

گلیڈ اسٹون کی حکومت

قانون کے بعد قانون پے در پے نافذ ہوتا رہا ۱۸۷۰ء میں "ابتدائی تعلیم کا قانون" نافذ ہوا جس کی بدولت برطانیہ میں بھی بقیہ یورپ کی طرح عام قومی تعلیم قائم ہو گئی لیکن قوم کو اس کی حقیقت کا احساس نہ ہوا کہ محض خانگی اور شخصی ذرائع کے بجائے تعلیم کو حکومت اور قوم سے متعلق کر دینے میں کیا کیا فوائد تھے۔ تمام پارلیمنٹی انتخابات کے لیئے چٹھی سے رائے دینے کا طریقہ جاری ہو گیا۔ فوج اور عدالت میں بھی اہم اصلاحات ہوئے لیکن گلیڈ اسٹون کا نام سب سے زیادہ آئرلینڈ کے مسئلے کی وجہ سے مشہور رہا۔ اب اس کو موقع ملا تھا کہ آئرلینڈ کے تمام شکایات کا مداوا کرئے اور ان مشکلات و خطرات کا ازالہ کر دے جو انگلستان و آئرلینڈ کے کشیدہ تعلقات کے باعث انگلستان کو اکثر پیش آئے تھے۔ جو طریقۂ کار اس نے اختیار کیا اس کے متعلق اب بھی اختلاف ہے اور ہم صرف اس کے مختلف مدارج بیان کر لینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

گلیڈ اسٹون نے مسئلہ آئرلینڈ کے دو پہلوؤں پر غور کیا تھا ایک تو مذہبی دوسرے زراعتی۔ آئرلینڈ میں پروٹسٹنٹ اور ایپسکوپل (Episcopal) مذہب اقلیت کا تھا بیشتر رعایا کیتھولک مذہب کی پابند تھی خود پروٹسٹنٹ گروہ میں تقریباً نصف تو پرسبیٹرین (Presbytarian) تھے جن کو اصل کلیسہ (انگلیسی کلیسہ)

سے بہت سے شکایات تھے۔ ۱۸۶۹ء میں گلیڈاسٹون نے ایک قانون نافذ کیا جس نے کلیسہ کی سرکاری حیثیت اور اس کی آمدنی کے ذرائع سلب و مسدود کر دیئے اس کے بعد گلیڈاسٹون نے آئرلینڈ کی اراضی اور زمینوں پر توجہ مبذول کی آئرلینڈ کی اراضی کا سوال ہنری دوم کی فتح سے آج تک کی تاریخ آئرلینڈ پر حاوی ہے اس پیچیدگی کے اسباب حسب ذیل تھے:۔ (۱) آئرلینڈ کے اکثر زمیندار انگلستان میں رہتے اور آئرلینڈ سے مالگذاری وصول کیا کرتے تھے (۲) آئرلینڈ کی کاشتکاری کا طریقہ انگلستان سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا اسامی کو اراضی کی حیثیت بڑھانے کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا برخلاف اس کے انگلستان میں وہ معاوضہ پانے کا قانوناً مستحق ہوتا

قانون اراضیات آئرلینڈ

تھا (۳) آئرلینڈ کی آبادی اس قدر کثیر تھی کہ اراضی کو سنگین و ہارہ اور سخت شرائط پر دینے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ گلیڈاسٹون کا قانون ان نقائص کو دور کرنے کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ جن اسامیوں نے اپنی اراضی کی حیثیت بڑھادی تھی ان کو معاوضہ دینے کی تجویز تھی اور اگر ان کو بیدخل کیا جائے تو بھی بجز اس کے کہ ایسی بیدخلی عدم ادائے لگان کی بنا پر ہو ان کو معاوضہ دینا واجب قرار دیا گیا۔ کسانوں کی حالت تو سنبھل گئی مگر ملک کو معلوم ہوا کہ یہ قانون یہیں تک ختم نہیں ہوگا۔ اصلاح زمین کی کوئی انتہا نہیں معلوم ہوتی تھی یہاں تک کہ اسامی کاشتکار اپنی زمین کا حقیقی مالک بن گیا۔

گلیڈاسٹون کی حکومت ملکی معاملات میں اسقدر جذب تھی کہ خارجی امور میں وہ الجھنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ امن قائم رکھنے میں یہ حکومت کامیاب رہی لیکن پھر بھی بعض اہم خارجی معاملات پیش آئے ۱۸۷۰ء فرانس و جرمنی کی جنگ نے انگلستان میں جوش پھیلا

فرانس اور جرمنی کی لڑائی

دیا تھا اور گلیڈاسٹون مداخلت کرنے سے انکار کرتا رہا۔ اس کا یہ فعل بلکہ سکوت قوم کو بھی پسند آیا۔ لیکن جب ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس وقت اکثروں کو یہ خیال ہوا کہ اگر انگلستان نے یورپ کی ان دو بڑی سلطنتوں کی باہمی لڑائی میں ایک سلطنت کو بالکل تباہ ہونے سے بچا لیا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا اس کے

الاباما (Alabama) کے معاملہ کا فیصلہ

کچھ ہی دنوں بعد گلیڈ اسٹون نے یہ معاملہ ثالثی کے سپرد کیا کہ خانہ جنگی کے زمانے میں الاباما (Alabam) نامی جہاز نے جو انگلستان میں بنا تھا جو کچھ نقصانات کئے تھے اس کی تشخیص کر دی جائے تاکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو وہ رقم دیدی جائے اس وقت تو اسکی یہ حرکت کمزوری سمجھی گئی مگر اب کوئی اس پر الزام نہیں رکھ سکتا کہ اس نے ریاستہائے متحدہ سے جنگ نہ کرنے میں دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا۔

۱۸۷۴ء کے آخر میں گلیڈ اسٹون کے اقتدار کی عمر ختم ہو گئی اور عام انتخاب میں ڈزرائیلی (Disraeli) ایک معقول اکثریت کے ساتھ برسر اقتدار ہو گیا (بجز دو ایک استثنا کے) یہ ایک خاص بات ہے کہ انیسویں صدی میں ہر عام انتخاب کے موقع پر انگلستان نے مخالف جماعت کی تائید کی۔ آیرلینڈ و ویلز (Wales) اور اسکاٹلینڈ کی رائیں البتہ ایک حالت پر قائم رہیں۔

ڈزرائیلی کی حکومت

ڈزرائیلی کی حکومت کو معمولی طول ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۰ء تک نصیب ہوا بہت کم ایسے قوانین منظور ہوئے جن کا دائمی اثر سلطنت کی زندگی پر پڑا ہو۔ ڈزرائیلی کو اصل دلچسپی خارجی امور سے تھی اور جب تک وہ برسر حکومت رہا اس صیغے میں اس کو بڑے اہم معاملات پیش آئے سب سے اہم تو روس و ترکی کی جنگ تھی جو ۱۸۷۷ء سے ۱۸۷۸ء تک رہی یہ جنگ دو نامور حریفوں یعنی گلیڈ اسٹون اور ڈزرائیلی کے باہمی تصادم کا باعث ہوئی اس لئے کہ گلیڈ اسٹون ترکوں کو لعنت ملامت کرتا تھا کہ انھوں نے بلغاروی شورش فرو کرنے میں جبر و سختی سے کام لیا اور ڈزرائیلی ترکوں کو تباہی سے بچانا چاہتا تھا اور قسطنطنیہ کو روسیوں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

روس اور ترکی کی جنگ

برطانوی مداخلت کی دھمکی نے روس کو آگے بڑھنے سے روکدیا اور قسطنطنیہ و درہ دانیال پر ترکوں کا قبضہ قائم رکھا۔ برلن میں دول یورپ کی ایک مجلس مسائل بلقان کے تصفیہ کے واسطے منعقد ہوئی تھی جس میں ڈزرائیلی برطانیہ کا نمائندہ بن کر شریک ہوا تھا جب وہ برلن سے انگلستان واپس آیا تو کہتا تھا کہ اس نے عزت کے ساتھ امن و امان قائم کرادیا۔ لیکن یورپ کی سب سے بڑی جنگ میں جو اس وقت چھڑی ہوئی ہے برطانیہ روس کی

امداد سے ڈزرائیلی کی تعمیر کردہ عمارت کو ڈھا رہا ہے اور تاریخ نے اس کی توقعات اور اس کے اندیشوں کی تردید کردی ہے اور اس مسئلے کا جو حل اس نے تجویز کیا تھا اس کو غلط ثابت کردیا ہے۔

مصر

مصر کے مقابلے میں بھی اس کے طرز عمل نے مستقبل کے لئے اہمیت پیدا کردی ۱۸۷۵ء میں اس نے خدیو مصر کا وہ حصہ جو اس کو نہر سویز (Saez) میں حاصل تھا خرید لیا اور بعد میں جب پھر خدیو کو مالی مشکلات درپیش آئے تو اس نے مصر کے مالی معاملات کو برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ قابو میں لانے کی کوشش کی کیونکہ ان دو ممالک کا مالی تعلق بہ نسبت دیگر ممالک کے زیادہ گہرا تھا ۱۸۸۰ء کے عام انتخاب میں پھر لبرل (آزاد خیال) جماعت برسر حکومت ہوگئی۔ ڈزرائیلی لارڈ بیکنس فیلڈ (Beaconslield) کے لقب کے ساتھ دارالامرا میں جا چکا تھا اور ۱۸۸۱ء میں وہ فوت بھی ہوگیا۔

(۶)

اب اس کے بعد کے حالات ہم تاریخ وار بیان نہیں کرینگے بلکہ ہم دو مختلف موضوعات پر جو ایک دوسرے سے غیر متعلق ہیں اور جن کی اہمیت سب سے زیادہ ہے بحث کرینگے یعنے مسئلۂ آئرلینڈ کی تاریخ اور انگلستان کے خارجی تعلقات کی تاریخ ہے۔

معاملات آئرلینڈ

گلیڈ اسٹون کا "قانون اراضی" گو نیک نیتی پر مبنی تھا مگر آئرلینڈ میں امن و سکون قائم کرنے میں ناکام رہا۔ ڈزرائیلی کے زمانے میں آئرلینڈ کے معاملے نے ایک نئے رہبر اور ایک نئے عضویت کے ساتھ

پارنل

مزید اہمیت پیدا کرلی اس رہبر اور زعیم کا نام چارلس اسٹوارٹ پارنل (Charles Stewart Parnell) تھا جو انیسویں صدی کی ممتاز سیاسی ہستیوں میں تھا وہ برطانوی النسل تھا اور پروٹسٹنٹ مذہب کا پیرو اور زمیندار بھی تھا لیکن اس کا سا پُرزور ذی اثر سردار کیتھلک آئرلینڈ کو نصیب نہیں ہوا جس نے کہ زمینداروں کے حقوق و امتیازات اور انگریزی پارلیمنٹ کے اقتدار و حکومت کے خلاف اس قدر جنگ و جدل کی ہو۔ آئیرش (Irish)

قوم کی کوئی خصوصیت اس میں نہ تھی نہ وہ بڑا مقرر تھا نہ مغلوب الجذبات اور آئرلینڈ کے گزشتہ مصائب وشکایات سے نہ تو وہ واقف ہی تھا اور نہ واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن انگلستان سے اس کو حقیقی نفرت تھی اور نہایت سکون قلب کے ساتھ وہ انگلستان کی کمزوریاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا تھا۔ اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں اس نے دارالعوام کی آئرش جماعت سے کام لیا جو بہت منظم اور اس کے حکم کی تابع تھی اور تاریخی فرقوں سے الگ تھلگ رہ کر کام کرتی تھی اور برطانیہ کے دستور وآئین کی اس کو مطلق پروا نہ تھی حتی کہ یہ جماعت اس آئین و دستور کو فنا کر دینا چاہتی تھی۔ نئی عضویت کا نام انجمن اراضی

انجمن اراضیات

(Land League) تھا سوراجی تحریک کی تہ میں معاشرتی اغراض بھی ہمیشہ سے مضمر رہے تھے لیکن اب ان اغراض کا اظہار واعلان بھی کر دیا گیا آئرلینڈ کی رعایا اپنے ملک کی زمینوں کی مالک گردانی جانے والی تھی۔ اس تحریک کے سبب سے جبر وتشدد کا ظہور پھر ہوا مگر ڈزرائیلی کی حکومت نے آئرلینڈ کے طرز حکومت یا وہاں کے نظام اراضی میں کوئی تبدیلی یا اصلاح نہیں کی لیکن جب ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۵ء تک دوبارہ گلیڈسٹون برسر حکومت ہوا تو اس نے پھر آئرلینڈ کے مسئلے پر توجہ مبذول کی کیونکہ یہی مسئلہ اس

۱۸۸۱ء کا قانون اراضیات آئرلینڈ

کی زندگی کا دلچسپ مسئلہ تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس نے "قانون اراضی آئرلینڈ" پیش کیا جو حقیقت میں اس کے سابقہ قانون کا ضمیمہ تھا ایک عدالت اراضی قائم ہوئی جس کا کام عدالتی طریقے پر لگان کا تعین کرنا تھا اور اس طور پر زمیندار کا قابو اراضی پر اور بھی کم ہو گیا باوجودیکہ اکثر صورتوں میں لگان میں تخفیف بھی کر دی گئی مگر آئرلینڈ کا جوش ٹھنڈا نہیں ہوا بلکہ حکومت اور آئرش سرگروہ کے تعلقات زیادہ تلخ وناگوار

لارڈ فریڈرک کیونڈش کا قتل

ہو گئے۔ پارنل گرفتار ہوا مگر پھر رہا کر دیا گیا شاید کچھ مفاہمت ہو جاتی کہ ۱۸۸۲ء میں لارڈ فریڈرک کیونڈش (Frederick) (Cavendish) وزیر آئرلینڈ ڈبلن (Dublin) میں قتل کر دیئے گئے تو فوراً احکام تشدد جاری ہوئے اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد جب

انتخاب عام شروع ہوا تو آئرلینڈ کے قائدین نے اپنا پورا زور لبرل (آزاد) جماعت کی مخالفت میں صرف کر دیا۔
۱۸۸۶ء میں جدید دارالعوام کا اجلاس ہوا جس میں لبرل جماعت کی تعداد قدامت پسند جماعت سے تو زیادہ تھی مگر یوان میں اس جماعت کی صحیح اکثریت مشتبہ تھی۔ پارنل کی سوراجی جماعت کے ہاتھ میں توازن کا بگاڑنا بنانا تھا۔

گلیڈاسٹون کا پہلا قانون سوراج

اپریل ۱۸۸۶ء میں گلیڈاسٹون نے پہلا قانون سوراج پیش کیا اس کی رو سے ایک آئرلینڈ کی پارلیمنٹ قائم ہوئی جس کو خالص آئرلینڈ کے معاملات میں کامل اختیار دیا گیا لیکن آئرلینڈ سلطنت متحدہ کا ایک جزو رکھا گیا اور فوجی خارجی اور مالی معاملات میں علیحدہ نظام و طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی ایک اور تجویز کا وعدہ کیا گیا کہ زمینداروں سے زمینیں خرید لیجائینگی۔
(نوٹ، تاکہ آئرلینڈ کے باشندوں کے قبضے میں آجائیں)۔
۱۸۳۲ء کے قانون اصلاح کے بعد سے فرقہ واری جوش کبھی اتنے زوروں پر نہیں ہوا تھا۔ گلیڈاسٹون کی نیت پر حملہ کیا گیا اور بیان کیا گیا کہ اصل میں آئرلینڈ

مسئلہ سوراج پر اختلاف آراء

کی جماعت کی مدد سے وہ اپنے کو برسر حکومت قائم رکھنا چاہتا ہے کچھ لوگ اس تجویز کی موزونیت و مناسبت پر معترض تھے اور السٹر (Ulster) کے پروٹسٹنٹ لوگوں کے حقوق کی حفاظت و لحاظ کا مطالبہ کرتے تھے۔ تقریباً اکنو لبرل نے جن میں برائٹ (Bright) ڈیوک آوڈیون شر (Duke of Devonshire) اور جمبرلین شامل تھے گلیڈاسٹون کا طرز عمل قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان لوگوں کی علیحدگی سے حکومت ٹوٹ گئی ایک عام انتخاب ہوا مگر حلقہ جات انتخاب نے گلیڈاسٹون کے طرز عمل کی مخالفت

سیالزبری کا زمانہ (Salisbury)

کی جسکی وجہ سے لارڈ سیالزبری (Salisbury) کی سرکردگی میں ایک قدامت پسند حکومت قائم ہوئی لیکن آئرلینڈ کا مسئلہ اب بھی سب سے زیادہ پیش نظر رہا اور اس کی اہمیت ویسی ہی باقی رہی۔ گلیڈاسٹون کو امید تھی کہ جب لوگ اس نئے خیال سے مانوس ہو جائینگے تو

ملک اس کی حکمت عملی کو پسند کریگا اس وجہ سے وہ آئندہ انتخاب عام کا ٹھنڈے دل سے انتظار کرنے لگا کہ اس قسم کا حکم اس کو حاصل ہو جائے۔ پارنل کے خلاف اخبار ٹائمز کا الزام کہ لارڈ کیوینڈش کے قتل میں اسکا بھی ہاتھ تھا گلیڈ اسٹون کے حق میں مفید ثابت ہوا کہ جن خطوط کی بنا پر یہ الزام عاید کیا گیا تھا ان کا فرضی و جعلی ہونا ثابت ہوگیا تھا لیکن سنہ ۱۸۹۰ء میں جب پارنل کے خلاف طلاق کی نالش پیش ہوئی تو پانسہ پلٹ گیا

پارنل کا زوال

گلیڈ اسٹون نے سمجھا کہ ان انکشافات کے بعد جو دوران مقدمہ میں پارنل کے متعلق ہوئے تھے۔ پارنل کی نیکنامی باقی رہنا غیر ممکن تھا خصوصاً لبرل جماعت میں اور اس لئے آیرش جماعت کے قائد اعظم کے ساتھ اتحاد عمل غیر ممکن نظر آتا تھا۔ پارنل اب بھی مستعفی ہونے پر آمادہ نہیں ہوا اور اس کی جماعت بھی دو گروہ میں تقسیم ہوگئی ایک تو وہ لوگ تھے جو اب بھی اس کی حمایت پر آمادہ تھے اور ایک وہ لوگ جنھوں نے گلیڈ اسٹون اور دیگر لبرل حضرات کی مرضی کے خلاف ایک دوسرے شخص کو اپنا قاید بنا لیا تھا۔

سنہ ۱۸۹۲ء میں جب عام انتخاب ہوا تو گلیڈ اسٹون اور اس کے طرفداروں کو ایک قلیل اکثریت حاصل ہوئی لیکن یہ اکثریت اس سے بہت کم تھی جس قدر کہ گلیڈ اسٹون امید رکھتا تھا سنہ ۱۸۹۳ء میں اس نے دوسرا قانون سوراج پیش کیا اور

دار الامراء سے گلیڈ اسٹون کی لڑائی

بڑی مشکلوں سے دار العوام کی منظوری حاصل کی لیکن دار الامراء نے بلا تامل اس کو نامنظور کر دیا۔ دار العوام میں اس نے جو آخری تقریر کی اس میں اس نے دار الامراء کے اختیارات پر سخت حملے کئے سنہ ۱۸۹۴ء میں وہ خدمت سے مستعفی ہوگیا اور چار سال بعد اٹھاسی سال کی عمر میں مرگیا آئرلینڈ کا مسئلہ برابر پارلیمنٹ میں زیر بحث رہا مگر وکٹوریہ کی وفات سنہ ۱۹۰۱ء تک کوئی ایسا واقعہ اس سلسلے میں ظہور پذیر نہیں ہوا جس کے بیان کرنے کی ضرورت ہو۔

(۷)

برطانیہ کی خارجی حکمت عملی

خارجی امور کا ایک معمولی خاکہ یہاں پیش کر دینا کافی ہے کیونکہ آئندہ باب میں بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت پر ہم دوبارہ

نظر ڈالینگے۔

مصر

مصر میں برطانیہ بُری طرح پھنس گیا۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ مصر کے مالی انتظام میں برطانیہ اور فرانس مشترکہ طور پر تعلق رکھتے تھے لیکن یہ تعلق ناپائدار ثابت ہوا عربی پاشا کی سرکردگی میں غیر ملکی حکومت کے خلاف شورش ہوگئی تو فرانس نے اس شورش کے فرو کرنے میں مدد نہیں دی اس وجہ سے کل بار برطانیہ کے سر پر پڑا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں ملکی فوج کو جنگ طلع الکبر میں شکست ہوئی خدیو کی حکومت کا خاتمہ تو نہیں کیا گیا مگر ملک پر حقیقی قابو برطانیہ کا ہوگیا جو ابتک بحال ہے حالانکہ وعدہ یہ تھا کہ یہ قبضہ عارضی رہیگا اور جب حالت سنبھل جائیگی تو برطانیہ مصر کو خالی کر دیگا اس کے تین سال بعد پھر مصر نے توجہ معطوف کرائی۔ مصر کے جنوبی علاقہ سوڈان میں مہدی نامی ایک مذہبی پیشوا کھڑا ہوا یہ علاقہ بھی خدیو کی سلطنت کا ایک حصہ تھا اس شخص نے تمام ملک کو تاراج کر دیا اور خارطوم و دیگر مقامات میں افواج کو محصور کر دیا حالت بہت نازک ہوگئی اور پھر گلیڈ اسٹون کی حکومت نے نہ تو قوت سے کام لیا نہ استقلال و پامردی سے

جنرل گارڈن

آخر میں جنرل گارڈن (Gordon) جو ولی صفت سپاہی تھا روانہ کیا گیا کہ فوج کے دستوں کو واپس لائے اور ملک مہدی کے اختیار میں چھوڑ کر چلا آئے۔ لیکن خارطوم میں پہنچ کر گارڈن نے ملک کا ازسر نو انتظام کئے بغیر واپس ہونے سے انکار کر دیا۔ مہدی نے فوراً اس کو محصور کرلیا اور گارڈن کو چھڑانے کے لئے وولزلی کی سرکردگی میں فوج بھیجنی پڑی لیکن کمک کے پہنچے تک شہر فتح ہوگیا اور گارڈن (Gordon) مارا گیا مہدی کی دیوانی فوج تمام سوڈان پر مسلط ہوگئی۔ بارہ سال بعد جب مصر میں ازسر نو انتظام ہوا اور برطانیہ کے زیر سایہ حکومت کو تقویت حاصل ہوگئی تو کچنر (Kitchener) کی کمان میں ایک فوج سوڈان روانہ کی گئی کہ مہدی کے جانشینوں کی طاقت توڑ دی جائے۔

جنگ عمدرمان (Omdurman)

خارطوم کے باہر ہی عمدرمان (Omdurman) کی لڑائی میں غنیم کی قوت کا خاتمہ ہوگیا اور اس کے بعد سے سوڈان میں برطانیہ کا حق مصر سے بھی زیادہ پیدا ہوگیا (سنہ ۱۸۹۸ء)۔

جنگ بویر (Boer)

ملکہ کے اخیر عہد حکومت میں ایک زبردست جنگ جنوبی افریقہ میں شروع ہوگئی۔ ٹرانسوال کی ڈچ جمہوری سلطنت میں "باہر والے" اور خصوصاً برطانوی رعایا کی کثیر تعداد سونے کی کان کی وجہ سے آباد ہوگئی تھی حکومت سے ان لوگوں کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہتے تھے۔ اور جیمسن (Jameson) نے نوآبادیات کیپ (Cape Colony) سے فوج لیجا کر دھاوا کردیا تو اور بھی بدمزگی بڑھ گئی یہ مہم محض ناکام رہی تو جوزف جیمبرلین (Joseph Chamberlain) نے زیر ہدایت برطانوی حکومت کے اُن باہر والوں کے لئے شہری حقوق دلانے کی بات چیت اور کوشش کی لیکن معاملہ بیڈھب تھا اور ٹرانسوال (Transvaal) کے صدر کروگر (Kruger) نے برطانوی حکومت کی تجاویز نامنظور کردیں جنگ چھڑ گئی اور شروع شروع برطانوی ہتھیاروں کو شکست و ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ بویر (Boer) لوگ گو بہت بہادری و ہوشیاری سے لڑتے تھے مگر اُن کی بساط ہی کیا تھی کل ایک مٹھی آدمی تھے اور مقابلہ ایک سلطنت سے کر رہے تھے۔ اور خارجی امداد کے بغیر انجام ظاہر تھا رابرٹس (Roberts) اور کچنر (Kichener) نے جمہوریہ کا دارالسلطنت فتح کرلیا اور جنگ کا خاتمہ قریب تھا کہ ملکۂ وکٹوریہ کا انتقال ہوگیا۔

ملکۂ وکٹوریہ کے عہد میں انگلستان میں امن وسکون

جنگ کریمیا اور ہندوستان و نوآبادیات میں کشت وخون کے باوجود ملکۂ وکٹوریہ کے زمانے میں وطن میں امن وسکون رہا ملک کو اپنے سپاہیوں اور اپنی فتوحات پر ناز ضرور تھا لیکن قوم کی اصلی قوت تجارت و صنعت اور علوم وفنون میں صرف ہو رہی تھی بعض لوگوں کی ان صداؤں پر کہ موجودہ حالت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے گی اور ممکن ہے کہ برطانیہ کو پھر کسی زبردست غنیم کے حملہ کا مقابلہ کرنا پڑے کچھ توجہ نہ کی گئی۔ قوم اعتماد۔ امید اور غرور کی امنگ میں تھی ملکۂ کے طویل عہد حکومت میں برطانیہ نے بڑے بڑے کام کئے تھے۔ صنعت وتجارت میں برطانیہ امام و ہادی بنا ہوا تھا اس لئے اپنے قدیم دستور وآئین کو موجودہ ضروریات کے موافق اس طرح ڈھال لیا تھا کہ تاریخ کا یہ

سب سے بڑا کارنامہ متصور ہوسکتا ہے تعلیم میں البتہ یہ ملک دوسرے یورپی ممالک کے مقابلہ میں پیچھے تھا لیکن اس عہد میں انگریزوں نے علم وحکمت میں جو کچھ کر دکھایا وہ کسی دوسری قوم نے نہیں کیا اس طویل عہد حکومت کے متعلق اگر ایک عام نتیجہ نکالنا ممکن ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہد وکٹوریہ کا ایک نقص یہ تھا کہ ایک گونہ دلجمعی واطمنان کے ساتھ یہ عقیدہ قائم کرلیا گیا تھا کہ برطانیہ عظمےٰ تمام دنیا سے الگ ایک دنیا ہے اور یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک سے تعلق قائم کئے بغیر اپنے قسمت کا فیصلہ آپ کرسکتا ہے اس خیال کی تردید ١٩١٤ء کی جنگ عظیم نے کردی۔

حوالۂ کتب متعلقہ باب ہذا:-

"انگلستان کی سیاسی تاریخ" از ایس لو ویل (S. Low) ایل سی۔ سانڈرس (L. C. Saunders)
"تاریخ صلح سی سالہ" از مس مارٹینو (Miss Martineau) -
"ہمارے زمانے کی تاریخ" از مکارتھی (McCarthy) "کابڈن" (Cobden) از مارلے (Morley) "میکالے" (Macaulay) از ٹرویلین (Trevelyan) "گلیڈاسٹون" از مارلے (Morley) "پارنل" (Pasnell) از او برائن (O. Brien) "حیات ڈزرائیلی" (Disraeli) از منی پینی و بکل (Buckle and Moneypenny) - "تذکرۂ گرنویل" (Greville) "مکاتیب ملکۂ وکٹوریہ"

باب بست و یکم

زمانۂ حال: دو لڑائیوں کا درمیانی زمانہ

(۱)

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے امکان کا کسی کو گمان نہ ہونا

ایک زمانے کے بعد جب اس عہد کی تاریخ لکھی جائے گی تو اغلب ہے کہ اس زمانے کے مورخ اس عہد کو دور ختم مدبرین کا عہد کہیں گے۔ اس عہد میں علم معاشرت کی ترویج عام ہو رہی تھی اور لوگ سمجھنے لگے تھے کہ انسانی امور بھی ایسے ہی ناقابل تغیر قوانین کے پابند ہیں جیسے کہ مظاہر قدرت اور ان قوانین کا کچھ حصہ دریافت بھی ہو چکا تھا۔ لوگوں کی آنکھ مستقبل پر لگی ہوئی تھی یہ عہد تصوریت کا عہد تھا۔ تمام دنیا خصوصًا امریکہ انگلستان و فرانس کے اہل قلم مستقبل کے خوش آیند خیالات میں محو و مسرور تھے اور ان کو ہمیشہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ مستقبل افلاس و تنگدستی کا ازالہ کر کے امن و چین قائم کرے گا لیکن کسی کو ۱۹۱۴ء کی جنگ نہیں سوجھی اور اگر کسی کو خیال بھی ہوا تو بہت خفیف اور چھوٹے پیمانے کی جنگ کا جو موجودہ جنگ کی خونریزیوں اور خوفناکیوں کا شائبہ بھی نہ رکھتی تھی۔ مستقبل کے مورخ شاید اس جنگ کو ناگریز بتلائیں گے (کیونکہ مورخین اس لفظ کو اکثر بغیر سمجھے بوجھے استعمال کرتے ہیں) اور اس عہد کے لوگوں کو طوفان نوح کے قبل کے لوگوں سے تشبیہ دیں گے جو طوفان آنے تک زندگی کے

معمولی مشاغل و مسرت اندوزیوں میں مصروف تھے۔

امن و آشتی کی توقعات

مدبرین یورپ کے دل میں جنگ کا اندیشہ و خطرہ برابر لگا ہوا تھا اور دنیا کے مختلف حصوں میں چھوٹی بڑی لڑائیاں بھی ہوتی رہیں لیکن مغربی یورپ خصوصاً برطانیہ عظمےٰ کو اس آنے والی آفت کا گمان تک نہ ہوا سلطنت روما کے پر امن عہد کے بعد سے مغربی یورپ کو اس تینتالیس سال ایسا طویل پر امن زمانہ نصیب نہیں ہوا تھا اور اس وجہ سے خواستگاران امن و آشتی کو امید ہو چلی تھی کہ یہ امن کا زمانہ لاتناہی مدت تک قائم رہے گا اور بہت سے لوگ تاریخ کے سب سے بڑے فوجی ہنگامہ کی آمد کے بجائے دول یورپ کے دائمی اتحاد و اتفاق کے قیام کا یقین کیے ہوئے تھے۔

سائنس و اختراعات

قبل اس کے کہ اس زریں عہد کی تاریخ بیان کی جائے مناسب ہے کہ اس کی چند نمایاں خصوصیات کا اظہار کر دیا جائے ایجاد و اختراع اور حکمت (Science) میں غیر معمولی ترقی کا یہ زمانہ تھا حکمت کے ہر شعبہ میں بیّن ترقی ہوئی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا انھی ماہرین حکمت کے قابو میں ہے۔ اختراعات میں اس سے بھی بڑھ کر ترقی ہوئی۔ خواب و خیال کی باتوں نے واقعیت کا جامہ پہن لیا انسان نے ہوا میں اڑنے کی ترکیب اور سطح سمندر کے نیچے سفر کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا اول الذکر کمال تو ہوائی جہاز اور زیپلین کی ایجاد سے اور آخر الذکر آبدوز کشتیوں کی اختراع سے حاصل ہوا۔ زمین پر بھی نقل و حرکت کے ذرائع میں خوب ترقی ہوئی۔ بخارات سے چلنے والے انجن پرانی وضع کے خیال کیے جانے لگے اور بجلی کی قوت سے چلنے والی ٹرام اور پیٹرول سے چلنے والی موٹر گاڑیاں ہماری سڑکوں و شاہراہوں پر پھرنے لگیں۔ طبابت و جراحی کو بھی عروج ہوا اور امراض کا مقابلہ کامیابی سے ہونے لگا۔

پارلیمنٹی حکومت کی عام ترویج

سیاسیات میں بھی بڑی ترقی ہوئی اور تقریباً ہر جگہ کسی نہ کسی شکل میں دستوری حکومت قائم ہو گئی برطانوی ہی دستور کی لابدی طور پر تقلید نہیں ہوئی لیکن ہر متمدن یا نیم متمدن ملک میں

حکومت قوم سے جدا کوئی چیز باقی نہیں رہی بلکہ دونوں میں کسی نہ کسی قسم کا اشتراک وتعلق ضرور پایا جانے لگا۔ روس وجرمنی میں یہ رشتہ وتعلق عمومیت کی حد تک نہیں پہنچا لیکن مغربی وجنوبی یورپ میں سلطنتیں صریحاً عمومی اصول پر قائم تھیں۔ کارلائل (Carlyle) ایسے بعض اشخاص نے اس رجحان کے خلاف صدائیں بلند کیں اور تمدن کو "بہتے ہوئے" نائیگرا[+] (Niagara) (یعنے ایک خطرناک چیز) سے تشبیہ دی لیکن یہ رجحان ہر جگہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور ضروری سمجھا گیا۔

جدید حکومت حکومت کا تخیل ونظریہ بھی بدل گیا اور اس میں وسعت پیدا ہوگئی۔ نظریئے کے ساتھ عملاً بھی تغیر ہوا۔ انگلستان کے ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) سے بعض فلسفی ایسے بھی تھے کہ حکومت کے فرایض کو رعایا کی جان کی حفاظت اور سرحدات کے تحفظ تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن عام رجحان سلطنت (حکومت) کے حلقۂ عمل کو وسعت دینے کا تھا۔ یونانی نظریۂ حکومت اور ارسطو کے فلسفہ کی طرف رجوع ہونے کا عام رجحان تھا۔ حکومت کو اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس فرض رعایا کی جان کی حفاظت کرنے تک ہی نہیں ہے بلکہ رعایا کو "عمدہ زندگانی" عطا کرنے کا بھی اس پر فریضہ ہے اس پر کچھ اعتراضات ہوئے لیکن (اس تغیر کے) سیلاب کا زور اتنا تھا کہ کوئی مزاحمت کارگر نہ ہوسکی اور اب زندگی کے ہر شعبہ پر حکومت کی نگرانی وسرپرستی قائم ہوگئی ہے اور ہر دقت ومشکل کے وقت حکومت کے اختیارات کی توسیع کی خواہش کی جاتی ہے۔ حکومت ہی رعایا کے بیشتر حصہ کو تعلیم دیتی ہے۔ وہی حفظان صحت کی تدابیر اختیار کرتی ہے اور کام

+ نائیگرا (Niagara) شمالی امریکہ میں ایک آبشار ہے جو دنیا کے سب سے بڑے آبشاروں میں سمجھا جاتا ہے اس کے پانی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ کسی جاندار کا اس میں سے صحیح سالم گذرنا بہت مشکل ہے۔
اسلیئے (Shooting Niagara) سے خطرہ میں پڑنے کا محاورہ بنایا گیا (مترجم)

و محنت کرنے کے طریقے و مواقع کا بھی وہی تعین کرتی ہے بلکہ اجرت کی تعیین بھی حکومت ہی کر دیتی ہے ۔ خود حکومت سب سے بڑی سرمایہ دار اور زمیندار ہے ادب ۔ صحافت اور مذہب اس کے اختیارات سے خارج ہیں لیکن اس کا بھی اندازہ پایا جاتا ہے کہ یہ شعبے بھی اس کے اختیار میں آجائیں گے موجودہ زمانہ کی حکومت

حکومت کی ہمہ گیری کو "ہمہ گیر" اور "ہرجائی" کہا گیا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مستقبل قریب میں وہ کلیسہ کی جگہ (اختیارات ہیں) حاصل کرے گی ۔ بعض نظریہ ساز خصوصاً جرمنی والے یہ کہتے ہیں کہ حکومت کو بجز اپنا اقتدار بڑھانے کے کسی دوسرے اخلاقی قانون کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں اور ہر فرد رعایا کے لیے حکومت کی تعمیل کے سوا کوئی دوسرا اخلاقی فرض نہیں ہے ۔

قومی حکومت حکومت بھی رفتہ رفتہ قومی ہوگئی ہے انیویں صدی کا ایک بڑا مقصد حکومت اور قوم کو ایک کر دینا اور جن لوگوں میں قومیت کا احساس پیدا ہو جائے ان کے ہاتھوں میں امور سلطنت کا انتظام دے دینا تھا ۱۹۱۴ء کی جنگ نے بہت سے امور میں غور و خوض کرنے کی ضرورت ظاہر کردی ہے مگر سب سے زیادہ قومیت کے مسئلہ پر ۔ اب یہ بات زیادہ واضح ہوگئی ہے کہ قومیت کوئی مادی یا طبعی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک جذبہ اور خیال ہے اور یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ کوئی قوم خالص نہیں ہے اور ہر فرقہ کو حکومت کا اختیار دیدینا غیر ممکن ہے اور آیندہ بھی مثل سابق کے ایسی ہی سلطنتیں و حکومتیں قائم ہوں گی جنمیں قومیت کے بہت سے اجزا شامل ہیں گے لیکن انیسویں صدی تو حکومت کی بنیاد ہی قومیت پر قائم کرنا چاہتی تھی اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو اس خیال کی منطقی پیروی کرنے کے نقائص کو سمجھتے تھے ۔

اشتراکیت نظریۂ سلطنت و حکومت کی اس وسعت کے ساتھ ساتھ تحریک اشتراکیت بھی وسعت حاصل کرتی گئی (لفظ اشتراکیت کو یہاں اس کے وسیع ترین معنوں میں استعمال کیا گیا ہے) ملک کی صنعت و تجارت کے انتظام میں مزدور پیشہ طبقہ کے نفع کو مد نظر و ملحوظ رکھنا موٹے الفاظ میں اشتراکیت کا اصلی مقصد ہے ۔ اور سلطنت کے پرانے تخیل کے ساتھ یہ بات ممکن نہ تھی ۔

اشتراکیت اور معاشرتی تحریکیں اس زمانے کی انوکھی اور ممتاز خصوصیات ہیں۔ سیاسیات میں معاشرتی مسائل کا خاص اثر ہوگیا بلکہ اس زمانے کے مذہبی خیالات پر بھی ان مسائل کا اثر پڑا ہر حکومت کی ساخت و ترقی پر معاشرتی حالت کا بہت اثر پڑنے لگا ہے حالیہ تحقیقات کی رو سے حکومت ایتھنز (Athens) کی خارجی و داخلی زندگی پر انھیں معاشرتی حالات کا نمایاں اثر تھا اور سلطنت روما کا زوال بھی انھیں حالات کے اثر سے ہوا۔ جاگیریت بھی جیسا کہ ہمیں معلوم ہے ہر زمانہ کے معاشرتی حالات کے مطابق رہی لیکن ہمارے زمانہ کی منتظم اور باضابطہ معاشرتی تحریکوں کا عشر عشیر بھی کسی زمانہ میں نہیں دیکھا گیا یہ تحریکیں ۱۷۸۹ء سے پہلے ہی شروع ہوگئی تھیں۔ ان کا پہلا ظہور فرانسیسی انقلاب میں ہوا ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک فرانس کی تمام تحریکیں اس کے زیر اثر تھیں ۱۸۷۱ء کے کمیون (Commune) میں یہ وحشیانہ انداز میں رونما ہوئیں لیکن اس کے بعد سے ان تحریکوں کی قوت و تنظیم کو روز افزوں استحکام و استواری حاصل ہوتی گئی تقریباً کل مغربی یورپ میں زبردست حزب العمالی تحریکیں ہیں لیکن فرانس میں سب سے زیادہ پُر انقلاب اور جرمنی میں سب سے زیادہ بااثر و دیرپا ثابت ہوئیں جنگ عظیم سے پہلے سلطنت جرمنی اور قلمرو پراشیا یورپ میں سب سے زیادہ منظم و قوی سلطنت سمجھی جاتی تھیں اور ان دونوں ممالک نے اشتراکیت کی تحریک کو فنا کر دینے کی بہتری کوشش کی مگر اس تحریک پر کوئی بیّن اثر نہ پڑ سکا۔ بمقابلہ دیگر ممالک کے جرمنی میں اشتراکیت کے زیادہ کامیاب ہونے کے کوئی خاص آثار نہیں تھے۔ سیاسی اکھاڑے میں دو باقاعدہ فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ پر صف آرا تھیں کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑ گئی اس جنگ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ تحریک اشتراکیت نے جن مسائل کی طرف قوم کی توجہ مبذول کرادی تھی حکومت وقت ان مسائل سے قوم کی توجہ منقطع کرنا چاہتی تھی۔

جرمنی اور اشتراکیت

قومیت و بین الاقوامیت

اس وجہ سے جب ہم حالیہ یورپ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر طرف قومی حکومتیں جنھیں ہر چیز پر قابو اور ہر شعبے میں دخل تھا نظر آتی ہیں قومیت ہی نہیں بلکہ بین الاقوامیت بھی اس زمانے کی خصوصیات میں سے ہے

اور آخر الذکر صفت نے گذشتہ پچاس سال میں بہت وسعت حاصل کرلی ہے موجودہ زمانے کے دونوں متخالف اجزا "سرمایہ" و "مزدوری" بین الاقوامی ہو گئے ہیں اور جنگ کے شروع ہونے تک یہ خصوصیت بڑھتی ہی رہی ایک ملک کا سرمایہ دوسرے ملک میں اسی سہولت سے لگایا جاتا تھا جیسا کہ خود اس ملک میں - اور سرمایہ داری کے بین الاقوامی مفاد کی وجہ سے بین الاقوامی امن کے قیام میں بھی مدد ملتی تھی - مزدوروں کی تنظیم اور ہمدردی اس سے بھی زیادہ بین الاقوامی حیثیت رکھتی تھی تحریک اشتراکیت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور دنیا کے مختلف حصوں کے حامیان تجارتی اتحاد ایک کانگرس میں جمع ہوتے تھے اور سب کا مقصد و مفاد ایک ہی ہوتا تھا علاوہ اس کے اب علوم و فنون سائنس و حکمت تمام دنیا کی عام ملکیت خیال کی جاتی ہیں - بہ نسبت پندرھویں اور سولھویں صدی کے اس زمانہ کے جوامع (Universities) زیادہ قومی حیثیت رکھتے ہیں اور گو طلباء و معلمین ایک جامعہ سے دوسرے جامعہ کو کم منتقل ہوتے ہیں لیکن کتابیں اور جدید خیالات بہت سہولت سے تمام طرف پھیلتے رہتے ہیں حالانکہ مختلف ممالک کی مختلف زبان ہونے سے دقت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس زمانہ میں جس سرعت و سہولت کے ساتھ خیالات و کتب کی اشاعت ہوتی ہے وہ اس زمانہ سے بہت زیادہ ہے جبکہ لاطینی زبان تمام تعلیم یافتہ لوگوں کی عام زبان تھی۔

مخالفین حکومت

ایسی حکومت کے مخالفین و بدخواہوں کی بھی کمی نہیں ہے ایک تو وہ لوگ ہیں جو کم و بیش انارکسٹ (کامل آزادی کے خواہاں) گروہ کے خیالات کی تائید کرتے ہیں اور حکومت کے ہر استبدادی تدبیر کو ناواجبی بتلاتے ہیں - علاوہ اس کے مغربی یورپ میں مجالست کی عام آزادی ہے اور جہاں مجالست کی آزادی ہوئی وہاں مزدوروں کی تجارتی انجمنیں (Trades Union) بین الاقوامی انجمن یا کلیسہ کے ایسی عضویتیں کسی نہ کسی وقت ضرور ظہور میں آئیں گی جن کے اراکین انجمن کی اطاعت کو حکومت کی اطاعت پر مقدم سمجھتے ہوں ہم کو معلوم ہے کہ سلطنت روما اس قسم کی مجالس سے جن پر اس کو قابو نہ تھا کسی قدر خوف کرتی تھی اور یہ خوف واجبی بھی تھا۔

حکومت و مذہب حکومت اور مذہب کے تعلق میں جو بیّن فرق ہو گیا اس کا بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے اس میں شک نہیں کہ اب بھی مذہب کا بہت اثر ہے بلکہ یہ اثر پہلے سے کسی طرح کم نہیں ہوا ہے لیکن جن ذرائع و طریقوں سے یہ اثر ڈالا جاتا ہے وہ پہلے سے بالکل مختلف ہیں بیسویں صدی کے یورپ اور تیرھویں صدی کے یورپ میں اس لحاظ سے کتنا تخالف ہے۔ یگانگت کے اجزاء و ذرائع کا وجود باقی نہیں رہا اب کوئی نہیں ہے جو خود کو سب کا شہنشاہ کہتا ہو نہ کہیں اب یہ عقیدہ ہے کہ ایک عام شہنشاہ کی ضرورت ہے کوئی کلیسہ کوئی مذہب یا کوئی طریقہ اب ایسا نہیں ہے جس کو عام مقبولیت حاصل ہو یورپ کی سیاسی حیات کی طرح اس کی روحانی حیات کا بھی کوئی ایک نائب نہیں ہے بہت سے مذاہب جو اس وقت رائج ہیں نہ جبر و تشدد کو روا رکھتے ہیں نہ اس کے استعمال کی خواہش۔ موجودہ زمانے کا سب سے مفید کارنامہ مختلف مذاہب کی عام اور وسیع رواداری ہے۔ اب ہم کو معلوم ہو گیا ہے کہ جس بات **رواداری** کو سولھویں صدی کے مدبر غیر ممکن سمجھے تھے وہ نہایت آسان اور سہل الحصول ہے یعنے یہ کہ ایک ہی حکومت کی ماتحتی میں مختلف مذاہب و عقائد کے لوگ پہلو بہ پہلو زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

(۲)

اب ہم یورپ کے اس پُرامن عہد میں یورپ کی دول عظمےٰ کی حالت کا مجمل خاکہ پیش کرینگے۔

فرانس ۱۸۷۰ء کی جنگ کے تباہ کن اثرات کے باوجود فرانس یورپ کے دول عظمےٰ سے خارج نہیں ہوا تھا گو شروع شروع بین الاقوامی معاملات میں اس کا اثر بہت کم ہو گیا لیکن علوم و فنون میں صلح فرینکفورٹ کے بعد سے جو فوقیت و عظمت اس کو حاصل ہوئی اس سے پہلے اس کو کبھی نہیں حاصل ہوئی تھی۔ سیاسی زندگی میں بھی اس کو بہت کامیابی حاصل ہوئی کسی حکومت نے ان مسائل میں ایسی کامیابی نہیں حاصل کی لیکن یہ کامیابی اس قسم کی نہ تھی کہ جس کا اثر تخیل پر پڑتا یا ذہن نشین ہو سکتی دستور کے مرتب کرنے میں واضعان قانون نے اس بات کی انتہائی کوشش کی کہ شاہی و شہنشاہی کو

تھیر (Thiers) آئندہ پھر کوئی حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ صدر کا انتخاب عوام کی رائے پر نہیں رکھا گیا بلکہ دونوں مجالس وضع قوانین کے منفقہ اجلاس سے ہونا طے پایا۔ ۱۸۷۳ء کے بعد سے جتنے صدر ہوئے ان میں سے کسی کا اثر تاریخ فرانس پر حاوی نہیں نظر آیا بجز تھیر (Thiers) کے اور ٹائرس کا انتخاب بھی جنگ کی وجہ سے ہوا تھا۔ جبکہ جمہوریت کے عہد طفلی میں ایک مضبوط اور قوی آدمی کی رہبری کی ضرورت تھی اس کا انتخاب بھی اس طریقہ پر عمل میں نہیں آیا تھا جو بعد کے جمہوری دستور میں مندرج تھا صدر نشینوں کی طرح فرانس کے وزرا نے بھی کوئی مستقل کارنامہ اپنے پیچھے نہیں چھوڑا وزرا کی حیات بہت مختصر رہی گمبٹا (Gambetta) فیری (Ferry) والڈک روسو (Waldeck-Rousseau) اور

فرانسیسی وزرا کلیمانسو (Clemenceau) ایسے ناموروزیر اعظم گزرے ہیں۔ لیکن فرانس کی سیاسی زندگی میں انگلستان ایسے باضابطہ نظام فرقہ واری کا وجود نہیں پایا جاتا جس پر کہ انگلستان کے وزیر اعظم کی قوت واقتدار کا انحصار ہوتا ہے اس وجہ سے سیاست فرانس پر نظر ڈالتے وقت پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ یہاں متواتر تغیرات بلکہ بدنظمی رہتی ہوگی لیکن اس پر بھی نظم ونسق مربوط اور کامیاب رہتا ہے بلکہ انگلستان کی پارلیمنٹ سے زیادہ فرانس کی مجلس (Assembly) نظم ونسق کو اپنے ہاتھ وقابو میں رکھتی ہے دوسرے ممالک کی طرح فرانس میں بھی ایسے مستقل عہدہ داروں کی ایک فوج کی فوج ہے جن کے نامعلوم ذرائع واثرات سیاسوں سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

جمہوری حکومت فرانس کے خطرات جمہوریۂ فرانس کی اس زمانہ کی تاریخ ان خطرات کا مجموعہ ہے جو اس کو پیش آتے رہے۔ شاہی پسند فرقہ نے تو کوئی کھلی مخالفت نہیں کی حالانکہ ایوانوں میں اس فرقہ کے بہت سے اراکین شریک تھے۔ جمہوریت پر جو حملے ہوگئے وہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہوئے۔

ژنیرال بولان ژے ۱۸۸۸ء میں بولان ژے تحریک شروع ہوئی سپہ سالار بولانژے (Boulanger) ایک مشہور سپہ سالار تھا جو اپنی وزارت جنگ کے زمانہ میں فوج میں بہت ہردلعزیز ہوگیا تھا ۱۸۸۶ء میں وہ ایک عجیب تحریک کا

پیشوا بن گیا۔ وہ خود نہ تو بڑا مقرر تھا نہ مدبر اور جو تحریک کہ اس کے نام سے مشہور ہے اس میں مختلف گروہ کے لوگ شریک تھے جن میں کوئی باہمی اتحاد و اتفاق نہیں تھا مگر یہ سب کے سب جمہوریت کی عام مخالفت پر تلے تھے۔ اس کے طرفداروں کا ظاہری مقصد دستور پر نظر ثانی کرانے کا تھا تاکہ جملہ مسایل کا تصفیہ رائے عامہ کے مطابق ہو سکے اور پارلیمنٹی اداروں کے اختیارات تخفیف کر دئے جائیں لیکن اسی حیلہ سے کیتھلک لوگ کلیسہ کے حقوق و امتیازات کو دوبارہ قائم کر لینا چاہتے تھے اور حامیان شاہی یہ امید رکھتے تھے کہ اگر دستور میں از سر نو ترمیم و تنسیخ ہوئی تو ممکن ہے کہ مرممہ دستور ان کی مرضی کا ترتیب پا جائے۔ کچھ عرصہ تک تو بولانژے کی پر جوش تائید ہوئی اور متعدد حلقۂ انتخاب سے حتے کہ خود پیرس (Paris) کے حلقہ سے وہ منتخب کیا گیا۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمت کر کے جمہوریت پر حملہ کر دیتا تو جمہوریت تاب مقاومت نہ لا سکتی۔ لیکن یہ سن کر کہ اس کی گرفتاری کا حکم جاری ہو گیا ہے وہ ۱۸۸۹ء میں فرانس سے نکل بھاگا اور تھوڑے ہی دنوں بعد برسلز (Brussels) میں اس نے خودکشی کر لی۔ اس معاملہ سے جمہوریت کے غیر محفوظ ہونے کا احساس و خیال پیدا ہو گیا۔

ڈریفیو (Dreyfus) کا مقدمہ

جمہوریہ کی حیات کا دوسرا سانحہ ڈریفیو کا معاملہ تھا جس کے تفصیلی حالات کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے ۱۸۹۴ء میں ایک یہودی افسر توپ خانہ کپتان ڈریفیو پر یہ الزام عاید کیا گیا کہ اس نے فوجی راز جرمنی پر ظاہر کر دئے ہیں اس کا تنزل کر دیا گیا اور جلاوطن کر کے اس کو مغربی ہند کے "جزیرۂ شیاطین" (Devils Isles) میں قید کر دیا گیا اس وقت اس معاملے کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں معلوم ہوئی بجز اس کے کہ مطابع کے ایک خاص طبقے کو یہودیوں کی مخالفت کا ایک حیلہ مل گیا۔

کرنل پیکار (Picquart)

لیکن ۱۸۹۶ء میں کرنل پیکار (Picquart) نے دفتر جنگ میں ایسی شہادت پیش کی جس سے ڈریفیو (Dreyfus) کی معصومیت و بے گناہی ثابت ہوتی تھی۔ فرانس بلکہ تمام یورپ میں اس کے متعلق زبردست اختلافات و بحث پیدا ہوگئی کہ آیا ڈریفیو واقعی خطاوار تھا یا بے گناہ

اور کیا اس کی تجویز سزا کے متعلق نظرثانی ممکن تھی یا نہیں - ذاتی یعنے قیدی کی تکلیف وہ دیر آلام حالت کا بہت گہرا اثر پڑا لیکن یہ مسئلہ محض ملزم کی ذات سے متعلق نہیں تھا۔ ڈریفیو کے مخالفین حقیقت میں جمہوریت کے مخالفین تھے - پادری شاہی پسند طبقہ حامیان شہنشاہی سب کے سب اس کی مخالفت پر کھڑے تھے دوسری طرف صرف چند ممتاز ہستیاں زولا (Zola) پیکار (Picquart) اناتول فرانس (Anatole France) شیورے کیسنے (Scheurer Kestner) تھے - لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں کے انصاف اور انسانیت کے تقاضے پر قوم کا بیشتر حصہ ان کا حامی ہو گیا اس کشاکشی میں جمہوریت کا وجود معرض خطر میں پڑ گیا - انجام معمولی اور ناقابل اطمینان ہوا ڈریفیو کو وطن میں بلا کر ازسرنو بمقام رین (Rennes) تحقیقات کی گئی - پھر وہ مجرم قرار پایا اور پھر اس کو سزا دی گئی - لیکن صدر جمہوریہ نے فوراً معافی دیدی - وزیراعظم والڈیک روسو (Waldeck Rouseau) کی بدولت جمہوریت اس بلاخیز طوفان سے صحیح سالم نکل آئی -

امر نزاعی

کلیسہ سے حکومت کی بے تعلقی

ڈریفیو کے معاملے کی وجہ سے ایک نہایت ملامت انگیز واہم کارروائی شروع کی گئی - فرانس کے کیتھلک مذہب اور مذہبی گروہوں پر ڈریفیو کی مخالفت اور جمہوریت کی عداوت کا الزام لگایا گیا ان دونوں پر سخت حملے کیئے گئے مذہبی گروہوں پر سخت نگرانی کر دی گئی - بہتوں کو ناجائز قرار دیا گیا تعلیم و تعلم کی یک لخت ان کو ممانعت کر دی گئی اور ان گروہوں کے افراد رفتہ رفتہ غیر ممالک کو چل دیئے - اس کے بعد فرانس کے کلیسہ پر ایک عام حملہ ہوا - نپولین کا قائم کردہ معاہدۂ مذہبی کالعدم کر دیا گیا اور کلیسہ و حکومت کی قطعی علیحدگی و بے تعلقی کا مطالبہ کیا جانے لگا - مذہبی پیشواؤں کی تنخواہیں مسدود کر دی گئیں لیکن عبادت کے لیے ایسی انجمنوں کے قیام کی اجازت دی گئی جو کلیسہ کی جگہ لے لیں پوپ نے احتجاج کیا مگر کوئی اثر نہ ہوا - (۱۹۰۶ء)

ہٹرتال

اس وقت سے جمہوریت فرانس کا انہماک زیادہ تر مسائل

مزدوری میں رہا جن کے سلسلے میں بعض اوقات ہڑتالیں بھی ہوئیں اور انتہائی بدمزگی پیدا ہو گئی۔ فرانس میں حزب العمالی تحریک کی دو خصوصیات ہیں ایک تو مزدوروں کے باہمی اتحاد یعنے (Syndicalism) کا زور شور جس کی مدد سے مزدوروں کی تجارتی انجمنوں (Trades-union) کو حکومت کی مداخلت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی دوسری خصوصیت مزدور پیشوں کے سرداروں کی امن وعافیت جوئی و مخالفت جنگ تھی لیکن جب ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو فرانس کے دیگر طبقوں کی طرح مزدور پیشہ طبقات بھی غنیم کو شکست دینے اور پسپا کرنے پر دل وجان سے آمادہ ہو گئے کیونکہ غنیم پھر فرانس کے سرسبز کھیتوں کو روند رہا تھا۔

جرمنی جرمنی کے حالات ہم اس سے بھی زیادہ اختصار کے ساتھ بیان کریں گے کیونکہ بین الاقوامی تعلقات کا تذکرہ ہم اس باب کے آیندہ حصہ میں کریں گے صنعت وتجارت اور نظم ونسق میں اس ملک نے غیر معمولی ترقی کی۔ یورپ کو ایک نئے جرمنی کے وجود کی خبر ہی نہ ہوئی جو پہلے کی طرح خیالی منقسیم اور مغلوب الجذبات نہیں تھا بلکہ متحد و منظم اور یورپ میں سب سے اعلیٰ فوجی قوت رکھتا تھا اور طلب وحصول زرمیں انگلستان ایسی ذی اقتدار سلطنت سے بھی زیادہ اس کا انہماک تھا۔ اس کی ابتدا بسمارک کے عہد سے ہوتی ہے اس نے سلطنت جرمنی قائم کر دی تھی لیکن آنے والی امت میں وہ ایک نیا رجحان اور نئے مقاصد کو تشویش واضطراب کی نگاہ سے دیکھتا تھا ۱۸۸۸ء میں ولیم اول کی وفات پر اصل تغیر واضح ہوا۔ فریڈرک اول اس کا جانشین ہوا اور اس نے اپنے سہ ماہی عہد حکومت میں حریت پسندی کا میلان ورجحان ظاہر کیا۔ جون ۱۸۸۸ء میں وہ بھی فوت ہو گیا اور ولیم دوم تخت نشین ہوا۔

ولیم دوم ولیم دوم کے مقاصد اور اس کی فطرت کے متعلق آیندہ کئی سال تک مورخین خامہ فرسائی کرتے رہیں گے لیکن اب بھی اس کے متعلق بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ ضدی اور تند خو تھا اور بادشاہی اختیارات کو خداداد سمجھ کر وہ مطلق العنانی کا

خواستگار تھا وہ اس بات پر تلا ہوا تھا کہ جرمنی کی اصل حکومت اسی کے ہاتھ میں رہے اس کی اس فطرت اور مقصد نے اسے اپنے باپ فریڈرک سوم ہی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ بسمارک سے پھر اس کا مقابلہ ہوگیا۔

بسمارک کا زوال دونوں میں کشاکشی اصل میں قوت و اقتدار کی بابت تھی کیونکہ بسمارک صریحاً ولیم دوم کے مطلق العنانی کا سد راہ ہورہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی طرز عمل کا بھی دونوں میں اختلاف تھا۔ بسمارک جرمنی میں بھی بقیہ یورپ کے نظام حکومت کا مماثل قائم کرنا چاہتا تھا اور نوآبادیات کی غیر معمولی توسیع کا بھی مخالف تھا اور بحری نظام کی غیر معمولی وسعت کے خطرناک انجام کو وہ جانتا تھا شہنشاہ کو ایسا کوئی خطرہ نہیں معلوم ہوتا تھا اور نہ اس کو کوئی جھجک تھی۔ اس نے علی الاعلان کہدیا کہ "جرمنی کا مستقبل سمندر سے وابستہ ہے"، اور اس نے کہا کہ اسکا ارادہ ہے کہ بحری بیڑے کو وہ ایسا ہی زبردست بنادے جیسا کہ اس کے دادا نے بری فوج کو بنا دیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے صاف صاف کہدیا کہ اگر بسمارک برسر عہدہ رہنا چاہتا ہے تو اس کے حکم و مرضی کے مطابق رہے۔ اس مشہور وزیر اعظم نے یہ بات قبول نہیں کی اور سنہ ۱۸۹۰ء میں مستعفی ہوگیا اس کے اور نوعمر شہنشاہ کے طرز عمل و حکمت عملی میں صریحی اختلاف و تضاد تھا لیکن بسمارک کی بدولت جرمنی صرف بن ہی نہیں گیا تھا بلکہ اس نے اپنی ہدایت و تلقین اور اپنی کامیابیوں سے جرمنی میں وہ خصوصیات پیدا کردی تھیں جو اب تک جرمنی کے طرز عمل میں نمایاں نظر آتی ہیں یعنی اپنی قوت پر بھروسہ بین الاقوامی قوانین و عدل کی تحقیر اور حکومت سے بڑھ کر کسی قوت کی اطاعت کا انکار۔

جرمنی کا بحری بیڑہ اور نوآبادیاتی سلطنت موجودہ شہنشاہ کو شخصی اختیارات حاصل ہونے کے بعد سے ایک زبردست بیڑے کی تیاری۔ نوآبادیاتی سلطنت کی بنیاد اور اشتراکیت کی ترقی و ترتیب و انتظام یہی باتیں جرمنی کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں برطانیہ سے ایک سمجھوتے کی بنا پر جزیرہ ہیلیگولینڈ (Heligoland) مل جانے سے جرمنی کو ایک نادر بحری مرکز ہاتھ آگیا سنہ ۱۸۹۵ء میں نہر کیل (Kiel) تیار ہوجانے سے جرمنی کی بحری طاقت بہت بڑھ گئی کیونکہ اسکے

ذریعے سے بحر شمالی و بحر بالٹک کے بیڑے بغیر ڈنمارک کے علاقہ کے سمندر کو پار کیے ہوئے بآسانی ایک دوسرے سے متوصل ہو سکتے تھے۔ اس طرز عمل کی حامی جرمنی کی انجمن بحری تھی جس کو رائے عامہ کی قوی تائید حاصل تھی ۱۸۹۸ء میں ایک عظیم الشان اسکیم جہاز سازی عمل میں لائی گئی جس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ جنگ عظیم میں جرمنی کی خطرناک بحری طاقت ظاہر ہو گئی۔

افریقہ وچین میں جرمنی کا دخل

جرمنی کی نوآبادیاتی سلطنت نتیجہ ہے افریقہ کی اس تقسیم کا جو لارڈ سالسبری (Salisbury) نے ۱۸۹۰ء میں طے کی تھی علاوہ اس کے ۱۸۹۷ء میں چین میں کچھ بدامنی ہونے سے شہنشاہ جرمنی کو کیاؤچاؤ (Kiaochou) پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا اور سنین مابعد میں یہ نیا مقبوضہ چین میں جرمن تجارت کی توسیع و کامیابی کا ذریعہ بن گیا اور تجارت میں ایسا فروغ حاصل ہوا کہ اس کو سلطنت کی بہترین کامیابی سمجھا جانے لگا جرمنی نے سلطان ترکی سے بھی دوستانہ تعلقات قائم کر لیے حالانکہ حال ہی میں سلطان نے آرمینیا والوں کا قتل عام کرا دیا تھا۔ غرض اس طرح جرمنی کو ایشیائے کوچک و مسوپوٹیمیا (Mesopotamia) میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ آغاز جنگ کے وقت جرمنی بغداد تک ریل نکال رہا تھا جس کی تکمیل ہو جانے سے وہ قطعۂ ارض جو تمدن کا سب سے پہلا گہوارہ تھا اور صدیوں سے ویران پڑا ہوا تھا تجارت کا مرکز بن جاتا اور وہاں تک دول یورپ کی رسائی ہو جاتی۔ مشرق قریبہ میں جرمنی کے جو منصوبے تھے وہ امید سے زیادہ بارآور ہو گئے۔

جرمنی کی تحریک اشتراکیت

لیکن تحریک اشتراکیت جرمنی کی اس ترقی کے پیچھے کتے کی طرح لگی ہوئی تھی حکومت کے استبداد و مطلق العنانی کی وجہ سے بہت سے لوگ جو دوسرے ممالک میں آزاد یا قدامت پسند فرقے میں شریک ہوتے یہاں کے اشتراکی گروہ میں شامل ہونے پر مجبور ہو گئے شہنشاہ نے پہلے تو مزدوری کے قوانین نافذ کرکے ان لوگوں کو ہموار کرنا چاہا لیکن بعد میں اس نے اس تحریک کو غدارانہ قرار دیا گو اس کا کوئی اثر اشتراکیوں کی کثرت آرا پر نہ پڑا کہ ۱۹۱۲ء میں یہی جماعت سب فرقوں سے زیادہ تھی اور اگر جرمنی میں نظام انتخاب کی اصلاح کسی مناسب و معقول اصول پر کی جاتی تو اس جماعت کے

اراکین کی تعداد بے انتہا بڑھ جاتی ۔ حکومت کے ساتھ اس جماعت کی مخالفت برملا و درشت تھی بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ یہ جماعت جرمنی کے روزافزوں فوجی منصوبوں پر روک قائم کرسکے گی کیونکہ اس فرقے کے سرداروں نے بارہا ظاہر کیا تھا کہ کسی تقدیمی یا جارحانہ جنگ کی یہ لوگ کبھی تائید نہ کریں گے ۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ نے ان امیدوں و خیالات کو بے اصل ثابت کردیا موجودہ زمانہ کی حکومتوں میں اقلیت کا کوئی اثر جنگ ایسے نازک مواقع پر کارگر نہیں ہوتا خواہ یہ اقلیت دوسری جماعتوں سے منفرداً کثرت ہی کیوں نہ رکھتی ہو ۔ اشتراکی بھی باوجودیکہ وہ جارحانہ جنگ کے حقیقتاً مخالف تھے جرمنی کی فوج میں شریک ہوکر بلجیم کا گلا گھونٹنے اور فرانس پر چڑھائی کرنے کے لیے بلا تامل بڑھے جنگ کے بعد جرمنی کی تحریک اشتراکیت کا مستقبل سب سے پیچیدہ و اہم سوال ہوگا ۔ یعنے اس کا سیاسی و معاشرتی نظام کیا ہوگا اور اس طرز عمل کے متعلق جس میں قصداً یا جبراً اس کی شرکت تھی آیندہ اس کا کیا رویہ رہے گا ۔

آسٹریا ہنگری آسٹریا ہنگری کی تاریخ ہم چند سطور میں بیان کریں گے ملکی معاملات میں زیادہ تر رائے دہی کا مسئلہ اور سلطنت کے مختلف اقوام کے باہمی تعلقات کا سوال اس کے پیش نظر رہا ان مسائل کے حل کی معمولی کوششوں کے بعد ۱۹۰۷ء میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رو سے (۲۴) سال سے زائد عمر کے تمام مردوں کو رائے دہی کا حق عطا ہوا ۔ جرمن نژاد لوگوں کو اپنی تعداد کے تناسب سے زیادہ اور چیک (Czechs) قوم کو اپنی تعداد کے تناسب سے کم نشستیں ملیں ۔ بوہیمیا (Bohemia) میں زک قوم کے ساتھ اور گیلیشیا (Galicia) میں پول (Poles) قوم کے ساتھ کچھ رعایتیں کی گئیں ۔ لیکن پھر بھی فرقہ وارانہ نفاق میں کمی نہ ہوئی ۱۸۶۷ء سے ہنگری میں ایک طرح کی خود اختیاری حکومت قائم تھی اور وہاں کے دستور کی بنیاد رائے عامہ پر قائم کی گئی تھی اسی وجہ سے ہنگری اپنی قوت و خود مختاری کی اظہار کی خاص کوشش کرتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ دیگر اقوام کے مقابلہ میں ماگیار (Magyar) قوم کی قومیت کا ادعا کرتا رہا ۔ آغاز جنگ (جس کی ذمہ داری زیادہ تر آسٹریا ہنگری پر ہے) کے پہلے ہی حکومت کی نوعیت میں صریحی تغیر ہوتا ہوا نظر آتا تھا اب اس کے تاجدار وہ ”بوڑھے کھلونے“ نہیں ہوتے تھے بلکہ ملک کے بیشتر حصہ میں تجارتی

و دماغی ترقی کے آثار نظر آتے تھے اور آئین و دستور کے دلچسپ تجربے عمل میں لائے جا رہے تھے چنانچہ شہنشاہ فرانسس جوزف (Francis Joseph) کی وفات پر سلطنت کے انشقاق و تباہی کی کوئی داستان سننے میں نہیں آئی۔ یہ بتلانا کہ اس طوفان جنگ کے بعد سلطنت کی کیا حالت و نوعیت رہے گی قبل از وقت ہے لیکن یہ واضح ہو گیا ہے کہ نفاق و افتراق کا زور کم ہو گیا ہے اور اتفاق و اتحاد کی قوت بڑھ رہی ہے۔

روس روس کے ملکی حالات جس قدر پیچیدہ ہیں اسی قدر اہم بھی ہیں زائد از نصف صدی سے خیالات و عقائد سیاست و معاشرت میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا ہے روسی خیالات و اعمال کا خاص اثر مغربی یورپ پر پڑا ہے اور آیندہ بھی یہ اثر زیادہ نمایاں ہونے کی امید ہے۔

غلاموں کی غلاصی و آزادی جنگ کریمیا کے بعد سے ہم نے روس کی تاریخ پر نظر نہیں ڈالی ہے اسکندر دوم کا عہد جو اسی جنگ کے زمانہ میں تخت نشین ہوا تھا دو باتوں کے لئے مشہور ہے ایک تو زرعی غلاموں کی آزادی اور دوسرے نہلی (Nihèlism) (جو ہر چیز کی نیستی یا معدوم کرنے میں یقین کرتے ہیں) نہلی کے معنی بھی فتنہ انگیز نہیں ہو سکتے گروہ کا عروج غلاموں کی آزادی کا خیال کچھ نیا نہیں تھا۔ ایک عرصہ سے اس رواج کی مخالفت اقتصادی وجوہات اور انسانیت کے نقطۂ خیال سے کیجا رہی تھی تقریباً پانچ کروڑ زرعی غلام مختلف حیثیتوں میں تمام روس میں پھیلے ہوئے تھے ان سب کی حالت یکساں تو نہیں ہوتی تھی۔ لیکن سب کے سب کسی خاص قطع زمین سے وابستہ جزو رہتے تھے۔ گویا اس زمین کا ایک جزو ہوتے تھے۔ مگر فرداً فرداً وہ اپنے آقا کی ملکیت بھی نہیں ہوتے تھی نہ ان کی خرید و فروخت ہو سکتی تھی۔ اور ایک ایک قطع زمین اور ایک ایک سکونتی مکان پر انکا قبضہ بحال رہتا تھا۔ ان کے آقا ان سے جبری خدمت البتہ لیا کرتے تھے اور ان کے تمام معاملات کا تصفیہ ان کے آقا کے اختیار میں ہوتا تھا حتیٰ کہ ان کے آقا کو

جسمانی سزا دینے کا بھی اختیار حاصل تھا اور اس کے روایتی اختیارات قانونی اختیارات سے بھی متجاوز تھے۔ مقامی حالات اور آقاؤں کے اختلاف مزاج کی مناسبت سے ان غلاموں کی حالت میں بہت فرق ہوا کرتا تھا ۱۸۵۸ء میں شاہی علاقے کے غلاموں کو آزاد کر کے خود زار نے ان کی آزادی کی ابتدا کی غلاموں کو آزاد آدمیوں کے حقوق حاصل ہو گئے اور بجائے اپنے آقاؤں کے عدالتی اختیارات کے تابع رہنے کے ملکی عدالتوں میں اپنے مقدمات پیش کرنے کا حق ان کو مل گیا مختلف طریقوں سے مگر عموماً زمینات خرید خرید کر یہ لوگ اراضیات کے مالک ہو گئے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اصلاح بہت زبردست و مستحسن تھی لیکن شروع شروع بہت مایوسی ہوئی کیونکہ توقعات بہت بڑے بڑے قائم کئے گئے تھے اور اراضیات کی قیمت بہت بڑھ گئی علاوہ اس کے بعض کسانوں کو غلامی کے زمانہ میں ہی زیادہ آسائش حاصل تھی ۔

"نہلی" (Nihilism) یعنی معدومیت تحریک

اس مایوسی کی وجہ سے "نہلی" (Nihilism) تحریک کا زور ہو گیا اور یہی وجہ تھی کہ اسکندر دوم کے آخری زمانہ میں ابتدائے عہد کی سی حریت نوازی باقی نہ رہی "نہلی" (معدومیت) تحریک کے حامی مختلف گروہ اور مختلف طبقہ کے لوگ تھے ایک تو وہ لوگ تھے جو روس میں کامل آزادی دستور چاہتے تھے اور جو مغربی سلطنتوں میں غالباً لبرل (آزاد خیال) یا ریڈیکل (انتہائے حریت پسند) جماعت میں شریک ہوتے۔ دوسرے بہت سے امرا ایسے تھے جو غلاموں کی گلوخلاصی و آزادی کی وجہ سے آزردہ ہو گئے تھے کیونکہ اس اصلاح کی بدولت ان کی دولت و قوت کو صدمہ پہنچا تھا اور اسی اصلاح کی وجہ سے بعض کسان بھی ناراض تھے کہ ان کو خاطر خواہ منفعت حاصل نہیں ہو سکتی تھی اس کے علاوہ بہت سے نوعمر تعلیم یافتہ مرد و عورتیں جو زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور بجز مایوسانہ و بیباکانہ تدابیر کے اور کوئی حل ممکن نہ سمجھتے تھے اس تحریک میں شریک ہو گئے غرضکہ سب موجودہ نظام کو الٹ دینے کے درپے تھے اور اس مقصد میں سب متفق تھے لیکن ان لوگوں میں اس امر پر کوئی اتفاق نہ تھا کہ اس

نظام کے بجائے پھر کیا انتظام ہوگا۔ البتہ ایک عام نیابتی مجلس کی جس کو ڈیوما (Duma) کہتے ہیں طلبی و انعقاد پر سب متفق تھے۔ جبر و تشدد ہیبت و خونریزی اس تحریک کے لوازم بن گئے۔ اسکندر دوم مجلس ڈوما (Duma) کا انعقاد ہی کرنا چاہتا تھا کہ ۱۸۸۱ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے جانشین اسکندر سوم نے کسی قسم کی رعایتی تدابیر اختیار کرنے سے قطعاً انکار کر دیا اور جبر و تشدد کے ساتھ اس تحریک کا انسداد کرنے لگا صرف "دہریوں" (عدمی) لوگوں کے ساتھ ہی سختی کا برتاؤ نہیں ہوا بلکہ پروٹسٹنٹ یہودی۔ کیتھلک و دوسرے مذہبی مخالفین کے ساتھ بھی یہی سلوک رہا۔ ملک مصیبت میں مبتلا ہوا اگرچہ کوئی کھلی بغاوت اس کی وفات ۱۸۹۴ء سے پہلے رونما نہیں ہوئی۔

نکولس دوم (Nicholas II)

نکولس دوم (Nicholas II) کا عہد بھی گویا اسکندر سوم کے عہد کا ہی سلسلہ تھا لیکن صنعت و تجارت کے فروغ کی اس نے ابتدا ہی سے کوشش کی۔ مخالفین کے ساتھ متشددانہ طرز عمل حسب سابق بحال رکھا گیا جنگ جاپان اور اس کی ہزیمتوں نے اور روسی عہدہ داروں کی نااہلی و بددیانتی نے قدیم طرز حکومت کی بحالی کو ناممکن کر دیا۔ فوج و بیڑے میں بڑی بڑی بغاوتیں ہوئیں پیٹروگراڈ (Petrograd) و دیگر شہروں میں سخت انقلابی ہنگامے ہوئے اکتوبر ۱۹۰۵ء میں زار نے مجلس ڈوما کی طلبی کا وعدہ کیا اور اختیارات رائے دہی کو بھی وسیع کر دیا اور اس طرح کی منتخبہ مجلس کو وضع قوانین و اجرائی محاصل کا اختیار بھی دینے کا وعدہ کیا ۱۹۰۶ء میں یہ مجلس منعقد

مجلس ڈوما (Duma)

ہوئی۔ اور امید ہوگئی کہ روس میں بھی دستوری و آئینی حکومت قائم ہو جائیگی لیکن خود اراکین میں بہت اختلاف آرا پیدا ہوگیا۔ گو اکثریت انتہا پسندوں کی تھی اس وجہ سے زار نے خوف زدہ ہو کر مجلس کو برخاست کر دیا لیکن مقابلہ یہیں ختم نہیں ہوا اور جب دوسری مجلس ڈوما نے بھی یہی رجحان ظاہر کیا

تو انقلابی خیالات کا ازالہ کرنے کے لئے سخت تشدد آمیز تدابیر اختیار کئے گئے۔ سائبیریا (Siberia) کو جلا وطنی اور پھانسی کے واقعات سُن کر تمام مغربی یورپ کانپ اُٹھا۔ آخر کار مشتبہ و ناجائز ذرائع سے ایک

روس اور جنگ اعظم

مطیع و فرمانبردار مجلس ڈوما منعقد ہوئی۔ لیکن "جنگ اعظم" کے آغاز تک کوئی قابل اطمینان دستوری زندگی قائم نہ ہو سکی نہ ملک کے مختلف اقوام خصوصاً فن لینڈ و پولینڈ والے ہموار ہو سکے۔ جنگ کے ساتھ ہی روس نے ایک نئی اہمیت پیدا کر لی۔ آزادی کی مخالفت کے بجائے روس حامی حریت اور جرمنی کی قہاریت کے مقابلے میں یورپ کے لئے سد سکندری بن گیا ہے۔ اُس کے سپہ سالاروں و افواج نے اُمید سے بڑھ کر کارگزاری دکھلائی ہے۔ یہ دیکھنا باقی ہے کہ روس کی معاشرتی و دستوری حالت پر جنگ کا کیا اثر پڑتا ہے۔ لیکن روس بھی اب یورپ کے متمدن ممالک کے حلقے میں شریک ہو چکا ہے۔

۳

گزشتہ باب میں انگلستان کی تاریخ ملکہ وکٹوریہ کی وفات تک بیان کر دی گئی ہے اس واقعہ کے بعد سے آغاز جنگ اعظم تک تیرہ سال کا جو عرصہ گزرا ہے اس میں بہت سے اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے لیکن اس اندوہناک مصیبت سے ان واقعات کو کچھ تعلق نہ تھا۔

برطانیہ عظمیٰ

جنگ بوار اپریل سنہ ۱۹۰۲ء میں ختم ہوئی۔ آخری زمانہ میں اس لڑائی کی حیثیت ایک جنگ پشیمانی کی (War of attrition) ہو گئی تھی اور جب بوار قوم کی پوری قوت کا خاتمہ ہو گیا تب کہیں جا کر اس نے اطاعت قبول کی۔ قدامت پسند فرقہ

جنگ بوار کا اختتام

برسر حکومت تھا جسکے وزیر اعظم اولاً لارڈ سالسبری (Salisbury) رہے اور بعد میں بالفور (Balfour) ہوئے سنہ ۱۹۰۵ء میں دونوں فرقوں کے لبرل قدامت پسند) کے تناسب میں جوزف چیمبرلین (Joseph Chamberlain) کی حمایت "محفوظ تجارت" کی وجہ سے فرق آ گیا جب سے کہ سر رابرٹ پیل (Sir Robert Peel)

لئے کابڈن (Cobden) کے نظریہ کو قبول و اختیار کر لیا تھا ملک میں آزاد تجارت کا اصول رائج ہوگیا تھا۔ اور بجز ایک حقیر گروہ کے کوئی اس کا مخالف نہ تھا اقتصادی و سیاسی وجوہ کی بنا پر مسٹر چیمبرلین کے ذہن میں حفاظتی محصول (محصول تارف) (Tariff) کا خیال پیدا ہوگیا۔ متعدد نو آبادیات کے زمانہ میں مسٹر چیمبرلین بڑے جوشیلے شہنشاہیت پسند ہو گئے تھے اور ان کا خیال تھا

چیمبرلین اور محفوظ تجارت (Chamberlain)

کہ حفاظتی محاصل کے ذریعہ سے سلطنت برطانیہ کو وہی فوائد حاصل ہو جائیںگے جو سالفرین (Zollverein) کے ذریعہ سے جرمنی کو حاصل ہوئے تھے۔ ان کو امید تھی کہ نو آبادیات و مستعمرات جب اولاً تجارتی اسباب و اغراض کی وجہ سے باہم ربط و اختلاط پیدا کرلیں گی تو پھر رفتہ رفتہ ایک مشترکہ متحدہ سیاسی عضویت قائم ہو سکے گی۔ گلیڈ اسٹون کے پیش کردہ قانون حکومت خود اختیاری کی مخالفت کرکے چیمبرلین نے لبرل (آزاد خیال) جماعت میں انشقاق پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے قدامت پسند فرقہ کو ایک عرصہ تک برسر حکومت رہنے کا موقع مل گیا تھا۔ چیمبرلین کا جدید طرز عمل قدامت پسند فرقہ کے لئے بھی ویسا ہی تباہ کن ثابت ہوا۔ بہت سے لوگ اس

سیاسی جماعتوں پر اثر

جماعت سے منحرف ہوگئے اور آخر کار نومبر سنہ ۱۹۰۵ء میں بالفور کو استعفا پیش کر دینا پڑا۔ سرہنری کیمبل بینرمین (Sir Henry Campbell-Bannerman) ان کے جانشین ہوئے اور انھوں نے پارلیمنٹ کو شکست کر دیا۔ عام انتخاب میں لبرل (آزاد) فرقہ کو ایسی اکثریت حاصل ہوئی کہ ملکہ اینی (Anoe) کے عہد حکومت کے بعد سے کسی جماعت کو آج تک حاصل نہیں ہوئی تھی۔

کیمبل بینرمین (Campbell) (Bannerman)

سرہنری کیمبل بینرمین کی علالت کی وجہ سے اوایل سنہ ۱۹۰۸ء میں مستعفی ہوگئے لیکن ان کے اس مختصر عہد حکومت میں جمہوریہ بوایر (Boer) کو جو حال ہی میں فتح کی گئی تھی حکومت خود اختیاری عطا کر دیگئی۔ تھوڑے ہی

دونوں بعد کیپ (Cape) اور ناٹال (Natal) بھی اسی میں شامل ہو گئے اور سب کی مل کر ایک مملکت قائم ہو گئی اور وہی جنرل بوتھا (Botha) جو چند دنوں پہلے برطانیہ عظمیٰ کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے متحدہ جنوبی افریقہ کے اولین وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ابتک ہیں۔ تاریخ میں ایسے تغیر کی مثال بہت کم ملے گی۔ اس واقعہ کے بعد سے جنوبی افریقہ کا جو طرز عمل رہا ہے وہ حریت نواز و منصفانہ برتاؤ کے مفید و صحت بخش نتائج کا کھلا ثبوت ہے۔

ایسکویتھ اور لائڈ جارج (Lloyd & George Asquith)

کیمبل بینرمین کے جانشین ایسکویتھ (Asquith) ہوئے۔ اس وقت سے دو مسائل جاذب توجہ بنے رہے ایک تو غربا و مساکین کی حالت سدھارنے کی تدبیریں تھیں جن کے محرک وزیر خزانہ مسٹر لائڈ جارج تھے چنانچہ ایک قانون "وظیفہ ضعیفی" (Old Age Pensions Act) پیش ہوا جس کی رو سے ستر برس سے زیادہ عمر والوں کو پانچ شلنگ فی ہفتہ وظیفہ دینے کا لزوم رکھا گیا۔ ایک قانون بیمہ کا نفاذ ہوا۔ جس کی رو سے حکومت نے مالک و ملازم کے چندوں میں اضافہ کر دیا تاکہ مزدوروں کو معذوری کی صورت میں ہفتہ وار ایک معینہ رقم مل سکے ان تجاویز کی بڑی مخالفت ہوئی اور اب تک ہے۔ لیکن حالیہ زمانہ میں انگلستان کی حکومت نے غربا کی حالت سنبھالنے میں ایسی سچی دلچسپی کبھی نہ لی تھی۔

دارالامرا اور لبرل فرقہ کی حکومت

دوسرا اہم مسئلہ دارالامرا کی حیثیت و اختیارات کا تھا یہ کوئی جدید مسئلہ نہیں تھا گلیڈ اسٹون نے اپنی آخری تقریر میں دارالامراء کے اختیارات پر سخت نکتہ چینی کی تھی چنانچہ لبرل جماعت کو بھی معلوم ہو گیا کہ جو باتیں اس کو سب سے زیادہ عزیز ہیں ان کی سخت مخالفت دارالامراء سے کی جا رہی ہے دارالامراء نے

۱۹۰۹ء کا موازنہ

"قانون حکومت خود اختیاری" کے مسودات کو کئی بار نامنظور کر دیا تھا۔ اور ۱۹۰۹ء میں انھوں نے وہ موازنہ بھی نامنظور کر دیا جو جدید معاشرتی

قوانین کے لئے مرتب کیا گیا تھا عوام و امراء کے اس نزاعی مسئلہ کے متعلق ملک کا خیال معلوم کرنے کے لئے پارلیمنٹ شکست کر دی گئی عام انتخاب کے بعد لبرل اکثریت بہت کم ہو گئی مگر حزب العمال اور آئرلینڈ کی قوم پسند جماعت کی تائید سے اب بھی ان کو (۱۲۲) رایوں سے اکثریت حاصل تھی۔

اختیارات دارالامرا کی محدودی

دارالامراء نے اب اس موازنہ کو منظور کر لیا جس کو اس نے پہلے نامنظور کر دیا تھا۔ لیکن اسکوتھ نے دارالامراء کے اختیار نامنظوری کو صرف دو سال تک محدود کر دینے کے لئے ایک تجویز پیش کی۔ جس میں یہ قرار دیا گیا کہ اس میعاد کے بعد بھی امرا منظوری نہ دیں تو ملک معظم کے دستخط کے بعد اس مسودہ کو قانون کی حیثیت حاصل ہو جائیگی۔ لیکن یہ تجویز بھی دارالامراء کی منظوری کی محتاج تھی مگر ملک معظم جارج پنجم کے اس وعدہ کے وجہ سے کہ اگر اب بھی مخالفت ہوگی تو وہ امراء کی تعداد اس تناسب سے بڑھا دینگے کہ تجویز منظور ہو جائے تمام مخالفت رفع ہو گئی اور یہ تجویز منظور ہو گئی۔

آئرلینڈ کے قانون حکومت خود اختیاری کی منظوری

لبرل فرقہ کو اب وہ ہتھیار مل گیا تھا جس کی مدد سے وہ قانون "حکومت خود اختیاری" نافذ کرا سکتے تھے اور انھوں نے اس کے استعمال میں جلدی شروع کر دی۔ دارالعوام سے بسرعت ایک قانون حکومت خود اختیاری منظور کر دیا گیا امراء اب بھی مخالفت پر قائم رہے لیکن جدید حربہ استعمال کیا گیا اور یہ مسودہ بھی قانون بن گیا۔

آئرلینڈ میں مخالفت

یہ قانون منظور ہونے کے بعد بھی مشکلات کا سامنا رہا آئرلینڈ خصوصاً السٹر (Ulster) میں اس قانون کی مخالفت کی تیاریاں ہونے لگیں حتیٰ کہ خانہ جنگی کی نوبت آگئی مصالحت کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور آئرلینڈ کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی کہ جنگ یا صلح کے زبردست سوال نے نازک سے نازک مسئلہ کو پس پشت

ڈالد یا جب جنگ شروع ہوئی تو باتفاق رائے قانون حکومت خود اختیاری پر ملک معظم کی دستخط ثبت ہو گئی لیکن اس کی تعمیل اختتام جنگ تک کے لئے ملتوی کر دی گئی ؂

(۱)

زمانہ مستقبل کے طالب علم تاریخ کے لئے یہ باور کرنا مشکل ہوگا کہ انگریزوں کی تمام توجہ اِنھی ملکی مسائل نے جذب کر لی تھی مدبرین تو طوفان کے آثار کا فکر و تردد سے مطالعہ کر رہے تھے لیکن معمولی شہریوں کو ۱۹۱۴ء کی جنگ بجلی کی طرح نازل ہوتی ہوئی معلوم دی۔ ہم دول یورپ کے بین الاقوامی تعلقات کا اس طرح مطالعہ کرینگے کہ ان دونوں جتھوں کے قیام کے اسباب معلوم ہو جائیں جو اس جنگ میں ایک دوسرے سے متصادم ہوئے۔ ۱۸۷۱ء کے بعد سے یورپ میں جرمنی کی فوقیت مسلمہ ہو گئی تھی اور بسمارک نے اس سے فائدہ اٹھا کر شہنشاہانِ روس و آسٹریا کو اپنی طرف ملا لیا تھا۔ اسی کو اتحاد شہنشاہانِ ثلاثہ (The League of the Three Emperors) کہتے ہیں لیکن یہ تسمیہ صحیح

تینوں شہنشاہوں کا اتحاد

نہیں کہا جا سکتا کیونکہ کوئی باضابطہ اتحاد نہیں قائم ہوا تھا۔ مغربی یورپ میں امن رہا اور معلوم ہوتا تھا کہ مغرب کا نظام حکومت ایک مستقل شکل اختیار کر چکا ہے جو ہمیشہ قائم رہیگا لیکن جزیرہ نمائے بلقان پیہم خطرات و شورشوں کا مرکز بنا رہا اور یورپ کے ہر بڑے سیاسی تغیر و انقلاب کا تعلق حتیٰ کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کا تعلق بھی بلقان کے کسی نہ کسی واقعہ سے وابستہ پایا جاتا ہے ؂

ترکی کا زوال

ترکی کا زوال و تجزیہ مسلسل جاری رہا اور ہر طرف سے اس کے سرحدات میں کمی ہوتی رہی اور نئی نئی مملکتیں قائم ہوتی گئیں ترکی کی بیخ کنی کے زبردست اسباب مذہب اور قومیت تھے۔ کیونکہ ترکی کے یورپی علاقہ میں زیادہ آبادی مشرقی کلیسہ کے عیسائیوں کی ہے اور اسلامی حکومت کا جوا ان کے کندھوں پر ناگوار ہو رہا تھا علاوہ اس کے ان کو یہ بھی احساس پیدا ہو گیا تھا کہ ترک غیر ملکی ہیں اور ان کو روس

کی اعانت وہمدردی پر بھی بھروسہ تھا۔ جنوب میں یونان تو بہت پہلے ہی ۱۸۲۹ء میں خودمختار سلطنت بن گیا تھا۔ مغرب میں مانٹی نیگرو (Montenegro) کی پہاڑی مملکت نے بھی لڑبھڑ کر تقریباً ایک قسم کی خودمختار حکومت قائم کر لی تھی گو ترکی نے اس کی خودمختاری کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ دریائے ڈینیوب کے

رومانیا (Roumania)

شمال میں رومانیا (Roumania) میں بھی خود اختیاری حکومت قائم تھی۔ گو برائے نام اُس کا شمار سلطنت ترکی کے حدود میں ہوتا تھا۔ ڈینیوب کے جنوب میں ہرزی گوینا (Herzegovina)

بلگیریا (Bulgaria)

سرویا (Serbia) اور سب سے بڑھ کر بلگیریا (Bulgaria) ہمیشہ شورش کرتے رہتے ترکوں کو اپنی کمزوری کا احساس تھا اور وہ ہیبت سے ان ممالک کو مطیع رکھنا چاہتے تھے اصلاح کے مواعید تو بہتر سے ہوئے مگر عملاً کچھ بھی نہ ہوا۔ ۱۸۷۵ء میں باسنیا (Bosnia) اور ہرزے گوینا (Herzegovina) ترکی حکومت کی برملا مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔ بلوائیوں کو ابتداءً کچھ کامیابی ہوئی لیکن ترکی کی ٹڈی دل فوج ان پر حاوی ہوگئی اسی زمانہ میں بلگیریا والے بھی اس طرح خودمختار ہونا چاہتے تھے کہ ترکوں نے نہایت بے رحمی سے ان کا قلع قمع کر دیا بلگیریا والوں کے قتل عام سے تمام یورپ لرز گیا۔

جنگ روس و ترکی

سب مدبرین اسی بات پر متفق تھے کہ جزیرہ نمائے بلقان یورپ کے طوفان کا مرکز و منبع ہے روس و آسٹریا کو پڑوس کی وجہ سے تعلق تھا اور برطانیہ کو بحر متوسط کی تجارت کی وجہ سے متعدد کانفرنسیں ہوئیں۔ اور صدہا تجاویز پیش ہوتی رہیں آخر کار ۱۸۷۷ء میں روس نے جنگ کا اعلان کر دیا اور چونکہ اس کے مطالبات پورے نہیں ہوئے اس لئے فوراً جنگ شروع ہوگئی۔ دیگر دول عظمی دور سے اس جنگ کا نظارہ کرتی رہیں۔

ترکی سپاہ و افسروں نے جنگ میں بڑی توانائی و قوت دکھلائی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ روس کو دریائے ڈینیوب کے پیچھے

ہٹ جانا پڑے لگا لیکن آخر میں روس کی کثرت تعداد و وافر دولت اور معقول ترتیب و انتظام نے اور حکومت ترکی کی بد انتظامی نے ہونے والے انجام کو پہنچا دیا روسی رومانیا والوں کے ساتھ قسطنطنیہ کے جوار تک پہنچ گئے اور ترکی ان کے رحم و کرم کا محتاج ہوگیا۔ سین اسٹیفینو (San Stefano) کی صلح ترکوں سے جبراً منظور کرا لی گئی اور اگر اس کی تعمیل موبمو ہوئی ہوتی تو یورپ میں ترکی کی حیثیت ایک بڑی سلطنت کی باقی نہ رہتی لیکن اس موقعہ پر یورپ خصوصاً برطانیہ نے ڈزرائیلی کی سرکردگی میں مداخلت کی۔ بسمارک کے اثرات اور جرمنی کی قوت کی وجہ سے ایک یورپی کانگرس کا انعقاد برلن میں ہوا جس میں بڑی رد و قدح کے بعد صلح برلن منظور ہوئی صلح سین اسٹیفانو (San Stefano) میں جو ذلت و خفت ترکی کو ہوئی تھی اس کا ازالہ تو صلح برلن نے ضرور کر دیا لیکن ترکی کا ارضی نقصان بہت ہوا اور اس کی وقعت بہت گھٹ گئی رومانیہ (Roumania) مانٹی نیگرو اور سرویا خود مختار سلطنتیں بن گئیں باسنیا (Bosnia) اور ہرزے گوینیا کہنے کو تو ترکی کے ماتحت رہے لیکن ان کا نظم و نسق آسٹریا سے متعلق کر دیا گیا سین اسٹیفانو کی مجوزہ وسیع سلطنت بلگیریا کے بجائے اسی نام کی ایک چھوٹی سی خود مختار مملکت قائم کر دی گئی جس کا نام جنوبی حد کوہ بلقان رکھا گیا اس پہاڑ کے جنوب میں رومیلیہ (Roumelia) کے نام کی ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی گئی جس کو خود اختیاری حکومت دی گئی مگر سلطان کی نام نہاد سیادت قائم رکھی گئی۔ برطانیہ کو اپنے خدمات کے معاوضہ میں سائپرس (Cyprus) مل گیا لیکن اس پر سلطان کی سیادت برائے نام قائم رہی۔

صلح سین اسٹیفینو (San Stefano)	
صلح برلن	
اتحاد ثلاثہ (Gortschakoff)	

اس جنگ کے مندرجہ صدر فیصلہ کی وجہ سے شہنشاہان ثلاثہ کا اتحاد قائم نہ رہ سکا زار روس اور اس کے وزیر گارشاکوف (Gortschakoff) نے سمجھ لیا کہ اس کے بلقانی منصوبات زیادہ تر بسمارک اور جرمنی کی بدولت رد ہو گئے اور بغیر کسی ظاہری بگاڑ کے روس و

جرمنی کے تعلقات کشیدہ ہو گئے برخلاف اس کے انہی اسباب کی وجہ سے جو روس و جرمنی کی باہمی کشیدگی کا باعث ہوئے تھے۔ آسٹریا اور جرمنی کے تعلقات زیادہ گہرے ہو گئے کیونکہ بلقان میں اپنا اپنا اثر و اقتدار قائم کرنے میں روس و آسٹریا ایک دوسرے کو حریف سمجھنے لگے تھے کچھ عرصہ بعد اٹلی بھی آسٹریا جرمنی کے ساتھ شریک ہوگیا۔ چونکہ اٹلی کی کی حالت اچھی نہ تھی اور شاہی کے مخالفین اندرون و بیرون ملک پیدا ہو گئے تھے اس لئے وسطی یورپ کی شاہی حکومتوں سے جن کی فوجی طاقت بہت بڑھی ہوئی تھی تعلقات قائم کرنا مفید و ضروری معلوم ہوا۔ فرانس کا نوآبادیاتی منصوبہ بھی اس انجام کا ممد و معاون ہوگیا۔ کیونکہ حال ہی میں فرانس نے ٹیونس (Tunis) پر قبضہ کرلیا تھا اور اپنے جنوبی ساحل سے فرانس کو اس قدر قریب

اٹلی جرمنی و فرانس

دیکھ کر اٹلی کو خطرہ پیدا ہوگیا تھا اس لئے ۱۸۸۲ء میں اتحاد ثلاثہ قائم ہوگیا۔ جرمنی اٹلی و آسٹریا نے ظاہر کیا کہ ان کا مقصد صرف یورپ میں امن و امان قائم رکھنے کا ہے اٹلی میں شروع سے ایک زبردست جماعت تھی جو اپنے قدیم دشمن آسٹریا و شمال کے وحشیوں[1] (Barbarians) سے اس قسم کا اتحاد قائم کرنا پسند نہیں کرتی تھی بلکہ اس اتحاد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

فرانس و روس کا اتحاد

فرانس کو اب اپنی تنہائی کا احساس ہوا اور اس لئے خیال کیا کہ اس اتحاد ثلاثہ کی مخالفت اور انگلستان کی ناراضگی میں اس کی فوجی طاقت بہت سے امکانی خطرات کے انسداد کے لئے کافی نہ ہو سکیگی۔ آخر کار اس کو روس سے مدد ملی۔ وہی روس جس کی تاریخ جس کے آئین و مقاصد فرانس کی تاریخ و آئین و مقاصد کے برعکس تھے لیکن جرمنی سے دونوں کو عداوت ہونیکی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کرنے کی دونوں کو ترغیب ہوئی۔ جب سے کہ جرمنی نے بذریعہ

[1] "شمال کے وحشیوں" سے مراد جرمنی ہے۔ من المترجم۔

صلح فرینکفورٹ فرانس سے السلاس (Alsace) اور لورین (Lorraine) کا علاقہ رعایا کی مرضی کے خلاف چھین لیا تھا اس وقت سے فرانس اور جرمنی کی عداوت مستقل اور مسلسلہ ہوگئی تھی روس اور جرمنی کی عداوت و رقابت حال کی تھی لیکن یہ بھی شدت میں کچھ کم نہ تھی۔ فرانس کو بڑا اطمینان ہو گیا جب اس کو ایسے نامحدود ذرائع اور ایسی زبردست قوت کا ایک حلیف مل گیا۔ ۱۹۰۵ء کی جنگ جاپان نے روس کی وقعت ومنزلت بہت گھٹادی لیکن اس کی وجہ سے اُس کی افواج کی ازسرنو تنظیم ہوئی اور اس کے بعد جنگ اعظم میں اُس کی سپاہ نے حیرت انگیز پامردی و مہارت فن کا ثبوت دیا۔

فرانس و انگلستان کا اتحاد دوستانہ

۱۹۰۳ء میں فرانس اور انگلستان کے "اتحاد دلی" یا "اتحاد قلبی" (Entente Cordiale) کی تحریک شروع ہوئی اور ایک دوسرا اتحاد ثلاثہ سابقہ اتحاد ثلاثہ کے مقابل میں تیار ہو گیا گو نام تو یہ نہیں رکھا گیا۔ یہ تحریک یکایک نہیں آغاز ہوئی تھی نوآبادیات اور افریقہ کے مسائل کے باوجود کچھ دنوں سے فرانس اور برطانیہ کے تعلقات گہرے ہو رہے تھے سخت مصیبت و تباہی میں (۱۸۷۱ء کی جنگ کے بعد) فرانس نے جو صبر و استقلال دکھلایا اس کی تعریف کیجا رہی تھی اور علوم و حکمت میں اس کی غیر معمولی ترقی کی تحسین ہو رہی تھی لیکن اُس باہمی کشش کا فوری سبب غالباً جرمنی کا معاندانہ رویہ تھا جو اس نے جنگ بوار کے زمانہ میں انگلستان کے خلاف اختیار کیا تھا اور پھر اس کے بعد ہی اُس کا اپنے بیڑے کو وسعت دینا ایک اور تازیانہ ہوگیا یہ تو ہمیں ٹھیک نہیں معلوم کہ فرانس سے انگلستان نے کیا معاہدہ کیا لیکن یہ معاہدہ استوار ہوتا گیا اور تقریباً ایک اتحاد کی صورت قائم ہوگئی

یورپ کا مسلمہ امن

اتحاد کے مقابلہ میں اتحاد قائم ہوگیا اور کچھ دنوں تک یورپ کے امن کا اطمینان ہوگیا دوسری صدی عیسوی کے بعد سے

یہی تینتالیس سال کا عرصہ سب سے طویل امن کا زمانہ ہے جو دول مغرب کو نصیب ہوا۔ لوگوں کو امید ہو گئی تھی کہ اگر نصف صدی تک ہم امن و اماں کے ساتھ رہ سکے تو سب عظیم الشان جنگی تیاریاں بیکار اور رائیگاں سمجھی جائینگی۔ اور باہمی اعتماد و اعتبار کی بنا پر یورپ کی کوئی تنظیم و ترتیب قابل قبول ہو جائیگی۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ یورپ کا دل امن و اماں کا جویان و خواہاں ہے فرانس کے ذہن سے انتقام کے خیالات محو ہو رہے تھے اور انگلستان میں پھر اگر کوئی شخص جنگ کی تہجین کے بجائے تحسین کرتا ہوا پایا جاتا تھا تو اس کو ملکی خدمات سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ جرمن لوگوں کی خطرناک اور جنگجو فطرت کا علم ضرور تھا لیکن افراد اور بڑی بڑی جماعتوں کی طرف سے مصالحانہ و امن پسند اظہارات ہوتے رہے جن میں صداقت کی بو پائی جاتی تھی۔ مستقبل والوں کو اس کا اندازہ ہونا مشکل ہے کہ سنہ ۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں یورپ کے اتفاق و صلح کی امیدیں کس طرح قائم کی گئی تھیں۔

قیام امن کے ذرائع کا فقدان

جنگ کے اسباب کے متعلق صدیوں تک بے شمار لوگ خامہ فرسائی کرتے رہینگے ہم اس مقام پر اتنا نوٹ کر سکتے ہیں کہ یورپ میں جنگی عقوبتیں تو بہتیری تھیں لیکن صلح و مصالحت کا کوئی آلہ نہ تھا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں زار روس نے البتہ اس مقصد کے حصول کی کوشش کی جبکہ اُس نے دول یورپ کو بمقام ہیگ (Hague) جمع ہونے کی دعوت دی تاکہ تخفیف سپاہ و سامان جنگ کی تدابیر اختیار کی جائیں تخفیف سپاہ کے حد تک تو یہ کانفرنس ناکام رہی کیونکہ جرمن نمایندوں نے اس قسم کی سب تجاویز کو ٹھکرا دیا لیکن ہیگ (Hague) میں ایک بین الاقوامی عدالت کا قیام منظور ہو گیا جس کی مدد سے بہت سے بین الاقوامی مناقشات بحسن و خوبی تصفیہ پاتے رہے ہیں اور جنگ کے بعد پھر امن و صلح کے قیام میں اس عدالت سے مدد ملنے کی بہت کچھ امید ہے۔ لیکن یہ ذریعہ بھی ناکافی تھا اور دول یورپ کے اختلاف کی وجہ سے اس سے زیادہ مکمل نظام قائم ہونا ناممکن تھا

جرمنی کی استعماری ہوس

جنگ عظیم کے دو خاص اسباب تھے ایک تو نوآبادیاتی

رقابت اور دوسرے بلقان میں دول عظمیٰ کا باہمی مقابلہ۔ جرمنی اپنی بڑھتی ہوئی دولت اپنی اعلیٰ انتظام اور اپنی زبردست طاقت کے گھمنڈ میں اس بات کا ادعا کرنے لگا کہ غیر یورپی دنیا میں بھی اس کو اسی مناسبت سے حصہ ملنا چاہیئے اور یہ مطالبہ رعایا کی ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ ہوس پوری کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ کیونکہ جرمن رعایا کی فارغ البالی ایک مسلمہ بات تھی لیکن دنیا کے تمام قابل حصول مقامات پر دوسرے دول کا قبضہ تھا اس لئے دوسرے اقوام کو بے دخل کئے بغیر نوآبادیاتی مقبوضات حاصل کرنا دشوار تھا اس کے باوجود جرمنی نے ایسی استعماری قوت پیدا کر لی جس سے آئندہ کے لئے بہت کچھ توقعات ہو سکتے تھے دوسرے دول سے گفت و شنید کر کے اس نے افریقہ میں وسیع و امید افزا مقبوضات حاصل کر لئے اور چین میں سنگ ٹاؤ (Tsing Tao) پر قبضہ کر کے اس نے تجارتی سرگرمی کا مرکز قائم کر لیا شمالی افریقہ پر بھی اس کی نظر تھی جہاں مراکش کا ملک یورپی اثرات سے خالی تھا لیکن یہاں اس کو کامیابی نہیں ہوئی بلکہ ان کوششوں کی وجہ سے فرانس سے عداوت ہوگئی۔ اور فرانس کو برطانیہ کی مدد حاصل تھی۔ جرمنی کو اس وجہ سے ندامت اٹھانی پڑی اور اس کے بجائے فرانس نے مراکش میں محمیہ (Protectorate) قائم کر لیا۔

مراکش

مشرق قریبہ میں جرمنی کا اثر

مراکش کا مسئلہ بھی استعمال جنگ کا باعث ہوا لیکن یہ آگ سلگی تو بلقان سے۔ جرمنی و آسٹریا نے بلقان و ترکی میں تجارت کا اچھا میدان دیکھ لیا تھا شہنشاہ نے سلطان کی دوستی کی بہت کچھ نمائش کی اور بعد میں بغداد ریلوے کی تعمیر میں اس کو بہت حصہ مل گیا۔ لیکن بلقان کی صورت حال سمجھنے کیلئے ہم کو ان واقعات پر غور کرنا چاہیئے جو صلح برلن کے بعد سے پیش آئے۔

صلح برلن کے بعد سے سلطنت ترکی کی تخریب و تجزیہ

صلح برلن کے تصفیہ کو مدبرین نے ترکی کا آخری تجزیہ سمجھ لیا تھا اور سلطان کے ممالک کی کلیت و تمامیت

کا سوال پھر پیدا ہو گیا تھا لیکن دولت ترکیہ کے حدود و قائم و محفوظ رکھنے کے لئے کوئی قوت کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں رومیلیا (Roumalia) اور بلگیریا ایک ہو گئے سنہ ۱۸۸۲ء میں مصر برطانیہ کی حکومت میں آ گیا اور سنہ ۱۸۹۸ء میں جزیرہ کا قراط (Crete) یونان کو مل گیا سنہ ۱۹۰۸ء میں ایک انقلاب کی وجہ سے جب سلطان معزول ہو گئے۔ اور داخلی اصلاحات کی امید پیدا ہوئی تو آسٹریا نے ترکی کی کمزور حالت دیکھ کر بوسینا اور ہرزے گوینا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کا اعلان کر دیا اور بلگیریا نے بھی اسی زمانہ میں کامل خود مختاری کا اعلان کر دیا سنہ ۱۹۱۲ء میں اٹلی نے طرابلس (Tripoli) پر چڑھائی کر کے قبضہ کر لیا یہ مہم آسانی سے سر نہیں ہوئی اور بڑی کوششوں سے اٹلی کا قبضہ بحال رہ سکا یہاں تک کہ جنگ بلقان شروع ہو جانے سے سلطان کو مجبوراً اس ملک سے دستکش ہونا پڑا۔ البتہ سلطان کی سیادت برائے نام قائم رہی۔

سنہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب اور آسٹریا کے الحاق بوسنیا و ہرزے گوینا کی وجہ سے تمام بلقان میں تہلکہ پڑ گیا ترک اور اُن کی ماتحت رعایا کی مصالحت کی تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور بلقان کی مسیحی مملکتوں نے ترکوں کو اس انشقاق و افتراق کی حالت میں یورپ سے نکال باہر کر لینے کا موقع دیکھا یونان۔ بلگیریا۔ مانٹی نیگرو و سرویا نے ایک خفیہ بلقانی اتحاد قائم کیا انھوں نے باہمی نزاعات پر پردہ ڈال دیا اور اپنی تمام کوششیں ترکوں کو شکست دینے میں صرف کرنے کے لئے متفق ہو گئے اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء میں جنگ شروع ہوئی جبکہ ترک بالکل تیار نہ تھے یونانی۔ سروی۔ بلگیری اور مانٹی نیگرو والوں سب کو فتح نصیب ہوئی لیکن جنگ کا زیادہ بار بلگیریا پر پڑا جس نے ترکوں کو دو لڑائیوں میں شکست دی اور سلونیکا تک بڑھ گئی اور پھر ایڈریانوپل (Adrianople) کا زبردست قلع فتح کر لیا۔ جنگ ختم ہوتے معلوم ہونے لگی اور شرائط صلح طے کرنے کیلئے لندن میں ایک کانگرس کے انعقاد کی تجویز ہوئی۔

یہ کوشش گو صدق نیت پر مبنی تھی مگر رائیگاں ہوئی کیونکہ ادھر مغرب میں مدبرین صلح کی بات چیت کر رہے تھے اور اُدھر بلقان میں

نقشہ ھ سرحدات ریاستہائے بلقان مطابق معاہدۂ بخارسٹ ۱۹۱۳ء
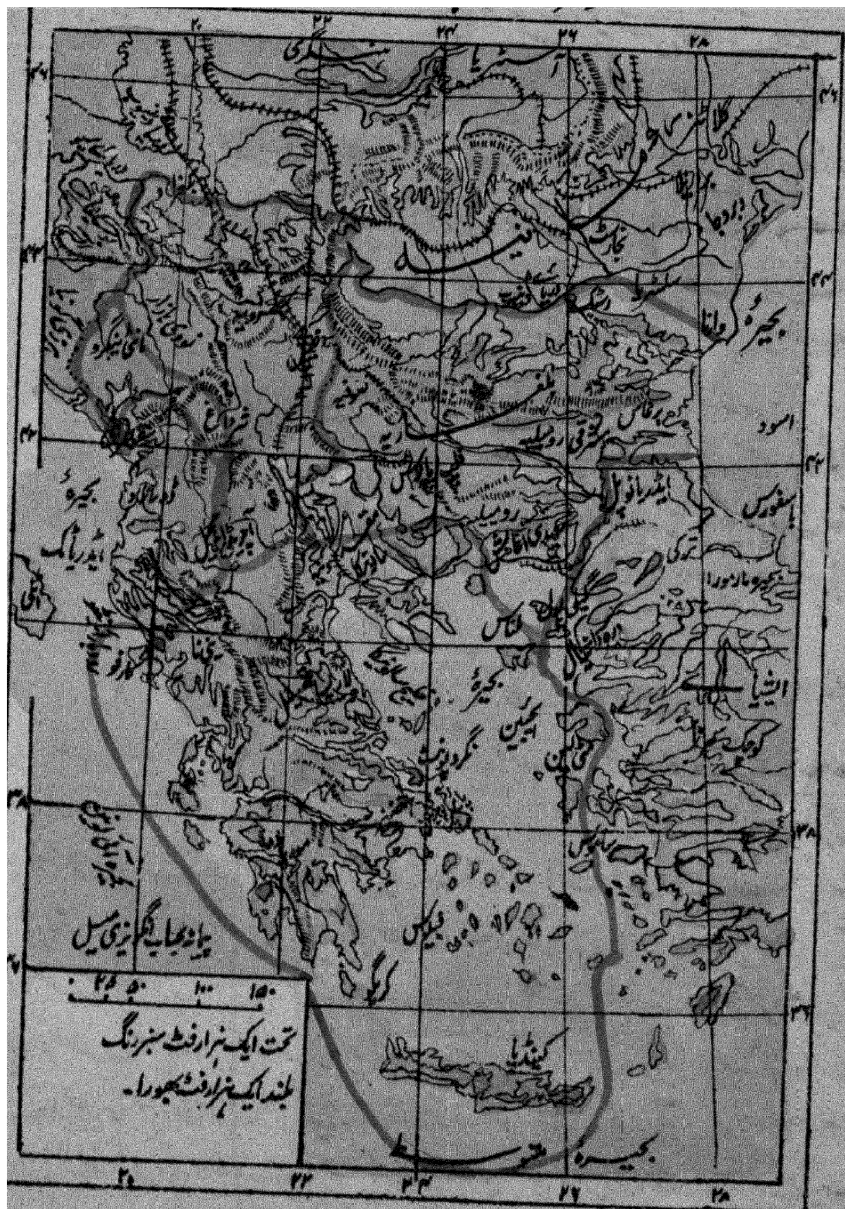
ایک نئی اور اس سے بھی زیادہ خوفناک جنگ چھڑ گئی دول بلقان کی باہمی رقابت حد کو پہنچ گئی تھی۔ بلغاریہ اور وہاں کا تاجدار فرڈیننڈ اپنی محنت کی بناء پر زیادہ حصہ لوٹ کا چاہتے تھے سابقہ جنگ کے دوران میں ہی سیلونیکا (Salomica) کے قبضہ کے متعلق بلغاریہ (Bulgaria) و یونان میں جھڑپ ہو گئی تھی اور یہی نزاع بنائے مخاصمت ثابت ہوئی۔ بلغاریہ کو اب بقیہ بلقانی دول کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اس لڑائی میں جو ۱۹۱۳ء کی جون میں شروع ہوئی۔ بلغاریہ کی حالت ترکی سے بھی بدتر ہو گئی۔ رومانیا والے بھی اس کے مقابلہ میں آ گئے اور ترکوں نے بھی ایڈریانوپل پر قبضہ کر لیا۔ بلغاریہ کو متواتر شکستیں ہوئیں اور وہ اپنے حریفوں اور یورپ سے صلح کا خواستگار ہوا۔ اس لڑائی میں عہد وسطیٰ کی لڑائیوں سے بھی زیادہ خوفناک مظالم ہوئے ایک چشم دید گواہ کا بیان ہے کہ "جزیرہ نمائے بلقان ایک بڑا پاگل خانہ ہے جس میں فرزانگی حماقت سمجھی جاتی ہے اور حماقت عین عقلمندی" جولائی میں عارضی صلح منظور ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں بعد صلح کا معاہدہ مکمل ہو گیا۔

بلقان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا لیکن شروع جنگ کی توقعات جب کہ دول بلقان کے عہد یہ کا امکان پایا جاتا تھا پورے نہ ہو سکیں۔ قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ بحال رہا اور ایڈریانوپل پر بھی انھوں نے پھر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اب ان کی حیثیت ایک بڑی یورپی طاقت کی باقی نہ رہی بلغاریہ کو بحر ایجین (A. Egeon) پہنچنے کا راستہ مل گیا لیکن اس کے علاقہ میں ایسی وسعت نہ ہو سکی جیسی کہ کچھ عرصہ قبل اس کو امید ہو گئی تھی سرویا حدود بڑھ جانے سے ایک اچھی خاصی طاقت بن گیا۔ ۱۳۹۸ء میں جنگ کوساو (Kossevo) میں ترکوں نے اُس کی سلطنت کو جو شکست دی تھی اس کا انتقام سرویا نے اس جنگ میں لے لیا۔ لیکن اب بھی اس کی رسائی سمندر کے ساحل تک نہ ہو سکی اور بوسنیا و ہرزے گوینیا میں اپنی قوم کے کروڑوں آدمیوں کو آسٹریا کی اطاعت

میں دیکھنا اس کو ناگوار ہوتا تھا یونان کے ملک و اعزاز میں بہت اضافہ ہو گیا۔ قراط (Crete) اس کے قبضہ میں آگیا (اور سیلونیکا بھی اس کو مل گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ صدیوں کے بعد پھر یورپی ممالک میں ایتھنز کا خاص اثر و اقتدار قائم ہو جائیگا گو وہ شعلہ جس نے ۱۹۱۴ء میں تمام یورپ کو مشتعل کر دیا یہیں سے اٹھا لیکن پھر بھی بلقان کا مستقبل امید افزا ہے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ کے اسباب

یہاں اُن معاملات کے سُلجھانے کی کوشش نہ کی جائیگی جن کی بدولت ۱۹۱۴ء میں یورپ ایک بلائے عظیم میں گرفتار ہو گیا۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ واقعات کا رنگ بھی بدلتا جائیگا اور موجودہ حالت میں شخصی و قومی اثرات کی حقیقی اہمیت کا ٹھنڈے دل سے موازنہ کرنا مشکل ہے۔ شاید ہے کہ مستقبل کا مورخ یورپ کے آتش گیر مادہ کی بہتات و فراوانی اور اس کو زایل کرنے کے اسباب و ذرائع کی کمی پر زیادہ زور دے گا لیکن یہ یقینی امر ہے کہ ان دستاویزات کے مطالعہ کے بعد جن کی اشاعت ہو چکی ہے ہر شخص یہی کہے گا کہ آسٹریا اور جرمنی چونکہ جنگ آزمائی پر تلے ہوئے تھے اس لئے جولائی ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہو گئی اور اسی وجہ سے ان ممالک نے بلقان کے واقعات سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا بلقان میں روس و آسٹریا کی شدید رقابت تھی اور روس و جاپان کی لڑائی کے اختتام کے وقت آسٹریا نے بامداد جرمنی روس کو بلقان میں زک بھی دی تھی۔ سرویا کو آسٹریا اپنا خاص دشمن سمجھتا تھا اور ۱۹۰۸ء میں اس لئے چند دستاویزات کی بنا پر سرویا پر سازش کا الزام بھی عاید کیا گیا تھا حالانکہ بعد میں ان دستاویزات کا جعلی ہونا آسٹریا نے تسلیم کر لیا یہ جعل سازی کوئی ایسی تحریف نہیں تھی جیسی کہ بسمارک نے ایمز (Ems) کے تار کے متعلق کی تھی بلکہ ایک صریح اور زبردست جعل کیا گیا تھا۔ جس کی کوئی مثال دول یورپ کے حالیہ سیاسی کارناموں میں دستیاب نہیں

ہو سکتی آسٹریا نے ۱۹۱۳ء میں سرویا پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اٹلی نے اسے روک دیا
۱۹۱۴ء میں ایک واقعہ کی بدولت اس کو موقع مل گیا۔ ۲۸ جون کو سراجیوو (Serajevo)
میں آسٹریا کا ولیعہد قتل ہو گیا تو حکومت سرویہ کی سازش کا شبہ کیا گیا اور آسٹریا نے
ایک اعلان کے ذریعہ دادرسی چاہی۔ جسکے الفاظ ایسے سخت تھے کہ یہ اعلان خود
ایک جنگی فعل کہا جا سکتا ہے۔ روس جو بلقان کی سلیوانی مملکتوں کی ہمیشہ حمایت کرتا
تھا آسٹریا کے بیہودہ مطالبات پر سرویا کی امداد کرنے پر آمادہ ہو گیا ادھر جرمنی آسٹریا
کی مدد پر تیار ہو گیا۔ فرانس بھی روس کے اتحاد کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا تھا
برطانوی وزیر خارجہ نے صلح و مصالحت کے ذریعہ سے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا لیکن کوئی
نتیجہ برآمد نہیں ہوا اٹلی نے البتہ اعلان کر دیا کہ اتحاد ثلاثہ کے حلیفوں کو وہ ایسی جنگ
میں مدد نہیں دے سکتا جسکے محرک خود وہ تھے چنانچہ کچھ عرصہ تک وہ غیر جانبدار رہا۔
برطانیہ کو فرانس کی دوستی کی وجہ سے جنگ میں شریک ہونا پڑا نیز اس وجہ سے
کہ اس نے بلجیم کی غیر جانبداری کے تحفظ کا وعدہ کر لیا تھا اور اب جرمنی بلجیم پر چڑھائی
کرنے لگا تھا حالانکہ خود جرمنی نے بلجیم کی غیر جانبداری کی ضمانت دی تھی۔
اس میں شک نہیں کہ یورپ کی بیشتر رعایا امن و صلح کی خواستگار تھی لیکن
مدبرین یورپ نے جس مشین کے بنانے میں نصف صدی صرف کی تھی
اس کے دندانوں کی گرفت سے یہ لوگ نہ بچ سکے۔

حوالۂ کتب متعلقۂ باب ہذا:—

کیمبرج کی تاریخ (Cambridge Modern History) "اقوام یورپ کا
نشو و ارتقاء" از (J. H. Rosis Development of European Nation)
ہمارے زمانہ کی تاریخ (History of our times) از گوچ (Gooch) تاریخ بلقان
حالیہ فرانس" ہینوٹاکس (Hanotaux) "تذکرۂ ہائن (Hohenlohe memoirs)
"تاریخ چہاردہ یوم" از ہیڈلم (Headlam) سر ایڈورڈ گرے کی خارجی حکمت عملی"
از گلبرٹ مرے (Gilbert Murray)

باب بست و دوم

محاربۂ عظیم

(۱)

جس شخص کی زندگی ان ہولناک پانچ سالوں میں گزری ہے جب کہ تمام دنیا ایک زبردست کشمکش میں مبتلا تھی جو بالاتفاق "محاربۂ عظیم" کے نام سے موسوم ہے، اس کے لئے نہایت مشکل ہے کہ ۳۰ صفحوں میں اس کا خاکہ کھینچنے کی جرأت کرے۔ ہر روز اخباروں میں ایسی وحشت ناک خبریں آتی تھیں جن سے اندیشہ ہوتا تھا کہ دنیا میں کوئی انقلاب عظیم ہونے والا ہے۔ فضا کچھ ایسی تھی کہ افراد اور واقعات کی نسبت صحیح رائے قائم کرنا ناممکن تھا۔ خبریں بعض صحیح ہوتی تھیں بعض دروغ آمیز بعض افواہی اور بعض محض چھوٹی جن سے لوگ پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ ان خبروں کا اثر مورخ پر یہ ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کے ماخذ گزشتہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے اور اس کے دل میں یہ خیال آنے لگتا ہے کہ جب زمانۂ حال کے بارے میں اسے صحیح اور قابل وثوق اطلاعیں نہیں ملتیں تو قرون وسطےٰ کے وقائع نگاروں کی تصنیفیں اور ہیروڈوٹس کی جنگ ایران کی تاریخ میں کب صحت کی امید ہو سکتی ہے۔ مورخوں کے یہاں جو امور بالکل مسلم ہیں ان کے متعلق بھی اسے شبہ ہونے لگتا ہے اور اسے نپولین کا یہ قول یاد آتا ہے کہ "تاریخ متفق علیہ دروغ ہے"۔ مگر یہ ارتیابی کیفیت دانشمندی کے خلاف ہے۔ تاریخ حقیقت

نہیں بلکہ حقیقت سے قریب ہے اور یہ قربت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس باب میں ہم اس جنگ کے حالات اس طور پر بیان کرینگے کہ گویا اسے ختم ہوکر عرصہ دراز ہو گیا ہے اور ہمارے دلوں یا نقاصد پر اس کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

صرف یہ کہدینا کافی ہیں کہ جو جنگیں صفحات تاریخ میں مذکور ہیں ان میں یہ جنگ بہ لحاظ عظمت اور جان کے نقصان کے سب سے بڑی تھی۔ جو ممالک اس جنگ میں شریک تھے ان کا مجموعی رقبہ زمین کے تمام خشکی کے رقبہ کا تین ربع تھا۔ جنگ میں جو سلطنتیں شریک تھیں ان کی تعداد اس قدر تھی کہ انکی پوری تعداد کے متعلق اکثر شبہ ہوتا ہے۔ اولاً جرمنی اور آسٹریا کے مقابلہ میں روس فرانس برطانیہ سربیا مانٹینیگرو، بلجیم اور جاپان تھے۔ مگر بہت جلد دوسری سلطنتیں بھی شریک ہوگئیں۔ جرمنی کی توجہ عرصہ سے ترکی کی طرف تھی اور ترکی وسیع اور غیر منتظم علاقوں میں اس کے سرمایا اور تنظیمی قوت کے لئے بہت موقع تھا۔ غالباً جنگ کے قبل ہی سے دونوں ملکوں میں کوئی سمجھوتہ تھا۔ جرمنی کے دو جنگی جہاز گوبن اور برس لا انگریزی جہازوں کے تعاقب سے بچکر اگست ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ پہنچ گئے اور اس کے بعد ترکی اور جرمنی میں علانیہ اتحاد ہوگیا۔ فرڈی نینڈ شاہ بلگیریا بھی ۱۹۱۵ء کے موسم گرما میں ان کے ساتھ مل گیا اس کے بعد ان چاروں سلطنتوں کو کوئی حلیف نہیں ملا مگر دوسری جانب آخر وقت تک حلیفوں میں اضافہ ہوتا رہا جن میں بڑی سلطنتیں حسب ذیل تھیں:۔

اطالیہ اتحاد ثلاثہ میں آسٹریا اور جرمنی کا شریک تھا مگر یہ اتحاد کچھ بے جوڑ سا خیال کیا جاتا تھا اس لئے جب جنگ شروع ہوئی تو اطالیہ نے اعلان کردیا کہ جرمنی کے ساتھ اس کا معاہدہ دفاعی جنگوں سے متعلق ہے، اور یہ جنگ دفاعی نہیں ہے اس لئے وہ غیر جانبدار رہے گا۔ اطالیہ میں ایک عجیب ہیجان تھا۔ ایک طرف تو اطالیہ کو اپنے ان علاقوں کو جو ممالک غیر کے تحت میں تھے، آزاد کرانے کی خواہش تھی اور جرمنی کے مظالم مثلاً لوسی تانیا اور دوسرے جہازوں کا ڈبونا انھیں مشتعل کر رہا تھا۔ دوسری طرف اپنی عافیت اور مالی نقصان کا خیال تھا۔ لیکن بالآخر مئی ۱۹۱۵ء میں اطالیہ نے آسٹریا پر اعلان جنگ کردیا اور اتحادیوں کا شریک ہوگیا۔

یورپ کی بڑی سلطنتوں میں اس کے بعد رومانیا اتحادیوں کا ہم نوا ہو گیا۔ بلقان کی جنگ میں اس نے اپنی فوجی قوت کا اظہار کیا تھا۔ اسے لاطینی الاصل ہونے سے فرانس اور ممالک غرب سے ہمدردی تھی مگر اس کا شاہی خاندان۔ خاندان ہوہن زولرن کی ایک شاخ سے تھا اور اس خاندانی تعلق کا اثر اس کی پالیسی پر تھا۔ ۱۹۱۴ء میں شاہ کیارل کے انتقال سے صورت حال متغیر ہو گئی اور اگست ۱۹۱۶ء میں رومانیا نے آسٹریا پر جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس کی طویل سرحد اور وسیع ذرائع سے اتحادیوں کو بہت امید تھی مگر اس کی فوری ہزیمت سے اتنی ہی مایوسی ہوئی۔

یونان ایک عرصہ تک لیت و لعل کرتا رہا۔ یونان کی ملکہ قیصر جرمنی کی بہن تھی اور اس سلطنت پر جانبین سے سخت دباؤ پڑ رہا تھا۔ لیکن اس کا سربرآوردہ مدبر وینی زیلوس شروع ہی سے اتحادیوں کی تائید پر تھا۔ ۱۹۱۷ء میں شاہ قسطنطین سلطنت سے دست کش ہو جانے پر مجبور کیا گیا اور اس کے بعد یونان اتحادیوں کا سرگرم معاون ہو گیا۔

جنگ کے اختتام پر یورپ میں صرف سوئیڈن، ناروے، ڈین مارک، ہالینڈ اور ہسپانیہ غیر جانبدار تھے اور یورپ کے باہر بھی غیر جانبداروں کی تعداد اس سے زیادہ نہ تھی۔ شروع ہی سے ظاہر تھا کہ دنیا کے دور دراز ممالک بھی اس جنگ میں پھنس جائینگے کیونکہ جرمنی کے دشمنوں نے اس کی ان نو آبادیوں پر حملہ کر دیا جو افریقہ اور بحر الکاہل میں واقع تھیں اور چین میں اس کے جو مقبوضات تھے ان پر جاپان نے حملہ کر دیا۔ اس لئے افریقہ اور انگلستان، فرانس اور بلجیم کی نوآبادیوں اور مقبوضات کا جنگ سے تعلق ہو گیا۔ لیکن امریکہ کے دونوں براعظم عرصہ تک کینیڈا کے سوا جنگ سے علیحدہ رہے۔ کناڈا سلطنت برطانیہ کا ایک جزو تھا اور اس کی طرف سے جنگ میں شریک تھا۔ مگر جنگ کے اختتام سے قبل ممالک متحدہ بھی اس گرداب بلا میں پھنس گئے اور جنوبی امریکہ کی اکثر جمہوری سلطنتوں نے اس کی متابعت کی۔ جرمنی سے جب بالآخر صلح ہوئی تو اس پر ۲۷ سلطنتوں کی دستخطیں ثبت تھیں۔ قوموں کی یہ تعداد کثیر فوجوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ فرانس کی سرحدوں اور سڑکوں پر ہر قوم اور مذہب کی زبانیں سنائی دیتی تھیں۔ کسی سپاہی بلے

ایسی جنگ کی پیشینگوئی نہیں کی تھی۔ جس میں دنیا کے قریب قریب سب ملک شریک ہوں۔

یورپ کی تمام قوموں نے جنگ کے آغاز ہی سے، برطانیہ نے ۱۹۱۵ء کے آخر سے اور ممالک متحدہ نے جنگ میں شرکت کے زمانے سے جبری فوجی خدمت کا اصول اختیار کر لیا اور قوم کے تمام نوجوانوں کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا فوجوں کی تعداد اس لئے بمقابلہ سابق بہت زیادہ تھی اور خدا نہ کرے کہ دنیا میں پھر اس سے بڑی فوجیں وجود میں آئیں۔ جان کا نقصان مجموعی تعداد کی نسبت سے بہت زیادہ تھا کیونکہ جب جنگ دست بدست تھی اور غیر معمولی سختی کے ساتھ جاری تھی اکثر ماہرانِ فوجی کا خیال تھا کہ دست بدست جنگ اب ناممکن ہے اور سنگین (Bayonet) بھی رومی چھوٹی تلوار یا نائٹ کے زرہ کی طرح متروک ہو جائیگی۔ مگر کھلے میدان کی چند ہفتوں کی جنگ کے بعد مغربی محاذ کی فوجوں نے خندقیں کھودیں جن کا سلسلہ انگلینڈ سے سویٹزرلینڈ تک چلا گیا تھا اور ان خندقوں میں جو ایک دوسرے سے بہت کم فاصلے پر تھیں ایک تباہ کن جد وجہد ہوا ایں' زمین کے نیچے اور زمین کے اوپر جاری تھی جس میں نہ کبھی عارضی طور پر صلح ہوئی نہ لڑنے والوں نے آرام لیا اس جنگ کے متعلق اعداد وشمار پوری طور پر فراہم نہیں ہوئے ہیں اور اندازوں میں بہت اختلاف ہے۔ مگر جنگ میں پانچ کروڑ افراد شریک تھے جن میں سے ۸۰ لاکھ غالباً کام آئے اور زخمیوں کی تعداد غالباً ان سے چوگنی ہوگی۔ یعنی یورپ کے نوجوانوں کی ایک نسل ضائع ہوگئی جو آج اگر زندہ ہوتے تو یورپ کے مدبر مذہبی پیشوا اور ماہران فنون لطیفہ وسائنس ہوتے۔

سائنس اپنے عالم طفولیت سے سپاہی کی معاون ہے مگر اس معاونت کی ہولناک تکمیل اس جنگ میں ہوئی۔ مختلف ممالک کی کشمکش کا سلسلہ نہ صرف خندقوں میں جاری تھا بلکہ سائنس کے معملوں (Heleorstories) اور انجینیرنگ کے کارخانوں میں بھی اسلحہ اور طریقہ جنگ کے لحاظ سے اس جنگ کو نپولین کی جنگوں سے وہی نسبت تھی جو اس کی جنگوں کو جولیس قیصر کی جنگوں سے تھی۔ گزشتہ صدی میں سائنس نے قدرت کے اکثر رازہائے سربستہ معلوم کر لیئے تھے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں
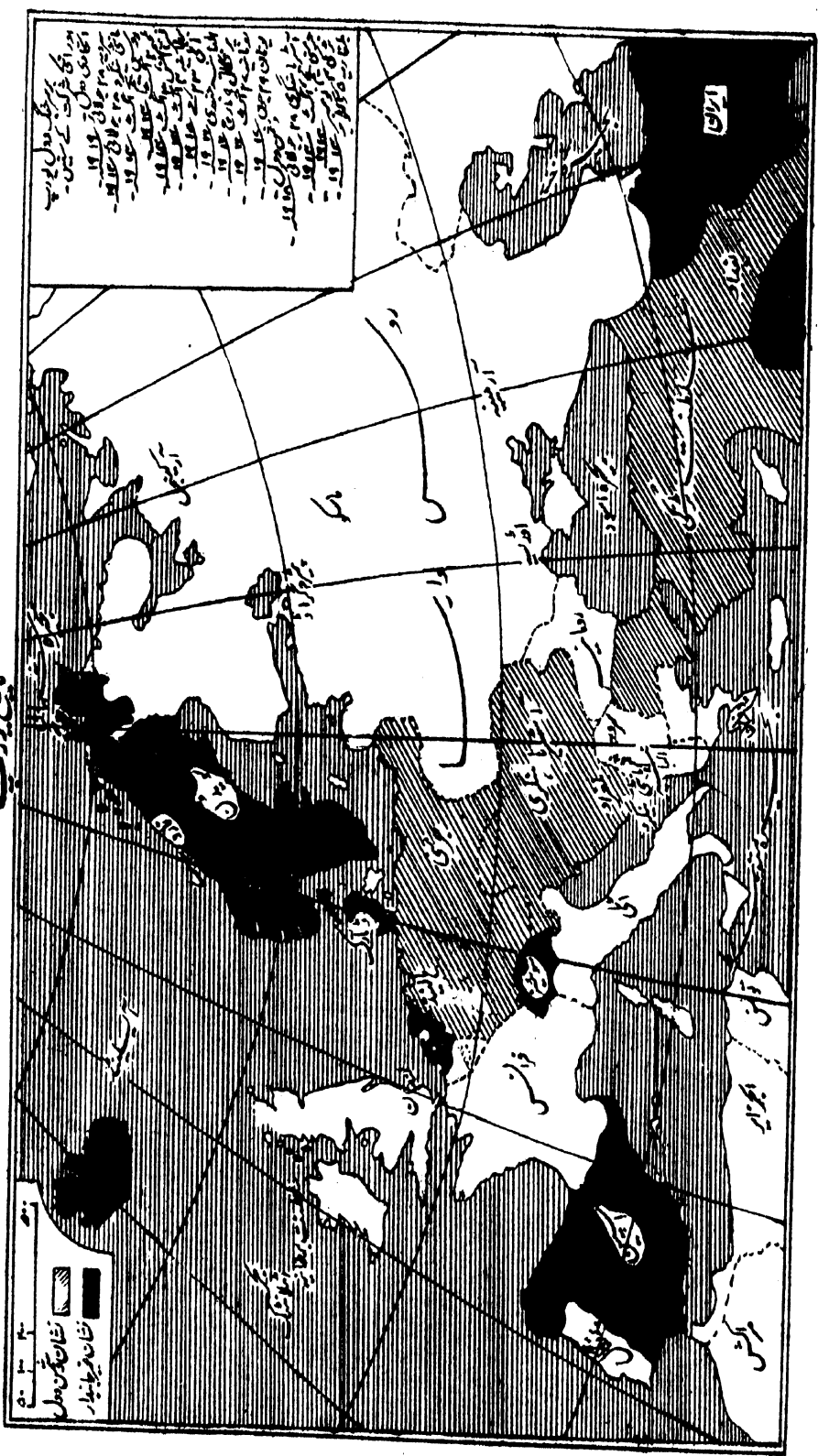
بنی نوع انسان اس کی ایجادوں کے شکار ہوئے۔ جنگ سے قبل ہی ظاہر تھا کہ بعض ایجادوں سے سپاہ کو خاص نفع ہوگا۔ زیر آب کشتیاں ہر ایک بحریہ میں موجود تھیں ہوائی جہاز اور زیپ لن غبارے حال ہی میں ایجاد ہوئے تھے اور اس کا مفید ہونا ثابت نہیں ہوا تھا مگر جنگ کے معرکوں اور اس کے نتائج پران دونوں کا اثر بہت ہوا۔ جنگ کے شروع ہونے کے بعد ہر ملک کے موجد حملہ یا دفاع کی نئی تدبیریں سوچنے لگے زہر بھری ہوائیں اور آتش رقیق کا استعمال پہلے جرمنی نے کیا۔ اور اس کے بعد تمام مبارزین نے اس کا استعمال شروع کر دیا۔ ستمبر ۱۹۱۵ء میں سے انگریزی فوجوں میں زرہ پوش موٹروں سے کام لیا گیا جن میں کلدار توپیں رکھی جاتی ہیں اور جو دشمن کی خندقیں عبور کر سکتی تھیں۔ یہ موٹریں ٹینک کے نام سے موسوم ہوئیں۔ جرمن جنرلوں نے تسلیم کر لیا کہ یہی موٹریں ان کی شکست کا باعث ہوئیں۔ ٹینک، ہوائی جہاز، زیپ لین اور زیر آب کشتیوں کا دارومدار اندرونی تحریق کے انجن پر ہے جس کے بغیر یہ جنگ ناممکن تھی۔ اس زمانے میں لشکر گاہوں کے حفظان صحت، امراض کے روکنے اور زخموں کے اندمال کے متعلق سائنس کی امداد قابل قدر ہے مگر سائنس ہی کی بدولت ایسے آلات حرب ایجاد ہوئے جن سے لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں۔ جنگ کے اس پہلو پر عرصہ تک غور و خوض ہوگا۔ عدالت انسانی میں سائنس کی حیثیت اس وقت ایک ملزم کی ہے۔

اس کے قبل کوئی جنگ ایسی نہیں ہوئی ہے جس میں عامۂ قوم پر سخت بار پڑا ہو۔ مگر اس جنگ میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جسے جنگ سے تعلق نہ ہو۔ اولاً خیال تھا کہ یہ جنگ چند روزہ ہوگی کیونکہ میدان جنگ میں بڑی بڑی فوجیں لے جانا تو آسان تھا۔ مگر انھیں کھلانا دشوار تھا۔ اس لئے خیال تھا کہ مبارزین کی معاشی خستگی سے جنگ جلد ختم ہو جائیگی۔ مگر موجودہ سلطنتوں کے ذرائع دیرپا ثابت ہوئے۔ عورتوں سے غیر معمولی خدمات لی گئیں اور برطانیہ میں اس کے صلہ میں انھیں حق رائے دہندگی عطا ہوا۔ عورتوں کے لباس اور طریقۂ زندگی بالکل بدل گئے۔ ٹریم گاڑیوں، ڈاکخانوں، دفاتر، اسلحہ کے کارخانوں کا کام بالکلیہ عورتوں سے متعلق ہو گیا اور زراعت میں بھی انھیں دخل ہو گیا۔ جنگ کے آخر میں جب

ہر ملک میں قحط پڑ گیا یا اس کا اندیشہ ہو گیا تو ہر شخص رضا و رغبت سے یا زبردستی مبارزین کی صفوں میں داخل ہو گیا اور کم خوراکی حب وطن کا جزو ہو گئی۔ برطانیہ اور اس کے حلیفوں کو تو صرف کچھ دقت ہوئی مگر وسطی سلطنتوں کی حالت قحط سے بہت بری ہو گئی۔

بہ لحاظ عظمت و طریقۂ کار اس جنگ کی کوئی نظیر نہیں مگر اس کے اصولی مقاصد وہی تھے جو یورپ کی سابقہ چار صدیوں کی جنگوں کے تھے یعنی یہ جنگ بھی توازن قوت کے بقا کے لئے لڑی گئی۔ جب حق کا احساس نہ ہو اور کوئی قوت اعلائے حق کے لئے موجود نہ ہو، افراد قدرتاً گروہوں میں مجتمع ہوتے ہیں، تاکہ زبردست اپنے آپ کو زبردست کی دست برد سے محفوظ رکھ سکیں۔ سلطنتوں میں توازن قوت کا رجحان اسی وجہ سے ہے۔ سلطنت روما جب یورپ پر چھائی ہوئی تھی۔ کسی توازن قوت کی ضرورت نہ تھی قرون وسطیٰ میں بھی اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ کلیسۂ کاتھولیکی اور مقدس شہنشاہت روما سے یورپ کی وحدت کا تخیل باقی تھا جس کی بنا حق اور انصاف کے بعض اصول پر تھی۔ لیکن سولھویں صدی کے بعد سے یورپی ممالک کے یہ باہمی تعلقات ضعیف ہونے لگے، قومی انانیت ہر سلطنت پر چھا گئی اور گزشتہ چار صدیوں میں ایک جد و جہد برابر جاری تھی جس میں کوئی ایک سلطنت ہسپانیہ یا فرانس یا آسٹریا یا پرشیا یا برطانیہ اپنے ہمسروں کی آزادی بلکہ وجود کے درپے تھی مگر دوسری سلطنتیں اس زبردست سلطنت کے خلاف متحد ہو جاتیں اور بالآخر اسے نیچا دکھاتیں۔ آسٹریا اور ہسپانیہ کی متحد قوت اپنے رقیبوں سے ایک سو سال سے زیادہ تک دست بگریباں تھی۔ لوئی چہاردہم کا زوال چالیس سال کے بعد ہوا۔ برطانیہ کو امریکا کی آزادی کی جنگ کے بعد اپنے دشمنوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ نپولین کا غلبہ یورپ میں بیس سال تک تھا اور پرشیا کی دھاک یورپ میں ۱۸۷۱ء سے ۱۹۱۸ء تک تھی۔ توازن قوت کا اصول ذاتی تحفظ کی خواہش پر مبنی ہے، اس لئے اس پر نفرین کرنا فضول ہے۔ بنی نوع انسان میں سلطنتوں کے قیام سے یہ خیال دفع ہوا، اسی طرح جب دنیا میں امن و امان ہو جائے گا تو مجلس اقوام کے وجود سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ جو قومیں اس میں شامل ہیں اپنے سے زبردست قوم کو اپنا دشمن نہ خیال کریں گی

اور اپنی ذاتی حفاظت کے لئے اس کے خلاف ایکا نہ کرینگی۔

(۲)

جنگ کو بخوبی ذہن نشین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم عالم خیال میں کسی ایک ایسے بلند مقام پر چڑھ جائیں جہاں سے ہم جنگ کے تمام محاذ دیکھ سکیں خصوصاً جو یورپ اور مغربی ایشیا میں واقع تھے۔ جنگ پر اس بلندی سے نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ دول وسطی ایک طولانی محاصرہ میں مبتلا ہیں اور دشمن کے خطوط محاصرہ توڑ کر نکل جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں انھیں کامیابی ہوگی۔ اس کے بعد مشرق میں عارضی طور سے انھیں کامیابی ہوتی ہے۔ مگر اس اثنا میں محاصرہ کن دشمن کی قوت بڑھتی جاتی ہے اور محصورین کو کہیں سے اعانت نہیں ملتی۔ مغرب میں محاصرہ توڑ کر بھاگ نکلنے کی کوشش ہوتی ہے اور بظاہر کامیابی ہوتی ہے مگر ان کے لاکھوں سپاہی کام آتے ہیں۔ دشمن پھر حملہ کرتا ہے اور دول وسطیٰ مجبوراً ہتھیار ڈال دیتی ہیں۔

مغرب میں انگریزی اور اتحادی بیڑوں اور انگریزی اور فرانسیسی فوجوں نے ناکہ بندی کر دی تھی۔ جنوب میں اطالیہ تھا اور مشرق میں روس اور ریاست ہائے بلقان۔ آسٹریا اور جرمنی مغربی اور جنوبی خطوط کبھی توڑ نہ سکے مشرق میں البتہ روسیوں رومانیوں اور سربیوں کے مقابلہ پر انھیں شاندار فتوحات حاصل ہوئیں اور مصر پر بھی انھوں نے دھاوا کر دیا۔ مگر یہ کافی نہ تھا کیونکہ مغربی اور جنوبی خطوط حسب حال رہے۔ اس کے بعد امریکا سرگرمی کے ساتھ اتحادیوں کا شریک ہو گیا اور انھیں پوری مالی امداد دی امریکا کی پوری فوج کے آنے کے قبل ہی اتحادی فوجوں نے آسٹریا اور جرمنی کو پسپا کر دیا اور انھیں اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔

وضاحت کے لئے اہم واقعات جنگ بیان کر دینا مناسب ہوگا جو حسب ذیل تھے (۱) جرمنوں نے پہلے دھاوا کیا کہ ایک ہی وار میں جنگ ختم کر دیں جیسے کہ انھوں نے آسٹریا کی جنگ ۱۸۶۶ء میں ختم کی تھی اور فرانس کی جنگ ۱۸۷۰ء میں مگر ۱۹۱۴ء میں انھیں ناکامی ہوئی (۲) چار سال تک مغربی محاذ پر دونوں فوجیں برابر لڑتی رہیں بے شمار لڑائیاں ہوئیں اور لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں۔ روس کو اسی اثنا میں شکست ہوئی اور انقلاب حکومت کے بعد اس نے برسٹ لیٹوسک میں مارچ ۱۹۱۸ء میں ہتھیار ڈال دئے

(۲۳) ممالک متحدہ نے مارچ ۱۹۱۵ء میں جنگ کا اعلان کیا۔(۲۴) مارچ ۱۹۱۵ء میں جرمنی فوجوں نے مغرب میں زبردست حملہ کیا جس سے ان کی کامیابی کی امید تھی (۲۵) لیکن جولائی میں اتحادیوں کے دوبارہ حملے نے بالکل کایا پلٹ کردیا اور بالآخر ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو عارضی طور پر صلح ہوگئی (۲۶) ان سب واقعات کے علاوہ انگریزی اور اتحادی بحری فوجوں کا دباؤ اور جو کنا پن تھا۔ اس جنگ سے پھر ثابت ہوگیا کہ جو فوجیں سمندر سے دور رہوں انکے لئے بھی بحری قوت ضروری ہے۔

(۳)

جرمنی حکومت اور قوم کو کامیابی کی قوی امید تھی لیکن انھیں خوب معلوم تھا کہ یہ مہم نہایت دشوار ہے۔ فرانس کی مشرقی سرحد قلعوں کی تعمیر سے مستحکم کردی گئی تھی اس لئے اس پر حملہ کرنے سے عاجلانہ فتح کی امید نہ ہوسکتی تھی۔ جرمنی نے اس وقت کی وجہ سے بلجیم کی راہ سے حملہ آور ہونے کا تہیہ کرلیا حالانکہ بلجیم پوری طور سے غیر جانب داری پر قائم تھا اور جرمنی نے خود اس کی غیر جانب داری قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ جرمنی کا خیال تھا کہ اگر بلجیم نے اپنے علاقوں سے جرمن فوج گزرنے دی تو فرانس پر ایک ایسا وار ہوسکتا تھا جو ۱۸۷۰ء کے حملے سے بھی زیادہ کاری ثابت ہوتا اور اس کے بعد جرمنی اپنے مشرقی دشمنوں سے نپٹ سکتا تھا۔ بیتھمن ہال ویگ نے خود تسلیم کیا ہے کہ بلجیم میں جرمنی کا داخل ہونا قانون بین الاقوامی کے بالکل خلاف تھا مگر جنگ کے مصالح کے لحاظ سے ضروری تھا اس لئے جرمن فوجیں فتح کی راہ نکالنے کے لئے بلجیم میں داخل ہوگئیں۔

بلجیم کی مہم میں جرمنی کو شروع ہی سے مایوسیوں کا سامنا ہوا اور اسی وجہ سے بالآخر اس کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ بلجیم سی چھوٹی سی سلطنت سے مقاومت کی امید نہ ہوسکتی تھی مگر خلاف امید بلجیم نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور جرمنی کے وعدوں اور دھمکیوں کی مطلق پروا نہ کی جس سے صفحات تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا لیئج نے کئی روز تک اطاعت قبول نہ کی جس سے اتحادیوں کو اپنی تیاریاں مکمل کرنے کا موقع مل گیا۔ جرمن بالآخر اس شہر کی تسخیر کے لئے بڑی بڑی قلعہ شکن توپیں لائے اور شہر والوں کو بے رحمی اور ظلم سے اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اسکا یہ فعل بین الاقوامی معاہدوں کے بالکل خلاف تھا اور مہذب ملکوں کی جنگ میں اسکی

کوئی نظیر نہ تھی مگر بیلجیم کا استقلال غضب کا تھا۔ فرانس اور انگلستان سے اس نے امداد
چاہی جو اس کی غیر جانبداری کے ضامن تھے اور جرمنی سے لڑنے کیلئے پوری طور سے تیار ہو گیا۔
اس کی فوجوں کو متواتر ہزیمت ہوئی اور تمام بڑے شہر اسکے قبضہ سے نکل گئے مگر ساحل
پر ایک ذرا سا قطعہ آخر تک اس کے قبضہ میں تھا۔ چار سال کے بعد اسے فتح نصیب
ہوئی اور بہادری اور استقلال کا اسے صلہ مل گیا۔

بیلجیم کی مقاومت سے نہ صرف جرمنی کا نظام عمل درہم برہم ہو گیا مگر اس
ملک کی غیر جانبداری کی خلاف ورزی سے انگلستان کی مداخلت ناگزیر ہو گئی۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں
پرشیا کو لارڈ اس ٹین لی نے متنبہ کر دیا تھا کہ اگر وہ چاہتا ہے کہ برطانیہ غیر جانبدار
رہے تو بیلجیم کو ہاتھ نہ لگائے۔ اس لئے عزت اور قومی مفاد کا تقاضا یہی تھا
کہ انگلستان فرانس کا ہم نوا ہو جائے۔ انگلستان میں اس وقت لبرل پارٹی برسر حکومت
تھی۔ ایسکوئیتھ وزیر اعظم تھے، لائیڈ جارج وزیر مالیہ اور سر ایڈورڈ گرے وزیر خارجہ
تھے۔ کنسرویٹو پارٹی بھی ان کی ہم خیال تھی۔ اس لئے ایک برطانی مہم فرانس روانہ
کی گئی۔ فرانس کے صدر جمہوریہ پوان کارے اور وزیر اعظم وویانی نے اس کا خیر مقدم
کیا۔ دونوں ملکوں کی جنگی شراکت کا یہی آغاز تھا جو چار سال کی جنگ میں برابر قائم
رہی اور امید ہے کہ اس شراکت سے دونوں قوموں میں ایک دائمی سمجھوتے کی بنیاد پڑ جائیگی۔

مگر اس وقت جرمنی کا سیلاب کوئی چیز نہ روک سکتی تھی۔ لیژ کے بعد نامور کا سقوط
عمل میں آیا جس سے سخت مایوسی ہوئی۔ شارل روائی فرانس کو سخت شکست ہوئی اور انگریزی
فوج بھی گھر گئی ہوتی مگر مون سے عاجلانہ رجعت کرکے بچ گئی۔ جرمن سواد پیرس سے
بارہ میل تک پہنچ گئے تھے۔ اس کے سقوط کا اندیشہ تھا اس لئے مرکز حکومت بورڈو
منتقل کر دیا گیا۔ جنگ کا یہ تاریک ترین زمانہ تھا گو اس جنگ میں اس قسم کے مایوس
کن واقعات اور بھی ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے بعد قسمت نے پلٹا کھایا جس کی وجہ
یہ تھی کہ جرمن سپہ سالاروں کو اپنی قوت کا زعم ہو گیا تھا جو ان کے حق میں مضر
ثابت ہوا، برخلاف اس کے فرانسیسیوں کی بہادری سرگرمی اور قوت تنظیم میں کوئی
فرق نہ آیا تھا۔ فان کلک مغرب سے مشرق کی طرف بڑھا تاکہ فرانس کی فوج کو
گھیر لے۔ مگر اس سے فرانسیسیوں کو عقب سے حملہ کرنے کا موقعہ ملگیا اور جنرل ژوفر نے اس

موقع سے خوب نفع اٹھایا۔ جرمنی فوج کو عقب سے حملہ کا اندیشہ تھا اس لئے انہوں کے عظیم انسانی سلسلہ کے بعد جو جنگ مارن کے نام سے مشہور ہے، اسے پورے حصار پر پیچھے ہٹنا پڑا۔ فرانس کا بہت سا علاقہ اس طرح حملہ آور کے قبضہ سے نکل گیا۔ جنگ کے بعد اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑائی میں فرانس کو قطعی کامیابی ہوئی۔ جرمنی کو امید تھی کہ موسم بہار میں اسے فتح حاصل ہو گی۔ اگر یہ کامیابی اسے حاصل ہوتی تو فرانس اور انگلستان کی حالت ایسی ردی ہو جاتی کہ وہ کارگر طریقہ پر جنگ جاری نہ رکھ سکتے۔ جرمنی کو کامیابی کا کبھی ایسا کوئی موقع نہیں ملا۔

مگر اس کے بعد اتحادیوں کو بھی مایوسیاں ہوئیں۔ جرمنوں نے اطمینان کے ساتھ بحیثیت انتشار کی اور مستحکم مقامات پر جا کر دم لیا جو پہلے ہی سے تیار رکھے تھے۔ اتحادیوں کو امید تھی کہ وہ بے ترتیب بھاگیں گے اور ان کی فوجیں جرمن فوجوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ جائینگی۔ اس کے بعد دونوں فوجوں نے خندقیں کھودلیں جو سمندر سے کوہ آلپ تک چلی گئی تھیں۔ ان خندقوں میں لاکھوں آدمی چار سال تک ایسی تکلیفیں سہتے رہے جن کا برداشت کرنا انسان کی قوت سے باہر تھا۔

روسیوں کو اسی زمانے میں ایک شکست فاش ہوئی تھی جس کا معاوضہ مارن کی فتح سے ہو گیا۔ روس کی فوج سے بہت امیدیں وابستہ تھیں اور خیال تھا کہ جنگ جاپان کی ہزیمتوں کے بعد اس فوج کی از سر نو تنظیم ہوئی ہے۔ یہ افواہ بھی اس زمانہ میں مشہور تھی کہ روسی سپاہ انگلستان سے گزرتی ہوئی فرانس پہنچ رہی ہے۔ مگر واقعات در اصل اس قدر حوصلہ افزا نہ تھے۔ ایک روسی فوج پرشیا کے مشرقی صوبوں پر حملہ آور ہوئی اور اسے اہم فتوحات حاصل ہوئیں۔ مگر ۲۶ اگست ۱۹۱۴ء کو ایک جرمن فوج نے ہنڈن برگ کے زیر کمان روسیوں پر حملہ کر کے انہیں سخت شکست دی۔ اس طرح مشرقی اور مغربی محاذ کے خصائص نمایاں ہو گئے یعنی مغرب میں اتحادیوں نے نہایت استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر ظفریاب ہوئے مگر مشرق میں روس کو عارضی فتوحات حاصل ہوئیں اور بالآخر تباہی اس کے حصے میں آئی۔

(۴)

ستمبر ۱۹۱۴ء سے مارچ ۱۹۱۸ء تک جنگ نہایت سختی کے ساتھ جاری تھی ہر فریق

اپنی فتح کا دعویدار تھا۔ جرمنی کا دعوے ہمیشہ یہی تھا کہ خزاں کے قبل قطعی فتح حاصل ہوگی۔ اتحادیوں کو ہمیشہ یہ امید رہتی کہ وہ جرمن فوجوں کو چیر کر آگے بڑھ جائینگے اور جرمنی پاش پاش ہو جائیگا۔ مغربی محاذ پر اور اطالیہ کے محاذ پر اس وقت کثیر التعداد فوجیں تھیں اور تمام قوموں کی نگاہیں انھیں پر لگی ہوئی تھیں۔ مگر فریقین کی انتہائی کوششوں کے باوجود لاکھوں سپاہیوں کے خون بہانے سے کوئی قطعی نتیجہ نہ ہوا۔ مشرق میں کبھی فتح ہوتی اور کبھی شکست اور جرمنی کی امیدیں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔

سب سے پہلے بحری جنگ پر نظر ڈالنی چاہئے۔ اگر بحری جنگ میں اتحادیوں کو شکست ہوتی تو امریکا سے رسد اور سامان جنگ کا آنا بند ہو جاتا۔ برطانیہ اور اس کی نوآبادیوں کو قطعی ہزیمت ہوتی اور فرانس اور اطالیہ کے باشندے بھوکوں مر جاتے۔ بحری جنگ کا مختصر قصہ حسب ذیل ہے۔ جرمنوں کو عارضی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ان کے بعض جہازوں نے اتحادیوں کی تجارت میں خلل ڈالا اور ان کی زیر دوز کشتیوں نے اپنی بہادری اور جانبازی کا ثبوت دیا۔ مگر اتحادیوں کے بیڑوں کا تفوق آخر تک باقی تھا اور جرمن اس کا بال بیکا نہ کرسکے۔ دسمبر ۱۹۱۴ء میں امیر البحر اسٹرڈی نے جزائر فاک لینڈ میں ایک جرمنی بیڑہ تباہ کر دیا جس نے ایک چھوٹے سے انگریزی بیڑے کو شکست دی تھی۔ مئی ۱۹۱۶ء میں جرمنی کا بیڑہ ہمت کرکے کیل کی نہر سے نکلا اور جٹ لینڈ کے قریب امیر البحر بیٹی اور انگریزی بیڑے کے مقدمۃ الجیش سے اس کا مقابلہ ہوا۔ جرمنوں کو سخت نقصان کے ساتھ اس نے شکست دی مگر اس کا بھی نقصان ہوا۔ لیکن جب جی لی کو اصل بیڑے کے ساتھ پہنچا تو جرمن بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے پھر اتحادیوں کی بحری قوت سے دوچار ہونے کی کوشش نہیں کی اور ان کا انحصار صرف آب دوز کشتیوں پر رہ گیا۔ جرمنی کی پوری ناکہ بندی کر دی گئی اور ۱۹۱۶ء سے رسد اور بعض اشیا خوردنی کی کمی اسے محسوس ہونے لگی۔

فرانس اور بلجیم میں جو جنگ ہو رہی تھی اس کی طرف اب توجہ زیادہ تھی۔ بیسیوں سخت لڑائیاں اس محاذ پر ہوئیں جن میں سپاہیوں کی تعداد واٹرلو سے زیادہ تھی مگر ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوا کہ خط جنگ کبھی ادھر ہٹا کبھی ادھر۔ البتہ یہ حقیقت

مجموعی اتحادیوں کا پلّہ بھاری تھا۔ یہ حالت مارچ ۱۹۱۸ء کی عظیم الشان جرمن پیش قدمی تک قائم تھی۔ اس میں قتل عام کے ان تمام طریقوں سے کام لیا گیا جو فراست انسانی ایجاد کر سکتی تھی مثلاً زہریلی گیس اور آتش رقیق، سرنگ، غبارے، ہوائی جہاز، اور توپیں جن کی زد کئی میل کی تھی۔ غرض جدید اسلحہ جنگ میں سے کوئی باقی نہ تھا۔ سردی اور نمی سے دونوں فوجوں کے مصائب میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا جن کو جانبین نے عجیب و غریب صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ اس محاذ پر جو عظیم الشان لڑائیاں ہوئیں، انکا ذکر ہم صرف سرسری طور پر کرسکتے ہیں۔

بلجیم کی فوج اس خط پر تھی جو ساحل سے قریب ترین تھا۔ اس کے بعد برطانی فوج تھی جس کا سپہ سالار سر جان فرینچ تھا اور اس کے بعد سر ڈگلس ہیگ۔ جنگ کا مرکز ایپرے تھا۔ یہ قرون وسطے کا ایک خوبصورت شہر تھا۔ اس کا گرجا نہایت نفیس تھا۔ متعدد نفیس عمارتیں تھیں مگر اب کھنڈروں کا ایک ڈھیر ہے۔ مغربی محاذ پر اکثر شہروں اور دیہات کا یہی حشر ہوا۔ اگر جرمن اتحادیوں کی صفیں چیر کر نکل جاتے تو ممکن تھا کہ بحیرۂ انگریز کے بندرگاہوں پر قبضہ کرلیتے۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں بھی انھوں نے اسی غرض سے ایک زبردست حملہ کیا تھا مگر اتحادیوں نے بڑی دقت سے انھیں پسپا کر دیا۔ اپریل ۱۹۱۵ء میں انھوں نے پھر حملہ کیا اور زہر بھری ہوائیں انگریزوں کے مقابلہ میں پہلی مرتبہ استعمال کیا جس سے انگریزی خط ٹوٹ گیا۔ مگر ایپرے سے گزرنا جرمنی کے لیے محال ثابت ہوا۔ ایپرے کی تیسری جنگ میں انگریز خود حملہ آور ہوئے۔ جولائی سے نومبر ۱۹۱۷ء تک اس شہر کے کھنڈروں کے آس پاس جنگ ہوتی رہی۔ جرمن کچھ پیچھے ہٹے اور ان کے کئی ہزار سپاہی قید ہوگئے۔ انگریزوں کے قدم پاسین ڈیل کی پہاڑی پر جم گئے۔ جرمن سپہ سالاروں کی ہمت ٹوٹ گئی مگر انگریزوں کا بھی سخت نقصان ہوا اور سر ڈگلس ہیگ نے، بعد میں اقرار کیا کہ ان معرکوں سے اس کی فوجیں خستہ حال ہوگئی تھیں اور انھیں کوئی تقویت نہیں پہنچی۔

اس کے بعد جنگ کا بڑا مرکز آرا تھا اور اس کے متصل علاقے جو سوم ندی کے بالائی حصہ پر واقع ہیں۔ یہیں جولائی ۱۹۱۶ء میں سوم کی عظیم الشان جنگ ہوئی۔
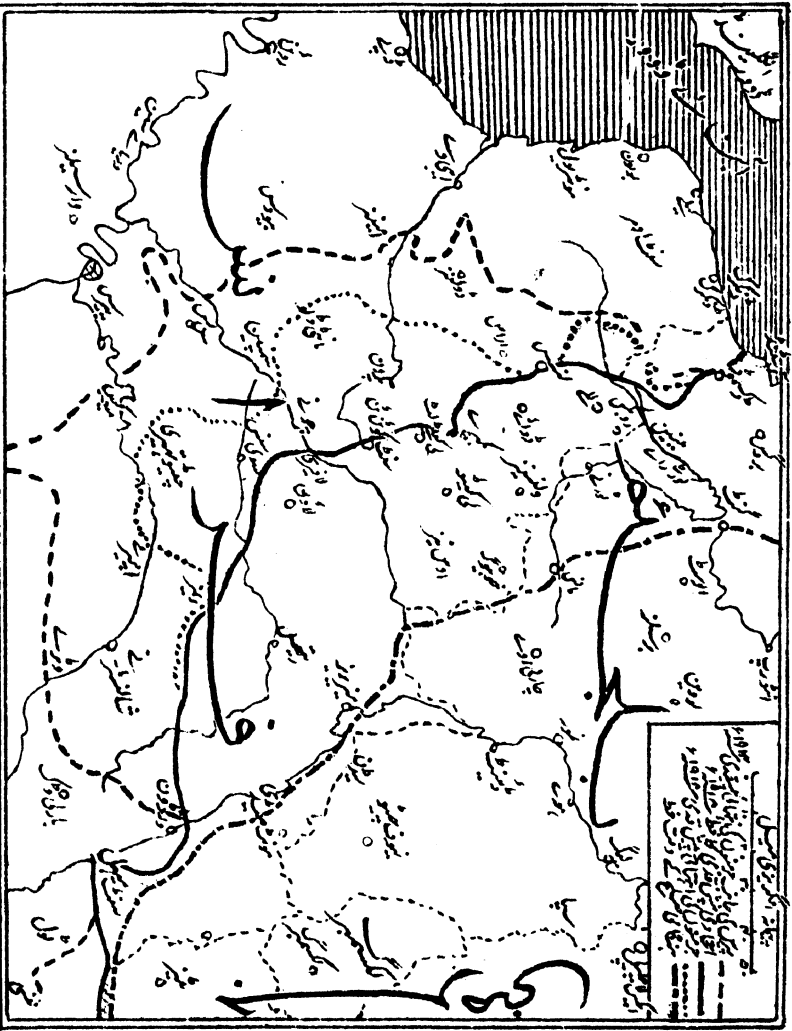
لڑائی کے عرصہ تک جاری رہنے کے بعد جرمن خط بہت دور تک پیچھے ہٹا دیا گیا۔ اتحادیوں کو مایوسی تو ہوئی کہ یہ فتح عالم خواہ نہ تھی مگر فی الحقیقت اس فتح سے فرانسیسیوں پر و بیرڈون میں جو دباؤ تھا وہ کم ہو گیا۔

جنوب و مشرق میں ریمز یا فرانسیسیوں کی گرفت کبھی کمزور نہیں ہوئی۔ اس شہر پر جرمنوں نے نہایت بے رحمی سے گولے برسائے اور اس کے بڑے گرجے کو سخت نقصان پہنچایا جو یورپ کے فنون لطیفہ کا ایک بے نظیر نمونہ ہے۔ ریمز کے قریب جنگ عرصہ تک جاری تھی۔ یہ دوسرا فرانسیسی حصن حصین ہے جو ہماری توجہ کے قابل ہے۔

ویردون مزندی پر واقع ہے اور پیرس کی طرف جو سڑکیں گئی ہیں ان میں سے سب سے اہم اس کی زد میں تھی اسی لئے حملہ آوروں اور محافظوں دونوں نے اس پر اپنا پورا زور لگا دیا۔ جرمنی کا سپہ سالار اس کا ولی عہد تھا اور محافظین یعنی فرانس کا سپہ سالار جنرل پے تین تھا۔ ویردون کے نواح میں جو جنگ ہوئی اس میں جنگ کے تمام مصائب اور شجاعت کے تمام اقسام موجود ہیں اور فرانس کی تاریخ کا یہ ایک باب ہے جس پر اسے ہمیشہ ناز رہیگا۔ جدوجہد کا سلسلہ کئی مرتبہ شروع ہوا اور ختم ہوا فروری ۱۹۱۶ء سے ستمبر ۱۹۱۷ء تک اس مقام پر چار لڑائیاں ہوئیں۔ کئی مرتبہ اس کے سقوط کا اندیشہ ہوا مگر فرانسیسی خط ٹوٹنے نہیں پایا گو کئی مرتبہ پیچھے ہٹا۔ اگست ۱۹۱۷ء میں فرانسیسیوں نے حملہ کر کے کھویا ہوا علاقہ واپس لے لیا۔ ایپرے کی طرح ویردون بھی جرمنی کی امیدوں کا مدفن ثابت ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لڑائیوں کا مجموعی نتیجہ جرمنی کے موافق نہ تھا۔ مارچ ۱۹۱۷ء میں انھوں نے اس خط کی طرف رجعت کی جو "ہنڈن برگ" کے نام سے موسوم ہے اور جسے وہ عرصہ سے تیار کر رہے تھے۔ رجعت بہت ہوشیاری اور بغیر کسی نقصان کے عمل میں آئی جس سے اتحادیوں کو پریشانی ہوئی۔ جنرل نےول نے اپریل ۱۹۱۷ء میں ایک زبردست حملہ کی تجویز کی جس سے قطعی نتائج کی امید تھی۔ اس میں کچھ خفیف سی کامیابی ہوئی مگر نقصان بہت زیادہ ہوا جسے فرانس کی آبادی برداشت نہ کر سکتی تھی کیونکہ اس کی تعداد پہلے ہی سے بہت کم ہو گئی تھی لیکن اگر جنگ صرف مغربی

محاذ پر ہوتی تو سال آئندہ بس کے ختم ہو جانے کی امید ہو سکتی تھی۔ روسی محاذ سے پریشان کن خبریں آ رہی تھیں اور اسی کا اب ہم ذکر کریں گے۔

(۵) مشرقی محاذ

زمانہ جنگ میں روس کی تاریخ لکھنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ امید و بیم، مایوسی اور منافرت، ایسے اسباب تھے جن سے سلسلۂ واقعات غیر صحیح معلوم ہوتا ہے تاہم اس عجیب و غریب قصہ کے اہم واقعات ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:۔

مارن کی جنگ سے مغرب میں جرمنی کی پیش قدمی رک گئی تھی مگر ٹینن برگ کی فتح کو جرمن اس کا نعم البدل خیال کرتے تھے۔ روسی فوج کو جرمنی کی اس فتح سے زخم کاری لگا مگر اس کے بعد ایک سال تک اسکی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔ روسی گیالیشیا میں دور تک پہنچ گئے اور وہاں کے بعض باشندوں نے انکا خیر مقدم کیا۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں لیم برگ پر انکا قبضہ ہو گیا جو ایک بڑا شہر ہے۔ یہ امید ہو چلی تھی کہ روسی عنقریب کراکاؤ میں داخل ہو جائینگے مگر پرزیمسل کا زبردست قلعہ انکا سد راہ تھا۔ یہ قلعہ مارچ ۱۹۱۵ء میں فتح ہوا جب کہ ایک لاکھ آسٹریوں نے ہتھیار ڈال دیے جس سے قوی امید ہو گئی کہ روسی کارپاتھیا کے پہاڑوں کو طے کر کے ہنگری پر حملہ آور ہوں گے۔ مگر اس جنگ میں روس سے کوئی امید پوری نہیں ہوئی۔ مشرق میں مغرب کی سپاہی کے مماثل کوئی چیز نہ تھی۔ روس کی گزشتہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ امید نہ ہو سکتی تھی کہ اس میں وہ تنظیمی قابلیت، قوت مقاومت اور سائنس سے کام لینے کی اہلیت ہو گی جن کی اس عظیم الشان جنگ میں کامیابی کے لیے سخت ضرورت تھی۔ محض شجاعت یا برداشت کی قوت سے اس جنگ میں کوئی نفع نہ تھا۔ اگر روسی اپنے محاذ پر جمے رہتے تو جرمنی کی شکست قطعی تھی۔ جرمنی نے ایک زبردست حملے کی تیاری کی اور میکنسن کے تحت میں بڑی بڑی فوجیں جمع کی گئیں جو جرمن قایدین میں فوجی شہرت کے لحاظ سے لیوڈاین ڈارف اور ہنڈن برگ کا ہم پلہ تھا۔ اس نے روسی خط کو چیر دیا جس سے روسیوں کو پری زیمسل، لیم برگ اور وارسا کا تخلیہ کر دینا پڑا۔ روسی

فوجیں ڈیوک اعظم نکولاس کے زیر کمان ترتیب کے ساتھ پسپا ہوئیں لیکن اگست ۱۹۱۵ میں جرمنی کا قبضہ بڑے بڑے علاقوں پر ہو گیا جن میں پولینڈ، لتھوانیا اور کورلینڈ شامل تھے۔

مگر اس ناکامی کے باوجود ۱۹۱۶ء میں روسی فتح کا امکان بہت کچھ تھا۔ اسلحہ اور گولی بارود کی مقدار کثیر آرچ اینجل پہنچ گئی اور وہاں سے مختلف روسی فوجوں میں یہ اسلحہ تقسیم ہو رہے تھے۔ فوجوں کی تعداد کو پورا کرنے اور ان کی از سر نو تنظیم کے بعد بروسی لاف نے اہل آسٹریا پر دول ہی نیا اور بکووینا میں حملہ کر دیا۔ روز خبریں آتی تھیں کہ آج یہ شہر فتح ہوا کل وہ علاقہ فتح ہوا دشمن کے ہزاروں سپاہی گرفتار ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ بکووینا فتح ہو گیا۔ اور قیدیوں کی تعداد چار لاکھ بیان کی جاتی تھی مگر ان میں سے اکثر ایسے ہوں گے جنھوں نے اپنی مرضی سے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ مگر اس وقت یہ بات کسی کو نہ سوجھی اور بروسی لاف سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ ان فتوحات کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہوا کہ رومانیا جو اب تک متزلزل تھا اتحادیوں کا شریک ہو گیا جس سے انھیں کامیابی کی پوری امید ہو گئی کیونکہ ایک جدید اور طویل محاذ وجود میں آگیا تھا اور جرمنی اور آسٹریا کی فوجیں اپنے موجودہ خط کی حفاظت نہ کر سکتی تھیں اب اور مشکل میں پڑ جائیں گی۔ اتحادیوں کو یقین کامل تھا کہ جنگ عنقریب ختم ہو جائے گی۔

اتحادیوں کو جنگ میں جو مایوسیاں ہوئیں ان میں یہ سب سے زیادہ تلخ تھی۔ کسی نہ کسی روز ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ اس محاذ پر اتحادیوں کو ناکامی کس حد تک میکنسین کی بہادری اور خوبی تنظیم سے ہوئی اور کس حد تک روس کی خستہ حالی، سیاسی شورشوں اور غداری سے ہوئی۔ صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ ختم سال کے قبل میکنسین نے رومانوی فوجوں کو جو ٹرین سل وے نیا پر حملہ آور ہو رہی تھیں پسپا کر دیا اور تمام ملک رومانیا اور اس کے دارالسلطنت بخارسٹ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد کسی چھوٹی ریاست کی جو جرمنی کی زد میں ہو یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ اس جنگ میں اتحادیوں کی شرکت کرے۔

۱۹۱۷ء میں روسی قوت کے مدوجزر نے ایک مہیب صورت اختیار کی۔

روس نے جنگ میں نہایت گرم جوشی سے شرکت کی تھی مگر اس کی اندرونی سیاسی شورشیں جاری تھیں جس کی اطلاع مغربی یورپ میں بہت کم پہنچتی تھی۔ جون سنہ ۱۹۱۶ء میں لارڈ کچنر جس نے انگریزی فوجوں کی تنظیم کی تھی، روس جاتے ہوئے غرقاب ہو گیا۔ مورخ بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ روس کی وہ حالت ہو گئی تھی جب کہ انقلاب حکومت ناگزیر ہے۔ مطلق العنان حکومت بہت سے ایسے کام کر سکتی ہے جو دستوری حکومت کے لئے نہایت دشوار ہیں مگر مطلق العنان حکومت میں استواری مطلق نہیں ہی اور اس کی بقا کا انحصار کامیابی پر ہے۔ زار کی حکومت کو کئی جنگوں میں ہزیمت ہو چکی تھی اور روسی قوم کی بڑی تعداد انقلاب کی خواہاں تھی۔ آزادی سے وہ مطلق نا آشنا تھے اس لئے دانشمندانہ طرز عمل اختیار نہ کر سکتے تھے۔ جنگ میں اگر کوئی زبردست فتح ہوتی تو حکومت کو اس سے تقویت ہوتی۔ جنگ میں بعض فتوحات ایسے حاصل ہوئیں مگر اس کے ساتھ ہی متعدد ہزیمتیں بھی ہوئیں جن سے انکا اثر زائل ہو گیا۔ روسی قوم کے مصائب اور جنگی نقصانات مغربی قوموں سے بھی زیادہ تھے۔

بالآخر مارچ سنہ ۱۹۱۷ء میں انقلاب ہو ہی گیا۔ زار حکومت سے دست کش ہوا اور سائبیریا بھیج دیا گیا جہاں وہ کس مپرسی کی حالت میں مارا گیا۔ مگر جدید حکومت کا قیام نہایت دشوار ثابت ہوا۔ انگریزی یا فرانسیسی نمونے کی دستوری حکومت ناممکن تھی۔ اشتراکیت کا پلہ بھاری تھا اور اشتراکیوں میں بھی انتہا پسند غالب تھے۔ روس میں جرمن اشتراکیت پسند کارل مارکس کی تعلیم بہت مقبول ہوئی تھی اور سنہ ۱۸۷۱ء کے فرانسیسی اشتراکیت پسندوں کے طریقہ کا تتبع کیا گیا۔ لینن اور ٹراٹسکی کو بالآخر غلبہ حاصل ہوا اگرچہ یہ لوگ جمہوری مساوات کے اصول کے مخالف تھے اور انہوں نے قوم کے دوسرے طبقوں کو سیاسی اقتدار سے خارج کر کے عوام یعنی ادنیٰ ترین طبقہ کی مطلق العنان حکومت کا اعلان کیا۔ جولائی میں روسی افواج نے پھر حملہ کیا اور ایسے شاندار فتوحات حاصل ہوئیں مگر سیاسی حکام کی کارروائیوں سے اس کی مساعی کا کوئی نتیجہ نہ ہوا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نئی حکومت جنگ کو بالکل مہمل خیال کرتی تھی۔ فرانس،

انگلستان یا امریکا سے جس قدر انھیں نفرت تھی اس سے زیادہ نفرت انھیں جرمنی سے
نہ تھی۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں بریسٹ لٹووسک کا معاہدہ ہوا جس کی رو سے روس نے
بڑے بڑے علاقے غنیم کو حوالہ کر دئیے اور زر کثیر بطور تاوان دینے کا وعدہ
کیا۔ روس کی تاریخ سے اس کے بعد ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہاں تاریخ کے ایک
نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور سیاسی اور تمدنی تنظیم کا ایک نیا تجربہ ہو رہا ہے۔ ہمارے
لئے واقعات مذکورۂ بالا کا صرف یہ نتیجہ کافی ہے کہ مشرق میں جرمنی کو بند کرنے کے
لئے جو دیوار کھڑی کی گئی تھی اس کو اس نے توڑ دیا۔

(۶)

بلقان

بلقان میں دول وسطی کو کچھ کم کامیابی نہیں ہوئی اور وہاں بھی اتحادیوں
کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ سرویوں نے دو مرتبہ آسٹروی فوجوں کو سخت
نقصان کے ساتھ پسپا کر دیا تھا۔ ترکی پر بھی فوراً حملہ کر دیا گیا کیونکہ دول وسطی سے
اس کا مل جانا خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اگر اتحادی دردانیال اور باسفورس میں
جبراً داخل ہو جاتے تو روسی فوجوں کو اسلحہ جنگ بہ آسانی اور جلد پہونچ جاتے اور
روس کا غلہ بھی آسانی سے آ جاتا جس کی مغربی دول کو شدید ضرورت تھی۔ اپریل ۱۹۱۵ء
میں ایک اتحادی مہم جس میں زیادہ تر برطانیہ اور اس کے نوآبادیوں کے سپاہی
شامل تھے گیلی پولی کے جزیرہ نما کے قریب لنگر انداز ہوئی۔ اس کے ورود سے
قطعی اور عاجلانہ فتح کی امید تھی۔ مگر یہ امید محض موہوم ثابت ہوئی اور مہینوں
کی سخت جنگ اور شدید مصائب کے بعد یہ فوج دسمبر ۱۹۱۵ء میں واپس بلائی گئی۔
اس کے قبل ہی سربیا تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ بلقان پر حملہ آور ہونے کے لئے جو فوجیں
جرمنی نے تیار کی تھیں ان کی کمان میکنسن کے سپرد کی گئی جسے پھر پوری فتح ہوئی
سربیا کے باشندے اور فوج اپنے وطن سے پہاڑوں کے پار بھگا دئیے گئے
اور انھوں نے فرانس اطالیہ اور انگلستان میں جا کر پناہ لی۔ مناسطر پر بھی قبضہ ہو گیا
اتحادیوں کی ایک فوج سلانیکا کے قریب لنگر انداز ہوئی اور ساحل کے ایک گوشہ پر

خالص تھی۔ اس فوج میں فرانسیسی سربی، یونانی اور برطانی تھے مگر کامیابی کی بہت کم امید تھی۔ جنوب کی طرح جنوب مشرق میں جرمنی نے وہ دیوار توڑ دی جو اتحادیوں نے اسے محصور کرنے کے لئے بنائی تھی۔

(۷)

اطالیہ

اتحادیوں کو اطالیہ کی شرکت سے بے حد خوشی ہوئی۔ اطالیہ کے حصول آزادی کا شمار انیسویں صدی کے عظیم الشان واقعات میں تھا اس لئے دستوری حکومتوں کے ساتھ اس کا شریک کار ہونا بالکل بجا خیال کیا جاتا تھا۔ اطالیہ کی مدد سے کامیابی کی قوی امید ہوگئی اور یہ امید بالآخر پوری ہوئی گو سخت اور طویل جنگ و جدال کے بعد جس کا اول اندیشہ نہ تھا۔

اطالوی فوجیں مشرقی کوہ آلپس پر فوراً حملہ آور ہوئیں اور اونچے اونچے مقامات پر جو برف سے ڈھکے ہوئے تھے جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر اس ہولناک جنگ کے کسی جزو پر "پراسرار" کی صفت صادق آسکتی ہے تو پہاڑیوں کے ان حصوں پر جو ایسے مقامات پر لڑے گئے تھے جہاں معمولی انسان پہنچ نہ سکتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں کبھی ایک فریق غالب آتا اور کبھی دوسرا، مگر اطالیوں کا پلہ بھاری تھا۔ آسٹریوں نے ٹرینٹو کی طرف سے حملہ آور ہوئے مگر پسپا کر دئے گئے۔ مشرقی محاذ پر اطالیوں نے اگست میں گوریزیا پر قبضہ کرکے ایک زبردست فتح حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء کے آغاز میں ان کے حوصلے نہایت بلند تھے۔ اگست میں جنرل کادورنا نے بن سیت زا کے سطح مرتفع کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کرلیا اور آسٹریا کے بہت سے سپاہی قید کرلئے۔ مگر اس کا بھی سخت نقصان ہوا اور وہ اس قدر آگے بڑھ گیا تھا کہ اس کے میمنہ اور میسرہ پر دشمن کے لئے حملے کرنا آسان ہوگیا۔ آسٹریوں نے اس موقعہ سے نفع اٹھایا اور میکنسن کے ظفریاب سپاہیوں کی امداد سے انھوں نے جنرل کادورنا پر کاپوریتو میں حملہ کر دیا جس میں اطالیوں کو ایسی شکست فاش ہوئی جس کی نظیر مغربی محاذ پر کوئی اور مثال نہیں۔ اطالیوں کی ایک پوری فوج بیکار ہوگئی اور ان کے

ڈھائی لاکھ سپاہی قید ہو گئے۔ آسٹریا والے وینس کے میدان میں گھس آئے۔ مگر اطالیوں نے اس شکست کے باوجود خوب مقابلہ کیا اور وینس محفوظ رہا۔ اتنے میں انگلستان اور فرانس سے کمک پہنچ گئی اور خط جنگ پھر بحال ہو گیا گو اطالیہ کے متعدد علاقے اس کے قبضہ سے نکل گئے۔

(۸)

ٹرکی

ہم اس غیر معمولی جنگ کے ہر محاذ کا ذکر نہیں کر سکتے۔ اس لئے جرمنی کی نو آبادیوں پر قبضہ کرنے اور اس کو چین سے خارج کرنے کے لئے جو جد و جہد ہوئی اسے ہم نظر انداز کر دینگے اور روس کی جنگ کے آخری دور کا بھی ہم ذکر نہیں کر سکتے۔ لیکن ٹرکی کا حشر نہایت اہم تھا کیونکہ اس کی فتح یا شکست پر اس جنگ اور بنی نوع انسان کی قسمت کے فیصلہ کا انحصار تھا۔

ٹرکی پر ایک فوجی مطلق العنان حکومت تھی اور ترکوں کو جرمنی اور آسٹریا کی حکومتوں کے ساتھ خاص ہمدردی تھی جو اسی قبیل کی تھیں ۱۶۸۳ء میں وائینا کے حملہ میں ہزیمت پانے کے بعد ٹرکی کی قوت اور سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا اور شاید ہی کوئی دس سال گزرے ہوں گے جن میں اس کی سلطنت کا کوئی جزو اسکے قبضہ سے نہ نکلا ہو۔ ٹرکی کو غالباً امید تھی کہ جرمنی کی زبردست فوجی قوت کی مدد سے اس کی سابقہ حالت عود کر آئیگی۔ جرمنی کو ٹرکی کی سلطنت سے ایک ایسی راہ کے ملنے کی امید تھی جسے طے کر کے وہ ہندوستان اور مصر میں برطانی قوت پر حملہ آور ہو سکیگا۔ قسطنطنیہ سے خلیج فارس تک جس ریل کے بنانے کی تجویز تھی اس کا بیشتر حصہ بن چکا تھا۔

۱۹۱۵ء میں ترکوں نے مصر پر یورش کی مگر کامیاب نہ ہوئے اسی سال ہندوستانی فوج فرات کے دہانے پر لنگر انداز ہوئی اور ایک فوج جنرل ٹاؤن شینڈ کے زیر فرمان اس ندی کے کنارے کنارے آگے بڑھی اور چند شاندار فتوحات کے بعد بغداد کے قریب پہنچ گئی۔ مگر اس کی فوج کی تعداد زیادہ نہ تھی اور ترکوں کو کمک پہنچ گئی

تھی۔ اس لیے اسے پسپا ہونا پڑا۔ قوت میں وہ بالآخر محصور ہو گیا اور گو کمک بھیجنے کی کوشش کی گئی مگر اپریل ۱۹۱۶ء میں اس نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ ایک زبردست رکاوٹ تھی جس سے مشرق میں برطانیہ کا اقتدار متزلزل ہو گیا۔

مگر ۱۹۱۷ء میں صورت حال متغیر ہو گئی۔ جرمنی کی تائید کے بغیر ترکی ایک ایسی سلطنت کے مقابلہ سے مجبور تھا جس کی فوجیں جدید ترین اسلحہ سے مسلح تھیں اور جرمنی کو اس قدر مجبوریاں تھیں کہ وہ ترکوں کی مدد نہ کر سکتا تھا۔ جنرل ماڈ نے ایک زبردست فوج نہایت احتیاط سے تیار کی اور جنوری ۱۹۱۷ء میں دجلہ کے کنارے کنارے بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ ترکوں نے خوب مقابلہ کیا مگر انگریزوں کو متواتر فتوحات حاصل ہوئیں۔ فروری میں قوت پر قبضہ ہو گیا اور مارچ میں بغداد کا سقوط عمل میں آیا جس سے ان نواح میں ترکی قوت بالکل ٹوٹ گئی۔

فلسطین میں ترکوں پر اور بھی تباہی آئی۔ اس کی فوجیں پہلے ہی سے مصر کی سرحد سے ہٹا دی گئی تھیں مگر غازہ کی مقاومت کی وجہ سے انگریزی فوجیں عرصہ تک فلسطین میں داخل نہ ہو سکیں۔ ۱۹۱۷ء میں فلسطین کی انگریزی فوج کی کمان جنرل ایلنبی کے سپرد ہوئی۔ اکتوبر کے آخر میں اس نے حملہ کیا جس میں فوری کامیابی ہوئی۔ غازہ کو اس نے ایک طرف چھوڑ دیا اور بیرسبع کی راہ اختیار کی۔ بیرسبع پر قبضہ کر لینے سے یروشلم کا راستہ کھل گیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس پر بلا کسی ہنگامہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ بغداد، بابل، نینوا، بیت المقدس اور مصر جو تمدن کے قدیم ترین مرکز تھے سب انگریزوں کے زیر اقتدار ہو گئے۔

(۹)

۱۹۱۸ء

۱۹۱۸ء کے آغاز میں صورت حال اتحادیوں کے موافق نہ تھی اور چار سال کی شدید جنگ کے بعد بھی دول وسطی حملہ آور ہو سکتی تھیں۔ روس کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ بلقان ان کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ اطالیوں کو ایک ایسی شکست ہو چکی تھی جسے بعض لوگ قطعی خیال کرتے تھے۔ صرف عراق اور فلسطین میں اتحادیوں کو کامل

فتح حاصل ہوئی تھی اور اگر دول وسطی کو یورپ میں فتح حاصل ہوتی تو ان ملکوں میں بھی وہ اتحادیوں سے نپٹ لیتے۔ سمندر جرمنی کے لیئے بالکل بند تھا مگر آبدوزوں کے ذریعہ سے وہ تمام جہازوں کو ڈبونے لگے تھے خواہ وہ ان کے مخالفوں کے ہوں یا غیر جانبداروں کے اور تجارتی ہوں یا جنگی۔ اپریل ۱۹۱۷ء کے ایک ہفتہ میں انھوں نے ۵۹ جہاز ڈبو دیئے۔ اگر یہی حالت رہتی تو اتحادیوں کے ذرائع ختم ہو گئے ہوتے۔ جرمنی کی مسلسل اور عظیم الشان کوششوں سے اس کی حالت خستہ ہو رہی تھی مگر اس کے دشمن بھی بہ استثنائے ممالک متحدہ امریکا خستہ حال ہو رہے تھے۔ امریکہ کی فوجیں آرہی تھیں جن سے اتحادیوں کا اعتماد بڑھ گیا تھا۔ مگر روس سے مصالحت ہو جانے سے جرمنی فوجیں اس محاذ سے علیحدہ ہو کر دوسرے محاذوں پر جا رہی تھیں جس سے یقین ہو گیا کہ موسم بہار کے آغاز میں مغرب میں وہ پھر ایک زبردست حملہ کریں گے

لوڈن ڈارف اب جرمن فوجوں کا سپہ سالار اعظم تھا اور اس نے نہایت خفیہ طریقہ پر اس حملہ کی تیاریاں کیں۔ ۲۱ مارچ ۱۹۱۸ء کو اس زبردست حملہ کا آغاز سینٹ کوئن ٹن کے قریب ہوا جہاں فرانسیسی اور انگریزی فوجیں ایک دوسرے سے قربت رکھتی تھیں۔ اس حملہ کا بار زیادہ تر انگریزی پانچویں فوج پر پڑا۔ جرمنی کو فوری کامیابی ہوئی اور اس کی جنگ کے ابتدائی زمانہ میں کوئی نظیر نہ تھی۔ جرمنی کی مستحفظ فوجیں اس قدر تھیں کہ وہ نہایت عجلت کے ساتھ حملے کر رہا تھا۔ اوّلاً مارچ کے حملوں میں جرمن امے میان کے چند میل کے فاصلہ پر پہنچ گئے اور ایک بڑی ریلوے کی آمد و رفت انھوں نے روک دی۔ اپریل میں پھر فلنڈروں کے پاس پھر ایک طویل اور زبردست جنگ ہوئی جس میں جرمنوں کا یہ مقصد تھا کہ مخالفوں کی صفوں کو چیر کر بحیرۂ انگریزی کی بندرگاہوں تک پہنچ جائیں۔ اپ ریرے پر تو وہ قابض نہ ہو سکے مگر جنوب میں خط جنگ بہت بڑھا ہو گیا۔ اور بپلے لیول کی فتح سے اندیشہ ہو گیا کہ بالکل ٹوٹ جائیگا۔ مئی میں ریم کے قریب کی فرانسیسی فوجوں پر حملہ ہوا۔ شمیں دے دام فرانس کے قبضہ سے نکل گیا جسے انھوں نے بڑی دقت سے فتح کیا تھا اور گو اپ رے کی طرح ریم پر بھی جرمنی کا قبضہ نہ ہوا مگر جرمن فوجیں مارن تک پہنچ گئیں۔ جولائی میں انھوں نے اس ندی کو عبور کیا اور ساڑھے چار سال

کی کوششوں اور مصائب کے باوجود پیرس ان کی زد میں آگیا۔ عوام کو ان کی فتح کا بالکل یقین ہو گیا تھا کیونکہ مارچ میں حملہ کا آغاز کرنے کے بعد ہی انھوں نے ۷۵ میل کے فاصلہ سے بڑی بڑی توپوں سے پیرس پر گولہ باری شروع کر دی تھی مگر آئندہ چار مہینوں میں صورت حال میں ایک ایسا کایا پلٹ ہوا جس کی صفحات تاریخ میں نظیر نہیں۔ جرمنی میں جب فتح کے شادیانے بج رہے تھے، عین اسی وقت اتحادی اس جوابی حملے کی تیاری کر رہے تھے جو اس کی فوجوں اس کی حکومت اور اس شہنشاہیت کی تباہی کا باعث ہونے والا تھا۔ جرمنی کو اس حملے میں کامیابی تو ہوئی تھی مگر اس کی مستقل فوجیں خستہ ہو گئیں اور ان پر اس قدر بار ڈالنا سخت غلطی تھی۔ برخلاف اس کے اتحادیوں میں کسی قسم کا انتشار نہ تھا اور وہ آخر وقت تک لڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ انگلستان اور امریکا سے فوجیں حد درجہ عجلت کے ساتھ بھیجی گئیں اس کے علاوہ یکسانی عمل کے لئے مغربی محاذ کی تمام فوجیں جنرل فوش کے زیر کمان کر دی گئیں جس نے جنگ سے قبل فوجی مضامین کی تعلیم میں شہرت حاصل کی تھی اور جنگ میں اپنی ہنرمندی اور استقلال سے ممتاز ہو چکا تھا۔ اس جنگ میں اس نے جو شہرت حاصل کی وہ صفحات تاریخ میں ہمیشہ باقی رہیگی۔ جنرل فوش ہمیشہ سے جوابی حملہ کا مؤید تھا اور اپنے سپاہیوں کی ہمت مردانہ سے اسے کامیابی کی قوی امید تھی مگر جب ہر طرف سے آگے بڑھنے کی صدائیں آتی تھیں یہ موقعہ شناس جنرل خوب سمجھتا تھا کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے اور توقف کی ضرورت ہے۔

۱۸ جولائی کو جوابی حملہ کا آغاز مارن کی دوسری جنگ سے ہوا۔ اس کے قبل بھی اس قسم کے بعض حملے ہوئے خصوصاً آسٹریا کی فوجوں کے۔ مگر اب جرمنوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پسپا ہونے لگے۔ پہلے تو وہ ترتیب کے ساتھ اور لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے مگر اس کے بعد ہر طرف پسپا ہونے لگے اور انھیں پوری ہزیمت ہوئی۔ اتحادیوں کی تمام فوجیں اس حملہ میں شریک تھیں۔ پہلا حملہ فرانس اور امریکا کی فوجوں نے کیا مگر اس کے بعد برطانیہ کی تازہ دم فوجیں پیش پیش تھیں انگریزوں نے امیان کے محاذ پر ۸ اگست کو حملہ کیا اور

جرمنوں کو سخت نقصان کے ساتھ پسپا کر دیا۔ زرہ پوش موٹروں سے انگریزوں کو بہت مدد ملی۔ لیوڈین ڈارف نے اپنی سوانح عمری میں اسے جرمنی فوج کا روز سیاہ لکھا ہے۔

اسکے بعد تین مہینے تک جنگ ہوتی رہی اور انگریزوں کا اس زمانہ میں بہت نقصان ہوا مگر جرمنی کو مسلسل شکست ہوتی رہی۔ ہن ڈین برگ کے مستحکم خط پر جو نہایت احتیاط سے تیار ہوا تھا دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ بلجیم کی فوج نے اینٹ ورپ اور برسیلز پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی کا فوجی تفوق جو یورپ پر ۱۸۶۶ء سے چھایا ہوا تھا خاک میں مل گیا۔ قیصر جرمنی سلطنت سے دست کش ہو گیا اور نئی حکومت نے عارضی صلح کی درخواست کی جو عرصہ کے آمد و پیام کے بعد ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو منظور کی گئی۔

جرمنی کو مغربی محاذ کے مصائب کا کوئی نعم البدل نہ ملا (۱)، اطالیوں نے کاپورٹو کی شکست کی پوری تلافی کر لی تھی۔ فوش کے جوابی حملہ کے ایک ماہ قبل یعنی جون میں انھوں نے آسٹریوں کو شکست فاش دی۔ اکتوبر میں جنرل ڈایز نے ایک زبردست حملہ کیا۔ آسٹریوں کے قدم بالکل اکھڑ گئے اور لاکھوں قیدی چھوڑ کر وہ بھاگ کھڑے ہوئے (۲) دشمنوں میں سے بلغاریوں نے سب سے پہلے اطاعت قبول کی کیونکہ جرمنی کی مدد کے بغیر وہ دشمن کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ سربیا والوں کو سب سے پہلے خط چیرنے میں کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد تمام اتحادی فوجوں نے پیش قدمی کی اور ۲۹ ستمبر کو بلغاریہ نے احتیاط اطاعت قبول کر لی (۳)۔ ترکی میں بھی اب تاب مقاومت نہ تھی۔ ستمبر میں جنرل ایلین بی نے قابل تعریف تدابیر حربی سے ترکوں کو فلسطین سے خارج کر دیا اور دمشق پر پیش قدمی کی۔ ترکوں نے بھی اکتوبر میں اطاعت قبول کر لی۔

جٹ لینڈ کی جنگ کے بعد سمندر میں کوئی اور بڑی جنگ نہیں ہوئی گو اب بھی تجربہ پر زیادہ تر دارومدار تھا۔ جرمنی کو آبدوزوں سے اس قدر کامیابی ہوئی تھی کہ لوگوں کو خیال ہو گیا تھا کہ انگلستان کی فوجی قوت کو وہ تباہ کر دیگا۔ اتحادیوں کو سخت دقت اور مصائب کا سامنا ہوا اگر ان کی بحری

فوجیں بالآخر ان وقتوں پر غالب آگئیں۔ جہازوں کے بنانے میں مزید عجلت کی گئی، آب دوز کشتیوں کا وجود معلوم کرنے اور انھیں تباہ کرنے کے جدید ذرائع دریافت کئے گئے۔ زی بروگ اور آس ٹینڈ کے بندرگاہ تباہ کر دئے گئے تاکہ یہ کشتیاں ان میں پناہ نہ لے سکیں۔ عارضی صلح کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جرمنی بیڑے کے زیادہ تر جہاز اتحادیوں کے سپرد کر دئے جائیں۔ جہازوں کی حوالگی جو جرمنی کے لئے باعث ذلت اور اتحادیوں کے لئے موجب فخر تھی ۲۱ نومبر کو عمل میں آئی۔

(۱۰)

جرمنی کے بیڑے نے اطاعت قبول کر لی تھی۔ اتحادی فوجوں نے رائن ندی کی طرف پیش قدمی کی۔ جنگ تو ختم ہو چکی تھی مگر فتح حاصل کرنے سے زیادہ دشوار مصالحت کا تصفیہ تھا۔

صلح کی گفت و شنید میں تین اشخاص کو زیادہ دخل تھا۔ وڈرو ولسن صدر جمہوریۂ امریکا، لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان، کلے مان سو وزیر اعظم فرانس۔ جنگ میں امریکا کی شرکت کا خیال اس کے صدر جمہوریہ کے ذہن میں بہت دیر میں آیا تھا مگر جرمنی کی زیر آب کشتیوں کی کارروائیوں نے کوئی اور چارۂ کار باقی نہ رکھا، کیونکہ جرمن غیر جانب دار سلطنتوں کے جہاز بھی تباہ کر دیا کرتے تھے اور امریکہ ایسی مقتدر سلطنت اسے گوارا نہ کر سکتی تھی۔ جنگ کے متعلق اسنے جتنی تقریریں کیں، ان سب میں اس نے یہی خیال ظاہر کیا کہ عالم متمدن میں کسی ایسے نظام کا ہونا ضروری ہے جو جنگ عظیم ایسے محاربات کا سد باب کر سکے۔ مجلس اقوام کے تخیل کا وہ خاص حامی تھا۔ غالباً اسے اس امر کا احساس نہ تھا کہ جنگ سے حسد، خوف اور بغض کے جو جذبات پیدا ہوئے ہیں ان کا فرو ہونا چنداں آسان نہیں لیکن مجلس اقوام سے جو امیدیں ہیں اگر وہ پوری ہوئیں تو ولسن کا شمار بنی نوع انسان کے محسنوں میں ہوگا۔ لائڈ جارج ۱۹۱۶ء میں بجائے ایسکوئتھ انگلستان کا وزیر اعظم ہوا تھا۔ اس کی جوشیلہ مندی، فصاحت و بلاغت اور سرگرمی کو اتحادیوں کی کامیابی میں بہت دخل تھا۔ یورپ کے اہل سیاست

میں صرف لائڈ جارج اور قیصر جرمنی دو اشخاص ہیں جنھیں معاملات جنگ میں شروع سے آخر تک دخل تھا۔ فرانس میں کلے مان سو' ایک بوڑھا شخص جو ۱۸۷۰ء کی جنگ اور اس کے بعد کا انقلاب دیکھ چکا تھا اور صحافت اور سیاسی معاملات میں سرگرمی سے حصہ لیتا تھا ۱۹۱۷ء میں وزیر اعظم ہوا۔

فرانس کے نظام حکومت میں اس کی وجہ سے استواری اور سرگرمی پیدا ہو گئی اور پیرس میں جب صلح کے متعلق نامہ و پیام شروع ہوئے تو وہ صدر منتخب ہوا مجلس صلح میں وہ سب سے نمایاں رکن تھا۔ ایک دفعہ اسے کسی نے گولی مار دی گولی اس کے شانہ میں لگی جہاں سے نکالی نہ جا سکتی تھی۔ مگر اس نے مطلق پروا نہ کی اور تھوڑی دیر کے بعد مجلس میں پھر شریک ہو گیا' گویا کچھ نہ ہوا تھا۔

امیر جمہوریہ ولسن نے ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو ممالک متحدہ امریکا کی کانگرس کو ایک پیام بھیجا تھا جس میں اس نے ان شرائط کی تصریح کی تھی جن پر اتحادی صلح کرنے پر رضامند ہو سکتے تھے۔ یہ شرطیں "چہاردہ اصول" کے نام سے مشہور ہوئیں اور جرمنی نے اس امید پر کہ صلح انھیں شرائط پر ہو گی ۱۱ نومبر کی عارضی صلح کی تلخ شرائط منظور کر لیں۔

شرائط چہاردہ میں امور ذیل شامل تھے۔ جرمنی اور اسکے حلیف تمام علاقے خالی کر دیں جن پر انھوں نے قبضہ کر لیا تھا' پولینڈ آزاد قرار دیا جائے۔ سمندروں پر ہر سلطنت کو آزادی ہو' تمام معاشی رکاوٹیں دور کر دی جائیں' الساس اور لورین کے اضلاع فرانس کو واپس کر دئیے جائیں' آسٹریا ہنگری کی مختلف قومیں آزاد کر دی جائیں' اطالیہ کی سرحد قومیت کے لحاظ سے درست کر دی جائے ایک مجلس اقوام قائم کی جائے۔

صلح کے لئے قطعی اصول کا قایم کرنا نہایت ضروری تھا مگر جب مختلف ملکوں کے سفیر جمع ہوئے تو ان اصول کی تعبیر کر کے انھیں صلح نامہ کے دفعات میں منتقل کرنا اور حریف سلطنتوں کے جذبات اور ان کی خواہشوں کا مدنظر رکھنا اور سب کو خوش رکھنا سخت دشوار ثابت ہوا۔ امیر ولسن کے اس فعل پر سخت اعتراض ہوئے ہیں جن کا کوئی باضابطہ جواب نہیں دیا گیا ہے مگر کسی نہ کسی طرح انھوں نے معاہدۂ صلح میں مجلس اقوام کا معاہدہ شریک کر دیا

جس کا ذکر آگے آئیگا۔

دول وسطی کا کوئی نائب مجلس صلح میں شریک نہیں کیا گیا۔ اتحادیوں کے نائب کبھی مجمع عام میں بحث کرتے تھے اور کبھی خلوت میں اور ان کے فیصلوں کے نتائج پہلے جرمنی کے نمایندوں کو معلوم کرائے جاتے تھے اور پھر دوسری مخالف سلطنتوں کے نمایندوں کو۔ اتحادیوں کے بہت سے سفیر جمع تھے مگر زیادہ تر اثر ممالک متحدہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی اور جاپان کے نمایندوں کا تھا۔ جاپان کو زیادہ تر سروکار ایشیا کے معاملات سے تھا اس لئے یورپ کے متعلق صرف چار سلطنتوں (برطانیہ، فرانس، اطالیہ، امریکا) کو دخل تھا جو اربعۂ عظمٰے کے نام سے مشہور تھیں اور جن کے نمایندے ولسن، لائڈ جارج، کلے مان سو، اور آرلینڈو تھے۔

تمام معاہدے ابھی تک مکمل نہیں ہوئے ہیں اور ٹرکی کے معاملات کا تصفیہ ممکن ہے کہ تعجب خیز ہو۔ مگر جن اصول پر ان کا تصفیہ ہوگا وہ بدیہی ہیں۔

جرمنی کے مدبروں اور اہل سیاست کو تمام دنیا پر تفوق حاصل کرنے کی آرزو تھی مگر یہ خیال خام ثابت ہوا۔ انقلاب کا سیلاب تمام ملک میں پھیل گیا۔ قیصر سلطنت سے دست کش ہوکر ہالینڈ بھاگ گیا اور جرمنی کے دوسرے رئیس بھی غائب ہو گئے۔ حکومت جمہوری قائم ہو گئی ہے گو ابھی تک شہنشاہت کا نام باقی ہے۔ بلجیم، فرانس اور دوسرے اتحادی ممالک کو اس نے جو نقصان پہنچایا اس کے لحاظ سے ایک رقم خطیر بطور تاوان جنگ اداکرنی ہوگی۔ السا‌س اور لورین پھر فرانس کے قبضہ میں آ گئے۔ مگر جرمنی کی وحدت ابھی تک باقی ہے اور فریڈرک اعظم اور بسمارک نے جو کام کیا تھا زائل نہیں ہوا ہے۔ جرمنی اب بھی ایک زبردست قوت ہے اور اس کے باشندے اب بھی جیسے سابق محنتی اور قابل ہیں۔ دنیا میں اب بھی وہ کار نمایاں کرینگے اور فلسفہ، سائنس اور فنون لطیفہ کی خدمت وہ برابر کرتے رہینگے۔

شہنشاہیت آسٹریا کا حشر بہت برا ہوا اور قریب قریب دنیا کے نقشے سے غائب ہو گئی۔ خاندان ہیپس برگ کے مقبوضات اب چھ آزاد سلطنتوں کے

قبضہ میں ہیں (۱) آسٹریا (۲) ہنگری (آزاد) (۳) جگوسلادیا جس میں سربیا اور مان ٹی نیگرو کے علاوہ آسٹریا کے سلاوی باشندے شامل ہیں (۴) رومانیا نے ٹرین سل وے نیا کا الحاق کر لیا ہے (۵) پولینڈ کی سلطنت جو روس پرشیا اور آسٹریا نے آپس میں تقسیم کر لی تھی از سر نو زندہ ہو گئی (۶) چے کوسلوا کیا جس میں بوہیمیا اور موروے وبا کے صوبجات شامل ہیں۔

وسطا میں بالکل نئی سلطنتیں پولینڈ اور چے کوسلوا کیا ہیں کیوں کہ جگوسلادیا فی الحقیقت سربیا ہے جسکی مقبوضات میں وسعت ہو گئی ہے۔ ان دونوں سلطنتوں کو سخت اندرونی اور بیرونی مشکلوں کا سامنا کرنا ہو گا اور دونوں کو اپنے زبردست ہمسایوں کے خلاف میں مجلس اقوام کی تائید کی ضرورت ہو گی۔ مورخوں کو ان دونوں سلطنتوں کے احیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی روایات ہمیشہ برقرار رہتی ہیں کیونکہ جنگ عظیم کے بعد جب دنیا تباہی کے بالکل قریب پہنچ گئی تھی تو اس کی تنظیم جدید انھیں روایات کی بنا پر عمل میں آئی۔

بلغاریہ کی حدود ارضی میں جنگ کے بعد زیادہ تغیر نہیں ہوا۔ بلقان میں تفوق حاصل کرنے کے خیال سے اسے اب بازآنا پڑیگا اور یونان، رومانیا اور سربیا کی ہمسری قبول کرنی ہو گی۔ ایشیائے کوچک کا مغربی حصہ اگر یونان سے ملحق کر دیا گیا تو اس کی وسعت میں معقول اضافہ ہو گا اور زمانۂ قدیم کی سی حالت پیدا ہو جائیگی کیونکہ انھیں ممالک میں یونانیوں نے سائنس، فلسفہ، شاعری اور فنون لطیفہ میں ابتدائی ترقی کی تھی۔

لیکن ترکی مقبوضات کے مستقبل کے متعلق ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی قسطنطنیہ کا کیا حشر ہو گا، ابھی یہ مسئلہ زیر بحث ہے اور اس کا حل کرنا نہایت وقت طلب ہے۔ شام یقیناً فرانس کے زیر اثر ہو جائیگا اور فلسطین میں برطانیہ کا اثر قائم ہو گا۔ جنگ کے مصائب اظہر من الشمس ہیں مگر اس سے ایک یہ نفع ہو گا کہ جو ممالک ترکوں کی بد انتظامی سے مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے، اب اپنی مراد کو پہنچیں گے۔

تمام صلح ناموں کے قبل مجلس اقوام کا میثاق ہو گا۔ اس میثاق کے ابتدائی

جملوں میں اس تحریک کے مقاصد جس کے ساتھ بنی نوع انسان کی آئندہ امیدیں وابستہ ہیں سنجیدہ الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔ "معزز معاہدہ کن سلطنتیں مجلس اقوام کے میثاق سے اتفاق کرتی ہیں تاکہ قوموں میں معاونت کا سلسلہ شروع ہو اور ان کے درمیان امن وامان قائم ہو اور ہر ایک کو اطمینان ہو۔ اس کے ذرایع یہ ہونگے کہ ہر ایک سلطنت ضمنی وعدہ کرے کہ دوسرے سے جنگ نہ کرے گی، قوموں میں جو تعلقات ہوں وہ انصاف پر مبنی ہوں، دونوں کے لئے باعث اعزاز ہوں اور بالکل عیاں ہوں، قانون بین الاقوام کے اصول پوری طور سے قائم ہوں اور ہر ملک کی سلطنت انھیں پر عمل پیرا ہو، انصاف کا پورا خیال رکھا جائے اور متمدن اقوام کے باہم ایس کے معاملوں میں ان فرائض کو مدنظر رکھا جائے جو معاہدوں سے پیدا ہوتے ہیں"

اس میثاق عظیم پر جسکے متعلق امید کی جاتی ہے کہ دنیا کے امن وامان کا منشور اعظم ہوگا، ۲۷ سلطنتوں کے نائبوں کی دستخط ہوی۔ دول وسطی کے نائب اس میں شریک نہیں کئے گئے۔ ان کے علاوہ ۱۳ سلطنتوں سے درخواست کی گئی کہ مجلس اقوام میں شامل ہوں۔ میثاق کا ماحصل حسب ذیل ہے:۔

اس کے ۲۶ دفعات میں معاہدہ کرنے والوں نے یہ وعدہ کیا ہے کہ امور بابہ النزاع عدالت ثالثی میں پیش کئے جائینگے یا اگر ثالثی کی کارروائی نامناسب ہو تو مجلس کی کونسل میں تحقیقات اور مشورے کی غرض سے پیش کیا جائیگا۔ مجلس اقوام کے تمام ارکان حملے سے محفوظ رکھے جائینگے۔ اگر تمام احتیاطی کارروائیوں کے باوجود جنگ چھڑ جائے تو زیادتی کرنے والی سلطنت کی تخویف کے لئے معاشی اور جنگی ذرائع سے کام لیا جائیگا۔

دفعات مذکور کی اغراض یہی ہیں کہ امن وامان قائم رہے، مگر مجلس اقوام کا ایک دوسرا مقصد بھی ہے یہ ایک عالمگیر سلطنت کا قیام نہیں ہے بلکہ ایسے مستقل ادارات کا قائم کرنا جن میں عالم متمدن کے مفاد پر غور کیا جائے اور ایسی تدبیریں عمل میں لائی جائیں جن سے سب کو نفع ہو۔ ایک مجلس شوریٰ بھی ہوگی جس میں مجلس اقوام کے ہر رکن کے نمایندے شامل ہوں گے۔ مگر اہم ترین جماعت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۵۴	۱۳	نکل سکتی نہ تھی	نکل نہ سکتی تھی
۳۵۶	۴	دربان وزا	دربان درا
۳۵۷	۹	عجز والحاج	عجز والحاج
۳۸۳	۸	سائمین ڈی تھا	سائمن ڈی مونٹ فورٹ تھا
۳۸۳	۹	اور اس مانٹ فورٹ	اور ڈی مونٹ فورٹ
۳۸۸	۱۶	Quia Emptoyes	Quia Emptors
۳۹۶	۶	ایکوٹمین	ایکوئیٹین
۴۰۱	۱۲	کی کی	کی
۴۰۶	۷	ذنائت	ذنائت
۴۱۷	۲	اکو اتحاد	کے اتحاد
۴۱۷	۲۰	Execrablis	Excrabilis
۴۲۲	۱۱	لگ برنم برگ	لگ زم برگ
۴۳۰	۱۰	ری نت زی	ری انت زی
۴۳۲	۱۶	اکی	اکی کہ
۴۳۵	۱۴	Guedalete	Guadalete
۴۳۵	۲۱و۲۳ و ۲۴و۲۵	دسی گاتھ	وزی گاتھ
۴۳۸	۲۰	سنہ ۱۲۹۲ء	سنہ ۱۴۹۲ء
۴۴۸	۱۳	شاانگلستان	شاہ انگلستان
۴۶۱	۱۵	Villeinge	Villeinage
۴۷۱	۸	طز	طنز
۴۷۲	حاشیہ	Games	Game
۴۷۲	حاشیہ	Chancer	Chaucer
۴۷۴	۱۲	تفرقہ	تفرقوں
۴۷۹	۱۷	شاعرورمل	شاعروربل
۴۸۷	۷	Fornova	Fornovo
۴۸۸	۱۴	Angeto	Angelo
۴۸۹	۱۵	Swise	Swiss
۴۹۰	۲	Maxmilian	Maximilian
۴۹۰	۱۱	Charlemagna	Charlemaghe
۴۹۱	۱۹	Arrgon	Aragon
۴۹۱	۲۲	Fornova	Fornovo
۴۹۳	۱۳	Youste	Yuste
۴۹۴	۴	Machiavelle	Machiavelli
۴۹۶	۱	Maregnano	Marignano
۴۹۸	۶	Castile	Castille
۵۰۲	۱۸	زاعل	زائل
۵۰۲	۲۲	Speer	Speier
۵۰۳	۱۴	Schmalkaldon	Schmalkalden
۵۰۳	۱۴	Brandenberg	Brandenburg
۵۰۴	۱	Muhlbug	Muhlberg
۵۱۰	۸	Communication	Communion
۵۱۰	۲۵	Or'leans	Orleans
۵۱۱	۶	وہاں کے	وہاں سے
۵۱۱	۸	Berne	Bern
۵۱۱	۹	Freeberg	Freirburg
۵۲۲	۹	Castile	Castille
۵۲۵	۲	عظمت اوران جنگوں	عظمت ان جنگوں
۵۳۰	۸	Geniblours	Gemblours
۵۳۱	۲	Anju	Anjou

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۳۱	۱۳	ڈلفٹ	ڈیلفٹ
۵۳۱	۲۲	ارل اف لیٹر	ارل آف لیسٹر
۵۳۱	۲۲	Leieester	Leicester
۵۳۲	۱۷	Layden	Leyden
۵۳۳	۲	Raphael Litian	Raphael or Titian
۵۳۳	۱۱	Oronge	Orange
۵۳۳	۱۸	Arminus	Arminius
۵۳۳	۲۴	ولڈن مارنیوٹ	اولڈن بارنیوٹ
۵۳۵	۱	Calean Cambresis	Cateau Cambresis
۵۳۶	۲۱	Erasums	Erasnus
۵۳۷	۹	Loyalla	Loyolla
۵۳۷	۱۳	Medichi	Medici
۵۳۸	۳	Borban	Bourban
۵۳۸	۴	Antony	Anthony
۵۳۸	۴	Navaire	Navarre
۵۳۸	۷	Loraine	Lorraine
۵۳۸	۱۳	L Hopital	L'Hopital
۵۳۹	۲۳	Antony	Anthony
۵۴۰	۱۹	روسیا کے	روسا کے
۵۴۱	۱۷	Margar-ret	Margaret
۵۴۱	۱۷	Velois	Valois
۵۴۱	۵	کالی نی	کالی نی
۵۴۲	۸	کالی فی	کالی لی
۵۴۳	۱۲	Alcan	Alcon
۵۴۴	۱۳	Angel	Anjou
۵۴۵	۲	Navorres	Navarre
۵۴۷	۳	Guise	Guises
۵۴۸	۱۷	ایوری	آئیوری
۵۵۰	۲	نوارکا	نوارکا
۵۵۱	۵	ہموارکرالیتا	ہموارکرلیتا
۵۵۲	۸	ایوری	آئیوری
۵۵۴	۱۴	Velois	Valois
۵۵۴	۱۶	Tuscony	Tuscany
۵۶۰	۲	Caherine	Catherine
۵۶۰	۲	Arragon	Aragon
۵۶۰	۱۱	Moore	More
۵۶۱	۱۱	Northam-berland	Northum-berland
۵۶۱	۲۱	Arragon	Aragon
۵۶۴	۳	کوٹ آف ہائی کمیشن	کورٹ آف ہائی کمیشن
۵۶۹	۱۱	Bortholo-mew	Bartholo-mew
۵۷۰	۲۲	Solway-moor	Solway Moss
۵۷۱	۲	Brittony	Brittany
۵۷۱	۱۵	Hegonet	Huguenot
۵۷۲	۶	Edin-brough	Edin-burgh
۵۷۴	۱۵	Michal	Michael
۵۷۷	۱	ابطالیہ	اطالیہ
۵۷۷	۶	زوینگے	زوینگلی
۵۸۰	۴	Augs-bergh	Augsburg
۵۸۳	۱۵	Milthias	Matthias
۵۸۳	۱۳	Milthias	Matthias

۵۸۶	۲	ٹیلی	ٹلی
۵۹۲	۱۰	Wellen-stein	Wallens tein
۵۹۲	۱۸	لوٹزن	لوٹزن
۵۹۳	۱۴	Breitan-field	Breintan-feld
۵۹۳	۲۰	Richelue	Richelieu
۵۹۳	۲۴	Weimer	Weimar
۵۹۴	۶	Tors Tenson	Torsten-son
۵۹۴	۷	لوٹزن	لوٹزن
۵۹۴	۱۱	Coude	Conde
۵۹۴	۱۵	Cattalonia	Catalonia
۵۹۴	۲۱	Rocroy	Roeroi
۵۹۴	۲۳	Rihelieu	Richelieu
۵۹۵	۸	Westpha-lis	Westpha-lia
۵۹۵	۱۰	Richeleu	Richelieu
۵۹۵	۱۳	Augsberg	Augsburg
۵۹۹	۳	Chillor	Schillar
۶۰۰	۱	Richeleu	Richelieu
۶۰۰	۴	Madici	Medici
۶۰۱	۱۵	پورپ	یورپ
۶۰۲	۱۹	Nauntes	Nantes
۶۰۳	۱ و ۲	Rachelle	Rochelle
۶۱۱	۲۰ و ۲۳	Inten-dents	Inten-dants
۶۱۲	۲۲	Longeville	Longue-ville
۶۱۴	۱۱	Pyrennes	Pyrenees
۶۱۴	۱۶	روسی ٹون	روسی لون

۶۱۶	۱	ازہیسل	ازہیسل
۶۱۶	۱	Hassal	Hassall
۶۱۶	۲	Honotaux	Hanotaux
۶۲۳	۲۱	Pyrennese	Pyrenees
۶۲۶	۲۳	Cassale	Casale
۶۲۷	۱۱	ابتدا	ابتداءً
۶۲۹	۲۲	اولاد	اولادیں
۶۳۸	۱۹	Anju	Anjou
۶۴۲	۵ و ۱۵	Gibralter	Gibraltar
۶۴۳	۲	Marl-brough	Marl-borough
۶۴۳	۷	Denian	Denain
۶۴۳	۱۳	Nehther-land	Nether-land
۶۴۳	۱۴	Gibralter	Gibraltar
۶۴۴	۵	فینلان	فنیلان
۶۴۶	۱	Lewisse	Levisse
۶۴۶	۲	Memoirs	Memoires
۶۴۶	۲	Hassal	Hassall
۶۵۱	۱۴	Heugonot	Huguenot
۶۵۱	۱۵ و ۱۶	Rachelli	Rochelle
۶۵۱	۱۷	Richelun	Richelieu
۶۵۴	۱۱	اسی	اسے
۶۵۵	۱	Naseli	Naseby
۶۵۷	۱۶	Pyrennese	Pyrenees
۶۵۷	۲۲	نارہن	ناراض
۶۶۱	۲۱	Monmath	Mon-mouth

Strasburg	Strassberg	۱۹	۶۶۲
Luxemburg	Luxemberg	۱۹	۶۶۲
Casale	Casselle	۱۹	۶۶۲
ضرورت نہیں ہے گو	ضرورت نہیں ہے کو	۱۴	۶۶۴
Ryswick	Reswick	۱۸	۶۶۴
ٹوری	لوڑی	۲۲	۶۶۶
Marlborough	Marlbrough	۱۰	۶۶۷
Oates	Oats	۱۰	۶۶۸
Penn	Pen	۷	۶۶۹
Pennsylvania	Pennisylvania	۹	۶۶۹
Lodge	Loder	۱	۶۷۱
Burnet	Burnett	۵	۶۷۱
Traill	Trail	۷	۶۷۱
Brandenburg	Brandenberg	۹	۶۷۵
Jagellon	Jagaelon	۲و۹	۶۷۷
Nineveh	Nenuva	۱۶	۶۷۸
Ivon	Ivan	۹و۱۲، ۱۹و۲۱	۶۷۹
Deptfoid	Detferd	۳	۶۸۲
Christina	Christian	۱۸	۶۸۲
Tannenberg	Tanningberg	۱۷	۶۸۸
Magdeburg	Magdeberg	۶	۶۹۰
Dettigen	Dettigor	۸	۶۹۷
Stanislas	Stansilas	۹و۱۷	۷۰۶
Leczinska	Lezinska	۱۰	۷۰۶
Stanislas	Stansilas	۱	۷۰۷
Fontenoy	Fontenoi	۱۴	۷۰۷
Lafayette	Lafayette	۳	۷۳۲
Constituent	Censtituent	۱۵	۷۳۲
Brumaire	Bramiare	۱	۷۵۵
Vendemiaire	Vendemieire	۸	۷۵۵
Consul	Council	۱۳و۱۵	۷۵۶
Luneville	Luivile	۱۲	۷۵۸
Wurtemberg	Wartenburg	۲۱	۷۵۹
سے گفت و شنید	گفت و شنید	۱۴	۷۶۰
Gallican	Galican	۶	۷۶۱
Theodosius	Thedosius	۱	۷۶۲
Luneville	Luniville	۱۲	۷۶۳
Enghien	Enighien	۱۷	۷۶۴
Ferdinand	Ferdinend	۲۱	۷۷۰
Corsica	Carsica	۲۰	۷۷۲
Liepzig	Liepzic	۱۳و۱۶	۷۷۴
Quatre-bras	Quatre-brass	۲۴	۷۷۵
Alison	Allson	۲	۷۷۷
Seeley	Seely	۳	۷۷۷
Blucher	Bluchor	۴	۷۷۷
Havover	Honover	۱۳و۱۴	۷۷۹
Shelley	Shelly	۹	۷۸۳
Priestley	Primeeley	۱۵	۷۸۳
میں ہو رہے تھے	ہو رہے تھے	۵	۷۸۴

۷۸۵	۱۰	ولسلپین	ویسلین
۷۸۸	۲۱	۱۸۵۷ء میں میں	۱۸۵۷ء میں
۷۸۸	۲۵	فہمات	مہمات
۷۹۱	۸	Mississp pi	Mississip pi
۷۹۱	۱۱	انکی	انکو
۷۹۶	۲۰	مفصل	اور تفصیل
۷۹۷	۱۱	بیوں	بینیوں
۸۰۸	۱۸	Clouds	Cloud
۸۰۸	۲۴	شاہان فرانس	شاہان فرانس
۸۱۶	۱۱و۱۳	Frankfort	Frankfurt
۸۱۸	۱۸	Frankfort	Frankfurt
۸۱۹	۱۰	Schwar-zenburg	Schwar-zenberg
۸۲۰	۲	Philips	Phillips
۸۲۳	۸	Redeliffe	Redcliffe
۸۲۳	۲۳	Sebasta-pol	Sebasto-pol
۸۲۵	۷	جنگ واٹر	جنگ واٹرلو
۸۲۵	۷	Emanuel	Emmanuel
۸۲۹	۱۳	مفحکہ غیر	مضحکہ خیز
۸۳۰	۸	Castel-Fedardo	Castelfi. dardo
۸۳۶	۲۴	مایدکریں	عایدکریں
۸۳۸	۲۴	Helstein	Holstein
۸۴۰	۱۱	بہت جلد یہ چھوٹی	بہت جلد یہ چھوٹی
۸۴۴	۶	Praefects	Paefects
۸۴۷	۱۸	Bencdetti	Benedetti
۸۴۹	۱	Strassberg	Strassburg
۸۴۹	۲۱	حیرت	حیرت سے
۸۵۰	۱	Philips	Phillips
۸۵۳	۹	Tore	Tory
۸۵۴	۳و۱۳	Connel	Connell
۸۵۵	۱۳	Sheffied	Sheffield
۸۵۵	۱۳	Bemin-gham	Bermin-gham
۸۵۶	۱۷	Gray	Grey
۸۵۶	۲۳	Monicipal	Municipa
۸۵۹	۲۰	Disrach	Disraeli
۸۶۱	۶	Russel	Russell
۸۶۱	۱۲	Disracli	Disraeli
۸۶۱	۱۷	Shafts-bury	Shaftes-bury
۸۶۱	۲۲	Canniug	Canning
۸۶۲	۶	Libaral	Liberal
۸۶۲	۲۳	Adistri-bution	Redistri-bution
۸۶۳	آخری سطر	Presbyta-rian	Presbyte-rian
۸۶۵	۱	Alabam	Alabama
۸۶۹	۳	باتھ	ہاتھ
۸۷۰	۱۰	کہڑ	کھڑا
۸۷۱	۱۴	Kichener	Kitchener
۸۷۳	۲	Saunders	Sanders
۸۷۳	۵	Pasnell	Parnell
۸۸۲	۱۹	Devils	Devil's
۸۸۳	۱۲	Rouseau	Rousseau
۸۸۴	۴	Trades-Union	Trade Union
۸۹۵	۴	۳	۴

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۹۸	۶	اٹلی کی کی	اٹلی کی
۹۰۳	۴	Salomica	Salonica
۹۰۳	۱۸	A. Egeon	Aegean
۹۰۳	۲۱	Kossevo	Kossovo
۹۰۶	۳	History of our times	History of our own time
۹۰۹	۸	لیت ولیل	لیت ولعل
۹۱۰	۲۲	Heleors-tories	Laborato-ries
۹۱۱	۸	موڑوں	موٹروں
۹۱۴	۱۶	ضرہی تھا	ضروری تھا

تمت